بابت ماہ جنوری سنہ ۱۹۴۲ء

شاہکار لاہور

مدیر معاون
قیصر جمشید واصل بی۔اے

جلد ۱۴ — نمبر ۱

فہرست

حصہ نثر

حصہ نظم

مستقل عنوانات

احسان اللہ خاں تاجور پرنٹر و پبلشر نے عالمگیر الیکٹرک پریس لاہور پرانی تحصیل بازار میں چھپوا کر دفتر شاہکار نیو جمعدار منصل نکیہ اڑی سائیں لاہور سے شائع کیا

مختصرات

پنجاب یونیورسٹی کی روائتی بدنظمی :-

گذشتہ تیس سال سے پنجاب یونیورسٹی کی بدنظمی کی شکایات داستان ِ بزم کی صورت صوبے کے تعلیمی طبقات اور صحافتی حلقوں میں اشاعت پا رہی ہیں۔ مدتہائے مدید سے یونیورسٹی کی انتظامی مشینری پر جو ایک خاص جماعت مسلط چلی آتی ہے۔ اس نے نہایت شاطری سے دو چار مسلمانوں کو بھی اپنے ساتھ ملا رکھا ہے۔ ان نام نہاد اسلامی نمائندوں کا کام ابتدا سے یہ رہا ہے کہ اپنے مفاد کے پیش نگاہ ملی مفاد کو قربان کرتے ہوئے مسلمیان پنجاب کو سب اچھا سنا سنا کر مسلط جماعت کو من مانی کارروائیاں کرنے کے لئے سہولتیں بہم پہنچاتے رہتے ہیں۔ اور جب کبھی صحافتی یا تعلیمی اداروں سے اس جماعت کی بے راہ روی کے خلاف کوئی آواز بلند ہوئی۔ اسے یہ کہہ کر صدا بصحرا بنا دیا گیا کہ :-

"یہ خود غرض حضرات علم کے اس حقیقت صافی کو بھی فرقہ داری کے زہر سے مسموم بنانا چاہتے ہیں۔ بدبخت اتنا نہیں سوچتے کہ علم کوئی مذہب نہیں رکھتا۔"

ان عقلمندوں سے کوئی کہہ دے کہ غرض کے پرستارو علم تمہاری طرح بے دین و بے آئین نہیں۔ علم کا مذہب ہے دیانت و صداقت اس کا آئین ہے عدل و انصاف اور بے غرضی تمہارے لئے علم کی وسعتوں میں قدم رکھنے کی گنجائش نہیں۔

علم اپنے حدود ترقی و حفاظت میں پرستاران غرض کے تسلط و اقتدار کو برداشت نہیں کرے گا۔ تمہارے لئے بہتر راستہ یہ ہے کہ اپنی دراز پائی سے کنارہ کش ہو کر علم کے حظیرہ قدس سے خود ہی نکل آؤ اس وقت سے پہلے نکل آؤ جب علم کے سچے اور بے غرض خدمتگذار تمہاری گردنوں سے ہاتھ پکڑ کے اٹھا دیں گے۔

ہاں تو یونیورسٹی کی بدنظمی کے خلاف جب بھی کسی گوشے سے آواز بلند ہوتی ہے۔ یونیورسٹی کے غرض پسند ممبر اسے مختلف تہمتیں تراش کر دبانے کی کوشش میں مصروف ہو جاتے ہیں لیکن ہر تعدی کی ایک انتہا ہوتی ہے کہ صداقت عمل کو ہمیشہ کے لئے ناکام نہیں بنایا جا سکتا چنانچہ علمی و تعلیمی طبقات اور صوبے کے چند با اصول اخبارات کے متحدہ احتجاج کا یہ اثر ہوا کہ حکومت نے سرکاری طور پر ایک تحقیقاتی مجلس مقرر کر کے مشہور ماہر تعلیم سر جارج اینڈرسن کو اس کی صدارت کے لئے انگلستان سے مدعو کیا۔ اس تحقیقاتی بورڈ کی راہ میں اگرچہ فرقہ داری اور فرقہ دار (جو درحقیقت ہندو ہیں نہ مسلمان بلکہ غرض پرست ہیں) سنگ حائل بنے رہے اور اس لئے اپنی محدود طاقت کے دائرے میں بورڈ جو کچھ کر سکتا تھا نہ کر سکا مگر ہجوم موانع کے باوجود جو کچھ بھی کر گیا۔ اگر یونیورسٹی کے ارباب اختیار بورڈ کی رپورٹ کو یونیورسٹی کی نئی زندگی کا مرکز بنا کر اس کی روائتی بدنظمیوں کو دور کرنا چاہتے۔ تو اس سلسلہ میں صوبے کے تعلیمی مفاد کی بہت کچھ حفاظت ہو سکتی۔ افسوس کہ وہ ایسا نہ کر سکے۔ اور صد افسوس کہ یونیورسٹی اپنی بدعنوانیوں کا بدستور گہوارہ بن رہی ہے۔

انکوائری کمیشن کے بعد یونیورسٹی کی شصت سالہ طویل زندگی میں ایک انہونی بات ضرور ہوئی۔ وہ یہ کہ وائس چانسلرشپ پر سے یورپین اجارہ داری کا خاتمہ کر دیا گیا۔ اگرچہ ہندوستان بھر کی یونیورسٹیوں میں تو مدت مدید سے وائس چانسلر ہندوستانیوں ہی کو بنایا جا رہا ہے مگر پنجاب کی تعلیمات میں ہندوستانی وائس چانسلر کا تقرر سب کے بعد ہی سہی مگر ایک حادثہ ضرور تھا اس وقت قوم پرور حلقوں کی جانب سے ہندوستانی وائس چانسلر کی سرکاری حیثیت پر نکتہ چینی ہوئی لیکن اسے پبلک نے اس لئے شائستہ اعتنا نہ گردانا کہ سرکاری وائس چانسلر اب بھی اپنے حدود اختیار میں اس قدر آزاد ہو گا کہ اس نے یونیورسٹی کی فضا کو غرض پرستوں کی پیدا کردہ بدعنوانیوں سے پاک کرنے کی مسلسل کوشش کی تو کوئی اس کا ہاتھ روکنے والا نہیں۔

اس میں شک نہیں کہ ہمارے دیسی وائس چانسلر نے کچھ نہ کچھ اصلاحات ضرور نافذ کیں اور اس کے لئے وہ تمام صوبے کے اعتراف کے مستحق ہیں۔ لیکن اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ ان کی ذات سے اس پہلو میں جو اچھی امیدیں وابستہ کی گئی تھیں۔ پوری نہ ہو سکیں۔ یہاں تک کہ بعض یورپین وائس چانسلر خصوصاً اخیر زمانے کے دو وائس چانسلر حریفانہ کشمکشوں کے علی الرغم جس آہنی عزم کے ساتھ کام کرتے رہے۔ نئے وائس چانسلر کی کارکردگی کا ذکر ان کے کارناموں کے مقابلے میں غیر ضروری بن جاتا ہے۔

اگر کوئی وائس چانسلر مروت۔ دوست نوازی اور حریفانہ کشاکش سے

سے بے تعلق و بے خوف ہو کر کام کرے۔ تو اس کا عہد یونیورسٹی کی تاریخ میں ہمیشہ کے لئے یادگار بن سکتا ہے۔ موجودہ وائس چانسلر کے متعلق بہت سے طبقات میں یہ شبہ کیا جا رہا ہے۔ کہ وہ اپنے بعض یونیورسٹی دوستوں کے زیر اثر ہیں۔ اور ان کی پشت پناہی کو سہارا بنا کر ان کے یہ خود مطلب دوست یونیورسٹی کے میزانیہ پر بار گراں بنے ہوئے ہیں۔ ان کی میعاد ملازمت کبھی کی ختم ہو چکی ہے۔ مگر اس اقتصادی بدحالی اور بے روزگاری کے زمانے میں بھی یونیورسٹی میں بعض ملازموں کو توسیع پر توسیع ملتی جا رہی ہے۔ اس توسیع بازی کا مالی نقصان یونیورسٹی کے مالیات کے لئے ناقابل برداشت ہو سکتا ہے۔ فرض کیجیے کہ ایک ملازم جو اس وقت اٹھارہ سو روپیہ ماہانہ یونیورسٹی سے تنخواہ پا رہا ہے۔ اسی تنخواہ پر اُسے ایک نہ دو اکٹھے پانچسال کی توسیع دے دی جائے۔ تو یہ بے تحاشا اور بیجا فیاضی یونیورسٹی فنڈ کے لئے حسب ذیل صورت میں اثر انداز ہو سکتی ہے۔

اگر اس ملازم کو ختم میعاد ملازمت پر سبکدوش کر کے کسی نئے آدمی کو اس کا جانشین بنا دیا جائے تو اس وقت تعلیمی بازار میں لائق سے لائق ولایت کا ڈگر یدار دو سو روپے ماہانہ پر مل سکتا ہے۔ الہ آباد۔ آگرہ۔ بنارس اور علیگڈھ کی یونیورسٹیوں کی جدید تقرریوں کو ثبوت کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے

ہاں تو پانچسال میں (پہلا سال اصلی تنخواہ پر) دو سو روپے پانے والے کو ۲۵ روپے سالانہ ترقی کے اصول پر زیادہ سے زیادہ سو روپے ترقی ملے گی۔ اور پانچ سال گذرنے پر اس کی تنخواہ تین سو روپے ہو جائے گی۔ اس صورت میں اسے پانچسال میں نو ہزار چھ سو روپے بطور تنخواہ اور تین ہزار بطور زندگی ترقی کے گویا کل بارہ ہزار چھ سو روپے یونیورسٹی ادا کرے گی لیکن اگر اٹھارہ سو روپے پانے والے زائد المیعاد ملازم کو پانچسال کے لئے یونیورسٹی کے سر مڑھ دیا جائے۔ تو اس صورت میں اس کی صرف پنجسالہ تنخواہ ہی کی مجموعی رقم ایک لاکھ آٹھ ہزار روپے ہو جائے گی۔ اس میں سے نئے تقرر پر کام کرنے والے ملازم کی پانچسال کی تنخواہ اور ترقیوں کی بارہ ہزار چھ سو روپے کی رقم تو منہا کر لیا جائے تو چورانوے ہزار چار سو روپے کا خالص خسارہ یونیورسٹی فنڈ کو اٹھانا پڑیگا۔ آجکل ولایت کی اعلیٰ ڈگری پائے ہوئے لائق سے لائق حضرات علم کی عام کساد بازاری اور بے روزگاری کے ہاتھوں پریشان پھر رہے ہیں ایسی صورت میں کسی ادارے یا محکمے کے زائد المیعاد ملازموں کو توسیع ملنا نہ ادارے ہی کے ساتھ کوئی انصاف ہے۔ اور نہ مستحق بے روزگار ہی کے علمی استحقاق سے کوئی ہمدردی حکومت کے تمام محکمے مدت سے توسیع میعاد کے اصول کو خیرباد کہہ چکے ہیں۔ مگر ہماری یونیورسٹی کی ذرہ نواز پالیسی بدستور جاری ہے۔ یونیورسٹی کے سابق رجسٹرار رائے بہادر الیشر داس ایم اے نے اپنے عہد ملازمت میں بڑی قابلیت سے کام کیا چنانچہ ان کے ریٹائر ہونے پر خود یونیورسٹی کی جانب سے ان کی بے مثال قابلیت اور عمدہ کارکردگی کا اعتراف کیا گیا۔ لیکن میعاد ملازمت کے ختم ہونے پر انہیں سبکدوش کر دیا گیا۔ بالکل ٹھیک، ایسا ہی ہونا چاہیئے تھا لیکن اس یونیورسٹی میں بعض حضرات ایسے بھی اب تک موجود ہیں جن کی میعاد ملازمت ختم ہوئے کئی سال ہو چکے ہیں مگر انہیں سبکدوش کرنے کی بجائے توسیع پر توسیع دی جا رہی ہے۔ آخر یہ کیوں؟ جو لوگ اپنے کسی دوست کو نوازنا چاہتے ہیں۔ انہیں اپنی جیب سے اس نوازش بیہم کو وابستہ کرنا چاہیئے پبلک فنڈ پر یہ فیاضی کوئی معنی نہیں رکھتی۔

رہا یہ غلط اور گمراہ کن سوال کہ ایسے قابل لوگ یونیورسٹی کو نہیں ملیں گے۔ اس قسم کے سوالات کے پس منظر اب پیش منظر کی عریانی حاصل کر چکے ہیں جاننے والے اس فریب طلسم سے آگاہ ہیں۔ کہ جب کسی پر نوازش کرم کی بارش کرنی مقصود ہوتی ہے۔ اس کی نام نہاد قابلیت کا ڈھنڈورا پیٹنے کی مہم شروع کر دی جاتی ہے۔ اس تبلیغ ناروا سے اب کوئی دھوکا نہیں کھا سکتا۔ جو لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ کہ پبلک کو غلط پروپیگنڈے سے گمراہ کر کے اپنے کسی دوست کی ممی یونیورسٹی کے میوزیم کے لئے ہمیشہ کے لئے محفوظ بنا لیں گے انہیں اپنے اس زعم فاسد کی اصلاح جلد کر لینی چاہیئے

"تم کچھ دنوں کے لئے کچھ لوگوں کو تو فریب دے سکتے ہو مگر ہمیشہ کے لئے تمام لوگوں کو دھوکا نہیں دے سکتے"

(باقی آیندہ) ادارہ

اردو سبھا لاہور۔

اس نام کی ایک ادبی انجمن دو سال سے لاہور میں قائم ہے۔ میں مدت سے اس کا نام سن رہا تھا۔ گذشتہ اتوار کو اس کے ہفت روزہ اجلاس کی صدارت کرنے کا مجھے موقعہ ملا۔ میں اس کے دستور عمل کو دیکھکر بے حد مسرور ہوا۔ اردو سبھا ادب و شاعری کی ایک تربیت گاہ ہے جس میں نوجوان ادیب و شعراء پہلے اپنے اپنے مضامین نظم و نثر پڑھتے ہیں۔ اور بعد کو ہر مضمون پر اہل مجلس آزادانہ تنقید کرتے ہیں۔ اور صاحب مضمون کو اس کے پیش کردہ مضمون یا نظم کے حسن و قبح سے

آگاہ کیا جاتا ہے۔ نہایت احترام کے لہجے میں اعتراضات کئے جاتے ہیں اور صاحب مضمون نہایت شکرگزاری سے معقول نکتہ چینی کو قبول کرتا ہے سچ یہ ہے کہ میرے لئے صدارت کے وہ دو گھنٹے ایک سال کی مجموعی مسرتوں سے زیادہ دل خوش کن ثابت ہوئے۔

آج کل کے نوجوان اس مقولے کو کہ۔

"شاعر پیدا ہوتا ہے بنایا نہیں جا سکتا"

جز وایمان بنا کر کسی ماہر فن سے اصلاح و مشورے کو فیشن کے خلاف تصور کرنے لگے ہیں۔ اس گمرہی کا نتیجہ ہر صاحب بصیرت کی نگاہوں کے سامنے ہے کہ جس کے ہاتھ میں قلم دیکھئے۔ وہی

"خو د غلط، املا غلط، انشا غلط"

کا مصداق نظر آتا ہے۔ جدید نسل کے بہت سے افسانہ نگار اور شعراء جنہیں چند ادبی ماہناموں کے بے خبر یا بے پروا ایڈیٹروں نے اچھال اچھال کر رسوائے ہر کوچہ و بازار بنا دیا ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ ان کی خامیاں اب پختہ ہو چکی ہیں یعنی وہ چاہیں تو اپنی پختہ کارانہ نومشقی کے نقائص کو دور نہیں کر سکتے۔ اور چونکہ ادبی مرک انبوہ کے اس جشن میں جدید ادبا کی ایک تعداد کثیر شامل نظر آتی ہے۔ اس لئے کسی کو اپنی نگارشوں کے عیب کا احساس نہیں رہا ہے۔ وہ اس واقعیت کو محسوس ہی نہیں کرتے۔ کہ ان کی غلط نگاریاں ادب و شعر کو رطب و یابس کا انبار بنا رہی ہیں۔ اس جامد اور غرور زدہ ماحول میں اردو سبھا اور ایسی ہی دوسری انجمنوں کا قیام نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں جن میں شامل ہو کر باہمی بحث و تمحیص سے خام کار اپنی خامیوں سے آگاہ ہو کر قلم سنبھال کر لکھنے کے خوگر بنائے جاتے ہیں۔

اردو سبھا کے اجلاسوں میں عوام کے لئے اذن عام نہیں۔ سبھا کا کوئی ممبر کسی دوست کو ساتھ لے آئے۔ تو وہ نووارد مہمان ایک خاموش تماشائی کے حدود سے گذر کر دخل در معقولات کی جرات نہیں کرتا۔ ایسے مفید اور بصیرت افزا جلسے پر ہزار ہنگامہ کار مشاعرے قربان کئے جا سکتے ہیں۔

میری رائے تو یہ ہے کہ اردو سبھا کے رنگ کی تنقیدی مجالس ہر ضلع اور ہر قصبے میں قائم ہونی چاہئیں اور جس جگہ کوئی ادبی مجلس قائم ہے۔ اسے اسی سانچے میں ڈھل جانے کی ضرورت ہے مجالس عوام دراصل ادب و شعر کو سازگار نہیں نوجوان ادیبوں اور شاعروں میں ہمہ گیر بدذوقی کا زیادہ تر باعث جلسوں میں عوام کی شرکت ہی بنی ہوئی ہے۔ اردو سبھا کی ترقی پذیر زندگی کا سہرا سبھا کے سکرٹری ظفر زبیری صاحب مالک "منزل" کے سر ہے۔ انہوں نے اتوار کے اجلاس میں پچھلے جلسہ کی جو رپورٹ پڑھی اس سے ان کی ادبی بالغ نظری کا اندازہ ہو رہا تھا۔

اساتذہ کا شکوہ۔

بعض اساتذہ ہم سے گلہ گذار ہیں کہ مدت سے مدارس میں اساتذہ کی حقوق تلفی کے سلسلے میں کوئی آواز بلند نہیں کی گئی ہمارا جواب یہ ہے کہ ہاں مگر یہ خاموشی کچھ اس لئے نہیں کہ ہم اساتذہ کی مشکلات زندگی سے بے پروا ہو گئے ہیں نہیں کبھی نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اساتذہ کی اپنے حقوق کی جانب سے بے حسی ہمیں ان کی مشکلات سے بے خبر رکھے ہوئے ہے یعنی جن پر بیت رہی ہے۔ وہ اپنی بپتا سنانے سے ڈر رہے ہیں۔ بقول غالب۔

"مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں"

گویا ہجوم مصائب نے مصائب سے مانوس کر دیا ہے۔ پھر اس صورت میں کہ اساتذہ کی مشکلات کا علم ہی نہیں ہم ان کے متعلق کیا لکھیں اور افسران محکمہ کو کس طرح توجہ دلائیں ضرورت ہے کہ دو چار باخبر اساتذہ محکمہ تعلیم سے متعلق شکایات کی تفصیل سے دفتر شاہکار کو وقتاً فوقتاً مطلع کرتے رہیں۔ اور ہم ان مشکلات کی جانب محکمے کے ارباب نظم و نسق کو توجہ دلانے کے لئے ایک سلسلہ مضامین شروع کریں ہمیں یقین ہے کہ افسران محکمہ بالخصوص محترم رائے بہادر منشی منموہن ڈپٹی ڈائرکٹر اساتذہ کی جائز اور صحیح شکایات کے ازالے میں ایک منٹ کا توقف بھی روا نہیں رکھیں گے۔ کیونکہ صاحب موصوف خود بھی مدت مدید تک ایک استاد کی حیثیت میں خدمت علم و تعلیم انجام دے چکے ہیں اور ایک استاد کی ضروریات زندگی اور حقوق خدمت سے اچھی طرح باخبر اور اس جماعت کے درد آشنا ہیں۔

شاہکار سے متعلق۔

جنوری کا شاہکار ہدیۂ نظر کیا جا رہا ہے شکر ہے کہ ہم ناقابل عبور مشکلات میں بھی وقت پر یہ نمبر شائع کر رہے ہیں کاغذ کی گرانی اور نایابی کا رونا رونے سے کیا فائدہ ؟ جب کہ شاہکار کے خریداران آنسوؤں کو کوئی وقعت اور اس داستان کو کوئی اہمیت ہی نہیں دیتے یعنی وہ یہ محسوس ہی نہیں کرتے کہ شاہکار اور شاہکار کے خریداروں کی حیثیت میں خود وہ بھی موجودہ جنگ عالمگیر کے سبب غیر معمولی حالات سے دوچار ہیں حالانکہ اپنی اپنی زندگی کے دوسرے پہلوؤں میں یہی حضرات اشیا کی حد سے بڑھی ہوئی گرانی سے پریشان اور تنگ ہیں اور اس کے گلہ گزار بھی رہتے ہیں لیکن حیرت ہے کہ جب ایک پرچے کی خریداری کا سوال آتا ہے تو یہی لوگ یہ سب کچھ بھول جاتے ہیں کہ جنگ کا سب سے تباہ کن اثر کاغذ کی درآمد پر پڑ رہا ہے۔

کون سنتا ہے سنائیں کس کو حال درد دل ٭ ساری محفل میں کوئی درد آشنا ملتا نہیں

اس نمبر میں آپ ملک کے اکثر مشہور نگار ادبا و شعرا کے مضامین نظم و نثر ملاحظہ فرمائیں گے۔ نوجوان شاعر صہبائی ایم اے مسٹر منیر کمال بی اے جالندھری۔ چودھری محمد اکبر خان صاحب بی اے۔ چودھری

یہ زمیں

[ڈاکٹر خالد کا نام محتاج تعارف نہیں۔ اب آپ کا مجموعہ کلام سرورِ نو زیرِ طبع ہے۔ مرقومۂ ذیل نظم اسی مجموعہ سے لی گئی ہے۔ آئندہ مسٹر خالد کا تازہ کلام اکثر شاہکار کے صفحات کی زینت ہوا کریگا۔] ——— مدیر معاون]

یہ زمیں!
عشق کے شعلوں، پتنگوں، صرصروں
پھولوں کی رنگیں کشمکش
اس خاک پر جبتی گئی،
رُوحِ انسانی کو حسنِ جاودانی مل گیا
حیرتوں کا راز ہے یہ سجدہ گاہِ قدسیاں
محسودِ چشمِ آسماں!
اس مقدس آستاں پر زندگی کا گھر بنے۔

ڈاکٹر تصدق حسین خالد بار ایٹ لا،

پھر شب ہوئی

پھر شب ہوئی !
تاریکیاں، اُف! بیکسی
بیچارگی ...... !
پھر مہرباں ہم پر ہوئی
بیچارگی۔
کوئی خدا سے تو کہو
اَے خالقِ شمس و قمر
وہ خواب ہی دے دے مجھے
دیکھا تھا جس میں ایک شب
اپنا دیا جلتا ہُوا

قیصر جمشید واصل

کی زبان سمجھ لینے کی کچھ نہ کچھ صلاحیت ابھی اس میں باقی ہے' چنانچہ ایک دن پچھلے پہر میں اسے سمندر کے کنارے چٹانوں کے عین بیچوں بیچ اپنے ساتھ لے گیا میں جانچنا چاہتا تھا۔ کہ کیا سچ مچ کچھ بصیرت ابھی اس میں باقی ہے؟

اس روز ہوا کہیں چھپ رہی تھی لیکن میں جانتا تھا کہ سمندر کے افق پر فضا کی گہرائیوں" میں کہیں نہ کہیں وہ موجود ہے۔ جو جھونکے اس کمین گاہ سے بے اختیار نکل بھاگتے تھے۔ اُن کے ڈر سے سفید بادلوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے آسمانوں میں دیوانہ وار دوڑتے پھر رہے تھے۔ جوار بھاٹے کی کشمکش میں سمندر خوف سے چیختا چلاتا خشکی کی طرف بڑھا چلا آرہا تھا اور اور لہریں کراہتی ہوئی ساحل کے پتھروں پر سر ٹپک رہی تھیں۔ تمام کائنات طوفان کی طاقت سے خوفزدہ ہو رہی تھی۔

اس وقت آنے والے خطرے کے متعلق میں نے اس سے کچھ نہیں کہا۔ ہم عین سمندر کے کنارے پہ پہنچ گئے۔ لہروں کے پہاڑ گڑگڑاتے ہوئے خشکی کی طرف بڑھتے اور چٹانوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتے۔ سارا ساحل جھاگ جھاگ ہو رہا تھا۔ اور فنا ہونے والی لہروں کا پانی کروڑوں بوندوں میں بکھر کر ہماری طرف یوں لپک رہا تھا۔ جیسے کوئی مصیبت زدہ انتہائی مایوسی میں ہاتھ اُٹھا کر مدد مانگ رہا ہو۔

ہم نے دیکھا کہ اندھیرا دور سے ہماری طرف رینگتا چلا آرہا ہے ہم سمندر سے لوٹ پڑے اور دیکھا کس طرح ارد گرد کی پہاڑیاں اس اندھیرے میں ڈوب رہی ہیں۔ بیچاری زمین اندھیری رات کا سامنا کرنے کے لئے اپنے دل کو پتھر بنا دینا چاہتی تھی۔ اس نے کہا" معاذ اللہ! کتنا سنسان مقام ہے۔"

اُسے یہ مقام سنسان معلوم ہوتا تھا۔ لیکن میں ہر طرف چھوٹے چھوٹے پودوں۔ کھیتوں۔ دیو قامت درختوں اور بکھرے ہوئے پتھروں کی اوٹ میں حرکت محسوس کر رہا تھا۔ اور مجھے یہ جگہ ضرورت سے زیادہ آباد معلوم ہوتی تھی۔ پھر بھی اس کے اکیلے پن کے احساس کو میں نے اچھا شگون سمجھا۔ کیونکہ یہ احساس بسا اوقات ظاہر کرتا ہے کہ اب کسی شخص میں علم حاصل کرنے کی صلاحیت پیدا ہو گئی ہے۔

پھر جب جاڑے کی تاریکی پوری طرح چھا گئی۔ تو میرا خیال تھا کہ وہ پوری طرح محفوظ ہے۔ وہ شام سے پہلے گھر آجاتا اور چٹانوں تک کبھی نہیں جاتا تھا۔ البتہ کبھی کبھی وہ میری طرف اس طرح دیکھتا۔ جیسے اس کے دل میں بغاوت جڑ پکڑ رہی ہو۔ گویا وہ میرے علم سے اُلجھ پڑنے کو تیار ہے۔

میں نے کبھی اسے جرأت نہ دلائی۔ کہ وہ بولے۔ مجھے یقین تھا کہ اس طرح وہ کبھی کچھ نہیں جان سکیگا۔ اور نہ میرا کوئی لفظ اس کی کچھ مدد کر سکتا ہے میرا یہ خیال تھا بھی درست لیکن اس نے مجھے بولنے پر مجبور کر دیا۔

ہم تاریک زمانے کے شباب میں تھے۔ ایک روز پچھلے پہر وہ میرے سامنے تن کر کھڑا ہو گیا۔ گویا میری مخالفت پر تلا بیٹھا ہے۔ بولا" علم کی بڑائی کا یہ اظہار کچھ فضول سا ہے۔ تصنع چھوڑ کر اگر تم مجھے اپنے وہم کی تائید میں کسی دلیل سے قائل نہیں کرو گے۔ تو مجھے باہر جا کر خود تجربہ کرنا ہوگا۔"

میں اپنی کمزوری کو جانتا تھا۔ اس لئے اسے ٹالنا چاہا۔ اور کہا" دلائل تو میں دے چکا ہوں"۔

"تم جانتے ہو۔ وہ دلیلیں بالکل بودی تھیں۔"

"اچھا تم کچھ انتظار تو کرو۔ کیا تم اس سے بھی انکار کرو گے۔ کہ ابھی تم نوجوان ہو"

"جوانی جرأت اور تجربے کا زمانہ ہے"

"تمہارا مطلب ہے فضول تجسس اور ناعاقبت اندیشی کا زمانہ"!

"میں جا رہا ہوں"۔

"تم واپس کبھی نہیں آؤ گے"۔

"اگر میں لوٹ آیا۔ تو کیا تم مان لو گے کہ میں راستی پر ہوں"

میں اس کے بے ہودہ چیلنج کو قبول نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے کہا" بعض لوگ بچ بھی نکلتے ہیں"

"جب تک تمہیں یقین نہیں آجاتا میں ہر رات جاؤنگا۔ جاڑا نکلنے سے پہلے پہلے تمہیں بھی میرے ساتھ چلنا ہوگا۔ میں تمہیں اس خوف سے نجات دلا کر دم لوں گا"

مارے غصے کے میں نے منہ پھیر لیا میں نے سنا کہ وہ باہر جا رہا ہے لیکن میں نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ اپنے پیچ و تاب میں خیالات سے لڑنے کے لئے میں ایک کونے میں بیٹھ گیا۔ آخر میں نے دل کو تسلی دی کہ شام تک وہ لوٹ آئے گا۔

شام تک میں نے انتظار کیا۔ لیکن وہ واپس نہیں آیا۔

میری بے چینی بڑھ رہی تھی۔ کھڑکی کھول کر میں نے دیکھا کہ مغرب میں ہلکی سی زردی ابھی باقی ہے۔ میں اس کی طرف اسی فکر اور مایوسی سے دیکھ رہا تھا جس طرح اس چراغ کی ٹمٹماتی ہوئی لَو کو جو طوفانی رات میں پہاڑیوں سے اس پار آنے والے مسافر کی رہنمائی کے لئے روشن کیا گیا ہو۔

خوفزدہ بادل سمندر کے کنارے سے اُچھل اُچھل کر اوپر نیچے چکر لگاتے یوں نکل رہے تھے۔ گویا آنے والی مصیبت کی دہشت سے کھوکھلے آسمان میں بازو پھیلائے بھاگے جا رہے ہوں۔

میں واپس کمرے میں چلا گیا۔ ٹوپی تلاش کی۔ پھر دروازے پر آیا۔ شام کے اندھیرے میں مجھے قدموں کی آہٹ کا انتظار رہا۔ مجھے یقین ہی نہیں آتا تھا۔ کہ اندھیرا چھا جانے کے بعد بھی وہ چٹانوں میں ٹھہرا رہیگا۔ اپنی خواہش کے سامنے ٹال مٹول کرتے ہوئے میں کھڑا رہا۔ یہاں تک کہ رات پوری طرح چھا گئی۔

اُس نے مجھے بُزدلی کا طعنہ دیا تھا۔ اور میں جانتا تھا کہ اب مجھے اس کو ڈھونڈھنے کے لئے جانا ہی ہوگا۔ لیکن دروازہ کھولنے سے قبل میں نے ایک مرتبہ اور سننے کی کوشش کی۔ آہٹ پا لینے کی خواہش نے میرے کانوں پر ایسا زور ڈالا کہ کھلتے ہوئے دروازہ کی چرچراہٹ اور قدموں کی چاپ کئی مرتبہ میں نے سُنی۔ لیکن اسے سنتے ہوئے بھی مجھے پورا علم تھا۔ کہ یہ آواز اصل نہیں۔ بلکہ میرے ہی دماغ کی پیدا کی ہوئی ہے۔

آخر میں ایک دم تیزی سے باہر بھاگ نکلا۔

میں باہر کے دروازے تک نہیں پہنچا تھا کہ ہوا کے ایک تیز جھونکے نے مجھے سر سے پاؤں تک جھنجھوڑ دیا۔ فضا دل ہلا دینے والی صداؤں سے اٹی پڑی تھی۔ بے شمار بادل چیخیں مارتے بھاگے جا رہے تھے۔ اور جھاڑتے چنگھاڑتے ان کے پیچھے لپکے آ رہے تھے۔ اور ان کے ساتھیوں کے گرجنے سے کائنات میں زلزلہ سا پیدا ہو گیا تھا۔

مجھ میں اتنی جرات نہیں تھی۔ کہ اوپر نظر اٹھا کر دیکھوں میں نے اپنے سر کو دونوں ہاتھوں میں مضبوط تھام لیا۔ اور گرتا پڑتا بے تحاشا اس پگڈنڈی کی طرف بھاگا جہاں سے ان خطرناک چٹانوں پر چڑھنے کا راستہ نکلتا تھا۔

میں نے اسے پکارنے کی کوشش کی لیکن میری آواز کو ہوا کے مضبوط ہاتھوں نے تندی سے مسل کر پاش پاش ہونے والے جھاگ کے اُن ہزاروں ذروں میں بکھیر دیا جو بے بسی اور بے چارگی میں ہر طرف سر پٹک رہے تھے۔

طوفان پورے زور پر تھا۔ دیودار صنوبر اور شمشاد کے اونچے اونچے درخت پاگلوں کی طرح جھوم جھوم کر دوہرے ہوئے جاتے تھے۔ تند اور تیز جھکڑ ان درختوں کی ٹہنیوں اور پتوں میں سے ایک جلوس کی شکل میں نکلے جا رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بدمست اور وحشی دیو یکزبان ہو کر موت کا راگ الاپتے ہوئے اس کی تانوں پر کوئی انوکھا ناچ ناچ رہے ہیں۔

سمندر کی گونج اور بادلوں کی گڑگڑاہٹ کے ساتھ یہ مہیب گانا جسم میں خون اور ہڈیوں میں مغز خشک کئے ڈالتا تھا۔ میرے پاؤں ٹھٹھر گئے۔ میرے قدموں نے آگے بڑھنے سے جواب دے دیا۔

فطرت پاگل ہو کر کھیل رہی تھی۔ ہر طرف ایک ہنگامہ بپا تھا۔ ابھی بوندا باندی۔ ابھی موسلا دھار بارش۔ ابھی شور محشر ابھی موت کا سا سکوت اندھیرے سے میرا دم گھٹا جا رہا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ بجلی بار بار چمکے لیکن جونہی بجلی کوندتی ہیں گھبرا کر آنکھیں بند کر لیتا۔ مجھ میں یہ سماں دیکھنے کی طاقت نہیں تھی۔ طوفان کی طاقتیں مجھے ڈرا دھمکا کر چٹانوں کی طرف ہانک دینا چاہتی تھیں۔

شور سے کانوں کے پردے پھٹے جا رہے تھے۔ فطرت غیظ و غضب میں دانت پیس رہی تھی میرا دل کہہ رہا تھا کہ اس طوفان میں اس کا زندہ رہنا قطعی ناممکن ہے میں جانتا تھا کہ اب اسے ڈھونڈنا بیکار ہے۔

کسی نہ کسی طرح گرتا پڑتا میں واپس سڑک تک پہنچا۔ اور پھر بے تحاشا گھر کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔

طبیعت میں سکون پیدا کرنے کے لئے میں بہت دیر تک آگ کے پاس بیٹھا رہا۔ انتہائی تلخی سے میں اپنے تئیں بُرا بھلا کہہ رہا تھا۔ کہ اسے کیوں روک نہ لیا میں ہار مان لیتا۔ ظاہر کرتا۔ کہ مجھے اس کی بات کا یقین ہے یا کم از کم اس کی بے ہودہ جہالت اور جوش سے کچھ ہمدردی ظاہر کر دیتا۔

پھر میں نے اس خیال سے سکون حاصل کرنے کی کوشش کی کہ یہ اس کی قسمت تھی اور جو کچھ ہوا وہ آخر ہو کر ہی رہنا تھا جن طاقتوں نے اس کی تباہی کا حکم جاری کر رکھا تھا۔ انہیں میری خواہشوں اور کوششوں کی کیا پروا تھی۔ آسمانوں میں ناچتے ہوئے جنات کی دھمک میرے دل میں اتری جا رہی تھی اور زمین کی چیزوں کو برباد کرنے والے بھوتوں کے شور اور غل سے میرا دماغ پریشان ہوا جاتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ میری کوشش اسے کبھی نہ بچا سکتی۔۔۔۔۔۔۔

پھر جب باہر کا دروازہ کھل کر زور سے بند ہوا۔ اور میں نے سچ مچ اس کے قدموں کی چاپ سُنی۔ تو میرا خیال تھا کہ مرتے وقت اس کی رُوح آخری مرتبہ مجھ سے ملنے آ رہی ہے لیکن جب وہ چمکتی ہوئی آنکھوں اور دمکتے ہوئے رخساروں سے ہنستا اور پیشانی کے بال پیچھے ہٹانے کی خاطر سر کو جھٹکتا میرے پاس آیا۔ تو میں حیران ہوا۔ کہ مجھے غصہ آ رہا ہے میں نے کہا "اتنی رات گئے تک تم کہاں رہے ہو میں تمہاری تلاش میں چٹانوں

تک ہو آیا ہوں۔

"میں تو یہ خیال کر چکا تھا۔ کہ تم مر گئے"!

"تم چٹانوں تک آئے تھے"! میرا غصہ اور بھی بڑھ گیا لیکن مجھے اعتراف کرنا پڑا۔ "نہیں چٹانوں تک جانے والے راستے کے سرے تک"۔

"اوہ۔ لیکن ایسے موسم میں تمہیں چٹانوں پر کبھی نہیں جانا چاہئے"۔

"تو گویا۔ اب تمہیں میری بات کا یقین ہو گیا ہے نا؟"

وہ مسکرایا۔ "مجھے یقین ہے کہ اس موسم میں ان چٹانوں پر جانا تمہارے لئے خطرے سے خالی نہیں۔ کیونکہ تمہارے دل میں اندھیرے کی بلاؤں اور طوفان کی قوتوں کا یقین ہے۔ اور تم ڈرتے ہو"۔

وہ دروازے میں کھڑا تھا۔ طوفان سے مقابلہ کرنے کے بعد اس کی تازہ جوانی میں اور بھی تازگی آگئی تھی میں نے اس کی آنکھوں میں وہ چمک دیکھی جو کوئی نئی چیز پا لینے ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ میں اُسے کچھ جواب نہ دے سکا۔ البتہ میرے دماغ میں یہ الفاظ گھوم رہے تھے۔

"جوانی ..... تجسس ..... جرأت ..... تجربہ ..... کامیابی!!"

مترجمہ سید اکبر علی

نغمات

گذرے ہیں کچھ زمانے ایسے بھی زندگی میں
صبحِ کفن کے جلوے دیکھے ہیں چاندنی میں

او مسکرانے والے تاروں کی دل کشی میں
اندھیرے ہے مسافر لُٹ جائے روشنی میں

جنّت بھی ہے اسی میں دوزخ بھی ہے اسی میں
کچھ بھی نہیں ہے لیکن سب کچھ ہے زندگی میں

اے ناخدائے ہستی ہے دور میری بستی
بہنے بھی دے یہ کشتی موجوں کی رہبری میں

تقسیم بیخودی کا آیا ہے دورِ مستی
ساغر چھلک رہے ہیں میخانۂ خودی میں

افسانۂ چمن کی تکمیل جن سے ہوگی
ایسے بھی چند سادہ اوراق ہیں کلی میں

ہے وہ ہی ایک داتا مانگوں تو کیا نہ پاؤں
وسعت کہاں سے لاؤں پیمانۂ تہی میں

آجاؤ مل کے گائیں، رومانِ دل سنائیں
نغمے تڑپ رہے ہیں سانسوں کی بانسری میں

گلچیں کی دسترس سے ناآشنا ہیں کلیاں
لٹ جائیں گی بہاریں اک دن ہنسی ہنسی میں

شام فریب نکلے صبح ازل کے جلوے
دنیا نے موت لے لی ارمانِ زندگی میں

وہ لے نثار شامِ وعدہ بھی گر نہ آئے
سوچا ہے مر رہیں گے آغوشِ بیکسی میں

نثار اوٹاوی

درسِ ہُو

ہو نہ شکارِ بے دلی، لذّتِ غم اُٹھائے جا
دل نہ بنا، نہیں سہی، درد کو دل بنائے جا

وہ بھی عطائے دوست ہے۔ یہ بھی اسی کی دین ہے
عیش میں قہقہے لگا۔ طیش میں مُسکرائے جا

دستِ طلب نہیں رسا، دستِ کرم تو ہے دراز
ل ہی رہے گا کچھ نہ کچھ، ہاتھ یونہی بڑھائے جا

سازِ بہارِ جانفزا، خود تری لَے بڑھائے گا
پیروئی ہزار کیا، اپنی ہی دُھن میں گائے جا

سارے جہاں کے فلسفے، ہیچ ہیں اس کے سامنے
عشق کا امتحان نہ لے۔ عقل کو آزمائے جا

عرضِ ثبوتِ زندگی، یوں بھی ہَے اور یوں بھی ہے
ہنس نہ سکے ہنسائے جا، رو نہ سکے رُلائے جا

محفلِ ناز دُور ہے، حُسن ہے دیر آشنا
نغمہ کو اور کر رسا۔ ساز کی لَے بڑھائے جا

برقِ بہار اک نظر! کون اب آئے گا اِدھر
تیری تجلّیوں کی خیر، شمعِ لحد جلائے جا

مل گئی تجھ کو راہِ دوست۔ پھر کوئی اور آئے کیوں
اپنے قدم بڑھائے جا، نقشِ قدم مٹائے جا

دعوتِ بزمِ انقلاب، ہو نہ اگر نگاہ یاب
اس کا جوابِ کامیاب یہ ہے کہ بِن بُلائے جا

یاد پہ تیری منحصر۔ ہَے یہ حیاتِ مختصر
مجھ کو نہ یاد کر مگر۔ تو مجھے یاد آئے جا

زندگی اور موت میں فرق بقیدِ غم نہیں
اب بھی اگر جِلائے تو تیری خوشی جلائے جا

اے نگرانِ کائنات، میں ہوں ترا ہی عکسِ ذات
بگڑی ہوئی ہے میری بات، جیسے بنے بنائے جا

بیٹھ کے دِل کے روبرو، آگ لگا دے چارسُو
سیکھ لے مجھ سے درسِ ہُو۔ کون و مکاں پہ چھائے جا

علم جہاں میں وارثیؔ ہو نہ مذاقِ آگہی
راز و نیازِ عاشقی، فاش نہ کر چھپائے جا

علّامہ سیماب اکبرآبادی

میں نے شادی کی کیونکہ اس

رفیقِ تنہائی

کو بھگانے کے لئے ---- ایک رفیقِ تنہائی کی ضرورت تھی

میرے عزیز دوست! تم کہتے ہو کہ اس معمّے کو آسانی سے سمجھنا مشکل ہے میں بھی اس کو مانتا ہوں۔ تمہارا خیال ہے کہ میں پاگل ہوگیا ہوں۔ ممکن ہے یہ درست ہو لیکن اس کے وجوہ وہ نہیں۔ جو تمہارے دماغ میں ہیں۔

میرے نظریات اور عقاید میں قطعاً کوئی تغیر نہیں آیا ---- آ ہی نہیں سکتا۔ میں ازدواجی زندگی کو ایک احمقانہ لغزش تصور کرتا ہوں۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ دس شوہروں میں سے نو شوہر اپنی بیویوں کی بیوفائی کا رونا روتے ہیں۔ شادی کر کے وہ اپنی زندگیوں کو تباہی کے غار میں دھکیل دیتے ہیں۔ وہ اپنی آزادی کو ضائع کر دیتے ہیں۔ اپنے رنگین تخیل کے پروں کو باندھ دیتے ہیں۔ وہ محبّت کی لذت چکھ ہی نہیں سکتے۔ محبت، دنیا کا واحد، بہترین اور مسرت انگیز جذبہ۔ تم جانتے ہو میرا مطلب کیا ہے۔ میں ہمیشہ یہ محسوس کرتا رہا ہوں، کہ میری محبت کسی ایک عورت پر اکتفا نہیں کر سکتی۔ میں ہزار ہا پُرگداز باہوں، لاتعداد نرم نرم ہونٹوں کا دلدادہ ہوں۔ میں بیک وقت اپنے آغوش میں اس حسین مخلوق کا اجتماع دیکھنا چاہتا ہوں لیکن اس کے باوجود میں شادی کر رہا ہوں۔

میں تم کو یہ بھی بتا دینا چاہتا ہوں، کہ میں اس لڑکی کے متعلق بہت کم جانتا ہوں، جو کل میری رفیقہ حیات ہوگی۔ میں نے اس کو صرف چار پانچ مرتبہ دیکھا ہے۔ میں یہ جانتا ہوں کہ اس کی فطرت میں کوئی معیوب بات نہیں۔ اور میری دلی تسکین کے لئے یہ کافی ہے۔ وہ توانا، خوبصورت اور اوسط قد کی دوشیزہ ہے۔ گو یہ ضرور ہے کہ پرسوں تک میں قدرتاً ایک دراز قد، سیاہ رنگ اور کمزور بدن دوشیزہ کی خواہش شدت کے ساتھ محسوس کروں گا۔ وہ امیر گھرانے سے نہیں، اس کا تعلق اوسط طبقہ سے ہے۔ اس میں کوئی ذاتی خصوصیات بھی نہیں، اور کوئی برائیاں بھی نہیں۔ تم مجھ سے پوچھو گے "کہ میں شادی کیوں کر رہا ہوں"؟

اس کی وجہ کیا ہے میں تمہیں یہ عجیب اور ناممکن سی وجہ بتاتا ہوں، جس نے مجھے یہ احمقانہ فعل کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ بہر کیف یہ حقیقت ہے کہ میں اپنی تنہائی سے ڈر گیا ہوں، اکیلے پن سے خوفزدہ ہوگیا ہوں۔ میں اب نہیں چاہتا کہ رات اکیلا رہ کر گذار دوں۔ میں چاہتا ہوں، کہ میرے پاس کوئی دوسری ہستی موجود ہو، جس کا ہاتھ میرے دل پر ہو، اور جو مجھ سے پیاری پیاری باتیں کرے!

میں چاہتا ہوں، کہ کوئی صبح سویرے مجھے جگانے کے لئے میرے سامنے کھڑا ہو، جس پر میں اچانک سوال کر سکوں، گو وہ سوال کتنے ہی احمقانہ اور لایعنی کیوں نہ ہوں، تاکہ میں کوئی انسانی آواز سن سکوں، اور یہ محسوس کر سکوں، کہ یہاں میرے آس پاس ہی کوئی جیتی جاگتی روح موجود ہے، جب میں جلدی سے شمع روشن کروں، تو اپنے قریب ہی کوئی انسانی چہرہ دیکھ سکوں، کیونکہ..... کیونکہ..... مجھے یہ کہتے ہوئے شرم محسوس ہوتی ہے..... کیونکہ..... میں تنہائی سے گھبرا گیا ہوں، اکیلا رہتے رہتے چلّا اٹھا ہوں۔

او! تم مجھے نہیں سمجھ سکتے!

مجھے کوئی خوف نہیں ڈرا سکتا، میں کسی خطرے سے مضطرب نہیں ہوتا، کوئی شخص اگر میرے کمرے میں گھس آئے تو میں بغیر کسی گھبراہٹ اور اضطراب کے اس کو قتل کر سکتا ہوں، میں چڑیلوں اور بھوتوں سے خوفزدہ نہیں ہوتا۔ کیونکہ میں ان کا قائل ہی نہیں ہوں!

میں مُردوں سے نہیں ڈرتا۔ کیونکہ میرا اعتقاد ہے۔ کہ جو شخص ایک دفعہ مر جاتا ہے، وہ دوبارہ دنیا میں واپس نہیں آتا۔

ہاں یقیناً مجھے یہ بتانا پڑے گا۔ کہ میں اپنے آپ سے خوفزدہ ہو گیا ہوں۔ ایک بھیانک احساس سے ڈر گیا ہوں۔ تم مجھ پر ہنس سکتے ہو، میری اس بزدلی پر مسکرا سکتے ہو۔ کیونکہ میں اس چیز پر اثر انداز نہیں ہو سکتا میں کمرے کی دیواروں، میز کرسیوں، اور تاریک گوشوں سے خوف کھانے لگا ہوں، فقط یہ ہی نہیں میں اپنے خیالات و تصورات سے بھی ڈرنے لگا ہوں۔ جب میں بولتا ہوں تو مجھے اپنی آواز سے خوف آتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے، جیسے دروازے کے پیچھے، پردوں کی اوٹ میں، اور

بستر کے نیچے کوئی چھپا بیٹھا ہے۔ اکثر چلتے چلتے پیچھے مڑکر دیکھنے لگتا ہوں، اس خیال سے کہ میری پشت پر کوئی آرہا ہے بیں مشتعل ہو جاتا ہوں خوف سے تھرتھرانے لگتا ہوں، اور اپنے آپ کو کمرے میں بند کر دیتا ہوں، اور آنکھوں کو ایک نامعلوم عرصہ کے لئے بھینچ لیتا ہوں، یہ جانتے ہوئے کہ میری شمع بستر کے پاس ہی، میز پر پڑی جل رہی ہے، اور جس کو مجھے بجھانا ہے، لیکن اس کے باوجود میں اس کو بجھانے کی جرات نہیں کرسکتا۔

کتنا بھیانک اور خوفناک ہے اس طرح کا جینا، یوں زندگی کے دن گذارنا! کیا یہ غلط ہے ؟

اس خوفناک جذبے کی اثرانگیزی سے پہلے میری یہ کیفیت نہ تھی۔ میں ایک مخصوص سکون کے ساتھ گھر میں داخل ہوتا تھا۔ مجھے کوئی بھیانک خیال مضطرب نہیں کرسکتا تھا۔ اگر اس وقت مجھے کوئی پاگل کہہ دیتا۔ تو میں بے اختیار اس کی کم ظرفی پر ہنس دیتا میں اندھیرے میں ہی کمرے کے دروازے کھول دیتا تھا، کمرے کو بغیر مقفل کئے ہی سوجاتا تھا۔ آدھی رات کے وقت مجھے جاگنے کی ضرورت پیش نہیں آتی تھی۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ آیا مکان کے تمام دروازے بند ہیں کہ نہیں۔

اس حادثے کی ابتدا خزاں کی ایک شام کو عجیب انداز سے ہوئی۔

جب کہ میرا خادم مجھے کھانا کھلا کر کمرے سے چلا گیا۔ تو مجھ پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہوگئی، میں نے کمرے میں ٹہلنا شروع کر دیا۔ اس وقت میرا دل نہ تو کوئی کام کرنے کو چاہتا تھا، اور نہ ہی مطالعہ میں جی لگتا تھا، باہر بارش ہو رہی تھی، میں کسی سے باتیں کرنا چاہتا تھا، کسی کی باتیں سننا چاہتا تھا۔ لیکن فوراً میں نے محسوس کیا، کہ میں اکیلا ہوں، یہ خیال آتے ہی مجھے اپنا کمرہ پہلے سے بھی زیادہ خالی نظر آنے لگا۔ مجھ پر تنہائی کا ایک شدید سا جذبہ چھا گیا، مجھے اب کیا کرنا چاہئے۔ میں بیٹھ گیا، لیکن ایک کرب نے مجھے اٹھ کھڑا ہونے پر مجبور کر دیا، میری ٹانگوں میں آگ سی بھر دی، اور میں دوبارہ کمرے میں ٹہلنے لگا

لیکن میری بے چینی بتدریج بڑھتی جا رہی تھی۔ میرے پاس کوئی نہ تھا جس سے میں اس بے چینی کا اظہار کر سکتا میں گھر سے باہر نکل گیا کسی دوست کی تلاش میں، جو میرا ساتھ دے سکے۔ لیکن افسوس کہ مجھے کوئی دوست نہ مل سکا اس لئے مجبوراً مجھے سڑک پر گھومنا پڑا، لیکن بارش کے باعث نم آلودہ سڑک بہت دیر تک مجھے ٹہلنے کی اجازت نہ دے سکی میں آہستہ آہستہ آگے چلنے لگا۔ دل میں یہ کہتے ہوئے "کیا مجھے کوئی ہستی نہیں ملے گی جس سے میں ہمکلام ہوسکوں"!

میں مختلف قہوہ خانوں میں جھانکنے لگا جہاں میں نے کئی افراد کو دیکھا جو میز کے گرد بیٹھے ہوئے تھے، اور جن میں اتنی طاقت باقی نہیں رہی تھی کہ وہ اپنی منگائی ہوئی چیزوں کو ختم کرسکیں، ایک لامحدود وقت کے لئے میں بغیر کسی مطلب کے ایک آوارہ گرد کی طرح ادھر اُدھر گھومتا رہا۔ اور آدھی رات کے قریب گھر کو لوٹا میں از حد تھک گیا تھا، میرے خادم نے مجھے دیکھتے ہی فوراً دروازہ کھول دیا، میں نے محسوس کیا کہ میرا پڑوسی بھی ابھی ابھی واپس گھر لوٹا ہے۔

جب میں گھر سے باہر جاتا ہوں، تو میرا معمول ہے کہ میں اپنے کمرے کو مقفل کرکے جاتا ہوں، لیکن اس رات میرے کمرے کے کواڑ بند تھے، لیکن مقفل نہ تھے جس نے مجھے حیران سا کر دیا، لیکن میں نے خیال کیا، شاید میری غیر حاضری کے دوران میں میرے کوئی خطوط آئے ہوں:

میں اندر چلا گیا، میں نے دیکھا کہ انگیٹھی میں آگ ابھی تک جل رہی ہے جس نے کمرے میں ایک مدھم سی روشنی پیدا کر دی تھی، اور جب میں شمع کو روشن کرنے کے لئے آگے بڑھا، تو میں نے دیکھا، کہ کوئی میری آرام کرسی پر آگ کے پاس بیٹھا ہوا ہے جس کی پشت میری طرف تھی۔ میں ذرّہ بھر بھی خوفزدہ نہ ہوا، میں نے سوچا، میرا کوئی دوست یا واقفکار ہوگا، جو مجھے ملنے کے لئے آیا ہوگا، اور بہت ممکن ہے، میرے خادم نے میری طویل غیر حاضری سے اُکتا کر کمرے کی دوسری چابی اس کے حوالے کر دی ہو، مجھے اپنے دوست کا صرف سر ہی نظر آرہا تھا، اور جیسے وہ کرسی پر میرا انتظار کرتے کرتے سو گیا تھا۔ اس لئے میں اس کو جگانے کے لئے اس کے قریب گیا، میری نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کا دایاں بازو نیچے لٹک رہا تھا، اور اس نے اپنی ٹانگیں ایک دوسرے پر رکھی ہوئی تھیں، میں نے دل میں کہا "یہ کون ہوسکتا ہے"! میں اس کو صاف طور پر نہیں دیکھ سکتا تھا۔ کیونکہ کمرے میں تاریکی تھیں میں نے اپنا ہاتھ اس کے شانے پر رکھنے کے لئے آگے بڑھایا، لیکن وہ کرسی کی پشت پر جا پڑا، وہاں کوئی نہ تھا، کرسی خالی تھی ـــ

میں ایک بھیانک خوف سے اُچھل پڑا، اور فوراً پیچھے ہٹ گیا۔ جیسے میری راہ میں دفعتاً کوئی خطرہ حائل ہوگیا ہو، میں دوبارہ آرام کرسی کی جانب بڑھا ـــ کانپتے ہوئے دل، اور تھرتھراتی ہوئی رُوح کے ساتھ۔

لیکن میں ایک ٹھنڈے دماغ کا مالک ہوں، میں نے بہت جلد اپنے آپ پر قابو پالیا، میں نے اس کو محض ایک وہم خیال کیا، میں فقط ایک چھلاوے کا شکار ہو رہا تھا، جس میں میرے دماغ کا کوئی قصور نہ تھا، یہ صرف میری آنکھیں تھیں، جنہوں نے مجھکو یہ دھوکا دیا تھا، ایک ایسا

دھوکہ جو بعض اوقات سادہ لوح لوگوں کو معجزوں کا قائل کر دیتا ہے۔
میں نے شمع کو روشن کر دیا' اور جب آگ کے قریب گیا' تو میں ایک بار پھر اچھل پڑا' جیسے مجھے کسی نے چھو دیا ہو' میرا دل ابھی تک اضطراب کی لہروں میں ڈوب رہا تھا' میں نے اسی بے چینی کو دور کرنے کے لئے زور زور سے گنگنانا شروع کر دیا' تب میں نے کمرے کو مقفل کر دیا جس سے میرے دل کو ایک اطمینان سا ہو گیا' کیونکہ باہر سے اب کوئی نہیں آسکتا تھا۔

میں اس واقعہ پر کافی دیر تک غور کرتا رہا۔ غور کرتے کرتے سو گیا لیکن چند لمحوں کے بعد میں نیند سے چونک سا پڑا' شمع بجھ چکی تھی' اور آگ بھی بجھتی جا رہی تھی جس کا تھوڑا سا عکس کرسی کے قریب فرش پر پڑ رہا تھا میں نے دیکھا کہ وہ شخص پھر کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔
میں نے جلدی سے دیا سلائی جلائی' لیکن مجھے غلطی ہوئی تھی۔
وہاں کوئی نہ تھا' بہر کیف میں اٹھ کھڑا ہوا' اور کرسی کو بستر کے پیچھے چھپا دیا اور سونے کے لئے کوشش کی' کیونکہ اب کمرے میں مکمل تاریکی تھی' لیکن ابھی مجھے اس واقعہ کو بھولے ہوئے بمشکل پانچ ہی منٹ ہوئے ہونگے' کہ میں یہ تمام منظر خواب میں دیکھنے لگا' جس سے میں چونک پڑا' شمع کو روشن کر کے میں بستر پر ہی بیٹھ گیا۔ سونے کی ذرا سی خواہش کے بغیر۔
دو مرتبہ مجھ پر نیند نے غلبہ کیا' لیکن دو ہی مرتبہ میں نے خواب میں وہی کریہہ منظر دیکھا' اور میں نے محسوس کیا' جیسے میں پاگل ہو گیا ہوں' جب سویرا ہوا' تو میں نے اطمینان سا محسوس کیا' اور دوپہر تک آرام و سکون کے ساتھ سویا رہا۔

میں نے وہ شام خوب زور شور سے منائی' ایک بہترین ریسٹوران میں کھانا کھایا' اور پھر تھیٹر چلا گیا' اور آدھی رات کے قریب واپس گھر لوٹا لیکن جونہی میں گھر کے قریب آیا' مجھ پر ایک ہیبت ناک سا خیال چھا گیا میں اس کی موجودگی سے خوفزدہ نہیں ہو رہا تھا' کیونکہ میں چڑیلوں اور بھوتوں کا قائل نہیں' میں آنکھوں کی فریب دہی سے ڈر رہا تھا' ایک تازہ وہم کا شکار ہو رہا تھا۔

مسلسل ایک گھنٹہ تک میں سڑک پر گھومتا رہا۔ یہیں پھر میں نے محسوس کیا کہ میں فی الواقع بہت بڑا احمق ہوں۔ جو خواہ مخواہ خوفزدہ ہو رہا ہوں۔ اور آہستہ آہستہ کمرے کی جانب چلنے لگا۔ اور اس کے سامنے آکر رک گیا۔ اور ایک شدید جرأت کے ساتھ تالا کھول کر کمرے میں داخل ہو گیا' میں نے ایک خوفزدہ نظر انگیٹھی کی طرف دوڑائی' لیکن وہاں کچھ نہ تھا' اور شمع روشن کر دی' کتنی اطمینان اور مسرت انگیز تھی یہ بات' میں کمرے میں ایک حوصلہ مند دل کے ساتھ ادھر اُدھر چلنے لگا' لیکن مجھے ابھی پورا اطمینان نہ ہوا تھا' ابھی تک کمرے کے گوشوں کے عکس مجھے خوف زدہ کرنے کے لئے کافی تھے۔
اس وقت سے میں رات کو اکیلا ہونے کے باعث ڈرتا ہوں۔ مجھے اب بھی ایسا محسوس ہوتا ہے' کہ وہ میرے قریب ہی ہے' میرے ارد گرد ناچ رہا ہے' یہ جانتے ہوئے کہ اس وہم کی کوئی حقیقت نہیں' وہ کون تھا' یہ مجھے معلوم نہیں' میں یہ جانتا ہوں' کہ اس کا وجود سوائے میرے بزدلانہ دماغ کے اور کہیں موجود نہیں۔ اس کے بغیر اس کی جگہ ہو ہی کہاں سکتی ہے۔ میں یہ جانتا ہوں' کہ میں اس کو دوبارہ نہیں دیکھ سکتا' لیکن اس کے باوجود میں گھر میں نہیں رہ سکتا۔ کیونکہ وہ میرے کمرے میں موجود ہے — میرے خیالات میں موجود ہے۔ وہ دروازوں کے پیچھے چھپا بیٹھا ہے' وہ الماری کی آڑ میں ہے' میرے بستر کے نیچے براجمان ہے' وہ ہر تاریک گوشے میں ہے کتنا احمقانہ خیال ہے یہ؟ لیکن میں کیا کر سکتا ہوں؟ مگر اس کمرے میں اگر ہم ایک کی بجائے دو ہوں' تو مجھے یقین ہے' کہ وہ وہاں سے بھاگ جائے گا۔ ایک منٹ کے لئے بھی وہاں نہ ٹھہر سکیگا۔ کیونکہ وہ اس وقت تک وہاں ہے۔ جب تک میں اکیلا ہوں' —— صرف اس لئے کہ میں اکیلا ہوں۔

مترجمہ
اثر چکوالی۔ بی اے

غزل

جذبِ صادق ہے مرا ذوقِ طلب خام نہیں
ہاں مجھے وسوسۂ گردشِ ایام نہیں

میری راحت طلبی سے کوئی کہہ دے کہ حیات
رقصِ بسمل ہے تماشاءِ لبِ بام نہیں

ایک راہی ہوں کہ جس کی کوئی منزل نہ مقام
میری تقدیر میں آسودگیٔ شام نہیں

سوزشِ قلب، جگر، ذوقِ نظر، لذتِ درد
یہ وہ دولت ہے جو دُنیا میں ابھی عام نہیں

حُسن اور عشق میں بنتی نہیں پھر بھی اے دوست!
حُسن خود بیں ہی سہی عشق تو خود کام نہیں

صبحِ آغاز کے عُقدے کو تو سُلجھانے دو!
میری نظروں میں ابھی ظُلمتِ انجام نہیں

اب چمکتی سی، دمکتی سی کوئی صبح کہاں؟
اب مہکتی سی، بہکتی سی کوئی شام نہیں

آدمی کتنے علائق میں ہے پابند و اسیر
اور ظاہر میں کہیں دانہ نہیں، دام نہیں

کتنے گذرے ہوئے طوفانوں سے بچ نکلا ہے
اتنا ناکام بھی میرا دلِ ناکام نہیں

تو مرے جینے کا مقصد بھی بنا جاتا ہے
اور تجھ سے کوئی مطلب نہیں کچھ کام نہیں

مجھ سے در پردہ محبّت کا ہے مظہر یہ بھی
اُن کی محفل میں مرا ذکر نہیں، نام نہیں

حُسنِ سیمین بدنان اور یہ فراغت بھی ضمیر
پھر بھی کیوں رُوح کو تسکیں نہیں، آرام نہیں

سیّد ضمیر جعفری بی اے

جوانی نے ایک حسین غلطی کی، **دل** کی رہنمائی میں۔ اور پرکاش کا گھر تباہ ہوگیا۔ اس نے تلافی کی کوشش کی، **عقل** کی رہنمائی میں۔ اور اس کا ضمیر بھی تباہ ہوگیا، غرض یہ

دوگونہ عذاب

کا اسیر ذہنی کشمکش کی قربان گاہ پر.............

پرکاش نے اپنا گرم چہرہ کھڑکی کے ٹھنڈے شیشے کے ساتھ لگا دیا۔ اس کی ماں کی سسکیاں بند دروازے میں سے بھی سنائی دے رہی تھیں۔ اس کا باپ غم و غصہ سے بھری ہوئی آواز میں گرج رہا تھا..... یہ کبھی ممکن نہیں ہوگا۔ رائے بہادر کا بیٹا گاؤں کے چمار کی بیٹی سے بیاہ نہیں کرے گا..... اگر اس لڑکے نے میری بات نہ مانی، اور اس لڑکی کا پیچھا نہ چھوڑا۔ تو میں اسے گھر سے نکال دوں گا۔ آج کل کے زمانے میں کوئی بی اے پاس کہیں روٹی کما کے دکھائے تو جانوں۔ پرکاش کانپ گیا۔ یہ سچ تھا۔ آجکل کے زمانے میں بی اے پاس کے لئے روٹی کمانا بھی مشکل ہے۔ وہ خود کئی ہفتے نوکری کی تلاش کر چکا تھا۔ جب اس نے چمپا سے بیاہ کرنے کا ارادہ کیا تھا اسی دن سے اس نے نوکری ڈھونڈھنا شروع کر دی تھی۔ کیونکہ اسے معلوم تھا کہ ماں باپ اس کی شادی کی مخالفت کریں گے۔ آخر جب ہر طرف سے مایوسی ہوئی تو اس نے گھر والوں کو اپنا راز بتا دیا۔ گھر والوں سے اسے ہمدردی کی بجائے جھڑکیاں مل رہی تھیں۔

اس کی بہن کملا جو بچپن سے اس کی غمخوار رہی تھی جس نے کبھی کسی بات میں اس کی مخالفت نہ کی تھی۔ جسے گھر والے "بھیا کی وکیل" کہا کرتے تھے۔ کیونکہ وہ ہر بات میں پرکاش کی طرف داری کرتی تھی...... آج اس نے بھی اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا...... وہ صوفے کے گدّوں میں منہ چھپائے پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی...... وہ جانتا تھا کملا کیوں رو رہی ہے...... وہ اپنی سہیلی لیلا کو اپنی بھاوج بنانا چاہتی تھی...... لیلا..... جو اپنے کالج میں سب سے لائق سمجھی جاتی تھی۔ جس کے چہرے کا رنگ کتب خانوں کی مصنوعی روشنیوں کے نیچے بیٹھکر پڑھنے سے زرد سا ہوگیا تھا..... جس کی تین بھوری آنکھیں برسوں کی دماغی محنت کی وجہ سے کچھ کمزور ہوگئی تھیں..... جسے دور سے کوئی چیز دیکھنے کے لئے اپنی آنکھوں سکیڑنا پڑتا..... کسی زمانے میں پرکاش کو لیلا سے محبّت تھی۔ وہ اسے حسین سمجھا کرتا تھا لیکن گرمیوں کی ایک سہانی شام نے اس کی زندگی کو بدل ڈالا...... وہ شکار کھیل کے واپس آرہا تھا جبکہ دریا کے کنارے ایک چھوٹے سے گاؤں میں اس نے ایک لڑکی کو تالاب سے پانی بھرتے دیکھا...... اس نے اسے دیکھا...... اور پھر کچھ اور دیکھنے کا اسے ہوش رہا۔ نہ طاقت رہی.... جب وہ چلتی تھی۔ تو یوں معلوم دیتا تھا۔ جیسے دریا کی لہروں نے ناچنا، اور درختوں کی ڈالیوں نے جھومنا اسی کی چال سے سیکھا........ اس کی چمکیلی سیاہ آنکھوں میں دن کی روشنی اور رات کی تاریکی ایک دوسری سے لپٹی ہوئی تھیں.......

پرکاش نے اس سے باتیں کیں...... اس کے بعد وہ روز شام کو اس کے پاس جاتا اور یہ دونوں تالاب کے کنارے پتھروں پر بیٹھ کر گھنٹوں پریم کی باتیں کرتے......

پھر وہ دن آیا جب چمپا کے باپ نے پرکاش سے کہا کہ یا تو میری لڑکی سے بیاہ کرلو، یا یہاں آنا چھوڑ دو۔ اسی دن سے پرکاش نے ملازمت کی تلاش شروع کر دی تھی...... آج آخری دن تھا۔ چمپا کے باپ نے کہا تھا۔ کہ کل میں لڑکی کا بیاہ ساتھ والے گاؤں کے ایک نوجوان چمار سے کر دوں گا.... جب پرکاش یہ سوچتا تھا تو اس کے سینے پر برچھیاں سی لگتی تھیں۔ میری چمپا چمار کے گھر؟ اس کا خون کھولنے لگتا۔ وہ گھبرا کر کمرے میں چکر کاٹنے لگتا۔ کملا صوفے پر سسکیاں لے رہی تھی۔ پرکاش نے اسے ہاتھ سے پکڑ لیا۔ "سن کملا بہن۔ وہ غریب سہی۔ بہت غریب سہی۔ لیکن وہ — کملا۔ وہ رانیوں سے بڑھکر حسین اور دیویوں سے زیادہ پاکیزہ ہے......"

"لیلا سے زیادہ خوبصورت کوئی نہیں ہو سکتی"۔ کملا نے اپنا ہاتھ جھٹک کر چھڑا لیا اور کمرے سے باہر نکل گئی.....

پرکاش دیوانہ سا محسوس کرنے لگا..... اس کی آنکھوں کے آگے سیاہی چھانے لگی..... اسے چمپا کے یہ لفظ یاد آرہے تھے..... "بابوجی اگر تم مجھ سے بیاہ کرنے نہ آئے تو میں دریا میں ڈوب جاؤں گی..." پرکاش جانتا تھا۔ کہ اگر وہ دریا میں نہ ڈوبی۔ تو صبح کو اس کا بیاہ ایک چمار سے ہو جائے گا.....

اس نے پاگلوں کی طرح ہوا میں ہاتھ مارنے شروع کردے۔ جیسے وہ چمپا کو کسی اور سے چھڑانے کی کوشش کر رہا ہے..... دفعتاً وہ ٹھہر گیا ..... نہ جانے اسے کیا خیال آیا..... اس نے ایک کاغذ پر کچھ لکھا۔ اسے میز کی دراز میں ڈالا اور پھر تیزی سے باہر نکل گیا۔

کملا کو نیند نہیں آرہی تھی..... آخر اس نے سوچا کہ کچھ پڑھنے کا کام ہی کروں۔ زنگی قلم میں سیاہی ڈالنے کے لئے اس نے پرکاش کی دراز کو کھولا تو اس کے ہاتھ میں ایک کاغذ آیا جو سب گھر والوں کے نام لکھا گیا تھا. ..... اس نے چند ہی سطریں پڑھیں۔ اور پھر بڑے زور سے چیخ ماری..... تمام گھر جاگ اٹھا۔ کملا بے ہوش پڑی تھی..... اس کے ہاتھ میں پرکاش کا لکھا ہوا..... خط تھا..... "میں اور چمپا اگر اکٹھے جی نہیں سکتے۔ تو اکٹھے مرنے سے تو ہمیں کوئی نہیں روک سکتا..... کل ہمارے بے جان بدن پاس پاس پڑے ہونگے۔ دیکھنے والے کہیں گے۔ یہ دریا میں ڈوب کر مرے ہیں لیکن وہ غلط کہیں گے۔ ہم دریا میں نہیں اپنی امیدوں کے خون میں غرق ہو رہے ہیں..... وہ خون جو میرے گھر والوں نے۔ اور سماج نے بہایا ہے..... پرکاش کو چمپا سے جدا کرنا جسم کو جان سے جدا کرنا تھا..

وغیرہ عورتیں تو رو ہی رہی تھیں۔ رائے صاحب کے بھی یہ خط پڑھکر ہوش اڑ گئے۔ انہیں خیال نہیں تھا کہ پرکاش یہاں تک بات پہنچا دے گا۔ وہ سمجھتے تھے۔ بگڑا ہوا امیرزادہ ہے۔ خود کچھ دنوں میں راہ پر آجائے گا..... گاؤں کا پتہ تو انہیں معلوم ہی تھا۔ وہ اسی وقت موٹر میں بیٹھکر روانہ ہو گئے۔ اور پرکاش اور چمپا کو دریا کی طرف جانے والی سڑک پر جاتے ہوئے جا پکڑا... پرکاش نے انہیں دیکھکر بھاگنا چاہا لیکن رائے صاحب نے موٹر سے اتر کر بیٹے کو گلے لگا لیا..... اور کہا "تمہیں تو میرے گھر کا چراغ ہو۔ تمہاری خوشی میں ہماری راحت ہے تم گھر چلو۔ جہاں تم چاہتے ہو وہیں تمہارا بیاہ کیا جائے گا.. چنانچہ اگلے دن پرکاش کی شادی چمپا سے ہو گئی.....

اب چمپا شہر کے ایک مشہور رائے صاحب کی بہو تھی۔ وہ کوٹھی میں رہتی تھی..... درجن بھر نوکر اس کی خدمت کے لئے تھے..... ہر طرف عیش و آرام کے سامان مہیا تھے۔ لیکن عجب بات یہ ہے کہ چمپا خوش نہ تھی..... پہلے تو اس نے اپنے آپ کو دھوکہ دینے کی کوشش کی۔ لیکن جو کانٹا ہر وقت چبھتا رہے۔ اس کی طرف آخر توجہ کرنا ہی پڑتا ہے۔ اسے ایسا محسوس ہوتا تھا۔ جیسے اسے کسی بالکل نئی دنیا میں بھیج دیا گیا ہے جس کے آداب و رسوم اسے کسی نے سکھائے ہی نہ تھے........ اس کی نند بی اے میں پڑھتی تھی۔ جب اس کی سہیلیاں آتیں اور باتیں کرتیں تو چمپا کو ایک لفظ بھی سمجھ نہ آتا تھا۔ جب کوئی لڑکی ہنس کر اس کی طرف دیکھتی تو چمپا سمجھتی کہ یہ شہری لڑکیاں میرا ہی مذاق اڑا رہی ہیں... وہ شرم سے پانی پانی ہو جاتی۔ گھبرا کے کہتی۔ بھگوان! میں کہاں آگئی ہوں؟

ایک دن وہ بڑی غمگین ہو کر کمرے میں بیٹھی تھی۔ پرکاش نے پوچھا کیا بات ہے۔ وہ بولی۔ مجھے یہاں کسی کی بولی سمجھ میں نہیں آتی۔

"کیوں؟ ہم ہر وقت تو انگریزی نہیں بولتے۔" پرکاش نے کہا۔

"جب تم انگریزی نہیں بولتے۔ پھر بھی مجھے کسی بات کا پتہ نہیں لگتا... تھوڑی تھوڑی بات سمجھ میں آتی ہے۔ ساری نہیں....."

پرکاش سوچنے لگا" ہاں یہ ٹھیک ہے۔ جب ہندوستانی بھی بولتے ہیں۔ تو بہت سے لفظ دوسری زبانوں کے بول جاتے ہیں....."

چمپا بہت روئی۔ اس نے سسکیاں بھرتے ہوئے کہا" مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں کسی اور ہی دیس میں آگئی ہوں....."

پرکاش نے کہا" دیکھو رو مت۔ میں تمہیں آج ہی انگریزی پڑھانا شروع کر دوں گا....." اور پرکاش نے اسے انگریزی پرائمر لادی۔

لیکن اے۔ بی۔ سی۔ ڈی یاد کر لینے سے چمپا کی مشکلات کا خاتمہ نہ ہوا۔ وہ رائے صاحب کے گھر میں...... اس امیرانہ کارخانے میں ہر وقت گھبرائی سی رہتی تھی۔ قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتی اور بات بات پر بے وقوف بنائی جاتی۔ ایک دن اس نے کھڑکی میں سے شوفر اور خانساماں کو باتیں کرتے سنا... ایک ہی فقرہ اس کے کان میں پڑا" آخر چمار کی بیٹی ہے نا..." اس کے دل پر نشتر سا لگا..... اب وہ ہر ایک سے شرمانے لگی.... وہ دروازوں کے پیچھے چھپ کر چلتی..... جب گھر میں کوئی آتا۔ تو وہ سامنے نہ جاتی.... اس کا دل ہر وقت دہلتا رہتا۔ کہ نہ جانے میں کیا غلطی کر رہی ہوں..... اور میرا کتنا تمسخر اڑایا جائے گا۔

بچپن میں ایک دفعہ اسے ایک تالاب میں سے پیدل چل کر دوسری طرف جانا پڑا تھا۔ اسے وہ بات اب تک یاد تھی.... وہ قدم قدم پر لرزتی تھی کہ نہ جانے اگلا پاؤں کسی گڑھے میں پڑے گا۔ یا کسی ٹوٹی ہوئی بوتل پر

یا کسی کٹے ہوئے سرکنڈے کی جڑ پر..... وہ ہانپتی کانپتی بڑی مشکل سے اس پار پہنچی تھی..... بالکل وہی احساس اسے آج کل اس گھر میں رہنے سے ہوتا تھا..... دوسرا ہاتھوں میں پکڑ کر کہتی — پرماتما! میں کبھی اس تالاب کے پار بھی پہنچ سکوں گی

پرکاش کی سالگرہ کے دن بہت سے لوگ جمع تھے کھانا کھا چکنے کے بعد سب اکٹھے بیٹھکر باتیں کر رہے تھے۔ کچھ بچپن کی شرارتوں کا ذکر ہو رہا تھا.... ایک صاحب نے سنایا کہ جب میں چھوٹا تھا۔ تو مجھے موٹر چلانے کا بہت شوق تھا۔ ایک دن جب بڑا کوئی پاس نہ تھا میں نے موٹر میں بیٹھکر اس کے سارے بٹن یکے بعد دیگرے گھما دیئے۔ یکایک موٹر نے ہلنا شروع کر دیا۔ مجھے لگا ڈر۔ میں نے زور زور سے چیخنا شروع کر دیا۔ میری آواز سن کر گھر کے بڑے آ گئے اور انہوں نے مجھے موٹر سے نکالا۔ کملا نے وہ واقعہ سنایا جب وہ چھوٹی سی تھی تو اس نے اپنی ماں کی ساڑھے سات سو روپیہ کی قیمتی ساڑی ان کے ٹرنک میں سے نکال لی تھی۔ اور اپنے اسکول میں جا کر پارٹی کے دن پہنی تھی۔ اس کی ماں کو جب خبر ہوئی۔ تو اس نے کئی دن کے لئے اس کا جیب خرچ بند کر دیا تھا..... اسی طرح سب اپنی اپنی باتیں کر رہے تھے چمپا بُت بنی بیٹھی تھی۔ اس نے نہ کھانے پر کوئی بات کی تھی نہ اب بول رہی تھی۔ ایک صاحب بولے بھئی۔ اب تو ہم مسز پرکاش سے کوئی بات سُنیں گے۔ دیکھئے آپ ضرور کچھ کہئے...، جب سب نے بہت اصرار کیا۔ تو چمپا نے بھی اپنے بچپن کا ایک واقعہ سنایا..... کہنے لگی..... ہمارے گھر کے پاس ایک بڑھیا اُپلے بیچا کرتی تھی..... میں اس سے ایک دن پیسے کے اُپلے لینے گئی۔ میرا اس کا جھگڑا ہو گیا۔ میں مانگتی تھی پیسے کے بیس اوپر پندرہ۔ وہ دیتی تھی بیس اوپر دس..... کتنی دیر ہو گئی..... آخر مجھے ایک بات سوجھی میں نے سہمی ہوئی شکل بنا کر کہا۔ اری اماں! تیری کوٹھڑی میں سانپ! بڑھیا تھی ڈرپوک..... گھبرا کر باہر آئی۔ اور جانے کدھر کو نکل گئی۔ اور میں نے پیسہ بھی بچا لیا..... اور اُپلوں کی ٹوکری بھر کر اپنے گھر بھاگ آئی۔ چمپا کی بات پر کسی کو بھی ہنسی نہ آئی۔ شہر کی نفیس خواتین نے تو اُپلوں کا نام سُنتے ہی ناک پر رومال رکھ لئے تھے۔ اور مرد سب کے سب کنکھیوں سے پرکاش کی طرف دیکھکر مسکرا رہے تھے..... پرکاش کا چہرہ ان اشاروں کناروں سے غصے کے مارے سُرخ ہو گیا۔

اس کے بعد پرکاش کو اپنی بیوی سے ڈر سا آنے لگا۔ وہ اسے اپنے دوستوں کے سامنے نہ آنے دیتا۔ اور نہ اسے اپنے ساتھ باہر لے کر جاتا۔ کہتا اس کا کچھ بھروسا نہیں۔ نہ جانے کیا بات کر دے گی؟

اور لڑکے ہفتوں تک میرا مذاق اڑاتے رہیں گے.....

ایک دن وہ کملا کے ساتھ ایک پارٹی پر گیا۔ چائے کے بعد وہ اپنی کرسی پر اکیلا بیٹھا تھا۔ وہ اکیلا اس لئے تھا کہ شادی شدہ ہونے کے باوجود وہ اپنی بیوی کو ساتھ نہیں لایا تھا... اور آج کل کی مخلوط سوسائٹی میں یہ بات معیوب سمجھی جاتی ہے.... جب وہ کسی کنواری لڑکی سے بات کرنے لگتا۔ تو وہ آہستہ آہستہ سرکنے لگتی۔ اور پھر کسی بہانے سے بھاگ کر دوسری لڑکیوں سے جا ملتی۔ اور جب وہ کسی بیاہی عورت سے بات کرتا۔ تو اس عورت کا شوہر آہستہ آہستہ سرکنے لگتا۔ یہاں تک کہ وہ اپنے آپ کو پرکاش اور اپنی بیوی کے عین بیچ میں ثبت کر دیتا۔ اور بے بیوی کا شوہر پرکاش پھر اکیلا بیٹھا رہ جاتا....

آج اسے رہ رہ کر کملا کی سہیلی لیلا یاد آ رہی تھی.... اس کا حق نہ تھا کہ اب اسے یاد کرتا۔ اس نے خود ہی چمپا کی خاطر اُسے چھوڑا تھا..... پھر بھی بار بار اس کا چہرہ اس کی آنکھوں میں پھرنے لگتا...... اب وہ کہاں ہے؟ اس کی بھوری متین آنکھیں یاد آ رہی تھیں جنہیں مدتوں کی دماغی محنت نے کچھ کچھ کمزور کر دیا تھا... اور اس کی ہلکی ہلکی ہنسی جو اس کے ہونٹوں پر صرف مسکراہٹ بن کر دکھائی دیتی تھی..... اسے وہ دن یاد آیا جب لیلا کو شکسپیر کے ایک ڈرامے میں اچھا پارٹ کرنے کے صلہ میں ایک کتاب انعام میں ملی تھی.... اس نے سب سے پہلے اپنا انعام پرکاش کو دکھایا تھا.... پرکاش نے ٹھنڈی سانس لی.... اس زمانے میں مجھے اس سے محبت تھی... پھر.... پھر چمپا کی محبت ایک بے پناہ سیلاب کی طرح آئی جس میں اور سب کچھ غرق ہو گیا.... اب وہ طوفان گذر چکا تھا۔ اور ڈوبی ہوئی چیزیں ایک بار پھر دکھائی دینے لگی تھیں..... اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ لیلا پارٹی پر نہیں آئی کیا؟..... پھر اسے وہ دن یاد آیا جب چمپا سے اس کا بیاہ ہوا تھا..... سامنے بیٹھکر تو لیلا نے اسے بہت مبارکباد دی.... لیکن جلد ہی اُٹھکر وہ اپنی موٹر میں جا بیٹھی تھی۔ اس کا بیگ کمرے میں ہی رہ گیا تھا۔ پرکاش کو بھی اس کے پیچھے جانا پڑا اس نے موٹر میں جھانکا.... لیلا دُور نہ جانے کہاں دیکھ رہی تھی اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کے اونچے نیچے بہت سے قطرے اُمڈ رہے تھے.... اس نے پرکاش کی طرف دیکھا.... مایوس نگاہوں سے.... اور پھر جلدی سے موٹر چلا کر باہر نکل گئی..... پرکاش کو اس کی آنکھیں رات بھر یاد آتی رہیں اس کی خوبصورت آنکھوں میں حسرت کے آنسو دیکھکر ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے کوئی ٹوٹا ہوا راج محل بارش میں بھیگ رہا ہو.....

ہاں... پرکاش نے سوچا..... اسے مجھ سے محبت تھی۔ میں نے اس کا دل توڑ دیا.... وہ بیٹھے بیٹھے اُکتا سا گیا۔ اس نے اپنے میزبان سے اجازت مانگی۔ اور گھر کی طرف روانہ ہو گیا.....

اپنے کمرے میں جھانک کر دیکھا تو چمپا دونوں کہنیاں میز پر رکھے ہل ہل کر پرائمر یاد کر رہی تھی...... پرکاش کو دیکھ کر بولی... "جاد کر لیا میں نے ......" پرکاش کو چمپا کی غلط بولی سے عموماً تو شرم سی آتی تھی۔ لیکن نہ معلوم اسے اتنا غصہ کیوں آ رہا تھا..... اسے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اس کی تمام تکلیفوں کا باعث یہی جنگلی لڑکی ہے..... "کیا جاد کر لیا تم نے؟" اس نے تلخی سے کہا....

چمپا جلدی جلدی سنانے لگی "کیٹ۔ پھیٹ۔ کیٹ ـــ" پرکاش کا خون اُبلنے لگا۔ اس نے بڑے زور سے میز پر مکا مار کے کہا... "پھیٹ نہیں فیٹ کہو جاہل ـــ گنوار لڑکی" چمپا تھرّا گئی....

سچّا الزام۔ جھوٹے الزام کی نسبت زیادہ تکلیف دیتا ہے۔ سچّے الزام کی چوٹ دل پر یوں آ کے لگتی ہے۔ جیسے ننگے بدن پر چابک ـــ کسی ماہ رُو حسینہ کو کالی چڑیل کہئے۔ وہ ہنس کے منہ چڑا دے گی..... لیکن کسی لڑکی کو گنوار کہئے....

چمپا تھرا گئی.... اس نے اپنے ہونٹوں کو دانتوں میں دبا لیا..... اس کی خوبصورت آنکھیں جن میں دن کی روشنی۔ اور رات کی سیاہی ایک دوسری سے لپٹی ہوئی تھیں.... آنسوؤں سے تھرتھرانے لگیں..... اس لرزتی ہوئی آنکھوں کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے کوئی ٹوٹا ہوا راج محل بارش میں بھیگ رہا ہو.... دفعتہً پرکاش کو ایک خیال آیا خیال کیا تھا۔ ایک گھن سا تھا جو اس کے دماغ پر آ کے لگا.... وہ تڑپ کر باہر نکل آیا

"نہیں نہیں !!" اس نے اپنے آپ سے کہا.... ایک آواز اس کے کانوں میں چلا رہی تھی "تم نے دو عورتوں کے دل توڑے ہیں۔ دو بے گناہ عورتوں کے دل.... جن کا صرف اتنا قصور تھا کہ انہوں نے تم سے محبت کی ...." وہ بہت دیر تک سوچتا رہا۔ آخر اس نے اپنا سر اُٹھایا۔ اور کہا۔ یہ میرا فرض ہے .....

اگلے دن اس نے چمپا کے لئے شہر میں ایک مکان کرایہ پر لیا۔ اور اسے وہاں لے گیا.... "لو چمپا" اس نے کہا۔ یہ تمہارا گھر ہے۔ یہاں جیسے تم چاہو گی۔ ویسے رہنا.... چمپا بہت خوش ہوئی۔ وہ اپنے نئے گھر کو اسی طرح چلانے لگی۔ جیسے وہ گاؤں میں اپنے باپ کا گھر چلاتی تھی.....

شروع میں وہ کچھ تنہائی محسوس کرتی تھی۔ کیونکہ وہ اپنے محلے کی شہری عورتوں سے ملتے جھجکتی تھی۔ اور کوئی اس کا واقف نہیں تھا لیکن دنیا میں ہر شخص کو کوئی نہ کوئی رفیق ضرور مل جاتا ہے چمپا نے بھی اپنے محلے کی مہترانی بندو کے ساتھ بہناپا کر لیا۔ اب اس کی بہت اچھی کٹ رہی ہے۔ بندو اپنا کام ختم کر کے چمپا کے گھر آ جاتی ہے۔ اور وہ دونوں اکٹھی بیٹھ کر گھنٹوں باتیں کرتی رہتی ہیں....

پرکاش جب دفتر سے کام کر کے نکلتا ہے تو نہ جانے کیوں اس کا گھر جانے کو جی نہیں چاہتا وہ ایک کھوئی ہوئی روح کی طرح ادھر اُدھر سڑکوں پر بھٹکتا پھرتا ہے۔ وہ دوسرے مردوں سے بھی نہیں ملنا چاہتا وہ سب لوگوں سے بھاگتا ہے یہی وجہ ہے۔ کہ اگر آپ شام کو لارنس گارڈن میں جائیں۔ اور اتفاق سے اس بنچ کا رخ کریں جس پر آپ سے پہلے پرکاش بیٹھا تھا۔ تو آپ کو پرکاش نہیں۔ صرف اس کے کوٹ کا آخری حصہ درختوں کے پیچھے چھپتا ہوا دکھائی دے گا۔

(لیڈی ڈاکٹر) **این، فاطمہ بٹ**

قطعات

(۱)

محبّت میں ڈوبا ہوا پھول آیا
اُڑا کر بہاریں جوانی کی لایا
وُہی حُسن و نزہت، وُہی کیف و نکہت
مگر خود تو آیا، اونہیں بھول آیا

(۲)

فضاؤں میں جُگنو اُڑا کر گئیں تم
حسین تیتری کا سا دم بھر گئیں تم
ستارا سا ٹوٹا، شرارا سا چمکا
مری نرم آواز سے ڈر گئیں تم

(۳)

بہاروں سے فردوس کی تازہ تر ہے
فرشتوں کے سجدوں سے پاکیزہ تر ہے
نزاکت کا حامل، لطافت کا حاصل
ترا نام تجھ سے بھی دوشیزہ تر ہے

(۴)

ترے اِک تصوّر کے رنگیں نظارے
بہاروں میں بجلی خزاں میں شرارے
ترے اِک تبسّم کے پاکیزہ جلوے
گلستاں میں کلیاں، فلک پر ستارے

(۵)

معطّر نفس میں خمستاں ہے آباد
نگاہوں میں اک انجمستاں ہے آباد
تبسّم کے انوار، نم خوردہ عارض
گلستاں میں گویا پرستاں ہے آباد

رشید ذوقی کاندھلوی

حسیّات

اِن زیست کے غمگین لمحوں پر غم اور اس سے کیا چھا جائیں
اک ہُوک سی دل میں اُٹھتی ہو آنکھوں میں آنسو آجائیں

وُہ عہدِ گذشتہ اُف وہ مری چنچل، سیتل، رنگیں شامیں
اے کاش وہ گھڑیاں آج افق سے جھانک پڑیں تڑپا جائیں

وہ عالم اُف وُہ عالم وُہ الفت کی گھاتیں کیا کہیئے؟
وہ دل کا بھید سمجھ جائیں ہم شوخ نگاہیں پا جائیں

اس ماتھے پر کالی کالی زلفوں کا سنور جانا توبہ
جنّت کے حسیں منظر بھی چلے آئیں تو یہاں خم کھا جائیں

سوگند ان مست نگاہوں کی پینے سے تو ضد سی ہے لیکن
ایسے میں کہاں انکار وہ دل پر ساون بن کر چھا جائیں!

کیوں دِل پر بار سا رہتا ہے کیوں سہما سہما رہتا ہوں
یہ درد نہاں ہے جن کی عطا کچھ آکے مجھے سمجھا جائیں

اس حالت میں جعفر کیا جانوں مرنا کیا جینا کیسا
دو دل آپس میں مل جائیں دو آنکھیں جب شرما جائیں

جعفر شیرازی

ایک لندنی رات کی یاد

(ہمارے رفیق محترم مسٹر کامران الماس ایک جواں سال مگر کہنہ مشق ادیب ہیں۔ آپ ایک عرصہ تک انگلستان میں رہنے کے بعد آغاز جنگ سے چند ہفتے پہلے ہندوستان تشریف لے آئے تھے۔ اب آپ نے ہماری فرمائش پر لندن کی زندگی کے متعلق ایک سلسلہ مضامین اپنے مخصوص انداز میں لکھا ہے جس کی پہلی قسط ہدیۂ ناظرین ہے ــــ اس مضمون کو پڑھکر دل سوچتا ہے کہ لندن کے یہ عشرت کدے جو صفحۂ قرطاس پر موجود ہیں۔ آج دس ماہ کی وحشیانہ بمباری کے بعد صفحۂ زمین پر بھی ہیں یا نہیں۔ مسٹر الماس کو یقین ہے کہ وہ صحبت گاہیں ان کا پھر انتظار کر رہی ہیں۔ - واصل)

ریاض کو اور مجھے لندن میں رہتے ہوئے تین سال گذر گئے تھے۔ اور ہم دونوں اس سے اس قدر مانوس اور آگاہ ہوچکے تھے کہ اگر کوئی ہماری آنکھوں پر پٹی بھی باندھ دیتا۔ تو ہم آسانی سے شہر کا چکر لگا سکتے تھے۔ لیکن محمود کی حیثیت ابھی نووارد کی تھی۔ وہ وہاں کی سردی، دھند اور برفباری سے اکتا گیا تھا۔ اور باوجودیکہ وہ عروس البلاد کے پہلو میں رہتا تھا۔ وہ انارکلی کی یاد میں بے کیف سا رہتا تھا۔

اسی اثنا میں باقر بھی لندن آپہنچا۔ اب ہماری چار یاری جسے لندن میں فورسم (FOURSOME) کہتے ہیں مکمل ہوگئی تھی۔ تازہ واردان کا دل بہلانے کے لئے ہم نے دستور بنالیا تھا۔ کہ ہم ہر شنبہ کی رات کو لنڈن کے بہترین علاقہ "ویسٹ اینڈ" میں نئے نئے فیشن کے نظارے اور جگمگاتی ہوئی دکانوں کی سیر کرنے جایا کرتے تھے۔ آہستہ آہستہ باقر کو "ویرائٹی شو" دیکھنے کا شوق زیادہ ہوچلا تھا۔ چنانچہ اس غرض کے لئے پرنس آف ویلز تھیٹر THEATR جانا ہمارے پروگرام کا اہم عنصر بن گیا۔

ان تفریحات سے فارغ ہوکر ہم پکاڈلی کے ایک خوبصورت رسٹورانٹ کی تحت الارض منزل میں جہاں اکل و شرب، در و دیوار کے نظارے۔ روشنیاں اور فانوس، اور مطربوں کے ملبوسات ہسپانوی طرز اور فیشن کے ہوتے تھے فروکش ہوجایا کرتے۔ اور نصف شب تک گرمیٔ محفل سے لطف اندوز ہوا کرتے تھے۔

ہر چند کہ محمود اور باقر نے لنڈن کے مشہور مقامات اور دیدہ و دل کی فراغت کے سامان دیکھ لئے تھے لیکن بال روم ڈانس کے وہ تا حال شاہد نہ تھے حسن اتفاق سے اس کی نوبت بھی جلدی آگئی۔ مغربی لنڈن کی مشہور رقص گاہ "ہیمر سمتھ پیلیس" (HAMMERSMITH PALACE) میں سینٹ ویلن ٹائن ڈے" (ST. VALENTINE DAY) کی تعطیل میں رات کو وسیع پیمانہ پر "کارنیوال ڈانس" کا اہتمام کیا گیا۔ اس دن کے متعلق پرانی روایت چلی آتی ہے۔ کہ دوشیزہ لڑکی کو اپنا "نصف بہتر" اور "ناکتخدا لڑکے" اپنی "رفیقۂ حیات" منتخب کرنے کی عام اجازت ہوتی ہے۔ اس رقص کی ایک اور دلکشی یہ بھی تھی۔ کہ لنڈن کے مشہور و معروف مطرب ایمبروس AMBROS اور اس کا آرکیسٹرا منگوایا گیا۔ اور آرکیسٹرا کے ساتھ ایک گانے والی لڑکی تھی جس کا نام ای ولین ڈیل (EVELYN DALE) تھا۔ ایوان رقص کی مشہوری، آرکیسٹرا کی ہردلعزیزی اور ای ولین کی آواز اور حسن کی شہرت سن کر ہم بھی گئے۔

ہیمر سمتھ پیلیس ایک وسیع ہال تھا جس کے صرف فرش پر تقریباً پچاس ہزار روپیہ صرف ہوا تھا۔ یہ فرش نہایت قیمتی اور نایاب لکڑی کا تھا۔ بڑے بڑے ہنرمندوں اور باکمالوں کو اس فرش پر رقص کا شوق لنڈن کے مضافات سے کشاں کشاں لے آیا کرتا تھا۔ اس رات رونق انتہا سے زیادہ تھی۔ ایوان کی چھت پر بے شمار بلوریں جھاڑ فانوس، جھنڈیاں اور غبارے لٹک رہے تھے۔ فرش کو خوشبودار اور پھسلنا بنانے کے لئے پاوڈر چھڑکا گیا۔ تاکہ ناچنے والے اور ناچنے والیاں آسانی سے مچھلیوں کی طرح تیر کر نکل جائیں۔ ہم میں سے کوئی بھی رقص نہیں جانتا تھا۔ تاہم جب ہم ایوان رقص میں پہنچے۔ تو وہاں کی شمع طراز لڑکیوں کے جلوے۔ ان کی زرق برق پوشاکیں۔ مختلف رنگوں کی روشنیاں اور مسرور اور معطر فضا دیکھ کر ہمیں بھی رقص کی بے تحاشا ترغیب ہونے لگی۔

یکایک بینڈ کے بجتے ہی مشتاق جوڑے فرش پر نکل آئے۔ اور بینڈ کی تال پر تھرکنے اور گھومنے لگے ہمارے سامنے حسن، موسیقی، روشنی رنگ، خوشبو اور زندگی کی پریڈ ہو رہی تھی۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ سارا ہال ساغر مے کی طرح گھوم رہا ہے ہم کرسیوں پر بیٹھے اس سین کو دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ جب پہلا ڈانس ختم ہوگیا۔ تو سخن پروری کے خیال سے

ریاض نے باقر سے پوچھا۔

"کہو اس بال روم ڈانس کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟"

باقر تاریخ کا ماہر تھا۔ اس نے رقص کی تاریخ قبل مسیح سے بیان کرنی شروع کی اس عرصہ میں دوسرا رقص شروع بھی ہوا اور ختم بھی ہو گیا لیکن باقر کا مضمون طویل ہوتا گیا۔ محمود باقر کی تقریر سے سراسر بے التفات ہو رہا تھا۔ اور جب تیسرا رقص شروع ہوا۔ تو وہ اس کے نظارے میں پھر مستغرق ہو گیا میں نے اس کا ذوق و شوق دیکھ کے ریاض سے کہا۔

"ہاتھوں کے طوطے اُڑنا اس کو کہتے ہیں"

ریاض مسکرایا۔ مگر محمود تصویر بنا بیٹھا رہا۔ ریاض نے محمود کو متوجہ کر کے کہا۔

"حضرت بلبل کی موہوم امید پر آپ نے طوطے کیوں اڑا دیئے۔ کچھ تو پاس رکھا ہوتا" ہم سب ہنس پڑے۔

ہماری اس مداخلت سے باقر کو رقص کی ہسٹری ناتمام چھوڑنی پڑی۔ چنانچہ اس نے پلٹ کر محمود سے اس کا بدلہ لے لیا۔

"تمہاری بے بسی اور سکوت دیکھ کے مجھے مصر کا ابوالہول یاد آتا ہے" ہم پھر ہنسنے لگے۔ اس دفعہ محمود بھی مسکرایا۔ ہم اسی دل لگی میں مشغول تھے کہ دفعتہً

ای وین نقرئی لباس میں اچک کر بینڈ کے سامنے آکھڑی ہوئی یہ معلوم ہوا کہ آسمان سے ستارہ ٹوٹ کر زمین پر آ گیا ہے۔ اس کے بال بجلی کی روشنی میں مقیش کے تاروں کی طرح جھلملاتے تھے۔ اس کے جسم پر دو ہی چیزیں سرخ تھیں۔ ایک اس کے لب، دوسرے اس کے ناخن، ورنہ وہ سرتاپا چاندی کی لعبت نظر آتی تھی۔ لیکن جب وہ گانے لگی۔ تو بیسویں صدی کا معجزہ صادر ہونے لگا یعنی چاندی پارہ بن گیا اور لعبت شعلۂ جوالہ۔

ایوان رقص میں کہرام مچ گیا۔ لوگ رقص بھول گئے اور ای وین کے گرد جمع ہو گئے۔ جیسے حاتم کے دروازے پر حاجت مند۔

یہ دیکھ کے محمود بھی کرسی سے اٹھ کر سٹیج کی طرف چل دیا۔ ریاض نے ہنستے ہوئے آواز دی "حضرت یہ عدم تعاون ہم سے کس جرم کی پاداش میں ہے"

محمود اپنی جلد بازی پر خفیف ہوا لیکن میں غالب کا فتوے لیکر فوراً اس کی اعانت کو پہنچا یہ "اے شوق یاں اجازت تسلیم و ہوش ہے" محمود میری وکالت سے مطمئن ہو گیا۔ بالآخر ہم ناظرین اور سامعین کے حلقہ میں جا کھڑے ہوئے۔ اور آتش عذار اور آتش نفس ای وین کا کرشمہ دیکھنے اور گانا سننے لگے۔

کبھی وہ عاشقانہ انداز میں جھک جاتی اور تعظیم بجا لاتی۔ اور کبھی وہ معشوقانہ ناز سے تن جاتی۔ جیسے دنیا اسی کے نیم غمزہ کی خیرات پر پل رہی ہے۔ کبھی وہ سہم جاتی جیسے گستاخ نگاہوں سے شرما گئی ہے۔ اور کبھی بپھر کر ابھرتی جیسے حملہ کرنے لگی ہے۔ کبھی وہ اس طرح لپکنے لگتی۔ جیسے شرابی میکدے کے دروازے پر ساقی کو اشیر باد دے رہا ہے۔ اور کبھی اسی طرح لہلہاتی۔ جیسے نسیم صبح گاہی سے شمع کا ارتعاش۔

جب وہ ارمان بھری آواز میں عشرت وصل کی آرزو بیان کرتی۔ تو فردوس اس کے چہرے پر ہویدا ہو جاتا۔ اور جب وہ حرمان نصیبی کا شکوہ کرتی۔ تو سننے والوں کے دل شدت الم سے پھڑکنے لگتے۔ وہ گاتی تھی، تو مسکراتی جاتی تھی۔ وہ مسکراتی تھی تو تڑپتی جاتی تھی۔

یہ معلوم ہوتا تھا کہ موسیقی کے آتشکدے میں سیماب قائم النار لرزاں کا سانپ وجد ذوق میں تڑپ رہا ہے۔

باقر کو ایک باریک بینی اور معنی آفرینی کی عادت زیادہ تھی۔ اور نیز رقص و سرود کی محفل میں یہ اس کا پہلا تجربہ تھا۔ چنانچہ جب گانا ختم ہو گیا۔ تو میں نے اس کے تاثرات سے مطلع ہونا چاہا۔

"تمہارے ذہن میں اس زندہ خواب کی تعبیر کیا ہے؟"

محمود عالم تحیر سے بیدار ہو چکا تھا اس نے پیش لفظی کی۔ اور باقر کی طرف سے طنزیہ جواب دیا۔

"حضرت ایسی نائٹ میئر (ڈراونا خواب) تو ہم نے ساری عمر نہیں دیکھی تھی۔

یہ کہہ کر وہ کھل کھلا کر ہنسنے لگا مگر باقر نے بڑی سنجیدگی سے میری بات کا جواب دیا۔

"کامران، حسن اور موسیقی پر کون حرف گیر ہو سکتا ہے"

جب میں باقر کے اس خیال کی تعریف اور تائید کر رہا تھا۔ تو ریاض نے ہم دونوں کی طرف لطیف اشارہ کیا

"محمود ملاحظہ کیا تم نے حسن اور موسیقی انسان کو کس قدر عالی ظرف بنا دیتی ہے؟"

یہ سن کر ہم سب نے قہقہے لگائے۔ محمود نے کہا۔

"بے شک اگر باقر کی یہی حالت رہی تو ہمیں اس کی بیوی کو شکایت نامہ لکھنا پڑے گا"

محمود اپنے اعمال نامہ کو باتر پر چسپاں کرتا تھا۔ مذاحیہ گفتگو کو دعوت دینے کا یہ اس کا ایک طریقہ تھا جس کا باتر نے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔

رات کے بارہ بجے بینڈ نے قومی گیت "یا رب رہے سلامت فرماں روا ہمارا" بجایا اور عیش و نشاط کی کتاب کو تہ کر دیا۔

جب ہم ہیمرسمتھ پیلیس سے باہر نکل رہے تھے۔ تو ای ولین سفید سمور کا کوٹ پہنے بڑی تیزی سے ہمارے پیچھے سے آئی اور بینڈ کے لیڈر ایمبروس کے ساتھ ایک عالیشان کار میں بیٹھ کر نکل گئی۔ یہ معلوم ہوا جیسے وہ جاتی ہوئی ایوان رقص کے چراغ گل کر گئی ہے۔ محمود یہ دیکھ کر ادل تو ساکت رہ گیا۔ پھر عجب وارفتہ حالی سے یہ شعر پڑھا ؎

"نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی"۔

دوسرے مصرعہ میں ہم چاروں یک زبان ہو گئے۔

"جس کے بازو پر تری زلفیں پریشاں ہو گئیں"۔

یہ ان دنوں کی باتیں ہیں جب لنڈن پر آگ برسنے کی بجائے امن و آشتی کی ہوا چلتی تھی۔

کامران الماس

مقرّر سے!

[یہ نظم فرانسیسی شاعری کی ایک فارم "ترائلیٹ" (TRIOLET) میں کہی گئی ہے۔ ترائلیٹ کے علاوہ دیگر بے شمار قاعدے ہیں۔ جو فرانس کے دربار کے زیر اثر پروان چڑھے۔ ان میں ایک خاص قسم کی موسیقی سادگی اور رنگینی ہوتی ہے۔ ایک مصرعہ بار بار کچھ ایسے انداز سے دہرایا جاتا ہے کہ ان مختصر بولوں میں بہت لطیف سا ترنّم پیدا ہو جاتا ہے۔ اردو میں نت نئے اسالیب بیان پیش کرنے کے مدنظر میں نے اس میدان میں اس حالت میں قدم رکھا ہے۔ کہ مجھے اس کی افقی دھندلاہٹوں میں بے شمار رنگینیاں رقص کناں دکھائی دے رہی ہیں۔ یہ نئی راہ سجھانے کے لئے میں بھائی محمد حسن عسکری کا مرہونِ احسان ہوں۔ ندیم]

کاروانِ زندگی

زیست اِک کاروانِ نادیدہ
جس کی منزل ہے کہکشاں سے دُور
ننھے بچّوں کا خوابِ ژولیدہ
زیست اک کاروانِ نادیدہ
غم بھری داستانِ بوسیدہ
جس کے کردار ہیں تھکن سے چور
زیست اک کاروانِ نادیدہ
جس کی منزل ہے کہکشاں سے دُور

احمد ندیم قاسمی

اقبال کے بعد

جدید شاعری پر تعمیری و تنقیدی مقالات

گذارش ۔ ان مقالات پر رائے زنی کرنے والے اصحاب کی خدمت میں التماس ہے۔ کہ چند ابتدائی مقالات کا آپس میں ایک خاص حد تک ربط ہے۔ اس لئے ان ابتدائی مقالات میں سے کسی ایک کو انفرادی حیثیت سے نہ دیکھیں بلکہ بر اشاعت آیندہ کا انتظار فرمائیں ممکن ہے آپ کے اعتراضات و شبہات کو اس میں دور کر دیا گیا ہو۔]

تصحیح ۱ گذشتہ مقالہ میں بعض جگہ **نکتہ نظر** لکھا گیا اسے نقطہ نظر پڑھیں۔ **تصحیح ۲** گذشتہ مقالہ میں آخری صفحہ کے آغاز میں جہاں پیراگراف ختم ہوتا ہے وہاں ان الفاظ کے بعد " نظم کی کسی ایک قسم کی عمر سو سال سے تجاوز نہیں کر سکی " ..... یہ فقرہ ایزاد کر لیں " اس سے صرف زمانہ عروج مقصود ہے۔ اور اس مدت میں وہ عرصہ شامل نہیں ہے جس میں وہ ابتدائی مراحل میں رہی اور نہ ہی وہ مدت شامل ہے جس میں وہ رفتہ رفتہ انحطاط پذیر ہو کر متروک ہوگئی ۔ د اصل]

مجلس اول

مقالہ دوم

منظوم بوالعجبیاں ۔ مقالہ گذشتہ میں ایک نظم بعنوان **"دھوکا"** دی گئی تھی اور اس سے اس تلخ حقیقت کا اظہار مقصود تھا۔ کہ جدید شاعری میں ہیئت شعری کی ساخت کا معاملہ ابھی تک خام کاروں کے ہاتھ میں ہے نظم آزاد کے تحت چھوٹے بڑے مصرعے بغیر کسی وجہ جواز کے ٹھونس دیئے جاتے ہیں۔ اور بعض وقت تو شاعر مضحکہ خیز آزادی سے کام لیتا ہے بہت سی نظموں میں دیکھنے میں آیا ہے کہ ایک مصرعے کے دو ٹکڑے کرکے دو مصرعے اس طرح پر بنا دیئے گئے ہیں۔ کہ دوسرا مصرعہ حرف جار سے شروع ہوتا ہے۔ مثلاً غالب کے اس مصرعے کو " نہ کھینچو تم جو دامن کو کشاکش درمیاں کیوں ہو" نئے ادب کا علمبردار یوں لکھ دیگا

نہ کھینچو تم جو دامن

کو کشاکش درمیاں کیوں ہو

یا محولہ نظم " دھوکا " میں ہی ملاحظہ فرمایئے ۔

".... آگئی سب کی آنکھ بچا کر

اندر"

اور " اپنی اس تصویر کی کرلی

چوری"

جدید شاعری میں ہیئت کی منظوم بوالعجبیاں آپ کو بکثرت ملینگی ہیئت سے قطع نظر کرکے اگر آپ جدید ادبی نمونوں میں نفس مضمون پر غور کریں۔ تو معلوم ہوگا کہ انگریزی نظموں کے تتبع میں پست ترین مضامین پر نظمیں لکھی جارہی ہیں۔ ذیل میں ایک نظم ملاحظہ ہو۔

خلل

کس محبت سے نظر بھر کے ہے دیکھا تو نے

آہ تو کون ہے اے راہ میں جانے والی۔

راہ کو غیرت فردوس بنانے والی

میرے احساس کے تاروں کو ہلانے والی

مجھ کو عجلت ہے کہ دفتر کو روانہ ہوں میں

مری رگ رگ میں تو کس وقت اتر آئی ہے

حادثہ کیسا مری راہ میں تو لائی ہے

بن کے سیماب مری روح میں لہرائی ہے

اب میں دفتر کو چلوں یا ترا جوبن دیکھوں

اے مری راہ کی رنگین رکاوٹ کچھ بول

اور بھی دیکھ گرہ دل کی ذرا اور بھی کھول

مسکراہٹ سے مری روح کے پردوں کو ٹٹول

آہ مجبور ہوں دفتر میں نہیں ٹھہروں گا

تیرے مہکے ہوئے گیسو مری قسمت میں کہاں
تیرے ہنستے ہوئے ابرو مری قسمت میں کہاں
تیرے انفاس کی خوشبو مری قسمت میں کہاں

ہیں بچاری ہوں فقط دور سے دیکھوں گا تجھے
جب تک آنکھوں سے نہ اوجھل ہو ترا جسم حسیں
جب تک آتا ہے نظر تیرا لباس رنگیں
موڑ وہ دور کا جب تک کہ تو مڑ جاتی نہیں

لیکن اے جانِ نظر کیوں نہ ترے ساتھ چلوں
وقت پر آگے بھی دفتر کو میں کب جاتا ہوں
راہ کے ایسے ہی حالات سے دب جاتا ہوں
دیکھ کر چاند سے ہر چہرے کی چھپ جاتا ہوں

بعض اوقات تو رستے میں ہی رہ جاتا ہوں
آگے جاتا ہوا پیچھے کو پلٹ آتا ہوں

ماخوذ از ادبی دنیا ستمبر ۶۱ء — عدمؔ

ایسی نظموں کے پست حصے کے متعلق یہ عذر پیش کیا جاتا ہے۔ کہ شاعر کے ذہن میں جس جس ترتیب سے خیالات آتے گئے۔ وہ انہیں لکھتا گیا۔ گویا صفحۂ قرطاس صفحۂ خیال سے دور نہیں۔ ایسی نظموں کے افہام و تفہیم کے لئے شاعر کی موجودگی ضروری ہوتی ہے۔ اس قسم کے اور عنوانات جن پر نظمیں لکھی گئی ہیں۔ ملاحظہ ہوں "کرایہ کے لئے خالی ہے" "پل کا پتہ" "آلوؤں کا ڈھیر" وغیرہ وغیرہ۔ جدید شاعری میں بے راہ روی کی وجہ سے نظم کا معیار بہت پست ہوتا جا رہا ہے۔

رہبر گم کردہ راہ۔ ہمارے نوجوان سخنوروں نے شاعری کی پرانی روشوں سے کنارہ کشی اختیار کی تو منہ موڑتے ہی سامنے ایک لق و دق ویرانہ نظر آیا۔ اب ان بچاروں کے پاس نہ تو جادو کا قالین تھا جس پر بیٹھ کر ایک ہی پرواز میں منزل پر جا پہنچتے نہ سائنس کا قطب نما جس سے قدم بہ قدم سمت معلوم کرتے ہوئے صحیح راستے پر گامزن ہوتے۔ جوشِ تجسس کی شدت پیچھے مڑنے سے روکتی ہے اور راہ کی ویرانی آگے بڑھنے سے۔ انہوں نے سوچا تھا کہ نئی راہیں تلاش کر کے دوسروں کے راہبر بنیں گے لیکن خود ہی بھٹک رہے ہیں۔

نوجوان شعرا کے تخیلات ابھی تک شہد کی مکھیوں کے اس بھنبھناتے ہجوم کی طرح ہیں جو کسی شاخ کی تلاش میں ہوا میں چکر لگا رہا ہو۔ ان تخیلات کو ہیئت شعری کی کوئی موزون و مناسب شاخ ابھی تک نہیں ملی

جدید شاعری میں آج کل صرف تین اصناف سخن رواج پا رہی ہیں ایک تو نظم بے قافیہ یا نظم معرّا کہ کر عوام سے متعارف کیا جا رہا ہے Blank verse جسے۔ دوسرے ایسی نظمیں جن میں قافیہ تو خواہ ہو یا نہ ہو لیکن ان کا طرّہ امتیاز یہ ہے کہ ان میں مصرعے چھوٹے بڑے ہوتے ہیں۔ ان کو نظم آزاد کا نام دیا گیا ہے اور تیسرے وہ نظمیں جن میں کہیں کہیں قافیہ کی چاشنی بھی ہوتی ہے۔

نظموں کی یہ تقسیم قطعی نہیں ہے۔ بسا اوقات نظم معرّا میں نظم آزاد کا رنگ بھی جھلکتا ہے۔ اور بعض اوقات نظم آزاد میں قافیہ کی موجودگی پائی جاتی ہے غرضیکہ تینوں اصناف سخن ایک دوسرے سے اس طرح مختلف نہیں ہیں جس طرح غزل، رباعی سے یا قطعہ، مسدس سے۔ ہیئت شعری کو ابھی تک کسی خالق کا انتظار ہے۔

ہیئت شعری۔ پرانی شاعری اب پر تول رہی ہے اور کوئی دن جاتا ہے کہ شاخ اردو پر دوسرے طیور بسیرا لینگے۔ نوجوان طبقہ ان فرسودہ مضامین اور کہنہ انداز بیان سے جو مدتوں سے چلے آ رہے ہیں۔ اکتا چکا ہے۔ اب اسے ادب کے دسترخوان پر کسی دوسرے قاب کی تلاش ہے۔

ایک نئی ہیئت شعری کو پبلک سے متعارف کراتے وقت شاعر کو دوگونہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایک تو یہ کہ اس سے پہلے شاعر کے سامنے کوئی مثال کسی نظم پابند کی یا بحر کی صورت میں موجود نہیں ہوتی جس کے سہارے وہ اپنی ادبی جدت کو پیش کر سکے۔ شاعر اپنی ادبی کاوش کے نتیجہ کو اس کی اپنی خوبیوں کے بل پر بازار میں لا رکھتا ہے اور اگر ذوق سلیم اور حسن طبع نے شاعر کی رہنمائی کی ہو۔ تو اسے اپنی جنس کے خریدار مل جاتے ہیں۔ ورنہ شاعر کے اشعار شاعر سے پہلے مر جاتے ہیں۔

دوسری مشکل جو شاعر کو پیش آتی ہے وہ یہ ہے کہ اسے اپنے ادبی نمونوں کے لئے عوام میں مذاق پیدا کرنا ہوتا ہے۔ اور مذاق پیدا کر دینے کے بعد اسے اس مذاق کو برقرار رکھنے کے لئے اور بھی زیادہ جدوجہد کرنا پڑتی ہے۔ شاعر اپنی ذہنی تخلیق کے قاب کو عوام کے کام و دہن سے آشنا کرنے کے بعد اور یہ دیکھنے کے بعد کہ وہ فی الحقیقت انہیں پسند ہے۔ اس خاص نسخے کو اس طریقے پر پیش کرتا جائے۔ کہ انہیں اس کی چاٹ پڑ جائے۔ صرف اس مرحلے پر پہنچ کر ہی ایک خاص ہیئت شعری ادب میں مستقل حیثیت اختیار کر سکتی ہے۔

حالیؔ مرحوم نے اردو شاعری میں ایک نئی طرح ڈالی لیکن بعد میں وہ عوام کی توقعات کے مطابق پورا نہ اتر سکے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج ان کی شاعری محض تاریخی حیثیت سے اہم ہے حقیقی لحاظ سے قابل تحسین نہیں۔ مقدمہ شعر و شاعری میں جس سادگی الفاظ کا ذکر کیا گیا ہے۔ وہ ورڈز ورتھ کی سادگیٔ الفاظ ہے

جو جگہ جگہ بے جان ہو کر رہ گئی ہے۔

اکبر الٰہ آبادی نے سیاسی شاعری میں مزاحیہ طنز کا طریقہ اختیار کیا اور اس خوبصورتی سے اسے نباہا کہ وہ اپنے حلقے میں الگ نظر آرہے ہیں۔

اقبال مرحوم نے ایک نیا پردہ لے کر اس پر تصویر کشی شروع کی اور خود ہی اس کی تکمیل کر گئے۔ اور اب نئی نسل اس پردہ تصویر کو دیکھ دیکھ کر نقل اتارنے کی کوشش کر رہی ہے۔ انگریزی ادب میں سپنسر نے جو کہ سولھویں صدی عیسوی کا ایک عالم شاعر گذرا ہے۔ ایک نئی قسم کا بند وضع کیا۔ جو مستقل حیثیت اختیار کر گیا۔ اور سپنسری بند کے نام سے معروف ہوا۔ اس کے بعد مختلف شعرا نے اسی بند میں نظمیں لکھیں۔

توضیع ہیئت شعری۔ ہر زبان کے ادب میں کوئی نئی ہیئت شعری قائم کرنے کے لئے جدت پسند طبقے کے سامنے صرف تین راہیں ہوتی ہیں۔ پہلی تو یہ کہ پرانے نمونوں کو کانٹ چھانٹ کر یا ان پر پیوند لگا کر انہیں اس طرح بدل دیا جائے کہ انہیں اپنے آباؤ اجداد سے کوئی وجہ مناسبت ہی نہ رہے دوسری یہ کہ صحیح ذوق رکھنے والے شعرا خود نئے بند وضع کریں یا قافیہ وغیرہ کی خاص ترتیب سے ایسی قسم کی نظم ایجاد کریں جو پہلے موجود نہ ہو۔ اسے قبول عام کی سند حاصل ہونا یا نہ ہونا اور بات ہے۔

تیسری یہ کہ دوسری زبانوں کے ادب سے استفادہ کیا جائے اور ان کی مروجہ ہیئات کو اپنی زبان میں متعارف کرایا جائے

(ان ہر سہ موضوعات پر مفصل بحث مختلف مقالات میں دیکھیے)

جہانتک طریقۂ اولیں کا تعلق ہے یعنی مروجہ بحور اور بند وغیرہ میں ترمیم و تحریف کر کے ایک نئی بحر یا نیا بند ادب میں لایا جائے۔ انگریزی ادب میں اس کی مثالیں بکثرت دستیاب ہو سکتی ہیں۔ انگریزی نظموں میں یہ بات عام دیکھنے میں آتی ہے کہ ایک بحر کے ارکان میں کسی اور بحر کا ایک رکن شروع میں یا اخیر میں یا درمیان میں رکھ دیا جاتا ہے اور اس کی وجہ محض ایک ہی بیان کی جاتی ہے۔ اور وہ ہے تنوع پیدا کرنا یعنی وہ لوگ اتنے ذکی الحس واقع ہوئے ہیں کہ کسی ایک نظم کے تمام مصرعوں میں ترنم کی یکسانیت کو برداشت نہیں کر سکتے۔ اس کے مقابلے میں ہمارے پرانے ادب میں مثنوی کو ہی لیجئے شاہنامہ میں ہزارہا اشعار ایک ہی بحر میں لکھے گئے ہیں۔ اور انہیں پڑھتے پڑھتے ہم ان کے ترنم کی یکسانیت سے مطلقاً نہیں اکتاتے اور یہ اصول ناقابلِ تنسیخ طریقہ پر رواج پا چکا ہے کہ کوئی ایک نظم یا مسدس یا غزل شروع سے اخیر تک ایک ہی بحر میں لکھی جائے اور کسی ایک مصرعے کا بحر سے خارج ہو جانا عروض کی ناقابلِ معافی غلطی تصور ہوتا ہے۔

جدید شاعری میں اب اس عیب نے ہنر کا لبادہ اوڑھ لیا ہے۔ اور یہ چیز ایک خوبی بن کر اردو نظم میں آرہی ہے کہ ماحول یا احساس یا جذبہ کے ماتحت مصرعے کو چھوٹا بڑا کر دیا جائے۔

مثال کے طور پر مسٹر قیوم نظر کی نظم "تھکن" میں یہ تین مصرعے دیکھئے۔

"تھم گئی ہے شعلہ پرور دن کے محشر خیز ہنگاموں کی جوئے تند رَو

رفتہ رفتہ بہتے بہتے اپنی منزل کے سکوت مضمحل کی چھاؤں میں

تاب جنبش ہی نہیں بے کیف تنہائی کی زنجیروں سے بوجھل پاؤں میں

تھکا ہوا درماندہ شاعر منزل کی طرف بڑھ رہا ہے لیکن اس کا قدم نہیں اٹھتا۔ انتہائی تکان کی وجہ سے ٹانگیں ایک مریض کی نکاہت کو دامن میں لئے ہیں اور مصرعے کا لبنان خود شاعر کے احساس بیچارگی کا حامل ہے۔ رفتار کی تیزی ظاہر کرنے کے لئے مصرعے ہمیشہ مختصر اور چست ہونے چاہئیں۔ اس کی بہترین مثال "آب لوڈور" ہے

ایک ہی نظم میں مصرعوں کے چھوٹے بڑے ہونے کی مثال آپ کو نظم "دھوکا" میں مل چکی ہے۔ اس پر تنقید کرتے ہوئے ہم مصرعوں کو خارج از بحر نہیں کہتے۔ بلکہ ان کو جائز سمجھتے ہوئے تنقید کو صرف اس بات پر مرکوز کرتے ہیں کہ شاعر کامیابی سے ایسا کر سکا ہے یا نہیں۔

طریقۂ دوم یعنی مروجہ ہیئات میں ترمیم و تحریف سے ایک نئی ہیئت قائم کرنے کے متعلق انگریزی ادب میں سولھویں صدی کے شاعر سپنسر کی مثال لیجئے۔ اس کے زمانے سے پہلے ایک خاص بند موجود تھا۔ اس نے اس میں تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ اسے اپنا لیا۔ اور اب وہ ترمیم شدہ بند سپنسری بند کے نام سے معروف ہے (اردو دان اصحاب کے لئے اس کی تفصیل غیر ضروری ہے)

اردو ادب میں یہ چیز مطلقاً موجود نہیں ہے ہمارے شعرا نے شعر کی پرانی اصناف کو خیرباد کہہ دیا اور کسی ایک نے بھی کوشش نہیں کی کہ ان پرانی اصناف کو کسی نئے رنگ میں پیش کیا جائے۔

میں نے خود تجرباتی طریقے پر سات مصرعوں کی ایک نظم وضع کی اور اس میں قافیہ کا بھی ایک خاص انداز ملحوظ رکھا۔ جو یہ ہے۔ مصرعہ نمبر ۱ و ۳ و ۵ ہم قافیہ مصرعہ نمبر ۲ و ۴ ہم قافیہ اور اخیر پر دو ہم قافیہ مصرعے یعنی تمام نظم میں تین قسم کے قوافی ہیں۔ ایک نظم ملاحظہ ہو

میرے صبح و شام کو......

اے کہ میری خامشی کے راز کا جویا ہے تو

میرے اس کہنہ خرابے پر پھر آئی شام دیکھ

بہ رہا ہے دیدۂ گریاں سے پھر دل کا لہو

حسن کی پوجا کا، آکر، قرمزی انجام دیکھ
ہفت سراب زندگانی، لُف مآلِ آرزو
ابتدا کی لذتِ امید دلوا دے کوئی
میرے صبح شام کو پھر پیچھے لوٹا دے کوئی

ہمارے نوخیز شعرا میں ابھی تک اس قسم کی تجرباتی مساعی کے شوق کا فقدان ہے جہاں تک طریقۂ سوم یعنی غیروں کے ادب سے خوشہ چینی کا سوال ہے ہر زبان میں اور ہر عہد میں ایسا ہوتا آیا ہے۔ اور یہ کوئی معیوب بات نہیں ہے احتیاط صرف اس بات میں لازم ہے۔ کہ کسی دوسری زبان کے اصناف سخن میں سے کسی ایک کو ہم بجنسہٖ اور بغیر کسی قسم کے ردوبدل کے اپنی زبان میں نہیں لا سکتے۔ کیونکہ نظم کی ایک قسم جس زبان یا قوم یا ملک سے متعلق ہوتی ہے۔ اس میں اس زبان کی خصوصیات الفاظ، محاورہ، تراکیب۔ اس قوم کی طبائع کے رجحانات اور اس ملک کی جغرافیائی اور سیاسی خصوصیات کا پورا پورا رنگ ہوتا ہے۔ اور اسے بجنسہٖ کسی دوسری زبان یا دوسرے ملک میں لا بٹھانا اس طرح ہے جس طرح افریقہ کے تاریک جنگلوں میں رہنے والی ایک حبشی عورت کو لندن کے بازاروں میں چھوڑ دیا جائے یا کسی سمور پوش اسکیمو کو اسی ہیئت کذائی میں عرب کے جہنم بداماں ریتیلے صحراؤں میں مسکن دیدیا جائے۔

دوسری زبانوں کے اصناف سخن میں سے کسی ایک کو اپناتے وقت اس میں قطع و برید ایک ضروری امر ہے یہاں یہ بیان کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جدید شاعری میں انگریزی کی (Blank Verse) اور Sonnet لئے جا چکے ہیں۔ (Blank Verse) کے لئے تو شعرا نے نظم معرا کا نام تجویز کر لیا ہے۔ لیکن Sonnet کے لئے ابھی تک کوئی نام تجویز نہیں کیا گیا۔ اسے سانیٹ ہی لکھا جاتا ہے۔ جس طریقے پر نظم معرا اور سانیٹ کو اردو شاعری میں ہم سے متعارف کرایا جا رہا ہے۔ وہ کچھ زیادہ قابل ستائش اور قابل قبول نہیں ہے۔ کیوں؟

(اس پر مفصل بحث ہم ایک علیحدہ مقالے کے لئے محفوظ رکھتے ہیں جو وقت کی رفتار سے آپ کے سامنے آجائیگا)

قیصر جمشید واصل بی۔اے

مدیر معاون

محبّت

محبت آپ ہوتی ہے محبت کی نہیں جاتی
مگر بدنام کرتے ہیں محبت کرنے والے کو
گرا دیتے ہیں نظروں سے وفا پر مرنے والے کو
اسے بدنام کرتے ہیں اسے دشنام دیتے ہیں
حیاتِ سرمدی کو موت کا پیغام دیتے ہیں
ملا تھا خلد میں پہلا سبق اُلفت کا آدم کو
کہ یہ سمجھے حیاتِ جاوداں اس سوزِ پیہم کو
مگر دنیا محبت پر کبھی ایماں نہیں لاتی

محبت اک امانت ہے خدا کی قلبِ انساں میں
محبت روحِ انساں کیلئے اک خوابِ نورانی
جوارِ خلد کی نزہت ستاروں کی درخشانی
کہ جیسے حور رہتی ہو کوئی چھپکر گلستاں میں
محبت دل کی گہرائی میں اپنا گھر بناتی ہے
محبت آسمانی خواب کی تعبیر ہوتی ہے
محبت کائناتِ دہر کی تعمیر ہوتی ہے

ش۔ا۔ شمیم جالندھری

مازورا قرونِ وسطیٰ کی حسین عفریت تھی جس کے دو حربے تھے، تبسم شیریں اور جام زہر۔ اور......... دونوں کارگر......... آخر

مازورا

کا رشتۂ حیات پیچ در پیچ ہو کر اس قدر الجھ گیا کہ ناخن تدبیر نے اظہار عجز کر لیا۔ اور مازورا نے اپنی زندگی کی پیچیدہ گتھی کو سلجھانے کے لئے .... اسے کاٹ دیا

روم جس کو روم ابدی کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے۔ اگر کبھی فنِ بت گری اور دیوتاؤں کی پوجا کے عروج کا مرکز بنا۔ تو عین اس کے برعکس گناہ کی پرستش اور ظلم و فریب کا گہوارا بھی رہا ہے۔ اس کے نشیب و فراز دنیا کے کسی شہر کو نصیب نہ ہوئے ہونگے۔ یہ شہر کئی بار آباد ہو کر اجڑا۔ اس نے انسانی ضمیر کو نئے نئے سانچوں میں ڈھالا یہی وجہ ہے۔ کہ روم کی تاریخ تحقیق و تنقید کے لئے گوناگون دلچسپیوں کا مرقع ہے۔ اگر دسویں صدی عیسوی کے روم کے واقعات کا مطالعہ کیا جائے۔ تو نیرو کا ظلم۔ نادرشاہ کا قتل و خون۔ قلوپیٹرا کی سنگدلی اس زمانے کے حالات کے سامنے ماند پڑ جائے گی۔

بعض مورخوں کے خیال کے مطابق یہ تاریخ انسانیت کا تاریک ترین عہد تھا۔ گو اس عہد کے حالات کا پتہ لگانا کچھ اتنا سہل نہیں۔ لیکن جو کچھ بھی تحقیق کی روشنی میں تاریخ عالم کو میسر آچکا ہے۔ وہ اس بات کا کافی ثبوت ہے۔ کہ پستی کے اعتبار سے اس وقت روم کی تاریخ بابل کے گھناؤنے اور تاریک مناظر سے زیادہ داغدار تھی۔

دسویں صدی میں اٹلی کی حکومت کسی ایک شخص کے ہاتھ میں نہ تھی۔ اور یہ ملک ایسے مقتدر رؤسا اور نوابوں کی نذر ہو چکا تھا جو اپنے اغراض و مقاصد کی تکمیل میں باہمی خانہ جنگیوں کا بازار گرم رکھتے تھے۔ یہ لوگ اٹلی کے جنوب میں بسنے والی عورتوں کے حسن کے بہت دلدادہ تھے۔ خود ان میں کوئی وصف نہ تھا۔ وہ پرلے درجہ کے نادان اور سوجھ بوجھ سے کوسوں دور تھے نہ ان کا کوئی تمدن تھا۔ اور انہیں کسی تمدنی یا معاشرتی اصول کی چاہ تھی صرف صنف نازک کے حسن اور عشوہ گری کا چسکا تھا اور بس۔

یہی مازورا کا عہد تھا جو اس زمانے کے ذی اقتدار امراء کی منظور نظر تھی۔ دنیا کی ذلیل ترین عورتوں کا دامن اتنا ناپاک نہ ہوگا جتنا مازورا کا تھا۔

گو حسب نسب کے لحاظ سے وہ ایک شریف خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کی ماں تھائرہ نے ایک پادری سے شادی کر رکھی تھی۔ لیکن تھائرہ کی زندگی بھی کئی ایک معاشقوں اور سازشوں سے خالی نہ تھی۔ عیسائیت محض برائے نام تھی۔ روم کا لاٹ بشپ جسے پوپ کہا جاتا تھا چند ایک ذی اثر امراء کی اغراض کا آلہ بنا ہوا تھا۔ وہ اسے جس وقت چاہتے۔ پوپ کی مسند پر بٹھا اور اتار دیتے وہ زمانہ ابھی بہت دور تھا۔ جب پوپ کی حیثیت براعظم کے روحانی پیشوا کی کی صورت اختیار کرنے والی تھی جب اسے بادشاہوں کی تقدیر کا خالق بننا تھا اور وہ انہیں بے دین کہکر ملک بدر کرنے کا حق حاصل کرنے میں کامیاب ہونے والا تھا۔

مازورا حسین تھی۔ اس کے خدوخال شہزادیوں کے سے تھے۔ اس کی آنکھوں میں روشنی اور لبوں پر تبسم کھیلتا رہتا تھا۔ اس کے گداز لب اور مرمریں جسم اس کی جوانی کے بے مثیل گوہر تھے۔ اس نے آہستہ آہستہ اپنی ماں کے ذریعہ اٹلی کے مشہور شاہی خاندانوں کے افراد سے جس میں ٹسکنی کے شہزادے اور سپالٹو کے رؤسا بھی شامل تھے۔ گہرے مراسم پیدا کر لئے۔ ٹسکنی کے شہزادے خانہ جنگیوں میں سب سے پیش پیش تھے۔ اسی وجہ سے سینٹ پیٹر کی گدی بھی انہیں کے اختیار میں تھی۔ وہ چھوٹے چھوٹے پادریوں کی معروضات کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے خود ہی گدی کا جانشین مقرر کر دیا کرتے تھے۔

مازورا جانتی تھی کہ وہ نہایت حسین ہے۔ اس لئے وہ ایسے موقعہ کی تلاش میں تھی جب وہ اپنا اثر و رسوخ کو بروئے کار لائے۔ اس کے لئے مازورا نے گائیڈا سے شادی کر لی۔ جو ٹسکنی شہزادوں کی روح رواں تھا۔ اس کی آواز سارے روم کی آواز تھی۔ کوئی پوپ اس کے ارادوں کے خلاف پوپ کی گدی پر نہ بیٹھ سکتا تھا۔ وہ شادی ہوتے ہی مازورا کی جائز و ناجائز خواہشات کو پورا کرنے لگا۔ یہاں تک کہ عین شادی کے چند دن بعد مازورا

نے اپنے عاشق سرگوس کو جو ایک ٹسکنی کونٹ کا بیٹا تھا۔ پوپ بنانا چاہا۔ تو اُسے بغیر کسی حیل وحجت کے انتخاب کرلیا گیا۔ انہی ایام میں پوپ کا اقامتی مکان دریائے ٹائبر کے مضبوط قلعے میں ہوا کرتا تھا۔ مازورا اور گوس نے یہ قلعہ اپنے عیش وعشرت کی آماجگاہ بنالیا۔ پانچ سال کے بعد جبکہ وہ سرگوس سے ایک لڑکے کی ماں بھی بن چکی تھی۔ وہ اپنے عاشق سے دل برداشتہ ہوگئی۔ وہ کسی اور کی تلاش میں تھی۔ ایسے نوجوان کی جستجو میں جو سرگوس سے بھی زیادہ جاہ وحشمت کا مالک ہو۔ وہ محبت میں نیا رنگ بھرنا چاہتی تھی۔ ایسے شخص کی مدد سے جو مازورا کو پھر سے حسین کہے۔ اور اپنی انگلیوں کے لمس سے اس کی سرد وآزرده رگوں میں گدگدی پیدا کردے۔ سرگوس پُراسرار طریقے سے اچانک مرگیا لیکن کسی کو یہ خبر نہ تھی۔ کہ مازورا زہریلی اشیاء کے مرکب بنانے میں اپنا ثانی نہیں رکھتی۔

جب پادری سرگوس کی لاش کو دفنانے کے لئے قبرستان میں لائے۔ اور اس لئے بھی کہ آخری بار پوپ آنجہانی کی خدمت میں تعظیم بجالائیں۔ تو مازورا نے تجہیز وتکفین کے متعلق تمام پادریوں سے صلاح ومشورے کرنے چاہے۔ دراصل ان سب باتوں سے اس کا مقصد اپنے اثر ورسوخ کے دائرے کو وسیع کرنا تھا۔ وہ ایک مرصّع کرسی پر بیٹھی پادریوں کو اپنے سامنے ایک ایک کرکے گذرتے دیکھ رہی تھی۔ پادری اسے سلام کرتے۔ اور وہ تمکنت کے ساتھ سر کو ذرا جنبش دیتی اور دوسرے پادری کی طرف اشارہ کرتی۔ آخرکار ایک خوبصورت نوجوان پادری اس کے سامنے آیا۔ جس کی موجودگی نے مازورا کے جذبات میں تلاطم پیدا کردیا۔

"تمہارا نام؟" مازورا نے پُرشوق انداز میں پوچھا۔

"مجھے اناطیہ کہتے ہیں!" پادری نے خوفزدہ ہوکر جواب دیا۔

"تم کس عہدہ پر کام کرتے ہو؟"

"میں ایک معمولی پادری ہوں۔ جو حضرت پوپ آنجہانی کی خدمت میں مامور تھا۔ موت نے آج ہمیں اس طاقت کی یاد دلائی ہے جس کی خدمت کرنا ہمارا فرض ہے مگر جس کا سمجھنا ہمارے قیاس سے بہت دُور۔"

مازورا کو زندگی اور موت کے فلسفہ سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ اپنے جذبات کے لئے ایک نئی دنیا استوار کرنا چاہتی تھی۔

"اناطولیہ؟" مازورا نے نوجوان پادری کے نام کو دُہرایا۔۔ "اس سے پہلے بھی کئی پوپ اس نام کے ہو گذرے ہیں نا؟"

نوجوان پادری بڑا سمجھدار تھا۔ وہ تاڑ گیا کہ مازورا اسے غور سے دیکھ رہی ہے۔ اس نے معاً حالات کا جائزہ لیا۔ اور اپنی بیکسی کی داستان بیان کرنے لگا۔ وہ مازورا کے قدموں پر گر پڑا۔ اور اعتراف کیا۔ کہ وہ کئی سال سے اس کی پوجا کررہا ہے۔ سرگوس کی زندگی اس کے لئے سدِّ راہ تھی۔ اور اب وہ آزاد ہے۔ اور پکے ہوئے پھل کی طرح کسی کے مشتاق ہاتھوں کا منتظر ہے! یہ باتیں جن میں جذبات اور خواہشات کا بے پناہ طوفان تھا۔ مازورا کو لبھا گئیں۔ وہ خود بے باک تھی۔ اور اپنے چاہنے والوں میں بے باکی کے عنصر کو بہت پسند کرتی تھی۔ اس نے باتوں ہی باتوں میں نوجوان پادری کو مطمئن کردیا۔ جو ایک روشن مستقبل کے انتظار میں دن گذارنے لگا۔

مازورا نوجوان پادری کی محبت میں گرفتار ہوچکی تھی۔ لیکن بدقسمتی سے وہ ایک معمولی پادری تھا۔ مازورا ایک شاہی خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ اس لئے کھلم کھلا وہ اس سے محبت نہیں کرسکتی تھی۔ ایک پست حیثیت ذات کے پادری سے اس کی محبت سماج کے اصولوں کے خلاف تھی۔ مازورا نے سوچا "وہ پادری کی قسمت کو بدل سکتی ہے۔ سرگوس کا جانشین بھی یہی نوجوان ہوسکتا ہے۔"

اگلے اتوار اناطیہ کو پوپ کا جانشین نامزد کردیا گیا۔ مگر اناطیہ مازورا کی محبت میں ثابت قدم کس طرح رہ سکتا تھا۔ وہ پوپ بننے سے پیشتر ہی مازورا کی چھوٹی بہن نائرہ کی محبت میں گرفتار ہوچکا تھا۔ وہ اس کی چالوں کو بھانپ گئی "وہ دو دلوں سے فریب نہیں کرسکتا" اس نے کہا۔ یہ ایک ایسا صدمہ تھا جو ناسور بنتا جارہا تھا۔ مازورا کے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ کہ وہ اناطیہ کو اس کی مکاری کی سزا دے۔ یہ کام اس کے لئے بہت آسان تھا۔ وہ غضبناک شیرنی کی طرح جھپٹی۔ اناطیہ کا وہی حشر ہوا جو سرگوس کا ہوا۔ اب پوپ اس کے لئے مٹی کے کھلونے تھے جنہیں وہ صرف انگلی کے اشارے سے بنا اور بگاڑ دیتی۔ وقت گذرتا گیا۔ یہانتک کہ مازورا کا حسن بھی پھیکا پڑنے لگا۔ اس کے ارمان سرد ہونے لگے۔ اب وہ ادھیڑ عمر کی عورت بن چکی تھی۔ اس نے اپنی زندگی کے تمام واقعات پر نظر ڈالی۔ جوں جوں وہ گذرے ہوئے حالات پر غور کرتی۔ اس کے دل میں ڈر سا محسوس ہوتا۔ جب وہ یہ سوچتی۔ کہ اس نے بیشتر گناہ اپنی ہوس اور نفسانی خواہشات کی تکمیل کے لئے کئے۔ تو وہ حیران ہوکر سہم جاتی۔

جان سرگوس اب جوان ہوچکا تھا۔ یہ اس کی پہلی محبت کی یادگار تھی۔ "پوپ کا بیٹا پوپ ہی ہوسکتا ہے" آج یہ خیال کئی بار اس کے دل میں آیا تھا "جان سرگوس اس کا اپنا بیٹا تھا" اسے ضرور پوپ بننا چاہئے۔ وہ اس منصب کے لئے پیدا ہوا تھا" مازورا بولی۔ وہ کھڑکی سے باہر سر نکالے آسمان کو گھور دیکھ رہی تھی۔ سورج غروب ہوچکا تھا۔ اور رات کے

سلائے نے زمین سے نکل کر دنیا کو تاریکی کی چادر پہنادی تھی۔ مازورا کو اپنی جوانی کے دن یاد آ رہے تھے۔ "آہ! میں کبھی کتنی حسین تھی" وہ آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر گیسوؤں کو سنوارنے لگی۔ اس نے گالوں کی پژمردگی کو مصنوعی طریقوں سے دُور کیا۔ وہ لباس زیب تن کیا جسے پہن کر وہ سرگوس سے ملنے جایا کرتی تھی۔ زہر آلودہ شراب کی بوتل لے کر وہ اس کام کے لئے چیل کی طرح جو اپنے ننھے ننھے بچوں کو معصوم چڑیوں کے خون سے پالتی ہے چلی۔ اور اپنی خادماؤں کے اُٹھنے سے پیشتر ہی گھر لوٹ آئی۔

پوپ کے مرنے کی خبر تمام شہر میں بجلی کی طرح پھیل گئی کئی افواہیں اُڑ رہی تھیں "شاید اس نے خودکشی کرلی ہے"۔ "نہیں وہ حرکت قلب کے بند ہونے سے مر گیا" "وہ دنیا سے بیزار تھا"۔ "اسے کسی دشمن نے زہر دے دیا ہے"۔ پوپ اناطیہ کی اچانک موت ایک معمہ بن گئی۔

مگر اس کی موت کا راز مازورا کے سوا کون جانتا تھا... جلد سرگوس پوپ منتخب ہو گیا......

آج مازورا کے دل میں سکون اور اطمینان تھا۔ گو وہ قاتل اور ظالم تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اتوار کوئی دور نہیں۔ پوپ۔ ہاں اس کا بیٹا جان سرگوس۔ وہ اس سے زندگی بھر کے گناہ بخشوائیگی حضرت مریم کے نام پر۔ وہ ضرور اپنے مظالم کا اعتراف کریگی۔ لاٹ بشپ کے روبرو۔ اپنے بیٹے کے روبرو۔ وہ اقبال کر لیگی۔ کہ اس نے کون کون سے گناہ کئے کس کس کے ساتھ ظلم روا رکھا کس کس کو موت کی نیند سلا دیا۔ وہ ہوس پرست تھی.... لوگوں کے جذبات سے کھیلنے والی"۔

اس کی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ اس کا تمام خون اس کے چہرے میں آکر منجمد ہو گیا۔ وہ پاگل ہو رہی تھی۔

"کیا میں خدا کو بھی فریب دے سکوں گی؟" یہ کہہ کر وہ بے خود سی ہو گئی اس کے ہاتھ کسی چیز کو تلاش کر رہے تھے۔ وہی شراب جسے وہ اپنی زندگی کا عزیز ترین جزو بنا چکی تھی۔

وہ پھر چلائی۔ کل اور پرسوں۔ اتوار دور نہیں۔ وہ تمام گناہ بخشوائیگی۔ مازورا نے پیالے کو منہ لگایا۔ اور لگاتے ہی دھڑام سے نیچے گر پڑی۔ اس کی روح جسم سے پرواز کر کے فضا کی نامعلوم وسعتوں میں گم ہو گئی۔

مگر اتوار کا دن دُور نہ تھا کل اور پرسوں۔

منیر کمال بی اے (جالندھری)

ماہ مارچ کی اشاعت سے ہم انعامی افسانوں کا ماہوار سلسلہ شروع کر رہے ہیں۔ مبلغ دس روپے کا ایک انعام اس افسانے کے لئے مقرر کیا گیا ہے۔ جو ادارے کے نقطۂ نظر سے بہترین اور قابل اشاعت ہو۔ مبلغ پانچ روپے کا انعام دوسرے درجہ کے افسانہ کے لئے رکھا گیا ہے۔ یہ افسانے اور ان کا حق اشاعت "شاہکار" کی ملکیت متصور ہوں گے۔

ادارے کو حق حاصل ہے کہ موصول شدہ افسانوں میں سے چیدہ چیدہ افسانے مصنفین کو معاوضہ دیئے بغیر شائع کر دے ماہ مارچ کے لئے افسانہ کا پس منظر غدر ۱۸۵۷ء ہو۔ اور افسانے میں صرف کردار نگاری ہی نہ ہو بلکہ پلاٹ بھی ہو۔

شرائط

(۱) افسانہ اچھے خط میں فلسکیپ کاغذ کے ایک طرف لکھا جائے (۲) افسانہ کے خاتمہ پر فرلیسند کا نام و پتہ مکمل و خوش خط لکھا ہوا ہو (۳) لفافے کی پشت پر جلی حروف میں "افسانہ برائے ماہ مارچ" تحریر ہو۔ (۴) تمام افسانے جو ماہ مارچ کے "شاہکار" کے لئے بھیجے جائیں۔ وہ دفتر ہذا میں ۲۰ فروری تک موصول ہو جانے چاہئیں۔

مہتمم شاہکار لاہور

حقائق

(۱)

دل ایسا کہ جو درد ذرا سہہ نہیں سکتا   وہ درد کی دُنیا میں کبھی رہ نہیں سکتا

اِس درد کی لذت سے جو محروم ازل ہو   وہ "درد کے عالم" کو بُرا کہہ نہیں سکتا

(۲)

بیدرد کو اس درد کی لذّت کی خبر کیا   کیا جانے "حذف کشتہ" کہ ہوتا ہے گہر کیا

سینے میں اگر دل ہی تو ہے درد بھی اسمیں   پتھر پہ کہیں ہوتا ہے پانی کا اثر کیا

(۳)

اس درد کی دُنیا میں ذرا درد تو سہہ دیکھ   اس موج مقدس میں تو اک بار تو بہہ دیکھ

بہیا گئی دل کا کہیں پول نہ کھُل جائے   بن دیکھے بُرا درد کی دُنیا کو نہ کہہ دیکھ

(۴)

میخانہ ہستی کی ہے جو مے وہ یہی ہے   کچھ تیز ابنا سکتی ہے جو شے وہ یہی ہے

ناداں کوئی کیا جانے کہ یہ درد ہے کیا چیز

جس سے کہ امیںؔ اپنی بقا ہے وہ یہی ہے

امیں حزیں سیالکوٹی

غریب کا مال دنیا کی ملکیت ہوتا ہے - اولاد کا ورثہ نہیں ہوتا - اس کی دنیا اس کی اپنی دنیا نہیں ہوتی - اور

غریب کی بہلی

اس کی اپنی بہلی نہ تھی ..... گویا وہ ایک امانت تھی - جو دنیا نے واپس لے لی لیکن ..... واپس لینے کا طریقہ ذرا مختلف تھا .....

شام کا وقت قریب تھا سورج اپنی زرد کرنوں کی مدھم روشنی سے رات کے پھیلتے ہوئے دامن کو چاک کرنے کی سعی میں پسپا ہو رہا تھا - دریا کا کنارہ رات کے اندھیرے میں موت اور حیات کے درمیان حد فاصل بن کر حائل ہونے والا تھا - پانی کی گہرائیاں موت کی آماجگاہیں بننے کے لئے نہ درنہ تاریکیوں سے سرگوشیاں کر رہی تھیں - لہریں ان گہرائیوں کو موت کی ہلاکت خیز لپیٹیوں میں منتقل کرنے کے لئے بے قرار ہو کر خشکی کے رہنے والوں کو دعوت غرقابی دے رہی تھیں - اس منحوس گھڑی میں جبکہ دونوں وقت مل رہے تھے ایک بہلی دریا کے کنارے کنارے چلی آتی دکھائی دی - ایک شخص جس کے جسم کو چند ایک چیتھڑے بمشکل ڈھانپ رہے تھے - بہلی میں جتے ہوئے دو جانوروں کو ہانک رہا تھا - یہ دو جانور جو اس بہلی کو کھینچ رہے تھے - یک جنس نہ تھے - ایک بیل تھا دوسرا گدھا اور دونوں نہایت ہی لاغر - بڑھتے بڑھتے یہ بہلی پل کے قریب پہنچی - ہانکنے والے شخص نے اسے روک دیا اور دو پیسے محصول طلب کیا - بہلی والا اس مطالبے کی نوعیت کو سمجھ نہ سکا اور بہلی ہانکنے لگا لیکن سامنے ایک شہتیر نے راستہ روک رکھا تھا اور دو پیسے کی ادائیگی پر شہتیر کو ہٹا کر راستہ دیا جا سکتا تھا - بوڑھے بہلی والے کے پاس دو پیسے چھوڑ دو کوڑیاں نہ تھیں جو ادا کرتا - اس نے چار و ناچار بہلی پھر موڑ لی اور جدھر سے آیا تھا ادھر واپس ہو لیا - رات کی تاریکیاں زمین کے مساموں میں سے سیاہ بخارات کی طرح اٹھ اٹھ کر فضا میں لقیہ دھندلی سی روشنی کو مصور کرنے کے لئے غلیظ تر ہو رہی تھیں بوڑھا اسی دھندلکے میں کچھ دیر چلتا رہا حتیٰ کہ تاریکی کا غلبہ مکمل ہو گیا - اب راستہ سجھائی نہ دیتا تھا - بوڑھا رکا اور اپنی نشست سے نیچے اترا اس نے بہلی کے اندر سے ایک بھبکا نکالا - ممکن ہے کہ اس بھبکے کو کسی امیر کے گھر میں کسی وقت چلنے کا تین کہہ کر بھی پکارا گیا ہو لیکن اس وقت اس کی حالت خستہ تھی - وہ زنگ آلود بھی ہو چکا تھا - بوڑھا اس بھبکے کو لیکر دریا کے کنارے کی طرف چلا بہلی میں سے ایک بچے کی توتلی آواز آ رہی تھی - شاید اسی بچے نے پانی مانگا تھا - بوڑھا کنارے کی طرف چلا جا رہا تھا اس کا دل جذبات کے سمندر میں ڈوبا ہوا تھا جذبات جو اس کی روح کی پہنائیوں میں بادہ پیمائیاں کر رہے تھے - اس کے غیر تربیت یافتہ اور ناخواندہ ہونے کی وجہ سے غیر مشخص تھے - اس کا دماغ اگرچہ ان کو متشکل کرنے کی قابلیت نہ رکھتا تھا لیکن ان سے پیدا ہونے والے جذبات اور احساسات کو روک بھی نہیں سکتا تھا - رات کی تاریکی اس کو پرسکون معلوم ہوتی تھی - اسے اس قسم کے صدمات متعدد بار پہنچے تھے لیکن کبھی اس کو ان کا اس طرح احساس نہیں ہوا تھا جیسا کہ آج ہو رہا ہے - اس کا دل گذشتہ تمام عمر کے صدمات کے اجتماعی اثر کے نیچے دب رہا تھا - وہ راحت اور سکون کا طلبگار ہو رہا تھا - اس کی ساری دنیا اپنی زندگی کے تجربات ہی تک محدود تھی - دھکے جھڑکیاں - گالیاں بیگار فاقے زد و کوب - موسم گرما اور سرما کی سختیاں اور ایسی ہی لاتعداد تلخیاں - وہ کنارے پر پہنچا - اور بے توجہی میں پانی لینے کے لئے جھکا - جھکا ہی تھا کہ کوئی بڑی سی چیز اچھل کر پانی سے باہر نکلی - اور اسے گھسیٹتی ہوئی پانی کی چادر کے نیچے لے جا کر غائب ہو گئی - صرف ایک چیخ کی آواز سنسان فضا میں گونج پیدا کر کے لہروں کے شور و غوغا میں کھو گئی - بچے نے کچھ دیر انتظار کیا اور پھر رونے لگا - وہ روتے روتے کبھی رک جاتا اور خوف زدہ آواز سے بابا بابا کہہ کر پکارتا - اور جب کوئی جواب نہ ملتا تو پھر رونا شروع کر دیتا - آخر روتے روتے وہ سو گیا - رات تاریک تھی - لہروں کا شور تھا جنگلی جانور متحرک سایوں کی طرح ادھر ادھر پھر رہے تھے - درخت بھوتوں کی طرح ہاتھ پھیلائے کھڑے تھے - اونچی اونچی گھاس میں سے تیز ہوا کی سرسراہٹ

سے سانپوں کے پھنکارنے کی آواز پیدا ہو ہو کر دلوں کو دہلا رہی تھی لیکن نیند اور موت توام نہیں ہیں۔ نیند میں موت اکثر سر سے گذر جاتی ہے۔ اور سونے والے کو خبر تک نہیں ہوتی۔ یہ بچہ بے خبر سوتا رہا۔ یہاں تک کہ سورج نکل آیا۔ اور اس نے تیز کرنوں کے لشکروں کو بڑھا کر تاریکیوں کو پسپا کرنا شروع کیا۔ رات کی سیاہ چادروں میں شگاف پڑ گئے۔ اور پھر ہلکے جالے کی طرح نسیم سحران کو اڑا کرلے گئی۔ رات ختم ہوئی۔ دن کا آغاز ہوا۔ بچہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ اس نے بند مٹھیوں سے انہیں ملنا شروع کیا۔ اور ساتھ ساتھ آہستہ آہستہ رونا بھی۔ جب اس کی آواز سن کر حسب معمول نہ تو کوئی اس کے پاس آیا اور نہ کسی نے آواز دی۔ تو اس نے چیخنا شروع کر دیا لیکن بھلا کبھی اس دنیا کی چیخ پکار اس دنیا میں بھی پہنچی ہے۔ اگر کبھی پہنچی ہوتی۔ تو پھر یہ نظام یہ صورت حالات۔ یہ اور وہ..... گویا سب کچھ۔ یہ تکلیف دہ اور ناقابل برداشت نظام عالم ضرور بدل جاتا۔ بچے کی آواز کسی کے کان تک نہ پہنچی۔ وہ تھک کر پھر سو گیا۔ سورج جب ذرا اور اُبھرا تو قریب کے گاؤں سے مویشیوں کا ایک گلہ آتا دکھائی دیا۔ ایک دو لڑکے اس کے ساتھ تھے۔ انہوں نے جب بہلی دیکھی۔ تو سیدھے اس کی طرف چلے آئے۔ بہلی میں سوائے بچے کے اور کیا تھا۔ انہوں نے ادھر ادھر دیکھا کوئی اور شخص نظر نہ آیا۔ البتہ دریا کے کنارے پڑا ایک جوتا اور ایک میلا سا پٹکا کسی کے کھو جانے کی شہادت ضرور دے رہے تھے۔

ان لڑکوں نے معاملہ بھانپ لیا۔ گاؤں واپس جا کر چوکیدار اور نمبردار کو اطلاع دی۔ چوکیدار اور نمبردار قانون کے محافظ اور حفظ امن کے ذمہ دار آئے۔ ان کے ہمراہ کچھ اور کسان بھی تھے۔ ان کو دیکھکر بچہ جو پھر رونے لگا تھا۔ سہم گیا اور سسکیاں بھر بھر کر آہستہ آہستہ رونے لگا۔ ان لوگوں نے فیصلہ کیا۔ کہ بہلی کو ہانک کر گاؤں لے جایا جائے۔ اور لڑکے کو پولیس کی معرفت شہر کے یتیم خانے میں داخل کروا دیا جائے۔ چنانچہ بہلی گاؤں میں پہنچی۔ چوکیدار لڑکے کو لیکر شہر روانہ ہو گیا۔ تاکہ تھانے میں رپورٹ لکھوا کر بچے کو پولیس کے حوالے کر دے۔ بیل کو نمبردار نے اپنے پاس رکھ لیا اور گدھے کو بھی کسی اور ایسے ہی معتبر شخص کے سپرد کر دیا گیا۔ ایک دو روز میں یہ تمام ماجرا رفت گذشت ہو گیا لیکن ابھی ایک ہفتہ نہ گذرا تھا کہ خانہ بدوش قوم کی ایک عورت پھٹے کپڑے پہلے ننگے پاؤں جھولی گلے میں ڈالے بہلی کے پہیوں کے نشانوں کے پیچھے پیچھے چلتی اس گاؤں میں آ پہنچی اور لوگوں سے بہلی کے متعلق دریافت کرنے لگی۔ وہ اسے نمبردار کے پاس لے گئے۔ نمبردار نے بتایا کہ بوڑھا تو غالباً دریا میں ڈوب گیا اور بچہ پولیس کی معرفت شہر کے یتیم خانے میں بھیج دیا گیا ہے۔ عورت بے چاری مامتا کے درد سے رونے لگی۔ اور پھر ذرا رکی۔ اور پوچھنے لگی۔ بیل اور گدھا کیا ہوئے۔ نمبردار نے بے اعتنائی سے جواب دیا بیل سخت کمزور تھا مر گیا اور گدھا ایک اور شخص کے پاس ہے۔ اس شخص کو بلوایا گیا۔ تو اس نے کہا کہ وہ تو دو دن ہوئے مر گیا۔ میں نے اس کا بہتیرا خیال رکھا چارہ وغیرہ بھی خوب ڈالا۔ لیکن بیچارہ ختم ہی ہو گیا۔ نمبردار نے بھی اس کی بات کو دہرایا اور کہنے لگا کہ میں بھی بیل کو بے سود چارہ ڈالتا رہا۔ عورت یہ سن کر خاموش ہو گئی اور پھر بین کیا کرتی اٹھی اور چلنے لگی۔ تھوڑی دور جا کر پھر لوٹ آئی۔ اور کہنے لگی۔ بہلی تو ضرور کہیں ہو گی۔ کہاں ہے؟ غربت نے دیہاتیوں کو ہر چیز کو استعمال میں لے آنا خوب سکھا رکھا ہے۔ وہ کوئی چیز رائیگاں نہیں جانے دیتے۔ بھلا بہلی کیوں نہ کسی مصرف میں آتی۔ ایک دیہاتی کی بہلی کی چھت ٹوٹی ہوئی تھی۔ وہ چھت اکھاڑ کر لے گیا۔ ایک اور کو جوئے کی ضرورت تھی۔ وہ جوا اتار کر لے گیا۔ اسی طرح بعضوں کو پہیوں تیروں۔ پٹڑیوں اور دیگر ایسے حصوں کی ضرورت تھی۔ انہوں نے بھی اپنی ضرورتوں کو اس طرح پورا کر لیا تھا۔ وہ گاؤں پہنچ چکی تھی۔ عورت کے اس سوال پر لوگ جو جمع ہو گئے تھے۔ ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ عورت کہہ رہی تھی بھلا بوڑھا دریا میں ڈوب گیا بیل اور گدھا مر گئے لیکن بہلی کہاں گئی۔ کیا اس کو بھی موت آ گئی؟ عورت نے چیخ چیخ کر دریافت کرنا شروع کیا۔ نمبردار کسی اور طرف دیکھنے لگا۔ مجمع خاموش اور بناوٹی طور پر غیر متوجہ ہو گیا۔ جب خانہ بدوش عورت نے رونا دھونا شروع کر دیا۔ تو ایک منچلے نے کہا۔ چوٹی کہیں کی جرائم پیشہ، بس اب کیا تھا۔ یہ بات سب کی زبان پر چڑھ گئی۔ اور سب نے اسے چوٹی چوٹی کہنا شروع کیا۔ بھلا عورت ذات اس کی بساط ہی کیا تھی۔ بیچاری گھبرا کر ایک طرف کو ہولی۔ تمام مجمع اس کے پیچھے پیچھے ہو گیا۔ سب چوٹی چوٹی پکار رہے تھے۔ ایک نے ڈرانے کے لئے روڑا اٹھایا۔ اب سب نے روڑے۔ ڈھیلے۔ ٹوٹے جوتے۔ اور ٹوٹی ہوئی ہنڈیوں کے ٹکڑے جو جو کچھ بھی ہاتھ آیا اٹھا اٹھا کر اس بیچاری پر پھینکنے شروع کر دیئے۔ ان ٹھیلاوں سے جان بچانے کے لئے وہ بھاگنے لگی۔ مجمع پیچھے تھا اور وہ آگے آگے بھاگی جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ گاؤں کی حد سے باہر نکل گئی۔ اس نے تھانہ کا رخ کیا لیکن وہاں کیا دھرا تھا۔ تھانے میں کس کی فریاد کرتی۔ وہ خود مجرم تھی۔ اور اس کا جرم تھا...... غربت۔

میر کفایت علی درد

تجلّیات

کس اَوج پہ چمکا ہے مقدّر کا ستارا
تو میرا سہارا ہے بَس دنیا کا سہارا

کیا جانے ترے نام میں یہ سحر ہے کیسا
ہے ذکر ترا میرے ہر اک درد کا چارا

تم سامنے آجاؤ تو کیا جانئے کیا ہو؟
طوفانِ محبّت ہے تصوّر بھی تمہارا

رگ رگ میں ترے جلوؤں کا طوفان بپا تھا
جب نام ترا لے کے تجھے دل نے پکارا

اب اس میں نہیں کچھ بھی بجز نغمہ و خوشبو
تیرے لئے کاشانۂ دل کو ہے سنوارا

پہنائی کونین پہ ہے اس کا تسلّط
جس ہاتھ میں آیا ترے دامن کا کنارا

اِک ایسے سمندر میں رواں کشتئ دل ہے
ہے سرحدِ امکاں سے پرے جس کا کنارا

دنیا کے ہر اک حسن سے محبوب ہے مجھکو
یہ صبح سکون بخش کا معصوم ستارا

بیگانۂ کونین ہے صہبائیِ بیخود
لب پر ہے مگر شام و سحر نام تمہارا

اثر صہبائی

بہشت کی بازیافت

خاندانی روایات کا اثر تھا یا لائق اُستادوں کی صحبت کا فیض کہ ہم اپنے گھر میں گھر کے سو فیصدی مالک کی حیثیت سے رہنے کے پرانے اصولوں پر کاربند تھے۔ اس اصول کی پابندی اس سختی سے کی جاتی تھی۔ کہ ہم گھر کے معاملات میں بیگم کی رائے پر عمل کرنے کو ایک شوہر کی انتہائی کمزوری اور سفاہت سمجھتے تھے۔ اسی سلسلے میں یہاں تک احتیاط ملحوظ تھی کہ اگر کسی معاملے میں اپنی رائے بھی وہی ہو۔ جو بیگم اپنی طرف سے پیش کر بیٹھیں تو اس سے عمداً اظہار اختلاف ظاہر کرتے ہوئے بیگم کو چپ کرا دیا جاتا تھا کہ خدا نے تم کو مرد کا (یعنی مردِ متعلقہ کا) حکم ماننے کے لئے پیدا کیا ہے۔ وہ بیچاری خاموش دم نہ مار سکتی تھیں۔ یہاں تک کہ ہمارے معاملات میں دخل دینے کی عادت اور ہماری رائے کو بدلوانے کی خواہش رفتہ رفتہ ان کی طبیعت سے نکل چکی تھی۔

(۲)

ایک دفعہ ہمیں یکایک نوبتی بخار آنے لگا جب بخار کا حملہ ہوتا تو یوں ہوتا تھا کہ کسی نے مشکیں کس کر تنور میں جھونک دیا ہے یا تیز دھوپ میں تپتی ریت پر چت لٹا دیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایسا معلوم ہونے لگا کہ سارے جہان کا درد سمٹ سمٹا کر ہماری دونوں کنپٹیوں کے درمیان آ بسا ہے۔ آنکھوں کے سامنے کبھی بالکل اندھیرا چھا جاتا تھا اور کبھی مطلع صاف نظر آنے لگتا تھا۔ کبھی یوں نظر آتا تھا کہ پہاڑی جنگل ہر طرف چھائے ہوئے ہیں۔ اور انہوں نے سورج اور ہمارے درمیان ایک بلند دیوار کھڑی کر دی ہے۔ کبھی ہوا کا جھونکا آکر اونچے درختوں کی ٹہنیوں کو حرکت دیتا ہے۔ تو دھوپ کو کہیں کہیں سے جھانکنے کا موقعہ مل جاتا ہے۔

(۳)

اس بیماری میں بیگم نے ہماری جس قدر خدمت کی اسے دیکھکر بے اختیار مُنہ سے یہ دعا نکلتی تھی۔ کہ خدائے قادر کریم اسے مرنے کے بعد بھی ہمارے حبالۂ عقد سے آزاد نہ کرے جس دن سے ہمیں بخار ہوا۔ اور ہم نیم بے ہوشی کی حالت میں بستر پر دراز ہوئے جس رُخ کروٹ بدلتے اس اللہ کی بندی کو موجود پاتے تھے۔ بخار سے تپتی ہوئی آنکھوں میں شکریئے کے آنسو جھلکنے لگتے تھے۔ اور طبیعت اس نظریئے کو بدلنے کی طرف تیزی سے مائل ہوتی تھی۔ کہ مرد اور عورت میں کوئی پیدائشی فرق موجود ہے۔ بار بار دل میں آتا۔ کہ اپنے اس ذہنی انقلاب کا اعلان بلند آہنگی سے کر دیا جائے۔ لیکن مدت دراز کے ان منجمد خیالات کی تردید پر اپنے آپ کو آمادہ نہ پاتے تھے جن کی حمایت میں اب تک بیگم سے سینکڑوں گرما گرم مباحثے ہو چکے تھے۔ دوسرے ہمارے مردانہ وقار کو یہ خدشہ بھی لاحق تھا کہ کہیں ایسی حالت میں کہ ہم صاحب فراش اور ہر چھوٹی سے چھوٹی بات میں بیگم کے محتاج ہیں۔ ہماری رائے کی مخلصانہ تبدیلی کو خوشامد پر محمول نہ کر لیا جائے۔

ہمیں اپنے گھر میں آمرانہ اختیارات حاصل ہوتے ہوئے بھی ایک حسرت ہمیشہ رہی۔ کہ بیگم ہمارے بلانے پر گنبد کی صدا کی طرح آواز نہ دیتی تھیں۔ اور ہمیشہ "ننھے کو نہلا رہی ہوں۔ اس کی آنکھوں میں کاجل لگا رہی ہوں۔ دھوبی کے کپڑے لکھ رہی ہوں۔ کنجڑے کے پیسے چکا رہی ہوں" کی قسم کے بیسیوں تمہیدی فقرات کے بعد مخاطب ہوتی تھیں۔ لیکن ہمارے بخار نے بیگم کی گویا طبیعت ہی بدل دی تھی۔ ادھر ہم نے آواز دی اور وہ موجود۔ ہم نے جدھر کروٹ بدلی۔ فوراً تکیہ رکھ دیا ہم نے مکھی اڑانے کو ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ تو اس نیک بخت نے فوراً اُٹھ کر سر دبانا شروع کر دیا۔

بیگم کی عادت تھی کہ اگر ایک دفعہ برتن دھو دھلا کر الماری میں بند کر دیئے اور استعمال کے وقت کسی نے پھر دھونے کی فرمائش کر دی تو پنجے جھاڑ کر پیچھے پڑ جاتی تھیں "ایک دفعہ برتن منجھ چکتے ہیں اور شیشے کی الماری میں بند کر دیئے جاتے ہیں۔ تو انہیں وہاں کونسی دیمک چاٹنے لگتی ہے یا ان پر کون سی مکھیاں بھنبھنانے لگتی ہیں؟ گھر بھر کا کام سنبھالے ہوئے ہوں۔ ایسی بدتمیز نہیں کہ کسی کو گندے برتن میں کھانے کی چیز ڈال کر دے دُوں۔ ایک دفعہ دھو دھلا کر برتنوں کو ٹھکانے لگا چکی ہوں اب انہیں پھر کیوں دھوؤں؟ جاؤ نہیں دھوتی" لیکن اب ہماری بیماری میں دُھلے ہوئے برتنوں کو بھی جب تک کھولتے پانی میں نہ ڈال لیتی تھیں۔ انہیں ہمارے سامنے نہ لاتی تھیں۔

اس کے علاوہ اگر ہم پہلے کبھی گھر کا کوئی کام اپنے ہاتھ سے کرنے بیٹھ جاتے۔ تو بیگم کو ہمارا ہاتھ بٹانے کی قسم تھی چاہے ہم سے اس کام میں کوئی غلطی بھی ہو رہی ہو۔ تو بھی وہ ہماری رہنمائی نہ کرتیں۔ بلکہ آتے جاتے مسکرا مسکرا کر گویا ہمیں اپنی کم فہمی کا احساس کراتی تھیں۔ لیکن بیمار پڑے تو بیگم نے ہمیں اپنے ہاتھ سے دوا تک نہ پینے دی جب وقت ہوتا۔ دوا تیار کر کے لاتیں اور تکئے کے سہارے ہمارا سر اونچا کر کے دوا کا پیالہ ہمارے ہونٹوں سے لگا دیتیں۔ آسانی سے ہم فوراً پی جاتے۔ کہ دوا کی تلخی کی شکایت کبھی زبان پر نہ لاتے۔ ہماری بیماری کی کیفیت بیگم خود ہی ڈاکٹر سے بیان کرتیں خود ہی ہمارے کھانے کے متعلق ہدایات حاصل کرتیں۔ اور ہمیں ضرورت کی ہر شے بیٹھے بٹھائے بغیر زبان ہلائے مل جاتی تھی۔ دل ہی دل میں اللہ میاں کا سو سو شکر کرتے جس نے ہمیں ایسی سلیقہ شعار بیوی کا میاں بنایا۔

(۴)

لیکن آہستہ آہستہ معاملے کا ایک اور پہلو ہماری نظر کے سامنے آنے لگا جس نے ہمارے اطمینان کے شیرازہ کو درہم برہم کر دیا ہمیں احساس ہونے لگا۔ کہ اب اس گھر میں ہمارا راج نہیں بلکہ اب راجہ سے پرجا بن چکے ہیں۔ ایک دن ہم نے کہا "بیگم نوکر سے کہو کہ ہمارا جوتا اور چھڑی نکال لائے۔ آہستہ آہستہ بازار تک جانا چاہتے ہیں۔ گھر میں اکتا گئے ہیں۔ ذرا جی بہل جائے۔" بیگم نے کہا "نوج۔ تمہارے جیسا بھی کوئی اپنی صحت کا دشمن ہو۔ بخار ابھی اترا نہیں چکا اور میاں چلے ہیں ٹہلنے کو۔" ہم نے کہا "ٹہلنے تھوڑی جا رہے ہیں اور سچ پوچھو تو ٹہلنے کی ہمت ہی ابھی ہم میں کب ہے۔ ایسے ہی ذرا ایک جگہ بیٹھکر بازار کی سیر دیکھیں گے۔ ارے نذیر جوتا لاؤ ہمارا اور چھڑی بھی۔ بیگم نے ہم سے تو کچھ نہیں کہا۔ ہاں وہیں بیٹھے بیٹھے نوکر کو ایک ڈانٹ بتا دی "خبردار! جو کسی کو جوتا یا چھڑی وڑی لا کے دی۔" ہم نے اپنی زندگی میں یہ پہلی مرتبہ دیکھا کہ نوکر ہمارے حکم کو سننے کے باوجود کھڑا ہے اور ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ بیگم کے حکم کا منتظر کھڑا ہے۔ ناچار ہم نے بھی نوکر کو ایک ڈانٹ دی "......کے بچے حکم نہیں سنا ہمارا؟" ابھی آخری لفظ ہمارے منہ میں ہی تھے کہ بیگم برس پڑیں "حکم نہیں سنا ہمارا؟......نوکر نہیں سنے گا تمہارا حکم۔ تم تو ٹھہرے بیمار۔ تمہیں کون پوچھے گا سب کہیں گے۔ وہ تو بیمار تھے۔ بیمار اونچے کی رائے کیا؟ لوگ مجھے برا بھلا کہیں گے کہ اس نے کیوں جانے دیا۔ سب سے زیادہ تمہارے بہن بھائی میرے گلے کا ہار ہو جائیں گے۔ ڈاکٹر کیا کہیگا میں نے تمہیں ہدایت نہ کر دی تھی۔ کہ جب تک میں مشورہ نہ دوں انہیں بستر سے نہ اٹھنے دینا خبر بھی ہے تمہیں یہ سب علاج ولاج کس کی ذمہ داری پر ہو رہا ہے؟ میری ذمہ داری پر۔ میں نہ ہوتی تو خدا جانے کیا ہو جاتا۔ کوئی ایسا ویسا مرض نہیں تھا۔ بخار تھا نوبتی بخار۔ اب سرکار ہیں کہ ذرا سی ہدایت پر عمل نہیں کرتے۔ لاکھ سر پٹکتی ہوں۔ ماننے میں نہیں آتے۔"

بیگم نے آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا۔ اور ہم تھے کہ نقاہت اور ندامت کے مارے گڑے جاتے تھے۔ زندگی کا یہ پہلا موقعہ تھا کہ کسی نے ہم پر یوں غصہ اتارا ہوا اور ہم نے دم نہ مارا ہو مگر وہ جو مثل مشہور ہے۔ قہرِ درویش بر جانِ درویش، اس کے بعد بیگم کی کسی بات کا جواب تو درکنار منہ سے اُف تک نہ کر سکے۔

ایک دن جب ڈاکٹر ہمارا معائنہ کر چکا۔ تو ہمت کر کے اس سے پوچھ بیٹھے "کیوں صاحب کتنے دن میں اچھے ہو جائیں گے؟"

ڈاکٹر نے ہمارے سوال کو سنا تو ضرور۔ لیکن جواب بیگم کو دیا۔ "بیگم صاحبہ یہ ہفتے عشرے میں اچھے ہو جائیں گے لیکن کھانے میں پرہیز اور دوا میں احتیاط شرط ہے۔" ہم نے پوچھا "ڈاکٹر صاحب آہستہ آہستہ بازار تک چلے جانے میں کوئی ہرج تو نہیں؟" ڈاکٹر صاحب نے اپنا منہ تک ہماری طرف پھیرنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ اور ہمارے سوال کو بیگم کا سوال تصور کرتے ہوئے کہا "بیگم صاحبہ انہیں ابھی بازار تک نہ جانے دیں۔ اگر یہ جانا بھی چاہیں تو انہیں روک دیا جائے۔" اب تو ہماری خفت اور غصے کی کوئی انتہا نہ رہی ہم نے کہا "سنئے ڈاکٹر صاحب! فیس آپ ہماری جیب سے لیتے ہیں یا بیگم کی جیب سے! ہمیں کوئی احمق یا سٹری سمجھ رکھا ہے آپ نے۔ سوال ہم کرتے ہیں اور جواب ملتا ہے بیگم صاحبہ کو۔ ڈاکٹر تو ہماری یہ ڈانٹ سنکر چپکا چل دیا لیکن اس کی خاموشی کی کسر بیگم نے پوری کر دی۔

"احسان فراموش دنیا کو خدا جانے کس جہنم کا ایندھن بنایا جائے گا۔ میاں کو وہ وقت یاد نہیں جب بے ہوش پڑے تھے منہ پر مردنی چھائی ہوئی تھی۔ دو گھڑی کے مہمان نظر آتے تھے۔ بیگم بدبخت نے اپنے آرام کو آرام نہیں سمجھا۔ اس دن سے سر میں پانی نہیں ڈالا۔ کپڑے نہیں بدلے میاں کی خدمت میں دن رات ایک کر دیا جس احتیاط کی ڈاکٹر نے ہدایت کی۔ اس پر پورا عمل کیا اور آج اگر ڈاکٹر نے بیگم کو میاں کی صحت کے متعلق کچھ بتایا تو ڈاکٹر کو قتل کر دو۔ بیگم کو پھانسی دے دو۔ تاکہ میاں کا کلیجہ ٹھنڈا ہو۔"

(۵)

جب نوبت یہاں تک پہنچی تو ہم نے گذشتہ واقعات پر ناقدانہ نظر دوڑائی۔ آخر بیگم کے ایک بے زبان محکوم سے یوں یکایک مختارِ مطلق بن جانے

کی وجہ کیا ہے؟ اپنے تاریخی مطالعہ سے بھی استفادہ کرنے کی کوشش کی۔ عقل نے رہنمائی کی اور ہمیں سمجھایا کہ بیگم شعوری یا غیر شعوری طور پر ان فرمانرواؤں کے نقش قدم پر چل رہی ہیں جن کا مقولہ ہے "آرام اور آسائش کی عادت ڈالو اور حکومت کرو"۔ یہ لوگ محکوموں کے لئے دنیا جہان کی آسائشیں بہم پہنچا دیتے ہیں جو آہستہ آہستہ ان کی زندگی کا جزو بن جاتی ہیں۔ اور نواوٗ ان کے گھروں کی حفاظت تک اپنے ذمہ لے لیتے ہیں۔ اور محکوم چور اور ڈاکو کے خوف سے بے فکر پڑے سوتے ہیں۔ رفتہ رفتہ محکوم یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ آزادی اور خودمختاری کی تمنا کرنا امن وعافیت سے ہاتھ دھونے کے برابر ہے۔ اس لئے حاصل شدہ آسائشوں کو چھوڑنے پر محکومی اور غلامی کو ترجیح دینے لگتا ہے۔ اور دوسرے کی اچھی حکومت کے سامنے اپنی حکومت کو ہیچ تصور کر لیتا ہے۔ بیگم نے ہماری اس قدر خدمت کی۔ کہ اب ہم بیگم کا کلمہ پڑھنے لگے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گھر بھر سے ہمارا رعب اُٹھ گیا۔ اور ہم حاکم سے محکوم بن کر رہ گئے۔

آخر ہم نے اپنے چھنے ہوئے تخت اور کھوئی ہوئی بہشت کو پھر سے حاصل کرنے کا تہیہ کر لیا۔

(۶)

ہماری بیماری کے دوران میں دوست عیادت کے لئے آتے رہے لیکن بیگم کا نادرشاہی حکم تھا کہ کوئی ہم تک پہنچنے نہ پائے۔ نوکر سب کو باہر سے باہر ہی لوٹا دیتا تھا۔

ہمارے دوستوں میں شیخ صاحب نہایت مخلص دوست ہیں وہ کئی دفعہ بیمار پرسی کے لئے تشریف لائے۔ لیکن انہیں ہم سے ملنے نہ دیا گیا نوکر نے اوپر ہی اوپر یہ کہدیا کہ ڈاکٹر نے ملاقات بند کر دی ہے۔ لیکن جب کبھی شیخ صاحب یا کسی اور دوست کو ہم سے ملے بغیر اس طرح لوٹا دیا جاتا تھا۔ تو ہمارے سینے پر سانپ سا لوٹ جاتا تھا۔ اور ہم غالب مرحوم کا یہ شعر پڑھ کر رہ جاتے تھے ؎

یارِ دیرینہ قدم رنجہ مفرما کایں جا
ایں نگنجد کہ تو در کوئی و من باز کنم

لیکن اب ہمارے دل میں اپنے کھوئے ہوئے وقار کو پانے اور گھر میں نئے سرے سے اپنا سکہ جمانے کا جذبہ پیدا ہو چکا تھا۔ بس موقعہ کا انتظار تھا۔

(۷)

ایک روز دروازے کی گھنٹی بجی۔ اور اس کے بعد کان میں شیخ صاحب کی آواز آئی۔ جو نوکر سے ہنس ہنس کر کہہ رہے تھے "کیوں بھئی۔ ابھی تک ہمارے دوست ڈاکٹر کی قید سے رہا ہوئے کہ نہیں؟" بیگم اس وقت دوا بنانے میں مصروف تھیں۔ شیخ صاحب کی آواز سن کر نوکر کو ہدایت دینے کے لئے اُٹھیں۔ ہم نے وہیں بیٹھے بیٹھے پورے زور سے چلا کر یہ شعر پڑھا ؎

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقین پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

ہماری آواز شیخ صاحب کے لئے اندر چلے آنے کی دعوت تھی۔ وہ فوراً تشریف لے آئے۔ اور ہم نے اُن سے بآوازِ بلند کہا "اب ہم نے فیصلہ کر لیا ہے۔ کہ کسی کا حکم نہیں مانیں گے۔ کسی کی ہدایت پر عمل نہیں کریں گے۔ اپنے دوستوں کو کھلے بندوں ملیں گے۔ بازار جائیں گے۔ اور جو جی میں آئے۔ کھائیں گے۔" شیخ صاحب حیران تھے۔ کہ جب ہمیشہ سے ہماری یہی عادت ہے تو از سرِ نو اس قسم کے ارادے باندھنے کا مطلب کیا ہے؟ لیکن اگرچہ ظاہرا ہماری گفتگو کے مخاطب شیخ صاحب تھے۔ لیکن دراصل ان کے پردے میں ہم بیگم صاحبہ کے خلاف اعلان بغاوت کر رہے تھے۔ جو باورچی خانہ میں دبکی بیٹھی تھیں

ٹیپ کے بند کے طور پر ہم نے اسی جوش کے ساتھ بآوازِ بلند کہا کہ "اگر کوئی متنفس (عورت یا مرد) ہمارے ارادے میں مزاحم ہوا۔ تو اسے اپنی حماقت پر پچھتانا پڑیگا۔

شیخ صاحب کے چلے جانے کے بعد بیگم نے نہایت شکست خوردہ آواز میں نوکر سے کہا

"میاں سے پوچھو کہ دوا لاؤں؟" ہمیں اپنا کھویا ہوا بہشت واپس مل چکا تھا۔

محمد اکبر خاں بی اے

ایک شعر ؎

مطلب پرست دوست نہ آئے فریب میں
بیٹھا رہا لئے ہوئے دامِ وفا کو میں

ابوالاثر حفیظ

آزادی

دارُالسلطنت سے دُور چنگیزی محلات کے قریب شاہی تفریح گاہ دُنیاوی عجائبات کا نمونہ پیش کر رہی تھی۔ حسین خواصیں نیم عُریاں لباس پہنے درد ریز ستار کے تاروں سے کھیلتی نظر آتیں۔ روح پرور نغمات جب فضاؤں میں رقص کرتے تو فطرت پر ایک وجدانی کیفیت طاری ہو جاتی۔ اُمنڈتے ہوئے چشمے کی شفاف سطح پر سبزے کی دیوی اٹھکیلیاں کرتی پھرتی موسمِ گُل میں کھلتے ہوئے پھول فرقت زدہ عنادل کو آمدِ بہار کا پیغام پہنچاتے گُل و بُلبل کے علاوہ یہاں چند خونخوار درندے بھی مدت ہوئی آزادی کو الوداع کہہ چکے تھے۔ ان میں ایک شیر بھی تھا۔ جیسے شاہی غلام نینوا کے صحرا سے پکڑ لائے تھے۔

صبح کی دیوی جب بستر شب سے انگڑائیاں لیتی ہوئی بیدار ہوتی تو چنگیزی لونڈیاں بھی ساز لئے ہوئے چمن کے سوئے ہوئے عناصر کو جگانے آتیں محبت کی وجد آفرین راگنیاں جب فضاؤں میں گونج کر ہوا کے شانوں پر پرواز کرتی ہوئیں شاہی محلات تک پہنچتیں اور پھولوں کے سیج پر آسودہ خواب بادشاہ کے کانوں میں اپنی نرم نازک اور لوچدار آواز سے ایک ہلکا سا ارتعاش پیدا کرتیں۔ تو بادشاہ کی رُوح اس کے جسم کو جھنجھوڑ کر بیدار کر دیتی۔ راگنیاں اُسے اُٹھا کر آہستہ آہستہ سیرگاہ کی جانب کھینچ لاتیں۔

غُصیلا چنگیز جب سیرگاہ کے اندر قدم رکھتا تو میٹھی راگنیاں اُس کا خیر مقدم کرتیں۔ ظالم بادشاہ کی پُرشکن جبیں ایک ہلکی سی مسکراہٹ سے چاند کی طرح چمکنے لگتی۔

بادشاہ زندہ حُسن کے اس جھرمٹ میں سے کسی حسین خواص کو اپنے شبستان عشرت کے لئے انتخاب کرتا۔ پھر مست خرام انداز میں مہ جمالوں کے درمیان سے گذر کر چشمے کے قریب رکھے ہوئے شیر کے پنجرے کے پاس جا پہنچتا چنگیز کی آمد پر شیر ایک دلخراش آواز بلند کرتا لیکن خونخوار بادشاہ اس کی آہوں پر مسکرا دیتا۔ بادشاہ کی خوبصورت چھڑی پنجرے کے سوراخوں پر کھیلنے لگتی۔ جسے شیر پنجوں میں پکڑ کر چھیننے کی ناکام کوشش کرتا۔ دونوں زور آزمائی میں اس طرح مصرُوف ہو جاتے۔ گویا دو بادشاہ ایک دوسرے کی سلطنت پر قبضہ جمانے کے لئے برسرِ پیکار ہوں۔ بالآخر غلام کی شکست اور آقا کی فتح ہوتی۔ چنگھاڑتا ہوا شیر پھر چھڑی پر لپکتا مگر بادشاہ شکست خوردہ حریف کا مدِمقابل ہونے سے گریز کرتا۔ اس طرح ہر روز اس کے قہقہے شیر کی خوفناک گرج میں گم ہو کر فضاؤں کو لرزا دیتے غلاموں کی یہ پستی بادشاہ کی دلفریب جنت تھی ہزاروں دوشیزاؤں کا پاکیزہ حُسن بادشاہ کی پُرشوق نگاہوں کی آماجگاہ بنتا اور اُن کا دامن گناہ سے ملوث ہو کر رہ جاتا بس یہ تھے چنگیز کی زندگی کے محبوب مشاغل۔

ایک شب جب چاندنی نُور برسا رہی تھی کھلے ہوئے پھول نورانی چادر اوڑھے شگفتہ کلیوں سے غلامی کا افسانہ کہہ رہے تھے۔ لالہ آنکھیں بند کئے خاموشی کے ساتھ کسی آزاد فضا کے تصور میں کھویا سا دکھائی دیتا۔ تفریح گاہ کی رنگین تیتریاں پھُولوں کے دامن میں بے حس و حرکت سو رہی تھیں تاہم پُرنور سناٹا اپنے دامن میں بہت سی دلچسپیاں لئے تھا۔ خلاف معمول بادشاہ اپنے ارا کین سلطنت کے ساتھ ٹہلتا ہوا شاہی باغ کی جانب آنکلا۔ گذری ہوئی فتوحات اور آنے والی شکستوں سے بےخبر بادشاہ آج شراب کے سہارے ٹہلتا پھرتا تھا۔ اُمرا، وزرا پیچھے پیچھے ساتھ ساتھ جا رہے تھے۔ بادشاہ آج ایک ترنگ اور سرشاری کے ساتھ تخیل کی روانی میں بہے چلا جاتا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چشمے کے قریب پہنچا۔ اس نے خلاف توقع اُوک سے پانی پیا۔ اور اُٹھ کر پنجرے کے شاہی قیدی شیر کی جانب دیکھنے لگا۔

دو ننھے پرندے پنجرے کی چھت پر بالمقابل بیٹھے چاندنی کی ردا اوڑھے چہچہا رہے تھے۔ بادشاہ نے وزیر سے پوچھا۔ یہ ننھے پرندے کیا پیغام سنا رہے ہیں؟ بے وقت کے سوال نے وزیر کے ہونٹوں پر خاموشی مسلط کر دی۔ وہ حیران تھا۔ اس اُلجھن کو کیونکر سلجھاؤں؟ وہ جانتا تھا کہ چنگیز کا خوفناک غصہ میرے ساتھ عزیز و اقارب کی تباہی کا پیغام بن سکتا ہے ہر وزیر کے دل میں خوفناک خواب کی تعبیر گھومنے لگی۔ موت کا تخیل انسانی ذہن کو دنیا و مافیہا سے بےخبر بنا دیتا ہے۔ ان کے دل ساکت ہو گئے۔ وہ درختوں کے سائے تلے بے حس و حرکت کھڑے تھے۔ جیسے خزاں رسیدہ سوکھے ہوئے درخت تیز درانتی کے انتظار میں گھڑیاں گن رہے ہوں۔ پنجرے کے دوسری طرف جہاں اس کا سایہ سبز گھاس پر سیاہ چادر

ڈالے تھے۔ اور سلاخوں سے چھن چھن کر آنے والی روشنی ایسا منظر پیش کر رہی تھی۔ جیسے کسی جوہری نے سیاہ بلور پر جواہر ریزے بکھیر رکھے ہوں۔

اس تاریکی و روشنی کی حسین چادر اوڑھے باغ کا بوڑھا محافظ جو ساٹھ برس تک اپنے خون کے عوض باغ کی شادابی خریدتا رہا۔ کھڑا سر اٹھائے پرندوں کے راگ سننے میں محو تھا۔ وہ جانتا تھا کہ طائران چمن کا روح پرور ساز کبھی کبھی دردناک گیت بھی سنایا کرتا ہے۔ اس کی کمان کمر سفید داڑھی جھریوں کا آماجگاہ چہرہ۔ زندگی کے تلخ تجربات کی تفسیر پیش کر رہا تھا۔ مرتعش ہاتھوں کی بوسیدہ لاٹھی اس کی جان کا سہارا بنی تھی۔ بوڑھا خاموش ہمہ تن گوش تھا۔ اور پرندے لگاتار اپنے راگ الاپ رہے تھے۔

ایک پرندہ سامنے سے اڑ کر دوسرے پرندے کے ساتھ آ بیٹھا۔ سنانے میں اس کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ صاف سنائی دی۔ اب دونوں پرندے منقار درمنقار خاموش ہو گئے۔

بوڑھے میاں کا ایک خوفناک قہقہہ خاموشی کی سطحوں کو چیرتا ہوا فضاؤں میں ڈوب گیا۔ اور ایک مسلسل پھڑپھڑاہٹ کی آواز کے ساتھ دونوں پرندے اونچے درختوں کے تاریک پتوں میں روپوش ہو گئے۔

”جواب دو“ بادشاہ کی رعب دار آواز ایک گونج کے ساتھ اٹھی۔ اور ہوا کے شانوں پر آسمان کی بلندیوں پر پرواز کر گئی۔

وزرا لرز گئے۔ جیسے کسی نے دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا ہو۔ بوڑھے نے اپنا عصا مسلسل قہقہوں کے درمیان گھما کر پنجرے میں پھینکا۔ جو شیر کی کمر پر تازیانہ بن کر گرا۔ بڈھا اپنے جذبات کی رو میں لگاتار قہقہے لگاتا ہوا باہر کی جانب بڑھا۔ شیر ایک مہیب گرج کے ساتھ اٹھا اور ڈرو کنے لگا۔ بڈھا بلند بانگ قہقہوں کے درمیان لوٹا۔ اس نے اپنی شعلہ بار آنکھیں شیر کی آنکھوں میں ڈال دیں شیر خاموش ہو گیا۔

”غلامی کو مجبوری سے تعبیر کرنے والے بزدل جواب دے“ ان ننھے ننھے آزاد پرندوں کی سرگوشیوں کا جو تیری محکومیت پر آزادانہ قہقہے بلند کرتے غائب ہو گئے ہیں۔ شیر غرایا۔ گویا وہ زبان حال سے کہہ رہا ہے ”کیا تم آزاد ہو بوڑھے باغبان؟“

”آہ میں بھی تیری طرح ایک غلام ہوں جنگل کے بادشاہ“ بوڑھے نے اعتراف کرتے ہوئے کہا۔

شیر اب پنجرے کے در و دیوار سے ٹکریں مارنے لگا۔ اس نے اپنے سامنے دونوں پنجے سلاخوں کے درمیان گاڑ دیئے۔ اس کے خوفناک دانت سلاخوں کو چبانے کی ناکام کوشش کرنے لگے۔

بوڑھا دونوں ہاتھوں سے جگر تھامے آہستہ آہستہ چشمے کی طرف جانے لگا ٹھوکر لگی اور اوندھے منہ گر پڑا۔ بادشاہ خاموش ڈھانچے کو بغور دیکھ رہا تھا ایک وزیر نے بوڑھے کی نبض پر ہاتھ رکھا۔ اور اپنی مایوس نظریں بادشاہ کی آنکھوں میں ڈال دیں۔ آہ یہ کس کی موت کا پیغام تھا اور یہ جذبہ غیرت غلامی کا جذبہ تھا جس نے بوڑھے باغبان کو قید عناصر سے آزاد کر دیا۔

دوسرے دن تفریح گاہ کے کنارے ایک قبر دیکھی گئی جس پر لکھا تھا ”شرمِ اسیری کا شہید“۔ اکثر دو ننھے ننھے پرندے اس مزار پر پھول چڑھاتے دیکھے گئے۔ یہ وہی پرندے تھے جنہوں نے بادشاہ کے بوڑھے غلام کو آزادی کا گیت سنایا تھا۔

کاوش

آنچہ فلک نہ خواست است ہیچ کس از فلک نہ خواست

ظرف فقیہہ مے نہ جُست، بادۂ ما گزک نہ خواست

رندِ ہزار شیوہ را طاعتِ حق گراں نہ بود

لیک صنم بسجدہ در ناصیہ مشترک نہ خواست

غالب مرحوم

یہ رات

رات ہوئی اور چھٹکے تارے
ننھّے ننھّے پیارے پیارے
نور بھرے آکاش سے پھوٹے
شیتل سوتے کومل دھارے
رات کی راجکماری نکلی ہاتھوں میں پھلجڑیاں لے کر
دُنیا کی مایوس فضا میں عشرت کی کچھ گھڑیاں لے کر
ہونٹوں پر مدہوش تبسم
اور آنکھوں میں سرد شرارے
رات ہوئی اور چھٹکے تارے

(۲)

وہ مغرب سے چاند نے جھانکا
جگ کو سیمیں جال سے ڈھانکا
چرخ کے دامن پر فطرت نے
اک انمول جواہر ٹانکا
چاندی کا باریک سا پردہ دھرتی پر مہتاب نے تانا
اس پردے کے تار روپہلی اور سنہری تانا بانا
کس دھج سے شب یوراج آیا
تیکھا ٹیڑھا ترچھا بانکا
وہ مغرب سے چاند نے جھانکا

(۳)

کنور کو مل گئی راجکماری
وہ اس پر میں تجھ پر واری
وہ آکاش پہ ہم دھرتی پر
راس رچائیں باری باری
رات یہ کیا من بھاتی آئی بچھڑے پریمی آن ملے ہیں
ان گھڑیوں کو نعمت جانو پھر سے من کے کنول کھلے ہیں
ایشور نے یہ رات دکھائی
ایشور کی ہے لیلا نیاری

کنور کومل گئی راجکماری

(۴)

ان دونوں کے دل کی خوشیاں
تاروں کے ہونٹوں پر رقصاں
ہم دونوں کے من کی آشا
تتلی بن کر باغ میں پرّاں
ہم خوش ہیں اور ساتھ ہمارے — پیتے ناچیں شاخیں جھومیں
ان کی خوشیاں کرنیں بن کر — پربت کے رخسار کو چومیں
گھڑی سہانی سماں سہانا
وہ بھی خنداں ہم بھی شاداں
تاروں کے ہونٹوں پر خوشیاں

(۵)

آج تو یہ ہے کل کیا ہوگا
رات کا جادو ٹوٹا ہوگا
چاند کے رُخ پر زردی ہوگی
تاروں کا منہ اُترا ہوگا
پھولوں پر کچھ رُوپ نہ ہوگا — تاروں میں تنویر نہ ہوگی
باتیں ہونگی کیف سے خالی — باتوں میں تاثیر نہ ہوگی
رات کا ہر اک روشن جلوہ
ماند پڑے گا پھیکا ہوگا
آج تو یہ ہے کل کیا ہوگا

(۶)

تم جاؤ گی صبح سویرے
غم ڈالے گا دل میں ڈیرے
لیکن کیوں ہو ایسا کیوں ہو
اب کیوں چنتا من کو گھیرے
کل جو ہوگا کل دیکھونگا — آج کی شب جی بھر کر جی لوں
آج تمہاری مست آنکھوں سے — مدھ کے ہنستے ساغر پی لوں
آج خوشی ہیں رونا کیسا
آج تو تم بھی پاس ہو میرے
تم جاؤ گی صبح سویرے

منظور احمد منظور
بی اے۔ ایل۔ ایل۔ بی

ڈاکو

(مشہور بنگالی فسانہ نگار پربھات بابو کا ایک بلند پایہ افسانہ)

نلنی علی پور میں پوسٹ ماسٹر تھا۔

تین بج رہے تھے۔ نلنی امید وبیم کی حالت میں اپنے دفتر میں بیٹھا تھا پوجا نزدیک آرہی تھی۔ اس نے رخصت کے لئے عرضی دی تھی مگر تاحال افسر سے کوئی اطلاع موصول نہیں ہوئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اگر پانچ بجے تک بھی رخصت کی منظوری آجائے۔ تو وہ اسی دن کی گاڑی سے عازم الہ آباد ہو جائے الہ آباد میں ان کے خسر رہتے تھے۔ اور یہ شادی کے بعد پہلی مرتبہ ان سے ملنے کے لئے جا رہا تھا۔ اس نے ضروری سامان خرید لیا تھا اس کے ٹرنک بندھے رکھے تھے صرف منظوری کا انتظار تھا۔

چار بجے ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ ٹنگ۔۔۔۔ ٹنگ۔۔۔۔ ٹنگ۔۔۔۔"

نلنی نے متوقعانہ انداز سے رسیور اٹھایا۔

"ہلو ——— !"

نہیں یہ اس کی رخصتی سے متعلق نہ تھا۔ بلکہ ایک منی آرڈر کے بارے میں استفسار تھا جس کے متعلق غلط فہمی ہوگئی تھی۔

مایوس نلنی واپس آیا اور دھم سے اپنی کرسی پر گر گیا تھوڑی دیر کے بعد اس نے اپنی جیب سے ایک خط نکالا اور پڑھنے لگا۔ یہ خط اس کی بیوی کا تھا۔

سب سے زیادہ محبوب!

آپ کا نامۂ محبت شمامہ پڑھکر آنکھوں کو سرور حاصل ہوا کتنی دلنواز خبر ہے کہ جدائی کے طویل ایام جلد ہی ختم ہونے کو ہیں۔ میرے دل کا طائر آپ کے لئے ہر وقت تڑپ رہا ہے مشتاق دید آنکھیں آپ کے لئے فرش راہ ہیں

آپ کے دامن سے بندھے ہوئے دو سال ہوگئے۔ مگر ابھی تک مجھے آپ کی خدمت کا موقع نہ مل سکا۔ رخصت ملتے ہی فوراً یہاں آئیے۔ آپ کی مایوس حیات کنیز صرف شوق دید کے سہارے جی رہی ہے۔ کنبی بالا آج ہی دیناج پور سے آئی ہے۔ رخصت کب تک مل جانے کی امید ہے؟ کیا آپ پنچمی کے روز روانہ ہو سکتے ہیں؟ میں نے آپ کا بہت وقت لیا۔ اب اجازت چاہتی ہوں۔ امید ہے کہ آپ مجھے بھول نہ جائیں گے۔

صرف آپ کی۔ سروجنی

نلنی نے وفور کیف میں مکرر سہ کرر خط پڑھا پھر تہہ کر کے جیب میں رکھ لیا۔ پانچ بجنے میں صرف ایک یا دو منٹ باقی تھے۔ کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجنی شروع ہوئی۔ نلنی نے دوبارہ رسیور کے منہ پر اپنا منہ رکھا۔

"ہاں۔۔۔۔۔"

"رخصت! رخصت!! رخصت!!!"

نلنی کو دو ہفتوں کے لئے رخصت مل گئی۔ اس کا دل الہ آباد پہنچنے کے لئے تڑپ رہا تھا۔ سالی سے ہمکلام ہونے کا خوش آیند تصور اس کے دل میں چٹکیاں لے رہا تھا۔

جب نلنی کی شادی ہوئی تو اس کی وضع قطع سے نسوانیت جھلکتی تھی۔ اس کی کلائیاں گول اور ہاتھ اتنے نرم تھے جیسے مکھن۔ رخسارے گداز اور آنکھیں شرمیلی تھیں۔ شوخ وشنگ سالی نے اسے دیکھکر پھبتیاں کستے ہوئے ٹیگور کا یہ شعر پڑھا تھا۔

"وہ یوں نظر نواز ہوتا ہے۔ جیسے سوسن۔ اور سوسن ہی اس کا نام ہے[۱]

وہ اتنا نرم ونازک ہے جیسے اس کا نام!!"

طنز وتضحیک کا ایک لفظ غیرت مند کو نصیحت کے دس الفاظ سے زیادہ مشتعل وبرانگیختہ کرتا ہے۔ بالخصوص جب وہ لفظ کسی خوبصورت عورت کے لبوں سے نکلتا ہے۔ اور اگر وہ عورت سننے والے کی سالی ہو۔ تو الفاظ کی تلخی اور تیز تر ہو جاتی ہے۔

شادی کے بعد نلنی کلکتہ واپس چلا گیا۔ اور اس کے خسر معہ اہل وعیال الہ آباد چلے گئے۔ وہ یہاں کاروبار کرتے تھے۔

شادی کو عرصہ گذر گیا۔ شادی کی کتنی ہی باتیں اس کے ذہن سے فراموش ہوگئیں۔ مگر شوخ وشنگ سالی کے تیز فقرے اس کے لوح دل سے محو نہ ہو سکے۔

نلنی ایک روز پوسٹ آفس سے واپس آکر آرام کرسی میں بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ کہ دفعتہً اس کے ذہن میں ایک خیال آیا۔ اس نے سوچا کہ اگر وہ کوشش کرے۔ تو اپنے دامن سے نزاکت کا داغ مٹا سکتا ہے

[۱] نلنی سوسن ہے

اور صحیح معنوں میں قوی ہیکل مرد بن سکتا ہے۔ وہ دوسرے دن بازار گیا تو سینڈو کے مگدر خرید لایا اور روزانہ ورزش کرنے لگا۔ اس نے کھانڈ۔ دودھ گھی اور چاول کے بجائے روٹی گوشت اور انڈے کھانے شروع کر دیئے ایک سال کی ورزش کے بعد اس کے اعضا کافی قوی ہو گئے۔ اس نے اپنے چہرہ کو پُر وقار بنانے کے لئے ڈاڑھی ترشوانا بھی ترک کر دیا۔ اور اپنے چند شکاری احباب کے ساتھ دیہاتوں میں جا جا کر بندوق چلانا بھی سیکھ لیا اور مرغابیوں۔ بگلوں اور دوسرے جانوروں کا شکار کرنے لگا۔

اس طرح دو سال کا عرصہ گذر گیا۔ اور اب نلنی وہ نلنی نہ تھا۔ اس کی پیشانی چربی سے خالی تھی۔ اس کی ٹھوڑی سخت ہو گئی تھی۔ بازو اور ٹانگیں فولاد کی طرح ہو گئی تھیں۔ اور اب وہ صحیح معنوں میں اپنے نام کے بالکل برعکس بن گیا تھا۔

اپنی شوخ سالی کے فقرے وہ اب بھی نہ بھول سکا تھا۔ وہ اکثر سوچتا اگر اپنا نام بدل کر اس سے ملوں تو خوب لطف آئے۔

نلنی دو بجے الہ آباد اسٹیشن پر اُترا۔ تنگ مہری کا پاجامہ۔ پنجابی وضع کا لمبا کوٹ اور سر پر پگڑی باندھے ہوئے تھا۔ ہاتھ میں ایک موٹی بید تھی۔ اس کے سامان میں ایک بندوق کیس بھی تھا۔ کیونکہ رخصتوں میں شکار کھیلنے کا شوق تھا۔ گاڑی سے اتر کر اس نے ادھر اُدھر دیکھا۔ اسے لینے کے لئے کوئی نہ آیا تھا۔ حالانکہ اس نے کل اپنے خسر کو تار بھیجا تھا۔

اس نے ایک قلی کو بلایا۔ اور اسٹیشن کے احاطہ سے باہر آکر بگھی والے کو بلایا اور کہا "تم مہندرا بابو پلیڈر کا مکان جانتے ہو؟"

"ہاں بابو جی آیئے۔"

نلنی بیٹھ گیا۔ اور آدھ گھنٹے کے بعد بگھی ایک مکان کے وسیع صحن میں داخل ہوئی۔ بیرونی کمرے کے برآمدے میں ایک نو دس برس کی لڑکی کھیل رہی تھی۔ قریب ہی ایک کنواں تھا جہاں ایک دیہاتی ملازم برتن مانجھ رہا تھا۔ گاڑی سے اتر کر نلنی نے اس سے پوچھا۔ "کیا یہ مہندر بابو پلیڈر کا مکان ہے؟"

"جی ہاں بابو جی"۔

"کیا وہ اندر ہیں؟"

"نہیں وہ کیدار بابو وکیل کے ہاں ڈائس کھیلنے گئے ہیں"۔

"اچھا اندر جاؤ اور کہو نئے بابو آیا ہے"۔

یہ سُنکر برآمدہ میں کھیلتی ہوئی لڑکی بھاگی ہوئی اندر گئی۔ اور جمے بابو آگیا۔ جمے بابو آگیا۔ کے شور سے سارا گھر سر پر اٹھا لیا ہے۔

ملازم نے جس کا نام رام سرن تھا مؤدبانہ انداز سے پوچھا "کیا آپ جمے بابو ہیں؟"

نلنی نے اثبات میں سر ہلایا۔ ملازم نے اپنے ہاتھ دھوئے اور قدرے جھک کر اسے سلام کیا۔ اور جلدی جلدی سامان اتار کر برآمدے میں رکھنے لگا۔ مختلف شکل وشباہت اور قد و قامت کی لڑکیاں اور لڑکے باہر نکلے اور نلنی کو دیکھنے لگے۔

رام سرن نے نلنی کو دیوان خانہ پہنچا دیا۔ اندر سے ایک لڑکی آئی۔ اور اس کے سامنے ایک گلاس پیش کرتی ہوئی بولی —— "جمے بابو آپ دور سے آرہے ہیں پیاس لگی ہوگی۔ ذرا شربت پیجیئے۔"

نلنی نے منہ سے لگاتے ہی گلاس ہاتھ سے رکھ دیا۔ یہ نمکین پانی تھا۔ لڑکیوں نے مذاق کیا تھا۔ ایک کونے میں ایک کمرے کا دروازہ کھلا۔ خادم نے پردہ اٹھایا۔ اور کہا —— "بابو جی آیئے ذرا جلپان کر لیجئے"۔ نلنی اُٹھا اور ٹہلتا ہوا زنانخانے میں داخل ہو گیا۔ درمیان میں فرش پر ایک خوبصورت قالین بچھی ہوئی تھی۔ اس کے سامنے نقرئی تھالیوں۔ پیالیوں اور گلاسوں میں کھانے پینے کی پرتکلف چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔ نلنی خاموشی کے ساتھ بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد دوسرے کمرے سے پازیبوں کی چھم چھم آواز آئی۔ ایک چھوٹی سی لڑکی دروازے میں آئی اور کہنے لگی "سالی آرہی ہے"

نلنی نے سمجھا کنبی بالا آرہی ہے۔ اس نے اپنے دائیں بازو کی آستین چڑھالی۔ تاکہ وہ دیکھ لے کہ اس کی کلائی عورتوں کی طرح اب گول نہیں ہے بلکہ فربہ اور سخت ہو گئی ہے۔ چھم چھم کی آواز اور قریب آگئی —— "بارے اتنی مدت کے بعد آپ کو ہماری یاد تو آئی" کہتی ہوئی ایک نوجوان عورت کمرے میں داخل ہوئی لیکن آنکھیں چار ہوتے ہی فوراً ساری کے پلّو سے مُنہ چھپاتی ہوئی بدحواسی کے ساتھ واپس چلی گئی۔ نلنی نے حیرت سے دیکھا یہ کنبی بالا نہ تھی۔

دوسرے کمرے سے دو تین عورتوں کی کرخت آوازیں نلنی کے کان میں آئیں —— "ارے تم واپس کیوں آگئیں؟ اتنی دور سے آئے ہوئے کے ساتھ کوئی ایسی بے رخی برتتا ہے؟"

"ارے ہمیں سنبھالو۔ یہ وہ نہیں۔ کوئی اجنبی ہے.... باہر نہ جانا...."

اس نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"کیا کہا —— ؟ کوئی اجنبی......؟"

"کیا ہمارا سرت نہیں ہے؟"

"نہیں سرت کیوں ہونے لگا؟"

"تو پھر یہ کون ہے؟"

"میں کیا جانوں؟"

"آخر کون ہے؟ کوئی رہزن ہے۔ ڈاکو ہے.....؟"

"اتنا قوی ہیکل موٹا موسٹنڈا ڈاکو ہو تو تعجب کیا ہے؟"

ایک لڑکے نے گھر میں چپکے سے آکر کہا ــــ ارے وہ ایک بندوق بھی لایا ہے۔"

"کیا کہا ــــ بندوق ــــ؟ آہ ہم لٹ گئے..... برباد ہو گئے۔ ارے او رام سرن! رام سرن! کہاں چلا گیا؟ دوڑ اور بابوجی کو جلدی سے بلا لا....."

اسی دوران میں نلنی کی نگاہیں کتابوں کی الماری پر گئیں۔ قانونی رپورٹوں کی مجلد کتابیں بالترتیب رکھی ہوئی تھیں۔ اور ان کی پشت پر طلائی رنگ سے "ایم۔ این۔ گھوش" کا نام کندہ تھا۔

نلنی ایک ہی لمحہ میں معاملے کی تہ تک پہنچ گیا۔ اسے سخت غلط فہمی ہوئی۔ اس کے خسر کا نام مہندر انا تھ بنرجی تھا۔ اور یہ مکان مہندرا ناتھ گھوش کا تھا۔ وہ غلطی سے دوسرے مکان میں آگیا تھا۔ اس بیجا مداخلت کے احساس سے وہ کسی قدر فکر مند ہوا اور جلدی جلدی کھانا کھا کر فارغ ہو گیا۔

رام سرن ہانپتا ہوا اپنے مالک کو اس حادثہ کی اطلاع دینے کے لئے دوڑا۔ آج تعطیل تھی۔ اور کئی کھلاڑی کیدار بابو کے ہاں اکٹھے ہوئے تھے مہندرا بابو گھوش اور مہندرا بابو بنرجی بسین بابو چٹرجی۔ کھیل خوب جما ہوا تھا۔ رام سرن اپنے بابوجی کو دیکھتے ہی چلایا ــــ بابوجی! بابوجی! جلدی گھر چلئے۔" اس کا چہرہ متوحش اور خوفزدہ تھا۔

مہندرا بابو نے دریافت کیا ــــ "کیوں کیا بات ہے؟ کوئی بیمار ہو گیا ہے"

"اے..... اے..... ایک..... ڈاکو..... آگیا..... ہے..... آپ کے گھر"

گھوش بابو نے گھبرا کر پوچھا ــــ "ڈاکو.....؟ ڈاکو.....؟ دن دہاڑے ڈاکو.....؟"

"ہاں بابوجی ڈاکو۔ یا کوئی ٹھگ یا پاگل ہو۔ کون جانے۔ وہ کہتا ہے۔ میں بابوجی کا داماد ہوں۔"

ملازم کی بات سنکر سب کھل کھلا کر ہنس پڑے لیکن مہندرا گھوش نے اسی بد حواسی کے عالم میں پوچھا ــــ "وہ کب آیا ہے؟ کیا کر رہا ہے؟"

"تین بجے آیا ہے۔ ایک بندوق اور لاٹھی ساتھ لایا ہے۔ زنانخانے میں گھس کر بیٹھا ہے۔ عورتیں بہت ہراساں ہیں۔" رام سرن ایک ہی سانس میں کہہ گیا۔

"وہ ایک بندوق اور لاٹھی بھی لایا ہے پاجی؟ تو گھر کس کی حفاظت پر چھوڑ کر آیا ہے؟"

مہندرا بابو ڈرتے سہمتے تیز قدم اٹھاتے گھر کی طرف چلے۔ اور دروازے پر پہنچ کر باہر ہی سے لڑکھڑاتی ہوئی آواز سے بولے "کہاں ہے ڈاکو.....؟"

نلنی کمرے سے نکل کر برآمدے میں آگیا۔ اور سنجیدگی سے سلام کرتے ہوئے پوچھا ــــ "کیا آپ مہندرا بابو ہیں؟ میں آپ سے معافی کا خواستگار ہوں"

متوحش نگاہوں سے دیکھتے ہوئے مہندرا بابو نے پوچھا ــــ "تم کون ہو ــــ؟"

میرا نام نلنی کانت مکر ہے۔ مہندرا بابو بنرجی میرے خسر ہیں۔ میں نے بگھی والے سے کہا تھا کہ مجھے مہندرا بابو پلیڈر کے گھر پہنچا دے۔ وہ مجھے یہاں لے آیا۔ کتابوں پر آپ کا نام دیکھ کر ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے اپنی غلطی محسوس کی۔ میں اب تک یہاں سے چلا گیا ہوتا لیکن ملازم آپ کو بلانے کے لئے گیا تھا۔ اس لئے میں نے سوچا کہ جانے سے پہلے آپ سے معافی مانگ لوں....." نلنی نے لجاجت آمیز انداز سے کہا۔

مہندرا بابو کا غصہ کافور ہو گیا۔ انہوں نے نلنی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر ایک طویل قہقہہ لگاتے ہوئے کہا ــــ "ایک ہی نام کے دو وکیل ہونے کی وجہ سے بعض اوقات موکلوں میں بھی غلط فہمی ہو جایا کرتی ہے۔ لیکن یہ پہلا موقعہ ہے کہ دامادوں کے متعلق بھی غلط فہمی ہو گئی ہے۔"

مہندرا بابو نے کرایہ کی ایک گاڑی منگوا دی۔ اور تھوڑی دیر کے بعد نلنی انہیں سلام کر کے گاڑی میں بیٹھ گیا۔

مہندرا بابو کے چلے جانے کے بعد کیدار بابو کے ہاں تاش کا کھیل بند ہو گیا۔ اور لوگ مکاروں اور دغابازوں کے حیرت انگیز اور پُر فریب قصے بیان کرنے لگے۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے مجلس برخاست ہو گئی۔

مہندرا ناتھ بنرجی شاہ گنج کوارٹر میں رہتے تھے۔ گھر واپس آکر انہوں نے ملازم سے چائے اور حقہ طلب کیا۔ اور بیٹھک میں آرام کرسی پر لڑھک کر چسکی لگائی۔ چائے پی۔ ملازم نے حقہ پر ایک بڑی چلم رکھ دی۔ اور پنکھے کی ہوا دینے لگا۔ تاکہ آگ بھڑک اٹھے۔ چائے ختم کر کے انہوں نے حقہ کی

نے مُنہ میں لے لی۔ اور وفورِ کیف میں آنکھیں بند کرلیں۔

تھوڑی دیر کے بعد ایک کرائے کی گاڑی ان کے احاطہ میں داخل ہوئی۔ چونکہ یہ ایک مشہور وکیل تھے۔ کتنے لوگ آیا جایا کرتے تھے۔ اس لئے انہوں نے کوئی خاص توجہ نہیں کی۔ صرف ایک بار نیم وا آنکھوں سے دیکھا۔ ساتھ ہی ایک نامانوس آواز کانوں میں آئی ــــ "کیا مہندرا بابو کا یہی مکان ہے ــــ؟"

"جی ہاں۔ کہئے کیا کام ہے؟"

"اندر خبر کردو کہ بابو جی کا داماد آیا ہے۔"

"داماد کا لفظ سُن کر مہندرا بابو اپنی کرسی سے گھبرا کر اُٹھے۔ کھڑکی کا پردہ اوپر اٹھا کر باہر دیکھا۔ ایک مضبوط و توانا شخص سامنے نظر آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بڑی لاٹھی تھی۔ اور ڈرائیور بگھی میں سے بندوق کا کیس نکال رہا تھا۔ مہندرا بابو چلاتے ہوئے برآمدے میں آئے ــــ کوئی ہے؟ ارے کوئی ہے...... ؟"

ان کی متوحش صورت دیکھکر نلنی گھبرا گیا کہ کیا قصہ ہے؟

مہندرا بابو خوف اور غصہ سے کانپتے ہوئے بولے ــــ "ابھی چلا جا..... سب جگہ سے گھوم کر میرے گھر آیا ہے؟ جھوٹا مکار۔ بدذات۔ بدمعاش داماد بن کر آیا ہے ــــ؟"

مہندرا بابو کی چیخ ولیکار سُن کر سارے ملازم جمع ہو گئے۔ انہوں نے للکار کر کہا ــــ "باہر نکالو اس کو۔ اس کی گردن پکڑ کر دھکیل دو۔"

نوکروں کا رُخ دیکھکر نلنی سمجھ گیا کہ جان کی خیر نہیں۔ اس لئے اس نے اپنی لاٹھی گھمانا شروع کی۔ اور کہتا ہوا آگے بڑھا ــــ "میں جا رہا ہوں لیکن کوئی میرے پاس آیا۔ تو ہڈیاں توڑ کر رکھدوں گا۔"

نلنی کی سرخ سرخ آنکھیں اور غصہ سے تمتمایا ہوا چہرہ دیکھکر سارے ملازم خاموش ہو گئے۔ اور حیرت سے اس کا منہ تکنے لگے۔ نلنی نے مہندرا بابو سے پھر کہا ــــ "آپ کو غلط فہمی ہو رہی ہے۔ میں آپ کا داماد نلنی ہوں۔"

مہندرا بابو طیش میں آکر بولے ــــ "جھوٹا کہیں کا۔ تو اپنے سسر کو پہچانتا ہے۔ میں اپنے داماد کو نہیں پہچانتا؟ کیا میرا داماد تمہاری طرح غنڈہ ہے؟ یہاں سے فوراً چلا جا۔ ورنہ پولیس کو بلواتا ہوں۔"

سرپھرے خسر کی باتیں سن کر نلنی کچھ نہ بولا۔ اور گاڑی میں بیٹھ کر اسٹیشن کی طرف واپس چلا گیا۔

تمیا کو چل جانے کے بعد مہندرا بابو زنانخانے میں گئے۔ ان کی بیوی نے پوچھا ــــ "کیا تم پاگل تو نہیں ہو گئے ہو؟ اپنے داماد کو بگڑ کر بھگا دیا؟"

مہندرا بابو نے سنجیدگی سے کہا ــــ "تم کسے اپنا داماد کہہ رہی ہو؟ اس فریبی مکار غنڈے کو؟"

"تمہیں کیسے معلوم کہ وہ مکار اور فریبی تھا؟"

انہوں نے کیدارا بابو کے ہاں سُنا ہوا قصہ دُہرایا اور کہا "تم ہی بتاؤ جھوٹا۔ فریبی اور غنڈہ نہیں تھا تو اور کون تھا؟"

جب ایک ہی نام کے دو وکیل ہیں اور دونوں بنگالی ہیں۔ تو کیا یہ ممکن نہیں کہ وہ غلطی سے دوسرے کے ہاں چلا گیا ہو ــــ؟"

بیوی کی باتیں سُنکر مہندرا بابو کا ذہن بھی حقیقتِ حال کی طرف منتقل ہوا۔ اور انہیں افسوس ہونے لگا۔ کہ چھڑی اور بندوق دیکھ کر بدحواس کیوں ہو گئے۔ اور انہوں نے ٹھنڈے دل سے اس کی باتوں پر غور کیوں نہیں کیا؟

کچھ دیر سوچنے کے بعد انہوں نے کہا ــــ اگر وہ میرا داماد ہوتا تو کم ازکم اپنے آنے سے پیشتر کوئی اطلاع دیتا۔ اور ہم لینے کے لئے اسٹیشن جاتے کیا ایک داماد پہلی بار اپنی سُسرال اسی طرح آتا ہے؟ نہ کوئی اطلاع نہ خبر۔ وہ ضرور کوئی مکار تھا۔ تم عورت ذات کیا سمجھو۔ اس نے ہمیں ٹھیک تاریخ نہیں لکھی تھی۔ پھر بھی اس کے آنے کا امکان تھا۔ ہم جانتے تھے کہ وہ پوجا سے پہلے آ رہا ہے۔ اس کا آنا تعجب کی بات نہ تھی۔"

اپنے والد کو اس طرح تذبذب میں دیکھکر کبنی بالا نے کہا ــــ "وہ نلنی ہرگز نہیں ہو سکتا۔ میں نے اسے دیکھ لیا تھا۔"

مہندرا بابو نے پوچھا ــــ "کیا تم نے اسے دیکھا تھا؟ بتاؤ..... بتاؤ..... تم نے اسے کہاں سے دیکھا؟"

لوگوں کا شور وغل سنکر میں سیڑھی پر گئی۔ تو اس نے گھورتے ہوئے دیکھا تھا۔ ہمارا نلنی تو نرم و نازک گڑیا کی طرح مکھن کا بنا ہوا ہے میں نے ایک ہٹا کٹا غنڈہ دیکھا۔"

مہندرا بابو نے اس کے بیان کی تائید کرتے ہوئے کہا "درست کہتی ہو میں نے اس کے منہ پر کہہ دیا تھا کہ بدمعاش غنڈے یہاں سے نکل جاؤ۔ ہمارا داماد تو ایک نرم و نازک خوش وضع شریف صورت نوجوان ہے۔ یہ صحیح ہے کہ میں نے صرف شادی کے روز اسے دیکھا ہے۔ لیکن اتنا بیوقوف اور اندھا نہیں ہوں کہ اس کے بارے میں غلطی کر جاؤں۔"

اسی گفتگو کے دوران میں ایک ملازم نے آکر مہندرا بابو کے ہاتھ میں ایک تار دیا۔ اسے پڑھتے ہی ان کا چہرہ زرد ہو گیا۔ یہ نلنی کا بھیجا

ہوا تا رہتا تھا۔ جو ڈاک خانہ کے کارکنوں کے تساہل سے قدرے ... ملا تھا۔

مہندرا بابو کی بیوی نے پوچھا "کیوں کیا چیز ہے؟"

ایک مجرم کی طرح انہوں نے اپنا سر کھجلاتے ہوئے کہا "یہ نلنی کا تار ہے۔ وہ یقیناً ہمارا داماد تھا"

ان کی بیوی نے ترش رُو ہو کر کہا — "اب کیا کیا جا سکتا ہے؟ ہم اسے کیسے واپس لا سکتے ہیں؟"

"میں جا رہا ہوں جس طرح ہوگا منا لاؤں گا۔ اس نے گاڑی والے سے اسٹیشن چلنے کو کہا تھا۔ وہ یقیناً گاڑی کے انتظار میں وہیں ہو گا"

نلنی جب واپس آیا۔ تو اس نے گذری ہوئی باتوں کا کنایۃً بھی تذکرہ نہ کیا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ گھر والے بے انتہا نادم اور متاسف ہیں۔ ہاں ایک روز بر سبیل تذکرہ اس نے صرف اتنا کہا۔ کہ ایک دوسرے شخص کے خسر کے گھر میری جو خاطر تواضع ہوئی۔ بسا اوقات لوگ اپنے سسرال میں اس سے محروم رہتے ہیں—!!

مترجمہ

مولانا امام الدین رام نگری

مختصر ترین افسانہ

یورپ اور امریکہ میں عوام میں ادبی شغف قرون وسطی سے آج تک کسی زمانے میں بھی انحطاط پذیر نہیں ہوا۔ اور ادبی رسائل کے مدیران کو مذاق عامہ کے معیار کے مطابق ادبی سامان مہیا کرنے کے خیال نے ہمیشہ ایک کشمکش مسلسل میں مبتلا رکھا ہے۔ وہ کبھی اپنے سرپرستوں کی طرف سے غافل نہیں ہوتے۔ اور وہ ہمیشہ اس چیز کے قائل رہے ہیں۔ کہ تنوع ہی سے دلچسپی قائم رکھی جا سکتی ہے۔ ادبی تجربے وہاں کے مصنفین کے مقصد حیات کا ایک اہم جزو بن چکے ہیں۔

فن افسانہ نویسی میں بیسیوں اقسام کا تجربہ کیا گیا۔ جذباتی، نفسیاتی، دیہاتی، غرضکہ ان کے ادب میں ہر قسم کے "نئے" افسانے لکھے گئے۔ اور اور مختلف اقسام ابھی ظہور پذیر ہو رہی ہیں۔ جدت پسند طبقہ ان میں ہر عہد میں موجود رہا ہے۔ اور وہ لوگ ادب کے پانیوں کو ہمیشہ حرکت میں دیکھتے ہیں۔

مدت کی بات ہے کہ ایک ادبی جریدے کے جدت پسند مدیر نے اپنے خریداروں کے شوق کو تازہ کرنے کے لئے اشتہار دے دیا کہ ایک مختصر ترین افسانہ لکھنے والے کو گراں قدر انعام دیا جائے گا۔ چنانچہ اس کے جواب میں بے شمار "بونے" افسانے موصول ہوئے۔ چند افسانے انعامات کے مستحق قرار دیئے گئے۔ لیکن جس افسانے کو بہترین سمجھ کر اول درجے کا انعام دیا گیا۔ وہ یہ تھا۔

دو آدمی ریل میں سفر کر رہے تھے
ایک نے دوسرے سے پوچھا "کیا
تم نے بھوت دیکھا ہے؟" اور کہہ کر
غائب ہو گیا۔

واصل

نیا ادب

الفاظ اپنی ذات میں دو قسم کے معانی رکھتے ہیں۔ ایک تو لغوی معنی جو ہر لغت میں ملتے ہیں۔ اور دوسرے صوری و صوتی معنی صوری و صوتی معنی معلوم کرنے کے لئے سوائے ذوق سلیم اور گوش حساس کے اور کوئی لغت نہیں ہے مثلاً ہوا کی سرسراہٹ۔ گاڑی کے پہیوں کی کھڑکھڑاہٹ۔ نثر میں ایک خیال کے اظہار کے لئے ہم الفاظ عموماً ان کے لغوی معنوں کے پیش نظر استعمال کرتے ہیں۔ لیکن اس کے برعکس نظم میں ایک خاص تاثر پیدا کرنے کے لئے الفاظ کے لغوی معانی کے ساتھ ساتھ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں۔ کہ ان کی آواز اور صورت کسی حد تک مطلوبہ تاثر کو عمیق تر کرنے میں مدد دیتی ہے یہی جستجو الفاظ اور انتخابِ الفاظ میں حد فاصل قائم کرتی ہے۔

جب ہم چند ہم معنی الفاظ پاتے ہیں۔ تو جس لفظ کی آواز نظم میں مطلوبہ ماحول یا تاثر پیدا کرنے میں سب سے زیادہ ممد ثابت ہوتی ہے۔ ہم اسے اختیار کر کے باقی الفاظ کو ترک کر دیتے ہیں۔

جدید شاعری میں، انتخاب الفاظ کے لحاظ سے، میں مندرجہ ذیل نظم کی طرف آپ کی توجہ مبذول کراتا ہوں۔ اس وقت نظم کے کامیاب یا ناکامیاب ہونے سے بحث نہیں ہے۔ میں اس نظم کی مدد سے فن شعر کے صرف ایک ہی پہلو (انتخاب الفاظ) پر روشنی ڈالنا چاہتا ہوں۔ آپ پہلے نظم پڑھئے۔

وحشی

۱۔ گرمیوں کی چلچلاتی دھوپ میں
۲۔ اس طرح لیٹے ہوئے تھے خانقاہوں کے جنوں پرور کھنڈر
۳۔ یاس کے سائے تلے سستا رہی ہوں جس طرح۔
۴۔ حسرتِ ناکام کی درد آفریں بے تابیاں،
۵۔ ہر طرف بکھری پڑی تھیں شور آلودہ سی اینٹیں اور بوڑھی ہڈیاں۔
۶۔ وقت کے موہوم پاؤں کے نقوش
۷۔ اک طرف دو دیو پیکر "جھرجھرائے" ون کھڑے۔
۸۔ سر ملائے کر رہے تھے جانے کیا سرگوشیاں
۹۔ اور سن کر کھڑکھڑاتی پتیوں کی جھانجھنیں
۱۰۔ جا بجا منڈلا رہے تھے گرد پیکر گردباد،
۱۱۔ جیسے بچوں کے خیال آباد میں
۱۲۔ الف لیلہ کے ہوں جادو کے محلوں کے ستون لہرا رہے،
۱۳۔ تن برہنہ بال ریچھوں کی طرح۔
۱۴ اور اک انداز استغنا، لئے با
۱۵۔ اس طرح اک ڈھیر پہ بیٹھا تھا وہ
۱۶۔ جس طرح مردار کھا کر اونگھتا سا گدھ کوئی،
۱۷۔ ٹھنٹھناتا جا رہا تھا شور آلودہ سی اینٹوں کو وہ اک ہڈی سے پیہم
۱۸۔ ——————— بے خبر ہر بات سے!

(ماخوذ از ادبی دنیا) انجم رومانی

شاعر نے ہمیں مصرعہ ۱۳ کے لئے یعنی وحشی کے "تن برہنہ" "بال ریچھوں کی طرح" دکھلانے کے لئے پہلے بارہ مصرعوں میں الفاظ کے ذریعے ہماری کامیاب رہنمائی کی ہے۔ درشت اور بیم افزا ماحول پیدا کرنے کے لئے "چلچلاتی دھوپ" اور پھر "خانقاہوں کے جنوں پرور کھنڈر" کا وحشت خیز تاثر اور اس تاثر کو عمیق تر کرنے کے لئے الفاظ کی صوتی معاونت قابل ستائش ہے "کھنڈر" کے ہم معنی الفاظ خرابہ یا ویران کدہ موجود ہیں۔ لیکن ان کی آواز میں نرمی ہے۔ اور کھنڈر کے لفظ کی آواز اپنے اندر کس قدر وحشیانہ ہیبت رکھتی ہے۔ جیسے کوئی بہت بڑا ستون یک لخت گر جائے "اینٹیں اور بوڑھی ہڈیاں" کے لفظی قرب نے منظر کو کتنا "جنگلی" بنا دیا ہے۔ "کھڑکھڑاتی پتیوں کی جھانجھنیں" ہمارے کانوں میں ایک مسلسل دھماکے کی آواز پیدا کر رہی ہیں۔ اور ہماری نگاہیں کسی وحشتناک منظر کی منتظر ہیں۔ دل احساس کے تعطل کے بوجھ سے دبا جا رہا ہے۔ اور اس احساس کے تعطل کو مصرعہ ۱۱ اور مصرعہ ۱۲ عمیق تر کر دیتے ہیں: "الف لیلہ کے ہوں جادو کے محلوں کے ستون لہرا رہے" سے گذر کر آنکھیں پھاڑے ہوئے ہم اس لفظی تصویر کی مرکزی ہستی پر جا پہنچتے ہیں۔ اور دیکھتے ہیں کہ "وہ تن برہنہ بال ریچھوں کی طرح" "اور اک انداز استغنا لئے ایک ڈھیر پہ بیٹھا ہے۔ بیٹھنے کی جگہ کے لئے ڈھیر میں جو لفظی اور صوتی موزونیت اور وحشیانہ شوکت کا اندازہ کرنے (بقیہ مضمون دیکھیں صفحہ ۴۵ کے نیچے)

سیاسیات حاضرہ

ایڈولف ہٹلر

(بیسویں صدی کا سب سے بڑا فتنہ کار)

اس دہشت بار جنگ سے ایک سال پیشتر یورپ کے ادبا اور مفکرین نے ہٹلر کی شخصیت سے متعلق زیادہ اعتنا کی ہے۔ اسی طرح انہوں نے اجتماعی زندگی اور دنیائے تہذیب کے جرمن تصور پر قلم اٹھایا۔ یہاں تک کہ یورپ اور امریکہ کے اہل قلم کا عام موضوع بحث جرمنی اور اس کا ڈکٹیٹر بن گئے۔ ان ادبا میں جی ہش ایڈورڈ بھی ہیں جنہوں نے اس مشترکہ موضوع سے بہت زیادہ دلچسپی لی ہے۔ ذیل میں ہم ان کا ایک مقالہ جس کا عنوان ہے "بیسویں صدی کا سب سے بڑا فتنہ کار ایڈولف ہٹلر" ہدیۂ نگاہ کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ وہ اپنے مقالے کو ان الفاظ سے شروع کرتے ہیں کہ:۔

"تم بتا سکتے ہو کہ آج جرمنی کس اضطراب میں زندگی بسر کر رہا ہے؟"

"کیا تمہیں اندازہ ہے کہ جرمنی میں موجودہ خلفشار کے نتائج کیا ظہور پذیر ہو سکتے ہیں؟"

یہ سوالات ہیں جو جرمنی میں یورپ کے سفیروں کے دماغوں میں پیدا ہو رہے ہیں۔

لیکن ٹھہرو! تم پر وہاں کے حالات کی اصلی حقیقت ابھی ظاہر ہوئی جاتی ہے۔

پہلے تم مجھے اجازت دو۔ کہ خود تم سے ایک سوال پوچھوں"

کیا تم اپنے تخیل کی آخری پرواز میں بھی یہ تصور کر سکتے ہو کہ انگلستان میں ایک کسان کا بیٹا جس کے دردناک ماضی مضطرب حال اور مایوس مستقبل کی کیفیت جرمن ڈکٹیٹر سے ملتی ہو۔ جو شاہراؤں پر ہٹلر کی طرح کارٹ بوستان کی تصویریں بیچتا پھرتا ہو۔ اور اس طرح لوگوں کی جیب سے خیرات کے پیسے وصول کر کے نان شبینہ حاصل کرتا رہا ہو۔ جس کے شکستہ اور میلے کپڑے کسی موسم کی مصیبتوں کے بھی پردہ دار نہ بن سکے ہوں جس نے اپنی گمنام زندگی میں افلاس و بے نوائی کی وہ وہ کٹھن گھڑیاں بسر کی ہوں۔ جو کسی آوارہ روزگار پر بھی نہ گذری ہوں گی۔ اور پھر دس سال سے بھی کم مدت میں کامیابی اور عروج کی بے کراں وسعتوں کو اس طرح پھلانگ گیا ہو۔ یقیناً تم انگلستان اور اس جیسے تدریجی ارتقا کے خوگر ممالک میں اس [illegible] ٹے کو خرق عادت خیال کرو گے۔ لیکن ہٹلر کے معاملہ میں یہ محال بھی ممکن ہو گیا۔ وہ تھوڑی سی مدت میں حضیض نکبت سے اُٹھا اور اپنے عروج کی آخری بلندیوں پر ایک چھلانگ لگا کر پہنچ گیا۔ آج وہ کسان کا گمنام اور بھکاری بیٹا اس اقتدار کا مالک نظر آتا ہے۔ کہ بڑے بڑے جنرلوں کے عزل و نصب میں اس کا اشارہ قانون بن رہا ہے۔ اس نے جرمنی میں اس قدر رفعتوں پر تسلط جما لیا ہے کہ قیصر ولیم اپنے عہد عروج میں بھی کبھی اس نفوذ و رسوخ کا مالک نہ بن سکا تھا کیا تمہارا تصور اس منظر کو انگلستان میں بھی دیکھ سکتا ہے؟

اس کا جواب آسان اور واضح ہے۔ اور وہ یہ کہ عظمت و اقتدار کی یہ چھلانگیں انگلستانی زندگی کے لئے موجب حیرت ہو سکتی ہیں، حق یہ ہے کہ ہمارے منطقے میں ہر وہ واقعہ جسے عقل محال اور وجدان ناممکن الوقوع خیال کرے۔ جرمن فضاؤں میں اُمور عادیہ کی طرح عامۃ الوقوع بن سکتا ہے بلکہ بن جاتا ہے۔ لیکن ایسے محیر العقول واقعات کا ظہور جرمن میں گذشتہ جنگ عظیم کی ہولناک ہزیمت کے بعد سے ممکنات میں شامل ہو گیا ہے۔ اس طرح ان کا انجام بھی ان حوادث کی طرح یقینی بن گیا ہے۔ کیونکہ ۱۹۱۸ء کی ہزیمت کے بعد سے جرمنی مستمر فسادات و بدنظمی کا مستقل گہوارہ ہو رہا ہے ان فسادات اور مسلسل بدامنی کے زیر سایہ ایسے خارق عادات واقعات کا وہاں ظہور ہوتا رہتا ہے۔

گزشتہ جنگ عظیم کی ذلیل اور گراں بار شکست نے اہل جرمنی کے غرور و کبریائی کو بری طرح چکنا چور کر دیا تھا۔ وہ اس زعم کو یقین بنائے ہوئے میدان میں لڑ رہے تھے کہ کوئی دن میں جرمن قوم تمام یورپ کی سیادت حاصل کر لے گی۔ اور جرمنوں کا وہ خواب شیریں جو ان کے پیشرو دیکھتے دیکھتے تابوت کی امانت بن گئے۔ اپنی شیریں تعبیر کو ہمارا الوشتۂ تقدیر بنا دے گا وہ

اپنے تابناک مستقبل کو دیکھ دیکھ کر سرشار ہو رہے تھے۔ کہ گردش ایام کے ایک ہی پلٹے نے انہیں عروج آسمان سے عمیق ترین پستی سے ہمکنار کر دیا۔ اس ناقابل برداشت احساس ندامت وشرمساری کے ساتھ ان کے دل اپنے لاکھوں نوجوانوں کی موت۔ لاکھوں ہی زخمی ہموطنوں کی چیخ وپکار اور لاکھوں ہی یتیموں اور بیواؤں کے بین وبکا سے پاش پاش تھے۔ رہی سہی کسر ان جانگسل مصائب نے پوری کر دی جن میں ہزیمت کے عقاب ونکال کے طور پر ان پر وقت نے مسلط کر دیا یعنی ایک زہرہ گداز خوف ودہشت جرمن قلوب پر حاوی ہوگئی۔ ایک عام قحط نے انہیں قوت لایموت سے محروم کر دیا۔ اس پر تاوان جنگ اس بے کراں مقدار میں ان پر عائد کیا گیا کہ شکست سے چکنا چور جرمنی اس کا سود بھی ادا کرنے کے قابل نہ رہی۔ لاکھوں جرمن باشندے نان شبینہ سے محتاج ہو گئے۔ ان کے رہنے اور شب بسری کے لئے زمین کے فرش اور آسمان کی چھت کے سوا سر چھپانے کو کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ اقتصادی پامالی بڑھتے بڑھتے اس قدر بڑھی کہ جرمنی کا سکہ (مارک) دنیا کے بازار کی خاک کے ہم قیمت بن گیا۔ فاقہ کش جرمن مرد اور عورتیں اپنے بیش بہا سامان راحت وآسائش کو کوڑیوں کے بھاؤ فروخت کر رہے تھے۔ جرمن زندگی کے لئے ہر صبح کا سورج ایک قہاری لے کر طلوع ہو رہا تھا۔ دیروز گذشتہ سے امروز حال اور امروز حال سے فردائے مستقبل ان کے لئے تاریک سے تاریک ترین کر آ رہا تھا۔ امن فضائے جرمنی سے عنقا صفت معدوم تھا آفاق ملک پر مصائب ومضائق کے گھٹا ٹوپ بادل چھا رہے تھے۔ یاس وقنوط قلوب کی فضاؤں میں اتھر کی طرح پھیل رہے تھے اور سارا جرمنی قحط وگرسنگی کے سبب ہڈیوں کا ایک انبار بن کر رہ گیا تھا۔ ان عبرانیوں (یہود) کی صورت جو فلسطین میں ہیکل کی دیوار گریہ کو چمٹ کر روتے رہتے ہیں جرمن باشندے بھی زندگی کو زار نالی میں بسر کر رہے تھے۔ ان ہولناک ساعتوں میں جبکہ زندگی کی خواہشیں ناامیدی ویاس کے طوفانی جھونکوں سے غبار راہ بن گئی تھیں ایک شخص کی صورت میں جرمن زندگی طوفان کی صورت میں ابل پڑی۔ یہ وہی واستاکی گلیوں کا تصویر فروش فقیر تھا جس نے افلاس وفقر کی گود میں آنکھ کھولی تھی۔ جسے زندگی نے شکم سیری سے محروم اور ستر پوشی سے ناچار بنا رکھا تھا اس کی افسردہ ہڈیوں میں برقی اور جامد رگوں میں خون زندگی گردش لے رہا تھا وجس کے ادراک وشعور نے احساس خودی کو بیدار کر کے اس کی نظری طاقتوں میں وہ بالیدگی بخش دی جو کبھی "جون آف آرک" پر الہامی پیغام بن کر طاری ہوتی تھی۔

ایڈولف ہٹلر نے جرمنی کی شکست کی خبر اپنے بستر مرض پر سنی۔ اس وقت وہ ایک اسپتال میں زیر علاج تھا۔ اس المناک خبر نے اس کے نظام زندگی کو درہم برہم کر دیا۔ وہ بے اختیار رو پڑا۔ اور روتے روتے اس کی ہچکی بندھ گئی۔ وہ اس قومی رسوائی سے تڑپ اٹھا۔ راتوں کی نیند اس کی آنکھوں کے لئے حرام ہوگئی۔ وہ دن رات اپنے قومی مصائب پر غور وخوض میں مشغول رہنے لگا۔ ۱۹۱۹ء کی گرمیوں میں اس نے میونخ کی ایک سرائے میں جو ایک سڑک کے کنارے بنی تھی۔ ایک اجتماع میں تقریر کی۔ یہ جلسہ صرف بارہ نفوس پر مشتمل تھا۔ اس نے اپنی آتشیں تقریر میں حاضرین کو بتایا کہ جرمن حکام کی کن ارادی غلطیوں کے سبب یہ شکست نصیب ہوئی۔ اور اس کے بعد کن ذلیل ورسوا کن شرائط صلح سے ملک کو کن مصائب سے دو چار ہونا پڑ رہا ہے۔ اس تقریر نے اس مختصر سے مجمع پر جادو کا سا اثر پیدا کیا۔ اور اسی وقت ایک سوسائٹی کی تشکیل عمل میں لائی گئی۔ اور ہٹلر کو اس سوسائٹی کا صدر بنایا گیا۔ اس کے بعد وہ جلد ہی عام اجتماعات میں آ گیا۔ اور اس نے اپنی آتش بیانیوں سے عوام میں بے حد اثر ورسوخ پیدا کر لیا ہمیں اس کا اعتراف کر لینا چاہئے کہ جرمن کی نامراد ومایوس قوم میں ہٹلر کی تقریروں نے جماعت وحمیت کی روح پھونک دی اور پھر جرمن باشندہ اس حالت میں نظر آنے لگا۔ جیسے وہ ایک طویل خواب سے ہڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوا ہے پرواز طائر کی طرح وہ جرمن آفاق پر گھوما۔ اس نے ان کی ذہنیت کو سمجھا اور ان کی خواہشوں کا جائزہ لے لیا۔ اس نے انہیں میں سے ایسے ایسے جوان کار افراد کو چن لیا۔ جو تربیت پانے کے بعد اس کی قوت بازو بنے اور جنہوں نے ساری قوم کو احساس حمیت سے قومی عروج کی بازگشت کے لئے آتش زیر پا بنا دیا۔ یہاں تک کہ ۱۹۱۹ء کی میونخ کی تشکیل یافتہ سوسائٹی کے بارہ افراد بڑھتے بڑھتے ۱۹۳۲ء میں ۱۵ لاکھ تک پہنچ گئے۔

وہ اگرچہ اس سال ہنڈنبرگ کے مقابلہ میں کامیاب نہ ہوا۔ لیکن یہ ناکامی اس کے جوش حرارت کو کم نہ کر سکی۔ اور چند ہی ماہ کے بعد جبکہ مارشل ہنڈنبرگ کو ایک مشیر (وزیراعظم) کی ضرورت تھی۔ ساڑھے بائیس لاکھ ووٹ لے کر جرمنی کا وزیراعظم بن گیا۔

اس انتخاب میں اس کی جماعت کو رشیناغ (جرمن پارلیمنٹ) میں ۲۳۰ نشستیں حاصل ہوئیں۔ مارشل ہنڈنبرگ اگرچہ میدان جنگ کا دیوتا تھا لیکن یہ بوڑھا سپاہی زندگی بھر سیاسیات کے مدوجزر کو دیکھ دیکھ کر ایک سیاس کی حیثیت میں ایک اعتدال پسند واقع ہوا تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ جرمنی معاہدات کی پابندیوں کے مطابق رہتے ہوئے تدریجی طور پر اپنی جنگی غلطیوں کی تلافی کرے۔ اور ۷۵ سال کی مدت میں میانہ روی

کی راہ پر گامزن رہ کر اپنا کھویا ہوا اقتدار وعروج حاصل کرلے ہٹلر کی جماعت کا طوفان اس کی راہ میں سنگ راہ نہ بنتا۔ تو وہ اپنے نصب العین کو یقیناً اس خوبی سے حاصل کرسکتا کہ دنیا کی کسی قوم اور کسی حکومت کو بھی اس سے وجہ پرخاش پیدا نہ ہوتی۔ خود برطانیہ عظمیٰ نے فرانس واطالیہ کی سخت گیریوں کے علی الرغم جرمن قوم کے اقتدار کو بحال کرنے میں اس کی مسلسل مدد کی۔ برطانوی قوم جرمنی سے انتقام لینے اور اُسے اس حد تک بے بس کرنے کے خلاف تھی۔ کہ وہ کبھی سنبھلنے کا موقعہ ہی نہ پاسکے۔ بگر ہٹلر اعتدال پسندی اور میانہ روی کو قومی کمزوری خیال کرتا تھا۔ اس نے وزارت عظمےٰ کے منصب پر پہنچتے ہی جرمن چانسلر مارشل ہینڈنبرگ کو آنکھیں دکھانی شروع کردیں۔ مارشل موصوف نے یہ رنگ دیکھا۔ تو اپنی عزت بچانے کی خاطر چانسلرشپ سے مستعفی ہوکر سیاسی زندگی سے دستکش ہوگیا۔ اس کے ریٹائر ہونے کے بعد ایڈولف ہٹلر کو پادرازی کے لئے ایک آزاد میدان ہاتھ آگیا۔ اور وہ ریشتاغ کا چانسلر بن کر جرمن قوم کا ڈکٹیٹر بن بیٹھا۔ ریشتاغ کے خوفزدہ ممبروں نے اسے سارے ریشتاغ کی طاقت سپرد کردی۔ اور اب جرمنی میں کوئی پارلیمنٹ اور کوئی پارلیمنٹری حکومت نہ رہی۔ قانون سازی ریشتاغ کی بجائے ہٹلر کے چشم و ابرو کے اشارات سے متعلق ہوگئی۔ مختصر یہ کہ دیکھتی آنکھوں کے سامنے ہی جرمنی کے خاکستر سے ایک نیا جرمنی اور تاریخ میں بیسویں صدی کا سب سے بڑا شیطان منصۂ شہود پر رونما ہوگیا۔ خوشامدی ساتھیوں نے اپنے اپنے مفاد کے پیش نظر جرمن ڈکٹیٹر کو پیغمبر آزادی کہنا شروع کردیا۔ اس کے حاشیہ نشینوں نے کتابیں تصنیف کر ڈالیں۔ اور ان کتابوں میں اسے "مسیح زندہ" بنا ڈالا۔ اس کی کتاب "مائن کیمف" کو انجیل کا رتبہ دے کر انجیل عیسوی کو جرمنی کے قلمرو میں ممنوع الاشاعت قرار دیدیا۔ مختصر یہ کہ آزاد جرمنی کے آزاد باشندے ہٹلر کی غلامی میں شامل کردیئے گئے۔

اب ہٹلر۔ ہاں ہٹلر کے لئے تاریخ عالم کے صفحات کھلے ہوئے ہیں۔ ان صفحات پر تا ابد مورخین عالم انسانی زندگی کی بربادی سے متعلق ہٹلر کے جرائم ثبت کرتے رہیں گے۔ اور جہنم کی تاریک ترین گہرائیوں کے دروازے بھی اس کے لئے کھول دیئے گئے ہیں۔ جہاں اس کی روح ابدالآباد تک معمورۂ انسانیت کی تباہی کے عقاب و عذاب سے جلتی رہے گی۔

ادارہ

نیا ادب

(بقیہ صفحہ ۵۱)

کے لئے آپ دو چار اور جاہائے نشستن کے نام دیکھئے۔ مثلاً کنار دریا' صحن چمن' لب جو' طرف کوہ' اور ان نرم نرم الفاظ سے نظر ہٹا کر پھر لفظ "ڈھیر" پر نظر جمائیں۔

مصرعہ ۱۶ میں تشبیہ کتنی بلیغ ہے: "جس طرح مردار کھا کر اونگھتا سا گدھ کوئی" اس کے لئے شاعر کے حسن انتخاب کی داد دیئے بغیر نہیں رہا جاتا اور آخری مصرعے میں اس وحشی کا شغل دیکھیے۔ "ٹھنٹھناتا جا رہا تھا شور آلودہ سی اینٹوں کو وہ ایک ہڈی سے پیہم" لفظ "ٹھنٹھناتا" سے خود صفحۂ قرطاس پر سے اینٹوں کی آواز پیدا ہو رہی ہے۔ اور پھر وحشی کا اینٹوں کو ایک ہڈی سے ٹھنٹھنانا اس کی وحشت کی تصویر کو کتنا مکمل کر رہا ہے۔ مصرعے کی لمبائی آواز کو وسعت تسلسل دے رہی ہے۔

یہ نظم ان معدودے چند اچھی نظموں میں سے ہے جن میں انتخاب الفاظ کے لئے شاعر کی رہنمائی دل کی بجائے دماغ نے کی ہے۔

قیصر جمشید واصل

بابت
ماہ فروری سنہ ۱۹۴۲ء
جلد ۱۴

شاہکار لاہور

مدیر معاون
قیصر جمشید واصل بی اے
نمبر ۲

فہرست

حصۂ نثر

حصۂ نظم

مستقل عنوانات

احسان الحق تاجور نے پرنٹر و پبلشر نے عالمگیر الیکٹرک پریس لاہور ... بازار میں چھپا کر دفتر شاہکار [illegible] سے شائع کیا

مختصرات

پنجاب یونیورسٹی کی بدعنوانیاں

(۲)

چار زبانوں کے ایک بورڈ کا پس منظر

پنجاب یونیورسٹی میں ہر تعلیمی مضمون کا ایک بورڈ ہے جیسا کہ دوسری یونیورسٹیوں میں بھی ہوتا ہے۔ انگلش، فرینچ، جرمن، سنسکرت، ہندی، پنجابی، بنگالی، سندھی، ان تمام زبانوں کے بھی جدا جدا بورڈ قائم ہیں۔ ہر بورڈ کے ممبران اپنے بورڈ سے متعلقہ زبان کی ترقی و ترویج کی بابت تجویزیں سوچتے ہیں۔ اس کی نشو و نما کے متعلق باہم تبادلہ خیالات کرکے نتیجہ خیز پاس کرتے ہیں۔ اور اس طرح اس کے حقوق حفاظت و اشاعت کی نگرانی کرتے ہیں بنگالی زبان کا بھی بورڈ ہے حالانکہ بنگالی کو اختیاری مضمون کے طور پر لینے والے امیدواروں کی تعداد دس بیس سے زیادہ نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس عربی، فارسی، اردو اور پشتو کا ایک مشترکہ بورڈ ہے جس کی کنویزشپ پر سالہا سال سے ایک شخص کی اجارہ داری قائم ہوگئی ہے۔ اس مشترکہ بورڈ کے متعدد ممبران اسی کی ٹولی کے ہیں اور چونکہ وہ یونیورسٹی میں اردو زبان کے حقوق ترقی کو برداشت نہیں کرسکتا۔ اس لئے پنجاب یونیورسٹی میں آج تک اردو اپنا درجہ اور اپنے حقوق حاصل نہ کرسکی حالانکہ اردو کے امیدواران امتحان کی تعداد انگلش کے امیدواران سے دوسرے درجے پر ہوتی ہے بلکہ اگر اس حقیقت کو پیش نگاہ رکھا جائے کہ انٹرینس کا امیدوار صرف انگلش کا پرچہ انگلش میں لکھتا ہے۔ اور باقی مضامین کے سوالات کا جواب عموماً اردو میں لکھتا ہے تو ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اس یونیورسٹی میں ہر سال اردو زبان کے امیدواران امتحان کی تعداد سب سے زیادہ ہوتی ہے۔ یوں بھی اردو زبان تمام صوبے کی تعلیمی زبان ہے لیکن حیرت یہ ہے کہ اس زبان کا یونیورسٹی میں کوئی جداگانہ بورڈ نہیں، بلکہ عربی، فارسی اور پشتو کے ساتھ اسے بھی نتھی کر دیا گیا ہے۔ اور چونکہ ان چاروں زبانوں کے بورڈ کا اجارہ دار کنوینر اردو سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتا، دلچسپی کیا معنی، یونیورسٹی میں اردو کے حقوق کا وہ سب سے بڑا مخالف بھی ہے۔ اس لئے آج اردو سے زیادہ یونیورسٹی کے دائرہ عمل میں ناقابل التفات اور کوئی زبان نہیں۔

اُردو پنجاب کی تعلیمی زبان قرار پا چکی ہے، پنجاب دہلی اور لکھنؤ کی بجائے اردو زبان کا گہوارہ سمجھا جاتا ہے حتیٰ کہ اردو زبان کا مستقبل اب پنجاب ہی سے وابستہ ہو چکا ہے۔ یہاں سے اردو کو جواب مل گیا تو پھر سارے ہندوستان میں اسے زندگی کا سانس لینے کو کوئی ٹھکانا نہ ملیگا۔ پنجاب کی تعلیمات کا سب سے بڑا ادارہ پنجاب یونیورسٹی ہے۔ آغاز قیام میں اس یونیورسٹی کا مقصد اجرا اردو زبان میں پنجابی نوجوانوں کو مغربی علوم و فنون کی تعلیم دینا ظاہر کیا گیا تھا لیکن یہ کس قدر افسوسناک واقعیت ہے کہ اردو زبان ہی آج پنجاب یونیورسٹی میں متاع کاسد و جنس کس مپرسی کی صورت اپنے حقوق زندگی سے محروم نظر آتی ہے۔

ہندوستان بھر کی یونیورسٹیوں میں مدت سے اردو اور ہندی کی تعلیم ایم اے تک پہنچ چکی ہے۔ اردو ہندی کے ایم اے پاس گریجوایٹ ہر صوبے میں بہ تعداد کثیر موجود ہیں لیکن مدت دراز تک پنجاب یونیورسٹی کے ارباب انتظام نے یہ بھی گوارا نہ کیا کہ ایف اے اور بی اے کے مضامین میں اردو کو بھی ایک مضمون کی صورت دی جائے پریس اور پبلک مجالس ایک چوتھائی صدی سے صدائے احتجاج بلند کر رہے ہیں۔ مگر یہ متفقہ احتجاج صدا بہ صحرا بن رہا ہے۔ ۱۹۳۰ء میں یونیورسٹی کے خلاف پبلک ایجی ٹیشن نے جو طوفانی صورت اختیار کرلی تھی۔ اس کی تہ میں بھی یونیورسٹی میں اردو زبان کی حقوق تلفی سے متعلق اہل پنجاب کا یہی تلخ احساس مضمر تھا۔ اس ایجی ٹیشن کے زیر اثر تحقیقاتی کمیشن کا قیام عمل میں آیا تھا جس پر حکومت نے ساٹھ ہزار روپیہ صرف کیا۔ مگر یونیورسٹی کے کرتا دھرتاؤں نے پبلک اور حکومت کی اس متحدہ سعی کو بھی حباب سطح آب بنا کر رکھدیا۔ اس سلسلے میں یونیورسٹی والوں کی ستم ظریفی داد کے قابل ہے کہ پریس کا منہ بند کرنے کی خاطر چند سال سے انہوں نے ایف اے اور بی اے میں اردو کو اختیاری مضمون بنا کر اس کے لئے صرف پچاس نمبر کا پرچہ تجویز کیا ہے حالانکہ دوسرے مضامین ڈیڑھ ڈیڑھ سو نمبر کے رکھے گئے ہیں۔ اردو زبان کے لئے یونیورسٹی میں ایک مستقل بورڈ نہ بنانے کی پالیسی میں بھی یہی جذبہ کارفرما ہے کہ اردو کو مجال نشو و نما نہ دی جائے۔ الگ بورڈ ہوگا تو اس کے ممبر اپنے فرض کا احساس کرتے ہوئے اردو کی تبلیغ و توسیع کی صورتیں پیدا کریں گے اور اس کے لئے وہ حقوق حاصل کرنے کی سعی کرینگے جنہیں مفاد پرست ٹولی مدت سے کچل رہی ہے

اس بیان سے قارئین اس مغالطے میں نہ پڑ جائیں کہ ہندوستان کی عام سیاسی رزمگاہوں کی طرح شاید پنجاب یونیورسٹی میں بھی اردو کی دشمنی پر ہندوؤں یا سکھوں نے کمر باندھ رکھی ہے۔ نہیں یہ بات نہیں بلکہ بدقسمتی سے یہاں اردو کی راہ ترقی میں پنجاب یونیورسٹی کے صرف دو تین مسلمان ممبر ہی سنگ گراں بنے ہوئے ہیں انہیں کی غرض پرستی نے اردو کو یونیورسٹی کے بازار کی بے ضرورت چیز بنا رکھا ہے۔ بات یہ ہے کہ عربی کے پڑھنے والے گنے چُنے ہوتے ہیں، اس کے امتحان کے پرچے دو چار ممتحنوں کی منہ بھرائی بھی نہیں کر سکتے۔ فارسی کو لازمی مضمون بنا کر امتحان دینے والوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے قدرتاً فارسی میں بھی یاران سرپل کی ایک بڑی جماعت کو ممتحن بنا کر ممنون اور اپنا آلہ کار بنایا جا سکتا ہے لیکن اردو کے امیدواروں کی تعداد عربی و فارسی کے مجموعی امیدواروں سے بھی کئی گنا ہوا کرتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اپنا حلقۂ اثر و اقتدار بڑھانے کے لئے سب سے زیادہ گنجائش اردو ہی کے مضمون میں نکل سکتی ہے۔ یہ ہے اصل معاملہ۔ اقتدار اور غرض کے بھوکوں نے عربی، فارسی، اردو اور پشتو ان چار زبانوں کا ایک بورڈ اس لئے بنا رکھا ہے کہ اپنی ٹولی کی تائید سے یکجائی بورڈ پر تسلط جمانا آسان ہے، الگ الگ بورڈ بنائے گئے۔ تو ممکن ہے، ہر بورڈ میں ان کے لگے بندھے اقلیت میں رہ جائیں اور اس طرح ان کی خدائی کی وسعتیں خطرے میں پڑ جائیں۔ یہ ہے اس بتی بھگت کا پس منظر جو اپنے پیش منظر سے بھی زیادہ عریان ہو چکا ہے۔

اب ذرا پیش منظر کی نامعقولیت پر بھی زحمت معائنہ فرمایئے۔ ان غرض کے پجاریوں کی جانب سے اردو کا بورڈ جدا کرنے کے سوال پر جواب دیا جاتا ہے کہ عربی، فارسی، اردو اور پشتو کے لئے جو یکجائی بورڈ بنایا گیا ہے، اس کے ممبروں میں ان چاروں زبانوں کے جاننے والے حضرات شامل ہیں۔ اس لئے جداگانہ بورڈ بنانے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی؟

مگر اس جواب کی سخافت کے پیش نظر کوئی کہہ سکتا ہے کہ اس بورڈ میں سب کے سب ممبر انگریزی بھی تو جانتے ہیں پھر انگریزی کا بورڈ جدا بنانے کی کیا ضرورت رہتی ہے؟ اور پھر اس بورڈ کے سب ممبر پنجابی بھی جانتے ہیں بلکہ پنجابی زبان کے اہل زبان ہیں۔ زیادہ سے زیادہ اتمام حجت کرنے کے لئے ایک سکھ ممبر کو اس بورڈ میں لے لیا جا سکتا ہے اس صورت میں پنجابی زبان کا بورڈ بھی بے ضرورت بن جاتا ہے۔ اسے بھی توڑ پھوڑ کر عربی فارسی والے بورڈ میں حل کر لیا جائے۔

یہ جواب اگرچہ ان خودغرضوں کی طمع و راز کے مطابق ہے مگر ایسا کرنے کی جرات ان میں نہیں، جانتے ہیں کہ پنجابی اور انگلش بورڈوں کے ممبران حضرات کو باہر کی چیز خیال کرتے ہیں مختصر یہ کہ چار زبانوں کو ایک بورڈ میں ٹھونس دینے کا کوئی معقول عذر تو ان کے پاس ہے نہیں۔ اور منہ پھوڑ کر اپنے دل کی یہ بات بتانے کی دلیری سے بھی یکسر عاری ہیں کہ فارسی، اردو وغیرہ کا الگ الگ بورڈ بنا دینے سے ہمارا کاروبار دادوستد تباہ ہو جائے گا۔

اب سوال یہ نہیں کہ یہ لوگ کیوں ایسا کر رہے ہیں بلکہ یہ کہ انہیں ایسا کرنے کی مجال کیوں دی جا رہی ہے؟

اس سوال کی ذمہ داری در اصل براہ راست ہمارے وائس چانسلر پر عائد ہوتی ہے۔ وہ اگر اس معاملے میں اپنے بعض مسلمان ساتھیوں کے پس پردہ ذاتی اغراض سے اب تک بے خبر ہیں۔ تو انہیں اب ان کی خود مطلبی سے واقف ہو جانا چاہیئے۔ اور واقف ہو کر اپنے ان دوستوں کو پبلک فنڈ پر یاسین کہنے کی مجال سے محروم کر دینا چاہیئے۔

یونیورسٹی کے سابق یورپین وائس چانسلروں نے اگر ان بدنظمیوں پر توجہ نہیں کی تو کچھ غیر متوقع نہیں کہ انہیں ان باتوں کی خبر تھی نہ پروا لیکن موجودہ وائس چانسلر یونیورسٹی کا پہلا ہندوستانی وائس چانسلر ہے جو پبلک اور پریس کے متفقہ مطالبے کی پزیرائی کی صورت میں مبعوث ہوا ہے۔ وہ ایک مدت مدید سے اس جماعت کے ایک رکن کی حیثیت میں اپنے ان ہم جلیسوں کے ساتھ کام کرتا رہا ہے وہ اپنے ان ساتھیوں کی ذہنیت اور ان تمام رخنوں سے باخبر ہے جو ان لوگوں نے یونیورسٹی کے حصار عافیت میں ڈال رکھے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ آج اگر غیر جانبدار مبصرین کا بااختیار اور آزاد تحقیقاتی کمیشن یونیورسٹی کے حالات کی چھان پھٹک کرے تو لیقین ہے کہ کچھ لوگوں کو جو توسیع کا گوندھ لگا کر یونیورسٹی کے بجٹ سے چمٹے ہوئے ہیں۔ وہاں سے بہ یک بینی و دو گوش نکال کر جبراً وہاں پہنچائے جہاں وہ جانا پسند نہیں کرتے۔ (باقی آیندہ) ادارہ

فورمن کرسچین کالج لاہور کا ادبی جلسہ۔

لاہور کا فورمن کرسچین کالج گورنمنٹ کالج لاہور کی ٹکر کا کالج ہے بلکہ اپنی بعض امتیازی خوبیوں کے لحاظ سے پنجاب کا سب سے بڑا، سب سے شاندار اور تعلیم کے لحاظ سے سب سے کامیاب کالج ہے۔

آج سے پہلے یہ کالج مال روڈ پر وائی ایم سی اے کی بلڈنگ کے بالمقابل ایک تنگ و تاریک بلڈنگ میں تھا مگر اب شہر کی آبادی سے چار میل دور ایک حد نظر تک طویل و عریض رقبے میں منتقل ہو گیا ہے۔ کالج کی منتظمہ کمیٹی نے سات سو بگیہ اراضی خرید کر دو تین سال میں وہاں ایسی ایسی پاکیزہ فراخ اور خوبصورت عمارات بنالی ہیں جنہیں دیکھ کر چشم تماشا بین سرور جھپکنے لگتا ہے۔

گزشتہ ۳۱ جنوری ۱۹۴۲ء کو فورمن کرسچین کالج کی بزم ادب نے اپنے دور جدید کا پہلا ادبی جلسہ منعقد کیا۔ کالج کے ہونہار طالب علم ملک محمد شریف جو بزم ادب کے مستقل پریزیڈنٹ ہیں۔ اردو ادب کے ایک قابل قدر نثر نگار ہیں۔ ان کے زیر اہتمام یہ جلسہ منعقد ہوا۔ اس شاندار ادبی اجتماع کی صدارت مجھے کرنی پڑی۔ "صدارت کی" کی بجائے "کرنی پڑی" اس لئے لکھ رہا ہوں کہ میں اپنے لئے

صدارت کے تصور سے بھی پریشان ہوجاتا ہوں۔ یوں تو اپنی ہنگامہ کار ادبی زندگی میں میں نے ہزاروں جلسے کئے۔ تقریریں کیں، اپنا کلام پڑھا، یہ سب کچھ ہوا۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ ہمیشہ اس تصور نے کہ فلاں جلسے میں مجھے کچھ کہنا یا پڑھنا ہے میرے حواس پر بہت برا اثر ڈالا ہے۔ ملک صاحب سے ہزار معذرت کی مگر وہ اخیر تک معذرت کو انکسار پر محمول فرماتے رہے۔ اخیر یہ کہ "مگر بردم" کے مصداق کشاں کشاں مجھے لے جایا گیا۔ یہ جلسہ ایک خوبصورت اور وسیع ہال میں منعقد ہوا۔ سب سے پہلے بزم ادب کے پریزیڈنٹ نے میرے خیر مقدم میں ایک مضمون پڑھا جس میں مجھے وہ سب کچھ بنایا گیا جو میں نہ تھا۔ پھر میں نے بزم ادب کی نشاۃ ثانیہ یا دور جدید پر مختصر سی تقریر کی۔ اس کے بعد عزیز کنور چوہنی لال کاوش مرحدی کے ایک رسیلے گیت سے اس مناظمے کا آغاز ہوا۔ پھر یکے بعد دیگرے حضرات شعرا میں آغا محمد علی بخاری، شہرت بخاری، تابش صدیقی، انجم رومانی، سید نذیر ترمذی، یزدانی جالندھری، مسٹر راج بلدیو، مسٹر ظفر زبیری سکرٹری اردو سبھا، پروفیسر بیدار ایم اے، پروفیسر پرشوتم لال ضیا ایم اے، راجہ مہدی علیخاں، مولنا حامد علیخاں صاحب ایڈیٹر رسالہ ہمایوں، حضرت احسان دانش اور بعض دیگر احباب نے اپنی سحر گفتاریوں سے بزم ادب کے اس جلسے کو بزم سرور و نور بنا دیا۔ اس جلسے کی امتیازی شان یہ تھی کہ طلبہ کی جماعتوں نے بڑے ضبط و سکون سے شعرا کو سنا اور موقع بہ موقع داد دے کر اپنے نذاق شعر و ادب کا ثبوت دیا۔ ورنہ طلبہ کے عام اجتماعات میں ضبط، سکون، خاموشی اور موقع شناسی کے سوا سب کچھ ہوتا ہے کسی کا گلا صاف اور آواز پاٹ دار ہے تو خواہ وہ مبتدی اور بد مشق ہی ہو۔ اسے داد دیکر جلسہ گاہ میں ہنگامہ برپا کر دیتے ہیں اور اگر کوئی تحت اللفظ پڑھ رہا ہے یا آواز کسی کی رسیلی نہیں تو خواہ آسمان کے تارے توڑ لایا ہو اسے شور و غل مچا کر بٹھا دیا کرتے ہیں۔ یہاں ان خفیف الحرکاتیوں کا نام نہ تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انہوں نے لاہور اور اپنی برادری کے ہنگامے دیکھے ہی نہیں۔ اس کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے۔ کہ لاہور سے دور چلے جانے کے سبب فورمن کرسچین کالج میں ضبط اور ڈسپلن کی فضا پیدا ہو گئی ہے طلبہ میں اس مبارک تبدیلی کو دیکھکر ہم کالج کے قابل اساتذہ اور پرنسپل کو مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

حلقۂ ارباب ذوق لاہور

حلقۂ ارباب ذوق اور اردو سبھا لاہور ایک ہی مقصد کے دو مظاہر ہیں۔ دونوں انجمنیں تنقیدی مجلسیں ہیں۔ دونوں قابل قدر مبارک اور مفید ہیں۔ ان دونوں میں فرق صرف اتنا ہے کہ اردو سبھا میں اعلےٰ تعلیم یافتہ ممبروں کی کمی ہے مگر اس کا ہفتہ وار جلسہ حلقۂ ارباب ذوق کی نسبت زیادہ دلچسپ ہوتا ہے۔ جلسہ کا انداز تنقید زیادہ احترام آمیز ہے۔ اس کے برعکس حلقۂ ارباب ذوق میں مقامی کالجوں کے اساتذہ اور لاہور میں مقیم ادبا و شعرا کی کثرت ہے مگر ہنجار تنقید کچھ حریفانہ اور زیادہ تر "نکات بعد الوقوع" کے رنگ کا ہے یعنی بعض اوقات کسی بے معنی سی چیز میں بھی ژرف نگر نقاد وہ وہ نکتے پیدا کر دیتے ہیں کہ شاعر کے ذہن اور نظم کے الفاظ کی ان تک رسائی نہیں ہوتی۔

۲۵ جنوری کو اس انجمن کا جلسہ میری صدارت میں ہوا۔ مسٹر یوسف ظفر (بی اے گجرات) نے گزشتہ جلسہ کی رپورٹ پڑھی۔ جو تھوڑی سی رد و قدح کے بعد منظور کر لی گئی۔ اس کے بعد مسٹر امجد حسین امجد نے "چھوٹا بھائی" کے عنوان سے ایک مزاحیہ مضمون پڑھکر سنایا۔ یہ مضمون بہت دلچسپ تھا۔ البتہ زبان کہیں کہیں نظر ثانی کی طلبگار تھی۔ ان کے بعد دو تین آزاد نظمیں پڑھی گئیں جن پر دیر تک مخالف و موافق تنقیدیں ہوتی رہیں۔ پروفیسر گوربچن سنگھ ایم اے سکھ نیشنل کالج اور میاں محمد رفیق خاور ایم اے ایل ایل۔ بی اس بحث میں زیادہ حصہ لیتے رہے۔

پروفیسر صاحب کے متعلق اتنا عرض کر دینا ضروری ہے کہ وہ اردو ادب (نظم و نثر) کے بہت بلند پایہ نقاد ہیں کسی گزشتہ "یوم غالب" کے جلسے میں میں نے مرزا غالب پر ان کا ایک گرانمایہ مقالہ سنا تھا اور اسی وقت اندازہ کر لیا تھا کہ تو بر تو حجاب گمنامی بھی اس جوہر کامل کو زیادہ دیر تک فضا تابی سے روک نہ سکے گا۔ حلقۂ ارباب ذوق کے جلسے میں میں نے ان کی تنقیدی نگاہ کی گہرائیوں کو دیکھا۔ وہ ایک ایسی آزاد نظم کو معنی پہنا رہے تھے جسے میں مطلق نہ سمجھ سکا۔ اور میرے غرور تنقید کے علی الرغم وہ یہ باور کرانے میں کامیاب تھے کہ اس نظم میں ایک عمیق خیال کو الفاظ کا جامہ پہنایا گیا ہے۔

میاں محمد رفیق خاور اس خاندان کے ایک ممبر ہیں جس کا ہر فرد ذہن و ذکا میں امتیاز خاص کا مالک ہے۔ ان کے انداز تنقید میں جبر کی بجائے فلسفیانہ تبسم کی آمیزش تھی۔ یہ تبسم کبھی کبھی خندہ استہزا بھی بن جاتا تھا۔

ایک نوجوان شاعر نے جس کا نام اور تخلص میرے حافظہ سے اتر گیا، ایک رنگین نظم پڑھی یہ نظم خاصی تھی منتظر نقادوں نے نظم کے ختم ہوتے ہی اسے اپنی آتشیں تنقید سے تپانا شروع کر دیا۔ میں نے جب دیکھا کہ معصوم شاعر کا حوصلہ بعض نقد و نظر بننے سے ابا کر رہا ہے صدارتی مداخلت کر کے بحث کو ختم کر دیا۔

اخیر میں ڈاکٹر صادق حسین صاحب ایم اے پی۔ ایچ۔ ڈی پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور نے آزاد کی "نیرنگ خیال" پر مضمون پڑھا۔ اس مضمون کا ماحصل یہ تھا کہ نیرنگ خیال مولنا محمد حسین آزاد کی تصنیف نہیں۔ بلکہ ڈاکٹر جانسن، اڈیسن اور بعض دوسرے مغربی مصنفوں کے مضامین کا ترجمہ ہے۔ ڈاکٹر لائٹنر سابق رجسٹرار پنجاب یونیورسٹی کی فرمائش پر انہیں کے انتخاب کردہ مضامین کا ترجمہ کیا گیا ہے فاضل مقالہ نگار نے اپنے دعوے کے ثبوت میں ان مغربی مصنفین کی عبارتوں

کا نیرنگ خیال کے جستہ جستہ مقامات کی عبارتوں سے مقابلہ بھی کیا۔ اسی ذیل میں انہوں نے یہ بھی فرمایا کہ مولانا آزاد کی انگریزی کی قابلیت اتنی تھی کہ وہ بے تکلف ان بلند تصانیف کا ترجمہ اردو میں کر لیا کرتے تھے۔

میں نے اس بیان سے اختلاف ظاہر کرتے ہوئے عرض کیا کہ مولانا آزاد کی انگریزی تعلیم کو اگر مان بھی لیا جائے تو وہ شدہ بدہ سے زیادہ نہ تھی۔ باقی ڈاکٹر لائٹنر کے انتخاب مضامین کا واقعہ بھی قیاس ہے۔ کیونکہ مولانا آزاد پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو میں انگریزی سے مترجمہ کتابوں کی زبان درست کرنے کی خدمت پر مامور تھے۔ اس سلسلے کے طفیل ادب و شاعری کے متعلق ان کے خیالات ترقی پذیر منازل کی طرف بڑھے۔ رہی ان کی انگریزی کی بیان کردہ قابلیت اس سے میں نے بدیں وجہ اختلاف کیا کہ مکتوبات آزاد کے دیباچے میں آزاد کی پنجاب میں آمد و ملازمت سے متعلق ان کے فاضل نبیرہ آغا محمد اشرف ایم اے نے اور خود اپنے خطوط بنام میجر سید حسن بلگرامی پر آزاد نے بھی ڈاکٹر لائٹنر کو بعض وقتی ضرورتوں کے لئے رخصت کی جو درخواستیں نقل کی ہیں۔ یہ سب درخواستیں اردو میں ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ اتنی بھی انگریزی نہیں جانتے تھے کہ اپنے ایک یورپین افسر کو درخواست لکھ سکیں۔ چہ جائے کہ بلند معیاری کتابوں کا ترجمہ کر سکیں۔ اس پر فاضل نامہ نگار نے یہ انکشاف پیش کیا۔ کہ مولانا آزاد کے ہاتھ کے لکھے ہوئے انگریزی مضامین کے مسودے موجود ہیں۔

ظاہر ہے کہ ان مسودوں پر مقالہ نگار کی نظر پڑی ہو گی مگر میں ابھی تک بھی آزاد کی انگریزی کی بیان کردہ قابلیت کو تسلیم کرنے کی حیثیت میں اپنے آپ کو نہیں پاتا۔ ہاں آنکھ سے دیکھ لینے کے بعد اس مسئلہ خاص میں اپنی رائے بدل سکتا ہوں۔ اس بارے میں آزاد اعلی اللہ مقامہ کے نبیرگان ذوالقدر کی معلومات زیادہ قابل تسلیم ہونگی آغا محمد باقر ایم اے اس سوال پر روشنی ڈالیں تو حقیقت زیادہ صحیح صورت میں رونما ہو جائیگی۔ بہر حال ڈاکٹر محمد صادق حسین صاحب کا یہ مقالہ نیرنگ خیال سے متعلق بہت سی بیش قیمت معلومات کا حامل تھا۔

اس جلسے کو ہمارے نوجوان فاضل ادیب مسٹر قیصر جمشید واصل ایڈیٹر شاہکار کی بسیار گفتاری نے زیادہ دلچسپ بنا دیا تھا۔ ان کی سیماب وشی اخیر تک سب کی نگاہوں کا مرکز بنی رہی۔ اسی جلسے میں مجھے پہلی بار ادبی دنیا کے "میراجی" کو دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ وہ اپنی ہیئات کذائی سے خواجہ حسن نظامی کے خلیفہ اول دکھائی دے رہے تھے۔ میں دیر تک بار بار انہیں دیکھتا رہا۔ دل میں متعجب تھا۔ کہ یہ سجادہ نشین قسم کے بزرگ کون ہیں اور اپنا گوشہ عزلت چھوڑ کر ادب و تنقید کے اس خرابات میں مصروف اہتمام ہو کر طریقت کی کونسی منزل طے کرنے یہاں پہنچے ہوئے ہیں؟ اخیر میں نہ رہ سکا اور خاور صاحب سے پوچھنے پر مجبور ہو گیا۔ کہ یہ خواجہ "صوفی صاحب" کون ہیں"؟ خاور صاحب کی زبان سے جواب میں یہ فقرہ سنکر کہ "ہیں!! میراجی کو آپ نہیں جانتے؟" مجھے اپنے ذوق بت تراشی پر ندامت ہوئی اور میراجی کی اس خوبصورت تصویر کو لوح حافظہ سے بادل اندوہگین محو کرنا پڑا جس پر میرے نقاش خیال نے بڑی محنت صرف کی تھی۔ تاجور

سالنامہ نیرنگ خیال۔

کاغذ کی اس بے تحاشا گرانی اور نایابی کے سبب اس سال اکثر رسائل و اخبارات اپنے خاص نمبر یا سالنامے شائع نہیں کر سکے لیکن تعجب ہے کہ سالنامہ نیرنگ خیال ان ناسازگار حالات میں بھی اپنی تمام امتیازی روایات کے ساتھ بصد آب و تاب شائع ہوا ہے حکیم یوسف حسن صاحب مدیر نیرنگ خیال کی جان نثارانہ ادبی مساعی کسی اعتراف و تعارف سے بے نیاز ہیں۔ انہوں نے اپنی ساری زندگی خدمت زبان و ادب کے سر صدقے بنا رکھی ہے۔ یہ اولوالعزمی صرف انہیں کے شایان شان تھی کہ اس آزمائشی دور میں انہوں نے اپنے پرچے کی آن بان میں فرق نہیں آنے دیا۔ زیر نظر سالنامے کے جہازی سائز کے ۲۰۰ صفحات میں زیادہ حصہ اقبال اور اقبالیات کی نذر کیا گیا ہے۔ اقبال پر ہندوستان اور غیر ممالک کے مشہور نقادوں، فلسفیوں اور ادباء نے جو کچھ اب تک لکھا اور حسن ع۔ ن پر لکھا اس کی روح کھینچکر سالنامہ نیرنگ خیال میں پیش کر دی گئی ہے۔ گویا یہ سالنامہ اقبال کی شاعری سے متعلق ایک طویل و بسیط تنقید پر مشتمل ایک کتاب ہے اور تنوع و تفنن پیدا کرنے کے لئے اس میں بہت سے دوسرے نوعیت کے دلفریب مضامین نظم و نثر بھی ہیں۔ اسے تمام اردو خواں طبقات کے مطالعہ کی چیز بنانے میں کار آگاہ ایڈیٹر پورے طور پر کامیاب ہوا ہے۔

اس کامیابی پر حکیم یوسف حسن صاحب مدیر نیرنگ خیال خدمت گذاران زبان و ادب کی مبارکباد کے مستحق ہیں۔ اس سالنامے کی قیمت صرف دو روپے ہے جو اخراجات اشاعت اور گرانی کاغذ کو دیکھتے ہوئے بہت کم ہے لیکن نیرنگ خیال کے ہر خریدار کو چار روپے آٹھ آنہ میں یہ سالنامہ اور آئندہ سال بھر کے پرچے دیئے جائیں گے۔

تاجور

اقبال کے بعد

مندرجہ بالا عنوان کے تحت جو سلسلۂ مقالات جاری ہے وہ اس ماہ نہیں دیا جائے گا۔ اشاعت آئندہ میں ہدیہ ناظرین کیا جائے گا

قیصر جمشید واصل

منگیتر کا استقبال

آؤ پیارے فیضی آؤ — آؤ ہمارے فیضی آؤ
آج کا چاند کدھر سے نکلا — قدم تمہارا گھر سے نکلا
آؤ میرے پیارے بیٹھو — لو تکیئے کے سہارے بیٹھو
دیسی پان کا ذائقہ چکھّو — لو یہ گلوری منہ میں رکھو
چائے بنا کر لاتی ہوں میں — پھر کھانا پکواتی ہوں میں
کیا کیا کھاؤ گے منہ سے بولو — منہ سے بولو لب تو کھولو
ہنسی خوشی میں وقت گذارو — موج کی صورت دل کو ابھارو
اتنے پریم کا پرچا دیکھو — سب میں ہے اس کا چرچا دیکھو
رنگا رنگ معجون ہے اس میں — میرا بھی مضمون ہے اس میں
چائے ساتھ مٹھائی کھاؤ — مکھن اور بالائی کھاؤ
چائے پیو اور کیک بھی کھاؤ — پرچوں سے کچھ دل بہلاؤ
یہ شہکار ہے وہ ہے ہمایوں — ایک سے ایک ہے بڑھکر مضموں

بوا نصیبن لاؤ کھانا — جھٹ پٹ جاؤ پکاؤ کھانا
کہو تو کیا کھاؤ گے فیضی — جو مانگو پاؤ گے فیضی
فیرینی، زردہ، بریانی — لوٹ پلاؤ اور بورانی
انڈوں کا حلوا بھی بنا ہے — گجریلا تیار دھرا ہے
کوفتے، شامی کباب پسندے — دہی بڑے، اچار مربّے
کچھ جو تمہاری مرضی پاؤں — دال بھری روٹی پکواؤں

ہو چپ چپ سے تمہیں غم کیا ہے — کیا چپ کا روزہ رکھا ہے
کیوں غمگین ہو کچھ تو سناؤ — دل کا بھید ہمیں بھی بتاؤ

چپ یہ لگی ہے کس کی لگن ہیں کس کا پریم بسا ہے من میں
خاموشی کا کیا مطلب ہے؟ کیوں خاموشی مہر بہ لب ہے
کیوں بیٹھے ہو کھوئے ہوئے سے کس کی تلاش میں گم ہو ایسے
کس کو ڈھونڈھ رہے ہو پیارے میں بھی ڈھونڈوں ساتھ تمہارے
پیارے میں اک بات بتاؤں بُرا نہ مانو تو سمجھاؤں
حُسن پہ مرنا ہے نادانی حسن انسانی ہے فانی
حُسن سے ہاتھ اٹھاؤ فیضی لب پہ یہ نام نہ لاؤ فیضی
حُسن جفاکاری کا ساتھی حُسن دِل آزاری کا ساتھی
حُسن وفا کا دُشمنِ جاں ہے صدق وصفا کا دشمنِ جاں ہے
حُسن ستم ایجاد ہے پیارے حُسن تو بے بنیاد ہے پیارے
رہزنِ ایماں، دشمنِ دیں ہے! میں ہوں یا کوئی اور حسیں ہے
حُسنِ فانی سے مُنہ موڑو اس ظالم سے رشتہ توڑو
آؤ تمہیں اک راہ دکھاؤں اِک محبوب کا نام بتاؤں
اُس کا حسن ہے حسنِ باقی بزم ابد کا ہے وہ ساقی
سورج چاند میں نور ہے اس کا کل سنسار ظہور ہے اس کا
کلی میں حسن نمو ہے اس سے پھول میں رنگ و بو ہے اس سے
جوت اسی کی ہے تاروں میں اس کا خرام ہے سیاروں میں
دھنک کمان میں رنگ ہے اس کا وقت بھی ہم آہنگ ہے اس کا
مجھ میں بھی کچھ اُس کی ادا ہے! تم میں بھی وہ جلوہ نما ہے!
باغ و راغ خزینے اس کے ہم تم سب آئینے اس کے
آؤ اس سے پریت بڑھائیں من میں اس کا پریم بسائیں

دوئی کا نام مٹائیں دونوں
دو سے اک بن جائیں دونوں

تاجور

سلہ میں اس تالیف کو جائز تصور کرتا ہوں۔

رومان

"رومان" ایک کھیل ہے، دل کا بہلاوا، عملی زندگی کا سب سے گیا گذرا باب، لیکن جب زندگی ہی رومان ہو...... رومان بھری زندگی نہیں، زندگی، زندگی خود ایک رومان! تب بھی بدنصیب خشک طبع گناہگار اسے "رومان" ہی کہیں گے! دل کو نہ توڑیئے یہ خدا کا مقام ہے۔

یہی نہیں، وہ ٹوٹے ہوئے دل کو توڑتے ہیں، اس کے ٹکڑے کرتے ہیں۔ زخم پر نمک چھڑکتے ہیں۔ اور پھر لفظی دلائل سے عذر گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں۔ یہ گناہگار احساسات لطیف کے قاتل ہیں۔ نازک احساسات کو کچلنا انہیں رفتہ رفتہ آہستہ آہستہ اور مکمل طور پر پامال کرنا ان کے نزدیک کسی بڑی چیز کو ختم کرنا ہے یا ایک شرمناک کمزوری کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا ــــ یہ قاتل ہیں روح کے جو اپنے جرم کی تلافی ایک متواتر اور مسلسل مضحکہ سے کرتے ہیں ــــ قتل کا بدلہ قتل ہے۔ اور میرے احساسات کی زخمی اب بھی وہ مناسب اور بجا انتقام لے سکتی ہے۔ آغاز شباب اور بھرپور شباب کی تمام قوتوں اور گرمیوں کو میں اب بھی گھسیٹ بلا سکتا ہوں میری روح میں اب بھی وہ تشنج پیدا ہو سکتا ہے روحانی خون کا بدلہ ہے ذہنی رفعت! اور...... اور استحکام طبع!.....

ذلیل، باغی کیڑے!

رنگینی! ہتھاس! دل کشی!! ہا ہا ہا!!!

میں باغی تھا، میں نے حسن اور دلکشی کے خلاف شاید گہوارہ ہی میں بغاوت کر دی تھی۔ میں ہر اس چیز سے متنفر تھا جو "دلکش" ہو "نرم" ہو اور "رنگین" ہو لیکن "بدنمائی" "سختی" اور "کرواہٹ" مجھے بھلی نہیں معلوم ہوتی تھی۔ ان دونوں سے بچ کر انسانی فطرت کہاں رہ سکتی ہے؟ یقیناً کہیں نہیں۔ لیکن میری فطرت کو ایک انوکھی پناہ میسر تھی ایک محفوظ... غیر انسانی پناہ! دو آنکھیں، اور ان کی گہرائیاں! ـــ!

میرا معیار دلکشی ایک عرصہ تک پوشیدہ رہا لیکن جب ابھرا تو لوگ غلط فہمی کا شکار ہونے لگے۔ مجھے اس بات کا علم نہ تھا کہ بیزاریٔ دلکشی، نے مجھ میں ایک دلکشی پیدا کر دی ہے۔ شاید یہ بہتر ہی تھا، غنیمت تھا۔ اس کے بغیر زندگی دشوار ہو جاتی۔ میں انسان سے جانور نہیں بن رہا تھا، ذی فہم سے بدحواس نہیں، وحشی نہیں، میں دلکشی سے برتر ہو رہا تھا، کشش سے بالاتر! بے حس؟ نہیں، میں حد درجہ حساس تھا، غیر قدرتی طور پر حساس۔ اور ــــ اس وقت کا آنا ضروری تھا جب میری یہ حس صنعتی رنگ اختیار کر کے مجھے دیوانہ بنا دے! صنعتی رنگ...... آپ کو غلط فہمی ہو رہی ہے۔ میرا مطلب عشق و محبت کی گرمی سے نہیں جس کا تعلق براہ راست دل اور جسم سے ہوتا ہے مطلق نہیں۔ میں دیوانگی کو کہہ رہا ہوں، دماغی دکھ اور بے چینی کو۔ اور اگر اس کا اثر جسم پر اور پھر جسم کا اثر دماغ پر پڑنا قدرتی امر ہے تو ہوگا۔ میں اپنے جذبات کی تشریح الفاظ میں نہیں کر سکتا۔

میں خوش نہیں تھا، مطمئن نہیں تھا، قانع نہیں تھا، میں مغموم تھا، غیر مطمئن تھا، بے چین تھا، بے رحم ہو چلا تھا۔ "دلکشی" کو فنا کر دینے میں مجھے چین نصیب تھا۔ نرمی کو مٹا دینے میں سرور حاصل تھا، مٹھاس کو کڑوا کر دینے میں ایک والہانہ لذت تھی۔

میں جانتا ہوں میری گفتگو مسلسل نہیں، ٹوٹی ہوئی ہے۔ مجھ میں روح نہیں، جو میری کہانی کو خاطر خواہ طور پر بیان کر سکے، وہ زندگی کا ایک ٹوٹا ہوا ناقابل فہم، بھدا، بے رنگ اور نامکمل خاکہ ہوگی۔ سچ یہی ہے کہ خالق کی اس دنیا میں میری زندگی بھدی۔ بے رنگ اور نامکمل رہی ہے لیکن بہتر ہے کہ میری کہانی ایک مٹا ہوا نامکمل خاکہ ہے۔ ان ٹوٹے ہوئے ادھورے اور گھن کھائے ہوئے ٹکڑوں میں مجھے اپنی زندگی کی اسی کے رنگ میں ایک تکمیل نظر آ رہی ہے، کاش... کاش لایزال کی دنیا میں کوئی دوسری روح اسے سمجھنے کی اہل نہ ہو۔

میری دیوانگی وقت کے ساتھ بڑھتی رہی۔ رفتہ رفتہ میں اس انوکھی ذہنیت کے لامحدود اور اتھاہ سمندر میں بہہ رہا تھا۔ اس کی گہرائیوں میں ڈوب رہا تھا۔ دوسروں کی ذہنیت اور ان کے خیالات یاد نہیں کہ کبھی مجھے ہلکے معلوم ہوتے ہوں لیکن ان سے متاثر ہونے کی صلاحیت مجھ میں باقی نہ رہی تھی۔ میری محدود دماغی اور روحانی قوت کے لئے میری اپنی دنیا کے اثرات کی شدت ہی بہت زیادہ تھی۔

اندھیری، گرم یا سرد راتوں میں، تنہائیوں میں، برشگالی اداسی میں چھٹکی ہوئی چاندنیوں میں، چکا چوند کر دینے والی روشنیوں میں، مسرت افزا گہما گہمی میں، سکون کے ماحول میں، غم و آلام سے تڑپتی ہوئی دنیا میں، کہیں کبھی کسی حالت میں کوئی چیز ان دھندلے نقوش پر جو آہستہ آہستہ گہرائی اور تیزی

اختیار کر رہے تھے، غالب نہ آسکی! یہ "رومان" ہے! اسی کو آپ رومان کہیں گے؟ کوئی چیز اس افسردہ شدت پر حاوی نہ ہو سکی ــ!! اس دکھتی ہوئی جس کو کوئی چیز نہ متاثر کر سکی ــ!! اور میں نے کسی کنج میں زندگی نہیں بسر کی میں زمانہ کے اُتار چڑھاؤ کے ساتھ اترتا اور چڑھتا رہا ہوں میں شاعر نہیں، میری دنیا عملی تھی، شدید طور پر عملی۔ میں نے تخیل سے کبھی کھیل نہیں کھیلے عقل سے ہاتھ نہیں دھویا مصلحت سے کنارہ کشی نہیں اختیار کی۔ مجھے احساس رہا ہے کہ میں ایک شرمناک اور دیوانہ کمزوری کا شکار ہو رہا ہوں۔ پھر بھی میں اپنی فطرت کو ملامت نہیں کر سکا۔ دیوانگی کی ان رفعتوں میں مجھے ایک خاطر خواہ سہارا نصیب تھا۔ کیسا اور کیوں میں نہیں کہہ سکتا۔

اس سمندر کی گہرائیوں میں جن کے خطرات اور طوفان مجھے وہ ابدی لذت اور سرور دینے کا وعدہ کر چکے تھے۔ جو انسانی روح کو "جنت" کے علاوہ کہیں نہیں مل سکتا تنہا پیرتے ہوئے میرے دل نے ایک عجیب خلش سی محسوس کی ــ میں کسی کی موجودگی اپنے قریب محسوس کر رہا تھا۔ میری نیم خوابیدہ آنکھیں آہستہ آہستہ وا ہونے لگیں میں چونک پڑا میرے ہاتھوں میں ایک تشنج پیدا ہوا لیکن میں پھر سو گیا۔۔ سب کچھ بے بنیاد تھا میں تنہا تھا۔ احتیاطاً میں نے ایک غوطہ لگایا اور اس طوفانی سمندر کی عمیق ترین گہرائیوں میں پہنچ گیا۔ پھر بھی میں نے بے چینی محسوس کی میری خلش بڑھتی گئی اور ناقابل برداشت ہونے لگی میں نے ایک جھٹکہ کے ساتھ اس کشمکش سے پیچھا چھڑانا چاہا بہت ہاتھ پیر مارے بہت تڑپا۔ آخر کار تھک گیا۔ میرے اعضا شل ہو گئے تھے۔ ان کی قوت سلب ہو رہی تھی تکان سے میں نے آنکھیں بند کر لیں اور اپنے آپ کو لہروں کے سپرد کر دیا میرا بہتا ہوا تکان سے چور جسم کسی ایسی چیز سے مس ہوا۔ جو اس اچانک خلش کشمکش اور خستگی میں نئی سی تھی۔ نرم سی تھی۔ انوکھی، ہلکی، لذیذ اور مادی تھی۔ وہ چیز میرے کمزور جسم کو سہارا دیتی ہوئی معلوم ہوئی۔ اسے سنبھالتی ہوئی تھپکتی ہوئی لیکن میں نے آنکھیں کھول کر نہیں دیکھا۔ دیکھنا چاہا ہی نہیں میں نے اپنے تھکے ہوئے جسم کو اس پر سہارا لے لینے دیا اور سو گیا میرے لب لاعلمی میں متبسم ہوئے اور کسی نے تڑپ کر اس تبسم کو اپنا بنا لیا۔ اس تڑپ میں ایک شدت تھی جسے انسان ہلکا نہیں کر سکتا۔ ایک خواہش تھی جسے کوئی روح نراس نہیں کر سکتی۔ اتنی گہری اتنی دائمی جس میں کائنات اپنے شدید ترین متضاد تاثرات کے ساتھ ڈوب جائے اور پھر ابھر نہ سکے جس میں تمام روحیں بے تاب ہو کر اس طرح سما جائیں کہ پھر علیحدہ نہ ہو سکیں۔ میں سو رہا تھا لیکن محسوس کر رہا تھا۔ حیران تھا ششدر تھا جس طرح کوئی جانور حیران ہو۔ اور بھول کر کھو کر بالکل کھو کر متحیر او غیر انسانی آنکھوں سے گھورتے ہوئے۔ حیرانی سے گھورتے ہوئے، میں نے ایک تبسم نذر کیا پھر ایک اور، اور پھر ایک اور۔۔۔

جب میری آنکھ کھلی تو مجھے محسوس ہوا کہ کسی نے اچانک میرے مخفی اور عزیز ترین خزانوں کو لوٹ لیا ہے۔ مجھے میری اپنی دنیا سے نکال دیا ہے، ذلت اور رسوائی سے میری خودداری، میری عزت کو کچل دیا ہے میں نے گھبرا کر بدحواس ہو کر چاروں طرف دیکھا ــ دشمن میرے احساس ایمانداری اور پاس عزت پر پھبتیں کستے ہوئے میرے قریب ہی کھڑا تھا اس کی آنکھیں کہہ رہی تھیں "تمہارا خیال غلط ہے کہ میں نے تمہاری دنیا کو لوٹ لیا ہے تمہیں مغلوب کر لیا ہے میں خود بیدست و پا ہوں، ہاں ایک گناہ سرزد ہو گیا ہے میں نے اپنا تمام سرمایہ تمہارے قدموں پر ڈال دیا ہے۔ اب میں تمہارے رحم و کرم پر ہوں۔ مجھے پناہ دو یا اگر تمہارا ضمیر اجازت دے۔ مجھے تنہا ہی کچل دو"۔ میں نے تڑپ کر اپنے مضبوط ہاتھوں سے اس کا نازک گلا دبا لیا لیکن۔۔۔۔۔ جب اس پر بھی وہ مسکرایا میں نے از خود رفتہ ہو کر اپنی گرفت سخت کر دی۔۔۔۔۔۔ اور اس کے مردہ جسم کو اٹھا کر پھینک دیا!

میرے سمندر میں ایک طوفان اٹھا۔۔۔۔ اس لئے نہیں کہ میری دنیا نے میرے ہی خلاف بغاوت کر دی تھی، نہیں، ایسا نہ ہو سکا، اس لئے کہ ایک اجنبی کی موجودگی نے اسے آلودہ کر دیا تھا، اس کے ذرات کو پریشان کر دیا تھا۔ اور یہی نہیں، اس کی نعش اس دنیا کو مسلسل طور پر پریشان کرنے کے لئے میرے سمندر کی تہ میں ہمیشہ کے لئے جا پڑی تھی۔

کہتے ہیں ایام طفلی میں میں ہنس مکھ تھا، بشاش تھا، یہ اصلیت نہیں ہے۔ اگر شہلا میری دوست تھی، تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ وہ معصوم اور دلکش تھی نہ اس لئے کہ وہ غیر معمولی طور پر سمجھدار تھی، نکتہ فہم تھی۔ بلکہ اس لئے کہ میں اور وہ متضاد ہستیاں تھیں، میں غیر مطمئن تھا اور وہ غیر معمولی طور پر قانع۔ میری فطرت مغموم تھی، اور اس کی فطرت ہنستی ہوئی ــ میں کارٹون بنایا کرتا تھا اور وہ مناسب تصویریں ــ مجھے اس کی دوستی میں اپنی دنیا کی فصیل کو مستحکم کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ وہ دنیا طفلی میں جیسی بھی ہو ــ ہم دوست تھے۔ اس لئے کہ ایک دوسرے سے مختلف تھے اس حد تک مختلف کہ ہماری خودداری ہیں ایک دوسرے کے حرکات اور طرز عمل کو نظر انداز کر دینے پر مجبور کرتی تھی ہم ایک دوسرے کو نکتہ چیں نظروں سے دیکھتے تھے ایک دوسرے سے کسی حد تک متنفر بھی تھے پھر بھی ہم ایک دوسرے کی عزت کرنا چاہتے تھے۔ اس طرح جس طرح دو مختلف مذاہب کے پیرو اپنے رکھ رکھاؤ اور اصول رواداری کے زیر اثر ایک دوسرے کی عزت کرنا چاہیں اور ہر دو کو اس بات کا پورا یقین ہو کہ دوسرا ہمارے مذہبی عقائد سے متاثر نہیں ہو سکتا۔

ہم نے شباب کی پہلی سیڑھیوں پر قدم رکھا ہمارا اختلاف بڑھ چلا۔ ہم ایک دوسرے سے کھنچ گئے پھر ایک وقت ایسا آیا کہ وہ میری فطرت کی سختی سے گھبرا کر خاطر خواہ طور پر بے نیاز ہو گئی۔ اس میں میری مخالفت کی قوت نہ تھی۔ اس کی کئی پچھلی تصویروں کو دیکھ کر میں نے کہا تھا "اب تم عنقریب ایک بہتر تصویر بنا ؤ گی" وہ ہنس دی "مجھے یقین نہیں کہ کبھی بنا سکوں گی"۔ "نہیں" میں نے کہا "کیوں نہیں" ایک دن وہ ایک نئی تصویر لائی۔ میں دیکھنے لگا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ میری فطرت کی نوعیت نے اس کے لئے ایک انوکھا آرٹ مہیا کر دیا تھا۔ وہ آرٹ کی اس نوعیت سے مسحور تھی۔ اس میں کھو گئی تھی۔ اس وقت میرا خیال تھا کہ اگر وہ اس حقیقت کے لئے میری ممنون نہ ہوتی تو مجھ سے کسی قسم کا تعلق رکھنا اسے ناگوار ہوتا۔

جو تصویر میں دیکھ رہا تھا اس کے متعلق وہ کہہ رہی تھی "نہیں معلوم میں کیا بناتی ہوں مجھے نہیں معلوم تکمیل کی کتنی سیڑھیاں ابھی باقی ہیں۔ باقی ہیں۔ یا ابھی میں نے ان پر قدم نہیں رکھا"۔۔۔۔ ایک پیراستہ کمرہ تھا۔ پردوں کی ہلکی جنبش اور پھولوں کے جھکاؤ سے پتہ چلتا تھا کہ ہوا کے ہلکے جھونکے آ رہے ہیں۔ ایک بیچی سی کھلی کھڑکی کے پاس ایک خوبصورت آراستہ دیوان پر نرم گدوں کے بیچ میں ایک کریہہ منظر بڑھیا عجیب وغریب انداز سے دراز تھی۔ اس آنکھوں میں وہ رنگ تھا جو کسی خوبصورت جوان آنکھوں میں ہو۔ اس کے لب ایک دلکش تبسم سے وا تھے۔ اس کا بدنما مرجھایا ہوا پیر نرم پاؤدان پر رکھا تھا۔ اس انداز سے جیسے ایک خوبصورت پیر رکھا جائے۔ میں ہنس دیا۔ ہنسنے لگا۔ خوب ہنسا۔ اس قدر اور اتنی دیر تک ہنسا کہ سانس پھولنے لگی "خوب! خوب! کیا مذاق ہے کس قدر پر لطف مذاق۔ بالکل نئی چیز ہے تمہاری شایان شان، تم خوب بناتی ہو تمہیں بنا سکتی ہو! ۔۔۔ ہا ہا ہا ۔۔۔ تمہیں بنا سکتی ہو"۔ مجھے احساس نہ تھا کہ کسی طنز کا جواب بدتر طنز سے دے رہا ہوں، کسی اوچھے وار کو زیادہ بے ڈھنگے طور پر واپس کر رہا ہوں کسی غلط اٹھائے ہوئے پردہ کو شرمناک طور پر نوچ کر اور پھاڑ کر پھینک دکھا رہا ہوں، جز بز ہو گیا ہوں۔ بپھر گیا ہوں کہ کسی پردے کو اٹھانے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ میں نے سمجھا وہ خفیف ہو رہی ہو گی۔ رومانسی ہو گئی ہو گی لیکن نہیں، وہ نفرت سے مسکرا رہی تھی۔

اس کے بعد کتنے ہی دنوں تک میں نے شہلا کے خاموش اور زرد بھوت کو نہیں دیکھا تھا۔ ہاں بظاہر وہ زندگی کی جیتی جاگتی مورت نہ تھی۔ ایک دن وہ اچانک آ گئی اور میرے سامنے ایک تصویر رکھ دی۔ میں نے مسکرا کر تصویر اٹھا لی خیال تھا کہ ابھی ایک حسین لڑکی کے ہاتھ میں ڈنڈا ہو گا اس کی کمر جھکی ہو گی، اور وہ نقاہت سے، دور کسی فاصلہ پر ایک فلک بوس پہاڑی کو دیکھ رہی ہو گی، دیکھ رہی ہو گی کہ آسمان پہاڑی سے کتنی دور ہے۔ اور یہ دوری بھی ہے کہ نہیں۔ لیکن یہ ایک معصوم دلکش چہرہ تھا کسی قدر آگے کو جھکا ہوا اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی دھندلی سرخی مائل تھیں گویا ان میں شعلے نکل رہے ہوں۔ منہ کھلا ہوا تھا معصوم منہ، نکل لب، ماتھے پر شکنیں تھیں، پریشانی، اداسی اور غصہ کی، پورا چہرہ ایک معصوم غصہ اور کرب کی تصویر تھا لیکن آنکھیں ۔۔۔۔ میں ہنسا نہیں، مسکرا بھی نہ سکا۔ "ہاں! میں نے کہا اچھی ہے"۔۔۔۔ "کتنی اچھی ہے" "بہت اچھی ہے" کسی گہری تنقید کے لئے میں سن ہو چکا تھا۔ اور گہری تنقید ضروری تھی۔ میں بچوں کا سا برتاؤ کر رہا تھا۔ اسے غالباً یہ بات محسوس ہو رہی تھی۔ میں اس کے علاوہ اور کچھ نہ کہہ سکا کہ "میرے علاوہ اور کوئی تمہاری تصاویر کی اتنی قدر نہیں کرتا" اس کے شبہات مٹانے کی بے اختیار کوشش میں میرے ان الفاظ میں غالباً وہ رنگ آ گیا تھا جس کی وہ منتظر تھی۔ وہ ہنس دی۔ اس ہنسی نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے اس کے چہرے کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں کس شدت سے افسردہ تھیں، ان میں کرب تھا، ایک دبا ہوا کرب۔ یہ تغیر ایک عرصہ سے تھا۔۔۔؟ تغیر؟ نہیں! غالباً ۔۔۔۔ غالباً کوئی حسین ترین کلی کھلنے سے پہلے مرجھا گئی تھی، شاید وہ کھلنے والی کلی کھلنے کے لائق نہ رہی تھی۔ غالباً وہ چھوٹی تھی مگر بڑھ بھی نہ سکی کسی تاثر، تو ضربوں نے اسے نڈھال کر دیا تھا اور ۔۔۔۔ اور وہ نڈھال ہی رہنا چاہتی تھی! وہ نڈھال رہ کر فوراً مرجھا جانا چاہتی تھی! مجھے احساس نہ تھا کہ میں کیا سوچ رہا ہوں۔ اچانک معلوم ہوا کہ یہ تصویر اس کی اپنی تصویر تھی۔ نظریں اٹھائیں تو وہ مجھے گھور رہی تھی کس طرح؟ مجھے معلوم نہیں! لیکن جیسے کوئی کسی برترین دیوتا کو اپنی روح کا دان دیکر بغیر کچھ صلہ چاہے واپس ہو رہا ہو!

وہ چلی گئی اور میرا دیوانہ دل اس سے بیزار ہو گیا۔ وہ دن۔ وہ زمانہ، اُف!

میری دیوانگی گھٹنے لگی میں نے اپنی پوری قوت کے ساتھ اسے دبا دینا چاہا۔ میں نے چھپنا چاہا۔ اپنی فطرت کو چھپانا چاہا میری فطرت کی وہ شدت اندر ہی اندر کھولنے لگی، ابلنے لگی۔ اگر اسی کو وحشت کہتے ہیں، اگر یہی دیوانگی ہے۔ تو ان دنوں میں وحشی ہو گیا تھا۔ دیوانہ ۔۔۔ وہ نقوش دھندلے پڑ گئے ۔۔۔ مٹنے لگے۔ کیوں، مجھے نہیں معلوم، یکا یک انہوں نے مجھ سے درخواست کی انہوں نے مجھ سے تڑپ کر کہا۔ "ہم فنا ہو رہے ہیں، ہم میں جان ڈال دو۔ ہم میں جان ڈال دو!" مجھے اپنی بے بسی کا احساس ہونے لگا۔ میں نے اپنے احساسات، خیالات، اپنے جذبات تصورات اور اپنے دل و دماغ کی پوری قوت سے ان میں جان ڈالنا چاہی۔ لیکن وہ مُردہ ہوتی گئیں میں بناتا رہا اور وہ مٹتی گئیں۔ میں تھک گیا۔ میری روح شل ہو گئی۔ اسی دیوانگی میں پنسل سے کاغذ کے پرزوں پر چھپ کر پوشیدہ رہ کر میں نے متواتر وہ نقوش بنائے اور پرزوں کو پھاڑ تا رہا پھینکتا رہا۔ تکمیل سے پہلے ہونے کے بھی نقوش بالکل نامکمل تھے کیسے ہی سیاہ کیسے ہی دھندلے، کتنے ہی

بڑے کس قدر بھی گہرے، وہ مکمل نہ تھے ـــ لیکن ایک بار صرف ایک بار اور آخری بار آدھے مٹے ہوئے، بہت دھندلے، عجیب۔ اُف وہ میری عجیب دنیا ـــ! اور میں نے اس پرزہ کو دیوانگی میں پاگل ہو کر مٹھی میں بھینچ لیا اور ـــ سو گیا ـــ شاید میں پہلے سے سو رہا تھا۔

جب آنکھ کھلی مٹھی کھل چکی تھی۔ ہاتھ کرسی کے دستہ پر سے لٹک رہا تھا۔ وہ پرزہ موجود نہ تھا لیکن کوئی چیز تصور میں واپس آگئی تھی جو میں ڈھونڈھ رہا تھا۔ وہ مجھے مل گیا تھا مگر ... میں اب بھی دیوانہ تھا، میں اب دکھی تھا، مغموم تھا۔ بے چین تھا، تڑپ رہا تھا ـــ! ایک دن میں واپس آیا تو شہلا میرے کرہ میں موجود تھی۔ مجھے دیکھکر سہم گئی۔ زرد چہرہ سفید پڑ گیا۔ جیسے اس کا سامنا اچانک کسی خوفناک ...... دیوتا سے ہو گیا ہو۔ مجھے تعجب ہوا۔ اس کی بڑی آنکھیں عجیب معلوم ہو رہی تھیں۔ لب جمے ہوئے تھے۔ اور اس نے اپنی انگلیوں کو خوف سے ایک دوسرے میں جوڑ رکھا تھا ـــ سامنے میز پر کوئی تصویر پڑی تھی۔ میں جھکا ...... اور میرا دماغ چکرا گیا معطل ہو گیا۔ میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور میرا سر بازوؤں پر آ رہا ـــ!

کسی نے وہ تصویر اٹھا لی۔ میری انگلیوں میں تشنج پیدا ہوا۔ دل چاہا۔ اس کا گلا گھونٹ دوں، اسے تڑپا کر مار ڈالوں۔ اسے اس طرح بے حس کر دوں کہ اس میں سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت باقی نہ رہے۔ میری خونبار نظروں نے اس کی نظروں سے ملنے سے انکار کر دیا۔ مگر یکایک بالکل خلاف توقع مجھے یہ الفاظ سنائی دیئے۔

"تم یہی چاہتے ..... تم یہی چاہتے تھے! کمینے انسان! اس ذلیل راز کی وہ شرمناک ہچکیاں میرے ناخنوں میں ہیں، تم نے مجھ سے بھیک مانگی، اور ..."

اور میں نے دے دی!" وہ دیوانہ وار ہنسی اور آہستہ، دبی ہوئی اور غیر قدرتی آواز میں کہنے لگی: "کمینے دیوتا! ـــ میرے ظالم محبوب! ـــ میری روح کی تمام پرستشوں کے عارضی اور مہلک مرکز ـــ! تمہارے آہنی تازیانوں نے مجھے بےقصور سزائیں دی ہیں، اوہ ...... اور کیسی سزائیں! خود غرض، بے نیاز، بے دل! مجھے سب کچھ یاد ہے۔ زندگی کا ایک ایک لمحہ، ایک ایک دن اور ایک ایک رات! تمہیں کچھ معلوم بھی نہیں ـــ! تمہیں کچھ معلوم بھی نہیں! خونخوار دیوتا! بے دل درندے! میں اپنی روح کی تمام گہرائیوں سے، میں اپنے جسم کی تمام قوتوں اور حسوں کے ساتھ تیری پوجا کرتی ہوں اور ..... اور کیسی پوجا ـــ! ـــ کاش!" اس کی آواز میں ایک چیخ پنہاں تھی۔ "ایک بار سر اٹھاؤ اور ـــ میری طرف دیکھو!" میرے سر پر اس کی کانپتی ہوئی انگلیاں محسوس ہوئیں۔ "ایک بار ادھر دیکھو!" اس نے گویا دم توڑتے ہوئے کہا: "اے غیر انسانی انسان!" اور میں بے تاب ہو گیا ـــ!

ہماری زندگیاں ایک دوسرے سے منسلک ہو گئیں۔ آہ وہ مسرور تھی

کتنی مسرور! اُف کس قدر مسرور! ۲۴ سالہ، زرد شباب، ہلکان اور نحیف شباب، کس درجہ جاذب، کتنا بے مثل! کس قدر شدید اور کتنا عرفانی! اندھا شباب اور کس قدر حسین طور پر نڈھال، جس نے ہمیشہ سے سب کچھ میری نذر کر دیا تھا ـــ!

"اور میں نے ایک اور تبسم نذر کیا ....."

"پھر ایک اور ....

"اور پھر ایک اور ... !

کیا میری آئندہ زندگی کے لئے کسی تفصیل کسی بیان کی ضرورت ہے؟ میں نہیں کہہ سکتا ـــ میں کچھ نہیں کہہ سکتا ـــ !!

"لیکن جب اس پر بھی وہ مسکرائی ـــ میں نے ازخود رفتہ ہو کر ـــ اپنی گرفت ـــ سخت کر دی اور ـــ اس کے مردہ جسم کو اٹھا کر پھینک دیا ـــ !

میرے پاس کیا ہے؟ وہی جو لڑکپن اور جوانی میں تھا۔ وہ تیز تر ہو رہا ہے۔ میری قوتوں کے زوال کے ساتھ تیز تر! ـــ!

وہ شدت میری قوتوں سے پورا تاوان لے رہی ہے ـــ اور میں دے رہا ہوں! میں دے رہا ہوں!! کسی دنیا کے لئے ـــ اس دنیا کے لئے ـــ اس وقت کے لئے جب یہ تاثرات میری انسانی قوتوں پر حاوی ہو کر انہیں فنا نہ کر سکیں گے ـــ جہاں وہ میری قوتوں سے زیادہ شدید نہ رہ سکیں گے! جہاں مجھے ان کی شدت کی مناسبت سے قوتیں عطا ہوں گی! اور ایک اشارہ سے محض ایک اشارہ سے میں ان کے ایک ایک روح گسل راز کو اپنے لئے طشت ازبام کر لوں گا ـــ میں اس سیاہ پردہ کو اتار پھینکوں گا۔ اور اس کی تمام گہرائیوں کو اپنی فطرت سے اپنے دل و دماغ اپنی روح اور اپنے جسم میں جذب کر لوں گا ـــ !

"شہلا! .... دو آنکھیں اور ان کی گہرائیاں!"

(صاحبزادی)

کشور محمود علی

داستانِ درد

ناچیز ہوں مگر ترے آنے کی دیر ہے — ذرّے کو آفتاب بنانے کی دیر ہے

دُنیا کو جگمگا دے مرے درد کی چمک — کہتی ہوں میں دلوں کے دکھانے کی دیر ہے

تارے مرے، شفق مری، خورشید و مہ مرے — اب بڑھ کے کُل جہان پہ چھانے کی دیر ہے

خود ہی سنبھل میں جاؤنگی دُنیائے عشق میں — دو چار بار ٹھوکریں کھانے کی دیر ہے

اہلِ زمانہ چونکنے والے ہیں خواب سے — ان غافلوں کا شانہ ہلانے کی دیر ہے

ہر آدمی ہے اپنی جگہ ایک کائنات — ان اُجڑی بستیوں کے بسانے کی دیر ہے

سنتی ہوں شام ہجر کی تکمیل درد میں — بس ایک میرے غم کے فسانے کی دیر ہے

میری نظر نظام جہاں کو بدل نہ دے — دُنیا کو بے قرار بنانے کی دیر ہے

تجھکو سناؤنگی میں محبت کی داستاں — اِک بار تیرے دیس میں آنے کی دیر ہے

دُنیا تڑپ اُٹھے گی ہمارے فسانے سے — وہ داستانِ درد سنانے کی دیر ہے

جھومے گی رات، وجد میں آئیگی کائنات
نجمہ ترے ستار اُٹھانے کی دیر ہے

نجمہ تصدق

روسی سپاہی

۲۵ نومبر ۱۹۴۱ء کا واقعہ ہے۔ روسی فوج ماسکو سے تقریباً بارہ میل کے فاصلے پر اپنے دارالسلطنت کی حفاظت کے لئے پڑاؤ ڈالے پڑی تھی جس طرف نگاہ جاتی تھی سپاہیوں کے خیمے ہی خیمے نظر آتے تھے۔

رات کا وقت تھا۔ تھوڑے سے پہرہ داروں کے سوا تمام سپاہی اس آرام واطمینان کی نیند سو رہے تھے۔ جیسے وہ میدان جنگ میں برف کے درمیان نہیں بلکہ نرم وگرم بستروں پر اپنے گھروں میں میٹھی نیند کے مزے لے رہے ہیں۔ آغوش خواب میں پڑے ہوئے سپاہیوں میں اگر کوئی بیدار تھا تو وہ دانیلا تھا۔ اسے نیند آتی بھی تو کیسے؟ وہ تو اپنی محبوبہ کی جدائی میں تڑپ رہا تھا۔

دانیلا کی محبوبہ کا نام نانکا تھا۔ لوگوں کی نگاہوں میں اسے کوئی امتیاز وخصوصیت حاصل ہو یا نہ ہو لیکن دانیلا تو اسے حسن وجمال اور لطافت ورعنائی کی ملکہ سمجھتا تھا۔ اسے یہ بھی خبر نہ تھی کہ نانکا اس سے محبت کرتی ہے یا نہیں مگر وہ اس پر جان ودل قربان کرتا تھا۔

آج پریڈ کے وقت دانیلا کے سپہ سالار نے فوج کے سامنے ایک مختصر سی تقریر کی تھی جس میں کہا تھا کہ "نازی فوج بسرعت تمام بڑھتی چلی آ رہی ہے۔ اور وہ ہم سے اپنے ان سپاہیوں کا انتقام لینا چاہتی ہے جن کو ہمارے بہادر اور شجاع بھائیوں نے اپنی آزادی کی مقدس جنگ میں پیوند خاک کر دیا ہے۔ نازی چاہتے ہیں کہ جس طرح انہوں نے ناروے، ڈنمارک اور بلجیم وغیرہ کو محکوم بنا لیا ہے روس کو بھی غلام بنا لیں اس لئے کل کے معرکے میں ہمیں دشمنوں پر ثابت کر دینا ہے کہ ہم کو دوسروں کی طرح غلام نہیں بنایا جا سکتا۔ یاد رکھو ہم یہ ثبوت زیادہ سے زیادہ قربانیاں ہی دے کر پیش کر سکتے ہیں۔"

سپہ سالار کے یہ الفاظ اب تک دانیلا کے کانوں میں گونج رہے تھے۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ آج کی رات کے بعد خونخوار نازیوں سے جو معرکہ پیش آنے والا ہے اس میں وہ جانبر ہوگا یا حرمت وطن اور قربانگاہ آزادی پر بھینٹ چڑھ جائے گا۔ اس لئے وہ کم از کم آج کی شب میں اتنا جان لینا چاہتا تھا کہ وہ جس طرح نانکا سے محبت کرتا ہے۔ نانکا بھی اسی طرح اس سے محبت کرتی ہے یا نہیں۔ اگر اسے معلوم ہو گیا کہ اس کی محبوبہ اس کی محبت کی قدر کرتی ہے تو وہ کل نئے جوش اور ولولے سے دشمنوں کا مقابلہ کریگا اور زندگی کی اس آخری رات کے جو چند لمحات اسے میسر آ جائیں گے ان میں وہ سکون وراحت کی نیند سو سکے گا۔

دانیلا نے سر اٹھا کر ایک بار اپنے گرد وپیش نگاہ ڈالی تمام سپاہی بیخبر سو رہے تھے۔ وہ سوچنے لگا: "ان سونے والوں میں کسے معلوم ہے کہ کل کے معرکے میں کتنے ملک کی حریت وآزادی پر قربان ہو کر ہمیشہ کے لئے موت کی آغوش میں جا سوئینگے۔ اور مجھے اپنے ہی متعلق کونسا اطمینان ہے کہ آج رات کی طرح میں کل کی رات دیکھنے کے لئے زندہ بچ جاؤنگا۔" اس کا سلسلہ خیال اسی طرح بڑھتا چلا گیا وہ تصور کی آنکھوں سے دیکھنے لگا۔ بگل بجا۔ فوج آگے بڑھی جنگ شروع ہو گئی۔ توپیں گرجنے لگیں، طیارے گرنے اور آگ برسانے لگے، موت کا بازار گرم ہو گیا......"

اس ہولناک تصور نے اسے پریشان کر دیا وہ گھبرا کر چونک پڑا اس کا دل نانکا سے آخری [illegible] کے لئے اور بھی بے چین ہو گیا۔ وہ اپنا بھاری کوٹ پہنکر خیمے سے باہر ہو گیا۔ وہ سوچتا جا رہا تھا: "صبح ہونے سے پہلے واپس آ جاؤں گا کسی کو کیا خبر کہ میں کہاں گیا تھا۔ ایسا قیمتی موقعہ پھر کب ہاتھ آ سکتا ہے؟" یہی سوچتے سوچتے وہ آخری چوکی پار کر گیا۔

رات چاندنی تھی مگر کہر کی وہ شدت تھی کہ ایک گز کے فاصلے کی چیز بھی صاف نظر نہ آتی تھی، ہلکی ہلکی برفباری بھی ہو رہی تھی۔ اس لئے سڑک برف سے ڈھک گئی تھی۔ دانیلا اپنے بھاری بوٹوں سے برف کو پیستا چلا جا رہا تھا۔ اس نے ایک دوبار پیچھے مڑکر دیکھا بھی مگر کوئی نظر نہ آیا۔

نانکا ماسکو کی ایک گلی میں رہتی تھی۔ سو دانیلا چلتے چلتے سوچنے لگا: "بس تین میل کا راستہ اور ہے۔ اس کے بعد میری محبوبہ دلنواز نانکا میرے حلقۂ آغوش میں ہوگی میں اسے اپنے دونوں بازوؤں میں جکڑ کر اپنے سینے سے...."

دانیلا یکایک رک گیا۔ پیچھے سے کسی کے پاؤں کی آہٹ سنائی دے رہی تھی۔ وہ سوچنے لگا شاید اس کے علاوہ کوئی اور بھی مورچے سے باہر نکلا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اس کی فوج کا کوئی نہ ہو نازی جاسوس ہو۔ وہ اپنے دانتوں کو زور سے دبا کر ایک درخت کی آڑ میں کھڑا ہو گیا۔ پاؤں کی چاپ رفتہ رفتہ قریب آئی اور سامنے سے گذر گئی۔ وہ چاپ دانیلا کو گوش آشنا سی معلوم ہوئی۔ وہ ان بوٹوں کی آواز کو کوشش کرنے پر بھی اپنے حافظے سے دور نہ کر سکا۔ وہ اپنے مخفی مقام سے آگے بڑھا مگر اس نے اتنا لحاظ رکھا کہ اس کے آگے جانے والے کو اس کی خبر نہ ہونے پائے۔

دانیلا کو ایک خاص جذبہ کھینچے لئے جا رہا تھا اس لئے تین میل کی مسافت اسے کچھ بھی معلوم نہ ہوئی۔ اب وہ ماسکو کی ایک تنگ گلی میں پہنچ چکا تھا یہی وہ گلی تھی جس میں دانیلا کی محبوبہ نازکا رہتی تھی۔ ایک تو گلی تنگ، دوسرے دو رویہ فلک بوس عمارتیں۔ اوپر سے پڑ رہی تھی کہر اس سے گلی اور بھی تیرہ و تار ہو رہی تھی۔ دشمن کے بمبار طیارے امن پسند شہریوں کو بھی بموں کا نشانہ بنانے میں باک نہ کرتے تھے۔ اسی لئے شہر میں رات کو روشنی بھی نہیں جلتی تھی، وہ تو کہو دانیلا ماسکو ہی کا باشندہ تھا۔ اگر وہ کہیں باہر کا رہنے والا ہوتا۔ تو اس کا اس گلی تک میں پہنچنا بھی دشوار تھا۔ وہ خیال ہی خیال میں اپنی پیاری نازکا سے باتیں کرتا ہوا اس کے دروازے پر جا پہنچا۔

دروازہ بند تھا۔ دانیلا سیڑھی پر چڑھ گیا۔ اس نے ایک بار اس غرض سے جسم کو حرکت دی کہ کپڑے پر پڑی ہوئی برف جھڑ جائے۔ وہ خوش تھا کہ اب کوئی لمحے میں نازکا اس کے پرشوق بازوؤں کی گرفت میں ہوگی۔ اس کے چہرے پر مسرت و شادمانی کی ایک ہلکی سی لہر دوڑ گئی۔ اس نے دروازہ کھٹکھٹانے کے لئے اپنا ہاتھ اوپر اُٹھایا۔ مگر پھر ایکا ایک ہاتھ رُک گیا۔ وہی گوش آشنا پاؤں کی چاپ اُسے پھر سنائی دینے لگی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ پہلے مسلسل آواز آ رہی تھی، اب قدرے رُک رُک کر ایسا معلوم ہوتا تھا؛ چلنے والا ڈر رہا ہے اور چور کی طرح رُک رُک کر قدم اٹھا رہا ہے۔

ایکبار۔ پاؤں کی چاپ سنائی دی، پھر رُک گئی، پھر سنائی دی، اس کے بعد ایسا معلوم ہوا، وہ تیزی سے مکان کی سیڑھیوں پر چڑھ گیا جس مکان سے یہ آواز آ رہی تھی۔ وہ تقریباً اس مکان کے سامنے ہی تھا جس کے دروازے پر دانیلا کھڑا تھا۔

دانیلا آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کرنے لگا مگر ایک عکس کے سوا اسے کچھ نظر نہ آیا۔ دانیلا نے سُنا اس شخص نے پہلے تین بار، پھر دو بار، اس کے بعد پانچ بار دروازے کو کھٹکھٹایا۔ دروازہ کھل گیا اور وہ اس میں داخل ہوگیا۔

دانیلا کا دل دھڑکنے لگا اس نے سوچا۔ یقیناً یہ کوئی غدار ہے، اس کا ہاتھ بے ساختہ کمر پر چلا گیا۔ بھری ہوئی پستول کیس میں موجود تھی۔ اس نے کیس کا بٹن کھولا پستول کے دستے پر ہاتھ رکھا۔ پستول سردی سے برف ہو رہی تھی۔ دانیلا سوچنے لگا اس کے دل نہیں ہے۔ اسے دوست اور دشمن میں امتیاز کرنا نہیں آتا۔ یہ جس کے قبضے میں ہوتی ہے اسی کو پہچانتی ہے اور اسی کی مدد کرتی ہے لیکن غدار وطن کے پہلو میں تو دل ہوتا ہے۔ وہ دوست اور دشمن کے فرق کو بھی سمجھتا ہے پھر کتنی عجیب بات ہے کہ وہ جس ملک میں پیدا ہوتا ہے جس کی آغوش میں پلتا ہے، اسی سے غداری کرتا ہے۔ اس کی حریت و آزادی کو دشمن کے ہاتھ فروخت کرتے ہوئے اسے مطلق شرم محسوس نہیں ہوتی وہ کتنا ذلیل اور بے حمیت ہوتا ہے، شاید اس میں انسانیت کا ادنیٰ سے ادنیٰ شائبہ بھی موجود نہیں ہوتا۔

ایکبار۔ دانیلا کے خیال میں انقلاب ہوا۔ "روس کا باشندہ اور اشتراکیہ روس کا باغی؟ یہ ناممکن ہے"۔ لیکن ساتھ ہی دل نے جواب دیا "اس دنیا میں کوئی چیز ناممکن نہیں، خود غرضی کا مادہ تو انسان کی سرشت میں داخل ہوتا ہے اس لئے جب وہ اُبھر جاتا ہے۔ تو انسان ناکردنی سے ناکردنی بھی کر گزرتا ہے"۔

اس نے سوچا چل کر دیکھنا چاہیئے کہ آخر وہ ہے کون؟ لیکن دل نے کہا "پیاری نازکا سے ملنے کا موقع پھر میسر نہ آئے گا"

دانیلا نے دل کو سمجھایا "بے شک مجھے نازکا سے محبت ہے۔ وہ مجھکو جان سے زیادہ محبوب ہے لیکن روس سے زیادہ محبوب نہیں۔ روس کے لئے ایک نازکا تو کیا چیز ہے۔ سو نازکا کو بھی بے دریغ قربان کیا جاسکتا ہے"۔

دانیلا اچھل کر اس مکان کے دروازے پر پہنچ گیا۔

کھٹکھٹاہٹ کے جس اشارے پر پہلی بار دروازہ کھلا تھا اسی اشارے سے دانیلا نے بھی کام لیا۔ دروازہ کھل گیا، دروازہ کھولنے والی ایک بوڑھی عورت تھی۔ جو دانیلا کو چڑیل سے زیادہ کریہہ المنظر معلوم ہوئی۔

بڑھیا نے اپنے خاص لہجے میں سوال کیا "اسی کام سے"؟

"ہاں اسی کام سے"۔

"کیا کہنے ہیں تم لوگوں کی حب الوطنی کے"؟

دانیلا کچھ جواب نہ دے سکا

"تو میں تمہارے بارہ میں اوپر اطلاع دیدوں"؟ بڑھیا نے پوچھا۔

"نہیں میں خود اوپر چلا جاؤں گا سب اوپر ہی ہیں نہ"؟

"ہاں سب اوپر ہی ہیں۔ ہر فان خریدتا ہے اور تم لوگ.....؟

بڑھیا نے ایک عجیب انداز سے اپنے ہاتھ کو حرکت دی اور ایک کمرے میں جا کر اندر سے دروازہ بند کر لیا۔

دانیلا بڑی احتیاط سے اوپر پہنچا۔ کمرے کا ایک دروازہ کچھ کھلا تھا۔ اس سے ایک ہلکی سی روشنی باہر نکل کر تاریکی سے جنگ کر رہی تھی۔ دانیلا نے چپکے چپکے دروازے پر جا کر اندر دیکھا میز پر بجلی کا لیمپ جل رہا تھا۔ ایک جرمن میز کی ایک جانب کھڑا تھا اور دروازے کی طرف پشت کئے ایک روسی افسر کھڑا تھا۔ اس کے کوٹ کے اوپر لگے ہوئے سنہری حروف اور سنہری فیتے صاف نظر آ رہے تھے۔ دانیلا نے سُنا۔ وہ غدار وطن سہمی ہوئی آواز میں کہہ رہا تھا "جناب عالی! یہ نقشے

بڑی مشکل سے دستیاب ہوئے ہیں۔ اب مجھکو رخصت دیجئے۔ اگر یہاں کے کسی ملازم نے مجھے پہچان لیا .....۔"

"اس بڑھیا کے سوا جس نے دروازہ کھولا تھا مکان میں کوئی نہیں ہے" جرمن نے کہا

"پھر بھی حالت خطرے سے خالی نہیں .... اس کے علاوہ مجھے ایک اور کام کرنا ہے"

"وہ کیا؟" جرمن نے ایک مکر آمیز ہنسی کے ساتھ سوال کیا۔

"میں تنہا اپنی فوج سے باہر نہیں نکلا ہوں"

"اچھا!"

"جی ہاں، مجھ سے پہلے ایک اور سپاہی اسی طرف آ رہا ہے"

"اگر میں اس سے پہلے پہنچ گیا تو اس کا انتظار کروں گا"

"پھر؟"

"اس کے وہاں پہنچنے پر ....."

"حماقت محض حماقت میرے دوست .... کیا تمہیں یقین ہے کہ تم اس طرح کامیاب ہو سکتے ہو؟"

"کامیاب نہ ہونے کی وجہ؟ ایک افسر کے مقابلے میں ایک سپاہی کی بات کون مانے گا؟"

"خیر تو اسے تم جانو"

جرمن نے ایک تھیلی پھینک دی جو "تھپ" کی ایک نفرت انگیز آواز کے ساتھ میز پر گری اور روسی افسر کے ہاتھوں کی گرفت میں چلی گئی

"پورا جتنا آپ نے کہا تھا۔؟"

"اگر اطمینان نہ ہو تو گن سکتے ہو؟"

"اب گننے کا وقت نہیں ہے، بارہ کا گھنٹہ بج رہا ہے۔ غالباً میری تلاش ہو رہی ہو گی اب میں اجازت چاہتا ہوں"

روسی نے اس گناہ کی کمائی یعنی حرمت وطن کی قیمت کو اپنے پتھر سے زیادہ سخت کلیجے کے پاس رکھ لیا۔

"افسوس ہے لفٹیننٹ! میرے پاس ایک ہی گھوڑا ہے جس پر سوار ہو کر مجھے یہاں سے جانا ہے۔ ورنہ میں آپ کو پیدل نہ جانے دیتا" جرمن نے کہا

"آپ میری فکر نہ کریں۔ مجھے کسی طرح کا خطرہ نہیں ہے۔ اچھا آداب عرض!"

لفٹننٹ کوٹ پہن کر اور ٹوپ سر پر رکھ کر باہر نکلا۔ دانیلا اسے آتے دیکھکر آڑ میں کھڑا ہو گیا لفٹیننٹ اپنی فکر میں تھا۔ اس نے کسی طرف توجہ نہیں کی سیدھے باہر جا کر اس نے دروازہ بند کر دیا۔

دروازے کے بند ہونے پر اطمینان کا سانس لیکر جرمن جاسوس نقشہ سمیٹنے لگا۔ دانیلا ہاتھ میں پستول لیکر کمرے میں گھس گیا۔ جرمن نے چونک کر دیکھا۔ دانیلا پستول ہاتھ میں لئے دروازے پر کھڑا تھا۔ بولا "کون؟"

"میرا نام دانیلا ہے۔ میں ایک روسی سپاہی ہوں"

"یہاں کیوں آئے ہو؟"

"اپنے وطن کو تباہی سے بچانے"

"اگر تمہارا یہ مقصد ہے تو واپس چلے جاؤ کل تمہیں اس کا بہترین موقع ملے گا"

"میرے لئے آج ہی بہترین موقعہ ہے!"

"تم یہاں کیوں آئے ہو؟"

"اس نقشے کو لینے کے لئے"

"اگر تم اس غرض سے آئے ہو تو تمہیں ناکام واپس جانا پڑیگا"

"نہیں تمہیں اطمینان رکھنا چاہئے۔ کہ میں ناکام واپس نہیں جا سکتا"

جرمن جاسوس نے کچھ دیر تک دانیلا کو غور سے دیکھا پھر کہا "کتنی رقم چاہتے ہو؟"

دانیلا گرج کر بولا "تم مجھے دولت کا لالچ دلاتے ہو کیا تم سمجھتے ہو۔ کہ روس میں دو غدار وطن ہو سکتے ہیں؟"

جرمن ایک خشک ہنسی ہنسکر بولا "تم بھی کتنے نادان ہو اگر دولت نہیں تو کیا اپنے ہاتھ سے اپنے گلے میں پھانسی کا پھندا ڈالنا چاہتے ہو تم چاہتے ہو کہ نقشہ لے کر جاؤ۔ اچھا فرض کر لیا کہ تم نقشہ لے گئے اور اپنے مارشل کے سامنے تم نے اپنی کارگذاری پیش بھی کی لیکن تمہاری بات پر یقین کون کریگا؟ تمہاری ہستی اس کے سوا کچھ نہیں کہ تم ایک معمولی سپاہی ہو۔ اور معمولی سپاہی کی بات پر کون یقین کرتا ہے وہ تمہاری باتیں سنکر تمہارا مارشل کہے گا۔ یہ سپاہی ترقی چاہتا ہے اور اس کی ترقی پسندی کی حرص اتنی بڑھ گئی ہے۔ کہ اسے مناسب اور نامناسب میں بھی تمیز باقی نہیں رہی۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہارا کورٹ مارشل ہوگا اور تم گولی سے اڑا دیئے جاؤ گے۔ بیوقوفی نہ کرو جتنا مال چاہو میں دینے کو تیار ہوں"

جرمن کوٹ کے جیب سے ال کی تھیلی نکالنے لگا۔

دانیلا نے غصے سے کانپتے ہوئے کہا "مجھے کچھ پروا نہیں کہ گولی سے اڑا دیا جاؤں گا یا پھانسی کے تختے پر لٹکا دیا جاؤنگا۔ مجھے گولی کے سائے اور پھانسی کے تختے پر بھی یہ اطمینان رہے گا کہ میں نے روس کو ایک بڑی تباہی سے بچا لیا"

جرمن نے کہا "لیکن تمہیں یقین رکھنا چاہئے کہ تم مرکر بھی نقشہ نہیں پا سکتے"

"نہیں جاسوس صاحب۔ آپ کا خیال غلط ہے اس فرزند وطن کو کوئی مار نہیں سکتا جس کی مادر وطن کو ضرورت ہو اور روس کو میری ابھی بہت ضرورت ہے"

"تمہارے جیسے دماغ باختہ آدمی کو کاغذ کا نقشہ تو نہیں مل سکتا۔ البتہ سینے کا نقشہ دیا جا سکتا ہے۔"

ابھی جاسوس کے یہ الفاظ کمرے میں گونج ہی رہے تھے کہ یک وقت دو پستولوں کے چلنے کی آواز سنائی دی۔ جاسوس سینے پر ہاتھ رکھ کر دھم سے زمین پر گر پڑا اور دانیلا کے دائیں بازو سے خون کا فوارہ جاری ہو گیا۔

دانیلا کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ شدت درد سے اس کی حالت دگرگوں ہونے لگی۔ لیکن وطن کا خیال آتے ہی وہ اپنی تکلیف بھول گیا اس نے جھک کر دیکھا جرمن جاسوس کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ دانیلا نے جاسوس کی جیب سے نقشے نکالے۔ پستول کی گولی نقشوں کو چھید کر جرمن کے سینے سے پار ہو گئی تھی۔ نقشے خون سے تر ہو کر سرخ جھنڈے کے پھریرے بن گئے تھے

دانیلا لڑکھڑاتا ہوا نیچے اترا جرمن جاسوس کا گھوڑا کھڑا تھا۔ اس پر سوار ہو کر اس نے اپنے مورچے کی راہ لی۔ وہ جیسے جیسے آگے بڑھ رہا تھا اس کا دماغ گھومتا ہوا سا معلوم ہو رہا تھا۔ وہ نیم غشی کی حالت میں گھوڑے پر لیٹ گیا

"کون جاتا ہے" کی کرخت پکار سے ایک مرتبہ وہ چونکا۔ اور مقررہ اشارے میں جواب دے کر پھر سے بیہوش ہو گیا۔

(۲)

شہر ماسکو سے تقریباً ۹ میل پر ایک روسی لفٹنٹ کی لاش برف میں دبی ہوئی ملی۔ اس کی وردی کے سنہرے فیتے پھیکے پڑ گئے تھے۔ اور اس کے جسم کی رنگت نیلگوں ہو گئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس نے وطن غداری نے اسے روسیاہ بنا دیا ہے۔ وہ مال جو اس نے وطن فروشی کے ذریعہ حاصل کیا تھا جوں کا توں اس کی جیب میں موجود تھا۔ وہ سزا جو اس نے دانیلا کے لئے تجویز کی تھی۔ اس میں وہ خود مبتلا تھا۔

صبح کا وقت تھا۔ کہر اتنی گہری تھی کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا جرمن ٹینکوں کی ہولناک گرج بتا رہی تھی کہ نازی طوفان ماسکو کی طرف بڑھا چلا آ رہا ہے۔

دانیلا نے آنکھیں کھول کر دیکھا وہ ایک خیمے میں گرم و گداز بستر پر پڑا ہے۔ اس کا شانہ پٹیوں سے بندھا ہوا ہے۔ پاس رکھی ہوئی انگیٹھی کے سرخ کوئلے اس کے جسم اور خیمے کو گرم کرنے کی ناکام کوشش کر رہے ہیں خیمے کے دروازے پر ایک سپاہی کھڑا پہرہ دے رہا ہے۔ دانیلا نے اٹھنے کی کوشش کی سپاہی نے بڑے احترام سے کہا "آپ اٹھنے کی کوشش نہ کریں لفٹنٹ!"

دانیلا نے چونک کر سپاہی کی طرف غور سے دیکھا اور پوچھا: "کیا میں قیدی ہوں؟"

"ہرگز نہیں لفٹنٹ!"

"لفٹنٹ!"

"جی ہاں محترم لفٹنٹ!"

"تمہیں غلط فہمی ہو رہی ہے۔ میں ایک معمولی روسی سپاہی ہوں۔ تم مجھے اٹھنے کیوں نہیں دیتے۔ مجھے اپنی حاضری لکھوانی ہے۔ جرمن —— جرمن —— جرمن آ رہے ہیں —— ہائے افسوس!"

دانیلا جھپٹ کر خیمے کی طرف بڑھا لیکن یکایک ٹھٹھک گیا۔ دروازے پر فیلڈ مارشل کھڑے تھے۔ دانیلا نے انہیں سلام کرنے کے لئے ہاتھ اٹھانا چاہا۔ مگر ہاتھ نہ اٹھ سکا۔

دانیلا نے بڑی حسرت سے کہا "جناب عالی! زندگی میں آج پہلا موقعہ ہے کہ میرا ہاتھ آپ کو سلام کرنے کے لئے اٹھ نہیں رہا ہے۔"

فیلڈ مارشل نے قریب آ کر تلطف آمیز لہجے میں کہا "اگر تم سکون کے ساتھ لیٹے رہو گے لفٹنٹ تو مجھے زیادہ خوشی ہوگی۔"

"لیکن جناب عالی ..... جنگ ....."

"کل رات تم اپنا فرض ادا کر چکے۔ روس کو تم جیسے بہادروں کی اب بھی ضرورت ہے میں تمہاری وطن پرستی کو سلام بجا لاتا ہوں۔"

دانیلا کا سر چکرانے لگا۔ بیہوش ہوتے ہوتے اسے ایسا معلوم ہوا کہ فیلڈ مارشل کے قوی بازوؤں نے اسے سنبھال کر چارپائی پر سلا دیا۔

صبح سے اس وقت تک جرمن فوج پانچ مرتبہ ماسکو تک پہنچنے کی ناکام کوشش کر کے واپس جا چکی تھی۔ بہادر اور فتحمند روسی سپاہی خوشی کے نعرے لگا رہے تھے۔ "اشتراکی روس زندہ باد" "سوویٹ روس پائندہ باد"

تنہا خیمے میں چارپائی پر پڑا زخمی دانیلا بھی پکار اٹھا۔

"سوویٹ روس زندہ باد!"

(ترجمہ) محمد امام الدین رام نگری

غزل نگار حضرات کی خدمت میں گذارش ہے کہ رسالہ میں جگہ کی قلت کے باعث صرف سات اشعار کی غزل درج ہو سکتی ہے لہٰذا صرف سات اشعار ہی بھیجئے

جب شام کی آواز پر

جب شام کی آواز پر
مغرب کی ظلمت گاہ سے
کچھ سرمئی سائے اڑیں
پرّاں، دواں - پرّاں، دواں
جا کر فرازِ قاف سے
کاشانہ ہائے چین تک
اپنے بنالیں آشیاں

کاجل کے پردے، ریشمیں
بے تار و پو، آزادہ رَو
تیریں ہوا کی موج پر

رہ جائے نابینا زمیں

عالم سیہ ملبوس میں
ماتم کی تیاری کرے

ایسے میں، قبرستان سے
تاریکیوں کو پھاند کر
آتی ہے اک آواز سی
گویا کہ روتا ہے کوئی
اور آبلے میں موت کے
نشتر چبھوتا ہے کوئی

قیصر جمشید واصل

ایک گمنام باکمال شاعر

کتنے بہت سے خوشنما پھول قدر دانوں کی نگاہوں سے اوجھل رہ کر دشت وصحرا میں کھلتے ہیں اور مرجھا جاتے ہیں۔ اور کتنے قیمتی لعل و یاقوت ہیں جن کی چمک دمک مٹی میں مل کر رہ جاتی ہے ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے۔ اس جوہر قابل کی تقدیر پر جسے نگاہِ جوہر شناس پہچان نہ سکی ہو۔ دنیا والے پتھروں، سنگریزوں اور کیڑے مکوڑوں کی تحقیق واکتشاف (Re search) کرتے رہتے ہیں۔ اور پرانے زمانہ کے ٹوٹے ہوئے ٹھیکروں کو بھی حفاظت کے ساتھ عجائب خانوں میں رکھتے ہیں۔ مگر افسوس کہ انسانوں کی (Re search) سے دنیا بڑی حد تک بے خبر ہے۔ کیا قیامت ہے کہ انسان اپنے سوا ہر چیز کی تلاش کر رہا ہے اور عجائب خانوں کی ڈائرکٹریوں اور آثار قدیمہ کے کتابچوں میں انسان کے سوا ہر چیز تشریحی طور پر نظر آتی ہے۔

اردو زبان میں باکمال شاعروں اور مایہ ناز انشا پردازوں کی کمی نہیں ہے، اردو کا ماضی، اس کے حال سے شاید بہت زیادہ تابناک ہے، مگر اس کو کیا کیجئے۔ کہ ہم "اپنوں" سے نگاہ پھیر کر "غیروں" پر ریجھے ہوئے ہیں۔ دوسروں کے سنگریزے ہمیں لعل و یاقوت نظر آتے ہیں۔ اور اپنے لعل و یاقوت پر ہم اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالنے کی بھی تکلیف گوارا نہیں کرتے۔ لوگوں کو نہیں معلوم کہ ہندوستان نے کتنے بہت سے "شکسپیر" اور "شیلے" پیدا کئے؟ گنتی کے چند شعرا جو شہرت کے اسٹیج پر آگئے ہیں ان کو تو ہم جانتے پہچانتے ہیں۔ مگر ہماری قدر ناشناسی کی بدولت جو ارباب کمال تعارف کی روشنی میں نہیں آئے۔ ان کے کام تو کیا نام سے بھی ارباب ذوق بے خبر ہیں۔

حضرت بے نظیر شاہ وارثی کا شمار بھی ان ہی بدقسمت شعرا میں ہے جن کو ان کے کمال کے مقابلے میں بہت ہی کم شہرت حاصل ہوئی۔ میں نے بعض اچھے خاصے پڑھے لکھوں سے بے نظیر شاہ کا ذکر کیا۔ تو انہوں نے بے نظیر کی شخصیت سے لاعلمی کا اظہار کیا۔ یورپ میں اگر ایسا اہل کمال پیدا ہوتا۔ تو اُس کے نام سے اکیڈیمیاں قائم ہوتیں اور بہت سی کتابیں اس پر لکھی جاتیں۔ مگر غلام ملک کے افکار و عزائم بلکہ اطلاعات و معلومات کے ذرائع بھی مستعار، غلام اور پابند رہتے ہیں چاہتا ہوں کہ اس "سینما پرستی" اور "ایکٹرس نوازی" کے دور میں ارباب ذوق کی توجہ کو تھوڑے دیر کے لئے ایک علمی و ادبی مشغلہ میں مصروف کر دوں۔

تغزل - بے نظیر شاہ غزل اور نظم دونوں پر قدرت رکھتے تھے۔ غزل میں ان کا اپنا خاص رنگ تھا۔ بے نظیر کی غزلیں بہت سادہ، معنی خیز اور دلکش ہیں۔ ان کے بعض مصرعے تو ایک "ترنم خاموش" کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کہ پڑھنے والا گنگنانا کرنہ پڑھے تو بھی وہ آپ ہی بولتے اور گنگناتے ہیں۔

بے نظیر کی زبان میں گھلاوٹ کیسا تھ سوز و درد کی تاثیر نہاں ہے اور اسی چیز نے ان کی شراب تغزل کو دو آتشہ بنا دیا ہے۔ ان کی غزلیں پڑھتے وقت محسوس ہوتا ہے۔ کہ شاعر سچ مچ محسوس کر کے شعر کہہ رہا ہے۔ اور اس کی غزل "روائتی" اور "تقلیدی" نہیں ہے۔

دنیا کے عروج و زوال پر کس شاعر نے فکر پیمائی نہیں کی، مگر بے نظیر کا انداز اور خیال سب سے اچھوتا ہے۔ کہتے ہیں ؎

نہ عروج کچھ نہ نزول ہے، یہ خیال و وہم فضول ہے
جو بلندیاں ہیں نشیب میں وہی پستیاں ہیں فراز میں۔

دنیا کے "عروج و زوال" کو "خیال و وہم" کہہ کر بے نظیر نے حقیقت کے چہرے سے نقاب سرکا دی۔

ایک غزل کا مطلع کس قیامت کا کہا ہے ؎

کیوں اس قدر جہان کی خاطر پہ بار ہوں
تیرا فراق ہوں نہ ترا انتظار ہوں

کم از کم اردو شاعری میں یہ مضمون میری نظر سے نہیں گذرا۔ میں اس شعر کی تشریح کروں گا۔ تو اس کی لطافت معنوی مجروح ہو جائے گی۔ پڑھئے اور وجد کیجئے۔

مجھے غزل کے جو شعر پسند ہیں، اور یاد ہیں اور جن کو میں اکثر گنگنایا کرتا ہوں۔ ان میں سے ایک شعر بے نظیر کا بھی ہے۔ مجھے یہ شعر بہت دلوں سے یاد ہے۔ لیکن اس کی خبر نہ تھی۔ کہ یہ شعر حضرت بے نظیر شاہ وارثی کا کہا ہوا ہے ان کا منتخب کلام نظر سے گذرا تو معلوم ہوا کہ یہ بے مثال شعر بے نظیر کا ہے ؎

وہ تری گلی کی قیامتیں کہ لحد سے مُردے نکل پڑیں
یہ مری جبینِ نیاز تھی کہ جہاں دھری تھی دھری رہی

جبین نیاز کی فتادگی اور خاکساری پر اس سے بہتر اور کیا تبصرہ ہو سکتا ہے ؟
اسی غزل کا ایک اور شعر کس قیامت کا ہے ؎

بڑی احتیاط طلب ہے یہ جو شرابِ ساغرِ دل میں ہے
جو چھلک گئی تو چھلک گئی، جو بھری رہی تو بھری رہی

ایسا شعر "اہلِ دل" شاعر ہی کہہ سکتا ہے۔ "مادہ پرست" اور دہریئے شاعر اس "لذت" کو کیا جانیں! دوسرے مصرعہ میں "جو" اور "تو" کی (repetition) دیکھئے۔ اور ان کے برمحل استعمال کی معنویت پر غور کیجئے۔

دُنیا کی مسلسل ناکامیوں کے بعد شاعر بے اختیار پکار اُٹھتا ہے ؎

اس قدر ناکامیوں کا خوف رہتا ہے کہ اب
دل میں ڈرتا ہوں خیالِ آرزو لاتے ہوئے

شاعر نے کہی تو ہے "آپ بیتی" مگر ہے یہ "جگ بیتی"
چھوٹی زمین میں ایک غزل کہی ہے جس کا "حسنِ مطلع" کس قدر تغزل میں ڈوبا ہوا ہے۔ ؎

اِدھر رہ گئی یا اُدھر رہ گئی
وفا کی شکایت مگر رہ گئی

ایک شعر تو "سہل ممتنع" کہا ہے ؎

خدا جانے آنکھوں میں اب کیا رہا
نظر تو ترے بام پر رہ گئی

شاعر نے کتنی لطیف بات کہی ہے۔ آنکھ کی جان نظر ہی تو ہوتی ہے۔ جب "نظر" محبوب کے بام پر رہ گئی۔ تو اب آنکھوں میں کیا رہا ہوگا؟

غنیمت ہے جس کو عداوت نہ ہو
محبت بس اب اس قدر رہ گئی

دنیا کی "بے مہر فطرت" اور "ریاکار ضمیر" کے سامنے شاعر نے آئینہ لاکر رکھدیا

پھر آئی نہ غربت میں یادِ وطن
وہ کم بخت بھی جا کے گھر رہ گئی

یادِ وطن کا "گھر جاکر رہ جانا" کتنی حقیقت کی ترجمانی اور پرلطف بات ہے۔

مثنوی:۔ بے نظیر شاہ وارثی کا اصلی رنگ "مثنوی" ہے۔ وہ اپنے زمانہ کا سب سے بڑا مثنوی گو شاعر ہے۔ جہاں تک منظر کشی کا تعلق ہے میرحسن کے بعد مثنوی کی صنف میں بے نظیر جیسا شاعر مشکل سے ہی نظر آئے گا۔ ان کے اشعار پر بدر منیر کا دھوکا ہوتا ہے۔

بے نظیر جب منظر کی تصویر کھینچنے بیٹھتے ہیں۔ تو معمولی سے معمولی "جزئیہ" بھی ان کی نگاہ سے نہیں بچتا۔ گردوپیش اور ماحول کی ایک ایک چیز کو بیان کرتے ہیں پھر لطف یہ ہے کہ اشعار میں بے ربطی، ثقالت اور تنافر پیدا نہیں ہوتا۔ اظہار مفہوم کے لئے بہتر سے بہتر الفاظ لانے کا خاص سلیقہ بے نظیر کو قدرت کی طرف سے ودیعت کیا گیا ہے۔

صبح کا وقت ہے۔ رات کی سیاہی چھنٹ چکی ہے۔ سورج نکل رہا ہے یہ سماں بے نظیر نے اس طرح مصور کیا ہے ؎

ہے کچھ دھوپ کا عکس کہسار پر
شعاعیں جھلکتی ہیں اشجار پر
تری اوس کی دھوپ کھونے لگی
ہوا بھی ذرا گرم ہونے لگی
پرندے زمیں پر اترنے لگے
ہرن کھل کے جنگل میں چرنے لگے
اُڑے کھول کر تازہ و سرخاب پر
گرے مرغ آبی وہ تالاب پر
وہ کھیتوں میں چڑیاں بھی آنے لگیں
وہ چن چن کے دانے اٹھانے لگیں
ہوا پھر وہی کاروبارِ جہاں
ہوئے لوگ مصروف کارِ جہاں
ہوا میں ابھی تک نہیں کچھ غبار
رطوبت لگی اڑنے بن کر بخار
مگر شہر میں یہ نہیں آب و تاب
کہ ٹیلوں کی ہے اوٹ میں آفتاب
بلندی پہ کچھ دھوپ آنے لگی
وہ کلسوں پہ سونا چڑھانے لگی
منڈیروں پہ کچھ کچھ جھلکنے لگی
اُتر کر وہ در پر چمکنے لگی

آپ کو مثنوی کے ان چند شعروں سے اس بات کا اندازہ ہو جائے گا۔ کہ بے نظیر مثنوی کی صنف پر کتنی قدرت رکھتے ہیں اور مناظر کی تصویر کھینچنے میں وہ کس تعمق و امعان سے کام لیتے ہیں بے نظیر کی شاعری ان گم راہ روشاعروں کے لئے مشعلِ راہ کا کام دے گی۔ جو نہ تو وزن و قافیہ کی پابندی ضروری سمجھتے ہیں۔ اور نہ ان کے پاس کوئی تخیل ہے۔

میں اس قسم کی شاعری کو "افسوسناک مذاق" سمجھتا ہوں۔ جو صرف چند بے تکے الفاظ اور نامانوس ترکیبوں کا مجموعہ ہے" اور پھر قیامت تو یہ ہے۔ کہ اس "بھونڈے مذاق" کو لوگ ترقی یافتہ

شاعری کہتے ہیں اور حیرت ہے کہ اچھے خاصے سمجھدار اس رو میں بہے جا رہے ہیں۔

ضرورت ہے اور شدید ضرورت ہے کہ بے نظیر جیسے گمنام اور کم شہرت رکھنے والے شاعروں کے کلام سے عوام کو متعارف کرایا جائے تاکہ لوگوں کو کھرے کھوٹے کی تمیز پیدا ہو۔ اور زبان و ادب کے خوفناک فتنوں سے طبیعتیں محفوظ رہ سکیں۔

ماہر القادری

غزل

پھر اہتمامِ دردِ جگر کر رہا ہوں میں ۔۔۔ پھر اپنی زندگی پہ نظر کر رہا ہوں میں

مجھ سے نہ پوچھیے مری رودادِ زندگی ۔۔۔ اچھی گذر رہی ہے بسر کر رہا ہوں میں

پھر یاد آ رہی ہیں کسی کی نوازشیں ۔۔۔ الفت کی ابتدا پہ نظر کر رہا ہوں میں

وہ میرے دل میں اور رہوں میں اپنے دل سے دور ۔۔۔ یہ بات گو بُری ہے مگر کر رہا ہوں میں

اک غیرتِ قمر کی تجلّی کے فیض سے ۔۔۔ روشن جہانِ قلب و نظر کر رہا ہوں میں

تارے گواہ ہیں مری شبنم گواہ ہے ۔۔۔ رو رو کے شامِ غم کی سحر کر رہا ہوں میں

آنکھیں جھکی ہوئی ہیں بظاہر مری طفیلؔ

دل کی بلندیوں پہ نظر کر رہا ہوں میں

طفیل ہینے والوی

تجلّیات

ہنگامۂ شباب اُٹھا اور گُذر گیا
طُوفانِ شوق تھا اِدھر آیا اُدھر گیا

گو تُو نہیں ملا ہے مگر تیرے شوق میں
یہ وقفۂ حیات تو اچھا گزر گیا

آنکھوں کو کچھ خبر نہ ہوئی اور جمالِ یار
آنکھوں کی راہ سے مِرے دل میں اُتر گیا

تھا تیری ذات سے مرا شیرازۂ حیات
موجُود تُو نہیں ہے تو وُہ بھی بکھر گیا

ممنُون کس قدر ہُوں ترا اے خیالِ دوست
تو میرے ساتھ ساتھ رہا میں جدھر گیا

آنے لگا ہے عشق میں اب بیخودی کا رنگ
غمہائے روزگار کا خوف و خطر گیا

صہبائی اپنے نغمۂ پُرسوز سے یہاں
روشن چراغ عشق و محبت کا کر گیا

اثر صہبائی

جرعات

عارضِ گُل پر سرِ شکِ شبنمیں
رُخِ فطرت ہی کے ہیں آئینہ دار
دیکھکر یہ منظرِ حسرت فزا
آنکھ ہو جاتی ہے میری اشکبار

بر سرِ پیکار ہے ہر سنگِ رہ سے آبِ جُو
موجزن سینے میں اس کے فاتحانہ جوش ہے
سُن بگوشِ ہوش اے زندانِ قسمت کے اسیر!
ہر صدائے موج پیغامِ عمل بردوش ہے

یادِ فصلِ بہار میں ہر شاخ
رنجِ ماضی کو بھول جاتی ہے
میں بھی پاتا ہوں لذّتِ نوروز
جب صبوحی کی یاد آتی ہے

فیروز سیالکوٹی بی اے

ریل بابو کانفرنس

شاید بہت کم لوگوں کو اس بات کا علم ہوگا۔ کہ لاہور میں ان ریل بابوؤں کی ایک ایسوسی ایشن قائم ہے۔ جو پنشن پا چکے ہیں۔ یہ بڈھے بابو ہر مہینے کے پہلے اتوار ایک کانفرنس منعقد کرتے ہیں۔ جو ریلوے روڈ پر میسرز ریلورام اینڈ سنز کے دفتر میں ہوا کرتی ہے۔ لالہ ریلورام بھی سابق ریلوے بابو ہیں۔ آپ سٹیشن ماسٹر ہوا کرتے تھے اب پنشنر ہیں۔

کل مجھے اس کانفرنس کا علم ہوا۔ تو ایک پنشنر ریل بابو کی وساطت سے جو ہمارے محلے میں رہتے ہیں میں بھی اس میں شامل ہوا۔ اور یہاں کے حالات دیکھ کر حیران رہ گیا ایسوسی ایشن کا چندہ ایک روپیہ ماہوار ہے۔ اور وصولی کی یہ صورت ہے۔ کہ ایک بابو اس کھڑکی کے اندر کی طرف بیٹھا ہوتا ہے۔ جو دفتر کے برآمدے میں کھلتی ہے۔ اس کے سامنے چھوٹی سی میز پر ٹکٹ رکھے رہتے ہیں۔ اور ساتھ ہی اس تاریخ کی مہر۔ ممبر آتے ہیں تو کھڑکی کے پاس جا کر ایک روپیہ ادا کرتے ہیں ٹکٹ بابو ٹکٹ پر کھٹ سے مہر لگاتا ہے۔ اور ٹکٹ ممبر کے ہاتھ میں دے دیتا ہے۔ دفتر کے دروازہ میں ایک گیٹ کیپر ہاتھ میں سروتا لئے کھڑا ہوتا ہے وہ ٹکٹ کا ایک کونہ کاٹ کر ممبر کو اندر جانے کی اجازت دیتا ہے۔ اندر کرسیاں لگی ہوتی ہیں جن میں ایسوسی ایشن کے عہدہ داروں کی کرسیوں پر "ریزرو" کا ٹکٹ لگا ہوتا ہے۔

مجھے ٹکٹ نہ خریدنا پڑا۔ کیونکہ مہمانوں کے لئے داخلہ مفت ہے۔ میں نے اندر جا کر ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔ تو دیکھا کہ ایک طرف ایک بورڈ پر لکھا ہے۔ کہ "تھوکو مت" اور دوسری طرف ایک دوسرا بورڈ آویزاں ہے جس پر یہ سطور لکھی ہیں :-

> "اگر کوئی شخص بغیر رضامندی اپنے ہمراہیوں کے تمباکو نوشی کریگا تو اس کو پچاس روپیہ تک سزائے جرمانہ ہو سکتی ہے۔ اور اگر کوئی شخص باوجود اس امر کے کہ اس کو کسی عہدہ دار نے تمباکو نوشی سے منع کیا ہو۔ تمباکو نوشی پر اصرار کرے گا۔ تو کوئی عہدہ دار اسے ہال سے باہر نکال سکتا ہے۔"

ایک دیوار کے ساتھ ساتھ ایک زنجیر جاتی تھی جس کے وسط میں ایک چھوٹے سے بورڈ پر لکھا تھا "خطرہ کے وقت زنجیر کھینچو"۔ ایک کونے میں ایک کیل سے پیتل کی گھنٹی لٹک رہی تھی جیسی کہ گائے بھینسوں کے گلے میں باندھا کرتے ہیں۔

صدر کی میز کے سامنے میں نے ایک عجیب بات دیکھی جس طرح تقریر کرنے والے کے منہ کے سامنے لاؤڈ سپیکر کا مائیکروفون ہوتا ہے۔ اس طرح یہاں ایک چھوٹا سا سگنل نصب تھا۔ جو بالکل ریلوے سگنل کی نقل تھا یہ ایک تار کے ذریعہ اوپر نیچے ہوتا تھا۔ اور اس تار کا دوسرا سرا پریزیڈنٹ کی میز پر ایک بھاری پیپر ویٹ کے نیچے دبا ہوا تھا۔

اس دفعہ کانفرنس کی صدارت کے فرائض میرے ہم محلہ چودھری غلام احمد نے انجام دیئے تھے۔ وہ کرسی صدارت پر بیٹھ گئے جب سارے ممبر اندر آ چکے۔ تو گیٹ کیپر نے دروازہ بند کر دیا۔ پریزیڈنٹ نے میز سے ایک لائن کلیر اٹھا کر سکرٹری کو دیا جو میز کے دائیں طرف کرسی پر بیٹھا تھا۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا۔ کہ اس مقصد کے لئے ردی فروشوں سے ریلوے کے استعمال شدہ لائن کلیر لائے جاتے ہیں سکرٹری لائن کلیر لے کر اٹھا۔ اور کرسیوں پر بیٹھے ہوئے ممبروں میں سے ایک کے ہاتھ میں دے آیا۔ یہ وہ ممبر تھا جس نے سب سے پہلے تقریر کرنی تھی سکرٹری نے واپس میز کے پاس آ کر اپنی جیب سے ایک سیٹی نکالی اور بجائی ایک شخص نے کونے میں لٹکی ہوئی گھنٹی کو بجایا۔ تقریر کرنے والا اٹھ کر میز کے پاس اور سگنل کے عین سامنے آ کھڑا ہو گیا۔ پریزیڈنٹ نے پیپر ویٹ ہٹا کر تار کو ڈھیلا کر دیا جس سے سگنل ڈاؤن ہو گیا۔ اور مقرر نے اپنی تقریر کی ڈاک گاڑی چھوڑ دی۔

میں یہاں بتا دوں کہ ریل بابو کانفرنس میں صرف ممبروں کے خاص دوستوں کو ہی اجازت دی جاتی ہے۔ کیونکہ ممبر اپنی تقریروں میں اپنی عہد ملازمت کی آپ بیتیاں سناتے ہیں۔ جن میں بعض جرائم کی قسم کی ہوتی ہیں۔ اور ان کا عوام تک یا یوں کہئے کہ افسروں تک پہنچ جانا خطرناک ہے۔

تقریر کرنے والے صاحب کا نام میلارام تھا۔ اور آپ نے یوں تقریر شروع کی صاحبان! جن دنوں میں لاہور وزیر آباد لائن پر ٹی ٹی کے طور پر چلتا تھا۔ ایک روز عجیب واقعہ ہو گیا۔

میں وزیر آباد سے لاہور کی طرف آ رہا تھا کہ ایک ڈبے میں میں نے ایک شخص کو پکڑا جس کے پاس ڈیڑھ من کے قریب خربوزے تھے۔ اور ان خربوزوں کا کرایہ

نہیں ادا کیا گیا تھا۔میں نے اس کا ٹکٹ دیکھا۔جو اس کے ساتھی کے پاس تھا۔اور خربوزوں کی بابت دریافت کیا۔تو اس نے کہا کہ جلدی کے باعث میں نے انہیں بُک نہیں کرایا۔میں نے اپنی جیب سے تولنے کا کانٹا نکال کر خربوزوں کا وزن کیا۔اور دوسری جیب میں میمو بک نکالنے کے لئے ہاتھ ڈالا۔لیکن جیب خالی تھی۔

بات یہ ہوئی کہ پچھلے ڈبے میں مَیں نے ایک بے ٹکٹ مسافر کو چارج کیا تھا۔اور میمو بک وہیں دھری رہ گئی۔ان دنوں مجھے حکم مل چکا تھا۔کہ چلتی گاڑی میں ایک ڈبے سے دوسرے ڈبے میں مت جاؤ۔اس لئے میں نے گاڑی ٹھہرنے تک انتظار کیا۔اگلے سٹیشن پر گاڑی ٹھہری تو میں پچھلے ڈبے میں گیا۔لیکن میمو بک غائب تھی۔میں نے مسافروں سے پوچھا۔تو وہ کہنے لگے کہ ہمیں علم نہیں۔اور یہ کہ آپ کتاب یہاں سے لے گئے تھے۔بات دراصل یہ تھی کہ وہ مجھ سے مذاق کر رہے تھے یہاں گاڑی کا سٹاپیج صرف ایک منٹ تھا۔وہ ہماری تکرار میں گذر گیا۔اور گاڑی چل پڑی۔آخر ایک مسافر نے ہنستے ہوئے میمو بک میرے ہاتھ میں دے دی لیکن اب اگلے ڈبے میں جانے کے لئے مجھے پھر انتظار کرنا پڑا۔

اگلے سٹیشن پر گاڑی رُکی۔تو میں خربوزوں والے ڈبے میں گیا۔کیا دیکھتا ہوں کہ وہاں صرف دو خربوزے سیٹ پر پڑے ہیں۔میں نے ادھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔تو خربوزوں والی گٹھڑی کہیں نظر نہ آئی۔میں نے اس بھلے مانس سے پوچھا کہ خربوزے کہاں ہیں؟ اس نے کہا۔کہ مسافروں سے پوچھئے۔میں نے سب مسافروں سے مخاطب ہو کر دریافت کیا کہ خربوزے کہاں ہیں؟ سب نے یکزبان ہو کر اور اپنے اپنے پیٹ پر ہاتھ رکھکر کہا "خربوزے یہاں ہیں"

میں بڑا خفیف ہوا۔اور خربوزوں کے مالک کی طرف دیکھنے لگا۔اس نے دونوں خربوزے اٹھا کر میرے ہاتھ میں دیدیئے اور کہا یہ آپ کا حصہ ہے۔مجھے اس کی حرکت پر بے اختیار ہنسی آگئی۔اور میں نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے یہ کہہ کر کہ اس سے مصافحہ کیا۔کہ آپ بڑے خوش طبع آدمی ہیں۔اور آج سے میں آپ کو اپنا دوست سمجھوں گا۔اس نے جواب دیا کہ اگر آپ دوست ہیں۔تو ذرا بیٹھ جایئے۔میں آپ کو ایک اور بات بتاتا ہوں۔

میں بیٹھ گیا۔اور اس نے کہا "جناب من میں نے صرف خربوزے ہی بُک نہیں کرائے تھے۔بلکہ خود بھی بے ٹکٹ ہوں"۔میں نے حیران ہو کر کہا "بے ٹکٹ تو آپ کا ٹکٹ تو ان صاحب نے مجھے دکھایا تھا"۔وہ بولا "بیشک لیکن وہ ان کی بیوی کا ٹکٹ ہے۔جو زنانہ ڈبہ میں بیٹھی ہے"۔

اس کے بعد اس شریف آدمی نے کہا کہ "میں کسی وجہ سے ٹکٹ نہیں خرید سکا تھا۔اس لئے پلیٹ فارم پر مجھے ایسے شخص کی تلاش ہوئی جس کے ساتھ زنانہ سواری بھی ہو۔کیونکہ میں جانتا ہوں کہ زنانہ سواریاں تو زنانہ ڈبہ میں بیٹھ جاتی ہیں۔لیکن ان کے ٹکٹ ان کے مردوں کے پاس ہوتے ہیں۔

میں نے دیکھا کہ ان صاحب کے ساتھ ایک خاتون ہے۔یہ اس کو زنانہ ڈبہ میں بٹھا کر خود اس ڈبے میں آ بیٹھے۔اور میں بھی ان کے پاس آ بیٹھا۔بیٹھتے ہی میں نے ایک بہت خوبصورت خربوزہ گٹھڑی سے نکال کر ان کی خدمت میں پیش کیا۔تاکہ راہ و رسم پیدا ہو جائے۔اور جب باتوں باتوں میں ذرا سی بے تکلفی ہو گئی۔تو میں نے اپنی مشکل بتائی۔انہوں نے مہربانی کر کے مجھے تسلی دی۔کہ کوئی بات نہیں"۔

مسافر کی یہ بات سُن کر مجھے فوراً اپنے سرکاری فرض کا احساس ہوا میں نے اپنی ساری سروس میں کبھی کسی بے ٹکٹ آدمی پر رحم نہیں کھایا تھا ہمیشہ کرایہ چارج کیا لیکن اس نئی دوستی کے بعد میں سوچنے لگا۔کہ اس نئے دوست کو کس طرح معاف کر کے محکمہ کے حق میں بددیانتی کروں؟ آخر میں نے ایک میمو کاٹ کر اسے دیدیا اور کہا کہ اسے اپنے پاس رکھئے۔وہ حیرت سے میری طرف تکنے لگا۔میں نے کہا کرایہ کی فکر نہ کرو۔میں اپنی جیب سے ادا کر دوں گا۔

یہ شخص آج تک میرا دوست ہے۔اس کا نام شیخ ظہور حسن ہے۔اور وہ آجکل اخبار "شہباز" کا ہیڈ کاتب ہے۔کچھ عرصہ کے بعد ایک روز......

بابو میلا رام کی تقریر یہاں تک پہنچی تھی کہ صاحب صدر نے سگنل کے تار کو کھینچا جس سے سگنل اَپ ہو گیا۔اس کا مطلب یہ تھا کہ بابو میلا رام کا وقت ختم ہو گیا ہے .... بابو میلا رام اپنی کرسی پر جا بیٹھے۔

اتنے میں پھر گھنٹی بجی۔اور ساتھ ہی ہال کا بغلی دروازہ کھلا۔اس دروازہ سے ایک شخص نکلا جس نے صدا دی "ہندو مسلمان چائے بسکٹ" یہ آواز سن کر سب لوگ کرسیوں سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔اور ساتھ والے کمرے میں گئے۔جہاں ٹی پارٹی کا انتظام تھا۔میزوں پر چائے۔کیک۔بسکٹ۔اور پھل قرینے سے سجے ہوئے تھے۔یہاں سب نے کھایا پیا اور پھر ہال میں آکر اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھ گئے۔

اب پھر لائن کلیر دیا گیا سیٹی اور گھنٹی بجی۔اور ایک اور صاحب

تقریر کے لئے میز کے پاس گئے جن کا نام خورشید علی تھا سگنل ڈاؤن ہوا اور آپ نے یوں تقریر شروع کی۔

صاحبان! جن دنوں میں لاہور سٹیشن پر پارسل کلرک تھا۔ ان ایام کا ایک واقعہ سنیئے۔

ہم چار پارسل کلرک تھے۔ دو ہندو ایک سکھ اور ایک میں لینی مسلمان۔ ہمارا معمول تھا کہ ہم کھانے پینے کی چیزوں کے پارسل کھول لیا کرتے تھے۔ ان میں سے کچھ حصہ نکال کر کھا لیتے اور پیکنگ کی اشیا ڈال کر وزن پورا کر دیا کرتے تھے۔

ایک روز دس سیر وزن کا ایک پارسل آیا جس کے اوپر لکھا تھا۔ "مٹھائی" یہ لفظ پڑھ کر ہمارے منہ میں پانی بھر آیا۔ اور ہم نے پارسل کو کھول مارا۔ دیکھا کہ اس میں لڈو، پیڑے اور ہر قسم کی مٹھائیاں بھری ہوئی ہیں۔ ہم نے نصف حصہ نکال لیا اور دروازہ بند کر کے کھانے بیٹھ گئے۔ جب خوب سیر ہو چکے تو باقی ماندہ پھر پارسل میں ڈال دی۔

اتنے میں کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ہم نے پارسل کو فوراً میز کے نیچے چھپا کر دروازہ کھولا۔ تو دیکھا کہ ایک عورت ہاتھ میں بلٹی لئے کھڑی ہے میں نے پوچھا کیا چاہتی ہو؟ عورت بولی میرا پارسل نہیں آیا؟ یہ ہے بلٹی۔

میں نے بلٹی لے کر دیکھی۔ تو یہ اسی مٹھائی کی بلٹی تھی۔ اب ہم لوگ گھبرا سے گئے۔ کیونکہ پارسل کو ابھی تک ہم نے وزن پورا کر کے بند نہیں کیا تھا بہرحال میں نے نہایت بے پروائی سے عورت کو کہا کہ یہ پارسل ابھی نہیں آیا بل آنا۔

عورت بولی کیوں نہیں آیا؟ چٹھی تو کل سے آ چکی ہے۔ یہ کہہ کر ایک چٹھی اس نے میرے ہاتھ میں دیدی اور کہا کہ پڑھ لیجئے۔ میں نے چٹھی کو کھول کر پڑھا۔ لکھا تھا۔

"میری بیٹی۔ لالہ لدھا رام ساہوکار کے بیٹے کی شادی تھی۔ میں نے لکھا تھا کہ شادی پر آ جاؤ۔ کیونکہ بہت سی مٹھائی آئے گی لیکن تم نہ آئیں۔ شادی ہو چکی ہے۔ اور ہمارے ہاں ایک من کے قریب مٹھائی کی جھوٹ (پنجابی جوٹھ) آئی ہے۔ اس میں سے دس سیر بھیجی جاتی ہے بلٹی ارسال ہے۔ رسیدگی سے اطلاع دو۔

تمہاری ماں
سنتو بھنگن

یہ سننا تھا کہ ہمارے ہوش اُڑ گئے۔ عورت تو چلتی بنی اور میرے دوست لگے پانی سے غرارے کرنے اور منہ میں انگلیاں ڈال ڈال کر صفائی کرنے۔ لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ بھنگیوں کے ہاتھوں کی جھوٹی مٹھائی ہمارے پیٹوں میں جا چکی تھی۔ اس دن سے ہم نے قسم کھائی کہ کبھی کسی کا پارسل نہیں کھولیں گے۔

یہ کہہ کر مقرر نے پریزیڈنٹ کی طرف دیکھا۔ پریزیڈنٹ نے سگنل اَپ کیا۔ اور بابو خورشید علی اپنی کرسی پر جا بیٹھے۔ پھر بغلی دروازہ کھولا اور آواز آئی۔ "کیلے سنگترے میٹھی گنڈیریاں"

سب لوگ پھر دوسرے کمرے میں گئے۔ اب کے پھلوں کی دعوت تھی پھل کھانے کے بعد سب لوگ اُٹھے اور پریزیڈنٹ نے اعلان کیا کہ آج کا اجلاس ختم۔

ممبر ہال سے ہو کر گیٹ کے راستے باہر نکلنے لگے۔ وہاں "ٹکٹ کلکٹر" کھڑا ہر ایک سے ٹکٹ وصول کر رہا تھا جب میں گزرنے لگا۔ تو اس نے مجھے ٹھہرا لیا کیونکہ میں نے ٹکٹ تھا۔

جب سارے ممبر باہر جا چکے۔ تو ٹکٹ کلکٹر مجھے صدر کی میز کے پاس لے گیا۔ وہاں اس نے ایک استعمال شدہ کتاب سے ایک میمو کاٹ کر میرے ہاتھ میں دیدیا اور کہا۔ اس کو اپنے پاس رکھئے۔ اور کرایہ کی فکر نہ کیجئے۔ میں اپنی جیب سے ادا کر دوں گا۔

حاجی لق لق

گلبانگ حیات

جناب امین حزیں کے کلام کا وجد آفریں مجموعہ جس کے شروع میں سر عبدالقادر بالقابہ نے طویل اور جامع دیباچہ تحریر فرمایا ہے ما امین حزیں کی شاعری فطرت انسانی کے نہایت گہرے مطالعہ اور شدید تاثرات کا نتیجہ ہے۔ ۲۰×۲۶/۱۶ سائز دو سو صفحات کتابت و طباعت دیدہ زیب۔ قیمت دو روپے مجلد اردو اکیڈیمی پنجاب بیرون لوہاری گیٹ لاہور سے مل سکتا ہے۔

ہندی اردو اور ہندوستانی

قبل اس کے کہ موجودہ قضیہ پر روشنی ڈالی جائے ہم الفاظ "ہندی" "اردو" "ہندوستانی" کی مختصر تاریخ بیان کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔اس سے ایک فائدہ تو یہ ہوگا۔ کہ ہر لفظ کے معنی متعین اور واضح ہو جائیں گے۔ اور دوسرا یہ کہ ہمیں فیصلہ کرنے میں آسانی ہوگی کہ کون سا نام زیادہ موزوں ہے۔ گریرسن نے ہندوستانی کو مغربی ہندی کی ایک شاخ بتلایا ہے۔ اس نے ہندوستانی کو دو شاخوں میں تقسیم کیا ہے یعنی عام ہندوستانی (Vernacular Hindustani) اور ادبی ہندوستانی (Literary Hindustani) آخر الذکر کو اس نے چار شاخوں میں تقسیم کیا ہے یعنی اردو، ریختہ، دکھنی اور ہندی پھر ان کی علیحدہ علیحدہ تعریف کی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ گریرسن کے نقطہ نظر سے ہندی اور اردو ہندوستانی کی شاخیں ہوئیں۔ اس نظریئے کے علاوہ ان الفاظ کی تاریخی حیثیتیں بھی ہیں۔ لفظ ہندی ابتدا میں اردو کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ میر تقی میر نے "نکات الشعرا" میں اردو کے معنے میں ہندی کا لفظ اکثر جگہ استعمال کیا ہے۔ دو ایک مقام پر "اردوئے معلے" بھی لکھا ہے۔ شاہ عبدالقادر نے اپنے قرآن شریف کے ترجمہ میں لکھا ہے کہ یہ ترجمہ ہندی میں ہے ریختہ میں نہیں۔ اردو کے لئے ابتدا میں مختلف نام استعمال کئے گئے ہیں۔ مثلاً اردوئے معلے، ریختہ، مراختہ، دکھنی، ہندوی، ہندی۔ اور ہندوستانی۔ سلاطین مغلیہ کے زمانے میں یہ عموماً شاہی لشکر میں بولی جاتی تھی اس لئے اردو معلے کا خطاب پایا۔ شعرا نے یہ زبان اپنے اشعار میں استعمال کی۔ اور ریختہ لقب دیا۔ لفظ "ریختہ" کا مطلب ہے آمیزش کیا ہوا۔ اردو۔ فارسی اور بھاشا کی آمیزش کا نتیجہ ہے۔ اس لئے ریختہ کہلائی۔ "مراختہ" مشاعرہ میں اردو نظم کے معنی میں استعمال کیا جانے لگا۔ دکن میں اردو کا نام دکھنی قرار پایا۔ امیر خسرو نے اپنی ہندی نظم کی زبان کو "ہندوی" کے نام سے موسوم کیا۔ شمال میں کافی عرصہ تک ہندی کا لفظ اردو کے بجائے استعمال ہوتا رہا۔ "ہندوستانی" کا لفظ عبدالحمید لاہوری کے بادشاہ نامہ اور "تاریخ فرشتہ" میں ایک عام ملکی زبان کے واسطے استعمال ہوا ہے۔ انگریزوں نے مستقل طور پر عام ملکی زبان کے لئے "ہندوستانی" یا "انڈوستانی" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ چنانچہ ٹیری (۱۶۱۶ء) اور فرہیر (۱۶۷۳ء) نے یہ لفظ استعمال کیا۔ گیلن (Gallen) نے اپنی گرامر کا نام "ہندوستانی گرامر" رکھا۔ گلگرسٹ ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ انہوں نے متعدد اردو کی گرامریں اور لغت تصنیف کیں۔ اردو کے لئے ہر جگہ "ہندوستانی" ہی استعمال میں لکھا ہے۔ ڈنکن فاربس اور مشہور فرانسیسی مستشرق گارساں دتاسی نے بھی اردو کے بجائے "ہندوستانی" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ تمام مصنفین اردو کو ہندوستان کی عام مشترکہ زبان سمجھتے تھے۔ اس لئے اس کو ہمیشہ ہندوستانی لکھا۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہندی اور ہندوستانی ایک ہی زبان کے مختلف نام ہیں۔ موجودہ ہندی در اصل انیسویں صدی کی پیداوار ہے جس کی للولال کوی نے "پریم ساگر" لکھ کر بنیاد ڈالی۔

یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ اردو ہندوستان کی مشترکہ زبان ہے۔ اسے ہر طبقے کے لوگ بلا امتیاز مذہب و ملت اچھی طرح سمجھتے اور بولتے ہیں۔ ہندوستان کے قریب قریب ہر حصے میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ یہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا ایک مشترک سرمایہ ہے۔ اس کا لہلہاتا باغ ان دونوں قوموں کے باغبانوں کی آبیاری کا ممنون ہے۔ انہیں کے دم سے اردو کا پودا پروان چڑھا ہے۔ اس کا ایک معقول ادب ہے۔ شاعری اس کی گھٹی میں پڑی ہے۔ بادشاہوں نے اسے سر آنکھوں پر رکھا۔ ولیوں کا اس کے سر پر سایہ رہا ہے۔ خود بخود یہ پیدا نہیں ہوگئی۔ بلکہ دو قوموں کے میل جول سے وجود میں آئی ہے۔ زمانے کا سرد و گرم اس نے دیکھا ہے۔ بھلا اسے ہندوستانی نہ کہا جائے گا۔ تو پھر ہندوستان کی کون سی زبان اس نام کے اختیار کرنے کی زیادہ مستحق ہوسکتی ہے؟

ہندی اردو کا یہ قضیہ کب اور کیوں پیدا ہوا؟ پنڈت کشن پرشاد کول کا قول ہے کہ "سر سید کے زمانے سے اس کی ابتدا ہوئی۔ واقعہ یہ ہے کہ ہندی اردو کا قضیہ فورٹ ولیم کالج کے وقت سے شروع ہوچکا تھا۔ للولال کوی "پریم ساگر" لکھ کر ایک نئی زبان کی بنیاد ڈال چکے تھے۔ فارسی اور عربی الفاظ کے بجائے سنسکرت الفاظ استعمال کرکے یہ نئی زبان اختیار کی۔ یہ عوام کی بول چال کی زبان نہ تھی۔ بلکہ درحقیقت ایک کتابی زبان تھی۔ ہندو ایک نئی زبان کی تلاش میں تھے۔ "پریم ساگر" نے اس ضرورت کو پورا کر دیا۔ ہندو اس سے قبل یا تو اردو میں کوئی تحریر لکھتے تھے۔ یا پھر اپنی محدود زبان مثلاً برج بھاکا، تیدیلی وغیرہ میں۔ لیکن اب انہیں نثر میں "پریم ساگر" کی زبان کا نمونہ مل گیا تھا۔ ڈاکٹر عبدالحق نے درست فرمایا ہے۔ کہ "جدید ہندی اردو کا بچہ ہے جو فورٹ ولیم کالج میں پیدا ہوا۔" یہ انیسویں صدی کی ابتدا کی

ا۔ نقوش سلیمان (سید سلیمان ندوی)

پیدا وار ہے ۱۸۳۷ء میں فارسی کے بجائے اردو عدالتوں میں رائج ہو گئی۔ انہیں بڑا صدمہ ہوا لیکن سرکار کی طرف سے ۱۸۶۸ء میں اردو رسم الخط کی بجائے کیتھی رسم الخط کے استعمال کرنے کی بہار میں عام اجازت مل گئی۔ اس میں سر انٹونی میکڈانلڈ کا اشارہ تھا جو اس وقت بہار میں کلکٹر تھے۔ بنارس میں بھی اس زمانے میں یہ سوال اٹھایا گیا لیکن سرسید کی وجہ سے مخالفین کو کامیابی نہیں ہوئی۔ انہوں نے ایک عرضداشت لکھی اور ایک وفد بھی بھیجا لیکن گورنمنٹ نے منظور نہ کیا۔ ۱۸۹۸ء میں سرسید کا انتقال ہو گیا۔ مخالفین نے اس موقع سے پورا فائدہ اٹھایا اور ہندی اردو کا سوال پھر پیش کر دیا۔ سر انٹونی میکڈانلڈ بھی صوبہ مغربی اور شمالی میں نواب لفٹنٹ گورنر ہو کر آ چکے تھے جب مخالفین کا وفد ان کے پاس پہنچا تو انہوں نے ان کی عرضداشت کو منظور کیا۔ اور ۱۹۰۰ء میں صوبہ شمالی و مغربی کی عدالتوں میں بھی اردو کے ساتھ ساتھ ہندی رسم الخط کے استعمال کرنے کی عام اجازت دی گئی۔ اردو کے بہی خواہوں میں اس سے عجیب اضطراب پیدا ہوا جلسے منعقد ہوئے تقریریں کی گئیں قرار دادیں منظور ہوئیں۔ اور ہم لوگ اس سے زیادہ کر ہی کیا سکتے ہیں۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ نواب محسن الملک کو لکھنؤ کے ایک جلسہ میں کہنا پڑا کہ اگر اردو کا جنازہ ہی نکلنا ہے تو ذرا شان و شوکت سے نکالا جائے۔ ع

"عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے"

لیکن نواب صاحب کو بھی گورنمنٹ کے دباؤ کی وجہ سے دستبردار ہونا پڑا۔ کالج کا کام اس سے زیادہ مقدم تھا۔ اگر نواب صاحب ایسا نہ کرتے۔ تو کالج پر جو گزرتی گزر جاتی۔ لیکن یہ قضیہ ہمیشہ کے لئے طے ہو جاتا۔ لیکن افسوس کہ ہندی اردو کے درمیان کی خلیج روز بروز وسیع ہوتی گئی۔

غالباً کانگریس کے کراچی کے سیشن میں یہ قرار پایا کہ ہندوستان کی مشترکہ زبان کا نام "ہندوستانی" ہوگا۔ اس نام پر کسی فرقے کو اعتراض کرنے کی گنجائش نہ تھی لیکن بعد کو ایک ادبی اور لسانی مسئلہ کو سیاسی گتھیوں میں الجھا دیا گیا۔ ۱۹۳۶ء میں ناگپور میں ہندی ساہتیہ سمیلن کے سلسلے میں "اکھل بھارتیہ ساہتیہ پریشد" کا افتتاح ہوا۔ اس کا مقصد تمام ہندوستانی زبانوں کو یکجا و متحد کرنا تھا۔ اس اجلاس میں اردو کی نمائندگی ڈاکٹر عبدالحق صاحب نے کی۔ گاندھی جی انجمن کے صدر تھے انہوں نے فرمایا کہ ہندوستان کی مشترکہ زبان ہندی اتھوا ہندوستانی ہوگی۔ ڈاکٹر صاحب نے دریافت کیا۔ کہ ہندی اتھوا ہندوستانی سے ان کا کیا مطلب ہے؟ ارشاد ہوا۔ وہ ہندی جو آگے چل کر ہندوستانی ہو جائیگی۔ ڈاکٹر صاحب نے کراچی کا رزولیوشن یاد دلایا۔ گاندھی جی نے جواب دیا کہ وہ بھی تو میں نے ہی بنایا تھا۔ اور یہ ریزولیوشن بھی میری ہی تصنیف ہے۔ اس میں کیا مضائقہ ہے۔ بحث نے زیادہ طول پکڑا اور آخر گاندھی جی نے صاف صاف کہدیا کہ اردو مسلمانوں کی مذہبی زبان ہے۔ قرآن کے حروف میں لکھی جاتی ہے اور مسلمان بادشاہوں نے اسے بنایا اور پھیلایا۔ اب مسلمان چاہیں تو اسے رکھیں اور پھیلائیں"۔ بات صاف ہو گئی۔ اور اس سلسلے میں کانگریس کا نقطہ نظر اچھی طرح معلوم ہو گیا۔ اس کے بعد اخبارات اور رسائل میں ہندی اردو ہندوستانی کے متعلق ایک ایسا طویل مضامین کا سلسلہ شروع ہوا۔ جو اب تک ختم ہوتا نظر نہیں آتا۔ بعض ہندی کی مخالفت اور اردو کی موافقت کرتے ہیں۔ اور بعض اس کے برعکس بعض درمیانی راستہ ڈھونڈھ کر دونوں میں سمجھوتہ کرانا چاہتے ہیں لیکن یہ زبان کا مسئلہ روز بروز پیچیدہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ اور ابھی تک اس کا کوئی معقول حل تجویز نہیں ہوا۔ ہم یہاں اس قضیہ کے متعلق بعض اہم مضامین کا ذکر کریں گے۔

پنڈت کشن پرشاد کول نے "ہندی' اردو' ہندوستانی" کے عنوان پر رسالہ "ہندوستانی" الہ آباد میں ۱۹۳۶ء کے کسی پرچہ میں ایک مضمون لکھا۔ ان کا خیال ہے کہ [1]

(۱) اس قضیہ کی ابتدا سرسید نے کی (۲) مسئلے کے دو پہلو ہیں' سیاسی اور ادبی (۳) ہندوستانی قومیت کے لئے یہ ضروری نہیں کہ عام مشترکہ زبان ہو۔ اس سے تفرقہ اور زیادہ بڑھتا ہے۔ سوئٹزرلینڈ میں مختلف نسلوں کے باشندے رہتے ہیں ان کی ایک زبان نہیں۔ وہ اپنی اپنی علیحدہ زبان بولتے ہیں لیکن قومیت کے لحاظ سے سب ایک ہیں (۴) ہندوستان کی آزادی کے لئے بجائے ایک مشترکہ زبان بنانے کے اقتصادی حالات کو بہتر بنایا جائے (۵) انگریزی ہندوستان میں ایک عام زبان کا کام دے سکتی ہے۔ (۶) اردو ہندی کی نشو و نما علیحدہ علیحدہ ہونا چاہیئے ہندوستانی کی کوئی ضرورت نہیں۔ ان کے جوابات یہ دیئے جاسکتے ہیں۔

(۱) اس قضیے کی ابتدا سرسید سے نہیں۔ بلکہ فورٹ ولیم کالج میں للولال کوی سے ہوئی (۲) پہلو تو صرف ایک ہی تھا یعنی ادبی یا لسانی۔ دوسرا پہلو خواہ مخواہ پیدا کر دیا گیا ہے (۳) ایک مشترکہ زبان کی ضرورت ہے۔ اگر دانشمندی اور رواداری سے کام لیا جائے تو تفرقہ نہیں پڑے گا۔ سوئٹزرلینڈ اور ہندوستان کے اقتصادی' معاشی اور سیاسی حالات مختلف ہیں (۴) لسانی اور اقتصادی حالات میں کوئی تعلق نہیں (۶) انگریزی صرف دو فیصدی ہندوستانی بولتے ہیں۔ اور یہ ملک کی مشترکہ زبان نہیں بن سکتی۔

منشی پریم چند مرحوم نے "شاہکار" بابت دسمبر ۱۹۳۵ء میں ایک مضمون "گزارش" کے عنوان سے لکھا اور یہ خیال ظاہر کیا کہ "ہندی" ہندوستان کی عام زبان اور ناگری رسم الخط ہندوستان کا عام رسم الخط ہونا چاہیئے۔ اس کے مختلف جوابات لکھے گئے۔ پھر منشی جی نے ایک اور مضمون بعنوان "عذر تقصیر" لکھا۔ اس میں وہ لکھتے ہیں [2]

(۱) مسلمانوں کے عہد میں رعایا کو اپنی زبان اور خط کی پامالی کا صدمہ اسی طرح تھا جیسے

[1] رسالہ اردو فائل بابت ۱۹۳۶ء

آج ہمیں انگریزی زبان کے غلبے کو دیکھکر ہوتا ہے۔

(۲) اس زمانے میں اسلامی عہد میں عوام اس درباری زبان اور رسم الخط کا جُوا گردن سے نہ اُتار سکتے تھے۔

(۳) ہم اردو زبان اور فارسی رسم الخط کو سفارتی بین الاقوامی زبان تسلیم کرنے کے لئے ہمیشہ تیار تھے۔ ان اعتراضات کے جواب میں کہا جاسکتا ہے کہ

(۱) اس زمانے میں وطنیت اور حب الوطنی (— Nationalism and Patriotism) اس مفہوم میں نہیں سمجھے جاتے تھے۔ جن میں کہ آج کل وہ سمجھے جاتے ہیں۔ اُس زمانے میں اس کا احساس ہی پیدا نہ ہوا تھا سلاطین مغلیہ کے زمانے میں سب ہندوستانی ایک قوم کی حیثیت رکھتے تھے۔

(۲) اردو درباری زبان نہیں۔ بلکہ عوام کی زبان تھی۔ وہ بازاروں میں بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ اس کا جوا آسانی سے اتارا جاسکتا تھا۔ کوئی مجبوری نہ تھی۔

(۳) گویا "اردو" ہندوستانی اور ملکی زبان ہی نہیں۔

مسٹر دھرونیدر ورما ایم اے۔ ڈی لٹ لیکچرار الہ آباد یونیورسٹی کے مندرجہ ذیل اعتراضات ہیں۔

(۱) مسلمان غیر ملکی ہیں (۲) اردو زبان غیر ملکی خصوصیات رکھتی ہے (۳) اردو کو حکومت اور بادشاہوں کی سرپرستی حاصل رہی ہے۔ (۴) اردو کو سیاسی وجوہ سے ایک اہمیت حاصل ہوگئی تھی (۵) اردو کو اب وہ عمدہ مواقع حاصل نہیں جو پہلے تھے (۶) ہندی خاص قومی زبان ہے۔ اردو اور اس کا رسم الخط غیر ملکی ہیں (۵) اردو کسی صوبہ کی زبان نہیں۔

افسوس ہے کہ ہندی کے ایک پروفیسر کی زبان سے یہ اعتراضات نکلے ہیں جنہیں تاریخی لسانی اور ادبی واقعات سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔ اس لئے جوابات نظر انداز کئے جاتے ہیں۔

سر امرناتھ جھا وائس چانسلر الہ آباد یونیورسٹی اپنے ایک لیکچر میں فرماتے ہیں کہ اردو شہری زبان ہے اور ہندی دیہاتی چونکہ دیہات کی آبادی نوے فیصدی کے قریب ہے اور شہروں کی دس فی صدی کے قریب ہے۔ اس لئے ہندوستان کی عام مشترکہ زبان ہندی ہونی چاہئے۔ یہ عجیب منطق ہے۔ سر جھا کے نزدیک اردو کی لسانی ادبی اور تاریخی حیثیت کوئی درجہ نہیں رکھتی۔ وہ شہری اور دیہاتی زبان میں کوئی امتیاز نہیں کرتے مختلف دیہاتوں میں علیحدہ علیحدہ دیہات کی بولیاں بولی جاتی ہیں۔ اُنہیں ہندی کیونکر کہا جاسکتا ہے عوام کی زبان اور دیہاتیوں کی زبان میں ان کے نزدیک کوئی فرق نہیں۔ پروفیسر سر جھا نے اپنی گوالیار کی تقریر میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ بھی حقیقت سے اتنی ہی دور ہیں۔ جتنے کہ ان کے ارشادات۔

حال میں ہی اخبار "لیڈر" الہ آباد میں دو حضرات کے مضامین شائع ہوئے تھے۔ ان میں اردو زبان اور مسلمانوں کے خلاف جو کچھ کہا جاسکتا تھا سب کچھ کہہ دیا گیا حتیٰ کہ انجمن ترقی اردو کو بھی نہیں چھوڑا گیا کسی کی زبان اور قلم کو نہیں روکا جاسکتا۔ واقعات کو بغیر کسی شہادت کے بیان کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ ان مضامین کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ انسان اپنی بات کو منوانے کے لئے کس درجہ غلط بیانی پر آمادہ ہوسکتا ہے۔

اب ہم ان مضامین کا ذکر کرتے ہیں جن میں واقعات کا خون نہیں کیا گیا۔ بلکہ حقیقت بیان کی گئی ہے۔ آپ ان سے خواہ اتفاق کریں یا اختلاف لیکن ان پر ٹھنڈے دل سے غور کرنا ضروری ہے۔

سر تیج بہادر سپرو کا مشہور مقولہ ہے کہ اردو زبان ہندو مسلمان دونوں کو اپنے آباؤ اجداد سے ایک مشترکہ و مقدس ترکہ کی حیثیت سے ملی ہے۔ جو قطعاً ناقابل تقسیم ہے

پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی کا خیال ہے کہ :-

(۱) اردو ہندو مسلمانوں کے اختلاط کا نتیجہ ہے (۲) عربی فارسی الفاظ ان لوگوں نے اردو میں داخل کئے۔ جو ایک طرف عربی و فارسی اچھی طرح جانتے تھے اور دوسری طرف پراکرت اور اپ بھرنش سے بھی واقف تھے۔ (۳) اہل ہند اسلامی حکومت کی ابتدا سے قبل فارسی زبان جانتے تھے۔ مثال کے طور پر البیرونی کا ایک ہندو عالم سے سنسکرت پڑھنا اور "ملک" وزیر محمود غزنوی کا فارسی میں مراسلات وغیرہ لکھنا مثال میں پیش کیا جاسکتا ہے (۴) ہندوؤں نے اپنے دھرم کے پرچار میں اردو کا استعمال کیا جس طرح اسلامی تسلط کے ابتدائے عہد میں مسلمان صوفیوں نے تبلیغ کے لئے اردو کا استعمال کیا تھا (۵) مسلمان شاعروں میں ملک محمد جائسی عبدالرحیم خانخاناں وغیرہ نے ہندی شاعری کی ترقی میں نمایاں حصہ لیا۔ اسی طرح چند کوی اور تلسی داس وغیرہ نے اپنے ہندی دوہوں میں عربی و فارسی الفاظ کا استعمال کیا (۶) موجودہ دور میں سرور جہان آبادی اور آرزو لکھنوی کا نام پیش کیا جاسکتا ہے (۷) گاندھی جی نے ناگپور میں ہندی کانفرنس میں یہ کہہ کر کہ "اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے" شدید غلطی کی ہے۔

اردو کی ہمہ گیری کے متعلق پنڈت کیفی کا خیال ہے "ہماری اردو ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترک مساعی اور اتحاد کا نتیجہ ہے اس کی تنظیم و تدوین میں ان دونوں فرقوں کی شرکت ہے۔ یہ تنظیم سلطان اور رعایا کے حاکمی اور محکومی (افسری) اور ماتحتی کے اثر سے مبرا ہے وہ ایک مبارک ثمر تھا اس ادبی کل برگش اور طوبی کے پیوند کا جو قدرت نے ہندوستان کی سرزمین پر بخشے یہاں معاشرت نے انہیں پیوند کیا رواداری نے اس کو تہذیب و تمدن کے امرت سے سینچا اور شائستگی نے اس کی ضروری شاخ تراشی کی حسن سلیقہ اور شعور لغیاتی نے موافق ہوا مہیا کی تب یہ علمی پودا پروان چڑھا اور پھولا پھلا اب انہیں باغبانوں کی نسلیں اگر اس سرسبز نونہال کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا چاہتی ہیں تو سمجھ لیجئے کہ یہ کیا بات ہے؟"

اس سے آگے میں کچھ نہیں کہونگا"۔

ڈاکٹر عبدالحق صاحب اردو کے ایک بہت بڑے محسن ہیں۔ انہوں نے اپنے مختلف مضامین اور تقریروں میں اس مسئلے پر اچھی طرح روشنی ڈالی ہے۔ حال ہی میں ان کے خطبات شائع ہوئے ہیں۔ ان کے مطالعے سے ہمیں ہندی اردو ہندوستانی کے قضیئے کے سمجھنے میں کافی مدد ملتی ہے۔

ہم پروفیسر مجیب کی رائے بھی اس سلسلے میں نظر انداز نہیں کر سکتے۔ ان کا خیال ہے کہ:-

(۱) گذشتہ زمانے میں مسلمانوں نے ہندی کی تحصیل کی۔ اور اسے ادبی زبان بنانے میں ہندو بھائیوں سے زیادہ نہیں تو ان کے برابر ضرور کوشش کی لیکن بات یہ ہے کہ اس زبان کے ساتھ مذہبی اور کلچرل (تہذیبی) لوازمات ایسے وابستہ ہو گئے ہیں کہ مسلمان بحیثیت مجموعی ان سے اپنے آپ کو متحد و منسلک نہیں کر سکتے۔

(۲) ہماری مشترکہ زبان ہندوستانی کے نام سے موسوم ہوگی نہ کہ ہندی کے نام سے

(۳) ہندوستانی کو کسی فرقہ کی مذہبی روایات سے مطلق کوئی تعلق نہ ہوگا۔

(۴) لفظ کا معیار اس کا رواج ہوگا نہ کہ اس کا دیسی یا بدیسی ہونا۔

(۵) تمام وہ الفاظ جو اردو کے ہندو اہل قلم نے اور ہندی کے مسلمان مصنفوں نے استعمال کئے ہیں۔ مروجہ الفاظ تسلیم کئے جائیں گے۔

(۶) اصطلاحی الفاظ خاص کر سیاسی اصطلاحات کے انتخاب میں سنسکرت کی اصطلاحات کو ترجیح نہ دی جائے۔ بلکہ اردو ہندی اور سنسکرت کی مصطلحات کے فطری انتخاب کی بھی گنجائش رکھی جائے۔

(۷) دیوناگری اور عربی رسم الخط دونوں مسلم خیال کئے جائیں دونوں کے سکھانے کی سہولتیں بہم پہنچائی جائیں۔

پروفیسر مجیب کے خط کا جس میں یہ تجویزیں پیش کی گئی تھیں۔ "کھل بھارتیہ ساہتیہ پریشد" کے اجلاس میں جو حشر ہوا۔ اور گاندھی جی نے اس کے متعلق جو کچھ فرمایا۔ اس کے دہرانے کی ضرورت نہیں "ہندی اردو ہندوستانی" کے تنازع کا زمانہ کانگریس کی صوبجاتی حکومتوں کا زمانہ تھا۔ صوبہ متحدہ آگرہ و اودھ میں اس قضیہ نے خوب زور پکڑا۔ اور نوبت یہانتک پہنچی۔ کہ وزیر تعلیم یوپی نے اپنی بنارس کی تقریر میں صاف صاف کہدیا۔ کہ اگر ہمیں ہندی کو جنوبی ہند والوں کے لئے عام فہم بنانا ہے۔ تو اس میں بیشتر سنسکرت الفاظ کی آمیزش کرنا پڑے گی۔ حالانکہ بقول ڈاکٹر عبدالحق جنوبی ہند کے لوگ ان ہندی کے پرستاروں سے صرف اسی لئے ناراض ہیں۔ کہ یہاں کی مادری زبان اور کلچر کو مٹا کر ایک نئی زبان اور کلچر رائج کرنا چاہتے ہیں۔ لاکھوں روپیہ خرچ کرنے کے بعد ہندی جنوبی ہند میں ایک

ایسی ہی کتابی زبان کی شکل میں ایجاد کی گئی۔ جسے سنکر بڑے بڑے پنڈت بھی کان پر ہاتھ دھرنے لگے۔ اردو کے شیریں اور عام فہم الفاظ نکال کر خواہ مخواہ سنسکرت کے ادق الفاظ ٹھونسے جانے لگے۔ حالانکہ بقول امیر انشاء اللہ خاں انشاء کے ہر وہ لفظ جو اردو میں مشہور ہوگیا عربی ہو یا فارسی۔ ترکی ہو یا سُریانی پنجابی ہو یا پوربی۔ از روئے اصل غلط ہو یا صحیح وہ اردو کا لفظ ہے۔ اگر اصل کے موافق مستعمل ہے تو بھی صحیح ہے اور اگر خلاف اصل مستعمل ہے تو بھی صحیح ہے۔ اس کی صحت و غلطی اردو کے استعمال پر موقوف ہے۔ گو اصل میں صحت نہ رکھتا ہو"۔ لیکن یہاں طرفیت نے ایسے ایسے نئے الفاظ تراشے کہ جنہیں سنکر ہنسی آتی ہے چند الفاظ ملاحظہ ہوں۔

صوبہ متحدہ	کا مترادف	ہندوستانی لفظ	جٹ پرانت
تعلیم	"	"	ٹکشا
آزادی	"	"	سوتنترتا
نقاد	"	"	لاگو
اعلان	"	"	گھوش گھونشا
مدعی	"	"	جھگڑا اپیلڑو

نام نہاد ہندوستانی زبان کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

"اس سبھا کا پتیو مجھے دینے کا کارن جب ڈھونڈھتا ہوں تو دو ہی پرتیت ہوتے ہیں۔ ایک میرا ساہتیہ کارتہ ہونا اور اس لئے کم سے کم دیش کا کارن ہونا۔ تھا دوسرا میرا ہندوستان کی سب بھاشاؤں کا پریم"۔*

اس عبارت کا ہر ہر لفظ پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ گاندھی جی کو ہندوستان کی سب بھاشاؤں سے کتنا پریم ہے۔

کچھ عرصہ ہوا کہ ریڈیو کے دہلی اسٹیشن سے ڈاکٹر تاراچند، ڈاکٹر مولوی عبدالحق بابو راجندر پرشاد، ڈاکٹر ذاکر حسین خاں، پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی اور مسٹر آصف علی کی تقریریں ہندوستانی کے موضوع پر ہوئیں۔ جامعہ ملیہ دہلی نے ان کو فوراً شائع بھی کر دیا لیکن افسوس یہ ہے کہ یہ مسئلہ جہاں تھا اسی جگہ رہا۔ ڈاکٹر عبدالحق کی تقریر کو چھوڑ کر بقیہ تمام تقریریں پڑھتے وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فاضل مقررین نے ان کے لکھنے میں قدم قدم پھونک پھونک کر رکھا ہے۔ اور کوشش کی ہے۔ کہ دل کی بات زبان پر نہ آئے جس تقریر یا تحریر میں خلوص نہیں۔ وہ تقریر یا تحریر نہیں۔ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کی تقریر پھر بھی غنیمت ہے۔ دوسرے حضرات یہ بھی نہ کہہ سکے۔ ڈاکٹر صاحب کا خیال ہے کہ "اچھی ہندوستانی کی پہچان یہ ہے کہ نہ اردو والا اس میں کوئی نقص نکالے اور نہ ہندی والا انگلی رکھ سکے۔ زبان کو اور خصوصاً ہندوستانی کو شدھ کرنے کی کوشش نہیں کرنا چاہئے۔ ورنہ تفرقہ

* گاندھی جی کا خطبہ صدارت (ناگپور)

اور زیادہ بڑھ جائے گا۔ نئے لفظوں کے لئے اردو اور ہندی والوں کو مل کر کام کرنا چاہیئے" کاش برادران وطن اس پر عمل کریں۔ اور یہ قضیہ ہمیشہ کے لئے طے ہو جائے۔

ہندی اردو اور ہندوستانی کے قضیہ کے متعلق سید سلیمان ندوی، میاں بشیر احمد، مولوی ابوالقاسم وغیرہ نے بھی مضامین لکھے ہیں اور اردو کی ہمہ گیری اور اس کے سلیس بنانے پر زور دیا ہے لیکن جب تک ذہنیت میں تبدیلی نہ ہوگی۔ یہ تحریریں کچھ نہیں کر سکتیں ہمیں اس بات کا خیال رکھنا چاہئے کہ اردو ایک آریائی زبان ہے۔ اور اس کے اہم عناصر عربی فارسی اور ہندی ہیں اس میں ہر زبان کے الفاظ جذب کرنے کی طاقت ہے۔ موجودہ دور میں انگریزی زبان کا بھی اس پر کافی اثر ہوا ہے۔ اس لئے ہمیں صرف ایک ہی زبان سے روک ٹوک کے بغیر نئے الفاظ اور اصطلاحات نہیں لینا چاہئیں۔ بلکہ ان تمام زبانوں کا خاص طور پر خیال رکھنا چاہئے۔ جو اردو میں بطور عنصر کے شامل ہیں۔ اردو گرامر کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ایک لسانی مسئلے کو سیاست کی گتھیوں میں الجھا دینا سخت غلطی ہے۔ اگر ہم نے اس پر عمل کیا اور عربی فارسی کے ثقیل الفاظ لینا بند کر دیئے تو ہم دیکھیں گے کہ مخالفین کی انتہائی کوششوں کے باوجود ایک دن اردو ہی ہندوستان کی مشترکہ زبان بنے گی۔

م ۔ ع ۔ ص

ماہ اپریل کیلئے
انعامی افسانے کا مقابلہ

پہلا انعام
دس روپے

دوسرا انعام
پانچ روپے

شاہکار کی ماہ اپریل کی اشاعت کے لئے انعامی افسانے میں مندرجہ ذیل خصوصیات کا ہونا ضروری ہے۔

۱۔ افسانہ مزاحیہ ہو۔
۲۔ پلاٹ میں تہذیب جدید اور پرانی تہذیب کا تصادم دکھایا جائے۔
۳۔ افسانے میں خواہ نئی تہذیب خواہ پرانی تہذیب کا پلہ بھاری رہے کسی ایک رنگ کو اچھا دکھانے کی کوئی قید نہیں ہے۔

مبلغ دس روپے کا ایک انعام اس افسانے کے لئے مقرر کیا گیا ہے جو ادارے کے نقطۂ نظر سے بہترین اور قابل اشاعت ہو **مبلغ پانچ روپے** کا ایک انعام دوسرے درجے کے افسانے کے لئے مقرر کیا گیا ہے یہ افسانے اور ان کا حق اشاعت شاہکار کی ملکیت ہونگے۔
ادارے کو حق حاصل ہے کہ موصول شدہ افسانوں میں سے انعامی افسانوں کے علاوہ چیدہ چیدہ افسانے مصنفین کو معاوضہ دیئے بغیر شائع کرے۔

شرائط

۱۔ افسانہ شاہکار کے تین صفحے سے تجاوز نہ کرے۔
۲۔ افسانہ اچھے خط میں فلسکیپ کاغذ کے ایک طرف لکھا جائے۔
۳۔ افسانے کے خاتمے پر مصنف کا نام و پتہ مکمل اور خوش خط لکھا ہوا ہو۔
۴۔ لفافے کی پشت پر جلی حروف میں "افسانہ برائے ماہ اپریل" تحریر ہو۔
۵۔ تمام افسانے دفتر شاہکار میں ۱۴ مارچ ۱۹۴۲ء تک موصول ہو جانے چاہئیں اس تاریخ کے بعد موصول شدہ افسانے مقابلہ میں شریک نہیں کئے جائیں گے
۶۔ مصنفین پر ان شرائط کی پابندی شرکت مقابلہ کے لئے ضروری ہے۔

مہتمم "شاہکار" لاہور

نقشِ حیات

آرزوئے کمال ہے یہ حیات
جستجوئے جمال ہے یہ حیات

ماورائے تعینات نظر
لمحۂ "لازوال" ہے یہ حیات

غور سے دیکھ اس کو غور سے دیکھ
خود عمل یا خیال ہے یہ حیات

اس نیامِ جمال کے اندر
ایک تیغِ جلال ہے یہ حیات

جس کا حل اس کے گردوپیش میں ہے
وہی ٹیڑھا سوال ہے یہ حیات

جانے وہ جانِ پاک کیا ہوگی؟
جس کا ادنیٰ کمال ہے یہ حیات

آگ کا کھیل ہے امیں یعنی
آپ اپنا وبال ہے یہ حیات

امین حزیں سیالکوٹی

رشحاتِ اکبر

[عزیز مکرم چودھری محمد اکبر خان صاحب بی اے اپنی گرانمایہ قابلیت علمی استعداد اور ادبی مہارتِ فن کے سبب "الشاب سِنّاً و افضلُ علماً" کے مصداق ہیں۔ ان کے لطیف و نفیس اندازِ شاعری کا نمونہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔ تاجور]

پھر ان سے التجائے کرم کر رہا ہوں میں
شیرازۂ امید بہم کر رہا ہوں میں

پھر کر رہا ہوں وعدۂ فردا پہ اعتبار
پھر دل کی سادگی پہ ستم کر رہا ہوں میں

پھر دے رہا ہوں دعوتِ بیداد برق کو
پھر اپنے آشیاں پہ کرم کر رہا ہوں میں

پھر دیکھتا ہوں گلشنِ مہر و وفا کے خواب
پھر قصد خارزارِ الم کر رہا ہوں میں

یوں چشمِ تر سے دیکھ نہ میری طرف ندیم
پھر دل سے محوِ یادِ الم کر رہا ہوں میں

جس میں سما رہا تھا جنونِ ترکِ عشق کا
اس سر کو ان کے پاؤں میں خم کر رہا ہوں میں

اکبر مرے کلام کی تعریف ہو نہ ہو
واللہ واردات رقم کر رہا ہوں میں

محمد اکبر خان

اقبال اور وطنیّت

قرآن پاک میں ایک آیہ کریمہ ذیل کے واقعہ کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

جب حضرت ابراہیمؑ نے رات کو جھلملاتے ہوئے ستاروں کو دیکھا تو خیال کیا کہ خدا انہی چھوٹی چھوٹی ہستیوں پر مشتمل ہے۔ جب ماہتاب بلند ہوا اور ستارے اس کی چاندنی میں معدوم ہو گئے۔ تو وہ چاند کو خدا پکارنے لگے۔ اور آفتاب عالمتاب نے مشرق سے طلوع ہو کر ماہتاب کی روشنی کو ماند کر دیا۔ تو اسے اپنا خدا مان لیا۔ مگر جب شام کو اسے بھی ڈھلتے اور چھپتے دیکھا تو بے اختیار اس خدائے لایزال کے آستانے پر گر پڑے جو اس تمام نظام شمسی کا خالق و آفریدگار ہے۔ سکوت شام میں غروب آفتاب نے خلیلؑ کی چشم جہان بین کو روشن کر کے اس کو معبودِ حقیقی کا نشان بتایا۔

یہ واقعہ خلیل اللہؑ کے ارتقاء ذہن و ادراک کی عمدہ ترین مثال ہے۔ اس سے ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ ایک صداقت طلب انسان کو درجۂ کمال تک پہنچنے کے لئے کن کن مدارج سے گذرنا پڑتا ہے۔ اقبال جیسے حقیقت طلب شاعر کے ارتقاء ذہن کو اسی مثال کی روشنی میں دیکھنا چاہیئے۔

اقبال کی تصنیف "جاوید نامہ" میں جب ہم ہندوستان کے متعلق یہ اشعار پڑھتے ہیں ؎

آسماں شق گشت و حورے پاک زاد ٭ پردہ را از چہرۂ خود برکشاد
در جبینش نار و نورِ لایزال ٭ در دو چشم او سرورِ لایزال
حلۂ در بر سبکتر از سحاب ٭ تار و پودش از رگِ برگِ گلاب
با چنیں خوبی نصیبش طوق و بند ٭ بر لبِ او نالہ ہائے دردمند

اور ان کا مقابلہ ابتدائی "قومی ترانہ" سے کرتے ہیں۔ تو ہمیں بظاہر شاعر کی کیفیات قلبی میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ مگر نظر غائر سے دیکھنے والے کو اقبال کے نقطۂ نظر میں ایک انقلاب دکھائی دیگا۔

بیسویں صدی کے اوائل یعنی ۱۹۰۵ء سے قبل کا وہ زمانہ تھا۔ جب کہ آزادی کا نعرہ بلند کرنا حکومت پر ضرب لگانے کے ہم معنی سمجھا جاتا تھا۔ غلامی لوگوں میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ وہ حکومت کی ظاہری سہولتوں اور آسائشوں کو دیکھ کر اس پر دل و جان فدا ہو رہے تھے۔ اور حکومت برطانیہ کی دیرپائی کے لئے مسجدوں، مندروں، گرجوں اور شوالوں میں دعائیں مانگی جاتیں اور گیت گائے جاتے تھے۔ آزادی کا نام لینے والوں کو سوسائٹی اور ملک کا جانی دشمن خیال کیا جاتا تھا۔ آخر کار اقبال سے نہ رہا گیا اور وہ پکار اٹھے۔

یہ دستورِ زباں بندی ہے کیسا تیری محفل میں
یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری

ابنائے وطن کی بے التفاتی ملاحظہ ہو۔ یہ نہیں کہ ان الفاظ کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر اقبال کو اپنے دل کی بات کہنے میں مدد دیتے۔ اس کے برعکس اس کی آواز کو دباتے ہیں۔ گویا آزادی انہیں ناگن کی طرح ڈستی ہے ؎

اس چمن میں مرغ دل گائے نہ آزادی کے گیت
آہ! یہ گلشن نہیں ایسے ترانے کے لئے

مگر اقبال ان تمام نازیبا سلاسل کو توڑ کر تن تنہا میدان عمل میں گامزن ہو جاتے ہیں۔ رو سو۔ والٹر اور روبسپئرے بھی اس وقت وطن کی حمایت میں اٹھے۔ جب انہوں نے اہل وطن میں آثار حیات دیکھ لئے اور انہیں یقین ہو گیا کہ ان کے الفاظ صدا بصحرا ثابت نہ ہونگے میزینی اور گیری بالڈی اور روبسپئرے بھی اس وقت وطن کی حمایت میں اٹھے۔ جب انہوں نے اہل وطن میں آثار حیات دیکھ لئے اور انہیں یقین ہو گیا کہ ان کے الفاظ صدا بصحرا ثابت نہ ہونگے۔ میزینی اور گیری بالڈی بھی اپنے ابنائے وطن کی رفتار ترقی کا بغور معائنہ کرتے رہے۔ اور آخرش ان میں زندگی کی جھلک اور آزادی کی دھندلی سی خواہش دیکھ کر انہوں نے اُن کی آزادی کے لئے پیشقدمی کی۔ ہندوستان کی جو حالت اس وقت تھی۔ اسے صفحۂ قرطاس پر بیان کرنا آسان نہیں ہے صرف چند خدا کے بندے جو انگلیوں پر شمار ہو سکتے ہیں۔ اپنے سینوں میں اس بے بہا گوہر کو چھپائے اس انتظار میں تھے۔ کہ کوئی انسان کامل۔ کوئی "ماسٹر سپرٹ" ان میں پیدا ہو۔ جو ان کی ترجمانی کرے۔ اُن کے جذبات کو تقویت بخشے اور حصول مدعا میں ان کی رہبری و رہنمائی کرے۔ خوش بختی سے ان کی مراد جلد ہی بر آئی۔

اقبال نے اول اول قوم کو محض خطرات سے آگاہ کیا۔ کمزوریوں کی طرف توجہ دلائی۔ اس کی خستہ حالی پر آنسو بہائے اور کہا۔ ؎

مرا رونا نہیں رونا ہے یہ سارے گلستاں کا
وہ گل ہوں میں خزاں ہر گل کی گویا ہے خزاں میری

اور ؎

رُلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں مجھ کو
کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں
وطن کی فکر کر ناداں! مصیبت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں
نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہو گی داستانوں میں

ان الفاظ میں کس قدر جسارت اور دلیری سے کام لیا گیا ہے۔ اس سے زیادہ صاف اور کھلی گفتگو اور کیا ہو سکتی ہے۔ صرف بے انتہا محبت ہی میں یہ الفاظ زبان سے نکل سکتے ہیں۔

اسی زمانے میں اقبال نے "ترانہ" لکھا۔ یہ زمانہ ۱۹۰۵ء تک ختم ہو جاتا ہے دوسرے محبانِ وطن کی طرح اقبال اپنے وطن سے کورانہ اور اندھا دھند محبت نہیں کرتا۔ وہ نقائص سے بخوبی آگاہ ہے۔ وہ جانتا ہے کہ علت و معلول کا سلسلہ اٹل ہے۔ سبب بغیر مسبب کے رُونما پذیر نہیں ہو سکتا اگر ہندوستان غلامی کی دلدل میں پھنسا ہوا ہے۔ اگر وہ ایک مدت مدید سے بیرونی استبداد سے کچلا جا رہا ہے۔ تو لا محالہ کسی گناہِ عظیم کی پاداش بھگت رہا ہے وہ سوچتا ہے اور اس کی حقیقت اس پر آشکار ہو جاتی ہے۔ اس کی عمیق نگاہیں فوراً فرقہ وارانہ نفاق اور تعصب کو غلامی کی تہ میں دیکھ پاتی ہیں ؎

نشانِ برگِ گل تک بھی نہ چھوڑ اس باغ میں گلچیں
تری قسمت سے رزم آرائیاں ہیں باغبانوں میں

اور ہے ؎

اُجاڑا ہے تمیزِ ملت و آئیں نے قوموں میں
مرے اہلِ وطن کے دل میں کچھ فکرِ وطن بھی ہے؟

تعصب کے تباہ کن مرض سے چھٹکارا پانا گویا کوہ بیستوں کو کاٹ کر جوئے شیر کا لانا ہے۔ اس کے لئے ایک نہایت "قابل حکیم" کی ضرورت تھی۔ جو مریض کو اس کی بیماری کی جڑ سے آگاہ کرتا ایسا طبیب روحانی موجود تھا۔ اس نے مرض کی صحیح تشخیص کر کے آزمودہ علاج پیش کر دیا کہ ؎

تعصب چھوڑ ناداں دہر کے آئینہ خانے میں
یہ تصویریں ہیں تیری جن کو سمجھا ہے بُرا تو نے
شجر ہے فرقہ آرائی تعصب ہے ثمر اس کا
یہ وہ پھل ہے کہ جنت سے نکلواتا ہے آدم کو

دیگر ؎

جو تو سمجھے تو آزادی ہے پوشیدہ محبت میں
غلامی ہے اسیرِ امتیازِ ما و تو رہنا
نہ رہ اپنوں سے بے پروا اسی میں خیر ہے تیری
اگر منظور ہے دنیا میں او بیگانہ خو رہنا

شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

اقبال سیاسی انقلاب سے پہلے قلبی انقلاب دیکھنا چاہتا ہے۔ ؎

پھر کہیں سے اس کو پیدا کر بڑی دولت ہے یہ
زندگی کیسی جو دل بیگانۂ پہلو ہوا

دل جو سینکڑوں آرزوؤں اور خواہشات کی آماجگاہ ہے جو ہزاروں امیدوں اور امنگوں کا منبع ہے جس سرچشمے سے زندگی کی گوناگون لہریں پھوٹتی ہیں۔ اور ہماری تمناؤں کی کشت کو ہرا بھرا کر دیتی ہے۔ وہ دل جس میں طرح طرح کی حسیات پیدا ہو کر ہمیں ایک دوسرے سے وابستہ کر دیتی ہیں۔ جو ہمارے رشتوں کو مضبوط بناتی اور ہم میں ایثار و قربانی کا مادہ پیدا کرتی ہیں۔ اگر دل نہ ہو تو زندگی کیسی؟ "دل کو پیدا کر بڑی دولت ہے یہ"۔ ایسی دولت جو فقر میں سلطانی کی مصداق ہے۔ دل غلامی کی زنجیروں کو ایک لمحے کے لئے بھی برداشت نہیں کر سکتا۔

اقبال آزادی کو رحمت اور نعمت عظمیٰ قرار دیتا ہے جس سے بے بہرہ رہنا گویا انتہائی درجے کی سیہ بختی اور ابدی بدقسمتی ہے۔ وہ جس کے لئے "خاکِ وطن کا ہر ذرہ دیوتا ہے" جب اپنے وطن کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا دیکھتا ہے تو یاس و ناامیدی سے کانپ اٹھتا ہے غیر کا تسلط اس کے سینہ پر نشتر کا کام کرتا ہے اور وہ دنیا بھر میں اپنے آپ کو سخت مظلوم بے کس اور بے بس خیال کرتا ہے۔ وہ روتا ہے لیکن اس کی آواز کوئی نہیں سنتا۔ اس کی فریاد فضا میں گونج کر خود بخود طوفانی موجوں کی طرح خاموشی اختیار کر لیتی ہے۔ وطن پھر اس کے لئے وطن نہیں رہتا ؎

بنائیں کیا سمجھ کر شاخِ گل پر آشیاں اپنا؟
چمن میں آہ کیا رہنا جو ہو بے آبرو رہنا!

انسان کس قدر جابر و غاصب ہے۔ قدرت ہمیں آزاد پیدا کرتی ہے لیکن اس کی ہوس ملک گیری ہماری آزادی کو غلامی میں مبدل کر دیتی ہے۔ وہ ہمارے جائز حقوق کو بزورِ شمشیر پامال کر دیتا ہے سینکڑوں بے دردیوں کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اس سے بڑھ کر انسان کے لئے اور کیا ذلت و بے کسی کا محل ہو سکتا ہے۔ کہ وہ اپنے ہی مکان یا وطن میں ایک بیگانہ بن کر رہے ہر چیز کے لئے جس کا قدرت نے اسے جائز مالک ٹھہرایا ہے۔ اسے غیر کی اجازت طلب کرنی پڑے۔

وطن کی محبت کم و بیش ہر انسان کے دل میں ہوتی ہے۔ یہ ایک فطرتی جذبہ ہے جس طرح ایک شخص اپنے مکان میں کسی غیر کا دخل گوارا نہیں کر سکتا۔ اسی طرح وہ اپنے وطن پر کسی غیر قوم کی حکومت برداشت نہیں کر سکتا۔ اقبال کی کوشش بیشتر اس کے کہ وہ اپنے مکان کو غیر کی دستبرد سے بچائے یہی ہو گی کہ وہ اپنے وطن اور اہلِ وطن کو غیر اقوام کی سلاسلِ محکومی سے نجات دلوائے۔ وہ غلامی کے تلخ اثرات

سے خوب واقف ہے۔ وہ جانتا ہے کہ زندگی جو آزادی میں بحرِ بیکراں کی مانند ہے۔ بندگی میں گھٹ گھٹ کر اک جوئے کم آب رہ جاتی ہے۔ غلامی میں دل مردہ اور روح بارِ تن ہو جاتی ہے۔ غلامی شیرِ غاب کو بزدل بنا دیتی ہے۔ اس سے ملک میں نفاق۔ ابتری اور فساد برپا ہو جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ آزاد اقوام اس ملک کی حالت پر نفرین بھیجتی ہیں ؎

از غلامی مردِ حق زنار بند ٭ از غلامی گوہرش نا ارجمند
شاخِ او بے مہرگانِ عریاں برگ ٭ نیست اندر جانِ او جز بیمِ مرگ
آبروئے زندگی در باختہ ٭ چوں خراں باکاہ وجو در ساختہ

اقبال کی سب سے بڑی آرزو اپنے ملک کو آزاد دیکھنا ہے۔ اس کی کوشش یہی ہے کہ کسی طرح سلطنتِ غیر اور غلامی کے سکراتی اثرات کو قوم پر عیاں کر کے اس کے دل و دماغ میں آزادی کی روح پھونکے۔ ہر ممکن طریق سے وہ اس کو اکسانے کی کوشش کرتا ہے ؎

فریاد ز افرنگ و دل آویزئی افرنگ ٭ فریاد ز شیرینی و پرویزئی افرنگ
عالم ہمہ ویرانہ ز چنگیزئی افرنگ ٭ معمارِ حرم! باز بہ تعمیرِ جہاں خیز
از خوابِ گراں، خوابِ گراں، خوابِ گراں خیز
از خوابِ گراں خیز

اقبال تاریخ کو بھی اپنے کام میں لاتا ہے۔ قصہ پارینہ کے جانگداز نغمے اس کے دل و دماغ کو آزادی سے گرماتے ہیں۔ پرانی یادوں سے اک خاص کیفیت اس پر طاری ہو جاتی ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ اب کوئی خارجی طاقت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ یقیناً اب حصولِ مدعا میں اسے کامیابی نصیب ہوگی عظیم الشان مستقبل کی امنڈتی ہوئی لہریں عہد حاضرہ کی خوشگوار موجوں کو دباتی ہوئی ابھر آتی ہیں۔ امید کی دیوی دھندلکے میں اس کو اپنی طرف پر افشاں نظر آتی ہے۔ اور آزادی اس سے بھی قریب ہے۔ ؎

ٹوٹنے کو ہے طلسمِ ماہ سیمایانِ ہند
پھر سلیمیٰ کو نظر دیتی ہے پیغامِ خروش
پھر یہ غوغا ہے کہ لا ساقی شرابِ خانہ ساز
دل کے ہنگامے مئے مغرب نے کر ڈالے خموش

یہاں مجھے ایک اہم واقعہ کی طرف آپ حضرات کی توجہ منعطف کرانا ہے۔ ۱۹۰۵ء سے لیکر ۱۹۰۸ء تک ہم اقبال کو اصنامِ باطلہ کے توڑنے میں مصروف پاتے ہیں۔ یہ عرصہ موصوف کے سفر یورپ سے اور بھی اہم صورت اختیار کر لیتا ہے۔ ۱۹۰۵ء میں اقبال آزاد اقوام کا مشاہدہ اور آزادی کے گُر فراہم کرنے کے لئے یورپ تشریف لے گئے۔ لیکن "دور کے ڈھول سہانے" یورپ کو آپ نے اپنی توقعات ارفع سے بہت فروتر پایا۔ اس چیز نے آپ پر ایک نمایاں اثر کیا۔ یورپ دہریت۔ مادہ پرستی۔ سرمایہ داری۔ سائنس اور قومی عناد کی زبردست لعنتوں میں جکڑا ہوا تھا۔ وہاں آپ کو "انسان نوع کا شکاری" اور پرانی تہذیب کا دشمن نظر آیا۔ اقبال نے قومیت اور وطنیت کے مہلک اثرات و نتائج کو دیکھ کر مارچ ۱۹۰۷ء والی نظم قلمبند کی جس کے ذیل کے دو اشعار قابل غور ہیں۔ جو اقبال کی دور بینی اور پیش گوئی پر حجت ہیں ؎

دیارِ مغرب کے رہنے والو! خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو، وہ اب زرِ کم عیار ہوگا
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہوگا

یہ پیش گوئی یورپ کی جنگ عظیم میں پوری ہوئی۔ اور متواتر چار سال تک یورپ کی ایک قوم دوسری قوم کو نیست و نابود کرنے میں مشغول رہی۔

چند سال کے عرصہ میں اقبال کے پیش نظر کوئی پروگرام نہ تھا ان کی روح کسی نصب العین کی جستجو میں تھی۔ وہ بار بار "کوشش ناتمام" "تنہائی" "سعی اور جدوجہد" کا ذکر کرتے ہیں۔ منزل کی تلاش میں ہیں لیکن راہ منزل سے بے خبر ہیں۔ مگر یورپ نے انہیں ایک چیز سے آگاہ کر دیا تھا اور وہ یہ کہ جس رستے پر دانایان فرنگ چل رہے ہیں وہ ترکستان کا راستہ ہے کعبہ کا نہیں۔

اس کے بعد ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ اور وہ "اسرار و رموز" کا دور ہے جب "اسرار خودی" کا ترجمہ انگریزی میں ہوا تو ہربرٹ ریڈ Herbert Reid نے متاثر ہو کر معاصرین شعراء کے نام یہ پیغام شائع کیا کہ "شاعروں کو چاہئے کہ وہ تغزل اور بد دماغی او باشیوں کو ٹھکرا کر اقبال کی طرح کسی پیغام کی اشاعت اپنے اشعار میں کریں۔ کیونکہ اقبال انسانیت کی نجات میں کوشاں و سرگرم ہے ——"

اقبال اپنے ایک مضمون میں رقمطراز ہیں کہ:۔

"انسان کی نجات کا دارومدار مساوات اور آزادی عامہ ہے ہمیں سائنس کے ان تمام استعمالات پر جو نوع انسان کے لئے اتنی مصیبت کا باعث ہوئے ہیں نظر ثانی کی ضرورت لاحق ہو رہی ہے نیز ہمیں سیاسیات پس پردہ یعنی ان پوشیدہ نوشتجات کو جو ہمیشہ کم فہم اور کمزور نسلوں کی بیخ کنی میں مستعمل ہیں بالکل ترک کر دینا چاہئے"

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان باتوں پر کس طرح عملدرآمد ہو قانون ساز مجلس یا دیگر احکام سے ان کا اقرار کسی طرح بھی عمل میں نہیں آ سکتا جنگ کے بغیر بھی بعض ممالک میں امن اور معاہدات و طریقوں سے کمزوروں کی حق تلفی کر سکتے ہیں مثلاً سرمایہ دار ہمیشہ مزدوروں کے ... اقبال کا خیال ہے کہ ہمیں ایک ایسی

شخصیت کی ضرورت ہے جو ہمارے معاشرتی مسائل کو حل کرے۔ اور ہمارے تنازعات باہمی کو رفع کرے۔ نیز اخلاق بین الاقوام کو اور بھی زیادہ مضبوط اور سنگین بنیادوں پر رکھے"۔ یہ ضروری نہیں کہ ایسی شخصیت صرف ایک ہی انسان تک محدود ہو۔ بلکہ وہ ایک جماعت پر بھی مشتمل ہو سکتی ہے جس کی زندہ مثال اسلام ہے۔

اب مجھے اقبال کے ارتقائے خیال کی آخری کڑی کو واضح کرنا ہے۔ اقبال جذبۂ وطنیت کے تنگ نظریوں کو کو دپھاند کر ارضیت کی وسعت میں سکون پذیر ہے۔ جس طرح کائنات ہستی کی ہر شے پر قانون نشو و ارتقا جاری ہے یعنی ہر چیز ابتدائی حالت سے انتہائی درجہ تک پستی سے بلندی تک اور نقص سے کمال تک بتدریج ترقی کرتی ہے۔ اور اس رفتار ترقی میں اسے مختلف درجوں اور منزلوں سے گذرنا پڑتا ہے۔ اسی طرح انسان کا احساس اجتماعی یعنی جذبۂ قومیت بھی تدریجی ترقی کا ایک پورا سلسلۂ ارتقا ہے۔ یہ ایک نہایت محدود دائرے سے شروع ہوتا ہے لیکن بتدریج بڑھتا اور پھیلتا ہے اور بالآخر وسعت و کمال تک پہنچ جاتا ہے۔ اس اجتماعی احساس و ادراک کے سلسلۂ ارتقا کی اساسی کڑیاں حسب ذیل ہیں:-

(۱) امومتہ
(۲) ابوۃ
(۳) عائلہ یا خاندان
(۴) قبیلہ
(۵) بلدۃ
(۶) وطنیت
(۷) جنسیت و قومیت
(۸) براعظمیت یا تقسیم بلحاظ جغرافیہ۔
(۹) انسانیت و ارضیت

انسان جب پیدا ہوتا ہے۔ تو فطرتاً پہلے پہل اپنی ماں سے محبت کرتا ہے۔ اس کے بعد والد کے ساتھ۔ پھر جوں جوں رشتۂ آشنائی بلحاظ عمر بڑھتا جاتا ہے اس کے تعلقات کا بھی حلقہ وسیع تر ہوتا جاتا ہے۔ نسلی الفت کے بعد ایک دوسرا سلسلہ وطنی محبت کا شروع ہو جاتا ہے جس کا آغاز ارتقا کی پانچویں کڑی یعنی بلدیت سے ہوتا ہے۔ ایک مدت تک جس مقام پر انسان رہتا ہے۔ قدرتی طور پر اس سے زیادہ مانوس ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد وطنیت کی کڑی آتی ہے۔ وطنیت "بلدیت" کے رشتے کی ایک خاص ترقی یافتہ صورت کا نام ہے جب تمدن میں مزید ترقی و وسعت ہوتی ہے کثرت آبادیاں اور شہر بس جاتے ہیں۔ انسان کے باہمی علائق بھی زیادہ وسیع ہو جاتے ہیں۔ تو بلدیت کے جذبات میں بھی وسعت شروع ہو جاتی ہے انسان نہ صرف اپنے مسکن و مولد ہی کو بلکہ اس تمام علاقے کو اپنا وطن محسوس کرنے لگتا ہے جس کے ایک گوشہ میں وہ آباد ہے۔

اس کے بعد جنسیت و براعظمیت آجاتی ہے رنگت کسی حد تک قوم کا امتیازی نشان بن جاتی ہے۔ رہنے سہنے کے ڈھنگ۔ کھانے پینے کے اطوار اور دیگر مذہبی اور رواجی رسومات پیدا ہو جاتے ہیں۔ جو ایک ملک کے باشندوں کو دوسرے ملک کے باشندوں سے ممتاز کرتے ہیں۔

جغرافیہ کی تقسیم پر پہنچکر اضافی وسعت کی تمام کڑیاں ختم ہو جاتی ہیں اور وہ منزل سامنے آجاتی ہے۔ جو حقیقت کی آخری منزل ہے جہاں اقبال نے پہنچکر یہ سلسلہ ارتقا درجۂ بلوغ و تکمیل تک پہنچ جاتا ہے۔ یہ منزل انسانیت کی منزل ہے۔ جہاں اقبال نے پہنچکر محسوس کیا کہ رشتوں علاقوں کی تمام پابندیاں اور اضافی نسبتیں جو انسان نے تیار کر رکھی ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی حقیقی اور فطری نہیں ہے حقیقی رشتہ صرف ایک ہے اور وہ یہ ہے کہ تمام کرۂ ارض انسان کا وطن ہے۔ تمام انسان ایک گھرانے کے افراد ہیں۔ اور ہر انسان دوسرے انسان کا بھائی ہے اس منزل پر پہنچکر اقبال کے اجتماعی علائق کا سفر ختم ہو جاتا ہے۔ وحدت نسلی۔ وحدت جنسی اور وحدت مکانی کی جگہ ایک ہی وحدت انسانی اپنی کامل اور بے پردہ صورت میں آشکارا ہو جاتی ہے ؎

شراب روح پرور ہے محبت نوع انساں کی
سکھایا اس نے مجھکو مست بے جام و سبُو رہنا

اور ؎

ریاض ہستی کے ذرے ذرے میں ہے محبت کا جلوہ پیدا
حقیقت گل کو تو جو سمجھے تو یہ بھی پیماں ہے رنگ و بو کا

وطنیت کے محدود دائرے سے نکل کر اقبال انسانیت کی وسعت میں داخل ہوتا ہے۔ وہ تمام نسلی، ملکی اور رنگت کے باطل اصنام کو توڑ کر حقیقت اور اصلیت کے حرم میں دست بدعا ہے کہ ؎

آنکھ میری اور کے غم میں سرشک آباد ہو
امتیاز ملت و آئیں سے دل آزاد ہو
بستۂ رنگ خصوصیت نہ ہو میری زباں
نوع انساں قوم ہو میری، وطن میرا جہاں

یہی درس ہے جو اقبال ہمیں نوع انسان کو دیتے ہیں۔ کیونکہ

اسی عالمگیر ربطِ باہمی سے نظامِ عالم کو ترقی فروغ اور امن جاوید حاصل ہو سکتا ہے۔ اسی سے محاربات کے لامتناہی اور خونین سلسلے پایہ اختتام کو پہنچ سکتے ہیں اسی سے انسان دوسرے انسان کی قدر و قیمت اور حریت کو پہچان سکتا ہے۔ ؎

ہو قید مقامی تو نتیجہ ہے تباہی
رہ بحر میں آزادِ وطن صورت ماہی

اقبال کی یہ تدریجی ترقی یا عام لوگوں کے خیال میں اس کی تبدیلی عقائد عوام میں کافی تنازع و کج بحثی کا باعث ہو چکی ہے۔ بہت سے لوگ جو اقبال کے مشن اور کلام سے ناآشنائے محض ہیں۔ بلکہ وہ بھی جو اقبال سے خاص عقیدت رکھتے ہیں۔ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ کہ اقبال میں وطن کی محبت بالکل مفقود ہو چکی ہے۔ اس کے دل میں اپنی زاد بوم کی آزادی کے لئے ذرا بھی تڑپ نہیں رہی۔ صداقت اور صورت حال اس کے بالکل برعکس ہے۔ اس سے پیشتر اقبال اگر صرف ہندوستان کی آزادی کا خواہاں تھا۔ تو اب وہ تمام دنیا کو آزاد دیکھنے کا آرزومند ہے۔ اس کی پہلی نظموں میں وطن کے لئے اتنی محبت کا اظہار ہے جتنا آخری نظموں میں ہے۔ اقبال وطن کا دوست ہے مگر وطنیت کا دشمن ہے۔ اس وطنیت کا جو بنی نوع انسان میں افتراق و محاربہ پیدا کرے جس طرح ایک وطن دوست ماں اور باپ کا قبیلہ اور شہر کا دوست بھی ہو سکتا ہے۔ اسی طرح اقبال انسانیت کا دوست ہوتے ہوئے وطن دوست بھی ہے۔ فرق صرف زاویہ نظر کا ہے۔ واضح رہے کہ وطن سے اقبال کی مراد جگہ نہیں بلکہ اہل مغرب کا سیاسی تصور ہے۔

اس اقدام نے اقبال کے عقیدتمندوں کی تعداد میں بہت بڑا اضافہ کیا ہے۔ ان نو پیروان اقبال میں سے مسز سروجنی نائیڈو قابل ذکر ہیں۔ وہ اپنے ایک خط میں لکھتی ہیں کہ "اقبال کی شاعری نے میری روح کو وطنیت کی سلاسل سے آزاد کر کے اس میں ایک نئی روح پھونک دی ہے۔ اور مجھ میں تمام بنی نوع انسان سے محبت کرنے کی جسارت اور قابلیت پیدا کر دی ہے"۔

یورپ نے بھی تلخ تجربے کے بعد معلوم کر لیا ہے۔ کہ وطنیت عامۃ الناس کے لئے کیسے کیسے خطرناک عنصر کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔ اس حقیقت کو واضح کرنے کے لئے مجھے یورپ پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالنی ازبس ضروری ہے۔

یورپ اور قوم پرستی:۔

یورپ ایک خوفناک جنگ کی سزا بھگت رہا ہے اور دوسری کی تیاریوں میں مشغول ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ یورپ کے اعمال کی سزا ہے یہ ایشیا پر استبداد کرنے کا نتیجہ ہے مگر یورپ کی بد کرداریاں ایشیا کے لئے بھی کچھ کم مہلک نہیں حقیقت یہ ہے کہ موجودہ دنیا اس قدر ایک ہو گئی ہے۔ اقتصادی ضروریات نے مختلف ممالک کو ایک دوسرے کا اتنا محتاج کر دیا ہے کہ وہ حقیقی معنوں میں "اعضائے یکدیگرند" کے مصداق ہیں۔ جرمنی کی بدحالی پر فرانس خوش سہی مگر تمام دنیا کا نظام درہم برہم ہو رہا ہے۔ ہماری تجارت ان کے بل پر چل رہی ہے۔ اور تجارت لین دین کا نام ہے اگر دینے کی صلاحیت نہ ہو تو کچھ لیا بھی نہیں جا سکتا۔ اگر ہندوستان اس قدر تباہ ہو جائے کہ یہاں کچھ بھی پیدا نہ ہو۔ تو انگلستان کی مصنوعات دھری کی دھری رہ جائیں یہاں اور وہاں کے لوگ فاقوں مر جائیں۔ ظاہر ہے کہ اس عالمگیر اصول کی صداقت کو دیکھتے ہوئے اقوام عالم کو نہایت صلح و آشتی کے ساتھ رہنا چاہیئے۔ اور امداد باہمی میں کوشاں ہونا چاہیئے مگر بدقسمتی سے حقیقت حال اس کے خلاف ہے۔ ایک قوم دوسری قوم کی جانی دشمن ہے۔

آخر اس کا سبب کیا ہے؟

یورپ میں متعدد حکما نے اس مرض کی تشخیص مختلف پہلوؤں سے کی ہے سب کے سب ایک ہی نتیجے پر پہنچے ہیں۔ ان سب کے نزدیک سارے فساد کی جڑ "قوم پرستی" ہے۔ وطنیت دنیا کو تباہی و ہلاکت کے گڑھے کی طرف دھکیل رہی ہے۔

۱۹۴۳ء کے آغاز میں چھ کتابیں سیاسیات عالیہ کے متعلق شائع ہوئی تھیں اور سب اقبال کے خیال کی تائید میں ہیں:۔

(۱) ڈاکٹر سائمنڈز　　"کیا یورپ صلح سے رہ سکتا ہے"؟

Can Europe Keep peace?

(۲) لیون بلم　　"صلح اور تخفیف اسلحہ"

peace and disarmament

(۳) شارکس　　"روس اور آئندہ جنگ"

The Soveet and The next war.

(۴) وہیلر بنیٹ　　"تخفیف اسلحہ اور امن"

Disarmament and Security

(۵) میجر جنرل فلر　　"دندان اژدر"

The teeth of The dragon.

(۶) ڈاکٹر ونگفیلڈ سٹریٹفورڈ　　"شمشیر زن"

They That take The sword.

وہیلر بنیٹ کی کتاب تاریخی ہے۔ اس نے معاہدہ لوکارنو ۱۹۲۵ء سے لے کر ۱۹۳۱ء تک کے حالات متعلقہ تخفیف اسلحہ دیئے ہیں اور بتایا ہے۔ کہ اس سلسلے میں امریکہ لیگ آف نیشنز اور روس کی مساعی جمیلہ کیوں ناکامیاب رہیں۔ ۱۹۲۷ء تک امریکہ اور برطانیہ کے تعلقات کشیدہ رہے۔ جرمنی اور فرانس

میں قدرتی دشمنی ہے۔ فرانس اور اٹلی کی ابھی ابھی رنجش بڑھ رہی ہے۔ اس کو تمام سرمایہ دار دنیا شک کی نظروں سے دیکھتی ہے۔ جاپان کی تازہ نقل و حرکت نے تمام معاملے کو اور ابھی پیچیدہ کر دیا ہے۔ اس تمام الجھی ہوئی داستان کے اختتام پر مصنف لکھتا ہے: "دراصل یہ مسئلہ سیاسی نہیں۔ نفسیاتی ہے کیا دنیا کی مختلف اقوام جنگ کے خیال کو اپنے دماغ۔ زبان اور قلم سے خارج کر سکتی ہیں۔ شعوری طور سے بھی اور غیر شعوری طور سے بھی؟ ——"

اس سوال پر ڈاکٹر سائمنڈز نے ٹھنڈے دل سے غور کیا ہے۔ اور اس کا جواب نہایت یاس انگیز ہے۔ مصیبت یہ ہے کہ یورپ کی سیاسی تقسیم اقتصادی تقسیم سے بالکل مختلف ہے۔ اقتصادی طور پر لازمی ہے کہ وسطی یورپ متحد ہو مگر حالت یہ ہے کہ پولینڈ اور ہنگری کی قائم مقام نئی ریاست چیکوسلوویکیا فرانس کی زائیدہ اور پروردہ ہیں۔ اور جرمنی اور آسٹریا سے نفور کرتی ہیں — جمہوریت تو محفوظ ہو گئی مگر کیا نظام عالم جمہوریت کے ہاتھوں میں محفوظ رہیگا؟

سوال یہ ہے کہ آیا وطنیت اور امن اکٹھے رہ سکتے ہیں۔ فرانس یورپ میں سب سے زیادہ خوشحال ہے۔ مگر شادکس ایک اور خطرہ کی طرف توجہ دلاتا ہے۔ مانا کہ وطنیت کے باوجود امن رہ سکتا ہے مگر اس کا کیا علاج کہ روس یورپ کی روزافزوں اسلحہ بندی کو دیکھ دیکھکر مدافعت کے سازوسامان سے لیس ہو رہا ہے۔ روس کا یہ خیال ہے کہ سرمایہ دار حکومتیں آخر اسی سے گتھم گتھا ہوں گی۔ اس رائے کی تائید لیون بلم کی کتاب سے بھی ہوتی ہے۔ بلم فرانس کی سوشلسٹ پارٹی کا لیڈر ہے۔ اس کا خیال ہے کہ تخفیف اسلحہ کے بغیر امن کا قیام ناممکن ہے۔ خود فرانس کی فلاح بھی اسی میں ہے کہ وہ اور اس کے تمام دشمن غیر مسلح ہو جائیں مگر یہ سب آرزوئیں اور تمنائیں ہیں ان کے حصول کا واحد ذریعہ وطنیت کی تباہی اور اخوت کی استواری ہے یہی وہ راستہ ہے جس کی طرف اقبال پکار پکار کر بلاتا ہے۔

ڈاکٹر ونگفیلڈ سٹریٹفورڈ جس کی کتاب "تاریخ تہذیب برطانیہ" متفقہ طور پر اپنی قسم کی بہترین کتاب سمجھی گئی ہے۔ اپنی تازہ تصنیف میں اسی اخوت کے سبق کو دہراتا ہے۔ اور قوموں کو وطنیت کے خطرات سے ڈراتا ہے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں مگر اس نے بالکل اچھوتے دلائل پیش کئے ہیں اور جدید علمی تحقیقات کو استعمال کیا ہے۔ آئن سٹائن کا نظریہ ہے کہ فضا منحنی ہے۔ اس سے فاضل مؤرخ صحیح طور پر استنباط کرتا ہے کہ نظام کائنات کا رجحان یگانگت اور ہم آہنگی کی طرف ہے۔ حیوانات اور انسانوں میں یہی رجحان عشق کے جذبے سے نمایاں ہے۔ مگر عشق سے نفرت کا جدا کرنا بہت مشکل ہے۔ یورپ کا عاشق ایشیا کا دشمن ہے۔ حب وطن دوسروں کے وطن سے نفرت پیدا کرتی ہے فاضل مصنف یورپ کی ساری تاریخ پر ایک طائرانہ نظر ڈالتا ہے۔ اور اس نتیجہ پر پہنچتا ہے۔ کہ حب وطن کی غلط تعلیم کی بدولت جنگ اور ہر قسم کی بہیمیت کو عزت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ اور ایام جاہلیت کے سے انتقامی جذبات کی نشوونما ہوتی رہتی ہے۔

جنرل فلر بھی اسی بین الاقوامی محبت کا حامی ہے۔ مگر اسے ڈاکٹر ونگفیلڈ کے شاعرانہ خیالات سے کوئی ہمدردی نہیں۔ اس کے نزدیک دنیا کی نجات جنگ کے ذریعہ ہی سے ہو سکتی ہے۔ جنگ محض ایک اقتصادی حربہ ہے۔ یہ حربہ جس قدر زیادہ کاری اور مہلک ہوتا جائے گا۔ اتنا ہی قابل نفرت ہوتا جائیگا تاجر اور شہروں میں امن سے رہنے والے۔ سرمایہ دار فوجوں کو لڑا لڑا کر اپنی مقصد براری کرتے ہیں۔ مگر زہریلی گیس اور ہوائی جہازوں کی ترقی کی بدولت شہر اور تجارتی مرکز محفوظ نہیں رہینگے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ لوگ صلح پر مجبور ہو جائینگے۔ جنگ بے سود ہو جائے گی اور مختلف قوموں کو یقین آجائے گا۔ کہ ان کی اقتصادی ترقی امداد باہمی ہی سے ممکن ہے۔ ہر ملک دوسرے کا محتاج ہے۔ غرض فاضل مؤرخ اور بہادر جرنیل سب کے سب مختلف راہوں سے ایک ہی منزل تک جا پہنچتے ہیں۔ سب اقبال کے ہم نوا ہیں۔

کیا ہندوستان اس تلخ تجربے سے فائدہ نہیں اٹھائیگا۔ اور یورپ کی طرح تباہی کی غار میں کود پڑے گا؟ —— کیا اقبال کی پیشگوئی ع

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی

ہندوستان کے حق میں اسی طرح صحیح ثابت ہوگی جس طرح یورپ کے حق میں ہوئی؟

اس کا جواب ہندوستان کے اختیار میں ہے۔ اقبال کا کام خطرات سے آگاہ کر دینا تھا۔ اس نے اپنا فرض بطریق احسن ادا کر دیا ہے۔ اس کے پیغام پر عمل کرنا ہمارا فرض ہے۔

عبدالرشید طارق ایم۔ اے

جب ہم دیکھتے ہیں کہ آج تمام دنیا جنگ کے ہولناک شعلوں کی لپیٹ میں آچکی ہے۔ اور اس جنگ کا محرک وہی جذبۂ نسل و وطن ہے۔ تو مندرجہ بالا مضمون کی اہمیت اور بھی زیادہ ہو جاتی ہے۔ اور ہم دور بینانِ عالم کی بالغ نظری کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتے۔

واصل

غزل

شوق جب گرم تقاضا ہے اسے پورا کریں
عشق میں دنیا کے ہنگاموں کی پروا کیا کریں

دہر میں خوش باش رندوں کی طرح تو جی چکے
آؤ! مرنے کے لئے اک زندگی پیدا کریں

دردمندانِ محبت کے ہیں کچھ آداب بھی
اس طرح تڑپا کریں، دنیا کو تڑپایا کریں

پھر نظامِ زندگی میں پڑ چکی ہے ابتری
آؤ! اس نظمِ جہاں کو پھر تہ و بالا کریں

یوں تو شاید زندگانی ڈھب پہ آ سکتی نہیں
کیا کریں پھر موت ہی سے جان کا سودا کریں

زیرِ استبدادِ عہدِ نو ہے تہذیبِ کہن
آؤ اس کو دفن کر ڈالیں اُسے زندا کریں

اس طرف افکار کی یورش، ادھر ابرِ بہار
خونِ دل پی لیں کہ شغلِ ساغر و مینا کریں

پردۂ عالم پہ مرگ و زیست تو اک کھیل ہے
دے خدا ہمّت، تو ہر طوفان سے گذرا کریں

آج ہی رکھ دیں نہ کیوں بنیادِ ترکِ رسمِ راہ
کب تک آخر اعتبارِ وعدۂ فردا کریں

اپنے دل کی کیا حقیقت ہے، ان کو زیبا ہے کہ وہ
پھول کی پتّی کو نوکِ خار سے چھیڑا کریں

جیتے جی تو محو ہو سکتا نہیں ان کا خیال
اب وہ حرماں جس قدر چاہیں مجھے رسوا کریں

حرماں خیرآبادی

یونانی دیوتا

ایک یک منظری تمثیل

پہلا سین

(نواب زادی زرین سلطانہ کا ڈرائینگ روم ریشمی پردوں اور پُرتکلف سامان سے سجا ہوا ہے۔ زریں اور جمیلہ پردہ اٹھا کر اندر آتی ہیں)

جمیلہ۔ (تھکے ہوئے انداز میں) اُف ۔۔ یہ ۔۔ ریلوں ۔۔ کے ۔۔ سفر ۔۔ ؟

زریں ۔ تم یہاں ۔۔ صوفے پر لیٹ جاؤ ۔۔ ملی ۔۔ بیرا چا رلارہا ہے (اسے صوفے پر بٹھا کے ارد گرد بہت سے کشن رکھ دیتی ہے) تمہاری کنپٹیوں پر بام لگا دوں ۔۔ ؟ ابھی درد جاتا رہے گا۔

جمیلہ۔ نہیں رہنے دو میرے پاس بیٹھ کے کوئی بات سناؤ۔

زریں۔ (مسکراتے ہوئے میز پر سے ایک تصویر اٹھا کر اُسے دیتی ہے) جانتی ہو۔ یہ کون ہیں ؟

جمیلہ ۔ وہی ہونگے ۔۔ جن کے ذکر سے تمہارے خط بھرے رہتے ہیں

زریں ۔ (لمبی سانس لے کے) ہاں ۔۔ وہی ۔۔ (اپنی ریشمی ساری کے آنچل سے تصویر کا شیشہ رگڑ کے صاف کرتی ہے) ۔۔ ایک دفعہ میں نے ایک نجومی کو ہاتھ دکھایا تھا۔ وہ کہنے لگا تم ایک آدمی سے ملوگی ۔۔ جو سمندروں کا سفر کر چکا ہوگا۔ اس کے بال گھنگریالے اور رنگ سفید ہے ۔۔ اس سے ملنے کے بعد تمہاری زندگی میں ایک نیا دور شروع ہوگا ۔۔ میں نے تو اختر کو پہلے دن دیکھتے ہی پہچان لیا تھا۔ میرے دل نے کہا ۔۔ یہ ہے تمہارے خوابوں کی تعبیر ۔۔ !

جمیلہ۔ ہوں ۔۔ اچھے ۔ خوبصورت انسان ہیں۔

زریں۔ بالکل یونانی دیوتا معلوم ہوتے ہیں ۔۔ نا ؟

جمیلہ۔ اس پر لندن لکھا ہے ۔۔ ؟

زریں۔ ہاں لندن میں ہی یہ تصویر اتروائی تھی ۔۔ پورے چھ سال ولایت میں رہے ہیں۔

جمیلہ ۔ چھ سال ۔۔ اتنی مدت۔ وہاں کیا پڑھتے رہے ؟

زریں۔ گئے تو تھے قانون پڑھنے۔ ان کی غیر موجودگی میں باپ کا انتقال ہو گیا۔ ساری جائیداد انہیں مل گئی ۔۔ پھر وہیں رہنے لگے تھے فرانس۔ اٹلی۔ اور امریکہ وغیرہ میں سیر کرتے رہے۔ وہاں کی بڑی دلچسپ باتیں سنایا کرتے ہیں۔

جمیلہ۔ (متفکر سی ہوتی جارہی ہے) ان ۔۔ کا ۔۔ نام ۔۔ اختر ۔۔ تو نہیں ؟

زریں۔ ہاں ۔۔ اختر ہے ان کا نام ۔۔ تم نے کہاں سے سُنا ؟

جمیلہ ۔۔ یونہی ۔۔ یاد نہیں مجھے ۔۔ وہ ۔۔ ایک امیر کبیر باپ کے بیٹے ہیں ۔۔ ؟

زریں ۔۔ ہاں ۔ بڑے خاندانی آدمی ہیں۔

جمیلہ۔ (گھبراہٹ سے ماتھے پر ہاتھ رکھ لیتی ہے۔ لیکن زرینہ تصویر کی طرف دیکھنے میں اتنی محو ہے۔ کہ کچھ نہیں پاتی) سنو ۔۔ زرینہ ۔۔ تمہیں ۔۔ ان سے بہت محبت ہے ؟

زریں۔ ہاں ۔۔ ! بے حد ۔۔ ملی ۔۔ بے حد ۔۔ جب تک میں نے انہیں نہیں دیکھا تھا۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ محبت کہتے کسے ہیں ۔۔ اب تو یہ حال ہے۔ کہ جس دن وہ ملنے نہیں آتے میں کھوئی کھوئی سی رہتی ہوں ۔۔ جیسے میرے دل میں بھی اور میرے گھر میں بھی اندھیرا چھا رہا ہو ۔۔

جمیلہ ۔۔ اور ۔۔ وہ بھی تم سے ۔۔ ؟

زریں۔ (لمبی سانس لے کر) ہاں ۔۔ وہ کہا کرتے ہیں۔ زرینہ۔ تم تو ساحرہ ہو۔ تمہارے پاس آکر مجھ پہ جادو سا ہو جاتا ہے ۔۔ ایک دن وہ کہہ رہے تھے میں نے مشرق اور مغرب میں لاکھوں ہی عورتیں دیکھ ڈالی ہیں۔ لیکن کوئی یوں میرے دل

دل میں نہ سمائی تھی۔

جمیلہ — اچھا اور کیا کہا کرتے ہیں — ؟

زریں۔ (اس موضوع پہ باتیں کرنے کا شوق ہے) ایک دن کہہ رہے تھے۔ میری کشتی زندگی کے سمندر میں مدتوں ہچکولے کھاتی رہی —— آخر تمہاری محبت سے اسے لنگر مل گیا — زرینہ — بھٹکے ہوئے مسافر کو تم نے منزل پر پہنچا دیا —

جمیلہ — بڑے شاعرانہ قسم کے آدمی ہیں — ؟

زریں۔ ہاں شعر بھی کہتے ہیں۔ نثر بھی اچھی لکھتے ہیں۔ (بیرا چائے لاتا ہے)

بیرا۔ سرکار لال کوٹھی والی بیگم صاحبہ کتنی ہی دیر سے باغ میں بیٹھی ہیں۔

زریں۔ اوہو! — بی — معاف کرنا۔ مجھے ان سے ایک کام ہے۔ تم چائے پیو۔ میں ابھی آتی ہوں (زریں جاتی ہے جمیلہ اکیلی بیٹھی سوچ رہی ہے)

جمیلہ۔ جھوٹ — کہتے — ہوں — گے — لوگ — حاسدوں نے — مشہور کر دیا — ہوگا —

ایک نوکر۔ صاحب آئے ہیں حضور! (اختر اندر آتا ہے۔ اور جمیلہ کو جھک کے سلام کرتا ہے)

جمیلہ — آیئے — آپ تشریف رکھئے مس زرینہ ابھی آجائیں گی۔

اختر۔ (بیٹھتے ہوئے) شکریہ — مجھے اختر کہتے ہیں — اور آپ مس جمیلہ رشید ہیں نا — ؟

جمیلہ — جی — ہاں —

اختر — آپ کی بہت سی تصویریں زرینہ کے پاس ہیں۔ وہ اکثر آپ کی باتیں کیا کرتی ہیں۔

جمیلہ۔ جی ہاں — ہم دونوں تقریباً دس سال اکٹھی رہی ہیں۔ پہلے اسکول میں اس کے بعد کالج میں — بیسیوں تصویریں ہم نے اکٹھی اتروائی ہونگی۔

اختر۔ آج کل آپ دہلی میں پڑھاتی ہیں — ؟

جمیلہ۔ جی ہاں — آپ کو ولایت سے واپس ہوئے کتنی دیر ہوئی ہے؟

اختر۔ تقریباً — ایک سال۔

جمیلہ۔ ولایت کے بعد اپنا وطن کیسا لگتا ہے — آپکو — ؟

اختر۔ اچھا نہیں لگتا — یہاں زندگی کا کچھ لطف نہیں آتا — ولایت کے لوگ جینا جانتے ہیں۔ یہاں تو — ہر چیز پہ مردنی سی چھائی رہتی ہے جب سے یہاں آیا ہوں۔ وقت بھی مشکل سے گذرتا ہے۔

جمیلہ۔ لیکن اپنے گھر والوں سے دور رہ کر وہاں اکیلے جی نہیں گھبرا جاتا ہوگا — ؟

اختر۔ اکیلے کہتی ہیں آپ مس جمیلہ! ولایت میں بھی کبھی کوئی اکیلا ہوتا ہے — وہاں تو اتنی دلچسپیاں ہیں کہ انسان کو مہینوں تک سوچنے کے لئے بھی وقت نہیں ملتا (مسکراتا ہے۔ جیسے کوئی بات یاد آرہی ہے) وہاں — ہمارے یعنی — ہمارے ساتھ ایک — لڑکا تھا۔ اس نے بیک وقت تین لڑکیوں سے دوستی پیدا کر رکھی تھی — اور لطف یہ کہ۔ ان میں سے ہر ایک اسے وفادار سمجھتی تھی اتوار کو ایک کے ساتھ سنیما جا رہے ہیں سوموار کو دوسری کے ساتھ چائے پیتے ہیں۔ غرض کہ خوب گذرتی تھی — اور —

جمیلہ۔ (موضوع بدلنا چاہتی ہے) زرینہ کہہ رہی تھیں آپ شعر بھی کہتے ہیں

اختر۔ جی ہاں بڑا مزاحیہ شعر کہتا ہوں رسالوں وغیرہ میں بھی میری چیزیں چھپتی رہتی ہیں۔

جمیلہ۔ کوئی نئی چیز لکھی ہے آپ نے؟

اختر۔ جی ہاں (جیب ٹٹولتا ہے)۔ ایک چیز کچھ مدت ہوئی میں نے لکھی تھی۔ ایک — مزاحیہ نظم تھی — یہ رہی — اس نظم میں میں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ کہ زندگی کا مقصد ہے — کھانا —

جمیلہ — کھانا؟ — خوب — سنایئے —

اختر۔ عرض کیا ہے ؎

کھانے سے ہے زندگی جہاں کی
یہ رسم قدیم ہے یہاں کی
ہے دوڑتا اشہب زمانہ
کھا کھا کے طلب کا تازیانہ
غم کھاتا ہے عاشق دل افگار
کھاتا ہے دلیر ضرب تلوار
واعظ جو ہے رات بھر کا بھوکا
سر کھاتا ہے اُٹھ کے دوسروں کا
مار کھاتے ہیں مکتبوں میں
قرض کھاتے ہیں ہوٹلوں میں
القصہ ہے اپنا کام کھانا
کھانا — کھانا — مدام کھانا

جمیلہ۔ خوب!

زرینہ۔ (کمرے میں داخل ہوتی ہے) — اختر — !

اختر۔ (جلدی سے اٹھتا ہے۔ اور سینے پر ہاتھ دھر کر جھکتا ہے) جانِ جہاں!

زرینہ۔ میں نے تمہارا انتظار کیا۔! تم کل کیوں نہ آئے۔؟

اختر۔ (میں تم سے معافی مانگنے آیا ہوں (جمیلہ چپکے سے اُٹھکر دوسرے کمرہ میں چلی جاتی ہے) مجھے آج لڑکوں کے ساتھ شکار کھیلنے جانا ہے۔

زرینہ۔ تو۔ تم ۔ میرے ساتھ سینما نہیں چلو گے ؟ ۔ جاؤ ۔ میں نہیں بولوں گی۔ !

اختر۔ سنو۔ زرینہ! لڑکے کئی دن سے کہہ رہے ہیں ۔ اور آج تو وہ میرے کمرے ہی میں آکے بیٹھ گئے کہ لے کے ہی جائیں گے۔

زرینہ۔ ا ۔ و ۔ ل۔

اختر۔ سنو۔ بات تو سنو۔ کل دوپہر کو۔ پہلے لنچ ۔ پھر سینما ۔ پھر پارک میں سیر۔

زرینہ۔ (منہ بنا کے) بہلانے بناتے رہتے ہو۔

اختر۔ نہیں۔ جان جہاں! ۔ بھلا تم سے بھی میں جھوٹ بول سکتا ہوں؟ دیکھو! اگر آج شام تمہیں خالہ کے ہاں نہ جانا ہوتا۔ تو میں ضرور چھ بجے تھوڑی دیر کے لئے آجاتا۔

زرینہ۔ خالہ ہر روز بلاتی رہتی ہیں۔ آج میں نے سوچا چلی ہی جاؤں ۔ تم کہو تو ۔ ٹھہر جاؤں۔

اختر۔ نہیں خالہ کو ناراض نہ کرو۔ کے بجے جا رہی ہو ؟

زرینہ۔ پانچ بجے۔

اختر۔ پانچ ۔ بجے ۔ خوب ۔ اچھا ۔ خدا حافظ۔ (جھک کے سلام کرتا ہے۔ اور جاتا ہے)

دوسرا سین

[وہی کمرہ جمیلہ صوفے پر لیٹی رسالہ پڑھ رہی ہے ۔]

اختر۔ (دروازے پر) کیا میں آسکتا ہوں۔؟

جمیلہ۔ (گھبرا کے اُٹھتی ہے) جی۔ آپ۔؟ وہ تو گھر پہ نہیں۔ ہیں۔

اختر۔ گھر پہ نہیں ؟ کہاں گئی ہیں۔؟

جمیلہ۔ ابھی ابھی خالہ کے یہاں گئی ہیں۔ آپ کو نہیں بتایا تھا ۔ انہوں نے ۔؟

اختر۔ مجھے تو کچھ نہیں کہا تھا ۔ اچھا میں ۔ جاتا ہوں۔

جمیلہ۔ اوہ ۔ آپ تو بہت مایوس ہو گئے۔ دیکھئے آپ یہیں انتظار کیجئے وہ گھنٹہ بھر میں لوٹ آئیں گی ۔ یہ ہیں میگزینیں ۔ یہ ہے گراموفون۔ اپنا جی بہلائیے (اٹھکر جانے لگتی ہے)

اختر۔ دیکھئے۔ ذرا ٹھہریئے۔ آپ نے ان میں سے کوئی میگزین پڑھی ہے؟ کوئی کہانی پسند آئی آپ کو۔ ؟

جمیلہ۔ جی ہاں۔ اس میں ایک جاسوسی افسانہ بہت دلچسپ ہے۔ لائیے۔ میں نکال دوں ۔ اس میں ایک جگہ ایک خوبصورت پہاڑی کا نقشہ بہت اچھا کھینچا گیا ہے۔ بس سماں باندھ دیا ہے۔

اختر۔ آپ کو قدرتی مناظر بہت پسند ہیں ؟

جمیلہ۔ بے حد! پھول۔ درخت اور بہتا ہوا پانی۔ دنیا کی حسین ترین چیزیں ہیں۔

اختر۔ میرے خیال میں تو عورت دنیا کی حسین ترین چیز ہے۔

جمیلہ۔ ہاں۔ جو شخص زرینہ کو دیکھ چکا ہو۔ وہ تو یہی کہے گا۔

اختر۔ (کچھ سوچ رہا ہے) آپ کو سینما کا شوق ہے۔؟

جمیلہ۔ کبھی کبھی جاتی ہوں۔

اختر۔ فرصت ہو تو آج چلئے۔

جمیلہ۔ اگر زرینہ ساتھ چلیں ۔ !

اختر۔ زرینہ کا ساتھ کس لئے ؟ (مسکراتا ہے) مس جمیلہ ۔ آپ میرا مطلب نہیں سمجھیں ۔ (ٹھنڈی سانس لیکر) جب سے میں نے آپ کو دیکھا ہے۔ مجھ پہ جادو سا ہو گیا ہے ۔ معاف کیجئے۔ میں دل سے ۔ جذبات سے مجبور ہو کر یہ کہہ رہا ہوں۔

جمیلہ۔ (چہرے کا رنگ اُڑ گیا ہے۔ آنکھیں زمین میں گڑ گئی ہیں)

اختر۔ مسٹر اختر ۔ !

اختر۔ (دو زانو ہو کر) مس جمیلہ! میری درخواست کو رد نہ کیجئے۔ میری محبت کے نذرانے کو یوں پاؤں سے نہ ٹھکرائیے مس جمیلہ! میں مدتوں یورپ اور امریکہ میں رہا۔ لیکن کوئی لڑکی یوں میرے دل میں نہ سما سکی ۔ تمہاری محبت سے میری ڈگمگاتی کشتی کو لنگر مل گیا ۔ بھٹکے ہوئے مسافر کو تم نے منزل کا پتہ بتا دیا ۔

جمیلہ۔ (مشکل سے) سنئے ۔

اختر۔ میں جانتا ہوں۔ آپ کیوں گھبرا رہی ہیں۔ آپ کو زرینہ کی ناراضی کا ڈر ہے۔ سو میں قسمیہ کہتا ہوں۔ کہ اس کو اس بات کی خبر تک نہ ہوگی (اس کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کرتا ہے) ہم زرینہ کو اپنی دوستی کا علم کبھی نہ ہونے دیں گے۔ زرینہ میں تو (ہنستے ہوئے) صرف اتنی خوبی ہے۔ کہ اس کے پاس روپے ہیں ۔ سو روپے ہم اس سے لے لیا کریں گے ۔

جمیلہ۔ (اُٹھ کے کھڑی ہوجاتی ہے) ۔ سنو ۔ یہ ۔ سچ ۔ ہے ۔

اختر۔ بالکل سچ جمیلہ! مجھے تم سے اور صرف تم سے محبت ہے۔

جمیلہ۔ یہ سچ ہے جو میں نے سنا تھا؟ ۔ وہ سچ ہے ۔ ؟

اختر۔ کیا سنا تھا ۔ آپ نے ۔ ؟

جمیلہ۔ چند دن ہوئے میں نے ایک پارٹی پر چند لڑکیوں کو باتیں کرتے سُنا تھا کہ مُنیں ابراہیم کا بیٹا اختر باپ کی ساری جائیداد ولایت میں برباد کرکے خالی ہاتھ گھر لوٹ آیا ہے۔ اور اب ایک امیر لڑکی کو لوٹ رہا ہے۔ جوا کھیل کرہارجاتا ہے۔ تو اس سے پیسے لے کر اپنا قرض ادا کرتا ہے۔ مجھے یقین نہ آتا تھا۔ میں یقین نہ کرنا چاہتی تھی۔ کہ کوئی زرینہ کے ساتھ بھی ایسا برتاؤ کرسکتا ہے ۔ ؟

اختر۔ (گھبرا کر ادھر ادھر دیکھتا ہے) آہستہ بولئے۔ اس گھر میں دو جنوں نوکر ہیں۔

جمیلہ۔ (غصہ میں آواز پر قابو نہیں رہتا) اختر صاحب! زرینہ جیسی نیک دل اور شیریں مزاج خاتون کو تو دشمن بھی دھوکا دیتے شرما جائیں۔ آپ کا دل کبھی پسیجا ہے ۔ ؟ یا شاید برسوں ایسے کام کرتے رہنے سے آپ کا ضمیر ہی مُردہ ہوچکا ہے ۔ ؟

اختر۔ (دانتوں سے ہونٹ دباتا ہے۔ گھبرا کر ادھر ادھر دیکھتا ہے۔ جلدی جلدی کچھ سوچ رہا ہے) اچھا۔ اب دیکھئے ۔ اس بات کا یعنی میرے آج یہاں آنے کا ذکر آپ زرینہ سے نہ کیجئے ۔ !

جمیلہ۔ میں زرینہ کو یہ بات ضرور بتاؤں گی۔

اختر۔ جانتی ہیں اس میں نقصان کس کا ہوگا؟ زرینہ کا ۔ ! زرینہ کو مجھ سے دیوانوں کی سی محبت ہے۔ وہ میرے بغیر ایک دن زندہ نہیں رہ سکتی۔ آپ جانتی ہیں۔ کہ اگر اس پر یہ کھل گیا۔ کہ میں اسے نہیں چاہتا۔ تو کیا ہوگا؟ وہ دیوانی ہوجائے گی۔

جمیلہ۔ دیوانی ۔ ؟

اختر۔ ہاں۔ ایک دفعہ میں دو دن اس سے ملنے نہیں آیا تھا۔ اس نے سمجھا میں نے اسے چھوڑ دیا۔ اور وہ زہر کھانے کو تیار ہوگئی تھی۔

جمیلہ۔ اُف۔ زرینہ! اس آدمی کے لئے ۔ ؟

اختر۔ ہا ہا۔ جی ہاں! اس آدمی میں بھی بعض عورتوں کو حسین دکھائی دیتا ہے ۔ !

جمیلہ۔ نہ جانے کیا دکھائی دیتا ہے۔ مجھے تو انسان کی شکل میں شیطان دکھائی دیتا ہے۔

اختر۔ (بھیانک ہنسی ہنستا ہے) شیطان کا انتقام مشہور ہے۔ محترمہ۔ اور یاد رکھئے۔ کہ اگر آپ نے میرا راز کھولا۔ تو میں اس کا بدلہ لوں گا ۔ ایسا خوفناک بدلہ۔ کہ دیکھنے والوں کے رونگٹے کھڑے ہوجائیں گے ۔ میں زرینہ کو ایک دیوانی بھکارن بنادوں گا۔ (زور سے ہنستا ہے) مجھے اس کے دل و دماغ پر پورا قابو حاصل ہے ۔ ہا ہا ہا کسی دن آپ انارکلی میں سے گذر رہی ہونگی کہ ایک فقیرنی ۔ سر سے ننگی ۔ کپڑے پھٹے ہوئے ۔ آپ کے ٹانگے کے پیچھے بھاگی آرہی ہوگی۔ آپ غور سے دیکھیں گی ۔ اور ۔

جمیلہ۔ (کانوں میں انگلیاں دے کر گھبرائی کمرے میں سے نکل جاتی ہے)

اختر۔ (جیبوں میں ہاتھ ڈال کر زور زور سے ہنستا ہے) ۔ لیکن ۔ کیا اس کا اعتبار کیا جاسکتا ہے ۔ ؟ ۔ کیا یہ چپ رہے گی ۔ ؟ (سوچ رہا ہے۔ دور سے کسی کے آنے کی آواز آتی ہے ۔ پردہ اٹھتا ہے۔ زرینہ اندر جھانکتی ہے)

زرینہ۔ (خوش ہوکے) اختر ۔ !

اختر۔ ۔ میں آج شکار کھیلنے نہیں گیا تھا۔

زرینہ۔ مجھے بہت خوشی ہوئی تم آگئے اختر۔ لیکن پریشان کیوں ہو طبیعت اچھی نہیں۔ کیا بات ہے۔ میرے اختر ۔ ؟

اختر۔ (سر ہلاتا ہے) نہیں نہیں۔ میں کبھی نہیں بتاؤں گا؟

زرینہ۔ کیا ۔ ؟

اختر۔ یہ راز میرے سینے میں مدفون ہوجائے گا۔ میں کون ہوں کہ دو سہیلیوں کے درمیان عداوت ڈلواؤں؟

جمیلہ۔ سہیلیاں؟ کونسی سہیلیاں؟

اختر۔ اُف ۔ ! میں نے یہ کیا کہہ دیا؟ مجھے معاف کرنا۔ میں چپ چاپ تمہاری زندگی میں سے نکل جانا چاہتا ہوں ۔ شرم اور غیرت میری زبان کو روک رہی ہے۔ مردانگی کہتی ہے۔ خود بدنامی برداشت کرلے۔ لیکن ایک عورت کے نام کو بچا۔

زرینہ۔ اختر میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔

اختر۔ میرا بھی سر گھوم رہا ہے۔ مجھے خیال نہ تھا کہ تمہاری دوست ہونے کے باوجود اس کا اخلاق اس قدر پست ہوسکتا ہے؟

زرینہ۔ کس ــــ کا ؟

اختر۔ جمیلہ کا ــــ میں یہ راز کبھی نہ بتاتا۔ لیکن زرینہ ہم نے پہلے دن سے یہ وعدہ کر رکھا ہے۔ کہ ہمیشہ ایک دوسرے سے سچ کہیں گے ــــ اس لئے مجھے زبان کھولنی پڑ گئی ہے ــــ آج پانچ بجے کے قریب میں باہر جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ کہ یکایک ٹیلیفون کی گھنٹی بجی اور جمیلہ نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا جلد آیئے۔ زرینہ بیمار ہیں۔ میرے تو یہ سن کے ہوش اڑ گئے۔ فوراً یہاں پہنچا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ تمہاری دوست تتلی بنی۔ دروازے پر کھڑی مسکرا رہی ہے۔ میں نے کہا آپ نے مجھے دھوکہ دیا۔ کہنے لگی محبت میں سب کچھ جائز ہے۔ پھر میرے گرد یوں گھومنے لگی۔ جیسے کھانے کے گرد مکھیاں گھومتی ہیں۔ جب میں نے التفات نہ کیا تو کہنے لگی۔ آپ زرینہ کو خوبصورت سمجھتے ہیں اس کا تو رنگ کالا ہے۔ اس کی تو آنکھیں چھوٹی ہیں۔ میرا خون کھولنے لگا میں نے غصہ میں آکر دو چار سنا دیں۔ بس منہ پھلا کر اندر چلی گئی۔ ابھی تک باہر نہیں نکلی۔

زرینہ۔ یہ سچ ہے۔

اختر۔ ہاں زرینہ ــــ میں یہ راز کبھی نہ بتاتا۔ لیکن مجھے ڈر تھا۔ کہ کہیں وہ میری غیر موجودگی میں آپ کو جھوٹی باتیں بتا کر مجھ سے بدگمان نہ کر دے۔ مجھے ڈر تھا کہ وہ اپنی ٹھکرائی ہوئی محبت کا انتقام مجھ سے نہ لے۔ (دروازہ کھلتا ہے جمیلہ اندر آتی ہے۔ ہاتھ میں بیگ ہے۔ رنگ زرد سا ہو رہا ہے۔ ہاتھ کانپ رہے ہیں)

زرینہ۔ جمیلہ! یہ سچ ہے جو اختر صاحب کہتے ہیں ؟

جمیلہ۔ (مشکل سے بات کرتی) ہا ــــ ں ــــ ٹھیک ــــ ہے۔

اختر۔ (ہنستا ہے) دیکھا! جھوٹ بولنے کی جرات تک نہ ہوئی۔ روشنی کے سامنے اندھیرا ٹھہرا جاتا ہے۔

زرینہ۔ مجھے آج معلوم ہے کہ دنیا میں سچے دوستوں کی تعداد کتنی تھوڑی ہے ؟

اختر۔ ہزاروں میں ایک وفادار ملیگا۔ آپ کو ــــ

زرینہ۔ (بات جاری رکھتے ہوئے) منہ پہ کچھ۔ پیٹھ پیچھے کچھ!

اختر۔ ہے وفا کی بو محبت کے چمن میں نام کو ــــ

زرینہ۔ آج مجھ پہ یہ کھلا ہے کہ بعض لوگ شکل سے تو فرشتے معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن ان کے دل ــــ ان کے دل ــــ

اختر ــــ دوزخ کے دھوئیں کی طرح سیاہ ــــ!

زرینہ ــــ دوزخ کے دھوئیں کی طرح سیاہ۔ اور دوزخ کی مٹی کی طرح ناپاک ہوتے ہیں۔

جمیلہ ــــ زرینہ! میرے اور تمہارے تعلقات ٹھیک نہیں رہے ــــ میرے خیال میں مجھے ــــ یہاں سے چلے جانا چاہئے ــــ

زرینہ ــــ جو شخص دوستی کا دعوےٰ کرتے ہوئے دشمنی کرے ــــ اور اپنے میزبان کے ساتھ ــــ اس پر تو اس گھر کا نمک کیا ہوا تک حرام ہو جاتی ہے۔

اختر (نفرت سے جمیلہ کی طرف دیکھتے ہوئے) فوراً چلی جایئے!

زرینہ۔ (اختر کی طرف نفرت سے دیکھتے ہوئے) فوراً چلے جایئے آپ!

اختر۔ کیا ــــ ؟

زرینہ۔ جی ہاں ــــ! میں آج خالہ کے یہاں نہیں جا سکی تھی ــــ راستے میں طبیعت اچھی نہ رہی۔ اور میں لوٹ آئی ــــ وہ ہے پردہ جس کے پیچھے سے میں نے تم دونوں کی باتیں سن لی تھیں ــــ اور وہ ہے دروازہ ــــ جس میں سے تم ــــ فوراً باہر چلے جاؤ۔ چلتے ہو ــــ یا (گھنٹی کی طرف بڑھتی ہے ــــ اختر سٹ پٹا کر بھاگتا ہے ــــ زرینہ بھی اس کے پیچھے جاتی ہے۔ جمیلہ حیران سی ہو کر دونوں کو دیکھتی ہے وہ ابھی تک اس معاملے کی تہ تک نہ پہنچ سکی۔

(لیڈی ڈاکٹر) مس این فاطمہ بٹ

گذارش

جو حضرات اپنے مضامین کے مسودات واپس منگوانا چاہیں۔ وہ مسودات کے ہمراہ ٹکٹ ضرور بھیجیں۔

غزل

الم آگیا، اضطراب آگیا — یہ دل کیا گیا اِک عذاب آگیا

جبیں پُر شکن ہے نگہ شعلہ ریز — یہ کون آج زیرِ عتاب آگیا

لفافے میں پُرزے مرے خط کے ہیں — مرے خط کا آخر جواب آگیا

نکالے گئے بزم سے بوالہوس — انہیں شیوۂ انتخاب آگیا

اِدھر بڑھتے بڑھتے بڑھا دستِ شوق — اُدھر آتے آتے حجاب آگیا

ہوئی قائلِ جلوۂ طور خلق — سرِ بام وہ بے نقاب آگیا

یہ طوفانِ غم میں ہے دل کی مثال — کہ جیسے بھنور میں حباب آگیا

زمانہ ہے کیوں مائلِ انقلاب — زمانے میں کیوں انقلاب آگیا

وفاؔ غیر رہنے لگے ساتھ ساتھ
گہن میں مرا آفتاب آگیا

میلا رام وفاؔ

غبارِ ماضی

دانائے فرنگ

(اس صفحے پر ہر ماہ ایک دلچسپ تاریخی واقعہ رقم کیا جاتا ہے۔ مہربان شاہکار کا فرستادہ "واقعہ" بھی مناسب ترمیم و تحریف کے بعد شائع کیا جا سکتا ہے۔ لیکن فرستندہ حضرات کتاب کا حوالہ ضرور دیں۔ واصل)

انگریز کی انگلیاں جنوبی کرہ ارض کو ٹٹولتی ٹٹولتی آسٹریلیا سے مس کرتی ہوئی نیوزی لینڈ تک جا پہنچی تھیں۔ لیکن ان کی گرفت ابھی مستحکم نہ ہوئی تھی

وہاں کے قدیم باشندے جو ماؤری (maori) کہلاتے ہیں پسپا ہو کر کوہستانی علاقے کی قدرتی پناہ گاہوں میں جا چکے تھے لیکن گاہے گاہے آنکھ بچا کر وہ دشمن پر چھاپہ مارتے اور ہنگامی مجادلہ و مقاتلہ کے بعد پھر اپنے مرکز کی طرف لوٹ جاتے۔ گویا انہیں ہماری سرحد کے آزاد قبائل کے افراد سے ایک گونہ فطری مناسبت تھی۔

آخر مغربی تدبر بروئے کار آیا۔ اور "خداوندانِ لندن" نے گرم راکھ میں دبی ہوئی چنگاریوں کو سرد کرنے کی راہ ڈھونڈھ نکالی اور سیدانی سپنیوں کو کوہستانی بلندیوں سے ہمدامن کرنے کے لئے سڑک بنانے کی تجویز منظور کر لی۔

تجویز تو منظور ہو گئی لیکن اب یہ سوال درپیش تھا کہ بلی کی گردن میں گھنٹی کون باندھے سڑک کی تعمیر کو ماؤری (maori) قبائل ہر حیلہ دفن سے روکنے کی کوشش کرتے۔ انجنیروں اور مزدوروں پر حملہ آور ہوتے سڑک کے بنے ہوئے حصے کو راتوں رات تباہ کر دیتے غرضیکہ انہوں نے اپنی پست قامتی میں ہی قیامت برپا کر رکھی تھی۔

زور تدبر اور قوت بازو میں پنجہ آزمائی جاری ہی تھی آخر نیوزی لینڈ کے نئے گورنر گورے نے ایک ہی ضربِ کلیم سے راستہ صاف کر دیا اس نے ایک نہایت ہی خوبصورت ہلکی پھلکی رکشا کی قسم کی ایک دو پہیہ گاڑی تیار کرائی اور اس کے لئے ایک اعلےٰ نسل کا ٹٹو مہیا کیا۔ اور یہ گھوڑا گاڑی ان جنگجو قبائل کے سردار کو تحفہ کے طور پر بھیج دی۔ پھر......

چند ہی ہفتوں میں ماؤری (maori) سردار کے اپنے ہی آدمیوں نے اس پہاڑی علاقے میں سڑک بنا دی۔

فیصر جمشید واصل

ازمنہ تاریک میں حقیقی مجرم کی گرفت کے لئے **قانون** کا ہاتھ اپاہج تھا۔ زمانے کا فانوسِ کاغذی گردش کرتا گیا، علم، تجسس، سائنس، سیاحت، تہذیب، سیاست، عدل کی تصاویرِ رنگا رنگ آدم نے دیکھیں، لیکن

قانون کا ہاتھ

اسی طرح اپاہج رہا — اور .... دکھی رام اس کی گرفت سے آزاد۔

دکھی رام رائے اور چھدام رام رائے دونوں بھائی صبح سویرے کدال لیکر مزدوری کو نکل جاتے۔ تو ان کی بیویاں آپس میں لڑنے جھگڑنے بیٹھ جاتیں۔ روز روز کے جھگڑے بکھیڑے سے پڑوسی اس قدر برداشتہ خاطر ہو چکے تھے۔ کہ اب ان کی جانب کوئی توجہ بھی نہ کرتا تھا۔ آخر کسے غرض پڑی تھی۔ جو روزانہ ان کے جھگڑے چکایا کرتا۔ وہ لڑیں مریں، لوگوں کی بلا سے۔ جیسے لوگ ان کے شور وغل کے سننے کے عادی ہو چکے تھے۔

بہر کیف آج بھی دونوں بھائیوں کے باہر جاتے ہی دیورانی جیٹھانی حسب دستور لڑنے بیٹھ گئیں اور تمام دن لڑتی جھگڑتی رہیں۔ نہ کسی نے چولھا جلایا۔ نہ کھانا پکایا۔ اور نہ گھر کی صفائی کی؛

آج نہ معلوم کیسا منحوس دن تھا جو تمام دن پانی میں بھیگ بھیگ کر محنت کرنے کے باوجود ایک پائی بھی نہ ملی۔ دونوں بھائی اپنی قسمت کو کوستے تھکے ہارے گھر میں داخل ہوئے۔ تو گھر دیکھا سارا گھر سنسان اور اندھیرا پڑا ہوا ہے کسی کی کوئی آواز سنائی نہیں دیتی چھوٹی بہو چندرا ساری کا آنچل بچھائے زمین پر پڑی ہے۔ اور بڑی بہو رادھا الگ منہ بنائے بیٹھی ہے۔ ڈیڑھ سال کا چھوٹا بچہ اس کے پاس ہی بیٹھا رو رہا ہے۔ اور بچہ تین سال کا انگنائی میں زمین پر پڑ کر سو گیا ہے۔

بھوک کا مارا دکھی رام بغیر کچھ پوچھے گچھے بولا ”لا کھانا دے“!

بھلا بڑی بہو کو اتنی تاب کہاں تھی جو سیدھے منہ بولتی: بجلی کی طرح کڑک کر بولی۔ کہاں سے لا کر دوں کھانا؛ تم دال چاول رکھ کر گئے تھے۔ یا میں جاتی کہیں سے کما کر لاتی؟

دکھی رام دن بھر محنت مشقت کے بعد بھوکا پیاسا آیا تھا۔ گھر کی حالت اور بچوں کی کیفیت دیکھ وہ پہلے ہی جل بھن چکا تھا۔ کھانا مانگنے پر بیوی نے یہ جواب دیا تو اس سے آپے میں نہ رہا گیا، بھوکے شیر کی طرح گرج کر بولا۔ کیا کہا؟ اور بغیر کچھ سوچے سمجھے زمین کھودنے کی کدال بیوی کے سر پر دے ماری۔ کدال کی ضرب کچھ ایسی پڑی کہ رادھا تڑپ بھی نہ سکی۔ دفعتہً ٹھنڈی ہو گئی، اس کے سر سے خون کی ندی جاری ہو گئی۔

چندرا یہ حال دیکھکر بے اختیار چیخ اٹھی۔ ارے یہ کیا؟

چھدام نے جلدی سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھدیا۔ دکھی رام نے گھبرا کر کدال ہاتھ سے پھینک دی، اور دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر سہما ہوا سا ایک طرف بیٹھ کر رونا شروع کیا، بچہ بھی دہشت زدہ ہو کر رونے لگا۔

اتفاق سے اسی حالت میں رام لوچن چکرورتی زمیندار کی مالگذاری وصول کرنے آ گئے، اس لئے کہ یہ اسی وقت پر گھر پر ملتے تھے۔ وہ مکان کے اندر قدم رکھتے ہی کانپ اٹھے، ہر طرف اندھیرا گھپ ہو رہا تھا جس میں دور سے دو تین بیٹھے ہوئے آدمیوں کی پرچھائیاں نظر آ رہی تھیں۔ اور ٹھہر ٹھہر کر کوئی رو پڑتا تھا چھوٹا بچہ ماں ماں کہہ کر رونا چاہتا تھا مگر چھدام اس کا منہ پکڑ کر چپ کر دیتا تھا

رام لوچن چکرورتی نے آواز دی ”دکھی گھر میں ہو؟“

دکھی جو پتھر کے بت کی طرح خاموش بیٹھا تھا کسی کو اپنا نام لیکر پکارتے سنا تو بچوں کی طرح چیخ چیخ کر رونے لگا۔ چھدام جلدی سے اتر کر صحن میں آیا تو دیکھا چکرورتی بابو کھڑے ہیں، پاس گیا تو چکرورتی بابو بولے ”معلوم ہوتا ہے عورتیں لڑ جھگڑ کر بیٹھی ہیں۔ بھائی آج تو دلوں کی چیخم دھاڑ جاری رہی۔ ہم لوگ تو ان کے روز روز کے لڑائی جھگڑے سے سخت تنگ آ گئے ہیں۔ تمہاری بیوی کی آواز تو کچھ کم سننے میں آتی ہے لیکن بڑی تو چلا چلا کر محلہ سر پر اٹھا لیتی ہے۔

چھدام کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا جواب دے۔ اس نے تو سوچا تھا جو ہونا وہ تو ہو چکا۔ اب کسی طرح جان بچانے کی فکر کرنی چاہئے۔ اچھی طرح بات ہو جائے

تو اسے لے جا کر کسی سنسان جگہ میں دفن کر دے۔ اب چکرورتی کے اس طرح کہنے پر جلدی میں اس سے اور کچھ تو کہتے نہ بنا بول اٹھا "جی ہاں آج دونوں بہت لڑیں"۔

یہ سن کر چکرورتی آگے بڑھتے ہوئے بولے "لیکن یہ دکھی کیوں رو رہا ہے عورتوں کا لڑنے جھگڑنے کا تو کام ہی ہے"۔

چھدام نے دیکھا اب واقعہ کا اخفا دشوار ہے۔ آخر اس کو کہنا ہی پڑا "چھوٹی بہو نے غصے میں بڑی بہو کے سر پر کدال دے ماری۔ اسی لئے رو رہا ہے"۔

چکرورتی چونک کر بولے "ارے یہ اس نے کیا کیا؟ بڑی بہو زندہ تو ہے؟"

چھدام نے جواب دیا "نہیں بھائی مر گئی"! اور ساتھ ہی چکرورتی بابو کے پیروں پر گر کر کہا "بھائی صاحب! بتایئے بیوی کو بچانے کی کونسی تدبیر کروں؟"

چکرورتی پریشان ہو گئے، یہ بیٹھے بٹھائے کہاں کی آفت دامنگیر ہو گئی عدالت میں جواب دہی کرتے کرتے بُری گت بن جائے گی۔ وہ پاؤں چھڑانے کی کوشش کرنے لگے مگر چھدام نے پاؤں نہ چھوڑا بولا "ایشور کے لئے مجھ پر دیا کرو اور مجھے کوئی تدبیر بتاؤ"۔

چکرورتی بابو معاملات و مقدمات کا کافی تجربہ رکھتے تھے۔ اور بستی کے تمام لوگ اس طرح کے کاموں میں ان سے مشورہ لیا کرتے تھے۔ اس لئے وہ تھوڑی دیر غور کرنے کے بعد بولے "تم ابھی جا کر پولیس کو اطلاع کر دو کہ میرے بڑے بھائی نے شام کو کام سے واپس آ کر بیوی سے کھانا مانگا کھانا تیار نہ تھا۔ اس پر انہیں غصہ آیا اور انہوں نے بیوی کے سر پر کدال کھینچ ماری۔ اتفاق کی بات تھی بیوی مر گئی۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ اگر اس طرح کہو گے تو تمہاری بیوی صاف بچ جائیگی"

چھدام رو کر بولا "بھائی! بیوی جائے گی تو دوسری بیوی آ جائے گی مگر دوسرا بھائی تو نہیں مل سکتا"۔

چکرورتی بابو بولے "اگر ایسا خیال ہے تو جا کر سچ سچ کہہ دو سارے جھگڑوں سے چھٹکارا پا جاؤ گے"۔ یہ کہکر چکرورتی بابو چلے گئے۔ ان کے جاتے ہی سارے گاؤں میں خبر پھیل گئی۔ کہ دکھی رام کی بیوی کو چھدام کی بیوی نے مار ڈالا۔

چھدام سوچنے لگا۔ لوگ جو کچھ کہہ رہے ہیں۔ اس کا باعث تو میری ہی ذات ہے۔ اس لئے کسی دوسرے پر اس کا کیا الزام۔ میں نے ہی تو چکرورتی سے کہا۔ کہ میری بیوی نے مارا ہے۔ اب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ میں جا کر پولیس سے کہہ دوں کہ یہ میری بیوی کا کام نہیں ہے ممکن ہے وہ اس طرح چھوٹ جائے۔

چندرا نے اس طرح کی بات سنی تو وہ بہت گھبرائی۔ چھدام نے کہا "تم پریشان نہ ہو۔ ہم لوگ تمہیں بچا لیں گے"۔

چھدام چندرا کو تو ڈھارس بندھا رہا تھا لیکن خود اس کے دل کی جو کیفیت تھی سو وہ کچھ وہی جانتا تھا۔

چندرا کی عمر سترہ اٹھارہ سال سے زیادہ نہ تھی۔ سرخ و سفید رنگ ہرن کی طرح بڑی بڑی سیاہ آنکھیں۔ آفتابی گول چہرہ۔ ملی ہوئی بھنویں۔ گر بدانا ک پتلے پتلے سرخ ہونٹ۔ گویا ہر وقت پان کھائے رہتی ہو صراحی دار گردن۔ نازک نازک ہاتھ۔ گداز بدن میانہ قد۔ غرض وہ سینکڑوں میں ایک تھی۔ بہنایت ملنسار ہر کس و ناکس سے میل محبت رکھنے والی۔ اس کی نیک مزاجی کی وجہ سے تمام گاؤں اس کی قدر کرتا تھا۔ وہ کام کاج میں بھی بہت ہوشیار تھی۔ وہ لڑائی جھگڑے سے بھی ڈرتی تھی مگر بڑی بہو خواہ مخواہ اس کے درپے رہتی تھی۔ چندرا جتنی نیک تھی۔ بڑی بہو ویسی ہی بد مزاج۔ گویا چھوٹی بہو کی بالکل ضد واقع ہوئی تھی۔ اس کی بدمزاجی سے سارا محلہ اس سے نالاں تھا۔ نہ کوئی اسے اچھی نظر سے دیکھتا تھا اور نہ کوئی اس سے خوش تھا۔ وہ تھی بھی ایسی ہی کہ نہ اس کی صورت اچھی نہ سیرت۔ دونوں بہوؤں میں جو جھگڑے بکھیڑے ہوتے رہتے تھے۔ وہ بھی محض بڑی بہو کے سبب، چھوٹی بہو آہستہ سے بھی کسی بات کا جواب دیتی تو آفت ہو جاتی۔ بڑی بہو شور و غل مچا کر سارے محلے کو سر پر اٹھا لیتی۔ لوگ سمجھ جاتے کہ دونوں میں معرکہ آرائی شروع ہو گئی۔ بڑی بہو خوب چیختی چلاتی۔ مگر چھوٹی سہمی ہوئی سی خاموش رہتی۔ اور بڑی گلا پھاڑ پھاڑ کر محلے والوں کی عافیت تنگ کر دیتی۔ یہی وجہ تھی کہ چھوٹی بہو تو ہر دلعزیز تھی۔ اور بڑی سے سب متنفر اور بیزار تھے۔ چھوٹی سے اس کا شوہر بھی بے حد محبت کرتا تھا۔ اس نے چکرورتی سے کہنے کو تو کہہ دیا۔ مگر اب وہ سخت پریشان تھا۔

لیکن چندرا نے سنا کہ اس کے محبوب شوہر نے خون کا الزام اس پر لگایا ہے۔ تو خلاف امید چندرا پر اس کا مطلق اثر نہ ہوا۔ اس نے اس ہولناک خبر کو اس سکون و سکوت کے ساتھ سنا جیسے وہ ایک بے جان حسین مجسمہ ہے۔

دکھی رام کو معلوم ہوا کہ چھدام نے چندرا کا نام بتا دیا ہے۔ تو اس نے سر پیٹ لیا۔ کہا "تم نے یہ کیا غضب کیا۔ خون تو میں نے کیا۔ اور بدنام کر دیا تم نے اس بیچاری کو"!

چھدام بولا "تم فکر نہ کرو میں اسے بچا لوں گا"۔

دکھی رام یہ سن کر خاموش ہو رہا۔ چھدام نے چندرا کو سمجھایا مجسٹریٹ پوچھے تو کہہ دینا۔ مجھ سے اور میری جیٹھانی سے لڑائی ہوئی۔ اس نے مجھے لوہے سے مارا۔ میں اس کو کدال سے ڈرا رہی تھی معلوم نہیں۔ اسے کدال کس طرح لگ گئی۔ اور یہ حادثہ ہو گیا۔ مجسٹریٹ مجھ سے سوال کرے گا۔ تو کہہ دوں گا یہ میری جان بچانے کے لئے اس طرح کہہ رہی ہے۔ در اصل یہ کام میرا ہے"۔

پولیس اطلاع پاتے ہی سیلاب کی طرح امنڈ آئی۔ گاؤں کے تمام لوگوں نے بالاتفاق بیان دیا کہ چندرا ایسی عورت نہیں جو خون کا ارتکاب کرے ہم لوگوں کے نزدیک یہ کام اس کا ہرگز نہیں ہے۔"

لیکن پولیس نے چندرا کا بیان طلب کیا۔ تو اس نے صاف اقرار کر لیا کہ ہاں یہ خون میں نے ہی کیا ہے۔

پولیس نے پوچھا "تم نے ایسا کیوں کیا؟"

چندرا نے جواب دیا "مجھے اس سے دلی عداوت تھی"

پولیس نے سوال کیا "کوئی اور سبب تو نہ تھا؟"

"نہیں"

"مقتولہ نے پہلے تم پر ہاتھ اٹھایا تھا؟"

"نہیں!"

پولیس نے سوال کیا "تمہارے شوہر نے تو کوئی ایسی بات نہیں کی۔ جو تمہیں ایسا کام کرنا پڑا؟"

چندرا بولی "جی نہیں"

یہ سنکر تمام لوگ حیران رہ گئے۔ چھدام جلدی سے بولا "حضور یہ جھوٹ کہتی ہے۔ پہلے بڑی بہو . . . ."

چھدام اسی قدر کہنے پایا تھا کہ پولیس نے اسے ڈانٹ کر خاموش کر دیا۔ پولیس نے چندرا سے بار بار جرح کی۔ مگر اس نے اپنے جواب میں ایک دفعہ بھی بڑی بہو کو قصوروار نہیں ٹھہرایا۔

کس قدر دلیر اور باوفا عورت تھی۔ اس نے طے کر لیا کہ خود پھانسی کے تختے پر لٹک کر جان دیدے گی۔ مگر شوہر اور جیٹھ کا بال بیکا نہ ہونے دیگی۔ چندرا پولیس کی حراست میں گئی۔ کوچے، بازار، اسکول، پوسٹ آفس اور شاہ راہ سے سینکڑوں آدمیوں کی نظروں کا نشانہ بنی پیشانی پر کلنک کا ٹیکہ لگا یا مگر گاؤں اور اعزا و اقارب سب کو چھوڑ کر چلی جا رہی تھی پیچھے پیچھے بچے، بوڑھے اور جوان تماشائیوں کا غول تھا۔ راستے میں جس مقام سے گذرتی۔ لوگوں کا ہجوم ساتھ ہو جاتا۔ کوئی دکان پر سے دیکھ رہا تھا۔ کوئی کوٹھے کے اوپر سے کوئی درخت پر چڑھکر عورتیں گھونگھٹوں کے اوٹ سے یہ دردانگیز اور عبرتناک منظر دیکھ رہی تھیں۔ کہ ایک سیدھی سادی دیہاتی عورت اور خون! اتنی حسین اور اس قدر سنگدل! اتنی نازک اور اتنی دلیر! غرض ہر طرف سے غریب چندرا پر لعنت ملامت کی بارش ہو رہی تھی اور وہ سر جھکائے سب کچھ برداشت کرتی پولیس کے ساتھ جا رہی تھی۔ تھانے پر پہنچکر مجسٹریٹ کے سامنے اسے بیان دینا پڑا۔ اس وقت بھی اس نے وہی کہا جو کچھ گھر پر کہہ چکی تھی۔ غرض ہر جگہ اس نے سارا قصور اپنا تسلیم کیا۔ بڑی بہو پر کوئی الزام نہ دھرا لیکن جب چھدام طلب کیا گیا۔ تو اس نے رو رو کر عدالت سر پر اٹھالی وہ بار بار کہتا تھا "دہائی سرکار کی۔ میری بیوی بالکل بیقصور ہے"

مجسٹریٹ نے اسے رونے دھونے سے منع کرتے ہوئے کہا "سچ سچ کہہ یہ خون کس نے کیا ہے؟"

چھدام نے کل واقعہ صحیح صحیح بیان کر دیا مجسٹریٹ کو اس کے کہنے پر یقین نہ آیا۔ اس کے بعد اس نے چکرورتی بابو کا بیان لیا انہوں نے کہا "خون ہونے کے تھوڑی دیر بعد میں جائے واقعہ پر مالگذاری وصول کرنے گیا۔ چھدام نے مجھ سے کل واقعہ بیان کر کے میرے پاؤں تھام لئے اور کہا کوئی ایسی تدبیر بتایئے جس سے میری بیوی بچ جائے۔ میں نے کچھ جواب نہ دیا تو اس نے کہا۔ اگر میں یہ کہدوں کہ میرے بڑے بھائی نے کھانا مانگا۔ اور کھانا نہ ملنے پر اس نے غصے میں آکر اپنی بیوی کو مار ڈالا۔ تو کیا اس طرح کہنے سے میری بیوی بچ سکتی ہے۔ میں نے کہا خبردار عدالت کے سامنے ایک لفظ جھوٹ منہ سے نہ نکالنا۔ یہ بہت بری بات ہے"

پہلے تو رام لوچن چکرورتی نے چندرا کو بچانے کے لئے خود ہی یہ ترکیب بتائی تھی مگر جب انہوں نے دیکھا چندرا خود اپنے کو پھنسانے پر تلی ہوئی ہے تو انہوں نے سوچا۔ کون جائے دروغ بیانی کا ارتکاب کر کے خود کو مصیبت میں ڈالے جتنا معلوم ہے اتنا سچ کہہ دینا چاہیئے۔ اس لئے وہ جو کچھ جانتے تھے انہوں نے بیان کر دیا۔ بلکہ ایک دو جملے اور اپنی جانب سے بڑھا دیئے۔ مجسٹریٹ نے مقدمے کو سیشن سپرد کر دیا۔

غریب چندرا کی زندگی میں ایک انقلاب عظیم واقعہ ہو گیا۔ مگر زمانے کی رفتار میں کچھ فرق نہ آیا وہی کہیں شادی ہے تو کہیں غم۔ کہیں رنج ہے تو کہیں راحت۔ غرض زمانے کی رفتار بدستور جاری رہی آخری پیشی کے روز گواہ پولیس وکیل، جیوری، تماشائی سب عدالت میں حاضر ہوئے چھدام پاگلوں کی طرح بدحواس کھڑا تھا کہ دیکھئے کیا فیصلہ ہوتا ہے اور دل ہی دل میں سوچتا جاتا تھا کہ کیا سے کیا ہو گیا۔ ماضی اور حال کے واقعات اسے خواب سے نظر آ رہے تھے۔ عدالت کے احاطے میں بڑ کے ایک تناور درخت پر ایک کوئل بیٹھی کوک رہی تھی جس کی آواز چھدام کو ایسی معلوم ہو رہی تھی۔ جیسے وہ کہہ رہی ہو کہ ان لوگوں کی نہ کوئی عدالت ہے نہ قانون۔

بدنصیب چندرا خونی ملزم کی حیثیت سے پولیس کی حراست میں عدالت میں پیش کی گئی۔ عدالت کے کمرے میں تماشائیوں کی کثرت

سے تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔

لوگ ایک عورت کے خون کے مقدمے کی کارروائی دیکھنے کے لئے جوق درجوق چلے آرہے تھے۔ چندرا نے جج کے دریافت کرنے پر کہا۔

"ارے صاحب کتنی بار دریافت کیجئے گا۔ اور میں کتنی مرتبہ جواب دوں گی کہہ تو دیا کہ میں نے خون کیا ہے"۔

جج نے سمجھاتے ہوئے کہا: "تمہیں معلوم ہے کہ تمہارے جرم کی سزا کیا ہے؟"

چندرا بولی: "جی نہیں"۔

جج نے کہا: "اس کی سزا پھانسی ہے"۔

چندرا بولی: "حضور میں آپ کے پاؤں پڑتی ہوں۔ مجھے جلد از جلد پھانسی پر لٹکا دیجئے یا اور آپ کے نزدیک جو مناسب ہو کیجئے۔ اب مجھ میں انتظار کی تاب نہیں ہے۔

جس وقت چھدام عدالت میں حاضر کیا گیا۔ چندرا نے اس کی جانب سے منہ پھیر لیا۔ جج نے گواہ کی طرف دیکھ کر چندرا سے سوال کیا: "یہ تمہارا کون ہے"؟

چندرا دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر بولی: "یہ میرے شوہر ہیں"۔

جج نے پوچھا: "کیا یہ تم سے محبت نہیں کرتا"؟

"جی وہ مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں"۔

"اور تم بھی اس سے محبت کرتی ہو"؟

"جی ہاں میں ان کو بہت چاہتی ہوں"۔

چھدام سے دریافت کیا گیا۔ تو وہ بولا "حضور! یہ خون میں نے کیا ہے"۔

"تم نے ایسا کیوں کیا"؟

"میں نے بڑی بہو سے کھانا مانگا۔ اس نے انکار کیا۔ میں نے غصے میں آکر اسے مار دیا"۔

جب دکھی رام پیش کیا گیا۔ تو وہ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ ہوش میں آنے کے بعد اس نے کہا: "حضور! یہ خون میں نے کیا ہے۔ اس جرم کا مرتکب میں ہوں"۔

"تم نے یہ جرم کیوں کیا"؟

دکھی نے جواب دیا: "میں نے اپنی بیوی سے کھانا مانگا۔ اس نے کھانا نہیں دیا۔ میں نے غصے میں آکر اس کے سر پر کدال دے ماری۔ وہ مر گئی"۔

پھر جرح ہوئی۔ سارے گواہوں کے گذر جانے کے بعد جج نے خیال کیا۔ عورت گھر کی عزت ہوتی ہے۔ اس لئے اس کو بچانے کی غرض سے دونوں بھائی خون کا الزام اپنے سر لے رہے ہیں۔ تاکہ عورت پھانسی پانے سے بچ جائے۔ لیکن چندرا تھانے سے لے کر عدالت اور سشن تک سب ایک ہی بیان دیتی چلی آرہی ہے۔ اس کے بیان میں کوئی فرق نہیں آیا۔ وکیلوں نے بڑی کوشش کی کہ یہ مجرم قرار نہ دی جائے۔ لیکن وہ خود ہی اقبال جرم کر رہی ہے تو اسے کون بچا سکتا ہے؟

آہ! جس روز آٹھ سال کی بھولی بھالی خوبصورت بچی اپنے ننھے ننھے ہاتھ پاؤں اور معصوم چہرے کے ساتھ کھیلنے کی گڑیا اور کھلونے پھینک کر ماں باپ کے گھر سے سسرال آئی۔ اس مبارک اور نیک ساعت میں آج کے منحوس دن کی کسے خبر تھی؟ آہ۔ مرتے وقت اس کے باپ نے کہا تھا۔ کہ اب جو کچھ بھی ہو۔ مجھے کسی بات کا فکر و تردد نہیں۔ میں نے اپنی پیاری بچی کا ٹھکانا کر دیا۔ اب میرے سکون و اطمینان سے مرنے میں کوئی چیز مانع نہیں رہی۔ مگر افسوس اس بدنصیب کو کیا معلوم تھا۔ کہ آئندہ کیا ہونے والا ہے۔ وہ کیا جانتا تھا۔ کہ اس کی پیاری بچی ایک روز پھانسی کے تختے پر لٹکائی جائے گی؟

پھانسی سے چند لمحہ قبل جیل خانے کے رحمدل سول سرجن نے چندرا سے سوال کیا:۔

"تم کسی کو دیکھنا چاہتی ہو"؟

چندرا بولی: "ایک بار اپنی ماں کو دیکھنے کی تمنا ہے"۔

ڈاکٹر نے پوچھا: "تمہارا شوہر تمہیں دیکھنا چاہتا ہے کیا اُسے بلاؤں"؟

چندرا بولی: "نہیں موت کو"۔

(ٹیگور)

آسی رام نگری

شاہکار

میں شائع شدہ مضامین (نظم و نثر) کے مسودات تاریخ اشاعت سے چھ ماہ بعد تک محفوظ رکھے جاتے ہیں۔ چھ ماہ بعد ان مضامین سے متعلق اعتراضات کے لئے ادارہ جوابدہ نہیں ہوگا۔

مدیر

تصحیح زبان

اِنے گِنے

[یہ عنوان پھر سے قائم کیا جا رہا ہے۔ اس کے تحت آیندہ بدستور مروجہ غلط الفاظ، غلط محاورات، اور الفاظ کے غلط استعمال کی تصحیح شائع کی جایا کریگی - مدیر]

پنجاب میں "گِنے چُنے" کی بجائے "اِنے گِنے" بولا اور لکھا جاتا ہے۔ یہ استعمال غلط ہے۔ یاد رکھئے! کہ صحیح لفظ ہے۔

گِنے چُنے

مثلاً

ڈاکٹر سیف الدین کچلو ملک کے ان گِنے چُنے لیڈروں میں سے ایک ہیں جنہوں نے ایثار، خلوص اور بے غرضی سے ملک کی خدمت انجام دی ہے اس کے ساتھ "چند" کا استعمال بھی موزوں نہیں یعنی یہ کہنا کہ فلاں شخص ان چند "گِنے چُنے" لوگوں میں سے تھے غیر فصیح ہوگا۔ کیونکہ گِنے چُنے اور "چند" کے الفاظ ہم معنی ہیں۔

تاجور

نیا ادب

انتخاب الفاظ DICTION

جدید شاعری نے نیا طرزِ بیان اور نئے نئے موضوع تو اختیار کر لئے لیکن ابھی تک انتخابِ الفاظ کے معاملے پر اس سنجیدگی سے غور نہیں کیا۔ جو اچھے اشعار کی تخلیق کے لئے لازمی ہے۔ جدید شاعری کے الفاظ اگر ایک طرف مروجہ، مانوس اور صدیوں کے پرانے فارسی الفاظ ہوتے ہیں۔ تو دوسری طرف پست، بھدے، اور ذلیل ترین نثر کے الفاظ سے کام لیا جاتا ہے یعنی ایک طرف اگر جدتِ کاوش کا فقدان ہے، تو دوسری طرف ذوقِ سلیم کا (جدید شاعری میں انتخاب الفاظ پر ایک علیحدہ مقالہ "اقبال کے بعد" کے عنوان کے ماتحت عنقریب ہی شائع کیا جائیگا) مندرجہ ذیل دو نظمیں ان ہر دو انتہاؤں کی دلیل ہیں واضح ولائح۔

اتفاقات (نظم کا ایک بند)

آج اس ساعتِ دزدیدہ و نایاب میں بھی،
جسم ہے خواب سے لذّت کشِ خمیازہ ترا،
ترے مژگاں کے تلے نیند کی شبنم کا نزول،
جس سے دُھل جانے کو ہے غازہ ترا،
زندگی تیرے لئے رس بھرے خوابوں کا ہجوم،
زندگی میرے لئے کاوشِ بیداری ہے،
اتفاقات کو دیکھ،
اس زمستاں کی حسیں رات کو دیکھ،
توڑ دے وہم کے جال۔
چھوڑ دے اپنے شبستانوں کو جانے کا خیال،
خوفِ موہوم تری رُوح پہ کیا طاری ہے،
آشنا بے صرفہ نہیں تیرا اجال
اس زمستان کی جنوں خیز حسیں رات کو دیکھ،
آج اس ساعتِ دزدیدہ و نایاب میں بھی،
تشنگی رُوح کی آسودہ نہ ہو،

جب ترا جسم جوانی میں ہے نیسانِ بہار،
رنگ و نکہت کا فشار،
(اقتباس از ماورا)

چال

تم نے کیا اپنی سہیلی سے کہا تھا؟ ——— بولو
وہ سہیلی جو سرِ راہ ملی تھی تم سے،
جب چلے آتے تھے ہم سیر سے واپس کل شام،
ہاں تمہیں نے تو کہا تھا "یہ سہیلی ہیں مری"
وہی جی، سانولی سی، نیلا سا تھا جس کا لباس،
دیکھکر تم کو لپکتی ہوئی یوں آئی تھی،
جیسے میں تھا ہی نہیں۔ جیسے تمہیں تم تھیں وہاں،
مسکراتے ہوئے کیا پوچھا تھا اس نے ——— بولو!
مسکراتے ہوئے کیا تم نے کہا تھا ——— بولو!
کیوں کنکھیوں سے مجھے دیکھا تھا اس نے سن کر،
اور پرنام کیا ——— کیوں مجھے پرنام کیا؟
اس کا میں کون ہوں؟ ——— میں کوئی نہیں اس کے لئے
وہ تو آئی تھی لپکتی ہوئی، بل کھاتی ہوئی
جیسے میں تھا ہی نہیں، جیسے تمہیں تم تھیں وہاں،—
اس نے پرنام کیا ——— تم نے کہا کیا تھا اُسے؟
"وہ کسے کہتے ہیں؟ میں؟ وہ ہوں؟" ——— یہی بات ہے نا
خیر میں اب کے تو چپ رہتا ہوں، لیکن سن لو۔
پھر اگر کوئی سہیلی ملی یوں رستے میں......
اور پھر میرے تعارف کی کوئی بات ہوئی
میں وہیں مہر لگادوں گا تمہارے لب پر ———
اس کا مطلب؟ بڑی انجان ہوا ——— اس کا مطلب بس
جیسے مطلب بھی ہوا کرتا ہے سرگوشی کا ———
اب کہو ——— آنکھ اٹھا کر تو کہو ——— کیا مطلب؟ ———

(ہمایوں فروری ۴۲ء)

اوراق لیل و نہار

جرمن نظام نو

نظام نو سے متعلق برلن کانفرنس کی وسیسہ کاری

مسٹر چرچل وزیراعظم برطانیہ اور مسٹر روزویلٹ صدر ولایات متحدہ امریکہ نے باہمی ملاقات و گفتگو کے بعد اقوام و ممالک کی آزادی کے متعلق جو اعلان کیا تھا۔ اور جو منشور اطلانٹک کے نام سے مشہور ہے اس کے جواب میں ہٹلر نے بھی برلن میں نظام نو کی تشکیل و تدوین کے لئے ایک کانفرنس کا ڈھونگ رچا ہے۔ جس میں تیرہ ملکوں کے نمائندے شریک تھے۔

کہا جاتا ہے کہ اس کانفرنس کا آئندہ اجلاس وی آنا میں ہوگا۔ مگر سوال یہ ہے کہ یہ بیل منڈھے بھی چڑھے گی؟ ہمارے نزدیک تو اس کا جواب نفی میں ہے۔ یہ رائے محض بے بنیاد نہیں ہے بلعد کی خبر میں بتایا گیا ہے کہ "سوشل ڈیماکریٹس" کے نامہ نگار مقیم برلن نے اطلاع دی ہے۔ کہ کانفرنس کے مختلف ممالک کے نمائندوں میں کافی اختلاف رائے موجود ہے۔ کروشیا، ر دمانیہ بلغاریہ اور اٹلی کے نمائندوں نے کہا کہ وہ اشتراکیت کے خلاف لڑنے اور مسئلہ تجارت میں تو جرمنی سے اشتراک کرنے کے لئے تیار ہیں لیکن وہ جرمنی کے ساتھ کسی سیاسی مشارکت کو پسند نہیں کر سکتے جاپانی نمائندے نے بھی کہا۔ کہ اس کی حکومت جرمنی روسی جنگ میں غیر جانبدار رہنا چاہتی ہے۔

اب آپ اس خبر سے کیا نتیجہ نکال سکتے ہیں؟ کیا جرمنی کی یہ خانہ ساز چودھرائیت کامیاب ہوگی؟ کلا ثم کلا۔

رومانیہ، بلغاریہ اور اٹلی نے اگر جرمنی کی ہاں میں ہاں ملائی۔ تو یہ سب ایسا کرنے پر مجبور بھی ہیں۔ اٹلی کی حالت دنیا کو معلوم ہے، آج اس کی ہستی ہٹلر کے رحم و کرم پر ہے۔ اگر ہٹلر مدد نہ کرتا۔ تو یورپ کا ایک چھوٹا سا ملک یونان ہی مسولینی کو تارے دکھا سکتا تھا۔ اب تک افریقہ سے اطالوی حکومت کا نام و نشان مٹ چکا ہوتا اور بحیرہ روم میں اطالوی اقتدار کی کشتی ڈوب چکی ہوتی لیکن آج جرمنی کا ہی وجود ہے جو اطالیہ کی زندگی کا ضامن بنا ہوا ہے پھر اطالیہ جرمنی کے اشارے کے خلاف کوئی لفظ کیونکر زبان پر لا سکتا ہے؟ اور [illegible] تو بحالت موجودہ جرمنی کے [illegible] اطالیہ کی [illegible] ایک مفتوحہ ملک سے بھی بدتر ہو رہی ہے۔ اسی طرح رومانیہ اور بلغاریہ بھی جرمنی کی ہمنوائی پر مجبور ہیں۔ اگر یہ دونوں مجبور نہ ہوتے۔ تو اپنی آزادی کو ہٹلر کے قدموں پر کیوں نثار کر دیتے؟ یاد رکھنا چاہئے کہ ان ممالک میں سے کوئی بھی ہٹلر کا عقیدت کیش اور ہوا خواہ نہیں ہے؟ یہ سب کے سب یا تو ہٹلر سے مرعوب ہو کر اس کا ساتھ دے رہے ہیں۔ یا اس لالچ سے کہ ہٹلر جنگ میں کامیاب ہو گیا۔ تو چند چھوٹے ٹکڑے ان کے سامنے بھی پھینک دے گا جن سے وہ بھی اپنی جوع الارضی کو تسکین دے سکیں گے لیکن جیسے ہی ان ملکوں کی گردن سے جرمنی کے آہنی پنجے کی گرفت ڈھیلی پڑی یا ان کا مقصد پورا ہوا۔ یہ جرمنی سے کوسوں دور کھڑے نظر آئیں گے جرمنی کی جابرانہ اور خونخوارانہ فطرت سے ان میں سے کوئی بھی ناواقف نہیں ہے۔

آج کل بہت سے قیاسات و خیالات غلط بھی ثابت ہوتے رہتے ہیں اس لئے فرض کر لیا جائے کہ جرمنی اپنی کوششوں میں کامیاب ہو گیا۔ تو غور طلب امر یہ ہے کہ اس کا اثر انسانیت کے لئے کس قسم کا ہوگا؟ اس سوال پر غور کرتے ہوئے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں ہٹلر کی سرکردگی میں جو نظام وجود میں آئے گا وہ نازیت کا چربہ ہوگا۔ اور نازیت میں آزاد انسانیت کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ نازیت کے اقتدار پسندانہ اور حربی فکر و تصور سے قطع نظر کر لیجئے جب بھی نازیت انسانیت کے لئے ایک لعنت ہے۔ نازیت میں جمہور کو فکر و زبان کی مطلق آزادی میسر نہیں۔ نازیت میں ہر فرد کو اپنی فکری اور علمی آزادی تو ڈکٹیٹر کو سونپ دینا پڑتی ہے۔

جس ملک میں نازی حکومت قائم ہو گئی بس سمجھ لینا چاہئے کہ اس ملک کے کروڑوں باشندوں کو اپنے دماغ سے نہیں سب کچھ اپنے ڈکٹیٹر کے دماغ سے سوچنا پڑے گا! اپنی زبان نہیں اپنے ڈکٹیٹر کی زبان سے بولنا پڑے گا اپنے قلم سے نہیں ڈکٹیٹر کے قلم سے لکھنا پڑے گا! ڈکٹیٹر کا خیال خیال ہوگا اس کی زبان [illegible] اور اس کا قلم قلم ہو [illegible] ان میں سے اپنے [illegible] کو استعمال

کرے گا۔ اسے قید و بند قتل اور سولی کی سزا بھگتنی پڑے گی۔ خود جرمنی میں یہی سب کچھ ہو رہا ہے۔ اور جہاں نازیت اور فاشیت کے حاکمانہ اصول رائج ہیں۔ وہاں بھی یہی ہولناک تماشے دیکھنے میں آتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ فرانس اس قدر جلد جرمنی کے سامنے گھٹنے نہ ٹیک دیتا اگر فرانسیسی خود جرمنی کے پانچویں کالم کے فریب میں مبتلا نہ ہو گئے ہوتے۔ لیکن آج کوئی ان فرانسیسیوں سے قدر عافیت دریافت کرے جو نازیت کی چکی میں پس رہے ہیں۔ مفتوحہ فرانس میں فرانسیسیوں کی عزت۔ دولت۔ عافیت۔ کوئی چیز نازی سپاہیوں کے ہاتھوں سے محفوظ نہیں۔ وہاں کا جرمن حکمران طبقہ سپاہیوں کی تمام خلاف انسانیت کارروائیوں کو دیکھتا اور سنتا ہے مگر چون و چرا نہیں کرتا۔ اس لئے کہ وہ خود ظلم و ستم اور جبر و تشدد کا علمبردار بن رہا ہے۔ جرمنی کے نظام نو میں اسی قسم کے مظالم و شدائد کے مظاہرے قیامت خیز پیمانے پر ہونگے۔ جرمن نظام نو کے معنی ہیں تمام دنیا میں جرمن اقتدار اس کی بسم اللہ جرمنی نے اپنے دوستوں اور مفتوحہ ملکوں سے شروع کی ہے۔ آج اطالیہ کی حالت یہ ہے کہ اطالوی فوجیں تو روس میں نازی جرنیلوں کی کمان میں لڑ رہی ہیں۔ اور اطالیہ کی حفاظت نازی فوجیں کر رہی ہیں۔ تاکہ جب بھی موقع ملے اطالیہ پر آسانی سے قبضہ کر لیا جائے۔ ادھر جرمنی نظام نو کے مسئلہ پر کانفرنس کر رہا ہے۔ اور ادھر [illegible] وحشی سپاہیوں کی شمالی افریقہ کی سات طیارگاہ [illegible] یہ ہے جرمن نظام نو کا مقصد اور [illegible] مقصد کو حاصل کرنے کی خاطر ہٹلر کروڑوں کا خون بہا چکا ہے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ نازیت میں چاہے اور کتنے ہی عیب ہوں لیکن اس میں روٹی کی تکلیف نہیں ہے۔ اچھی بات ہے اس میں روٹی کی تکلیف نہیں ہے۔ نازی ڈکٹیٹر اور اس کا طبقۂ رفقا، لذائذ و نعائم کھاتا ہے تو ان لوگوں کو جن کو وہ جانوروں کی طرح استعمال کرتا ہے۔ اسی طرح دانے اور چارے کا بندوبست کر دیتا ہے جس طرح کسان اپنے بیل کے لئے۔ مگر کیا انسانیت کی انتہا صرف شکم پری ہے؟ نہیں یہ تو انسانیت کا اسفل درجہ ہے۔ جہاں پہنچکر انسانیت حیوانیت کی ہم سطح ہو جاتی ہے لیکن اگر جرمنی کا جدید نظام عالم خدانخواستہ دنیا میں قائم ہو گیا۔ تو حیوانیت سے زیادہ انسانیت کی کوئی حیثیت باقی نہ رہے گی۔

ادارہ

بابت
ماہ مارچ ۱۹۴۲ء
جلد ۱۴

شاہکار لاہور

مدیر معاون
قیصر جمشید واصل بی اے
نمبر ۳

فہرست

حصہ نثر

حصہ نظم

مستقل عنوانات

احسان اللہ خاں تاجور پرنٹر و پبلشر نے عالمگیر الیکٹرک پریس لاہور، ہاتی گیٹ تحصیل بازار میں چھپوا کر دفتر شاہکار فتح محمد روڈ متصل تکیہ اڑی سائیں لاہور سے شائع کیا

مختصرات

پنجاب یونیورسٹی

بہت سے لوگ آمریت (ڈکٹیٹرشپ) کو سخت ناپسند اور جمہوریت کی آٹھ پہر قصیدہ خوانی کرنے کے عادی بن گئے ہیں اور جہاں کسی پبلک اجتماع میں کبھی انہیں بولنے یا کسی اخبار میں کچھ لکھنے کا موقعہ ملتا ہے تو گورنمنٹ کو خوش کرنے کے لئے بات سے بات پیدا کرکے بھی جمہوریت اور آمریت کے سوال پر پھول برسانا شروع کر دیتے ہیں مگر آمریت سے بیزاری اور جمہوریت سے وارفتگی کا یہ جذبہ ان کی اصول بیانی کے حدود سے کبھی باہر قدم نہیں رکھتا۔ یعنی جب کبھی انہیں کسی محکمے کا اقتدار یا کسی جماعت پر آقائی کا موقعہ نصیب ہوتا ہے تو ان کا یہ نظریہ خواب فراموش کی تعبیر بن کر رہ جاتا ہے اور وہ یہ یک طغرہ مسندِ اقتدار کے فرعون بے عصر بن بیٹھتے ہیں۔ یہی کچھ ہنجار پنجاب یونیورسٹی کے بعض اقتدار پرست حضرات نے اختیار کر رکھا ہے۔ وہ یونیورسٹی کو اپنے قلمرو اور اپنے آپ کو اس قلمرو کا مطلق تصور کرنے ہی میں راحت محسوس کرتے ہیں۔ تمام حکومتی اور اجتماعی محکمے اور ادارے جو فرض شناس نگرانوں کے زیر سیادت چلائے جا رہے ہیں۔ ان کا یہ معمول ہے کہ تجربہ، کارکردگی اور اہلیت کار کو معیار ترقی قرار دیکر اپنے ملازموں کو درجہ بدرجہ ترقی دیا کرتے ہیں۔ اس قدر شناسی اور انصاف پروری کا یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اپنے طور پر تمام اعلےٰ و ادنےٰ ملازم اپنے معاشی مستقبل کی کامیابی کی امید میں جوش، شوق اور احساس ذمہ داری کے ساتھ کام کرنے کے عادی بن جاتے ہیں اور اس وجہ سے وہ محکمہ یا ادارہ اپنے متعلقہ فرائض کو سر انجام دینے کے قابل رہتا ہے۔ لیکن سنا جاتا ہے کہ ہماری یونیورسٹی مدت مدید سے اپنے اقتدار پرست، دست بُرد اور مفاد طلب ارباب حل و عقد کی آئین شکنیوں سے فریاد کناں ہے۔ خوشامد، پست کاری اور حرص و آز اس قلمرو کے رائج الوقت سکے ہیں جو یونیورسٹی کے دائرہ تسلط میں بے خوف و خطر چلائے جا سکتے ہیں۔ بکارداں اور فرض آگاہ ملازموں پر یہ دلی طاری ہے کہ ان کا حال مضطرب اور مستقبل خواب پریشان بن رہا ہے۔ جب کسی کے ریٹائر ہونے پر اس کے اسسٹنٹ کو اگلے درجہ میں ترقی دینے کا وقت آتا ہے اور اس پر اخلاق کے باقی ملازم درجہ بدرجہ ترقی کے اصول پر اپنے مستقبل سے کوئی آس باندھتے ہیں تو اچانک یہ معلوم کرکے ان سب کے دل بیٹھ جاتے ہیں کہ جس بڑے ملازم کی ترقی پر ان کی ترقی کا انحصار تھا اسے محروم کرکے باہر سے کسی سکیمتر کو بلایا جا رہا ہے اور چونکہ نئے آدمی کی پرورش مقصود ہوتی ہے اس لئے محروم الارث ملازم میں سو قسم کے نقائص پیدا کرنے کی مہم شروع کر دی جاتی ہے اس کے برعکس جنہیں ساقی حسن فرسودہ کار ملازموں کی شریک اسرار ہے وہ پیر مغاں کی دریا نوالیوں کے واحد اجارہ دار بنا دیئے گئے ہیں۔ اس سلسلہ میں اپنی آئین شکنی پر پردہ ڈالنے کی خاطر یہ بے نیاز ثبوت دعوے پیش کر دیا جاتا ہے کہ شخص معہود کو اس کی فرسودہ سالی نے "باسمتی کے چاول" کی گرانمائگی بخش دی ہے اور اس وقت زمین و آسمان کی وسعتیں اس کا مثیل و نظیر پیش کرنے سے عاجز ہیں۔ گردش ایام چراغ آسمان کو لے کر کائنات کی تمام ظاہری و باطنی پہنائیوں میں پانچ سال سے پامالِ درو جستجو ہے مگر شش جہات کے گوشے گوشے سے اسے یہی جواب ملتا ہے کہ اے عالم ناسوت کی سیاح مادرِ کائنات یونیورسٹی کے اس وحدہ لاشریک انسان کو جننے کے بعد بانجھ بنا دی گئی ہے جس کے نظیر و مثیل کا ذوق تلاش تجھے

آوارہ و مجبور رے رسوا سر بازار رے

کی حیثیت میں دربدری میں مبتلا کئے ہوئے ہے اگر ہماری صداقت بیانی پر تجھے شک ہے تو اپنے مزید اطمینان کے لئے لاہور کے اورنٹیل کالج میں جا کر اس حقیقت ثابتہ کی تصدیق کرلے۔"

مختصر یہ کہ یونیورسٹی کے بینہ حوادث سے عقل حیران ہے۔ اور:۔

اس سلسلے میں عالم خیال کا ایک مکالمہ التفات طلب ہے۔" ناطقہ سر بہ گریبان کہ اسے کیا کہئے"

ایک آواز۔ رائے بہادر! شیر داس سابق رجسٹرار بہت لائق، بہت نبرد کار، بہت کارنامہ طراز" لیکن تشریف لے جائیں کہ ان کی میعاد ملازمت ختم ہو چکی اور بیکاری و بے روزگاری کے موجودہ عہد میں انہیں ایک دن کی بھی توسیع نہیں دی جا سکتی کہ یونیورسٹی کی اقتصادی حالت اتنی سی قدر شناسی کی بھی متحمل نہیں۔

رائے بہادر۔ اچھا صاحب جانتے ہیں خانہ آباد و دولت زیاد مگر یہ خلش سوال ہمیں مضطرب رکھے گی کہ ہماری توسیع کا تصور تو ارباب نظم و نسق کے لئے دماغ پاش بن گیا مگر فلاں منظور التفات کا کون سا حج مقبول بارگاہ لم یزلی ہو گیا ہے کہ ایک نہ دو اکٹھے پانچ سال سے یونیورسٹی کے خزانے پر اس انداز میں دھنا دیئے بیٹھے ہیں کہ ع

"زمیں جنبد نہ جنبد نہ گل محمد"

آواز۔ سادہ رائے بہادر! زمین کی پستیوں میں سانس لینے والوں کو آسمان کی رفعتوں کے راز نہیں بتلائے جا سکتے۔ دور کا ایک اشارہ سمجھ سکتے ہوں تو ؎

جسے پیا چاہے وہی سہاگن ہے، اور جسے نہ چاہے وہی بیراگن

رائے بہادر۔ اچھا صاحب! جانے دیجئے۔ یہ جبری بیراگ منظور، مگر میرے اسسٹنٹ کے لئے کیا ارشاد ہے؟ غریب پندرہ سال سے فرائض نہایت قابلیت اور محنت سے انجام دے رہا ہے ولایت کا اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے جو وائس چانسلر آیا اس کی کارکردگی کے گن گاتا گیا انصافاً اس کا حق ہے کہ میرے بعد میری کرسی سنبھالے صوبے کی تقسیم سرفرازی کا اصول بھی اسی کو رجسٹراری کے مستحق ٹھہراتا ہے کہ اول یورپین اس کے بعد ہندوستانی عیسائی پھر ہندو اب مسلمان کی باری آنی چاہئے تاکہ وہ بھی چند

چاندنی کے لطف اٹھاکر آنے والی سحر کی مسرتیں کسی مستحق سکھ کے حوالے کرکے رخصت ہو جائے۔

آواز ۔ جناب یہ آسمان ہے یہاں فرقہ دارانہ معاملات پیش نہیں کئے جا سکتے۔ ان رفعتوں میں کسی جناح اور ساورکر کو مجال سخن نہیں دی جاتی۔

رائے بہادر ۔ بجا ارشاد ہوا۔ اگر ایک ہندو کی زبان سے ایک مستحق مسلمان کی حمایت تو فرقہ داری میں داخل نہیں۔

آواز ۔ کچھ بھی ہو ہم ہندو مسلمان کے امتیاز سے بالا تر ہیں۔ یہ ہندوستان نہیں آسمان ہے یہاں سرفرازی کا معیار صرف قابلیت ہے۔ قابلیت۔

رائے بہادر ۔ صرف اصول بیانی تک محدود نہیں تو یہ اصول ہے تو بہت اچھا۔ مگر سنتا ہوں ایک قابل مسلمان کو ذاتی وجوہ کی بنا پر رجسٹراری سے محروم کرکے باہر سے ایک ناکردہ کار اور غیر قابل مسلمان کو لایا جا رہا ہے اور اس کے ساتھ باہر کے ایسے دو غیر مسلم اشخاص کو اس نئے مسلمان کے ساتھ دعوت التفات دی جا رہی ہے جو یوں تو ہر پہلو سے اس سے قابل تر مگر ہندو امیدوار تو غیر معمولی طور پر قابل بھی ہے اور یونیورسٹی کے کاموں کا ۱۵ سال کا تجربہ بھی رکھتا ہے۔ اگر یہ سچ ہے تو جانتے ہیں اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟

یہی ہوگا۔ کہ یونیورسٹی نے جو ایک قابل مستحق اور ۱۵ سال کے تجربہ کار مسلمان کو رجسٹراری سے محروم کرکے پھر ایک دیسی عیسائی کو سر دست رجسٹراری پر سرفراز کر دیا ہے اس کے ریٹائر ہونے پر رجسٹراری پھر ایک ہندو کا حصہ بنے گی کیونکہ مسلمان قوم تو آپ کے "سب اچھا" سنانے پر خاموش ہو گئی۔ موجودہ رجسٹرار کے ریٹائر ہونے پر میری قوم اپنے اس قابل ترین فرد کو قربان کرنے کی اجازت نہیں دے گی۔ اور پھر جانتے ہیں یونیورسٹی کی روایت کیا بنے گی پے در پے یورپین رجسٹراروں کے بعد دیسی عیسائی اس کے بعد ہندو (یعنی میں) ہندو کے بعد پھر دیسی عیسائی (موجودہ رجسٹرار) اور اس کے پھر ہندو (جدید ملازم جو تجربہ اور قابلیت کے لحاظ سے یونیورسٹی بھر میں سب سے ممتاز ہے) بالفاظ دیگر گذشتہ ۷۰ سال کی طرح آئندہ تیس سال تک اور بھی کسی مسلمان کو رجسٹراری نصیب نہ ہو سکیگی۔

آواز یہ بات ہے تو آپ کو بحیثیت ہندو ہونے کے خوش ہونا چاہئے کہ یونیورسٹی پر آپ کی قومی اجارہ داری کی بنیادیں استوار ہو رہی ہیں۔

رائے بہادر ۔ ہاں میں ایک ہندو کی حیثیت میں ضرور خوش ہوں کہ ہندو میرے لئے عزیز ہے لیکن انصاف اس سے عزیز تر ہے۔

آواز ۔ انصاف ۔ انصاف کی بھی ایک ہی کہی ۔ رائے بہادر! یہ تو عہد قدیم کی زبان کا ایک لفظ ہے جو مدت سے متروک الاستعمال ہو چکا ہے عملی دنیا کی کسی زبان میں بھی اس کا استعمال فقرے کو غیر فصیح اور زبان کو ٹکسال باہر بنا دیتا ہے۔

ذرا کان آگے کیجئے اور دیکھئے اپنے ہی تک اس راز کو رکھئے۔ بات یہ ہے۔ کہ یونیورسٹی میں ہمارا نزول ہندو مربیوں ہی کی توجہ کا منت پذیر ہے۔ اور مسلم قوم تو ایک سادہ لوح قوم ہے وہ ان لطافتوں کو نہیں سمجھ سکتی۔ وہ اسی میں مست ہے کہ یونیورسٹی کی باگ ڈور مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے! اس سطح میں ملت کو کیا خبر کہ

"کچھ ہے بھی پس پردہ یا پردہ ہی پردہ ہے"

اس معصوم کو نگاہ سطح شگاف نصیب ہوتی تو دیکھتی کہ ہندو کا اقبال یونیورسٹی میں ہر قالب میں بصورت روح جلوہ کار بن رہا ہے۔

بات یہ ہے کہ

خبر نواب کی مناتے ہیں — جس کا کھاتے ہیں اس کا گاتے ہیں

ہندو مربی حال و مستقبل کا جو لائحہ عمل تیار کرتے ہیں ہم آنکھ بند کرکے

"آئی سیکنڈیو"

کہنے ہی میں فرائض عقیدت سے سرخروئی محسوس کرنے کے خوگر ہو گئے ہیں۔ ہمارے مربیان کرام نے مسلمانوں کو یونیورسٹی کے حدود سے باہر رکھنے کی جو اسکیم بنائی تھی۔ دیکھئے کس خوبصورتی اور سلیقے سے ہم اس کو عملی جامہ پہنا رہے ہیں۔ ہمارے اس کارنامے کی داد دیجئے۔

نمبر ۱ آپ کا اسسٹنٹ مسلمان تھا پندرہ سال کا تجربہ کار اعلیٰ تعلیم یافتہ گرم کار اُسے اس کا حق دے کر رجسٹرار بنا دیا جاتا تو کم از کم پندرہ بیس سال تک جم کر وہ مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کرتا ہم مسلمانوں نے اس طویل خطرے کا سر کچل کر رکھدیا اور سارا نظام درہم برہم کرکے اصول و آئین کے خاکستر پر ایک عیسائی ملازم کو رجسٹرار بنا کر چار اسسٹنٹوں میں اسے ایک ہندو اسسٹنٹ ایسا بخش دیا جو اعلیٰ تعلیم یافتہ تجربہ کار اور محنتی ہے۔ اب یہ عیسائی رجسٹرار جب کبھی ریٹائر ہوگا ظاہر ہے کہ نئے ناقابل مسلمان اسسٹنٹ کی موجودگی اس کے راستے کی دیوار نہ بن سکے گی جیسا کہ آپ بھی اسے تسلیم کر چکے ہیں۔ گویا اس طرز عمل سے ہم نے آئندہ چوتھائی صدی تک مسلم رجسٹرار کے خطرے کو ہندو قوم کے سر سے ٹال دیا ہے۔

نمبر ۲ ایک سینیئر موسٹ گریجوایٹ مسلمان کو جو ۲۵ سال سے یونیورسٹی کی اہم ذمہ داریو

کو نہایت عمدگی سے انجام دے رہا تھا۔ اور گزشتہ چند سال سے امتحانات سپرنٹنڈنٹ کنٹرولر کی حیثیت میں یونیورسٹی کے کانفیڈنشل ڈیپارٹمنٹ میں بطور قائم مقام کار ہائے نمایاں انجام دیکر اس نے اس منصب پر اپنا حق ثابت کر دیا تھا۔ ہم نے ایک معمولی قابلیت کے ناتجربہ کار مسلمان کو باہر سے لیکر اس سینیر مسلمان کو اس کے حق سے محروم کر دیا اب وہ کسی اہم منصب پر کبھی نہ آسکے گا اور نیا جدید ملازم اپنے ساتھ کے قابل ترین جدید ہندو ملازم کی رجسٹراری کے راستے میں حایل ہونے کی جرأت کر سکے گا۔

نمبر۳ یونیورسٹی لائبریری میں ایک سینیر مسلمان اسسٹنٹ کو ہندو لائبریرین کی موت پر نظر انداز کر کے ایک جونیر ہندو کو لائبریرین بنا دیا گیا اور مسلم قوم کو کانوں کان خبر نہ ہونے دی مختصر یہ کہ ایک ہی تیر میں تین مستحق مسلمانوں کو اس صفائی اور خوبصورتی سے نشانہ بنا لیا گیا کہ دم نہ مار سکے۔

رائے بہادر مگر آپ نے پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے نمائندوں کی شکایت پر تو انہیں یہ بتایا ہے کہ ہم مسلمان یونیورسٹی میں رجسٹراری کے مستحق اور قابل مسلمان اسسٹنٹ رجسٹرار کو رجسٹرار بنانا چاہتے تھے مگر ہندو ممبروں نے متفقہ مخالفت کی اس وجہ سے افسوس ہے کہ ۱۵ سال کا تجربہ کار مسلمان اپنے حق سے محروم رہ گیا۔

آواز۔ آپ بھی کتنے بھولے ہیں رائے بہادر! چند مسلمان نوجوان ہمارے پاس یہ شکوہ لے کر آئے تھے کہ "فلاں مسلمان کا حق تھا۔ اسے رجسٹرار کیوں نہیں بنایا گیا؟ ہم نے کہا۔ عزیزو! تم ابھی بچے ہو۔ سمجھ کے کچے ہو تم یہ نہ سمجھ سکے کہ ہم نے ایک تعلیم یافتہ مسلمان کو باہر سے لیکر مسلمان ملازموں کی تعداد میں اضافہ کر لیا ہے۔ رہی رجسٹراری اگر ہم موجودہ اسسٹنٹ مسلمان کو رجسٹرار بنا دیتے تو کئی ماتحت ہندو ملازموں کو ترقی دینا پڑتی ہمارے مدبرانہ طرز عمل نے مسلمان اسسٹنٹ کو اگرچہ اپنے موجودہ عہدے پر قائم رکھا لیکن بہت سے ہندو ملازموں کو ترقی سے محروم کر دیا!"

آپ آجکل کے شورش کار نوجوانوں کی ذہنیت سے واقف ہی ہیں۔ یہ لوگ جس طوفانی انداز میں یہ پروٹسٹ لیکر ہمارے پاس آئے تھے۔ ہمارے ایک ہی انچھر میں بصورت حباب بیٹھ گئے

(باقی آیندہ) ادارہ

موجودہ اردو غزل۔

اس عنوان سے رسالہ ادب لطیف کے سالنامے میں ڈاکٹر محمد الدین تاثیر کا ایک مضمون شائع ہوا ہے۔ اس مضمون کی تقریب تحریر رسالہ نگار کے غزل نمبر پر تنقید ہے۔ جو بالفاظ مضمون نگار ایڈیٹر نگار کی درخواست کی تعمیل ہے۔

ہمیں اس شذرے میں اس وقت اس مضمون کا جواب یا اس پر اظہار رائے مقصود نہیں کہ اس ضرورت کو ہم کسی آیندہ فرصت کے حوالے کرتے ہیں۔ بلکہ سردست صرف ذیل میں یہ بتانا چاہتے ہیں کہ مضمون نگار اپنی دیرینہ متجر بستیوں میں گدا زپیدا کر کے کس قابل رحم انداز میں اپنی دماغی کشاکش کو تراوش خامہ بنانے پر مجبور رہا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ محترم ایڈیٹر نگار نے نگار کا "غزل نمبر" شائع کرنے سے پیشتر ملک کے خاص خاص غزل نگار شعراء سے ان کی غزلیات کے "کم از کم ڈیڑھ سو اشعار" اور ان کے حالات طلب کئے تھے جن شعراء کو ان کے ارشاد کی تعمیل منظور تھی انہوں نے اپنے اشعار کے ساتھ اپنے حالات لکھکر بھی بھیج دیئے تھے اور اس ضمن میں اپنے خاندانی شرف و مجد کا بھی تذکرہ کر دیا تھا یہ بات ڈاکٹر محمد الدین عرف تاثیر کو بہت شاق گذری ہے۔ آپ تمام علوم عربیہ و دینیہ کے مصنفین کے تذکرے اٹھا کر ملاحظہ کیجئے مشاہیر علماء و ادبا کے تاریخی حالات درج کرتے ہوئے تذکرہ نگاروں نے ان کے خاندانی حالات اور سلسلہ ہائے نسب بہت سی زحمت تلاش و جستجو کے بعد حاصل کر کے درج کئے ہیں کہ ایسا کرنا اسماء الرجال کے ان خدمت گزاروں کے لئے ضروری تھا۔ اردو ادب کے قدیم ادبا کے متعلق محققین ادب کو یہی افسوس ہے کہ انہوں نے اپنے حالات کہیں نہیں بتائے نگار کے غزل نمبر میں ایڈیٹر نے حالات اس لئے طلب کئے تھے کہ وہ تاریخ غزل کے لئے ضروری ہیں۔

رسالہ نگار کے غزل نمبر کے غزل نگاروں میں تاثیر کے لئے سب سے بڑی وجہ اشتعال یہی چیز بن گئی۔ اس سلسلے میں کہیں علامہ تاجور کے تذکرۂ حال میں درانی افغان اور اختر شیرانی کے نام کے ساتھ "شیرانی الافغانی" کا لفظ بھی ان کی نگاہ سے گزرا یہ صدمہ واقعتہً ان کے لئے قابل برداشت نہ تھا تڑپ اٹھے اور شکست ضبط نے انہیں اس پر مجبور کر دیا کہ غزل نمبر کے تمام ان شعراء کے خلاف جن کے حالات میں نسبی مجد و شرف کا کچھ ذکر تھا برس پڑیں چنانچہ وہ ایسے نگاتار برسے کہ اپنے حسرت آشکار آنسوؤں کے سیلاب سے ان شعراء کے شاعرانہ کمال کو بھی بزعم خود مٹا دیا۔ ان کی جگہ کوئی دوسرا نقاد ہوتا تو اپنے رنج بدنسلی کو جان پر کھیل کر بھی چھپانے کی کوشش کرتا اور اس حسرت مشتعل کا انتقام ان شعراء کے شاعرانہ محاسن کو مٹانے تک محدود رکھتا مگر

"جادو وہ جو سر پہ چڑھ کے بولے"

غریب مضمون نگار جذبۂ اشتعال کا شکار بن گیا اور بری طرح شکار ہوا۔ اور اس نے بلا ارادہ ہر شریف آدمی کے لئے ایک لمحہ فکریہ یہ جاننے کے لئے پیدا کر دیا کہ ڈاکٹر محمد الدین تاثیر شرافت نسبی کے مضمون سے کیوں چراغ پا ہو جاتے ہیں؟

تاثیر صاحب کے لئے دوسری وجہ اشتعال صنف غزل ہے لیکن وہ برا نہ مانیں تو فرصت گزارش کر ہمیں قارئین شاہکار کو اس حسرتناک واقعے سے روشناس کرنے دیں کہ ہمارے ڈاکٹر نقاد شاعری کے سوا سب کچھ جانتے ہیں۔ اس شاعری بدبخت کی فرعونیت نے ہر کہ ومہ کو منہ لگایا مگر ہمارے منچلے نقاد ہی کو اپنے حدود میں قدم رکھنے کی مجال نہ بخشی۔ یوں فیشن کے طور پر وہ ایک تخلص کے گنہگار ضرور رہے ہیں مگر حاشا و کلا اس سے آگے اپنی حسرتوں کے خون کے سوا انہیں کچھ دیکھنا نصیب نہیں ہوا۔ زندگی بھر میں ایک بار ایک رسالے میں انہوں نے تین شعر شائع کر کے شاعری کی دنیا کو ایک شاعر کی ولادت باسعادت کی خوشخبری سنانی چاہی تھی مگر آہ!

"حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے"

قسمتی سے وہ تینوں شعر بے وزن ہو گئے علاوہ ازیں ان پر ایک نوٹ میں جو بظاہر ان کے ایڈیٹر دوست کی جانب سے معلوم کیا گیا تھا۔ بانداز ہوش ربا بتا دیا گیا تھا کہ

"مرلنا تاثیر کے ان تین اشعار کا جواب دنیا کی کسی زبان کی کوئی شاعری بھی پیش نہیں کر سکتی" (المناہ)

مگر پنڈت ہیمراج نرائن چکبست نے اپنے رسالہ صبح امید میں نو زائیدہ شاعر کے غرور و طلسم کو توڑتے ہوئے لکھا کہ یہ تینوں شعر شاعری کے عجائب گھر میں پیش کرنے کے قابل ہیں کہ سخافت خیال کے ساتھ تینوں ہی بے وزن بھی ہیں۔" تو دو اور دو چار کو پانچ ثابت کرنے والے کی جانب سے یہ جواب دیا گیا کہ:۔

"مولنا تاثیر کی گراں مایہ شاعری فنی قیود سے بالاتر ہے"

گویا بالفاظ دیگر مجیب بے خبر اس وہم میں مبتلا تھا کہ شاعری نہ کرنے والا تعزیرات ہند کی کسی دفعہ کی زد میں آجاتا ہے۔

لن ترانی حادثے کے بعد سے جہاں تک دماغ پر زور ڈالنے کا سوال ہے نومولود شاعر کی توبہ تو بہ نصوح بن گئی۔

باقی کامریڈ تاثیر کی جانب سے جو یہ تشاعرانہ منظوم خیالات منسوب ہیں کہ "چکی پیسو روٹی کھاؤ"

یہ نام نہاد شاعری اُسی قسم کی جعلی و مصنوعی تھی جس نوعیت کی ان کی کامریڈیت کچھ دنوں کے لئے موسم کی چیز بنی رہی۔ موسم بدلا۔ یہ دونوں مجازی بھی سبزۂ خودرَو کے ساتھ پامال فنا ہو گئے۔ غزل نمبر کے غزل نگاروں پر زحمت فنا بہ فرماتے ہوئے غریب کو دو مشکلات کی "دور باش" سے دوچار ہونا پڑا۔ اول حفیظ کی غزل نگاری کو اس ضغطے سے نکالنا ضروری تھا کہ ایک ہی ٹولی کے ممبروں کے روابط پر اثر نہ پڑے دوسری مشکل یہ آپڑی کہ ریاست جموں و کشمیر کے ہوم منسٹر خان بہادر نواب جعفر علی خان صاحب اثر لکھنوی کا شمار بھی غزل نمبر کے غزل نگاروں میں ہوا ہے۔

تاثیر صاحب گورنمنٹ کالج لاہور کی خالی جگہ پُر کرنے کی سعی میں سوشلزم اور کامریڈیٹ دونوں مجعول سے تائب ہو کر اپنی ریڈیو کی اجارہ داری کو حکومت برطانیہ کی قصیدہ خوانی اور ہٹلر کے خلاف سبّ و شتم پر صرف کرنے کے بعد بھی حسبِ "اندر آنے کی اجازت نہیں" سرنگوں ہو گئے تو یاران منزل خواجہ غلام السیدین ڈائرکٹر تعلیمات کشمیر و جموں کی حالات سے بیخبری کا بیجا فایدہ اٹھاتے ہوئے ایک پرنسپل کو اہل کشمیر کی تیرہ بختی بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ ریاست جموں کشمیر کا محکمہ تعلیم نواب اثر کے تحت میں ہے بھلا اُن پر کیچڑ اچھالنے کی دیوانگی تاثیر صاحب کس سے مانگتے؟ چنانچہ اس تنقید میں حفیظ اور نواب اثر کی انہوں نے مدح سرائی کی ہے۔ کم بخت مصلحت بھی انسان کو بعض اوقات کیسا ذلیل کر دیتی ہے

علامہ تاجور کی ادبی خدمات اور اس راہ میں ان کی مالی قربانیوں کے ذکر سے بھی تاثیر صاحب مضطرب نظر آتے ہیں۔ علامہ موصوف نے نگار کے اس نمبر میں اپنے حالات بیان کرتے ہوئے کہیں لکھ دیا تھا کہ جدید نسل کے ادبا اور شعرا میں ان کے تربیت یافتہ شاگردوں کی تعداد بہت زیادہ ہے اور جدید دور ادب کی تعمیر کرنے والوں کے ناموں میں اسی فیصدی ان کے شاگرد ہیں کیا تاثیر صاحب کو اس سے انکار ہے؟ انہیں اپنے ہی صوبہ کے ادبا و شعرا پر ایک نظر ڈال کر اندازہ کر لینا چاہئے تھا۔

اختر شیرانی، احسان دانش، فاخر ہریانوی، وقار، اثر صہبائی، اصغر حسین خان نظیر لدھیانوی، سوہن لال ساحر، پروفیسر کرپال سنگھ بیدار، میاں بشیر احمد ایڈیٹر ہمایوں، چودھری منظور احمد مصنف دیروحرم، الطاف مشہدی، قیوم نظر، ڈاکٹر تصدق حسین خالد، ن م راشد، پروفیسر ضیا، غلام مرزا ادیب، پروفیسر عابد علی جگن ناتھ آزاد، آغا خرچکوالی اور ان کے علاوہ بیسیوں ادبا، شعرا، اخبار نویس، افسانہ نگار، ڈراماٹسٹ، نقاد اور مصنفین ہیں جو علامہ تاجور کی رہنمائی سے مستفید ہو چکے ہیں انہیں نکال لینے کے بعد پنجاب میں زیادہ تر تاثیر ایسے "خود غلط" "املا غلط" "انشا غلط" رہ جاتے ہیں جن کی شہرت سنیٹر یکا صدقہ جاریہ بن رہی ہے۔

وہی اختر شیرانی اور احسان دانش جن کے خلاف آپ کی معاندانہ سرگرمیاں ابتدا سے جاری ہیں۔ آپ میں ہمت ہے کہ گھٹنے سے گھٹنا ملا کر اُن کے مقابلہ میں وہ باوزن شعر یا صحیح زبان میں چار سطر کی نثر لکھ سکیں؟

علامہ تاجور کی خدمات اور قربانیوں کا ہمہ گیر اعتراف آپ کو شاہکار کے اُن نمبروں میں دیکھنے کا ضرور موقعہ ملا ہوگا۔ جو ان کی تقریب خطاب پر تہنیت ناموں کی صورت میں ملک کے ہر گوشے اور طبقے کے عمائد کی جانب سے کیا گیا ہے۔ کیا یہ اعترافات آپ کی نظر سے نہیں گذرے کیا یہ واقعہ نہیں کہ آپ نے اپنے بعض دوستوں سے اظہار حسرت کے طور پر کہا تھا کہ:-

اگر مجھے ایک ہفتہ پہلے بھی یہ علم ہو جاتا کہ شمس العلماء کے خطاب کے لئے ان کے نام کی سفارش ہوئی ہے۔ تو میں .... نہ ہوتا اگر خطاب کو رکوا نہ دیتا۔

پھر آپ ہی بتایئے کہ اس پست ذہنیت کو صوبہ داری کے تعصب کے سوا اور کیا نام دیا جا سکتا ہے؟ (ضرورت پڑی تو باقی آیندہ) ادارہ

میرے صبح و شام کو......

اے کہ میری خامشی کے راز کا جویا ہے تو

میرے اس کہنہ خرابے پر پھر آئی شام دیکھ

بہ رہا ہے دیدۂ گریاں سے پھر دل کا لہو

حُسن کی پُوجا کا آکر قرمزی انجام دیکھ

ہف سرابِ زندگانی تُف مآلِ آرزو!

ابتدا کی لذّتِ امید دلوا دے کوئی

میرے صبح و شام کو پھر پیچھے لَوٹا دے کوئی

واصل

---

۱ متعدد مشہور شاعر اور ادیب یہاں ایسے بھی ملینگے جو بخوف غلط اندازی علامہ کی شاگردی سے انکاری ہو گئے ہیں

ممتاز

وہ پا بڑھی ہو گئی تھی۔ سر کے بال روئی کے گالوں کی طرح سفید ہو چکے تھے۔ مگر جوں جوں زندگی گھٹ رہی تھی۔ جینے کی تمنا ابھر رہی تھی اور بڑھتی بھی کیوں نا؟ اسے اپنے للو کا بیاہ دیکھنا تھا بیاہ دیکھنے کی تو بات ہی کیا ہے۔ وہ تو چاہتی تھی کہ پھولتا پھلتا دیکھے اسی کے بچوں کو گود میں لے کر کھلائے بالوری دے کہانیاں سنائے۔ اور وہ "دادی دادی" کرتے آگے پیچھے پھریں چور چور کر روٹی کھلائیں تب اسے سکھ کی موت نصیب ہو۔

لال چند کی عمر سولہ سترہ سال کی تھی۔ رُوپا اسے اب بھی ننھا للو ہی سمجھتی تھی۔ جسے اس کا باپ دو برس کا چھوڑ کر مرا تھا اور جسے اس نے بڑے لاڈ و پیار اور محنت سے پالا تھا اس کا دھن، دھرم اور دنیا سب کچھ وہی تھا۔ پہلے وہ بیٹی، بہن اور بیوی سب کچھ رہی ہوگی مگر اب وہ ماں ـــــ صرف ماں تھی۔ اس کی تمام آرزوؤں، امنگوں اور خواہشوں کا ایک مرکز للو تھا۔

ماں بیٹے کی دنیا محبت اور پیار کی دنیا تھی۔ اس دنیا میں کتنے دن، کتنے مہینے، اور کتنے سال گذر گئے انہیں کسی چیز کی کمی محسوس نہ ہوئی۔ ماں نے اگرچہ شوہر کو کھویا تھا۔ مگر بیٹے کو پا کر سب کچھ پا لیا تھا۔ وہ اسی میں مطمئن تھی لیکن للو نے تو کچھ نہیں کھویا تھا۔ اسے تو ماں ملی تھی اور ماں اس کے پاس تھی۔

ماں بیٹا ایک دوسرے میں جذب ہو کر زندگی کے دن گذار رہے تھے۔ ان کا پیار انانیت پر چھا چکا تھا۔

مگر اب ماں کے دل میں ایک خواہش سر اٹھا رہی تھی۔ وہ چاہتی تھی۔ کہ للو کا بیاہ ہو جائے۔ بہو گھر آئے جسے وہ دکھا سکے کہ اس کا للو اتنا بڑا ہو کر بھی ماں سے بچوں کی طرح پیار کرتا ہے۔ میرے للو کا پیار دنیا سے نرالا ہے اور لافانی ہے۔

اس خیال کے آتے ہی اس کی سوکھی رگوں میں ایک کیف آور رو دوڑ گئی۔ اس نے گود میں پڑے للو کی ٹھوڑی ایک ہاتھ سے پکڑ کر اس کا منہ اوپر اٹھایا اور دوسرا ہاتھ اس کے نرم نرم بالوں میں پھیرتے ہوئے بولی۔

"کیوں بیٹا للو! اب تو تمہارا بیاہ ہو جائے"

"بیاہ" للو نے سر ماں کی چھاتی پر رکھ کر کہا۔

"ہاں بیاہ" پھر تمہاری گڑیا سی بہو گھر میں آ جائیگی۔ وہ ٹھمک ٹھمک اندر باہر پھرا کریگی وہ کام کیا کریگی اور میں بیٹھ کر دیکھا کروں گی"

"لیکن ابھی نہیں" للو نے غیر ارادی طور پر ہی ایسا کہا

"اچھا پھر تمہیں بتاؤ۔ کب لاؤ گے؟"

"جب تم مر جاؤ گی ماں"

ان الفاظ میں للو کے دل کی سادگی اور معصومیت بھری تھی۔ کیونکہ وہ ماں کے ہوتے بیاہ وغیرہ کسی چیز کی ضرورت محسوس نہ کرتا تھا لیکن مرنے کا نام سُنکر ماں کے دل کو ٹھیس پہنچی اور اس نے رقت آمیز لہجے میں کہا: "نہ بیٹا! اشبھ نہیں بولا کرتے" یہ کہہ کر اس نے ایک گہری سانس لی اور پھر بولی "میں مر گئی تو اس بیگانی بیٹی کو کیا سونے گھر میں لاؤ گے؟ میرے بیٹھے آئیگی۔ اور کچھ نہیں ساس کو تو دیکھ لیگی"

"ساس کو دیکھ لے گی پھر کیا وہ موٹی ہو جائیگی" للو نے ہنس کر کہا۔

"موٹا تو کون ہوتا ہے بیٹا! کہہ تو دیا کریگی کہ میری ساس بڑی اچھی تھی"

اب للو کو شرارت سوجھی اور اس نے بھویں سکیڑ کر کہا "اور یوں نہ کہے گی کہ میری ساس بہت بری تھی"

"اونہہ! پگلا کہیں کا! آدمی بُرا ہو تبھی دوسرا بُرا کہتا ہے۔ کوئی ویسے ہی تھوڑا کہہ دیتا ہے" یہ کہکر ماں نے اپنی تمام محبت، محنت اور ریاضت کو آنکھوں میں یکجا کیا۔ اور پھر پوچھا "اچھا تمہیں بتاؤ کیا میں بری ہوں؟"

للو نے ماں کی آنکھوں میں دیکھا اس کا دل خوشی سے جھوم گیا وہ بے پایاں محبت اور بے لوث قربانی کے سرچشمے تھے جن میں سے نکلتی ہوئی امرت کی دھارائیں اس کے دل و دماغ کو شاداب کر رہی تھیں۔ اسے ماں پر فخر محسوس ہوا لیکن جواب میں کہا۔

"ہاں میں تو کہتا ہوں بری۔ لاکھ بُری"

"اوں چھوٹا کہیں کا" ماں نے اسے اپنے کمزور بازوؤں میں بھینچتے ہوئے کہا۔

(۲)

آخر وہ بھی دن آ گیا جب للو دولہا بنا اور دلہن بیاہ کر گھر لایا۔ بوڑھی ماں کا قدم زمین پر نہ پڑتا تھا جس طرح چاند چمکتے ہی سمندر کے پانی میں مدّ و جزر اُٹھنے لگتا ہے۔ نئی نویلی چنبیلی سی دلہن کا مکھڑا دیکھکر اس کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ اس کا مستقبل۔ امیدوں اور خوابوں پر تعمیر شدہ مستقبل یکایک حقیقت پذیر ہو گیا اور روشنی سے جگمگا اُٹھا لیکن یہ روشنی بجلی کی تیز و تند اور آنکھوں کو چندھیا دینے والی روشنی نہ تھی بلکہ چودھویں کے چاند کی میٹھی، مدھم اور ٹھنڈی روشنی تھی جو شریت پسندوں میں نازک اور لطیف جذبات محرک کرتی ہے۔

روپا نے سمجھا کہ اس نے منزل کو پا لیا جس پودے کو اتنی محنت مشقت اور تکلیف سے پالا تھا وہ آج پھل لایا دکھوں کا جگ بیت گیا اب سے سکھوں کا آغاز ہوگا۔ اسے روز روز کے دھندوں سے چھٹی ملیگی جھاڑو، بہارو، چوکا چولہا سب بہو کیا کریگی ـ اور وہ۔ وہ تو راج رانی بنکر پڑوسنوں میں بیٹھے گی۔ اپنے للو کی محبت اور بہو کی خدمت کا تذکرہ سو ڈھنگ اور سو خوبیوں سے کریگی اور پڑوسنوں کی زبانی ان کے بیٹوں اور بہوؤں کے شکوے و غیبیاں سن سن کر فخر سے پھول جائیگی یہ سب باتیں پہلے ہی سے اس کے دماغ میں بیٹھی کسی ناول نویس کے پلاٹ کی طرح سمٹی چٹکیاں لے رہی تھیں۔

وہ بار بار للو کے منہ کی طرف دیکھتی اور دیکھتی ہی جاتی تھی۔ آج وہ کتنا خوبصورت، کتنا بھلا اور پیارا معلوم دیتا تھا۔ گلاب کا پھول بارش میں دُھل کر پہلے سے کہیں زیادہ دلکش، زیادہ شگفتہ اور زیادہ جاذب نگاہ بن گیا تھا۔ اسے دیکھتے ہی رہو طبیعت بھرتی ہی نہیں۔ اس کی دید آنکھوں کو طراوت بخشتی ہے۔۔۔۔

ماں کی خوشی میں للو بھی خوش تھا لیکن بیاہ سے نوجوانی کی جو امنگیں منسوب ہیں للو کے دل میں وہ اُمنگیں ابھی پیدا ہی نہیں ہوئی تھیں۔ اس نے بیاہ کیا تھا۔ تو اپنی خوشی سے نہیں، ماں کے اصرار پر۔ جو مسرتیں اور جذبات بیاہ کو بیاہ بنا دیتے ہیں وہ اس میں کہاں تھے اس نے جب سے ہوش سنبھالا تھا ماں کا پیار دیکھا تھا اور وہ پیار اتنا تھا کہ بلا شرکت غیرے اس کے دل کی بستی پر قابض تھا۔ اس نے کسی دوسرے پیار کو اندر آنے ہی نہ دیا تھا اس لئے للو کے دل میں صرف ایک پیار کے لئے جگہ تھی اور اس پر ابھی تک ماں کا پیار چوکڑی مارے اور گردن اٹھائے بیٹھا تھا۔

(۳)

ایک سال گذر گیا

للو چند کھانا کھا کر اندر سے نکلا تھا اور دکان کو جا رہا تھا۔ ماں نے اسے پاس سے گذرتے دیکھا تو بولی:۔

"بیٹا ذرا بیٹھ جاؤ۔ دس منٹ سستا لو۔ ابھی تو روٹی کھائی ہے۔ آخر کیا جلدی ہے۔ چلے جانا۔۔۔۔۔۔"

"جلدی کیوں نہیں دکان پر گاہک کھڑے ہونگے میں نہ جاؤں تو انہیں کون نپٹائیگا۔ اگر اس طرح دیر کرنے لگوں تو سب کچھ چوپٹ ہو جائے۔"

"بیٹا للو! تم تو لٹنے روکھے کبھی نہ تھے۔ کیا تمہیں ماں سے پیار نہیں رہا؟"

"بھلا ماں! اس میں پیار بے پیار کی کونسی بات ہے؟ اگر دکان پر نہ جاؤں۔ تو گذارہ کیسے چلے؟"

"اچھا بیٹا!" روپا نے ایک لمبی سانس لی اور کہا: "تمہاری کُھسی، میرا کیا جور چلتا ہے۔"

"پھر وہی نہ چلتا ہے۔ سچ ہے۔ بڈھے اور بچے برابر ہوتے ہیں۔ ذرا بھی عقل نہیں رہتی۔"

بڈھے اور سب کچھ سن لینگے مگر اپنی عقل کی برائی وہ نہیں سن سکتے۔ اور کسی کو پہلے ہی شک ہو مگر انہیں اپنی عقل سلیم پر کامل اعتماد ہوتا ہے۔ "عقل نہیں رہتی۔" للو کی یہ بات روپا کو بھی چُبھ گئی اور وہ تُنک کر بولی:۔

"اچھا للو جیادہ جیان (زیادہ زبان) نہ چلاؤ۔ اکل نہیں رہی۔ اکل کرنی ہی کیا ہے؟ عمر کھائے بیٹھی ہوں جو تھوڑا بہت اور جینا ہے۔ تو بھی بنا اکل کے جی لوں گی۔ تو اکل والا بنا رہ۔ میں نے تو بنا اکل کے ہی پال پوس کر اتنا بڑا کر دیا۔" یہ کہتے کہتے اس کی سانس پھول گئی۔ اور جھریوں بھرا چہرہ غصہ سے تمتما اُٹھا۔

"اچھا چپ ہو رہے۔ لگی طعنے دینے۔ نہ کرتی اتنا بڑا۔ کوئی تمہیں کہنے گیا تھا!"

اتنا کہکر للو باہر نکل گیا ماں نے حسرت بھری نگاہوں سے اسے جاتے دیکھا اور آنچل سے آنسو پونچھ لئے۔

بہو بھی رسوئی سے نکل کر باہر آگئی تھی اور کھڑی کھڑی سب کچھ سن رہی تھی۔

بڑھیا کے آنسو دیکھکر اس کا دل ہمدردی سے بھر آیا۔ للو کا ماں سے یہ روکھا سلوک اسے بُرا لگا اور وہ اس کے پاس آکر بڑی نرمی اور حلیمی سے بولی:۔

"ماں جی، تم انہیں کیوں چھیڑا کرتی ہو۔ وہ تو کسی کی سنتے ہی نہیں۔"

"میں اسے لاکھ چھیڑونگی تمہیں اس سے مطلب؟ وہ میرا بیٹا ہے میں اس کی ماں ہوں وہ میرے ساتھ لڑے جھگڑے میں اسے لاکھ کوسوں، لاکھ جھڑکوں تم کون ہوتی ہو بیچ میں بولنے والی" روپا نے گرج کر کہا۔

"ماں جی، تم تو ہر ایک سے لڑی پڑتی ہو۔ میں نے تو سیدھی بات کہی۔ تم الٹا لڑنے لگیں۔ ہم سے تو لڑا نہیں جاتا۔"

"تم سے کیوں لڑا جانے لگا۔ پہلے بیٹے کو سکھا کو بھجا وہ گیا تو خود آ دھمکی پھر کہتی ہے ہم سے تو لڑا نہیں جاتا۔ ہاں بورانی تم کیوں لڑو تمہارے لئے وہ جو لڑ لیتا ہے۔"

"میرے لئے کیوں لڑنے لگے تم خود لڑتی ہو تو وہ بھی بول پڑتے ہیں۔"

"تو بس میں ہی لڑاکی ہوں۔ کوئی سنے تو سچ ہی جانے۔ یہ تو سارا محلہ جانتا ہے کہ اتنی عمر گئی میں کسی سے کبھی بولی تک نہیں۔ ماں بیٹے میں کبھی تکرار نہ ہوئی تم نے آتے ہی اس پر نہ جانے کونسا جادو کر دیا۔"

"میں کوئی جادوگرنی ہوں؟۔۔۔۔۔"

"جادوگرنی نہ ہوتی۔ تو میرا للو ایسا نہ تھا کہ ماں کو اتنی جلدی بھول جاتا۔ اس کا تو ماں، ماں کرتے گلا سوکھتا تھا۔ کہنے پر بھی پاس سے اُٹھکر نہ جاتا تھا۔"

"میں انہیں اٹھاکر تھوڑا ہی لے گئی۔ اب بھی اپنے پاس بٹھلائے رکھو۔ ڈبے میں بند کرو کہیں مت جانے دو۔"

اتنا کہکر بہو اگر اندر نہ چلی جاتی تو تکرار دیر تک جاری رہتی۔ روپا کے پاس جواب تیار تھا۔

قدرت کا خاصہ ہے کہ بیاہ کے بعد لڑکے ماں باپ سے نہیں بیوی اور بچوں سے پیار کرنے لگتے ہیں مگر موہ اور مایا کے بس میں پڑے ہوئے ماں باپ یہی چاہتے ہیں کہ ان کے نوجوان اور شادی شدہ لڑکے انہیں پہلے ہی کی طرح پیار کرتے رہیں۔ اس لئے روپا بھی للو کی بے رخی کا باعث بہو کو سمجھتی تھی اور اس سے بات بات پر الجھ پڑتی تھی۔

ایک دن ان دونوں میں اچھی خاصی جھپٹ ہو گئی۔ بہو بچ کر نکل جانا چاہتی تھی۔ مگر روپا کو یہ بات پسند نہ تھی۔ اس کے تیر ہمیشہ خطا ہوتے تھے مگر آج وہ کامیاب نشانہ لگانا چاہتی تھی۔ وہ جھلائی ہوئی بلی کی طرح اس پر جھپٹ پڑی۔ بہو کے پاس بیلن تھا۔ اس نے حفاظت کے خیال سے ہاتھ جھٹک دیا۔ بیلن بڑھیا کی کن پٹی میں لگا اور خون نکل آیا۔ روپا کا سارا جوش سرد پڑ گیا اور وہ ہائے ہائے کرتی وہیں زمین پر بیٹھ گئی۔

(۴)

بڑھیا نے اس دن کچھ نہیں کھایا منہ لپیٹے بیٹھی رہی۔ للو رات کو دیر سے گھر آیا۔ اسے امید تھی کہ وہ آکر منائیگا منت سماجت کر کے کھانا کھلائیگا۔ تبھی کھائیگی ورنہ بھوکی پڑی رہے گی۔

للو اس کے پاس آیا ضرور مگر اس ڈھنگ میں نہیں جس میں روپا نے سوچا تھا۔ وہ آتے ہی بولا۔

"چل ماں روٹی کھا لے"

ماں سمجھ نہیں سکی کہ وہ روٹی کھانے کو پوچھتا ہے یا روٹی کھانے کا حکم دیتا ہے اسے چپ

کی مزاج پرسی کرنی چاہئے تھی۔ اگر وہ اتنا پوچھ لیتا۔ "ماں تمہارے کہاں چوٹ آئی ہے، درد تو نہیں ہوتا؟" کیا بات تھی، ماں کی مامتا مطمئن ہو جاتی وہ اٹھ کر کھا لیتی لیکن یہ کیا آتے ہی کہدیا۔ "ماں روٹی کھالو"۔ اس سے تو نہ پوچھنا ہی اچھا تھا۔

روپا کا دل بجھ گیا اور وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی: "مجھے تو بھوک نہیں بیٹا"۔

"بھوک کہاں گئی؟"

"لگی ہی نہیں"۔

"صبح سے کچھ نہیں کھایا۔ رات ہوگئی پھر بھی بھوک کیوں نہیں لگی؟"

"اسی (بہو) سے پوچھ لو۔ کیوں نہیں لگی؟"

"اس سے کیا پوچھوں؟ بھوک تمہیں لگنی ہے نا کہ اسے؟"

"اچھا بیٹا! مجھے جب لگیگی میں آپ کھا لوں گی"۔

"پھر کھا کیوں نہیں لیتی۔ بے فائدہ پاکھنڈ رچانے سے کیا حاصل؟"

"میں پاکھنڈ رچاتی ہوں۔ سارا مار مار کر اَدھ موئی کر دیا۔ پھر بھی تم پاکھنڈ بتلاتے ہو؟"

بوڑھی ماں نے ہچکیاں بھرتے ہوئے کہا۔ اس نے سوچا تھا کہ ماں کا رونا سن کر بیٹے کا دل پسیجے گا مگر للو تھا کہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ اپنی بات پر مستقل رہا اور بولا۔ "پاکھنڈ نہیں تو اور کیا ہے؟ پہلے لڑتی ہو پھر ڈراتی ہو۔ مجھ سے یہاں یہ مفت کی اکڑ نہیں سہی جاتی"۔

"اچھا بیٹا! سہنا بڑا ہی دکھڑا ہے نا۔ وہ اب ختم ہو جائے گا۔ تمہارا ہی منہ دیکھ کر جیتی تھی جب تمہیں ہی اچھی نہیں لگتی تو جی کر کیا کرونگی۔ ایسے ہی پڑے پڑے مر جاؤنگی۔ تم دونوں جیو۔ سکھی رہو۔ مجھے جی کر اور کیا کرنا ہے؟" اس کی آواز میں رقت تھی۔

"اچھا اب تو اٹھ کر روٹی کھاؤ"۔

"بس بیٹا اب میں نہ کھاؤنگی"۔

"کیوں نہ کھاؤ گی مجھ سے یہ روز روز کا جھگڑا نہیں دیکھا جاتا۔ آج تو اٹھ کر روٹی کھا لو کل سے بیری والے گھر رہا کرنا۔ نہ بانس رہے گا نہ بنسری بجے گی"۔

روپا نے پہلے رو کر پھر مرنے کا نام لیکر بیٹے کے دل میں درد پیدا کرنے کی کوشش کی اس کی سوئی ہوئی محبت کو پھونکوں سے جگانا چاہا۔ مگر اس کی محبت سوئی نہ تھی بجھی نہ تھی۔ راکھ پر پھونکیں مارنا اور پھونس ڈالنا بے سود تھا۔ اس کے دل میں محبت ویسے ہی موجود تھی مگر اس پر کسی اور کا تصرف ہو چکا تھا۔ ماں اس میں حصہ نہیں بٹا سکتی تھی کیونکہ وہ صرف ایک رخ ہی بہنا جانتی تھی مختلف نالیوں میں بٹ جانا اس نے نہیں سیکھا تھا۔ روپا غم کی رو میں بہی جاتی تھی وہ چاہتی تھی کہ بیٹا پکڑ کر لگائے کسی طرح سہارا دے مگر اسے ایک جگہ کھڑا دیکھ کر خود ہی بانہہ آگے بڑھائی۔

"کیا کہا؟ بیری والے گھر جا کر رہوں۔ لوگ کیا کہیں گے کہ بیٹے نے ماں کو گھر سے نکال کر الگ کر دیا"۔

"لوگ کہیں گے تو کہتے رہیں۔ مجھے کسی کے کہنے سننے کی پروا نہیں۔ جب گھر میں جھگڑا رہے تو سب کچھ سننا پڑتا ہے"۔

"بستے گھروں میں ایسا ہو ہی جاتا ہے جہاں دو برتن ہوں گے کھڑکیں گے۔ میرا کیا ہے میں تو وہاں بھی رہ لوں گی۔ پر تمہاری ناک کٹ جائیگی کہیں منہ دکھانے جوگ نہ رہو گے"۔

"میری ناک کی تم فکر نہ کرو۔ یہ ایسی موم کی بنی ہوئی نہیں کہ الٹے استرے بھی کٹ جائے الگ رہنے کی بات ہے تو الگ ہی رہوں گا"۔ ——— محبت کی آخری اپیل بھی خالی گئی۔

(۵)

بیری والا گھر دوسرے محلہ میں واقع تھا۔ پرانے ڈھب کا مکان تھا۔ دو بڑے بڑے کمرے اور ایک وسیع صحن پر مشتمل تھا۔ صحن کے وسط میں بیری کا ایک درخت تھا اسی وجہ سے اس کا نام بیری والا گھر پڑ گیا تھا۔ پہلے اس میں مویشی بندھتے تھے لیکن جب سے روپا کا خاوند مرا تھا یہ بالکل خالی پڑا تھا۔

اب روپا خود دو ماہ سے اس مکان میں رہتی تھی۔ اس کے یہاں آنے پر لوگوں میں سرگوشیاں اٹھتی رہیں کسی نے لال چند کو برا کہا کسی نے بڑھیا کو چڑیل اور بس کی گانٹھ بتایا لیکن الگ ہونا اور الگ رہنا زمانے کا دستور ہے۔ کچھ دنوں میں بات آئی گئی ہو گئی۔

ایک کمرے میں روپا کی چارپائی پڑی تھی۔ اس کے پاس دو تین برتن رکھے تھے جن پر اس کے من کی طرح میل چڑھ گئی تھی۔ دکان کا نوکر دونوں وقت آ کر کھانا ان میں ڈال جاتا تھا کبھی کبھی بہو خود بھی آ جاتی تھی۔ اور کئی دفعہ تہوار پوجا کے موقع پر گھر چلنے کے لئے بھی کہہ چکی تھی مگر روپا نہیں گئی تھی۔ للو کی بے رخی اسے ہمیشہ غمگین رکھتی تھی وہ بہو کو بیٹے کا پیار نہ دکھا سکی پوتوں میں بیٹھ کر اپنی خوش قسمتی پر نہ اترا سکی۔ دل کی حسرتیں دل میں رہ گئیں۔ ناول نویس کا پلاٹ ہی رہا ناول نہ بن سکا۔

چیت کا مہینہ بیری پر بیر لگے تھے۔ صبح کی سپیدی نمودار ہو رہی تھی۔ روپا کمرے میں پڑی بیٹے کے سلوک پر کڑھ رہی تھی۔ کیا اس نے للو کو اس لئے پالا تھا کہ بڑا ہو کر بوڑھی ماں کی بات تک نہ پوچھے اور گھر سے نکال کر الگ پھینک دے؟ اس سے زیادہ بے غیرتی اور بے حیائی کیا ہو سکتی ہے؟ کیا اس کے سارے سکھ، تکلیف، امنگوں اور حسرتوں کا یہی ایک انجام ہونا تھا؟ اس سے تو کہیں اچھا تو وہ بانجھ ہی رہتی تاکہ یہ ہونی تو ٹل جاتی۔ یہ سرد مہری کا جلاپا تو نہ ہوتا . . . . .

اسی وقت ہوا چلی۔ آنگن میں دو چار ٹپ ٹپ ہوئی۔ روپا نے یہ آواز سنی اور سوچا۔ بیری سے بیر گرتے ہیں ——— پکے ہوئے بیر!

وہ اٹھ کر باہر آئی۔ دن صاف نکل آیا تھا اور محلے کے چند لڑکے بیری کے نیچے بیر چن رہے تھے جب نیچے کے بیر ختم ہو گئے تو انہوں نے اوپر جھانکا اور ٹہنیاں پکڑ پکڑ کر ہلانے لگے۔

"بیٹا! پکے پکے توڑنا۔ کچے مت گرانا"۔

روپا نے یہ جملہ ختم ہی کیا تھا کہ عمری دائی اندر داخل ہوئی اس کے چہرے پر بشاشت اور آنکھوں میں چمک تھی۔ وہ روپا کو دیکھتے ہی بول اٹھی "روپا! بدھائی ہو بدھائی"۔

"کیوں ری عمری! ایسا کیا کھبرائی"۔ روپا نے پوچھا۔

"پوتا ہوا پوتا! لا اب مٹھائی کھلا"۔

"پوتا!" ——— "ہاں پوتا! چل دکھاؤں ———"

بہو کے لاکھ کہنے پر بھی روپا گھر جانے پر رضامند نہیں ہوئی تھی جیسے گھر سے اسے دودھ کی مکھی کی طرح نکالا گیا ہو وہ وہاں کیوں جائے؟ مگر آج نہ جانے کیوں فوراً تیار ہو گئی اور عمری کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر چلی۔

عمری نے چلتے چلتے کہا۔ "بچہ کیا ہے دودھ کا کھلونا ہے گورا چٹا گول گول چہرہ اور چپٹی ناک بالکل تجھ کو پڑا ہے"۔

"مجھ کو؟" روپا نے آنکھوں میں غیر معمولی چمک بھر کر پوچھا ——— "ہاں" عمری نے جواب دیا اس "ہاں" میں نہ جانے کون جادو بھرا تھا کہ روپا کا دل خوشی سے اچھلنے لگا غم کے بادل پھٹ گئے اور قوس قزح کا رنگین منظر آنکھوں کے سامنے پھر گیا وہ چاہتی تھی کہ اسے دوڑ کر چھو لے معلوم نہیں اس کے کمزور ٹانگوں میں کہاں کی طاقت آگئی کہ اس نے عمری کو ذرا آگے دھکیل کر کہا ——— "جلدی چل"۔

رہبر بی اے

کیا آپ بیکار ہیں؟

بلائیں تو ساری ہی بری ہوتی ہیں مگر سب سے بری قسم کی بلا بیکاری ہے مسئلہ بیکاری دنیا جہان والوں کو بالخصوص بہت زیادہ پریشان کر رہا ہے۔ اندریں حالات بیکاری کے انسداد پر غور و خوض کرنا نہ صرف ہماری اقتصادی ضرورت ہے بلکہ یہ ہمارا ایک سیاسی فرض بھی ہے سرزمین ہند کے ہر ایک مذہبی یا اجتماعی اور اخلاقی مسئلہ کو نہایت آسانی سے پس پشت ڈالا جا سکتا ہے مگر مسئلہ بیکاری کو ایک لمحہ کے لئے بھی ثانوی حیثیت نہیں دی جا سکتی ہندوستان اور بیرون ہند کے بہترین دماغوں نے مسئلہ بیکاری کا کامیاب حل سوچنے کی کوشش کی مگر بیکار۔ اس مسئلہ پر جتنا سوچا گیا اتنا ہی پیچیدہ تر ہوتا گیا بھلا ہندوستان کے ہندو مسلمانوں کا یہاں پر ابدالآباد سے نہ کوئی مسئلہ حل ہوا اور نہ آئندہ ہو۔ وجہ یہ ہے کہ

کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا بھان متی نے کنبہ جوڑا

سب سے خطرناک قسم کے لوگ کانگرسی مسلمان اور مسلم لیگی ہندو ہیں جو نہ تو ہندو مسلمانوں کو اکٹھا ہوتے دیکھ سکتے ہیں اور نہ الگ الگ رہنے دیتے ہیں دبھلا ان لوگوں کی موجودگی میں بیکاری کا انسداد ہو سکے قطعی ناممکن بعض وقت بڑے بڑے فلاسفر بڑی عامیانہ سی بات کر دیتے ہیں مگر وہ بھی ایک نظریہ کی حیثیت حاصل کر لیتی ہے ڈارون کا نظریہ نسل انسانی اسی قسم کی ایک عامیانہ سی بات ہے برعکس ازیں کبھی کبھی ایک معمولی سا انسان ایسی بات کہہ بیٹھتا ہے کہ روسو اور نٹشا تو کیا نیٹشے اور شوپن ہار خیام اور طوسی اقبال اور ٹیگور بھی سر دھننے پھریں مگر چونکہ خدا کا یہ خوددار بندہ اخباروں کے مدیروں علمی و ادبی رسائل کے دبیروں اور ریڈیو سٹیشن کے ہدایات کاروں کی آستان بوسی سے بے نیاز ہے اس لئے اس کی کہی ہوئی بات آئی گئی ہوتی ہے۔ آخر الذکر قسم کی ایک بات مسئلہ بیکاری کا سو فیصدی کامیاب علاج ہے جو میرے دماغ سے اتر قلم تک پہنچا وہاں سے صفحۂ قرطاس نے ہتیایا اب نہ معلوم سامعین اس کے حق میں کیا فیصلہ صادر کریں۔

صنعت و حرفت کی تعمیم تعلیم مسئلہ بیکاری کا حل نہیں اور نہ اس کا حل ہاتھ سے کام کرنے کو عار نہ سمجھنے میں مضمر ہے ضبط اولاد اس کا کامیاب گر نہیں ہندوستان سے ہجرت کر جانے میں بھی بہت سی مشکلات ہیں ہندوستان کے قدرتی دفینوں کو کہاں تک اکھاڑتے پھروگے۔ بھلا بھوک ہڑتال سے بھی کبھی مسئلہ بیکاری حل ہوا ہے جیلوں میں جانا بے سود پری جمال لڑکیوں کو رقص و سرود کی تعلیم دینا بھی بیکار۔ مدکشا پے اور فیکٹریوں کا قیام عارضی طور پر تو شاید اس مسئلے کو حل کر سکے مگر بالآخر یہی مشینیں عالم بیکاری کا باعث بن جائیں گی۔ مسئلہ بیکاری کا حل محض ایک ہے اور صرف ایک۔ اور وہ ہے مفت خوری "جادو وہ جو سر پر چڑھ کے بولے"

ایک بارات جا رہی ہے نہایت سجے ہوئے باراتیوں کی ناک بہ نہایت بے تکلفی سے اس بارات کے ہمراہ ہو لیں مگر یہ خیال رہے کہ ذرا پیچھے یا آگے رہیں۔ ایسی جگہ جو بارات والوں اور دلہن والوں کا نقطۂ اتصال ہو۔ بیچ میں مدغم ہو جائیں یقین جانئے کہ بارات والے آپ کو دلہن والوں میں سے سمجھیں گے اور دلہن والے ایک معزز و موقر باراتی بھال کیا آپ سے کوئی بات کر جائے۔ ایک یا دو وقت زردہ پلاؤ متنجن شیرینی بڑے مزے سے اڑا لیجئے۔ مگر یہ یاد رہے کہ یہاں پر قدرے تصنع اور اینچ کی ضرورت پڑے گی جیسا موقعہ دیکھا ایسی بات کر دی مگر یہ گر عام طور پر بڑے بڑے شہروں بڑی بڑی باراتوں اور گنجان آباد گلی کوچوں میں چلتا ہے۔ جہاں آنے جانے والوں کی اتنی بھیڑ ہو کہ کسی کو آپ سے کچھ پوچھنے کی نہ تو ضرورت پڑے اور نہ وقت ملے۔

آپ اپنے شہر میں (بشرطیکہ یہ کم از کم ضلع کا صدر مقام ہو) ٹی پارٹی کی ٹوہ میں رہیں جہاں کہیں بھی اس کا سراغ ملے۔ آپ نہایت بے تکلفی کے ساتھ ٹی۔ پارٹی کے وقت سے عین دو چار منٹ قبل اپنا مکلف لباس پہنکر پارٹی میں تشریف لے جائیں۔ آپ کا گیٹ پر اسی طرح استقبال کیا جائے گا۔ جیسے گیسٹ آف دی ایوننگ' کا۔ گیٹ پر دعوتی کارڈ دیکھنا یا دکھانا خلاف آداب ہے آپ نہایت پھرتی سے کسی ایسے کونے والے کی میز پر جا بیٹھیں جہاں صرف ایک شریف آدمی کسی دوسرے ساتھی کا منتظر بیٹھا ہو مگر یاد رہے کہ یہ شخص آپ کا واقف نہ ہو آپ کے وہاں پہنچنے سے ایک تو اس شریف آدمی کی تنہائی اور اجنبیت دور ہو جائیگی دوسرے آپ پیٹ بھر کر کھا پی سکیں گے۔ کیونکہ چار آدمیوں کا خورد و نوش آپ دو معزز مہمانوں کے رحم پر ہوگا۔ اگر آپ کی میز صدر گاہ سے قدرے اوجھل ہو تو آپ قرب و جوار میں لگی ہوئی میزوں کا سامان بھی استعمال میں لا سکتے ہیں۔ ورنہ 'ادھیرا' او بوائے' کہنا سیکھ لیجئے۔ کیک پیسٹری۔ لائم جوس۔ آئس کریم۔ کریم رولز اور پیٹیز کی کمی نہ رہیگی۔ جو لوگ اس شام گھر آ کر کھانا کھاتے ہوں۔ وہ اس قسم کی پارٹیوں سے فائدہ اٹھانا نہیں جانتے۔ ایک فیلٹ ہیٹ۔ ایک سوٹ۔ انار کلی میں بکنے والی تین چار قسم کی نکٹائیاں۔ ایک یا دو ہارڈ کالر ایک جوڑا بوٹ تاشو اس قسم کی پارٹیوں کے لئے مخصوص کر لیجئے۔ اگر آپ گاگلز (دھوپ کی عینک) لگا لیں تو سبحان اللہ۔ رعب و داب کے علاوہ آپ کے پہچانے جانے کے امکانات بھی دو تین فیصدی کم رہ جائیں گے۔

اگر آپ کسی دوست کے ہاں ملاقات کے لئے جانا چاہتے ہیں تو ہمیشہ ایسا وقت مقرر کریں جو یا تو کھانے کا ہو یا کم از کم صبح کے ناشتے کا یا شام کی چائے کا۔ صاحب خانہ سے جاتے ہی پہلے کہئے گا۔ "بہتیرا چاہا کہ کھانے کا وقت ٹال کر آپ کے ہاں پہنچوں۔ مگر ملے ہوئے ہفتہ عشرہ ہو چکا تھا۔ اس لئے کم بخت دل ہی نہ مانا۔ کشاں کشاں ادھر لے ہی آیا۔" گویا کہ آپ نے نہایت شریفانہ انداز سے صاحب خانہ کو یاد دلا دیا کہ آج آپ ان کے دسترخوان کو سرفراز کرنے کے لئے تشریف لائے ہیں۔ اگر آپ چائے کے وقت وہاں پہنچے ہیں تو یہ کہئے گا: "بیوی نے بہتیرا کہا کہ چائے کے وقت کسی کے ہاں نہیں جایا کرتے۔ مگر چونکہ ملنے کو جی تڑپ رہا تھا۔ اس لئے رہا نہ گیا۔" بس پھر سمجھ لیجئے کہ آپ کی چائے محفوظ ہو گئی۔ اور اگر کھانا یا چائے بلا کسی تمہید کے آ جائے تو اتنا ضرور کہہ ڈالئے گا "حضرت! اس لئے تو میں آپ کے ہاں آنے سے کتراتا ہوں۔ آپ خواہ مخواہ بلا ضرورت بھی کھانے پر کھینچ لیتے ہیں"۔ اس تمام التزام کے لئے دس پندرہ دوستوں کی ضرورت ہے۔ تاکہ کم از کم دو ہفتے کے بعد ایک دوست کے ہاں ایک دفعہ دعوا بولنے کی نوبت آ سکے اور دس پندرہ دن

کے بعد آپ کی چائے یا ایک وقت کا کھانا ان کو دو پہر بھی معلوم نہ ہو۔ اس طرح آپ دس پندرہ وقت کے لئے پہلے ہی سے بک ہو جایا کریں گے۔ اس سلسلہ میں دوسری بات یاد رکھنے کے قابل یہ ہے کہ خواہ آپ ناشتہ یا شام کی چائے کے لئے ہی بیٹھیں۔ مگر آنے والے لنچ یا شام کے ڈنر کا بسیار خوری سے یہیں انتظام کر لیجئے۔

ما بر رسولاں بلاغ باشد و بس

اگر دو چار امیر زادوں کے ساتھ آپ کے دوستانہ تعلقات ہو گئے ہوں تو بس سمجھ لیجئے۔ کہ مہینے میں پانچ سات وقت کا کھانا کسی ہوٹل یا ریستوران میں مستقلاً آپ کے لئے ریزرو ہو گیا کسی اچھے بازار میں سے گذرتے وقت جہاں اچھے اچھے ہوٹل ہوں آپ اپنے امیر زادہ دوست کے ساتھ کسی ہوٹل یا ریستوران میں داخل ہو جائے گا۔ خواہ پیغام دعوت آپ ہی کی طرف سے ہوا ور ماکولات طیبات کا آرڈر آپ ہی دینے والے ہوں مگر جس وقت پلیٹ میں رکھا ہوا بل آئے۔ تو آپ اپنی جیب ٹٹولنے میں ذرا ایک دو منٹ لگا دیجئے بس پھر کیا ہے سارے کا سارا بل اس امیر زادے کی طرف سے ادا ہو جائے گا۔ اور اگر آپ ایسے موقعوں کے لئے دکھاوے کی غرض سے ادھار یا سود پر دس روپے کا نوٹ لیکر اپنی جیب میں رکھ چھوڑیں۔ تو آپ کا تیر کہیں بھی خطا نہیں ہوگا جیب میں سے نوٹ نکالئے (تنبیہ مگر کہیں اسے پلیٹ میں نہ رکھ دینا ورنہ خطرہ ہے کہ بل آپ کو چکانا پڑے) اور فوراً کہئے: "والد سے ہزار دفعہ کہا کہ جیب میں باہر جایا کروں تو چھوٹے چھوٹے نوٹ یا ریزگاری جیب میں ڈال دیا کرو۔ مگر وہ ہیں کہ اس سے کم کا نوٹ میری جیب میں کبھی ڈالنے میں راضی نہیں ہوتیں۔ ابھی پرسوں دیکھو ں تو سو کا نوٹ جیب سے نکلا۔ بڑی بے دھڑک ہیں" بس بات کو ذرا لمبا کیجئے تو آپ کے دوست اگر واقعی امیر زادے ہیں جھٹ بل چکا دینگے۔ امیر زادوں کی تلاش آپ کا فرض ہے مگر اس قسم کے دوست بدلتے رہنے چاہئیں کیونکہ یہ منتر زیادہ دن نہیں چلتا آپ تقریباً نو دس بجے قبل از دوپہر یعنی جب بازار میں ہر قسم کی دکانیں بالخصوص میوہ اور مٹھائی کی کھل چکیں۔ بازار نکل جایا کریں۔ سب سے پہلے کسی میوہ فروش کی دکان پر پہنچیں۔ دو چار منٹ خوب ٹکٹکی باندھکر میوہ سے بھری ہوئی ہر ایک ٹوکری کی طرف دیکھیں میوہ فروش بار بار پوچھے گا "حضور کیا چاہیئے حضور یہ پیاسا رینڈ بلڈ ہے' یہ ناگپوری سنگترہ ہے۔ آج ہی آیا ہے یہ قندھاری انار تو ہاتھوں ہاتھ بک گیا۔ یہ سنڈکس صاحب کے باغیچے کا سیب ہے۔ کشمیری ناشپاتی ہے' یہ چمن کا انگور ہے' مگر آپ دم بخود کھڑے رہیں گویا کہ آپ ایک دو روپیہ کا نہیں بلکہ دس بیس روپے کا فروٹ خریدنے والے ہیں۔ پھر ہر ایک ٹوکری میں سے ایک ایک پھل اٹھا کر اسے ہاتھ کی ہتھیلی میں خوب جھکدیں کبھی ہتھیلی پر رکھ کر اس کا وزن کریں کبھی ناک سے لگا کر سونگھیں کبھی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس کے چھلکے کو دیکھیں۔ پھر آپ نہایت اطمینان سے کہیں: "یہ سنگترہ تو قدرے کھٹا معلوم دیتا ہے" وہ کہیگا: "حضور! یہ ٹوکرہ تو آج ہی آپ لوگوں کیلئے منگایا ہے آپ ذرا چکھ کر تو دیکھیں"۔ آپ فوراً کہیں "نہیں نہیں' رہنے دیجئے۔ رہنے دیجئے" جتنا آپ انکار کرتے جائیں گے اتنا ہی اس کا اصرار بڑھتا جائیگا۔ بالآخر دو ہی منٹ کے انکار و تکرار و اصرار کے بعد پورے کا پورا سنگترہ آپ کی نذر ہو جائے گا۔ اگر گرمی کا موسم ہو تو آم۔ آلوچہ۔ ننھا آلو۔ آلو بخارا۔ خوبانی۔ انجیر۔ انار۔ امرود اور لیچی تک کا مزا آپ چکھ سکینگے۔ ایک آم ایک آلوچہ ایک لیچی اور ایک انجیر آپ کے معدہ کی ضیافت کے لئے کافی ہے پھر آپ یہ کہکر کہ "دیکھو ہم لیں گے تمہاری دکان سے ہی۔ مگر ہم دو چار دکانوں سے نرخ تو دریافت کرلیں آخر آٹھ دس روپے کا فروٹ خریدنا ہے نہ!" وہاں سے چل کر آپ دوسری دکان کا رخ کرلیں پھر تیسری پھر چوتھی بس آپ سیر ہو جائیں گے۔ اگر سردی کا موسم ہو تو یہی کرتب خشک میوہ کی دکان پر کھیلا جاسکتا ہے یہاں بادام پستہ چلغوزہ۔ اخروٹ کشمش۔ گری کا چوا مونگ پھلی ملیگی۔ اور لطف یہ کہ ایک ایک چیز کئی کئی قسم کی۔ اگر ہر ایک چھابے میں سے دو دو چار چار دانے بھی چکھ لئے۔ تو بس آپ نے ایک وقت کا کھانا مار لیا۔ یاد رہے کہ خشک میوہ فروش نسبتاً زیادہ فراخ دل ہوتے ہیں۔ مونگ پھلی سے تو آپ جتنا عرصہ دکان پر کھڑے رہیں اپنے لب و دندان کی ضیافت کرتے رہیں۔ یہاں سے چلتے وقت صرف یہ کہدیا کریں "ہمارا نوکر غالباً سودا یہیں سے لے جاتا ہے۔ دیکھو بھئی ذرا اچھا سودا دیا کرو چلغوزے پستہ قدرے مہنگا ہے بھئی کل آپ نے اچھے چلغوزے نہیں بھجوائے! اچھا ہم ذرا دوسری دکان سے مقابلہ کرلیں"

یہاں سے روانہ ہو کر آپ دوسرے بازار میں دیسی حلوائی کی دکان پر پہنچ جائیں مثلاً قند۔ برفی۔ لڈو۔ گاجرپاک اور سوہن حلوہ ہر ایک کی بانگی چکھئے گا "اس میں میٹھا زیادہ ہے۔ اس میں گھی کم ہے یہ کل کی بنی ہوئی ہے ہمیں تو تازہ چاہئے۔ یہ تازہ ہے ہمیں تو کل کی چاہئے سوہن حلوہ باسی اچھا ہوتا ہے وغیرہ وغیرہ اس قسم کے چند ایک کلمات سیکھ لیجئے بس آپ کا کام بن گیا پھر آپ کسی انگریزی مٹھائی کی دوکان کا رخ کیجئے جاتے ہی کہئے گا: "دیکھئے مجھے بیس پچیس دوستوں کو چائے پر بلوانا ہے کتنی پیسٹری لگیگی۔ کیک کتنے چاہئیں۔ سادہ اچھے ہونگے یا بھرے ہوئے اگر آج آپ سے یہ چیزیں خرید لی جائیں۔ تو کل کام آسکیں گی یا کل تازہ سپلائی کرسکو گے۔ کیا کیا چیز کس کس قسم کی آپ مہیا کرسکینگے" بس پھر کیا تھا آپ کے سامنے بکس کے بکس کھل جائیں گے۔ ایک ایک ٹکڑا (piece) چکھتے جائیے مجال کیا آپ بھوکے رہ جائیں چلتے وقت یہ کہہ دیجئے گا: "اچھا ہم اپنے بیرے کو بھیجیں گے۔ بیرا چیٹ لائیگا۔ اس کے مطابق تمام چیزیں باندھ دینا۔ ہاں دیکھنا پیکنگ اچھا ہو۔ روز کا نیچ پہنچیگا روز کا نیچ" اگر آپ پیٹو قسم کے انسان ہیں اور اب بھی کچھ کسر باقی رہ گئی ہو۔ تو سبزی فروش کے ہاں چل دیجئے مٹر کی پھلیاں ایک مولی ایک شلغم۔ گوبھی کے پھول کی ایک شاخ آپ کی شکم پری کے لئے کافی ہے۔ مگر گرمی کے موسم میں یہ چیزیں آپ کو نہ مل سکیں گی۔ آپ ان کی بجائے ایک دو گلاس پانی پر اکتفا کریں' ایک سوٹ خوبصورت سی زنجیر دار عینک اور ایک چھوکرا نوکر اس کامیاب شو کے لئے کافی ہیں۔

جس وقت آپ ریل میں سفر کر رہے ہوں۔ تو آپ ایسے مسافر کے پاس بیٹھیں جس کے ہمراہ توشہ دان ہو اس سے بے تکلف ہو جانا یہ آپ کا کام ہے آپ ایک سگرٹ پیش کر دیجئے۔ تکلف دور۔ آپ کے پاس اخبار ہے انہیں ذرا دیدیجئے گا بس آپ کا جادو چل گیا۔ اگر وہ پلیٹ فارم پر سے کوئی خشک چیز کھانے کے لئے خرید رہا ہو آپ ایثار و مال پیش کر دیں بس آدھی کے حقدار آپ ہو گئے جب کھانے کا وقت آئے تو مسلمانوں کی مہمان نوازی دلبشرطیکہ آپ اور وہ مسلمان ہیں) کے قصیدے پڑھ دیجئے اور غیر مسلموں کے آپس میں ملکر نہ کھانے پینے کی مذمت کر دیجئے پس پھر کیا تھا توشہ دان میں رکھے ہوئے محفوظ کھانے پر آپ کی مہر ثبت ہو گئی۔

رشتہ دار تو یقیناً آپ کے بھی بہت سے ہونگے ان میں سے بعض ایسے بھی ہونگے جو واقعی آپ سے ملنے جلنے میں خوشی محسوس کرتے ہوں ایسے رشتہ والوں کی ایک فہرست مرتب کرلیجئے گا اگر خوش قسمتی سے اس قسم کے رشتہ والوں کی تعداد بارہ تک بھی پہنچ گئی ہو۔ تو آپ نہایت اطمینان سے ہر ایک عزیز کے ہاں ایک ہفتہ نہایت عزت و وقار کے ساتھ گذار سکتے ہیں سال میں محض ایک مرتبہ ایک عزیز کے ہاں ایک ہفتہ کے لئے آپ کے طعام و قیام کی باری

ٹنگی سال بھر میں بارہ ہفتے یعنی کم دبیش تین ماہ کے لئے پیٹ کا سامان اس طرح مہیا ہوسکتا ہے اور اگر آپ قدرے ڈھیٹ ہو جائیں تو کچھ عرصہ ایسے عزیزوں کے ہاں بھی گذارہ ہوسکتا ہے جو آپ کی آمد کو مصیبت ناگہانی سمجھیں۔

اگر آپ کسی دوست یا عزیز کے ہاں بطور مہمان جا رہے ہوں۔ تو اپنے شہر سے کچھ بیر یا بھٹے یا گنڈیری یا بھرے چنے یا امرود یا سستی قسم کے آم غرضیکہ فصل کے مطابق سوغات لے جائیں۔ یہ یاد رہے کہ یہ سوغات نہایت ہی عام اور سستی قسم کی ہو۔ اول تو وہاں سے چلتے وقت آپ کو آپ کا میزبان اپنے شہر یا قصبہ کی سوغات جو یقیناً نسبتاً بڑھیا قسم کی ہوگی پیش کرے گا۔ ورنہ جب وہ آپ کے ہاں بطور مہمان آئیگا تو یقینی طور پر آپ کے ہاں کوئی عمدہ قسم کی سوغات لائیگا اس معاملہ میں آپ کو قدرے صبر و تحمل سے کام لینا پڑے گا۔

آپ شادی اور مرگ کی رسوم سے کچھ ٹیکنیکل طور پر واقف ہو جائیں اگر آپ تہنیت و تبریک کے آداب عیادت و تعزیت کے طور طریقوں سے واقف ہیں پھر سمجھ لیجئے کہ آپ کے شہر یا قصبہ میں کوئی تقریب خورد و نوش ایسی نہیں ہوگی جس میں آپ کو دعوت نہ دی گئی ہو۔ اگر آپ دغا فریب رسوخ اور چرب زبانی سے کام لے کر میونسپل کمشنر ڈسٹرکٹ بورڈ یا کنٹونمنٹ بورڈ کے ممبر بن جائیں۔ پھر تو آپ کا نام دعوت میں بلائے جانے والے مہمانوں کی فہرست میں سب سے اوپر ہوگا بشرطیکہ یہ ہندوستانی قسم کی دعوت ہو۔ اور اگر انگریزی قسم کی پارٹی ہے تو آپ کے نام دعوتی کارڈ ضرور پہنچیگا۔ فرشتہ اجل وقت پر آنے سے چوک سکتا ہے۔ یہ دعوتی کارڈ آپ کو ہر جگہ تلاش کرلیگا اور اگر مہمانوں کی فہرست میں آپ نام نظر نہ آئے اور نہ دعوتی کارڈ آپ کے پاس پہنچے تو اسے سہواً نظر اندازی سمجھکر تقریب میں ضرور شامل ہو جائیں۔

آپ بڑے مزے میں رہیں اگر آپ لیڈر یا کم از کم مقرر قسم کے انسان بن سکیں اگر آپ مسلمان ہیں تو پاکستان تعلیم نسواں سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کا تناسب مغربی تہذیب کی مذمت تحریک خاکساران اور شہید گنج کے متعلق چند ایک تقریریں نوک زبان کرلیں۔ دیوبندی بریلوی اور قادیانی عقاید کے متعلق کتابوں میں لکھی ہوئی سطور سنہ زبانی کرلیں مدح صحابہ اور تبرہ کے متعلق کچھ واقفیت بہم پہنچائیں تو آپ کا حلوہ مانڈہ کہیں نہیں گیا دوران تقریر میں قدرے آنسو بہانا یا گریہ در گلو آواز نکال کر اپنے رومال سے خشک آنکھوں کو صاف کرنا سیکھ لیں تو آپ سو فیصدی کامیاب ہیں مجال کیا آپ کو عمر بھر بھی گھر کا کھانا نصیب ہو اگر آپ ہندو دھرم سے تعلق رکھتے ہیں تو اردو ہندی کا جھگڑا وار دھا سکیم ودیا مندر سکیم ادم منڈلی ہریجنوں کی آزادی مردم شماری اور دیسے شکر کا فن ترقی ضبط تولید مخلوط انتخاب اور ستیہ گرہ ایسے مسایل پر کچھ کہنا سیکھ لیں ہر جگہ آپ کا وصف یاد کیا جائے گا اور اگر آپ سکھ ہیں۔ تو سکھ یونیورسٹی گورو دوارہ اکیٹ شرومنی گوردوارہ پربندھک کمیٹی اکالی تحریک وائسریگل کی کونسل میں سکھوں کی نمائندگی سکھوں کی فوجی خدمات پنجاب میں سکھوں کے راج پر کچھ کہیں تقریریں کردیں بس ہر جگہ آپ کو جی آیا نوں کہا جائیگا۔

مفت خوری کے فن کو ترقی دینا ہر ایک ہندوستانی سپوت کا فرض عین ہے۔

(سید) نیاز احمد ترمذی۔ بی اے بی ٹی۔

لمعاتِ قمر

میرے دلِ فسردہ میں نام کو بھی خوشی نہیں
لطفِ بہار تو کجا ذکرِ بہار بھی نہیں

نالہ ہے ناگداز سا، درد میں دلکشی نہیں
ہیچ ہے زندگی اگر حاصلِ زندگی نہیں

وہ بھی ہے کوئی آرزو جس کی خلش کو ہو سکوں
وہ تو ہوس کی پیاس ہے شوق کی تشنگی نہیں

تیری رضا کے سامنے تیری خوشی کے سامنے
میری رضا رضا نہیں میری خوشی خوشی نہیں

تیرے سبو کی خیر ہو اپنے کرم کا واسطہ
یونہی پلائے جا ابھی دل کی لگی بجھی نہیں

عالمِ حسن و عشق کا اتنا زوال، الاماں!
عشق میں سرخوشی نہیں حسن میں دلبری نہیں

تیرا گدائے در ہوں میں میرے لئے ہے بس یہی
بندۂ بے نوا ترا۔ طالبِ سروری نہیں

اب بھی سجود گاہِ شوق جذب طراز ہے مگر
اب وہ جبینِ شوق میں شورشِ بندگی نہیں

کاوشِ چارہ ہے عبث اب یہ بجھائے بجھ چکی
دل کی لگی ہے اے قمر یہ کوئی دل لگی نہیں

قمر رامنگری

زندگی

شہر کی پُرشور زندگی سے سریندر دو ہی مہینے میں تنگ آگیا۔ وہ اس سے پہلے بھی بسنت کے میلے پر بلند پور آیا تھا لیکن اس وقت تو اسے شہر کی چہل پہل نے اتنا مسحور کیا تھا کہ گھر پہنچ کر کئی دن یہی تدبیریں سوچتا رہا کہ وہ شہر دوبارہ کب جا سکتا ہے۔ اس کا اپنا قصبہ بلند پور سے کوئی بیس کوس دور تھا۔ پرماتما نے اسے یہ دن جلد ہی دکھا دیا اور وہ ایک پرائیویٹ فرم میں بیس روپیہ مشاہرے پر کلرک کی حیثیت سے کام کرنے لگا۔ مگر کہاں بیس روپے اور کہاں بلند پور جیسے بڑے شہر کے اخراجات۔ سات روپے ماہوار پر ایک چھوٹا سا مکان کرایہ پر لے کر اور ہوٹل کے بناسپتی گھی سے بنی ہوئی سبزیوں پر دن گذارنے لگا۔ پھیری والوں کی بے جوڑ آوازیں "ڈبل روٹی تازہ مکھن" "بوٹ پالش" "ریشمی کپڑے" جنہیں وہ شہریت کی جان اور زندگی خیال کیا کرتا تھا۔ اب اس کے دماغ کو چاٹنے لگیں۔ جب وہ گلی کے موڑ پر سبزی اور کپڑے کی دکانوں کے سامنے سے گذر کر فرم کو جاتا تو اسے پھیری والوں کی بے ذوقی پر اور بھی غصہ آتا۔ وہ سوچتا کہ حکومت اگر بھیک مانگنے والوں کو قانون کی آڑ لیکر جیل میں ٹھونس سکتی ہے تو اس سے یہ لوگ کیوں بری ہیں۔ کیا یہ گلیوں میں بسنے والوں کا مذاق نہیں اُڑاتے۔ وہ شہر سے کہیں دور بھاگ جانا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے منیجر سے دو دن کی رخصت کے لئے درخواست بھی کر دی۔ وہ شہر کے رومان سے خالی گوشوں میں کب تک رہے گا۔ صبح سویرے سورج دیوتا کا درشن اسے آجتک شہر میں رہتے ہوئے نصیب نہ ہوا تھا۔ وہ اپنے سائیکل پر سوار ہو کر شہر سے باہر کی طرف دا ہوا۔ جرنیلی سڑک کو چھوڑ کر ایک کچے راستے پر جو دور سے نیلے نیلے آسمان کی سطح میں دھنستا ہوا دکھائی دے رہا تھا چل پڑا۔ اسی خیال سے کہ ادھر کوئی نہ کوئی گاؤں شہر سے نزدیک ضرور ہوگا جہاں سے روزانہ شہر اپنے کام پر بآسانی حاضر ہو سکیگا۔ وہ راستے کے دونوں جانب ہرے بھرے کھیتوں اور لہکتے ہوئے سبزہ زاروں کو دیکھتا ہوا جا رہا تھا۔ آگے راستہ کچھ ناہموار سا تھا۔ اس نے سائیکل کو آہستہ آہستہ چلانا شروع کر دیا۔ سامنے اسے ایک بوڑھا آدمی نظر آیا جو برسیم کی پولی سر پر رکھے مخالف سمت سے آ رہا تھا۔ وہ ٹھہر گیا۔

"بندگی! باباجی۔ یہاں سے گاؤں کتنی دور ہے؟" بوڑھے نے زمین میں گاڑی ہوئی نظر اوپر اٹھائی "کون سا گاؤں بیٹا؟"

سریندر یہاں کسی گاؤں کے نام سے واقف نہ تھا اور اپنی اجنبیت کو چھپانا بھی چاہتا تھا وہ سائیکل کے پہیوں کو غور سے دیکھنے لگا کہ چلتے چلتے ان میں کوئی نقص تو واقع نہیں ہو گیا اور پھر ذرا ٹھہر کر "وہی جہاں دولت رام بنئے کی دکان ہے"۔

دولت رام کا نام سریندر نے کئی بار فرم کے مزدوروں کی زبانی سنا تھا۔ بوڑھے نے برسیم کی پولی ایک طرف پھینک دی اور ہانپتا ہوا اس پر بیٹھ گیا۔

"گنگا نگر بیٹا!" "وہ یہاں سے تقریباً ایک کوس دائیں ہاتھ کو ہے۔ میں وہاں چوکیدار ہوں۔ یہ برسیم تھانیدار کے لئے لے جا رہا ہوں۔ اس کی گھوڑی اور بھینس کے لئے"۔

"تو تھانیدار نے چارہ گنگا نگر سے خریدا ہوگا"۔

"نہیں اگر زمیندار لوگ اسے چارہ مہیا نہ کریں تو دوسرے ہی دن ان کی شامت آجائے بیچارے کیا کریں"۔

"وہاں کوئی اچھا مکان کرائے پر مل جائے گا باباجی؟"

"بہوت بابوجی! دولت رام بنیا بڑا مالدار ہے۔ اس کی کئی حویلیاں خالی پڑی ہیں آپ رہیں گے وہاں۔ خوشی سے آئیں ہم بھی آپ کی سیوا کیا کریں گے"۔

سریندر غور سے چوکیدار کے الفاظ سن رہا تھا اور یہ سوچ رہا تھا کہ یہ مزدور زندگی کا کتنا صحیح ترجمان ہے۔ یہ ان پڑھ اخلاق و مروت کی زندہ تصویر ہے۔

"گنگا نگر شہر سے کتنی دور ہے بابا؟"

"یہی کوئی تین کوس"

سریندر نمسکار کرتے ہوئے پھر سائیکل پر سوار ہو گیا۔ اسے وہ قصبہ جس کی طرف بوڑھے چوکیدار نے اشارہ کیا تھا۔ نزدیک ہی دکھائی دے رہا تھا۔ تقریباً دس منٹ کے بعد وہ سیدھا سیٹھ دولت رام کی دکان پر پہنچا۔ سیٹھ صاحب سے آدھ گھنٹہ گفتگو کے بعد سریندر نے مکان اور کرائے کا فیصلہ چکا لیا۔ سیٹھ صاحب نے اپنے ایک کارندے بدھو کو مکان دکھانے کے لئے بھیج دیا۔ مکان اینٹوں کا بنا ہوا تھا۔ سیٹھ صاحب کے اپنے مکان سے کوئی پندرہ بیس گز کے فاصلے پر۔ دو کمرے کافی کشادہ اور ہوادار۔ مکان کا دوسرا حصہ بند تھا۔ اور وہاں چولھے کے پاس تھوڑی سی راکھ اور آدھی آدھی جلی ہوئی لکڑیاں پڑی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دوسرا حصہ آباد ہے۔

"مکان کے دوسرے حصے میں کون رہتا ہے بدھو؟" سریندر نے پوچھا۔

"مالتی بابوجی۔۔"

"وہ کون؟"

"رامو معمار کی بدھوا۔" "پچھلے سال رامو سیٹھ صاحب کے مکان بنانے آیا تھا۔ بڑا کاریگر تھا بابوجی۔۔۔ یہ سامنے والا مکان اور وہ مندر اور مورتی سب اسی کے بنائے ہوئے ہیں لیکن کیا بتاؤں بابوجی! ایک دن وہ سیٹھ جی کے مکان کے پردوں پر پھول کاڑھ رہا تھا کہ اچانک اس کا پاؤں پھسل گیا۔ بیچارے کی گردن ٹوٹ گئی۔ اور دو گھنٹوں کے بعد چل بسا۔۔۔۔ مالتی اب تک یہیں ہے۔ اس کا کوئی نہ تھا۔ بیچاری غریب بھی کہاں جاتی؟ سیٹھ جی کے دل میں رحم آیا۔ اسے یہ مکان دے دیا۔ اب وہ سیٹھ جی کی دکان پر محنت مزدوری کرتی ہے۔ کبھی دال دلنے کی کبھی بیسن پیسنے کی۔ یہ نہ ہوئے تو سیٹھ جی کے گھر میں کوئی چھوٹا موٹا کام کر دیا۔ بہت ہی شریف ہے بابوجی۔ بہت ہی سندر"۔

سریندر کے پاس زیادہ باتیں سننے کے لئے وقت کہاں تھا۔ وہ شہر سے اپنا مختصر سامان لانے کی فکر میں تھا۔ آخر یہ طے پایا کہ سائیکل پر ہی دو تین بار چیزیں ڈھو لی جائیں۔ چھکڑے پر کم از کم تین روپے کرایہ کا حوصلہ شکن خیال اس کے سد راہ تھا۔ دو چھٹیوں میں

یہ کام بخوبی ختم ہوگیا۔ اب سرنیدر روزانہ شہر آنے جانے لگا۔ شہر کے ایک معمولی ہوٹل میں کھانے کا بھی اچھا خاصہ انتظام ہوگیا۔ وہ صبح اشنان سے فارغ ہوکر شہر روانہ ہوجاتا اور کھانا کھانے کے بعد دفتر حاضر ہوجاتا۔ شام کو کھانا کھاکر گاؤں آجاتا۔ اتوار کی چھٹی کا دن گاؤں میں کپڑے وغیرہ دھونے میں لگ جاتا اور اس دن وہ برت بھی رکھ لیتا۔ کئی مہینے اسی طرح گذر گئے۔ سرنیدر اور مالتی کی آپس میں واقفیت بھی ہوگئی۔ اتفاقاً کئی بار وہ ایک ہی کنوئیں پر کپڑے دھونے کے لئے جا پہنچتے۔ دونوں ایک دوسرے کی تھوڑی بہت مدد بھی کردیتے۔ بڑے بڑے کپڑوں کے نچوڑنے میں کبھی صابن زیادہ جھاگ دینے لگتا تو وہ ایک دوسرے کے کپڑے میں ڈال دیتے۔ پھر تو یہاں تک ہوگیا کہ مالتی بھی اتوار کا دن ہی کپڑے دھونے کے لئے مقرر کرلیتی۔ ایک دن اسی طرح وہ آگے پیچھے ایک کنوئیں پر جا پہنچے اس دن مالتی کے چہرے پر غیر معمولی اُداسی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کچھ سرنیدر سے کہنا چاہتی ہے اور اس کے لئے موقع کی تلاش میں ہے۔ یونہی سرنیدر نے سر پر پانی ڈال کر صابن ملنا شروع کیا تو مالتی نے یہی لمحے غنیمت جانے اور ذرا رک رک کر بولنا شروع کیا۔

"سرنیدر بابو تم سے ایک بات پوچھوں جو سچ سچ کہو تو۔"

"تو میں جھوٹ بھی کہتا ہوں مالتی!"

"میرا یہ مدعا تو نہ تھا" یہ کہکر وہ مرجھائی ہوئی کلی کی طرح مسکرادی ...." اچھا تو کہو۔ تم بھوجن کہاں کرتے ہو؟" "ہوٹل میں" "گنگا نگر میں کونسا ہوٹل ہے؟" "نہیں شہر" "اور اتوار کو تم کہیں نہیں جاتے؟" "اس دن برت رکھ لیتا ہوں" "پیسوں کی بچت اور پُن" "ہاں مالتی یہ بھی درست ہے ہفتے میں ایک چھٹی اس دن بھی آرام نہ کروں تو کیونکر جیؤں؟" "شہر میں تم کھانا کیوں کھاتے ہو؟" "کیا کروں۔ گاؤں میں سبزی اگرچہ سستی ملتی ہے۔ گھی بھی خالص ہوگا لیکن پکانے پر وقت صرف کون کرے؟"

مالتی کی بجھی ہوئی آنکھوں میں دم بھر کے لئے روشنی کی کرن پھوٹی۔ اس کے دل میں کسی نئی اُمنگ کے پیدا ہونے کا احساس نمودار ہوا مگر وہ جیون سے ناامید ہوچکی تھی۔ اس نے سرنیدر کے الفاظ "پکانے پر کون وقت صرف کرے؟" دل ہی دل میں دُہرائے اور خاموش ہوگئی۔

شام کو مالتی بینگن کا بھرتہ تیار کررہی تھی کہ سرنیدر اُدھر آکر کھڑا ہوگیا۔ مالتی سرنیدر کو وہاں موجود پاکر شرماسی گئی اور اپنے سر کے ہوئے دوپٹے کو درست کرکے اسے ایک ٹوٹی پھوٹی چارپائی پر جو قریب ہی پڑی تھی۔ بیٹھنے کے لئے اشارہ کیا۔ سرنیدر نے پہلے اِدھر اُدھر دیکھا اس انداز سے کہ جس طرح مکان کی دیواریں اس کے دل کی دھڑکن کو سنکر اسے مشکوک نگاہوں سے تک رہی ہیں اور پھر چارپائی پر بیٹھ گیا۔

"بینگن کا بھرتہ کھاؤ گے؟" مالتی نے سرنیدر سے شگفتہ سی آواز میں پوچھا۔ "بڑا چٹ پٹا اور مزیدار ہے"۔ یہ کہتے ہی وہ ایک پیالی میں تھوڑا سا بھرتہ اور دو پھلکے ایک بڑے پیتل کے تھال میں لگاکر لے آئی۔

"کیا بھول گئی ہو مالتی۔ میرا آج برت ہے اور میں ہر اتوار کے دن ایسا کرتا ہوں۔"

"اتوار کو برت رکھنا کوئی کرشن بھگوان کا اپدیش تو نہیں۔ برت رکھنے کو انسان سارے سال برت رکھتا جائے بھلا مجبور ہوکر ایسا کرنے میں کیا پُن ہوسکتا ہے۔ اتوار کے برت میں یہی مصلحت ہے ناکہ اس دن تم شہر نہیں جاسکتے؟"

مالتی کے سادہ اور سچے الفاظ سرنیدر کو لاجواب کرگئے۔ سرنیدر نے غیر ارادی طور پر تھال مالتی کے ہاتھ سے لے لیا پھر کچھ دیر سوچنے کے بعد کھانا شروع کردیا۔ مالتی دو اور پھلکے لے آئی بھرتہ اتنا لذیذ اور مزیدار بنا ہوا تھا کہ سرنیدر دیکھتے ہی دیکھتے سب کچھ ختم کرگیا۔

مالتی چولھے کے پاس جا بیٹھی کبھی کبھی وہ آنکھ بچاکر سرنیدر کو دیکھ لیتی اور پھر راکھ میں بجھتی ہوئی چنگاریوں میں نظر دوڑانے لگتی۔ وہ اپنی زندگی کا ان شراروں سے مقابلہ کررہی تھی۔ ایک دن وہ بھی ان کی طرح ٹمٹماکر بے نور ہوجائے گی۔

"بہت ہی اچھا پکا ہے بھرتہ، مالتی!" سرنیدر نے کھانا ختم کرتے ہوئے کہا "شکریہ! آج میں نے تمہیں بہت تکلیف دی ہے جیسی تم روپا ہو۔ ویسے ہی تمہارا کھانا بھی سندر ہے۔"

چولھے کے سامنے کھرپے سے راکھ کریدتے ہوئے مالتی نے کہا۔

"مجھ ابھاگن میں اب روپ کہاں۔ اگر میں سندر ہوتی تو میرے نصیب بھی بھلے ہوتے۔"

"مالتی یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو ہیرا عام لوگوں کی نظر میں صرف بلور کے برابر ہوتا ہے لیکن جوہری ہی اس کی قیمت کا اندازہ کرسکتا ہے کہ وہ کانچ ہے یا کچھ اور.... پھول اپنے لئے کچھ بھی نہیں لیکن مالی کی ساری دنیا اس کی ننھی ننھی پنکھڑیوں میں پوشیدہ ہے۔"

"اور اگر ہیرے کو جوہری نہ دیکھے اور پھول کو مالی نہ ملے تو ہیرا اور پھول ٹھیکری اور راکھ سے کیونکر بہتر بن سکتے ہیں؟" مالتی نے دبی ہوئی زبان میں کہا اور دو موٹے موٹے آنسو اس کی پلکوں سے ڈھلکر راکھ میں جذب ہوگئے جنہیں سرنیدر نہ دیکھ سکا۔

سرنیدر نے سرد آہ بھری اور چارپائی سے اٹھکر مالتی کے قریب آکر کھڑا ہوگیا۔ شہر کے ہوٹل میں کھانا کھاتے کھاتے سرنیدر اُکتا گیا تھا۔ اس کی صحت بھی پہلے سے کہیں گر چکی تھی مگر وہ سب کچھ مجبوری کی حالت میں کئے جارہا تھا۔ اسے اتفاقاً آج اس کا علاج بھی خود بخود نظر آگیا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے مالتی سے اس کی بابت سب کچھ کہدیا۔ وہ اس بات پر رضامند ہوگئی کہ صبح و شام وہ سرنیدر کے لئے کھانا تیار کردیا کریگی۔ سب اخراجات سرنیدر کے ذمے تھے۔ اب سرنیدر دفتر سے بہت جلد لوٹ آتا۔ وہ مالتی کے کاموں میں دلچسپی لینے لگا۔ مالتی نے بھی سیٹھ جی کے ہاں آنا جانا کم کردیا۔ سارا دن وہ سرنیدر کے کمرے کو صاف کرنے اور اس کے لئے کھانا تیار کرنے میں لگا دیتی۔ سرنیدر بھی اکثر دفعہ دفتر کا کام بعجلت نپٹا کر جلد گھر واپس آجاتا۔ اسے مالتی سے زیادہ دیر تک باتیں کرنے میں سکون محسوس ہوتا۔ سرنیدر اور مالتی دونوں آپس میں محبت کررہے تھے۔ کب سے؟ یہ دونوں میں سے کسی کو علم نہ تھا۔

ایک دن سرنیدر اور مالتی شام کے کھانے سے فارغ ہوکر آپس میں باتیں کررہے تھے۔ کہ باہر سے کسی نے مالتی کو زور سے آواز دی۔

"یہ کون ہے مالتی؟" سرنیدر نے کہا۔

"راجکمار معلوم ہوتا ہے"۔

سرنیدر راجکمار سے اچھی طرح واقف تھا۔ سیٹھ دولت رام کا بڑا لڑکا تھا۔ اس کی عمر کوئی تیس سال کے قریب ہوگی۔ سیٹھ جی نے دکان کا کاروبار زیادہ تر اس کے سپرد کردیا تھا۔ مالتی ننگے پاؤں دروازے کی طرف بھاگی اور پھر اُلٹے پاؤں واپس آگئی اور جوتا پہن کر چلنے ہی والی تھی کہ سرنیدر نے مالتی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ مالتی کے سارے جسم میں بجلی سی دوڑ گئی۔

"ذرا چھوڑ دیں راجکمار کے کہنے ہی جاؤں" مالتی نے کجائی ہوئی آواز میں کہا اور اپنا ہاتھ چھڑا کر باہر چلی گئی۔

سرنیدر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ طرح طرح کے شبہات اس کے دل میں سنبھانے لگے: وہ کیوں

ایک ایسی اجنبی لڑکی سے پریم کرنے کا حق رکھتا ہے جو..... نہیں نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا مالتی ایسی نہیں"۔ وہ مالتی کی زندگی پر جتنا غور کرتا اس کے تشکک میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ "وہ سال سے وہ اکیلی یہاں کس طرح دن کاٹ رہی ہے.... وہ عورت ہے ایک حسین نوجوان عورت سیٹھ جی نے اپنا مکان بغیر کرائے کے کیوں اسے دے رکھا ہے"۔ "آخر وہ اس جگہ سے کیوں کہیں اور طرف نہیں چلی گئی" "اس سے کوئی نہ کوئی رشتہ دار ضرور ہونگے" "وہ ہرگز ہرگز اکیلی ہی اس دنیا میں نہیں ہو سکتی" سریندر ایسے خیالات کے اضطراب میں اپنے کمرے میں جا کر ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔

مالتی بھاگتی ہوئی سیٹھ جی کے عالیشان مکان میں داخل ہوئی۔ اُسے راجکمار کے سونے کے کمرے کا بخوبی علم تھا لیکن آج پہلا موقعہ تھا کہ وہ کمرے کے اندر داخل ہو رہی تھی۔ وہاں لالٹین اور بستر جنہیں وہ جلانے اور بچھانے کے لئے گئی تھی اس کے جانے سے پیشتر ہی تیار تھے۔ لالٹین کی مدھم مدھم روشنی میں کمرے کی تمام اشیا دُھندلی دھندلی نظر آ رہی تھیں۔ لالٹین کی روشنی کو تیز کرتے ہی مالتی کو یاد آ گیا گھر کے تمام افراد سیٹھ جی کے بھتیجے کی شادی پر بلند پور گئے ہوئے ہیں مکان میں کوئی نوکر بھی موجود نہ تھا۔ دوسرے کمروں کی بھیانک تاریکی اور سائیں سائیں کی آواز سے مالتی کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ راجکمار کی چارپائی پر نئی ریشمی چادر بچھی ہوئی تھی۔ تکیئے کے پاس تازہ گلاب کے پھول اور دو موتیئے کے ہار پڑے تھے۔ مالتی کی آنکھوں میں تاریکی چھا گئی۔ "یہ پھول اور کلیاں یہاں کیوں پڑی ہیں"۔ "نئے نئے تکیئے اور چادریں اس سے پہلے مالتی نے یہاں کبھی نہ دیکھی تھیں" مالتی نے بستر کی چادر کو ہاتھ لگایا۔ اسے خیال تھا کہ اس کی آنکھیں دھوکا دے رہی ہیں مگر نہیں وہ دیکھنے میں غلطی نہیں کر رہی تھی اسے ڈر محسوس ہوا۔ چادر خود بخود اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ "اتنے بڑے مکان میں وہ اکیلی کیا کر رہی ہے" "وہ کب تک یہاں ٹھہریگی"۔ "راجکمار گھر والوں کے ہمراہ شادی پر کیوں نہیں گیا۔ یہ پھول اور ہار یہاں پر کیوں رکھے ہوئے ہیں"۔ مالتی نے اپنے ضمیر کی آواز کو سنا۔ جو اسے مکان سے بھاگ جانے کے لئے کہہ رہی تھی۔ مکان میں ٹھہرنا خطرے سے خالی نہیں وہ کانپ گئی اور پیشتر اس کے کہ راجکمار کے آنے کا انتظار کرتی وہ اپنے مکان کی طرف چلی گئی۔ اپنے کمرے میں قدم رکھتے ہی وہ چارپائی پر گر کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ سریندر جو اضطراب کی حالت میں اپنے کمرے میں گھوم رہا تھا مالتی کو پریشانی کی حالت میں مکان میں داخل ہوتے دیکھ کر مالتی کے کمرے کی طرف آیا وہ اسے زار زار روتے دیکھ کر سہم گیا۔ اس کے تشکک تحیر و اضطراب میں بدل گئے۔ سریندر اسی چارپائی پر بیٹھ گیا جہاں مالتی اپنی بیکسی پر آنسو بہا رہی تھی اس نے زور سے مالتی مالتی پکارا اور پھر مالتی کے شانوں کو پکڑ کر اس کا سر اپنے گھٹنوں پر رکھ لیا۔ چند لمحے جو بعد میں گذرے نہایت دردناک اور غم آلودہ تھے۔ مالتی کے آنسو تھمنے نہ رکتے تھے وہ بیگناہ تھی معصوم اور مظلوم۔ اس نے سیٹھ جی کے ہاں جو کچھ گذرا تھا صاف صاف کہدیا۔ مالتی کے موٹے موٹے چمکتے ہوئے آنسو سریندر کے دل کو بھی ساتھ ہی بہا لیگئے۔ رات آنکھوں آنکھوں میں کٹ گئی۔ سریندر کا دل اب گاؤں سے بھی اچاٹ ہو گیا۔ رات بھر مالتی اور سریندر اپنے مستقبل پر غور کرتے رہے صبح ہوئی سریندر مالتی کے ہمراہ بلند پور کو روانہ ہوا۔ راجکمار شرارت آمیز نگاہوں سے اپنے عالیشان مکان کے پھاٹک سے انہیں گھور رہا تھا۔

چھکڑے نے ہولے ہولے سفر طے کرنا شروع کیا اور اس کے پیچھے پیچھے اڑتی ہوئی گرد میں قصبے کے مکانات عہد ماضی کے گذرے ہوئے واقعات کی دھندلی سی تصویر کھینچ رہے تھے۔

منیر کمال بی اے (جالندھری)

ماہیّت عشق

عشق نے ایک دن سوال کیا
یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟

میری قسمت میں اضطراب ہے کیوں؟
جرم کیا ہے مری خطا کیا ہے؟

اک خلش سی ہے میرے پہلو میں
یہ شب و روز کی سزا کیا ہے؟

تیری دنیا میں غم نصیب ہوں کیوں؟
جورِ پیہم سے مدعا کیا ہے؟

خون ہوتا ہے آرزوؤں کا
مقصد جورِ ناروا کیا ہے؟

جبّہ سائی مری ہی قسمت میں
ایک مجھ ہی سے تو خفا کیا ہے؟

میری نس نس ہے درد سے نالاں
یہ مری آہ نارسا کیا ہے؟

بجلیاں دشمنِ نشیمن ہیں
خار و خس میں دھرا ہوا کیا ہے؟

شکوہ برلب تری جناب میں ہوں
کوئی کیا جانے کس عذاب میں ہوں

امین حزین سیالکوٹی

ایک آنے کی کسر

لائل پور میں ایک انجمن ترقی اردو قائم ہے۔ اس کے منتظمین ہر سال ایک شاندار ادبی جلسہ کیا کرتے ہیں جس میں تقریریں بھی ہوتی ہیں قراردادیں بھی منظور کی جاتی ہیں اور مشاعرہ بھی منعقد ہوتا ہے اس سال حفیظ جالندھری جگر مرادآبادی، ساغر نظامی احسان دانش، اوج بدایونی اور احمق پھپھوندوی نے شرکت کی۔

اس نیازمند کو بھی مدعو کیا گیا۔ انجمن کے سکرٹری نے مجھے دس روپے کا منی آرڈر بھیجکر لکھا تھا کہ یہ کرایہ ہے۔ باقی "خدمت" لائل پور پہنچنے پر کی جائیگی۔

۲۴ فروری کی صبح کو میں سٹیشن پر پہنچا لیکن خدا جانے مجھے دیر ہوگئی یا گاڑی کو کوئی جلدی کا کام آپڑا تھا وہ مجھے ساتھ لئے بغیر روانہ ہوگئی۔ اب دوسری گاڑی شام کو جاتی تھی۔ اس لئے میں نے سوچا کہ دفتر جاکر تھوڑا بہت دفتر کا کام بھی کرلوں اور دوپہر کے وقت لاری میں سوار ہوجاؤں گا دفتر پہنچا دفتر کا کام کیا۔ اس کے بعد جی میں آئی کہ ایک عدد "لقلقہ" بھی ساتھ لیتا جاؤں کیونکہ شاعروں میں "لقلقہ" کی نظموں کی فرمائش اکثر ہوا کرتی ہے۔ میں نے چپڑاسی کو رقعہ دے کر کہا کہ اردو اکیڈمی سے ایک جلد "لقلقہ" لے آؤ لیکن چپڑاسی لقلقہ لیکر اس وقت آیا جبکہ نہ لاری مل سکتی تھی نہ ٹرین میں مجبوراً گھر پہونچا۔

اگلے دن گھر سے روانہ ہوتے وقت سوچا کہ فالتو پیسے ساتھ لے جانے کی کیا ضرورت ہے؟ کرایہ اور چند آنے پان سیگرٹ کے لئے کافی ہونگے۔ چنانچہ یہی کیا اور ٹکٹ خرید کر ٹرین میں سوار ہوا۔ گاڑی میں دو لڑکے بیٹھے تھے۔ ٹرین کے ساتھ ٹی ٹی بھی تھے جب بے ٹکٹ لڑکوں کو ان کی موجودگی کا علم ہوا تو وہ آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے میں نے ان کی باتیں سن لیں وہ یہ کہہ رہے تھے کہ جب ٹی ٹی آئے تو ہم کہہ دیں کہ ہم فلاں ٹکٹ کلکٹر کے رشتہ دار ہیں۔ مجھے ان کی حالت پر رحم آرہا تھا اور میں دل میں خیال کر رہا تھا کہ ٹی ٹی ان کی بات نہیں مانیں گے اور بیچارے پکڑے جائیں گے۔

جڑانوالہ سٹیشن آنے ہی کو تھا کہ ایک ٹی ٹی ہمارے ڈبے میں آگیا جب چیک کرتے کرتے ان لڑکوں کے پاس پہنچا تو انہوں نے وہی کہا جو سوچ رکھا تھا۔ ٹی ٹی نے ان کو چھوڑ دیا اور میرے پاس آیا میں نے ٹکٹ دکھایا تو ٹی ٹی بولا کہ آپ نے بھنگ تو نہیں پی رکھی؟ میں نے حیرت سے پوچھا وہ کیوں؟ ٹی ٹی بولا کہ آپ کو شیخوپورہ سے ٹرین بدلنی چاہئے تھی۔ اتنے میں جڑانوالہ سٹیشن آگیا اور ٹی ٹی نے مجھ سے کہا کہ مہربانی کرکے نیچے اتریئے تاکہ آپ سے کرایہ چارج کیا جائے۔ میں نے ان لڑکوں کی طرف دیکھا جو بے ٹکٹ ہونے کے باوجود چھوڑ دیئے گئے تھے اور اب مجھے اپنے آپ پر رحم آنے لگا کہ باٹکٹ ہونے کے باوجود چور پکڑا گیا ہوں۔

پلیٹ فارم پر دوسرا ٹی ٹی بھی آگیا اور دونوں نے میرے معاملہ پر غور کیا اور خدا کا شکر ہے کہ یہ غور ہمدردانہ تھا مجھ سے کہا گیا کہ اگر آپ اس ٹرین کے ذریعہ لائل پور جانا چاہتے ہیں۔ تو آپ کو تین ساڑھے تین روپے اور دینے پڑیں گے۔ کیونکہ آپ شیخوپورہ سے جڑانوالہ تک بے ٹکٹ متصور ہونگے یہ کرایہ بھی معہ جرمانے کے وصول کیا جائیگا اور آگے وایا شور کوٹ لائل پور کا کرایہ بھی لیا جائے گا۔

میں یہ سنکر چکرا گیا کیونکہ میرے پاس فالتو پیسے نہ تھے میں نے عرض کیا کہ کوئی صورت میرے بچاؤ کی ہو بھی سکتی ہے؟ ایک ٹی ٹی نے ذرا سوچنے کے بعد کہا کہ آپ اسی اسٹیشن پر اتر جایئے اور جڑانوالہ سے لائل پور تک لاری کے ذریعہ پہنچیئے یہ تجویز سن کر میری جان میں جان آئی اور میں ان ٹی ٹی صاحبان کا شکریہ ادا کرکے روانہ ہوا لیکن میں نے سوچا کہ اگر گیٹ کے راستے باہر گیا۔ تو ممکن ہے ٹکٹ کلکٹر بھی مجھے شیخوپورہ سے جڑانوالہ تک بے ٹکٹ تصور کرکے کرایہ چارج کرے میں پلیٹ فارم کے ایک طرف چل پڑا۔ اور جنگلے کے اوپر سے باہر نکل گیا۔

موٹروں کے اڈہ پر پہنچکر میں نے دریافت کیا کہ لائل پور تک کا کرایہ کس قدر ہے؟ جواب ملا۔ چھ آنے۔ میں نے اپنی جیب کا معائنہ کیا تو پانچ آنے نکلے میرا رنگ فق ہوگیا کہ اب ایک آنہ کی کسر کہاں سے پوری کی جائے؟

ایک لاری تیار کھڑی تھی میں نے سوچا کہ ڈرائیور سے اپنی مصیبت بیان کروں شاید وہ پانچ آنے پر رضامند ہوجائے لیکن دل نہ مانا۔ کیونکہ یہ کام ڈرائیور کا نہ تھا بلکہ اس شخص کا جو سامنے بکنگ آفس میں ٹکٹ بیچ رہا تھا میں اس طرف گیا وہاں ٹکٹ خریدنے والوں کی بھیڑ تھی میں کھڑا ہو کر انتظار کرنے لگا کہ بھیڑ چھٹے تو بکنگ منشی سے عرض حال کروں لیکن بھیڑ کم ہونے کے بجائے بڑھتی ہی گئی۔

میں مایوس ہوگیا اور بازار کی طرف روانہ ہوا تاکہ کسی دکاندار سے اپنا قصہ غم بیان کرکے ایک آنہ حاصل کروں لیکن بازار تمام سنسان۔ جڑانوالہ میں مکمل ہڑتال تھی میں نے خیال کیا آنکھیں بند کرکے اور ہاتھ پھیلا کر سڑک کے ایک طرف کھڑا ہوجاؤں۔ شاید کسی کو "سفید پوش اندھے" پر رحم آجائے لیکن دل نے یہ بھی گوارا نہ کیا۔

پھر موٹروں کے اڈے پر پہنچا۔ اڈے کے متصل مٹی کے تیل کی ایک دکان تھی جس کے باہر تین چار کرسیاں پڑی تھیں اور دکان کے مالک ایک سکھ صاحب دھوپ میں اپنے کیس سکھا رہے تھے۔ دل نے چاہا کہ ایک آنہ ان سے مانگ لوں میں سوال کی غرض سے ان کے قریب گیا لیکن حوصلہ نہ پڑا اور واپس آگیا اس کے بعد دفعتہً یہ خیال سوجھا کیوں نہ سردار صاحب سے اخبارات کے ایجنٹ کا پتہ دریافت کیا جائے۔ اخباروں کے ایجنٹ میرے نام سے واقف ہی ہوں گے۔ اور ممکن ہے کہ وہ "شہباز" کا ایجنٹ بھی ہو جس میں میں کام کرتا ہوں۔

یہ بات سوچکر میں سردار صاحب کے پاس گیا میں نے پوچھا کہ کیوں سردار صاحب یہاں اخبارات کا ایجنٹ کہاں رہتا ہے؟ میری یہ بات سن کر سردار صاحب دکان کے اندر گئے اور اندر سے "ٹریبیون" اخبار لاکر میرے ہاتھ میں دیدیا اور کہا۔ لیجئے اخبار پڑھنا ہے تو یہ حاضر ہے اور یہاں کسی ایجنٹ وغیرہ کی دکان نہیں۔ ایک دو ہاکر ہیں وہی چل پھر کر اخبار بیچتے ہیں۔

میری یہ اسکیم بھی ناکام رہی اور میں اخبار لے کر کرسی پر بیٹھ گیا سردار صاحب سمجھ رہے تھے کہ میں اخبار پڑھنے کا بڑا شوقین ہوں اور اخبار کے مطالعہ میں غرق ہوگیا ہوں لیکن میں دل میں ایک آنہ پیدا کرنے کی تجاویز سوچ رہا تھا۔ سردار صاحب نے آخر مجھ سے پوچھا کہ کہاں سے آئے ہیں کہاں جائیں گے اور کیا کام کرتے ہیں میں نے عرض کیا کہ لاہور سے آیا ہوں۔ لائل پور جاؤں گا

اور اخبار نویس ہوں "شہباز" کا جائینٹ ایڈیٹر ہوں۔ اتنے میں سردار صاحب نے ایک آدمی کو جو ادھر سے گذر رہا تھا آواز دی اور کہا کہ ادھر آؤ۔ یہ ایڈیٹر صاحب بیٹھے ہیں ان سے ملاقات کرو۔ ان مہاشہ جی نے گاندھی ٹوپی پہن رکھی تھی۔ ان سے ملاقات ہوئی کہنے لگے کہ یہاں میں اخبارات بیچتا ہوں پھر انہوں نے نام پوچھا۔ تو میں نے کہا کہ حاجی لق لق۔ اس پر تو مہاشہ جی اچھل پڑے اور کہا کہ آپ کے درشن کہاں پائیے ؛ وہ تو میری خیر خیریت پوچھ رہے تھے اور میں یہ سوچ رہا تھا کہ ایک آنہ کس طرح مانگوں ؟

سڑک کے پار ایک مکان سے ایک اور سردار صاحب نکلے مہاشہ جی نے ان کو بھی آواز دی اور کہا کہ آئیے آپ کو ایک مشہور ہستی کے درشن کرائیں۔ یہ سردار صاحب بھی آئے اور تعارف ہوا سردار جی بولے کہ آپ کو مل کر بے حد خوشی ہوئی میں یہاں یونائیٹڈ پریس کا نمائندہ ہوں اور ایک عدد چھاپہ خانہ بھی رکھتا ہوں میں نے بھی خوشی کا اظہار کیا۔

سردار امر سنگھ (یہ ان کا نام تھا) ہاتھ جوڑ کر بولے کہ کیا خدمت کروں ؟ جی میں آئی کہ کہہ دوں ایک آنہ عنایت کرو لیکن پھر سوچا کہ ذرا صبر سے کام لو۔ سردار امر سنگھ یہ کہہ کر چل دیئے۔ کہ ابھی حاضر ہوتا ہوں چند منٹ کے بعد سردار صاحب آئے ان کے ہاتھ میں ایک تھال تھا جس میں حلوا۔ پوری اچار اور گوبھی کا پلاؤ تھا میں نے سردار صاحب کا شکریہ ادا کر کے یہ چیزیں کھانی شروع کر دیں لیکن ساتھ ہی ساتھ سوچتا جا رہا تھا کہ آنہ کس طرح مانگوں ؟ لاری جا چکی تھی۔ اور دوسری تیار تھی سردار صاحب یہ کہکر لاری کی طرف چلے گئے کہ میں آپ کے لئے سیٹ رکھوالوں۔

سردار صاحب سیٹ رکھوا آئے اور کہنے لگے کہ آپ نے ٹکٹ خرید لیا ہے ؟ میں نے کہا کہ ابھی نہیں۔ آپ بولے کہ لالیئے مجھے پیسے دیجئے میں ٹکٹ لے آؤں۔ اب میرا رنگ اڑ گیا۔ بہرحال میں نے کوٹ کی اوپر والی جیب سے پانچ آنے نکال کر سردار صاحب کے ہاتھ میں دیدیئے انہوں نے کہا کہ یہ تو پانچ آنے ہیں۔ لائل پور کے چھ آنے لگتے ہیں یہاں میرے دماغ نے تھوڑا بہت کام کیا میں نے حلوا پوری کی چکناہٹ سے بھرا ہوا ہاتھ دکھا کے کہا کہ کھانے سے فارغ ہولوں نوٹ اندر کی جیب میں ہیں اور چکنے ہاتھ نہیں لگنے چاہیئں۔

سردار صاحب بولے کہ پروا نہیں۔ ایک آنہ میں ڈال دیتا ہوں۔ سردار صاحب یہ کہہ کر بکنگ آفس کی طرف چلے گئے اور میری جان میں جان آئی۔ اس دن سے میں نے کان کو ہاتھ لگا لیا ہے کہ سفر میں فالتو پیسے ضرور پاس ہونے چاہئیں۔

حاجی لق لق

غزل

کیا ہے بساطِ آسماں خاکِ وطن کے سامنے
ہیچ ہے جوئے کہکشاں گنگ و جمن کے سامنے

ٹوٹ چکا ہے ہند میں جادوئے ساحرِ فرنگ
منزلِ حریت ہے آج اہلِ وطن کے سامنے

کیا ہے قفس کی زندگی مرغِ چمن کو کیا خبر
مرغِ قفس فغاں نہ کر مرغِ چمن کے سامنے

مجھکو ہے جاں سے بھی عزیز گفتۂ برتری ہری[1]
ہیچ ہے اوجِ قیصری ذوقِ سخن کے سامنے

اوس سی ان پہ پڑ گئی جب ہوا تذکرہ ترا
لالہ و گل کے روبرو سرو و سمن کے سامنے

جگن ناتھ آزاد

[1] قدیم ہندوستان کا ایک مہاراجہ جس نے دنیا سے دل برداشتہ ہو کر فقیری اختیار کر لی تھی علامہ اقبالؒ اور مرحوم کی بدولت برتری ہری کو اردو ادب میں بقائے دوام حاصل ہو چکی ہے (د)

"محبت فراموش سے"

اپنے کوچہ کی ہواؤں کو مقید کر لو

تم ہی جب روٹھ گئیں زیست کا حاصل کیا ہے
حسرتیں جس میں پشیمان ہوں وہ دل کیا ہے
چھین لو اپنے تصور کی بھی دنیا مجھ سے
خون ارمانوں کا دیکھا نہیں جاتا مجھ سے
مجھ سے برہم ہو تو پھر خواب میں آتی کیوں ہو
آرزو بن کے خیالوں میں سماتی کیوں ہو
اپنی تصویر سے کہدو کہ وہ پردا کر لے
میرے غم خانۂ الفت سے کنارا کر لے
یاد کو اپنی یہ سمجھاؤ کہ آیا نہ کرے
کسی مایوس تمنا کو ستایا نہ کرے
رازِ الفت کے امیں۔ آہ وہ پرزے جن پر
جم کے رہ جاتی ہے اب بھی مری مایوس نظر
میری تقدیر سے وابستہ کیا تھا جن کو
ان محبت کے نوشتوں کو بھی واپس کر لو
میری برباد جوانی کو یونہی رہنے دو
اور کچھ روز زمانے کے ستم سہنے دو
گر غم عشق کے ہنگاموں سے اکتاؤں گا
بزمِ ہستی سے کہیں دور چلا جاؤں گا

اپنے کوچہ کی ہواؤں کو مقید کر لو

محمد حفیظ قیصر نجیب آبادی

ارمان

(ایک آزاد نظم)

چند موہوم سی شکلیں میرے ارمانوں کی
روشنی جن کو ملی شام و سحر
تیرے رخساروں کی تابانی سے
اور آخر وہ جواں سال ہوئے
جس طرح دشت کی تاریک سی ویرانی میں
اک خیاباں کے جلو میں اے دوست!
پھول اُگ آئے کہیں
اور وہ دشت کو فردوس بداماں کر دے
موتی شبنم کے ہوا جس پہ گرا دیتی ہے
آگ کو آب بنا دیتی ہے۔
میرے ارمانوں کو مٹاؤ نہ ابھی
جس طرح زلزلے اک پل میں مٹا دیتے ہیں
پچھلی صدیوں کے نشاں
نہیں بجھتا ہے مگر
ان سے مٹی کا دیا
تنگ و تاریک سی کٹیا میں کہیں
روحِ مزدور جہاں
مشتعل بھوک سے ہو کر آخر
موت سے کلہ بہ کلہ ہو جائے
اس طرح میری تمنائیں فروزاں رہ جائیں
لیکن ایسا ہو کبھی
بھیگتی رات کے وقت
تو مرے دھیان سے ڈر کر اُٹھے
اور لبِ بام کے نزدیک آئے
میں جہاں منتظرِ فردا ہوں
چند شکلیں میرے ارمانوں کی
یاد میں گم ہیں جہاں تیرے شبستانوں کی

منیر کمال

دُکاندار

ایتی کو ابھی نفع و نقصان کی سمجھ ہی نہ تھی۔ کہ باپ نے اسے اپنی ہی دُکان پر بٹھا دیا وہ دکاندار کا لڑکا نہ ہوتا۔ تو شاید اسے اسکول میں داخل کر دیا جاتا۔ سکول میں جانے والا لڑکا خرید و فروخت اور نفع نقصان کے معمولی قاعدے جاننے میں بھی سات آٹھ سال لگا دیتا ہے مگر دکان پر بیٹھا ہوا بچہ ایک دو سال میں اِن باتوں کی اچھی جانچ اور پرکھ پیدا کر لیتا ہے یہی خیال تھا جس نے ایتی کے باپ کو مجبور کیا تھا پہلے پہل ایتی چھوٹی موٹی چیزیں اٹھا دیتا۔ اگر کوئی خریدار خریدنے سے انکاری ہوتا تو وہ انہیں واپس ان کی جگہ پر رکھ دیتا۔ مگر جوں جوں وہ بڑا ہوتا گیا۔ اس کا ہاتھ زیادہ تیزی اور زیادہ احتیاط سے کام کرنے لگا بعض اوقات اپنے باپ کی غیر موجودگی میں وہ چھوٹی موٹی چیز بھی بیچ بیٹھتا۔ اور وہ دن بھی جلد آگئے جب اس کا باپ ناغہ کر دیتا اور ایتی دکان چلاتا رہتا۔

جس طرح کنوئیں میں رہنے والی مینڈک کی دنیا کنوئیں کی گولائی اور گہرائی تک محدود ہوتی ہے۔ اسی طرح ایتی کی دنیا بھی گھر کی چار دیواری' دکان اور دکان تک جانے والی سڑک تک محدود تھی۔ اگر وہ بچپنے سے دکان پر نہ بیٹھتا۔ تو شاید وہ شہر کی گلی گلی سے واقف ہوتا اور شاید وہ ان گھروں کو بھی جانتا جن میں یونہی برتن بجتے رہتے ہیں یا جن کی بالائی منزل کی کھڑکیاں خاص خاص وقت پر کھلتی رہتی ہیں۔

ایتی کے غدود اور اعصاب پختگی کو پہنچ رہے تھے اس کا دل کسی کو چاہ رہا تھا۔ اس کی نظر میں بھوکی بھوکی نظر آتی تھیں۔ اس کے دماغ میں تخیلات کے طوفان پیدا ہو گئے تھے۔ اس کی ہر حرکت کچھ انداز لئے ہوئے تھی۔ اور یہ سب چیزیں عروج پر ہوتیں۔ جب وہ بالکل آزاد ہوتا مگر باپ کی موجودگی میں گھٹا گھٹا سا رہتا تھا جس طرح ایک بڑے درخت کے نیچے ایک چھوٹا سا درخت۔ درحقیقت وہ دکان کا مالک ہی تھا مگر اس کو اس بات کا احساس اس وقت ہوتا جب وہ تنہا دکان پر ہوتا۔

اس کی روکھی پھیکی زندگی میں اس دن رنگینی آئی تھی جب اس کے ہاتھ سے آئینہ گر کر ٹوٹ گیا تھا خریدار فرنگی لباس پہنے ہوئے تھے۔ اور اس کے ساتھ اس کی لڑکی تھی۔ لڑکی میں کوئی خاص جاذبیت نہیں تھی نہ ہی وہ جوان تھی۔ اور نہ ہی خوبصورت تھی مگر ایتی کی نظروں اس کے ہاتھوں اور اس کے ذہن نے جو بغاوت کرنی تھی سو کر دی اس نے غیر ارادی طور پر آئینہ اٹھایا تھا اس لئے اس کا گرنا قریب قریب یقینی تھا۔ اور شیشہ گر کر بچ جائے یہ انسان کے اختیار میں نہیں۔ لڑکی کے ہونٹوں پر شرارت آمیز ہنسی دوڑ گئی تھی۔ شاید شعور نے اسے ابھی تک نہیں چھوا تھا مگر ایتی کا باپ معاملے کی اتنی گہرائی تک چلا گیا تھا جہاں تک اسے اتنی جلدی نہیں پہنچنا تھا۔ شاید ایتی کا یہ تساہل کسی اور اسباب کا نتیجہ ہو؟ مگر ایتی کے باپ کے ذہن پر یہ بات گہری کُھد گئی تھی کہ جب ایتی بچہ تھا تو اس کے ہاتھ سے کیوں کوئی چیز نہیں ٹوٹی تھی۔ وہ سمجھ رہا تھا۔ کہ ایتی کے ہونے والے جیون ناٹک کا پردہ اُٹھ چکا ہے مگر وہ یہ نہیں سمجھ سکا تھا کہ کسی نے سوکھی لکڑی پر تیل تو ڈال دیا ہے مگر آگ کسی اور نے دکھائی ہے۔

ایتی جو خلا محسوس کر رہا تھا۔ اس کا باپ اسے پُر کرنا چاہتا تھا سماجی روایات اور رسومات کچھ ایسی چیزیں تھیں جنہیں راستے سے ہٹانے میں وقت لگتا ہے۔ ایتی کا باپ ان کے ہٹانے میں لگ گیا تھا۔ مگر قدرت نے اسے ہی دنیا کی سٹیج سے ہٹا دیا اور وہ کام جو وہ کرنے والا تھا۔ کچھ عرصہ کے لئے رُک گیا۔ ایتی کی بہن تھی۔ اس کی ماں تھی۔ دادی تھی مگر وہ اپنے باپ کی دکان کا اکیلا مالک تھا۔

کچھ دنوں تک دکان بند رہی تھی۔ کھولی تو نئی طرز پر سجا دی۔ ہر چیز میں کشش کی چنگاریاں بھر دیں۔ صفائی اور قرینہ دو پہئے تھے جن سے وہ اپنی دکان کی گاڑی چلانا چاہتا تھا خریداروں کا ہجوم اس لئے بھی لگ جاتا کہ دیکھیں باپ کی دکان بیٹا کس طرح چلاتا ہے مگر ایتی ہر خریدار سے اس طرح پیش آتا کہ وہ اس کے باپ کو بھول جانا چاہتے۔ کیونکہ اس کے باپ کے رویہ میں جو تلخی اور اس کی آواز میں جو ترشی تھی وہ ایتی میں نہ تھی۔ ایتی جو پہلے ان خریداروں کو محض چلتے پھرتے پتلے سمجھتا تھا۔ اب ان میں زندگی اور احساسات پاتا تھا۔ پہلے اگر کوئی گاہک آتا تھا تو وہ اسکی طرف توجہ ہی نہ کرتا تھا بلکہ اس کے کان۔ اس کے قدم اس کی آنکھیں اور اس کے ہاتھ اپنے اپنے کام میں لگ جاتے تھے مگر ایتی وہ پہلا ایتی نہ تھا۔ اب اس کی دنیا بدل چکی تھی جب اس کی زبان گاہک سے پوچھتی "کیا چاہئے حضرت؟" تو اس کا دل مچل اُٹھتا۔ اس کا دل پوچھتا "میرے لئے بھی کچھ لائے ہیں؟" کیونکہ اب وہ چاہتا تھا کہ دکان پر کوئی آئے اور اسے خرید جائے۔ نفع و نقصان کے جاننے والا ایتی جان بوجھ کر اپنے آپ کو خسارے میں ڈالنا چاہتا تھا۔ کاش وہ سکول جاتا تو اتنی بڑی غلطی کا مرتکب ہونا نہ چاہتا مگر نہیں سکول کے لڑکے بھی تو غلطی کر بیٹھتے ہیں۔ وہ ہر خریدار میں کچھ یگانگت محسوس کرتا تھا وہ خریداروں کی ذہنیتوں کو پڑھتا رہتا تھا۔ نہ جانے کیوں؟

جوں جوں دنوں کا ذخیرہ بڑھتا جاتا تھا۔ اس کی پونجی بھی زیادہ اور زیادہ ہوتی جاتی تھی۔ اب وہ ایتی نہیں رہا تھا بلکہ افتخار بن گیا تھا متوسط درجہ کا دکاندار مگر اس کا اخلاق۔ اس کا حسن سلوک اور اس کی خوش کلامی۔ یہ سب چیزیں اس کو بڑے سوداگروں کی سی منزلت پر لے آئی تھیں۔ لوگ اسے قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے وہ شہر کی دوسری دکانیں چھوڑ کر اکثر اس کی دکان پر آتے اور خوش خوش مطلوبہ چیزیں لے کر واپس جاتے۔

افتخار کے ذہن پر کبھی ایک دھندلا خاکہ بیٹھ گیا تھا۔ اب وہ اجاگر ہو رہا تھا۔ وہ سوچتا کہ وہی فرنگی لباس والا خریدار اپنی لڑکی کے ساتھ ایک دفعہ پھر ضرور آئیگا۔ اس خیال کی پختگی کے ساتھ وہ یہ بھی سوچتا تھا کہ شاید وہ نہ آئے۔ شاید وہ کوئی مسافر ہو۔ یا اگر وہ آئے تو اپنی لڑکی کو ساتھ نہ لائے۔ وہ اب جوان ہو گئی ہو گی اور اس کی مرضی کے خلاف اس کی شادی بھی ہو گئی ہو گی اور اس کی مرضی کے خلاف اس کی شادی بھی ہو گئی ہو گی۔ مگر وہ اس سلسلہ تخیلات کو بہت جلد توڑ دیتا۔ کیونکہ اسے اس لڑکی سے محبت نہیں تھی۔ وہ واقعہ تو ایک معمولی واقعہ تھا کیونکہ اس لڑکی نے کوئی جادو نہیں کیا تھا۔ وہ ایک چنچل لڑکی ضرور تھی شرارت سوجھی اور ہنس پڑی تھی اور بس۔ اور ویسے بھی مکتب عشق میں نہ پڑھنے والی لڑکی کی ہنسی مہمل ہوتی ہے۔ ایسے خیال آتے اور لوٹ جاتے۔ کہ

وہ خیال کرتا کہ اس کی دکان پر لڑکیاں کیوں نہیں آتیں۔ وہ خود آکر اپنے انتخاب کی چیزیں کیوں نہیں لیتیں وہ نوکروں نوکریوں کو کیوں مفت کے چکر لگواتی ہیں۔ اس قسم کی پریشان خیالیوں نے اسے گھیر رکھا تھا۔

شام کو جب دکان بند کر کے گھر آتا۔ تو وہ پہلے رستے پر سے نہ آتا۔ بلکہ بڑے بازار میں سے چکر مار کر آتا۔ چلتے وقت اس کی نظریں چھوٹی چھوٹی گلیوں اور تنگ کوچوں میں دوڑ جاتیں۔ وہ اب نظروں سے زیادہ کام لیتا تھا۔ اس کی ان حرکات سے معلوم دیتا کہ اس نے کوئی چیز کھو دی ہے حالانکہ اس نے ابھی وہ قیمتی اور عزیز چیز کھوئی نہیں تھی بلکہ کھو دینا چاہتا تھا۔

اس کی ان ذہنی اور جسمانی تبدیلیوں کو اس کی ماں دیکھتی۔ وہ ایک عورت تھی کیا کر سکتی تھی۔ اس کا جی چاہتا کہ وہ ضرور کوشش کرے کیونکہ ماں کو بہو کی ضرورت تھی اور بیٹے کا جیون اجیرن تھا۔ مگر دونوں نے ایک دوسرے کو من کی بات نہ بتائی بہن کو بھی بھابی کی چاہ تھی چھوٹی لڑکی کب چپ رہنے والی تھی۔ باتوں باتوں میں بھابی کا نام لے گئی۔ افتخار نے محسوس کیا کہ اس کے من کے ایک تارے میں خدا نے دوسرا تار لگا دیا ہے۔ اب ایک آواز کی بجائے دو آوازیں نکلکر ایک کیف آور موسیقی پیدا کریں گی جب دونوں اکیلے ہوتے تو بھابی کی باتیں ہوتیں۔ کہتا "جیجی تمہاری بھابی کیسی ہوگی؟" جیجی کہتی "تم جیسی خوبصورت ہوگی" کہتا "میں تو خوبصورت نہیں ہوں" کہتی "میری بھابی تو ضرور خوبصورت ہوگی"۔ مگر افتخار محض ان باتوں سے جی بہلاتا تھا۔ حقیقت میں وہ خود بھی نہیں جانتا تھا کہ جیجی کی بھابی کیسی ہوگی۔ وہ کہاں سے آئیگی۔ آیا وہ آئیگی بھی یا نہیں ہزاروں ایسی باتیں تھیں جو ممکنات اور ناممکنات کی حامل تھیں۔

ہفتہ بھر میں صرف ایک دن دکان بند ہوتی مگر وہ چھٹی کا دن بے لطف سا گذر جاتا افتخار کا جی چاہتا تھا کہ وہ دکان کبھی بند ہی نہ کرے کیونکہ گھر میں اس کے لئے کچھ نہ تھا۔ جیجی تھی دل بہلانے کو مگر وہ بھی منہ پھٹ تھی۔ ڈھنڈورہ تھی۔ ذرا بات ہوئی اور ماں کے کانوں تک پہنچی۔ افتخار اس سے بہت کم باتیں کرتا۔ ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ افتخار یونہی چھت پر چڑھ گیا۔ کیا دیکھتا ہے کہ گلی کے موڑ والے مکان کی دوسری منزل میں کھڑکی کے سامنے ایک دوشیزہ شیشہ ہاتھ میں لئے تزئین حسن کر رہی تھی افتخار کی نظریں جم گئیں جس طرح مقناطیس پر لوہا۔ وہ مجسمۂ حسن تغافل ہی بہت دیر تک ٹھہری رہی وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ اپنے حسن کا نظارہ کرنے والی صرف خود ہی نہیں بلکہ ایک جوہری کی نظریں بھی اس ہیرے پر ٹکی ہوئی تھیں۔ وہ کچھ دیر تک وہاں ٹھہری رہی پھر کھڑکی سے ہٹ گئی۔ شاید قدرت افتخار کی نظروں کا اشتیاق اور زیادہ بڑھانا چاہتی تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ ایک حسین خواب دیکھ رہا تھا۔

دوسرے دن افتخار چھت پر گیا مگر وہ کھڑکی ہی بند تھی۔ نظارگی میں ایک ٹھوس پردہ حائل تھا۔ اسے ہٹانا اس کے بس میں نہ تھا مگر وہ اس کھڑکی کے پٹ کھلنے کا منتظر ضرور تھا اتنے میں جیجی دوڑتی اوپر آگئی۔ افتخار نے فوراً کہدیا "دیکھو جیجی یہ چھوٹا سا شہر بھی کتنا بڑا نظر آتا ہے وہ دیکھو سامنے والا مکان کتنا خوبصورت معلوم دیتا ہے بالکل موڑ پر"۔ جیجی کیا جانے یہ باتیں۔ کہنے لگی "وہ تو پرانا ہے" کہنے لگا "کاش میں اپنی نظریں تمہیں دے سکتا"۔ مگر جیجی بچی تھی نہ سمجھ سکی۔ دکان پر جانے کا وقت نکل چکا تھا۔ ماں نے نیچے سے پکارا "کیا کر رہے ہو اوپر؟" اس سوال کا جواب تو تھا مگر جیجی نہ جانتی تھی اور افتخار کہہ نہیں سکتا تھا۔ اس لئے وہ چپ چاپ نیچے اتر آئے۔

افتخار دکان پر تو جا بیٹھا مگر اپنا دل چھت پر چھوڑ آیا تھا۔ مضطرب اور منتظر! دکان پر حسب معمول گاہکوں کا ہجوم ہو گیا مگر افتخار چاہتا تھا کہ آج کوئی دکان پر ہی نہ آئے۔ کیونکہ آج اس نے اپنا سودا کرنا تھا۔ مگر گاہکوں کو اس کے لین دین سے کیا سروکار؟ وہ تو یہی جانتے تھے کہ دن کا اجالا خرید و فروخت اور تن کے دھندوں کے لئے ہے۔ وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ افتخار کا من کیا چاہتا ہے۔ آج افتخار کھویا کھویا سا تھا۔ وہ پہلی سی مروت، وہ پہلا سا رویہ آج کچھ بدلا بدلا سا تھا۔ گاہک اس کے دل کی پہنائیوں کو نہیں پہنچ سکتے تھے۔ افتخار کے لئے آج دن اتنا لمبا ہو گیا تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ دو دن اکٹھے ہو گئے ہیں۔ آج بھی اس کے ہاتھ سے لمپ کی چمنی گرتی گرتی بچی سا سے وہ پرانا واقعہ یاد آگیا تھا۔ کاش آج کوئی ہوتا اور اس کی اس حماقت پر ہنس دیتا سو ہی کھڑکی والی ساحرہ ہوتی؟

کئی دن آئے اور افتخار کی بدحواسیوں پر ہنس ہنس کر چلے گئے۔

ایک نہ ایک دن کھڑکی کھلنی تھی سو کھلی۔ وہی ساحرہ اپنی آرائش میں مگن تھی مگر اب کے افتخار کی طرف اس کی پیٹھ تھی۔ اس کے شیشہ سامنے کمرے میں یا میز پر رکھا ہوا تھا یا کسی دوسری چیز پر لیکن وہ اتنا اونچا تھا کہ افتخار کا عکس اس میں صاف آگیا۔ وہ گھبرا کر مڑی تو افتخار کو انتظار میں پایا۔ وہ شرما گئی اور اس نے کھڑکی کا ایک رخ بند کر دیا۔ وہ کتنی دفعہ کھڑکی کھول کر اپنے آپ کو سنوارتی رہتی تھی کبھی کبھی والہانہ حرکات بھی کر بیٹھتی تھی۔ وہ اکثر کھڑکی میں کھڑی ہو کر گنگناتی رہتی تھی۔ وہ آج اپنی ان باتوں پر بہت نادم تھی۔ اس کی اس ندامت کو نسوانیت نے اور بھی تیز کر دیا تھا۔ کاش وہ جانتی کہ افتخار نے صرف ایکبار اسے پہلے دیکھا ہے۔ ادھر افتخار کو معلوم ہو رہا تھا کہ وہ ہوائیں اڑ رہا ہے۔ اس کی خوشی کی انتہا ہو رہی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کھڑکی کا ایک رخ کھلا ہے وہ ضرور اس کے سامنے سے گذرے گی یا وہ کھڑکی کو بالکل بند کرنے کی کوشش کرے گی۔ اتنے میں جیجی نے اسے چونکا دیا۔ شاید ماں نے اسے جاسوسی کے لئے بھیجا ہو یا وہ خود ہی آگئی ہو لیکن وہ جونہی اوپر آئی۔ تو کیا دیکھتی ہے کہ سامنے والے مکان کی کھڑکی سے ایک عورت گذری ہے اور بھائی نے اسے دیکھا بھی ہے۔ جیجی اس سے کوئی نتیجہ اخذ نہ کر سکی لیکن یہ ایک سین تھا۔ جو اس کی نظروں کی پلیٹ پر اتر آیا تھا اور شاید کبھی یہ سین اجاگر ہو کر اس کے ذہن میں بیٹھ جائے۔

اب روزانہ یہ دکان کھلتی اور لوٹنے والے متاع سکون لوٹ کر لے جاتے۔ افتخار اپنے نفع و نقصان سے بے پروا ہو چکا تھا۔ وہ چاہتا ہی یہی تھا۔ مکان میں دھواں جتنا بند کرو آخر کسی نہ کسی سوراخ سے نکل پڑے گا۔ یہ بات بھی چھپنے کی نہ تھی۔ ماں کو خبر ہو گئی۔ مگر وہ بے پروائی اور لاعلمی ظاہر کرتی رہتی۔ ایک دن ماں بھی اپنے من کی بات کو نہ دبا سکی کہنے لگی "بیٹا کہو تو اڑوس پڑوس میں راہ و رسم قائم کروں۔ آخر کب تک یہ حویلی دلہن کے قدموں کو ترستی رہے گی" بیٹے کی خاموشی نے اسے اجازت دی مگر بیٹا دن بھر یہی سوچتا رہا۔ کہ ماں کہاں جائے گی۔ وہ چاہتا تھا کہ دوسرے تمام راستے بند ہو جائیں۔ اور ماں سیدھی سامنے والے مکان میں جا پہنچے۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ کہدے جو اس کا جی کہنا چاہتا تھا مگر نہیں کہہ سکتا تھا۔ لیکن کچھ دنوں کے بعد جب ماں نے یہ کہا کہ موڑ والے مکان میں ایک لڑکی رہتی ہے۔ تو اس نے چاہا کہ فضا کی پہنائیوں میں ایک جست لگا دے۔ اور کائنات کے ذرے ذرے کو اپنی مسرت کا مژدہ سنا دے اور پھر ماں کے پاؤں میں گر جائے اور کہے "والدین اپنے بیٹے کی بھلائی میں ہوتے ہیں۔ ماں جو ہو تم مانگو ہم کچھ نہیں کہیں گے تم جانو تمہاری بہو جانے" ماں اپنی خوشی کا اندازہ خود بھی نہیں کر سکی تھی۔

اب دونوں گھروں میں آنا جانا شروع ہو گیا جیجی بھی دن بھر ہونے والی بھابی کے

پاس رہتی۔ افتخار کے سسرال کسی دوسرے ضلع کے تھے مگر نوکری کے بارے میں یہاں آئے ہوئے تھے اور کافی عرصے تک آمد و رفت نہ ہونے کی وجہ سے اپنے رشتہ داروں سے ان کے تعلقات منقطع ہو چکے تھے وہ گھر میں جوان بیٹی بٹھانا نہیں چاہتے تھے جب انہوں نے یہ پیغام سنا اور دیکھا کہ افتخار ایک اچھا دکاندار ہے اس کی آئندہ ترقی کے کافی توقعات ہیں اور مستقبل قریب میں ایک بڑا سوداگر بن جائے گا۔ تو انہوں نے یہی سوچا کہ بیٹی کی بھلائی اسی میں ہے کہ یہ پیام رد نہ کیا جائے اور وہ خود بھی بوڑھے ہو چکے تھے۔ وہ اس بار کو اٹھا دینا چاہتے تھے۔ دونوں ہی گھروں میں تیاریاں شروع ہو گئیں۔

گذرنے والے دنوں کی ایک رات کو تین بجے کے قریب یہ خبر آگ کی طرح شہر میں پھیل گئی کہ تین دکانیں بیک وقت جل کر ڈھیر ہو گئی ہیں۔ ان تین دکانوں میں سے درمیان والی افتخار کی دکان تھی۔ چھوٹے سے شہر میں دکانوں کی حفاظت کا خاص انتظام نہیں تھا پہرہ دار کو بھی اس وقت خبر لگی جب آگ قابو سے باہر ہو چکی تھی۔ دکانیں تو جل گئیں مگر ایک دوسرا طوفان اٹھا گئیں۔ تینوں دکانداروں نے ایک دوسرے پر مقدمہ کھڑا کر دیا۔ ہر ایک دوسرے پر یہ اعتراض کرتا کہ آگ اس کی بے توجہی اور بے احتیاطی سے لگی ہے۔ دونوں طرف سے رہی سہی پونجی بھی راکھ ہونے لگی۔ آخرکار سرکار نے جب یہ دیکھا کہ قصور کسی پر ثابت نہیں ہو سکتا اور وہ خواہ مخواہ تباہی کے گڑھے میں گر رہے ہیں تو مقدمہ بند کر دیا۔

غم کی گھٹائیں چاروں طرف سے گھر کر آتی ہیں افتخار ابھی اپنی رہی سہی پونجی کو اپنے ہاتھوں بہا کر کف افسوس مل رہا تھا کہ ایک اور دھکا لگا۔ کسی نے آ کر کہا کہ ہونے والے سسرال نے اپنی بیٹی کا نکاح شہر کے ایک متمول اور حاکم شخص سے کر دیا ہے۔ افتخار کے سر پر کوئی ہتھوڑا مار دیتا مگر یہ خبر نہ سناتا۔ بوڑھی ماں جس کی شمع حیات آخری جھکولے کھا رہی تھی سہم گئی۔ کاش کوئی کسان کے تیار شدہ کھیتوں کو اولوں سے تباہ ہوتے دیکھتا وہ دوڑی دوڑی ان کے گھر گئی۔ دیکھا کہ جیجی کو حکم مل رہا ہے کہ وہ آئندہ ان کے گھر نہ آیا کرے۔ بچی بے سمجھ تھی۔ اس کے پاس ایک بے لوث دل تھا وہ بھابی چاہتی تھی۔ وہ یہ نہیں سمجھ سکتی تھی کہ بھابی والے اسے نند بنانا نہیں چاہتے۔ بوڑھی بھی ٹھٹک گئی۔ اور منہ سے کچھ نہ کہہ سکی۔ وہ بولے "والدین اپنی اولاد کو راکھ میں دبانا نہیں چاہتے۔ ہم نہیں چاہتے کہ ہماری بیٹی اس گھر میں جائے جہاں سینہ جلانے کے لئے آتش غم و افسوس سلگ رہی ہے۔ ہم شادی کر رہے تھے دکاندار سے، افتخار سے نہیں۔"

بوڑھی ماں کی زبان کسی نے پکڑ لی تھی۔

افتخار سوچ رہا تھا "کاش وہ دکاندار نہ ہوتا"

دلشاد کلانچوی ایم اے

غزل نگار

حضرات کی خدمت میں گذارش ہے کہ رسالہ میں جگہ کی قلت کے باعث صرف سات اشعار کی غزل درج ہو سکتی ہے۔ لہذا صرف سات اشعار ہی بھیجئے۔

مدیر

غزل

میری بربادی کے سبب۔ تجھ کو خدا رکھے آباد
میری عبادت، میری نماز۔ تیری باتیں، تیری یاد

بھول گیا ہستی کے غم۔ اے غم جاناں! زندہ باد
میرا ہنسنا بھی رونا۔ میرے نغمے بھی فریاد

ایک مسلسل ناکامی۔ میرے جینے کی روداد
ڈوب چلا اے موج رواں۔ تو ہی کر اب کچھ امداد

شکر الٰہی! تیرا شکر۔ دل ایک اور ہزار افتاد
چھوڑ بھی دے لہروں پر ناؤ۔ کہہ کر "ہرچہ بادا باد"

عشق اک ٹھنڈی ٹھنڈی آگ۔ عشق اک میٹھی میٹھی یاد
میری صورت ایک سوال۔ میں خود ہوں اپنی روداد

گیت کا رس، تاروں کا نور۔ اُف یہ حسن گلستان زاد
میخانہ اور لاکھوں رنگ۔ مسجد میں بس ایک ہی یاد

ہنسنے پر مجبور ہوں میں۔ چہرہ شاد اور دل ناشاد
نغمے کے طوفانوں میں۔ کون سُنے میری فریاد

کاش کبھی دیتے وہ ضمیر
میرے ایک ہی شعر کی داد

سید ضمیر جعفری بی اے

مجبُوری!

باز آ! میری محبت کے جنونِ خام سے!!
دیکھ! دامن کو بچالے تلخیٔ انجام سے!!

چھوڑ دے! میرے لئے یہ بیقراری چھوڑ دے!!
میری خاطر روز و شب کی اشکباری چھوڑ دے!!
یہ بظاہر جذبِ غم کی پردہ داری چھوڑ دے!!

باز آ! میری محبّت کے جنونِ خام سے!!
دیکھ! دامن کو بچالے تلخیٔ انجام سے!!

یہ تری پھیکی جوانی، یہ ترا سونا شباب
مضمحل انگڑائیاں لیتا ہوا حسن خراب
بن گئی ہے زندگی گویا مسلسل اک عذاب

باز آ! میری محبّت کے جنونِ خام سے!!
دیکھ! دامن کو بچالے تلخیٔ انجام سے!!

کس لئے بے کیف و بے رونق ترے لمحات ہیں!
کس لئے افسردہ و غمگیں ترے جذبات ہیں!
کس لئے تاریک و یاس انگیز احساسات ہیں

باز آ! میری محبّت کے جنونِ خام سے!!
دیکھ! دامن کو بچالے تلخیٔ انجام سے!!

رات کی خاموشیوں میں تیرے نالوں کی پکار!!
سسکیوں کے ساز پر آہوں کے نغمے بیقرار!!
سن کے اکثر کانپ اُٹھا ہے مرا عزم و وقار!!

باز آ! میری محبت کے جنونِ خام سے!!
دیکھ! دامن کو بچالے تلخیٔ انجام سے!!

تجھکو میرے جذبۂ ناکام حسرت کی قسم!!
تشنگیٔ ذوق و احساسِ محبت کی قسم!!
شام ویران کی قسم صبح قیامت کی قسم!!

باز آ! میری محبت کے جنونِ خام سے!!
دیکھ! دامن کو بچالے تلخیٔ انجام سے!!

میری خاطر زندگی کو روشناس غم نہ کر!!
دیکھ! رہ جائیں کہیں نالے نہ محروم نہ کر!!
یوں کہیں تنہا بھی ساری عمر ہوتی ہے بسر!!

باز آ! میری محبت کے جنونِ خام سے!!
دیکھ! دامن کو بچالے تلخیٔ انجام سے!!

یہ محبّت آگ ہے، اے کاش تو بھی جان لے!!
آستین کا ناگ ہے، اے کاش تو بھی جان لے!!
عشق دیپک راگ ہے، اے کاش تو بھی جان لے!!

باز آ! میری محبّت کے جنونِ خام سے!!
دیکھ دامن کو بچالے تلخیٔ انجام سے!!

عشق کی راہوں میں تیرے ساتھ چل سکتا نہیں!!
اس طریقِ کار ہستی کو بدل سکتا نہیں!!
واسطے تیرے کفِ افسوس مل سکتا نہیں!!

باز آ! میری محبّت کے جنونِ خام سے!!
دیکھ! دامن کو بچالے تلخیٔ انجام سے!!

میرے اظہارِ حقیقت پر نہ کر اتنا ملال!!
سچ تو یہ ہے میرا پالینا ہے اک امرِ محال!!
ہو سکے تو چھوڑ دے للّٰہ اب میرا خیال!!

باز آ! میری محبّت کے جنونِ خام سے!!
دیکھ! دامن کو بچالے تلخیٔ انجام سے!!

صہبا لکھنوی

ورائٹی شو

(VARIETY SHOW)

[ہمیں افسوس ہے کہ "لندنی زندگی" کی دوسری قسط فروری کے شاہکار میں اشاعت پذیر نہ ہو سکی۔ ناظرین سے بھی "یاد دہانی" کے طور پر چند خطوط موصول ہوئے۔ اس سلسلہ کی دوسری قسط بعنوان "ورائٹی شو" اشاعت ہذا میں درج کی جا رہی ہے۔ ہم امید رکھتے ہیں کہ جناب کامران اس دلچسپ سلسلہ کو "ماہ بماہ" کچھ عرصہ تک جاری رکھکر سرپرستان شاہکار کی جوع الادب کی تسکین کا سامان بہم پہنچائیں گے ۔ وتسل]

ریاض محمود اور میں تینوں لندن کے مغربی علاقہ (SHEPHERD BUSH) میں رہتے تھے باقر بھی میں رہتا تھا۔ باقر اور ریاض یونیورسٹی میں تھے۔ اور محمود اور میں انگریزی فرموں میں ملازم تھے۔ محمود پکاڈلی میں تھا اور میں سٹی آف لندن میں۔ ہم دونوں کے اوقات میں آدھ گھنٹہ کا فرق تھا یعنی مجھے آدھ گھنٹہ پہلے فراغت ہو جایا کرتی تھی۔ اس لئے میں محمود کو اکثر پکاڈلی میں جا ملتا تھا۔ وہاں سے ہم اکٹھے گھر جایا کرتے تھے۔ جب ہم نے فورسم ڈے (چاریاری کا دن) منانا ہوتا۔ تو ہم مقررہ مقام پر سب جمع ہو جایا کرتے۔ اور سارا دن اور آدھی رات تک اکٹھے سیر اور شغل میں لگے رہتے۔ ہم سب باری باری سے ایک دوسرے کی میزبانی کرتے تھے۔ اس طرح کسی ایک اکیلے دوست پر بار نہیں پڑتا تھا۔

شنبہ کے روز مجھے فرم سے بارہ بجے چھٹی مل گئی تھی۔ فرصت کا وقت تھا۔ میں پر رونق بازاروں کی سیر کرتا ہوا پیدل پکاڈلی چلا گیا۔ ساڑھے بارہ بجے محمود سے ملاقات کا وقت پہلے سے مقرر تھا۔ جب میں "پرنس آف ویلز تھیٹر" کے سامنے سے گذر رہا تھا۔ تو مجھے اس کی بلڈنگ کی پیشانی پر بڑا سا اشتہار نظر پڑا۔

"نیا پروگرام اور نئے اداکار"

یہ دیکھ کے میں نے رفتار تیز کر دی۔ میں ابھی محمود سے دس قدم کے فاصلے پر تھا کہ میں نے کہنا شروع کر دیا

"دوست آج پرنس آف ویلز میں نیا پروگرام ہے۔ گو۔ یا فورسم (چاریاری) کی عید ہے۔ سو لنچ میرے ساتھ کھاؤ۔ پھر ہم ہائیڈ پارک جائیں گے جھیل کے کنارے گل گشت کریں گے۔ اور اگر طبیعت چاہی تو کشتی کرایہ پر لے کر لہروں پر وقت گذاریں گے۔ اور شام کو...... نیا پروگرام اور نئے اداکار۔ منظور؟"

"منظور" محمود نے بڑی مستعدی سے جواب دیا۔

"لاؤ ہاتھ" یہ پیمان ہوتے ہی میں ٹیلی فون باکس پر لپکا۔ محمود میرا مطلب سمجھ گیا۔

"چاریاری زندہ باد"

بیس سیکنڈ میں میرا باقر سے CONNECTION ہو گیا۔ میں نے مختصر سے الفاظ میں بڑی تیزی اور عجلت سے کہا۔

"پکاڈلی سٹیشن کی اوپر کی منزل میں جہاں [illegible] اوپر شہر کا وقت بتانے کی کلاک لگا ہے۔ اس کے پاس ہم تمہارے انتظار میں چشم براہ ہیں۔ اور دیکھو تمہارے لئے ایک خوش خبری بھی ہے۔"

چشم زدن میں میں نے ریاض کو بھی یہی پیغام ٹیلی فون کے ذریعہ پہنچایا۔ آدھ گھنٹہ کے اندر ہماری چاریاری مکمل تھی۔

باقر نے آتے ہی پوچھا۔

"میرے لئے کونسی خوشخبری ہے؟"

میں نے جواب دیا۔ "اول طعام بعد کلام"۔ جب ہم ریجنٹ پیلس ہوٹل کے ریسٹورانٹ میں بڑی تلاش کے بعد ایک خالی میز پر بیٹھ گئے اور لنچ کی پہلی قسط ہمارے سامنے آ گئی۔ تو میں نے اسے کہا۔

"وہ خوشخبری یہ ہے باقر کہ آج پرنس آف ویلز میں نیا پروگرام ہے۔"

باقر خوشی سے اچھل پڑا اور بلند آہنگی سے مجھے دعا دی

"تیری آواز مکے اور مدینے"

اگرچہ لندن میں دل لگی اور فارغ البالی کے لمحات زیادہ تر لڑکیوں کی ہم باشی میں گذارے جاتے ہیں۔ اور ہم اس قاعدہ سے مستثنٰی نہ تھے لیکن ہم آپس کی ہمدمی کو اس لئے ترجیح دیتے تھے کہ ہم اپنی مادری زبان میں آزادانہ تگ و تاز کر سکتے تھے اور لندن میں صبح و شام لگاتار انگریزی بولنے کے بعد یہ بجائے خود تفریح کی حیثیت رکھتی تھی۔

لنچ پر ہم نے تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ صرف کر دیا۔ بینڈ بج رہا تھا مسرت اور امن کی ہوا سارے ریسٹورانٹ میں مہک رہی تھی۔ ڈھائی بجے ہم باہر آئے اور سیدھے پرنس آف ویلز تھیٹر جا کے چار نشستیں ریزرو (RESERVE) کروا لیں۔ پہلا پروگرام پانچ بجے شروع ہونا تھا اور ابھی وقت کافی تھا۔ ریاض نے کہا۔

"آؤ ادھر ادھر کی سیر کریں پھر کہیں چائے پئیں جب تک شو دیکھنے کا وقت ہو جائیگا۔"

"لیکن چائے پئیں گے ہم ہائیڈ پارک کے ریسٹورانٹ میں کھلی ہوا میں چھتری کے سایہ میں سبز گھاس کے اوپر۔"

محمود نے جب بات کی تو ساتھ ہی اپنی اداکاری کا ہنر بھی دکھایا۔ ہم چاروں فی الفور ہائیڈ پارک

جانے والی سڑک پر ہو لئے۔

سر تن نائین (جمیل کا نام) کا چکر لگانے کے بعد ہم چائے کے لئے کھلی فضا میں جا بیٹھے۔

ہمارے آس پاس سبز گھاس پر بے شمار لوگ مختلف اشغال میں وقت گذار رہے تھے۔ زیادہ تر دھوپ میں غسل کر رہے تھے۔ کچھ گیند سے کھیل رہے تھے بعض پتنگ اڑا رہے تھے اور بعض محبت کے راز و نیاز میں مشغول تھے۔ یہ نظارہ اس قدر دلکش اور فرحت انگیز تھا کہ ہم وقت سے غافل ہو گئے۔ دفعتہً باقر چونک پڑا۔

"اٹھو بھاگو یہاں سے" شو شروع ہونے میں صرف پندرہ منٹ رہ گئے تھے۔

بجائے اس کے کہ ہم ویٹرس (WAITRESS) کا اپنی میز پر انتظار کرتے یا اُسے اشارہ سے پاس بلاتے ہم نے اسے کاونٹر پر جا لیا۔ اس سے بل لکھوایا اور جلدی سے حساب بیباق کیا اور تیر کی طرح سڑک پر بھاگے۔ اتفاق سے ایک بس پکاڈلی جا رہی تھی۔ اسے ٹھہرائے بغیر ہم یکے بعد دیگرے اس میں کود پڑے۔ ہمارا سانس پھول گیا تھا اور ہم پسینہ سے تر ا بور ہو گئے تھے۔

شو شروع ہونے میں تین منٹ رہ گئے تھے کہ ہم تھیٹر ہال میں داخل ہوئے۔ اندر جاتے ہی ایک "دربانہ" خوبصورت یونیفارم میں ملبوس بڑی سرعت سے پیشوائی کے انداز سے آگے بڑھی۔ اور ہماری نشستوں کا نمبر پوچھا۔ اس نے ہماری رہبری کی۔ اور ہم آسانی سے اپنی جگہوں پر پہنچ گئے۔ ہمارے بیٹھتے ہی ایک دوسری لڑکی ورائٹی شو کا پروگرام بیچنے آئی۔ پروگرام میں اداکاروں کے نام اور کھیل کی مختصر سی ہسٹری درج ہوتی ہے۔ اس لئے اس کا خریدنا دلچسپی سے خالی نہیں ہوتا۔ باقر نے پروگرام خرید لیا۔ وہ لڑکی مسکرائی اور تھینک یو (THANK YOU) کہہ کر چلی گئی۔ ایک دو اور لڑکیاں سفید پوشاکوں میں چاکلیٹ سگریٹ اور آئس کریم بیچ رہی تھیں۔ ہم باہر کی دوڑ دھوپ سے گرم ہو رہے تھے۔ ریاض نے چار آئس کریم کی اینٹیں (BRICKS) خرید لیں اور ہم کو بانٹ دیں۔ ہم ابھی پروگرام دیکھ ہی رہے تھے کہ آرکیسٹرا بجنے لگا اور روشنیاں ماند پڑنے لگیں اور نگاہیں شدت کی بے تابی سے پردہ اٹھنے کا انتظار کرنے لگیں۔ ہر شخص کا قیاس کہتا تھا۔ کہ پردہ کے پیچھے حسن جہاں افروز کا دربار لگا ہے لہذا پردہ اٹھنے میں ساعتوں کی طوالت ناقابل برداشت بن رہی تھی۔

بالآخر ہمارے قیاسات کی عملی تصویر ہمارے سامنے آگئی۔ پردہ اٹھا اور ایک طرف سے لڑکیوں کا گروہ ناچتا ہوا اور ٹانگوں کو سر سے بلند اچھالتا ہوا اسٹیج پر آگیا۔ ان کے سنہری بال شانوں تک شکن در شکن ہو کر چھلے ہوئے تھے ان کے سفید سائے سامنے سے پھٹے ہوئے تھے۔ جو اُن کی سڈول اور براق ٹانگوں کو نگاہوں کا فوکس بنا رہے تھے۔ دوسری طرف سے لڑکیوں کا ایک اور گروہ سیاہ مردانہ لباس میں ناچتا ہوا آموجود ہوا اور پہلے گروہ سے گھل مل گیا۔ انہوں نے TOP HATS سروں پر ٹیڑھی رکھی ہوئی تھیں جیسے سبھی اصل کج کلاہ کے جوان سال بیٹھے ہیں۔ پہلے گروہ کے سفید اور دوسرے گروہ کے سیاہ لباس نے سیاہ اور سفید (BLACK & WHITE) شراب کی مستی کو دیکھنے والوں کے دلوں میں بھر دیا

اتنے میں ایک پری ہوا سے اتری اور اس نے ان الہڑ لڑکیوں کے حلقہ میں بڑے نازو انداز سے گانا شروع کیا۔ اس کی آنکھوں سے یوم وصال کے وعدے اور آواز سے عشق کی پیاس آتش خموش کی مانند نکل رہی تھی۔ یہ نظارہ دیکھ کے محمود پر وارفتگی کے آثار طاری ہو گئے۔

ساقی بجلوہ دشمن ایمان آگہی ؎ مطرب بہ نغمہ رہزن تمکین و ہوش ہے

میں نے اس کا ہاتھ دبا کر کہا "محمود ذرا آہستہ"۔ اسی اثنا میں وہ سین ختم ہو گیا۔

پھر تین ACROBATS آئے۔ وہ قوی ہیکل بلند بالا اور شاہ زور مرد جنہوں نے صرف سیاہ پتلونیں پہنی ہوئی تھیں سینہ تان کر سٹیج پر آ گئے۔ اور ان کے درمیان ایک چھوٹی سی لڑکی تھی جیسے دو عقابوں میں ایک کبوتری۔ اس کی سڈول چھاتی پر ایک نامعلوم سی ریشم کی جھالر تھی اور کمر میں ہلکی سی سلیپ۔ اس کا جسم کندن کی طرح دمکتا ہے۔

ان پہلوانوں نے اس لڑکی کو بڑی آسانی سے ہوا میں اچھالنا اور لپکنا شروع کیا کبھی وہ اسے دھکیل دیتے۔ جیسے انہیں اس پر عتاب آ رہا ہے اور کبھی وہ اس سے لپٹ جاتے جیسے وہ اس سے پیار کر رہے ہیں کبھی وہ زمین پر ہوتی کبھی ان کے ہاتھوں میں اور کبھی ان کی دسترس سے باہر ہوا میں کبھی وہ تیندوے کی طرح جسم تول کر ان پر جھپٹتی اور کبھی مچھلی کی طرح ان کی گرفت سے نکل جاتی کبھی وہ گیند کی طرح گول ہو جاتی اور کبھی ریشم کے تھان کی طرح کھل جاتی کبھی برہنہ تلوار کی طرح تن جاتی۔ اور کبھی رگ بسمل کی طرح تھر تھرانے لگتی۔

اس لڑکی کے جسم پر بے جان رسی کی طرح پیچ اور بل پڑ رہے تھے مگر نہ اس کی ہڈی ٹوٹتی تھی اور نہ اس کی دل افروز مسکراہٹ اس کے لبوں سے رخصت ہوتی تھی۔

"انسان غصہ اور ورزش کی حالت میں مسکرا نہیں سکتا لیکن ملاحظہ کرو اس لڑکی کا کمال"۔ باقر نے ہم سے داد طلب کی۔ باقر کی تصریحات محمود کے برعکس سنجیدہ اور فلسفیانہ ہوا کرتی تھیں۔

ایک سین میں ترکی حرم سرا میں غسل خانہ کی فرضی روایات کا نقشہ دکھایا گیا۔ سلطان المعظم حریر اور اطلس کے لباس میں بڑے طمطراق سے تشریف لائے۔ ان کے سر پر عمامہ تھا جس پر ہلال کی صورت ہیرے ٹنکے ہوئے تھے۔ اور انگلیوں میں لعل و زمرد کی انگشتریاں تھیں جتنی کہ ان کی پاپوش پر بھی سونے کی مینا کاری ہو رہی تھی۔ جن کے حمام میں داخل ہوتے ہی گل بدن نوخیز کنیزوں نے انہیں جھرمٹ میں لے لیا ایک لڑکی صراحی لئے سامنے آئی۔ دوسری مینا کو کندھے پر اٹھا لائی۔ اور شراب لالگوں ساغر میں ڈال کر پیش کرنے لگی۔ کسی نے ان کے کپڑے اتارے کوئی ان کے پاؤں دبانے لگی۔ کوئی روغن زیتون سے ان کے جسم پر پالش کرنے لگی اور کوئی عود سلگانے لگی۔

ان سب نے جالی کی شلواریں پہنی ہوئی تھیں باقی جسم پر کوئی چیز نہ تھی سوائے اس کے کہ ان کے گلوں میں پھولوں کے ہار تھے۔ جو بمشکل نگاہ بے باک سے ان کی شباب آور نسوانیت کو پناہ میں لے رہے تھے۔ کمرہ کے درمیان میں ایک حوض تھا جس میں فوارہ نصب تھا۔ غضب یہ تھا کہ اس فوارے کے نیچے تین لڑکیاں انگڑائی کی حالت میں بالکل مادر زاد برہنہ بیٹھی تھیں

انگلستان میں سٹیج کا قانون ہے کہ اگر ایک لڑکی مجسمہ کے طور پر بالکل سالم اور ساکت ہو جائے جس سے دیکھنے والوں کو چینی، مومی یا مرمریں مجسمہ کا مغالطہ ہو جائے تو بغیر لباس کے سٹیج پر ظاہر ہونا جائز ہے یہاں اتنی رعایت اور کی گئی تھی کہ ان جیتے جاگتے مجسموں پر روشنی اس زاویہ سے پڑ رہی تھی۔ کہ ان کی عریانی تماشائیوں کو دعوت عام نہیں دے رہی تھی۔ لوگ زیادہ تر سلطان المعظم کی نافرمانیوں اور لطف اندوزیوں کا رشک کے جذبات سے مطالعہ کرنے میں کھو گئے تھے۔

اسی اثنا میں انٹرول ہو گئی محمود نے دو چار سرد آہیں بھریں۔ باقر اس کی حرکت پر دل کھول کر ہنسا۔ "واہ رے ماڈرن واجد علی شاہ"۔

تھیٹر کی عمارت کے اندر ایک جانب ریسٹورانٹ تھا جہاں قہوہ چائے سکیٹین بالائی کی بہت فرحت بخش کیک اور سینڈوچ وغیرہ ملتے تھے ہم نے وہاں جا کے [illegible]

پیا محمود نے اپنے مخصوص مستانہ انداز میں کہا۔

"حمام کے سین میں جو لڑکی حضرت سلطان المعظم کو مالش کر رہی تھی وہ مہتاب کا ٹکڑا تھی۔ کیا اس کا جسم کیا اس کا چہرا اور کیا اس کا قامت، اگر وہ جالی کی شلوار اتار بھی دیتی۔ تو کیا فرق پڑتا تھا"۔

محمود کی وضاحت اور انداز بیان سے ہم سب ہنسنے لگے میں نے کہا۔

"مالش کرنے والی پر تبصرہ پھر کریں گے پہلے یہ بتاؤ کیا تم نے خیال کیا کہ یہ فوارہ کس چیز کا تھا؟"

وہ سب ہمہ تن استفسار بن گئے۔

جب میں نے ان کو عریانی کے متعلق انگلستان کی سٹیج کا قانون بتایا۔ تو ان کے تعجب کی کوئی حد ہی نہ رہی۔

"تو کیا وہ لڑکیاں تھیں اور بالکل ننگی؟" محمود نے سانس روک لیا۔ باقر کا استعجاب محمود سے کم نہ تھا۔

"لیکن دوستا ہماری ادھر توجہ ہی نہیں گئی تھی۔ کم بختوں نے کتنی جرات کی ہے!"

"یہی تو مغربی اداکاری کا کمال ہے۔"

"زوال کیوں نہ کہئے کامران"۔ ریاض نے مشورہ دیا۔

ہم ان باتوں میں مشغول ہو رہے تھے کہ بینڈ بجنے لگا۔ اور ہال کی روشنیاں ماند ہونے لگیں ہم جلدی سے اٹھکر اپنی نشستوں پر آ گئے۔ سٹیج پہ مذاحیہ کھیل ہونے لگا سارا ہال داد تحسین دے رہا تھا۔ اس کے بعد ایک جادوگر نے حیرت انگیز کھیل دکھائے۔ اس کی دو معاون لڑکیوں نے بظاہر جان پر کھیل کر جادوگر کو اپنے ناز پروردہ جسم پر مشق ہنر کی اجازت دی۔ اس نے تین تلواروں کو فرش میں گاڑ دیا اور ان کی نوکوں پر ایک لڑکی کو لٹا دیا۔ پھر یکے بعد دیگرے تلواریں اس کے نیچے سے نکال لیں لیکن وہ لڑکی ہوا میں معلق بدستور لیٹی رہی پھر دوسری لڑکی کو جادوگر نے ایک ستون سے رسے سے باندھ کر اس پر پستول سے فائر کیا۔ لڑکی نے ایک دلخراش چیخ ماری اور نگاہوں سے غائب ہو گئی کچھ دیر میں وہی لڑکی تماشائیوں کے ہجوم میں ہال کی درمیانی روش پر خراماں خراماں ٹہلتی ہوئی سٹیج پر پہنچ گئی۔ بعد ازاں اس جادوگر نے ایک مرد ملازم کو بلا کر اپنے ہاتھ پاؤں رسی سے بندھوائے اور اپنے آپ کو ایک صندوق میں بند کروا دیا جسے تالا لگا دیا گیا پھر اس ملازم نے صندوق پر چادر ڈال کر اور ایک چکر لگا کر اسے کھولا تو اچانک معلوم ہوا کہ کھولنے والا خود جادوگر ہے اور صندوق کے اندر اسے قید کرنے والا ملازم بند ہے۔ غرضیکہ ہر کھیل دلچسپ تھا اور وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ آخر باقر نے ہمیں پروگرام دیکھ کے بتایا کہ وہ

"اب آخری کھیل شروع ہونے والا ہے۔"

آرکیسٹرا کے بجتے ہی لڑکیاں نیم عریاں لباس میں سٹیج پر اس طرح اتر آئیں۔ جیسے بادلوں سے بجلیاں کوند کر نکل آئی ہیں۔ باری باری سے لڑکیوں کے گروہ مختلف لباسوں میں آنے گئے۔ اور ناچ ناچ کر ہلال کی صورت میں کھڑے ہوتے گئے۔ ان کے درمیان ایک مسند لا کر رکھی گئی۔ جسے زینت دینے کے لئے ایک کافر ادا ملکہ تاج زرنگار سر پر رکھے مستی اور غرور سے جھومتی جھامتی زنانہ سپاہیوں کے جھرمٹ میں آئی۔ سپاہیوں کا تقریباً سارا جسم ننگا تھا صرف سینوں پر "بہادری کے تمغہ جات" آویزاں تھے۔ اور کمروں میں "ہم رنگ زمین" پیٹیاں تھیں جن میں ننگی تلواریں لٹک رہی تھیں۔ وہ دلنواز سپاہی جو ساز و سامان کی بجائے کمی لباس کی وجہ سے قتل و غارت میں ماہر معلوم ہوتے تھے ملکہ کے تخت کے گرد تلواریں سونت کر

کھڑے ہو گئے۔ پھر درباری ایک گڈریئے کو پکڑ کر لائے جو ملکہ کی ایک خاص الخاص خادمہ پر بہزار جان سے عاشق ہو گیا تھا۔ وحشت اور دیوانگی میں وہ دربار کا کوئی آداب بجا نہ لایا اور بے اعتنائی کی شان سے عاشقانہ اشعار گانے لگا۔ اس کا لباس پھٹا پرانا تھا اس کے بال پریشان تھے اور آواز سے ایک ایسی تپش اور رقت ٹپکتی تھی کہ سننے والوں کے کلیجے ہل جاتے تھے۔ اس پر گستاخی اور بغاوت کا الزام لگایا گیا۔ ملکہ کی جنبش ابرو پر "جلاد" نے چاندی کا بڑا سا پیالہ گڈریئے کے ہاتھ میں دیا جس میں زہر ہلاہل بھرا تھا جانباز عاشق نے اسے شربت وصل سمجھکر پیا اور جان بحق تسلیم ہو گیا۔

یہ دیکھ کر اس گڈریئے کی محبوبہ جو ملکہ کے دربار میں حاضر تھی تاب نہ لا سکی اور ہائے کا نعرہ مار کر بیہوش ہو گئی۔ بیدار ہو کر ملکہ کو بجائے رحم کے سخت طیش آیا اور حکم دیا کہ کنیزک کو سامنے حاضر کرو۔ وہ ترساں و لرزاں سامنے آئی ملکہ نے فرمان سنایا:۔

"ما بدولت کا حکم ہے کہ تم گڈریئے کے عشق سے باز آؤ ورنہ تمہارا حشر بھی اس کے ساتھ ہو گا۔"

لیکن عشق کی مجرم ذرا خوفزدہ نہ ہوئی اور اپنے عشق کا بیباکی سے اعتراف کیا۔ ملکہ کے چہرہ پر آگ برسنے لگی فرمایا کہ اسے ننگا کر دیا جائے جب اس پیکر حسن و جمال کے پارچات ایک ایک کر کے اتارے گئے تو ہر دیکھنے والے پر سکتہ کا عالم طاری ہو گیا اس لڑکی کا جسم اس قدر خوبصورت تھا کہ بجلی کی روشنی میں بجلی کو مات کرتا تھا۔ غضبناک ملکہ چابک لیکر ایک زہریلے سانپ کی طرح پھنکارتی ہوئی اور بل کھاتی ہوئی تخت سے نیچے اتری اور تڑاخ تڑاخ اس لڑکی کے بدن پر چابک برسانے لگی وہ گلعذار آگے آگے بھاگتی تھی اور چابک کی مار پڑتی تھی سہم جاتی تھی لڑکھڑاتی تھی پھر اٹھتی تھی اور برگ خزاں کی طرح کانپتی تھی اس پر چھت سے جو روشنیاں پڑ رہی تھیں وہ ہر لحظہ بدلتی تھیں کبھی زرد کبھی سرخ اور کبھی سبز یہ معلوم ہوتا تھا کہ سٹیج کو درد کے دورے ہو رہے ہیں بینڈ بھی اس انداز سے بجنے لگا جیسے قہر و غضب اور جبر و جلال کی موسلا دھار بارش ہو رہی ہے ملکہ کا انتقام اور اس لڑکی کا ہراس اگرچہ کتنا ہی قدرتی تھا لیکن اس طرح ترتیب دیا گیا تھا کہ وہ ایک دلفریب ناچ کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ آخر وہ لڑکی بیدم اور زخمی ہو کر اپنے عاشق کی لاش پر گر پڑی اور سرد ہو گئی اس کے مرتے ہی روشنیاں آہستہ آہستہ گل ہو گئیں اور بینڈ بھی خاموش ہو گیا جب کچھ دیر بعد روشنی ہوئی تو ملکہ اور سپاہی سب غائب ہو چکے تھے یکایک عاشقوں کی لاشوں کو حرکت ہوئی اور وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر عشق کی بقا اور مدامت کے گیت گاتے ہوئے آسمان پر اڑ گئے جو آنکھ دردناک سین سے نمناک ہو گئی تھی وہ پھر مسکرانے لگی اور ٹریجیڈی کامیڈی میں تبدیل ہو گئی۔

جب ہم ہال سے باہر آئے تو معلوم ہوا جیسے عالم رویا سے بیداری میں آ گئے ہیں۔ پرنس آف ویلز تھیٹر کے دروازہ میں عورت کا ایک مرمریں مجسمہ تھا جو دونوں ہاتھوں میں سر سے بلند بجلی کا آفتاب تھامے ہوئے تھا ہم اس کے پاس سے گذر رہے تھے کہ محمود ٹھٹھک کر رہ گیا

"یہ بھی کیا حقیقی لڑکی ہے کامران" بے اختیار قہقہوں نے ہماری پسلیوں میں درد ہونے لگا۔

انگلستان میں گرمی کا دن اٹھارہ گھنٹہ کا ہوتا ہے سو ساڑھے سات بجے جب ہم باہر آئے۔ تو اس وقت سورج آسمان پر اس آب و تاب سے چمک رہا تھا جیسے ابھی سہ پہر کا عمل ہے۔ ریاض نے کہا۔

"وقت کافی ہے چلو رچمنڈ Richmond چلیں وہاں کسی لب ساحل ریسٹورانٹ میں سپر کھائیں گے کیا فرماتے ہیں اس بارہ میں اصحاب اربعہ؟"

ساڑھے آٹھ بجے ہم دریا کے کنارے ٹہل رہے تھے دو گھنٹہ بعد ہم ایک ریسٹورانٹ کے برآمدہ میں سپر کے لئے بیٹھ گئے ایک خوش رو ویٹرس (waitress) دور سے چل کر ہمارے پاس آئی محمود نے مہر چنگی کی طرح سر سے پاؤں تک اس کا جائزہ لیا جب وہ آرڈر لیکر چلی گئی تو ریاض ہنسا اور کہا:۔

"یہ وہی ہے جو سلطان المعظم کو مالش کر رہی تھی۔"

کامران

عورت

مقصدِ رنگین فطرت آزروئے خاص و عام
ہے شگفتِ رنگ و بوئے دہر تیرا ابتسام

تیرے نغموں میں نہاں ہے سوز و سازِ زندگی
تجھ سے قدرت کی فسوں آرائیوں کا اہتمام

تُو ہے اُن دشوار ذمہ داریوں پر حکمراں
جن سے وابستہ ہے دنیائے محبت کا نظام

تیری تقدیس محبت پرستارے ہیں گواہ
تیری ہستی کا فرشتوں نے کیا ہے احترام

عشق پر تیرا تسلط، حسن تیری کائنات
ہیں سکونِ زندگی تیری نگاہوں کے پیام

ہے حقائق سے مزیّن تیرا دربارِ مجاز
زاہد و عابد شہنشاہ و گدا تیرے غلام

زندگی کی تجھ سے وابستہ ہیں ساری عشرتیں
تجھ سے محروم تمنّا رہ کے جینا ہے حرام

ترجمانِ روح ہے تیرا وجودِ دلنشین
ہے کتابِ زندگی کی شرح تیرا ہی تو کام

اک ذرا سی جنبشِ لب اور حشرِ کائنات
ہے ترا طرزِ تکلم کس قدر معجز نظام

شعر و نغمہ حُسن و طلعت تجھ سے پاتے ہیں نمود
تیرے ہاتھوں میں ہے کیف و رنگ کا لبریز جام

ناتمام اک تازگی، اک کیفِ بے انجام ہے
تیری تعریفِ مکمل اک خیالِ خام ہے

(آنسہ) نجمہ تصدّق

کاش میں لکھتا

مرقومہ بالاعنوان سے دو پہلو نمایاں ہیں۔ ایک میں عدل کے ساتھ فیصلہ کی آرزو پائی جاتی ہے۔ اور دوسرے میں رشک جھلکتا ہے۔ اول الذکر میں انسانی فطرت کا بہت اہم پہلو ہے اور یہ اس وقت زیادہ روشن ہوتا ہے جب کوئی شخص ایسے شخص کے متعلق جس کے محاسن سے وہ بخوبی واقف ہو اور اس کی سیرت و کردار کا غائر مطالعہ کر چکا ہو۔ اپنی توقع کے خلاف ایسے معائب پڑھے جو اس کے مشاہدہ اور مطالعہ کے معمل میں کھوٹے اور غلط ثابت ہوتے ہوں۔ یا پھر کسی دیکھے بھالے انسان کے متعلق جھوٹے مضامین بے روح اور مداحی روداد یں یا غلط پروپیگنڈے کی بڑھتی ہوئی رَو صداقت کے خلاف برسرِ پیکار نظر آئے۔

مجھے دوران مطالعہ میں اکثر ان مقامات کا سامنا ہوتا ہے اور نہ جانے کتنی بار یہ فقرہ زبان سے نکلتا کہ کاش میں لکھتا مگر یہ جذبہ زندگی کی مسلسل اور بے ترتیب مصروفیات کے انبار میں بعض اوقات تو دب کر رہ جاتا ہے اور بعض اوقات جب شفقتوں اور فکرمندیوں کی بقائیں ہلکی اور حریری ہوتی ہیں تو اپنی پوری آب و تاب سے نہیں تو دھندلی دھندلی خلش انگیز روشنی سے دل و دماغ پر ضرور اثر ڈالتا رہتا ہے اور میری ادبی جدوجہد کا بڑا حصہ مختلف صورتوں میں اسی جذبہ کا رہین منت ہے کہیں تو یہ بیواؤں غریبوں اور کسانوں کو اذیت میں دیکھ کر مجھے ان کی ہمدردی پر آمادہ کرتا ہے کہیں مزدوروں کے خون کو کوڑیوں کے مول بکتا دیکھ کر کرب میں مبتلا کر دیتا ہے جو میری نظموں کی تخلیق کا باعث ہے اور یقین و صداقت کی بنا پر میں اپنی قسم کی ادبی جدوجہد کو عبادت خیال کرتا ہوں۔

متذکرہ بالاعنوان کے دوسرے پہلو میں رشک ہے اور رشک کے ساتھ ساتھ ایک مبہم افسوس بھی اور اس عالم سے مجھے کبھی واسطہ نہیں پڑا اور نہ کسی معیاری ادیب اور شاعر کو ایسا موقع آتا ہے یہ تو ایک شعر کی تعریف کے سلسلہ میں پُرتکلف فقرہ ہے جس میں خلوص نہیں!

ہاں ایسے ایسے شعر ضرور ہوتے ہیں جو دشمنوں کو بھی داد پر مجبور کر دیتے ہیں۔ اور مجھے تو جب کوئی شعر پسند آتا ہے تو کئی کئی دن گنگناتا رہتا ہوں لیکن مجھے کوئی ایسا وقت یاد نہیں جس پر میرے منہ سے شعر پر یہ فقرہ نکلا ہو کہ کاش میں لکھتا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ میں نے تیسرے درجہ کے شعرا کا تو مطالعہ کیا ہے مگر ان کے کلام کا نہیں اور کبھی کبھی جب کہیں کسی مشاعرے یا مخصوص نشست میں سننے کا موقعہ ہوا تو کسی کی شاعری میں جناب جوش کی روح کارفرما نظر آئی کہیں حضرت جگر کی عکاسی اور کہیں شعر کی شریانوں میں میرا خون اسی طرح اور بہت سے حضرات ہیں جو اپنے فیض نظر پر پردے ڈالنے کے باوجود نمایاں ہیں اور بھرتے ہیں کہ برابر دھوکا دیئے جا رہے ہیں۔

جن بلندپایہ شعرا کے کلام کا میں نے مطالعہ کیا ہے۔ مجھے ان پر کبھی رشک نہیں ہوا۔ بلکہ ان کے ایک ایک مصرعہ پر جھوم جھوم گیا ہوں اور تنہائی میں والہانہ داد دیتا رہا ہوں چنانچہ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں نے ایک زمانہ میں میر انیس کا ایک شعر پڑھا اور اس قدر متاثر ہوا کہ غالباً ایک ہفتہ تک پڑھتا پھرا اور جب ذرا غور کرتا تھا تو کربلا کے بعد ان میں واقعات کے نقوش ابھرتے نظر آتے ہیں تھے اور حسین علیہ السلام کی عظمت کے خیال سے وارفتہ ہو جاتا تھا۔ ایسے انداز سے شعر کہا گیا ہے کہ سالاری کے منصب کا مقصد اور ہوش و حواس کے ساتھ جگرداری کی تلقین اس سے بہتر کہیں نظر نہیں آتی۔ فرماتے ہیں ؎

ایسا بھی ہے کوئی ترے وہم و قیاس میں
لاکھوں سے جو لڑائے بہتر کو پیاس میں

ممکن ہے کہ اس شعر کو پڑھ کر کسی کے دل میں یہ بات بھی آتی ہو کہ "کاش میں لکھتا"۔ لیکن مجھے تو اس کے محاسن اور دوستوں سے ہی فرصت نہیں ملی۔

ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ چھوٹوں کو بڑوں کی برتری اور بزرگی پر رشک نہیں ہوتا۔ بزرگ تو اپنی صورت کے مالک ہوں یا نہ ہوں بہرحال چھوٹوں کے لئے قابل تعظیم ہوتے ہیں رشک تو ہمیشہ خام عقل کے بزرگوں کو ہوتا ہے کیونکہ چھوٹوں کی غیر معمولی ترقی استعداد شہرت عظمت اور دولت سے انہیں اپنی مناصب اور مدارج میں رخنہ اندازی اور پستی کا احتمال ہوتا ہے۔ اور یہ حربہ حریفوں ہمدوشوں ہم جماعتوں اور ہم پلہ لوگوں تک ہی محدود نہیں رہتا۔ بلکہ جب کوئی پست ہمت کاہل اور اوچھے دماغ کا انسان اپنے چھوٹے بھائی کو بھی راہ ترقی پر گامزن دیکھتا اور اس کے رسوخ کے ساتھ دل و دماغ کو مستعد اور بیدار پاتا ہے تو کچھ دنوں تک تو اس کے لبوں پر ایک مسموم خاموشی طاری رہتی ہے۔ اور پھر رفتہ رفتہ یہی خاموشی بلاوجہ ناراضی اور بے سبب گالیوں کی صورت میں منتقل ہو جاتی ہے۔ ساتھ ساتھ وہ برادرانہ محبت میں ایک خلا محسوس کرنے لگتا ہے جو کبھی کم ہو جاتا ہے اور کبھی زیادہ یہی نہیں بلکہ اس کا انجام اس زہریلی تلخی سے گذر کر برمحل نقصان رسانی کو عبور کرتا ہوا قتل و غارت کے خونیں اور بھیانک راستوں سے جا ملتا ہے۔

اگرچہ عموماً بزرگ ایسے ہیں جو چھوٹوں کی ترقی سے خوش ہوتے ہیں اور اسے اپنی عظمت خیال کرتے ہیں لیکن ان میں رشک نہیں ہوتا بلکہ محبت کا پاکیزہ اور بلند جذبہ!

اچھا شعر سن کر ایک پرکیف اور لطیف انکشاف ہوتا ہے جس کا تعلق مدح سے ہے اس میں یہ رشک نہیں ہوتا کہ کاش یہ شعر میں کہتا۔ بلکہ فوراً ہی اس کے دیگر پہلوؤں کے انکشافات شروع ہو جاتے ہیں اور بار بار یہ خیال آنے لگتا ہے کہ اس میں شک نہیں کہ شعر خوب ہے مگر فطرت یا واقعہ کے اس پہلو پر اس سے بہتر شعر ہو سکتا ہے اور غالباً میں کہہ سکتا ہوں بعض شعرا کے کلام میں جو توارد ہو جاتا ہے اس کا اہم سبب یہی ہے۔ چنانچہ مرزا غالب کا شعر ہے ؎

ہے خبر گرم ان کے آنے کی ؛ آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا — غالب

شعر سے ظاہر ہے کہ اپنی مفلسی ناداری اور خستہ حالی کا احساس دوست کی آمد پر ہوا ہے ورنہ افلاس اور نکبت کی طرف تو عشق میں نظر جاتی ہی نہیں۔ اسی بات کو مولانا حالی اپنے ایک شعر میں فرماتے ہیں ؎

دیکھیے آپ کی اور آپ کے گھر کی صورت — حالی

اگرچہ احساس ایک ہے لیکن انداز دوسرا ہے اور انداز ہی شاعرانہ حیثیت کا معیار قائم کرتا ہے۔ اسی مفہوم کو جناب جوش ملیح آبادی اس طرح کہتے ہیں ؎

اب تک نہ خبر تھی مجھے اجڑے ہوئے گھر کی
تم آئے تو گھر بے سروساماں نظر آیا
(جوش ملیح آبادی)

اسے نہ تو چربہ کہا جاسکتا ہے نہ تقلید۔ ہاں توارد خیال ضرور ہے۔ اور توارد خیال کوئی عیب نہیں کیونکہ انسانی فطرت، مناظر، واقعات اور واردات کے بیشمار پہلو ایسے ہیں جنہیں عوام کی نگاہیں دیکھتی اور چھوتی ہیں اور ان پر اظہار خیال بھی کیا جاتا ہے لیکن ہر ایک کا انداز الگ اور پیرایہ جدا ہوا کرتا ہے کیونکہ واقعات اور مناظر خارجی مشاہدہ اور داخلی احساس حواس باطنی سے اظہار کو لازمی کا مطالبہ کرتا ہے۔ اب جس کے جس قسم کے حواس باطنی ہونگے وہ ویسا ہی پیرایہ بیان اختیار کریگا۔ اور سننے والا جس قدر شدید الاحساس ہوگا اسی قدر اکتساب کیف کر سکے گا۔ ہاں ایک پہلو اور بھی ہے کہ شعر ایک خاص جذبہ اور اقتضائے مجبوری کے تحت تخلیق ہوتا ہے۔ اس لئے اس کا وہی پہلو کامیاب اور کارگر ہوتا ہے جس کے اثرات اس کی تخلیق میں معاون ہوتے ہیں اور وہی عالم کیف یا کرب جس شخص کے واقعات اور حالات سے جا ملتا ہے۔ اسی پر شعر طوفانی کیفیت سے طاری ہو جاتا ہے۔ ورنہ اپنے حالات اور ماحول کے خلاف بہت کم اشعار بیتاب کر دینے والا جذبہ دیکھا گیا ہے ایک وقت تھا کہ مجھے بیدم شاہ صاحب کا یہ شعر بہت پسند تھا اور پہروں اس کا مزہ لیتا تھا ؎

اک عمر کا ساتھی چھوٹا ہے مدت کا سہارا ٹوٹا ہے
دل ٹھہرتے ٹھہرتے ٹھہرے گا صبر آتے آتے آئیگا
(بیدم)

طویل مدت تک یہی شعر آلات تسکین کا کام دیتا رہا لیکن جب ذاتی واقعات نے رخ بدلا اور وقت نے ایک موافق کروٹ لی تو خیال ہوا کہ لفظ تو ٹھہرنا ہے نہ کہ ٹھیرنا اور پھر ایک ہی مصرعہ میں تین جگہ یہی لفظ استعمال ہوا ہے یہ خیال آنا تھا کہ شعر دوسرے خیالات کے گرد و غبار میں اٹتا چلا گیا اور اس کے تمام کیفیاتی نشتر کند ہو کر رہ گئے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ شعر میرے واقعات کے مطابق نہیں رہا تھا اور اس کی تمام تر دلکشیاں واقعات سے وابستہ تھیں ور کہ ہنگامی کیفیات ہنگامی کیفیات ہی سے ہم آہنگ ہوا کرتی ہیں۔ البتہ وہ شعر جن میں فلسفہ تصوف یا زندگی کا کوئی پہلو اچھے اور موثر انداز میں بیان کیا گیا ہو وہ شاعر ہی کے لئے نہیں بلکہ ہر صاحب بصیرت کے لئے ہمیشہ شعر رہتا ہے۔

علامہ اقبال مرحوم فرماتے ہیں ؎

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا ؛ ورنہ گلشن میں علاج تنگیٔ داماں بھی ہے

کیا یہ شعر کبھی پرانا ہو سکتا ہے؟ یا مولانا شرقی چاندپوری کا شعر ؎

مری مجبوریوں کو کون جانے ؛ میں خود مختار ٹھہرایا گیا ہوں ۔ (شرقی چاندپوری)

ایک شعر سیف مرادآبادی کا ہے ؎

مدت کے بعد اس نے جو کی لطف کی نگاہ
جی خوش تو ہو گیا مگر آنسو نکل پڑے

اس قسم کے اشعار ہمیشہ اشعار ہی رہتے ہیں اگرچہ وقت اور حالات کی ہم آہنگی میں ان کی دھاریں تیز ہو جاتی ہیں لیکن حقیقت آشنا نگاہوں کے لئے ہر وقت ان میں وہی شباب رہتا ہے جو پہلے تھا۔ واقعات سے بیگانگی کے عالم میں بھی شعر سامعت سے بالا بالا تیر کر نہیں اتر جاتا بلکہ ایک نقش چھوڑتا ہے وہ ہلکا ہو یا گہرا یہ سننے والے پر بات ہے تلوار کا کام کاٹنا ہے جتنی نرم سطح ہوگی جلد کٹ جائے گی اور جس قدر سنگین و پرپیچ ہوگا اسی قدر دھندلا اور ہلکا نشان قائم ہوگا۔

رشک کا جذبہ اگرچہ اکتسابیت کی پیداوار ہے مگر جب اس میں ناکامی ہوتی ہے تو یہ پہلو بدل کر حسد بن جاتا ہے اور مدمقابل کے اس سرمایہ کو تباہ و برباد کر دینا چاہتا ہے جو اسے حاصل نہیں ہو سکتا۔

ادب و شعر میں بھی رشک کا جذبہ جب شاعر یا ادیب کو کم ظرف اور تنگ نظر پاتا ہے تو دوسرے ادیب یا شاعر کے سرمایہ کو یا تو مسخ کر کے جعلی سکوں میں شامل کر لیتا ہے یا پھر بے غیرتی اور بے حیائی سے فکر انجام کو بالائے طاق رکھکر جوں کا توں اپنے گلے میں ڈال لیتا ہے حالانکہ شعر ہزار پردوں میں بھی اپنے رنگ اور خصوصیت سے پہچان کے قابل رہتا ہے۔ اور جب تک وہ شعر رہتا ہے۔ اپنے شاعر کی طرف اشارہ کرتا رہتا ہے لیکن چور جب کہیں دور جا کر مال فروخت کرتے ہیں۔ اور انہیں بہت کم جھجک ہوتی ہے چنانچہ بہت سے اہم واقعات میں سے ایک قریب کا واقعہ ہے۔ کہیں آل انڈیا اردو کانفرنس دہلی کے مشاعرے سے جناب حیدر دہلوی کا یہ شعر گنگناتا چلا آرہا تھا ؎

چمن والوں سے مجھ صحرانشیں کی بود و باش اچھی
بہار آکر چلی جاتی ہے ویرانی نہیں جاتی
(حیدر دہلوی)

فوراً ایک آوارہ صورت اور آزاد شاعر نے کنوتیاں بدلیں اور کہا کہ پھر تو کہئے! میں پہلے اس شخص کی عادت سے تو آگاہ نہ تھا مگر سنتا تھا کہ ان کے یہاں اچھے اشعار ہی سے نہیں بلکہ غزلوں کی غزلوں سے لفظ بہ لفظ توارد ہو جاتا ہے اور اس پر یہ حضرت فرمایا کرتے ہیں کہ ہمیشہ بڑے آدمی ایک ہی مرکز پر فکر کرتے ہیں کہ ہمیشہ بڑے آدمی ایک ہی مرکز پر فکر کرتے ہیں میں جھجکا مگر امتحان کے طور پر یہ شعر دوہرایا فرمانے لگے شعر آپ کا ہے ؎

میں نے کہا نہیں! یہ صاحب خاموش ہو گئے۔

چند روز روزنامہ ملاپ میں وہی شعر ان کے نام سے چھپا ہوا دیکھا جس پر ایڈیٹر کی طرف سے تقریباً تین چوتھائی صفحہ پر ایک تقریظی نوٹ بھی تھا۔ مجھے اس کی دلیری پر ایک حیرت ہے اور نامعقولیت پر افسوس۔ حالانکہ اسے بتا دیا گیا ہے کہ یہ شعر حیدر دہلوی کا ہے لیکن وہ ہیں کہ بڑے ٹھاٹھ سے توارد ہی سے تعبیر کئے جاتے ہیں اسی طرح اور بہت سے کم ظرف اور باطل دماغ شعراء کے مصور و منقش دواوین میں آپ کو ایسے اشعار ملیں گے جو اپنے مکمل پتے اور سبب انتقال کی تاریخ اپنے دامن میں رکھتے ہیں۔

موجودہ دور ادب اگرچہ خاموش ہے مگر بہت جلد وہ زمانہ آنے والا ہے کہ ان کا یہ طلسم ٹوٹے گا اور محققین ادب نظموں اور غزلوں کا نہیں بلکہ مصرعوں اور لفظوں کا ماخذ معلوم کر لینگے اور بتائیں گے کہ یہ اسی جذبہ رشک کی گلکاریاں ہیں جو پرملال انداز میں یہ کہلا دیتا تھا کہ "کاش میں لکھتا"۔

اس میں بھی شک نہیں کہ بعض پہلوؤں سے رشک کا جذبہ قوت عمل کو بیدار کر کے ناتواں سے ناتواں انسان کو سعی پر آمادہ کر دیتا ہے لیکن اس کے ساتھ ایسے سامان ضروری ہیں جو دوسروں کے منافع سے تصادم سمجھتے ہیں اگرچہ تصادم بھی ازلی ہے اور اب تک جزو زندگی بنکر انسان کے ہمراہ چلا آرہا ہے لیکن اخلاق و عدل کے پیمانے اس کے اعتدال کے لئے ہی تراشے گئے ہیں اس لئے اگر یہ جذبہ اعتدال کی حد تک ہے تو مفید ضرور ہے مگر تحفظ سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتا اور اگر ایذائے غیر کو مقصد زندگی میں شمار کرتا ہے تو اسے یقیناً ادبی آئین اور مذہبی ادارں اور سوسائٹی کے قانون سازطبقوں سے دور رہنا پڑیگا اور ان سے دور رہ کر جو کام ہوگا وہ یقیناً گناہ ہے اور گناہ اس لئے کہ جرم صرف جرم ہے کیونکہ اس کی سزا معین اور ہمراہ ہے لیکن گناہ جرم بھی ہے اور گناہ بھی۔

ایسی مثالیں بھی ہیں کہ اس قسم کے اخلاقی مجرم دل و دماغ کی ترقی اور بیداری کے ایماء سے اسی جذبہ کو لئے ہوئے سوسائٹیوں کے دامن میں آگئے اور ان کا وہ مجرمانہ خیال جماعت اور گروہ کا خیال پا کر ملکوں اور قوموں کی بہبود اور فلاح کا ذریعہ ثابت ہوا ہے مگر ؎ آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک! غالب

وہ اتفاق ہے اور اتفاق مستثنیات سے علیحدہ نہیں ہو سکتا!

احسان دانش

سپاہی

عورتوں کی حفاظت سے متعلق زنانہ رضاکاروں کی وردی پہنے۔ وہ ادھر ادھر ٹہل رہی رہی تھی۔ آہوئے رم دیدہ کی مانند دیوانہ وار۔

یہ دسمبر ۱۹۴۱ء کا واقعہ ہے۔

انگیٹھی میں آگ جل رہی تھی۔ لکڑی کے بڑے بڑے کندوں سے شعلوں کا عکس دیوار پر پڑ رہا تھا۔ ایک سرے پر اس کا باپ اور دوسرے سرے پر اس کی ماں آرام کرسیوں پر خاموش بیٹھے ہوئے اس کی جانب قدرے تشویش انگیز نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ وہ کبھی کھڑکیوں کے پردوں کو اٹھا کر باہر کی طرف دیکھتی ہے۔ اور کبھی صوفہ پر آکر بیٹھ جاتی ہے اور پھر یکدم اٹھکر کمرہ میں مضطربانہ انداز سے گھومنا شروع کر دیتی ہے۔

یوں تو وہ ۲۲ سالہ لڑکی تھی لیکن عمر کے اس مرحلہ پر پہنچ چکی تھی جو نوجوانی اور جوانی کے بین بین واقع ہے جسمانی مشقت اور پیہم ذہنی کوفت سے اس کے لالہ رنگ رخسار کسی قدر زرد پڑ گئے تھے۔ بڑی بڑی اصیل آنکھوں کے ارد گرد ہلکے نقوش نے اس کے مثلثی متبسم چہرہ میں ایک دلاویز افسردگی پیدا کر دی تھی۔

نازک اندام اور بلند قامت نوجوان عورت!

باپ نے کہا: "بیٹی اب ہمیں اپنے کمرہ میں جانے دو۔"

"ہاں ہمارا یہاں بیٹھنا مناسب نہیں تم تنہا اس کا انتظار کرو۔" ماں نے ازراہ تائید کہا۔

نوجوان عورت نے بےصبری سے کہا: "نہیں اباجان! آپ دونوں یہاں بیٹھے رہیئے۔ وہ دو سال کے بعد آرہے ہیں۔"

اس نے غیر محسوس طور پر آہ بھرتے ہوئے زیر لب کہا: "ہاں دو سال بعد" پھر بلند آواز سے کہا: "آپ یہیں رہیئے۔ مجھے آپ کی موجودگی سے ایک گونہ اطمینان رہیگا۔"

تھوڑی دیر بعد یکایک وہ ٹیکسی کی آواز سے وہ چونک اٹھے۔

"آخر وہ آگئے" بیوی نے دل میں کہا اور صوفہ کی پشت پر سہارا لے چشم براہ ہوگئی۔

"میرا نور نظر" باپ نے دبی آواز سے کہا۔ اور اٹھ کھڑا ہوا۔

"میرا بچہ" ماں نے بلند آواز سے کہا اور وہ دروازہ کی طرف لپکی۔

بیوی نے کھڑکی میں سے دیکھا وہ ایک ہاتھ میں سوٹ کیس اٹھائے اور دوسرے بازو میں کٹ بیگ دبائے دروازہ کے قریب آرہا تھا۔ بلند بالا قد سے لاغر لیکن قوی الجثہ۔ جب ہم اکیلے ہوں گے وہ اپنے مضبوط بازوؤں سے مجھے بھینچ لیگا۔ اور غالباً ازراہ شوخی مجھے اٹھائے ہوئے ایک دو چکر بھی دیگا...... ہاں وہی...... اس میں کوئی خاص تبدیلی نہ تھی۔"

وہ کمرے میں داخل ہوا کٹ بیگ اور سوٹ کیس کو دروازہ پر گراتے ہوئے وہ آگے بڑھا۔

"اماں! اباجان!!" پھر ہنستے ہوئے: "اوہ! میں تو تمہیں اس فوجی وردی میں پہچان نہ سکا۔"

اس نے ڈرائنگ روم میں چاروں طرف نظر ڈالی۔ بیوی نے دل میں کہا: "واقعتاً اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ ذرا پچکا ہوا لیکن مضبوط مردانہ چہرہ رخسار کی ہڈیاں قدرے ابھری ہوئیں۔ آنکھوں میں وہی ناصبوری کون کہہ سکتا ہے کہ وہ ساڑھے تیئس سال کا لڑکا ہے۔" لیکن وہ لڑکا نہ تھا۔ اب وہ مرد تھا۔ جسے وہ دو سال پیشتر ریلوے سٹیشن پہ الوداع کہنے گئی تھی۔

نوجوان خاوند نے کہا: "ہاں وہی کمرہ ہے۔ اور میں حیران ہوں کہ لڑائی ہوئی اور ختم بھی ہوگئی۔ اور یہ در و دیوار بدستور قائم ہیں" اس کے بعد لب و لہجہ میں پہلی سی تندی نہ تھی۔ اس نے کمرہ کی چھت دیواروں فرش ساز و سامان میز کرسی صوفہ۔ انگیٹھی طاق گلدان اور بھاری پردوں کا جائزہ لیا پھر بیوی کی طرف دیکھا۔ جیسے کوئی گھور کر دیکھتا ہے۔ ۲۴ مہینے پہلے بھی اس نے سٹیشن پر گاڑی چھوٹتے وقت اسی انداز سے اس کی جانب دیکھا تھا۔ گویا وہ ایک نگاہ میں اسے ہمیشہ کے لئے آنکھوں کی پتلیوں میں سمیٹ لینا چاہتا ہے۔ وہ الوداعی وقت بیوی کو از سر نو یاد آگیا تب اس کی عمر ۲۰ سال کی تھی۔ اور اس کی آنکھوں نے اس سے پیشتر ایسا ہنگامہ خیز سین کبھی نہ دیکھا تھا۔ ریلوے سٹیشن پر ہنستے روتے نعرے لگاتے اور خاموش مردوں عورتوں اور بچوں کا ایک ہجوم تھا...... لیکن اب...... اب اسے بھوک لگ رہی ہوگی۔

(۲)

ماں دوڑتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔ "بیٹا پہلے کھانا کھالو۔ اسباب کو یونہی پڑا رہنے دو۔"

اس تقریب پر ڈنر خاص اہتمام سے تیار کیا گیا تھا۔ اس کے حسب پسند کھانے میز پر چن کر رکھے گئے تھے۔ "اوہ! اتنے کھانے؟" پھر اس نے ہنستے ہوئے کہا: "مجھے چنداں بھوک نہیں۔ میں نے ڈائننگ کار میں کھانا کھالیا تھا۔ یونہی وقت گذارنے کی خاطر۔ لیکن میں دوبارہ کھا سکتا ہوں"

اس دعوے کے باوجود وہ کچھ زیادہ نہ کھا سکا۔ اور ازراہ معذرت ہلکا سا قہقہہ لگاتے ہوئے اس نے کہا: "ایک سال پہلے میں اس سارے کھانے کو دیکھتے دیکھتے چٹ کر جاتا۔"

بیوی کو قدرے صدمہ پہنچا۔ "کیا وہ واقعی اتنا بے پرواہ ہوگیا ہے۔ اس نے ہمارے جذبات کی قدر نہ کی۔ اس کی خاطر سے ہم نے اتنی پرتکلف ضیافت کا انتظام کیا۔ کیا وہ تھوڑی دیر کے لئے اپنی اشتہا کو روک نہیں سکتا تھا؟"

اس اثنا میں اس نے اپنے زمانۂ اسیری کی سرگذشت چھیڑ دی: "جب ہمارے ساتھیوں کو پہلی مرتبہ گھر سے پارسل موصول ہوئے۔ تو ہم ان پر بھوکے بھیڑیوں کی طرح پل پڑے۔ گوشت اور سبزی کے ڈبے سگرٹ کے پیکٹ مٹھائیاں۔ چاکولیٹ۔ دیکھتے دیکھتے یہ ساری چیزیں ختم ہوگئیں۔ اس رات ہم میں سے آدھے تقریباً بیمار پڑ گئے۔"

وہ یکایک رک گیا اور سگرٹ کو دیا سلائی دکھاتے وقت اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

بیوی کے دل میں جذبۂ ہمدردی نے جوش مارا جس کی لہروں میں تمام شکوے خس و خاشاک کی طرح بہہ گئے۔

ماں نے کہا: "تو تمہیں کافی کھانا بھی نہیں ملتا رہا؟"

بیٹے نے مسکراتے ہوئے کہا: "لیکن اس میں ان کا کیا قصور؟ ہر چیز بشرطیکہ دستیاب ہو سکے راشن پر ملتی تھی۔ پھر ان کے اپنے سپاہیوں کی ضرورت سب پر مقدم تھی۔ اور وہاں فاقہ مستی کا یہ عالم تھا کہ جب روٹی کے ٹکڑے کو ہمارے یہاں کے کتے نہ کھائیں۔ ان کے لئے ان کے بچے ترستے

تھے .خیر یہ سب خواب سا معلوم ہوتا ہے۔ایک ہولناک خواب جو ختم ہو گیا ہے ..... اب کیا ہوگا!
اس نے آخری الفاظ زیر لب کہے۔

بوڑھے باپ نے کہا: "اس کی فکر نہ کرو خدا کا دیا سب کچھ ہے۔ اور تمہارے آنے سے پیشتر میں نے نیو انشورنس کمپنی کے ذریعے انتظام کر لیا ہے"

"ان ..... شو ..... رنس ..... کمپنی" بیٹے نے آہستہ آہستہ ان الفاظ کو دُہرایا گویا وہ ہر وقفہ پر ان کی اہمیت محسوس کر رہا ہے۔ پھر اس نے اپنے بازوؤں کو انداز احتجاج حرکت دی۔ اس کے لب و لہجہ میں ایک گونہ درشتی تھی اور تلخی۔

"ابا جان! اگر بچپن سے مجھے کسی کام سے نفرت رہی ہے تو وہ بیمہ ہے۔ منہ سے اور گزشوا سے خدا بچائے۔ سچ عرض کرتا ہوں جب یونیورسٹی نے ریاضی کو ایک اختیاری مضمون بنا دیا تو میں شکرانہ بجا لایا اور میں کرکٹ ٹیم میں کیوں شامل نہ ہوا اس لئے کہ وکالت کے امتحان میں کامیابی یقینی ہو جائے۔ اور وہ امتحان بھی نہ دے سکا۔ جنگ!

بیوی نے اس کی طرف غور سے دیکھا۔ اس کے دل میں ایک خوف سا پیدا ہو رہا تھا۔ کیا یہ وہی آدمی ہے۔ آخر اسے ہو کیا گیا ہے۔ اس نے کلاک کی طرف دیکھا اور کہا: "بچے کے جاگنے کا وقت ہے میں ذرا اوپر ہو آؤں"

یہ کہکر وہ اُٹھ کھڑی ہوئی اور سیڑھیوں کی طرف چل دی نصف رستہ میں کھڑے ہو کر اس نے دیوار سے کان لگائے۔ باپ بیٹے میں بحث ہو رہی تھی چند نا تمام جملے اس کے کانوں میں پڑے "نہیں ابا جان۔ غلط خیال..... دشمن کو شکست ..... جنگ کو جیت لینا کافی نہیں۔ بلکہ..... دائمی امن ..... نئی پود ..... ایک جدید سیاسی فلسفہ۔ عزت اور قومی تعصب کا خاتمہ..... ایک انقلاب ..... بین الاقوامی اتحاد ..... عالمگیر اخوت ..... نیا نظام عالم" اس قسم کے الفاظ تو اس کے خاوند کی زبان پر پہلے کبھی نہ آئے تھے۔ اسے ہو کیا گیا ہے؟ اب وہ سیڑھیوں پر چڑھنے لگی: "کیا وہ اپنے بچے کو دیکھنے کے لئے بے قرار نہیں۔ بوڑھا باپ تو پنشن یافتہ سکول ماسٹروں کی طرح بحث چھیڑ دینے کا عادی ہے۔ کیا اس کے لئے یہی موزوں وقت ہے" پھر کرسیوں کے ادھر اُدھر ہونے کی آواز اور ساں کے الفاظ "بیٹا اب تم آرام کرو دس بج گئے ہیں۔"

خاوند زینے کے قریب آ رہا تھا بیوی دبے پاؤں اوپر چلی گئی۔ اور اپنے کمرہ کے برآمدہ میں ٹھہر گئی جہاں بچہ پنگھوڑے میں سو رہا تھا۔

(۳)

اب وہ اکیلے تھے۔ بیوی نے خاوند کی طرف دیکھا۔ اس کے دل کی گہرائیوں سے دعائیں اٹھ رہی تھیں کہ وہ ایک جست میں قریب آ کر اپنے مضبوط بازوؤں میں بھینچ لے۔ وہ اس کے قریب آ کر ٹھہر گیا۔ خاموش۔ پھر اس کی نظریں جھولا پر گڑ گئیں چپ چاپ۔ کیا وہ اپنے بچہ کو اپنی بیوی سے زیادہ محبوب سمجھتا ہے۔ ان کے مابین پردہ سا حائل ہو گیا تھا۔ کیا وہ ایک لفظ ایک حرکت سے اس پردہ کو توڑ نہیں سکتا۔ بیوی کی نگاہوں میں التجا تھی۔ اور دردناک اپیل۔ خاوند نے پنگھوڑے کی طرف بازو پھیلائے۔ اس کی انگلیوں میں ارتعاش تھا۔ بیوی نے بے اختیار بچے کو اٹھایا۔ باپ نے اپنی ناک بچہ کے پیٹ پر رکھ دی۔ اس میں سے بچے کی سی عجیب و غریب خوشبو آ رہی تھی۔ بچے نے نیند میں ڈوبی ہوئی ادھ نیم وا آنکھوں سے

اس کی طرف دیکھا۔

باپ نے ہنستے ہوئے کہا: "اس کی شکل صورت تم سے یا مجھ سے کس سے ملتی ہے؟ اتنا موٹا تازہ! یہ کھاتا کیا ہے۔ دودھ، مچھلی، بسکٹ، کیک، میں تمہیں مبارکباد دیتا ہوں تم نے جو فوٹو بھیجا تھا اس سے تو کہیں زیادہ تندرست نظر آتا ہے۔ کب اُٹھتا ہے۔ کب سوتا ہے کتنی دیر سوتا ہے۔ کب روتا ہے۔ کب ہنستا ہے اور کیوں؟"

اس نے فوجی افسر کی طرح سوالات کا تانتا باندھ دیا جو ملزم سے پوچھے جاتے ہیں۔

بیوی نے اپنے دل میں کہا۔ کیا وہ یہی باتیں پوچھنا چاہتا ہے۔ اور بس۔ اسے میرے متعلق......

سیڑھیوں پر کسی کے چڑھنے کی آواز آئی تھوڑی دیر بعد باپ نے کہا: "بیٹا تمہاری ماں کی طبیعت قدرے ناساز ہو گئی ہے میں تمہارے آرام میں مخل ہونا نہیں چاہتا میں صرف اتنا پوچھنا چاہتا ہوں دشمن کو شکست تو ہو گئی۔ اب اس کا کیا خیال ہے وہاں لوگوں کے تاثرات کیا ہیں۔ اخباروں سے تو کچھ پتہ نہیں چلتا۔ بیٹی تم ذرا بچہ کو دودھ پلاؤ۔ ہم یہیں چند منٹ باتیں کریں گے"

ماں بچہ کو اُٹھائے خواب گاہ میں چلی گئی۔ "پھر وہی سیاسی فلسفہ!" کمرے کے گوشہ میں بچہ کو دودھ پلاتے وہ ایک طویل اور مبہم گفتگو سن رہی تھی۔ آخر وہ بچہ کو ساتھ لئے چارپائی پر لیٹ گئی: "کیا وہ اندر نہیں آئے گا"

باپ بیٹے میں گرما گرم بحث جاری تھی۔

باپ۔ "دشمن کی وہ گت بنانی چاہئے کہ وہ آئندہ سر نہ اٹھا سکے ..... بین الاقوامی معاہدہ کی تقدیس کو برقرار رکھے بغیر عالمگیر امن ناممکن ہے"

بیٹا۔ "عالمگیر مسائل محض لفاظی سے حل نہیں ہو سکتے۔ آپ دشمن کے جذبات کا اندازہ نہیں لگا سکتے ہماری طرح ان کے سپاہیوں کو بھی یہی احساس تھا کہ ہم ایک ارجمند مقصد کی خاطر لڑ رہے ہیں۔ ارجمند مقصد! ابا جان آپ کی جانے بلا ہم کس دوزخ میں سے ہو کر گزرے ہیں ہم دوبارہ یہ دوزخ برپا نہ ہونے دینگے۔ کیا مائیں بچوں کو اس لئے جنیں۔ کہ جونہی وہ جوان ہوں۔ انہیں جنگ کی بھٹی میں جھونک دیا جائے"

ایک لمحہ کے لئے خاموشی طاری ہو گئی۔ سوئے ہوئے بچہ کے مدھم خراٹوں کی آواز آ رہی تھی بیوی کے خواب آلود دماغ میں دو سال پیشتر کے دھندلے نقوش ابھر ابھر کر نمایاں ہو رہے تھے۔ وہ ان دنوں لا کالج میں پڑھتا تھا۔ یونیورسٹی کے زیر اہتمام جو جلسہ ہوا اس کے دوران میں ان کی ملاقات جس کا سلسلہ اس وقت تک نہ ٹوٹا جب تک ان کی شادی نہ ہو گئی۔ اور شادی کے ایک ہفتہ بعد وہ محاذ جنگ پر چلا گیا پہلے پہل اس کی چٹھیاں جذبات محبت سے معمور ہفتہ میں دو مرتبہ آیا کرتیں پھر ان کے درمیان وقفہ بتدریج بڑھنے لگا پھر کبھی کبھار چٹھی آ جاتی معمولی یہاں سب خیریت ہے۔ یکایک ان کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ دفتر جنگ کی اطلاع کے مطابق وہ دشمن کی قید میں تھا۔ قیدی! وہ ایک لمبی رات وہ کئی دن تک متواتر سو نہ سکی۔ اور اب دو سال کے بعد آیا ہے۔ تو باپ بیٹے میں پولیٹکل بحث ہو رہی ہے۔ کلاک نے ایک بجایا۔

باپ کہہ رہا تھا: "ہاں تو میرا مطلب یہ نہیں۔ کہ کسی اعلےٰ مقصد کو پیش نظر رکھے بغیر جنگ شروع کر دی جائے"

بیٹے نے بے صبری سے کہا: "مصیبت یہ ہے کہ ہر ملک کے لوگ جو مصروف جنگ ہیں۔ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم ایک بلند مقصد کی خاطر لڑ رہے ہیں خیر جو کچھ ہو گیا اسے جانے دیجئے۔ آیندہ کیلئے

میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ دنیا بھر کے نوجوانوں نے آیندہ جنگ کو ناممکن بنانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اور یہ قطعی امر ہے۔"

باپ نے پائپ بھرا اور کش لگاتے ہوئے اٹھا۔ "اچھا آرام کرو صبح باتیں کریں گے میرے چند دوست کل آ رہے ہیں۔ وہ تم سے تبادلہ خیالات کر کے بہت محظوظ ہوں گے۔"

میاں بیوی کو باتیں کرتے نہ معلوم کتنی مدت گذر گئی خاوند نے کہا: "ہمارے والدین کو خدا جانے کیا ہو گیا تھا۔ مجھ ایسے ہزاروں نوجوان روزمرہ تے تھے۔ وہ بھی میری طرح یہ کہتے نہ تھے۔ کہ آیندہ جنگ کو موقوف کرنے کا کوئی نہ کوئی طریقہ برتنا چاہیئے بہر حال ان گنت نوجوانوں نے اپنی اولاد کو جنگ کی زد سے دور کرنے کا عہد کر رکھا ہے میرے بالغ ہونے میں ابھی تین ماہ تھے۔ کہ مجھے محاذ جنگ پر بھیج دیا گیا۔"

خاوند نے بیوی کے گلے میں بازو حائل کرتے ہوئے کہا: "میری جان! یہ دیکھو ہمارا بچہ خدا اسے پروان چڑھائے میرے والدین کو میری اکیسویں سالگرہ منانے کا موقع نہ ملا۔ کہ میں اس وقت میدان جنگ میں تھا۔ میں اپنے والد کی طرح پدرانہ شفقت سے اتنا عاری نہیں ہم دونوں مل کر اسے مسرت آمیز زندگی بسر کرنے کے قابل بنائیں گے ہم اس کی تعلیم میں حارج نہ ہوں گے۔"

بیوی نے کہا "ہاں ایک بات اور ہم اس کی اکیسویں سالگرہ پر ایک شاندار ضیافت کا اہتمام کریں گے۔"

ان دونوں نے قہقہہ لگایا۔ بچہ بلبلا اٹھا صبح ہوئی۔ دوپہر اور شام گردش لیل و نہار کا یہی سلسلہ جاری رہا۔ تا آنکہ ان کے بچہ نے طفلی اور نوجوانی کی ۲۰ منزلیں طے کر لیں۔

اس کی اکیسویں سالگرہ کی تقریب منانے کے لئے تیاریاں ہو رہی تھیں۔ دعوت نامے لکھے جا رہے تھے۔ فضا شادمانی و مسرت سے معمور تھی کہ اخبار فروشوں کی مختلف صدائیں بلند ہوئیں۔

"دوسرا عالمگیر جنگ شروع ہو گیا۔" "جبری بھرتی کا قانون"۔ "نوجوانو! ملک اور قوم کی حفاظت کے لئے سینہ سپر ہو جاؤ۔" "رہنمایان قوم کا ولولہ انگیز پیغام۔" "بھرتی کے دفتر کے سامنے ہزاروں نوجوان جمع ہیں۔"

وہ ۱۹۱۸ء کا واقعہ تھا۔ یہ ۱۹۳۹ء کا واقعہ ہے۔

غیر معروف جرنلسٹ

اقبال کے بعد

جگہ کی قلت کے باعث مجھے اپنے مقالات کی تیسری قسط کی اشاعت اس بار بھی ملتوی کرنا پڑی جس کے لئے معذرت خواہ ہوں۔

واصل

غزل

آپ سے محبت تھی آپ سے محبت ہے
یہ مرا فسانہ ہے یہ مری حکایت ہے

اک لطیف جوش میں تم کو چوم بیٹھا ہوں
اس حسین جرات پر مجھکو خود ندامت ہے

یہ شراب نوشیاں گیسوؤں کی چھاؤں میں
مجھ خراب حال پر کس کی یہ عنایت ہے

انحراف ہوش بھی کوئی ہے جیسے خطا
میری بیخودی سے کیوں دہر کو شکایت ہے

اشک تھمتے ہی نہیں آہ رکتی ہی نہیں
جیسے میری زندگی درد سے عبارت ہے

چھیڑ کر رباب دل ہائے میں نے کیا کیا
تم بھی شرمسار ہو مجھکو بھی ندامت ہے

اپنے آپ سے ہی میں بدگمان ہوں اثر
کچھ عجیب آجکل میرے دل کی حالت ہے

اثر چکوالی۔ بی اے

سقراط کی مَوت

پھٹے پرانے اور بوسیدہ کپڑوں میں ایتھنز کی سڑکوں پر ننگے پاؤں پھرنے والا ایک بدصورت شخص جس کے بدن نے سردی ہو یا گرمی ایک کوٹ کی شکل تک نہ دیکھی ہو اگر دنیا کی تاریخ میں اس وقت کی عظیم ترین ہستی تصور کی جائے تو کیا جائے تعجب نہیں۔ دنیا اسی شخص کو سقراط کے نام سے یاد کرتی ہے۔ اس کے نام کے لئے آج ہر طرف عزت محبت اور تعریف ہے۔

سقراط ۴۷۰ سال قبل از مسیح کے قریب ایتھنز میں پیدا ہوا۔ اس نے اپنی تمام زندگی ایتھنز کے شہریوں کے ساتھ گفتگو کرنے میں گزار دی لیکن یہ اس کی عاقلانہ گفتگو ہی تو تھی جس کی وجہ سے وہ ایک فیلسوف مشہور ہوا۔ سقراط پر کفر اور دہریہ پن کا الزام لگایا گیا۔ اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ نوجوانان ایتھنز کے درمیان انہیں گمراہ کرنے والے خیالات کی تبلیغ کرتا ہے۔

۳۹۹ قبل از مسیح میں جبکہ سقراط کی عمر ۷۰ سال کی تھی۔ اس کے دشمنوں نے اس پر مقدمہ چلایا۔ سقراط نے قانون کے مطابق اپنے بچاؤ میں جو لمبی تقریر پانسو ججوں اور شہریوں کے سامنے کی۔ آج ایک لاثانی دستاویز تصور کی جاتی ہے۔ افلاطون نے جو سقراط کے ساتھیوں میں سے تھا اس تقریر کو لکھا ہے سقراط نے تقریر کرتے ہوئے کہا۔

اے ایتھنز کے باشندو! میں نہیں جانتا کہ مجھ پر الزام لگانے والے حضرات کی لچھے دار باتوں نے تم پر کہاں تک اثر کیا ہے لیکن مجھے معلوم ہے کہ ان کے ترغیب دہ الفاظ اس قدر پُر اثر تھے کہ انھوں نے مجھے بھلا دیا کہ میں کون ہوں لیکن کیا میں کہہ سکتا ہوں کہ انھوں نے شائبہ بھر بھی سچ نہیں بولا......

میں عدالت کے طور و طریق سے بالکل بے خبر ہوں۔ اس ستر سال کی عمر میں آج پہلا موقعہ ہے کہ میں نے عدالت کی چوکھٹ پر قدم رکھا ہے اگر میں کوئی بات اس طریقے سے کہوں جس کا میں عادی ہو گیا ہوں یا جو تم نے روزمرہ کی زندگی میں سنی ہو تو مجھے ایک پردیسی سمجھ کر معاف کر دینا میرے بولنے کے طریقے پر نہ جایئے سچائی کا امتحان ہے منصف کو چاہیئے کہ انصاف کرے اور بولنے والے کو لازم ہے کہ سچ بولے"

سقراط نے یہ بتلاتے ہوئے کہ اس نے ایتھنز کے باشندوں کو خوش و خرم دیکھنے کے لئے اپنا سب کچھ قربان کر دیا تھا کہ دیوتاؤں کے حکم سے اس نے لوگوں پر دولت سے زیادہ روح کی طاقت کو ظاہر کیا تھا۔" مجھے سوائے دیوتاؤں کے حکم کے اور کیا غرض پڑی تھی کہ میں ہر شخص سے ملتا اور کہتا۔ اپنے آپ کو جانو۔ اچھے بنو..... کیا میں نے کبھی کسی سے کچھ مانگا۔ یا معاوضہ طلب کیا..... میری غربت میرا سب سے بڑا ثبوت ہے..... بس بس۔ میری باتیں ابھی ختم ہوا چاہتی ہیں۔ تم میں سے بہت سے اشخاص ایسے بھی ہوں گے۔ جو سوچتے ہوں گے کہ سقراط کو کیا ہو گیا ہے وہ تو ایسے موقعہ پر گڑگڑاتا آنسو بہاتا اپنے ننھے ننھے بچوں کو عدالت کے سامنے پیش کرتا تا کہ ان کے دلوں میں سویا ہوا رحم جاگ پڑے وہ اس کی جان بخشی کر دیں تو اسے میں جواب دوں گا اے دوست میں بھی ایک انسان ہوں دوسرے انسانوں کی طرح میری ساخت بھی گوشت و پوست سے ہوئی ہے میں کوئی لکڑی یا پتھر کا ٹکڑہ نہیں۔ اور میرے...... ہاں ہاں میرے بال بچے بھی ہیں لیکن میں ان میں سے کسی کو بھی آپ کے سامنے اس لئے نہیں لاؤں گا۔ کہ تم مجھے آزاد کر دو۔ کیوں نہیں؟ اس لئے کہ اس قسم کا برتاؤ مجھے ذلیل معلوم ہوتا ہے۔ مجھ سا معمر شخص اگر اس طرح گڑگڑائے تو کیا باعث شرم نہیں۔ لوگ کہیں گے کہ ایتھنز کے وہ لائق شخص جنہیں ایتھنز کے باشندے خود عزت و وقار بخشتے ہی عورتوں سے بہتر نہیں ....."

میں اپنے متعلق کوئی سزا کیوں تجویز کروں مجھے معلوم ہے کہ ہر سزا بری ہے لیکن میں موت کی اچھائی یا بُرائی سے بے خبر ہوں۔ اگر میں کہوں قید ــــ بھلا میں کسی کا غلام ہو کر کیوں رہوں۔ اگر سزا جرمانہ ہو اور تا ادائگی قید ـــــ تو بھی مجھے قیدی بننا پڑیگا کیونکہ جرمانہ ادا کرنے کے ذرائع میرے پاس نہیں ــــ اگر میں کہوں جلاوطنی ــــ تو جن الفاظ اور باتوں کو تم ــــ میرے اپنے شہری برداشت نہ کر سکے اُن کے متعلق یہ امید کیسے رکھوں۔ دوسرے انہیں سنیں گے اور کچھ نہ کہیں گے وہ کیا زندگی ہوگی۔ اس بڑھاپے میں شہر در شہر گھومنا ہر روز بدلتی دنیا میں بسنا اور ہر روز وہاں سے نکالا جانا میں جانتا ہوں کہ جہاں بھی جاؤں گا۔ نوجوان میرے پاس آئیں گے۔ اگر میں انہیں اپنے نزدیک نہ آنے دوں گا تو وہ اپنے بڑوں کو کہکر مجھے وہاں سے نکلوا دیں گے۔ اور اگر انہیں پاس بیٹھنے دوں گا۔ تو ان کے والدین اور احباب مجھے ان کی بہتری کی خاطر خود نکال دینگے...... کوئی کہے پھر سقراط تجھے کیا پڑی ہے کہیں چلا جا اپنی زبان بند رکھ پھر تجھے کوئی کچھ نہ کہے گا... لیکن میں تمہیں کیسے سمجھاؤں کہ یہ خدائی حکم کی نافرمانبرداری ہوگی۔ اے ایتھنز کے باشندو! میرا وقت قریب ہے۔ تم میرے قاتل ہو۔ موت کے قریب ہر شخص میں آئندہ کی باتیں جاننے کی قوت آجاتی ہے...... کیا میں بھی پیشینگوئی کروں میری موت کے بعد تم پر قہر الہی نازل ہوگا..... تم نے مجھے قتل کیا۔ کیونکہ تم الزام لگانے والے سے بچنا چاہتے تھے۔ اور اپنی زندگی کا حساب نہ دینا چاہتے تھے لیکن ابھی اور الزام لگانے والے زندہ ہیں۔ کیونکہ وہ جوان ہیں۔ وہ زیادہ سخت بھی ہوں گے۔ کیا تم سب کو قتل کر سکو گے؟ تم غلطی پر ہو۔ بچنے کا طریقہ یہ نہیں۔ نہ یہ راستہ باعزت اور پروقار ہے۔ آسان طریقہ تو دوسروں کو تباہ کرنے کی بجائے اپنے آپ کو سدھارنے میں ہے"

باوجود سقراط کی اس تقریر کے ایتھنز کی عدالت نے اسے مجرم گردانا۔ اس وقت کے قانون کے مطابق سقراط کو اجازت تھی کہ وہ خود اپنے لئے کوئی سزا تجویز کرے۔ اس نے پہلے ایک مائنا (مائنا ایک سکہ ہے جس کی قیمت تین پونڈ کے لگ بھگ ہوتی تھی) جرمانہ تجویز کیا۔ لیکن احباب کے اصرار پر کہ مبادا عدالت اسے اپنی ہتک تصور کرے اس نے اس کی تعداد تیس مائنا کر دی۔ عدالت نے اسے بھی نامناسب خیال کیا۔ اور سزائے موت تجویز ہوئی۔

سقراط نے بغیر کسی پرواکے اپنی تقریر کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔" اب ہمارے جدا ہونے کا وقت ہے میرے لئے موت ہے اور تمہارے لئے زندگی لیکن کون بہتر حالت کو جا رہا ہے۔ یہ خدا کے سوائے اور کوئی نہیں جانتا"

ایتھنز کے رواج کے مطابق یہ سزا اس وقت تک نہ دی جا سکتی تھی جب تک کہ "مقدس کشتی" جو ہر سال کسی نہ کسی نزدیکی جزیرے میں آتی تھی۔ نہ لوٹ آئے۔ اس "مقدس کشتی" کے لوٹنے تک جو تقریباً تین ہفتہ کا عرصہ تھا۔ سقراط کو قید میں رکھا گیا۔ اس کے دوستوں کو اس سے ملنے کی اجازت تھی۔ اس دوران میں وہ ان سے موت۔ روح۔ نیکی اور اسی طرح کے موضوعات

پر گفتگو کرتا رہا۔

کرائٹو نامی ایک شخص نے جو سقراط کے دوستوں میں سے تھا سقراط کے بچ نکلنے کا مکمل انتظام کر لیا لیکن سقراط نے بھاگ جانے سے صاف انکار کر دیا۔

"سقراط بتلاؤ تمہیں کس طرح دفنائیں؟"

"جیسے تمہیں پسند ہو بس ایک بات کا دھیان رکھنا۔ مجھے اس طرح پکڑ لینا کہ میں بھاگ نہ جاؤں"...... کرائٹو سمجھتا ہے کہ میں وہ سقراط نہیں رہا اور اب وہ مجھ سے ہی میرے دفن کرنے کا طریقہ پوچھتا ہے حالانکہ میں نے کتنی بار بتلایا ہے کہ زہر پیتے ہی میں ایک غیر فانی مسرتوں کی دنیا میں پہنچ جاؤں گا لیکن میرے ان الفاظ کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ کرائٹو ...... خوش ہو...... اور سمجھو کہ تم سقراط کو نہیں دفنا رہے اس کے جسم کو دفنا رہے ہو۔"

دوپہر ہو گئی تھی سقراط حمام میں گیا جب باہر نکلا غروب آفتاب قریب تھا۔ گھر کی عورتیں اور بچے اس سے ملنے آئے۔ اس نے انہیں دیکھا چند باتیں کیں اور گھر واپس بھجوا دیا۔ تب وہ اپنے ساتھیوں کی جانب مڑا۔ تھوڑی دیر بعد ہی قید خانے کا افسر داخل ہوا اور بولا۔

"سقراط میں تمہیں یہاں آنے والوں میں سے سب سے زیادہ نیک اور پاک خیال کرتا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ جب میں اپنے اوپر عائد کئے گئے فرض کو بجا لاؤں گا تو تم مجھ سے ناراض نہ ہو گے۔ بھلا میرا اس میں کیا ہاتھ ہو سکتا تھا......" اتنا کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

سقراط نے اس کی جانب دیکھا اور کہا "تمہاری خواہشات کا شکریہ۔ میں تمہارے کہنے کے مطابق ہی کروں گا...... کرائٹو۔ اگر زہر کا پیالہ تیار ہو گیا ہو تو کیا دیر ہے؟"

کرائٹو نے کہا: "ابھی سورج پوری طرح غروب نہیں ہوا۔ ابھی کچھ مہلت ہے پھر جلدی کیا ہے؟"

سقراط نے جواب دیا۔ "ہاں کرائٹو۔ دوسرے شخص اگر مہلت چاہتے ہیں تو ٹھیک کرتے ہیں کیونکہ ان کے خیال کے مطابق دیر کرنے سے انہیں فائدہ ہوتا ہے لیکن میرا دیر نہ کرنا ہی ٹھیک ہے۔ کیونکہ دیر کرکے۔ ہر چیز سے بھلا مجھے کیا فائدہ؟ گئی ہوئی زندگی کو بچانا بے سود ہے۔ مجھے تو اس پر ہنسی آتی ہے۔ کرائٹو اب دیر نہ کرو۔"

پیالہ لایا گیا ہنستے ہنستے خوشی خوشی پیالہ منہ کو لگایا اور تمام زہر پی گیا۔ اس کے ساتھی اس نظارہ کی تاب نہ لا کر چیخ اٹھے۔ ان کی چیخ و پکار اور تمام غم اس کے لئے نہ تھا بلکہ انہیں معلوم ہوا جیسے ان کے سروں پر سے ایک ایسا سایہ اٹھ گیا ہے جس کے بغیر وہ یتیموں کی طرح زندگی بسر کریں گے۔

سقراط پھر اور بولا: "یہ کیا؟ اسی لئے تو میں نے عورتوں کو یہاں سے بھجوا دیا تھا میں نے سنا ہے کہ انسان کو امن کے ساتھ مرنا چاہئے چپ رہو اور صبر رکھو۔"

یہ کہکر اس نے چلنا شروع کیا۔ اس کی ٹانگیں بھاری ہو گئیں۔ انہوں نے چلنے سے جواب دے دیا۔ وہ اپنی پیٹھ کے بل لیٹ گیا۔ زہر چڑھتا گیا آہستہ آہستہ ٹخنوں سے گھٹنوں میں گھٹنوں سے رانوں میں اور پھر ــــ حتیٰ کہ زہر کا اثر دل تک جا پہنچا۔ اس کا بدن سخت اور ٹھنڈا ہو گیا۔ اس نے اپنا منہ ڈھانپ لیا۔ ایک لحظہ کے بعد حرکت سی ہوئی۔ اپنے وقت کا نیک ترین انسان وہ فلاسفر جو ہر ایک کا دوست تھا ایک گہری اور میٹھی نیند سو گیا۔

کیا ہم اب کہہ سکتے ہیں کہ ان بوسیدہ کپڑوں اور بدصورت جسم میں ایک منزہ روح پوشیدہ تھی یقیناً عظمت کا تعلق انسان کے فانی جسم سے نہیں بلکہ روح سے ہے۔ گوردھن لال ایم۔اے

غزل

عقل و خرد کے جال سے بچ کے نکل گیا ہے دل
تو اسے دام عشق کے پیچ ذرا و کھائے جا

ابر کا رنگ قرمزی بادہ کا رنگ ارغواں
دونوں کے امتزاج سے رنگ نیا جمائے جا

تیرا تبسم جمیل نور و سرور کا کفیل
میرے غموں کی جھیل میں تازہ کنول کھلائے جا

میں بھی ہوں زادۂ بہار تو بھی ہے زادۂ بہار
میں تجھے گدگدائے جاؤں تو مجھے گدگدائے جا

زیست کو حادثات نے کر دیا بے طرح تباہ
اپنی نگاہِ لطف سے بگڑی مری بنائے جا

شمع خراشیاں مری جاری رہیں تو کیا ہوا!
تیرا سکوت ہے وہی بس یونہی مسکرائے جا

رازِ حیات کھل گیا تیری نگاہ جب اٹھی
پردہ دری نہیں ہے یہ پردے یونہی اٹھائے جا

عبد العزیز فطرت

(۳)

دوسرے روز میں سوکر دیر سے اٹھا دن نکل آیا تھا اور دھوپ کا رنگ تیز ہو چلا تھا۔ زمیندار باہر بیٹھے آدمیوں سے باتیں کر رہے تھے میں بھی باہر آکر بیٹھ گیا۔ زمیندار کی چھوٹی بچی ہرے رنگ کا کوٹ پہنے باہر نکلی۔ اس کے بالوں میں بندھا ہوا سرخ فیتہ بہت خوبصورت معلوم ہو رہا تھا۔ میں نے بچی کو اُٹھا کر شال میں چھپا لیا اور اس کے سنوارے ہوئے بالوں پر ہاتھ پھیرتا ہوا بولا۔ تمہارا نام کیا ہے بیٹی؟

وہ ہنس کر بولی "شستی"!

میں نے کہا تم بھی اچھی ہو اور تمہارا نام بھی، میں تم کو اپنے ساتھ شہر لے چلوں گا، موٹر پر بٹھا کر پھراؤں گا۔ اچھے اچھے کھانے کھلاؤں گا۔ کیوں چلو گی نہ میرے ساتھ؟

وہ خوش ہو کر میری گود میں اچھلنے لگی۔ بولی۔ ماں کو بھی ساتھ لے چلو گے نا؟

زمیندار صاحب شستی کی بات سنکر ہنس پڑے۔ شستی بھی ہنستی ہوئی میری گود سے بھاگ کر اندر چلی گئی۔

دوپہر کا کھانا کھا کر میں شستی کے ساتھ پھر گاؤں گھومنے اور جھیل کی سیر کرنے نکلا۔ وہ خوبصورت رنگین ساری پہنے سرسوں کے پیلے پیلے کھیتوں میں ایک تتلی سی معلوم ہوتی تھی۔ میں نے پیلے پھولوں کا ایک چھوٹا سا گچھا توڑ کر اس کے بالوں میں لگا دیا۔ اس کے زرد رنگ کو دیکھ کر مجھے گیتوں والی کی یاد آگئی اور میں اُسے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دور دور تک کے کھیتوں میں تلاش کرنے لگا۔

وہ یکایک سامنے سے آتی ہوئی نظر آگئی۔ شستی اسے دیکھ کر چلا اُٹھی "گیتوں والی۔ گیتوں والی" پھر وہ میری طرف مخاطب ہو کر بولی "گیت سنو گے وہ گیتوں والی آرہی ہے"۔

میں نے کہا "ہاں شستی بلاؤ مجھے اس کے گیت بہت بھلے معلوم ہوتے ہیں"۔

شستی دوڑ کر اس سے لپٹ گئی اور کہنے لگی "انہیں گیت سُنا دے، یہ دور شہر سے آئے ہیں ہمیں بھی موٹر پر لے جائیں گے۔ گیت سُنا دے گی تو تجھے بھی لے چلیں گے"۔

گیتوں والی ہنسنے لگی، شرم سے اس کے رخسارے سرخ ہو گئے، اس نے شستی کو گود میں اٹھا لیا اور چاہا کہ اسے لیکر چلی جائے لیکن میں رستے میں کھڑا تھا اور آس پاس کے کھیتوں میں مرد و عورت کام کر رہے تھے میں نے ذرا اونچی آواز سے پکارا "شستی آؤ چلیں جھیل کی سیر کرنے"

اس نے شستی کے کان کے پاس منہ لیجا کر کچھ کہا شاید یہی کہا ہوگا کہ وہ اسے یہیں کھیتوں میں گھمائیگی اور گیت سنائیگی۔ وہ اسے ساتھ لئے ہوئے گوبھی اور شلجم کے کھیتوں کے درمیان سے ہو کر آگے بڑھ گئی اور میں وہیں کھڑا کا کھڑا دیکھتا رہ گیا کچھ دور جانے کے بعد اس نے ایک دفعہ پیچھے مڑ کر دیکھا اور ہنس کر گردن پھیر لی پاس ہی شلجم کے کھیتوں میں ایک بوڑھا پانی دے رہا تھا اور اس کی بڑھیا کھرپی لئے مینڈوں کو کاٹ کاٹ کر پانی کا راستہ بنا رہی تھی۔ سادہ لڑکیاں سرسوں کے چھوٹے پودوں کو جن میں ابھی پھول نہیں آئے تھے توڑ توڑ کر جمع کر رہی تھیں۔ وہ ان کو بیچنے کے لئے بازار لے جائیں گی۔ دُور کے کھیت میں ایک نوجوان دیہاتی نے گیت گانا شروع کیا جسے بوڑھا کسان پانی کھینچنا بند کر کے سننے لگا۔

میں کھیتوں کی ہریالی دیکھتا ہوا جھیل کی طرف بڑھا چلا جا رہا تھا۔ میرا دل بار بار کہہ رہا تھا کہ گاؤں بھی کتنے دلکش اور سہانے ہوتے ہیں جن کو سکون و اطمینان کی خواہش ہو اسے گاؤں میں آکر رہنا چاہئے شہروں کے باشندے بنگلوں اور کوٹھیوں میں بیل بوٹے اور دلاتی پودے لگاتے ہیں لیکن ان میں ان کھیتوں کی سی رنگینی اور دل آویزی پیدا نہیں ہوتی۔

میں نے طے کر لیا کہ ابھی چند روز یہاں اور ٹھہروں گا۔

رات والے راستے سے چل کر میں جھیل پر پہنچا۔ پانی پگھلی ہوئی چاندی کی طرح جھلمل جھلمل کر رہا تھا۔ کچھ لڑکے کنارے پر کھیل رہے تھے۔ کچھ پانی میں اتر کر کنول کے پھول توڑ رہے تھے۔ دوپہر مرغابی جل مرغ اور سون "قیں قیں" کرتے ہوئے تیر رہے تھے۔ لڑکوں نے شور کر کے انہیں اڑا دیا۔ وہ جھنڈ کے جھنڈ اڑ کر جھیل کے اوپر چکر لگانے لگے۔ ان کا پانی کے اندر تیرتا ہوا عکس دیکھنے میں عجیب تماشا سا معلوم ہو رہا تھا۔ تھوڑی دیر تک اڑتے رہنے کے بعد وہ جا کر ایک کنارے پر بیٹھ گئے۔ اور پھر لگے باری باری پانی میں اُترنے۔

میں نے ایک لڑکے سے پوچھا۔ اس جھیل کا نام کیا ہے جی؟

لڑکا بولا۔ اس کا نام تو ہے بابوجی وہر لیکن ہم لوگ اسے گیتوں والی جھیل کہتے ہیں۔

میں نے قدرے حیرت کے ساتھ سوال کیا۔ یہ کیوں؟ کیا یہ گیت گاتی ہے؟

اس نے جواب دیا۔ یہ بات نہیں ہے بابوجی۔ ہم اس کو اس لئے گیتوں والی کہتے ہیں کہ یہاں جو آتا ہے اس سے گیت گائے بغیر نہیں رہا جاتا۔ ذرا دیر میں آپ بھی گنگنانے لگیں گے۔ یہ اس جھیل میں خاص اثر ہے۔

میں مسکراتا ہوا آگے بڑھ گیا اور ایک جگہ بیٹھ کر سوچنے لگا۔ یہاں گیتوں کا کتنا رواج ہے۔ لڑکے تک گانا جانتے ہیں۔ واقعی میں خود بخود گنگنانے لگا۔

یکایک وہی لڑکا پیچھے سے بولا۔ دیکھا بابوجی میں نے جھوٹ کہا تھا؟ آپ ہی گا رہے ہیں میں دیر سے کھڑا سن رہا ہوں۔

میں نے چاہا کہہ دوں۔ لڑکے میری بات چھوڑ دے میں گیت لکھتا ہوں۔ اس لئے میری تو عادت ہی گنگنانے کی ہے لیکن اس بھولے بچے کا دل توڑنا گوارا نہ ہوا۔ میں نے کہا بچے! تم ٹھیک کہتے ہو یہ گیتوں والی جھیل ہے۔ یہ کہہ کر میں وہاں سے چل دیا۔

میں واپسی میں پھر انہیں کھیتوں سے گذرا۔ وہ اس بار بھی مجھے مل گئی۔ اس کے سر پر لکڑی کا چھوٹا سا گٹھا تھا۔ جسے وہ باغ سے چن کر لا رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس نے آنکھیں نیچی کر لیں اور رستے سے ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے کپڑے میلے کچیلے تھے اور وہ مزدورنی سی معلوم ہو رہی تھی۔ میں ایکبار اس کی طرف دیکھ کر پاس سے نکل گیا۔ آگے بڑھ کر میں نے بار بار مڑ کر دیکھا وہ اس جگہ کھڑی ہو کر میری طرف دیکھ رہی تھی۔ ہر بار میری نظر اس کی نظر سے مل جاتی تھی۔

میں سوچنے لگا وہ ایسا کیوں کرتی ہے؟ وہ اس طرح مجھ کو کیوں مل جایا کرتی ہے؟ اس کی شادی ہو چکی ہے، اس کا شوہر جنگ پر چلا گیا ہے معلوم نہیں زندہ ہے یا مر گیا۔ اگر اس کا شوہر واپس نہ آیا تو یہ کیا کریگی؟ مجھے اس کے شوہر پر غصہ آنے لگا۔ اس نے ایسی نوجوان اور خوبصورت عورت کو چاندی کے ٹکڑوں کے لئے چھوڑ دیا۔

مجھے اپنے اوپر بھی غصہ آرہا تھا میں کیوں اس کی طرف دیکھتا ہوں۔ کیوں اس کے بارے میں یہ سب سوچتا ہوں۔ یہ کتنی بری بات ہے میں کل ہی یہاں سے چلا جاؤں گا، یہاں رہنا اچھا نہیں لیکن اس کے گیت کتنے دل گداز و جان سوز ہوتے ہیں جذبات خلوص میں ڈوبے ہوئے ہیں میں کچھ دنوں اس کے گیت اور سنوں گا اور لکھوں گا وہ اپنے کچھ گیت مجھے لکھا بھی دے۔

گھر پہنچ کر میں نے زمیندار سے کہا۔ دوست تمہارے گاؤں نے مجھ پر جادو کر دیا ہے۔ اب میں دو چار دن اور رہ جاؤں گا۔ وہ میری طرف دیکھ کر ہنسنے لگے۔

(۴)

مجھے یہاں آئے پانچواں روز تھا۔ اس درمیان میں کئی بار جھیل کی سیر کر چکا تھا اور گیت بھی سن چکا تھا ان میں دو تین بار اس سے بھی ملاقات ہو جاتی تھی۔ اب وہ مجھ سے بات چیت بھی کرنے لگی تھی۔ میں اس سے ملنا ہی چاہتا بھی تھا تنہائی میں ایک روز میں نے اس سے پوچھا تم بہت اچھا گاتی ہو تمہارے گیت مجھے ہمیشہ یاد رہیں گے میں نے تمہارے بہت سے گیت لکھ بھی لئے ہیں تم نے کہاں سیکھے ایسے اچھے گیت؟

اس نے جواب دیا۔ آپ بھی تو جھیل کے کنارے بیٹھے گھنٹوں گاتے رہتے ہیں۔ آپ نے گیت کس سے سیکھے ہیں؟

میں نے اسے سمجھایا میں اکیلا ہوتا ہوں تو جو جی میں آتا ہے گنگنانا شروع کر دیتا ہوں پھر اسی کو لکھ لیتا ہوں، وہی گیت بن جاتا ہے۔

وہ کہنے لگی میں بھی بالکل یہی کرتی ہوں، کام دھندے سے فرصت کر کے لیٹتی ہوں تو ان کی یاد ستانے لگتی ہے۔ اس وقت جو جی میں آتا ہے کہنے لگتی ہوں۔ اس کو سنکر گاؤں والے کہتے ہیں میں گیت گا رہی ہوں۔ لیکن یہ بھی کوئی گیت ہیں جن کو گانے والا رو ئے۔ بس اتنی بات ہے کہ اس طرح میری طبیعت کچھ ہلکی ہو جاتی ہے۔

میں نے اس سے پوچھا تمہاری شادی ہو چکی ہے تم میرے جیسے اجنبی آدمی سے بات کرتے ڈرتی نہیں کوئی دیکھ لے تو؟

وہ بولی۔ دیکھکر کیا کرینگے؟ کچھ گاؤں والوں کا ڈر تھوڑا ہی پڑا ہے میں آپ کی نظر پہچانتی ہوں۔ گاؤں کے کتنے آدمی جن بری نظروں سے مجھے گھورتے ہیں۔ آپ نہیں گھورتے۔

میں کھلکھلا کر ہنس پڑا وہ شرما کر زمین کی طرف دیکھنے لگی۔ میں نے کہا تمہارا گاؤں بڑا اچھا ہے۔ جی چاہتا ہے یہیں بس جاؤں مگر جا رہا ہوں۔

وہ بولی ایسا کونسا کام اٹکا ہے جس کے لئے جانا اتنا ضروری ہے۔ تھوڑے دن اور رہ نہ لو اب ہریالی برابر بڑھتی ہی جائیگی۔ اور کچھ ہی دنوں میں سرسوں کے تمام پودے ایک ساتھ اپنے پیلے پیلے پھولوں کے ساتھ ہنسنے لگیں گے۔ تو گاؤں اور بھی دیکھنے کے لائق ہو جائیگا۔ بسنت بھی آہی چلا ہے۔ بس اب آموں میں بور آئیگا۔ اور کوئل بورے لدی ہوئی ڈالیوں پر کوکتی پھریگی۔ گاؤں سب پیلے کپڑے پہنیں گے اور خوب رنگ رلیاں منائیں گے۔

میں نے کہا ہاں تم یہ سب تو ٹھیک کہتی ہو مگر کیا کروں کہ کالج میں چھٹی نہیں ہے۔

" اچھا تو پھر مجبوری ہے۔"

یہ کہکر وہ چلی گئی، میں ٹکٹکی باندھے اسے دیکھتا رہ گیا۔

شام کو مجھے جانا تھا۔ اس لئے میں نے چاہا ایکبار اور جھیل کی سیر کر آؤں چنانچہ صبح ہی صبح جھیل جانے کے لئے گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ سورج کی ٹھنڈی کرنیں پانی پر پڑ رہی تھیں اور کنول کے سرخ سرخ پھول کھل گئے تھے۔ ان کے چوڑے چوڑے سبز و شاداب پتے پانی پر پھیلے ہوئے تھے۔ ان کے درمیان سرخ سرخ پھول بہت دلفریب اور خوش نما معلوم ہو رہے تھے۔ کنارے کی گھاس سیدھی کھڑی ہو گئی تھی۔ اور اس کی جڑ میں بھرا ہوا پانی کالا کالا سا معلوم ہو رہا تھا۔

کچھ دور چڑیاں شور و غل مچا رہی تھیں۔ ایک لڑکے نے کنول کا ایک بڑا سا پھول توڑ کر مجھے دیا میں اسے دیکھ دیکھکر خوش ہو رہا تھا۔ اتنے میں پیچھے کچھ آدمیوں کے آنے کی آہٹ معلوم ہوئی میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ کچھ لوگ شکاری کپڑے پہنے ہاتھ میں بندوق لئے آ کر کنارے پر کھڑے ہو گئے۔

جھیل سے لوٹتے ہوئے میں جیسے ہی باغ میں داخل ہوا۔ وہ لکڑیاں توڑتی ہوئی دکھائی دی میں پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ بولا۔ گیتوں والی! میں آج شام کو یہاں سے جا رہا ہوں۔ کوئی اچھا سا گیت سنا دو۔ شاید پھر کبھی مجھے تمہارا گیت سننے کا موقعہ نہ ملے۔

اس نے جواب میں اس طرح میری طرف دیکھا جیسے کہہ رہی ہو۔ تم نے اتنے دنوں تک میری طرف دیکھ دیکھکر میرے دل میں شوق پیدا کر دیا ہے۔ اس لئے میں تمہیں دیکھنا چاہتی ہوں، تم نہ جاؤ۔ تم چلے جاؤ گے۔ تو مجھے بہت برا معلوم ہوگا۔ میرا شوہر دور لڑائی پر گیا ہوا ہے۔ وہ نہ جانے کب تک واپس آئے، میری بات مانو یہیں رہو،

یہ سب میں خود کہہ رہا ہوں لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے یہ اسی کے الفاظ ہیں۔

اس نے میری فرمائش کے مطابق ایک گیت سنایا۔

"بسنت آتے دیر نہیں لگتی سال کتنی جلدی پورا ہو جاتا ہے لیکن سوامی کا ایک دن کا انتظار ایک سال سے بھی زیادہ معلوم ہوتا ہے۔"

"جھیل کے کنول کھل کر دن بھر تمہارا انتظار کرتے ہیں اور شام کو مایوس ہو کر بند ہو جاتے ہیں۔ ان پر پڑی ہوئی شبنم سے ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے وہ تمہاری جدائی میں آنسو بہا رہے ہوں۔"

"میری وہ پہلے والی ہنسی نہ جانے کہاں چلی گئی۔ کھیتوں میں اکیلے کام کرتے کرتے جی اکتا گیا ہر دم تمہاری ہی سوچ میں پڑی رہتی ہوں۔ معلوم نہیں تم کب آؤ گے؟"

وہ گیت پورا کر کے چپ ہو گئی میں نے کہا۔ لڑائی برابر زور پکڑتی جا رہی ہے تم نے ان کو جانے ہی کیوں دیا وہاں سے بہت بری خبریں آ رہی ہیں۔

اس نے اندوہگین لہجے میں کہا۔ کیا کروں، میں نے تو انہیں بہت منع کیا۔ پر وہ نہیں مانے۔ بڈھے بابا نے اور بھی زور دیکر انہیں بھیجدیا۔

میں نے دلاسا دیتے ہوئے کہا۔ اچھا دیکھو کوشش کروں گا ممکن ہے ان کا کچھ پتہ چل جائے۔

میں اس کے ساتھ آگے بڑھا میں نے دیکھا اس کے پاؤں ٹھکانے سے نہیں پڑ رہے ہیں۔ وہ کسی خیال میں کھوئی ہوئی سی ہے۔

کھیت کے پاس آ کر اس نے دوسرا رستہ پکڑ لیا اور میں سیدھا چلا گیا۔ اور کھانے کے وقت تک واپس آ گیا۔ زمیندار دوست نے پوچھا تمہاری کیا حالت ہے۔ اداس اداس سے رہتے ہو تمہارے چہرے پر وہ پہلی سی بشاشت نظر نہیں آتی۔

میں نے کہا دوست کوئی بات نہیں ہے۔ کئی روز ہو چکے ہیں۔ آج شام کو چلا جاؤں گا۔

وہ میری بات سن کر ہنس دیئے۔

شام کا وقت تھا میں زمیندار کی گاڑی پر بیٹھکر گاؤں سے روانہ ہوا۔ وہ کچھ دور تک مجھے پہنچانے آئے اور جلد ہی پھر آنے کا وعدہ لیکر واپس چلے گئے۔ گاڑی کھیتوں کے درمیان سے گذر رہی تھی۔ اور میں گیتوں والی کو دیکھ رہا تھا جو ایک کھیت کے کنارے میرے انتظار میں بیٹھی تھی میں زبان سے کچھ نہ کہہ سکا۔ دل ہی دل میں اسے تسلی دیتا آگے بڑھ گیا۔ وہ مجھے آنکھیں پھاڑے برابر دیکھتی رہی تھوڑی دیر بعد وہ آنکھوں سے اوجھل ہو گئی میں گاؤں کے اطراف جانب پر الوداعی نگاہ ڈالتا ہوا شہر کی طرف چلا گیا۔

تشنۂ تکمیل

کیا آپ نے کبھی خواب دیکھے ہیں وہ خواب نہیں جو آپ سوتے ہوئے دیکھتے ہیں بلکہ وہ خواب جو آپ جاگتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ اس وقت جب آپ چارپائی پر لیٹ تو جاتے ہیں لیکن نیند نہیں آتی یا جب پھر آپ کے پاس کوئی اور بات سوچنے کے لئے نہیں ہوتی اور آپ موٹر میں کسی لمبے سفر پہ جا رہے ہوتے ہیں یا اگر خوش قسمتی سے آپ کو ریل میں تیسرے درجہ کا ڈبہ قریب قریب خالی مل جائے اور آپ کا ہم مذاق وہاں کوئی نہ بیٹھا ہو اور نہ چیتھڑوں میں لپٹی ہوئی کوئی حسینہ ہی بیٹھی ہو تب ان سے بھی بہتر موقعہ وہ ہے جب آپ کسی ننھی سی کشتی میں پاؤں پسارے اپنی نیم وا آنکھوں سے پانی کی ہموار سطح پر اپنے تئیں تیرتے ہوئے دیکھیں جس طرح اس وقت میں اپنے تئیں پا رہا ہوں جہلم کا یہ سبزی مائل پانی کس قدر سکون بخش ہے۔ وہ سامنے امیرا کدل پل پر سے جو سڑک گذر رہی ہے اس میں اور اس آبی شاہراہ میں کس قدر تفاوت ہے وہ انسانی ہاتھوں سے بنائی گئی سڑک شور و غوغا سے پُر گرد و غبار سے اَٹی ہوئی اور راہ گیروں کی ریل پیل اور پھر ہر لمحہ خلاف مرضی کسی بھی واقفکار سے ملاقات کا حادثہ ہو جانے کا خطرہ اور دوسری جانب یہ آبی راستہ قدرت کے ہاتھوں ہموار کیا گیا سکون زا۔ گرد و غبار کا نام تک نہیں اور سب سے بڑھکر یہ کہ ایک بار آپ نے لنگر کھول کے کشتی کو موجوں کے حوالہ کر دیا کہ وسط دریا کی فضا نے آپ پر کچھ ایسا جادو کیا۔ کہ آپ جاگتے ہوئے بھی خواب دیکھنے لگ گئے وہی خواب جن کا میں ذکر کر رہا تھا اور مجھے ان خوابوں سے کچھ ایسا اُنس ہے کہ میں ہمیشہ یہی کوشش کرتا ہوں کہ امیرا کدل سے گھر جاتے وقت کشتی میں ہی سفر کروں جب میں شکارے میں نیم دراز ہوا اپنے ارد گرد پانی کی لہروں کا ناچ دیکھ رہا ہوتا ہوں اور ناؤ کا کشمیری کھویا بھی نہایت مہارت سے ڈانڈ چلاتا چلا تا اس فضا سے متاثر ہو کر اپنی زبان میں اور ایک خاص لے میں پکار اُٹھتا ہے۔

اتی روز وُ مدن وار و قدمن ہا گژھ پاری
ٹھہراؤ قدم یار دکن تھو بو وُ نے زاری
در سینہ رٹم گری کرمیہ شرمی شرمی
تس کو نہ دلس نرمی ییس پتھ میہ تجم خواری

[اے میرے حسین دوست ایک ذرا ٹھہر جا۔ میں تیرے قدموں پر قربان انہیں ذرا رک اور کان دھر کے سن کہ میری آہ و زاری کیا ہے۔ میں نے شرار عشق کو اپنے سینہ میں ہی چھپا رکھنے کی سعی کی۔ اور شرماتے شرماتے ہی اپنا یہ حال کر لیا۔ اے خدا جس کے پیچھے میں نے اس قدر خواری اُٹھائی۔ اس کے دل میں کیوں نرمی نہیں آتی ؟]

اس وقت نہ پوچھئے کہ تصور انسان کو کہاں کہاں لے اُڑتا ہے اور پھر خوابوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے میں ایک راہ بھول گئے شہزادے کی صورت میں اپنے تئیں ایک جنگل میں پاتا ہوں اور وہاں ایک نوجوان حسین گوالن مجھ پر ترس کھا کر مجھے دُکھ سے ہی تھوڑا سا دودھ لاتی ہے۔ دودھ پیتے پیتے میں آنکھیں اوپر اٹھا کر اس کی آنکھوں میں ڈال دیتا ہوں۔ دودھ میرے ہاتھوں سے بنے ہوئے اوک میں سے چھلکتا چلا جاتا ہے اور میں اس کے نینوں سے ٹپکتا ہوا امرت پیے جاتا ہوں حتیٰ کہ ساری کی ساری مشکی خالی ہو جاتی ہے اور ہم چونک پڑتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ زمین پر دودھ کی ندی بہہ رہی ہے اور ہمارے سینوں میں محبت کے دریا ان تین ندیوں کے سنگم پر پریم محل تعمیر ہو جاتا ہے جہاں راجکمار اور گوالن ——

اچانک میری نگاہ پیچھے کو جاتی ہے۔ کھویا بھی کسی کا خواب دیکھ رہا ہے جو اس کی آنکھوں میں ناچ رہا ہے لیکن اس کے ہاتھ ایک بے جان مشین کی طرح ڈانڈوں پر کام کر رہے ہیں۔ وہ دریا کے دُھندلے کنارے کی جانب نظریں گاڑے ہوئے ہے جہاں پھیلتے ہوئے اندھیرے میں ایک کھڑکی میں سے روشنی آ رہی ہے شاید وہاں کوئی ہے جس کے خواب وہ بھی دیکھ رہا ہے یا اس مکان اور مکان والی سے وابستہ کوئی رومانی افسانہ اسے پھر سے یاد آ گیا ہے۔ ڈانڈ اب بھی اسی طرح چل رہے ہیں یہ "شڑاپ شڑ شڑاپ شڑ شڑاپ شڑ" اور شکارہ رواں ہے میں پھر خواب دیکھتا ہوں۔

اب کے سائیکل پہ دفتر کو بھاگا جا رہا ہوں کہ اچانک ایک موٹر کی جھپٹ میں آ جاتا ہوں اور مجھے دنیا گھومتی ہوئی نظر آتی ہے حتیٰ کہ ایک لمبی بیہوشی مجھ پر غلبہ پا لیتی ہے بیہوشی سے قبل مجھے محض اتنا یاد ہوتا ہے کہ میں نے موٹر میں ایک شعلۂ جوالہ دیکھا تھا جس کی کنول ایسی آنکھوں سے آنکھیں ملتے ہی مجھے نہ جانے کیا ہوا تھا کہ میں اس کی موٹر کے آگے گر پڑا اور جب ہوش آتا ہے تب بھی انہی دو کنول کے پتوں ایسی لمبی اور گلابی ڈوروں والی آنکھوں کو اپنے سامنے پاتا ہوں جو کنول کے ڈنٹھلوں ایسے دو بازو میرے پلنگ پر رکھے اپنی لمبی لمبی انگلیوں سے میری انگلیوں کو تھپکا رہی ہے میں ایک نظر میں ہی بھانپ لیتا ہوں کہ یہ کوئی راجکماری ہے اور میں ایک راج محل میں ہوں ہو بہو اسی طرح کا محل جس میں راجکمار اور گوالن کا خواب دیکھا تھا۔ گویا میرے تصور نے جو محل اپنے مذاق کے موافق تیار کر رکھا ہے۔ ہر جگہ مجھے وہی میسر آتا ہے اس کی انگلیوں کے مس سے مجھے اپنے قلب و جگر میں ایک خوابیدہ نغمہ گونجتا سنائی دیتا ہے گویا اس کی انگلیاں مضراب ہیں اور میری انگلیاں کسی ستار کے تار۔۔۔۔۔۔ اچانک میں گھبرا سا اٹھتا ہوں اس کے سامنے اپنی حقیقت کھول دینا چاہتا ہوں تاکہ اسے کوئی غلط فہمی نہ رہ جائے لیکن پھر دل کہتا ہے کہ ابھی آنکھ نہ کھول اسی طرح بے ہوش پڑا رہ مبادا یہ حسین نغمہ حقیقت کے کرکش شور میں گم ہو جائے میں آنکھیں بند کئے رہتا ہوں لیکن زبان بے قابو ہو کر بول اٹھتی ہے لیکن میں تو ایک غریب کلرک ہوں۔ راجکماری — میرے کانوں میں ایک نقرئی گھنٹیوں ایسی آواز آتی ہے: "ایسا نہ کہو میرے راجہ" اور میں اپنے گالوں کے قریب کسی کا گرم گرم معطر سانس محسوس کرتا ہوں۔ فوراً آنکھیں کھول دیتا ہوں۔ اور ۔۔۔۔ میں اور راجکماری ایک ہو چکے ہوتے ہیں۔

ملاح پھر گا رہا ہے۔

باغ نشاط کے گلو ناز کران کران دلو

صنائع کرنفس پہ سوندرا ماپہ پران پران دلو

(اے نشاط باغ کے پھولو! یا ان ایسے نازک شگفتہ رنگین اور دلکش حسینو۔)

نازخرامی کے ساتھ میرے قریب آؤ۔

اے میرے حسین محبوب تو نے (محض میرا دل ہی نہیں بلکہ سر سے لیکر پیر تک)

مجھے تباہ و برباد کر دیا ہے (اب بھی وقت ہے) ہر گام پر اپنی محبت میں اضافہ

کرتا ہوا میرے قریب تر آ۔)

اس کی محبوب کا مکان دور رہ گیا ہے چنانچہ نظروں سے اوجھل ہوتے وقت اس کے جذبات میں پھر جوش آگیا ہے یا کیا جانے کہ اس کی تصور کی آنکھیں اس کھڑکی میں بیٹھی ہوئی کسی سلنے کو دیکھ رہی ہوں جو دریا کی لہروں پر تیر کر پہنچنے والے اس گیت کی آواز کو اچھی طرح پہچانتی ہے اس کا خاوند پوچھتا ہے "تمہاری آنکھوں میں آنسو کیوں آگئے" تو وہ آنکھیں پونچھتی ہوئی کہہ دیتی ہے کہ "باہر سے دھواں آرہا ہے" "سے" تو کھڑکی سے "اٹھ آؤ" لیکن وہ وہاں سے اٹھتی نہیں یا اٹھ ہی نہیں سکتی۔ اس کے کانوں میں پیا کی پریم پکار گونج رہی ہے۔

باغ نشاط کے گلو ناز کران کران دلو

اور کئی بار اس نے عقد کیا ہے کہ اب کے جب بھی یہ پریم پکار آئیگی وہ دریا اور خشکی سے بے نیاز وسط دریا میں بہنے والی کشتی کی جانب بھاگ جائے گی لیکن ..... عشق کی مجبوریاں۔!

جہلم کی سطح پر ہمارا شکارہ رواں ہے۔ اور میرے خواب بھی کنارے کے مکانوں کی طرح ایک ایک کرکے گذرتے چلے جارہے ہیں میں اپنے تئیں اپنے دفتر میں بیٹھا پاتا ہوں۔ ڈاک آئی ہے میں اپنے نام کا لفافہ چاک کرتا ہوں کسی انجانے مداح کا ہے۔ لکھا ہے۔ "آپ کے افسانے ایک مدت سے دیکھ رہی ہوں لیکن آپ کے تازہ ترین افسانہ "شمع" نے تو گویا مجھے بھی "شمع" بنا دیا ہے خدا کے لئے اپنے افسانوں میں اس قدر سوز نہ بھرا کیجئے کسی کے نازک دل کا بھی خیال رکھئے۔ کیا آپ کے دل میں سچ مچ اسی قدر سوز بھرا ہوا ہے۔؟ کیا آجتک کسی نے آپ کی اس آگ پر پریم کا پانی چھڑکنے کی کوشش نہیں کی۔ کاش میں ...."

اور میں فوراً اس کا ہمت افزا جواب دیتا ہوں جس کے جواب میں وہ اپنا فوٹو بھی بھیج دیتی ہیں اور پھر یکے بعد دیگرے کئی خطوط آتے ہیں لیکن میں آگ لگا کر ایک دیوتا کی مورتی کی طرح خاموش رہتا ہوں۔ البتہ ہر نئے خط سے ایک نیا لطف نہ صرف میں بلکہ میری "چاند" بھی اٹھاتی ہے۔ کیونکہ وہ جانتی ہے کہ مجھے حسینوں کے جذبات سے اس طرح کھیلنا خوب پسند ہے۔ اور ہر نئی حسینہ کے اس طرح "زخمی" ہونے کی خبر سنتے ہی وہ میرے گلے میں باہیں ڈال کر میرے ہونٹوں پر اپنے باریک باریک ہونٹ رکھکر کہتی ہے کہ "میرے جادوگر۔ لو تمہارے نئے افسانے کے لئے بھی پلاٹ مل گیا" اور سچ مچ مجھے ان ناکام عشق حسینوں کی جانب سے آنے والے خطوط میں قلمبند کئے گئے جذبات سے بہترین افسانے مل جاتے ہیں اور انہی افسانوں کے باعث جن میں حقیقت کی تپش ہوتی ہے میری شہرت کو پر لگ جاتے ہیں جتنی کہ جہلم میں بہتے بہتے اس ناکامیٔ حسن اور اس کی بنیادوں پر کھڑے کئے گئے میرے قصر شہرت کا سلسلہ کنارے سے ٹکراتی ہوئی لہروں کے نہ ختم ہونے والے سلسلہ کی طرح یہاں تک دراز ہوجاتا ہے کہ میں یا میری چاند جب کبھی کسی حسینہ کے ہاں جاتے ہیں تو وہاں میری تصویر ایسی جگہ ٹنگی ہوتی ہے جہاں ہر وقت اس کی آنکھوں کے سامنے رہے اس پر تازہ پھولوں کے ہار لٹکائے ہوئے ہوتے ہیں اور جس کسی کو میری تصویر میسر نہ آئی ہو اس نے اپنے تصور کی مدد سے ایک حسین نوجوان کی تصویر بنائی ہوتی ہے اور میں ہر ایسے مکان سے لوٹنے کے بعد اسے ایک خط لکھتا ہوں کہ "آج تمہارے پاس وہی شخص آیا تھا جس کی تصویر کو تم ہر صبح تازہ پھولوں سے سجاتی ہو" اور پھر تصور کی آنکھوں سے اس حسینہ کا چھٹپٹانا۔ ہاتھ آئے ہوئے پریتم کے اس طرح نکل جانے پر سارے پچھتاوے کے ہاتھوں کو مل مل کر خونیں رنگ دینا اور پھر بےچینی بڑھ جانے پر دیوانہ وار ہر در و دیوار سے پوچھتے پھرنا کہ "شاعر کہاں ہے۔؟" دیکھتا ہوں یہ نظارہ ہوتے ہوتے اس قدر وسعت اختیار کر جاتا ہے کہ زمین و آسمان میں حسینوں کا ایک قیامت زا جمگھٹ ہے اور ہر جانب سے یہی آواز آرہی ہے: "شاعر کہاں ہے۔ شاعر کہاں ہے" اور میں عین اس جمگھٹ کے درمیان بیٹھا مسکرا رہا ہوں لیکن پیار کی زیادتی نے ان کی آنکھوں پر کچھ ایسا پردہ ڈال دیا ہے کہ وہ مجھی سے پوچھتی ہیں کہ "شاعر کہاں ہے؟" اور مجھے پہچان نہیں سکتیں۔ مجھی کو پکارتی ہوئی میرے گرد اگرد گھومتی ہیں اور میں خاموشی سے مسکراتا ہوا درمیان میں بیٹھا ہوں۔ اس حبہ کدل کے پل تلے اس پرشور جھانجھری کے وسطی نقطہ کی طرح جس کے گرداگرد بھنور کا پانی بھنورتا پھرتا ہے تاکہ شاید کہیں کہ "تم نے تو خواب ہی خواب میں اللہ اور روح کی مفارقت باوجود یگانگت" کا روحانی مسئلہ حل کر لیا ہے" لیکن یقین جانئے کہ میں مجازی پیار کی اس حد تک پہنچکر بھی جہاں کثرت وحدت میں سما جاتی ہے۔ اسے روحانیت کا نام دے کر اپنے ان خوابوں میں سے تمام کیف نچوڑ دینے کو تیار نہیں خواہ روحانی مسئلہ حل ہوتا ہے یا نہیں میری بلا سے۔ میرے ہاں تو ع

"بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر"

ڈانڈ ایک بندھی رفتار سے چل رہے ہیں: "شڑاپ شڑ شڑاپ شڑ شڑاپ شڑ"

سامنے حبہ کدل کے پل کی محرابوں سے لہریں ٹکرا رہی ہیں اور پھر ریزہ ریزہ ہو کر فضا میں بکھری جاتی ہیں۔ گویا یہ محرابیں دنیا کی وہ سنگین حقیقتیں ہیں جن سے انسان کے روپے ہی کا پیار اور اس کے خواب ٹکرا کر چورچور ہوجاتے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ ان میں سے دراصل حقیقت کونسی ہے۔ وہ لمحاتی خواب۔ یا زندگی کی وہ تلخ کامیاں جنہیں عموماً حقیقت کہا جاتا ہے خیال اپنا اپنا ہے چنانچہ میں ان خوابوں ہی کو حقیقت سمجھتا ہوں میری نظروں میں زندگی کی تمام مشکلات اور تلخ کامیاں درحقیقت ریاضت کا درجہ رکھتی ہیں جن کا صلہ ہمیں ان چند لمحوں میں ملتا ہے۔ جو سنہرے خوابوں سے رنگے ہوتے ہیں آخر ان خوابوں کو محض خیال غلط کا نام دے کر ان سے حاصل ہونے والے کیف و سرور کو کیوں بےمعنی بنا دیا جائے کیوں نہ اسی کو حقیقت مان لیا جائے ورنہ یوں دیکھئے تو یہ دنیا۔ یہ زندگی۔ یہ انسان۔ یہ پریم۔ یہ سب کچھ بھی آخر خواب ہی ہے۔

ملاح پھر مدہم سُروں میں کچھ گنگنا رہا ہے کنارے کے مکانوں سے روشنیوں کا عکس دریا میں لہرا رہا ہے کنارے کے مندروں میں گھنٹے بجنے شروع ہوگئے ہیں۔ اندھیرے اور دھند کے باعث نظر نہ آنے والے دینگھشوں سے چوڑیوں اور چھاگلوں کے فردوس گوش چھنا کے سنائی دے رہے ہیں لیکن آخر یہ لہریں کیوں بڑھ رہی ہیں میری کشتی کو انہوں نے چاروں جانب سے گھیر لیا ہے

اب تو شیشہ بھی محال ہو رہا ہے دریا کی سطح پر سکون ہے۔ پھر میری کشتی کے ارد گرد ہی یہ اضطراب کیوں۔ موجیں اس طرح اٹھ رہی ہیں گویا دہانِ آب سے سینکڑوں زبانیں نکلی ہوئی ہیں۔ کیا یہ کوئی پیغام کہہ رہی ہیں کس کا پیغام۔ شاید یہ اسی نالہ کا پانی ہے۔ جو اس ساٹھ میل دور واقع درہ میں سے آتا ہے جس کے کنارے ایک پن چکی ہیں "وہ" گاؤں والوں کا آٹا پیسا کرتی ہے۔ تو کیا اسی نے بہنے والے نالے کو یہ کہا تھا۔ تم اسی شہر میں سے گذرتے ہو۔ جہاں وہ رہتے ہیں کبھی ان سے مڈبھیڑ ہو جائے تو کیا میرا سندلیسہ نہ دو گے؟ اگر تم سے نشانی مانگیں تو یہ دکھا دینا" اور اس نے دو آنسو نالے میں ٹپکا دیئے۔ اسے شاید ان دو قطروں کی اس طاقت کا علم نہ تھا کہ وہ سارے کے سارے دریا کو مضطرب کر کے "کسی" کی کشتی کو ڈانوا ڈول کر سکتے ہیں۔

آہ وہ بھی کونسا دن تھا جب میرے دوست اس درّے میں مجھے اکیلا چھوڑ آئے گوپال داس بار بار ہمت توڑ رہا تھا "بس بھائی میں تھک گیا ہوں اب اور آگے نہیں" اور مجھے سخت غصہ آ رہا تھا کہ یہ جنگل۔ یہ برف سے ڈھکے ہوئے پہاڑ یہ بڑے بڑے پتھر جن سے ٹپکتا ہوا دودھیا پانی اتنے حصوں میں بٹ گیا تھا۔ کہ اس پہاڑی نالے کا پاٹ کسی بڑے دریا سے کم نہ ہو گا اور پھر ایسی فضا میں کوئی کہے میں تھک گیا ہوں۔ اس کے لئے میرے پاس "تپ دق کا مریض" سے بہتر کوئی خطاب نہ تھا بالآخر ایک جگہ سب بیٹھ ہی گئے لیکن میں پتھروں سے کھیلتا ہوا ادران پر سے پھاندتا ہوا دھیرے دھیرے نالے کو پار کرنے لگا۔ اچانک مڑ کر دیکھا تو سب کے سب واپس لوٹنے کی تیاری کر رہے تھے مرزا شفیع اس خلاف تہذیب طریقہ کے خلاف احتجاج کر رہا تھا لیکن وہ سب اسے گھسیٹے جا رہے تھے "میاں اس پگلے شاعر کا کیا ٹھکانا جی چاہے تو اسی پتھر پر بیٹھا بیٹھا سانجھ کر دے"۔ آخر وہ چلے گئے لیکن نالے کی مختلف شاخوں نے میرے پاؤں میں کچھ ایسی زنجیر ڈالی کہ میں وہیں کا وہیں رہ گیا رفتہ رفتہ پار ہوا۔ قریب ہی ایک پن چکی کی "گھر گھر" سنائی دے رہی تھی میں تجسس کے مارے اندر چلا گیا چھوٹی سی مٹی کی جھونپڑی تھی کسی کی موجودگی سے بے نیاز میں پانی کی گرتی ہوئی آبشار کو بہت دیر تک دیکھتا رہا۔ اچانک نظر اٹھا کر چکی کی جانب دیکھا۔ تو "اس" پر نظر پڑی۔ وہ اپنی نرگس ایسی آنکھوں سے "ایک پردیسی" کی جانب دیکھ رہی تھی۔ ان آنکھوں سے خدا جانے شہد کی نہر بہہ رہی تھی یا شراب کی۔ بہر حال مجھے وقتی طور پر ایسا محسوس ہوا گویا جنت میں پہنچا دیا گیا ہوں میرے لئے پن چکی کا اور کچھ دیکھنا باقی نہ رہ گیا میں اس کے عین مقابل چکی کی دوسری جانب کھڑا ہو گیا لکڑی کے ڈنڈوں کے ساتھ اس طرح لگ کر کہ اس کے قریب تر ہو سکوں مجھے اس بات کا خیال تک نہ رہا۔ کہ میرے جسم پر آٹا لپٹ رہا ہے میں اس کے چہرے پر نظریں گاڑے کھڑا رہا۔ اس نے شرما کر نظریں جھکا لیں۔ اور اپنے کپڑوں پر جما ہوا آٹا جھاڑنے لگ گئی۔

خوش قسمتی سے وہاں کوئی دوسرا نہ تھا لیکن اگر ہوتا بھی۔ تو اس وقت مجھے اس بات کا قطعاً کوئی دھیان نہ تھا میں اس کیچڑ میں کھلے ہوئے کنول کی جانب دیکھے جا رہا تھا اور بس اس نے ایک بار نظریں اٹھا کر پھر میری جانب دیکھا لیکن مجھے اس طرح دیکھتے دیکھ کر پھر گردن جھکا لی۔ آخر میرا خمار ٹوٹا میں نے پہل کرتے ہوئے پوچھا "یہ چکی تمہاری ہے؟" اس نے اسی طرح چکی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "جی" میں نے پھر ادھر ادھر کی باتیں پوچھیں۔ لیکن "جی" اور "ہاں" کے سوا کوئی جواب نہ ملا۔ پھر میں نے پوچھا "تمہارا نام کیا ہے؟" "ساہب" میں نے جھٹ فقرہ جوڑ دیا "میم صاحب" اس نے جلدی سے سر اٹھا کر میری جانب دیکھا۔ وہ اپنے ہونٹوں پر اس مزاح سے پیدا شدہ مسکراہٹ کو دبا نہ سکی میں کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ وہ جھینپ گئی میں نے پھر پوچھا "شادی ہو چکی ہے؟" "ہاں" "کوئی بچے ہیں؟" "نہیں" میں کچھ سوچ میں پڑ گیا "کیا یہ شادی شدہ حسینہ ایک پردیسی سے رومان کا ناٹک کھیل سکتی ہے نہیں۔ تو پھر یہ ہنسی کیوں۔؟ شاید عادتاً ہی لیکن نہیں اس کی آنکھوں میں کچھ "وہ" جھلک رہا ہے۔ ایسا کیوں۔ اچھا تجربہ کر دیکھو مجھے انسانی نفسیات کا مطالعہ کرنے کا بیحد شوق ہے کیونکہ میں اپنے افسانوں کی بنیاد ہمیشہ مشاہدے پر رکھتا ہوں چنانچہ اس بار میں نے ایک شادی شدہ لڑکی کے نفس کا مطالعہ کرنے کی غرض سے کچھ پیش قدمی کی۔

چکی کا ایک پرزہ دیکھنے کے بہانے میں اس کے پیچھے جا کھڑا ہوا۔ اس نے وہاں سے ہلنے کی کوشش نہیں کی ہمت نے زور پکڑا میں نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور پھٹے ہوئے لباس کے باعث نیم عریاں بازوؤں اور شانوں پر محبت سے ہاتھ پھیرنے لگا اس نے سر نیچے ڈال دیا میرا ہاتھ دراز تر ہوتا گیا کہ اچانک وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور آہستہ سے باہر جانے لگی میں نے آگے بڑھ کر اسے روک لیا لیکن اس نے آہستگی سے محض اتنا ہی کہا "ٹھہرو میں آبشار کا پانی بند کر آؤں" میں نے اسے راستہ دینے سے پہلے اس کے باریک باریک ہونٹوں پر اپنے لب رکھ دیئے میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھیں جیسے مدہوشی سے لبریز ہو گئی ہیں اس کے انگ انگ کی اٹھان میں ایک نکھار پن آ گیا۔ اس کی کیفیت بیان سے باہر تھی۔ گویا وہ ایک ندی تھی۔ جو ہوا کے کسی آوارہ جھونکے سے مس کرتے ہی لہرا اٹھتی ہے اس کی سطح پر ایک تھرتھری پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی حالت میں میں نے اسے چھوڑ دیا اور وہ باہر چلی گئی۔

دوسرے ہی لمحہ میں میرے دل میں خیال اٹھا مبادا یہ کسی کو بلا لائے۔ آہ! انسان بھی کس قدر بدگمان ہوتا ہے میں اس بوسیدہ تختے کی آڑ سے جسے دروازہ کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے دیکھتا رہا حتیٰ کہ وہ اسی طرح خاموشی سے واپس لوٹ آئی چکی پر گرنے والی آبشار بند ہو چکی تھی۔

وہ اندر آئی اور چپ چاپ سر جھکا کر جھونپڑی کے وسط میں کھڑی ہو گئی مجھے اس کے بوسیدہ لیکن ڈھیلے ڈھالے کشمیری فرن کے اندر سے بھی مختلف اعضا کی پھڑک دکھائی دے رہی تھی میں نے اپنے بازو پھیلا دیئے اور اس نے اپنے تئیں میری گود میں ڈال دیا۔

میں نے اس کی شبابی لٹوں کو سلجھاتے ہوئے پوچھا "صائب! تمہیں میں اچھا لگا؟" اس نے میرے سینے سے لگے لگے ہی میرے فاؤنٹین پن کے کلپ کو انگلی سے صاف کرتے ہوئے کہا۔ "میں کیا جانوں؟" اُف! کیا بتاؤں کہ اس جواب میں کس قدر معصومیت تھی اتنی معصومیت سوتے بچے کی مسکراہٹ میں بھی نہ ہوتی ہو گی میں نے پھر پوچھا "تم بھاگ کیوں نہ گئیں؟" "میں کیا جانوں" میرا جذبۂ تحقیق، تجسس اور دعوے نہ جانے اس معصوم "میں کیا جانوں" میں کہاں ڈوب گئے۔ میں اس کے نفس کی شکست کا مطالعہ کرنے والا تھا لیکن خود اپنی شکست کا سامان کرنے لگا میں نے حسینوں کے جذبات سے کھیلنا سیکھا تھا لیکن مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ اس کھیل میں کبھی کبھی خود بھی ہار ماننی پڑتی ہے اور اس روز کشمیر کی پہاڑیوں کے ایک سنسان درے میں پھٹے کپڑوں والی ایک دیہاتی لڑکی نے ایک ہی بھولی ادا سے ایک کھلنڈرے پردیسی کو لوٹ لیا۔

ہاں ہر اس طرح لٹ جانے پر بھی مجھے اتنی ہوش رہی کہ ایک شادی شدہ عورت کی تشنگیٔ محبت کی وجہ جان سکوں۔ مجھے اس نے بتایا کہ اس کی شادی اس شخص سے ہوئی ہے۔ جو آج سے چار سال قبل اس کا سگا پھوپھا تھا اور کافی بوڑھا لیکن حیثیت دار ہے۔ اس تحقیق نے میرے اس عقیدہ کو اور بھی پختہ کر دیا۔ کہ "عورت بدکار نہیں ہوتی۔ اسے دولت پرست سماج ہی ایسا بنا دیتا ہے۔"

مجھے اپنے دوستوں سے ملنے کی جلدی تھی۔ اس لئے میں اس سے دوسرے روز آنے کا وعدہ کر کے چلا آیا لیکن تمام راہ مجھے وہ لوگ نہ ملے۔ وہ کیمپ میں پہنچ چکے تھے۔ اور میں بار بار سوچ رہا تھا کہ کیا یہ سچ تھا۔ مجھے اس واقعہ کی حقیقت پر اعتبار ہی نہ آتا تھا۔ دوستوں سے بچھڑنے کے بعد چند ہی لمحوں میں کیا کچھ ہو گیا یقیناً یہ ایک خواب تھا۔ ویسا ہی خواب۔ جیسے دیکھنے کا میں عادی ہوں حتیٰ کہ صبح ہوتے ہوتے مجھے اس بات میں کوئی شک نہ رہ گیا کہ نالے پر کسی پتھر پر بیٹھے بیٹھے میں نے ایک حسین خواب دیکھا تھا لیکن پھر دل میں یہ کسک کیوں؟ اور میں خود اپنے آپ پر اس بات کے لئے ہنس پڑا کہ خواب میں دیکھی ہوئی حسینہ کو دل دیدیا۔ یہ سب باتیں تھیں لیکن میں سانجھ کے لئے بیتاب تھا خواہ یہ خواب ہی تھا لیکن میں پھر وہیں جانا چاہتا تھا جہاں صاحب سے ملنے کا وعدہ کیا تھا۔

سانجھ ہوئی اور میں پھر اسی جھونپڑی میں تھا۔ آج اسے دیکھتے ہی میری آنکھوں کی وہی حالت ہو گئی جو پورنماشی کا چاند دیکھنے سے ہوتی ہے اس کے چہرے پر آج ایک بھی دھبہ نہ تھا وہ شبنم سے دھوئی ہوئی پنکھڑیوں کی طرح پاکیزہ تھا اس نے اپنے دیہاتی فیشن میں نہایت خوبصورتی سے چوٹی گندھوائی تھی ان کا رنگ آج مٹیالا نہ تھا بلکہ ان کی چمک سانپ کی آنکھوں کو مات کئے دیتی تھی شاید تمام دن اس نے اپنے چہرے اور بالوں کی کڑی حفاظت کی تھی۔ اس کا فراک وہی تھا لیکن اس پر گرد کی موٹی تہ نہ تھی۔

آج چاند تو چودھویں کا تھا مگر لیکن بادل اور ذنب نے اسے گرہن لگا رکھا تھا۔ آج اس کے پاس دو بارہ بارہ سالہ لڑکیاں بیٹھی تھیں۔ جو حیرت سے مجھے تک رہی تھیں میں اس کی چکی کے قریب بھی گیا لیکن اس نے آنکھ تک اٹھا کر میری طرف نہ دیکھا میں سمجھ گیا کہ یہ اسی کی کوئی رشتہ دار ہو نگی میں ایک اجنبی کی طرح کچھ دیر ادھر اُدھر کی چیزیں دیکھتا رہا اس دوران میں اس نے پہلے ایک لڑکی کو کسی بہانے باہر بھیجنے کی کوشش کی لیکن اس نے میری جانب اشارہ کیا۔ گویا اس نے کہا کہ تمہیں معلوم نہیں۔ یہ پرایا مرد یہاں ہے۔ ہم تیری حفاظت کے لئے یہاں ہی بیٹھیں گی۔ اس نے سر جھٹک دیا اور پھر اس نے کوئی "کوشش" نہ کی گویا ایک نہایت نازک کلی پر اوس پڑ گئی میں تھوڑی دیر کے بعد باہر نکلا اور نالے کے کنارے ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھ گیا کہ شاید باہر آئے لیکن بہت دیر ہو چکی تھی۔ وہ باہر تو نکلی لیکن آٹے کی بوری سر پر اٹھائے ہوئے یعنی وہ گھر واپس جا رہی تھی۔ دروازہ بند کرتے کرتے اس نے ایک لڑکی کو زور سے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ کہ تم نے بہت تنگ کیا ہے۔ کل میں آؤنگی تو تمہیں قطعاً ساتھ نہیں لاؤنگی" گویا اس نے مجھے بالواسطہ طور پر کل کی دعوت دی لیکن......

میں دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا کر رہ گیا "اے معصوم حسینہ کاش تجھے معلوم ہوتا کہ تو کل جس کے انتظار میں صبح سے سانجھ کر دیگی وہ یہاں سے سینکڑوں میل دور بیٹھا ہو گا۔ تو سانجھ کو گھر لوٹتی ہوئی کہیگی کہ "پردیسی کس کے میت" لیکن کاش تو آج بات کرنے کا کوئی موقعہ پیدا کرتی اور میں تجھے اپنی مجبوری بتاتا کہ گوپال داس کے گھر سے فوراً لوٹ آنے کا تار آ گیا ہے۔ ہم کل نہیں رُک سکتے۔ اب بھی وقت ہے راہ میں سے لوٹ آ۔ کوئی بہانہ کر کے کہ میری فلاں شے پن چکی پر رہ گئی ہے لیکن افسوس تو نے ابھی تک مکاری نہیں سیکھی"!

میں کتنی ہی دیر تک اس پہاڑی پر چڑھنے والی پگڈنڈی پر جاتی ہوئی تین عورتیں دیکھتا رہا جن میں سے ایک بار بار رُک کر پیچھے کو مڑ کر دیکھ رہی تھی اور تینوں کے مل کر اس مشہور پہاڑی گیت کو گانے کی آواز آ رہی تھی۔

وے لاجوا۔

کداں بلاں وے جندریاں دے او ہلے۔ ننان بڑی ڈاہڈی اے لاجو۔

[اے لاجو میں تمہیں پن چکی کے پیچھے کس طرح ملوں میری نندڑی کا یاں ہے]

اور میرے لب پر یہ دوہا تھا ؂

ندی ناؤ کا بیٹھنا ایک پلک کی پریت

پھر بچھڑے ناہیں ملیں صدیاں جائیں بیت

ملاح کے چپو چل رہے ہیں "شڑاپ شڑ شڑاپ شڑ شڑاپ شڑ"۔ وہ سامنے فتح کدل پل کے نقوش کسی بھولے ہوئے خواب کی طرح دھندلے دھندلے دکھائی دے رہے ہیں۔

گہرے اندھیرے میں سے پل کی محرابیں ایک ایک کر کے اجاگر ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ عین اسی طرح جس طرح آج پانی کی اس خاموش روانی کے ساتھ ساتھ بہتے ہوئے میری زندگی کے وہ حسین اور سنہری لمحے باری باری ماضی کی یاد کے اندھیرے میں سے اجاگر ہوتے چلے جا رہے ہیں جنہیں میں زندگی کی چور کر دینے والی کلفتوں کا واحد خوشگوار ماحصل سمجھتا ہوں۔ وہ لمحے جب کسی دوپٹے کے خونیں رنگ نے ہمارے دل کو خون کر دیا جب کسی کے مسکراتے ہوئے تیکھے لبوں نے ہمیں چرکہ لگایا جب کسی نے ہنستے ہنستے ہم سے دو باتیں کیں اور ہمارے دامن کو سدا بہار پھولوں سے بھر دیا یا جب کسی نے جھکی ہوئی شرمیلی آنکھوں سے کچھ اس طرح دیکھا گویا ایک تیر نیم کش چھوڑا ہو یعنی وہ چند لمحے جو ہمیں اس بات کا یقین دلاتے ہیں کہ جو رنگین خواب ہم نیم خوابی کی حالت میں دیکھا کرتے ہیں۔ وہ محض سراب نہیں۔ بلکہ کبھی کبھی حقیقت کی صورت بھی اختیار کر لیتے ہیں مگر یہ لمحے انسان کی زندگی میں خال خال آتے ہیں۔ بایں ہمہ ان کا سلسلہ لامتناہی ہے کیونکہ ایسے لمحے ہر ایک شخص کی زندگی کے طویل اندھیارے میں کہیں کہیں ایک لہری روشنی کی مانند نور افشاں ہیں چنانچہ ان رنگین روشنیوں کا سلسلہ بھی بہت دراز ہے اس جہلم کی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ جہلم تو ذخیرہ عرب سے مل کر اپنی تکمیل کر لیتا ہے لیکن ان رنگین خواب نما حقیقتوں کا بیان ہمیشہ تشنۂ تکمیل رہے گا۔

فتح کدل کی محرابیں زیادہ واضح ہوتی جا رہی ہیں اور مجھے وہ واقعہ یاد آ رہا ہے جس کی تشبیہ اس پازیب کی جھنکار سے دی جا سکتی ہے۔ جو پردے کے پیچھے کسی حسینہ کے نازک پاؤں میں جھنک رہی ہو جس کی محض آواز ہی سے اس کی ناز خرامی اور چال کی لٹک کا اندازہ کیا جاتا ہے۔

میرا کیمپ ایک پہاڑ کی چوٹی پر لگا ہوا تھا اس جگہ وہی چار کیمپ اور تھے ایک میرا ایک

اینگلو انڈین عورت تھی جس کا نام تو تھا "للی" لیکن شکل نرگس ایسی نہ تھی۔ گویا ایسی ہی بات تھی جس طرح ہم سیاہی کو روشنائی کہتے ہیں۔ اُردو میں اسے کافی مہارت تھی بلکہ ادب سے بھی کچھ کچھ لگاؤ تھا بریں وجہ ہماری میل ملاقات بھی تھی۔ وہ مجھ سے کتابیں بھی پڑھنے کے لئے لے جاتی تھی۔ ایک دن اس نے مجھے بتایا کہ آپ کا فلاں ڈراما اس کیمپ میں رہنے والی لڑکی لے گئی ہے۔ وہ ایک دن میں مل جائیگا۔ میں نے کہدیا۔ "کوئی ہرج نہیں" میں نے اس لڑکی کو دیکھا تو نہیں تھا لیکن جانتا ضرور تھا۔ وہ ہند سرکار کے کسی بہت بڑے افسر کی نورِ چشم تھی اور تفریح کی غرض سے وہاں آئی تھی۔ میں عموماً ان کے کیمپ کے پچھواڑے ہی صبح شام ٹہلنے جاتا تھا کیونکہ وہاں سے دُور نیچے تک وادی کا منظر بہت بھلا معلوم ہوتا تھا۔ ایک روز میں وہاں ٹہل رہا تھا کہ کیمپ سے ایک ماما نکلی اور میرے قریب آکر بولی۔ " باؤجی یہ کتاب آپ کی ہے۔" "جی ہاں" ۔ " تو بی بی جی کہتی ہیں کہ ہم اسے دو ایک روز تک اپنے پاس رکھ سکتی ہیں۔" میں نے رسمی طور پر کہدیا۔

"بڑے شوق سے بلکہ اگر انہیں شوق ہو تو میرے پاس اور کتب بھی ہیں۔"

ماما دعائیں دیتی ہوئی چلی گئی اور میں یہ سوچتا ہوا رہ گیا کہ "آخر یہ معاملہ کیا ہے مجھ سے "بی بی جی" کو پوچھنے کی ضرورت کیوں؟ میں نے للی سے کب تقاضا کیا تھا۔" مجھے دال میں کچھ کالا کالا نظر آنے لگا۔ اور اس وقت تو مجھے کوئی شک نہ رہا جب وہ کتاب واپس آئی۔ اس میں ایک پرچہ ان کے دست مبارک سے لکھا ہوا پڑا تھا۔ "میں نے آپ کی کتاب کو ایک بھی داغ نہیں لگنے دیا۔ کیوں ہے نہ؟" اسی جملے اس کی ہلکی سی شوخی نے میری ہمت بڑھائی۔ دوسرے ہی روز ماما کے ذریعہ مزید کتب کا مطالبہ آیا۔ میں نے اپنے ہی افسانوں کی ایک کتاب بھیجدی جس کے ساتھ ایک نامہ بھی تھا جس میں ان کی پہلی مہربانی کا شکریہ ادا کیا گیا تھا اور کتاب پر تنقید کرنے کو کہا تھا۔

جواب میں انہوں نے لکھا "میں ادبی دنیا سے ناواقف ہوں اور تنقید سے قاصر علاوہ ازیں میں مذاحیہ کی دلدادہ ہوں لیکن آپ کی یہ کوشش ہے کہ آپ کے افسانے پڑھکر کوئی بھی آنسو بہائے بغیر نہ رہ سکے بہرحال میں اس بات سے خوش ہوں کہ آپ دوسرے افسانہ نگاروں کی مانند اظہار محبت کے واہیات منظر پیش نہیں کرتے۔"

میں نے جواب دیا۔ "آپ کا تنقید سے گریز واجب نہیں۔ ادبی دنیا سے آپ کی بے تعلقی میرے حق پر دال ہے کیونکہ ادبی دنیا سے واقف لوگ بعض مرتبہ افسانہ نگار کے نام ہی سے مرعوب ہو جاتے ہیں۔ یا پھر منہ دیکھے کی ستائش ہوتی ہے اور یہاں تو میں بدقسمتی سے اس رخ پس پردہ سے قطعی ناآشنا ہوں۔ اس لئے آپ کی تنقید بے لاگ ہوگی۔ اور مجھے اپنی حقیقی پوزیشن کا تعین کرنے میں آسانی رہیگی۔ میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ میرا اپنا معیار یہ ہے کہ ایک افسانہ پڑھنے کے بعد کم از کم چند ساعت تک تو آپ میں یہ سکت باقی نہ رہے کہ آپ ورق پلٹ کر اگلا مضمون شروع کر دیں۔ آپ کی زبان سے بے ساختہ "آہ!" یا "واہ!" نکل جائے۔ ٹریجیڈی ہو تو آپ ایک لمبی سانس کھینچ کر رہ جائیں۔ تو سمجھ لیجئے کہ افسانہ نگار کامیاب ہے۔ اس کا مقصد اسی وقت پورا ہو جاتا ہے۔"

ماما کے ہاتھ جواب پہنچا۔ "ہم نے افسانہ نگار کے نام سے رعب تو کھا لیا۔ پھر بھی میں آپ کے منہ دیکھے کی بھی ستائش نہ کرسکوں گی۔ ہاں آپ کے افسانے پڑھکر میں نے لمبی سانس تو کھینچی تھی منہ سے "آہ" بھی نکلی تھی شاید مجبوراً ہی ایسا ہوا ہے۔"

میں نے جواباً لکھا۔ "میرا انکھڑا کونسا چاند کا ٹکڑا ہے جسے دیکھکر کوئی لازماً میری ستائش ہی کرے۔ اور یوں بھی نہ ستائش کی تمنا۔ نہ صلہ کی پروا۔ رہا افسانہ نگار کے نام سے رعب کھانا سو شاید اسی رعب کے مارے آپ کو آج تک اس سے آنکھیں چار کرنے کی ہمت نہیں پڑی"

میرے طعنے کے جواب میں انہوں نے اپنا رخِ روشن تو نہ دکھایا۔ البتہ یہ جواب بھیجا کہ "میں کل واپس بمبئی جا رہی ہوں۔ دل میں یہ تمنا ہی رہے گی۔ کہ آپ کے تازہ ترین افسانے نہ پڑھے۔ اس لئے اپنا ڈاک کا پتہ لکھ بھیجئے۔ تا کہ وہیں سے منگوا سکوں۔"

اور ہمارا یہ رومان پس پردہ ہی رہا۔ اور اسی صورت میں اب تک چھیڑ چھاڑ جاری ہے بعض دفعہ تو میں یہ سوچتا ہوں کہ اسے رومان کہہ بھی سکتے ہیں یا نہیں۔ کیا جانے کہ وہ کھلنڈری لڑکی میری ہی طرح مردوں کے جذبات سے کھیلنے میں لطف پاتی ہو۔ تو گویا ہم دونوں آج تک ایک دوسرے سے کھیل رہے ہیں کس قدر دلکش ہے یہ کھیل۔ اور اس پر لطف مستزاد یہ کہ آج تک میں پردہ کے پیچھے ہی سے اس پازیب کی جھنکار سن رہا ہوں۔

چپو اب بھی اسی طرح چل رہے ہیں۔ "شڑاپ شڑ شڑاپ شڑ شڑاپ شڑ" ملاح کے دل سے شاید اب وہ رومانی کیفیت دور ہو گئی ہے۔ جو کچھ دیر پہلے اس پر طاری تھی۔ اب اسے اپنے گاہک کا خیال آیا ہے۔ اور وہ مجھے "پردیسی" سمجھتا ہوا کہہ رہا ہے۔ "باؤجی! یہ شاہ ہمدان کی مسجد آج سے چھ سو سال پہلے کی تعمیر ہے۔" لیکن اندھیرے میں مجھے کوئی عمارت نظر نہیں آ رہی۔

جہلم کی خاموش روانی اور میرے خواب۔ دونوں جاری ہیں۔ اچانک شکارہ کنارہ سے ٹکراتا ہے۔ ملاح کہہ رہا ہے۔ "لیجئے باؤجی۔ زینہ کدل کا پل آگیا۔" کنارے والے مکان کے باہر روشن قمقموں سے بنے ہوئے حروف میں "دینا ناتھ چوپڑہ اینڈ برادرز" چمک رہا ہے اور میں اب بھی سوچ رہا ہوں کہ اس دارالخلافہ کشمیر سے ساٹھ میل دور اس کونے میں پہاڑیوں کے درمیان جو نالہ بہتا ہے اس کے کنارے ایک پن چکی میں بیٹھی ہوئی ایک الھڑ دیہاتی حسینہ کیا اب بھی ایک "پردیسی" کی منتظر ہے؟ اور ابھی تک اس کی زندگی کا ایک رومانی افسانہ تشنۂ تکمیل ہے

راماننْد ساگر

ناظرین شاہکار کے فروری نمبر میں مندرجہ ذیل تصیح فرمالیں

صفحہ ۱۹ پر مصرعہ ۱۲ کو یوں پڑھئے: "عالم سیہ ملبوس میں ماتم کی تیاری کرے" سیاہ غلط ہے۔

صفحہ ۲۳ پر جرعات میں پہلے مصرعہ کو یوں پڑھیں: "عارضِ گل پر سرشک شبنمی" سرشک غلط ہے

صفحہ ۳۹ پر چھٹے شعر کے مصرعہ اولیٰ کو یوں پڑھئے۔

"زیر استبدادِ عصر نو ہے تہذیب کہن" عہد غلط ہے۔

صفحہ ۵۴ پر دوسرے شعر کے مصرعہ اولیٰ کو یوں پڑھیں۔

"جبیں پر شکن ہے نگہ شعلہ ریز" نگاہ غلط ہے۔

ان کتابت کی اغلاط کے لئے ہم شعرا حضرات سے معذرت خواہ ہیں۔

ادارہ

سوال و جواب

[اس عنوان کے تحت قارئین کے مرسلہ سوالات کے جواب دیئے جایا کریں گے۔ مدیر]

سوالات

(۱) ندوی مولانا صاحب کی ماہنامہ میں ایک غزل اس طرح شائع ہوئی ہے:۔

(۱) کبھی بار اس کی خاطر ذرے ذرے کا جگر چیرا
مگر یہ چشم "حیراں جسکی" حیرانی نہیں جاتی

(۲) مری "چشم تن آساں" کو بصیرت مل گئی جب سے
بہت جانی ہوئی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی

(۳) سر خسرو سے "ناز کجکلاہی" چھن بھی سکتا ہے
"کلاہِ خسروی" سے بوئے سلطانی نہیں جاتی

(۴) بجز دیوانگی "واں اور" چارہ "ہی کہو" کیا ہے
جہاں عقل و خرد کی ایک بھی مانی نہیں جاتی

(۱) کیا پہلے شعر کا مصرع ثانی مہمل نہیں؟ اگر "جس کی" کا استعمال صحیح ہے تو شعر کا مفہوم کیا ہے؛ اور جملے کی خبر کہاں ہے۔ کیا شاعر یہ کہنا چاہتا ہے "مگر چشم تحیر گو کی حیرانی نہیں جاتی" یا کچھ اور؟

(۲) شعر ۲ میں "چشم تن آساں" صحیح ہے یا غلط؟ محاورہ مروج تن آساں ہے یا "چشم تن آساں"؟

(۳) شعر ۳ کے مصرع اول میں "ناز کجکلاہی" جائز ہے یا نہیں؟ بادشاہ کے سر پر تاج ہوتا ہے نہ کہ تاج؛ مصرع ثانی میں کلاہ خسروی کی جگہ دماغ خسروی فصیح اور درست معلوم ہوتا ہے۔

(۴) شعر ۴ میں "واں اور" "ہی کہو" بھرتی کے الفاظ ہیں یا نہیں؟ کیا ہماری شاعری ایسے اشعار تک ہی محدود ہوتی جائیگی؟

جہاں پا چلا جائے وہاں مانی نہیں جاتی کہ اسکی بات اس کے سامنے مانی نہیں جاتی

منتظرِ اصلاح منیر کمال (جالندھری)

(۲) آپ کبھی کبھی شاہکار میں ہماری ادبی خامیوں کی اصلاح کیا کرتے تھے اور ہمیں مفید مشورے دیا کرتے تھے مگر اب عرصہ سے ہماری آنکھیں اس کو ترس گئی ہیں کیا ہم خامیوں سے بری ہو گئے ہیں یا آپ نے خدمت ادب سے آنکھیں پھیر لی ہیں براہ کرم مجھے غالب کے مندرجہ ذیل شعر کا مطلب واضح طور پر سمجھائیے۔

نورِ نالہ ہائے زار سے میرے خدا کو مان دے آخر نوائے مرغ گرفتار بھی نہیں

مجھے مصرع ثانی بے جوڑ سا معلوم ہوتا ہے شاعر جو کہنا چاہتا تھا وہ اس کے الفاظ ادا نہیں کر سکے کیا میری نظر کوتاہ ہے یا واقعی یہ مصرع ایسا ہے۔ نیاز مند اختر عجمی

(۳) ایک صاحب نے قحط کے اسباب پر سبق دیتے ہوئے تختہ سیاہ پر مندرجہ ذیل جملہ لکھا:۔

"قحط کے وجوہات"

اس جملہ کے حرف "کے" پر اکثر اساتذہ نے اعتراض کیا اور کہا کہ یہاں "کی" ہونا چاہیئے کیونکہ وجوہات مونث ہے لیکن ہم یقینی طور پر کسی فیصلہ پر نہیں پہنچ سکے اور آخری تصفیہ کیلئے آپ کی خدمت میں لکھنا ضروری خیال کیا گیا ہے۔ (ایک ڈپٹی انسپکٹر صاحب مدارس)

جوابات

(۱) (۱) شاعر کیا کہنا چاہتا ہے یہ تو شاعر سے پوچھنے کی بات ہے شعر کے الفاظ سے جو معنی متبادر ہوتے ہیں ان کے پیش نظر تو یہی کہا جا سکتا ہے کہ ع اس مبتدا کی دیکھئے نکلے خبر کہاں؟ ثانی مصرعہ میں جواب صلہ نہیں ملتا آپ کا اعتراض حق بجانب معلوم ہوتا ہے مگر آپ کی اصلاح "تحیر گو" بھی سامعہ پاش ہے اس کی بجائے تحیر زا موزوں ہوگا۔

(۲) "چشم تن آساں" غالب نے کہیں لکھا ہے شاعر کے لئے غالب کی سند کافی ہے مگر مجھے تو چشم کی یہ صفت اچھی نہیں معلوم ہوئی

(۳) جواز کی قلمرو تو بے کراں ہے ہر جواز شعری کے لئے کسی استاد کی سند مل سکتی ہے مگر میرے خیال میں شاعری نہ کرنا تعزیرات ہند کی کسی دفعہ کی خلاف ورزی میں داخل نہیں جواز سے فائدہ اٹھانیوالوں کے لئے جبر شعر کو مجروح کرنے سے کہیں بہتر ہے کہ وہ اپنے خیالات کو نثر میں ادا کرلیا کریں۔

(۴) واں، یاں، زبان داغ کے متروکات میں سے ہے مگر علامہ اقبال مرحوم ان الفاظ کا استعمال کرتے ہیں اور جدید شاعری تو متروکات داغ کو بے محابا استعمال کر رہی ہے یوں لیٹ طور پر یہاں، وہاں کی بجائے یاں، واں سے کام نہیں لیتا اس شعر کے مصرعہ اولیٰ میں "کہو" واقعتہً حشو ہے۔

آپ نے ہماری شاعری سے بے تحاشا توقعات کیوں وابستہ کر رکھی ہیں جدید نسل کے خام کار شعرا کی بدسلیقگی نے شاعری کی صورت مسخ کر رکھی ہے بچپن کا حال یہ ہو اس کا مستقبل کیا ہوگا؟

(۲) ثانی مصرعے میں بظاہر کوئی پیچیدگی یا پہلے مصرع سے بے ربطی بھی نہیں معلوم ہوتی۔ شاعر کہتا ہے کہ میرے نالۂ زار کو مرغ گرفتار کی نوائے بے اثر خیال نہ کر میری فغان درد کمزور رہی سہی مگر بے اثر نہیں جفا کیلئے اس سے بے اعتنائی نہ کر مبادا اس کا خمیازہ تجھے بھگتنا پڑے مرغ گرفتار کی نوا حالت آزادی و اسیری میں ایک جیسی ہوتی ہے گویا قدرتی ہے مگر انسان کرب و اذیت میں جو زاری کرتا ہے وہ اس کی عام حالت آواز و گفتار سے مختلف ہوا کرتی ہے درد کی آمیزش اسے اثر خیزی بخش دیتی ہے اسی اثر خیزی سے شاعر محبوب کو ڈرانا چاہتا ہے۔

(۳) اردو میں جو عربی و فارسی الفاظ مونث بولے جاتے ہیں ان کی عربی جمع یا جمع الجمع کی تذکیر و تانیث سے متعلق دلی و لکھنؤ کے فصحا میں اختلاف ہے اہل لکھنؤ ان الفاظ کی جمع یا جمع الجمع کو مونث خیال کرتے ہیں اور اہل دہلی مونث الفاظ کی عربی جمع کو بھی مونث ہی استعمال کرینگے میرا خیال ہے کہ صحیح ذوق سامعہ ہی اس امر کا فیصلہ کر سکتا ہے کہ کس لفظ کی جمع کو مونث استعمال کیا جائے اور کس کی جمع کو مذکر؛ مثلاً دلائل، فضائل، وجوہ، وجوہات، توقعات، اور نظریات وغیرہ ایسی جمعیں ہیں کہ اردو میں علامت تذکیر یا ضمیر مذکر کے ساتھ ان کا استعمال ہونا معلوم ہوتا ہے اس کے برعکس خطیات تقریبات تکبیرات ایسی جمعیں ہیں کہ ان کے ساتھ علامت تانیث ہی فصیح معلوم ہوتی ہے ضرورت ہے کہ مستند ادبا کی کوئی جماعت اس سوال پر تفصیلی غور و بحث کے بعد کچھ قطعی اصول بنا کر ان کا اعلان کر دے۔

تصحیح زبان

[اس عنوان کے تحت مروّجہ غلط الفاظ، غلط محاورات اور الفاظ و محاورات کے غلط استعمال کی تصحیح کی جاتی ہے۔ مدیر]

"بُھلے ہی وہ اِنکار کر دے"

پنجاب کے اردو خواں اور اردو نگار طبقات میں مندرجہ بالا محاورہ بالعموم بولا جاتا ہے۔ اردو زبان کے محاورات کی ڈکشنریوں میں اس کا سراغ کہیں نہیں ملتا۔ بالفاظ دیگر یہ محاورہ اردو محاورہ نہیں۔ اردو بولتے یا لکھتے ہوئے اس کا استعمال غلط سمجھا جائے گا۔

اردو میں اس کے مشابہ ایک محاورہ بولا جاتا ہے:-

بھلے کو وہ آ گئے ورنہ جھگڑا اُٹھ کھڑا ہوتا

مگر اس کا محل استعمال پہلے سے مختلف ہے۔

تاجور

نقد و نظر

نجمہ کے سو شعر مرتبہ آنسہ نجمہ خانم شروانیہ۔ تقطیع صفحات ۳۰ قیمت ۵ مع محصول ڈاک۔

محترمہ نجمہ تصدق ایم اے بی ٹی کا کلام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ آپ کی نظمیں اور غزلیات ملک کے بیشتر ادبی رسایل و جراید میں شائع ہو کر اصحاب ذوق سے خراج تحسین لے چکی ہیں۔ یہ مجموعہ آپ کے کلام میں سے منتخب اشعار کا مجموعہ ہے۔ اشعار پرسوز جذبات میں ڈوبے ہوئے اور تخیل سے لبریز ہیں ملنے کا پتہ:۔ ایوان ادب علی گڑھ (یو۔پی)

شمع۔ اگر آپ کو ناول نویسی کردار نگاری۔ پلاٹ کی دلاویزی۔ نئی اور پرانی تہذیب کی رنگ آمیزی کا اعلےٰ نمونہ دیکھنا ہو تو شمع (مصنفہ اے۔ آر خاتون دہلوی) پڑھیئے ملنے کا پتہ جلال منزل۔ کوچہ پنڈت دہلی۔

رسالہ مشیر الاطبا کا مشیر الاطفال نمبر۔ رسالہ مشیر الاطبا کے ادارے نے ماہ اکتوبر و نومبر ۱۹۴۲ء کے نمبر کو مشیر الاطفال کے ٹائیٹل سے زیر نگرانی شفاء الملک حکیم محمد حسن قرشی شائع کیا ہے۔

"مشیر الاطفال نمبر" میں عورتوں اور بچوں کی بیماریوں۔ ان کے علاج احتیاطی تدابیر' غذا' طبی نسخہ جات اور دیگر مفید صحت مضامین فاضل حکما کے قلم سے لکھے گئے ہیں۔ چند ایک عنوانات یہ ہیں۔ بچہ کی نفسیاتی نشوونما عصبی المزاج بچے۔ اسکول اور اس کا ماحول حفظ صحت حاملہ اور ولادت سے پہلے لیکھوکار فارما کوپیا۔ کلکتہ کا فارما کوپیا بچوں کی غذا کا معیاری طریقہ وغیرہ وغیرہ ایسے بیسیوں عنوانات پر مضامین لکھے گئے ہیں۔ تقطیع صفحات ۲۴۰ قیمت ایک روپیہ ملنے کا پتہ:۔ ناظم مشیر الاطبا و چشمہ زندگی۔ دل محمد روڈ۔ لاہور۔

رسالہ کتاب لاہور۔ تقطیع صفحات ۴۴ چندہ ششماہی ایک روپیہ

یہ رسالہ کتاب خانہ پنجاب ۱۲۰ بیرون لوہاری گیٹ لاہور سے زیر ادارت پروفیسر محمد سرور ہر ماہ شائع ہوتا ہے۔ ادبی مضامین کی اشاعت کے علاوہ مختلف کتب اور ان کے مصنفین پر ناقدانہ نظر بھی ڈالی جاتی ہے۔ اچھی کتابوں کے متعلق واقفیت بہم پہنچانے کے لئے اس رسالہ کا مطالعہ نہایت سودمند ہے۔

رسالہ اردو۔ انجمن ترقی اردو (ہند) کا سہ ماہی آرگن ہے جو دہلی سے زیر ادارت ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب شائع ہوتا ہے۔ یہ خالص ادبی رسالہ ہے جس میں زبان اور ادب کے مختلف شعبوں اور پہلوؤں پر بحث ہوتی ہے مضامین کے علاوہ مختلف کتب پر تبصرہ بھی کیا جاتا ہے۔ تقطیع حجم ڈیڑھ سو صفحات قیمت سالانہ مع محصول ڈاک سات روپے۔ نمونے کی قیمت ایک روپیہ بارہ آنہ چندہ بھیجنے کا پتہ:۔ انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی۔

رسالہ زمانہ کانپور تقطیع حجم ۴۸ صفحات قیمت سالانہ پانچ روپے (نمونہ سات آنے)

یہ ماہوار رسالہ کانپور سے زیر ادارت جناب دیا نرائن نگم شائع ہوتا ہے۔ اس میں ملک کے چیدہ اہل قلم کے لکھے ہوئے ادبی علمی مضامین اور مشہور شعرا کی نظمیں اور غزلیں شائع ہوتے ہیں۔

ماہنامہ روپ (ہندی) لاہور۔ حال ہی میں لاہور سے ایک ہندی ماہنامہ "روپ" جاری ہوا ہے جس کی عنان ادارت جناب راما نند ساگر کے ہاتھوں میں ہے آپ ایسے تجربہ کار جرنلسٹ اور بلند پایہ ادیب کا نام ہی "روپ" کی کامیابی کی کافی ضمانت ہے۔ رسالہ ادبی مضامین اور افسانوں کا حامل ہے۔ البتہ ایک حصہ فلموں کے لئے بھی وقف کیا گیا ہے۔ ٹائیٹل دیدہ زیب لیکن سادگی کا پہلو لئے ہوئے سائز ۲۰×۳۰ صفحات ۹۴ قیمت ۳ سالانہ قیمت اڑھائی روپے۔ ملنے کا پتہ:۔ مینجر روپ منگل منشن میکلوڈ روڈ لاہور۔

پرل کلوریم آئی ڈراپ (رجسٹرڈ) کا اشتہار عموماً آپنے اخبارات میں دیکھا ہوگا۔ اس دوا کے استعمال سے تین لاکھ آنکھوں کے لاعلاج مریض صحت کلی پاکر شفایاب ہوئے۔ یہ دوا آنکھوں کی تمام بیماریوں مثلاً کالا موتیا بند۔ موتیا بند ہر قسم پھیچک سے ضائع آنکھیں۔ آنکھ کا بیٹھ جانا جالا پھولا ککرے وغیرہ کے لئے تیر بہدف ہے قیمتیں سپیشل پوٹنسی گیارہ روپے چار آنے۔ نارمل پوٹنسی بڑی چار روپے چار آنے چھوٹی شیشی دو روپے چار آنے ملنے کا پتہ:۔ مینجر پرل اینڈ کمپنی (رجسٹرڈ) کوٹھی نمبر ۹ بمقابل نشاط تھا کیز ایبٹ روڈ لاہور۔

آریجنل ہومیو پیتھک میڈیکل ہال نکلسن روڈ لاہور۔

ڈاکٹر ایم اے سید صاحب ماہر ہومیو پیتھک کی زیر نگرانی یہ دواخانہ کئی سال سے بڑی کامیابی کے ساتھ چل رہا ہے۔ اس دواخانہ سے تمام ہومیو پیتھک ادویات اعلےٰ درجہ کی دستیاب ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر ایم اے سید صاحب ہومیو پیتھک طریق علاج میں بڑے کامیاب ترین ڈاکٹر ثابت ہوئے ہیں۔ بہت سی لاعلاج امراض آپ کے علاج سے دور ہوئی ہیں۔ مریضوں کا ہر وقت تانتا بندھا رہتا ہے۔ اب جبکہ ہومیو پیتھک علاج کی طرف پبلک بیش از پیش توجہ کر رہی ہے۔ ڈاکٹر محمد سعید کا وجود اس علاقہ میں نعمت غیر مترقبہ ہے۔ آریجنل ہومیو پیتھک دواخانہ سے ہر قسم کی اصلی ہومیو پیتھک ادویات مل سکتی ہیں۔ ضرورت مند اصحاب فایدہ اٹھائیں۔

منی آرڈر

کرتے وقت اپنا نمبر خریداری و مکمل خوش خط پتہ تحریر کیا کریں۔ مینجر

سناتن دھرم کالج لاہور کا یادگار ادبی اجتماع

لاہور کے سناتن دھرم کالج میں جب سے ڈاکٹر بھوپال سنگھ کا پرنسپل کی حیثیت میں تقرر ہوا ہے۔ کالج کے شش جہات میں ایک نئی زندگی پیدا ہوگئی ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف صوبے کے ان دو تین فضلا میں سے ایک ہیں جن کے علمی تبحر اور ہمہ گیر قابلیت کے اعتراف سے تعلیمی فضا معمور ہے۔ یورپ اور امریکہ کے مشہور اور مقتدر رسائل و اخبارات ان کے مضامین بیش قدر معاوضے پر حاصل کر کے شائع کرتے رہتے ہیں۔ بین الاقوامی شہرت کے ایسے قابل و فاضل پرنسپل کی باعظمت شخصیت سناتن دھرم کالج کی ساری فضا پر جلوہ پاش نظر آتی ہے۔

۷ جنوری کو اس کالج کی بزم ادب کا جلسہ ہوا۔ پروفیسر ڈھینگرا ایم اے کار فرما کی نگرانی میں مسٹر پربھو دیال اور مسٹر کرشن چند صدر و ناظم بزم ادب نے جلسے کا اہتمام کیا۔ یہ جلسہ اپنی اس امتیازی حیثیت کے سبب لاہور میں ایک تاریخی ادبی اجتماع کہلانے کا مستحق ہے۔ کہ پنجاب اور پنجاب میں قیام پذیر حسب ذیل مشہور سحر بیانوں نے اس میں حصہ لیا لالہ تلوک چند محروم۔ پنڈت میلا رام وفا۔ مولانا ملک نصراللہ خان عزیز سابق ایڈیٹر اخبار مدینہ۔ حضرت احسان دانش۔ مولانا حرمان خیرآبادی۔ مولانا حامد علیخاں صاحب بی اے ایڈیٹر رسالہ ہمایوں۔ ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ ایم آے ڈی لٹ پنجاب یونیورسٹی۔ حضرت قمر جلال آبادی۔ حضرت قیوم نظر ایم اے۔ مسٹر جگن ناتھ آزاد بی اے۔ مسٹر قیصر خورشید واصل بی اے ایڈیٹر شاہکار۔ پروفیسر پرشوتم لال ڈھینگرا ایم اے۔ راجہ مہدی علی خاں صاحب۔ حضرت ظفر زبیری ناظم اردو سبھا لاہور۔ سید نذیر ترمذی۔ شہرت بخاری۔ نسیم چغتائی۔ چاند۔ پنڈت مکاوی شانت۔ مسٹر راج بلدیو۔ انجم رومانی۔ جاوید پکوالی۔ حضرت کاوش سعدی اور تاجور صدر جلسہ۔

حاضرین میں پنجاب یونیورسٹی کے ڈاکٹر جین۔ ڈاکٹر بھوپال سنگھ پرنسپل۔ ڈاکٹر پیارے لال آنند پی ایچ ڈی اور کالجوں کے بہت سے اساتذہ اور طلبہ تھے۔ میں نے اپنی صدارتی تقریر میں اپنے دیرینہ تجربے کی بنا پر یہ کہدیا تھا کہ اس عہد کے طلبہ منطق و فلسفے کے تمام دقیق و عمیق مسائل زندگی اور کائنات کے تمام پیچیدہ رازوں کو سمجھ لیتے ہیں مگر جس چیز کو نہیں سمجھتے اور نہیں سمجھنا چاہتے وہ شعر ہے۔ ان کا مذاق شعری پست اور شعر فہمی کے صحیح ذوق سے ان کا ذہن ایمان کی طرح پاک و صاف ہے"

مگر سناتن دھرم کالج کے طلبہ نے اپنی حیرت انگیز سخن فہمی سے میرے اس کلیہ سے اپنے آپ کو قاطبۃً مستثنےٰ کر لیا۔ ہر چند کہ فورمن کرسچین کالج کے گذشتہ ادبی اجتماع میں طلبہ کا سکون و ضبط تعجب انگیز تھا لیکن سناتن دھرم کالج کے اس ہجوم زا میں طلبہ نے جس متانت، تہذیب اور ضبط کا ثبوت دیا اس کو دیکھکر تمام مدعو حضرات عش عش کر رہے تھے

اس یادگار جلسے میں شریک ہونیوالے سحر نواؤں نے اپنے اپنے سرور فشاں کلام سے اس فضا کو کیف و مستی سے سرشار کر دیا تھا۔ جی چاہتا ہے کہ شاہکار کے قارئین کے بھی ذوق بصیرت کو ہدیہ عفت نظر کے طور پر اس وجد آفرین منظر سے روشناس کراؤں۔ جو تھوڑی مدت کے بعد میری آنکھوں نے دیکھا۔

عزیز کاوش سعدی کو میں نے قارئین شاہکار ہی کی خاطر ہر شاعر کے کلام کی نقل کرنے پر متعین کر دیا تھا۔ ان کا شکرگزار ہوں کہ انہوں نے اس جبری خدمت کو گوارا کرتے ہوئے اپنے لطف سماعت کو لذت سرور سے محروم کئے رکھا۔ ذیل کا خرد افروز انتخاب انہیں کی توجہ کا نتیجہ ہے:۔

غزل

ابھی چھوٹی تمناؤں کی تابانی نہیں جاتی ۔۔۔ وہی حسرت ہے دل میں آہ نادانی نہیں جاتی

گیا نقد دل وجاں ہے کہ اس کی رونمائی کو ۔۔۔ مری حیران نگاہوں کی پشیمانی نہیں جاتی

تجھے مجھ سے چھپے صدیاں ہی گذریں تاجنگ لیکن ۔۔۔ نظر کی بیکسی، دل کی پریشانی نہیں جاتی

وہ آنکھیں یوں بدل جائینگی یوں مجھکو دغا دیگی ۔۔۔ یقینی بات ہے اے دل مگر مانی نہیں جاتی

نہ تو بدلا نہ میں بدلا، مگر یہ کیا قیامت ہے ۔۔۔ کہ اب باہم گر صورت بھی پہچانی نہیں جاتی

ملیں دو دل بہم یارب تو شور الاماں کیسا؟ ۔۔۔ جہان فتنہ گر کی فتنہ سامانی نہیں جاتی

مرے تن میں نہیں اب روح لیکن یہ غضب کیا ہے ۔۔۔ کہ مرنے پر بھی تکلیف گران جانی نہیں جاتی

ابھی اس کی جفائے ظاہری کو دل نہیں بھولا ۔۔۔ ابھی یاد نوازش ہائے پنہانی نہیں جاتی

ترے نغمے بدل کر ہو گئے نالے یہ دن آئے
مگر حامد تری مشق غزل خوانی نہیں جاتی

حامد علی خاں

جسے دیکھوں اسے اپنی طرح دیوانہ کرتا ہوں ۔۔۔ خرد کا نام سنکر ہاتھ میں کانوں پہ دھرتا ہوں

جنون پنہاں جنون ظاہر جنوں اول جنوں آخر ۔۔۔ اسی اک حرف سے پیدا میں سو افسانے کرتا ہوں

ہلاتی ہے زمین و آسماں کو خود سری میری ۔۔۔ گراں خود خاطر خلاق فطرت پر گزرتا ہوں

نہ پروا ہے سفینوں کی، نہ منت ناخداؤں کی ۔۔۔ نہنگ آسا ہر اک طوفان کی موجوں میں اترتا ہوں

مرا نقش اے اجل کیا لوح ہستی سے مٹاتی ہے ۔۔۔ کریں ہر بار روح کن فکاں بن کر ابھرتا ہوں

عدم کا گلشن تاریک بھی مجھ سے فروزاں ہے ۔۔۔ فنا کے ہاتھ سے شمع بقا کا گل کترتا ہوں

نگار آرائے فطرت ہے مری خاک پریشاں بھی ۔۔۔ برنگ غازہ میں رخسار ہستی پر نکھرتا ہوں

بیزدی سے اور مجھ سے ہے رشتہ زلف و عارض کا کہ گیسو جس قدر تقدیر اتنا ہی سنورتا ہوں

تجھے کیا ساقیا ہے بزم عشرت کی ہوا داری
کہ خود میں خونِ دل سے پے بہ پے پیمانہ بھرتا ہوں

وطن عزیز

اے سرزمین زا وطن - فارس و شام سے عزیز
شعر و شباب سے عزیز - بادہ و جام سے عزیز
کیف خیال سے زیادہ - لطف کلام سے عزیز
مال و منال سے فزوں - شہرت و نام سے عزیز
عیش و نشاط و عاشقی جشنِ تمام سے عزیز

خلوت شام کا نشاط - جلوت صبح کا سکون
گیسوئے عنبریں کا مس - جلوۂ روئے لالہ گوں
سحر خرام نازنین - قامت یار کا فسوں
اور وہ ایک آرزو - جس کو بیاں نہ کر سکوں
مجھکو یہ سب عزیز ہیں - تو ہے تمام عزیز

سیر و سفر کی لذتیں - دشت و چمن کی عشرتیں
قول و عمل کی حریت - کوہ و کمر کی وسعتیں
اہل و عیال کی بہجت - حور جمال طلعتیں
ساز و رباب کی نوا - غنچہ و گل کی نکہتیں
مجھکو یہ سب عزیز ہیں - تو ہے تمام سے عزیز

ملک نصراللہ خان عزیز

راوی پر ایک شام

ساحل راوی ہے، سناٹا ہے اور وقت غروب
ہو گیا افسانۂ تنویر کا عنوان شام
نبض مدھم ہے شفق کی، رک چلی دریا کی سانس
درہم و برہم ہوا جاتا ہے منظر کا نظام
سبزۂ نوخیز پر ہے صندلی کرنوں کا رقص
دن کے سیمیں ساغروں میں ہے مے زرینِ شام
دوش پر مغرب نے اوڑھی جھٹپٹے کی اوڑھنی
کر لئے پر ہول تاریکی نے خنجر بے نیام
بامِ مغرب پر دریچے کھل گئے الماس کے
جھومتی ہے زلف بکھرائے ہوئے لیلائے شام
چوٹیاں پیڑوں کی کچھ روشن ہیں ڈھلتی دھوپ سے
ان پہ بھی ہو جائے گا لیکن اندھیرے کا قیام
سبز پتوں پر یکایک سانولا پن آ گیا
اور سبک رفتار جھونکے ہو گئے محو خرام
شورشیں چپ ہو گئیں - خاموشیاں گانے لگیں
گردشوں میں آئے گھٹاؤں پر حسیں تاروں کے جام
پرچمِ ظلمت ہے قصرِ نور پر سایہ فگن
چل دیا ہے کارروان کرنوں کا اب ناشاد کام
شام کی دیوی اٹھی انگڑائیاں لیتی ہوئی
ہیں کنیزانِ فلک پہلو میں محو اہتمام
دامن ساحل میں آکر رک گئی ہیں کشتیاں
ہو رہے ہیں ناخدا اپنے خدا سے ہم کلام
فرش آبی پر ہوا سے سلوٹیں پڑنے لگیں
جھک کے شاخوں نے کیا ہے تیرگی کا احترام
یک بیک راوی نے ہاتھوں میں اٹھایا جل ترنگ
بانسری جیسے بجائے رادھکا کے ساتھ شیام
اٹھ کے دریا سے فضا میں نغمے اڑنے لگے
گویا دریا بھی ہو کوئی مطرب شیریں کلام
دھم سے جب گرتی ہے پانی میں کنارے کی زمیں
دل یہ کہتا ہے کہ یونہی زیست کا ہے اختتام
خواب طاری ہو گیا ہے آم کے اشجار پر
نیند میں ڈوبی ہوئی ہیں کشت ہائے سبز فام
تان کر ظلمت کی چادر سو چلی سب کائنات
خواب کی پریوں کا ہے بزم جہاں میں انصرام
چاندنی سے ماہِ کامل کی بجھی قندیل ہوش
ہر ستارے نے سمیٹا سیم گوں کرنوں کا دام
مضطرب جلووں کے ہیں آغوش فطرت میں ہجوم
انوئے کوکب کا ہے ایوانِ گردوں میں قیام
رقص کرتے ہیں فرشتے، گنگناتا ہے فلک
اور کھنکتی ہے صراحی جام پر اڑتے ہیں جام
بے خودی ہے عرصۂ افلاک پر چھائی ہوئی
ساحل دریا پہ میرے منہ سے نکلا کس کا نام

پروفیسر ضیا ایم اے

غزل

کس کے لئے پھرتا ہے مورکھ یوں آوارہ گلی گلی
صورتیں اور بھی ہیں دنیا میں کچھ ایسی ہی بھلی بھلی
ڈھونڈھ لے کوئی اور اب چہرہ وہ نہیں گر کوئی اور سہی
دیکھ کہ بھونرا باغ میں جاکر چوم رہا ہے کلی کلی
عمر کی ٹہنی پر دو دن ہنستا ہے پھول جوانی کا

دیکھ تیرے چہرے کی رونق دیکھ اے غافل ڈھل ڈھل
حسن کے منہ کو آگے بڑھ کر چوم لے جتنا چوم سکے
اپنی کلائی تجھ سے چھڑا کر دیکھ جوانی چلی چلی
کوند رہی ہے تیرے سر پر موت کی بجلی رہ رہ کر
چونک سنبھل اے ناداں تیری کشت جوانی جلی جلی
کس کے لئے پھرتا ہے مورکھ یوں آوارہ گلی گلی
دیکھ کہ بھونرا باغ میں جا کر چوم رہا ہے کلی کلی

راجہ مہدی علیخاں

شبخون

کالی، آندھی، رات، بھیانک
پھیلی پھیلی خاموشی کا
کالا جادو اس میں اچانک
اک ہنگام سیلِ بلا ہے
دوڑ رہے ہیں وحشی گھوڑے
ہیبت ناک گھنی تاریکی
مار رہی ہے آتشیں کوڑے
راج محل پیوند زمیں ہیں
شعلے ہیں اور اُن کے مکیں ہیں
چمکی خون آشام سپاہی
چیخیں آہیں ہچکیاں نالے
دہشت سے لپٹی ہے تباہی
خاک کے ہر سو ڈھیر کھڑے ہیں
زندہ مردے جن میں گڑے ہیں
بڑھتے چڑھتے جنوں کے سہارے
مثلِ شہابِ ثاقب پل میں
آئے گئے برسا کے شرارے
نقشِ پا ہے نہ رہگذر ہے
ویرانی تا حدِ نظر ہے
اسکندر چنگیز ہلاکو
یکساں عقاں سب کی نظر میں
چشمہ حیواں چشمۂ باکو
اب بھی وہی ہے فطرتِ آدم
جو بادہی میں ہے عظمتِ آدم

مسٹر قیوم نظر ایم اے

غزل

سینے میں دل تو ہے مگر دل میں شگفتگی نہیں۔
پھول ہے رنگ و بو نہیں چاند ہے چاندنی نہیں
دیکھ کے رنگِ روزگار۔ تم بھی خلاف ہو گئے
ایسی تو بات آج تک دیکھی تو کیا سنی نہیں
ہاں مجھے بھول جایئے۔ بھول کے بھی نہ آیئے
آپکی ہو خوشی خوشی میری کوئی خوشی نہیں
تیرے کرم کی خیر ہو میری خطائیں بھول جا
میری جبینِ نامراد قابلِ بندگی نہیں
تیرے بغیر کیا کروں رونقِ کائنات کو
تو نہیں زندگی تو پھر لائقِ زندگی نہیں

شہرت بخاری

ترغیب

سانیٹ

شبنمی رات ہے فطرت ہے عناں گیرِ حیات
عشق بیکل ہے محبت کی جواں باہوں میں
پھول برسائیں نہ کیوں عشق بھری راہوں میں
وقت کا راگ ہے منت کشِ تعبیرِ حیات
اور مخمور جوانی کا تقاضا ہے یہی
رات بھر اپنے مقدر کو منا لیں اے دوست
دامِ تقدیر میں فطرت کو پھنسا لیں اے دوست
بے کلی دل کی مٹانے کا طریقہ ہے یہی
سرخ ہونٹوں کی جوانی مجھے پی لینے دے
اپنی بے لوث محبت کی قسم دیتا ہوں
جذبۂ عشق کی عظمت کی قسم دیتا ہوں
آج کی رات خدارا مجھے جی لینے دے
روح میں آگ کا طوفان بھڑک اٹھا ہے ؛ دیکھ قدرت کا بھی دل آج دھڑک اُٹھا ہے

سید نذیر ترمذی

غزل

وہ کیا گئے کہ موت کا پیغام دے گئے ؛ آفاتِ صد زمانہ بہر گام دے گئے
ان کے ستم کرم سے زیادہ عزیز ہیں ؛ جو غم وہ دے گئے طرب انجام دے گئے
آنکھیں تصورِ رخ و گیسو میں مست ہیں ؛ وہ کس مزے کی گردشِ ایام دے گئے
آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے بے خود بنا دیا ؛ گویا وہ دو چھلکتے ہوئے جام دے گئے
سن کر وفا کا نام ہنسی آ گئی انہیں ؛ کتنا حسین وہ مجھے انعام دے گئے
حاصل شمیمِ گل ہے قفس میں مجھے نسیم
جھونکے ہی بادِ تند کے کچھ کام دے گئے

نسیم چغتائی

غزل

مقصدِ زندگی ہے تیری تلاش گرچہ میں تجھ کو پا نہیں سکتا
جس طرح طفل ماہتاب کے پاس جانا چاہے تو جا نہیں سکتا

غرق ہیں اس طرح پسینے میں ان کے رخسار تمتمائے ہوئے
صبحدم جس طرح گلاب کے پھول آبِ شبنم سے ہوں نہائے ہوئے

بھول جاتا ہوں جورِ پیہم کو بے وفا سامنے جب آتا ہے
مے کے پیتے ہی جس طرح مینوش
سارے آلام بھول جاتا ہے

حضرت جاوید چکوالی

تمہاری یاد

ہیں گھٹائیں کہ بستیاں آباد یا ہیں خوابوں کی بستیاں آباد
یہ گھٹاؤں کی نشہ افشانی یہ فضاؤں کی کیف سامانی
ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں بادہ بدوش پی کے آتی ہے یا کوئی سرجوش
یہ ہواؤں کی نرم رَو موجیں یا بہارِ بہشت کی فوجیں
یہ جواں اور رس بھری برسات چھائی ہے گویا الفتوں کی رات
دردِ الفت کی نرم زا لہریں بیخودی کے وفور کی نہریں
پھر ہے دل میں جواں تمہاری یاد!
میٹھی میٹھی یہ پیاری پیاری یاد!

انجم رومانی

اعتراف

مآلِ عشق دنیا کو میں سمجھاتا رہا برسوں نیاز و ناز کی تشریح فرماتا رہا برسوں
طریقِ عشق کی پرپیچ راہوں سے نکلنے کا حدودِ عقل سے نزدیک تر لاتا رہا برسوں
اچھوتے اور نادر استعاروں کی مدد لے کر سراپا حسن نادیدہ کا دکھلاتا رہا برسوں
خیالِ وصل کے رنگین افسانے بیان کر کے خس و خاشاکِ دل میں آگ سلگاتا رہا برسوں
ستم یہ ہے کہ بے بنیاد مہجوری کے قصوں سے ستم ناآشنا دل پر ستم ڈھاتا رہا برسوں
مری نظمیں وظائف کی طرح تھیں یاد لوگوں کو سخن فہموں سے دادِ شاعری پاتا رہا برسوں
شباب و شعر کو آپس میں یوں میں نے سمویا تھا کہ اپنی شاعری میں گم سا ہو جاتا رہا برسوں
مرے افکار کے ماحول میں نشتے برستے تھے میں بہکا خود بھی اور دنیا کو بہکاتا رہا برسوں
مری ہر نظم اک رومانِ نو تخلیق کرتی تھی
رہِ الفت سے یوں آتا رہا جاتا رہا برسوں
کسی کو بھی نہیں معلوم شاید یہ اپچ میری جنوں کے گیت سازِ عقل پر گاتا رہا برسوں
دماغی کاوشوں کو میں رموزِ حق سمجھتا تھا خرد کے ساتھ خود بھی ٹھوکریں کھاتا رہا ہوں
پجاری بن کے مدت تک میں ان دیکھے خداؤں کا جبیں کو سنگ کی چوکھٹ سے ٹکراتا رہا برسوں
مری رنگیں بیانی اے ظفر وہ رنگ لائی تھی ہر اک انساں کا دل میں واہمہ پاتا رہا برسوں
مرا یہ زعم تب تک تھا تجھے جب تک نہ دیکھا تھا
تجھے دیکھا تو پھر سمجھا کہ اب تک کچھ نہ سمجھا تھا

حضرت ظفر زبیری

بیتے دن

بیتے دنوں کی یاد میں پیاری اکثر روتا رہتا ہوں
تیری تلاش میں دن بھر سورج تھک کر آخر سو یا ہے
شام نے کروٹ بدلی ہے اور دن نے جیون کھویا ہے
چاند کی کرنیں بادل سے کچھ آنکھ مچولی کھیلتی ہیں
کالے شیام سے جیسے سکھیاں نور کی ہولی کھیلتی ہیں
جنگل بھی خاموش ہیں سارے۔ دنیا بھی چپ سادھے ہے
پریت کے مندر میں سنسان کرشن ہے ناہیں رادھے ہے
پریت کے چشمے پریت کی موجیں، نور کے دریا بہتے ہیں
بن میں ڈھاک کھلا ہے پکھیرو پریم کہانی کہتے ہیں
لیکن میں تیرا بیراگی ہجر کے صدمے سہتا ہوں
بیتے دنوں کی یاد میں پیاری اکثر روتا رہتا ہوں
صبح سویرے گھر کی چھت پر پیاری وہ تیرا آنا
ہاتھ کی اوٹ سے دیکھنا مجھکو، دیکھ کے فوراً چھپ جانا
بجلی کوندی چلمن میں یا جوت کی دھارا بہتی تھی
دیکھ نہ لیتا جب تک تجھکو دل میں خلش سی رہتی تھی
تیرا حسیں آنچل جب سر سے رخ پہ تیرے آجاتا تھا
ہوش و حواس پہ بجلی گرتی دل بھی تھرا جاتا تھا
وہ دن بھی کیا دن تھے پیاری گیت لبوں پر رہتے تھے
دل میں ہلچل رہتی تھی جذبات کے دھارے بہتے تھے
زیست میں اک کیفیت تھی رونے میں مسرت ہوتی تھی
آشا من کی ملنے کارن سیس جھکا کر روتی تھی
ایک سمندر ہے دکھ درد کا جس میں ہر دم بہتا ہوں
بیتے دنوں کی یاد میں پیاری اکثر روتا رہتا ہوں۔

نسیم جاوید کاوش

شاہکار

ماہ اپریل ۱۹۴۲ء

جلد ۱۴ — نمبر ۴

فہرست

حصہ نثر

حصہ نظم

احسان احمد خاں تاجور پرنٹر و پبلشر نے عالمگیر الیکٹرک پریس لاہور پرانی تحصیل بازار میں چھپوا کر دفتر شاہکار فتح محمد روڈ متصل تکیہ اڑی سائیں لاہور سے شائع کیا

مختصرات

مردم شماری کی بوالعجبیاں

گذشتہ جنگ عظیم سے قبل شیعہ سُنی جماعتوں میں جب کبھی کسی جگہ کوئی ہنگامۂ حرب و ضرب برپا ہوکر دونوں طبقات میں کشیدگی ہوجاتی تھی۔ تو "شیعہ کانفرنس" میں اس حادثے کے خلاف اظہار ناراضگی کی قرار داد پر تلخ لہجہ مقرر جوش خطاب میں یہ بھی کہہ جایا کرتے تھے کہ ہندوستان میں مومنین (شیعہ حضرات) کی جماعت ایک کروڑ سے بھی زیادہ ہے"۔ رہی مومن برادری (نوربافوں کی برادری) ہمیشہ سے عام مسلمانوں میں مدغم رہی۔ اس کی کوئی الگ جماعتی تنظیم نہ تھی۔ دستکار طبقات میں اس کا شمار رہا۔ اور مردم شماری میں تیس پینتالیس لاکھ کے درمیان اس کی تعداد تھی لیکن اصلاحات ملنے پر جب سے اقوام وطبقات کو سیاسی حقوق ملنے لگے۔ ملک کا ہر طبقہ اور ہر فرقہ اپنی اپنی تنظیم میں مصروف ہوگیا۔ اور ہر جماعت نے اس سلسلہ میں اپنے اپنے سلسلہائے نسب کی سراغرسانی شروع کردی مسلمانوں میں ہر طبقے کے تعلیم یافتہ حضرات نے تحقیق و تفحص کرکے کسی صحابی کسی مشہور پیر طریقت یا کسی عربی قبیلے کے کسی سردار تک نسل و نسب کی ڈور کو کھینچ تان کر پہنچا دیا اور دیکھتے دیکھتے عجیب و غریب تاریخیں تیار ہوگئیں حضرت سلیم الراعی ارائیں طبقے کے پیر کلال (ایک خدا رسیدہ صوفی) کلالوں کے "بنو اُمیہ" قصابوں کے "قریش" تک میراثیوں کے "انصار مدینہ" مومن برادری کے افغنہ بن ارمیا (ابن حضرت طالوت علیہم السلام) افغانوں کے مورث اعلےٰ قرار پائے۔

نسبی مجد و تقدس کے انتظام سے فارغ ہوکر ان میں سے کچھ طبقے سیاسی حقوق میں سب سے بڑا حصہ دار بننے کی خاطر اپنی مردم شماری کی تصنیف کی جانب متوجہ ہوگئے۔ شیعہ بھائیوں کو نسبی کاوشوں سے توریوں نجات مل گئی کہ وہ پہلے ہی سے سنی اور حسینی ہیں۔ البتہ دوسری مصروفیت میں انہوں نے جی لگا کر کام کیا۔

وہ ایک کروڑ کے ادعا سے یک زقند ڈھائی کروڑ بن گئے اور دوسری زقند میں جس کی حد ۳۵-۱۹۳۴ء تک ہے ساڑھے تین کروڑ ہوگئے اور تیسری چھلانگ میں ساڑھے چار کروڑ ہو چکے ہیں بالفاظ دیگر بیس سال میں ایک کروڑ کی آبادی میں ساڑھے تین کروڑ کا اضافہ ہوگیا جل وعلی

جماعت مومنین پاک کی دیکھا دیکھی "مومن برادری" (جماعت نوربافاں) کو بھی حرص دامنگیر ہوئی اور اس کے لیڈر پہلی زقند میں ساڑھے تین کروڑ اور دوسری نصف میں ساڑھے چار کروڑ بنکر اب اگلی زقند کی تیاری کر رہے ہیں۔ الحاصل اب ہندوستان میں مومنین کی یہ دونوں جماعتیں نو کروڑ افراد کی مالک بنی بیٹھی ہیں حالانکہ ۱۹۴۱ء کی مردم شماری کی رُو سے اس ملک میں مسلمان آٹھ کروڑ اور چند لاکھ ہیں گویا مومنین کی ہر دو جماعتوں کے ادعا کو صحیح تسلیم کرنے کے لئے کم و بیش تیس چالیس لاکھ غیر مسلموں کو مسلمان بنانا پڑیگا۔ اور اس کے ساتھ ہندو قوم کو اس مذہبی ایثار پر آمادہ کرنا بھی ضروری ہو جائیگا کہ وہ ہندوستان کے تمام غیر شیعہ سیدوں، تمام مغلوں، پٹھانوں، شیخوں، راجپوتوں، راعیوں، قصبوں، لوہاروں، موچیوں اور بے شمار مسلم طبقات کو اپنی جاتی میں شامل تصور کرنے لگیں۔

دوسری طرف خطرہ یہ بھی ہے کہ قصابوں اور لوہاروں کی جماعتیں جن میں ہر جماعت واقعتہً مومن جماعت اور مومن برادری سے دوچند ہے کہیں ان کے جماعتی لیڈروں میں زندگی کی کوئی تڑپ پیدا ہوگئی۔ اور اکثریت سازی کے شوق بیقرار نے انہیں بھی مردم شماری کی تصنیف کی جانب مائل کر دیا۔ تو یہ دونوں جماعتیں اپنی "پیشرو برادریوں" سے روشنی لے کر بیس کروڑ بن کر بھی دم نہ لیں گی۔ اور ان کے بعد یا ساتھ ہی شیخ برادری نے بھی اگر اپنی سیاسی تنظیم کے لئے کوئی کروٹ بدلی۔ تو ان کی چار شاخوں سے تو اسلامی ہند کے چاروں گوشے بھرے پڑے ہیں۔ ہر شاخ نے ڈھائی کروڑ کا دعوے بھی دائر کر دیا۔ تو دس کروڑ سے کم کی ڈگری پر شیخ رہنما بھی راضی نہ ہوں گے۔ پھر اس امکان پر اس امر محال کی تعبیر ناگزیر ہو جائیگی۔ کہ ہندوستان کی ساری آبادی میں ہندو، عیسائی، سکھ اور پارسی نام کے کسی جاندار کا وجود بھی بدیہی نہیں بلکہ نظری ہوکر جس سے امان اٹھا دیگا۔ تمام مشاہدات نظر کا دھوکہ کہلائیں گے اور بیس کروڑ جیتے جاگتے انسان مرزا غالب کے "اصنام خیالی" بنکر رہ جائیں گے۔

دور جانے کی ضرورت نہیں پانچ سال پیشتر کے اخبارات اٹھا کر پڑھ لیجئے اُن میں آپ کو شیعہ اور مومن کانفرنسوں کی قرار دادوں میں "ساڑھے تین کروڑ" کا ادعا بہ مشاہدہ واضح نظر آئیگا۔ تفرقہ پرداز سبھائی اخبارات میں وہ قرار دادیں چار کالمی سرخیوں میں جاذب توجہ کالموں میں مندرج ملیں گی لیکن دو سال سے ہم دیکھ رہے ہیں۔ کہ ان قرار دادوں کے الفاظ وہی ہیں۔ جو ۱۹۳۵ء میں تھے۔ البتہ ہر دو جماعتوں کے رہنماؤں نے "ساڑھے تین کروڑ" کے مرکب عددی کو "ساڑھے چار کروڑ" سے تبدیل کر لیا ہے۔ گویا تین سال کی قلیل مدت میں ہر دو جماعتوں پر افزائش نسل کا ایسا دورہ پڑا کہ ایک کروڑ افراد کا ہر ایک میں اضافہ ہوگیا۔ یہ بے تحاشا اضافہ اگر واقعتہً صحیح ہے تو سمجھ لیجئے کہ آئندہ ۲۵ سال تک اس برِاعظم کی بے کراں وسعتیں انسانی آبادی کے لئے قفس بن جائیں گی۔

حقیقت تو یہ ہے کہ اس انداز میں ریاضی کے اعداد کے ذریعہ سیاسی شاعری کی جارہی ہے۔ مگر اس شاعری کا رواج عرب کے "عہد جاہلیت" کے ساتھ ختم ہوچکا ہے جبکہ اچھے شعر کی تعریف "اَحْسَنُ الشِّعْرِ اَکْذَبُہٗ" (سب سے اچھا شعر وہ ہے جس میں سب سے زیادہ دروغ بیانی سے کام لیا گیا ہو) کی جاتی تھی۔ اب یہ سکہ نہیں چلے گا۔

گذشتہ تیس سال میں تین بار ہندوستان کی مردم شماری ہوچکی ہے۔ ان

مردم شماریوں کی سرکاری رپورٹیں ملک کی تمام لائبریریوں میں محفوظ اور ملک کے ہر ضلع اور ہر قصبے میں مل سکتی ہیں۔ انہیں اٹھا کر پڑھ لیجئے۔

پارسال جو مردم شماری ہوئی۔ اس کی رُو سے شیعہ حضرات کی تعداد تین لاکھ اور مومن برادری پچاس لاکھ کے لگ بھگ نکلتی ہے۔ سب جانتے ہیں کہ ہر دس سال کے بعد جو مردم شماری کی جاتی ہے حکومت کے زیر اہتمام کی جاتی ہے۔ حکومت کے بغیر یہ مہم سر بھی نہیں ہو سکتی۔ آج تک یہ بھی کبھی نہیں سنا گیا کہ کوئی مردم شماری غیر سرکاری طور پر بھی کبھی ہوئی یا ہو سکتی ہے۔ یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ مردم شماری کرنے والوں کو جن میں ہندو مسلمان اور مسلمانوں میں شیعہ سنی، نورباف اور طورباف سبھی جماعتوں کے افراد ہوتے ہیں۔ شیعہ جماعت یا مومن برادری سے کوئی ذاتی بغض ہے اور شیعہ اور مومن کو بھی وہ سنی اور شیخ لکھ دیتے ہیں۔ پھر آخر شیعہ رہنماؤں اور نورباف لیڈروں کی قوت باصرہ پر چند سال سے اس قدر ویدانتی رنگ کیوں چھا رہا ہے کہ

"جدھر دیکھتا ہوں اُدھر تو ہی تُو ہے"

خاتمہ گذارش کے طور پر یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ راقم السطور کانگریسی ہے نہ مسلم لیگی، احراری نہ نام دھاری۔ سیاسیات کے دائرے سے بارہ پتھر باہر ایک تماشائی کی حیثیت رکھتا ہے اور بس!

تاجور

اسلامیہ کالج لاہور:

سنا جاتا ہے کہ اسلامیہ کالج لاہور نے پرنسپل کو اربابِ نظم و نسق نے اس انداز میں زائد المیعاد بنا کر کالج کی خدمات سے سبکدوش کر دیا کہ دو دن پیشتر تک نہ طلبا کو اس حادثے کی اطلاع تھی۔ نہ اسٹاف کو اور بہ روایت بعض اساتذہ نہ خود پرنسپل کو۔ اور اس سلسلے میں اس قدر شتاب کاری کو برتا گیا کہ نئے پرنسپل کے لئے نہ اعلان شائع ہوا۔ نہ درخواستیں طلب کی گئیں نہ اس منصب کے لئے کسی کا انتخاب زیر غور آیا۔ اگر یہ واقعات صحیح ہیں تو انتہا درجہ اندوہناک ہیں۔ محترم خواجہ دل محمد صاحب قبلہ صوبے میں ایک معزز شخصیت کے مالک ہیں پنجاب کے مشہور ماہر ریاضی ہونے کے ساتھ ہی ان کی متنوع قابلیتوں نے انہیں تمام طبقات میں ہر دلعزیز بنا دیا ہے ایک ایسے باوقار و ذی وجاہت تعلیمی رہنما کو یہ یک گردش قلم اس انداز میں پرنسپل شپ سے سبکدوش کر دینا حمایت اسلام کی انتظامی بوالعجبیوں میں ایک افسوسناک اضافہ ہے — ہم اربابِ انتظام سے یہ پوچھنے کا حق رکھتے ہیں کہ صوبے کے اس سب سے بڑے اسلامی ادارے میں ان بے عنوانیوں کا سلسلہ کبھی ختم بھی ہوگا یا نہیں! آخر وہ ساعت سعید کب آئیگی جبکہ کالج کو ایک مستقل آزاد اور آزاد کار پرنسپل کی خدمات میسر آسکینگی۔ انجمن کے اربابِ حل و عقد کا رواں طرز عمل دیکھتے ہوئے کون کہہ سکتا ہے کہ اس خواب کو کبھی تعبیر بھی نصیب ہوگی۔ مسٹر ہیری مارٹن، مسٹر عبداللہ یوسف علی، مسٹر ایم اے غنی کے بعد پرنسپل کی اچانک سبکدوشی یہ اس صوبے کے تعلیمی حادثات ہیں جن کے پیش نظر اسلامیانِ پنجاب کی رائے عامہ انجمن کے اقتدار پرست ارباب سے یہ مطالبہ کرے تو بیجا نہ ہوگا کہ تم اس امانت کے

سامنا

یوں ہوا تھا بارِ اول اُن کا میرا سامنا

جس طرح آوارہ نغموں کو بہم کر دے فشار
یا کسی طوفان سے ہو جائیں موجیں ہمکنار
ٹوٹ کر جیسے فضا میں ناگہاں تارے ملیں
یا کہیں پردیس میں دو درد کے مارے ملیں

یوں ہوا تھا بارِ اول اُن کا میرا سامنا
کیا کہوں اے ہمنشیں! تھا کس مزے کا سامنا

بارِ اول جب ملے تو دل کے یوں گھُل مل گئے

جس طرح موجِ صبا میں حل ہو پھولوں کی شمیم
جس طرح سیراب ہو شبنم کو پی پی کر نسیم
جس طرح ہو برگِ گل میں رنگ و بو کا امتزاج
جس طرح افلاس کے رُخ پر ہو نورِ احتیاج

بارِ اول جب ملے تو دل کے یوں گھُل مل گئے
دل ملے، امید کے گویا شگوفے کِھل گئے

ہدیۂ دل لے لیا اور ہدیۂ دل دے دیا

وہ اُدھر خوش ہیں کہ یہ سودا تو وجہِ غم نہیں
یعنی یہ جامِ سفالیں جامِ جم سے کم نہیں
دل اِدھر شاداں کہ اس کو مل گیا اوجِ قبول
جوہری کی بھول تھی لیکن بہت دلچسپ بھول

ہدیۂ دل لے لیا اور ہدیۂ دل دے دیا
سادگی! بدلے خزف کے ماہِ کامل دے دیا

چودھری منظور احمد منظور بی اے ایل ایل بی

غزل

نگاہِ مست نظر میں سمائی جاتی ہے نیاز و ناز کی دنیا بسائی جاتی ہے

یہ دلفریب نظارے، یہ دلنواز حسین حقیقتِ غمِ ہستی چھپائی جاتی ہے

کچھ اس طرح سے نگاہوں کے تار ملتے ہیں کہ حسن و عشق میں بجلی سمائی جاتی ہے

عروسِ ماہ کی سرکار میں تعالے اللہ شرابِ حسن نظر سے پلائی جاتی ہے

وہ برقِ حسن جو لہرا رہی ہے ہونٹوں پہ بہار بن کے مرے دل پہ چھائی جاتی ہے

عیاں نہ ہونے دے نظروں سے جذبۂ الفت یہ من کی آگ ہے من میں جلائی جاتی ہے

سمجھ رہا ہوں خزاں کو نویدِ موسمِ گل کچھ اس طرح خلشِ غم مٹائی جاتی ہے

نظر وہ برقِ جمال اور وہ پیامِ سرور اسی سے آگ لگائی بجھائی جاتی ہے

یہ رقصِ جام یہ دُنیائے رنگ و بو یہ بہار یہ مجھ سے کیوں مری جنت چھڑائی جاتی ہے

ادائے حسن ہے کچھ اس قدر لطیف و گداز نظر پہ چڑھتی ہے دل میں سمائی جاتی ہے

یہ درسِ ضبط ہے احسنؔ کہ امتحانِ وفا

بڑھا بڑھا کے محبت گھٹائی جاتی ہے

اصغر علی احسنؔ

بیوی

تعارف

سر شنکر شرما	ادھیڑ عمر کے پروفیسر
مادھوی	سر شنکر کی نوجوان بیوی
للت کمار	مادھوی کا لڑکپن کا دوست
رام دیو	سر شنکر کا ملازم
مقام	مادھوی کا ڈرائنگ روم
وقت	پونے ۹ بجے شب

سر شنکر۔ (آپ ہی آپ) ابھی تک للت نہیں آیا۔ اچھا ہے مجھے کچھ اور موقع مل گیا جب تک، میں کچھ اور انتظام کروں گا (جیب سے گھڑی نکال کر) ابھی نو بجنے میں پندرہ منٹ باقی ہیں میرا تو خیال تھا عشاق بے صبر ہوتے ہیں وہ گھنٹہ آدھ گھنٹہ پہلے ہی آ موجود ہوگا مگر میرا خیال غلط ثابت ہوا (گھڑی کو جیب میں رکھتے ہوئے) خیر اب آتا ہی ہوگا ٹھیک نو بجے آنے کو لکھا تھا (بلند آواز سے) رام دیو! رام دیو!

رام دیو۔ جی آیا۔ (رام دیو ڈرائنگ روم میں داخل ہوتا ہے)

سر شنکر۔ کیوں رام دیو کوئی آ تو نہیں رہا ہے؟

رام دیو۔ جی نہیں۔

سر شنکر۔ خیر (رام دیو جانے لگتا ہے) ذرا سنو رام دیو۔ کچھ دیر پہلے اطلاع ملی ہے کہ لیڈی شرما کا کوئی پرانا دوست نو بجے ان سے ملنے آرہا ہے۔ انہیں معلوم ہے کہ وہ بوا جی کے ہاں گئی ہیں میں نے سوچا ممکن ہے انہیں واپس آنے میں دیر ہو اس لئے میں فوراً گھر چلا آیا اگر وہ شخص آجائے تو لیڈی شرما کو پوچھے تو اسے سیدھے کمرے میں پہنچا دینا لیکن اسے خبر نہ ہونے پائے کہ لیڈی شرما گھر پر موجود نہیں ہیں سمجھ گئے نا!

رام دیو۔ جی حضور!

سر شنکر۔ اچھا اب تم جا سکتے ہو۔

(رام دیو چلا جاتا ہے)

سر شنکر۔ (خود بخود) ابھی تک مادھوی بالکل بچی ہے کہیں دوست کے خط کو بھی کوئی اس طرح بے پروائی سے ٹیبل پر پھینک دیتا ہے۔ وہ تو کہو میری ہی نظر پڑی اگر کوئی اور دیکھ لیتا تو کیا خیال کرتا؟ اور کچھ تعجب بھی نہیں جو کسی کی نظر پڑ گئی ہو میں نے کتنی کوششوں سے اسے بوا کے ہاں جانے پر رضامند کیا میں نے بوا سے تاکید تو کر دی ہے کہ نو بجے میری کار جائیگی اور اسے واپس لے آئیگی اس سے پہلے اسے آنے نہ دینگی اس طرح مجھے آدھ گھنٹے کا وقت مل گیا ہے (ٹہلتے ہوئے) للت نے اپنی سابقہ محبت کو یاد دلاتے ہوئے لکھا ہے کہ میرے تمام محبت نامے میرے پاس بحفاظت موجود ہیں

امید ہے کہ میرے خطوط بھی تمہارے پاس محفوظ ہوں گے

(ایک کرسی پر بیٹھکر) میں نے ہی غلطی کی ۵۰ برس کی عمر میں بیس برس کی نوجوان لڑکی سے شادی کرنا کہاں کی دانشمندی تھی؟ پھر مجھے تعلیم و تدریس کے سوا دوسرے کسی مشغلے سے دلچسپی نہیں اور وہ ٹھہری شیر مارکیٹ کے دلال کی بیٹی۔ اور کلکتہ کی سوسائٹی گرل اسے نہ جانے کتنے نوجوانوں سے ملنے جلنے کا اتفاق ہوا ہوگا۔ اس لئے میں اس کو کہاں تک مطمئن اور خوش رکھ سکتا ہوں۔ اگر ایسی صورت میں وہ مجھے ناپسند کرتی ہو تو اس میں تعجب کی کونسی بات ہے لیکن ان تمام باتوں کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ میری بیوی ہے اس کو مجھ سے محبت ہو یا نہ ہو اس کی عفت و عصمت کی حفاظت میرا فرض ہے اگر وہ مجھ سے ترک تعلق کرلے تو بیشک اس کے کسی معاملے سے مجھے کوئی واسطہ نہ ہوگا مگر اس کے پہلے ...... (یکایک خاموش ہو جاتے ہیں)

(للت کمار کمرے میں داخل ہوتا ہے مگر کرسی کی آڑ میں ہونے کے باعث وہ سر شنکر کو نہیں دیکھتا)

للت کمار (ادھر ادھر دیکھکر خود بخود) عیش و عشرت کے یہ تمام سامان مادھوی نے محبت کے عوض میں حاصل کئے ہیں لیکن کیا ایک عورت کے لئے دولت و ثروت ساز و سامان اور عیش و راحت ہی سب کچھ ہے اس کے نزدیک محبت کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ میں مادھوی کے لئے اتنے سامان فراہم نہیں کرسکتا تھا پھر بھی میں اسے آرام و اطمینان سے رکھ سکتا تھا اول اول جب ہم دونوں میں ملاقات و شناسائی ہوئی مادھوی پندرہ سال کی تھی اس کے بعد چار سال تک ہم دونوں گہرے دوست کی حیثیت سے برابر ملتے جلتے اور ایک ساتھ نشست و برخاست کرتے رہے جب میں ولایت جا رہا تھا تو اس نے کس وثوق کے ساتھ وعدہ کیا تھا کہ وہ میرا انتظار کریگی لیکن ایک ہی سال میں ... لیکن نہیں اس نے اپنی رضامندی سے شادی نہ کی ہوگی اس کے باپ نے اسے شادی کرنے پر مجبور کیا ہوگا اس میں کچھ شک نہیں کہ مادھوی میرے سوا کسی سے محبت نہیں کر سکتی وہ میری ہے اور میری ہی رہیگی۔ وہ اب تک مجھ سے محبت کرتی ہے ورنہ اس وقت ملنے کے لئے مجھے خط کیوں لکھتی۔ اس نے لکھا تھا کہ آج سر شنکر بورڈ آف ڈائرکٹرس کی آرکیسٹرا کی معمولی میٹنگ میں جائینگے اس لئے ان کی واپسی میں یقیناً دیر ہوگی تم نو بجے تک ضرور آجانا میں تمہارے انتظار میں رہونگی ...

سر شنکر۔ نو بجنے میں صرف چھ منٹ اور باقی ہیں۔

للت (چونک کر) ایں یہ کون؟

سر شنکر (کرسی سے اٹھکر آگے بڑھتے ہوئے) کیا کہا آپ نے؟

للت: "میں ... میں نے پوچھا آپ کون ہیں ؟
سر شنکر: "واہ کیا خوب! آپ کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھکر میرے دل میں بھی یہی سوال پیدا ہوا تھا۔
للت: "لیکن میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ آپ کو میرے متعلق یہ جاننے کی کیا ضرورت ہو سکتی ہے ؟"
سر شنکر: کچھ خاص ضرورت تو نہیں پھر بھی میرا خیال ہے کہ انسان کو ایک دوسرے سے واقف ہونا ہی چاہیئے۔"
للت: لیکن کیا میں یہ امید کر سکتا ہوں کہ آپ میرے متعلق آپ اپنا یہ خیال ترک کر دیں گے ؟ میں اس صاف گوئی کے لئے معذرت . . . ."
سر شنکر: نہیں نہیں اس معذرت خواہی کی ضرورت نہیں۔ (وہ کرسی پر بیٹھ جاتے ہیں)
للت: آپ کو دیکھکر تو ایسا معلوم ہوتا ہے۔ آپ اس گھر کو بالکل اپنا گھر سا خیال کئے بیٹھے ہیں۔
سر شنکر: جی ہاں۔ لیکن ایسا خیال نہ کرنے کی کوئی وجہ تو نہیں معلوم ہوتی۔
للت: آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ یہ سر شنکر اور لیڈی شرما کا مکان ہے۔ کیا میں جان سکتا ہوں کہ آپ لیڈی شرما کے کمرے میں اس بے تکلفی کے ساتھ کیسے تشریف فرما ہیں ؟
سر شنکر: "بیشک، مگر آپ کو اس طرح کے سوال کا جتنا حق ہے اس کے جواب نہ دینے کا مجھے اس سے کم حق حاصل نہیں۔
للت: "لیکن شاید آپ اسے بھول رہے ہیں کہ میں آپ کو لیڈی شرما کے کمرے میں تنہا بیٹھے ہوئے دیکھ چکا ہوں۔"
سر شنکر: "نہیں میں اسے بھول نہیں سکتا میں پہلے کھڑا تھا اس کے بعد بیٹھ گیا اور اگر آپ تھوڑی دیر اور کر کے آتے تو شاید مجھے سوتا ہوا پاتے۔ اور ہاں آپ نے خوب یاد دلایا کیا میں بھی آپ سے دریافت کر سکتا ہوں کہ آپ یہاں کس غرض سے آئے ہیں ؟"
للت: "میں! میں لیڈی شرما سے ملنے کے لئے آیا ہوں۔"
سر شنکر: "کیا خوب! میرے آنے کی غرض بھی یہی ہے۔"
للت: "کیا آپ یہ نہیں سوچتے کہ لیڈی شرما جیسی شادی شدہ خاتون کے کمرے میں رات کے وقت ایک اجنبی کی موجودگی کس قسم کے شکوک کا موجب ہو سکتی ہے ؟"
سر شنکر: "میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے ایک بڑے خطرے سے ہوشیار کر دیا میرا خیال اب تک اس طرف نہیں گیا تھا۔ آپ یقیناً ایک دور اندیش آدمی ہیں۔ اچھا تو کہیئے اب مجھے کیا کرنا چاہیئے ؟"
للت: شریف آدمی کے لئے تو بس ایک ہی صورت ہو سکتی ہے . . ."
سر شنکر: "میں نے آپ سے اپنی شرافت کے بارے میں کب کہا تھا بخیر اس بات کو جانے دیجئے مجھے وہ صورت بتایئے۔"
للت: "بس یہاں سے فوراً رفوچکر ہو جایئے۔"
سر شنکر: "صورت تو آپ نے بہت معقول بتائی مگر میں سوچتا ہوں میرے چلے جانے کے بعد آپ کی موجودگی بھی شبہات کا باعث ہو سکتی ہے۔"
للت: میری موجودگی شبہات کا باعث کیوں ہونے لگی ؟"
سر شنکر: "فرض کیجیئے میں آپ کے کہنے کے مطابق یہاں سے چلا گیا اور آپ تنہا رہ گئے تو بحیثیت ایک شریف آدمی کے آپ کے لئے بھی وہی ایک صورت باقی رہ جاتی ہے کہ آپ بھی یہاں سے تشریف لے جائیں۔"
للت: "آپ کا خیال صحیح نہیں ہم دونوں کی حالت یکساں نہیں ہے میں لیڈی شرما کے خاص بلاوے پر یہاں آیا ہوں۔"
سر شنکر: "اگر یہ بات ہے تو ہم دونوں کی حالت میں کوئی فرق نہیں میں بھی خاص دعوت ہی پر یہاں آیا ہوں۔"
للت: "میں اس پر ہرگز یقین نہیں کر سکتا کہ آپ کو یہاں آنے کے لئے دعوت دی گئی ہے۔ لیڈی شرما بیک وقت ہم دونوں کو ہرگز بلا نہیں سکتیں۔"
سر شنکر: "آپ کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھکر میرے دل میں بھی یہی خیال پیدا ہوا تھا اور اب بھی مجھے یقین نہیں ہے کہ انہوں نے آپ کو اس وقت یہاں آنے کے لئے مدعو کیا ہوگا۔"
للت: کیا آپ نے ایک لمحے کے لئے بھی اس بات پر غور کیا ہے کہ سر شنکر کو آپ کے آنے کا علم ہو جائے تو لیڈی شرما پر کیا گذرے ؟"
سر شنکر: "کیا فرمایا ؟"
للت: میں کہہ رہا ہوں اگر سر شنکر کو آپ کے آنے کا پتہ چل گیا تو آپ سمجھ سکتے ہیں۔ لیڈی شرما کا کیا حشر ہوگا ؟
سر شنکر: "اجی سر شنکر کو وہ کب خاطر میں لاتی ہیں پھر انہیں پر کیا موقوف ہے آج کل عام عورتوں کے نزدیک شوہر کی کوئی حقیقت نہیں۔"
للت: تو آپ کے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ لیڈی شرما پر سر شنکر کا کوئی دباؤ نہیں ؟
سر شنکر: جی ہاں۔ اس لئے کہ ماڈرن عورتوں کے نزدیک شوہروں کی حیثیت تانگے کے ٹٹو سے زیادہ نہیں ہوتی۔ وہ شوہروں کو اپنی ضرورتوں کی تکمیل کے لئے ایک آلہ کار سمجھتی ہیں اور بس۔ مگر میں نہیں سمجھتا کہ آپ اس فضول مسئلے پر مغز پاشی کیوں کر رہے ہیں ؟"
للت: "اس لئے کہ لیڈی شرما سے میرے دیرینہ تعلقات و مراسم ہیں۔ اس بنا پر ان کی نیک نامی و بدنامی کا خیال رکھنا میرا فرض ہے۔"
سر شنکر: "میں آپ کے اس دعوے کو تسلیم نہیں کر سکتا لیڈی شرما سے میرے دیرینہ مراسم نہیں لیکن ان کے شوہر سر شنکر میرے پرانے دوست اور کلاس فیلو ہیں میں نے اس سے پہلے کبھی آپ کو یہاں نہیں دیکھا۔"
للت: آپ کو ایسی بات کرتے شرم نہیں محسوس ہوتی۔ آپ بنتے تو ہیں سر شنکر کے پرانے دوست اور کلاس فیلو اور آتے ہیں تنہائی میں ان کی بیوی سے ملنے۔"
سر شنکر: "اس میں شرم محسوس ہونے کی کونسی وجہ ہے ؟ میرے سوا دوسرے خوش قسمت لوگوں کو بھی تو ایسے مواقع حاصل ہوتے رہتے ہیں۔ پھر میں ہی کیوں محروم رہوں آجکل تمام دنیا کی یہی حالت ہو رہی ہے بیویاں خفیہ طور پر جو کچھ کرتی رہتی ہیں اگر ان کے شوہروں کو پتہ چل جائے تو وہ دو ہی روز میں پاگل ہو جائیں۔ آپ اپنے ہی کو دیکھ لیجئے۔ آپ کس غرض سے تشریف لائے ہیں ؟"

للت: "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ ایک ہی بات کیوں دہراتے رہتے ہیں؟ آپ نے سنا نہیں کہ میں لیڈی شرما کے خاص اصرار پر یہاں آیا ہوں لیکن آپ تو اپنے آنے کی کوئی معقول وجہ بھی نہیں بتاتے۔"

مسٹر شنکر: "او میں مسٹر شنکر کی بار بار خوشامد پر......"

للت: ان کی بیوی کے کمرے میں ڈیرہ ڈالے پڑے ہیں۔ کیوں؟ کیا بات فرما رہے ہیں آپ؟

مسٹر شنکر: "ہم دونوں کا آپس میں فیصلہ کرنا ناممکن ہے۔ اب اس معاملے کو لیڈی شرما پر ہی چھوڑ دینا چاہئے۔

للت: "آپ نے مذاق کی بھی حد کر دی۔ ارے جناب میرے ان کے پانچ سال کے تعلقات ہیں"

مسٹر شنکر: "میں اسے تسلیم کرتا ہوں کہ پندرہ سال کی ایک لڑکی کا آپ جیسے حسین و خوبرو نوجوان کے ساتھ بآسانی تعلق قائم ہو سکتا ہے لیکن بیس برس کی ایک دوشیزہ کا آسانی سے کسی کے قابو میں آنا ممکن نہیں۔ اس لئے کہ اس عمر میں پہنچکر وہ دنیا کو سمجھنے کے قابل ہو جاتی ہے۔ وہ صرف صورت پر ریجھ نہیں سکتی لیکن آپکے پاس تو اس کا بھی کوئی ثبوت نہیں کہ لیڈی شرما سے آپکے قدیمی مراسم ہیں"

للت: "آپ تو ناحق میرا دماغ چاٹ رہے ہیں یہ لیجئے (جیب سے خطوط کا ایک بنڈل نکالکر) یہ دیکھئے یہ تمام خطوط انہیں کے ہیں جو انہوں نے مجھے کبھی کبھی لکھے تھے صاحب کہئے اس سے زیادہ ثبوت آپ کو اور کیا چاہیئے؟"

مسٹر شنکر۔ (جیب سے کاغذوں کا پلندہ نکال کر) اگر خطوط ہی تعلقات کا ثبوت ہیں تو خطوط تو انہوں نے مجھے بھی لکھے ہیں جن میں اپنی محبت کا اظہار بھی کیا ہے ممکن ہے ان خطوں میں انہوں نے جو خیالات ظاہر کئے ہیں وہ ان کے دلی خیالات نہ ہوں پھر بھی یہ خطوط تو ہیں انہیں کے لکھے ہوئے!"

للت: غلط بالکل غلط میں اس پر کبھی یقین نہیں کر سکتا۔ کہ انہوں نے آپ کو عشقیہ خطوط لکھے ہوں گے۔"

مسٹر شنکر: "اگر آپ کو یقین نہیں تو آیئے شرط لگا لیجئے۔"

للت: "کس بات کی شرط؟"

مسٹر شنکر: "لیڈی شرما ہم میں سے جس کے تعلقات و مراسم کی تصدیق کر دیں گی۔ وہ دوسرے کا بنڈل جیت لیگا۔ کیوں۔ آپ پس وپیش کیوں کر رہے ہیں للت بابو؟"

للت: "میں بالکل پس وپیش نہیں کرتا۔ اس لئے کہ یقیناً جیت میری ہی ہوگی۔"

مسٹر شنکر: "تو پھر آیئے قسمت آزمائی کر لی جائے۔ پہلے آپ کوشش کیجئے گا اور بعد میں میں لیکن ایک شرط ہے۔"

للت: "وہ کیا؟"

مسٹر شنکر: "میں ابھی پاس کے کمرے میں چلا جاؤں گا تاکہ وہ مجھے دیکھ نہ لیں اور آپ بھی ان سے میرا ذکر نہ کریں"

للت: "مجھے یہ شرط منظور ہے۔"

مسٹر شنکر۔ "تو میں پاس کے کمرے میں چلا جاتا ہوں۔"

(مسٹر شنکر چلے جاتے ہیں)

للت (دل ہی دل میں) معلوم نہیں یہ کون شخص ہے؟ اور مادھوی سے اس کا کیا تعلق ہے؟...... تعجب ہے کہ صرف ایک سال کے اندر مادھوی میں اتنا انقلاب کیسے آگیا؟ آخر اس جیسی رومانٹک گرل ایک بوڑھے وہ بھی خشک طبع پروفیسر سے کیونکر محبت کر سکتی ہے۔"

(لیڈی شرما کا داخلہ)

للت (قریب جاکر) مادھوی!"

لیڈی شرما: "اچھا مسٹر للت آپ آگئے۔"

للت: "مجھے تمہارے اس طرز خطاب پر تعجب ہے تمہیں یاد نہیں کہ کچھ ہی دنوں پہلے تم مجھے للت بھیا کہکر مخاطب کیا کرتی تھیں؟"

لیڈی شرما: "مگر آپ بھی تو یہ سمجھنے میں غلطی کر رہے ہیں۔ کہ میں اب مادھوی نہیں لیڈی شرما ہوں۔"

للت: "اس میں غلطی کی کونسی بات ہے؟"

لیڈی شرما: "ممکن ہے آپکے نزدیک غلطی نہ ہو لیکن میرے نزدیک تو بہت بڑی غلطی ہے"

للت: "ممکن ہے تمہارا ہی کہنا درست ہو۔"

لیڈی شرما: ممکن نہیں یقیناً۔ اور آپ کا فرض ہے کہ آئندہ مجھے لیڈی شرما کہہ کر مخاطب کریں۔

للت۔ بہت بہتر۔ انسان کی یہ ایک عام فطرت ہے کہ اگر وہ بڑی قیمت پر کوئی جواہر خرید لے اور اسے یقین ہو جائے کہ اس نے اصلی جواہر کی قیمت دیکر غلطی سے نقلی جواہر خرید لیا ہے پھر بھی وہ اپنے کو تسلی دینے کے لئے نقلی جواہر بڑے فخر سے لوگوں کو دکھاتا پھرتا ہے۔"

لیڈی شرما: "اس کے کیا معنی؟"

للت۔ اس کے معنے سمجھانے کی ضرورت نہیں تم خوب سمجھ رہی ہو کہ میرے کہنے کا کیا مطلب ہے؟

لیڈی شرما: "خیر یہ بتایئے آپ نے مجھے اس کے لئے کیوں مجبور کیا کہ میں آپ کو یہاں ضرور بلواؤں۔"

للت: "کس طرح کہہ رہی ہو مادھوی!"

لیڈی شرما: "کیا یہ حقیقت نہیں ہے؟"

للت: "خیر چھوڑو اس بات کو میں سمجھتا ہوں میرے اس وقت آنے سے تمہیں جس قدر خوشی ہوئی ہوگی، مسٹر شنکر موجود ہوتے۔ تو تمہیں اتنی خوشی نہ ہوتی۔"

لیڈی شرما: "اگر آپ ان سے واقف ہوتے تو ایسے خیال کا اظہار نہ کرتے۔"

للت: "اوہو! تب تو وہ بہت دلچسپ آدمی ہوں گے۔ (یکایک لہجہ بدل کر) مادھوی میری سمجھ میں نہیں آتا تم میرے ساتھ اس قدر بیگانہ وار کیوں پیش آ رہی ہو؟ کیا تم ان مسرت آگیں ایام کو بھول گئیں میں تو انہیں کی شیریں یاد کے

تمہارے اب تک جی رہا ہوں ورنہ ....."

لیڈی شرما: "مجھے امید ہے کہ آپ اسی طرح جیتے رہینگے۔ یہاں تک کہ ایک روز ایک ہستی آکر آپ کی زندگی کو پُرکیف اور سرور آفریں بنادیگی۔"

للت: "تم میرا مذاق اڑا رہی ہو مادھوی!"

لیڈی شرما: "مذاق نہیں میں ایک دوست کی حیثیت سے واقعی بات کہہ رہی ہوں۔"

للت: "تو کیا ہم ایک دوسرے کے صرف دوست ہی تھے؟"

لیڈی شرما: "شاید اس سے کچھ زیادہ مگر آپ کو یہ حقیقت پیش نظر رکھنی چاہیے۔ کہ میں اس وقت ایک کمسن اور ناتجربہ کار لڑکی تھی اور میرے والد آپ کو ایک متمول نوجوان سمجھ کر آپ سے تعلق قائم رکھنا ضروری خیال کرتے تھے۔ اس وقت میرے والد بازار میں بہت بدنام تھے۔ اس لئے کوئی ان کے ہاں کام کرنے کے لئے رضامند نہ ہوتا تھا یہی وجہ تھی جو والد صاحب آپ کو پاکر چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ وہ تو کہیئے اس وقت انہوں نے میری بات نہیں مانی ورنہ آج جبکہ آپ قلاش ہوچکے ہیں میرے ساتھ ان کو بھی پچھتانا پڑتا۔ آپ ان کے ہاں جایئے۔ دیکھئے وہ آپ کے ساتھ پہلا سا سلوک روا رکھتے ہیں۔"

للت: "لیکن مادھوی تم ...."

لیڈی شرما: "میں نے آپ کو بار بار سمجھا دیا کہ اب میں مادھوی نہیں لیڈی شرما ہوں لیکن افسوس اتنی سی بات بھی آپ کے دماغ میں نہیں اُترتی۔"

للت: "تو کیا تمہارا وہ اظہار عشق و محبت اور شادی کا وہ عہد وپیمان بھی تمہارے باپ کے تعلقات و مراسم کی طرح محض فریب تھا"

لیڈی شرما: "آپ حقیقت حال کے سمجھنے سے دانستہ یا نادانستہ گریز کر رہے ہیں للت بابو۔ آپ جب کی بات کہتے ہیں میرا دنیاوی تجربہ بہت محدود تھا۔ اس وقت میں نے جو کچھ کہا وہ میری نادانی اور ناتجربہ کاری کا نتیجہ تھا۔ اس لئے اس عہد وپیمان سے کوئی ذمہ داری عائد بھی ہوتی ہو تو وہ مادھوی پر عائد ہوسکتی ہے۔ نہ کہ لیڈی شرما پر جو ایک ناتجربہ کار اور نادان لڑکی نہیں بلکہ بائیس برس کی ایک بصیرت مند اور زمانہ شناس عورت ہے۔"

للت: "لیکن اس کو عورت بننے پر مجبور کیا گیا۔"

لیڈی شرما: "دیکھئے للت بابو! دائرہ تہذیب سے تجاوز نہ کیجئے۔ آپ پندرہ برس کی نادان لڑکی مادھوی سے باتیں نہیں کر رہے ہیں۔"

للت: "کاش میں مادھوی ہی سے باتیں کرتا ہوتا۔ وہ نادان و ناتجربہ کار ہونے کے باوجود تمہاری طرح محبت کو دولت و ثروت اور عیش و عشرت کے عوض فروخت نہیں کرسکتی تھی۔"

لیڈی شرما: "اگر آپ کو اس طرح کی باتیں کرنی ہیں تو بہتر ہے کہ آپ تشریف لے جائیں۔ مجھے ایسی اہانت آمیز باتوں کے سننے کی تاب نہیں۔"

للت: "بہتر ہے لیکن کیا میں جان سکتا ہوں کہ تم نے مجھے کیوں بلایا تھا؟"

لیڈی شرما: "اس لئے کہ میری نادانی اور ناتجربہ کاری کی یادگار آپ کے پاس میرے جو خطوط ہیں۔ انہیں آپ سے واپس لے لوں۔"

للت: "کیوں؟"

لیڈی شرما: "ضرورت ہے۔"

للت: "کونسی ضرورت ہے۔ کیا میں جان سکتا ہوں؟"

لیڈی شرما: "میں ایک شوہر پرست عورت ہوں۔ اور اپنے شوہر سے سچی محبت کرتی ہوں۔ اس لئے اگرچہ ان خطوط میں کوئی خاص بات نہیں ہے۔ پھر بھی ممکن ہے وہ خطوط ان کے جذبات و احساسات کے منافی ثابت ہوں۔ اس لئے میں ان کو آپ سے واپس لے لینا ضروری خیال کرتی ہوں۔"

للت: "یہ کیوں نہیں کہتیں کہ وہ تم پر شبہ نہ کریں۔ اس لئے تم ان خطوں کو واپس لینا چاہتی ہو۔"

لیڈی شرما: "اچھا اب آپ مہربانی کرکے میرے کمرے سے نکل جائیں۔"

للت: "میں جا رہا ہوں لیکن ایک مرتبہ غور کر لو کہ اگر یہ خطوط تمہارے شوہر کے علم میں آگئے تو تمہارے حق میں اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟"

لیڈی شرما: "آپ اطمینان رکھئے میں نے سب کچھ غور کر لیا ہے۔ آپ میرا کچھ بگاڑ نہیں سکتے۔"

للت: "مجھے تم سے محبت ہے اور بے پناہ محبت! اس لئے میں تمہیں حاصل کرنے کے لئے خطرناک سے خطرناک اقدام کرنے میں بھی پس و پیش نہ کروں گا۔ مجھے معلوم ہے کہ سر شنکر سے تمہاری شادی ہوچکی ہے لیکن تم ان سے محبت نہیں کرتیں۔ صرف محبت کا پارٹ کرتی ہو جسے اب میں ختم کر دینا چاہتا ہوں۔"

لیڈی شرما: "آپ جاتے ہیں تو جایئے۔ ورنہ میں خود چلی جا رہی ہوں۔"

(لیڈی شرما جانا چاہتی ہیں)

للت: (دروازہ روک کر) "نہیں نہیں جانے کی ضرورت نہیں تم یقین کرو میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ اس لئے میں تمہارے راز کو سر شنکر پر ہرگز ظاہر نہیں کرسکتا۔"

لیڈی شرما: "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں میرے آپ کے درمیان کوئی راز ہی نہیں ہے۔ آپ کسی پر ظاہر کیا کریں گے؟"

للت: (جیب سے خطوط کا بنڈل نکال کر) "اور یہ خطوط جو تمہارے خلاف زبردست شاہد کی حیثیت سے موجود ہیں (یکایک لیڈی شرما کا ہاتھ پکڑ کر) بولو۔ مادھوی! کیا تم مجھ سے محبت نہیں کرتیں؟"

لیڈی شرما: (ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے) "دیکھئے میرا ہاتھ چھوڑ دیجئے۔ ورنہ سمجھ لیجئے۔ کہ آپ اپنے حق میں اچھا نہیں کر رہے ہیں۔"

(سر شنکر یکایک بغل کے کمرے سے نکل کر پہنچ جاتے ہیں۔ للت ہاتھ چھوڑ دیتا ہے لیڈی شرما پر سکتہ سا طاری ہوجاتا ہے)

سر شنکر: "مجھے افسوس ہے کہ میں آپ دونوں کے معاملے میں مخل ہوا۔"

للت: "اُف! مجھ کو ذلیل کرنے کے لئے یہ اسکیم بنائی گئی تھی۔"

سر شنکر: (للت سے) "اب تو شاید آپ خود تسلیم کریں گے کہ آپ ہار گئے۔ اس لئے مجھے تو امتحان دینے کی ضرورت نہیں۔"

للت: "جی ہاں۔ مجھے تسلیم ہے کہ میں ہار گیا لیکن اس ڈرامے کو یہیں ختم نہ سمجھئے۔

ابھی اس کا آخری سین باقی ہے۔ (گھنٹی بجاتا ہوا) او گھر کے نوکر چاکر! لیڈی شرما کے کمرے میں آکر دیکھو۔ دس بجے رات کی تنہائی میں کس لطف سے عشق و محبت کے کھیل کھیلے جا رہے ہیں"

(رام دیو آتا ہے)

رام دیو۔ (سر شنکر سے) حضور نے مجھے بلایا ہے"۔

سر شنکر" ہاں"

للت" حضور! آپ ..... آپ کون ہیں؟"

سر شنکر۔ جس سے لیڈی شرما سوسائٹی اور مذہب کے ضابطے کے مطابق محبت کر سکتی ہیں یعنی سر شنکر شرما۔ اس لئے لائیے شرط کے مطابق خطوط ادھر عنایت کیجئے"

سر شنکر۔ (للت کے بے حس ہاتھوں سے خطوط کا بنڈل لیکر رام دیو سے) "رام دیو! آپ کو سڑک تک پہنچا آؤ"

رام دیو (للت سے) "چلئے!"

(للت سر جھکائے رام دیو کے ساتھ کمرے سے نکل جاتا ہے)

لیڈی شرما میں سخت نادم اور شرمسار ہوں۔ اور اپنے کئے کی معافی چاہتی ہوں"

سر شنکر" مجھے قبل از شادی کسی معاملے سے کوئی واسطہ نہیں۔ اور آج سے تم میری وفادار بیوی ہو۔ اس کا تم نے بخوبی ثبوت دیدیا ہے"

لیڈی شرما (سر شنکر کے پاؤں پر گر کر) تم نے ساری باتیں سن لی ہیں۔ علاوہ ازیں میرے یہ خطوط میرے جرم کی شہادت دے رہے ہیں"

سر شنکر۔ (بیوی کو قدموں سے اٹھا کر) "بے شک مجھ کو سب کچھ معلوم ہو چکا ہے پھر بھی میں اپنے کو خوش قسمت سمجھتا ہوں جو تمہاری جیسی وفادار رفیقۂ زندگی ملی۔ ان خطوط کی میرے نزدیک کوئی حقیقت نہیں"

(سر شنکر جیب سے دیا سلائی نکال کر خطوط کے بنڈل کو آگ لگا دیتے ہیں اور خطوط جل کر خاک ہو جاتے ہیں' لیڈی شرما ان کا پاؤں چھونے کے لئے جھکتی ہے۔ سر شنکر اسے سینے سے لگا لیتے ہیں)

محمد قمر الدین رام نگری

ڈچ نیو گائنا ان جزائر میں سے ایک ہے جو آسٹریلیا کے قریب واقع ہیں۔ آجکل جاپان نے اس جزیرے کے ساحلوں پر اپنی فوجیں آتار دی ہیں۔ اب یہاں آبادی کافی ہے لیکن جب یہ جزیرہ دریافت ہوا۔ اور ڈچ سیاح اور محقق اس کے اندرونی حصوں میں گئے تو انہوں نے تین تین فٹ قد کے خطرناک چوہوں کو جنگلوں میں گھومتے دیکھا۔ کنگرو پالتو جانور ہے لیکن اس علاقہ میں کنگروؤں نے سیاحوں کے لئے مشکلات پیدا کر دیں۔ سیاح کنگروؤں کو پکڑنے کی کوشش نہیں کرتے تھے بلکہ ان کے لئے ان جانوروں سے پیچھا چھڑانا مشکل ہو گیا تھا۔ سیاح جہاں بھی جاتے کنگرو ان کا تعاقب کرتے تھے۔

نثر لطیف

ارمغانِ دوست

یہ چنبیلی کے حسین و سیم رنگ پھولوں کا ہار

میرے بالیں کی زینت ہے۔

گویا کسی حور کے نفیس و پاکیزہ خیالات کا سلسلہ ہے۔

نرم و نازک جذبات کی بے رنگ تصویر۔

یا حرم کے سفید پوش کبوتروں کی ایک منحنی قطار

جو منجمد ہو کر رہ جائے۔

یا کسی خوش قسمت کی مسرت و انبساط کی گھڑیاں،

غم و الم کی سیاہی سے پاک،

کمرہ ان کی نکہتِ عطر بیز سے اس طرح معمور ہے،

جیسے کسی منتظر کا دل دوست کی آمد کے خیال سے۔

مس نیاز بیٹ ایم ۔ اے

ادب جدید

جاؤگی سچ مچ چلی جاؤگی کیا؟
تم یہاں واپس نہ پھر آؤگی کیا؟
پھر دلِ مضطر کو تڑپاؤگی کیا؟
رنج دیکر مجھ کو کل پاؤگی کیا؟
جاؤگی سچ مچ چلی جاؤگی کیا؟

سانس کو ہونٹوں پہ جلتا چھوڑکر
آگ کا طوفاں اُبلتا چھوڑکر
جان جاتی، دل اُچھلتا چھوڑکر
مجھ پہ دانستہ ستم ڈھاؤگی کیا؟
جاؤگی سچ مچ چلی جاؤگی کیا؟

چاہنے والوں سے تم ہو سرگراں
کیا دکھانے کو ہے دورِ آسماں
گلشنِ امید اور نذرِ خزاں
میرے ارمانوں کو ٹھکراؤگی کیا؟
جاؤگی سچ مچ چلی جاؤگی کیا؟

یہ تکلم یہ حسیں خاموشیاں
یہ محبت سے بھری سرگوشیاں
یہ نگاہِ مست کی مدہوشیاں
ان سے پھر آنکھوں کو ترساؤگی کیا
جاؤگی سچ مچ چلی جاؤگی کیا

رات دن آنسو بہیں گے ہجر میں
بے اثر نالے رہیں گے ہجر میں
کس سے حالِ دل کہیں گے ہجر میں
رحم مجھ پر تم اب نہ کھاؤگی کیا؟
جاؤگی سچ مچ چلی جاؤگی کیا؟

تم کو اس قلبِ شکستہ کی قسم
شورشِ ایامِ رفتہ کی قسم
تلخیٔ عہدِ گذشتہ کی قسم
یہ بتا دو پھر کبھی آؤگی کیا؟
اور اب سچ مچ چلی جاؤگی کیا؟

جاؤگی نجمہ سے کیا منہ موڑ کر
جاؤگی عہدِ محبت توڑ کر
جاؤگی مجھ کو تڑپتا چھوڑ کر
ظلم پر اپنے نہ شرماؤگی کیا؟
جاؤگی سچ مچ چلی جاؤگی کیا؟

نجمہ تصدق

طالب علم ایڈیٹر

آجکل تو پنجاب یونیورسٹی نے جرنلزم کی ایک کلاس کھول رکھی ہے جس میں ایڈیٹری کی باقاعدہ تعلیم دی جاتی ہے لیکن جب ہم ایڈیٹری کے طالب علم تھے۔ تو ہمیں ایڈیٹری اسی طرح سیکھنی پڑی جس طرح موچی یا نائی کا کام سیکھا جاتا پیشہ وروں کے ہاں بچے بٹھا دیئے جاتے ہیں جو استاد کے کام کو دیکھ دیکھکر اپنا پیشہ سیکھ لیتے ہیں۔

مجھے الٹی سیدھی مضمون نویسی تو آتی ہی تھی۔ اس لئے ایک روزانہ اخبار میں جا بھرتی ہوا چونکہ میں نو آموز تھا اس نے میری تنخواہ اتنی ہی مقرر ہوئی جتنی جوتے گانٹھنے والا مہینے میں کما لیتا ہے۔ کام سیکھنا تھا اس لئے میں نے غنیمت سمجھا کہ چلو گھر سے کھا کے تو کام نہ سیکھنا پڑا۔

پہلے ہی دن چیف ایڈیٹر صاحب نے مجھے ایسوشی ایٹیڈ پریس کے چند تار ترجمہ کے لئے دیئے میں نے ان کو پڑھکر دیکھا تو ایسے مشکل نہ تھے کہ میں ترجمہ نہ کرسکوں مثلاً ایک تار میں لکھا تھا۔ 500 Head goats were taken away by The tribes men.

اس میں ایک بھی لفظ ایسا نہ تھا جس کے معنے مجھے نہ آتے ہوں میں نے قلم اٹھایا اور اس کا حسب ذیل ترجمہ لکھ دیا۔

قبائلی لوگ بھیڑوں کے ۵۰۰ سر کاٹ کرے گئے۔ "کاٹ کر" فالتو لفظ تھے جو میں نے اپنی گرہ سے لگا دیئے کیونکہ تار میں کاٹنے کا ذکر نہ تھا۔ بہرحال میں اتنا بیوقوف نہ تھا کہ یہ بھی نہ سمجھ سکوں کہ آخر قبائلی سر لے گئے تو کاٹ کر ہی لے گئے ہوں گے۔

جب میں یہ ترجمہ لیکر چیف ایڈیٹر کے پاس گیا۔ تو وہ ترجمہ دیکھکر میرے منہ کی طرف تکنے لگا میں حیران تھا کہ معاملہ کیا؟ مجھے اطمینان تھا کہ میں نے کسی ایک لفظ کا ترجمہ بھی غلط نہیں کیا اس وجہ سے چیف ایڈیٹر کی نگاہیں مجھے اچھی معلوم نہ ہوئیں۔ آخر اس نے کہا۔ "تمہاری انگریزی تعلیم کہاں تک ہے؟" میں نے جواب دیا "کہ مڈل پاس ہوں"۔ چیف ایڈیٹر مسکرایا اور بولا معلوم ہوتا ہے کہ تم پڑھاؤوں کے کوٹھے میں پڑھے ہو۔"

میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ بات کیا ہے۔ آخر چیف ایڈیٹر بولا۔ ارے میاں مویشیوں کے ساتھ head کا لفظ اسی طرح استعمال ہوتا ہے جس طرح اردو میں "راس" کا مثلاً ایک راس بیل۔ ایک راس گدھا۔ ایک راس تم۔

یہ ایڈیٹری کا پہلا سبق تھا دوسرے دن ایک تار میں یہ الفاظ تھے۔

His 15 years old son.

یہ سارے الفاظ اتنے آسان ہیں کہ چوتھی پانچویں جماعت کا طالب علم ان کا ترجمہ کرسکتا ہے۔ اور پھر میں تو ایک دم مڈل پاس تھا میں نے اس کا یہ ترجمہ لکھا:۔

"اس کا پندرہ سال بڈھا لڑکا"

اب کے ترجمہ لے کر چیف ایڈیٹر صاحب کے پاس گیا۔ تو وہ بولا "ارے بھئی! ایڈیٹری کرنا کیا ضرور ہے؟ تمہارے لئے یہ اچھا ہے کہ دلی دروازے کے باہر پان کی دکان کرلو۔"

اس دفعہ تو مجھے بھی ذرا سا غصہ آگیا۔ اور میں نے کہا کیوں جناب! کیا غلطی ہے؟ آپ ہی بتلایئے۔ کہ his کے معنی "اس کا" نہیں؟ 15 پندرہ نہیں؟ years کا ترجمہ "سال" نہیں؟ اور old "بڈھے" کو نہیں کہتے ہیں۔ اور "son" کے معنی "بیٹا" نہیں۔

چیف ایڈیٹر "ہاں۔ ہاں" کرتا گیا لیکن آخر میں بولا۔ کہ ترجمہ پھر غلط ہے۔ میں نے پوچھا۔ "وہ کس طرح؟" اس نے جواب دیا کہ "بھلے مانس ۱۵ سال کا آدمی بھی بڈھا ہوتا ہے؟" میں نے کہا۔ "نہیں تو لیکن یہ تار کے حروف کی غلطی ہے میری نہیں۔ دراصل ۱۱۵ ہوگا تار والوں نے ایکا اڑا دیا ہے۔

اس پر چیف ایڈیٹر نے قہقہہ لگایا اور شفقت آمیز لہجہ میں کہا کہ بھائی یہاں old کے معنی عمر ہیں۔ اس کا ترجمہ یہ ہوگا۔ "اس کا ۱۵ سال عمر کا لڑکا"۔ میں نے عرض کیا کہ کس کی بات مانی جائے۔ ماسٹر کی یا ایڈیٹر کی۔ ماسٹر نے تو ہمیں old کے معنی "بڈھا" ہی بتائے تھے بہرحال دونوں ٹھیک ہیں "ڈ" دونوں میں مشترک ہے۔

ایک دن چیف ایڈیٹر نے مجھے نصیحت کی کہ ترجمہ کرتے وقت اپنی اردو تحریر میں خوبی پیدا کیا کرو۔ یہ ضروری نہیں کہ ترجمہ بالکل لفظی ہے آزاد ترجمہ ہونا چاہئے۔

اس نصیحت کے بعد جو تار میرے پاس ترجمہ کے لئے آیا۔ وہ صرف دو سطروں پر مشتمل تھا جس میں لکھا تھا کہ بارش کے باعث پالم پور کے قریب ایک ندی کا پل ٹوٹ گیا۔

میں نے سوچا۔ کہ اس تار کے ترجمہ میں چیف ایڈیٹر صاحب کی نصیحت پر عمل کرنا چاہئے۔ چنانچہ میں نے اللہ کا نام لیکر قلم اٹھایا اور لکھا:۔

رات کا بھیانک سماں ہر طرف تاریکی خوفناک تاریکی۔ ندی کی سطح پر ابھی چند گھنٹے پہلے آفتاب کی سنہری کرنیں رقص کر رہی تھیں لیکن اب اس پر ظلمت چھائی ہوئی تھی سکوت طاری تھا صرف اس سکوت کی سحر کو پانی کی لہریں توڑ رہی تھیں۔ جو بچوں کی طرح مچل کر ایک دوسری سے کھیل رہی تھیں۔ دفعتہً شمال کی طرف سے گرجتا ہوا ابر اٹھا بجلی کوندنے لگی اور آن کی آن میں موسلا دھار بارش شروع ہو گئی جل تھل ایک ہوگئے اور ندی میں اس قدر طوفان اٹھا کہ اس کے شور سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی ساتھ میں پانی کا ایک ایسا زبردست ریلا آیا کہ ندی کے پل کو کاغذ کی طرح بہا کے لے گیا۔۔۔۔۔۔ وغیرہ۔

یہاں میں نے اختصار سے کام لیا ہے لیکن اصل ترجمہ پورے فلسکیپ کاغذ پر آسکا میں مطمئن تھا کہ آج چیف ایڈیٹر صاحب بہت خوش ہونگے چنانچہ میں یہ فلسکیپ کاغذ اور اس

کے ساتھ تار کا چھوٹا سا پرزہ دے کر چیف ایڈیٹر کے کمرہ میں گیا۔ اس نے پہلے تار کو پڑھا پھر ترجمہ کو۔ وہ پڑھ رہا تھا اور مسکرا رہا تھا جب ختم کر چکا۔ تو اس نے سرخ پنسل اٹھائی اور کاغذ کی پیشانی پر لکھدیا "پہلا باب" اور مجھ سے کہا کہ اچھا ناول ہے اسے ختم کرو۔

ترجمہ کے مراحل سے گذرنے کے بعد "رپورٹنگ" کا کام میرے سپرد ہوا میں جلسوں میں جاتا اور ان کی روئیداد لکھکر دفتر لاتا سیاسی لیڈروں کے پاس جاتا۔ اور مختلف سیاسی واقعات کے متعلق ان کی رائے قلمبند کرتا۔ ایک سیاسی لیڈر کی تقریر رٹ رکھی ہے صرف موضوع کے مطابق اس میں تھوڑا سا تغیر و تبدل کر لیتا ہے۔

ایک دفعہ ان صاحب نے باغبانپورہ میں تقریر کرنی تھی۔ شام کے وقت میں باغبانپورہ جانے لگا۔ تو راستہ میں ایک دوست مل گئے اور مجھے ورغلا کے اپنے ہاں لے گئے میں نے بھی سوچا کہ تقریر تو وہی ہوگی جو ہمیشہ ہوا کرتی ہے صرف اس میں "شہید گنج" کا اضافہ ہوگا۔ میں دو تین گھنٹے اپنے دوست کے ہاں بیٹھا رہا۔ اور وہیں بیٹھے بیٹھے میں نے باغبانپورہ کی تقریر مرتب کرلی۔ وہاں سے اٹھکر دفتر پہنچا۔ اور رپورٹ نائٹ ایڈیٹر کے حوالے کردی۔

اگلی صبح کو ہمارا پرچہ نکلا۔ تو یہ تقریر پوری کی پوری ہنگامہ خیز عنوانات کے ساتھ شائع ہوئی۔ عنوان یہ تھے۔

خدا کا گھر قیامت تک خدا کا گھر ہے
دنیا کی کوئی حکومت مسلمانوں سے مسجد شہید گنج نہیں چھین سکتی۔
مسلمان مسجد کو حاصل کرنے کے لئے خون کا آخری قطرہ بہادیں گے۔
باغبانپورہ میں حضرت .... کی ولولہ انگیز تقریر

لیکن جب میں نے دوسرے اخبارات دیکھے۔ تو ان میں لکھا تھا کہ حضرت ...... علالت کی وجہ سے باغبانپورہ میں تقریر نہیں کر سکے۔ آئندہ تاریخ کا اعلان بعد میں ہوگا۔

حاجی لق لق

معلوم نہیں کہ ہندوستان میں بھی کتنے شوہر ہونگے جو بیویوں سے ڈرتے ہوں گے لیکن یورپ و امریکہ میں تو ایسے شوہروں کی کمی نہیں چنانچہ یورپ و امریکہ کے اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ وہاں ہر سال ہزاروں شوہر اپنی بیویوں کے خوف سے گھر چھوڑ کر بھاگ جاتے ہیں اور سالہا سال تک گھر واپس آنے کا نام نہیں لیتے۔

ایک ۴۱ سالہ اطالوی فوجی افسر کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ جنگ سے پہلے بھاگ کر فرانس آگیا اور اس نے پولیس کو بتایا کہ میری بیوی قیامت ہے میں مسولینی سے اتنا نہیں ڈرتا جتنا کہ اپنی بیوی سے چنانچہ وہ فوج کے قانون سے نہ ڈرا لیکن بیوی کے ڈر سے فوج کو چھوڑ کر فرانس بھاگ گیا۔

امریکہ کا ایک لکھ پتی سان فرانسسکو میں رہتا ہے وہ اپنی بہت بڑی جائیداد نیو یارک کے علاقہ میں چھوڑ آیا ہے اس کا بیان ہے کہ وہ اپنی بیوی سے اس قدر ڈرتا ہے کہ کھانا پینا تک بھول جاتا ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ یورپ و امریکہ کے تقریباً ۲۰ ہزار شوہر بیویوں کے خوف سے ہر سال بھاگ جاتے ہیں اور بعض نے تو خودکشی تک کر لی ہے۔

غزل

غیب سے عشق کو ندا آئی
بیخبر! مظہر حیات ہے تو
اے یم کائنات کی مستی!
ناز کر ناز بے جہات ہے تو
تیرے نالوں سے گرمیٔ محفل
مطرب بزم کائنات ہے تو
خون سے تیرے دشت رشکِ جناں
قیسِ لیلائے ممکنات ہے تو
عشق! تو ہے دنوں میں عید کا دن
اور شبوں میں شب برات ہے تو
جانتا ہے مقام کو اپنے؟
ماورائے تعینات ہے تو
اک تسلسل ہے تیری ہستی میں
یعنی زنجیر واردات ہے تو
وادیٔ ابتلا میں ہمت کر
آپ اپنی امیں نجات ہے تو
"غم اگر جنس جانگسل نہ بدے"
ابن آدم امیں دل نہ بدے"

امین حزیں سیالکوٹی

فرانسیسی رقاصہ

فرانسیسی میدان جنگ کے آخری کنارے پر ایک چھوٹا سا گاؤں تھا ۔ موسلا دھار بارش ہو رہی تھی دن رات کی طرح تاریک ہو رہا تھا جرمن فوج کے حملوں سے برباد شدہ چھوٹا سا گاؤں اس طرح خاموش اور ساکن تھا جیسے کسی حسین و جمیل دوشیزہ کی لاش !

جرمن سپہ سالار میجر گرافان فاریس برگ اپنے معتمد علیہ جاسوسوں اور کئی بر گیڈ سپاہیوں کو لئے ہوئے ایک سال ہی سے اس علاقے میں پڑا ہوا تھا ۔ کمانڈر انچیف کے حکم آنے تک اس علاقے کے امن و امان کی حفاظت و نگرانی اس کے سپرد تھی ۔ گاؤں کا سب سے بڑا مکان ان سب کا مسکن بنا ہوا تھا ۔ مکان کا نام شیودی وائل تھا ۔

شام کا وقت تھا ۔ میجر گرافان اپنے کمرے میں آرام کرسی پر لیٹا جرمن اخبارات اور اپنے خطوط دیکھ رہا تھا ۔ اس کے سامنے سنگ مرمر کی ایک چھوٹی سی ٹیبل تھی جس پر رکھے ہوئے کافی کے پیالے سے بھاپ نکل رہی تھی ۔ میجر کے منہ میں خوشبودار تمباکو کا پائپ تھا ۔ اپنے نیم و شیم جسم شعلے کی طرح روشن چہرے اور چوڑے چکلے بازو اور سینے کے اعتبار سے گرافان انسان نہیں دیو زاد معلوم ہوتا تھا ۔

خطوط دیکھ چکنے کے بعد میجر نے دو لکڑیاں اور آگ میں ڈال دیں ۔ یہ لکڑیاں گاؤں کے آدمی جنگل سے کاٹ کر لاتے تھے ۔ اس لئے یہ خوب فراخدستی کے ساتھ جلائی جاتی تھیں ۔ میجر نے شیشے کی کھڑکی کھول کر ایک پرشین قومی گیت گنگنانا اور اس کے ساتھ بوٹوں کی نوک سے تال دینا شروع کیا ۔ اتنے میں دروازے پر ہلکی سی تھپتھپاہٹ ہوئی ۔ میجر گھوم کر اٹھ کھڑا ہوا اور بولا " اندر آؤ "

جو شخص اندر داخل ہوا وہ میجر گرافان کا اسسٹنٹ کیپٹن بیرن فان کال وستن تھا ۔ اس کی صورت ہی سے پتہ چل رہا تھا کہ کوئی شیطانی خیال اس کے دماغ میں چکر لگا رہا ہے ۔ ایک روز رات کو اس نے نہ جانے کیوں سامنے کے دانت تڑوا دیئے جس کا راز اب تک لامعلوم ہے ۔ اب یہ پوپلے منہ سے اس طرح بولتا کہ اس کی بات اچھی طرح سمجھ میں نہ آتی اس کی چندیا بالکل صفاچٹ تھی لیکن سر کے گرد ہلکے سرخ رنگ کے گھنے بال کافی موجود تھے ۔ —— میجر نے آگے بڑھ کر کیپٹن سے ہاتھ ملایا اور اس کے بعد کافی کے پیالے کو ایک ہی گھونٹ میں خالی کر دیا ۔ صبح سے یہ اس کی چھٹی پیالی تھی ۔ کیپٹن نے رات کی قابل اطلاع باتیں میجر کو بتائیں ۔ اسی درمیان میں خانساماں نے کھانے کے لئے آواز دی جسے سنتے ہی دونوں آپس میں باتیں کرتے ہوئے کھانے کے کمرے میں چلے گئے ۔ وہاں تین فوجی افسر پہلے سے موجود تھے ۔ ان کے نام تھے لفٹنٹ اٹوفان گروسلنگ ، لفٹنٹ فرنیشتے برگ ، لفٹنٹ بیرن فان ہیرک ۔

اس آخری شخص کی نسبت یہ بتا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس کی شکل و شباہت اور نشست و برخاست باقی جرمن افسروں سے بالکل مختلف تھی ۔ اس کے حسین چہرے ، متبسم آنکھیں اور بڑے بڑے گھنگریالے بال دیکھ کر خیال ہوتا تھا کہ یہ فوج کی افسری کی بجائے رومانی شاعری کے لئے زیادہ موزوں ہو سکتا تھا ۔ فرانس آنے کے بعد سے اس کے ساتھی اس کو " مادام فیفی " کہہ کر مخاطب کیا کرتے تھے ۔ اپنی پتلی کمر ، نسوانی چہرے اور تیز آواز کے باعث اس علاقے میں یہ کافی مشہور ہو گیا تھا لیکن اس کے اخلاق و اطوار بالکل جنگلی درندوں کے سے تھے ۔ اس میں نام کو بھی انسانیت نہ تھی ۔ قیدیوں کے ساتھ اس سے زیادہ ظالمانہ سلوک اور کوئی فوجی افسر روا نہ رکھتا تھا اگر وہ ذرا مشتعل ہو جاتا تو معلوم ہوتا بارود میں آگ لگ گئی ۔

کھانے کے کمرے کو قیمتی ساز و سامان سے خاص قرینے کے ساتھ سجایا گیا تھا ۔ جو فوجی افسروں کی رقص گاہ میں تبدیل ہو جانے کے باعث بالکل درہم برہم ہو گیا تھا ۔

کھانے کی چیزوں کے سنہراؤ کے بعد شراب کا دور شروع ہوا شراب میں پیسے تو خرچ ہوئے نہیں تھے جو زیادہ اور کم کی پروا کی جاتی بوتل پر بوتل صاف ہونے لگی ۔ ہنسی مذاق ظرافت اور گانے کے شور و غوغا سے ایک ہنگامہ سا برپا ہو گیا ۔ شراب ختم ہو چکی تو سگار کا سلسلہ شروع ہوا جس کے بے پناہ دھوئیں سے ایسا معلوم ہوتا تھا کوئی آتشیں بم پھٹا ہو ۔

یکایک مادام فیفی بول اٹھا ۔ ارے بھئی کچھ شغل بھی ہوگا یا اسی طرح بے لطفی میں وقت گذرے گا ؟

لفٹنٹ اٹوفان اور لفٹنٹ فرنیز ایک ساتھ بول اٹھے ہاں بھئی کچھ تو ہونا چاہیئے طبیعت گھبرا رہی ہے

مادام فیفی نے کہا اگر میجر صاحب کو اعتراض نہ ہو تو میں تفریح کا کچھ بندوبست کروں ۔

میجر نے پائپ کو منہ سے الگ کرتے ہوئے کہا ۔ کیا بندوبست کرنا چاہتے ہو بیرن فان ؟

مادام فیفی نے کھڑے ہو کر بڑے جوش سے کہا ۔ لے ڈیو بیر اس چلے جائینگے وہاں سے چند فرانسیسی دوشیزاؤں کو لئے چلے آئیں گے ۔ رات بڑے لطف سے گذر جائیگی ۔

میجر ایک سن رسیدہ آدمی تھا اس کو اس مشغلے سے زیادہ دلچسپی نہ تھی وہ منع کرنا چاہتا تھا کہ اس کے ساتھی بول اٹھے ۔ آپ منع نہ کیجئے میجر ۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہاں ہماری زندگی کس بے کیفی میں گذر رہی ہے ۔ مادام فیفی جو کچھ کرنا چاہتے ہیں کرنے دیجئے ۔

میجر مسکرا کر خاموش ہو رہا ۔

مادام فیفی نے لے ڈیو بیر کو بلوایا ۔ یہ عجیب طرح کا منحوس سپاہی تھا اس کے ہونٹوں پر کبھی ہنسی نہیں دیکھی گئی تھی ۔ یہ افسروں کے حکم کی تعمیل میں سنگدلی اور بے رحمی کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھتا تھا ۔ وہ اکثر مادام فیفی کو سلام کر کے خاموش کھڑا ہو گیا اور اس کا حکم سن کر اسی طرح سلام کر کے چپ چاپ واپس چلا گیا اس کے بعد ہی پانچ گھوڑوں کی فوجی گاڑی کھڑ کھڑ کرتی باہر

نکل گئی جرمن فوجی افسر فرطِ سرور سے قومی گیت گانے اور سیٹی بجانے لگے لیکن مادام فیقی کے اظہارِ مسرت کا طریقہ ان سب سے بلکہ ساری دنیا سے جدا تھا۔ وہ جب بہت خوش ہوتا تو تخریب اور تباہ کاری پر اتر آتا اس نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔ دیوار پر خوبصورت اور قیمتی تصویریں آویزاں تھیں جن میں ایک عورت کی تصویر بالخصوص فن مصوری کا دلفریب نمونہ تھی۔ اس کی آنکھوں سے ایسا معلوم ہوتا تھا ایک جیتی جاگتی دوشیزہ دعوتِ کیف وسرور دے رہی ہے۔

مادام فیقی نے اپنی ریوالور سنبھالی اور دو گولیاں سر کر دیں۔ تصویر کی دونوں آنکھیں اُڑ گئیں۔ مادام فیقی برہمی! تیز لہجے میں بولا بدبخت کہیں کی! گھورتی ہے جانتی نہیں مجھکو!

اس کے بعد مادام فیقی نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ آؤ مائین کھیلا جائے۔

مائین مادام فیقی کا ایک پسندیدہ کھیل تھا۔ اس کے ساتھیوں کو بھی اس کھیل سے کافی دلچسپی تھی۔ لیکن میجر نے نہ جانے کیوں قدرے ناگواری کے لہجہ میں کہا۔ مجھے تمہاری حرکتیں پسند نہیں تمہیں جو کچھ کرنا ہو بغل کے کمرے میں جا کرو۔

مکان کا فرانسیسی مالک نہایت خوش ذوق آدمی تھا اسے آرٹ سے بہت دلچسپی تھی۔ وہ جرمنوں کے خوف سے مکان، ساز و سامان، روپیہ پیسہ سب اسی طرح چھوڑ کر بھاگ گیا تھا۔ بغل کا کمرہ اب بھی آرٹ کے نادر ترین نمونوں سے آراستہ تھا۔

مادام فیقی اپنے ساتھیوں کو لیکر اس کمرے میں گیا اس میں چینی کا ایک خوبصورت مجسمہ تھا مادام فیقی نے اس کے اندر بارود بھر دی۔ پٹرول میں تر کر کے ایک فلیتہ اس کے منہ میں ڈال دیا جس کا ایک سرا باہر نکلا ہوا تھا۔ نشانہ باندھکر ٹھیک اسی فلیتے پر ریوالور کی ایک گولی سر کی۔ جس کے ساتھ ہی ایک ایسا خوفناک دھماکہ ہوا کہ ساری عمارت ہل گئی۔ اور اس میں آرٹ کے جتنے سامان تھے سب ٹوٹ پھوٹ کر خراب ہو گئے۔

اس وحشیانہ کھیل میں مادام فیقی کو تو اتنا حظ و سرور حاصل ہوا کہ وہ پاگلوں کی طرح ناچنے لگا۔ اس کے ساتھی بھی فرطِ مسرت سے تالیاں بجانے لگے۔

تمام عمارت دھوئیں سے بھر گئی میجر نے اٹھکر طعام خانے کی کھڑکی کھول دی، بارش اب بھی ہو رہی تھی۔ گاؤں کا گرجا سامنے ہی کھڑا گاؤں کی تباہی اور اپنی زبوں حالی پر آنسو بہا رہا تھا جب سے گاؤں پر جرمنوں کا قبضہ ہوا تھا۔ گرجے کے بڑے گھنٹے کے بجنے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ ہزار ہزار منت سماجت کرنے کے باوجود گرجے کا پادری گھنٹہ بجانے کی اجازت حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ مادام فیقی اسے زبردستی شراب پلا چکا تھا۔ اس کے علاوہ وہ مادام فیقی کے طرح طرح کے مظالم کا تختۂ مشق بنا رہتا تھا اگر میجر نے اجازت دی ہوتی تو وہ اب تک پادری کو اپنی ریوالور کی گولی کا نشانہ بنا چکا ہوتا۔

رفتہ رفتہ شام ہو گئی جرمن افسر کھانے کے کمرے میں آ موجود ہوئے سب کے سب قیمتی لباس میں ملبوس تھے، مادام فیقی نے اپنے تمام ساتھیوں پر سبقت لے جانے کی کوشش کی تھی بڈھا میجر بھی عطر میں بس کر آیا تھا۔ ڈیوپر کے انتظار میں سب بے چین تھے اور اسے بار بار کھڑکی سے جھانک کر دیکھ رہے تھے۔

یکایک فوجی گاڑی کی گھڑگھڑاہٹ کی آواز سنائی دی سب جرنیل کھڑکی سے جھانک کر دیکھنے لگے۔ ڈیوپر پانچ حسین و جمیل فرانسیسی دوشیزاؤں کے ساتھ گاڑی سے اترا اور انہیں لئے ہوئے کمرے میں داخل ہوا۔ نازنینانِ فرانس کی یہ چھوٹی سی ٹولی کیا تھی خوش رنگ پھولوں کا ایک دل آویز گلدستہ تھا ان کا نازک اور گداز جسم سردی کی شدت سے برف ہو رہا تھا۔

مادام فیقی نے ایک خوش جمال دوشیزہ کے حسین گال پر ایک ہلکا سا چانٹا لگا کر کہا۔ آؤ ڈارلنگ۔ لفٹنٹ اٹرا اور کیپٹن فرنز ایک ساتھ بول اُٹھے تم اس پر ڈورے نہ ڈالو مادام فیقی، یہ میری ہے۔

مادام فیقی نے کہا لڑ مرنے کی ضرورت نہیں میں نے تقسیم کی ایک مناسب صورت سوچ لی ہے۔ یہ کہکر مادام فیقی نے پانچوں دوشیزاؤں کو قطار سے کھڑا کر دیا۔ اور کہا ان میں سے جو جس کے قد کے مطابق ہے وہ اس کی ہے۔

اس اصول کے مطابق دوشیزاؤں کی تقسیم عمل میں آئی۔ جو حسینہ مادام فیقی کے حصے میں آئی وہ شاید یہودی تھی! اس کا نام ریاچل تھا وہ حسن و جمال کے اعتبار سے سب میں ممتاز تھی۔

مادام فیقی نے تمباکو کا ایک زوردار کش لگا کر منہ میں دھواں بھرے ہوئے ریاچل کا اس طرح بوسہ لیا کہ کھانستے کھانستے اس کا بُرا حال ہو گیا۔

لفٹنٹ اٹوفان اپنی محبوبہ کو آغوش میں لئے اس کا گلا زور سے دبانے کے لئے بیقرار ہو رہا تھا کہ ریاچل کی کھانسی سن کر بولا یہ کیا کر رہے ہو مادام فیقی؟

مادام فیقی نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ مائین کھیل رہا ہوں۔

ریاچل نے کھانستے ہوئے اشک آلود آنکھوں سے ایکبار مادام فیقی کی طرف دیکھا مگر وہ اس کی بربریت کے متعلق منہ سے ایک لفظ نہ نکال سکی۔

شراب کا دور شروع ہوا اور سب نے اتنی شرابیں پی کہ نشے سے پاگل ہو کر بوتل اور پیالے توڑ ڈالے کرسیاں اُلٹ دیں، دوسری چیزوں کو درہم برہم کر دیا۔ دوشیزائیں بھی آپے میں نہ رہیں جرمنوں نے انہیں اس قدر پلا دی کہ وہ بھی عالم بیخودی میں کمر تک برہنہ ہو کر ان کے ساتھ ناچنے لگیں۔ مادام فیقی نے ریاچل کو اپنے ناخنوں اور دانتوں سے نوچ کھسوٹ کر اس کی ہیئت خراب کر دی۔ اس کے کپڑے زیر و زبر ہو گئے اور جگہ جگہ سے جسم خون آلودہ ہو گیا۔ مادام فیقی پھر اسے آغوش میں لینے کے لئے اس کی طرف بڑھا۔ تو وہ چیخ کر کمرے کے ایک گوشے میں بھاگ گئی۔ وہ چھلانگ مار کر اس پر ٹوٹ پڑا جس سے ریاچل کا سر دیوار سے ٹکرا گیا۔ مادام فیقی نے فرطِ غضب سے اپنا دانت پیوست کر کے اس کے پھول سے ہونٹوں کو لہولہان کر دیا۔

اس کے ساتھیوں میں شراب کا از سر نو دور شروع ہو چکا تھا وہ ریاچل کو کھینچتا ہوا پھر اس طرف لے چلا سب کے سب ہاتھ میں شراب کا گلاس لئے ایک ساتھ وحشیانہ انداز میں چلا اُٹھے

"پرشیا زندہ باد"

"آج تمام فرانس ہمارے قدموں میں ہے"

ریاچل وطنی غیرت سے بے تاب ہو گئی۔ اس نے کہا نہیں فرانس آزاد ہے۔ وہ آزاد ہو کر رہے گا۔

مادام فیقی بولا چپ شیطان! فرانس ہمارا ہے ہم اس کے دریا، پہاڑ، دولت و جائیداد اور اس کی عورت سب کے مالک ہیں۔

ریاچل تڑپ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ کرسی الٹ گئی۔ اس نے چیخ کر کہا۔ تم سب کمینے بدذات ہو۔ فرانسیسی عورتیں تم کو کتوں سے زیادہ ذلیل سمجھتی ہیں۔

مادام فیقی بجائے غصہ ہونے کے قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔ بولا۔ کہ اگر فرانسیسی ڈائنیں ذلیل سمجھتی ہیں۔ تو ہمارے پاس آئیں کیوں؟

ریاچل فرط غضب سے زور زور سے سانس لے رہی تھی۔ اس نے شیرنی کی طرح گرج کر کہا۔ ہمارا کیا ہے ہم تو بازاری عورتیں ہیں۔ تم نے ہم کو اپنی حیوانی خواہشیں پوری کرنے کے لئے بلایا ہم کو چلا آنا پڑا۔

مادام فیقی ریاچل کے سینے پر ایک گھونسہ رسید کر کے الٹی ہوئی کرسی سیدھی کرنے کے لئے جھکا۔ میز پر ایک چاقو پڑا ہوا تھا۔ ریاچل نے اسے اٹھا کر مادام فیقی کے تالو میں پیوست کر دیا اور کھڑکی سے کود کر گھنے اور تاریک جنگل میں گم ہو گئی۔

چند ہی منٹ کے اندر مادام فیقی کا کام تمام ہو گیا۔ فریزا اور آٹوفان نے تلواریں نکال لیں اور چاہا کہ ان چاروں دوشیزاؤں کو قتل کر دیں لیکن میجر نے ان کو روکا۔ اور سپاہیوں کو ریاچل کے تلاش کرنے کا حکم دیا۔ جرمن سپاہی تمام رات ریاچل کو تلاش کرتے اور قدم کی آہٹ پر گولیاں چلاتے رہے مگر ریاچل کا پتہ نہ چلا۔ صبح معلوم ہوا کہ انہوں نے اندھیرے میں اپنے ہی آدمیوں کو گولی کا نشانہ بنا دیا۔

صبح کو جرمن گرجا کے قبرستان میں مادام فیقی کو دفن کرنے لے گئے تو اس عجیب واقعہ سے سب حیران رہ گئے کہ گرجا میں خود بخود گھنٹہ بجنے لگا۔ اس کے بعد سے دن اور رات میں کئی کئی مرتبہ خود بخود گھنٹہ بجنے لگتا۔ تمام گرد و نواح میں شور ہو گیا کہ گرجا گھر میں کوئی بھوت ہے جو گھنٹے کو بجاتا ہے لوگوں نے بھوت کے ڈر سے گرجا میں آنا چھوڑ دیا۔

یہ حال دیکھ کر جرمن فوج اس گاؤں سے کوچ کر کے دور جنوب کی طرف چلی گئی جس روز جرمن فوج یہاں سے روانہ ہوئی اسی روز گرجا سے ایک گاڑی نکلی جس کے جلوس میں گاؤں کے تمام باشندے تھے۔ گرجا کا بوڑھا پادری گاڑی ہانک رہا تھا۔ گاڑی پر ریاچل سوار تھی۔ اسی کی حب الوطنی اور جرأت و بہادری سے گاؤں والوں کو جرمنوں کے مظالم سے نجات ملی اس لئے گاؤں کے باشندے اس عزت و احترام سے ریاچل کو اس کے گھر پہنچانے لے گئے۔

گرجا میں کوئی بھوت نہ تھا۔ پادری نے بھوت کی افواہ اڑا دی تھی۔ ریاچل ہی گھنٹہ بجایا کرتی تھی۔ ریاچل کی اس حب الوطنی سے متاثر ہو کر ایک معزز فرانسیسی نوجوان نے اس کے ساتھ شادی کر لی۔

رقاصہ ریاچل اب کسی شریف فرانسیسی خاتون سے کم قدر و منزلت کی مستحق نہیں سمجھی جاتی۔

ابو محمد امام الدین

(رامنگری)

غزل

بتوں کو کبریائی کیوں نہ آئی
خدا ہو کر خدائی کیوں نہ آئی

مزاج یار رنگیں تھا مرے کام
مری رنگیں نوائی کیوں نہ آئی

وفا بھی دلربائی کا ہے انداز
تمہیں یہ دلربائی کیوں نہ آئی

وفاداری ذرا تم کیوں نہ سیکھے
ہمیں کچھ بیوفائی کیوں نہ آئی

مجھے باد صبا سے یہ گلہ ہے
برائے دلکشائی کیوں نہ آئی

ہماری داستان درد سنکر
انہیں رقت نہ آئی کیوں نہ آئی

مری کشتی ڈبوئی نزد ساحل
تمہیں کچھ ناخدائی کیوں نہ آئی

کلیم آئے جو سوئے طور سینا
تماشا تھا خدائی کیوں نہ آئی

شب غم کی نہ صورت دیکھتی میں
"اجل روز جدائی کیوں نہ آئی"

سکینہ محمود ایم اے

سرزمین پنجاب کے قومی افسانے کی ادبی تاریخ

تاریخ قصّہ ہیر و رانجھا

متمدّن انسان کی تقسیم اوقات

وقت متمدن انسان کی بہترین دولت ہے اس کا اکثر و بیشتر حصہ زندگی کی بیکار مصروفیتوں کی بھینٹ چڑھ جاتا ہے اور رہا سہا کارآمد بیکاریوں کی نذر ہو جاتا ہے غرضکہ بہت سی مصروفیتوں اور چند ایک بیکاریوں کے مجموعہ کا نام زندگی ہے پیٹ کے لئے دوڑ دھوپ جاہ و احتشام کے لئے جدوجہد ملک و قوم کیلئے ایثار و قربانی حیات بعد ممات کے لئے عبادت و ریاضت یہ ہیں وہ مصروفیات جو انسانی زندگی کے حصے بخرے کر لیتی ہیں دن بھر کی محنت مزدوری کے بعد قدرے آرام ہمارے دن کی بیداری کے بعد اسکے چند ایک گھنٹوں کی نیند دماغی اور ذہنی کاوش کے بعد سیر و تفریح معاشرتی پابندیوں کے بعد کھیل تماشے یہ ہیں وہ بیکاریاں جو بادی النظر میں بیکاریاں معلوم ہوتی ہیں مگر انسانی زندگی کیلئے جزو لاینفک ہیں فکرِ معاش دنیا جہان کی تمام رنگینیوں اور دنیا والوں کی تمام تفریحوں کو سمیٹ لیتی ہے جہاں پیٹ کی فکر ہو وہاں عشق و محبت کی کارفرمائیاں جلوہ گر نہیں ہوتیں ؎

چناں قحط سالے شد اندر دمشق ٭ کہ یاراں فراموش کردند عشق

خوشحالی اور عشق و محبّت

اس کے برعکس جہاں خوشحالی اور فارغ البالی کا دور دورہ ہو وہاں سب سے پہلے کیوپڈ (حضرت عشق) اپنے تیر و کمان کے ساتھ جلوہ بار ہوتا ہے اس کے جلو میں فوراً رقص و سرود نظم و موسیقی داستان اور مصوری کی پریاں اس کی خوش فعلی کے لئے آموجود ہوتی ہیں۔ آرٹ ترقی پاتا ہے۔ مذاق سلیم آفسکار رہوتا ہے لطائف و ظرائف خودرو زیر درختی کی طرح بڑھتے ہیں۔ لمحات فرصت کو بہترین طریق پر گذارنے کے لئے ان سے بڑھکر اور کونسے مشاغل ہو سکتے ہیں۔

سرزمین پنجاب کی فنون لطیفہ کے لئے موزونیت

سرزمین پنجاب اپنے محل وقوع و دیگر جغرافیائی لحاظ سے حسن و عشق کی داستانوں اور ہجر و وصال کے قصہ کہانیوں کے لئے نہایت ہی موزوں خطۂ ارض ہے۔ تمام فنون لطیفہ حسن و عشق کے خواصہ بردار ہیں پانچ کی بجائے سات دریا بشمول جمنا و سندھ پنجاب کو سیراب کرتے ہیں۔ یہ جنت ارضی پانچ دوابوں اور ایک فاصل آب کو لسبیط کئے ہوئے ہے۔ اگر لیلیٰ قیری کے لئے یہاں دشت و صحرا موجود ہیں تو کسی آبلہ پا کے لئے مغیلان کے جنگلات بھی پائے جاتے ہیں۔ اگر ایک طرف شیریں جانوں کے لئے سر بفلک محلات ہیں۔ تو دوسری طرف تیشہ آزمائی کے لئے سنگلاخ چٹانیں بھی موجود ہیں دریاؤں نے اپنی گذرگاہوں کو بدل بدل کر چپہ چپہ زمین میں سونا بکھیر دیا ہے۔ یہاں کی سردی دلفریب۔ یہاں کی گرمی دلپذیر۔ یہاں کی خزاں بہار سے اچھی۔ یہاں کی بہار حسن زا اور گلزار خیز یہاں کی برسات کا کیا کہنا شدت و قلت دونوں سے محفوظ ہلکی ہلکی بوندیں دھیمی دھیمی ہوا مچھر دل کہہ اٹھتے ہیں ؎

ابر چھایا ہے مینہ برستا ہے ٭ جلد آجا کہ جی ترستا ہے

اس پر موسمی فصلوں کی فراوانی سرسوں پھولتی ہے تو جامہ چاک ہونے کو طبیعت چاہتی ہے۔ کپاس کھلتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ آسمان مع ستاروں کے نیچے اتر آیا۔ باجرہ جوار اور مکئی کے دانوں پر خاکستری۔ روپہلی اور سنہری موتیوں کا گمان ہوتا ہے۔ کماد کی فصل میں گنے اور پونے کی پوریوں کو دیکھو معلوم ہوتا ہے بعد سیمیں پر ہاتھی دانت چڑھا ہے گیہوں کی پکی ہوئی فصلیں سبحان اللہ ہر طرف سونا ہی سونا بکھرا ہے۔ لاہور ریڈیو سٹیشن سے شمشاد بیگم کا گایا ہوا ذیل کا گیت اس موسم کا بہترین مظہر ہے۔ ؎

کنکاں دیاں فصلاں پکیاں نیں ٭ آہا جی آہا واہ داتا
بدلاں وچہ خوشیاں وسیاں نیں ٭ کنکاں دیاں ....
وادھی دا موسم آیا اے ٭ ہر پا سے نور سمایا ہے
جٹ پیلی دے وچہ گجدا اے ٭ پکوان پکاندیاں جٹیاں نیں
کنکاں دیاں .... ٭ آہا جی آہا ....

موسم برسات کے آغاز میں آم کے پیڑوں پر کور اور کیکریوں کی مست کن خوشبو سے مست ہو کر کوئل کا کوکنا فریقین عشق کو تڑپانے کے لئے کافی ہے۔ ان حالات کے ماتحت انسان آمادہ عشق نہ ہو تو گناہ نہیں تو کیا ہے۔ اچھی جوانی نکھرا ہوا حسن عمدہ آب و ہوا اور مستقل خوشحالی کی پیداوار ہیں پنجاب میں ان دونوں کی فراوانی ہے لہذا اس سرزمین سے جہاں کڑیل جوان پیدا ہوتے ہیں وہاں حسینوں اور جمیلوں کی بھی کمی نہیں۔ محمد اکرم غنیمت کنجاہی نے بھی پنجاب کو حسن آباد کہا ہے، نواب احمد یار خاں یکتا نے کشور حسن خیز کا خطاب دیا ہے۔ حضرت گرامی نے بھی اسے حسن آباد پنجاب کہہ کر اپنی آہ جگر تاب کی گرمی کو ٹھنڈا کیا ہے۔ جوش جوانی اور حسن نسوانی آمنے سامنے ہو جائیں تو ایک خاموش تکر کے بعد ایک غیر مرئی شعلہ پیدا ہوتا ہے اسی شعلہ کا نام محبت ہے۔

پنجاب کا تمدن اور حسن و عشق

حسن و جوانی کے ساتھ پنجاب کے رہنے والوں کا تمدن اور ان کے مشاغل کچھ ایسے محبت پرور ہیں کہ طبیعت خواہ مخواہ عشق و محبت کی طرف کھچ جاتی ہے غیر مسلم پردہ کی قید و بند سے بالکل آزاد ہیں معاشرتی مجبوریوں نے مسلم آبادی کے اکثر حصہ کو بھی پردہ سے بیگانہ ہی رکھا اکثر لوگ زمیندار اور کاشتکار ہیں۔ دیہاتی آبادی شہری آبادی کی نسبت کہیں زیادہ ہے کھیتوں کی پیداوار پر ان کی گذر اوقات ہے مرد و عورت دونوں کو بلا امتیاز عمر و رشتہ پہلو بہ پہلو سبزہ زاروں میں کام کرنا پڑتا ہے۔ کپاس کی فصل کثرت سے ہوتی ہے کپاس بہت کاتنا

ٖ سعدی ٭ گنا بیگم منکوحہ نواب امجد علی شاہ و الئی اودھ ٭ مثنوی نیرنگ عشق ٭ مثنوی یکتا ٭ یادگار روایت،

دیہات میں جوان لڑکیوں کا محبوب مشغلہ ہے۔ گاؤں کی جوان جوان لڑکیاں ایک زمیندار کے مکان میں اکٹھی ہو کر چرخہ کاتنے کا باہمی مقابلہ کرتی ہیں۔ اسے دیہاتی زبان عرف عام میں "ترنجن" کہتے ہیں۔ موسم بہار میں جب پھوار پڑتی ہے۔ دیہاتی حسن کے یہ چلبلے پھرتے مہتے یکجا جمع ہو کر جھولا جھولتے ہیں۔ اس قسم کے اجتماع کے موقعوں پر بن بیاہی دوشیزگان اور بیاہتا اٹھان کے درمیان جو باہمی چہل ہوتے ہیں۔ وہ کچھ دیکھنے اور سننے ہی کی چیز ہے گاؤں سے باہر کھیتوں میں کنوؤں پر نگاہ شوق کے لئے بڑے روح پرور مناظر دیکھنے میں آتے ہیں دیہاتی مویشی غمنے اور چراگاہیں عشق ضموش کی نہایت موزون پرورش گاہیں ہیں۔ کپاس بیلنا چرخہ کاتنا۔ جھولا جھولنا چرسہ رہٹ کا چلانا۔ مویشی چرانا اور دودھ دوہنا۔ یہ سب کے سب کچھ اس قسم کے مشاغل ہیں کہ خاموشی ان کے رومان کو چھین لیتی ہے۔ ان مشاغل کو گیت قصے [illegible] کہانیاں چار چاند لگا دیتی ہیں فصل کاٹنے کے دن کاٹے نہیں کٹتے۔ اگر تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد کھیتوں اور کھلیانوں میں جوگی اور بیراگی ڈھولک اور سارنگی کے ساتھ راگ الاپتے نہ پھریں۔ زحمت کش انسانوں کی تفریح ہو جاتی ہے اور ان بیکار گداگروں کا پیٹ پل جاتا ہے

قصہ کہانی کی تخلیق اور پنجابی قصے قاعدہ ہے کہ عشق و محبت کی داستان انسان فطرۃً زیادہ سننا پسند کرتا ہے ضرورت ایجاد کی ماں ہے چنانچہ بہت سے قصے کہانیاں زبان زد عام ہو گئیں عشق و محبت کی ان داستانوں کو بہت سا مواد واقعات محبت سے مل گیا جو کبھی کبھی اور کہیں کہیں رونما ہوتے رہے اور اکثر حصے سراسر دماغی تخلیق کا نتیجہ ہیں بہادری اور جرأت آموزی کے قصے لکھے گئے بہت سی اخلاقی کہانیاں سپرد قلم ہوئیں مگر پنجاب میں محبت کے افسانوں کو جو شہرت و قبولیت حاصل ہوئی ہے اس کی مثال کہیں نہیں ملتی ہیر رانجھا سوہنی مہینوال مرزا صاحباں اور سسی پنوں۔ یہ وہ قصے ہیں جو جنوبی پنجاب کے علاوہ ہر ایک گاؤں میں گائے اور پڑھے جاتے ہیں۔

قصہ ہیر رانجھا اور اسکی مقبولیت ہیر رانجھا ان قصوں کا سرتاج ہے ہیر رانجھے کا چرچا پنجاب میں گھر گھر ہے گاؤں میں ہر ایک عاشق مزاج مرد کو رانجھے کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ ہر وہ دوشیزہ جو کہیں محبت کا اظہار کر بیٹھے ہیر کہلاتی ہے۔ پنجابی عورتیں اکٹھی بیٹھیں تو ہیر رانجھے کا قصہ محفل کو گرما دیتا ہے۔ ہیر رانجھا گانے والے قوال بہت جلد مقبول عام ہو جاتے ہیں میلوں پر ہیر رانجھے کی تانیں اڑتی ہیں۔ چرواہے ہیر رانجھا گا گا کر چراگاہوں میں پہاڑ سے دن کاٹتے ہیں کہیں عرس ہو تو رانجھا کو عاشق حقیقی اور ہیر کو معبود حقیقی کے استعاروں سے یاد کیا جاتا ہے۔ تانگہ چلانے والے۔ راہ رو گداگر ریلوے قلی اور دیگر مزدور پیشہ لوگ اس مقبول عام قصے سے سارے دن کی تھکن اتارتے ہیں۔ اس قصہ نے پنجابی ادب میں آنا بیش بہا اضافہ کیا ہے کہ شاید فارسی زبان میں شیریں فرہاد اور عربی ادبیات میں لیلیٰ مجنوں نہ کر سکے ہوں۔ اس قصے سے فارسی اور اردو ادبیات بھی متمتع ہوئے بغیر نہ رہ سکیں ہندوستان کے کسی اور صوبائی خطہ میں کسی ایک مقامی قصہ یا واقعہ کو اتنی شہرت اور ہردلعزیزی حاصل نہ ہو سکی جتنی ہیر رانجھا کو پنجاب میں۔ یہ قصہ پنجاب میں ایک مستقل ادبی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ ایک ادبی امانت ہے جو پوری چار صدیوں سے سینہ بسینہ اور قلم بقلم چلی آ رہی ہے اور لطف یہ کہ بمرور زمانہ اس کی اہمیت اور مقبولیت بڑھتی جا رہی ہے ہیر رانجھا کی داستان عشق سرزمین پنجاب کا ایک قومی سرمایہ ہے جس کا تحفظ ہر پنجابی سپوت کا فرض عین ہے۔

عشق و محبت کی یہ سادہ سی داستان حسن و رعنائی کا یہ ادنیٰ سا کرشمہ۔ ایثار و خلوص کی یہ معمولی سی مثال۔ اخلاقیات معاشرات۔ مذہبیات اور تفریحات کا وہ بیش بہا گنجینہ ہے جس پر پنجاب اور پنجاب کے رہنے والے جتنا بھی فخر کریں کم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تقریباً دوسو سال سے ہیر کے حافظ[1] چلے آتے ہیں۔ بقول سر جارج گریرسن یہ قصہ ہندوستان کے دیہاتی قصوں میں مقبول ترین قصہ ہے۔

اسکی مقبولیت کی وجوہ ہیر رانجھا اس قدر مقبول کیوں ہوا اس کی وجوہ حسب ذیل ہیں

(۱) یہ پنجاب کی قومی زبان میں لکھا گیا

(۳) اس قصہ کے کردار پنجاب سے لئے گئے۔

(۴) یہ قصہ پنجاب کی دیہاتی معاشرت کا حامل ہے۔

(۵) اس قصہ کو سید وارث شاہ جیسا قادر الکلام۔ پنجابی زبان کا بہترین شاعر صوفی منش درویش صفت عالم و عامل اور وسیع النظر صاحب قلم ملا۔ جو اپنا سب کچھ عشق و عاشقہ کی نذر کر چکا تھا اور جسے بھاگ بھری کی محبت میں تمام منازل عشق طے کرنا پڑیں۔ یہ قصہ پہلے بھی لکھا گیا مگر وارث شاہ کی کیفیات دلی اور محسوسات قلبی نے اسے روحانی اور وجدانی حیثیت بخش دی۔

واقعات قصہ قصہ مختصر اتنا ہے کہ اجو نامی تخت ہزارہ (ضلع سرگودھا) کا مہر[2] تھا۔ یہ قوم کا رانجھا تھا اس کے جواں سال بیٹے کا نام دھیدو تھا جو اپنے گاؤں میں خاندانی نسبت سے رانجھا کے نام سے مشہور تھا ایک پنجابی جوان کی تمام خوبیاں اس میں موجود تھیں جوانی اور اس پر چہرہ مہرہ کی مناسبت گاؤں کے جس گلی کوچہ سے گذرتا تمام نگاہیں اس طرف اٹھ جاتیں چونکہ آغاز شباب میں ہی یتیم ہو گیا تھا۔ بھائی حسد اور بھاوجائیں مذاق کرنے لگیں جائیداد کی تقسیم پر جھگڑا ہوا۔ بنجر زمین اس کے حصہ میں آئی۔ بھاوجاؤں کے طرز سلوک سے یہ پہلے ہی آزردہ خاطر تھا انہوں نے ہیر بیاہ لانے کا طعنہ دیا۔ جوانی اور طبع غیور یکجا اکٹھی ہو جائیں تو زمین و آسمان کو ملایا جا سکتا ہے۔ رانجھا فوراً ترک وطن کر کے ہیر کو بیاہ لانے کا منصوبہ باندھ کر جھنگ کی طرف روانہ ہوا۔ دریائے چناب نے راہ روکا مگر عزم بالجزم کے سامنے پہاڑ تنکے بن کر اڑ جاتے ہیں صحرا سکڑ جاتے ہیں اور دریا خشک ہو جاتے ہیں سو دریا نے راستہ دیا کشتی سے اترا لب دریا ایک باغیچہ میں پلنگ پڑا نظر آیا تھکا ماندہ تھا ہی وہیں پڑ کر سو رہا۔ یہ پلنگ اسی ہیر کا تھا جس کے لئے بادیہ پیمائی کی تھی ہیر جھنگ کے بڑے زمیندار چوچک سیال کی نوجوان تنخدا لڑکی تھی۔ جو اپنے دہقانی حسن و جمال کی وجہ سے قرب و جوار میں مشہور تھی۔ یہ اپنی جوانی کو بہلانے کے لئے اپنی چند ایک سہیلیوں کے ساتھ حسب معمول دریا کی طرف آ نکلی۔ اپنے پلنگ پر ایک بیٹے کٹے مسٹنڈے کو پڑا دیکھ کر عزت حسن اور نخوت نسوانی کو چھپا نہ سکی سونے والے کو بڑے طمطراق سے جگایا۔ رانجھا آنکھیں ملتا ہوا اٹھا پہلی ہی نظر میں ہیر کے حسن نے رانجھا کی جوانی کے سامنے سر تسلیم خم کیا کشور حسن کے اس فاتح کو ہیر ناز و کرشمہ کی زنجیروں میں جکڑ کر اپنی ماں ملکی کے پاس بطور چاک (نوکر) کے لے گئی۔ وارفتگان محبت کی آزمائشیں۔ خدا کی پناہ۔ بارہ برس بھینسیں چرائیں حسن و عشق آپس میں کھیل کھیل کر جوان ہوئے حسن عشق پر اور عشق حسن پر قربان ہونا چاہتا تھا کہ ہیر کا چچا کیدو معترض محبت کر نمودار ہوا۔ وہ ہر ہر گام پر مانع آیا ہیر کو ایک بے جوڑ شادی کی قربانگاہ پر

[1] یادگار۔ وارث صفحہ ۲۔ یادگار۔ وارث صفحہ ۳ سے یہ لفظ مہر بمعنی سردار کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔

چڑھا دیا گیا۔ رنگپور کے رہنے والا ایک کھیڑا سیدا نامی اسے بیاہ لے گیا۔ رانجھا کو گھر سے نکال دیا گیا۔ ادھر ہیر عشق سسرال گھر میں بہانہ بنا کر بیمار پڑ گئی۔ رنگپور سے جھنگ کی طرف جانے والی چند ایک عورتوں کو اعتماد میں لیکر رانجھا کو دعوت دیدار دی گئی۔ اس نے ٹلہ کے جوگی بالناتھ سے جوگ حاصل کیا۔ کان پڑوا لئے مندریاں ڈالیں۔ بال بال میں بھبوت رمائی اور جوگیا چیتھڑے پہن کر رنگپور پہنچا۔ دنیا و ما فیہا سے ایک بے خبر جوگی کا روپ دھار کر گاڑی سے باہر ایک کٹیا میں جا بیٹھا۔ رنگپور کے ایک عیال سے سیدا کھیڑا کے مکان کا پتہ لیا۔ کاسۂ گدائی ہاتھ میں سنبھال خیرات حسن کی خاطر کوچۂ جاناں کی طرف جا نکلا نگاہیں ملیں۔ ادھر عشق تڑپا ادھر حسن چمکا عشق و مشک چھپے نہیں رہتے سہتی (ہیر کی نند) تاڑ گئی۔ چونکہ خود مجبور تھی رقابت نے اپنا کام کیا۔ جوگی (رانجھا) سے الجھ پڑی۔ نند بھاوج میں نوک جھوک ہوئی۔ شدہ شدہ سہتی تحصیل مراد (اس کے محبوب کا نام بھی مراد تھا) کے لئے جوگی جٹادھاری کے پاس پہنچی۔ اس سے مراد طلب کی۔ دنیا میں لین دین کا اصول کار فرما ہے جوگی نے ہیر سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ خود غرضی پر سب کچھ قربان کیا جا سکتا ہے سہتی ہیر کو لے کر کپاس کے کھیت میں گئی عورتوں کے مکر و فریب مشہور ہیں کانٹے کو سانپ بنا کر دکھا دیا۔ جنتر منتر تونے ٹوٹکے کے لئے جوگی بلوایا گیا اس نے علاج معالجہ کے لئے خلوت چاہی۔ آتول رات جوگی ہیر کو لے کر بھاگ نکلا سہتی مراد سے جا ملی۔ اطلاع ملنے پر کھیڑوں نے جوگی کا تعاقب کیا۔ محبت کے چور پکڑے گئے ہیر کھیڑوں کو واپس مل گئی سنتے ہوئے مجبور دل سے بد دعا نکلی۔ راجہ عدلی کے شہر کو آگ لگ گئی ؎

بترس از آہ مظلوماں کہ ہنگام دعا کردن　　　اجابت از در حق بہر استقبال مے آید

راجہ نے سلامتی اسی میں دیکھی کہ ہیر رانجھا سے اور رانجھا ہیر سے مل جائے حکم کی دیر تھی وفا رنگ لائی۔ محبت کا پھر سے ملاپ ہو گیا تخت ہزارہ کی طرف لوٹتے وقت جھنگ راہ میں پڑا۔ ہیر کے ماں باپ نے رانجھا سے باقاعدہ بارات لانے اور ہیر کو بیاہ لے جانے کی استدعا کی محبت کیا کچھ نہیں کروا دیتی۔ مستقل ملاپ کے لئے عارضی جدائی گوارا کی۔ رانجھا تخت ہزارہ پہنچکر بارات کی تیاری میں مصروف ہوا ادھر ہیر اپنے چچا کیدو کی مکاری کا شکار ہو کر زہر مار ہوئی۔ رانجھا کو اطلاع ہوئی۔ دیوانہ وار ہیر کی قبر پر پہنچا۔ اس کی آہوں سے قبر شق ہوئی اور رانجھا آغوش محبوب میں ابدی نیند جا سویا۔

قصہ یا واقعہ واقعہ کو قصہ میں تبدیل کر دینا بُعدِ زمانہ کا ادنیٰ سا کرشمہ ہے ماضی بعید کے تمام واقعات آہستہ آہستہ حکایات کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ سال اور تاریخ کی قید و بند واقعہ کو قصہ میں تبدیل نہیں ہونے دیتی۔ زمان و مکان کا تعین واقعات کی ہمیشہ پاسبانی کرتا ہے (دنیا کی ہر ایک قوم کا ماضی مائتھولوجی (علم الاصنام) سے بھرپور ہے یونانی اور روما والے اپنی مائتھولوجی پر آجتک فخر کر رہے ہیں، رامائن اور مہابھارت کے واقعات بھی اب بمرور زمانہ حکایات سے زیادہ نہیں رکھتے۔ یوسف اور زلیخا کے واقعہ کو قرآن کی زبان نے احسن القصص کہا ہے۔ ہیر رانجھا ماضی قریب کا واقعہ (یا قصہ) ہے مگر قطعی دلائل سے نہ تو اسے واقعہ ثابت کیا جا سکا ہے اور نہ ہی قصہ۔ گو توازن واقعہ کی طرف زیادہ ہے مگر اس کی رومانوی حیثیت اور واقعہ کی عمومیت اسے روز بروز قصہ میں تبدیل کر رہی ہے۔ اس سلسلہ میں پروفیسر ضیا محمد صاحب ایم اے مصنف یادگار وارث کی رائے نظر انداز نہیں کی جا سکتی۔

(”بعض محققوں[1] کی رائے ہے کہ پنجاب کی عشقیہ داستانیں ساری کی ساری فرضی یا خود ساختہ ہیں اور شاعروں اور بھاٹوں کی جودت طبع کا نتیجہ۔ یہ قصے غالباً انہوں نے اپنے حاکموں یا آقاؤں کی تفریح طبع کے لئے گھڑے یا اصلاح عامہ کے لئے۔ محققوں کا خیال ہے کہ یہ قصے نہ تو آج کل کی تنقیدی کسوٹی پر کسے جا سکتے ہیں اور نہ ہی ان کا صحیح صحیح زمانہ معین ہو سکتا ہے اور بعض صورتوں میں تو زمانہ معلوم ہی نہیں ہوتا۔

یہ صحیح ہے کہ پرانی داستانیں عموماً آئندہ زمانہ کی تنقیدی کسوٹی پر پوری نہیں اترتیں مگر محض اس واسطے ان کو من گھڑت تصور کر لینا درست نہیں کیونکہ ہر زمانے کا تنقیدی معیار اور علمی مذاق یا تاریخی معلومات کا ذخیرہ عموماً مختلف ہوتا ہے۔ اور گذشتہ زمانہ کی نسبت عموماً زیادہ ترقی یافتہ اور زیادہ وسیع ہوتا ہے۔ لہذا یہ فتوے صحیح نہیں۔

باقی رہا زمانہ کا تعین۔ اگر کسی واقعہ یا کسی شخص کی ہستی محض اس وجہ سے معرض شک و شبہ میں آجائے کہ اس کے زمانہ کے تعین میں اختلاف ہے تو یہ چنداں قابل حجت نہیں کیونکہ دنیا کی تاریخ میں بہت سے ایسے واقعات یا اشخاص ہیں جن کے زمانہ کے متعلق مورخین میں اختلاف ہے۔۔۔۔۔

عام تنقیدی معیار یا تعین زمانہ والے اصول پر پنجاب کی باقی عشقیہ داستانیں گر جائیں تو گر جائیں مگر قصہ ہیر رانجھا تو گرتا نظر نہیں آتا۔ کیونکہ اس کے افراد اور مقامات تاریخی ہیں اور ان کی تحقیق و تفتیش کے لئے اب تک مسالہ موجود ہے مثلاً رانجھا کو لیں تو اس کا وطن تخت ہزارہ (ضلع سرگودھا[2]) موجود ہے اس کی قوم رانجھا اب تک زندہ ہے اس کے جوگ لینے کا مقام ٹلہ (ضلع جہلم) موجود ہے۔ گورو ڈل کا سلسلہ بقید حیات ہے ہیر کو لیں تو اس کا وطن جھنگ موجود ہے اس کی قوم سیال[3] اب تک زندہ ہے۔ کھیڑے اور رنگپور موجود ہے سب سے زیادہ تاریخی ثبوت جھنگ میں ہیر[4] کا مقبرہ ہے“۔)

اسی سلسلہ میں معشوقۂ[5] پنجاب کا ایک اقتباس ہمارے ادعا کی جزوی تائید کرتا ہے۔

’موضع تبوکہ پاک پٹن سے تیسرا اسٹیشن ہے۔ کھنڈرات اب بھی اس کی قدیمی عظمت کا پتہ دیتے ہیں اور گرد شکستہ فصیل ہے فصیل کے باہر کوڑے کرکٹ کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں چولہے کی راکھ سے ان بجھی ہوئی چنگاریاں دھواں دیتی ہیں گرد و نواح کے بھولے لوگ اس کو ہیر کے جذبۂ عشق کی تاثیر بیان کرتے ہیں‘

غالباً یہ عدلی راجہ کی نگری ہو گی جو ہیر رانجھا کے مقدمہ کے فیصلہ کے وقت جل اٹھی تھی ہو سکتا ہے کہ عین فیصلہ کے وقت اس قصبہ کو کسی خارجی اسباب کی بنا پر آگ لگ گئی ہو مگر تطابق حوادث نے لوگوں کو اسے ہیر کے جذبۂ عشق کی تاثیر سمجھ لینے پر مجبور کر دیا ہو

تعین زمان سر جارج گریرسن مشہور مستشرق نے ہیر رانجھا کو یونانی قصہ ہیرو اور لینڈر کا چربہ بتاتے ہوئے کہا ہے کہ سن عیسوی کی ابتدائی صدیوں میں یہ قصہ یونانیوں سے پنجاب میں پہنچا۔ ہیر لفظ ہیرو کا اختصار ہے علم ہیرو یونانی قصہ ہیرو اور لینڈر کی ہیروئن تھی تعاقد

[1] یادگار وارث صفحہ ۱۰۰ [2] ... پنجاب گیزیٹیر میں اسے ضلع گوجرانوالہ بتایا گیا ہے صفحہ ۱۷۷ [3] کھیال نام کا ایک گاؤں ضلع فیروزپور ... فیروزپور ... [illegible] ... بیان ... [4] ... [5] ... صفحہ [illegible]

ہے کہ ہر ایک قصہ ہیرونی کے نام سے مشہور ہوتا ہے مگر فارسی زبان میں لکھے ہوئے قلمی نسخے اس امر کی ناقابلِ تردید تصدیق کرتے ہیں کہ یہ قصہ سلطان محمد غوری جو ہندوستان کا سب سے پہلا شہنشاہ ہوا ہے کے زمانے میں لکھا گیا مگر اسے ایک نظریہ سے زیادہ وقعت نہیں دی جا سکتی۔ مولوی محمد شفیع ایم اے پرنسپل اورینٹل کالج لاہور اسے سات آٹھ سو سال پہلے کا قصہ بتاتے ہیں۔ مگر سوجان رائے بھنڈاری بٹالوی نے اپنی خلاصۃ التواریخ میں (سنہ ۱۱۰۷ھ (۱۶۹۵-۹۶ء) کی تحریر بتایا ہے اور اورنگ زیب عالمگیر کی حکومت کا یہ چالیسواں سال تھا) مگر اکثریت کی رائے اسے جلال الدین اکبر کا زمانہ دیتی ہے (بعض اسے لودھیوں اور بابر کے زمانہ کا واقعہ بتاتے ہیں۔ مسٹر چرڈ ٹمپل نے بھی اسے اکبر ہی کا زمانہ بتایا ہے۔ ہیر کے سب سے پہلے ناظم دمودر داس نے بھی اسے اکبر کے زمانہ کا واقعہ بیان کیا ہے۔ سید وارث شاہ نے عدلی راجہ غالباً مبارز خان عادل شاہ سوری (۱۵۵۳ء) حاکم پنجاب یا ملتان کو لکھا ہے۔ اکبر کے عہد کا آغاز ۱۵۵۶ء میں ہوتا ہے اور عادل شاہ کی وفات کا سال ۱۵۵۶ء ہے۔ لہٰذا اس قصہ کو اکبری عہد کی قربت ضرور حاصل ہے۔

ہیر رانجھا کی اخلاقی حیثیت

(جتنے ناظم و ناثر اس قصہ کو حاصل ہوئے ہندوستان تو کیا ادبیات عالم میں کسی دوسرے قصہ کو اسقدر صاحبِ قلم نہ ملے اور یہی قصہ کی شہرت و مقبولیت کی سب سے بڑی دلیل ہے) مجھے چودھری افضل حق کی رائے سے قطعی اختلاف ہے۔ وہ یہ لکھتے ہیں کہ "ان قصوں کا پنجابیوں پر بلحاظ اخلاق نہایت ہی تباہ کن اثر پڑا جس قدر قصے لکھے گئے وہ ملک کے مخصوص حالات کے منافی ہیں اس لئے تمام کے تمام مخربِ اخلاق ہیں۔ ... بلاشبہ قصہ پورن بھگت ایک ایسا قصہ ہے جسے ہر ایک نوجوان تو زیرِ مطالعہ رکھنا چاہئے بقیہ مضامین بحق سرکار ضبط ہونے چاہئیں" اس معیار پر گلستان جیسی مقبول ترین کتاب بھی نہیں اترتی۔ اس کا بابِ عشق ذرا پڑھ کر دیکھئے جس کتاب میں اس قسم کا مخربِ اخلاق باب ہو کیا وہ کسی شریف گھرانے میں رکھے جانے اور پڑھے جانے کے قابل ہے بمقامات حمیدی کے دو نقاب جلا دینے کے قابل ہیں مگر سالہا سال پنجاب یونیورسٹی کے امیدواران منشی فاضل امتیازی نمبر دار اسے پڑھا ملیں اخلاق کو بگاڑنے والے قصہ یوسف زلیخا سے بھی بُرے ہی نتائج اخذ کرینگے ملیے موقعہ پر دع ماکدر وخذ ما صفا کے زرّین اصول کو مدنظر رکھ لینا چاہئے۔ مجھے پروفیسر ضیا محمد ایم اے مصنف یادگارِ وارث کے اس قول سے قطعی اتفاق ہے۔

> "ہیر کی صحیح حیثیت یہ ہے کہ وہ ایک عشقیہ داستان ہے جو پنجاب کی دیہاتی زندگی کا پورا ایک نقشہ ہے اور جس کو سید وارث شاہ نے نہایت محنت اور کاوش سے منظوم کیا حقیقت میں اس نے تمام تمدنی خرابیوں اخلاقی کمزوریوں اور بداعتقادیوں کا نقشہ کھینچا ہے اس طرح اس اخلاقی پستی اور تمدنی خرابی کی طرف سوسائٹی کو متوجہ کیا ہے اس کی اصلاح و علاج کے لئے اسرارِ شریعت اور رموزِ طریقت کی حقیقت بیان کی عام حقائق و معارف اور پند و نصائح کو جابجا درج کیا ہے۔"

ہیر رانجھا کے ناظم و ناثر

اس قصہ کو سب سے پہلے دمودر نے نظم کیا دمودر داس سے پہلے بھی اس کا کوئی ناظم و ناثر نہیں ملتا اور نہ ہی اس سے قبل اس کا کوئی منظوم نسخہ دستیاب ہوا۔ دمودر کا اصلی نام دامودر داس تھا۔ یہ اپنے آپ کو رانجھا کا ہمعصر لکھتا ہے۔ ذات کا کھتری تھا اور جھنگ کا پٹواری تھا۔ اکبر کا زمانہ تھا۔ دمودر کی ہیر تاریخی لحاظ سے اہم ہو تو ہو مگر ادبی لحاظ سے اسے کوئی حیثیت نصیب نہ ہوئی اس کی تصنیف کا سن بھی ابھی تک معلوم نہیں ہو سکا۔

مقبل دوسرا شخص ہے جو اس قصہ کا مشہور و معروف ناظم نظر آتا ہے۔ سر جارج گرائرسن نے ہیر رانجھا لکھنے والوں میں سے سید وارث کو درجہ اول دیا ہے اور مقبل کو درجہ دوم۔ مقبل نے اپنی ہیر میں اپنے زمان و مکان کی نسبت کچھ نہیں لکھا مگر اس کے نظم کردہ جنگ نامہ سے اس کے زمانہ کا تعین ہو سکتا ہے ؎

تیرھویں ذی قعد ستوی روز دوم شنبہ پیر	یارا سے لائے اٹھوی سن ہجری تحریر
عہد محمد شاہ دا سن اُنتی جبان	ایہہ رسالہ جوڑیا مقبل شاہ جہان
تخلص ایس فقیر دا مقبل ہے مشہور	ایہہ عاجز ہے بھائیو اکھیں تیں مجبور

اشعار بالا سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ جنگنامہ بروز پیر، ذی قعد ۱۱۵۸ھ میں لکھا گیا۔ اور یہ کہ ناظم کا نام مقبل شاہ تخلص مقبل اور آنکھوں سے نابینا تھا محمد شاہ کا عہد تعین ہوتا ہے اسی زمانہ کے لگ بھگ ہیر رانجھا کا قصہ منظوم ہوا ہوگا۔ اس کا ایک قلمی نسخہ جو ۴۸ صفحات پر مشتمل ہے اور شرف الدین کا نقل کردہ ہے فارسی رسم الخط میں پروفیسر بنارسی داس جین ایم اے پروفیسر اورینٹل کالج کی تحویل میں ہے اس کی تاریخ نقل ۴ جمادی الثانی ۱۲۵۶ھ ہے اس کا دوسرا قلمی نسخہ گورمکھی رسم الخط میں پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہے اس کا لکھنے والا لال سنگھ ہے اس کا تیسرا قلمی نسخہ گورمکھی رسم الخط میں پیارا سنگھ کا لکھا ہوا ہے یہ بھی پنجاب یونیورسٹی لائبریری کی ملکیت ہے۔ مفید عام پریس لاہور نے اسے ۱۹۱۲ء میں گورمکھی رسم الخط میں شائع کیا۔ اس نسخہ کو پنجاب یونیورسٹی نے ۱۹۲۱ء میں پروفیسر بنارسی داس جین ایم اے اورینٹل کالج لاہور کے دیباچہ کے ساتھ شائع کیا۔ اس کا نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

رانجھا جھنگ سیالاں تُوں روان ہویا بھائی تخت ہزارے نوں آوندے نے
ویر تیرے بہت غمناک ہوئے پئے جھور دے ان نہ کھاوندے نے
ملے جھب سانوں کنویں پھیر رانجھا پئے رب نوں نت دھیاوندے نے
مقبل یار وچھنیاں جگ ہیئے عاشق کونج وانگوں کرلاوندے نے

۱۲۰۰ھ میں اس قصہ کو فقیر اللہ لاہوری نے بزبان فارسی نظم کیا۔ یہ مثنوی نام و نیاز کے نام سے مشہور ہوئی فقیر اللہ لاہوری وارث شاہ کا ہمعصر ہے۔

نواب احمد یار خاں المتخلص بہ یکتا نے ہیر رانجھا کو فارسی زبان میں نظم کیا۔ اس کا نام مثنوی یکتا رکھا۔ یہ مثنوی ۱۲۲۲ھ میں تصنیف ہوئی۔ نواب صاحب کا سن وفات ۱۲۷۰ھ ہے نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

سرزمینے کہ عشق را باب است	کشورِ حسن خیز پنجاب است
مزرعِ حسن دشتِ محبوبی	گلشن ناز و جنت و خوبی
شہر وہ باغ حرم و دلکش	از گلِ حسن گلشن آتش
غرض پنجاب ارضِ محبوبی است	یوسفستانِ عالمِ خوبی است

سید وارث شاہ نے اس قصہ کو حیات جاوید بخشی سر جارج گرائرسن نے سید وارث شاہ

(بقیہ صفحہ پچھلا) قوم رہتی ہے۔ ضلع مظفر گڑھ رنیل پنجاب بیچنڈ صفحہ ،، ۔ جھنگ کے سول اسٹیشن سے قریباً نصف میل کے فاصلہ پر واقع ہے بسرکاری کاغذات میں اسے مقبرہ ہیر دکھایا گیا ہے یہاں ہر ماگھ (فروری) میں میلہ لگتا ہے (دیباچہ ہیر رانجھا مقبل پنجاب یونیورسٹی صفحہ ۱۲) مصنفہ چودھری افضل حق ۔ دیباچہ مشرق پنجاب صفحہ ۔ ہیر رانجھا مقبل پنجاب یونیورسٹی صفحہ ۱۱۔

بلیٹین آف دی سکول آف اورینٹل سٹڈیز لندن انسٹی ٹیوٹ جلد پہلی حصہ تیسرا ۱۹۲۰ء صفحہ ۸۰ ۔ ہیر رانجھا مقبل پنجاب یونیورسٹی صفحہ ۱۱ (فٹ نوٹ) ۔ ہیر رانجھا مقبل پنجاب یونیورسٹی صفحہ ۱۱ ۔ دیباچہ ہیر رانجھا مقبل صفحہ ۱۱ ۔ دیباچہ ہیر رانجھا مقبل صفحہ ۱۱)

دیباچہ مشرق پنجاب ۔ یادگار وارث صفحہ ۱۲ ۔ دیباچہ ہیر رانجھا مقبل صفحہ ۹ ۔ دیباچہ ہیر رانجھا مقبل صفحہ ۱۰ ۔ یہ نسخہ میری تحویل میں ہے ۔ ہیر مقبل پنجاب یونیورسٹی صفحہ ۔ یادگار وارث صفحہ ۳۳۔

کو ہیر رانجھا کا بہترین ناظم تصور کیا ہے۔ سید وارث شاہ کی تاریخ پیدائش کے متعلق قطعی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ مگر چوہدری افضل نے عشوۂ پنجاب میں سن وفات ۱۲۲۳ھ بتائی ہے۔
یہ احمد شاہ ابدالی کا زمانہ تھا۔ ہیر رانجھا ۱۱۸۰ھ یعنی ۱۸۲۰ بکرمی میں تصنیف ہوئی۔

تدوں شوق ہویا قصہ جوڑ نیدا اگل عشق دی جدوں اظہار ہوئی
سن یاراں سواسی نبی ہجری لے دیس دے وچ تیار ہوئی

سید صاحب جنڈیالہ شیر خان کے رہنے والے تھے۔ یہ قصبہ شیخوپورہ سے آٹھ نو میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ آپ کا مدفن بھی یہیں ہے۔ آپ ذات کے سید تھے والد کا نام سید قطب شاہ تھا نرینہ اولاد کوئی نہ تھی۔ کہتے ہیں کہ ایک لڑکی چھوڑی۔ آپ نہایت ذہین اور علم و فضل کے شوقین تھے۔ حصول تعلیم کی غرض سے قصور پہنچے۔ اس زمانہ میں قصور پٹھانوں کے ماتحت علم و فضل اور اسلامی تمدن کے لئے مشہور تھا۔ آپ نے نامور ادیب حافظ غلام مرتضےٰ المعروف مخدوم چہانیاں کے آگے تہ کئے۔ سائیں بلھے شاہ[1] ان کے ہم مکتب تھے یہاں سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد آپ کسی مرشد کی تلاش میں پاک پتن پہنچے اور حضرت بابا فرید شکر گنج چشتی علیہ الرحمۃ کے خاندان کے ایک بزرگ سے بیعت کی یہاں پر سلوک و معرفت کی تمام منازل طے کیں اور اپنے وطن مالوف کی طرف چل دیئے۔ واپسی پر آپ ٹھٹہ جاہد کے پاس سے گذرے یہاں پر ایک مسجد میں قیام فرمایا یکسوئی اور تنہائی تو تھی ہی یہیں کے ہو رہے حقیقت کو پہنچنے کے لئے مجاز کی راہ اختیار کی۔ ایک حسین و جمیل عورت "بھاگ بھری" پر فریفتہ ہو گئے۔ اظہار عشق میں سخت سست سنا سہ بازار پڑے۔ اپنی محبوبہ کی فرمائش پر ہیر لکھی بقول چوہدری افضل حق یہ کتاب دوسرے معنوں میں وارث شاہ کا کھلا عاشقانہ خط تھا جو بھاگ بھری کو لکھا گیا یہ کتاب علاقہ کھرل ہانس (ضلع منٹگمری) میں لکھی گئی ؎

کھرل ہانس دا ملک مشہور ملکاں جتھے شعر کیتا نال راس دے میں
پرکھنے بیٹھ کے ہیر کتاب لکھی یاراں واسطے نال قیاس دے میں

یہی ہیر وارث شاہ ہے جس کے دو سو سال سے مرد و عورت حافظ ہوتے آئے ہیں۔ اور وارث شاہ کی ہیر پنجاب میں ہر جگہ گائی جاتی ہے۔ وارث شاہ کی ہیر پنجابی تہذیب و تمدن اور تصوف و معرفت کا بیش بہا ذخیرہ ہے۔ ہیر وارث شاہ کے نقاد بہت ہیں۔ مگر افسوس کہ ان کی تنقید افراط و تفریط کی حامل ہے۔ اور یہ تفریط والے کہتے ہیں کہ اسے بحق سرکار ضبط کر لینا چاہیئے۔ اور افراط والے اسے پنجابی زبان کا قرآن کہتے ہیں مگر سید وارث شاہ نے بذات خود اس کا ایسا فیصلہ کیا ہے جس پر نظر ثانی نہیں کی جا سکتی ؎

بعضے کہن ایہہ بہت فضول قصہ اوہ بھی کرن نہ سوچ وچار میاں
بعضے کہن قرآن ہے ہیر وارث اوہ بھی شستر نے بے بہار میاں
عقل والیاں واسطے ہے وارو ایہہ احمقاں نوں زہر مار میاں
خذ ما صفا ما کدر سمجھ ایس نوں ہو ہوشیار میاں

انتخاب ہیر وارث شاہ

ہیر وارث شاہ کے چیدہ چیدہ اشعار ملاحظہ فرمائیں۔ اور پڑھ کر اس کی خلاقی عظمت کا اندازہ لگائیں۔

عدل نہاں سرداراں رکھ اہیل رن گدھی اسے جو وفا دار ناہیں
نار نہاں ہے کنجنی باجھ جیہی مرد گدھا جو عقل دا یار ناہیں
نہاں آدمیت انسان ناہیں بنا آب قاتل تلوار ناہیں
ہمت باجھ جوان بن حسن جوان دلبراں باجھ طعام سوار ناہیں

بُرا کسب نہ نوکری جیڈ کوئی یاد حق دی جیڈ کا بری دے
علم ہنر دے باجھ نہ ہنچ کوئی عمل صالح جیڈ نہ رہبری دے

جیہڑے مرن سو فقر تھیں ہون واقف نہیں کم اے مرن تھیں ننگیاں دا
شوق سر تے تصدق یقین باہجوں کیا فائدہ ٹکڑیاں منگیاں دا
من مارئیے جوگ نوں پالئے جی مارئیے ناگ رکھ سونٹڑی نوں
ہتھ پکڑ مطہر یقین والی ماریں نفس شیطان دی کھونٹڑی نوں
داغ ذنب تے بہت سنبھال رکھیں چادر فقر دی چیتری دھونٹڑی نوں
ایس لکھ آلودہ جھوٹ بولیں چار لیاونان اپنی کھونٹڑی نوں
حال فقر دے نوں ننگ نہ لائیں دلوں صاف رکھیں نیت کھونٹڑی نوں
وڈی ماں برابر ہی جاننا ئیں اتے بھین برابر ہی چھوٹڑی نوں
جتی ستی نمانیاں ہو رہیئے ثابت رکھئے ایس لنگوٹڑی نوں
بوٹے اک دے نال نہ انب لگن ہو دے نہیں انار کریر ڈیلا
پُتر کھوتیاں دے گھوڑے نہیں ہوندے تیور اٹھ نہ جیڈ جیویں لیلا
ہیر آکھیا عشق دی راہ پوناں نہیں کم ملوانیاں قاضیاں دا
ایس عشق میدان دے کٹھیاں نوں رتبہ بل واکر بل دے غازیاں دا
جتھے عشق دریا دی موج آوے اوتھے اوکھیاں ترنیاں تاریاں نی
جنہاں عشق توں جان قربان کیتی انہاں بخشیاں رب سواریاں نی
کدی وارڈاں نال نہ ہون چنگے جنہاں لگیاں عشق بیماریاں دے
لوح قلم پئی سجدے عشق اگے بندی ہیر میں کون وچاریاں دے
سودے کرن مجاز دے ہٹ وچوں کوئی گاہک نہ حق حقاں دانی
جویں باجھ نماز دے بنن مومن تویں عشق تے عمل کماں دانی
سارے کرن منصور دا لک دعوے کون سولیاں تے چڑھ جان دانی
شاہ شمس تبریز دے بن طالب کیتوں حوصلہ چم لہان دانی
ماتم حسن حسین دا کرن لکھاں حگلا کسے نہ سیس کٹان دانی
نعرہ حق کا وانگ بلال موہوں بچھے حق دے مار نہ کھان دانی
ایہہ عشق تصدیق ایمان دائے تصدیق بنا عشق نان دانی
وارث شاہ آزمائشاں بون جس دم پورا اتر نا کم عاشقاں دانی

[1] حضرت سید بلھے شاہ صاحب قادری شطاری رحمۃ اللہ علیہ متوفی ۱۱۷۱ھ ان کا مزار قصور میں ہے ان کی کافیاں مشہور ہیں [2] ۱۹۳۱ء میں راقم الحروف کو امتحان آنرز ان اردو کے سلسلہ میں معدی پارک مرکز (لاہور) ٹھہرنا پڑا۔ میری جائے قیام کے ہمسایہ میں ایک تانگہ چلانے والے کا گھر تھا۔ جو گوجرانوالہ کا باشندہ تھا۔ اس کی جوان سال لڑکی اور ایک بیٹے کی بیوی ہر رات ہیر وارث شاہ کے گانے کا باہمی مقابلہ کیا کرتی تھیں۔ یہ مقابلہ بالکل زبانی ہوتا تھا۔ تحقیقات پر معلوم ہوا کہ ان دونوں کو ہیر زبانی یاد تھی۔ یادگار وارث صفحہ ۱۲۸

رسم ایں جہان دی چپ رہنا موہوں بولیاں سوئی اوہ ماریا ئی
منصورنے عشق دا بھیت دتا اوہنوں ترت سولی اُتے چاڑھیا ئی
جیہڑے عشق دی اگ دے تاتے انہاں دوزخاں نال کی واسطا ئی
دوزخ موریاں ملن بے صدق جھوٹے جیہڑے نال تکن آس پاس دائی
پیٹ واسطے سب خرابیاں نے پیٹ واسطے خون گذاسنے نی
پیٹ واسطے پھرن امیر دردر سید زادیاں نے گدھے چارنے نی
پیٹ واسطے حور تے پریزاداں جان جن تے بھوت تے وارنے نی
پیٹ واسطے رات نوں کرن چوری پیٹ واسطے اگ وچ سڑنے نی
پیٹ واسطے فقر تسلیم توڑن شاہ ملکاں نوں پئے اجاڑدے نی
پیٹ واسطے رات نوں چھوڑ گھراں باہر وہو کے ہوکرے مارنے نی
سوال منناں کہ بہادراں دا بھلا کردیاں ڈھل نہ لوڑیئے جی
جیہڑا آس کرکے دوارے آن ڈگے جی اوس دا نہ تروڑیئے جی
منکر ہون جو پیر استاد کولوں اہناں ڈونگڑے کھوہ نگھارنینگے
ماں باپ دے حکم توں عاق جیہڑے اوروز قیامتے ہارنینگے
صحبت نیک دی نیک بناوندی اوگن ہار بیلی اوگن ہاردے نی
عطر گھستی اُنہاں دیاں لیٹریاں نوں جیہڑے صحبتی ہون عطارنے نی
بھاویں تخت بہیں بھاویں زمیں سوویں آخر خاک دے وچ رلیونائیں
وارث شاہ میاں انت خاک ہوناں لکھ آبحیات جے پیونائیں
گیا بیج تقدیر دے نال ٹھوٹھا ساتھوں حیتنے جاہ مٹ دی دے
تقدیر اللہ دی نوں کون موڑے تقدیر پہاڑاں نوں پٹ دی دے
آدم حوا نوں کڈھ بہشت وچوں تقدیر زمین تے سٹ دی دے
سلیمان جھوکے بھٹ ماچھیاں دے تختوں چا تقدیر پلٹ دی دے
موسے لنگھیا پار فرعون اُتے تقدیر دریا الٹ دی دے
یوسف جیہے پیغمبر زادیاں نوں تقدیر کھوہے وچ سٹ دی دے
بیجھی مرگ پھاہی وچہ آن پھلے نہیں صبر تقدیر دے جھٹ دی دے
تقدیر جیہدے سر تے تاج رکھے قدم اوسدے پرتھمی چٹ دی دے
دتی زہر تقدیر نے حسن تائیں سیس شاہ حسین دا کٹ دی دے
وارث نبی دا دند شہید ہویا تقدیر نہ کسے توں ہٹ دی دے
جس مرد نوں شرم نہ ہووے غیرت اس مرد توں چنگیاں تیویاں نی
پنج انگلیاں ویکھ نہ اکو جیہیاں اک اچیاں تے اک نیویاں نی
مایہ عیب چھپاوندی ناقصاں دے مایہ لاج رکھے سبھ تھاں میاں
مایہ باجھ نہ کوئی ہے یار بیلی مایہ باجھ نہ بھینڈ گراں میاں
مایہ وارثی آدری کے خلقت مایہ باجھ نہ لیندا ئی ناں میاں
مایہ باجھ ڈُبے عقل ہوش سبھے کسے فکر نہ رہے اوساں میاں
دانشمند تے عقل دے کوٹ پورے مایہ باجھ اوہ حیران میاں
مایہ واسطے دین ایمان دُوہن جنہاں احمقاں نہ کوئی آن میاں

ہیر وارث شاہ کے اکثر مصرعے ایسی فردات کی شکل اختیار کر گئے ہیں جو سرزمین پنجاب میں زبان زد خاص و عام ہو چکے ہیں۔ مثلاً:۔

۱۔ رناں مار رڑلئے امام زادے مار گھتیا پیریاں والیاں نوں
۲۔ وارث فعلاں دے نال خراب ہوندے بندے پاک گناہ تھیں جمدے نی
۳۔ دولت دین تے دھرم ایمان سبھے وارث شاہ ہے نال کمائیاں دے
۴۔ خالی ہتھ آیا تے جائے خالی وارث شاہ جو عمل تھیں مڑے بھیڑا
۵۔ جیہا بیجئے وارث شاہ وڈھ لئے مکم وچہ حدیث دے آئیا ئی
۶۔ جیسا کرے کوئی تیہا پاوندا ئے سچے وعدے پروردگار دے نی
۷۔ پڑھن علم تے عمل نہ کرن جیہڑے واگ ڈھول دے بول جو سکھنائیں
۸۔ وارث شاہ اور سدا ہی جیوندے نی جنہاں کیتیاں نیک کمائیاں نی
۹۔ جھوٹ ساڑ دا چا ایماں نوں جی جوں اگ ساڑے ککھاں ساریاں نوں
۱۰۔ انت سچ دا سچ ہی نبڑے گا کدے دیس نہ وسدے جھوٹھیاں دے
۱۱۔ قول ہارناکم ہے پاجیاں دا جیہڑے حرص دے مگر دوڑیں قاضی
۱۲۔ مڑن قول زبان تھیں پھرن پیراں تڑے دناں دی ایہہ نشانیاں نی
۱۳۔ وارث اوہدار دا نماز روزہ حقدار نوں کرے ناحق جیہڑا
۱۴۔ جیہڑا حق نوں کرے ناحق میاں ایس جگ توں اس کی کھٹنائیں
۱۵۔ وارث شاہ جو عیب نہ کہیدا اے رب اوسدا نہیں چھپاوندائے
۱۶۔ موہوں نکلی گل خوار کردی نہیں دلیدا کھولنا راز بھائی
۱۷۔ وارث شاہ مغرور نہ ہوویں ہرگز کا لانہ شیطان کر دتا ئی
۱۸۔ ان دھن تے کبھی رب دلیسی وارث شاہ نوں کاسدی لوڑ ہے جی
۱۹۔ پڑھکے علم تے عمل نہ کرن جیہڑے اوہ شیطان مردود ونیال دے نی
۲۰۔ بدل فضل دے جدوں آوسدے نی فیض پہنچدا اچیاں نیچیاں نوں

وارث شاہ نے بےشمار آیات قرآنی کو تضمین کیا ہے۔ اس کے ان گنت اشعار قرآنی مضامین کے حامل ہیں۔ وارث شاہ نے جا بجا اسلامی تلمیحات استعمال کی ہیں حضرت آدم و حوا کا بہشتوں سے نکلنا۔ ہابیل وقابیل کی لڑائی طوفان نوح حضرت ابراہیم کا آتش نمرود میں بیٹھنا حضرت اسمٰعیل کا ذبیحہ حضرت یعقوب کی بینائی کا فراق یوسف میں زائل ہونا حضرت یوسف کا کنوئیں میں گرایا جانا ان کا سر بازار بکنا حضرت سلیمان کا بھٹ جھونکنا حضرت ایوب کے جسم مبارک کا کرموں کی خوراک بننا حضرت یونس کا شکم ماہی سے زندہ برآمد ہونا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت حضور کا غزووں میں شریک ہونا حضور کے دندان مبارک کا شہید ہونا حضرت امام حسن کو زہر دیا جانا حضرت امام حسین کا میدان کربلا میں شہید ہونا شمس تبریز کی کھال اتروانا منصور حلاج کا سولی پر چڑھنا غرضکہ اسلامی تاریخ کا کوئی واقعہ نہیں چھوڑا جسے تلمیح نہ کیا گیا ہو جا بجا احادیث نبوی کو باندھا گیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ سید وارث شاہ اپنے زمانہ کے عالم اجل و فاضل اکمل تھے۔ کہتے ہیں کہ انہوں نے اردو زبان میں بھی طبع آزمائی کی ہے مگر ایک غزل کے علاوہ ان کا اردو کلام نہیں ملا۔

ولا تجزون الا ما کنتم تعملون

اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں محمد اکرم ایک فارسی زبان کا شاعر گذرا ہے۔ اس کا تخلص غنیمت تھا عام طور پر ملا غنیمت کے نام سے مشہور رہا قصبہ کنجاہ ضلع گجرات اس کا وطن ہے اس نے ایک مثنوی بزبان فارسی لکھی۔ اس کا نام نیرنگ عشق رکھا اس مثنوی میں قصہ ہیر رانجھا کو فارسی زبان میں منظوم کیا گیا ہے۔ اسے حال ہی میں رائل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال نے از سر نو طبع کر کے شائع کیا ہے۔ قیمت صرف ۴۔ رکھی ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔

ندیدم کشور غارت گر تاب	بہ خوبی ہائے حسن آباد پنجاب
فضائے نشئہ مستی ہوائش	زمین و آسماں ہا خاک پائش
زلالش بادہ ساز مستیٔ عشق	نسیمش روح بخش مستیٔ عشق
گلش بر خاک ہر جا سایہ انداخت	زمین از آتش یاقوت بگداخت
بتانش چوں زر دے مہر جوشند	شکر گویند گوہر مے فروشند

اس قصہ کو وارث شاہ کے زمانہ کے لگ بھگ ہی ایک پنجابی شاعر احمد یار نے بھی پنجابی زبان میں نظم کیا۔ احمد یار موضع مرالہ ضلع گجرات کا رہنے والا تھا۔ یہ بڑا مشہور پنجابی شاعر گذرا ہے۔ صاحب خمسہ ہے چالیس سال تک قصہ نویسی کی قصہ سیف الملوک قصہ یوسف زلیخا اور قصہ حاتم طائی کو مخصوص انداز میں لکھا۔ بڑا پرگو و پر نویس ہو گذرا ہے۔ اسے طبابت سے بھی شغف رہا ہے طب احمد یاری لکھی۔ اپنے آپ کو ملک الشعرا کہا کرتا تھا مگر وارث کی قادر الکلامی کا معترف ہے۔ احمد یار نے کچھ عرصہ پیر کرم شاہ کی صحبت میں بھی گذارا پیر صاحب موضع پیر کھارا ضلع جہلم میں مقیم تھے۔ طب احمد یاری اور قصہ حاتم طائی انہی پیر صاحب کی فرمائش پر لکھی۔ احمد یار تیز نویس اور خوش نویس بھی تھا اس کے قصہ ہیر رانجھا کو زیادہ مقبولیت حاصل نہ ہوئی۔ وارث شاہ کے سامنے ان کا چراغ نہ جل سکا۔ پرگوئی کے علاوہ ان کی اور کوئی خصوصیت نہیں۔ ہر قسم کا رطب و یابس لکھ مارا یہی وجہ ہے کہ ان کی تصنیفات کو دوام حاصل نہ ہو سکا۔ رنجیت سنگھ کے دربار سے اسے کچھ وظیفہ ملتا تھا پنجابی زبان میں ان کی تصانیف ان گنت ہیں۔ کہتے ہیں کہ باتیں بھی پنجابی شعروں میں ہی کیا کرتا تھا نمونہ کلام ملاحظہ ہو ؎

وارث شاہ جنڈیالے والے واہ واہ ہیر بنائی ہٗ بہں بھی ریس اوسے دی کر کے لکھی تو ڑ نبھائی
سبھ صفت داعشق خلاصہ اول آخر تائیں ہٗ وہیلیاں ایہہ زور آوریاں سبھے حکم قضائیں
عاشق معشوق دیاں جنہاں جھیاں چاپل جائیں ہٗ احمد یار تیاں جگ دُھمان چھیڑیاں عشق ہوائیں

اشعار بالا سے معلوم ہوتا ہے کہ احمد یار کے اشعار میں نہ سوز و گداز ہے اور نہ ہی ربط و ضبط۔

قصہ ہیر رانجھا کو محمد شاہ ایک پنجابی شاعر نے بھی نظم کیا۔ اس کا یہ منظوم کلام چار سہ حرفیوں پر مشتمل ہے یہ گمنام شاعر علاقہ میر پور پرچھکہ ریاست جموں میں ہو گذرا ہے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

ساڈیاں سہیلیاں سبز رنگاں اساں اج چڑھائیاں رانجھنا وے
تیری خاطر ہار سنگھار کیتے دھڑیاں اج میں لائیاں رانجھنا وے
باغ بلغ ہووے دل ویکھ تیرا داگاں اج گنڈائیاں رانجھنا وے
محمد شاہ تیری ملاقات کارن سیجاں اج وچھائیاں رانجھنا وے

اس کے اشعار میں درد اور سوز پایا جاتا ہے۔

قصہ ہیر رانجھا پر سید فضل شاہ نے بھی خامہ فرسائی کی ہے۔ ہیر سید فضل شاہ فی زمانہ شہرت و مقبولیت کے لحاظ سے ہیر وارث شاہ سے دوسرے درجے پر ہے فضل شاہ کے دوہڑے بھی پنجاب بھر میں مشہور ہیں آپ کے والد ماجد کا نام بھی سید قطب شاہ تھا۔ آپ متصل لاہور کے رہنے والے تھے۔ آپ ۱۸۲۷ء میں پیدا ہوئے اور ۱۱ فروری ۱۸۹۰ء مطابق ۱۳۰۷ھ داعی اجل کو لبیک کہا آپ کا مزار گاؤں کے مغرب کی طرف واقع ہے۔ آپ فنانشل کمشنر کے دفتر میں ایک دفتری کی اسامی پر متقرر تھے۔ آپ کی دیگر تصنیفات یہ ہیں:۔
تحفۂ فضل (۱۲۶۰ھ) سوہنی مہینوال (۱۲۶۹ھ) سسی پنوں (۱۳۰۳ھ) لیلیٰ مجنوں (۱۲۸۸ھ) یوسف زلیخا (۱۳۰۲ھ) سی حرفی جات (۱۲۷۰ھ) بارہ ماہ فضل، فضل کے دوہڑے۔ ہیر رانجھا کا سن تصنیف ۱۲۸۴ھ ہے چونکہ سید وارث شاہ اور سید فضل شاہ کے زمانے میں پون صدی کا فرق ہے اس لئے زبان میں بھی ایک نمایاں تفاوت نظر آتا ہے۔ آپ بھی احمد یار کی طرح صاحب خمسہ ہیں اور اپنے آپ کو ملک الشعرا کہلواتے تھے۔ آپ پہلے پنجابی شاعر ہیں جنہوں نے اپنے کلام میں صنعت تجنیس کی عام طور پر رعایت رکھی ہے نمونہ کلام ملاحظہ ہو:۔

دوروں دھوڑ دھمدی تیری جنج جاتی بیٔے موت دے اُٹھ سوار سوہنا
وے میں موئی بے دردیا موڑ واگاں لگی سانگ کلیجڑے کار سوہنا
ایہو ویڑا اِی مینوں مل سایاں گل لاواں سینہ ٹھار سوہنا
ہیر اعرش دا کنگرہ ڈھا گیوں گئی کوک عرشوں لنگ پار سوہنا

قصہ کو رائے بہادر منشی کنھیا لعل المتخلص بہ ہندی نے مثنوی نگارین نامہ کے نام سے بزبان فارسی نظم کیا۔ یہ زلیخا جامی کی بحر میں لکھا گیا اور ایک دو مرتبہ لاہور میں چھپ کر مفت تقسیم ہوا۔ یہ قصہ ۱۸۸۱ء میں شائع ہوا اس کی زبان نہایت پاکیزہ اور شستہ ہے قصہ میں جا بجا ہندی جزئیات پائی جاتی ہیں۔ اول منشی صاحب نے وارث شاہ کی پیروی کی ہے وجہ تصنیف نگارین نامہ کے تحت میں خود منشی صاحب نے لکھا ہے ؎

اگر پیش ازیں وارث سخنداں	رقم کرد است نظم حال ایشاں
مگر نظمش بہ پنجابی زبان است	کہ مطبوع دل مبتدیان است

اشعار بالا سے منشی صاحب کی روانیٔ بیان اور سلاست مضمون کا بھی پتہ چلتا ہے۔ مگر صاحب دیباچہ ہیر وارث شاہ پیراندتہ ایڈیشن لکھتے ہیں کہ اصل میں یہ تصنیف منشی غلام مرتضیٰ لاہوری کی ہے اور ہندی کے نام پر لگائی گئی مجھے ان کے اس بیان سے اختلاف ہے کیونکہ رائے بہادر منشی کنھیا لعل بڑے مسلم صاحب قلم رہ چکے ہیں۔ ان کو کیا ضرورت پڑی تھی کہ کسی دوسرے شخص کے رشحات قلم کو اپنے نام کے ساتھ موسوم کر کے اپنے ادبی وقار کو ٹھیس لگاتے۔

صاحب دیباچہ یادگار وارث نے تین اور فارسی قصوں کا ذکر کیا ہے جو اسی موضوع پر لکھے گئے۔ ان میں سے ایک ہیر رانجھا مصنفہ منت دہلوی ہے۔ دوسرا ہیر رانجھا مصنفہ سندر داس آرام تیسرا مثنوی باقی مگر ان تینوں مصنفوں کے متعلق مفصل روشنی نہیں ڈالی

لے: نک سائر مفقود ہے حسین میاں ظریف نے ۱۸۶۸ء میں اس نام کا ایک ڈرامہ تصنیف کیا۔ نقش ساگر صفحہ ۷۰ ۲ فہرست کتب او بستان جہاں پرساد۔ ۳ ضلع جہلم۔ ۴ یادگار وارث صفحہ ۱۲ ۵ دیباچہ ہیر وارث شاہ پیراندتہ ایڈیشن ۶ دیباچہ ہیر وارث پیراندتہ ایڈیشن ۷ دیباچہ ہیر وارث شاہ پیراندتہ ایڈیشن ۸ سید وارث شاہ کے والد کا نام بھی سید قطب شاہ تھا۔ ۹ یادگار وارث صفحہ ۳۳ ۱۰ دیباچہ ہیر وارث شاہ پیراں دتہ ایڈیشن۔

جا سکی نہ ہی ان کے کلام کا نمونہ میسر آسکا ہے۔ تاہم اس سے قصہ ہیر و رانجھا کی فارسی زبان میں بھی مقبولیت کا پتہ چلتا ہے۔ جنت دہلوی کا اس پنجابی قصہ پر خاص احسان ہے کہ انہوں نے اس روائتی تعصب کو بالائے طاق رکھتے ہوئے جو دہلوی حضرات کو ہر ایک ایسی چیز کے خلاف جو قومیت کے لحاظ سے پنجابی ہو، ہوتا ہے ایک پنجابی قصہ کو اپنی طبع آزمائی کے لئے منتخب کیا اور قصہ کی تمدنی ثقالت ان کی دہلوی نزاکت پر بار ثابت نہ ہوئی۔

بھگوان سنگھ نے اس قصہ کو پنجابی زبان میں نظم کیا۔ یہ ۲۷۰ کبت پر مشتمل ہے زبان علاقہ مالوہ کی استعمال کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بھگوان سنگھ بھی علاقہ مالوہ کا باشندہ ہے۔ یہ قصہ سکھ لوگوں میں زیادہ مقبول ہے اور دیوی ماتا کے نام سے شروع ہوتا ہے۔ اس قصہ کا پہلا شعر ملاحظہ ہو ؎

کتھا کہوں ۔ ہیر کی جو کچھ آزاد ل ۔ بھگوان سنگھ وچ دوستاں کے سچ دینال

ایک اور سکھ پنجابی شاعر جوگ سنگھ نامی نے بھی اس قصہ پر طبع آزمائی کی۔ یہ بھی کبتوں پر مشتمل ہے اور بازار میں عام ملتی ہے اس لئے نمونہ اشعار نہیں دیا جاتا۔

اللہ دتا رائیں ایک ان پڑھ تک بند نے بھی اس مشہور و معروف قصہ پر تک بندی کی ہے۔ یہ موضع نون میانی ضلع شاہ پور کا رہنے والا تھا حال ہی میں وفات پائی۔ یہ قصہ ہیر کی وار کے نام سے مشہور ہے کلال لوگ عام طور پر ہیر رانجھا کا سوانگ بھر کر اس کی نقل اتارا کرتے ہیں۔ ہیر کی وار کے اشعار ان لوگوں کو خوب ہی یاد ہوتے ہیں۔ یہ سوانگ عام طور پر بیاہ شادی کے موقعوں پر بھرے جاتے ہیں۔ اور ان پڑھ آدمیوں کی ضیافت طبع کا سامان بہم پہنچاتے ہیں۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو ؎

ہیرے نی اک جوگی آیا گلیاں دے وچ وگدا
اڑ اڑ اندر ول جھاتی پاوے جس دروازیوں لنگھدا
اجڑگیاں دی کوئی نہیں نگری نہ کوئی باپ نہ مائی
نہ کوئی بندہ خویش قبیلہ نہ کوئی بھین نہ بھائی

بقول مصنف دیباچہ ہیر وارث شاہ پیر اندتہ ترگڑ والی اس قصہ پر میاں محمد صاحب مصنف سیف الملوک نے بھی طبع آزمائی کی ہے مگر اس کا نمونہ نایاب ہے ایک قصہ ہیر رانجھا حال ہی میں چھپا ہے اس کے مصنف پنجابی کے شاعر مولا بخش صاحب کشتہ ہیں۔ جو امرتسر کے باشندے ہیں۔ اس قصہ کی ابتدا یوں ہوتی ہے ؎

سب تعریف اس مالک الملک تائیں پیدا جس نے کون و مکان کیتے
عقل فکر تھیں باہر راز آہے ذات پاک نے جو عیاں کیتے

اس قصہ پر بہت سی سی حرفیاں لکھی گئی ہیں۔ ان کا شمار مشکل ہے مگر بقول صاحب دیباچہ ہیر وارث شاہ سات سی حرفیاں بہت مشہور و مقبول ہیں۔

۱۔ سی حرفی ہیر حسین۔ یہ شخص موضع گاجر گولہ علاقہ رسول نگر میں ہو گذرا ہے۔ بہت بلند طبع شاعر تھا۔ نمونہ کلام ؎

ث۔ ثابتی صدق یقین سیتی میری ماہی دے نال پریت مائے
حد تک جیوساں تھیوساں نال ماہی اساں نال وعدے ایہو نیت مائے
اساں مرن قبول پتنگ وانگوں ایہو مرن عاشقاں دی ریت مائے
میری عرض ہے عرض حسین ایہو شالا پیت نہ ہووے پلیت مائے

۲۔ سی حرفی ہیر جھیل نمونہ کلام۔

ب۔ بید دکی جانن ہیرے دردمنداں دیاں آہیں ...... بھڑکن بھائیں
باجھوں دردو دیار نہ ہیرے بن دردوں کجھ ہیں ...... سمجھ کدائیں
الانتظار اشد من الموت بھی لکھ واراں ...... انتظاراں
آئی جان لباں تے جھیل کدی تے موڑ مہاراں ...... گھر باراں

۳۔ سی حرفی ہیر روشن۔ یہ بازار میں عام ملتی ہے۔

۴۔ سی حرفی ہیر محمد۔ یہ سی حرفی اسی میاں محمد مصنف سیف الملوک کی تصنیف ہے۔ جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ یہ دراصل ایک مخمس ہے ایک مرتبہ شائع ہوئی۔ غالباً دوسرا ایڈیشن نہیں نکلا اس لئے نایاب ہے اس کا ایک مصرعہ نہایت مشہور ہے

پچھو جا محمد ہیر کولوں لوک جاندے عشق سوکھا لڑے نی

۵۔ سی ہیر سید فضل شاہ۔ ان کا مفصل ذکر اوپر آچکا ہے۔ اب سی حرفی کا نمونہ ملاحظہ ہو

الف الف الٰہی میل ماہی نوں ہجر ماہی دے تلیاں پھاٹن تلیاں
ہک ماہی نوں نے گل لاون ہک اُٹھ ڈھونڈن گلیاں اس غم گلیاں
میں نہ بھلیاں ماہی تیکھے سکھ ہزاراں بھلیاں بھلیاں بھلیاں
ہک تڑفن فضل پیا دے باجھوں جیوں بن پانی کلیاں داں ملیاں

۶۔ سی حرفی ہیر میاں محمد عمر ساکن لگا ضلع جھنگ۔ اس کا نمونہ نہیں مل سکا۔

۷۔ سی حرفی ہیر سید شاہ شرف۔ بقول صاحب دیباچہ ہیر وارث پیر اندتہ یہ سی حرفی بھی ابھی تشنۂ طباعت ہے

۸۔ سی حرفی ہیر شاہ جلال۔ نمونہ نہیں ملتا۔

۹۔ سی حرفی ہیر علی حیدر۔ یہ بڑی مشہور و معروف سی حرفی ہے پنجاب کے بڑے بڑے شہروں کے گلی کوچے میں بیت بازی کا مقابلہ عام طور پر علی حیدر کی سی حرفی ہی سے ہوتا ہے قوال لوگ اس سی حرفی کے حافظ ہوتے ہیں جو دوہڑوں کی شکل میں گاتے ہیں۔ اس سی حرفی میں بڑا سوز و گداز ہے۔ علی حیدر بڑے اعلیٰ پایہ کے صوفی منش پنجابی شاعر ہو گذرے ہیں۔ آپ ملتان کے رہنے والے تھے۔ آپ نے ۱۱۹۰ھ میں وفات پائی۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو ؎

الف ازل الست دی یاری لگ رہی ہیر یتیم دی آ
میں تاں رانجھاں وچہ رسولاں ڈِٹھا مینوں قسم جے عرش عظیم دی آ
اوہے موہنے تے کمل مزمل والا اوہدے ہتھ کھونڈی یٰسین دی آ
علی حیدر رانجھا اج چھپا تا اودہ تے ظاہر صورت میم دی آ

قصہ ہیر رانجھا کو سید میراں شاہ نے ۱۳۰۱ھ میں سپرد قلم کیا تاریخ اختتام چھٹا روز ماہ رمضان لکھی ہے۔ شیخ محمد بخش فضل حسین نے الیکٹرک ابوالعلائی پریس آگرہ میں طبع کرا کر شائع کیا۔ اس قصہ کو اس طرح پر شروع کیا ہے۔ ؎

اول صفت خدا دی کریئے قادر قدرت والا ۔ ہر ہر دے وچ ذات ہے اُسدی سب تھیں رہے نرالا
کن فیکون آوازہ کر کے کیتا نور اجالا ۔ آدم جن فرشتے کیتے پیدا رب تعالیٰ
رازق رزق دیندا سب تائیں کر تقسیم نوالا

کہیں کہیں واقعات قصہ کا آغاز میں ترگئی رانجھا ہوئے سے شروع کیا ہے۔ تاریخ تصنیف قصہ و وجہ تصنیف یوں بیان کی جاتی ہے:-

بارہ دھیر ہوئی تم ساری کیتا فضل الہی ؛ جیسی عقل تمیز سی مینوں سو تمہید اٹھائی

کیتا یاد یاراں دا کہنا مینوں طلب نہ کائی ؛ تیرہ سو ستر سی سن ہجریاں میں ہیر بنائی

ماہ رمضان ستے چھیواں دنہ نبیرے پیر لکائی ؛ کل حقیقت رانجھے دی یار آکھ سنائی

آکھو کلمہ پاک نبی دا جس امت بخشوائی ؛ میراں شاہ اس کلمہ رب دی بیڑی پار لنگھائی

ان کے اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اشعار اردو آمیز پنجابی میں ہیں۔

ہیر رانجھا انگریزی زبان میں بھی لکھی گئی۔ اس کے مصنف کا نام سردار محمد عبدالقادر خان آفندی ہے۔

ہیر وارث شاہ کے بیشمار ایڈیشن مرتب ہوئے مگر ہیر پیرانہ ترگڑ والی، پیر محبوب عالم نکوی اور ہیر شیخ غلام علی تاجر کتب لاہور کے ایڈیشن نہایت محنت اور جانفشانی سے مرتب ہوئے ہیں لطف یہ ہے کہ ان تینوں ایڈیشنوں کے متن کو سید وارث شاہ سے منسوب کیا جاتا ہے مگر ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ یہ بذات خود الگ قصے بن گئے ہیں جن کی زبان مختلف اور انداز بیان جدا ہے پیرانہ ایڈیشن مصور ہے اور اس کے ساتھ ایک مبسوط دیباچہ زائد کیا گیا ہے جس سے راقم الحروف نے کہیں کہیں استفادہ کیا ہے۔

ہیر رانجھا تھیٹر کی سٹیج پر بھی کہیں کہیں کھیلا گیا اس قصہ کو کئی مرتبہ ڈراما کیا گیا ڈرامہ ہیر رانجھا مصنفہ حافظ محمد عبداللہ نہایت شہرت حاصل کر چکا ہے۔ حافظ صاحب موصوف چتورہ کے رئیس تھے۔ یہ پہلے امپیریل تھیٹریکل کمپنی اور پھر لائٹ آف انڈیا تھیٹریکل کمپنی میں بطور ایکٹر کام کرتے رہے اور بہت سے طبعزاد ڈرامے ان کی طرف منسوب ہیں۔ ڈرامہ ہیر رانجھا موخرالذکر کمپنی میں کھیلا گیا۔ حافظ صاحب کے دوسرے ڈرامے جشن پرستان۔ فرخ سبھا ستم سامان۔ انجام ستم۔ فتنۂ عالم۔ پولیس ناٹک۔ عاشق جانباز۔ زہرہ و بہرام۔ انصاف محمود اور نورجہاں ہے سو ڈرامہ ہیر رانجھا غالباً ۱۸۹۰ء میں لکھا گیا۔

یہ قصہ اس قدر مقبول عام اور مرغوب خاص ہے کہ سینما کا پردہ بھی اس سے نہ بچ سکا اندرا موویٹون نے اس قصہ کو بصرف کثیر فلمایا۔ اس کھیل کا نام ہیر سیال ہے پنجاب کے ہر ایک شہر میں جہاں سینما گھر موجود ہیں یہ کھیل ہفتوں چلا ملا ہور میں اس فلم نے تمام سابقہ فلموں کے ریکارڈ مات کر دیئے۔ اس کے مکالمے اور گانے بابو فیروز دین شرف پنجابی شاعر نے لکھے کہیں کہیں وارث شاہ سے بھی استفادہ کیا گیا۔

میرا یہ مقالہ تشنۂ تکمیل رہیگا۔ اگر میں یہاں پر چودھری افضل حق صاحب مصنف زندگی و آزادی ہند کی معشوقۂ پنجاب کا ذکر نہ کروں چودھری صاحب پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی کے رکن ہیں اور گڑھ شنکر کے رہنے والے۔ آپ احراری لیڈر ہیں۔ اور کئی مرتبہ جیل کی کال کوٹھریوں کو بسا چکے ہیں۔ اب بھی حال ہی میں بوجہ عدالتی سزا کی میعاد سے پہلے ہی رہا ہو چکے ہیں۔ ان کی اکثر تصنیفات کو حبسیات کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا جیل کے ماحول۔ یکسوئی اور جذباتی زندگی نے ان کی تصانیف میں واقعاتی۔ اخلاقی اور جذباتی رنگ پیدا کر دیا ہے۔ ان کی معشوقۂ پنجاب دراصل ہیر رانجھا کا قصہ ہے جسے پہلی مرتبہ اردو جیسی شیریں زبان میں نثرایا گیا گو سن تصنیف کا پتہ نہیں چلتا مگر حال ہی کی تصنیف معلوم ہوتی ہے معشوقۂ پنجاب کریمی پریس لاہور میں چھپی ہے اور اسے میر نثار حسین نے شائع کیا ہے۔ قیمت ۸ر رکھی ہے ابتدا میں ایک مختصر سا دیباچہ از مصنف درج ہے۔ کل کتاب ۱۵۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ جسے پچیس چھوٹے چھوٹے بابوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ہر ایک باب بذات خود ایک دلپذیر افسانہ ہے۔ ہر ایک باب کا متن اردو زبان میں چودھری صاحب کے مخصوص انداز تحریر کا حامل ہے۔ مگر عنوان پنجابی مصرعہ یا شعر سے شروع ہوتا ہے۔ مثلاً پہلا باب حسب ذیل پنجابی شعر سے شروع ہوتا ہے:-

رانجھا پھل گلاب دا میری جھولی ٹٹ پیا
میں وِ ستر بھلے سنگھیا میرے لوں لوں رچ گیا

چونکہ معشوقۂ پنجاب عام ملتی ہے۔ اس لئے بخوف طوالت نمونتہً کچھ درج کرنے سے درگذر کرتا ہوں۔ چودھری صاحب کے زور بیان نے اسے پڑھنے کی چیز بنا دیا ہے۔

نیاز احمد ترمذی بی اے بی ٹی

غزل

یہ موسم بہار ہے اپنا کہ کچھ نہ پوچھ
سینہ وہ داغدار ہے اپنا کہ کچھ نہ پوچھ

ہر روز روزِ حشر ہے ہر شب شبِ حساب
ہمدم! وہ حال زار ہے اپنا کہ کچھ نہ پوچھ

ہوتا جو اختیار میں مرنا اچھا کیا بُرا
جینا وہ مجھ پہ بار ہے اپنا کہ کچھ نہ پوچھ

یارب یہ کس طرح سے بجھے گی لگی ہوئی
دل ایسا شعلہ بار ہے اپنا کہ کچھ نہ پوچھ

پڑھتا رہا ہے رات اسی کی نماز لعل!
اک بت سے ایسا پیار ہے اپنا کہ کچھ نہ پوچھ

لعل

ص؎ چودھری صاحب انتقال فرما گئے ہیں۔ ایڈیٹر

"آخری خط"

لکھے لاکھوں ہی خط تم کو ہزاروں التجائیں کیں

ربابِ زندگی پر نغمۂ آہ و فغاں گایا
خیالی راحتوں سے دِل کے ارمانوں کو بہلایا

کیا رنگین اپنے خوں سے اُلفت کی کہانی کو
دیا آغوشِ ظلم و جور میں اپنی جوانی کو

تمنائے سکوں میں کاٹ دیں تاروں بھری راتیں
بُھلائے سے نہیں بھُولیں تمہاری دلنشیں باتیں

فسُردہ حسرتوں کے خُوں سے کتنی ہولیاں کھیلیں
تمہیں اپنا سمجھکر کیسی کیسی آفتیں جھیلیں

کبھی جب اضطرابِ شوق میں حد سے گذرتا تھا
تصوّر میں ہزاروں التجائیں تم سے کرتا تھا

دُعائیں کیں تمہارے واسطے اور بد دعائیں لیں
چراغِ زندگی اب ٹمٹما کر بجھنے والا ہے

پشیماں گر کبھی ہو جاؤ تم اپنی جفاؤں پر
تو دو آنسو بہا دینا مری نیکیں وفاؤں پر

شبستانِ محبّت پر اندھیرا چھانے والا ہے
لکھے گا کون اب خط تم کو، اب تم کس سے رُوٹھو گی؟
ہمیشہ کے لئے یہ "آخری خط" پڑھ کے چھُوٹو گی؟

حفیظ قیصر نجیب آبادی

سیر و سیاحت

شکار رفٹ بال، ہاکی ٹینس کی طرح سیر و سیاحت بھی فارغ وقت کو صرف کرنے کا ایک اچھا طریقہ ہے۔ ہائکنگ میں شہری اور پُر رونق زندگی کو کچھ دن کے لئے چھوڑ کر آدمی دیہاتوں میں پہاڑوں پر اور جنگلوں میں ایک آزاد اور بے فکر انسان کی حیثیت سے گھومتا ہے اور قدرت کا نظارہ کرتا ہے۔

ہر شخص کے دل میں دنیا کے عجائبات کے دیکھنے کا شوق ہے اور وہ چاہتا ہے کہ چل پھر کر اپنی نظر سے ہر پسندیدہ چیز کا معائنہ کرے۔ قدرت کا مشاہدہ مختلف طریقوں سے کیا جا سکتا ہے اگر فاصلہ زیادہ طے کرنا ہو اور کوئی خاص چیز کسی خاص جگہ پر دیکھنی مقصود ہو تو بحری اور ہوائی جہاز ریل اور موٹر کا استعمال سب سے بہتر ہے اگر فاصلہ کم ہو۔ اور موٹر اور تانگہ کے لئے سڑکیں موجود نہ ہوں۔ تو بآسانی گھوڑا استعمال میں لایا جا سکتا ہے لیکن بعض اصحاب گھوڑے کی سواری پر پیدل چلنے کو ترجیح دیتے ہیں کیونکہ پیدل چلنے میں بھی اول تو آدمی ہر چیز کو بخوبی دیکھ سکتا ہے اور دوسرے اس میں ٹانگوں کے علاوہ جسم کے باقی حصے بھی حرکت کرتے ہیں۔

عام لوگ تازہ ہوا کے فائدے سے واقف ہونے کے باوجود اس سے مستفید نہیں ہوتے شہروں کی گھٹی ہوئی فضا اور تکلفات کی زندگی سے صحت خراب کر بیٹھتے ہیں۔ تو قدرت کے خزانوں سے فایدہ اٹھانے کی بجائے سینکڑوں روپے ڈاکٹروں حکیموں اور وید وں کی نذر کر دیتے ہیں۔ کاش وہ جانتے کہ صاف اور کھلی ہوا نہروں سے بہتر دوا ہے اور ورزش انسان کے اکثر امراض کو دور کر دیتی ہے۔

ہائکنگ میں نہ تو اتنا زیادہ چلنے کی ضرورت ہے کہ آدمی بہت زیادہ تھک جائے اور نہ اتنا تھوڑا چلے کہ جسم کو بالکل معلوم ہی نہ ہو۔ بہرحال باقاعدہ سیر نہایت ہی ضروری ہے اور یہ بھی بہتر ہے کہ ایسی سیر کے وقت کپڑے نہایت ہلکے ہوں۔ ہائکنگ میں بعض اشخاص اپنے دوستوں اور ساتھیوں کے ہمراہ جانا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ راستے میں مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی ہے۔ ادھر اُدھر کی باتیں ہوتی ہیں جس سے نہ صرف سیر ہی میں لطف ملتا ہے۔ بلکہ ایک آدمی دوسرے سے بہت سی نئی باتیں سیکھ لیتا ہے لیکن ایک اور طرح کے آدمی بھی ہیں جو اکیلا چلنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ یہ لوگ چلتے ہوئے باتیں کرنا پسند نہیں کرتے بلکہ خود ہی قدرتی نظاروں کو غور سے دیکھتے ہیں۔ اور اس طرح اپنے علم میں اضافہ کرتے ہیں۔ ایسے لوگ اپنے گھر کے بھولے ہوئے تکلیف دہ واقعات کی یاد اس وقت پسند نہیں کرتے۔ بلکہ اپنے گھر، شہر اور تمام پرانی چیزوں کو بھولنے میں ہی مزا پاتے ہیں۔

اکثر مہذب ملکوں میں ہائکنگ کو دوسرے مفید کھیلوں کی طرح تنظیم دی گئی ہے کلب اور سوسائٹیاں قائم ہیں۔ ان کے بیسیوں ممبر ہیں۔ ہر سال ان ممبروں کی ٹولیاں بنائی جاتی ہیں کہ وہ مشکل مہمات پر جا کر ان جگہوں کے حالات قلمبند کر کے لوگوں کے علم میں اضافہ کریں۔ آپ اکثر ان باہمت اصحاب کا ذکر پڑھتے ہونگے جو اپنی جان ہتھیلی پر رکھکر اپنے پیارے وطن اور اس میں رہنے والوں کو خیرباد کہکر ہمارے ملک میں آتے ہیں۔ اور کوہ ہمالیہ کی بلند ترین چوٹیوں پر چڑھنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ اپنی جان پر کھیل کر اپنے ہمجنسوں کو ان بلند چوٹیوں کے حالات سے آگاہ کریں۔ ان کی ہمت ہمارے لئے مشعل راہ بنی اور پچھلے سال یہ فیصلہ کیا گیا کہ پنجاب ماؤنٹینیرنگ کلب کی بنیاد ڈالی جائے اور اس کی پہلی مہم اسی سال لاہول کی سب سے بلند برفانی چوٹی پر چڑھنے کی کوشش کرے کیونکہ اس مہم میں بعض بہت زیادہ تجربہ کار نہ تھے فیصلہ ہوا کہ تمام ممبروں کی ہمت کا نشان اشد ضروری ہے اس لئے تمام قافلہ شملہ سے روانہ ہوا۔ تاکہ اوٹ تک جو شملے سے ۔۔ میل دور ہے یہ بات ظاہر ہو جائے کہ کون ممبر لاہول کی تکلیف کو برداشت کرنے کے قابل نہیں اور اسے کلو پہنچنے پر واپس جانے کی ترغیب دی جائے۔

آٹا چاول گھی مکھن دودھ شہد چینی سبزی پھل اور دوسری ضروریات زندگی کا بندوبست کر کے ہم نے اپنا سامان درست کیا اور گھوڑوں پر لادنے کے لئے گھوڑے والوں کے سپرد کیا۔ اس وقت گھوڑوں کی کافی قلت تھی۔ کیونکہ آلوؤں کا موسم تھا اور اکثر گھوڑے آلو لادنے کے لئے وقف کر دیئے گئے تھے۔

جمعرات ہی سے موسلا دھار بارش ہو رہی تھی اور جب تک ہم کلو پہنچے بارش نے بھی ٹھہرنے کا نام نہ لیا۔ چونکہ ہم روانگی کا فیصلہ پہلے ہی کر چکے تھے۔ اس لئے باوجود بارش کے ہر ایک نے اپنی برساتی سنبھالی اور ۱۲۔ اگست بروز جمعہ ۲ بجے دوپہر اپنی منزل پر روانہ ہوئے۔ کچھ فاصلے تک تو لوگ خال خال نظر آتے رہے لیکن اس کے بعد سوائے جنگلی جانوروں کے اور جھاڑیوں اور بلند درختوں کے کوئی چیز نظر نہیں آتی تھی عام! پہاڑی سڑکوں کی طرح اس سڑک کے ایک طرف بلند پہاڑ اور دوسری طرف کھڈ ہیں اور سڑک شروع میں تو ہموار ہے لیکن جس قدر ہم لوگ آگے بڑھتے گئے یہ آہستہ آہستہ بلند ہوتی گئی حتیٰ کہ ہم فاگو پہنچ گئے۔ فاگو سطح سمندر سے ۔۔۷۷ فٹ بلند ہے اور شملہ سے ۱۲ میل دور ہے یہ بہت اچھی جگہ ہے۔ یہاں ہم نے آگ جلائی تاکہ اپنے کپڑے جو باوجود واٹر پروف کے بھیگ چکے تھے خشک کریں۔ ایک صاحب نے ڈاک بنگلہ میں پناہ لی اور باقی صاحبان نے خیمہ میں بسیرا کیا یہ خیمہ ہم اپنے ہمراہ لاہور ہی سے اس مطلب کے لئے لے گئے تھے۔ یہاں کا ڈاک بنگلہ نہایت ہی کشادہ ہے اور بہت اہتمام سے بنایا گیا ہے اس کے علاوہ یہاں ایک سرائے بھی ہے لیکن اس کے کمرے گندے اور بدبودار ہیں اور ان میں ہوا پہنچنے کا خاطر خواہ انتظام نہیں۔

بھلا ان لوگوں کو جنہیں شہری اور پر رونق زندگی کے چھوڑنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا کیا معلوم کہ سیر و سیاحت میں کیا لطف ہے اپنے روزمرہ کے کاروبار اور فکروں سے آزاد صرف چند ضروری چیزیں ہمراہ ہیں اور کشاں کشاں چلے جا رہے ہیں راستے

میں نہ کسی پیغام کا انتظار اور نہ کسی دوست اور رشتہ دار کی ملاقات کا خیال بھوک لگتی ہے تو سبزہ زار پر نیلگوں آسمان تلے یا سرسبز و شاداب درختوں کے نیچے ڈیرا لگتا ہے سادہ خوراک کھانے کو اور چشمہ کا صاف اور ٹھنڈا پانی پینے کو میسر آتا ہے لیکن بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ میلوں چٹیل میدان اور ننگی چٹانوں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا لیکن یہ نظارہ بھی لطف سے خالی نہیں ہوتا۔

ہم نے رات فاگو میں بسر کی دوسرے دن علی الصبح اٹھے اور ضروری مشاغل سے فارغ ہو کر گھوڑے والوں کا انتظار کرنے لگے لیکن وہ کچھ ایسے سست واقع ہوئے تھے کہ ۱۱ بجے سے پہلے چلنے کا نام نہ لیا۔ آخر ہم آہستہ آہستہ گپیں ہانکتے ہوئے روانہ ہوئے اور تھیوگ جا پہنچے۔ تھیوگ میں ایک خاصہ اچھا بازار ہے جس میں دوسری دکانوں کے علاوہ دو تین معمولی ہوٹل بھی ہیں جن کا انتظام عورتوں کے ہاتھ میں ہے۔ ان دنوں بارش کی وجہ سے بازار کیچڑ سے بھرا ہوا تھا۔ اور چلنے کے لئے راستہ بھی ملنا مشکل تھا تھیوگ میں ہم نے کھانا کھایا اور آگے چلے ساڑھے چھ بجے شام متھیانہ پہنچے۔ یہ جگہ ناگو سے ۱۰ میل کے فاصلے پر ہے اور اس کی بلندی ۸۰۰۰ فٹ کے قریب ہے یہاں ایک بہت بڑی اور شاندار سرائے ہے جسے سرائے پورن چند کہتے ہیں یہاں بلا امتیاز رنگ و مذہب ہر شخص ایک ہفتہ کے لئے مفت قیام کر سکتا ہے یہ عمارت سیمنٹ سے بنی ہوئی ہے اور اس میں رہنے کے لئے کافی کمرے موجود ہیں۔ سرائے کے پاس ایک باؤلی ہے جس کا پانی ٹھنڈا اور مزیدار ہے یہی پانی نہانے۔ کھانا پکانے اور پینے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

دوسرے دن یعنی اتوار کو آسمان صاف تھا اور بادل کا نام تک نہیں تھا ہم دس بجے صبح پھر اپنے سفر پر روانہ ہوئے لیکن ابھی بمشکل آدھا راستہ طے کیا تھا کہ بارش نے آلیا۔ اس دن نارکنڈہ میں قیام کیا جہاں اڑھائی بجے دوپہر کو پہنچے۔ نارکنڈہ متھیانہ سے ۱۰۰۰ فٹ زیادہ اونچا ہے اور ۱۴ میل دور ہے یہاں ایک پادری کے پرتکلف اور سجے ہوئے مکان میں پناہ لی یہ مکان ڈاک بنگلہ سے ذرا اوپر ہے۔

سوموار کو ساڑھے دس بجے ہم نارکنڈہ سے روانہ ہوئے۔ اس دن ہمیں ۸۰۰۰ فٹ کی بلندی سے ۲۶۰۰ فٹ کی گہرائی میں پہنچنا تھا یعنی پہاڑ سے ہم میدان میں اتر رہے تھے۔ کہاں پہاڑ کی سردی اور موسم اور کہاں میدان کی گرمی۔ یہ دن کافی مشکل اور تکلیف میں گذرا خیال تھا کہ آج بجائے لوری ٹھہرنے کے انی جا ٹھہریں لیکن گرمی کے سبب ایک دن میں ۲۴ میل سفر کرنا مشکل نظر آیا۔ دوسرے گھوڑوں نے ساتھ دینے سے انکار کر دیا لہذا لوری ٹھہرتے ہی بنی۔ لوری میں ایک چھوٹا سا ڈاک بنگلہ ہے جس میں صرف دو چھوٹے چھوٹے کمرے ہیں۔ ایک کمرہ پہلے ہی رکا ہوا تھا۔ دوسرے کمرہ پر ہم میں سے ایک صاحب نے قبضہ جما لیا اور باقی اصحاب نے رات آسمان تلے ہی کاٹی اور سامان اپنے خیمے میں رکھا۔ اس جگہ پانی کا خاطر خواہ انتظام نہیں ہے پانی کافی فاصلے سے لایا جاتا ہے کیونکہ یہاں بہت زیادہ گرمی تھی۔ اس لئے دوسرے دن صبح سویرے ہم روانہ ہو گئے۔

لوری کے قریب دریا کافی کشادہ ہے اور خوب ٹھاٹھیں مارتا ہوا بہتا ہے۔ لوری سے ۹ میل کے فاصلے پر ۴۰۰۰ فٹ کی بلندی پر سڑک دو پہاڑیوں کے درمیان چلتی ہے یہاں ٹھنڈی ہوا کے جھونکے آتے ہیں۔ اس سے آگے گرمی بتدریج کم ہوتی جاتی ہے راستہ بھی آسان ہے آج کی منزل انی تھی جہاں ہم تین بجے دوپہر کو پہنچے۔ انی ۴۱۰۰ فٹ بلند جگہ ہے۔ اور یہ پہاڑیوں سے گھری ہوئی ہے۔ رات انی میں رہنے کے بعد دوسرے دن ہم پھر روانہ ہوئے۔ راستہ آج دشوار گذار تھا۔ انی سے ۸۰۰۰ فٹ کی بلندی پر خناگ پہنچنا تھا۔ یہ جگہ انی سے ۹ میل کے فاصلے پر ہے۔

۱۶۔ اگست کو دس بجے خناگ سے روانہ ہو کر سوجھا ہوتے ہوئے بنجار پہنچے جلوری پاس خناگ سے ۲½ میل کے فاصلے پر ۱۰۰۰۰ فٹ کی بلندی پر دو چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کے درمیان راستہ ہے جہاں سے گذرنے کے بعد ہمیں نیچے اترنا پڑا حتیٰ کہ ہم بنجور پہنچے جس کی بلندی ۵۰۰۰ فٹ سے زیادہ نہیں۔ بنجور تحصیل ہے اور پر رونق مقام۔ یہاں سول اور ڈسپنسری ہسپتال بھی ہیں۔

دوسرے دن بنجار سے ہم علی الصبح روانہ ہو گئے۔ آج دو بجے دوپہر سے پہلے اوٹ پہنچنا تھا جو بنجار سے ۱۵ میل کے فاصلے پر ہے اور وہاں سے کلو تک اور کلو سے منالی تک پکی سڑک ہے اور یہاں موٹر کا انتظام ہے۔ ہم وقت سے کافی پہلے اوٹ پہنچ گئے۔ کھانا کھایا اور لاری میں بیٹھ کر شام کو کلو ہوتے ہوئے منالی پہنچ گئے۔ کچھ دن منالی ٹھہرنے کے بعد پھر سفر کا ارادہ کیا اور روہتانگ پاس کو جو ۱۳۰۵۰ فٹ بلند ہے عبور کر کے برفانی چوٹی تک چڑھنے کی کوشش کی وہ نظارہ بھی دیکھنے کے قابل تھا۔ کافی قلی نہ ملنے کی وجہ سے اپنا ضروری سامان ہماری پشت پر تھا۔ پاؤں تلے سخت برف اور سر پر خوفناک بادل یا سخت دھوپ۔ خدا خدا کر کے آخر ۲۰۰۰۰ فٹ کی بلندی پر پہنچنے میں کامیاب ہو گئے اور خوشی خوشی واپس ہوئے۔

واپسی پر ایک دو واقعات ایسے پیش آئے جو خالی از دلچسپی نہیں۔ اس لئے ان کا ذکر یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ایک شام کڑائن میں جو منالی اور کلو کے درمیان ایک پر رونق مقام ہے ہم سیر کر رہے تھے سامنے چند گز کے فاصلہ پر ایک ٹیڑھی سی چیز پڑی تھی لیکن چونکہ عام طور پر ایسی چیزیں پہاڑی سڑکوں پر نظر آتی رہتی ہیں۔ نہایت بے پروائی سے ہم آگے بڑھنے لگے ابھی ایک ہی قدم اٹھایا تھا کہ ایک کتا جو ہمارے پیچھے پیچھے آرہا تھا۔ آگے بڑھا اور اس نے بھونکنا شروع کر دیا ہمارا ماتھا ٹھنکا اور ہم نے اپنی چھڑی سے اس بے حس چیز کو چھیڑا۔ پھر کیا تھا یکلخت وہ چیز ہلنے لگی اور نہ صرف زندگی کے تمام آثار اس میں ظاہر ہوئے بلکہ اس نے پھنکارنا شروع کر دیا اور پر معنی آواز نکالنے لگا ہم نے اپنی چھڑی کو گھمایا اور آن کی آن میں اس چیز کا جو اب سانپ بن چکی تھی۔ کام تمام کر دیا معائنہ پر معلوم ہوا کہ سانپ ([illegible]) کی قسم کا ہے

دوسرا واقعہ جوگندر نگر کا ہے۔ ہم کلو سے لاری میں جوگندر نگر پہنچے اور وہاں ایک بہت بڑے کمرے میں جس کے ہر طرف سبزہ زار اور جھاڑیاں تھیں قیام کیا چونکہ اس مقام پر ہم دیر سے پہنچے چارپائیوں کا بندوبست نہ ہو سکا اس لئے فرش پر بستر کئے۔ نوکر کو پانی لانے کے لئے کہا اور خود باہر سیر کو نکلے۔ واپس ہوئے تو گھڑا ننگا پایا۔ اسے ڈھانپ دیا گیا تاکہ کوئی چیز اس میں گرنے نہ پائے۔ یہ گھڑا ہمارے بستروں کے بالکل قریب ہی پڑا تھا۔ رات کو اس پانی سے کسی نے ہاتھ دھوئے اور کسی نے منہ۔ الغرض جب دوسرے دن اٹھے اور پانی لینے کے لئے گھڑے کا ڈھکنا اٹھایا تو کیا دیکھتے ہیں کہ پانی میں ایک سانپ بڑی پھرتی سے سر ہلا رہا ہے گویا راستہ کی تلاش میں ہے کبھی اوپر سر اٹھاتا ہے اور کبھی پھر آرام سے نیچے کر لیتا ہے۔ کچھ دیر تک تو ہم یہ تماشہ دیکھتے رہے۔ اور اپنی خوش قسمتی پر خوش ہوتے رہے پھر گھڑے کو باہر میدان میں لا رکھا تاکہ ڈھکنا اٹھانے پر اگر سانپ بھاگنے کی کوشش کرے تو کہیں چھپ نہ سکے اور ہم چھڑیاں اور پتھر لیکر مقابلہ

کے لئے کھڑے ہو گئے۔ بھلا ایک چھوٹا سا چیتھڑا اتنے سوراخوں کا کس طرح مقابلہ کرتا جونہی سر نکالا ایک ڈنڈا ایسا پڑا کہ ہوش گم ہو گئے پھر کیا تھا۔ فوراً اسے قابو میں کر کے بوتل میں بند کر دیا گیا۔ اور دوسرے جانوروں کی طرح اسے بھی سفر کی نشانی کے طور پر ساتھ لے آئے سانپ گھڑے میں کب کہاں سے اور کس لئے پہنچا ہم یہ معلوم کرنے سے قاصر رہے ممکن ہے یہ کلوبی میں ہمارے بستر میں چھپا بیٹھا ہو یا ممکن ہے یہ جوگندر نگر میں کسی جھاڑی سے نکل گھڑے میں آن پڑا ہو لیکن جوگندر نگر کے چند رہنے والوں نے ہمیں بتایا کہ انہوں نے ایسا سانپ وہاں پہلے کبھی نہیں دیکھا سانپ کی شکل و صورت سے یہ ظاہر تھا کہ وہ پانی میں رہنے والا سانپ نہیں بلکہ بن کا باشندہ ہے۔ یہ کریٹ تھا جس کا زہر ناگ کے زہر سے دگنا خطرناک ہوتا ہے۔

ختم کرنے سے پہلے میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ جنگلوں اور پہاڑوں کی آزاد فضا میں انسان وہ کچھ سیکھ سکتا ہے جو مہذب انسان پر رونق شہروں میں رہ کر نہیں سیکھ سکتا۔ اپنے گھر سے دور انسان کو صرف اپنی ہمت۔ طاقت اور عقل پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے اور وہ ایسے ایسے تجربات کرتا ہے جن کا شہر میں رہکر خیال تک نہیں آ سکتا۔

چودہری **نذیر احمد** ایم۔ ایس۔ سی (آنرز)

غزل

دل مضطر کا ہر ذرہ درخشاں ہوتا جاتا ہے
زہے قسمت کہ سامانِ چراغاں ہوتا جاتا ہے

محبت میں تمیزِ دوست و دشمن نہیں ہوتی
یہاں جو آتا جاتا ہے وہ مہماں ہوتا جاتا ہے

بہاروں میں نہ جانے باغباں کو کیا یہ سوجھی ہے
کہ خود مائل بہ تخریبِ گلستاں ہوتا جاتا ہے

مری کشتی کو بھی اے ناخدا! طوفان بننے دے
کہ ساحل بھی شریکِ جوشِ طوفاں ہوتا جاتا ہے

بھلا ہو دشمنوں کا دوستوں سے پھر بھی اچھے ہیں
مرا ہر عیب اب مجھ پر نمایاں ہوتا جاتا ہے

مصائب کی فراوانی سے دل پُر نور ہے میرا
اندھیرا جتنا بڑھتا ہے چراغاں ہوتا جاتا ہے

ترے ماتھے کی شکنیں دیکھ کر میں اور کیا سمجھوں
مری تقدیر کا لکھا نمایاں ہوتا جاتا ہے

کہیں یوں بھی نگاہیں پھیر لیتا ہے کوئی شہرت!
مری ہستی کا شیرازہ پریشاں ہوتا جاتا ہے

شہرت بخاری

غزل

خرد ہر گام پر سمجھا رہی ہے
جوانی پھر بھی ٹھوکر کھا رہی ہے

تمنا دل میں بیٹھی جا رہی ہے
کلی جیسے کوئی مرجھا رہی ہے

تجھے مرنے سے "وحشت" اور اے دوست!
مجھے جینے پہ بھی شرم آ رہی ہے

الٰہی خیر میری آرزو کی
کلی پہ پھول بنتی جا رہی ہے

قیامت ہے قضا کی برق پائی
نظر آتی نہیں اور آ رہی ہے

مسرت ہے اک گریزاں حسن جیسے
کوئی دلہن کھڑی شرما رہی ہے

تمنا کا نتیجہ جانتا ہوں
طبیعت پھر بھی آئی جا رہی ہے

یہ کس نے بربطِ احساس چھیڑا
کہ رگ رگ میں نوا تھرا رہی ہے

جوانی کے رنگیلے گیت سنکر
محبت جھومتی ہے گا رہی ہے

یہ کون آیا تصور میں سہ مست
فضا مستی میں ڈوبی جا رہی ہے

کہاں ہو شربتی ہنستی سی آنکھو!
طبیعت زیست سے اکتا رہی ہے

ضمیرؔ اشعار میں رس ہو نہ کیونکر
کہ میرے دل میں کوئی گا رہی ہے

سید ضمیر جعفری بی اے

کلرک

"دفتر میں کام کے اوقات کیا ہوں گے؟"

"صبح نو بجے سے چھ بجے شام تک"

ایک سال پہلے کا سوال اور رائے بہادر کا وہ جواب اس کے کانوں میں اسی طرح گونج رہا تھا جیسے ابھی ابھی کہا گیا ہو۔ اس نے آنکھ اٹھا کر دفتری کلاک کی طرف دیکھا جس نے ابھی ٹن ٹن کر کے سات بجائے تھے۔ کلاک بدستور چل رہا تھا۔ سات بجا کر رک نہیں گیا تھا پھر وہ کیوں رک جائے۔ اور پیشتر اس سے کہ اس کی نظریں سوس کلاک سے میز پر منتقل ہوں۔ اس کا قلم دوات سے سیاہی لے کر سامنے پڑی فائل کے کھلے صفحہ پہ چلنے لگا۔

کلاک کی ایک آواز نے شنکر میں جو ستعدی پیدا کر دی تھی۔ دوسری آواز نے اسے فنا کر دیا۔ ساڑھے سات بجے کی "ٹن" ہوئی۔ اور شنکر کا قلم پھر رک گیا۔ اس نے جوانی میں نیم سفید ہو جانے والا سر اٹھا کر نہ رکنے والے کلاک کی جانب اور پھر اپنے سامنے پڑے ہوئے کاغذوں اور فائیلوں کے انبار کی جانب دیکھا۔ ابھی بہت کام باقی تھا لیکن یہ ختم کب ہوگا؟ یہ رائے بہادر کے دفتر کا کام۔ جو ان کے کرایہ داروں سے کرائے وصول کرنے کے لئے مقدمے لڑنے سے لیکر گھر میں آنے والے اُپلوں کو گننے تک پھیلا ہوا تھا۔

آج اسے چند دوستوں کے ساتھ سات بجے سینما دیکھنے جانا تھا۔ لیکن یہ کام ــــ

اس کی گہرے بھورے رنگ کی بڑی بڑی آنکھوں میں سرخی پھیل گئی۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور کرسی کی پشت پر اپنا بوجھ ڈال کر جیسے کچھ سوچنے لگا۔

لیکن کلاک نہیں رکا تھا اور اس کا کام ....

دن کی روشنی اور رات کے اندھیرے نے ایک دوسرے کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔ ان کے آخری قہقہے نے دور افق پر ایک سرخ رنگ کے چمکتے ہوئے بادل کی صورت اختیار کر لی۔ باہر سڑک پر سیر کرنے والے دوستوں کی ٹولیاں اور ان کے قہقہے موٹروں اور ٹانگوں کے شور و شغب فضا میں ایک گونج پیدا کر رہے تھے۔ اور اس شور کے اوپر ہی اوپر تیرتی ہوئی وہ باجوں کی سریلی آواز ــــ شائد کسی نئی فلم کی اشتہار بازی کے لئے جلوس نکالا گیا تھا۔ یا کوئی برات جا رہی تھی۔ کتنی مسرور ہے دنیا۔ لیکن رائے بہادر کا کلرک ــــــــ

"آخر اس کا کام کب ختم ہوگا؟"

رات کے اندھیرے نے آدھی دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ابھی تک نیچے سڑک پر سے کسی اِکے دُکے راہ گیر کے چلنے کی آواز آ رہی تھی۔ کبھی کبھی دوستوں کی کوئی قہقہہ نا منڈلی بھی گذر جاتی۔ تو کیا ابھی تک دوستوں کی مجلسیں گرم ہیں؟ اور اس کے اپنے دوستوں کی مجلس؟ ..... کیا وہ بھی ابھی تک کہیں بیٹھے ہوں گے ......؟ لیکن اس کا کام ......؟ یہ کب ختم ہوگا؟ نہیں دوستوں کی مجلس کب کی بکھر چکی ہوگی۔ اب جلدی سے کیا فائدہ .....؟ کام ختم ہی کیوں نہ کر لیا جائے ...... لیکن یہ ختم کب ہوگا؟

اور پھر ختم کیا ہی کیوں جائے؟ کیا کلرک کی زندگی کا مقصد یہی ہے کہ تیس پینتیس روپے ماہانہ کی خاطر زندگی کی تمام رنگینیوں اور تمناؤں کو ان موٹے موٹے اور پھٹی ہوئی جلد والے رجسٹروں کو کالا کرنے میں گم کر دے

اسے رائے بہادر کے ہاں نوکر ہوئے سال بھر ہو چکا تھا۔ اور رائے بہادر کا وہ اوقات کار کے متعلق روز اول والا جواب ابھی تک ایک تعبیر تشنہ خواب تھا۔ اول تو کام ہی ساڑھے سات آٹھ بجے سے پہلے ختم نہ ہونے پاتا۔ اور اگر ہو بھی جائے۔ تو اتنی دیر میں رائے بہادر ٹینس کھیل کر واپس آ چکے ہوتے اور اپنی تکان اتارنے کے لئے محض اس غرض سے دفتر میں بیٹھ جائے کہ ان کے دو تین کلرک ان کے سامنے نیم دائرے کی صورت میں دست بستہ کھڑے رہیں اور آنجناب اپنی بے معنی اور بدذوقی کی حامل باتیں سناتے رہیں۔

رائے بہادر یہ اسی میں راحت محسوس کرتے تھے کہ جب تک وہ رات کا کھانا کھا کر بستر پر دراز نہ ہو جائیں ان کے کلرک دفتر کی رونق بڑھاتے رہیں۔ شاید وہ یہ چاہتے تھے کہ شاید ملاقاتی کسی وقت بھی آ جائے تو اس پر رائے بہادر کی عظمت کا ویسا ہی اثر پڑے جیسا بیلی رام برادرز کی ۲۴ گھنٹہ سروس کا اس کے گاہکوں پر۔ ان کے دل میں کئی بار یہ خیال آیا تھا کہ کلرکوں کے ہوتے رات کو چوکیدار کی کیا ضرورت ہے؟ لیکن کلرکوں کو ناجائز تکلیف دینے کے خلاف ان کا ضمیر بغاوت کر دیتا تھا۔ جہاں ناجائز تکلیف دینا انہیں گوارا نہ تھا۔ وہاں انہیں ناجائز رعایت دینا بھی پسند نہ تھا چنانچہ ان کے ہاں ہفتہ وار، ماہوار یا سالانہ تعطیل کا کوئی ریکارڈ موجود نہ تھا۔ ہاں اگر کلرک کا کوئی قریبی رشتہ دار مر جائے۔ تو رائے بہادر اپنا اصول توڑنے سے بھی دریغ نہ کرتے تھے۔

یہ سب کچھ سوچتے سوچتے شنکر کی آنکھوں کے سامنے رائے بہادر کی شکل پھر گئی ...... ایک مکروہ شکل ..... جس پر حرص و طمع کی سیاہی پھیلی ہوئی تھی۔ جس کے قہقہے کی آواز کئی مفلسوں کی سوکھی ہڈیوں کے چڑچڑانے سے مرکب تھی جس کے گالوں کی سرخی اس کے کاشتکاروں کی آنکھوں سے بہنے والے خون سے لی گئی تھی اور جس کی پیشانی پر انسانیت کا ایک بھی خط نہ تھا لیکن جسے خدا کی ایک ہی نے سینکڑوں انسانوں کا مرجع بنا رکھا تھا۔ انسانیت ..... انسانیت کے لئے رحم و انصاف

لازمی ہیں اور وہ ان سے کورا ہے۔ اسی لئے ..... لیکن کیا ہم میں انسانیت ہے ۔؟ انسانیت کبھی شیطنت کے آگے سرخم نہیں کرتی۔ پھر ہم .....

ہم جو دن میں کئی کئی مرتبہ اس کے سامنے گڑگڑاتے ہیں۔ کیا ہم انسان ہیں۔ جو اس کے ہر روا و ناروا کو چپ چاپ برداشت کرتے ہیں۔ ہم سے وہ بہتر ہے اگر شیطان ہی ہے تو بھی ایک فاتح ہے۔۔۔ تڑاخ ..... شنکر کے ہاتھ میں قلم جانے کس جوش کے زیر اثر ٹوٹ چکا تھا۔

شنکر کے سامنے والی میز پر بیٹھے ہوئے بڑھے امین چند نے اپنے دادا کے وقت کی عینک کو جس کی ایک کمانی ابھی تک صحیح سلامت تھی۔ ناک کی گھوڑی سے ایک لمحہ کے لئے اٹھا کر اس چھوکرے کی جانب کچھ عجیب ڈھنگ سے دیکھکر کہا "شنکر کیا سوچ رہے ہو ؟ تمہارا کام کب ختم ہوگا ؟"

اس نے بڈھے کی جانب دیکھا جس کی بامعنی نگاہیں پکار پکار کر کہہ رہی تھیں ۔

"چھوکرے تم کس جھنجھٹ میں پھنس گئے ہو۔ یہاں اس دنیا میں ایسا ہی ہوتا آیا ہے۔ یہاں فاتح کا قانون ہی انسانیت اور انصاف کہلاتا ہے۔ یہ دنیا ہے .... حقائق کی ۔ تمہاری شاعری اور تصورات کی نہیں۔ تم شاعر مزاج ہو۔ ہی ۔ ہی ۔ ہی ۔ ہی ۔"

شنکر اس نگاہِ طنز کی تاب نہ لاسکا۔ اپنے سامنے پڑے کاغذوں کے انبار کی جانب دیکھنے لگا اور میز پر پڑے ہوئے ہر کاغذ پر جلی حروف میں لکھا تھا ۔

"تم شاعر مزاج ہو۔ احساسات کو زندہ رکھنے والے ۔ اور اس دنیا میں آئے ہو شاعری کرنے ...... ہا ۔ ہا ۔ ہا ۔ ہا ۔؟"

اس نے سر دھن لیا۔ آنکھیں بند کرلیں لیکن کانوں میں کوئی کہہ رہا تھا ۔

" رائے بہادر کا کلرک اور پھر اس قدر حساس ۔ او ۔ ہو ۔ ہو ۔ ہو ۔ ہو !"

اس نے کانوں میں بھی انگلیاں دے لیں۔ کیا ایک کلرک کے لئے حساس ہونا گناہ ہے کیا اسے ایک زندہ لاش بن جانا چاہیے۔ ایک لاش جسے سہانی برساتوں کی گھنگھور اور سرمئی گھٹائیں بسنت کے نیلے پیلے اور اودے پتنگ۔ ہولی کی رنگ پاشیاں کیسی بڑے تیوہار کے دن بیوی بچوں کا میلہ دیکھنے پر اصرار۔ یہ سب کچھ جسے اس دفتری قبر سے باہر نہ نکال سکے ۔ ایک لاش جس کا جسم تو زندہ ہو لیکن احساس مردہ ہو چکا ہو۔

میں ایسی کلرکی سے باز آیا۔ اگر شادی کی جائے تو بیوی کو گھر کی چار دیواری میں حبس بیجا میں کیوں رکھا جائے ۔ آخر نوکری کی غایت یہی ہے نا کہ خالی اوقات میں عیش سے زندگی بسر کی جائے ۔۔ خالی اوقات ۔۔۔ یہ خالی وقت کب ملیگا ۔۔ ؟ اخیر یہ کام کب ختم ہوگا ؟

اس نے سامنے بیٹھے ہوئے امین چند کی جانب دیکھا۔ وہ بوڑھا ہو چکا ہے۔ اُسے بیوی کے احساسات یا عیش سے کیا۔ لیکن بہاری لال تو ابھی پینتیس سال سے زیادہ کا نہیں اس کی بیوی بھی ماشاء اللہ خیر سے ابھی جوان ہی ہے۔ تو پھر اس کے احساس کو کیا ہو گیا ہے ؟

اس نے بہاری لعل کی جانب دیکھا جس نے نیلے رنگ کے رجسٹر کا خانہ پُری کرتے ہوئے اچانک سر اٹھایا لمحہ بھر کے لئے اس کی جانب دیکھا اور پھر اپنے کام میں منہمک ہو گیا لیکن اس ایک ہی لمحے میں اس کی نگاہیں شنکر کو جواب دے گئیں۔

"تم کیا جانو ؟ بھولے نوجوان تمہارے تصورات کی لہر ابھی تک دنیاوی حقیقت کی کسی چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش نہیں ہوئی۔ ورنہ تم ایسا نہ سوچتے۔ ہمارے احساسات کی راکھ میں سے اب بھی کبھی بھولے بھٹکے کوئی شرارہ تڑپ اٹھتا ہے ۔ کبھی کبھی ہمارے دماغوں میں بھی زلزلے کے چند جھٹکے محسوس ہوتے ہیں لیکن ان سب کی شدت اس گہرائی تک نہیں پہنچتی۔ جو بیوی بچوں کا پیٹ بھرنے کے خیال میں ہے ۔ لیکن تم خالی کیوں بیٹھے ہو۔ تمہارا کام کب ختم ہوگا ؟"

شنکر کی نگاہیں پھر جھک گئیں ۔ سامنے فائیلوں کا انبار لگا ہوا تھا۔ نیچے سڑک پر ایک سائیکل سوار گھنٹی بجاتا ہوا جا رہا تھا۔ گھنٹی کی آواز سے اس کی تیز رفتاری کا اندازہ ہو رہا تھا "اسے گھر جانے کی جلدی ہے۔ شاید گھر بیوی انتظار کر رہی ہوگی۔ اس کے بچے تو اب تک سو چکے ہونگے۔ اور کیا جانے بیوی بھی اونگھ رہی ہو۔ کھانا پروسنے کے لئے کئی مرتبہ سر دیچی کھولا ہوگا لیکن اس کا خاوند جلدی کیسے آجائے۔ آخر دفتر دفتر ہی ہے ۔ گو پیٹ پالنے ہی کے لئے دفتر جانا ہوتا ہے لیکن دفتر کا کام .... اس مقابلے پر پیٹ بھرنا مقدم نہیں ہو سکتا ۔ بہاری لعل کی بیوی بھی تو منتظر ہوگی ..... اور میری ہونے والی بیوی ......

لیکن یہ کام کب ختم ہوگا ..... ؟ یہ رائے بہادر کے دفتر کا کام ۔۔۔

دفتر سے باہر نکلتے وقت کوٹھی میں ایک موٹر داخل ہوئی ۔ شنکر نے دیکھنے کی کوشش کی کہ اس میں کون بیٹھا ہے۔ لیکن سامنے کی تیز بتیوں نے نگاہ خیرہ کر دی تھی۔ شنکر پھاٹک پار کر رہا تھا کہ کسی کے اونچی ایڑی والے بوٹوں کی "ٹھپ ٹھپ" گول کمرے میں سنائی دے رہی تھی اور ہوا کا کوئی آوارہ جھونکا اس کے لبوں سے نکلنے والے گیت کے چند بول شنکر تک پہنچا گیا ۔

"ندی کنارے کھڑی ہوں ساجن ۔۔۔ تیرے ملن کی ماری"۔

شنکر نے آواز پہچان لی۔ یہ رانی تھی۔ رائے بہادر کی چنچل لڑکی۔ شاید سنیما دیکھکر لوٹی تھی۔ کتنی حسین ہے وہ۔ اور باپ سے کس قدر مختلف ۔ وہ ایک بے کیف اور کڑوی دوائی کی بوتل ہے تو یہ نور کے سانچے میں ڈھلا ہوا پیمانہ جس میں شربت شراب کی صورت میں چھلک رہی ہے کہ اس میں رحم اور انصاف کا مادہ بھی بہت زیادہ ہے حُسن ہمیشہ رحمدل ہوتا ہے۔ اس روز اس کے طلائی نیکلس کی کئی کڑیاں ریت میں گر گئی تھیں شنکر نے بہت محنت سے ایک ایک کر کے ڈھونڈھ نکالیں۔ تو پھر ایک دھاگے میں پرو کر باندھ بھی دیا تو اس نے کس قدر لطف آمیز نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا تھا "منشی جی۔ آپ کتنے اچھے ہیں"۔ اور پھر اس کی وہ مسکراہٹ قریب ہی موتیا کے گملے میں ایک کلی چٹک پڑی تھی رانی نے اسے توڑا سونگھا اور بالوں میں لگا کر چلی گئی۔ اسی طرح بیباکانہ ہنستی ہوئی۔ لان کے صحن میں لگے ہوئے تمام پھول کھلے ہوئے تھے۔ رانی ہنس رہی تھی۔ اس نے سوچا وہ بھی اپنے آنگن میں پھولوں کا ایک پودا لگائیگا۔ اس نے پہلے بھی ایک دو مرتبہ اپنا کمرہ سجانے کی کوشش کی ہے لیکن ہر بار ماں یہی کہتی ہے ۔ "گھر کی سجاوٹ تو تیری بہو کے آنے پر ہی ہوگی" اور بہو لانے سے وہ ہمیشہ انکاری رہا جب اپنا پیٹ بھرنے کی ابھی کوئی اچھی سبیل نہیں تو بہو لانے کیا معنی ؟ رائے بہادر کی نوکری کا کیا بھروسہ۔ پرائیویٹ ملازمت ٹھہری۔ اور پھر اس جیسے بد سیرت مالک کی نوکری ۔۔ نہیں وہ یہ ملازمت نہیں کریگا یہاں اس کے تصورات کی دنیا آباد نہیں ہو سکتی لیکن آج رانی نے اس کا خیال پھر

بدل دیا۔ اس نے مجھے آپ کہکر بلایا ہے۔ آپ — کتنی خوش سیرت ہے۔ اس کی پیشانی باپ کی طرح شکن آلود نہیں۔ اس کے مسکراہٹ میں کھلے ہوئے لب شاید غصے کے مارے پھڑکنا نہیں جانتے۔ وہ صرف مسکرانا جانتے ہیں ۔۔۔۔ اور پھر ان کے صحن میں کھلے ہوئے پھول یقیناً اس کوٹھی میں حسین اور رحمدل انسان بھی رہتے ہیں۔ جو کلرکوں کو "آپ" کہہ کر بھی پکار سکتے ہیں۔ اور ان سے ہنس ہنس کر باتیں کرسکتے ہیں۔ اس کوٹھی میں اچھے آدمی بھی بستے ہیں مسکراتے چہروں والے اور پھر کوٹھی کے صحن میں کھلے ہوئے پھول ۔۔۔۔ وہ بھی اپنے آنگن کے لئے ضرور شگفتہ پھولوں کا ایک پودا لائیگا۔

چند ہی روز کے بعد وہ کہیں سے گلاب کی ایک قلم لے آیا۔ انہی دنوں اس کی ماں نے شنکر کے لئے ایک خوبصورت لڑکی کا رشتہ ڈھونڈھ نکالا منگنی ہوگئی۔ ماں شادی کی تیاریوں میں مصروف تھی شنکر نے گلاب کی جو قلم لگائی تھی۔ اس میں ایک کونپل پھوٹ پڑی تھی۔

اچانک شنکر کو ٹھوکر لگی۔ اس کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا سامنے موتی محل سنیما میں روشنیاں دھڑا دھڑ جل رہی تھیں۔ اسے پھر بہت دیر ہوجانے کا احساس ہوا۔ اس کی بوڑھی ماں کو کتنی تکلیف ہوتی ہوگی۔ جو بیٹے کے انتظار میں سو بھی نہیں سکتی۔ ایسی ملازمت بھی کیا ہوئی ؟

سامنے سنیما کے باہر ایک انگوری رنگ کی کار کھڑی تھی جس میں ایک ڈرائیور بیٹھا بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ آخر یہ بیچارا بھی تو ملازمت ہی کرتا ہے نا ۔ اس کی زندگی کلرک سے بھی بدتر ہے۔ کیا جانے اسے کب چھٹی ہوگی ہوسکتا ہے کہ مالک سنیما سے نکلے تو کسی شرابخانے میں جا بیٹھے اس بیچارے کی بھی بیوی ہوگی۔ وہ تو یقیناً انتظار نہیں کرتی ہوگی۔ کیونکہ ہر انتہا میں سکون ہوتا ہے لیکن یہ تو لالہ کشوری لعل کی کار ہے۔ سنا ہے کہ اسے سرمایہ داری کی نخوت چھو تک نہیں گئی۔ اپنے ملازموں کا بہت خیال رکھتا ہے ہوتا ہوگا۔ آخر سرمایہ داروں میں تو اچھے لوگ بھی ہوتے ہیں یہ ضرور خوبصورت ہوگا جیسی اچھی سیرت رکھتا ہے رانی بھی تو خوبصورت ہے نا ؟ ۔۔۔۔ وہ مسکراتا ہوا چہرہ اور اس کے صحن میں وہ کھلے ہوئے پھول۔ میرے پودے کی کونپل بھی اب کلی بن چکی ہوگی بس پہلے ہی دن اسے دیکھا تھا جب وہ پھوٹ رہی تھی۔ ادھر کئی دن سے دفتر جلدی جانا ہوتا ہے اور دیر سے آنا پڑتا ہے۔ اسے دیکھنے کی فرصت ہی نہیں۔ رانی کو بھی تو اس دن کے بعد سے نہیں دیکھا۔ وہ اس روز مسکرائے ہی جارہی تھی۔ شاید وہ ہر وقت مسکراتی رہتی ہے کیا اس لئے کہ اس کے صحن میں پھول ہر وقت کھلے رہتے ہیں لیکن اگر وہ دفتر کے کلرکوں کی ابتر حالت دیکھے۔ کیا پھر بھی اسی طرح مسکراتی رہے لیکن نہیں اس سے یہ توقع فضول ہے۔ ابھی کل ہی زلدو السوئیا سنا رہا تھا کہ چھوٹی بی بی نے اسے بیت مارا۔ وہ بوڑھا بیچارا — وہ کہتا ہے اسے کبھی ہنستے نہیں دیکھا تو کیا وہ صرف نوجوانوں ہی سے مسکرا کر باتیں کرتی ہے۔ اور "آپ" کہکر بلاتی ہے۔ پھر اسے کیا سمجھا جائے۔ انصاف پروری یا نفس پروری ۔۔۔۔۔

شنکر کے سامنے اندھیرا چھپتا جا رہا تھا سینما کی چکا چوند روشنیاں بہت پیچھے رہ گئی تھیں۔ سامنے میونسپلٹی کی مہربانی سے اندھیرے کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا۔

بوڑھے امیں چند نے اپنے دادا کے وقت کی عینک کو جس کی ایک کمانی ابھی تک صحیح سلامت تھی ناک کے اونچان سے ایک لمحہ کے لئے اٹھا کر اس کی جانب کچھ عجب ڈھنگ سے دیکھکر کہا۔

"شنکر تم ابھی بچے ہو۔ ان باتوں کو نہیں سمجھتے۔ رائے بہادر نے تمہیں جو برطرف کر دیا ہے تو ان کی مراد درحقیقت یہ نہیں بلکہ وہ تمہیں مایوسی کے اندھیرے میں دھکیل کر اس بات کا احساس کرا دینا چاہتے ہیں کہ ایسی غلطیوں کا انجام کیا ہوسکتا ہے۔ تاکہ تم آئندہ تم غلطی کے خوف سے لرزتے رہو۔ جاؤ دو تین مرتبہ گڑگڑاؤ گے تو ڈانٹ ڈپٹ ہی میں معاملہ نپٹ جائیگا جاؤ اسی وقت جاؤ۔ وہ اندر ہیں۔ وہاں جاکر گڑگڑاؤ۔ عورتوں کا دل جلدی پسیج جاتا ہے۔ شاید تمہاری سفارش ہوجائیگی۔

شنکر نے سر جھکا لیا۔ "عورتیں سفارش کردیں گی۔ وہاں رانی بھی تو ہوگی۔ وہ یقیناً اسے بچا لیگی۔ آخر غلطی ہی تو ہوگئی۔ اسے سنگین غلطی کہنے سے کیا حاصل ؟ سنگین یا معمولی کی تخصیص تو جب ہو اگر وہ جان بوجھکر کی گئی ہو غلطی محض غلطی ہی ہے

شنکر صحن میں داخل ہوچکا تھا سامنے ہی رانی کھڑی تھی مسکراتی ہوئی۔ اس کے ساتھ ایک خوبرو جوان نفیس سوٹ زیب تن کئے باتیں کر رہا تھا۔ دونوں کی آنکھوں میں ایک چمک تھی۔ جو کسی خاص وجہ سے پیدا ہوا کرتی ہے۔

شنکر ایک لمحہ کے لئے رکا۔ "یہ تو یہاں کھڑی ہے۔ وہاں میری سفارش کون کرے گا۔ کیا یہ اندر نہیں آسکتی۔ اس خوبرو جوان کو چھوڑ کر لیکن ۔۔۔۔ شنکر سوچتا جا رہا تھا لیکن رکا نہیں۔ برآمدے میں قدم رکھا ہی تھا کہ رانی کی آواز سنائی دی

"کہاں جارہے ہو"

"رائے بہادر کے پاس"

"کیا کام ہے ؟"

شنکر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ کیا بتائے کیا کام ہے ؟ اسے چنچل حسینہ تو اس وقت اکیلی ہوتی۔ تو شاید بتا بھی دیتا۔ تجھے نفس پروری سے فرصت نہیں۔ تو انصاف پروری کیا کریگی"

رانی نے کرخت آواز میں پھر پوچھا

"کیا کام ہے ؟"

"کچھ تھوڑا سا —"

"کچھ تھوڑا سا کے لگتے تمہیں پتہ نہیں کہ یہ وقت ان کے آرام کرنے کا ہے انہیں تھوڑی دیر تو چین کی سانس لینے دیا کرو۔ چلے آتے ہو منہ اٹھائے —"

شنکر نے جواب نہیں دیا چپ چاپ واپس آگیا۔ ایک سفید رنگ کا خوش نما پھول آگے کو بڑھا ہوا تھا۔ اس نے اسے توڑ لیا اور پھر مسل کے پھینک دیا۔ اس میں سے کسی کے خون کی رنگت دکھائی دے رہی تھی۔ سفید خوشنما — اس کے قریبی برآمدے سے رانی اور وہ نوجوان ہنستے ہوئے گزر گئے۔ صحن میں لگے ہوئے پھول کھلے ہوئے تھے۔

پرلی کیاری میں مالی مرجھاتے ہوئے پھولوں کے پودے اکھاڑ اکھاڑ کر باہر پھینک رہا تھا۔ شنکر کوٹھی سے باہر نکل گیا۔

" وہ اب معافی مانگنے نہیں آئے گا نہیں وہ اب یہ ملازمت نہیں کریگا ایسے بدسیرت مالک کی نوکری جس میں انسانیت نام کو نہیں نہیں یہاں اس کا جذبۂ انسانیت بغاوت کرتا ہے یہاں اس کے تصورات کی دنیا آباد نہیں ہو سکتی۔ وہ کچھ اور کریگا۔ اگر ملازمت ہی کرنا ہے تو کہیں کسی اور جگہ ڈھونڈھ لیگا سرمایہ داروں میں کئی اچھے لوگ بھی تو ہوتے ہیں۔ اور لالہ کشوری لعل بھی تو سرمایہ دار ہے۔

"آداب عرض —" شنکر نے چونک کر جواب دیا۔

" آداب عرض بھئی کہو مزاج اچھے ہیں۔ کیا دفتر سے آرہے ہو ؟"

" کونسا دفتر —"

شنکر نے حیران ہو کر پوچھا " کیسی بات کرتے ہو ؟"

" ہاں بھائی! مجھے لالہ کشوری لال نے برطرف کر دیا ہے "

" برطرف" شنکر کی آواز رک گئی " برطرف کس لئے کر دیا —؟"

" ارے بھائی سرمایہ داروں کی کیا پوچھتے ہو۔ انہیں وجہ جاننے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بیوی کے گاؤں کا کوئی لڑکا آیا تھا اسے ملازم رکھنا تھا۔ مجھے نکال دیا۔ اچھا مجھے ذرا جلدی ہے — آداب عرض —"

شنکر کتنی ہی دیر تک وہاں سے ہل نہ سکا۔ کشوری لعل نے بھی برطرف کر دیا یہی رام لعل کسی روز اس کے گن گاتا نہیں تھکتا تھا بھولا پنچھی۔ یہ نہیں جانتا۔ کہ شکاری خواہ خوبصورت ہو یا بدصورت وہ ہر حال میں شکاری ہے۔

سرمایہ داری نام ہے خون کے سفید ہو جانے کا۔ اس کی انگلیاں کچھ ایسی حرکت کر رہی تھیں۔ جیسے کسی سفید پھول کو مسل رہی ہوں۔

ہارن کی آواز نے اسے دہلا دیا۔ چوک کے عین درمیان وہ کھڑا تھا۔ اور اس سے چند قدم کے فاصلے پر کسی سرمایہ دار کی لینڈ و باڈی کار گھرڑ گھرڑ کر رہی تھی پھر زور سے ہارن بجا شنکر نے اس جانب دیکھا ۱۹۴۲ء ماڈل کی بیوک کے پچھلے ہوئے جبڑے اور جائنٹ ٹائر غصے سے کانپتے ہوئے پکار رہے تھے ہماری راہ سے ہٹ جاؤ نہیں تو کچلے جاؤ گے " ایک بار تو اس کی انسانیت بغاوت کرنے پر تل گئی۔ اس نے چاہا کہ اپنی انسانیت کو سرمایہ دار کی اس انسانیت سے عاری موٹر سے ٹکرا دے۔ اگر اس کی انسانیت اس پر غالب نہ آسکے تو ایسی انسانیت کا فنا ہو جانا ہی لازمی ہے لیکن اس کی ماں .... وہ بوڑھی ماں جو اس کے انتظار میں سو بھی نہیں سکتی۔ اور .... اس کی منگیتر جسے اس کے گھر کی سجاوٹ کرنی ہے —؟

وہ راہ میں سے ہٹ گیا۔ موٹر فاتحانہ انداز میں آگے بڑھ گئی۔

ایک ہفتہ امید و بیم کی کشمکش کا ایک ہفتہ گذر گیا شنکر چاروں طرف سے تھک ہار کر اور دوسری نوکری کی کوئی سبیل نہ پا کر پھر اسی کوٹھی میں داخل ہوا۔ دروازہ کے قریب ہی بھنگی ردی کاغذوں کے ڈھیر کو جلا رہا تھا۔ اوپر ہی اوپر شنکر کو اپنے ہاتھوں کا لکھا کوئی کاغذ دکھائی دیا۔ اس نے تجسس کے خیال سے اٹھا لیا جانے کب اس نے بیٹھے بیٹھے اپنے جذبات قلمبند کئے تھے۔ وہ پڑھنے لگا۔ اگر ان میں انسانیت نہیں تو کیا ہم میں ہے؟ ہم جو کئی مرتبہ ان کے سامنے ...... " سامنے سے رائے بہادر نکلتے دکھائی دیئے شنکر نے دست بستہ کچھ عرض کرنے کی اجازت چاہی۔

رائے بہادر نے جواب دیا۔

" اب تمہاری عرض بیہودہ ہے۔ ہم نے نیا آدمی رکھ لیا ہے —"

رائے بہادر اندر جا چکے تھے شنکر کے ہاتھ میں پرانا کاغذ تھا جس کی آخری سطر ابھی پڑھی نہیں گئی تھی۔ کہ

" ہم سے وہ بہتر ہیں۔ اگر شیطان ہیں۔ تو بھی فاتح ہیں "

" ہا — ہا — ہا —" صحن میں سے رانی کے قہقہوں کی آواز آرہی ہے۔ شنکر نے اس طرف دیکھا صحن میں رانی ہنس رہی تھی۔ وہاں تمام پھول کھلے ہوئے تھے۔ اس نے بھی اپنے آنگن میں گلاب کی ایک قلم لگائی تھی لیکن کئی روز سے اسے پانی نہیں دیا گیا تھا اور اس میں جو کلی لگی تھی۔ وہ پھول بننے سے پہلے ہی مرجھا گئی تھی۔

رامانند ساگر

غزل

تصور میں کسی کی پھر نگاہِ مست کار آئی
مری مجروح امیدوں کی دنیا میں بہار آئی

شگوفے مسکراتے ہیں کہ بیچارے نہیں سمجھے
فضائے گل چمن میں صورت ابر بہار آئی

بڑی رسوائیوں کے ساتھ بزم یار تک پہنچا
بڑی ویرانیوں کے ساتھ شام انتظار آئی

فرید اب تک دلِ مایوس کی حالت نہیں بدلی
نہ کچھ صبر و شکیب آیا نہ کچھ تاب و قرار آئی

حکیم فریدالدین فرید انگمیانوی

تانگے والا

"میرے تانگے نے میری زندگی میں ایک گہرا اثر ڈالا ہے۔ میرا تانگہ میری زندگی ہے میرے جیون کا ساتھی۔"

شروع شروع میں مجھے تانگہ کرنے میں کچھ دلچسپی نہ تھی۔ مگر جس طرح جُتا ہوا گھوڑا تانگے سے چھٹکارا نہیں پا سکتا میری حالت بھی اسی طرح تھی۔ میں بہت چاہتا کہ تانگے کے پہیوں میں چکر کھاتی ہوئی زندگی سے بھاگ جاؤں مگر مجھ پر اس زندگی کی گرفت اتنی سخت تھی جتنی لوہے کی سلاخ کی پہیوں پر۔ اور یہ گرفت جبھی ڈھیلی پڑ سکتی جب میری زندگی کی شاہراہ تانگے کے پہیوں کے نیچے سے تمام کی تمام پھسل جاتی۔

تانگہ سائیکل کے حادثے اکثر ہوتے رہتے ہیں مگر سائیکل والے بھی عجیب قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ ہر روز ہر وقت کوئی نہ کوئی حادثہ درپیش ہوتا ہے۔ چلانے والا تو کم و بیش بچ جاتا ہے مگر سائیکل کی جو صورت بن جاتی ہے۔ دیکھ کر بے اختیار ہنسی آ جاتی ہے۔ کبھی پہیہ کچلا جاتا ہے کبھی ہینڈل ٹوٹ جاتا ہے کبھی فریم کا ستیاناس ہو جاتا ہے۔ اور کبھی سارا سائیکل تانگے کے پہیئے کے نیچے سے یوں گذر جاتا ہے۔ جیسے بیلنے میں سے گنا۔ حادثہ ابھی وقوع پذیر برپا ہوتا ہے کہ ایکدم تانگے والے پر حملہ شروع ہو جاتا ہے۔ اور یہ حملہ صرف سائیکل والے کی طرف سے نہیں ہوتا۔ بلکہ ارد گرد کے تمام لوگ اتحادی بن جاتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے اندھے بن جاتے ہیں تانگے والے۔ انہیں تو دکھتا ہی کچھ نہیں کوئی کہتا ہے "کیوں بے ہوش سے نہیں چلایا جاتا" کوئی پکارتا ہے "سالے گورنمنٹ سے بھی تو نہیں ڈرتے" اور دوسرا کوئی جواب دیتا ہے "کیوں ڈریں گھر کا راج ہے" اسی دوران میں سائیکل والا بھی زخمی سائیکل والا بھی فسٹ ایڈ پہنچا کر تن جاتا ہے اس کے منہ سے زیادہ تر گالیوں کے بم چھوٹتے ہیں۔ "پاجی..... نزادہ۔ گدھا....." اور نہ جانے ان بموں کی کتنی قسمیں ہیں ایسے احول میں اگر تانگے والا کچھ بولے بھی تو کیا بولے؟ کوئی یہ تو سوچتا نہیں کہ قصور کس کا ہے؟ اگر سائیکل والے کی غلطی ہے تو تانگے والے نے گھوڑا کیوں نہ روکا؟ یہ کوئی نہیں سمجھتا کہ بے جان تو رک سکتا ہے مگر جاندار کو روکنے کے لئے وقت چاہئے۔ گھوڑے کو تو بریک نہیں لگ سکتی۔ اور پھر یہ بھی تو کسی کی عقل میں نہیں آتا۔ کہ تانگہ تو سڑک پر سیدھا اپنا راستہ پکڑے جا رہا تھا سامنے کون آیا تانگہ یا سائیکل؟ دوڑتے ہوئے تانگے میں اگر سائیکل والا سائیکل مارے تو یہ خطا کس کی؟ تانگے والے کی؟

یہی نہیں یہ جو سڑک پر لمبی تان کر سونے والے کتے ہوتے ہیں۔ ان کی بھی نرالی ضد ہے۔ سو دھتکارو لاکھ جتن کرو پہلے تو اٹھیں گے نہیں اگر اٹھ بھی گئے۔ تو رستے پرے اس بے فکری کے ساتھ ہٹتے ہیں کہ گویا کسی تانگے والے نے اسے جگایا ہی نہیں اور اگر سڑک پر دو کتے لڑ پڑیں تو اپنی تو تو میں میں تیسرے کی کوئی بات ہی نہیں سنتے سان کے علاوہ بیمار کتے تو خواہ مخواہ اپنی موت تانگوں کے پہیوں میں ڈھونڈتے ہیں۔ یہ قصور بھی تانگے والے کا شمار کیا جاتا ہے اور قانون کی زد میں بھی آہستہ چلنے والا تانگہ ہی آتا ہے تیز دوڑنے والی موٹروں کو کوئی پوچھتا بھی نہیں۔ جو فرسے کسی جاندار کو ختم کر کے نکل جاتی ہیں۔ اور لوگوں کو بعد میں خبر لگتی ہے کہ کوئی کتا پلا موٹر کی زد میں آ گیا ہے

میرے تانگے کے ساتھ بھی کئی حادثے ہوئے ہیں اور جن جن صورتوں میں میں نے جان بچائی ہے۔ وہ محض خدا کی مہربانی تھی۔ ایک دفعہ تو موٹر سے ٹکر ہو گئی کھلی سڑک تھی مگر شام ہی سے سیاہی زیادہ گہری ہو چلی تھی میں نے بتیاں جلا رکھی تھیں۔ دور سامنے سے مجھے کار آتی دکھائی دی اس کی بتیاں گل تھیں۔ اور وہ کچھ اس طرح پھرتی پھرتی آ رہی تھی کہ کچھ سمجھ میں نہ آتا کہ تانگا کس ہاتھ پر رکھوں۔ آخر کار میں نے ٹریفک کے عام اصول "بائیں ہاتھ چلو" پر عمل کیا مگر میری جان نکل گئی جب دیکھا کہ موٹر نے "دائیں ہاتھ چلو" پر عمل کر دیا ہے ٹکر یقینی تھی۔ کیونکہ اگر وہ کار روک لیتے تو میرا گھوڑا تو فوراً نہیں رک سکتا تھا۔ اور خصوصاً نہ رکنے کے بارے میں میرا گھوڑا مجھے پسند نہ تھا۔ اسے چار قدم پہلے روکتے تو تب جا کر معین جگہ پر رکتا۔ اگرچہ اس شام گھوڑے کو خدا نے سمجھ دی کہ روکنے پر فوراً رک گیا مگر کار والے صاحب سے خدا سمجھے۔ کار تانگے میں دے ماری۔ ان کی تو صرف مڈگارڈ ہی ٹیڑھی ہو گئی مگر میرے تانگے کی ایک لیمپ ٹوٹ گئی اور ایک پائیدان بھی اور قدرے گھوڑا بھی زخمی ہو گیا تھا۔ سواریوں کو جھٹکا تو محسوس ہوا۔ مگر کوئی خاص چوٹ کسی کو نہ آئی۔ کیونکہ ٹکر کے وقت تانگہ بالکل رک چکا تھا اب موٹر والا حسب عادت مجھ پر ٹوٹنا چاہتا تھا۔ کہ اچانک میرے تانگے میں سے ایک صاحب کچھ انگریزی میں بول اٹھے میں نے اس کے منہ سے صرف دو لفظ سمجھے "رائٹ اور لیفٹ" میری ہمت بندھ گئی۔ بولا "صاحب پہلے تو آپ کی بتیاں بجھی ہوئی تھیں اور دوسرے آپ لیفٹ پر نہیں چلے۔ مگر میں نے اپنے نقصان کے بارے میں کچھ نہ کہا۔ اس کے جواب میں کار والے نے کہدیا کہ ہماری مڈگارڈ ٹوٹ گئی ہے یہ کون بنائیگا؟" مجھے ایک آنریری وکیل مل گیا تھا۔ اس لئے مجھے بولنے کی حاجت نہ رہی معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ ایک خالی تانگہ آ رہا تھا۔ میری سواریاں اس نے لیں میں اپنے نقصان کی فکر میں لگ گیا۔

ایک اور حادثہ میرے ذہن میں گھسا ہوا ہے۔ ایک شام پانچ بج چکے تھے۔ وہ بچے جو دن بھر پنجرے میں پنچھیوں کی طرح اسکول میں رہتے ہیں۔ آزاد ہو چکے تھے اور محلے کے وہ لڑکے جو ان کی عدم موجودگی میں ادھر ادھر بیٹھے رہتے ہیں۔ اپنے گھروں سے نکل کر محلے کی گلیوں میں اکٹھے ہو چکے تھے شہروں میں کچھ ایسی بڑی سڑکیں بھی ہوتی ہیں جن کے دائیں بائیں چھوٹی چھوٹی گلیاں چکر کاٹتی آ ملتی ہیں میں ایسی سڑک پر گھوڑا دوڑائے جا رہا تھا۔ کیونکہ گاڑی کا وقت ہو چکا تھا۔ اور کافی انتظار و تلاش کے باوجود ریلوے اسٹیشن کی کوئی سواری بھی نہیں سکا تھا خالی تانگے کے ساتھ ساتھ میرا دماغ بھی کہیں سے کہیں دوڑ دوڑ جاتا خدا جانے میں کس سوچ میں تھا کہ پہیئے کے ساتھ اچانک کسی چیز کی ایک ہلکی سی ٹکر سے چونک اٹھا۔ ایک بچہ شدید طور سے زخمی ہو چکا تھا میں نے تانگہ روک لیا اور اتر کر بچے کی طرف لپکا۔ بھری سڑک پہ مجمع

ہوتے دیر نہیں لگتی اور مجمع کو دیکھکر تانگے والا کبھی حواس قائم نہیں رکھ سکتا اور خاصکر ٹریفک انسپکٹر کو موجود پاکر میں ڈر گیا میری خیر نہ تھی میرا جی چاہا کہ قبل اس کے کہ کوئی مجھ سے باز پرس کرے میرے پاس سننے کی قوت ہی نہ رہے میں پاگل ہوجاؤں یا میری روح نکل جائے۔

خدا جانے اس میں میرا قصور تھا یا نہیں مگر حکومت کے سامنے یہ ایک سنگین جرم تھا سرکار نے مقدمہ چلا دیا غریب تانگے والا لوگوں کی دھمکیوں سے بھی ڈر جاتا ہے یہاں تو حکومت کی گرمیں تھیں میری پہلے سے جان نکلی جا رہی تھی مختلف لوگوں کے بیانات اور شہادتیں لی گئیں سنچے والے نے بہت زور لگایا۔ ان باتوں نے میری موت کو میرے قریب تر لا کھڑا کیا مگر ٹریفک انسپکٹر کے صحیح بیان اور بے لوث شہادت نے موت کو مجھ سے اتنا دور کر دیا کہ میں سمجھنے لگا کہ مجھے دوبارہ ایسی زندگی مل گئی ہے اس نے بیان دیا کہ وہ حادثہ کے وقت موجود تھا کیونکہ وہ مذکورہ تانگے کے ساتھ ساتھ اپنے سائیکل پر آرہا تھا اور اصل واقعہ یوں ہے کہ ایک دوسرا بچہ مذکورہ بچہ کے پیچھے اسے پکڑنے کے لئے دوڑتا ہوا آرہا تھا اور مذکورہ بچے کی نظریں تعاقب کرنے والے بچہ کی طرف مڑی ہوئی تھیں۔ اس لئے اس کی ٹکر تانگے سے ضروری تھی۔ تانگے والا کسی صورت اس دوڑتے ہوئے اور غیر محتاط بچے کو نہ دیکھ سکتا تھا کیونکہ عام سڑک پر چلنے والا معلوم نہیں کرسکتا کہ ملحقہ گلی میں کیا ہورہا ہے۔ جبتک کہ کسی خاص طریقے یا آواز سے آگاہ نہ کیا جائے۔ اس لئے میرے نزدیک تانگے والا بے قصور ہے اور یہ غلطی مذکورہ بچے کی ہے یا اس بچے کی ہے۔ جو اس کے تعاقب میں دوڑ رہا تھا جسمانی طور پر تو میں اس مقدمہ سے بچ گیا۔ مگر میرے ذہن کو ایک ایسی سزا دی گئی تھی جس کی شدت جسم کی بڑی سے بڑی سزا سے بھی کم تھی میں نے ایک بچے کو زخمی کیا تھا وہ چلنے کے قابل بھی نہیں رہا تھا اور اس کا ایک ہاتھ بھی ناکارہ ہوگیا تھا۔ اب اس کی کیا زندگی ہوگی؟ سہارے کا جینا بھی کوئی جینا ہے۔ سہارا چھوٹا تو پھر کچھ بھی نہ رہا۔ کون ہے جو دوسرے کا بار اٹھائے پھرے۔ مجھے تفکرات کھائے جاتے تھے۔ میری طبیعت سنجیدہ ہوگئی میرے صفحۂ لب سے ہنسی کے حروف مٹا دیئے گئے میں اکثر سوچتا ہوں کہ خدا نے مجھے یہ سزا کیوں دی ہے؟ میں تو بے قصور ہوں۔ ہم حکومت اور لوگوں کی نظروں میں کیوں مجرم قرار دیئے جاتے ہیں اور اس طرح ہماری زندگیاں کیوں بے کیف بنائی جاتی ہیں۔ مجھے ان لوگوں کی زندگیوں پر رشک آتا ہے جو میرے تانگے میں بیٹھے ہیں۔

مجھے وہ بنیا خوب یاد ہے جو سٹی پارک سے واپس آرہا تھا۔ بھاری بھرکم اور پاپیادہ۔ بیچارا ہانپتا ہوا آرہا تھا۔ دھوپ بھی تیز ہوچکی تھی۔ بڑی توند والے بڑے دھن وان ہوتے ہیں۔ تجوریاں کی تجوریاں بھری پڑی ہیں۔ اور پھر بھی روپیہ ہے کہ ان کی طرف پانی کی طرح بہا چلا آرہا ہے۔ سچ ہے روپیہ روپے کو کھینچتا ہے مگر اس پر بھی یہ لوگ تانگے والے سے یوں لڑتے جھگڑتے ہیں کہ بیچارے پیٹ سے کاٹ کر کچھ دے رہے ہیں میں گول سڑک سے مڑ کر اس طرف سے واپس آرہا تھا کہ بنئے نے پیچھے کی طرف مڑ کر میری طرف دیکھا۔ میں نے جان لیا کہ یہ شخص ضرور تانگے پر سوار ہوگا میں نے رفتار کم کر دی۔ اس نے کہا۔ "بھائی لے چلو گے؟" میں نے دل میں کہا تم پیسے سے مجھے بھی خرید سکتے ہو۔ یہ تانگہ کیا ہے؟" میں نے جواب دیا "سیٹھ جی! آپ ہی تو غریبوں کے پالن ہار ہیں" سیٹھ جی کچھ رعونت سے ساتھ تانگے میں بیٹھ گئے سو گیا بیٹھے میرے دل پہ ایک بار بیٹھ گیا سیٹھ جی کا ذہن کچھ کاروباری جولانیاں کھا رہا تھا۔ مگر میرا ذہن مجھے کوڑے لگا رہا تھا چار پیسے اور اتنا بھاری بوجھ! سیٹھ اگر زیادہ کرایہ دیدے تو کیا ہرج ہو؟ دریا سے ایک قطرے کی بجائے دو قطرے نکل جائیں تو کیا کمی ہو مگر نہیں یہ ہماری اپنی کمزوری ہے اگر ہم انہیں تانگوں میں سوار نہ کریں تو ان کی چربی پگھل جائے۔ اور یہ توندیں پچک کر پیٹھ سے جا لگیں لیکن یہ کیسے ہوسکتا ہے اگر ہم یوں کریں تو ہمارے پیٹ ان کی توندوں سے پہلے پیٹھ کو جا لگیں۔ ہم ان کے خلاف کوئی قدم بھی تو نہیں اٹھا سکتے۔ کیونکہ ہماری انجمنیں اور سبھائیں بھی تو ان سیٹھوں ساہوکاروں کے ہاتھوں میں چل رہی ہیں۔ ہم مزدوروں اور تانگے والوں کا تو نام ہی ہوتا ہے اور ہم کر بھی کیا سکتے ہیں۔ اور جنہیں چار سواریوں کے پیسے گننے کی سدھ بدھ نہیں۔ اور یہ یونین تو ..... "ٹھہرو بھائی یہاں اتار دو" اس نے کہا میرے ذہن کی دوڑیں سمٹ کر ایک ہی مرکز پر آگئیں۔

مجھے یہ بھی تو یاد ہے کہ جبکہ تھانیدار صاحب نے میرے تانگے کی سواری کی اور منزل مقصود پر اتر کر یوں چلے گئے۔ جیسے وہ اپنے تانگے پر آئے تھے میں کچھ کہنے والا تھا مگر الفاظ حلق میں اٹک گئے پیسے تو ملنے سے رہے۔ الٹی ڈانٹ ڈپٹ مفت کی سوغات ملتی طبیعت پر جبر کیا۔ اور گھوڑے کو تھپکی دیتے ہوئے چلدیا۔ آخر تانگے والا تھا۔

مگر ہم غریب غریبوں پر بھی تو رحم نہیں کھاتے۔ مجھے وہ واقعہ یاد ہے جب میں ریلوے سٹیشن کو جا رہا تھا اور کسی نے راستے میں کہا "کیوں بھئی کیا لوگے؟" میں نے رفتار کم کردی میرے تانگے میں ایک آدمی کی جگہ خالی تھی میں نے کہا "چار پیسے" اس نے کہا "دو پیسے لیلو" میں نے کہا "اپنی شکل بھی دیکھی ہے" وہ بیچارہ اپنا سا منہ لیکر رہ گیا اور میں نے تانگا تیز کر دیا۔ مجھے آج احساس ہو رہا ہے کہ میں نے کتنا سخت جواب دیا تھا۔ مجھ سے یہ سخت اور روکھا جواب سنکر وہ اسٹیشن کی طرف دوڑتا ہوا آرہا تھا شاید اس کا کوئی عزیز بیمار ہوگا۔ یا اسے کسی حاکم کے سامنے پیش ہونا ہوگا اگر میں اسے مفت سوار کر لیتا تو میں اس پر کتنا احسان کرتا اگر اس کے پاس چار پیسے ہوتے یا دے سکتا تو وہ ضرور دے دیتا۔

کبھی کبھی ہم دوسرے لوگوں کی خوشیوں میں بھی شریک ہوجاتے ہیں۔ مگر یہ تانگے کی خوشی پھیکی اور بے اثر ہوتی ہے۔

جب میں کسی کو دریا پہ لے جاتا ہوں۔ تو مجھ میں ایک ہیجان پیدا ہوجاتا ہے۔ کتنی خوشی ہوتی ہے جب وہ پرہمی شہر کی دھول سے دور کسی دریا کے کنارے نکل جاتے ہیں جہاں پہنچکر وہ وقتی طور پر سماجی اور قانونی بندھنوں سے کچھ کچھ آزادی محسوس کرتے ہیں۔ جہاں کی کھلی ہوا اشتعال انگیز ہوتی ہے اور جہاں پانی کی لطیف لہریں دلوں کو گدگداتی ہیں اور جہاں زندگی پرکیف اور رنگین ہوتی ہے میں بھی تو دریا پر ان کے ساتھ جاتا ہوں مگر ایک خالی پیٹ آدمی کی طرح جس کی نظروں میں فطرت کی رنگینیاں کچھ کشش نہیں رکھتیں۔ نہ جانے وہ ان آزاد لمحوں میں زندگی کی کن راہوں کو پاٹتے ہیں مگر مجھے اپنی زندگی کے وہ لمحے تانگے میں اونگھتے اونگھتے کاٹنے پڑتے ہیں۔

اور کبھی کبھی جب میرا تانگہ کسی بارات کو لیکر چلتا ہے تو میں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ میرے تانگے میں پھول لدے ہیں اور پھر جب ساتھ والے تانگے پر طبلے کی دھپ

دھوپ میرے گھوڑے کے ٹاپوں سے ہم آہنگ ہوتی ہے اور سڑک پر موسیقی بکھری جاتی ہے میں اس وقت بھول جاتا ہوں کہ میں تانگے والا ہوں میں اپنے آپ کو بارات کا ایک فرد تصور کرتا ہوں مگر جب وہ اتر جاتے ہیں۔ تو میرا تانگہ پھر بھاری ہو جاتا ہے میں محسوس کرتا ہوں کہ مجھے چھاؤں سے اٹھا کر دھوپ میں ڈال دیا گیا ہے۔

اسی طرح میری زندگی کا پہیہ چکر کھاتا رہتا ہے۔

آہ! ایسے لوگوں کی زندگیاں تانگے کے پہیئے میں کیوں نہیں جکڑ دی جاتیں میں کیوں انہیں زندگی کی مختلف منزلوں پر لے جاتا ہوں، ان کی دنیا کیوں وسیع ہے؟ مگر میری دنیا شہر سے ریلوے سٹیشن تک اور وہاں سے شہر کی مختلف گلیوں تک کیوں محدود ہے؟ تیز رفتار پہیئے رکھتے ہوئے بھی میں ان حدود کو عبور نہیں کر سکتا میری زندگی صرف اپنے محور پر گھوم رہی ہے میرے تانگے کے پہیے کی طرح۔

دلشاد کلانچوی ایم اے

غزل

آنکھ سے دیکھا ہے کیا کیا کچھ بیاں کیا کیجئے
اک جہاں کو درپئے آزارِ جاں کیا کیجئے

یہ حوادث کا تواتر یہ مصائب کا ہجوم
آرزوئے زندگئ جاوداں کیا کیجئے

باغِ ہستی میں کہ طوفانِ حوادث ہے بپا
زحمتِ عزم بنائے آشیاں کیا کیجئے

ہر کسی سے شکوۂ اہلِ جہاں کا فائدہ
ہر کسی سے شکوہ اہلِ جہاں کیا کیجئے

کیجئے خود ہی سبیلِ ابتدائے انقلاب
انتظار انقلابِ آسماں کیا کیجئے

مہربانی رحم کا ہے دوسرا نام اے وفا!
مہربانی پر محبت کا گماں کیا کیجئے

میلارام وفا

غزل

نگاہِ حسن کو میں کامیاب پاتا ہوں
جہانِ عشق میں اک انقلاب پاتا ہوں

جفا میں فرد وہ ہیں میں وفا میں ہوں یکتا
نہ اُن کا مثل نہ اپنا جواب پاتا ہوں

اب اس کو اور کہوں کیا بجز فریبِ نظر
کوئی حجاب نہیں اور حجاب پاتا ہوں

یہ انتظار کا عالم یہ شوقِ نظّارہ
کہ اپنی آنکھوں کو محرومِ خواب پاتا ہوں

ہے اُن کے حسن کا پرتو کہ میرا حسنِ نظر
ہر ایک ذرہ میں اک آفتاب پاتا ہوں

سکوں شناس ہوا بھی جو دل تو کیا حاصل
سکونِ دل میں بھی اک اضطراب پاتا ہوں

جہاں کا رنگ بدلتا ہے ہر گھڑی نیساں!
ہر ایک سانس میں اک انقلاب پاتا ہوں

نیساں اکبرآبادی

قطعات

کیا گوہرِ شاہوار، ناسفتہ رہیں؟
داناؤں کے افکارِ حسیں، خفتہ رہیں؟
اے ہمتِ مردانہ! سخن ہائے دقیق
کیوں دہشتِ ابلہاں سے ناگفتہ رہیں؟

آفاق کے رخ پر ہیں نگاہیں تیری
کونین کے سینے میں ہیں راہیں تیری
پھولوں ہی پہ کب حصر ہے اے روحِ بہار
کانٹوں کے گلے میں بھی ہیں باہیں تیری

اے نوعِ بشر، عقدہ کشائے فردا
اے مشعلِ محرابِ سرائے فردا
مردانہ قدم بڑھا سوئے اوجِ کمال
اے "بندۂ" امروز و خدائے فردا

تابش سے فضا چمک رہی ہے گویا
ہیرے پہ کرن جھلک رہی ہے گویا
یہ قد کی بلندی، یہ جھکنا مکھڑا
نیزے پہ انی دمک رہی ہے گویا

جوش ملیح آبادی

غزل

غمگیں فضا کو عشق سے بھڑکا رہے ہیں ہم
تاریکیٔ حیات کو چمکا رہے ہیں ہم

دل اعتبارِ دوست سے بہلا رہے ہیں ہم
ہر روز اک فریب نیا کھا رہے ہیں ہم

دم آ کے رک گیا مری آنکھوں میں وقتِ نزع
کس نے یہ دی صدا کہ ٹھہر آ رہے ہیں ہم

مے خانۂ جمال سے پی تھی کبھی مگر
ابتک اسی سرور سے لہرا رہے ہیں ہم

اے دوست تابہ کے یہ تری پردہ داریاں
بے ننگ و نام دیکھیے ہوتے جا رہے ہیں ہم

پیشِ نظر ہے کس کا جمالِ جہاں فروز
بے کیف مہر و ماہ کو بھی پا رہے ہیں ہم

مدت سے درد و کرب میں کٹتی ہے زندگی
اس مستقل عذاب سے گھبرا رہے ہیں ہم

اس آستاں پہ پھر ہے جبیں اپنی سجدہ ریز
افسانہائے عشق کو دہرا رہے ہیں ہم

ہے ان سے اب شکایتِ جور و جفا فضول
اپنے کئے کی آپ سزا پا رہے ہیں ہم

دل کے لئے جو مایۂ تسکیں ہے اے فدا
دل کو اسی کی یاد میں تڑپا رہے ہیں ہم

سری کرشن فدا

رُوسی کِسان

دشمن کی توپوں کی بھیانک آوازیں دور و نزدیک آتی ہوئی سنائی دے رہی تھیں۔ گریگور وسکیف کھانا کھا رہا تھا کہ اسے معلوم ہوا دشمن گاؤں کے بہت قریب آ گئے ہیں۔ اس نے کھانا سامنے سے اٹھوا دیا اور اُٹھ کر کمرے میں ٹہلنے اور سوچنے لگا۔

"وہ بہت قریب آ گئے ہیں پیارے"! اس کی بیوی ایرنیا نے بظاہر سرسری لہجے میں اسے مخاطب کیا مگر اس کی بھوری آنکھیں تشویش کو نہ چھپا سکیں۔ دفعتاً اسے کچھ خیال آیا اور وہ کہنے لگی۔ "مگر ہمیں ڈرنا نہیں چاہئے بلکہ ہر خطرے کے مقابلے کے لئے تیار رہنا چاہئے" اور اس کی آنکھوں میں بہادری کی چمک پیدا ہو گئی۔ میز کے پاس سے اُٹھ کر وہ کمرے کے دوسرے کونے میں پہنچی جہاں ان کا چار سالہ بچہ بورِیس پالنے میں میٹھی نیند سو رہا تھا۔ ایرنیا نے پالنا ہلا دیا اور لوٹ کر اپنے شوہر سے کہنے لگی "تم میری اور بورِیس کی فکر نہ کرو۔ پگڈنڈی کی راہ سے ٹولا کا فاصلہ بہت کم ہے میں بورِیس کے ساتھ اسے آسانی سے طے کروں گی اور پھر میں اکیلی بھی تو نہ ہوں گی، ماریا دوسری عورتیں ان کے بچے نیز سرکاری محافظ سبھی ہوں گے پھر ڈر کاہے کا"!

"گاؤں چھوڑنے سے پہلے تمہیں بہت کچھ کرنا ہے مگر افسوس ننھے بورس کی وجہ سے میں تمہاری مدد کے لئے رُک نہیں سکتی — اور ابھی تو اطلاع بھی نہیں آئی، نہ جانے کتنا انتظار کرنا پڑیگا؟ ایرنیا نے بات ختم کی اور اس کی انگلیاں اس کے سیاہ ملائم بالوں میں کنگھی کرنے لگیں۔

"ہاں ارنیا تم سچ کہہ رہی ہو۔ یہ انتظار کٹھن ضرور ہے مگر ہم بہرحال وہی کریں گے جو کامریڈ سٹالن نے کہا ہے" گریگور نے طویل خاموشی کے بعد سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔

"تم بورِیس کو لے کر جاؤ۔ جب میں اپنا کام ختم کر لونگا۔ تو ٹولا میں تم سے آ ملوں گا۔ لیکن پہلے مجھے اپنا فرض انجام دینا ہے"! یہ کہتے کہتے اس کی نگاہیں گھر کی خوبصورت دیواروں اور قیمتی فرنیچر کو دیکھتی ہوئی باہر گیہوں کے لہلہاتے ہوئے کھیتوں کی طرف گئیں اور اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ وہ سوچنے لگا۔ یہ گھر — یہ ننھا حسین گھر جو یورال کی خوبصورت پہاڑیوں کے کنارے سر اُٹھائے کھڑا ہے اور جس کے چاروں طرف گیہوں کے ہرے بھرے کھیت لہلہا رہے ہیں — ایرنیا اور اس نے اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے۔ شادی کے بعد سے برابر وہ یہیں رہے ہیں سُکھ اور خوشی کے پانچ سال انہوں نے اسی گھر میں ہنستے کھیلتے گذارے ہیں۔ ان کی ازدواجی زندگی کی حسین یادگار — ننھا بورِیس — یہیں انہیں ملا ہے یہیں رہکر خود اپنی محنت اور لیاقت سے وہ اس علاقے کی ۴۳ زرعی انجمنوں (Collective Farms) کا نگرانِ اعلےٰ (Director) مقرر ہوا ہے یہاں اس کی زندگی ہر طرح سکھی اور مطمئن رہی ہے۔ مگر آج ...... ؟؟؟

آج اس کا یہ گھر، اس کے لہلہاتے ہوئے کھیت، اس کی آئندہ زندگی کی امیدیں اور اس کے پیارے بورِیس کا مستقبل سب کچھ برباد ہونے والا ہے۔ آج اس کی ہر وہ شے جسے وہ اپنی جان سے زیادہ عزیز سمجھتا ہے۔ اس سے چھن جانے والی ہے۔ یہ سوچ کر اس کا دل بیٹھنے لگا مگر پھر اسے خیال آیا کامریڈ اسٹالین کی پالیسی ہی بہتر پالیسی ہے۔ اسی پر چل کر ہم اپنے ملک کو ہمیشہ کی غلامی سے بچا سکتے ہیں مجھے یہ سب کچھ کرنا ہی ہوگا۔ روس کی آزادی اور حریت کے لئے اپنا سب کچھ میں خود اپنے ہاتھوں سے برباد کر دوں گا — ہاں اس کے سوا کوئی چارہ نہیں !!!

مگر ایرنیا اور بورِیس — ایرنیا اور بورِیس یقیناً سلامتی سے اپنا سفر طے کر کے محفوظ جگہ پہنچ جائیں گے اور اپنا فرض انجام دینے کے بعد میں بھی ان سے جا ملوں گا۔ پھر اس نے سوچا میں اپنے بچے اور بیوی سے کتنی گہری محبت کرتا ہوں پل بھر کے لئے بھی کبھی ان سے جدا نہیں ہوا مگر آج اس بے سر و سامانی میں اتنے شدید خطروں کے باوجود میں انہیں تنہا بھیج دینے پر مجبور ہوں — مگر مجھے حکم مل چکا ہے اور میں اسے ضرور بجا لاؤں گا"۔

گریگور نے چہل قدمی جاری رکھی اور اس کا دماغ تجویزوں اور ارادوں کو بناتا بگاڑتا رہا — دشمن کی توپوں کی گرج زیادہ بھیانک ہوتی جا رہی تھی — وہ بالکل قریب آ گئے تھے!

(۲)

دفعتاً کمرے کا دروازہ زور سے کھلا اور میکائیل بریانسکوف ہاتھ میں ایک "اندھی" لالٹین لئے اندر داخل ہوا۔

"وقت ہو گیا ہے پیارے"! اسے دیکھتے ہی ایرنیا نے گریگور کو مخاطب کیا اور بورِیس کو پالنے سے اٹھا کر اس کے پھول سے رخسار چومنے لگی۔

"کیا خبر ہے میکائیل"؟ گریگور نے نووارد کسان سے پوچھا۔

"وہ بہت قریب آ گئے ہیں گریگور، عورتوں اور بچوں کو فوراً بھیج دینا چاہئے اب تم بھی ایرنیا اور بورِیس کو رخصت کر دو۔ پہاڑی پگڈنڈی کی راہ سے یہ الیکس ارلاف سے جا ملینگے! اور وہ ان سب کو خفیہ راستے سے ٹولا پہنچا دیگا —" کسان نے لالٹین میز پر رکھ کر جواب دیا۔

"جرمن تیزی سے بڑھتے چلے آ رہے ہیں۔ اور میرا خیال ہے صبح سے پہلے ہی وہ یہاں پہنچ جائیں گے"۔

گریگور کو خاموش دیکھ کر کسان نے اس کے بازو کو ٹھوکا دیا اور کہا: "اب سوچنے کا وقت نہیں ہے میرے دوست! انہیں رخصت کرو اور میرے ساتھ آؤ! ابھی ہمیں بہت سے کام کرنے ہیں"

"رخصت .... پیاری ایرنیا رخصت" گریگور نے کانپتے ہوئے ہونٹوں سے سوئے ہوئے بورِیس کو بوسہ دیا — وہ بہت سی باتیں کرنا چاہتا تھا مگر تسلی کا ایک لفظ تک نہ کہہ سکا اسے اپنے حلق میں کچھ پھنستا ہوا محسوس ہو رہا تھا اس کی پلکوں میں رُکے ہوئے آنسو تیزی سے بہنے لگے!

"رخصت — پیارے سرتاج، خدا تمہاری حفاظت کرے اور ٹولا میں ہم سے ملا دے"

سسکتی ہوئی ایرینیا نے اپنے شوہر کو حسرت سے دیکھا اور روتی ہوئی باہر نکل گئی۔

دوسرے ہی لمحے گرگیور نے پٹرول کا ٹین کھولا اور کمرے میں پڑے ہوئے سامان پر ــ جو میکائیل نے اکٹھا کر دیا تھا ــ پٹرول چھڑک کر آگ لگا دی ..... اور جب وہ کھیتوں میں بھاگے جا رہے تھے۔ دیواروں کے چٹخنے کی آوازیں ان کے کانوں میں آئیں مگر گرگیور ایک بار بھی پیچھے مڑ کر وہ بھیانک منظر نہ دیکھ سکا۔ لیکن چاروں طرف کی اس آگ سے وہ کیسے آنکھیں بند کر لیتا جو اس کے ساتھی کسانوں کے گھروں اور کھلیانوں کو جلا رہی تھی؛

گھروں کو جلا کر گرگیور اور اس کے ساتھی کسان کھیتوں میں پہنچے اور لہلہاتے ہوئے کھیتوں کو برباد کرنے میں مشغول ہو گئے۔ یہ اسکیم انہوں نے اسی وقت بنا لی تھی جب پہلی بار اسٹالین نے اپنی "مشہور پالیسی" (TOTAL) کا اعلان کیا تھا مگر لہلہاتی ہوئی کھیتی کو برباد کرتے وقت کسانوں کے دلوں میں غم و غصہ اور انتقام کی آگ کے شعلے بھڑک اٹھے کیونکہ بہت جلد وہ وقت آنے والا تھا جب وہ اناج کاٹتے اور ان کے کھلیانوں میں غلے کے ڈھیر لگ جاتے لیکن درندہ صفت جرمنوں نے ان کی ساری محنت برباد کر دی اور آج وہی ہاتھ اس اناج کو برباد کرنے پر مجبور ہیں جنہوں نے اسے پیدا کیا تھا۔

یکایک اسے خیال آیا اب وقت آ گیا ہے کہ جس قدر جلد ممکن ہو یہاں سے چل کر اپنی بیوی بچوں کے پاس تولا میں پہنچ جایا جائے ــ لیکن شمالی گھاٹی کی فصل ابھی تک باقی تھی!

دشمن کی توپوں کی آواز دم بدم قریب آ رہی تھی اور جرمن ہوائی جہاز بھی نظر آنے لگے تھے جو آتشیں بم برسا رہے تھے۔ یہ دیکھ کر گرگیور نے اپنے ساتھیوں سے کہا: "تم سب پہاڑیوں میں چھپتے چھپاتے تولا کی طرف نکل جاؤ۔ تھوڑی ہی دیر میں میں بھی آتا ہوں۔ گھاٹی کی فصل برباد کرنی ضروری ہے اور یہ کر کے میں ابھی تم سے آ ملوں گا۔

(۳)

گرگیور نے اپنا کام ختم کیا ہی تھا کہ دو جرمن سپاہی سامنے سے نمودار ہوئے۔ ان میں سے ایک نے فائر کیا اور گرگیور زخمی ہو کر گر پڑا۔ جب وہ گرگیور کے قریب آئے تو انہوں نے دیکھا کہ اس کے شانے پر گولی لگی ہے وہ درد سے کراہ رہا ہے مگر وہ اٹھ کھڑا ہوا اور وہ اسے قیدی بنا کر اپنے ساتھ لے گئے۔

جرمن کیمپ میں پہنچ کر گرگیور نے دیکھا کہ ایک ہیبت ناک اور کریہہ منظر جرمن افسر ایک بڑی میز کے سامنے بیٹھا ہے اور میز پر اس ضلع کا نقشہ پھیلا ہوا ہے۔

"تم جرمن زبان بول سکتے ہو؟" جرمن افسر نے رعب دار آواز میں پوچھا۔

"ہاں" گرگیور نے جواب دیا۔

"تم اس ضلع کی زرعی انجمنوں کے نگران اعلیٰ گرگیور وسکیف ہو؟" جرمن نے گرگیور کے چہرے پر اپنی بھیانک نظریں جما کر سوال کیا۔

"ہاں" گرگیور نے بے پروائی سے جواب دیا۔

"تمہیں میری بات کا جواب دیتے وقت مجھے 'کپتان بہادر' کہنا چاہئے" غضبناک جرمن افسر نے گرگیور کے معکے جواب سے چڑ کر کہا: "مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ تم نے گاؤں کی ہر چیز برباد کر دی ہے حالانکہ یہ بدترین قسم کا جرم ہے اور اس کی سزا موت ہے!" اور اس کے ہونٹوں پر شیطانی مسکراہٹ کھیلنے لگی: "مگر ہم تمہیں معاف کر دینگے۔ اگر تم تولا جانے کا خفیہ راستہ ہمیں دکھا دو ــ ہاں، شاباش فوراً اپنی جان بچانے کا سامان کر لو!"

گرگیور کی تیوری چڑھ گئی اور جرمنوں کو غضبناک نظروں سے گھورتے ہوئے وہ مضبوط آواز میں کہنے لگا: "کپتان بہادر! میں غدار نہیں ہوں۔ ایک روسی کسان کسی حال میں بھی اپنے ماتھے پر یہ کالک نہیں لگا سکتا!"

جرمنوں نے غصے اور نفرت سے اپنے ہونٹ چبائے اور ان کا افسر چلایا: "تب تو تمہیں گولی سے اڑانا ہی پڑے گا" مگر فوراً ہی اس کے ہونٹوں پر کسی شیطانی ارادے کی جھلک نمایاں ہوئی اور اس نے رک رک کر کہا: "لیکن ہمارے پاس ایک ایسا 'آلہ' بھی ہے جو تمہیں اپنا یہ خیال بدلنے پر مجبور کر سکتا ہے۔ سمجھے!" ساتھ ہی وہ چلایا: "انہیں اندر لاؤ" اور زور زور سے قہقہے لگانے لگا۔

گرگیور یہ دیکھ کر سر سے پاؤں تک کانپ اٹھا کہ ایرینیا پولیس کا ہاتھ پکڑے ایک چھڑی پر اپنے جسم کا بوجھ ڈالے کچھ لڑکھڑاتی ہوئی اندر آ رہی ہے اور دونوں کے پیچھے ایک جرمن سارجنٹ بھی ہے جس کے ہاتھ میں بھرا ہوا پستول ہے

"مجھے معاف کرنا پیارے! ....." ایرینیا گرگیور کو دیکھتے ہی چلائی: "اندھیرے میں ٹھوکر کھا کر میں پتھروں پر گر پڑی اور میرا شانہ بری طرح زخمی ہو گیا ہے اس لئے....."

مگر جرمن افسر نے اس کی بات کاٹ دی: "انہیں دور رکھو، بولنے نہ دو" صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس وقت بہت خوش ہے اور اس دردناک منظر سے خوب لطف اٹھا رہا ہے!!

"اچھا اب بتاؤ" اس نے گرگیور کو مخاطب کیا: "یہ تمہاری بیوی اور بچہ ہے اور تمہیں ان سے زیادہ کسی سے محبت نہیں ہو سکتی" وہ ٹھہر ٹھہر کر بولنے لگا: "اس حالت میں کیا تم گوارا کرو گے کہ انہیں ابھی فوراً گولی سے اڑا دیا جائے؟ ــ اگر نہیں تو ہمیں خفیہ راستے سے تولا پہنچا دو!" اور گرگیور کے چہرے پر انتہائی تکلیف کے آثار دیکھ کر وہ دوبارہ زور زور سے ہنسنے لگا۔

"گرگیور ــ!" ایرینیا کی آواز ایک چیخ میں بدل گئی: "روس سے بڑھ کر ہمارا خدا کے لئے غداری ....." مگر فوراً جرمن سارجنٹ کی ڈانٹ سنائی دی: "چپ رہو!" ساتھ ہی اس نے ایرینیا کے منہ پر زور سے گھونسا مارا۔

گرگیور یہ نظارہ دیکھ کر بے تاب ہو گیا مگر تین آدمیوں کی گرفت سے نکل آنا آسان نہ تھا! فوراً بیوی اور شوہر کی نگاہیں ملیں۔ ہونٹ کانپے اور آنکھوں ہی آنکھوں میں نہ جانے انہوں نے کیا بات کی کہ گرگیور کا سر بلند ہو گیا، سینہ تن گیا اور اس نے پرجوش آواز میں کہا: "میں غدار بننے سے انکار کرتا ہوں ــ سوویٹ روس زندہ باد"

جرمن افسر کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے۔ اور وہ کسی درندے کی طرح غرایا۔

"گولی مار دو ــ جہاں کھڑے ہیں وہیں گولی مار دو!" اس نے اپنا ہاتھ جھٹک کر ایرینیا اور پولیس کی طرف اشارہ کیا اور خود نقشے پر جھک گیا۔

"لیکن اس معصوم بچے نے تمہارا کیا بگاڑا ہے۔ یہ تو ....."

غضبناک جرمن افسر نے اپنی نظریں اوپر اٹھائیں۔ ایرینیا کو غور سے دیکھا مگر فوراً اس کی نگاہیں نقشے کی ٹیڑھی ترچھی لکیروں میں کھو گئیں۔ اور وہ بے رحمی سے چلایا

"جہاں کھڑے ہیں وہیں گولی مار دو۔"

جرمن سارجنٹ نے پستول سیدھا کیا اور ننھے بوریس کے سر کو نشانہ بنا کر گھوڑا دبا دیا۔ ماتا ماری ایرنیا بوریس سے لپٹ گئی اور اسے محسوس بھی نہ ہوا کہ سارجنٹ کی دوسری گولی اس کی پشت میں گھس کر اس کا کام بھی تمام کر چکی ہے!!!

تھوڑی دیر کے لئے گریگور کو ایسا محسوس ہوا کہ وہ پاگل ہو گیا ہے اور بے ہوش ہو کر گرنے ہی والا تھا کہ سپاہیوں نے مضبوط پکڑ لیا اور جب اس کے حواس بجا ہوئے تو جرمن افسر نے پوچھا "اب بھی بتاتے ہو یا نہیں؟ اب بھی اگر ہمارا کہا مانو تو تمہاری جان بچ سکتی ہے؟"

"اب کس کے لئے غداری کروں؟" گریگور نے روکھا جواب دیا۔

"باہر لے جا کر اسے بھی گولی مار دو۔۔۔۔" افسر نے سپاہیوں کو حکم دیا "مگر پہلے اسی کے ہاتھ سے اس کی قبر کھدوا لو اور پھر سب مل کر اسے اس میں ڈال دینا ۔۔۔ سوویٹ کسان کی موت بھی سوویٹ نظام کے مطابق ہی ہونی چاہئے!!" جرمن درندے نے مذاق اڑاتے ہوئے کہا اور پھر نقشے پر اپنی نظریں جما دیں۔

(۴)

سپاہی گریگور کو باہر لے گئے اور اس نے گڑھا کھودنا شروع کر دیا مگر اس کا دماغ ماؤف ہو چکا تھا اور انتقام سے مایوس ہو کر وہ محسوس کر رہا تھا کہ ارینیا اور بوریس سے ملنے جا رہا ہے!

گڑھا تیار ہو گیا، ساتھ ہی فضا میں گھڑگھڑاہٹ سی سنائی دی اور جب گریگور نے آسمان کی طرف دیکھا تو ایک روسی بمبار فضا میں تیرتا نظر آیا ۔۔۔ بمبار نے جرمن کیمپ کے اوپر پہنچ کر دو بھاری بم گرائے۔ جو کیمپ سے کچھ ادھر ہی گر گئے۔ گریگور نے اپنی "قبر" سے "شیلٹر" کا کام لیا اور جب بمبار چلا گیا۔ تو اس نے باہر نکل کر دیکھا تینوں جرمن سپاہی زمین پر مردہ پڑے تھے۔

گریگور قریب کی جھاڑیوں میں گھس گیا اور ان میں چھپتا چھپاتا تولا کی طرف ہو لیا۔ اور رات کو جب وہ تولا پہنچا تو اس کی حالت ناقابل بیان حد تک بدلی ہوئی تھی ۔۔۔ کپڑے تار تار، بال پریشان، شانہ زخمی، دماغ ماؤف اور متجسس آنکھوں میں وحشیانہ چمک! غرضکہ اس کی ظاہری اور معنوی حالت بالکل ہی بدل چکی تھی۔ اور اب اس کی زندگی کا صرف ایک ہی مقصد تھا ۔۔۔ انتقام!!

دوسرے ہی روز وہ "موت کا دستہ" نامی گوریلا روسی فوج میں شامل ہو گیا جس کا کام جرمن فوجی لائنوں کے عقب میں تباہی پھیلانا جرمنوں کے سلسلۂ رسل و رسائل کو منقطع کرنا تھا۔

چند ہی روز کی تربیت کے بعد ایک صبح تولا کے کمانڈر نے اسے بلایا اور کہا "تم نے اتنی تربیت حاصل کر لی ہے کہ ایک گوریلا دستے کی کمان کر سکو اس لئے تمہیں اپنے دستے کے ساتھ آج ہی رات کو دشمن لائنوں کے عقب میں ہوائی چھتریوں کی مدد سے اتر کر اپنا کام کرنا ہو گا!"

گریگور کی آنکھوں میں چمک بڑھ گئی۔ اور وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ تیاری میں مشغول ہو گیا!

اسی رات تین اور گوریلا دستوں کے سپرد یہ کام کیا گیا تھا کہ وہ دشمن فوجوں کے پیچھے اتر کر ان کی رسد روک دیں اور انہیں جتنا جنگی نقصان پہنچا سکتے ہوں پہنچائیں ۔۔۔ اس کے بعد اگر لوٹ سکیں تو اپنی فوج میں لوٹ آئیں!!!

(۵)

رات کو ساڑھے گیارہ بجے گریگور نے اپنے ساتھیوں کو اکٹھا کیا اور وہ سب چھوٹی مشین گنوں، دستی بموں اور پستولوں سے مسلح ہو کر ہوائی جہاز سے دشمن لائنوں کے پیچھے کود پڑے ۔۔۔ جب وہ زمین پر اترے تو سامنے ہی ایک چھوٹا سا دشمن کیمپ بھی نظر آیا۔

بڑی احتیاط مگر تیزی سے پیش قدمی کر کے گریگور اپنے ساتھیوں کے ساتھ کیمپ میں گھس گیا اور سنتریوں کی نظر سے بچتا ہوا خیمے کے سامنے جا کھڑا ہوا خیمے کے اندر سے قہقہوں کی مکروہ آوازیں آ رہی تھیں۔

دروازے پر سنتری کھڑا تھا مگر اس کے چلانے سے پہلے ہی گریگور نے فائر کیا اور وہ زمین پر گر پڑا۔ اپنے ساتھیوں کو وہاں چھوڑ کر گریگور خیمے میں گھس گیا۔

میز کے گرد بارہ یا تیرہ جرمن بیٹھے ہنسی مذاق کر رہے تھے۔ سرے پر ان کا افسر بیٹھا ہوا تھا جسے دیکھتے ہی گریگور نے پہچان لیا کہ "کپتان بہادر" ہے۔

"ہائیں ۔۔۔ تم؟" گریگور کو دیکھتے ہی وہ بدحواسی سے چلایا۔

"ہاں ۔۔۔ میں!" گریگور نے اطمینان سے جواب دیا مگر رفتہ رفتہ اس کی آنکھوں کی وحشیانہ چمک بڑھتی جا رہی تھی "میرے جنرل کا حکم ہے کہ تم سب کو گولی مار دی جائے!" اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"مگر ۔۔۔ مگر ہم تو نہتے ہیں!!" کریہہ منظر جرمن درندہ، گریگور کے چہرے پر بے رحمی اور عزم صمیم کے آثار دیکھ کر کانپتے ہوئے بڑبڑایا!

"بے شک، آپ نہتے ہیں کپتان بہادر!" گریگور نے طنزیہ انداز میں جواب دیا "مگر میری بیوی اور معصوم بچہ بھی تو نہتے تھے! کیا بھول گئے؟" گریگور نے کھوکھلا قہقہہ لگایا اور چیخ کر اپنے ساتھیوں کو حکم دیا "یہ سب جہاں بیٹھے ہیں وہیں گولی مار دو!"

شریف چکوالی

دُعا

میں نہیں طالبِ چراغ، میں نہیں کچھ عوام سے
شامِ سیاہ کو مری زہرۂ تابدار دے
لالہ و گل تو کھل گئے بادِ سحر کے فیض سے
شاخِ حیات کے لئے بھی تو کوئی بہار دے
دل تو دیا کہ ہو رہے حسن کے اختیار میں
حسن پہ یا رب ایک بار دل کو بھی اختیار دے

جھلک

"اے بھگوان رحم!"

اس نے اپنے دونوں ہاتھ مورتی کے سامنے پھیلاتے ہوئے کہا۔

اور بھگوان جیسے معاملے پر غور کرنے کے لئے سکوت میں آگئے ہوں۔

مندر میں چاروں طرف سناٹا تھا۔ تاریکیوں میں لپٹی ہوئی دیواریں رعب دار انداز میں اپنے متبرک ہونے کا اعلان کر رہی تھیں۔ وسط صحن میں لگا ہوا پیپل کا درخت آدھے سے زیادہ مندر پر سایہ کئے ہوئے تھا کسی بڈھے کی بے ترتیب داڑھی کی طرح اس کے تنے سے بیشمار جڑیں لٹک رہی تھیں جب ہوا پتوں سے سرسراتی ہوئی گذرتی تو ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے بیشمار کبوتر آسمان میں قلابازیاں لگا رہے ہیں۔

پیپل کے نیچے متعدد قبریں بنی ہوئی تھیں جن کے سفید سفید گنبد ان مقدس پجاریوں کی تعداد بتا رہے تھے جو اپنی زندگی مندر کی سیوا کے لئے وقف کر چکے تھے اور مرنے کے بعد ان کی راکھ بھی یہیں دفن کر دی گئی تھی۔

سامنے اس دیوار کے بڑے بڑے پتھر لڑھک کر صحن میں جمع ہو گئے تھے۔ جو گذشتہ بارش میں گر گئی تھی۔ کچھ دور ندی کا پانی سینہ ارض پر لہرا رہا تھا۔ جو مندر کی سیڑھیوں سے ٹکرا کر جھاگ اڑاتا ہوا لوٹ جاتا تھا آسمان پر کالے کالے بادل۔ گھبرائے ہوئے آدمیوں کی طرح ادھر سے ادھر پھر رہے تھے۔

بھگوان کی مورتی پُر وقار انداز میں کھڑی سوچ رہی تھی۔ اور پاس کی تھالی میں جلتے ہوئے۔ دیئے آہستہ آہستہ جھلملا رہے تھے۔ جن کا عکس کالی ننگی دیوار پر کانپ رہا تھا۔

اس نے اپنا سر مورتی کے قدموں پر ڈال دیا اور بھگوان کی بے پناہ عظمتیں اس کے قلب میں تڑپ کر اپنے رحم و کرم کا یقین دلانے لگیں۔

"اے بھگوان!

میری بیوی اچھی ہو جائے۔ تو میں مندر کی ٹوٹی ہوئی دیوار بنوا دونگا" اس نے رک رک کر کہا۔

فضا تھوڑی دیر تک خاموش رہی پھر دو آنسو اس کے قلب کی گہرائیوں سے امنڈتے ہوئے آنکھوں کی راہ سے پھوٹ نکلے۔ وہ کھڑا ہو گیا پھر ایک رحم طلب نگاہ مورتی پر ڈالی اور لوٹ گیا لیکن تقدس کی وجہ سے اس نے اس وقت تک پیٹھ نہ پھیری جب تک مورتی آنکھوں سے اوجھل نہ ہو گئی۔

اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا تھا۔ خوشی کسی چلتے ہوئے دریا کی طرح اس کے دل میں کروٹ لے رہی تھی اس نے تشکر آمیز نگاہوں سے آسمان کی طرف دیکھا۔ جیسے بھگوان نے اس کی دعا قبول کر کے اس کے ساتھ بڑا عظیم الشان احسان کیا ہے اسے کامل یقین تھا کہ اس کی بیوی اچھی ہو جائے گی۔

بادلوں کے ہجوم کی طرح بھگوان کی عظمتیں اس کے سینہ میں تڑپنے لگیں۔

"کتنا اچھا ہے۔ بھگوان۔ اس نے دنیا پیدا کر کے مخلوق پر کتنا زبردست احسان کیا ہے اور پھر وہ اپنی پیدا کی ہوئی دنیا کا خیال بھی کیسا کرتا ہے۔ اس نے سوچا۔ زمین۔ چاند سورج ستارے سب اس کی ذات کا ادنیٰ سا کرشمہ ہیں اور پھر پنڈت جی کے لاکھوں ڈھلے ہوئے عظیم الشان الفاظ اس کے دماغ میں سرسرانے لگے۔ جو انہوں نے بھگوان کے متعلق کتھاؤں میں کہے تھے۔ اگر بھگوان دنیا نہ پیدا کرتا۔ تو۔ اس نے خیال کیا۔ اس سے آگے کیا ہوتا وہ کچھ سمجھ نہ سکا اور ایک ہلکی سی کپکپاہٹ اس کے تمام بدن میں دوڑ گئی۔

بچپن بھی عجیب چیز ہے جب لوگ اس سے کہتے تھے کہ یہ سب چیزیں بھگوان نے پیدا کی ہیں تو اسے یقین نہ آتا تھا بھلا بھگوان سب چیزیں کیسے پیدا کر سکتا ہے۔ اگر وہ دنیا کے متعلق یہ مان بھی لے کہ بھگوان نے پیدا کی ہیں۔ تو چاند سورج ستارے اور آسمان تک بھگوان کے ہاتھ کیسے پہنچے ہوں گے یہ بات اس کے خیال میں نہ آتی تھی۔

جب ایک مرتبہ یہی سوال اس نے اپنے بڈھے دادا سے کیا جن کی گردن جاپانی گڈے کی طرح ہمیشہ ہلتی رہتی تھی۔ اس وقت دادا نے اسے اپنے پاس بٹھا لیا اور پھر ایک موٹی سی کتاب نکال کر اس کی لیٹری۔ آڑی ترچھی لکیروں کو غور سے دیکھتے رہے۔

بیٹا تو بڑا قسمت والا ہے تیرے ہاتھ کی (ریکھائیں) بہت اچھی اوصاف ہیں انہوں نے پوپلے منہ سے الفاظ چبا چبا کر ادا کرتے ہوئے کہا۔

اور دادا جی آپ نے وہ تو بتایا ہی نہیں کہ۔۔۔

ہاں۔ ہاں ٹھیک ہے بیٹا اس کے دادا نے بات کاٹتے ہوئے کہا بھگوان آسمان پر ہی رہتا ہے۔

اور پھر یہ زمین اس نے کیسے بنا ڈالی؟

بے وقوف کہیں کا۔ سارے اس کے حکم سے بن گئی۔ وہ جو چاہے کر سکتا ہے اس دن سے اس نے سمجھ لیا کہ بھگوان جو چاہے سو کر سکتا ہے بھگوان کی قوتیں بے پناہ ہیں۔ اور اب بیشمار دوسرے خیالات بھگوان کے متعلق اس کے دماغ میں آنے لگے۔

بھگوان کا محل کیسا عالیشان ہوگا۔ وہ سب کا سب خالص سونے کا ہوگا چمکتا ہوا جھلملاتا ہوا اور بھگوان کے نوکر کیسے اچھے اچھے لباس پہنتے ہوں گے۔ اور پھر بھگوان کا لباس تو سب سے ہی اچھا ہوگا۔ اور اگر بھگوان نہ ہوتا۔ تو یہ دنیا کون پیدا کرتا یہ چاند سورج ستارے۔ آسمان۔ زمین۔ اس کا گھر ماں اور بڈھے دادا کچھ نہ ہوتا۔ وہ ڈر کر آنکھیں بند کر لیتا اسے ایسا معلوم ہوتا۔ جیسے آسمان۔ زمین چاند ستارے ایک دوسرے سے ٹکرا کر اندھیرے میں غائب ہو گئے وہ کانپ اٹھتا اور ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھول دیتا۔ اور تمام کائنات جیسے اس کے خیالات پر کھڑی مسکرا رہی ہے۔

کیسے خراب خیالات تھے اس زمانے کے اس نے سوچا بھگوان کے متعلق یہ سوچ کر

کہ کیوں ہے؟ اور کیوں نہیں ہے کتنا بڑا پاپ ہے اس نے ہزاروں مرتبہ توبہ کر ڈالی اور اس کا دل خوشی سے معمور ہو گیا بھگوان بڑا رحیم ہے۔ ضرور اس کی بچپن کی بے ترتیب باتیں معاف کر دیگا ۔۔ اور جب وہ بچپن میں ایک مرتبہ املی کے اونچے درخت پر چڑھ گیا تھا اور بیشمار املیاں گدر پکی کچی توڑ توڑ کر کھاتا رہا یہاں تک کہ اس نے اپنی گود بھر لی۔ وہ املی سے نیچے اُترنے لگا مگر نہ معلوم کیوں وہ اتر نہ سکا۔ اس نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح سے نیچے اُتر آئے مگر ہر مرتبہ اس کا دل نیچے پھیلی ہوئی نوکدار چٹانوں کو دیکھکر کانپ گیا۔ اور اطراف میں پھیلے ہوئے اونچے اونچے درخت اس کی آنکھوں میں ناچنے لگے۔

وہ کسی راہگیر کے انتظار میں ایک موٹی سی ڈال کو مضبوط پکڑ کر بیٹھ گیا اور دیر تک دور پھیلے ہوئے راستوں پر آنکھیں گاڑے کسی آنے والے کی راہ دیکھتا رہا یہاں تک کہ املیاں کھاتے کھاتے اس کے دانت کھٹے ہو گئے۔

بھگوان سب کچھ کر سکتا ہے یہ تھا اس کے دادا کے الفاظ اس کے ذہن میں اُتر آئے اس نے خلوص دل سے گڑگڑا کر بھگوان سے پرارتھنا کی کہ وہ بچ جائے پھر کبھی املی پر نہ چڑھے گا۔

دھڑکتے ہوئے دل۔ اور لرزتے ہوئے ہاتھوں سے املی کے موٹے تنے کو پکڑ کر نیچے لٹک گیا جب اس کے پاؤں نے زمین کو چھوا اس نے آنکھیں کھولدیں اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا جیسے بھاگتے ہوئے بیل کے گلے کی گھنٹی بجتی ہے پیٹ پر سفید سفید خراشیں پڑ گئے تھے۔ اور کہنیوں کے چھل جانے سے ہلکا ہلکا خون جھلک آیا تھا گود کی تمام املیوں کا خود بخود کچومر بن گیا تھا مگر وہ بچ گیا تھا ۔۔ لمبی لمبی نوکدار چٹانوں سے۔ ورنہ املی کے بیچوں کی طرح لڑھک کر جان دیدیتا۔

اس کے بعد وہ ہر مصیبت میں بھگوان سے دعا کرنے کا عادی ہو گیا۔

ایک دن جب وہ دن بھر گھر سے غائب رہنے کے بعد شام کو گھر پہنچا۔ تو مار کھانے کے ڈر سے وہ دروازے کے سوراخوں میں سے بڑی دیر تک کھڑا اپنے دادا کی ہلتی ہوئی سفید داڑھی دیکھتا رہا۔

اور جب بڈھے دادا نے اپنا موٹا لٹھ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اٹھاتے ہوئے کہا نہ معلوم شیطان کہاں رہ گیا۔ ذرا دیکھ آؤں ۔ اور جھومتے ہوئے صحن میں قدم رکھا تو اس کی آنکھوں میں گھر میں جلتے ہوئے چراغ ناچنے لگے۔ اور پھر تھر تھراتے ہوئے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

بھگوان ۔۔ آج بچا لے پھر کبھی نہ جاؤں گا۔

اس دن وہ بہت پٹا اور دیر تک روتا رہا اگر بھگوان کے متعلق اس کے اعتقادات میں فرق نہ آیا۔

اگر بھگوان اسے آٹھویں جماعت میں پاس ہونے میں مدد نہ کرتا تو اس کے بڈھے دادا اسے کبھی کا گھر سے نکال چکے ہوتے اور آجکل نہ معلوم وہ کہاں ہوتا۔ اس کے سب پرچے تو اچھے ہوئے تھے لیکن جیومیٹری اسے بالکل نہ آتی تھی اصل بات اصل یہ تھی کہ اس نے ان ٹیڑھی۔ آڑی لکیروں میں کبھی اپنا دماغ کھپانے کی ضرورت محسوس نہ کی تھی۔

جیومیٹری کے گھنٹے میں وہ اور اس کا دوست موہن دونوں سکول کی بغیہ میں بیٹھے باتیں کیا کرتے تھے دونوں کو اپنے اپنے حساب پر ناز تھا دونوں یہ سمجھے ہوئے تھے۔ کہ حساب میں کافی نمبر لے آئیں تو جیومیٹری کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔

اور جب حساب کا امتحان دینے کے بعد اسے معلوم ہوا کہ موہن کے پورے چھ سوال ٹھیک ہیں اور اس کے ہر غلط ہیں تو گویا دنیا اس کے سامنے اندھیر ہو گئی فیل ہو جانے کی ندامت تو خیر لیکن گھر سے نکالے جانے کا ڈر اس کے دماغ میں بے تحاشا چوٹیں لگا رہا تھا اسے معلوم ہو رہا تھا جیسے یہ آڑی ترچھی لکیریں قسمت کی لکیریں تھیں جنہیں وہ سمجھنا بھول گیا۔

وہ رات بھر بڑا کروٹیں بدلتے اور فیل ہو جانے کے بعد تاریک مستقبل کے بھیانک مناظر دیکھتا رہا۔

آخر کچھ نہ کرنے سے کرنا بہتر ہے اس نے خیال کیا۔ اگر وہ نقل کرے تو اور نقل کے لئے بھگوان کی معاونت کو ضروری خیال کرکے ۔ وہ رات بھر اسے اپنی مدد پر آمادہ کرنے میں مصروف رہا اور آئندہ کے متعلق لاکھوں عہد بھگوان کے خوش کرنے کے لئے بھی کر ڈالے۔

صبح اٹھکر اس نے ضروری سوالات اپنی کتاب سے پھاڑ کر جیب میں رکھ لئے جیب امتحان گاہ میں داخل ہوا تو جیسے بیشمار آنکھیں اس کے بدن کے ریشہ ریشہ سے بھگوان کے سامنے رحم کی درخواست کر رہی ہیں۔

اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے پرچہ پڑھا اور پھر کتاب سے پھاڑے ہوئے اوراق کو رانوں کے اوپر رکھکر کرتے سے ڈھک لیا اور ڈیسک پر جھک کر بالکل کمان کی شکل میں سمٹ گیا۔

جب ہیڈ ماسٹر تمام لڑکوں کو غور سے دیکھتا ہوا اس کے پاس سے گذرا تو اس کی تمام نبضیں ساقط ہو گئیں اور اس کی آنکھوں میں خوف و ہراس کے جذبات لرزنے لگے۔

ہیڈ ماسٹر گذرتا چلا گیا۔ بلا ٹل گئی اور وہ کامیاب ہو گیا۔

اس کے بعد اس کی زندگی میں کتنے انقلابات آئے۔ اس نے آٹھویں جماعت کے بعد پڑھنا چھوڑ دیا اس دادا جن کے سہارے وہ پڑھ رہا تھا آخرت کو سدھار گئے ۔۔ اسے نوکری کرنا پڑی۔ اور اس کی ماں نے کہہ سن کے اس کی شادی کرا دی۔ اور اب اس کی ساری کائنات اس کی بیوی تھی۔ اسے اپنی بیوی سے بے انتہا محبت تھی جب وہ سنتا کہ فلاں شخص اپنی بیوی کی پروا نہیں کرتا۔ تو کس قدر حیرت ہوتی کہ دنیا میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو اپنی بیویوں کی قدر نہیں کرتے۔ وہ اپنی بیوی کے خوبصورت سنہری بالوں سے کھیلتے ہوئے کہتا۔

شاما مجھے حیرت ہے کہ لوگ تم جیسی بیویوں پر بھی ظلم کرتے ہیں۔ جو دن رات مردوں کے آرام کے لئے اپنی جان کو جان نہیں سمجھتیں۔ اور شاما تم کہو تو میں تمہارے ہاتھ بٹانے کے لئے ایک نوکر رکھ لوں۔ کیوں ٹھیک ہے نا۔ وہ اپنی بیوی کے خوبصورت گالوں کو تھپتھپاتے ہوئے کہتا۔ اور جب اس کی بیوی اپنی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں اٹھا کر ۔۔ احسانمندانہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھکر کہتی ۔ کہ جب تنخواہ بڑھ جائے تو رکھ لینا۔ تو اس کا رواں رواں فرط مسرت سے جھوم اٹھتا۔

شاما تم میری زندگی ہو تم میری روح ہو اور بیشمار خوبصورت الفاظ اس کی زبان سے بے ساختہ پرواز کرنے لگتے۔

وہ دونوں بیٹھے بیٹھے مستقبل کے سنہری خوابوں میں کھو جاتے۔

جب سے شاما بیمار ہوئی تھی اس نے شہر بھر کے تمام حکیموں ڈاکٹروں کے دروازوں کی خاک چھان ماری۔ وہ ہر قیمت پر شاما کو بچانا چاہتا تھا مگر وہ دن رات مضمحل ہوتی گئی اور مرض خطرناک صورت اختیار کرتا گیا۔ اس کی خوبصورت آنکھیں پیلی پڑ گئیں۔ اور سیب کے مانند تر و تازہ رخسارے سوکھ کر پچک گئے۔ اب وہ بستر سے بھی نہ اُٹھ سکتی تھی۔ اس کی بوڑھی ماں اسے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے دوا پلاتی تھی۔

ماتا۔ وہ روتے ہوئے کہتی۔ آپ کیوں میرے لئے اتنی تکلیف برداشت کر رہی ہیں؟

نہیں بیٹی! تیری وجہ سے تو میرا گھر روشن ہے۔

اس دن شاما کی طبیعت خراب تھی۔ آج تک کسی دوا نے بھی مرض کو گھٹانے میں مدد نہ کی تھی۔ بلکہ دواؤں سے اور مرض شدید ہوتا جا رہا تھا۔

جا بیٹا! مندر میں بھگوان سے پرارتھنا کر۔ اس کی مرضی ہے تیری پرارتھنا قبول ہو جائے اس کی ماں نے کہا۔

اور ہزاروں امیدوں کے دیئے رات کی تاریکیوں میں جگمگانے لگے۔ اور اب جبکہ وہ واپس جا رہا تھا۔ بھگوان کے رحم و کرم کے بیشمار واقعات اس کے دماغ میں چکر لگا رہے تھے۔

رات کی تاریکیاں گہری ہوتی جا رہی تھیں۔ ہر طرف خوفناک سناٹا سائیں سائیں کر رہا تھا ہوا کی طوفانی لہریں درختوں سے اُلجھ اُلجھ کر چیخ رہی تھیں سنسان گلیوں اور ویران سڑکوں پر کتے بے تحاشا چلّا چلّا کر اندھیرے کو بھگانے کی کوشش کر رہے تھے۔ زمین سے بے شمار ملی جلی آوازیں نکل رہی تھیں جن سے فضا میں سیٹیاں سی بج رہی تھیں۔ وہ تیزی سے قدم بڑھاتا ہوا چلا جا رہا تھا اور اس کے دل کی تمام فکریں بھگوان کی بے پناہ عظمتوں کے بوجھ سے دب گئی تھیں اسے یقین کامل تھا کہ اس کی بیوی بچ جائیگی۔

اپنے گھر کے دروازے سے چھنتی ہوئی روشنی جس نے تاریکی میں ہلکے ہلکے شگاف ڈالدیئے تھے اسے نظر آنے لگی۔

وہ تیزی سے گھر میں داخل ہو گیا۔

بیٹا۔ گئی ۔۔۔ سدھار گئی ۔۔۔ اس کی ماں نے اپنے پوپلے منہ سے رُک رُک کر کہا اور دو موٹے موٹے آنسو اس کی بے نور آنکھوں سے نکل کر افسردہ چہرے کے نشیب و فراز پر بکھر گئے ۔۔۔ بھگوان ۔۔۔ اس نے چیخ مارتے ہوئے کہا۔ میری شاما کو تو نے کیوں چھین لیا۔ اور اس کے ہاتھ میں سے پوجا کی تھالی ۔۔۔ ایک زوردار آواز کے ساتھ زمین پر آ رہی ۔۔۔ وہ سسکتا ہوا اپنی مردہ بیوی سے لپٹ گیا۔ بھگوان ۔۔۔ دنیا۔ آسمان ۔۔۔ زمین اس کی آنکھوں میں پارہ پارہ ہو کر بکھر گئے۔

آسمان پر گھبرائے ہوئے بادل خوفناک آواز کے ساتھ ایک دوسرے سے ٹکرائے جیسے فضا کی باقی دیواریں بھی اُڑ اُڑا کر زمین پر آ رہی ہوں۔

بھگوان ۔۔۔ بھگوان کچھ نہیں۔ اگر ہوتا تو میری بیوی کو بچا لیتا۔ وہ سب کچھ اتفاق تھا۔ نرا اتفاق ۔۔۔ ماتا۔ اس نے چیختے ہوئے کہا۔

اُفق پر بجلی ایک کڑک کے ساتھ جھلملاتی ہوئی غائب ہو گئی۔

سید مقصود علی ہاشمی بھوپال

"گنہ گارِ ہوس"

جب غمِ عشق کے گستاخ ارادوں کے لئے
تیری زلفیں تیرے شانوں پہ پریشاں ہو جائیں

آئینہ درسِ وفا دے تیری رعنائی کو
آرزوئیں تیری خلوت میں گل افشاں ہو جائیں

تیری آنکھوں کی سیاہی میں گداز آ جائے
مرمریں جسم میں کچھ شعلے سے رقصاں ہو جائیں

حُسن میں درد کے انداز کی تخلیق سی ہو
عشق میں کیف کے آثار نمایاں ہو جائیں

تیرے لبہائے گلابی میں شراب آ جائے
آبگینے یہ مئے و نور کے لرزاں ہو جائیں

سُرخ رخساروں پہ لہرائے شفق کی سُرخی
سرمئی آنکھیں گہرہائے شبستاں ہو جائیں

تری باہوں میں سکوں جھلکے خود آرائی کا
انگلیاں وجہِ شکستِ غمِ پنہاں ہو جائیں

تیرے سینے سے مہک اُٹھے جوانی کا غرور
سرد آہوں کے یہ انوار فروزاں ہو جائیں

جب حیا کر نہ سکے ضبطِ خود آرائی عشق
جرأت ربط سے جب غنچے گلستاں ہو جائیں

رقص میں پھر در و دیوار نہ ہوں اے عذرا!
ایسے میں کون گنہ گار نہ ہو اے عذرا!

منیر کمال بی اے (جالندہری)

شاہکار

میں شائع شدہ مضامین (نظم و نثر) کے مسودات تاریخ اشاعت سے چھ ماہ بعد تک محفوظ رکھے جاتے ہیں۔ چھ ماہ بعد ان مضامین سے متعلق اعتراضات کے لئے ادارہ جوابدہ نہیں ہوگا۔

شاہکار کا نرخنامہ اشتہارات

پورا صفحہ	پچیس (۲۵) روپے	فی اشاعت
نصف صفحہ	پندرہ	″ ″
چوتھائی صفحہ	آٹھ	″ ″

چوتھائی صفحہ سے کم کا اشتہار اشاعت پذیر نہیں ہو سکتا۔

ادارہ
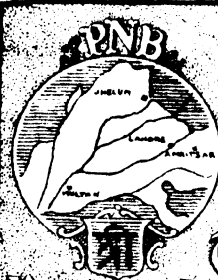
شاہکار

جلد ۱۴ ماہ مئی ۱۹۴۲ء نمبر ۵

فہرست

حصۂ نثر

حصۂ نظم

احسان اللہ خان تاجور پرنٹر و پبلشر نے عالمگیر الیکٹرک پریس لاہور پرانی تحصیل بازار میں چھپوا کر دفتر شاہکار فتح محمد روڈ متصل تکیہ ادی سائیں لاہور سے شائع کیا

مختصرات

پنجاب یونیورسٹی کی بدعنوانیاں

گزشتہ نومبر میں پنجاب یونیورسٹی کی آئین شکنیوں سے متعلق صوبے کے جرائد میں بہت کچھ شائع ہو چکا ہے۔ مگر گزشتہ ربع صدی کے مسلسل احتجاجوں کی طرح یہ ہنگامہ بھی آواز بازگشت کا منت پذیر نہ ہوا۔ کاش ہم اس سال کے آغاز سے یونیورسٹی کے ارباب نظم و نسق کو یونیورسٹی کی داخلی بدنظمیوں پر متنبہ کر رہے ہیں۔ مگر مسلط جماعت کے بعض ذی اقتدار اپنے شیش محل کو برج مشیدہ تصور کئے ہوئے ہیں۔ انہیں یہ زعم ہے کہ ہم اپنے اقتدار کی پناہ گاہ میں ہر پاداش عمل سے محفوظ ہیں۔ وہ اس حقیقت سے بالکل آنکھیں بند کئے بیٹھے ہیں کہ آج اس قسم کی پناہ گاہوں سے بڑھ کر کوئی چیز خطرناک نہیں۔ اورینٹل کالج کے پرنسپل کو توسیع پر توسیع دینے کے بعد ان حضرات کو جب محسوس ہوا کہ اس کے بعد انہیں دوست پروری کو زیادہ دراز پائی کی اجازت دینا دشوار ہوگا اور ممکن ہے اس سے ہماری مطلق العنانی پبلک کے جذبات کو غیر مفتوح بنا دے۔ تو جھٹ پینترا بدل کے التفات فرمانے کی دوسری راہ اختیار کر لی یعنی اسے بادل ناخواستہ زائد المیعاد قرار دے کر اکٹھے ایک سال نو ماہ کی پوری تنخواہ جس کی مقدار ۲۸ ہزار روپیہ بنتی ہے بخش کر رخصت کر دیا گیا۔ حالانکہ سر کے پیچھے سے ہاتھ گھما کر ناک کو پکڑنے کی یہ بے آئین پالیسی ان کے فریب خوردہ دماغ کے سوا کسی کو مطمئن نہیں کر سکتی۔ اول تو ایسی حالت میں کہ یونیورسٹی کے بجٹ میں ایک لاکھ روپیہ سے زیادہ کا خسارہ ہو رہا ہے کسی زائد المیعاد ملازم کو خصوصاً جبکہ وہ متعدد توسیعات بھی لے چکا ہو، فرلو دینا بجٹ کے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں لیکن اس سے قطع نظر اسے قاعدے کی رو سے زیادہ سے زیادہ چھ ماہ کی فرلو دی جا سکتی تھی مگر یونیورسٹی کے بعض دوست پرور اقتدار پسندوں نے آئین کو پس پشت ڈال کر اس فرسودہ سال ملازم کو اکٹھی ایک سال نو ماہ کی فرلو دلا دی۔ اس آئین شکن طرز عمل کے پیش نظر اگر یہ کہا جائے کہ یونیورسٹی کے بعض ارباب اقتدار یونیورسٹی کے مالیات کے لئے خطرہ بنے ہوئے ہیں۔ تو یہ غلط نہ ہوگا۔

پبلک کا مطالبہ تو یہ تھا کہ یونیورسٹی کے زائد المیعاد ملازمین کو بیش قرار تنخواہیں بخشنے کے لئے میعاد یونیورسٹی کے بجٹ پر بے جا تصرف ہے اس لئے انہیں پہلی فرصت میں یونیورسٹی سے رخصت کر دینا چاہئے۔ مگر سخن فہمی عالم بالا کا انداز ملاحظہ ہو کہ پبلک کو غلط طور پر مطمئن کرنے کی خاطر ایک ملازم کو رخصت تو کیا گیا لیکن ۲۸ ہزار روپیہ کی گراں قدر رقم چلتے چلتے اس کے پلے میں باندھ دی گئی۔ اور اس کی جگہ اب اس کے جانشین کو ایک سال نو ماہ تک تنخواہ دی جائے گی اور اس طرح گویا ایک کام کی دو تنخواہیں اس طویل مدت تک یونیورسٹی کو دینی پڑیں گی۔

اول تو اقتصادی بدحالی کے پیش نظر کسی ملازم کو ایک بار بھی توسیع دینا ٹیکس ادا کرنے والوں پر بیجا بار ڈال دینا ہے۔ لیکن بار بار توسیع دینا۔ اور جب یہ ممکن نہ ہو تو اکٹھے ایک سال نو ماہ کی تنخواہ پر اسے فرلو دے دینا حد سے بڑھی ہوئی بے باکی اور پبلک جذبات سے دیدہ دانستہ بے اعتنائی نہیں تو آخر اس ناروا اقدام کے لئے وجہ جواز کیا ہے؟

یونیورسٹی کے بعض اقتدار پسند ممبروں کا کچھ مدت سے رویہ یہ چلا آتا ہے کہ جب کسی اپنے دوست کی پرورش کرنا چاہتے ہیں۔ تو سال ڈیڑھ سال پہلے کسی اور شخص کو ایک مخصوص عنایت سے نواز دیتے ہیں۔ اور پھر اسے مثال بنا کر وقت خاص پر اپنے اس دوست کو اسی رعایت کا مستحق گردان کر بے کھٹکے اس کی پرورش کا سامان بہم پہنچا دیتے ہیں۔ اور اس طرح گویا یونیورسٹی کے بجٹ پر دوگونہ بار ڈال دینے میں پس و پیش کرنے کی انہیں ضرورت ہی نہیں پڑتی۔

مثال کے طور پر ملاحظہ ہو کہ پرنسپل اورینٹل کالج کو توسیعات دینی مقصود تھیں چونکہ کسی سابقہ مثال کی موجودگی کے بغیر ایسا کرنا دشوار تھا۔ اس لئے انہوں نے پہلے کامرس کالج کے یورپین پرنسپل کو مخصوص رعایات سے نوازا اور پھر اسے مثال بنا کر انہیں رعایات کی ارزانی پرنسپل اورینٹل کالج پر کر دی گئی۔ رائے بہادر ایشر داس سابق رجسٹرار یونیورسٹی بعض حضرات کے لئے غنچہ گلو بن رہے تھے۔ انہیں یونیورسٹی سے رخصت کر دینا ان کا مقصود تھا تو باوجود منفرد قابلیت اور دیرینہ تجربے کے انہیں ایک توسیع بھی نہ دی گئی چنانچہ رائے بہادر کو رخصت کیا گیا۔ تو چلتے چلتے ۲۸ ہزار روپیہ دے کر انہیں مثال بنا لیا گیا اور انہیں کی مثال سے سند لیکر ایک ایسے شخص کو جسے کئی توسیعیں دی جا چکی تھیں۔ رخصت کیا تو ۲۸ ہزار روپیہ نذرانۂ الوداع کے طور پر انہیں بھی پیش کر دیا گیا اور اس طرح چھپن ہزار روپیہ یونیورسٹی فنڈ کا ضائع کر دیا گیا حالانکہ اس وقت یونیورسٹی کے بجٹ میں ایک لاکھ روپے سے زیادہ کا خسارہ ہے۔ پرائے مال پر یا حسین لگانے کی اس سے بری مثال کہیں نہ ملے گی۔

مثال نمبر ۲۔ اب کہ پرنسپل اورینٹل کالج خدا خدا کر کے یونیورسٹی سے رخصت ہو رہا ہے اس کی جگہ کسی اور کو پرنسپل بنایا جائیگا۔ زائد المیعاد پرنسپل مسٹر وولنر آنجہانی سابق پرنسپل کی پرنسپلی کے وقت سے وائس پرنسپل تھا۔ جب مسٹر وولنر کا انتقال ہوا۔ تو اسے پرنسپلی ملی۔ بالکل درست۔ حق بحقدار رسید۔ لیکن آج یہ قاعدہ کہ پرنسپل کے ریٹائر ہونے پر وائس پرنسپل کو پرنسپل بنایا جائے۔ یونیورسٹی کے دوست پروروں کی نگاہ میں کھٹک رہا ہے اور وہ موجودہ وائس پرنسپل کو اس کے حق سے محروم کر کے اپنی جماعت کے ایک غیر موزوں جونیئر شخص کو پرنسپل بنانے کی سعی ناروا میں لگے ہوئے

سنا ہے آج ہی معلوم ہوا ہے کہ فرلو تنخواہ کی ... دی جا سکتی تھی۔ کیونکہ رائے بہادر ایشر داس کو جب فرلو دی گئی تھی۔ تو اس وقت یونیورسٹی نے ایک قانون پاس کیا تھا کہ یونیورسٹی کے صرف اس ملازم کو چھ ماہ کی فرلو دی جا سکتی ہے۔ جسے توسیع نہ ملی ہو۔ اس قانون کو بنے ہوئے ایک سال بھی نہیں گزرا ہوا۔ اورینٹل کالج کے پرنسپل کو جبکہ توسیعات مل چکی تھیں۔ ایک سال نو ماہ کی فرلو دے کر اس قانون کو توڑ دیا گیا۔

ہیں۔ اور یہاں بھی انہوں نے اپنا روایتی کھیل کھیلتے ہوئے اپنے آئندہ طرزِ عمل کے لئے ایک مثال تیار کر لی ہے یعنی ہیلی کالج آف کامرس کے موجودہ قابل اور تجربہ کار وائس پرنسپل کو نظر انداز کر کے ایک جونیئر شخص کو ہیلی کالج کا پرنسپل بنا دیا گیا ہے۔ یہ ستم رسیدہ وائس پرنسپل پنجاب یونیورسٹی کا ایم اے کیمبرج یونیورسٹی کا پی ایچ ڈی اور لنڈن یونیورسٹی کا بی کام ہے۔ بی کام کی ڈگری ہیلی کالج کسی استاد یا پرنسپل کیلئے سب سے زیادہ ضروری اور قطعی طور پر جسے ترجیح ہونی چاہیئے تھی۔ اور پھر لطف یہ کہ ہیلی کالج کا یہ وائس پرنسپل کئی سال تک مختلف وقتوں میں اس کالج کا قائم مقام پرنسپل بھی رہ چکا ہے مگر اس کی ان زندہ قابلیتوں تجربوں اور حقوق کا گلا گھونٹ دینے کا عمل جاری ہے تاکہ اس کے حقوق کی موت مثال بنکر اورنٹیل کالج کے موجودہ پرنسپل کے استحقاق کی خونریزی کے لئے بطور فتوے استعمال کی جاسکے۔ "دراز دستی ایں کوتہ آستیناں بیں"

دیوان بہادر مسٹر ایس پی سنگھا یونیورسٹی کے موجودہ رجسٹرار کے ماتحت ایک ایسے اسسٹنٹ کی ضرورت تھی۔ جو اکاؤنٹنسی کا کام انجام دے سکے۔ اس جگہ کے لئے اشتہار دینے پر جو درخواستیں موصول ہوئیں ان میں کئی ایسے تجربہ کار اور قابل حضرات بھی امیدوار تھے۔ جو اپنی دیگر قابلیتوں کے سوا بالخصوص اکاؤنٹنسی میں بھی ماہر تھے مگر چونکہ وہ منظورِ نگاہ نہ تھے نہیں لئے گئے۔ اور جن صاحب کو مخصوص مصالح کے زیر اثر لیا گیا۔ بدقسمتی سے وہ اکاؤنٹنسی ہی کے کام سے نابلد ہیں حالانکہ اسی مصرف کے لئے رکھے گئے ہیں۔ مگر اس مشکل کو یوں حل کیا گیا کہ حکومت سے ایک اکاؤنٹنٹ کی خدمات یونیورسٹی کے نابلد اسسٹنٹوں کو اکاؤنٹنسی کا کام سکھانے کے لئے طلب کر لی گئیں۔ اور اب یونیورسٹی کو مطلوبہ اکاؤنٹنٹ کی تنخواہ سات سو روپیہ ماہانہ کی صورت میں اس وقت تک ادا کرنی پڑے گی جب تک یونیورسٹی کے یہ نابلد ملازم اکاؤنٹنسی نہ سیکھ جائیں۔ حالانکہ اگر پہلے ہی کسی ماہر اکاؤنٹنٹ امیدوار کو چن لیا جاتا تو یونیورسٹی پر یہ مفت کا مالی بار نہ پڑتا۔ سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ جب یونیورسٹی کے بجٹ میں ایک لاکھ روپیہ سے زیادہ کا خسارہ ہو رہا ہے۔ ایسے وقت میں اس قسم کی زرپاشی کیونکر جائز ہو سکتی ہے؟

۱۹۴۲ء یہ سال پنجاب یونیورسٹی کے لئے خاص طور پر منحوس ثابت ہو رہا ہے۔ ضبط اور ڈسپلن جو کسی ادارے کی زندگی ہے۔ اس سے یونیورسٹی محروم ہو چکی ہے۔ میٹرک کے طلبہ حساب کے پرچے کو مشکل پاتے ہیں اور ہلڑ مچا دیتے ہیں۔ ارباب انتظام اگر ذرا سی سمجھ اور سلیقے سے کام لیتے تو یہ ہنگامہ طوفانی صورت اختیار نہ کرتا۔ ایک جانب طلبہ کو مطمئن کیا جاتا۔ کہ پرچہ مشکل ہے تو تمہارے ساتھ رعایت کی جائے گی۔ دوسری جانب ممتحن کو فہمائش کی جاتی۔ اور اس طرح یہ طوفان فرو ہو سکتا تھا۔ مگر اس سلسلہ میں منتظموں نے خارج از عقل ہو کر جو کمزوری دکھائی اور دوبارہ امتحان لیا شورش پسند نوجوانوں کو اس سے شہ مل گئی۔ ان کے حوصلے بجا طور پر بڑھے۔ فرنچ کے پیپر کا ہنگامہ دراصل یونیورسٹی کے ضبط آشنا منتظمین کی کمزوری ہی کا قدرتی نتیجہ ہے۔ اب ارباب انتظام اس پیشینگوئی کو اپنی اپنی یادداشت میں درج کرلیں کہ ان کی اسی طرح بے تدبیری بلکہ بد تدبیری ایک ایسا بیج ہے جس کا درخت ہر سال ایک نئی ہنگامہ فشاں بہار کے تماشے دکھایا کرے گا۔ عموماً ہر سال امیدواران امتحانات کو کسی نہ کسی پرچے کے متعلق شکایت ہوتی رہتی ہے۔ اس سال کوئی نئی قیامت نہ تھی جس سے ارباب کار اس مضحکہ انگیز حد تک حواس کھو بیٹھے ہر سال شکایت کرنے والوں کی بجا شکایات پر انہیں اس انداز میں مطمئن کیا جاتا رہا ہے کہ یونیورسٹی کا ڈسپلن بھی قائم رکھا گیا۔ اور اہل شکایات کی تشفی بھی کر دی گئی مگر اس سال تو اہل اہتمام نے اپنی خام تدبیری سے ڈسپلن کو بھی چکنا چور کر دیا اور دوسری طرف ہنگامہ کاروں کی شورشوں کے لئے دروازے کھول دیئے گئے۔

یونیورسٹی یونین سٹوڈنٹس کی منظم جماعت یونیورسٹی کی بدنظمی اور بے راہ روی کے خلاف جو مسلسل صدائے احتجاج بلند کر رہی ہے اُس کا یہ غلط علاج کبھی حالات کو درست نہیں کرے گا کہ طلبہ میں ہندو مسلم کی تفریق پیدا کر کے صوبے کی تعلیمی فضا کو مسموم بنا دیا جائے۔ "ڈیوائڈ اینڈ رول" کی پالیسی عظیم الشان عالمی حکومت کو بھی راس نہیں آئی یونیورسٹی کے چھوٹے سے ادارے کو تو بھلا کیا راس آئے گی؟

موجودہ وائس چانسلر کی تقرری سے پندرہ سال پیشتر سے راقم الحروف کی جماعت یورپین وائس چانسلروں کی اجارہ داری کے خلاف مسلسل احتجاج کرتی رہی ہے۔ گزشتہ یونیورسٹی تحقیقاتی کمیشن میں اس جماعت نے بہت سی شہادتیں اس مطلب کے متعلق گزرانی تھیں کہ ہندوستان کی باقی تمام یونیورسٹیوں کی طرح پنجاب یونیورسٹی کا وائس چانسلر بھی کوئی ہندوستانی ہونا چاہیئے۔ چنانچہ جب موجودہ وائس چانسلر کے تقرر کا اعلان ہوا تو یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ محترم اُسی مسلط جماعت کے ایک فرد ہیں جو یونیورسٹی کے نظام کو درہم برہم کئے ہوئے ہے اس جماعت نے اظہار مسرت کیا تھا لیکن افسوس ہے کہ پہلے ہندوستانی وائس چانسلر سے یونیورسٹی کی بہبودی اور اصلاح سے متعلق پبلک نے جو توقعات وابستہ کی تھیں بہت بری طرح مجروح ثابت ہوئیں۔ اور ڈھائی سال کے تلخ تجربات کے بعد بلا خوف تردید یہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ موجودہ وائس چانسلر اپنے فرائض منصبی سے سرخرو نہیں ہو سکا۔ اور یہ بھی کہ سابق یورپین وائس چانسلر ہزار غیر ملکی سہی مگر موجودہ ہندوستانی وائس چانسلر سے کہیں زیادہ ذمہ دار بہت زیادہ مفید اور اس کے برعکس بے لاگ بھی تھے

سنا جاتا ہے۔ کہ کچھ افراد موجودہ وائس چانسلر کی میعاد ختم ہونے کے بعد اس کے لئے توسیع میعاد کی تگ و دو میں لگے ہوئے ہیں ہم ہز ایکسیلنسی چانسلر پنجاب یونیورسٹی کو اس سلسلے میں آگاہ کر دینا ضروری خیال کرتے ہیں کہ اگر موجودہ وائس چانسلر کی میعاد میں مزید توسیع ہوئی۔ تو پنجاب کی تعلیمی فضا ادا کرنے والے اس بار دوش خراش کو برداشت نہیں کرینگے۔

یہ بھی سنا جاتا ہے کہ موجودہ وائس چانسلر کی انقضائے میعاد کے بعد اورینٹل کالج کا ریٹائرڈ پرنسپل بھی وائس چانسلر شپ کے امیدواروں میں ہے۔ اگر اس افواہ میں کوئی شمہ صداقت ہے۔ تو سمجھ لینا چاہئے کہ پنجاب یونیورسٹی کا مستقبل اس کے حال سے بھی مہیب تر ہوگا۔ کیونکہ زائد المیعاد پرنسپل اپنے دائرہ اقتدار کے درجنوں اساتذہ اور ملازمین میں سے کسی ایک شخص کو بھی خوش نہیں رکھ سکا۔ اور اگر صداقت بیانی کی پاداش سے حفاظت کا اطمینان دلا کر اس پوری جماعت سے جو اس پرنسپل کے ساتھ تعاون کی بدنصیبی میں مبتلا تھی، حلفیہ بیانات لئے جائیں تو ایک شخص بھی سینے پر ہاتھ رکھکر یہ کہنے کو تیار نہ ہوگا۔ کہ اس پرنسپل کے طویل عہد میں کوئی لمحہ بھی اسے ایسا میسر آیا ہے کہ اس نے اطمینان کا سانس لیا ہو حقیقت یہ ہے کہ اس شخص کے وائس چانسلر بنائے جانے کا ہر امکان یونیورسٹی کی تمام فضا کو مضطرب کرنے باعث ہوگا۔

اسلامیہ کالج لاہور

عام افواہ ہے کہ یونیورسٹی کے بعض وہ مسلمان ممبر جو اورینٹل کالج کے زائد المیعاد پرنسپل کے ساتھ مل کر پنجاب یونیورسٹی میں تیس سال سے صوبے کے مسلم مفاد کو اپنی معاشی زندگی کا سہارا بنائے ہوئے ہیں۔ اس پرنسپل کو اسلامیہ کالج کے سر منڈھنا چاہتے ہیں۔ یہ اگر سچ ہے تو پھر یہ پیشگوئی بھی غلط نہیں کہ اسلامیہ کالج کی پنجاہ سالہ ترقیات معرض خطر میں پڑ جائیں گی۔ کالج ہر پہلو سے رجعت قہقری پر مجبور ہو جائیگا۔ اور یقیناً طلبہ اور اسٹاف کے ممبران اورینٹل کالج کے اقتدار پرستانہ حوادث کو اسلامیہ کالج میں نشو و نما کی اجازت نہ دیں گے۔ نتیجۃً پرنسپل کی اقتدار پرستی اور کالج کی آزاد زندگی میں ایسا تصادم ناگزیر بن جائے گا جس سے نہ صرف کالج کی چلتی گاڑی ہی کے رک جانے کا خطرہ ہے بلکہ صوبے کی تعلیمی فضا میں اس کی ہوا خیزی ہو جائے گی۔ ادارہ

سوال و جواب

بغرض استفادہ ذیل میں چند استفسارات پیش کر رہا ہوں از راہ کرم بواپسی رائے عالی سے مطلع فرمایئے۔

۱۔ جو الفاظ "غلط العام فصیح" کے ذیل میں آتے ہیں کیا اُن کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ مستند اساتذہ سخن اور فصحا نے بھی اُنہیں اپنے کلام اور مضامین میں بکثرت استعمال کیا ہو؟

۲۔ سوال ۱ کا جواب اگر اثبات میں ہے۔ تو کیا لفظ "شروعات" پر "غلط العام فصیح" کا اطلاق ہو سکتا ہے جبکہ یہ لفظ قدیم و جدید مستند شعرا اور اساتذہ سخن کے کلام میں ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتا؟

۳۔ کیا جناب والا نے لفظ "شروعات" کسی مستند شاعر کے کلام میں دیکھا ہے؟ اور کیا خود بھی کبھی نظم فرمایا ہے۔ اگر نظم نہیں فرمایا تو کیوں؟

۴۔ ایک جماعت لفظ "شروعات" کو ٹکسالی بتاتی ہے اور دوسری عوام کی زبان کا لفظ قرار دیتی ہے۔ دونوں میں سے کون حق پر ہے؟

چونکہ حضور والا علم و ادب اور زبان کے مختلف نیز مسائل کے حل میں طالبان فن کی ہمیشہ رہبری فرماتے رہتے ہیں اس لئے امید ہے کہ مجھے بھی مایوس نہ فرمائیں گے۔ اور اپنی اولین فرصت میں تفصیلی جواب سے مفتخر فرمائیں گے۔ خاکسار صدیقی مدیر شاعر آگرہ

جواب

(۱) یہ لفظ غلط العام نہیں "اَلغَلَطُ العَام" ہے یعنی ترکیب اضافی نہیں توصیفی ہے۔ یہ الفاظ دیگر مروجہ غلطی اسی صورت میں فصیح سمجھی جائیگی جبکہ خاصان ادب میں بھی اس کا استعمال عام ہو جائے۔ اس لئے مستند اساتذہ سخن اور فصحائے کلام کی کثرت استعمال کسی غلط لفظ کی فصاحت کے لئے ضروری شرط ہے۔

(۲) شروعات کا لفظ محتاط ادبا و شعرا کے کلام میں میری نگاہ سے تو نہیں گذرا اگر میری نگاہ کی وسعتیں محدود ہیں۔ اس لئے میرا قیاس "قیاس استقرائی" نہیں کہلا سکتا۔

(۳) یہ لفظ میری گفتگو میں تو غالباً آتا ہے مگر اپنی نظم و نثر میں اس کے استعمال سے اجتناب کرتا ہوں۔ ایسا کیوں ہے؟ اس کا جواب کیا عرض کروں؟

بس یہ سمجھ لیجئے کہ تحریری زبان کے لئے الفاظ کے انتخاب میں وہم کی حد تک محتاط ہوں جو بولو وہ لکھو کے اصول کو غلط تصور نہیں کرتا لیکن ذاتی طور پر اپنے ذوق و وجدان کے اشارات کی تعمیل ضروری سمجھتا ہوں۔ مثلاً "رہائش" بمعنی اقامت مستند ادبا کی تحریروں میں بھی رواج پا چکا ہے۔ مگر ابھی تک میری زبان تحریر کے لئے نامانوس ہے۔

(۴) جو جماعت "شروعات" کے لفظ کو ٹکسالی بتاتی ہے۔ کچھ مبالغہ ہی کرتی ہے اور جو اسے عوام کا لفظ قرار دیتی ہے اُس کی مراد غالباً عامیانہ تحریر سے ہے کیونکہ اپنی گفتگو میں تو اکثر ممتاز اہل قلم بھی اس سے احتراز نہیں کرتے مختصر یہ کہ شروعات کا لفظ مستند ادبا و شعرا کے کلام میں میری نظر سے نہیں گذرا اور چونکہ ایک وہم زدہ ادیب ہوں اس لئے اس لفظ کو سب کے بعد اپنی تحریر میں شامل کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں لیکن اس سلسلہ میں اپنے دل کی ایک خلش کو ماہرین لفظیات کے روبرو پیش کرنا چاہتا ہوں۔ میری رائے میں "شروعات" کا لفظ ارباب فصاحت سے التفات طلب ضرور ہے کیونکہ کثرت استعمال کے سبب اس لفظ میں ایک مخصوص مفہوم پیدا ہو چکا ہے، جسے آغاز، ابتدا اور پہل کے الفاظ پوری طرح ادا نہیں کرتے۔ مثلاً ذیل کے فقرات پر غور فرمایئے۔

(۱) اس مرض کی ابتدا یوں ہوئی (۲) اس مرض کی پہل یوں ہوئی (۳) اس مرض کی شروعات یوں ہوئی فقرہ ۱ میں ابتدا کا لفظ مرض کا صرف نقطۂ آغاز بتاتا ہے دوسرے فقرے میں پہل کا لفظ ابتدا کا ہم معنی ہے مگر اس فقرہ روزمرہ کے خلاف ہو جاتا ہے تیسرے فقرے میں شروعات صرف نقطۂ آغاز ہی کو ظاہر نہیں کرتا بلکہ ابتدائیات مرض کے مفہوم کو بھی بیان کرتا ہے دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجئے کہ شروعات کے لفظ سے صرف ابتدا نہیں بلکہ تدریجی ابتدا کے معنی بھی تصور رہتے ہیں اور آغاز، پہل اور ابتدا کے الفاظ سنکر صرف نقطۂ آغاز کی جانب ذہن متبادر ہوتا ہے گویا نقطۂ آغاز پر تدریجی ابتدا ایک اضافی مفہوم ہے۔ اگر یہ گذارش صرف تخلیق وہم نہ قرار دی جائے تو ماننا پڑیگا کہ "شروعات" اردو کا ایک معنی خیز لفظ ہے اور اس کا ہم معنی اردو میں کوئی اور مفرد لفظ نہیں۔ "واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب"

تاجور

فیض پراچہ

مآلِ رقص و سرور

اونچے پہاڑ پر سفید سے کے سر بفلک درختوں کی آخری چوٹیوں پر شفق کا جھلملاتا ہوا عکس ناچ ناچ کر دم توڑ رہا تھا۔ پہاڑ کے دامن میں بہتی ہوئی "کشن گنگا" کی ملبے تاب و تیز رفتار موجیں بارگاہ ہمالہ میں اپنا وجد آفرین رقص پیش کر رہی تھیں۔ ندی کی چھاتی اور نیلے آسمان پر نارنجی رنگ کی پرچھاؤں کے درمیان چیلیں اور کوے پروازِ شام میں مصروف تھے۔ کبھی کبھار ان کی تیز و تند "ال" پڑھتے ہوئے وھند لکے میں ایک چیخ سی پیدا کر دیتی۔ وہ نہ عام طور پر فضا خاموش و پرسکون تھی۔ پہاڑ کے فراز پر جاتی ہوئی پگڈنڈی کے کنارے ایک جدید طرز کی جھونپڑی کے بیرونی باغ میں سبز گھاس کے دالان پر ایک بوڑھی اور متین عورت نیم دراز تھی۔ اس کے سر کے برف سے زیادہ سفید بال اور چہرے اور ہاتھوں کی گہری جھریاں اس بات پر دلالت کرتی تھیں کہ کم از کم مصورِ فطرت کی ایک صدی کی مسلسل نقاشی کا پختہ شاہکار رہے۔ آس پاس کی ہر شے رفتہ رفتہ سیاہی میں گم ہو رہی تھی لیکن پگڈنڈی پر ابھی آمد و رفت جاری تھی۔ دہقانی لڑکیاں ندی سے پانی لانے جا اور لا کر آ رہی تھیں جو گذرتی بوڑھی اور سنجیدہ عورت سے پرسش حال کرتی لیکن آج وہ ان کے آداب اور تسلیمات سے بالکل بے نیاز تھی۔ اس کے تخیلات میں ایک اضطراب انگیز ہیجان تھا۔ وہ عمیق تفکرات میں کھوئی ہوئی تھی آسائش و آرام کے باوجود وہ اپنی زندگی میں ایک عظیم الشان کمی محسوس کرتی تھی بڑھیا اسی گاؤں میں پیدا ہوئی تھی۔ اس کا بچپن انہی وادیوں میں پروان چڑھا تھا جوانی کے حسین عہد کی غیر حاضری کے بعد اب اس کا بڑھاپا بھی کئی سالوں سے یہیں بسر ہو رہا تھا اس حساب سے اس نے سینکڑوں شام اس جھونپڑی میں بسر کئے ہونگے۔ اور ہزاروں مرتبہ سورج کو یونہی عظیم الشان پہاڑ کے پیچھے دم توڑتے اور ستاروں کو طلوع ہوتے دیکھا ہوگا۔ لیکن آج وہ ان چیزوں میں معمول سے زیادہ محو تھی کبھی کبھی وقت وہ اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو آر پار کر کے دباتی۔ ہاتھ کی ہتھیلیوں کو ملتی، اور پھر مسکرا دیتی تھی۔ یا ایک طویل سرد سانس سے دل کے غبار کو ہلکا کرنے کی سعی کرتی۔ "آہ! زمانہ کتنا انقلاب انگیز ہے" یہی چند دلخراش الفاظ تھے۔ جو گہرے سکوت کے طویل وقفہ کے بعد اس کے مرجھائے ہوئے خشک ہونٹوں سے نکل کر فضا میں پھیلتے اور ہمیشہ کے لئے مر جاتے معلوم ہوتا تھا کہ آج اس کی نظر سالوں کی اس کثیر تعداد پر تھی جو اس کی عمر پر بیت چکے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ سب قطار در قطار اس کی بارگاہ تصور میں حاضر تھے۔ جو جتنا آگے تھا۔ اتنا قریب و نمایاں، جو جتنا پیچھے تھا اتنا دور و دھندلکا۔ وہ ایک ایسے غمگین فلسفی کی طرح جو فلسفۂ حیات کی باریکیوں کو دارۂ فہم و ادراک میں محیط کرنے کے لئے بیتاب ہو، اپنی گذری ہوئی طویل عمر کے نشیب و فراز کا جائزہ لے رہی تھی لیکن ان پر حاوی نہیں ہو سکتی تھی۔ اور تنگ آ کر گردش زمانہ کا گِلا کر کے مسکرا دیتی تھی یا آہ کھینچتی تھی۔ اب ہوا میں اس کی نمی شامل ہو چکی تھی۔ اور آسمان پر انجم شب جھلملا چکے تھے۔ وہ گھاس کے تختہ سے اُٹھی اور جھونپڑی کے عقبی کمرہ میں داخل ہو کر کم طاقت سے جلتی ہوئی شمع کی روشنی میں فرش پر بچھے ہوئے نمدے پر ایک تکیہ کے سہارے لیٹ گئی۔ وہ بدستور خیالات میں کھوئی ہوئی تھی

آخر یہ زندگی کیا ہے۔ آدمی دنیا میں پیدا ہوتا ہے حیات کے مختلف منازل طے کر کے چلا جاتا ہے۔ نابود ہو جاتا ہے کتنا ہی باشکوہ و باوقار کیوں نہ ہو اس کے مر جانے کے بعد اس کا کوئی نشان باقی نہیں رہتا۔ البتہ اس کے متعلق ان واقعات کی یاد باقی رہ جاتی ہے جس کی اس کی زندگی دوچار ہوئی ہو، اور جن میں بعد کی نسلوں کے لئے کسی خوش قسمت ہستی کا کوئی کھوج اور نشان باقی رہ جاتا ہے، ورنہ زندگی ایک دردناک کھیل ہے۔ جو طفلی، دوشیزگی، شباب، ازدواج، حاصل ازدواج، اور بڑھاپے کی شاہراہ پر کھیلا جاتا ہے —" وہ انہی خیالات میں مستغرق تھی کہ ایک نوجوان و قد آور لڑکی جو پیچھے ہی کمرہ میں آ جا رہی تھی، داخل ہوئی اور ترنم خیز آواز میں کہا: "اماں کھانا تیار ہے آؤ"! نوجوان لڑکی نے یخنی کا پیالہ چاندی کی طشتری میں دھرے آگے بڑھایا۔ اور ایک طرف آگے بیٹھ گئی۔ "آہ" بڑھیا کی سرد آہ ہونٹوں سے نکلی اور پھیل گئی۔

سرد ہوا کو روکنے کے لئے کمرے کے دروازے بند کر کے پردے سرکا دیئے گئے قیمتی اسباب سے مزین کمرے کا لوح و جمال جوانی پر تھا۔ بڑھیا جس کی جوانی اب اس کے چہرے کی جھریوں میں دفن تھی۔ اپنے پاس بیٹھی ہوئی حسن و شباب رنگینی و رعنائی، اور مستی و جذبات کے پرتپاش شعلوں میں کھیلنے والی لڑکی کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی نگاہوں میں لرزش تھی۔ اور آنکھوں میں حیرانی اور لڑکی کے تابناک چہرہ کی ضیا پاشیاں اسے منہ سے کچھ کہنے سے روکتی تھیں لیکن اس نے کانپتی ہوئی آواز سے کہا۔

" فریدہ! رہنے دو آج رقص و رباب کو رہنے دو" اُداس بڑھیا

آج گردش زمانہ کی انقلاب انگیزیوں سے بہت زیادہ متاثر تھی۔ فریدہ کے حسن و شباب نے اس کے احساسات کو اور غم انگیز کر دیا تھا۔ وہ آج اپنی کھوئی ہوئی شوکت شباب کی رنگین کہانی دل ہی دل میں نہیں دُہرانا چاہتی تھی۔ بلکہ چاہتی تھی کہ فریدہ کو بھی سنا دے ''مرقع تصاویر اٹھا لاؤ!'' فریدہ کے نورافشاں ہاتھوں کی مرمری انگلیوں نے سنہری جلد کی کتاب بڑھیا کے سامنے پیش کر دی۔ شمع کی کانپتی ہوئی روشنی میں اوراق کتاب شعاعیں چھوڑ رہے تھے۔ خاموش و شاندار کمرہ کی ہر شے اوراق کتاب کی رونق کے سامنے بے حقیقت تھی۔ بڑھیا نے ایک ایک کر کے چند اوراق اُلٹے ہر ورق پر ایک رنگین و شگفتہ، دلفریب و جمیل تصویر سونے چاندی کی باریک تاروں اور قیمتی جواہرات سے منڈھی ہوئی باصرہ نواز بیلوں کے درمیان موٹی مخمل کی سطح پر چسپاں تھی۔ بڑھیا کی سالخوردہ آواز اس حسین مرقع کی وضاحت کے لئے کمرے میں گونج رہی تھی۔

''فریدہ! میری عمر عزیز کے گذرے ہوئے عہد کا رنگین و حسین فسانہ ان اوراق پر ثبت ہے۔ میرے بچپن، بچپن کے ٹھیک بعد اور جوانی سے عین پہلے، امن میں سوئے ہوئے جوبن۔ جوانی۔ جوانی کی جوان کیفیات۔ مہارت فن۔ دولت خیز شہرت۔ شہرت کے بعد جماعتی زندگی سے علیحدگی کے مختلف اوقات کی تمام تصاویر بالترتیب اس مرقع میں موجود ہیں میں کبھی کبھی تخلیہ میں اس پر ایک نگاہ ڈالتی ہوں عیش فراواں کے بیتے ہوئے زریں عہد کی سنہری یاد ساز تصور کے ہر تار کو چھیڑ کر میرے دل و دماغ میں ایک اضطراب انگیز ہیجان پیدا کر دیتی ہے میں پھر دل اپنی خیالات میں کھوئی رہتی ہوں جن وادیوں کو میں نے قطع کیا ہے چونکہ تم انہیں میں گامزن ہوا چاہتی ہو۔ جو کھیل میں نے کھیل کر دولت کو جیتا ہے تم اسی کی مشق کر رہی ہو۔ اس لئے ضروری ہے کہ تمہیں اس داستان سے آگاہ کیا جائے۔ جو ایک عورت کے حسن و کمال سے رنگین ہے میرا یقین ہے کہ انسانی چہرہ کیفیات دل کا ترجمان ہوا کرتا ہے۔ اب مرقع کی ہر تصویر پر نگاہ ڈالو خیالات کی روانی زمانے کی رفتار کے ساتھ ساتھ خد و خال پر کتنا عمیق اثر کیا ہے۔ ہر تصویر اپنے عہد کے خیالات کی بہترین تحریر ہے۔

پہلی تصویر میری عمر کے دسویں سال کی ہے۔ لڑکپن، جب رات کو بڑی اماں سے مٹی کے چراغ کے غبار آلود روشنی میں ہمجولیوں کے درمیان ''چڑی چڑے'' اور وزیر و شہزادی کی کہانیاں سنی جاتی تھیں۔ نہ نسوانیت کا پاس تھا۔ نہ جنسی امتیاز نگاؤں سے۔ لڑکے اور لڑکیوں کی رنگین ٹولیاں کے ہمراہ، باغوں میں پڑے ہوئے جھولوں میں جھول جھول کر زندگی شباب کی طرف بڑھ رہی تھی۔ دیکھو تصویر کتنی سادہ اور معصوم ہے مصنوعی آرائش سے پاک۔ فطرتی سادگی اب بھی سطح کاغذ پر کھیل رہی ہے۔

دوسری تصویر میری عمر تیرھویں چودھویں سال کی ہے، نسوانیت کا احساس، شرم و حیا کی ابتدا جوانی کے ہنگامہ خیز دور کا پیشین عہد جبکہ طفلی کی سادگی ختم ہو جاتی ہے لیکن پوری سمجھ کا آغاز نہیں ہوتا۔ کیا تم کہہ سکتی ہو کہ تصویر ان اوصاف کا مکمل و ساکت بیان نہیں۔ ہاں دیکھو سینہ پر نگاہ ڈالو چھاتیوں کا اُبھار بالکل نمایاں ہے لیکن چہرے کو دیکھو کہ شوخی و جوش سے بالکل مبرا ہے وہی لڑکپن کی سادگی کا سماں۔ ہاں میری زندگی کا یہی وہ عہد ہے جبکہ میں کاروبار حیات سے پہلی مرتبہ روشناس ہوئی میری انگلیوں نے ہارمونیم کی سروں اور رباب کی تاروں پر ابتدائی عمل شروع کیا۔

تیسری تصویر۔ عمر کے سولھویں سال کی تکمیل کا نشان ہے جبکہ میرا ''ابتدائی عمل'' تین سال کے عہد شاگردی سے گذر چکا تھا۔ زندگی منزل شباب میں وارد ہو کر اپنے حسن و شباب کا احساس کر چکی تھی' غرور نسوانی زوروں پر تھا کیا تصویر سے غرور و تمکنت بے نیازی و سرفرازی نہیں جھلک رہی؟ دیکھو چہرے کا انداز اور آنکھوں کا انداز بتا رہا ہے کہ غرور حسن نے دو چنوں کو ٹھوکریں ماری ہونگی۔ یہ وہ ایام تھے۔ کہ میری ہونہاری کے چرچوں سے محفلیں آباد تھیں۔ استاد ـــ ایک باکمال رقاصہ مغنیہ ـــ والدہ مرحومہ کہتی تھی۔ کہ لڑکی ایک دن آسمان رقص و سرود پر آفتاب بن کر چھا جائیگی۔

مرکزی تصویر ـــ آہ! یہ تصویر ان رس بھرے ایام کی ہے جبکہ میرا کمال عروج کے انتہائی مدارج طے کر کے پھیل رہا تھا۔ یہی وہ منزل تھی جہاں سے کاروان حیات نے کچھ عرصہ دم لیکر انحطاط کے سفر کا آغاز کرنا تھا۔ ان دنوں میرے حسن کمالات کا چرچا درمیانہ لوگوں کے محافل عشرت سے ایک قدم آگے بڑھ چکا تھا۔ ایک نہیں درجنوں۔ ان حکمرانوں کے دلوں پر میری حکومت تھی۔ جواہرات کی میرے سامنے اتنی ہی حقیقت تھی۔ کہ وہ میرے سینہ و گلو کی زینت نہیں ہوا کرتے تھے بلکہ میں انہیں پاؤں کی آرائش کے کام میں لاتی تھی میں ان کی افراط کی وجہ ان سے بے نیاز ہو کر بہترین باغوں کے تازہ پھولوں سے سنگھار کیا کرتی تھی۔ قدرت کے یہ پھول' مجھے دمکنے والے بے جان و بے بو رنگین جواہرات سے زیادہ مرغوب تھے میرے نشہ آور شباب اور سحر زا حسن سے لطف اندوز ہونے کے لئے کتنے حسین و جمیل مردانہ سر میری دہلیز پر جھکے۔ کیف شباب اور شراب کیف کی موجیں مارتے ہوئے سمندر سے کچھ گھونٹ حاصل کر کے تمناؤں کو سیراب کئے بغیر لوٹ گئے یونہی میرا عشرت کدہ آباد رہا۔ اور میں کسی ایک جری اور دلیر مرد کے دل کی ملکہ بننے کی بجائے سینکڑوں دل چھینا۔ عشرت دوست امیرزادوں کا مرکز بنی رہی۔ غرض جس ماحول میں میری پرورش ہوئی تھی۔ اور جس ماحول کے لئے مجھے تیار کیا گیا تھا۔ میں اسے اب سر کر چکی تھی جہاں فرحت بخش عیش اور کیف آور لذتیں' اب تمام دلچسپی کھو کر میرے لئے سوہان روح ہو رہے تھے میں محسوس کر چکی تھی کہ اس دلیس میں ''فن'' اور ''کمال فن'' ایک بے معنی شے ہے' فن شناس' اب یہاں نایاب ہیں۔ اور دستیاب بھی ہوں۔ تو اس ٹولی میں نہیں جہاں میں بسا کرتی ہوں۔ جہاں داد فن کے حصول کا امکان تھا۔ وہاں جاہ و جلال مفقود تھا بالکل مفقود۔ اور ''شان و شوکت'' ذوق کمال فن ہی سے تہی دامن تھی۔ میں ان محافل میں جب رباب و مضراب سے ان خوابیدہ نغموں کو چھیڑتی جن سے کائنات تک بھی سو جاتی تھی۔ یہ لوگ ''واہ واہ'' سے میرے نغموں کی توہین

کرتے۔ اور جب میں ان نغموں سے سرشار ہو کر دائرہ رقص میں پاؤں کو حرکت دیتی۔ تو تمام فضا پر حیرت چھا جاتی تھی لیکن یہ لوگ "تالیاں" بجا کر میری روح کو ایذا دیتے تھے۔ ان کی ان حرکتوں سے میرے ساز دل کے تمام تار ٹوٹ گئے میں نے فیصلہ کر لیا کہ ان نامعقول محافل میں رقص و سرود کی توہین نہیں کروں گی میں محسوس کرنے لگی تھی کہ میری بارگاہ میں لوگوں کی حاضری "حاصل کمال و اوج کمال" کے باعث نہیں۔ بلکہ "داد فطرت" کی وجہ سے ہے۔ اس احساس نے مجھے کمال فن سے بے نیاز کر کے "آرائش حسن و تزئین لباس" کی جانب راغب کر دیا میں چند سال اس نئے مشغلہ میں مصروف رہی۔ اور اسی کی بدولت معصیت خیز شان و شوکت سے کھیلتی رہی۔ کیا تصویر تمہیں یہ سب حکایت نہیں سنا رہی۔ ذرا دیکھو۔ آنکھوں کی بیباکی سینے کا بے طرح ابھار۔ ابروؤں کا ترچھا پن۔ بناوٹ ہی بناوٹ۔ سرتاپا مصنوعات۔

اسی طرح وہ ورق کے بعد ورق کے بعد ورق الٹتی گئی۔ اور ایک مختصر سی داستان کہتی رہی۔ اب اس کی آواز زیادہ غمگین ہو گئی تھی۔ آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے لیکن وہ نہیں تھلے ہوئے تھی۔ چند لمحہ خاموشی کے بعد بڑھیا نے ایک سرد اور افسوسناک آہ کے ساتھ ایک اور تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پھر کہنا شروع کیا۔

"یہ اس وقت کی تصویر ہے جب میری عمر چالیس کے لگ بھگ تھی جب میں عیش و عشرت کے سرسبز و شاداب گلزاروں کو طے کر کے ایک ایسے کنارے پر آ کر رک گئی تھی جہاں سے ایک ایسے خشک و بے برگ صحرا کا آغاز ہوتا تھا جس کی ابتدائی منزلیں تو چنداں ناگوار نہیں تھیں لیکن جیسے جیسے میں آگے بڑھتی گئی۔ صحرا کی وحشت میں اضافہ ہوتا گیا ابھی تک جا رہی ہوں۔ اب بڑھیا کے آنسو گر رہے تھے۔

فریدہ نے اس تصویر کو بڑے انہماک سے دیکھنا شروع کیا۔ ایک ادھیڑ عمر کی حسن گم کردہ عورت ایک سادہ و صاف ساڑھی میں ملبوس ایک چوکی پر بیٹھی تھی چہرے پر افسوس و پشیمانی کے نہ مٹنے والے گہرے نقوش تھے شوخی و رعنائی کی متانت و سنجیدگی نے لے رکھی تھی۔ "آہ! زمانہ کتنا انقلاب انگیز ہے"! بڑھیا کی دلخراش آواز نے اس عبرتناک داستان پر مہر سکوت ثبت کی۔ اور دونوں خنک و تاریک شب بسر کرنے کے لئے شمع گل کر کے سونے اور گرم بستروں میں لیٹ گئیں۔

آج کی رات فریدہ کے لئے بہت اضطراب انگیز تھی۔ وہ دھڑکتے ہوئے دل کے احساسات اور بوجھل دماغ کے تفکرات سے گہری نیند سو کر تعلق منقطع کر دینا چاہتی تھی لیکن نیند تھی کہ بدستور بھاگے جا رہی تھی۔ اور خیالات بڑی تیزی سے اپنا دامن ایک دوسرے سے جوڑ رہے تھے۔ زندگی کے ہر مرحلہ اور ہر واقعہ کی یاد اسے متوجہ کر رہی تھی۔ شدت فکر و غور سے اس کے بدن کی حرارت اعتدال سے بہت بڑھ چکی تھی "ماضی اور مستقبل" دونوں پر اس کی نگاہ تھی۔ اس میں شمولیت کے لئے جانے والے دلیر و جری نوجوان کا خیال اسے ماضی کی طرف کھینچ رہا تھا۔ اسے یاد تھا۔ کہ آج سے ایک سال قبل گاؤں میں "طبل جنگ" بجا تھا۔ اور گاؤں کا ایک نوجوان جو اس کی نگاہوں میں باقی جوانوں سے بہت زیادہ حسین باشکوہ قابل اور دلیر تھا۔ اپنے ہمراہیوں کے ساتھ اپنے تمام حسن و شباب کو وطن عزیز کی آزادی پر قربان کرنے کے لئے عشق و محبت اور اپنے گہوارہ طفلی دونوں سے منہ موڑ کر چلا گیا تھا۔ فریدہ اکثر اس نوجوان کو یاد کیا کرتی تھی لیکن آج اس کے خیال نے دل و دماغ کو بے حد گھیر رکھا تھا وہ سوچ رہی تھی۔ کہ اپنے مستقبل کو اپنے کیف انگیز حسن و شباب کو اس نوجوان کے وجود میں غرق کر دے یا بڑھیا کی طرح امراء و رؤسا کی رنگین محافل میں لٹا دے دل و دماغ میں کشمکش تھی۔ دل کا تقاضا تھا کہ بہادر نوجوان کی آغوش ہی بہترین عشرتکدہ ہے لیکن وہ سوچتی تھی کہ دولت و ثروت، شان و شوکت بچارے نوجوان کے ہاں کہاں، بے شک وہ عزت و شہرت اور علم و کمال سے مالا مال ہے لیکن عزت و شہرت اور علم و کمال کوئی ایسی شے تو نہیں جس سے آرام و آسائش حیات نصیب ہو سکے۔ وہ سوچ رہی تھی ایک طرف "نوجوان و محبت" اور "نسوانیت" تھے۔ دوسری طرف "عشرت محافل اور دولت و شوکت" تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آج رات وہ ان دونوں کے مابین کوئی قطعی فیصلہ کر لینا چاہتی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی۔ کہ آج کل محافل کی بجائے پردہ فلم پر بھی ایک ماہرہ فن کے دلفریب رقص و سرود کے مناظر بے بہا دولت حاصل کر سکتے ہیں۔ اسی نوع کے خیالات و تفکرات کی الجھن کو اس نے سلجھا ہی لیا۔ وہ قطعی فیصلہ کر چکی تھی۔ کہ "عزت و ناموس" پر "دولت و آسائش" کو ترجیح نہیں دی جا سکتی۔ محض دولت و شوکت کو پانے کے لئے ساری "عمر و قار نسوانی" کو عوام کے قدموں پر ڈالنا، جس "رنگ و حسن" کو بڑھتی ہوئی گرمی و سردی جھلس دیتی ہو۔ اسے بے باکی سے ہزاروں کے سامنے محض ان کی تفریح طبع کے لئے لٹاتے رہنا خود "حسن و شباب" اور "نسوانیت" کی بدترین توہین ہے۔ وہ فیصلہ کر چکی تھی۔ اب نوجوان، دلیر و دیوتا نوجوان اس کے تفکرات کا مرکز تھا۔

جھونپڑی کے عقبی کمرہ کی دہلیز پر کھڑی ہوئی حسین و جمیل فریدہ کا ضیاپاش چہرہ طلوع ہونے والے سورج کی ابتدائی کرنوں کو شرمارہا تھا۔ بڑھیا کی آواز پر روزمرہ کے معمول کے مطابق فریدہ نے کمرے میں داخل ہو کر "رقص و سرود" کی مشق شروع کر دی۔ اس کی نازک و مرمریں انگلیاں، رباب کی تاروں پر تیزی سے حرکت کر رہی تھیں۔ نغمے وجد آفریں و حیرت زا نغمے پھوٹ رہے تھے۔ بڑھیا مبہوت تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہوا تھم گئی ہے اور پرندوں نے پرواز بند کر دی ہے۔ نغمے بندیوں سے لوٹ کر گہرائیوں میں کھو رہے تھے۔ کہ مست شباب مطربہ نے سرشار ہو کر رباب پھینک دیا اور رقص کرنے لگی کمرے کی مرمریں فرش کی چھاتی پر بلوریں پاؤں مینڈلیاں رقصاں تھیں۔ پاؤں کی ہر حرکت کے ساتھ کافر ادا رقاصہ کے جسم کا ہر مو متحرک تھا۔ فضا میں ایسا جوش تھا۔ کہ کھڑکیوں سے باہر ہوا میں اڑتا ہوا ہر پرندہ جنگل کے درخت کا ہر پتہ گلشن گنگا کی ہر موج اور پہاڑ کا ہر جانور مست ہو کر رقصاں ہے۔ وہ ناچ رہی تھی۔

والہانہ و بے خود۔ رقص کے ساتھ اب وہ گا رہی تھی۔ بڑھیا ساکت و مبہوت اپنی شاگردہ کے اوج کمال کو دیکھ رہی تھی۔ اس کا تعجب ہر لمحہ بڑھ رہا تھا۔ باکمال رقاصہ رقص کی لاہوتی کیفیات میں سرشار بڑھیا کے مسند کی طرف بڑھی۔ آہ! اس کا تار نفس ٹوٹ چکا تھا۔ باکمال شاگردہ "عروج فن" کے سامنے آج اس کی زندگی خاموش تھی۔ رقص کا سماں ٹوٹ گیا

جنگ جاری رہی۔ فریدہ اپنی جھونپڑی میں دلیر و حسین سپاہی کی انتظار میں رقص و سرود کی وجد آفرین کیفیات میں کھوئی رہی حتیٰ کہ جنگ ختم ہو گئی بہت سے سپاہی فاتح و کامران لوٹ آئے۔ لیکن وہ جوان جو فریدہ کی نگاہوں میں سب سے زیادہ دلیر و حسین تھا۔ وطن کی آن پر قربان ہو گیا۔ گاؤں کے باہر اونچے پہاڑ کی چوٹی پر ایک برجی نصب کی گئی جس کے سینہ پر مرنے والے دلیر کی داستان دلیری رقم تھی۔ ایک شام فریدہ اس کی فلک بوس برجی کی بارگاہ میں حاضر ہوئی۔ اپنے غیور وطن دوست، دوست کی یاد میں، فضا کو تھام دینے والا رقص پیش کیا اس کی نوجوان زندہ جاوید روح کو حاضر کرنے کے لئے خوش گلو رقاصہ نے ایک درد انگیز گیت گایا جس میں خود اس کی روح تحلیل تھی۔

کس کو پرواہ تھی اور کس میں یہ دم رکھا تھا
وادیٔ غربت میں جب ہم نے قدم رکھا تھا
دور تک یاد وطن آئی تھی سمجھانے کو

رقص و گیت ختم ہو گئی۔ اور فریدہ بے جان برجی پر جان قربان کر گئی۔

ناچیز بھینٹ

نیچے جمنا کا جل بہہ رہا تھا۔ پاس ہی پہاڑوں پر گھنا جنگل تھا۔ گورو گوبند چٹان پر بیٹھے گیان چرچا کر رہے تھے۔ ان کا دولتمند چیلا رگھوناتھ آیا اور شری چرنوں میں پرنام کر کے بولا۔ میں اپنی ناچیز بھینٹ لایا ہوں۔ اگرچہ آپ کے نا قابل ہے۔

اس نے گورو دیو کے نزدیک ہی ہیروں سے جڑے ہوئے بیش قیمت سونے کے دو کڑے رکھ دیئے۔ گورو دیو نے ایک کو ہاتھ سے اٹھا لیا۔ ہیروں سے روشنی نکل رہی تھی۔ گورو دیو کڑے کو ہاتھ میں لیکر گھمانے لگے۔ کڑا ہاتھ سے چھوٹ کر جل میں جا گرا۔

"کیا ہوا؟" کہہ کر رگھوناتھ جل میں کود پڑا شانتی چت گورو دیو پھر گیان چرچا کرنے لگے۔

شام ہو گئی۔ رگھوناتھ لوٹ کر گورو دیو کے پاس آیا۔ اس کے تمام کپڑے بھیگے ہوئے تھے۔ ہانپتے ہوئے اس نے کہا اگر آپ بتائیں کہ کڑا کدھر گرا۔ تو میں اب بھی اسے نکال لاؤں گا۔

گورو دیو نے دوسرے کڑے کو جل میں پھینک کر کہا "وہاں" (ٹیگور)

غزل

چاندنی رات ہے جوانی بھی
کیف پرور بھی اور سہانی بھی

ہلکا ہلکا سرور رہتا ہے
عیش ہے عیش زندگانی بھی

دل کسی کا ہوا کوئی دل کا
مختصر سی ہے یہ کہانی بھی

اپنی اپنی جگہ پر اچھی ہے
بدگمانی بھی مہربانی بھی

بارہا بیٹھکر سنا چپ چاپ
ایک نغمہ ہے بے زبانی بھی

بت پرستی کا جو نہیں قائل
کیا جوانی ہے وہ جوانی بھی

عشق بدنام کیوں ہوا رہبر
کوئی سنتا نہیں کہانی بھی

رہبر
بی اے

نوشتہ وامن چور گھڑے — مترجمہ امجد یوسف زئی عثمانیہ

گھاٹ پر

(وامن چور گھڑے مرہٹی زبان کے مشہور نوجوان افسانہ نگار ہیں۔ ان کی دو کتابیں سوتیما اور مہر دے بہت مقبول ہوئی ہیں مختصر افسانے لکھنے میں انہیں کمال حاصل ہے ذیل میں ان کے ایک افسانہ کا ترجمہ درج کیا جاتا ہے — امجد)

سبھی اتنا کام ہو گیا؟ ذرا مجھے بھی دیگی وہ جگہ؟ یہ بات' یہ سوال ایک ہی منہ کا نہ تھا بلکہ آتی ہوئی ہر ایک عورت اپنے دھونے کے کپڑوں کی گٹھڑی گھاٹ کی سیڑھیوں پر ٹپکتی اور اپنی پہچان کی دوسری عورتوں سے پوچھتی اور وہ پہچان والی عورتیں بھی جواب میں' ہاں یہ ابھی ہوا — ایسا یا ایسا ہی کچھ کہتیں۔

ویسے ہمیشہ سب کام کاج بڑے میل جول سے چلتا رہتا تھا۔ بیچ بیچ میں لڑائی جھگڑا مچ جاتا تھا لیکن وہ بالکل معمولی ہوتا۔

اس تلویہ کا پانی کا رنگ ہرا اور گندا ہو گیا تھا لیکن وہ سب اسی سے اپنے کپڑے دھویا کرتی تھیں۔ صاف آسمان کی پرچھائیں کبھی اس تلویہ میں پڑ جاتیں۔ تو وہ پانی کچھ چمکنے لگ جاتا۔ وہ چمک بھی کتنی بھیانک تھی۔ ملائم گول مٹول کبوتر کو نگل کر جیسے اصغر (ایک بڑا سانپ) مطمئن دکھائی دیتا ہے۔ ویسے ہی وہ چمک دکھائی دیتی تھی۔

چھوٹے چھوٹے ننگ دھڑنگ بچے اور ماں کا آنچل پکڑے روتی ہوئی بچیاں ماں کے غصہ کی پروا کیے بغیر سطحوں کو تکتی ڈبکی مارنے والے شریر لڑکے ..... سب کا شور و غل۔ اور کپڑے دھونے کی پھٹ پھٹ یوں محسوس ہوتا تھا کہ یہ شور کبھی ختم نہیں ہوگا!

گھٹنے تک پانی میں پیر ڈبائے ہوئے گھاٹ کی آخری سیڑھی پر بیٹھ بیٹھ کر وہ سب ایکدم اپنے کپڑوں کی گانٹھیں دھپ دھپ پچھاڑنا شروع کر دیتیں۔ آس پاس کی عورتوں پر چھینٹیں اڑتے۔ جواب دے کون؟ جواب دینے کی فرصت بھی کسے؟ اس کے بعد گھر کا کام کاج شروع ہو جاتا۔ گھر لوٹتے لوٹتے وہ ساڑھیاں، دھوتیاں سوکھ جائینگی۔ کون پروا کرے گا

ان کے پیر پانی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ ہر ایک کے ہاتھ سے چھینٹیں پانی میں پڑتیں اور وہ پانی میں تھوڑی سی حرکت پیدا کرتیں۔ اسی وجہ سے پانی میں ابھری ہوئی ان کی وہ پرچھائیں بھی تھرتھرا جاتیں۔

ایک گھاٹ اور دوسرا گھاٹ۔ ان دونوں ہی گھاٹوں پر آمد و رفت جاری تھی۔ پرانے اور میلے کپڑوں کا گویا بازار لگا تھا۔ ادھر کا شور ادھر سنائی نہیں دیتا تھا ہاتھوں کے ساتھ زبانیں بھی چل رہی تھیں۔

ایک شریر لڑکا پانی میں پتھر پھینک رہا تھا۔ کسی ایک عورت کو وہ کہیں ذرا سا چھو گیا۔

کیوں رے؟ کیا تیری دونوں آنکھیں پھوٹ گئی ہیں۔

کس کا ہے ری یہ سپوت؟

ہوگا کسی موئی کا!

اری تجھے نہیں معلوم۔ یہ بنی کا لڑکا ہے' پہلے پتی کا۔

ارے رام کسی کا جی بڑی ہمدردی سے امڈ آیا۔ اس لڑکے کا رنگ اور روپ اور ڈیل ڈول ہی ایسا تھا۔

بنی نے اپنے پتی کو کیوں چھوڑ دیا۔ کس وجہ سے؟

وجہ کاہے کی۔ کہتے ہیں باہر کسی سے پریم تھا۔

تو کیا ہوا یہی بہانہ بن سے پتی برتا نہیں۔ فضول ہی بدنام کرے پتی کو۔

اس رانڈ کا ہی من کہیں بدل نہ گیا ہوگا۔

یہ تو موا روز کا ہی رونا ہے۔ چل ری سانتی گھر کو۔

سانتی کو کیا جلدی ہے۔ بڑھاپے کی شادی۔ لاڈلی رادھا چڑیل کی دیوی اور ....

واہو۔ کیا رادھا دیوی ہے۔ مگر ادھر پانی روپے روپے میں اور بابا جلے روپے میں کسی کی دبی ہوئی آواز اور دو عورتوں کی ہنسی۔ انڈپڑی کسی میں ذرا بھی خامی یا نقص دکھائی دیا کہ وہ ان کے ہنسنے بولنے کا موضوع بن جاتا۔ انہیں اس کا یقین تھا کہ دنیا میں اگر کوئی خوش ہے تو وہ ہمیں ہیں۔ ممکن ہے کہ شاید وہ دکھ کی وجہ سے ایسی بن گئی ہوں۔ اور اس کا بھی امکان ہے کہ ان کے الفاظ کی لعنت سے سکھ دکھ نام کے صفحے ہی پھٹ گئے ہوں۔

پھر سے نیا کوئی موضوع چھڑ گیا۔

آہا! آو تلسی ماں بہت دنوں کے بعد دکھائی دیں۔ آج کو یا ابھی ہی آئی ہو؟

گئی تھی تیرتھ کرنے مہادیو کی یاترا میں۔

کیوں جی وہاں کیا کیا۔ کچھ ہوتا؟ دنیا بھی ملا؟ کسی مورتی کے چرنوں کے پاس ایک آدھ پیسہ تو مورتی بھی ملا تا نہیں۔

سجنی! ذرا زبان سنبھال کر بول۔ ٹھاکر جی کے نام پر یہ کیا بول رہی ہے یہ بڑے بول مگر یاترا کو گئی تھی تو پھر بن ٹھن کر اور میرے پیروں میں کھسک پڑے پیجن۔

چڑھ گئے ہونگے مہادیو کو۔

اچھی ہی رہی تمہاری یاترا۔

اور کیا ......؟

ذرا ٹھہر شانتا — اس گھاٹ کی طرف دیکھ، کیسی بھیڑ مچی ہے؟

سب عورتیں دوسرے گھاٹ کی طرف دیکھنے لگیں۔

کون گرا تالاب میں؟

رام جی کی بہو

کون؟ پاروتی؛ کیسے گر پڑی؟

ارے رام — ابھی پرسوں ہی تو ہلدی چڑھی تھی۔ اور بچہ بھی کیسا گلزار سا تھا۔ گئی بیچاری سہاگن ہوگئی، سکھ پایا

گھر کا کام دھندا ہی چھوڑ کر بھاگتی۔ دوڑتی آئی ہوگی بیچاری نہ جانے وہ کو بھی پورے ہوئے ہونگے یا نہیں۔

جانے دو موئی کو آگ پڑے، اچھی یاد دلائی۔ گھر میں دال چڑھا آئی ہوں سو ویسے ہی جل جل جائیگی۔ جانا ہے جلدی سے نہیں تو گھر بھر کو آگ لگ جائیگی

ری ٹھہر بھی۔ میرا تو کام ہوگیا ہے چکی پر آٹا میں چھوڑ آئی ہوں۔ سو پیسونگی۔ پھر کہیں روٹی .....

یہاں کون مرا بیٹھنے کے لئے آیا ہے۔ ہم بھی چل رہی ہیں۔ ٹھہو ری جانے والیو!

مجھے بھی دیری نہیں ہے۔ ٹھہر ذرا بڑھا۔ ایے گھر جانا ہے نہیں تو کھا جائینگے سب گھر والے۔

ارری — مگر وہ دیکھ رام جی کا لڑکا آیا ہے۔ پاروتی کو پانی کے باہر نکالنے دیکھوا پانی میں اُترے گا۔

تو بھلا ٹھہری رہ — ادھر تو میرا سارا گھر گرجے گا جب تک ہیں تب تک سب نبھانا ہی ہے۔ جانا ہوگا تب ہم بھی چلی جائیں گی۔

ایک ایک عورت جانے لگتی اور خالی پڑے ہوئے پتھر پر دوسری عورت آکر کپڑے دھونا شروع کر دیتی۔

گھٹنوں تک کے پانی میں پیر ڈبائے ہوئے وہ اپنے کپڑے زور سے دھو رہی تھیں۔ ان کی پرچھائیں اس ہرے پانی میں لگاتار تھرتھرا رہی تھیں رام جی کی بہو کی لاش ابھی تک باہر نہیں نکلی تھی۔ بادلوں کی پرچھائیں اس تلیہ میں ادھر ادھر تیرتی چلی جا رہی تھیں۔

خط و کتابت کرتے وقت اپنے نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دیں ورنہ عدم تعمیل کی شکایت معاف!

محسوسات

حسن جب دیوانگیٔ عشق کا محرم نہ تھا
آج جو عالم ہے مدہوشی کا وہ عالم نہ تھا

جب پرستی تھی تری نظروں سے صہبائے خلوص
دل کی امیدوں کا عالم اس قدر برہم نہ تھا

اے خوشا مضبوطیٔ عزم و وفاداریٔ عشق
حسن کا کوئی ارادہ اس قدر محکم نہ تھا

دل کی بیچینی کا دامن تھام لینا تھا حجاب
ورنہ ان کے دل میں بھی دردِ محبت کم نہ تھا

میری نظروں کا اشارہ، میری نظروں کا سوال
آپ سمجھے تھے کہ مبہم ہے، مگر مبہم نہ تھا

عشق کو شدت سے تھا احساسِ معیارِ وفا
حسن کی بے اعتنائی کا ذرا بھی غم نہ تھا

کس نے بخشا دنیا و عقبیٰ کو نورِ زندگی
حسن گر جلوہ نمائے بزمِ دو عالم نہ تھا

موجؔ ان کا عالمِ خفگی قیامت تھا کہ جب
اک تبسم بھی نثارِ دیدۂ پُرنم نہ تھا

موجؔ (علیگ)

کشور ساہو بی اے

لال کوٹھی

(مسٹر کشور ساہو بی اے مشہور فلم آرٹسٹ ہیں جن کے چند افسانے اور مقالات اردو رسائل و جرائد میں شائع ہو چکے ہیں ذیل میں ان کا تازہ ترین افسانہ نذر قارئین کیا جا رہا ہے (عزیزی)

جب ہم لوگ میوزیم، سیش باڑی اور جوناگڈھ دیکھکر لوٹے تو چھ بج چکے تھے۔

"بھئی کھانا تیار ہے، منگوایا جائے؟ دورکا نے پوچھا۔

"یار" میں نے کہا: ابھی تو بھوک نہیں۔"

"بغیر کھائے ہوئے تم جا بھی نہیں سکتے۔"

"تو ساتھ بندھوا دینا!"

"اچھا مگر چائے لسی کچھ تو؟"

"لسی چاہو تو منگوالو"

دورکا لسی منگوانے نیچے چلا گیا۔

سامان تو تیار ہی تھا میں کمرہ سے باہر نکلکر ٹہلنے لگا۔

جس چھت کے کنارے والے کمرہ میں میرے رہنے کا انتظام کیا گیا تھا وہ معد کا کی عالیشان کوٹھی کی چوتھی منزل پر تھا یہاں سے سارا شہر بخوبی دکھائی دیتا تھا ساٹھ واڑے کے شہر ہی نرالے ہیں مکان اکثر چھجے دار اونچے اور پتھر کے بنے ہوتے ہیں جن پر کمال کی نقاشی ہوتی ہے سو کر اٹھنے کے بعد اسی چھت پر نکل کر ہر روز میں بڑی دیر تک ٹہلا کرتا تھا اور راجپوتی ٹھاٹ کے بنے ہوئے ان ہشیار مکانوں کی چھوٹی چھوٹی کھڑکیوں کے پٹ ایک کے بعد ایک کھلتے ہوئے دیکھا کرتا تھا۔ ان پانچ چھ دن میں ہی اپنی اس چھت کے چاروں طرف کے ہر مکان ہر کھڑکی اور ہر چھت سے پورا واقف ہو گیا تھا سچتے ہیں۔ دل میں رہتے رہتے در دبھی دل ہو جاتا ہے۔ آج بیکانیر چھوڑتے ہوئے مجھ کو دکھ ہو رہا تھا بیکانیر اکیلا نہیں چھوٹ رہا تھا دورکا چھوٹ رہا تھا میرا وہ کمرہ چھوٹ رہا تھا اس کمرے کی دیواروں پر کسی پرانے مصور کی بنائی ہوئی رنگین تصویریں چھوٹ رہی تھیں جن کو میری آنکھیں ہر روز سونے سے پہلے گھنٹوں بڑی دلچسپی سے دیکھا کرتی تھیں کبوتر کا وہ جوڑا چھوٹ رہا تھا جو میرے کمرے کی ایک جالیدار کھڑکی میں رہتا تھا۔ وہ اونٹ بھی چھوٹ رہے تھے جو صبح و شام پیٹھ پر پانی کی پکھال لادکر میری کھڑکی کے پاس والی گلی سے گذرا کرتے تھے۔

جلدی جلدی ــــ سیڑھیوں پر چڑھتا ہوا دورکا میرے پاس آیا۔

"دیکھنا پتنگ اپنی ہی چھت پر گرنے والی ہے، دیکھو ہوا ادھر ہی کی ہے"

"کونسی پتنگ کٹنگی، بولو؟" میں نے پوچھا: "پتنگ کی لڑائی میں مجھے لطف محسوس ہو رہا تھا کئی لوگ اپنی اپنی چھتوں پر نکلکر تماشہ دیکھ رہے تھے۔

"سبز پتنگ کے آثار ٹھیک نہیں، دیکھو چکر کھانے لگی ...... کٹتی ہے اب"

دوسرے لمحہ سبز پتنگ کٹ چکی تھی، چکراتی، منڈلاتی وہ ہماری چھت ہی کی طرف آنے لگی۔ آس پاس کی تنگ گلیوں میں لڑکے بانس اور لکڑیاں لیکر پتنگ پکڑنے اور ڈور حاصل کرنے کے لئے دوڑنے لگے۔ ایک شور برپا ہو گیا۔

دورکا لپکا، پر ڈور اس کے ہاتھ نہ لگا پتنگ بازو والے لال پتھر کے مکان کی چھت پر جا گری۔

"لال کوٹھی" دورکا بول اٹھا" پتنگ تو بس لال کوٹھی پر ہی قربان ہیں جتنی بھی کٹتی ہیں لال کوٹھی ہی پر گرتی ہیں۔ دیکھو نا لونڈوں کو معلوم تھا کہ پتنگ لال کوٹھی پر ہی پٹکے گی۔ پہلے ہی وہاں موجود ہیں۔

"کیوں دورکا، اس لال کوٹھی میں مجھے اب تک کوئی صورت دکھائی نہ دی کون رہتا ہے اس میں؟ میں نے پوچھا" مکان تو اتنا عالیشان ہے مگر اس کی کھڑکیوں کے پٹ میں نے کبھی کھلے نہیں دیکھے، کس کا مکان ہے؟

"ارے کیا بتائیں ...... لمبا قصہ ہے پچھلے تین سال سے تو خالی ہی ہے۔ لوگ کہتے ہیں اس میں بھوت رہتا ہے۔

بدری دو گلاس لسی لئے کھڑا تھا۔ دورکا ایک گلاس مجھے دیکر اور دوسرا آپ لیکر بولا۔

"کیوں رے بدریا۔ پھر لال کوٹھی میں رات تک کوئی نہیں آیا ہے، سنتے ہیں کوئی اسے خرید رہا تھا؟"

"کون مول لے مالک اس بھوتیا گھر کو" بدری بھویں تان کر آنکھیں مٹکاتا ہوا بولا۔

بدری خالی گلاس کھن کھن بجاتا ہوا نیچے چلا گیا۔

"کیوں دورکا" میں نے پوچھا: "بھوتیا گھر ــ ستا مارتن ــ یہ کیا معاملہ ہے؟"

"معاملہ واملہ کچھ نہیں، ایک چھوٹی سی دردبھری پریم کہانی ہے، بات تو دیسے ذرا لمبی ہے مگر موٹر تنے میں ابھی دیر ہے۔ اگر سننا چاہو تو سن لو۔

"ذرا ٹھہرو" میں نے کہا "کمرے سے سگرٹ کا ڈبہ لے آؤں"

چھجے پر پتھر کی بنی ہوئی ایک بنچ تھی اس پر ہم لوگ بیٹھ گئے۔ دورکا نے

منہ سے دھواں کا حلقہ اڑاتا ہوا لال کوٹھی کی چوتھی منزل کی ایک کھڑکی کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرتا ہوا بولا۔

"اس کھڑکی سے میں نے پہلی بار اسے جھانکتے ہوئے دیکھا تھا۔"

"کسے" میں نے پوچھا۔

"شیاما کو" اس کا پورا نام شیاما کنواری تھا لیکن تم ایسے نہیں سمجھو گے اچھا سنو بالکل شروع سے کہتا ہوں ..... جب سیٹھ سگن چند رلی یہ لال کوٹھی بنکر تیار ہو گئی تو انہیں فکر ہوئی کہ ان کے بعد اس عالیشان عمارت میں کون رہیگا۔ سگن چند کی عمر ڈھل رہی تھی اور راستہ ہی موڑ چکی تھی۔ اور اولاد کوئی نہ تھی۔ اس عمر میں دوسری شادی کرکے اولاد کی امید کرنے کے بجائے کسی لڑکے کو گود لے لینا ہی انہوں نے زیادہ بہتر سمجھا سیٹھ جی سٹہ کھیلنے کے عادی نہ ہونے کے سبب سے ایک اور ایک گیارہ نہ گن کر صرف دو ہی گننا اچھی طرح جانتے تھے۔ اور اسی سبب سے مطلبی لوگوں کے بیہودہ بہکاوے میں نہ آکر انہوں نے اپنے ایک رشتہ دار کو جس کا نام چمپالال تھا گود لے لیا اور اسی برس انہوں نے اس متبنیٰ لڑکے کی شادی بڑی دھوم دھام سے کرکے اپنی لال کوٹھی آباد کر لی۔

چمپا لعل کو میں بچپن سے جانتا تھا ہم لوگوں نے کئی مرتبہ ایک دوسرے کی پتنگ کاٹی تھی۔ اس کے بیاہ سے بھی میں واقف تھا۔ جس سال اس کی شادی ہوئی اسی سال سیٹھ سگن چند نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور چمپا لعل ان کی ساری جایداد کا مالک بن گیا۔

چمپا لعل کی بیوی شیاما کنواری جودھپور کے رہنے والی تھی اکیلی نہیں ساتھ کافی دولت زیور اور کپڑے کے علاوہ حسن وشباب اور امیدیں لیکر بھی آئی تھی — ہاں اور ایک پریمی بھی ساتھ تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ رتن سنگھ سے اس کی پرانی ملاقات تھی۔ جب شیاما جودھپور سے بیکانیر چلی آئی تو رتن سنگھ کے لئے اس کی جدائی ناقابل برداشت ہوگئی۔ رتن راجپوت تھا، تھوڑی سی زمین اور بوڑھی ماں اس کی ساری جایداد تھی۔ ماں نے پہلے تو رتن کو جودھپور چھوڑنے سے روکا لیکن جب اس نے زیادہ ضد کی اور کہا کہ بیکانیر ریاست کی فوج میں اسے نوکری مل رہی ہے۔ تو بیچاری نے آنکھوں میں آنسو بھر کر اجازت دیدی۔ رتن نے ماں کو بھی ساتھ چلنے کو کہا لیکن اس نے اپنا پرانا گھر چھوڑنا پسند نہ کیا

رتن سنگھ کو واقعی بیکانیر کی فوج میں جگہ مل گئی۔ وہ اپنی ماں کو برابر خط لکھا کرتا اور مہینہ میں ایک دو بار خود جودھپور جاکر اسے دیکھ بھال بھی لیتا۔

"نہ جانے کیسے رتن سنگھ اور چمپا لعل میں ملاقات ہوگئی اور روزانہ رات کو دونوں شطرنج کھیلنے کے لئے اکٹھے ہونے لگے کھیلتے وقت اگرچہ رتن کی آنکھ شطرنج کے بساط پر ہوتی ہاتھ مہروں پر ہوتا لیکن کان کنارے والے دروازہ ہی پر ہوتے آہستہ آہستہ پاؤں کی آواز اور دھیمی سے دھیمی چوڑیوں کی کھنک بھی اس کے کانوں تک پہنچ جاتی۔ ایک دن رتن نے دیکھا کہ دروازے کی دراز میں کاغذ کا ایک ٹکڑہ لٹک رہا تھا چمپا لعل کے پیچھے۔ رتن کا کوٹ کھونٹی میں لٹکا ہوا تھا رتن اپنے کوٹ سے رومال نکالنے کے بہانے اٹھا اور آہستہ سے اس نے وہ کاغذ کا ٹکڑا کھینچ کر اپنی جیب میں رکھ لیا۔

"ہاں تو" دورکا نے ایک لمبا کش لیکر سگریٹ کا ٹکڑا پھینک دیا "رتن جب گھر لوٹا تو سب سے پہلے اپنی جیب سے اس کاغذ کے ٹکڑے کو نکال کر قندیل کے پاس گیا اور پڑھنے لگا۔ اس میں لکھا تھا "پیچھے کی چھت کا کواڑ کھلا رہیگا۔ رات کو گیارہ بجے۔"

اس کے بعد رتن اور شیاما برابر ملتے رہے شیاما نے شاید ملازموں کو ملا لیا تھا جب رتن کو شیاما سے ملنا ہوتا یا جب شیاما کی ملازمہ گوپی رتن کو بلانے آتی تو رتن فوراً دیوار پھاند کر لال کوٹھی کے پیچھے والی چھت پر جا پہنچتا۔ یہاں کے مکانوں کی دیواریں اور چھتیں ایک دوسرے سے کس طرح ملی ہوئی ہیں۔ یہ تمہیں معلوم ہی ہے ایک گھر سے دوسرے میں چلا جانا کوئی بڑی بات نہیں اور پھر لال کوٹھی کے پیچھے والی وہ چھت تو تم دیکھ ہی رہے ہو۔ خیر کئی مہینے گذر گئے شیاما اور رتن کی ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ اور چمپا لعل کو اس کی قطعی خبر نہ ہو سکی۔

شیاما رتن کو کہاں تک چاہتی تھی۔ یا رتن شیاما کو کتنا پیار کرتا تھا یہ کہنا بہت مشکل ہے جب کبھی مذاق کرتا ہوا رتن اس سے کہتا۔

"ماں نے مجھے بلایا ہے۔ اور اب کے شاید میں نہ لوٹوں" تو شیاما کی آنکھوں میں آنسو بھر جاتے "اگر تم نہ لوٹے" وہ کہا کرتی "تو میں زہر کھا لونگی" تو رتن اس کے گالوں کو چوم کر کہتا "پگلی کہیں کی ایسا بھی کہیں ہو سکتا ہے۔" اور پھر اس کی صورت سے تفکر ظاہر ہونے لگتا اور وہ کہتا "شیاما اگر تم میری ہی بیوی ہوتیں تو کتنا اچھا ہوتا؟"

"قسمت کا لکھا کون مٹا سکتا ہے" رتن کے گالوں پر وہ اپنے ہاتھ پھیرنے لگی "میں نے اپنی طرف سے تو کچھ بچا نہیں رکھا سب کچھ تمہیں کو دیدیا ہے۔"

"ہاں شیاما میں بڑا خود غرض ہوں، اپنے حصہ سے زیادہ چاہتا ہوں"

"رتن" شیاما اس کا ہاتھ پکڑ کر بولی "چلو کہیں بھاگ چلیں دور۔ بہت دور"

"میرے پاس دھن دولت تو ہے نہیں، یہ کپڑے، یہ گہنے، یہ نوکر چاکر، یہ مکان، یہ آسائش تمہیں وہاں میرے ساتھ کہاں نصیب ہوگا شیاما؟"

"مجھے یہ سب کچھ نہیں چاہئے" وہ کہتی "تمہارے ساتھ جہاں چاہو گے میں چلونگی" پھر وہ رونے لگی۔

ایک پورنما کی رات کا میں ذکر کرتا ہوں، قریب بارہ بجے ہونگے بالکل سناٹا تھا۔ لال کوٹھی میں لگی ہوئی رات کی شہزادی مہک رہی تھی" اور اس کھڑکی میں" دورکا نے پھر لال کوٹھی والی چوتھی منزل کی اس کھڑکی کی طرف اشارہ کیا "شیاما اور رتن بڑی دیر سے ایک دوسرے کی باہوں میں جکڑے ہوئے آسمان پر چاند اور بادلوں کی آنکھ مچولی دیکھ رہے تھے۔ شیاما رہ رہ کر کچھ پریشان سی دکھائی پڑتی تھی۔

"تم آج کیوں آئے؟" شیاما نے پوچھا "میں نے گوپی کے ہاتھ کہلا بھی بھیجا تھا کہ آج نہ آنا۔ تم سے نہیں کہا اس نے؟"

"کہا تھا لیکن کل میں جودھپور جا رہا ہوں، ماں بیمار ہے، سوچا جانے سے پہلے تم سے ملتا جاؤں معلوم نہیں کب آنا ہو شیاما نہ جانے کیوں مجھے ایسا معلوم ہو رہا ہے

کہ یہ اپنی آخری ملاقات ہے "

" نہیں نہیں رتن! ایسا نہ کہو" شیاما نے اس کے منہ پر اپنی مہندی رچی ہوئی نازک ہتھیلی رکھدی "تمہارے بغیر میں کیسے جی سکونگی لیکن ...... تم ابھی چلے جاؤ "

"کیوں ؟"

" آج میں ان کے ساتھ....."

" تو پھر انہوں نے آنے کیسے دیا ؟"

" وہ سو رہے تھے گوپی نے چپکے سے جاکر مجھے جگایا اور میں ——"

" چپکے سے اٹھکر چلی آئی ؟"

" چلے جاؤ رتن" شیاما نے مضطرب لہجہ میں کہا "پہلے جاؤ، دیکھو اگر انہوں نے مجھے وہاں نہ پایا تو ——"

" اچھا شیاما! مگر آج تم کتنی خوبصورت معلوم ہو رہی ہو" پھر اس نے اس کے نرم گالوں کو چوما اور خوشبودار زلفوں کا بوسہ لیا۔ چاندنی میں جگمگاتے ہوئے بور کو بھی چوما۔

" بور کیا چیز ہے" میں نے پوچھا۔

" بور ماڑواڑی عورتوں کے ماتھے پر ایک گول زیور تم نے نہیں دیکھا ہے؟"

" اچھا جو سرچ لائٹ کی طرح —— وہ تو نہیں ؟"

" ہاں ہاں، وہی" دورکا نے ہنسکر کہا "بور سہاگ کی نشانی ہے..... ہاں تو اسی وقت گھنٹہ بجا شیاما اپنے کو چھڑانے کی کوشش کرنے لگی "

" جاؤ رتن بھاگ جاؤ جلدی سے"

" تمہارا بور کتنا سندر ہے کتنا بھلا لگتا ہے شیاما! —— معلوم ہوتا ہے کہ میں تمہارے اس بور سے بھی محبت کرنے لگ گیا ہوں"

" یہ بور تمہارے ہی لئے تو پہنتی ہوں رتن ——"

اسی وقت کسی کے آنے کی آہٹ ہوئی۔ دونوں نے چونک کر دیوار کی طرف دیکھا۔ اور پھر ایک دوسرے کی طرف ۔" رتن" شیاما نے گھبرا کر کہا۔ اپنے بازوؤں میں رتن نے اسے اور زور سے جکڑ لیا۔ دروازہ کی کنڈی کسی نے کھٹکھٹائی۔ شیاما کی پیشانی پر پسینہ کے بڑے بڑے موتی جھلکنے لگے۔ اس نے اپنے کو اس کے بازوؤں سے چھڑا لیا دوڑ کر وہ دروازہ کے پاس گئی اور پھر لوٹ آئی —" شاید وہ ہیں" اس نے کراہ کر کہا۔

کنڈی برابر بج رہی تھی۔

" کون ہے" شیاما نے زور سے پوچھا۔

" میں، کھولو"

آواز چمپالال کی تھی

شیاما نے رتن کا ہاتھ پکڑ کر کہا "بھاگ نکلو کہیں سے رتن ..... سنو جلدی کرو" رتن کی آنکھیں بے چینی کے ساتھ اس کمرہ سے باہر نکلنے کو ڈھونڈھنے لگیں۔ دروازہ وہی ایک تھا جس پر چمپالال کھڑا تھا ..... رتن سہم گیا۔

" رتن، رتن — میری لاج رکھو رتن ..... شیاما کا گلا سوکھ گیا اور وہ بجلی کی طرح کانپ اٹھی۔

رتن نے پھر شیاما کو اپنے پاس کھینچ لیا اس کے گالوں کو ایک بار پھر چوما۔ اس کے بور کو بھی چوما اس کی آنکھوں میں لمحہ بھر اپنی درد آہ اور پیار بھری نظروں سے دیکھکر کہا "جاؤ شیاما کھولدو دروازہ"۔ اور دوسرے لمحہ وہ کھڑکی کے پاس تھا۔

جوں ہی شیاما نے دروازہ کھولا چمپالال اندر داخل ہوا اس کی کھڑکی کے نیچے والی گہری سنسان اور اندھیری گلی میں" بھد" سے گرنے کی ایک آواز ہوئی۔ جو صرف شیاما ہی کے کانوں تک پہنچ سکی ....

" شیاما" چمپالال نے اپنی بیوی کے دونوں کندھوں کو ہاتھ سے پکڑ کر کہا "ابھی ابھی میں نے ایک بہت ہی بھیانک خواب دیکھا ہے تم — تم چلی کیوں آئیں؟"

" وہاں بڑی گرمی تھی۔ مجھے نیند نہ آئی"

" میں بھی نہ سو سکا نیند میں مجھے بڑا خوفناک خواب دکھائی دیا میں نے دیکھا۔ ہم لوگ ایک پہاڑی پر چڑھ رہے ہیں اچانک تمہارا پاؤں پھسل گیا اور تم چٹان سے نیچے گر گئیں میں دوڑ کر تمہارے پاس پہنچا لیکن تم تم ..... اچانک میری نیند ٹوٹ گئی۔ او جب میں نے تمہیں بستر پر نہ پایا۔ تو ......"

شیاما نے دوپٹہ سے پیشانی پر کا پسینہ پونچھا۔ او مسکرانے کی کوشش کی لیکن الٹے اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

" کیوں تم کانپ رہی ہو ؟"

" کہاں کانپ رہی ہوں" شیاما کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

" کیا بات ہے شیاما، طبیعت تو ٹھیک ہے نا ؟"

" میں اچھی ہوں تمہیں تو گھبرائے ہوئے ہو" اس نے پھر ہنسنے کی کوشش کی مگر پہلے ہی کی طرح ناکام رہی —— کونے میں پلنگ پڑا ہوا تھا چمپالال نے شیاما کو اسی پر بٹھا دیا اور آپ بھی اس کی بغل میں بیٹھ گیا شیاما نے اس کے سینہ پر اپنا سر رکھدیا۔

" کیا بات ہے بولو تو ؟ ارے تم تو پسینہ میں شرابور ہو رہی ہو شیاما مجھ سے کہو" چمپالال نے آج بڑے پیار سے اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرا پھر اس کی ٹھوڑی پکڑ کر اس کا چہرہ اٹھایا "شیاما! شیاما !" شیاما بیہوش ہو چکی تھی۔

دورکا نے ایک درد بھری آہ کی دوسری سگرٹ جلائی اور پھر داستان شروع کی۔

" صبح کو سارا بیکانیر اس گلی میں امنڈ آیا۔ رتن کا لہولہان سر دجسم اس جگہ پڑا ہوا تھا۔ پولیس نے تحقیقات کی کسی نے کہا موٹر سے ٹکرا گیا ہوگا۔ کوئی بولا کسی نے ڈنڈے سے مارا ہے، قصہ کوتاہ کچھ پتا نہ چلا۔ ادھر شیاما کا برا حال تھا اس رات جب اسکی بیہوشی دور ہوئی تو بخار چڑھ آیا اور بڑھتا ہی گیا جیسے تیسے دن گذرا۔ دو دن گذرے تین دن گذرے ... اسکی بدتر ہی ہوتی گئی بخار میں وہ بہت کچھ بڑبڑائی ہر وقت رتن رتن کی رٹ لگائے رہتی چوتھے یا پانچویں دن سورج نکلنے کے ساتھ لال کوٹھی کی شمع بھی گل ہو گئی ..... چمپالال کی تلاش ہوئی لیکن اس کا کہیں پتہ نہ تھا لوگوں کا خیال ہے کہ اس نے سنیاس لے لیا ...

دوغزلہ

بیا ورید اگر ایں جا بود زباں دانے غریب شہر سخنہائے گفتنی دارد

احسان دانش کی سحر نوائیوں کا اثر نکتہ رس سخن فہموں اور نکتہ چیں حسد زدہ حضرات پر مختلف نوعیت میں پڑ رہا ہے۔ اول الذکر اس کی اعجاز بیانیوں کو سنتے ہیں اور سر دھنتے ہیں، پڑھتے ہیں اور وجد کرتے ہیں اور شرزمۂ حساد نہ اسے سننے کی تاب رکھتا ہے نہ پڑھ کر سمجھنے کا یارا۔ جب احسان کے آسمانی نغموں سے فضا معمور اور ادبی اجتماعات سے غلغلۂ تحسین بلند ہو کر ان کے بہ جلنے کی تنہائیوں سے ٹکراتا ہے تو یہ لوگ اسے شور نشور تصور کر کے کانوں میں انگلیاں دے لیتے ہیں کہ مبادا کانوں کے ساتھ دل کے پردے بھی پھٹ جائیں۔ اور یہ نہ ہو تو کم از کم اس امکان ہی سے محفوظ ہو جائیں کہ ان کے تاریک دماغ کا کوئی گوشہ عکس پذیر ہو کر اچانک جگمگا اٹھے اور ان کے لئے سب سے آسان کام (حرف گیری) بھی سب سے دشوار بن جائے یا ادھر اپنی کج مج زبان اور ژولیدگی نگارش و بیان کے حسرت انگیں احساس کے پیش نظر تحدی (چیلنج) کی جرات کو بھی مفلوج پاتے ہیں تو اس باختہ ہو کر بلبلانے لگتے ہیں کہ "احسان کی شاعری فانی ہے۔ احسان کی غزل سرائی ناکام ہے۔ احسان غزل کا شاعر نہیں" وغیرہ ذالک من الخرافات۔ جب کوئی ان سے یہ پوچھتا ہے کہ احسان غزل کا شاعر نہیں تو کبھی نظم کا شاعر بھی ہے کہ نہیں؟ تو اس سوال پر بھی دائیں بائیں جھانکنے لگتے ہیں کہ صداقت کا اعتراف نصیب میں نہیں ۔۔۔ ذیل میں سحر نگار احسان دانش کا ایک دوغزلہ درج کیا جاتا ہے ایک ہی ردیف و قافئے میں دو زمینیں کو اس حد تک قائم رکھنا کہ مطلع سے لیکر مقطع تک کہیں خامی نظر نہ آنے، احسان کی غزل نگاری کا اعجاز کرامت ہے نکتہ رس اس کا اقرار کریں گے کہ تغزل، رنگینی، رفعت خیال، سوز و تنیت الفاظ، ندرت بیان، تازگی و رنگی کے سبب یہ دونوں کس قدر مرصع اور دلپذیر بن گئی ہیں۔ یہ تو آپ کو حق پہنچتا ہے کہ صنف غزل کے خلاف فیشن کے طور پر چیخ پکار کر کے جدید شاعری کے پانچویں سواروں میں شامل ہونے کا دم بھرنے لگیں۔ لیکن اس زمانہ کو روا نہ بانے کی ناکام و شرمساری کیونکر شرمندۂ اعتبار ہو سکتی ہے کہ آپ غزل کی صنف کے حقوق زندگی تسلیم کرتے ہوئے بھی غزل نگاری میں اپنے حریفان کامران کا منہ چڑ چڑا کر اپنے اشتعال حسد کو نقد و نظر کے لباس میں پیش کریں

ادارہ

غزل

اگر محبت کے مدعی ہو تو یہ رویہ روا نہیں ہے

جو شکوہ ہے روبرو نہیں ہے جو بات ہے برملا نہیں ہے

یہ روز تجدید عہد الفت، یہ روز پیمان دلنوازی

ہزار تسلیم کر رہا ہوں مگر یقین وفا نہیں ہے

بساط گردوں پہ ماہ و انجم زمیں کے دامن میں لالہ و گل

تجلیاں ہی تجلیاں ہیں کہ ہوش عالم بجا نہیں ہے

عجب نہیں ذلت وفا سے مجھے کسی دن نجات دیدے

یہی میری بے زباں محبت جو درخور اعتنا نہیں ہے

مرے سفینے کو جوش طوفاں جدھر بہائے ادھر بہا دے

مجھے تلاش خدا ہے آخر نہ ہو اگر ناخدا نہیں ہے

غم دو عالم خدا کے شایاں، غم زمانہ سے خوش زمانہ

زہے غم ارزانی محبت، مجھے غم ماسوا نہیں ہے

بجا بجا بیشمار عارض نظر نظر کو ترس رہے ہیں

مگر یہ دل کا معاملہ ہے نگاہ کا واسطہ نہیں ہے

ہزار نامہرباں سہی تو میں ایسا محسوس کر رہا ہوں

تمام دنیا میں جیسے کوئی ترے سوا آسرا نہیں ہے

غم محبت سے دور ہٹ کر بھی سینکڑوں مشکلیں ہیں لیکن

وہ آنسوؤں میں نمک نہیں ہے وہ تلخیوں میں مزا نہیں ہے

مری محبت عقیدتوں میں پرستشوں کی حدوں سے گذری

مگر وہ یوں بے نیاز مجھ سے کہ جیسے میرا خدا نہیں ہے

حسین چہروں کی آڑ لیکر جنوں کو آواز دینے والے

نگاہ سے ماورائی سہی تو شعور سے ماورا نہیں ہے

یہ تیرے جلووں کو جس نے جلوہ بنا دیا تہمتیں اٹھا کر

مرا وہ ذوق نظر سلامت خدا کی دنیا میں کیا نہیں ہے

یہ جانتا ہوں تری نظر ہے بلند شخصیتوں کی جویا

مگر کبھی ماننا پڑے گا جو میں ہوں وہ دوسرا نہیں ہے

مرے مصائب تو ہر نفس پر ترے کرم ہی سے مطمئن ہیں

وہ لوگ کس طرح جی رہے ہیں جنہیں ترا آسرا نہیں ہے

رہ طلب میں جہاں سے مڑتا ہے راستہ دل کی وادیوں کو

وہاں سے ہے سلطنت جنوں کی خرد وہاں رہنما نہیں ہے

میں حاسدانہ مخالفت کو بصیرتوں سے پرکھ رہا ہوں

کہ میرے ذوق ادب سے میرا عدو ابھی آشنا نہیں ہے

بجا کہ احسان نامرادی امید کی اک سزا ہے لیکن

خدا مرے دوستوں کو رکھے کہ دشمنوں کا گلہ نہیں ہے

غزل

وفا سے بیزار ہو چکا ہوں کہ احترام وفا نہیں ہے
اس آئینہ کو شکست کر دو یہ آئینہ آئینہ نہیں ہے

ہے تیرے کافر شباب سے خوب میری معصوم میگساری
سرور کی ایک حد ہے قائم غرور کی انتہا نہیں ہے

ہزار دل نے فریب کھائے ہزار جلوے نظر پہ ٹوٹے
مگر ابھی تک ہے ہوش اتنا بشر بشر ہے خدا نہیں ہے

یہ پھر تو کہیئے کہ ہے محبت بھی زندگی کی مسرتوں میں
یہ زندگی کی مسرتیں ہیں تو موت کا غم بُرا نہیں ہے

نہ جانے کس کس سے دل لگا کر وفا سے مایوس ہو چکا ہوں
نظر پریشاں ششش جہت ہے کوئی بھی درد آشنا نہیں ہے

غلط کہ تبدیل ہو چکا ہے جنوں سے میری نظر کا مرکز
ابھی تو اپنی جگہ ہے دُنیا ابھی تو ایسا ہوا نہیں ہے

تڑپ سکے جس قدر تڑپ لے مگر ذرا یہ خیال رکھنا
کہ جو ترا مدّعا ہے اے دل! وہ عشق کا مدعا نہیں ہے

بڑی بڑی پائمالیوں سے یہ راز کھلتا ہے اہلِ دل پر
غمِ محبّت نہیں میسّر تو زندگی کا مزا نہیں ہے

ہر اک بلندی کا بارِ پستی لئے ہوئے دوش پر کھڑی ہے
گزرنے والے گزر رہے ہیں مگر کوئی دیکھتا نہیں ہے

غلط ہے بالکل غلط کہ جلوؤں کے رحم پر عشق جی رہا ہے
میں اب وہاں ہوں کہ تو بھی شاید مرے مرض کی دوا نہیں ہے

یہ حُسن کی بے نقابیاں ہیں کہ غیرتِ عشق کے کرشمے
کبھی جو سجدوں میں سامنے تھا وہ اب مرادِ دعا نہیں ہے

حریم روحِ جمال تک ہے رسائی لے دیکھے صرف دل کی
تعیناتی حدوں سے آگے نگاہ کا راستہ نہیں ہے

اگرچہ فرصت زندگی میں نہیں ہے احسان! شادمانی
مگر میں خوش ہوں کہ میری فطرت غلام حرص و ہوا نہیں ہے

احسان دانش

میرزا ادیب
(بی اے آنرز)

(افسانہ)

گندگی

دوسرے شہروں کا ذکر چھوڑیئے ہمارے شہر میں تو یہ ایک عام دستور ہے کہ جیسے ہی کسی محلے میں ایک نیا ہمسایہ آتا ہے محلہ والے فوراً اس کے متعلق تحقیقات شروع کر دیتے ہیں مرد تو چند دن یا چند ہفتے اس معاملہ کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے لیکن عورتیں تو اسی دن اپنی نئی ہمسائی کے متعلق پوری پوری معلومات حاصل کر لیتی ہیں چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ اگر دوسرے دن محلہ کی کسی عورت سے نئی ہمسائی کی بابت دریافت کیا جائے۔ تو وہ یقیناً اس کے اور نہ صرف اس کے بلکہ اس کے باپ دادا کے حالات بھی بتا دیگی لیکن لاہور کے محلہ ن ..... کی رہنے والیاں تین ہفتوں کے بعد بھی اپنی نئی ہمسائی سے بے خبر ہیں اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ محلہ والیاں خاموش بیٹھی رہی ہوں یا انہوں نے جان بوجھکر اس کی طرف توجہ نہ کی ہو بلکہ اصلی وجہ یہ تھی کہ نئی ہمسائی نے انہیں باتیں کرنے کا موقعہ ہی نہیں دیا تھا۔

جیسے جیسے دن گذرتے جارہے تھے عورتوں کا جذبہ تجسس شدت اختیار کرتا جارہا تھا لیکن دوسری طرف جیسے جیسے عورتیں نئی ہمسائی کی طرف بڑھتی جا رہی تھیں۔ وہ پیچھے ہٹتی جارہی تھی اسی عالم میں کئی دن گذر گئے۔ ایک دن مائی نابان نے بڑی بے تابی کے عالم میں ایک گہرے راز کا انکشاف کر دیا یعنی نئی ہمسائی کے یہاں لاتنے قیمتی ملبوسات اور زیورات موجود ہیں۔ کہ وہ بڑی آسانی کے ساتھ تمام محلے کے مکانوں کو خرید سکتی ہے۔ عورتوں کو کپڑوں اور زیورات سے جتنی دلچسپی ہوتی ہے وہ ظاہر ہے پھر کیونکر ممکن تھا۔ کہ وہ اتنی ہنگامہ خیز خبر سنیں اور اسکی تحقیق کے درپے نہ ہوجائیں حمیدہ بیگم کو محلہ میں بڑی چالاک عورت سمجھا جارہا تھا اسلئے عورتوں نے اسی کو بطور جاسوسہ کے نئی ہمسائی کے یہاں بھیجا حمیدہ نے پوری کوشش کی کہ پراسرار نئی ہمسائی سے بے تکلف ہو کر اس کے اور اس کے خاندان کے حالات معلوم کرے لیکن جب وہ ڈیڑھ گھنٹے کے بعد کمرے سے باہر نکلی۔ تو اسے صرف یہی معلوم ہوسکا تھا کہ یہ عورت بیوہ ہے شادی لدھیانہ میں ہوئی تھی شادی کے دو سال بعد شوہر فوت ہو گیا اور وہ مکان کے مالک ٹھیکیدار نور دین کی رشتے میں بہن ہے۔

بھلا ان معلومات سے عورتوں کے جذبہ تجسس کی خاک تشفی ہوسکتی تھی حمیدہ کی باتوں نے تو جلتی آگ پر تیل کا کام کیا۔ اور عورتیں زیادہ بےقراری کے ساتھ اجنبی عورت کی تحقیق کرنے لگیں۔

چند دن کے بعد ایک نیا شگوفہ کھلا اور محلے میں ایک سرے سے لیکر دوسرے سرے تک ایک سنسنی سی دوڑ گئی حمیدہ بیگم کے شوہر کی جوانی کا بیشتر حصہ بازار حسن کے آغوش میں گذرا تھا۔ اور وہ قریباً قریباً ہر رنڈی سے واقف تھا اس نے کسی نہ کسی طرح نئی ہمسائی کی شکل دیکھ لی اور محلے میں شور مچا دیا کہ یہ تو امرتسر کی ایک طوائف ہے محلے کے ایک اور تجربہ کار شخص نے بھی اس خبر کی تصدیق کر دی بس پھر کیا تھا تمام محلے میں ایک تہلکہ مچ گیا۔ مولوی فضل دین نے مسجد سے نکلتے وقت اپنی گرجدار آواز میں کہا "ٹھیکیدار کو معلوم ہونا چاہیئے۔ یہ شریفوں کا محلہ ہے اور شریفوں کے محلے میں ایک طوائف کا سایہ تک نہیں آسکتا۔ کیا ٹھیکیدار کا خیال ہے کہ محلہ کے نوجوانوں کا اخلاق بالکل تباہ کر دیا جائے۔ میں اس حرامزادی فاحشہ کی موجودگی ایک لمحہ کے لیے بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ فاحشہ انسانی وجود میں ایک جہنم ہے۔ بولتی چالتی گندگی ہے خدا ہر انسان کو اس سے بچائے محلہ والوں کا فرض ہے کہ جتنی جلدی ہو سکے اس گندگی کو محلے سے نکال دیں۔

دوسری جانب پنڈت ہرنام داس نے فرمایا بیسوا کا شریر بھی پلید ہے۔ اور جیون بھی پلید ہے۔ اس کی آتما زہریلی ناگن ہے۔ پرماتما ہر شریف آدمی کو اس گندگی سے بچائے!

محلہ والوں نے جوش غضب میں نور دین ٹھیکیدار کو زخمی کر دیا۔ کیونکہ وہی اس گندگی کو محلہ میں لایا تھا۔ نور دین نے وعدہ کر لیا۔ کہ وہ دوسرے دن فاحشہ کو مکان سے نکال دیگا۔ اور کبھی بھی اس قسم کی ذلیل حرکت نہیں کریگا۔

دوسرے دن شام کے وقت مولوی صاحب نماز سے فارغ ہو کر مسجد سے نکل رہے تھے کہ طوائف کے نوکر نے تنہائی میں ان سے کہا۔

"مولنا صاحب! وہ جارہی ہیں مگر کہتی ہیں کہ مولنا صاحب صرف ایک منٹ کے لئے میری ایک درخواست سن لیں۔

مولوی صاحب نے بڑی سختی کے ساتھ انکار کر دیا لیکن نوکر بار بار کہتا رہا آخر مجبور ہو کر مولوی صاحب اس کے دروازے کے پاس آکھڑے ہوئے اندر سے آواز آئی۔

"مولنا صاحب قبلہ! میں اس کے لئے ہزار بار معافی مانگتی ہوں۔ لیکن خدا کے لئے میری ایک عرض سن لیجیئے۔ آپ کو شاید معلوم نہیں میں مسلمان ہوں مسلمان گھرانے میں پیدا ہوئی خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے میرے والدین مسلمان تھے۔ میں بڑے افسوس کے ساتھ آپ کو یہ خبر سنا رہی ہوں کہ پنڈت جی نے مجھے کہا ہے۔ اگر تم ہمارے مذہب میں داخل ہوجاؤ۔ تو ہر ہندو تیری حفاظت کریگا آپ فرمایئے میرے لئے کیا حکم ہے؟"

یہ الفاظ سنتے ہی مولوی صاحب کا چہرہ فرطِ خفگی سے سرخ ہو گیا۔ داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے:۔

"یہ بات تم نے پہلے کیوں نہ بتائی۔ جب تک مسلمان محلے میں موجود ہیں۔ کوئی ہندو تجھے اس مکان سے نہیں نکال سکتا!"

اندر سے شکریے کی کئی آوازیں آئیں۔ مولوی صاحب تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے گھر کو روانہ ہو گئے چند منٹ گھر میں رہنے کے بعد پنڈت جی کے یہاں پہنچے۔ اور اپنے پھیپھڑوں کا تمام زور لگاتے ہوئے بولے۔

"پنڈت جی! یہ لقمہ تر آسانی کے ساتھ نہیں نگلا جا سکتا! اس نے مجھے بلا کر صاف طور پر کہدیا ہے پنڈت جی مجھے صرف اس وجہ سے نکال رہے ہیں کہ میں مسلمان ہوں، آپ کو شرم تو نہ آتی ہو گی! وہ مسلمان ہے اور ہمارا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کریں اور یاد رکھو ——"

مولوی صاحب نے ابھی اپنی تقریر ختم بھی نہیں کی تھی کہ پنڈت جی بولے۔

"مگر وہ تو ہندو ہے میں نے اسے اپنے سامنے یہ کہتے ہوئے سنا ہے۔ کہ مسلمان مجھے ہندو سمجھ کر اس ذلت کے ساتھ نکال رہے ہیں۔ ہندو اس کی حفاظت کریں گے"! پنڈت جی فرطِ غصہ سے کانپ رہے تھے۔

بات بڑھی اور آن کی آن میں کئی ہندو اور مسلمان جمع ہو گئے۔ چند منٹ تو تو میں میں ہوتی رہی اس کے بعد ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ اسلام کے بہادر بیٹے اور ہندو جاتی کے دلیر سپوت ایک دوسرے کا سر پھوڑنے لگے۔ انسانوں کے خون سے محلے کی گندی نالی کا پانی سرخ ہو گیا ——!

یہ ہنگامہ دو تین گھنٹہ برپا رہا آخر پولیس آئی اور خدا خدا کر کے کشت و خون بند ہوا لوگوں نے دیکھا کہ فساد کے نتیجہ میں ایک آدمی دم توڑ رہا ہے اور دس ہندو مسلمان زخمی پڑے ہیں۔

شرارت پسندوں کی گرفتاری شروع ہو گئی۔ اس کام سے پولیس فساد کے سرچشمے یعنی فاحشہ کے گھر کی طرف چلی۔ مولوی صاحب اور پنڈت جی پولیس کے ساتھ تھے۔ مکان کا دروازہ کھولا گیا مگر دیکھنے والوں کو یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی۔ کمرے میں فاحشہ کی بجائے محلے کی گندی نالی کے متعفن کیچڑ کا ڈھیر پڑا ہے!

فاحشہ غائب ہو چکی تھی!

ڈاکٹر:۔ یہ دوا صبح کو دو چمچے۔ دوپہر کو دو چمچے اور سہ پہر کو دو چمچے اور رات کو دو چمچے پیا کرو۔

مریض۔ ڈاکٹر صاحب یہ تو ناممکن ہے۔

ڈاکٹر۔ کیوں؟

مریض۔ ہمارے گھر میں صرف پانچ چمچے ہیں۔ اور آپ آٹھ چمچوں کا حساب بتا رہے ہیں۔

غزل

کس لئے شکوہ کریں زلفِ گرہ گیر سے ہم
بستۂ شوق ہیں مانوس ہیں زنجیر سے ہم

مائلِ شکوہ ہوئے گردشِ تقدیر سے ہم
کامراں ہو نہ سکے جب کسی تدبیر سے ہم

خود گیا اس سے سوال اور دیا خود ہی جواب
گفتگو کرتے رہے یوں تری تصویر سے ہم

تابشِ حسن سے بھی دل کی کلی کھل نہ سکی
باغِ عالم میں رہے غنچۂ دلگیر سے ہم

شوقِ بیتاب کو اب روک بھی اے فرقِ نظر!
بارہا خوار ہوئے ہیں تری تقصیر سے ہم

اس طرف بھی نگہِ لطف کہ کر لیں اے دوست
خانۂ دل میں اجالا تری تنویر سے ہم

جگن ناتھ آزاد

میرزا خاموش

سید عمر مختار

طرابلس کا ایک جاں فروش مجاہد

تاریخ ہر دور میں اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ اور اس کی بجھی ہوئی راکھ میں کبھی نہ کبھی ایک آدھ چنگاری چمک کر قرون اولیٰ کے شعلوں کا پتہ دے جاتی ہے جن سے اس بابرکت عہد کے مسلمانوں کے دل بھڑکتے تھے۔ ذیل کا مضمون تاریخ کے ایک زریں واقعہ کی تکرار ہے۔ جو سید عمر مختار نامی ایک طرابلسی مجاہد کو اطالوی استعمار کے خلاف طرابلس کے جہاد آزادی میں پیش آیا۔ اور جو اس مرد مجاہد نے اپنے خون شہادت سے صفحات تاریخ پر قلمبند کیا۔ (م۔خ)

ولادت و نسب: عمر بن مختار [illegible]ھ میں قریۂ بطنان میں پیدا ہوئے۔ یہ قریہ غربی طرابلس علاقہ برقہ میں واقع ہے نسبی لحاظ سے خالص عربی ہیں۔ اور بدوی قبیلہ منفہ سے مربوط۔ ان کے والد نے ان کی تربیت کا خاص خیال رکھا اس لئے وہ شہری زندگی اور اس کے نقائص سے دُور رہ کر عزت و شرافت کے احساسات کے ساتھ عمر میں بڑھنے لگے عربی دلاوری اور شہسواری کے ماحول نے دل اور روح میں قربانی کا جذبہ اور خودداری کی محبت کا وہ ولولہ پیدا کر دیا تھا۔ جو کسی ایسے شخص کی فرمانبرداری پر مائل نہیں ہونے دیتا جسے دین و مذہب نے اقتدار نہ بخشا ہو۔

قرآن اور دوسرے علوم کی تعلیم: جب سید عمر بچے تھے اس وقت سید محمد مہدی رحمۃ اللہ علیہ برقہ کے روحانی پیشوا اور اقتدار ولفوذ کے مالک جغبوب میں مقیم تھے۔ جب ان کی عمر حفظ قرآن کے قابل ہوئی تو ان کے والد نے انہیں جغبوب کے سنوسی تکیہ میں حفظ قرآن اور دوسرے علوم حاصل کرنے کے لئے بھیجا۔ ابتدائے تعلیم ہی میں سید مہدی کو ان میں فہم و ذکاوت کے آثار اور نجابت و شرافت کے جوہر چمکتے نظر آئے جس سے انہیں نہایت قریبی درجہ حاصل ہو گیا۔

شخصیت کا ظہور: جب خوش قسمتی سے سید عمر کو سید مہدی کے نزدیک یہ قرب و منزلت حاصل ہوئی۔ اور وہ قرآن حکیم کے حفظ و بعض علوم کے درس تدریس سے فارغ ہوئے۔ تو ان کی شہرت عام ہو گئی۔ اور زبانیں ان کی صفت و ثنا میں مشغول نظر آنے لگیں۔ خاندانی بزرگی اور شیخ سنوسی کے قرب کی وجہ سے رؤسائے قبائل کی گردنیں ان کے سامنے جھک گئیں۔

حفظ قرآن میں ان کے استاد سید زروالی مغربی حرانی تھے اور دوسرے علوم انہوں نے مشہور و معروف ادیب علامہ سید فالح بن محمد بن عبداللہ الظاہری مدنی سے حاصل کئے۔

تکیہ جغبوب میں حفظ قرآن اور تحصیل علوم کے بعد سید مہدی نے انہیں "تکیہ قصور" کا شیخ مقرر کیا جو مرج کے قریب جبل اخضر میں واقع ہے۔ وہاں ان کے جوہر کھلنے لگے اور وہ مسلمان بچوں کی تعلیم میں مصروف ہو گئے۔ جود و سخا کا یہ عالم تھا کہ جس فقیر و مسکین اور راہ گیر کو کہیں پناہ نہ ملتی۔ سید عمر کے دروازے ہر وقت اس کے لئے کھلے رہتے

عربی قبائل کے جھگڑے چکانا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ ان کوششوں نے ان کی شہرت میں چار چاند لگا دیئے۔ عقلمندوں کے نزدیک ان کی قدر و قیمت بڑھ گئی۔ اور اہل بصیرت انہیں اور زیادہ احترام کی نگاہوں سے دیکھنے لگے۔

سید مہدی نے قصور کے تکیہ کی ذمہ داری خاص مقصد کے پیش نظر سید عمر کے حوالے کی تھی۔ یہ تکیہ قبیلہ عبید کے قبضۂ اختیار میں تھا۔ جو اپنی سخت گیری اور خود سری کی وجہ سے بہت مشہور تھا۔ اس قبیلہ کے افراد کو آزادی کی تربیت نے گمراہ کر رکھا تھا اور چونکہ دور رس نگاہیں اور عاقبت بین دماغ اسے اپنے لئے ضرر رساں سمجھتے تھے۔ اس لئے ایسے سرکش افراد کو رام کرنا اور راہ راست پر لانا فقط سید عمر کا کام ہو سکتا تھا جن کے خلق و مروت اور مردم شناسی کے متعلق تمام عرب یک زبان ہو کر مدح خواں تھے۔ لہذا اس غرض کے تحت سید عمر اس تکیہ کے شیخ مقرر ہو کر آئے اور بعد میں مرور ایام نے جسے ثابت کر دکھایا۔ کہ سید عمر کا انتخاب بالکل صحیح اور موزوں تھا

یہ بتا دینا ضروری ہے کہ عمر مختار حسب نسب کے لحاظ سے سید نہ تھے۔ یہ لقب انہیں سید مہدی سنوسی سے منسوب ہونے کی وجہ سے ملا تھا۔ اور صرف انہی کو یہ حق پہنچتا تھا۔ کہ اہل برقہ میں سے جسے اس لقب کا مستحق دیکھیں اسے عطا کریں

سید مہدی کا اعتماد: بعض حالات نے سید مہدی کو سفر سوڈان کے لئے مجبور کیا۔ اس کے لئے انہیں ایک نائب کی اور رفیق سفر کی بھی ضرورت پڑی لہذا اس طویل اور مشکل سفر میں رفاقت اور مصاحبت کے لئے پہلی نگاہ انتخاب جس شخص پر پڑی وہ سید عمر مختار تھے۔ لہذا وہ اپنے استاد کے ہمراہ ۱۳۱۲ھ میں روانہ ہوئے اس تمام عرصے میں سید مہدی ہر چھوٹے بڑے کام میں ان سے مشورہ لیتے تھے حتیٰ کہ ان کی اصابت رائے اور ذہن کی رسائی نے ان سے یہ حقیقت منوانے پر مجبور کر دیا۔ "اگر ہمارے پاس عمر مختار کی طرح کے دس آدمی بھی ہوتے تو ہمارے لئے کافی ہوتے"

جب سید مہدی امور کی انجام دہی کے بعد واپس ہوئے تو سید عمر کو "کلک" کے تکیہ کا شیخ اور سوڈان میں اپنا نائب بنا کر چھوڑ آئے جہاں وہ لوگوں میں اسلامی پروپیگنڈا کرتے اور مسلمان بچوں کی تعلیم میں کافی عرصہ تک مشغول رہ کر آخر ۱۳۲۱ھ میں لوٹ کر

پھر ترکیہ قصور کی شخصیت سنبھال لی اور ۱۳۲۹ھ تک اس کے معاملات کو سلجھایا حتیٰ کہ اٹلی نے بنغازی پر قبضہ کر لیا اور جب اس کے خلاف جہاد کا بگل بجا تو سید عمر پہلے شخص تھے۔ جنہوں نے توپ و تفنگ کے ساتھ جہادِ وطن پر لبیک کہی۔

اطالوی بیڑے نے بنغازی پر ۴ شوال ۱۳۲۹ھ کو حملہ کیا اور جمعرات کی صبح کو اس کی توپوں نے گولہ باری شروع کی۔ لوگ اپنے وطن کی مدافعت کے لئے اطراف و جوانب سے جمع ہونے لگے۔ جب اطالوی فوج شہر میں داخل ہوئی۔ تو ترکی سپاہ اور وطنی مجاہدوں نے ایسی جگہ اپنا محاذ قائم کیا جہاں لوگوں کی رسائی نہ ہو سکتی ہو۔ وہاں انہوں نے اپنی مدافعتی لائن ایسی مضبوطی سے قائم کی کہ دشمن کو کئی سال تک ایک قدم آگے نہ بڑھنے دیا۔

اپنے وطن کی مدافعت کے لئے جو سردارانِ قبائل آئے تھے۔ ان کے پیش پیش سید عمر مختار تھے وہ اس دلاوری اور شجاعت سے لڑے کہ ترک جرنیل بھی حیرت میں رہ گئے۔ جو مدافعتی لائن انہوں نے قائم کی تھی وہ تمام ایام جنگ میں شیر سے زیادہ مضبوط اور دشمن کے حق میں بلائے بے درماں ثابت ہوئی وہ دشمن کے مقابلے میں جہاد پر ڈٹے ہوئے تھے۔ کہ ایک طرف انگریز و اطالیہ اور دوسری جانب سیدادیس کے مابین معاہدۂ زویتیہ قرار پایا اور جنگ ختم ہوئی۔ سید عمر لوٹ کر برقہ پہنچے اور اپنے خانگی معاملات کی دیکھ بھال شروع کی۔

دوبارہ جہاد پر پہنچے۔ اور اس دفعہ ان کے ایمان کی پختگی، وطن پرستی کا جذبہ، حکمت، تدبر اور بےنظیر شجاعت اس اوجِ کمال پر پہنچی ہوئی تھی جسے تاریخ نے اپنے اوراق میں زرین الفاظ کے ساتھ لکھ کر قیامت تک کے لئے محفوظ کر لیا ہے۔ ہم اس مختصر سے مضمون میں ان کے بہادرانہ اعمال کو تفصیل کے ساتھ بیان کرنے سے قاصر ہیں۔ لہٰذا ان کی مجاہدانہ زندگی کے آخری مرحلہ پر پہنچتے ہیں۔

کفرہ پر قبضہ۔ کفرہ پر اطالوی قبضے کی خبر ایک بجلی تھی۔ جو سننے والوں کے سر دل پر گری۔ طرابلس کی قسمت کا یہ آخری فیصلہ تھا۔ لوگ جبل اخضر میں سید عمر اور ان کے ساتھی دوسرے مجاہدین کے انجام سے خوفزدہ ہو گئے۔ یہی ایک حرکت تھی جو اطالوی استعمار کے حلق میں ابھی تک کانٹا بنکر کھٹک رہی تھی۔ سید عمر کی قوی ارادہ شخصیت جن کی شہرت آسمان پر پہنچ چکی تھی۔

کفرہ کے تسلط نے سید عمر پر عالم اسلامی سے اتصال کی ہر راہ بند کر دی۔ صرف مصر کی راہ باقی تھی۔ جسے اطالوی فوجوں۔ توپوں اور ہوائی جہازوں نے روک رکھا تھا۔ تاہم مجاہدین فوجوں، اور ہوائی جہازوں کی موجودگی کے باوجود اطالوی فوجوں سے چھینا ہوا مالِ غنیمت مصر کو پہنچاتے اور وہاں سے اپنی ضروریات کا سامان لاتے رہتے تھے۔ اس لئے جب جنرل گرازیانی کفرہ سے لوٹ کر آیا تو اس نے اپنی فوجوں اور ہوائی جہازوں کو مجاہدین کے روکنے کے لئے ناکافی سمجھ کر ایک تیسری قوت کا اضافہ کیا یعنی اس نے بردی سلیمان سے لیکر جغبوب کے آخر تک جس کا فاصلہ تقریباً تین سو میل ہوگا تاریں لگوادیں۔ ان تاروں کے لگنے کی مدت شوال ۱۳۴۹ھ سے ربیع الآخر ۱۳۵۰ھ تک ہے۔ ان خاردار تاروں نے مجاہدین کو ہر طرف اور تمام انسانوں سے بالکل منقطع کر دیا۔ اگرچہ انہوں نے ان سے گزرنے کی کئی دفعہ کوشش کی لیکن ہر بار مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔

سید عمر کا ثبات۔ اس نئی مشکل اور مصیبت میں بھی سید عمر اپنے جہاد پر قائم تھے انہیں اس بات پر یقین تھا کہ ان کے مسلمان بھائی باہر سے ان کے آزاد کرانے کی کوشش کرینگے لیکن کوئی بھی ان کی امداد کو نہ پہنچا۔ مدت ہوئی مسلمان اس حمیت و غیرت سے عاری ہو چکے ہیں۔ انہیں اسلحہ کی ضرورت نہ تھی۔ وہ اس بات کے طالب نہ تھے۔ کہ ان کے مسلمان بھائی ان کے لئے لڑیں۔ ان کی خواہش تھی کہ ان کے مجاہدین کے لئے روٹی پہنچتی رہے۔ انہیں اٹلی کی فوجوں، اس کی توپوں یا اس کے ہوائی جہازوں سے کچھ خوف نہ تھا۔ وہ صرف بھوک سے ڈرتے تھے محض اسی دشمن کا خطرہ تھا جس کے مقابل ان کے ثابت قدم غازی نہیں ٹھہر سکیں گے۔ اور آخر کار یہی وہ فرض کی کوتاہی اور مسلمانوں کی غفلت تھی جس نے اٹلی کو طرابلس میں کامیاب کیا۔ اور مٹھی بھر غازیوں کی بائیس سال کی مدافعت، ثابت قدمی، بہادری اور شہادت مسلمانوں کی نفس پسندی، خودغرضی، دینی بےحمیتی کی نذر ہو گئی۔ پانچسال کی قلیل سی مدت تک مسلمانوں کا مال اور ان کے قلم طرابلسی مجاہدین کے پشت پناہ رہے۔ اس امداد نے انہیں اور بارہ برس تک اپنے دشمن کے مقابل ثابت قدم رکھا لیکن آخر بھوک نے کمزور اور نڈھال کر دیا۔

سید عمر کی گرفتاری۔ سید عمر کی عادت میں داخل تھا کہ وہ اکثر اوقات دشمن کے مواقع۔ اس کی حرکات اور حملے کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لئے نکلا کرتے تھے۔ لہٰذا وہ اپنی عادت کے موافق چالیس سواروں کے ساتھ اس غرض کے لئے نکلے۔ اور بروز جمعہ ۲۸ ربیع الآخر ۱۳۵۰ھ کو سلنطہ کا رُخ کیا۔ وہ جا ہی رہے تھے کہ اچانک اطالوی سپاہ نے سامنے سے آکر راستہ روک لیا۔ ڈوڈیاشی حاکم مرج کو کسی طرح ان کے نکلنے کی خبر مل گئی تھی۔ لہٰذا اس نے اریٹیریا کی دو پلٹنیں اور لیبیا کا ایک رسالہ ان کی گرفتاری کے لئے بھیجا۔ سید عمر پیچھے کی جانب مڑے تاکہ اس طرح اپنی جان بچا کر نکل جائیں لیکن پشت کی جانب سے رسالہ نے راستہ روک رکھا تھا۔ اب وہ دونوں طرف سے آگ میں گھر چکے تھے۔ اب فریقین نے ایک دوسرے پر گولیاں برسانی شروع کیں۔ اس طرح سید عمر کے کئی ساتھی شہید ہو گئے اور ان کا گھوڑا مر گیا جس سے وہ زمین پر گر پڑے۔ ابھی وہ اُٹھنے کی کوشش ہی کر رہے تھے۔ کہ ایک سپاہی نے بڑھ کر انہیں پکڑ لیا۔ ان کی شخصیت کی تحقیق کرنے کے بعد خبر ڈوڈیاشی حاکم مرج کو پہنچائی گئی جو سنتے ہی ہوائی جہاز کے ذریعہ وہاں پہنچا۔ اور پہلی نگاہ میں انہیں پہچان لیا۔ وہ کئی بار ان سے مل چکا تھا۔ اسی وقت انہیں سوسہ پہنچایا گیا۔ پھر وہاں سے سمندر کے راستے ”اوسپنی“ کشتی پر بٹھا کر بنغازی بھیجدیا۔ جہاں وہ ۲۹ ربیع الآخر سنیچر کی شام کو پانچ بجے پہنچے کشتی سے اترے تو قیدیوں کی گاڑی میں بٹھا کر جیل کو منتقل کئے گئے جہاں منگل ۳ جمادی الاول ۱۳۵۰ھ تک رہے یہی دن ان کی پیشی کا تھا۔

سید عمر کی پیشی:۔ سید عمر کی پیشی ایک بڑے ہال میں ہوئی جو انجمن فاشسٹی کا دفتر ہے جسے لاتیو کہتے ہیں۔ جو کبھی بنغازی کے نمایندگان مجلس کا ہال تھا اسی دن پانچ بجکر دس منٹ پر سید عمر کو وہاں حاضر کیا گیا۔ اور دوسرا [illegible]

عدالت پہنچے جن کے نام یہ ہیں:۔

کرنل ماریونی صدر۔ فرنشسکو، دمانو میجر ڈ لیٹیلا سینو منڈ دلیا سینو رمانز وتی اور سینو رڈی کرسیٹوفرو کلارک مجلس عدالت کی تکمیل کے بعد سید عمر کے خلاف دعوے پیش کیا گیا کہ اس نے حکومت کی سلامتی اور ملک کے امن میں خلل اندازی کی ہے۔ اس کے بعد ان سے سوالات کئے گئے۔ ان کا نام جائے ولادت اور عمر کے متعلق پوچھ لینے کے بعد دریافت کیا گیا:۔

کیا حکومت اطالیہ کے مخالف باغیوں کے سردار تم ہی ہو؟ کیا تم نے حکومت سے جنگ کی ہے حکومت کی فوجوں کے مقابل ہتھیار اُٹھائے اور قتل وقتال میں بذات خود شامل ہوئے ہو؟ کیا تم نے جنگ کا حکم دیا۔ اور اس میں شریک رہے ہو۔ کیا تم نے قبائل کے لوگوں کو جنگ کی خاطر بلایا تھا؟ سید عمر نے ان تمام سوالات کا جواب اثبات میں دیا۔ پھر پوچھا گیا۔ کہ تم نے کتنی جنگیں لڑی ہیں۔ انہوں نے جواب دیا شمار یاد نہیں۔ کیا تم کچھ کہنا چاہتے ہو، جواب دیا کچھ نہیں۔ پورے چھ بجے عدالت برخاست ہوئی۔ اور ساڑھے چھ بجے ارکان عدالت لوٹ کر کمرے میں آئے اور صدر نے فیصلہ سنایا۔ کہ سید عمر کا جرم ثابت ہے۔ لہٰذا انہیں پھانسی کی سزا دی جائے۔

دوسرے دن صبح کے وقت اس بطل حریت اور مجاہد وطن کو تختۂ دار پر لٹکا دیا گیا اور ان کی روح پاک ظلم وجور کی شکایت لے کر اپنے خالق کی طرف پرواز کر گئی

اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ○

دلچسپ معلومات

انگریزی فلم (in old chicago) میں بڑے وسیع پیمانہ پر آتشزدگی کے سین لئے گئے تھے۔ آگ کی تپش اس قدر تیز تھی۔ کہ تیس تیس گز کے فاصلے پر کھڑے ہوئے کیمرہ مین اور دوسرے لوگوں پر جو اس فلم میں کام کرتے تھے بالٹیاں بھر بھر کر پانی ڈالا جا رہا تھا۔

مشہور انگریزی فلم (Hurricane) میں پانی کے ریلے اور سخت بارش و طوفان کے شور کی صدابندی ایک بجلی کے پنکھے اور زوردار پانی کے پائپ کی مرہون منت تھی۔

چین کے مشہور جنرل چیانگ کائی شک کی پیدائش ۱۸۸۶ء قصبہ فنگو آ چیکینگ میں ہوئی

ہرن اپنی آنکھ اور ناک دونوں سے سانس لیتا ہے۔

ہم تم

کب نگاہیں ملائینگے ہم تم
کب قیامت اٹھائینگے ہم تم

جھوم اٹھیں گے انجم و ماہتاب
نغمے ایسے سنائینگے ہم تم

جس سے ہو جائیگی فضا رنگیں
ہولی ایسی منائینگے ہم تم

راہ روکیگا تو نصیب کو بھی
ٹھوکروں میں اڑائینگے ہم تم

تم ہو اک چاند میں ہوں اک تارا
عرش پر جگمگائینگے ہم تم

آگ غم کی اگر بھڑک اٹھی
آنسوؤں سے بجھائینگے ہم تم

جس سے بیدار ہوگی روحِ حیات
کبھی وہ گیت گائینگے ہم تم

چاند تاروں سے دور اے نجمہ
اپنی دنیا بسائینگے ہم تم

دوشیزہ نجمہ تصدق ایم اے بی ٹی

تم نے تو کہا تھا آؤ نگی!

تم نے تو کہا تھا آؤنگی — ہاں تم نے کہا تھا آؤنگی!

جب رنگ سحر کچھ ہلکا تھا!

جب چاند کا ساغر چھلکا تھا!

جب تاروں نے لی تھی انگڑائی!

اور نور کا آنچل ڈھلکا تھا!

اے جانِ وفا ایمانِ وفا — کچھ یاد ہے وہ پیمانِ وفا!

تم نے تو کہا تھا آؤنگی، ہاں تم نے کہا تھا آؤنگی!!

دنیائے سکوں تھی زیر و زبر!

چھائی تھی اُداسی عالم پر!

جب پیار سے تم نے دیکھا تھا!

ہوتے ہوئے رخصت مڑ مڑ کر!

وہ عہدِ وفا کا طرزِ یقیں — ممکن ہو تو کہہ دو یاد نہیں!

تم نے تو کہا تھا آؤنگی، ہاں تم نے کہا تھا آؤنگی!!

پھر جذب دروں کی گہرائی!

تنہائی — مسلسل تنہائی!

اُف بارِ سیہ وہ ظلمتِ شب!

جب دل کی تمنا گھبرائی!

احساس نے دامن تھام لیا — جب دل نے وفا کا نام لیا!

تم نے تو کہا تھا آؤنگی، ہاں تم نے کہا تھا آؤنگی!!

پھر عشق کا زعم نادانی!

نظروں کے چمن کی ویرانی!

پلکوں کی گھنیری چھاؤں میں!

اشکوں کی تلاطم سامانی!

گہرائی سے نکلا ڈوب کے جب — یاد آہی گیا وہ عہدۂ شب

تم نے تو کہا تھا آؤنگی، ہاں تم نے کہا تھا آؤنگی!!!

صد جلوہ بداماں - کوئی نہیں!

پھولوں میں خراماں کوئی نہیں!

دریا کے دھڑکتے سینے پر!

سرمست غزلخواں - کوئی نہیں!

ماضی کے نظاروں کو لیکر — لوٹ آؤ بہاروں کو لیکر!

تم نے تو کہا تھا آؤنگی، ہاں تم نے کہا تھا آؤنگی!!

صہبا لکھنوی

حاجی لق لق

تمباکو کانفرنس

برطانیہ کی جنگی کابینہ نے اپنا خاص ایلچی سر سٹیفورڈ کرپس ہندوستان بھیجا تاکہ وہ ہندوستان کی مختلف سیاسی جماعتوں اور حکومت برطانیہ کے مابین کوئی سمجھوتہ کرادے۔ سر سٹیفورڈ کے ہندوستان پہنچتے ہی مختلف سیاسی جماعتوں نے مشاورتی کانفرنسیں منعقد کرنی شروع کردیں تاکہ اپنے اپنے حقوق متعین کرکے برطانی ایلچی کے ساتھ گفت و شنید کرسکیں۔

اس موقع پر ہندوستان کی مشہور سیاسی جماعت حقہ کانفرنس نے بھی جو ۲۵ کروڑ حقوقیوں کی نمایندہ جماعت ہے سرگرمی دکھائی اور منٹو پارک لاہور میں ایک عظیم جلسے کا اعلان کردیا تمام ہندوستان کے وزیروں کو دعوت شرکت دی گئی اور منٹو پارک میں شاندار پنڈال بنایا گیا صدارت کے لئے مولانا ظفر علی خان کا نام تجویز ہوا۔ اور پنڈت میلا رام وفا استقبالیہ کمیٹی کے صدر بنائے گئے۔

تاریخ مقررہ پر "زمیندار" کے دفتر سے صدر منتخب کا جلوس نکلا۔ مولانا کو عطا محمد بٹ سوداگر تمباکو کے اس تانگے میں سوار کیا گیا جس میں بٹ صاحب کے آدمی تمباکو رکھکر شہر کے تمباکو فروشوں میں تقسیم کیا کرتے ہیں۔ تانگے میں ایک شاندار حقہ صاحب صدر کے لئے رکھا گیا جو تمام حقوں کا صدر معلوم ہوتا تھا۔ جلوس میں ہزار ہا ہندو مسلمان حقوقی شریک تھے۔ اور قدم قدم پر "حقہ زندہ باد" "مولانا ظفر علی خان زندہ باد" کے نعرے لگ رہے تھے۔ اور ہر شخص کے ہاتھ میں ایک حقہ تھا اور حقے کے کشوں سے فضا دھواں دھار ہو رہی تھی۔

جلوس شہر کے بڑے بڑے بازاروں میں چکر لگانے لگا شہر میں مختلف مقامات پر تمباکو کے پتوں سے خوبصورت محرابیں بنائی گئی تھیں۔ اور ان کے نام مشہور حقہ نوشوں کے نام پر رکھے گئے تھے۔ "اقبال گیٹ" "میر نور احمد گیٹ" "ملک نور الٰہی گیٹ" "نواب مظفر خاں گیٹ" وغیرہ۔

جلوس ان محرابوں سے گذرتا ہوا تین گھنٹے کے عرصہ میں منٹو پارک پہنچا۔ جہاں باقاعدہ جلسہ شروع ہوا۔ سب سے پہلے مجلس استقبالیہ کے صدر نے اپنا خطبہ پڑھا جس میں مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ اس کے بعد صاحب صدر نے اپنا خطبہ صدارت پڑھنا شروع کیا جس میں حقوقیوں کی بے حسی کا رونا رویا گیا تھا۔ مولانا نے کہا کہ ہندوستان میں اتنے حقہ نوش ہیں کہ اگر ایک ایک کش لگا کر دھواں آسمان کی طرف چھوڑ دیں۔ تو سارے ملک کے اوپر دھوئیں کی ایک گھنگھور گھٹا چھا جائے لیکن افسوس ہے کہ انہیں اپنے حقوق کا کوئی خیال نہیں۔ آپ نے ہندوستانیوں کی فیشن پرستی کی مذمت کی اور کہا کہ لوگ حقے کو چھوڑ کر سگرٹ، سگار اور پائپ کی طرف بھاگ رہے ہیں۔ اور اس طرح اپنے ملک کو اقتصادی طور پر نقصان پہنچا رہے ہیں۔ مولانا نے حقوقیوں کو متحد رہنے کی تلقین کی۔ اور کہا کہ حقوقیوں کے ہاتھوں ہمارا ملک دنیا میں سربلند ہو سکتا ہے۔ آخر میں اس بات پر آپ نے زور دیا۔ کہ ہم ہندوستان میں اپنے لئے علیحدہ وطن کا مطالبہ کرتے ہیں جس کا نام "چلمستان" ہو۔ مولانا کا خطبہ صدارت "چلمستان زندہ باد" کے نعروں کی گونج میں ختم ہوا۔

اس کے بعد مختلف قرار داد پیش ہو کر منظور ہوئیں۔

چونکہ علامہ اقبال مرحوم کی وفات کے بعد حقہ کانفرنس کا یہ پہلا اجلاس تھا۔ اس لئے حاضرین نے کھڑے ہو کر علامہ مرحوم کے انتقال پر اظہار تاسف کی قرار داد منظور کی۔

اس کے بعد مولانا محمد اشرف خان عطا معاون مدیر "شہباز" نے اپنی گڑگڑی ہاتھ میں لیکر ذیل کی قرار داد پیش کی۔

"ہم ہندوستان کے ۲۵ کروڑ حقوقی حکومت سے مطالبہ کرتے ہیں کہ ہمیں ہندوستان میں "چلمستان" بنانے کی اجازت دی جائے۔ ہم سگرٹ، سگار اور پائپ پینے والوں کے ساتھ مل کر نہیں رہ سکتے۔ کیونکہ ہماری ان کی تہذیب میں زمین آسمان کا فرق ہے ہم حیوانوں میں نہیں رہنا چاہتے۔ اس لئے "چلمستان" کا مطالبہ کرتے ہیں۔"

عطا صاحب نے یہ قرار داد پیش کرکے ایک طویل تقریر کی جس میں بتایا کہ مغربی فیشن کے تمباکو نوش حقہ نوشوں کے حقوق پر کس طرح ڈاکہ ڈالتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ ایک حقہ نوش گلی میں بیٹھا حقہ پی رہا ہوتا ہے۔ اور ادھر سے ایک شخص ہاتھ میں سگرٹ لئے آتا ہے۔ اس کے پاس ماچس نہیں ہوتی۔ اس لئے وہ بغیر اجازت لئے حقے پر جھک کر چلم سے اپنا سگرٹ سلگا لیتا ہے۔ اور اس طرح آگ کی کئی چنگاریاں غصب کر لیتا ہے

تمام حاضرین نے اس قرار داد کی تائید کی۔

اس کے بعد ملک نور الٰہی مالک اخبار "احسان" نے ذیل کی قرار داد پیش کی "لاہور میونسپلٹی سے مطالبہ کیا جائے۔ کہ وہ حقہ نوشوں کے بادشاہ حضرت علامہ اقبال مرحوم و مغفور کی یادگار کے طور پر لاہور میں واٹر ورکس کے پاس ہی ایک "دھواں ورکس" تعمیر کرے۔ یہ ایک اتنے بڑے حقے کی شکل میں ہو۔ جو سارے لاہور کے حقہ نوشوں کے لئے کفایت کرے۔ اس میں سے پانی کے نلوں کی طرح دھوئیں کے نل نکلکر ہر گھر میں پہنچیں تاکہ حقہ نوش اپنے اپنے گھروں یا دفتروں میں بیٹھے نلکے کی ٹونٹی گھما کر حقہ نوشی کا لطف اٹھا سکیں۔"

اس پر پنڈت مہری چند اختر نے یہ ترمیم پیش کی کہ میونسپلٹی دھوئیں کے نلکوں

کا جو ٹیکس وصول کرے وہ نصف پیسہ روزانہ سے زیادہ نہ ہو۔ ترمیم شدہ قرارداد منظور ہو گئی۔

اس کے بعد لالہ امرناتھ نے ایک قرارداد اس مضمون کی پیش کی۔ کہ حقہ نوشوں کو کبری ٹیکس سے مستثنیٰ قرار دیا جائے۔ نواب مظفر خاں نے اس کی مخالفت میں تقریر کی۔ اور رائے شماری پر یہ قرارداد منظور نہ ہو سکی۔

دو تین اور قراردادوں کے بعد جلسہ "حقہ پائندہ باد" "تمباکو زندہ باد" "چلم گرم باد" "نیچہ گڑ گڑ باد" کے نعروں میں ختم ہوا۔ اختتام کے قریب اگر جلسہ گاہ کے ایک کونے میں کچھ گڑبڑ ہوئی اور چند آدمیوں نے جو سگرٹ نوش تھے۔ شورش برپا کرنے کی کوشش کی۔ لیکن حقہ برداروالنیٹروں نے ان پر قابو پالیا۔ اور انہیں جلسہ گاہ سے باہر نکال دیا۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اگلے دن لاہور کے بازاروں میں بڑے بڑے پوسٹر چسپاں پائے گئے جن میں لکھا تھا کہ حقہ کانفرنس والے سگرٹ نوشوں کے ہرگز نمائندہ نہیں۔ وہ ہمارے حقوق پر چھاپہ مارنا چاہتے ہیں۔ اس لئے لاہور کے تمام سگرٹ نوشوں کو سر جوڑ کر بیٹھنا اور اپنے بچاؤ کی تدبیر سوچنا چاہئے اس غرض کے لئے کل ۵ اپریل کو ٹاؤن ہال میں ایک جلسۂ عام منعقد ہوگا جس میں سگار اور پائپ پینے والے حضرات کو بھی شامل ہو کر ہمارے ساتھ مل کر متحدہ محاذ بنانا چاہئے۔

۵ اپریل کو وقت مقررہ پر ٹاؤن ہال اہل جلسہ سے کھچا کھچ بھر گیا۔ حاضرین میں تارکے سگرٹ سے لے کر ہوانا کے سگرٹ پینے والے لوگ موجود تھے۔ جلسے کا افتتاح مولانا چراغ حسن حسرت کی تقریر سے ہوا۔ مولانا نے حقے کے نقصانات اور سگرٹ کے فوائد پر بہت کچھ کہا۔ مثلاً یہ کہ حقے کو ہر شخص منہ لگا لیتا ہے۔ اور اس طرح بعض امراض کے جراثیم ایک سے دوسرے کو منتقل ہو جاتے ہیں۔ اس کے برعکس سگرٹ جراثیم کش ہے۔

حسرت صاحب نے تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا:۔

حقہ کانفرنس کے اجلاس میں ایک مقرر نے بڑے فخر کے ساتھ کہا تھا کہ ریل کے سفر میں ایک حقے والے کو فوراً ڈبے کے اندر جگہ مل جاتی ہے کیونکہ سواریوں کو حقے کے چند کش لگانے کا لالچ ہوتا ہے اور وہ خود تکلیف اٹھا کر اس کے لئے جگہ بنا دیتے ہیں۔ یہ بالکل درست ہے لیکن کتنی بری بات ہے کہ پڑھے لکھے سفید پوش آدمی میلے کچیلے کپڑوں والے ذلیل دیہاتی کے لئے جگہ بنا دیتے ہیں۔ حالانکہ اس کے کپڑوں سے بو آ رہی ہوتی ہے۔ اگر یہ لوگ سگرٹ کو ہی اپنا پیدائشی حق تصور کریں۔ تو ان سے ایسی ذلیل حرکت ہرگز سرزد نہ ہو۔ بہرحال ہمیں حقہ کانفرنس کے خلاف متحدہ محاذ بنانا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ سگار نوش اور پائپ نوش بھی آج ہمارے ساتھ ہیں۔ ہمیں عہد کر لینا چاہئے کہ ہم حلیستان ہرگز نہیں بننے دینگے۔

حسرت صاحب کے بعد شیخ فضل الٰہی سپرنٹنڈنٹ محکمہ دیہات سدھار پائپ منہ میں لئے سٹیج پر آئے اور آپ نے یقین دلایا کہ تمام پائپ پینے والے سگرٹ نوشوں کے ساتھ ہیں۔ شیخ صاحب کے بعد خان بہادر چودھری مشتاق احمد گورمانی نے اپنے سگار کے دو تین کش لگا کر ایک دھواں دھار تقریر کی اور حاضرین سے "حلیستان مردہ باد" کے نعرے لگوائے۔

اس کے بعد ایک صاحب نے درخواست کی۔ کہ مجھے بھی چند منٹ بولنے کی اجازت دی جائے۔ اجازت دی گئی۔ ان صاحب کا نام میرزا خاموش تھا۔ آپ نے کہا افسوس ہے کہ تمباکو نوشوں کے ایک بڑے طبقہ کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ نہ ان کو پوسٹر میں دعوت دی گئی ہے۔ نہ کسی دوسرے طریقہ سے۔ میں بیڑی نوشوں کا نمائندہ ہوں اور بغیر دعوت کے چلا آیا ہوں۔ آپ کو شاید معلوم نہیں کہ بیڑی نوشوں کی تعداد ہندوستان میں کتنی زیادہ ہے میرزا صاحب کی تقریر کے بعد صدر جلسہ جناب حسرت نے اس فروگذاشت پر اظہار تاسف کیا اور ذیل کی قرارداد پیش کی جو باتفاق آرا منظور ہوئی:۔

"ہم ہندوستان کے سگرٹ نوش۔ پائپ نوش۔ سگار نوش اور بیڑی نوش سر سٹیفورڈ کرپس سے مطالبہ کرتے ہیں۔ کہ وہ کوئی ایسی تجویز منظور نہ کریں جس سے ہندوستان کے اندر حلیستان بننے کا امکان پیدا ہو جائے۔"

تین چار روز کے بعد اخباروں میں خبر شائع ہوئی۔ کہ سر سٹیفورڈ کرپس نے مولانا ظفر علی خان۔ مولانا چراغ حسن حسرت۔ خان بہادر چودھری مشتاق احمد گورمانی اور میرزا خاموش کو تار بھیجکر ملاقات کے لئے بلایا ہے۔

ملاقات ہوئی جس میں سر سٹیفورڈ نے سب کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ سب تمباکوی فرقے متحد ہو جائیں۔ نہ کوئی حقہ کانفرنس ہو۔ نہ سگرٹ کانفرنس۔ نہ پائپ کانفرنس۔ حلیستان۔ سگرستان یا پائپستان وغیرہ بنانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ آپ سب لوگ "تمباکو کانفرنس" کے نام سے متحد ہو جائیں۔ اور میں ولایت جا کر برطانی پارلیمینٹ کو اس بات پر آمادہ کروں گا۔ کہ تمباکو کانفرنس کو آزاد کر دیا جائے۔ اور ایک نیشنل گورنمنٹ قائم کر دی جائے۔ میں جا کر مسٹر ایمری سے پوچھوں گا کہ مردم شماری کی رو سے حقہ نوشوں، سگرٹ نوشوں وغیرہ کی آبادی کیا ہے۔ اس کے لحاظ سے آپ لوگوں کو حقوق نمائندگی دیئے جائینگے۔

سب نے یہ کہا۔ کہ ہم واپس جا کر کانفرنسیں کریں گے۔ اور آپ کو فیصلے سے آگاہ کرینگے۔

یہ لوگ لاہور آ کر کانفرنسیں ہی کر رہے تھے۔ کہ سر سٹیفورڈ کرپس ولایت تشریف لے گئے۔

غزل

مسرت کا ساماں ہوا اور نہ ہو گا ۔ یہ ناشاد شاداں ہوا اور نہ ہو گا

مقدر کی تاریکیاں کچھ نہ پوچھو! ۔ یہ تارا درخشاں ہوا اور نہ ہو گا

نہ جائیگی دل سے بتوں کی محبت ۔ یہ کافر مسلماں ہوا اور نہ ہو گا

خزاں آشناسی رہی کشت ارماں ۔ یہ صحرا گلستاں ہوا اور نہ ہو گا

محبت میں جینا ہی مشکل نہیں ہے ۔ کہ مرنا بھی آساں ہوا اور نہ ہو گا

کلیم آتش بجاں جا رہا ہوں ۔ وہ تب طور ساماں ہوا اور نہ ہو گا

ہر اک داغ حسرت بجھا جا رہا ہے ۔ یہ خورشید تاباں ہوا اور نہ ہو گا

گئی آرزوئے محبت نہ دل سے
فدا گھر یہ ویراں ہوا اور نہ ہو گا

مسٹر سری کرشن فدا اٹھیالوی

قمر اجنالوی

نغموں کی دیوی

شاہانِ یورپ کی محبوب مغنیہ کا رومان

وہ ایک گانے والی تھی ——— تمکنت مآب مغنیہ

لیکن صرف چند سر پھرے اس کے نغموں کو سُنکر حظ اٹھایا کرتے تھے۔ درحقیقت اس کی ہر دلعزیزی کا باعث تر شاداب و رنگین پھول کی طرح نکھرتا ہوا حسن و شباب تھا۔ اس کی لانبی لانبی پلکوں سے پرے گہری اور ساکن جھیلوں کی سی آنکھوں میں گھومتا ہوا شراب جوانی کا خمار تھا۔ انار کے پُر شباب پھولوں کی مانند دہکتے ہوئے رخسار تھے اور پھر ان سے زیادہ اثر انداز ہونے والا اس کا طرز کلام اور بات کرتے ہوئے اپنے حسین شہد آمیز لبوں کے کناروں کو اوپر نیچے حرکت دیتا تھا۔ ورنہ گا تو قریباً سب سکتے ہیں۔ اور وہ نوجوان حبشن بھی اپنے زعم میں خوب گایا کرتی تھی جو ایڈلین کے پڑوس میں رہا کرتی تھی۔ اپنے مکان کے صحن میں کھڑے ہو کر نارنجی کے درخت سے لگ کر وہ اکثر اوقات گایا کرتی تھی۔ ہندوستانی کوئل کی طرح ——— اور آخر کوئل کا رنگ بھی تو کالا ہی ہوتا ہے۔

حسین ایڈلین نے کئی مرتبہ اپنے سہ منزلہ مکان کے لکڑی کے سرخ چھجے پر کھڑے ہو کر اسے گاتا ہوا دیکھا تھا ——— وہ اپنے موٹے موٹے سیاہ اور بھدے ہونٹوں سے عجیب و غریب سُریں نکالتی۔ اور اکثر محویت کے عالم میں ان خیالی جزیروں میں گھومتی جن کا ان کے نغموں میں ذکر آتا تھا۔ بہت عرصہ کے بعد ایڈلین کو معلوم ہو سکا کہ کئی سال قبل اس کا محبوب جب وہ دونوں افریقہ کے ایک ساحلی علاقہ میں آباد تھے بحر اوقیانوس کے کسی برطانی جزیرہ میں گیا تھا جو آج تک نہیں لوٹا۔ اور اب وہ اکیلی اوقیانوس کے نیلگوں پانیوں کی اتھاہ گہرائیوں میں کھو جانے والے عاشق کے غم جدائی میں اکثر گا گا کر اپنے غمگین دل کو تسلیاں دیا کرتی تھی بیچاری کا خیال تھا شاید سمندر کی لہریں کسی وقت اس کے عاشق کے جسم کو باہر اگل دیں۔ اور وہ دونوں ایک مرتبہ پھر موسم گرما کی دل افزا اور رومان انگیز شاموں کو کچھ سیر و تفریح کر سکیں لیکن یہ محض اس کا جنون تھا۔ ورنہ اس کا شوہر تو اس دنیا میں پہنچ چکا تھا۔ جہاں سے اب تک کوئی نہیں لوٹا ایڈلین کو جب اس کی یہ غم انگیز داستان معلوم ہوئی تو اسے اس حبشن سے غیر معمولی ہمدردی پیدا ہو گئی۔

اس دوران میں ایڈلین نے دو چار سمندری نغمے سیکھے اور ان کی ایسی نفیس سُریں ایجاد کیں کہ جس محفل میں اس نے وہ گیت گائے محفل کی محفل تڑپ اُٹھی لوگ وجد کے عالم میں سر دھنتے رہے۔ دراصل اس کے گانوں کی مقبولیت کا باعث وہی سمندری نغمے تھے جو اس نے اوقیانوس میں کھو جانے والے حبشی کی محبوبہ سے سیکھے تھے۔

یورپ کی تمکنت مآب مغنیہ کا بچپن شروع ہی سے محفل ہائے نشاط و سرور میں گذرا تھا۔ وہ گا گا کر لوگوں کو محظوظ کیا کرتی تھی اور معاوضہ میں اسے کچھ سکے مل جاتے تھے۔ اکثر نوجوان اس کے سحر آلود حسن کو دیکھ کر لوٹ جاتے اور اسے اپنے آغوش طرب میں دیکھنے کے لئے بیقرار ہو جاتے۔ ایڈلین کی نغمہ سنجی ابھی ابتدائی مراحل ہی طے کر رہی تھی۔ کہ اس کے شیدائیوں کی ایک جماعت پیدا ہو گئی۔ اس نے اپنے عاشقوں میں سے کسی کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا وہ صرف گانے سے مطلب رکھتی۔ آہستہ آہستہ اس کے نغموں کی قیمت میں اضافہ ہونے لگا۔

ایک روز جب آفتاب مغرب کے کثیف دھندلکوں میں روپوش ہو چکا تھا۔ شام کے لمبے لمبے سایوں میں سمندر کے ساحلی علاقوں میں اٹھنے والی دھند ہوتے ہوتے پھیلتی جا رہی تھی چاروں طرف ایک عجیب سناٹا طاری ہو گیا تھا۔ اور بدن کو کپکپا دینے والی سرد ہوائیں چل رہی تھیں۔ تو ایڈلین اپنے مکان سے نکلکر اپنی پڑوسن کے دروازہ پر آئی۔ کیونکہ آج رات اس کو کوئی نیا گیت یاد کرنا تھا ابھی اس نے دروازہ کے اندر قدم ہی رکھا تھا کہ اس کے عقب میں کسی نے اس کو پکارا ———

"ایڈلین!"

جب اس نے مُڑ کر دیکھا۔ تو اس کے سامنے اس کا ایک دوست "ہیگی" کھڑا تھا جس نے اکثر جگہوں پر اس کے گانے کی تعریف کر کے اس کے لئے میدان صاف کئے تھے۔

ہیگی ایک شریف اور متین نوجوان تھا اور اپنی خوبصورتی اور متانت کی وجہ سے ایڈلین نے کئی بار اس کی تعریف کی تھی۔ اور درحقیقت ہیگی ایک بہترین دوست تھا۔

"ہیگی! ـــــــ تم؟" ایڈلین نے گھوم کر اسے حیرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ اس طریق سے کھڑی تھی۔ کہ اس کے سنہرے بال اس کے کندھوں پر لہرا رہے تھے۔ لچکدار کمر کی ریشمیں پیٹی کے کس جانے کی وجہ سے آسمانی رنگ کے گون میں سے سینے کا ابھار زیادہ ہو گیا تھا۔ ایک قیمتی فیتہ جو کمر میں بندھا ہوا تھا۔ لہراتا ہوا گوری گوری پنڈلیوں پر لٹک رہا تھا جس کو طلائی رنگ کے تاروں سے سجایا ہوا تھا۔ اور اس پر ستم یہ تھا کہ اونچی ایڑی کے شو پہننے کی وجہ سے اس کی پیٹھ کے ذرا اوپر بدن میں ایک دلفریب خم پیدا ہو گیا تھا۔ نوجوان اس نئے راہب کی طرح خاموش اور سہما ہوا کھڑا تھا جو پہلے روز لوگوں کے ہجوم میں عہد نامہ دہرانے سے قبل کچھ سہم سا جاتا ہے۔

ایڈلین ناز و ادا کے ساتھ اپنے مرمریں پاؤں اٹھا کر اس کے قریب آگئی۔ اور ہیگی نے محسوس کیا کہ اس کے تن بدن میں ایک آگ سی لگ گئی ہے۔ اس کی رگوں میں جیسے کسی نے شعلے بھر دیئے ہیں۔ اور اس لذت افزا احساس نے اس کے جسم میں ایک ناقابل بیان شرابی نشہ کی سی رو دوڑا دی ہے۔

"ایڈلین! ـــــــ" اس نے جیسے تھرتھراتے ہوئے کہا "میں جا رہا ہوں اور جانے سے قبل میں تم سے چند باتیں کرنا چاہتا ہوں ـــــــ کیا اجازت ہے؟" اس نے ٹھہر کر پوچھا اور ایڈلین کی طرف دیکھنے لگا۔

"کہاں جا رہے ہو؟" کچھ دیر خاموش رہکر حسین مغنیہ نے پوچھا۔

"جزیرہ فیرو کی طرف ـــــــ ہر چند کہ موسم خراب ہے اور برفباری کی وجہ سے سخت خطرہ ہے لیکن کپتان نے حکم دیا ہے کہ پرسوں ہم روانہ ہو جائیں گے۔"

وہ ایک جہاز میں نائب کپتان تھا۔ اور اکثر سمندری سفر کر چکا تھا۔ ایڈلین نے اس کی گہری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"موسم تو واقعی خراب ہے لیکن کپتان کو کیا سوجھی۔ کیا وہ ایک مہینہ اور نہیں ٹھہر سکتا؟"

"ایک مہینہ؟ ـــــــ وہ تو ایک دن نہیں ٹھہرتا۔"

معاً ایڈلین کے دل میں رنج کی لہر سی اٹھی۔ اور اس کی آنکھوں کی گہرائیوں میں جذبۂ محبت نے کروٹ بدلی وہ چونک سی پڑی۔

"ہیگی! کتنا لمبا سفر ہے؟" اس نے پوچھا۔

میرا خیال ہے۔ ہم چھ ماہ سے قبل واپس نہ آسکیں گے۔ کیونکہ سرما میں سمندری سفر بعجلت طے نہیں ہوا کرتے؟"

"ہیگی ـــ! مجھے افسوس ہے کہ تمہارا کپتان اپنی بیوقوفی پر ضد کر رہا ہے ـــ"

ایڈلین نے اس سے اور قریب ہوتے ہوئے کہا ـــــــ "سردیوں کے دنوں میں اوقیانوس کے جنوبی سمندروں میں شدید برفباری کے وقت سفر کرنا یقیناً ایک حماقت ہے شاید کپتان پاگل ہے۔ یا اُسے فیرو سے کسی بھاری نفع کی امید ہے۔"

"میرا خیال ہے۔ وہاں اس کے کسی دوست نے سونے کی کان کا انکشاف کیا ہے۔"

"لیکن ہیگی! کیا تم رک نہیں سکتے؟" اس نے انتہائی کرب آمیز لہجہ میں کہا "کپتان کو قسمت آزمانے دو۔"

"نہیں ـــــــ" وہ ڈوبتی ہوئی آواز میں بولا۔ "ایڈلین! تم جانتی ہو کہ کپتان پھر مجھے جہاز میں یہ عہدہ نہ دیگا ـــــــ میرا مستقبل صرف اسی کے رحم و کرم پر منحصر ہے۔ اگر میں اس کے حکم کی خلاف ورزی کروں۔ تو میرے لئے اچھا نہ ہوگا۔ اب یہی بہتر ہے کہ میں اس کے ساتھ سفر کے لئے تیار ہو جاؤں۔ ہم عنقریب ملیں گے۔"

اس کے سینہ میں خیالات کی مہین مہین تہیں جمی ہوئی تھیں۔ اور عشق کی کوئی سیمابی رو اس کی نبضوں کے ہر گوشے میں دوڑ رہی تھی جس کی وجہ سے کبھی کبھی اس کی آواز تھرا جاتی تھی۔

موسیقی کی دیوی ـــــــ نے رحم آلود نگاہوں سے ہیگی کی طرف دیکھا۔ وہ کسی گہرے خیال میں کھو گئی۔ اپنی آنکھوں کو ذرا اتنا سکیڑا کہ ان کے کناروں پر ہلکی ہلکی سی لکیریں پیدا ہو گئیں اور پلکیں تیروں کی طرح سیدھی ہو گئیں۔ وہ کچھ سوچنے لگی ـــــــ سنہرے تاروں والا فیتہ بدستور اس کی کمر کے گرد بل کھاتا ہوا اس کی سفید سفید پنڈلیوں تک لٹک رہا تھا۔ اور کبھی کبھی ہوا کا ایک آدھ خفیف سا جھونکا اس کے بدن سے اس طرح مس ہو کر گذر جاتا کہ وہ سردی محسوس کرتی اور اپنے شانوں پر لہرانے والے بالوں پر ہاتھ پھیر لیتی ـــــــ دیر تک وہ کسی خیال میں غرق رہی۔ آخر اس نے عشق آلود نگاہوں سے ہیگی کے سفید و سرخ چہرے کی طرف دیکھا جس پر سمندری سفروں کے دوران میں خنک اور برفانی ہواؤں کے کبھی نہ مٹنے والے رنگ کے اثرات ظاہر تھے ـــ بچارا ہیگی خاموش کھڑا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ اپنے جذبات کو کیونکر بیان کرے ـــــــ وہ ایک لمبے سفر پر جانے والا تھا۔ اور یقیناً اسے اپنی دل کی ملکہ کو ایک طویل الوداع کہنا چاہئے۔ اور اسے تو اور بھی بہت کچھ کہنا تھا لیکن اس نے محسوس کیا کہ شاید وہ کچھ بھی نہ کر سکے گا ـــ وہ خاموشی سے صرف ایڈلین کے گون کو دیکھتا رہا۔

"ہیگی" اچانک ایڈلین بولی ـــ "تم مجھ سے کچھ کہنا چاہتے تھے۔"

"ہاں ـــــــ" ہیگی نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا ـــــــ "اور اب مجھے محسوس ہونے لگا ہے۔ کہ میں کچھ نہ کہہ سکوں گا۔"

"کیوں اب کیا بات ہے؟"

وہ خاموش رہا۔ اس کے چہرے پر ایک حسرت خیز مسکراہٹ ظاہر ہوئی۔ اور جیسے کسی شدید احساس سے اس کے ہاتھ باوجود روکنے کے لرزنے لگے۔

"ایڈلین ـــــــ ایڈلین!! میں تم سے محبت کرتا ہوں" آنکھوں کو بند کئے اوپر دھند آلود آسمان کی طرف منہ کر کے اس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ اور پھر خاموشی کے ساتھ انتظار کرنے لگا کہ موسیقی کی ملکہ اسے کیا جواب دیتی ہے؟

ایڈلین نے اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لیکر دبایا۔ اور قدرے آگے جھک کر کہنے لگی ـــــــ

"رخصت ہونے سے قبل ہمیں لازم ہے۔ کہ ہم ایک دوسرے کو بوسہ دیں ـــ ہیگی! میں تمہارے جلد لوٹ آنے کی دعا کروں گی۔ میں سمندری سفروں سے ڈرتی ہوں"

لرزتے —— کانپتے —— کپکپاتے ہوئے ان دونوں نے ایک دوسرے کو بوسے دیئے۔ یہ ان کی محبت کا پہلا اور آخری پیمان تھا —— وہ دونوں دیر تک سفید سفید دھند میں کھڑے ایک دوسرے کے دل کی دھڑکنوں کو سنتے رہے —— حتیٰ کہ تاریکی کی بڑھتی ہوئی لہریں تمام فضا پر چھا گئیں اور دور دور شہر کی تنگ گلیوں سے کسی کتے کے بھونکنے کی بھیانک آوازیں سنائی دینے لگیں۔

صبح کو پرندے جب بال و پر سمیٹے درختوں میں چھپے بیٹھے تھے ہیگی کا جہاز اوقیانوس کے نیلگوں پانیوں میں تیرنے لگا۔ اور جزیرہ فیرو کی طرف روانہ ہو گیا۔

ادھر دھندلکوں کے گہرے سینے کو چیر کر سورج کی اولین چمکدار —— اور نقرئی شعاعیں دور موجوں پر تیرتے ہوئے جہاز کے عرشہ پر کانپنے لگیں۔ اور ادھر ساحل پر کھڑی ایڈلین نے آخری بار اپنا سرخ رومال ہلایا —— جہاز ہوتے ہوتے دور سے دور تر ہو گیا —— اور آخر سینۂ بحر پر وہ ایک متحرک نقطہ کی طرح نظر آنے لگا اور چند لمحوں کے بعد —— اوقیانوس کے جنوبی سمندروں کی جھلکتی کانپتی اور اچھلتی ہوئی موجوں سے اس پار غائب ہو گیا۔

ایڈلین دیر تک خیالات کے ہجوم میں کھوئی رہی۔ ساحل کے آدمی اسے گھور گھور کر دیکھ رہے تھے۔ اور ایک نوجوان تو بار بار اس کے قریب سے صرف اسی لئے گذرتا تھا۔ تاکہ اس کے چہرے کو نظر بھر کے دیکھ سکے۔ لیکن وہ پتھر کی مورتی کی طرح گم سم کھڑی دور افق پر دیکھ رہی تھی۔ جہاں ہیگی کا جہاز ایک کانپتے ہوئے نقطہ میں متشکل ہو کر غائب ہو گیا تھا —— کچھ دیر کے بعد کسی کی پروسن نے اسے وقت کے گذرنے کا احساس دلایا۔ اور وہ اپنے مکان کی طرف چلنے لگی۔

ہیگی کے چلے جانے کے بعد وہ اکثر سمندری نغموں سے اپنے دل کو بہلایا کرتی۔ اس کی آواز میں بلا کا سوز اور موسیقیانہ انداز پیدا ہو گیا۔ وہ بے دھڑک محفلوں میں اپنے محبوب کی آمد کے گیت گاتی۔ اور ان میں سمندر سے آنے والی ہواؤں سے مخاطب ہو کر کہتی۔

"میں نے اپنا محبوب ایک لمبے سفر پر بھیجا ہے۔ اسے میری یاد دلاتی رہنا ہے صبح کی نرم رو نسیم اور شام کی مشام جاں کو معطر کرنے والی ہوا کی لہروں پر اپنے نغمے بہایا کرتی۔ اس کی آواز —— باد شمال کے چلنے سے بانس کے درختوں کی پتلی پتلی شاخوں سے پیدا ہونے والی دلربا موسیقی کی طرح سریلی اور میٹھے پانی کی طرح جھیل کی طرح شیریں اور صاف تھی۔ اکثر محفلوں میں گانے کی وجہ سے وہ مشہور ہو گئی۔ کیونکہ جزیرہ فیرو کو جانے والے محبوب کی محبت نے اس کی آواز میں ایک ایسا جادو آمیز اثر پیدا کر دیا تھا کہ جو بھی اس کے گانے کو ایک مرتبہ سن لیتا وہ دوبارہ سننے کی خواہش کرتا۔ اور یہی وجہ تھی کہ وہ ملک میں چاروں طرف مشہور ہونے لگی۔

جب وہ کسی ہوٹل یا ریستوران میں مدعو ہوتی۔ اور اس کے گرد اکثر فوجی افسر بیٹھے ہوتے تو اس وقت وہ ایک سپاہیانہ نغمہ چھیڑتی۔ جس میں قدیم وحشی تا

روسیوں کے موٹی موٹی کھال۔ گردن کے لمبے لمبے بالوں اور تیز نوکدار سموں والے گھوڑوں کا ذکر ہوتا جن پر سوار ہو کر وہ مختلف شہروں اور آبادیوں پر حملہ آور ہوتے تھے۔

پھر وہ الفاظ میں ان بہادروں کا نقشہ کھینچتی۔ جو وسط ایشیا کے پہاڑی اور صحرائی علاقوں سے نکل کر تمام دنیا میں پھیل گئے تھے۔ ان کی قدیم معاشرت کے حالات سرخ رنگ کے چہروں پر بہادرانہ جفاکشی اور دلیری کے نقوش۔ جانوروں کی کھالوں سے ڈھکے ہوئے مضبوط اور توانا بدن —— غرض وہ اس طریق سے حال بیان کرتی کہ لوگ حیران ہو کر ششدر رہ جاتے۔ اور دنیا کی گذشتہ تہذیب مختلف زاویوں سے اُن کی آنکھوں کے سامنے آ جاتی۔

لیکن ان سب سے بڑھ کر اس کا اپنا دل پسند ایک سمندری گیت تھا جس میں جہازرانوں کی اولوالعزمی اور جرات و ہمت کی طویل اور روح پر وجد طاری کر دینے والی ایک منظوم داستان تھی کہ کس طرح بہادر ملاحوں نے اپنی جان پر کھیل کر وحشی سمندروں کو عبور کر کے جزیروں اور نئے ملکوں کا انکشاف کیا۔ اور کس طرح برفانی ہواؤں اور بحری سفروں نے ان کے چہروں پر اپنے لافانی اثرات چھوڑے جن کو دیکھنے سے ان کی شجاعت اور دلیری آشکار ہوتی۔

غرض اسی طرح وہ اپنے عجیب اور دل پر بہادرانہ عظمت کے نقوش ابھارنے والے نغموں کی وجہ سے چاروں طرف مشہور ہو گئی۔ دنیائے موسیقی میں وہ ایک قابل عزت و احترام ہستی بن گئی۔ لوگ جوق در جوق اس کے گیت سننے کے لئے اکٹھے ہو جاتے اور وہ ایک پر وقار اور جادو آمیز انداز سے ان لوگوں کا شکریہ ادا کرتی۔ جو اس کی سحر انگیز آواز پر سونے چاندی کی بارش کیا کرتے تھے۔

"اس کی آواز میں طلسم ہے اور وہ خود ایک جادو ہے" اس کے بارے میں تمام ناقدان فن کی یہ رائے تھی۔

"زندہ جادو" لوگ کہا کرتے تھے

اور جب وہ کسی محفل سے واپس آتی۔ تو اس کی جیبیں دولت سے بھری ہوئی ہوتیں۔ اور سونے چاندی کے سکوں کو دیکھ کر اس کے نازک دل میں ایک ہوک سی اٹھتی اور بیچارے ہیگی کی متفکر اور خوبصورت شکل آنکھوں میں پھر جاتی۔ جو محض دولت کی خاطر جزیرہ فیرو کے طویل سفر پر گیا ہوا تھا۔

"نغموں کی دیوی" —— ایک خوش مذاق نوجوان نے کہا جب وہ ساحل سمندر کے قریب ایک روشن اور چمکدار صبح کو گارڈن پارٹی میں اپنا ایک سمندری گیت گا رہی تھی۔

جواب میں اس کے ہونٹوں پر ایک زہر آلود مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اور اس کی شرابی آنکھوں سے آنسوؤں کے قطرے ڈھلک آئے۔ لوگوں نے حیرت بھری نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا لیکن وہ بدستور گاتی رہی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور وہ گا رہی تھی۔ دلسوز لہجہ میں۔ لوگ بُت بنے ہوئے سن رہے تھے اور وہ گائے جا رہی تھی۔

"اے سمندر کی کف گیر موجو!
اے وحشی ناگنو!! —
تمہاری پر ہیبت آلود پھنکاریں سنکر
میرا دل کانپ اُٹھتا ہے
اے اوقیانوس کے جنوبی سمندرو!
رحم کرو ——— رحم کرو۔
میں نے متواتر آٹھ ماہ تک فیبر و کو جانے والے محبوب کی
واپسی کا انتظار کیا — لیکن سمندروں کے اس پار
سے کوئی خبر نہیں آئی۔
میں اس دل وجان سے عزیز کے غم فراق میں دیوانی ہو رہی
ہوں۔ اے بحری ہواؤ! تم ہی کچھ مجھے تسکین دو —"

یہ ایڈلین کا اپنا بنایا ہوا گیت تھا۔ جو اس نے ہیگی کی یاد میں گایا۔ اس کی نغمہ ریز آواز آہستہ آہستہ مدہم ہوتی ہوئی سکوت میں ڈوب گئی چاروں طرف ایک الم انگیز سناٹا طاری ہو گیا — سرما کی چمکتی ہوئی صبح تھی۔ اور ایڈلین — یورپ کی نکہت تاب ساحرہ — نغموں کی دیوی "کھڑی دو سمندر کی موجوں پر اڑتی ہوئی سفید اور چمکدار جھاگ کو دیکھ رہی تھی۔

بعض نرم دل لوگ اس کی اس حالت کو دیکھکر اپنے آنسو پونچھے بغیر نہ رہ سکے ان کے دلوں پر ایڈلین کے اس غم دوز گیت نے بہت اثر کیا۔ ایک بوڑھی عورت تو اس سے بے اختیار لپٹ گئی۔

"ایڈلین — !تمہیں کس کی یاد ستا رہی ہے ؟" اس کے نغموں کے مداح ایک نواب نے پوچھا جب وہ دونوں تنہا باغ کی روشوں پر چہل قدمی کر رہے تھے — "مجھے آج ہی تمہارے گیت سے معلوم ہوا ہے کہ تم کسی کے عشق میں تڑپ رہی ہو — آخر وہ کون ہے ؟"

"کاونٹ! وہ سمندروں کے سفر کرنے والا ایک جہازراں ہے — لیکن سنو!" ایڈلین نے ذرا ٹھہر کر جیسے فیصلہ کن انداز میں کہا "تمہیں اس معاملہ میں مجھ سے مزید کوئی بات نہ کرنا چاہیئے "

اور وہ ایک طرف کو تیز تیز چلنے لگی۔ نواب متحیر و متکیف کھڑا حسرت پاش نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا دور سمندری موجوں کے وحشیانہ انداز میں گانے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

کئی سال گذر گئے لیکن اوقیانوس میں سفر کرنے والا جہازراں واپس نہ آیا وہ سمندر کی خونخوار اور سفاک موجوں کا لقمہ بن چکا تھا۔

دیوانی ایڈلین اس کے فراق میں گھل گھل کر نحیف و نزار ہو چکی تھی۔ اور اپنی حبشن پڑوسن کی طرح وہ بھی اب اکثر اوقات تصورات کے پروں پر اڑتی ہوئی سمندری جزیروں کی سیر کیا کرتی تھی۔ اس نے ایک گیت بنایا جس کا عنوان تھا۔

"خونی جزیرے کا مسافر"

اور اپنے اس گیت کو اس نے اکثر محفلوں میں گایا۔ اس پر رقت کی سی حالت ہو جایا کرتی تھی۔ جب وہ درد انگیز لے میں یہ اشعار پڑھا کرتی۔

"ایک دھندآلود صبح کو میں نے ساحل پر کھڑے ہوکر
اسے الوداع کہی۔
وہ مسکراتا ہوا موت کی لہروں پر عازم سفر ہوا۔
آہ! خونی جزیرے کا مسافر! —"

اکثر نوجوانوں نے جو اس کے حسن شعلہ ریز کے پروانے تھے "نغموں کی دیوی" کو اداس اور غمگین دیکھکر اس کی زندگی میں رومانس پیدا کرنا چاہا۔ تاکہ وہ کسی طرح مسرور رہ سکے۔ لیکن ایڈلین کے دل کو ایسا شدید صدمہ پہنچ چکا تھا۔ کہ اس کے زخم ایک عرصۂ دراز تک مندمل نہ ہو سکے۔

ایک طویل مدت کے بعد جب وہ اپنے ہوش میں آئی۔ تو اس نے پھر ایک قیامت بپا کی۔ اور اب وہ اپنے نغموں میں اتنی مشہور ہو چکی تھی کہ یورپ کے ہر ملک میں اس کے بے شمار پرستار پیدا ہو چکے تھے — ایک مدت تک وہ مغربی شہروں میں گھومتی رہی۔ اور اس نے لاکھوں روپیہ پیدا کیا لیکن یہ سب کچھ ہیگی کی محبت کا اثر ہی تھا جس نے اس کی طبیعت میں حقیقی سوز وگداز پیدا کیا اور وہ ہر دلعزیز ہو گئی

اخیر میں ہم صرف شاہان یورپ کے کچھ اعزازی فقرے جو انہوں نے ایڈلین کی شان میں لکھے آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

"تمہارا گانا مدہوش کن اور تسکین آور ہے" ——— زار روس
"سب زمانوں کی بلبل کو میرا سلام" ——— قیصر جرمنی
"میں فخر کرونگی اگر تم خود کو میری رعایا میں شمار کرو" ——— ملکۂ سپین
"تمہاری خدا داد شیریں آواز ایک "نغمۂ حیات" ہے ——— شاہ بیار
"تم گانے میں تمام عورتوں پر سبقت لے گئیں" ——— ملکۂ وکٹوریہ
"موسیقی کی ملکہ کو سلام شرق" ——— شاہ آسٹریا
"جادو اثر آواز والی مغنیہ" ——— ملکۂ بلجیم

"اے جان محفل!! اے نغموں کی شہزادی!! میری محبت کا ہاتھ تیری طرف بڑھ رہا ہے۔ میرا ہدیۂ دل قبول کرو"۔
——— پیٹرس پریزیڈنٹ جمہوریہ فرانس

کیا جمہوریہ فرانس کے اس صدر اعظم کی آرزو پوری ہو سکی ——— ؟؟

لیکن سنا ہے کہ ایڈلین ——— جہازراں کی محبوبہ اور موسیقی کی دیوی ——— سرما کی دھندلی دھندلی صبحوں کو اکثر ساحل پر کھڑی ہوکر ایک گیت گایا کرتی تھی۔ جس کا آخری شعر ہے —

اوقیانوس کے جنوبی سمندروں میں کھو جانے والے گویے!
سلام ——— !!"

انوار کمال

ایسی گھڑیاں بھی بیتی ہیں
ایسی راتیں بھی آئی ہیں

جب تم مجھ سے دور نہیں تھے
دنیا میں مجبور نہیں تھے
شاید تم کو پاسِ وفا تھا
شاید تم مغرور نہیں تھے
اکثر یاس میں ڈوبے رہنا
الفت کے دستور نہیں تھے
میرا دل تھا شاداں از حال
تم غم سے رنجور نہیں تھے

ایسی گھڑیاں بھی بیتی ہیں
ایسی راتیں بھی آئی ہیں

تم نے بھی قسمیں کھائیں تھیں
میں نے بھی اقرار لیا تھا
ڈوبے تھے آکاش کے تارے
حسن کو جب گلبار کیا تھا

ہم نے جوانی کی کھیتی کو
یوں ہی لالہ زار کیا تھا
شام کی اجلی تاریکی میں!
میں نے تم سے پیار کیا تھا

ایسی گھڑیاں بھی بیتی ہیں
ایسی راتیں بھی آئی ہیں

سندر سپنا تمہاری ہستی!
بہکی بہکی مسرت نگاہیں
چاہ کا رشتہ کیسے توڑیں
بھولیں کیونکر پریت کی راہیں
کس نے تمہارے لب سے چرائیں
تپتے من کی ٹھنڈی آہیں
رنگیں بادہ ۔ دلکش نغمہ
چنچل نظریں سیتل باہیں

ایسی گھڑیاں بھی بیتی ہیں
ایسی راتیں بھی آئی ہیں

منیر کمال بی اے (جالندھری)

عبدالرشید بی اے

گلبانگِ حیات

کفِ خاک بیباک ہو، دیدہ ور ہو — خود آگاہ ہو، خودگر و خودنگر ہو — زمیں پر قدم آسماں پر نظر ہو
کہ لاریب منشائے فطرت یہی ہے (احوال و مقامات)

اگر بزرگوارانِ اردو اس ترکیب میں کوئی کج پیچ محسوس نہ کریں۔ تو میں "شاعر" کا ترجمہ استعارہ" ہلاکِ جرأت" کروں گا۔ کیونکہ ہر زبان کے نامور شعرا کے افکار کا بغور مطالعہ یہ حقیقت آشکار کرتا ہے کہ جنسِ انسانی کا یہ حصّہ بالعموم موجود سے غیر مطمئن، غائب کے خواب دیکھنے والا، قریب سے بیزار اور بعید کا دالہ و شیدا واقع ہوا ہے ان کی زندگی کا ہر لمحہ ایک مسلسل ذہنی کرید ہے۔ جو ہر رنگ میں انوکھا پن ڈھونڈھنے اور نہ ملے تو پیدا کرنے کی کوشش میں ہے۔ وہ غیر مانوس کو مانوس اور مثالی کو حقیقی میں تبدیل کرنا چاہتا ہے۔ اسے ہر موجود میں یہ منقوش ہو یا تصوراتی ایک کمی محسوس ہوتی ہے۔ ایک خلا دکھائی دیتا ہے۔ وہ یہ کمی پورا کرنے اور یہ خلا پُر کرنے کا متمنی ہے چنانچہ یہی وہ "نقشِ کامل" کی دھن ہے۔ جو اسے غرقِ فکر رکھتی ہے۔ وہ ہر بار ایک نئی دنیا تعمیر کرتا ہے۔ پھر اس پر وہ نظر ڈالتا ہے نقش غیر مکمل دکھائی دیتا ہے۔ وہ ایک نیا نقش تیار کرتا ہے۔ اس امید سے کہ یہ وہ متوقع نقش ہوگا جس کا وہ جویا ہے چنانچہ وہ اپنی اس دنیائے تصورات کو بسانے کی تگ و دو میں مصروف رہتا ہے۔ بعض اپنی اس تگ و دو کو الفاظ کا جامہ پہنانا جانتے ہیں۔ بعض اسے رنگوں اور خطوں سے ظاہر کرتے ہیں بعض پتھر پر اس کا اظہار کرتے ہیں بعض اس کا اظہار عمل سے کرتے ہیں بعض اس کا ظاہر کرنا پسند نہیں کرتے۔ یہ سبھی لوگ شاعر کہلائیں گے۔

گلبانگِ حیات کے مصنف خان بہادر خواجہ محمد مسیح پال امینؔ حزیں نے بھی ایک دنیا بسائی ہے۔ وہ بھی "نقشِ کامل" کی تلاش میں ہیں جس کے کچھ دھندلے سے نقوش شعرِ محولہ بالا میں عیاں ہیں لیکن جیسا کہ سبھی جانتے ہیں اس دنیا کے بسانے میں کچھ قدور ترجیحات بھی حصہ لیتی ہیں بلکہ اس دنیا کی تعمیر کا مواد یہی قدور و ترجیحات ہیں۔ کسی شاعر کے افکار کا صحیح جائزہ لینے کے لئے یہ ناگزیر ہے کہ اس کی ان قدور و ترجیحات کا پتہ چلایا جائے اور ان کی جانچ پڑتال کی جائے صرف اسی طرح شاعر کی دنیا کا جغرافیہ معلوم ہو سکتا ہے۔ آب و ہوا پیداوار اور بسنے والوں کے حالات سے شناسائی ہو سکتی ہے "گلبانگِ حیات" کا مطالعہ بعض ایسے تصورات بیدار کرتا ہے جو اقبال کے طالبعلموں سے مخفی نہیں اور جن پر علامہ مرحوم کی مہر نمایاں ہے۔ انہوں نے "خمخانۂ اقبال" سے اتنی پی ہے کہ وہ خود بھی اسی دو آتشہ سے پُر نظر آتے ہیں۔ ان کا خیال کسی جانب ہی رُخ کیوں نہ کرے ہمیں اندازہ لگانے میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوتی۔ کہ ان کی منزل علامہ مرحوم کا نشان کیا ہوا کوئی مقام ہے۔ خطِ فکر اقبال کا ہے۔ وجدانی ماحول پر اقبال کا سایہ ہے

اب یہ بات کہ قطرہ سمندر میں مل کر اپنا آپ کھو چکا ہے یا خود بھی سمندر بن چکا ہے۔ ایک طویل و غیر ضروری اور لفظی بحث ہے جگہ کی قلت اور مقام کی ناموزونی دو اور حیا تیں ہیں۔ جو اس راستے میں حائل ہیں۔ بہرحال اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انہیں اقبال سے مجنونانہ عقیدت ہے۔ وہ انتساب میں "پیرِ ہندی" سے مخاطب کرتے ہیں۔ ان کی اس عقیدت کے جذباتی پہلو کا اظہار ان کی نظم "تربتِ پیرِ ہندی" سے ہوگا۔

لحد میں مردِ مومن سو رہا ہے ۔۔ نزولِ رحمتِ حق ہو رہا ہے

عقیدت پیرِ ہندی سے ہے کتنی ۔۔ کہ جو زائر ہے دل سے رو رہا ہے

کھنچا ہے گردِ تربت حلقۂ نور ۔۔ یہی ہوتے ہیں مردوں کا ہے طور

بزرگوں کی زیارت کر رہا ہوں ۔۔ دو عالم میں وہ اعلائی وہ منصور

دوسرے قطعے کی بین السطوری فضا جو نورانی منظر پیش کر رہی ہے۔ وہ بیان ہونے کی نسبت تصور میں حسین تر نظر آئے گا۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتے تھے۔ مگر رک گئے ہیں۔ تاب گویائی نہیں رہی یا شاید وہ زبان بے زبانی کے فلسفہ پر عامل ہو گئے ہیں۔ انتہائی درد و کرب اور انتہائی مسرت ہر دو انتہاؤں پر ایک سی کیفیت بھی پیدا ہوتی ہے۔ آنسوؤں کا اُمڈ آنا اور ہونٹوں پر مہر لگ جانا کسی جلال و جمال کی حامل بارگاہ میں کچھ ایسا ہی ہیبت آمیز لطف و سرور ہوتا ہے جو گویائی چھین لیتا ہے یہاں بھی یہی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ مگر یہ بادل بعد میں چھٹ جاتے ہیں۔ علامہ مرحوم کے وصال بحق ہونے پر جو نظم لکھی ہے اور پھر اقبال خدا کے حضور میں ان کی جذباتی عقیدت کے اظہار اور ان کی شاعری کے ماحول اور پس منظر کی بعض چیدہ چیدہ خصوصیات کا پتہ دیتی ہیں اس کے پہلو بہ پہلو ایک اور پس منظر بھی ہے جس کی اہمیت بیان شدہ پس منظر سے کسی طرح کم نہیں۔ ان کی تربیت ایک ایسی فضا میں ہوئی ہے۔ جہاں نیکی کے چہرے پر ایک مستقل میٹھی مسکراہٹ کھیلتی رہتی ہے۔ وہ ایک ایسے گھرانے میں پرورش پائے ہیں۔ جہاں نیکی اور دیانتداری پالیسی نہیں سمجھی جاتی۔ بلکہ ایک مثبت سچائی کی حیثیت سے عمل میں لائی جاتی ہے مصنف نے اپنے والد بزرگوار کے وصال بحق ہونے پر ایک نظم "حیاتِ طیبہ" لکھی ہے۔ اور طیبہ کے جتنے مفہوم میں تصور میں لا سکتا ہوں۔ ان کی ایک تصویر ان کے والد مرحوم کی زندگی تھی حق گوئی حق جوئی اور حق کوشی کا جذبہ جو آجکل کی "واقعیت پرست" دنیا میں تقریباً دستیاب ہونا بھی دشوار ہے۔ ان کے ہاں جنون کی حد تک پہنچا ہوا ہے۔ اس قسم کے جذبات نہیں ورثہ میں

ملے ہیں۔ اور یہ امر موجب اطمینان ہے۔ کہ اس مقدس اور بیش بہا ورثے کی حفاظت حاسدانہ طور پر کی گئی ہے۔ یہ طاقت گو پہلے تو سابقہ طاقت کے متوازی کام کرتی رہی مگر چونکہ جوہر میں دونوں ایک تھیں منزل ایک تھی۔ رفتار و ساز و سامان میں یکسانیت رہی اور پایان کار دونوں کو ایک ہونا پڑا اقبالیت کا عنصر مگر غالب ہی رہا۔ اس کی وجہ غالباً مغربی تعلیم اور آزادی فکر ہے۔ ان کی قدریں روحانی ہوں یا مادی ان پر اقبالیت کی مُہر نمایاں دکھائی دیتی ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اپنی مثالی دنیا بساتے ہوئے یا اس کا تصور قائم کرتے ہوئے انہوں نے اقبال کو ہادی راہ بنا لیا ہے۔ اس دنیا کی تعمیر اور ایسے نظام حیات کی تخلیق جو ان کا مطمح نظر ہے بعض خاص عناصر کی خاص قسم کا مطالبہ کرتی ہے۔ چنانچہ سے

رونقِ بزمِ زندگی تجھ سے ؛ گرمیٔ رزمِ زندگی تجھ سے
آرزو اے زرِ گلِ ہستی ؛ سرِ سبز لشۂ گلِ ہستی
تو نہ ہوتی تو زندگی کیا تھی ؛ ایک بے لطف سا تماشہ تھی

اس دُنیا میں سب سے زیادہ اہم اور بنیادی چیز "آرزو" ہے۔ زندگی کے تعلق میں آرزو کی اہمیت اور قیمت ایسی سلاست صفائی اور بے تکلفی سے بیان ہوئی ہے۔ کہ مزید تصریح کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی لیکن ایک اور مقام پر ایک ہی شعر میں آرزو کی اہمیت عظمت اور حسن کچھ اس انداز میں بیان ہوتے ہیں کہ "تغزل" اور "حقیقت نگاری" یکجا کرکے سمو دیئے گئے ہیں سے

اسی کے خون سے رنگیں ہے داستانِ حیات ؛ نہیں کھو کر دوں کیا جو آرزو نہ کروں

آپ جانتے ہیں کہ ہوا چلے تو پتوں میں سرسراہٹ پیدا ہوتی ہے۔ پودے جھومتے ہیں سبزہ وجد میں آتا ہے کلیاں ہنستی ہیں۔ دریا پر تموج ظاہر ہوتا ہے۔ یہ زندگی کی لہر ہوتی ہے جو کائنات کے رگ و ریشہ میں دوڑ جاتی ہے۔ انسانی زندگی میں "آرزو" نسیم کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسی کے دم سے ریاض حیات میں شادابی و رنگینی دکھائی دیتی ہے۔ یہی اس کی پژمردگی اور افسردگی کو بشاشت اور رونق میں تبدیل کرتی ہے لیکن یہ امکان نظر انداز نہ ہونا چاہئے۔ کہ نسیم باد سموم بھی بن سکتی ہے۔ خاص طور پر جب مقصود آرزو بنفسہٖ مقصد نہ رہے۔ بلکہ ذریعہ بن جائے۔ یہ صورت حرص و آز کا عنصر داخل ہونے سے پیدا ہوتی ہے اور انسان کہہ اٹھتا ہے سے

حرص نے کچھ بھی دیکھنے نہ دیا ؛ دانۂ زیرِ دام نے مارا

یوں بھی غور کرنے سے معلوم ہوگا۔ کہ اول تو حرص و آز طالب و مطلوب کے درمیان دیوار بن جاتی ہے لیکن اگر یہ مطلوب تک پہنچا بھی دے تو اس کامیابی کا عنوان ہی میرے خیال میں ناکامی ہوگا۔ حرص بجائے خود ایک دام ہے اور تہِ دام دانہ چگنے کی بجائے مخلصی کا فکر اور صیاد کے ہاتھوں ذبح ہونے کا غم زیادہ دامنگیر ہوتا ہے۔ اور اول الذکر مشکل ہو یا آسان ثانی الذکر صورت ضرور جانگداز ثابت ہوتی ہے۔ ویسے بھی یہ فضا کچھ خوشگوار دکھائی نہیں پڑتی۔ اس لئے آرزو کا صالح اور حرص و آز سے منزّا ہونا ضروری ہے۔ ورنہ یہ حرص کی دلدل شاہراہ حیات کو انتہائی طور پر دشوار گذار بنا دے گی۔

مگر آرزو محض بحیثیت ایک جذبۂ لطیف "باد و چنگ" کے مرادف ہے۔ بلکہ عمل کے بغیر خطرناک بھی ثابت ہوسکتی ہے۔ مگر یہ کہ اس کی تکمیل صرف عمل سے ہوسکتی ہے۔ اس کے متعلق اختلاف رائے ہونا دشوار ہے۔ عمل کی عدم موجودگی اس کی عدم تکمیل پر منتج ہوگی۔ اور یہ ایک ایسی کیفیت ہوگی۔ کہ پست ہمتی بیقینی کی کمی اور بدی کی محبت کی ذہنیت کے خوفناک نتائج اس کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے۔ عمل کے بغیر یہ محض بچوں کا گھروندہ ہوگا۔ جو کھیل سے جی بھر جانے پر وہیں تک جا تاہے جہاں وجود میں آنے سے پہلے تھا۔ اس بات کے مدنظر "گلبانگ حیات" کے مصنف نے آرزو کے ساتھ عمل کی اہمیت پر بھی بہت زور دیا ہے۔

حیات زیرِ فلک ہماری نہیں ہے بچوں کا کھیل ہمدم
ہے کارخانے میں قدر اسی کی جو کارکن ہے جو کاروان ہے
عمل کے شعلے سے کوئی نسبت نہیں ہے تقریر کے دھوئیں کو
میں پوچھتا ہوں کہ ہاتھ بھی ہیں یہ میں نے مانا تری زباں ہے

کیونکہ

خیالِ محض کجا اور کجی عملِ ناداں ؛ سراب ہو نہیں سکتا علاج تشنہ لبی
وہ ایک صیدِ زبوں ہے فلک کی نظروں میں ؛ عزیز جس کو نہیں شیوہ جفاطلبی

یہاں اس "شیوۂ جفاطلبی" کا ذکر غالباً اس لئے ضروری تھا کہ اگر حرص و آز سے منزّا آرزو اپنی تکمیل کی طرف قدم بڑھائے یعنی صاحب آرزو میدان عمل میں کود پڑے تو وہ ایک ایسے میدان میں اترتا ہے۔ جو وسیع ہونے کے علاوہ دشوار گذار بھی ہے اور جہاں "میاں" بھی گھات میں رہتا ہے۔ مشکلات رکاوٹیں ناکامیاں مصائب و آلام اسی سطح مرتفع کی پیداوار ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ طبیعت خطر پسند ہو لیکن آرزو اور عمل کے کچھ عرصہ گھل مل جانے سے انسانی زندگی ایک ایسی سطح پر پہنچتی ہے جہاں عالم جذبات کی فضا "ابن حزیں" کے لفظوں میں کچھ ایسی ہوتی ہے۔ کہ سے

آبلہ پائی سے ہوتے ہیں قدم اور بھی تیز
دردِ شوق بہرحال سوا ہوتا ہے
سیلِ دریا ہے کہ رُکنا جسے آتا ہی نہیں
کوئی طوفان سا طوفان بپا ہوتا ہے
اک دُھن ہے کہ ہر کیف لئے جاتی ہے
یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ کیا ہوتا ہے

اور صاحب عمل کی زبان پر ہر وقت یہ نعرہ بیباکانہ ہوتا ہے کہ سے

ہو طوفان در بغل جس موجِ مضطر کا ہر اک قطرہ
اسے کیوں جستجو ہو راحتِ آغوشِ ساحل کی

اس میں ایک جنگجو یانہ جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ مشکلات و مصائب کو خاطر میں نہیں لاتا لیکن اگر اس کی ان تھک کوششیں بھی اسے مطلوب تک نہ پہنچا سکیں۔ اسے شکست کا سامنا ہو۔ تو بڑے سے بڑے جگر دار کی کمر ٹوٹ جاتی ہے۔ اور اگر میدان عمل میں شکست لازمی نہ بھی ہو تب بھی اس کا امکان تو نظر انداز نہیں

کیا جا سکتا۔ شکست کے نتائج میں بیدلی و پست ہمتی پیش پیش ہیں لیکن شکست کا درد اس درد کی لذت اور اگر وجدان کی قوت بھی موجود ہو۔ تو اس درد کی تحریکی قوت صرف اسی انسان کو معلوم ہو سکتی ہے۔ جو کچھ کرے" امین حزیں اس نشیب و فراز سے آگاہ ہیں۔ اور ایک "صاحب حال" کی طرح ایک مستغنیانہ انداز اختیار کرتے ہیں۔ اور صاف صاف کہہ دیتے ہیں ؎

ہو شکوہ سنج ہی کیوں دل کہ جب ہو یہ معلوم
بنے ہیں کس کے لئے رنجہائے گوناگون

سرسری نظر میں یہ تبصرہ چنداں حوصلہ افزا نہیں مصرع ثانی میں استفہام پیدا ہونے سے آلام و مصائب کی ناگزیریت جس انداز سے پیش ہوئی ہے۔ وہ عام طور پر شکست پذیر ذہنیت کا غماز ہوتا ہے لیکن مصرعہ اولی اسے ایک جنگجو سپاہی کے جذبات بنا رہا ہے اور اگر طبیعت "خطر پسند" ہو تو بین السطور میں ایک ایسا منظر نظر آئے گا۔ جو "سازگار" بھی ہو۔ اس لئے امین حزیں بعض ترغیبیں بھی پیش کرتے ہیں۔

ایمان کی دنیا ہے' ایقان کی دنیا ہے
مہجور کی دنیا بھی کس شان کی دنیا ہے
معمول یہاں کا ہے بے تابی و بے خوابی
یہ جان کی دنیا ہے۔ پہچان کی دنیا ہے

نہایت رواں دواں انداز ہے لیکن مصنف اس امر سے ناواقف نہیں کہ ابھی ایک خطرناک مقام اور ایسا ہے۔ جو بعض ایسے اعمال کی طرف رہنمائی کرتا ہے جس کو امین حزیں کی دنیا کی مخلوق پسندیدہ نگاہوں سے نہیں دیکھتی۔ جیسا کہ اوپر کہیں ذکر آچکا ہے شکست صاحب عمل کے یقین میں کمی اور حوصلے میں پستی پیدا کر سکتی ہے اور ہو سکتا ہے کہ ایسے میں انسان ہجر کو وصال میں تبدیل کرنے کے لئے غیر سے طالب امداد ہونے کی ترغیب سے نہ بچ سکے۔ یہ ان کی زندگی کے بنیادی اصولوں کے خلاف ہے۔ اوروں کا دست نگر ہونا امین کی دنیا کی مخلوق کے وقار کے خلاف ہے۔ کیونکہ ؎

یہی تو کام کی اک چیز دگئی تھی تجھے
امین دراز نہ کرنا تھا التجا کے لئے

چنانچہ وہ اپنی دنیا کے مثالی انسان کے منہ سے نکلواتے ہیں کہ ؎

ہم تو کہتے ہی رہیں گے دل مردہ سے امین
خود اگر جی نہ سکے منت عیسے نہ کرے

اور پھر ؎

اسی شعلہ کا میں قائل ہوں جو ہو اپنے سینے میں
کلیم اللہ کریں جا کر طواف شعلۂ سینا

اس میں اقبال کی بیباکی لہریں مار رہی ہے ہماری واقعیت اور خاص طور پر ترقی پسند دنیا اسے "جنون" کہیگی۔ کیونکہ ان کی زندگی کا بنیادی اصول "مفاہمت" (Compromise) ہے۔ لیکن شاعر یا فنکار عوام کی رائج کردہ قدروں کا پابند نہیں۔ وہ اپنی قدروں رائج کرنا چاہتا ہے۔ کیونکہ وہ دنیا بھی اپنی آباد کرنا چاہتا ہے۔ یہی جنون "شعریت" ہے لیکن امین نظیری کے اس شعر کی ماہیت سے واقف ہیں کہ ؎

خطا بمردم دیوانہ کس نمے گیرد ؎ جنوں نداری و آشفتہ خطا اینجاست

یہ جنوں دماغی خلل یا نظیری کے لفظوں میں "آشفتگی" نہیں۔ اور اس سے جتنا بھی دور ہو اتنی ہی عظمت کا حامل ہوتا چلا جائیگا۔ اس لئے وہ نتائج سے بے نیاز رہنا چاہتے ہیں اور عمل پیہم کے گیت گاتے ہیں۔ دوزخ ہجر کو "جنت وصل" میں تبدیل کرنے کے لئے غیروں کا دست نگر ہونا ان کی نگاہوں میں "عقوبت ہجر" کے برابر ہے لیکن وہ عامل کو مایوس نہیں دیکھنا چاہتے۔ یہ مطمح نظر کے قابل حصول ہونے میں یقین کی کمزوری پر دال ہے۔ اور یاس کے خلاف ان کے الفاظ میں انتہائی جذباتی شدت پیدا ہوگئی ہے ؎

یاس میں چھوڑ۔ کے مرتے ہیں کم ظرف امین
ظرف عالی ہے تیرا ہمت فریاد نہ کر

یہ رجائیت کی جوانی ہے۔ جو پھوٹ پڑی ہے۔ انہیں یقین ہے کہ آرزو اور عمل کے اتصال سے ایک ایسی بے پناہ طاقت وجود میں آتی ہے جس کی زیادہ دیر تک مزاحمت محالات سے ہے اور پایان کار ہر چھوٹی بڑی مزاحمت اس کے خلاف ٹکرا ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتی ہے۔ اس بات نے ان کے یقین کو یہانتک پختہ کر دیا ہے کہ وہ دیوار جو ہجر و وصال کے درمیان کھڑی ہے۔ اس بے پناہ سیلاب کی رو میں بہجائیگی۔ اور وہ محبوب سے ہمکنار ہو جائینگے اس لئے وہ اظہار درد کو بھی قابل مذمت سمجھتے ہیں۔ ایک جنگجویانہ جذبہ ان کے سینے میں موجزن ہے۔ پکار اٹھتے ہیں ؎

اپنی آنکھوں کو نہ خونناب فشاں ہونے دے
آسماں تک سے یہ کہدے مری امداد نہ کر

وہ خود تو یہ جانتے ہیں کہ ہر شخص ان خطوط پر چل کر اپنا گوہر مقصود حاصل کر سکتا ہے لیکن ان کی یہ تمنا ہے کہ عوام بھی یہ جان لیں۔ اس راز سے آشنا ہو جائیں۔ تاکہ ضرب مخالف پڑنے پر پسپائی کا خیال تک نہ آئے۔ مدافعت کے ساتھ حملہ کرنے کا ارادہ اور حوصلہ بھی ہو ہمت برقرار رہے عزم نہ ڈگمگائے۔ کیونکہ جذبہ طلب کی موجودگی حصول مقصد کا عزم راسخ اور مقصود کے حسن و عظمت کا یقین کامیابی کے ضامن ہیں۔ اور اس کا شاعرانہ ثبوت یہ ہے کہ ؎

جو نونہال طالب بالیدگی رہے ؎ پھولے وہی چمن میں وہی بار ور ہوئے

یہ وہ دنیا ہے جس میں وہ خود جینا چاہتے ہیں اور متمنی ہیں کہ عوام بھی اس میں سانس لیں اور جب یہ تمام ڈھلوانیں وادیاں۔ دریا و صحرا عبور کر لئے جائیں۔ تو زندگی ایک ایسے مقام پر پہنچتی ہے۔ جسے امین حزیں یوں پیش کرتے ہیں ؎

زندگی ہے برق سا بیتاب ہو جانے کا نام
چشم انجم کی طرح بیخواب ہو جانے کا نام
شمع کی مانند بہر بزم جل جانے کا عشق
دن کا سورج' رات کا مہتاب ہو جانے کا نام

یہی وہ کیفیت ہے جو "شعور ذات" کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ اور جسے علامہ اقبال

کی اصطلاح میں "خودی" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ "خودی" فلسفہ کا ایک ٹیڑھا اور الجھا ہوا مسئلہ ہے۔ اس پر محض ایک اصطلاحی بحث و تمحیص ہوتی رہی ہے۔ یورپ کے مفکرین نے اس پر حیثیت ایک نکتۂ فلسفہ خاصی موشگافیوں سے کام لیا ہے۔ اقبال وہ پہلی اور مجھے امید ہے کہ آخری شخصیت تھی جنہوں نے اس کا شاعرانہ اطلاق روزمرہ زندگی پر کرنا چاہا۔ اور اس میں معقول حد تک کامیاب ہوئے۔ "خودی" پر یہ شاعرانہ تبصرہ اقبال کے حصے میں آیا تھا۔ انہوں نے اپنا یہ پارٹ بوجہ احسن ادا کیا۔ "گلبانگ حیات" کے مصنف اقبال کے روحانی شاگرد ہیں۔ جیسے کہ دیباچہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ انہوں نے ایکبار علامہ کی خدمت میں زانوئے تلمذ تہ کرنے کا ارادہ بھی ظاہر کیا چنانچہ وہ اپنے روحانی پیر کے خاص الخاص موضوع سے غیر متاثر نہیں رہے۔ ان کے شعور و وجدان و مشاہدہ تینوں طاقتیں انفرادی طور پر کام کرتی ہوئی اس نتیجہ پر پہنچی ہیں۔ کہ یہ خودی ایک مثبت سچائی ہے۔ محض فلسفیوں کی ہوا ہوائی نہیں۔ اور جملہ موجودات کائنات کی آرزوں کا معراج "خودی" ہی ہے۔ کیونکہ مشاہدہ شعور و وجدان کی مشترکہ شہادت ہے کہ ؎

احساس خودی ہی سے بلبل کا ترانہ ہے ؛ پھولوں کی دلآویزی رنگین بہانہ ہے

احساس خودی سے ہے احساس حقیقت کا ؛ یہ ربط نہ ہو جس میں بے ضبط فسانہ ہے

اور

دریا کے تموج میں قطرے کی خودی پنہاں ؛ گوہر کے تجمل میں قطرے کی خودی نازاں

ہر چیز خودی سے ہے ارضی کہ سماوی ہو ؛ مہر و مہ و انجم میں ہے ان کی خودی رخشاں

ایک اور نظم بعنوان "گل و شاعر" میں جذبۂ خودی کی کارفرمائی عجیب انداز میں بیان کی گئی ہے۔ "گل" کا کہنا ہے ؎

قلب بیخ سبز کا اک اضطراب ؛ بن گیا ہے رنگ و بوئے لاجواب

گل ضمیر شاخ میں جو موج تھی ؛ آج میں صورت ہوں اس کے اوج کی

مجموعہ زیر نظر کی پہلی نظم میں وہ اپنا نقطۂ نظر ذرا تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔ "خودی" جیسے کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں فلسفہ کا ایک الجھا ہوا مسئلہ ہے۔ عوام کی اصطلاح میں یہ لفظ نیک مفہوم میں استعمال نہیں ہوتا۔ اقبال نے اسے رنگین کہانی بنا کر پیش کیا اور اس طرح کہ وہ کہانی کی صورت میں بھی حقیقت بن گئی ہے۔ امین نے اس مسئلہ پر اظہار خیال کیا ہے۔ الفاظ وہ ہیں جو ورڈز ورتھ کے شاعرانہ زبان کے نظریہ کے جملہ لوازمات پورے کرتے ہیں۔ ان کی زبان عام گفتگو کی زبان بن گئی ہے۔ ؎

تجھ کو تری ہی آنکھ سے دیکھ رہی ہے کائنات

بات یہ راز کی نہیں۔ اپنا خود احترام کر

علامہ مرحوم کے طالب علم جانتے ہیں کہ وہ "تجدید آدم" پر بہت زور دیتے ہیں۔ اور بڑی بیباکی سے کیونکہ ان کے معیار کے مطابق "موجودہ آدم" آدمیت سے گر چکا ہے۔ امین بھی اس جذبہ سے غیر متاثر نہیں رہ سکے۔ وہ اتنی بیباکی سے تو نہیں کہتے کہ "کہ ہو نقش اگر باطل تکرار سے کیا حاصل" مگر ان کے اشعار کے بین السطور سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی نگاہوں میں "موجودہ انسان" اور "گناہ" دو ایک ہی چیز کے مختلف نام ہیں۔ اس خیال کے مدنظر "موجودہ آدم" اور "آئیڈیل آدم" میں ایک حد امتیاز قائم کرتے ہیں ؎

عیش حاضر ہے تیری دنیا میں — میری دنیا قال کی دنیا

تیری دنیا میں بولہب کا فروغ — میری دنیا بلال کی دنیا

ان خطوط پر سوچنے کے بعد جب وہ قدم بڑھاتے ہیں۔ تو ان کے سامنے ایک بھیانک منظر آجاتا ہے۔ "شیطانی گناہ" انسانی گناہوں کے سامنے حقیر اور بے حقیقت سے دکھائی دیتے ہیں۔ شیطان گناہ کرتا ہے صرف اسی لئے کہ گناہ کرے اور اس کا جواز پیش نہیں کرتا۔ انسان گناہ کرتا ہے۔ اپنے نفس کی غرض کیلئے اور اس کا جواز پیدا کرتا ہے۔ اپنے گناہ کو گناہ تسلیم کرنے سے منکر ہوتا ہے۔ امین حزیں یہ مشاہدہ کرتے ہیں۔ خالص اقبالی انداز میں ایک نظم "شکوۂ شیطان" لکھی ہے۔ شیطان حضور حق میں اذن باریابی چاہتا ہے۔ اور اجازت ملنے پر بارگاہ حقانی میں گھبرائے ہوئے انداز سے یوں لب کشا ہوتا ہے ؎

قدیم و قیوم و حی و احکم میرے گناہوں کا کیا ٹھکانہ

تیرا آدم ہے جرم کرکے تراش لیتا ہے جو بہانہ

گناہ ہی زندگی ہو جس کی اور اس پہ ہو وہ گناہ گر بھی

بڑی ہی کیا ہے اسے کہ تنتا پھرے وہ توبہ کا تانہ بانہ

اس تاریک منظر کے ہوتے ہوئے بھی وہ انسانی مستقبل سے مایوس نہیں ہیں اس خیال کے زیر اثر کہ ایک بڑی جنگ میں بدی چند لڑائیاں جیت سکتی ہے۔ جنگ میں فتح حاصل نہیں کر سکتی۔ آخری ضرب حق کی ہوگی۔ اور بدی کے لئے مہلک بھی اس لئے وہ موجودہ آدم کی خاکستر پر ایک نئے آدم کی تخلیق پر زور نہیں دیتے۔ بلکہ ان کے خیال میں ؎

تضاد دنیا کا ہے کرشمہ۔ جہاں اندھیرا وہاں اجالا

شہید ظلمت ہے آج اگر کل یہی پرستار نور ہوگی

برس کے اڑ جائیں گی گھٹائیں۔ ظہور مہر منیر ہوگا

کلیم کوئی نہ کوئی آئے گا۔ خاک یہ پھر سے طور ہوگی

یہ وہ مقام ہے جہاں پر اقبالیت نمایاں طور پر غالب ہے اور میری رائے میں امین حزیں وہ پہلے اردو شاعر ہیں جنہوں نے اس اقبالیت میں رنگا جانا پسند کیا۔ اور اسے شاعرانہ لبیک کہی۔

شاید بعض حضرات کو یہ امر موجب حیرت ہو رہا ہو کہ امین میں رومان موجود نہیں اور یہ اغلب ہے کہ بعض حضرات محض اس رومانی پہلو کی کمی کو ایک روحانی کمی کو ایک مہلک کمی تصور کریں قطع نظر اس امر کے کہ یہ اعتراض صحیح ہے یا غلط یہاں قارئین کو یہ یاد دلانا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مجموعہ زیر نظر مصنف کے اس کلام پر مشتمل ہے جو ان کی ملازمت کے آخری چند سالوں میں سیاہ و سفید میں ظاہر ہوا۔ اور یہ دور جیسے کہ آپ جانتے ہیں۔ وہ دن دور نہیں ہوتا جب ہر چیز جوان معلوم ہو بلکہ یہ وہ دور ہے جب "فضائی قلعوں" کی نسبت "فکری حقائق" میں زیادہ جاذبیت اور حسن ہوتی ہے۔ اس عمر میں ایک عام انسان بھی بعض ایسے امور پر غور کرتا

ہے جنہیں ازلی ابدی کہنا مبالغہ نہ ہوگا۔ اور شاعر ہونے کی حیثیت سے تو ان امور پر غور کرنا اور بھی ناگزیر دکھائی دیتا ہے۔ اسے ان خطوط پر سوچنا چاہیئے۔ انہیں خطوط پر سوچنے سے وہ داخلی خلوص کا دعوے کرسکتا ہے۔ یہ کہنا چنداں ضروری نہیں کہ خلوص کے ایک حسین اظہار کا نام شاعری ہے۔ اس کے باوجود آتین حزیں کے کلام میں بعض ایسے اشعار بھی ملینگے جسے میں تو روائتی شاعری ہی کہونگا۔ مگر جن میں حسن وعشق کا چرچا ضرور ہے مگر یہ بات اطمینان بخش ہے کہ اس چرچے میں جنسی بھوک کا ڈھنڈورہ پیٹا لیا۔ کہیں کہیں سنجیدہ و متین رومانیت کی لہر موجود ہے اور کہیں کہیں محض "زبان" اس سلسلے میں ذیل کے شعر قابل توجہ ہیں۔

پیارا ہوتا ہے جس سے اے پیارے ؛ اس کو ہی بار بار دیکھتے ہیں

عشق میں جوش عبودیت دل وب نہ سکا ؛ کہیں آنسو کہیں نالہ کہیں بپ ہو کے رہا

اک تو کر بے حجاب نہ ہونا تیری ادا ؛ اک ہیں کہ شوق دید کی دنیا لئے ہوئے

لالہ زار سینہ ہاں تیرے لئے ؛ آنکھ ہی کو آ بجو ہونا پڑا

اب رسمی شاعری کے چند ایک اشعار ملاحظہ فرمایئے:۔

جفا سہنا مگر اُف تک نہ کرنا ؛ جگر کے میں فدا قربان دل کے

عشق کا انجام رنگیں دیکھئے ؛ اشک سادہ کو لہو ہونا پڑا

پیر فانی تیری نمازوں کا ؛ خود انعام رکھدیا کس نے

جلوہ گر ہیں وہ خشمگیں ہو کر ؛ نور کے ساتھ نار دیکھتے ہیں

دُختِ رز کی ہیں شوخیاں قبلہ ؛ جبہ داغدار دیکھتے ہیں

مگر ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ "جفا سہنا" "جبہ داغدار" اور "دُختِ رز" محض ایک صدائے بازگشت ہے۔ ایام شباب کی نہیں بلکہ اس شاعری کی جو اس عہد میں زیر مطالعہ رہی اور جس کی صدا کبھی کبھی کانوں میں پہنچتی رہتی ہے۔ اب اس میں تجربات کا نچوڑ سمو دیا گیا ہے اس لئے جنسی اشتہا مفقود ہے۔ ان کا خاص موضوع بس "اقبالیت" ہے۔ وہ اقبال کے مفسر ہیں۔ وہ زندگی کا تجزیہ کرتے ہیں۔ اس کا سونا اور پیتل وہ الگ الگ کر دکھاتے ہیں بعض قدریں ان کے ساتھ ہیں بعض ان کا مطمح نظر ہیں۔ دونوں پر ناقدانہ نظر ڈالی ہے نتیجتہً کہیں والہانہ تبصرہ ہے کہیں مشفقانہ تنقید بعض مقامات پر شدید تخریبی سُر ہیں ہیں وہ خود زندگی کے حقیقی حسن سے آشنا ہو کر اس کی گود میں سانس لینا چاہتے ہیں۔ اور جو وہ خود پسند کرتے ہیں۔ اوروں کے لئے چاہتے ہیں۔ ان کے کلام میں اسی حسن کی اہمیت، حقیقت اور ہیئت کے گیت گائے گئے ہیں۔ ان کے کہنے کے انداز میں تکلف نہیں پختگی ہے اور ایک اعرابی کی سی کشادہ دلی۔ اس کے باوجود زندگی کی تصویر جو وہ پیش کرتے ہیں اس کی قیمت کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے ایک شائستہ و مہذب تخیل درکار ہے وہ بعض اہم نکات و حقائق سیدھی سادی مثالوں کے ذریعہ ایک ایسے انداز میں بیان کرتے ہیں جسے کسی طرح بھی پر پیچ نہیں کہا جاسکتا۔ زندگی سے ان کا مطلب وہی ہے۔ جسے علامہ مغفور "حریفانہ کشاکش" کہہ چکے ہیں۔ اس لئے وہ بھی قاری کے اندر "ذوق فراش" بیدار کرنے کی فکر میں ہیں لب پائی کی ان کے ہاں بھی کم ہی گنجائش ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس تمام کائنات کو حق و باطل کی ایک ناختم جنگ کا میدان سمجھتے ہیں۔ ان کی آرزو ہے کہ ان کی دنیا کی مخلوق کھانے پینے، اٹھنے بیٹھنے، جینے مرنے غرضیکہ ہر حرکت میں حق کی طرفدار ہو۔ وہ باطل کو کم از کم اتنا دور پھینکدینا چاہتے ہیں۔ کہ وہ ما و حق میں روڑا اٹکانے کے قابل ہی نہ رہے۔

ان اشعار میں مصنف نے اپنی پختگیٔ فکر کا مرقع پیش کیا ہے۔ اور یہ مرقع ان ایام کے افکار سے متعلق ہے۔ جہاں فکر کی پختگی غالباً اپنے معراج پر پہنچ چکی ہے۔ اس لئے ہم ان کے فکر کے ارتقائی مدارج بیان نہیں کرسکتے۔ وہ ایک مقام پر پہنچ گئے ہیں۔ مگر ہم یہ نہیں جانتے کہ یہاں پہنچنے تک انہیں کونسی گلیوں سے گذرنا پڑا کونسے موڑ کاٹنے پڑے۔ کن سڑکوں اور شاہراؤں کو طے کرنا پڑا۔ کیسے کیسے صحرا و وادی کو عبور کرنے کی مشکلات جھیلنی پڑیں۔ وہ پہنچ گئے ہیں اور لکھ رہے ہیں۔

پا یم بپیش از سرایں کوئے رود
یاراں خبر دہید کہ ویں جلوہ گاہ کیست (نظیری)

او میرا خیال ہے کہ مطالعہ کلام کے بعد قاری بھی ان کے ہمنوا ہونے سے بچ نہ سکے گا۔

غزل

پر تو ترے شباب کا گل کے نکھار میں
جلوہ ترے جمال کا حسن بہار میں

دل کو رہیں وعدۂ فردا کئے ہوئے
اک عمر ہو چکی ہے ترے انتظار میں

مقصود ہے نمائش حسن ازل ہنوز
کیا ہے وگرنہ گردشِ لیل ونہار میں

ان کو عتاب اور مجھے اعتراف جرم
کچھ کہہ گیا تھا جذبۂ بے اختیار میں

جس سوز جاوداں سے ہے لالے کی آگ تیز
پنہاں وہی ہے میرے دل داغدار میں

سیر جہاں ہے سیر گلستان ہست و بود
کیا کیا مزے ہیں زندگیٔ مستعار میں

منظور دیدنی ہے مرا کیف بیخودی
دونوں جہاں ہیں آج مرے اختیار میں

منظور ایم اے ایم او ایل

قاضی لپولوس ؟

میری زندگی کے چند اوراق

۱۰ نومبر ——————!

نیند میرے پاس نہیں بھٹکتی چراغ کی دھندلی روشنی میں توہمات اور منحوس علامات کا ایک تباہ کن طوفان اُٹھ رہا ہے۔ اور وحشیانہ انداز سے میرے دل و دماغ پر سے ناچتا ہوا گذر رہا ہے۔ سیاہ بلی کی خوفناک آنکھوں کا نقشہ میرے ذہن سے ایک لمحہ کے لئے بھی محو نہیں ہوتا۔ آخر آتے ہی دروازے پر اس سے دوچار ہونا کیا معنی؟ اور پھر چراغ بھی تو جلتے جلتے کئی بار بجھ گیا ہے۔ یہ بدشگونی نہیں تو اور کیا ہے۔ کمرہ میں داخل ہوئے ایک گھنٹہ ہی تو گذرا لیکن ان منحوس علامتوں کا قدرتی تواتر کیونکر بے معنی ہوسکتا ہے۔ ایسی مایوسی تو کمرے میں پہلے کبھی نہیں چھائی تھی خدا جانے میری ایک ہفتہ کی غیر حاضری میں کیا سے کیا ہوگیا ہے۔

اس وقت ایک بجا ہے۔ دریچے کے باہر تاریکی کتنی خوفناک اور حوصلہ شکن معلوم ہوتی ہے لیکن میری روح اس تاریکی میں گم ہوجانا چاہتی ہے۔ نہ معلوم کیوں ہم انسان یا تو بحدِ کمال خوش و خرم ہو یا بحدِ یاس پریشان و مضطرب جبھی اسے تاریکی مرغوب ہوسکتی ہے۔

میں میز کے پاس بیٹھ گیا ہوں۔ وحشتناک اور غیر مسلسل تخیلات میرے دل و دماغ میں چکر لگا رہے ہیں۔ اور میں احمقانہ اور مبہم الفاظ لکھے جا رہا ہوں۔ اس خیال سے کہ شاید خوفناک آلام فراموش کر سکوں —— کاش کہیں زرقا کو بھی معلوم ہوجائے کہ اس وقت میرے دل کی کیا کیفیت ہے۔ کاش وہ اچانک یہاں آجائے۔ اور آہستہ سے دروازہ کھول کر اپنی ملائم اور دلپذیر آواز میں پکارے —— تو میں کس قدر بیتابی سے اسکی طرف دوڑوں۔ اسے دیکھکر میرا دل کتنی مسرت محسوس کرے۔

میں اپنی روح کی ہر حرکت اور اپنے تخیل کی ہر جنبش کا جائزہ لے رہا ہوں لیکن بے سود —— میں طبیعت کی اس ازلی پریشانی کے اسباب تلاش کرنے میں عبث سرگرداں ہوں۔ کیا یہ سچ ہے کہ میں بھی عوام الناس کی طرح قیاسات کے گھوڑے دوڑانے لگا ہوں۔ شاید میری یہ حالت آنے والے رنج و مصائب کا پیش خیمہ ہو۔ میں نہایت توہم پرست ہوتا جا رہا ہوں ....

۱۱ نومبر

میرے توہمات ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ عملی صورت اختیار کر رہے ہیں۔ اس وقت پونے نو ہو گئے ہیں لیکن ہنوز اس کا چہرہ کہیں نظر نہیں آیا صبح سے لیکر اب تک میری متجسس نگاہیں ایک لمحہ کے لئے بھی اس کے دروازے سے نہیں ہٹیں مگر وہ تو اس طرح بند پڑا ہے جیسے اس مکان میں کوئی رہتا ہی نہیں

مجھے اسکول سے دیر ہو رہی ہے لیکن میرے پاؤں مضبوط میخوں سے زمین میں گاڑ دیئے گئے ہیں۔ انسان کے پیش نظر اگر امید انجام اور معاوضے کا تصور نہ ہو۔ تو وہ دنیا کے لطیف سے لطیف کام میں بھی نہ ٹک سکے۔ مجھے ہنوز امید ہے کہ وہ بغل میں کتابیں لیکر گلی میں ضرور نمودار ہوگی۔ اور حسب معمول مجھے آگے آگے چلنے کا اشارہ کریگی۔

میری تمام امیدیں مایوسی سے بدل رہی ہیں۔ تفکرات نے میرے گرداگرد گھیرا ڈال لیا ہے۔ جو باریک اور دھکتی ہوئی سوئیوں کی طرح میرے دماغ میں چبھ رہے ہیں۔ میں بہت کوشش کرتا ہوں کہ کسی ایسے اعلےٰ اور تسکین دہ خیالات کو ذہن میں لاؤں جو میرے دل کی ڈھارس بندھائے .... لیکن بے سود!

سکول کا وقت نکل گیا ہے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب یقیناً میرے متعلق فکرمند ہوں گے اور میرے شاگرد سرسوں کے کھیتوں میں پگڈنڈی پر کھڑے بیتابی سے میری راہ تک رہے ہوں گے

میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا رہا ہے۔ میری تمام قوتیں سلب ہوچکی ہیں۔ کمرہ کے سامنے سے گذرنے والے صورت آشنا لوگ نہ معلوم اندر جھانک جھانک کر میری طرف پھٹی پھٹی نگاہوں سے کیوں دیکھ رہے ہیں۔ کاش میں یہ جان سکتا۔ کاش میں یہ سمجھ سکتا۔ کہ چند ہی دنوں میں میرے گرد و پیش کی دنیا میں یہ انقلاب، یہ تغیر کیوں رونما ہو گیا ہے۔

۱۸۔ نومبر

کبھی کبھی یہ خیال کہ حقیقتاً میرے اور اس کے درمیان منافرت کی خلیج روز بروز وسیع تر ہوتی جائے گی میری روح کے اندر آ داخل ہوتا ہے۔ اور میرے گہرے اور دردناک زخم کو کچھ اس طرح کریدڈالتا ہے کہ میں بے تاب ہو کر اکثر باہر کھیتوں میں دوڑ جاتا ہوں اور تن تنہا اپنے خیالات و احساسات کو ایک ہی چیز پر مرتکز کر کے گھنٹوں وہیں بیٹھا رہتا ہوں۔

چند دنوں سے مجھے یہ محسوس ہو رہا ہے کہ میری زندگی کے ایام قریب قریب ختم ہو رہے ہیں۔ آجکل جب بھی بازار سے گذرتا ہوں تو لوگوں کے تیکھے اور بے ہودہ آوازے کچھ اس طرح میرے کانوں میں پڑتے ہیں گویا کسی نے مجھ پر بم پھینک دیا ہے۔ شروع شروع میں ان کے اشارے میرے دل میں صرف چبھتے تھے۔

لیکن اب ان اشاروں کی چوٹیں زیادہ پیہم اور ناقابل برداشت حد تک تکلیف دہ بن گئی ہیں۔ باوجود میرا مخلص دوست ہونے کے اسلم کا زاویۂ نگاہ نہایت تنگ ہے اس کا خیال ہے۔ کہ میں فضول اپنی جان کو روگ لگا رہا ہوں۔ اس کے مطابق انسان کی زندگی میں اس قسم کے کئی واقعات آتے ہیں اور کئی جاتے ہیں۔ اگر ہر واقعہ کو اسی طرح اہمیت دی جائے۔ تو دنیا کے کاروبار ہی بند نہ ہو جائیں؛ اصل میں یہ لوگ ہر چیز کو اپنے ہی قائم کردہ معیار پر پرکھنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ حتیٰ کہ محبت ایسے پاک اور بے لوث جذبہ کا بھی وہ اپنے ہی آئینہ میں عکس دیکھتے ہیں۔ وہ اس بات کا تصور تک بھی نہیں کر سکتے۔ کہ انسان کی زندگی میں کئی لمحات ایسے ایک نیزہ کی مانند اس طرح چبھتے رہتے ہیں کہ اس کے جسم سے خون ایک نامعلوم مدت کے لئے قطرہ قطرہ ہو کر بہتا رہتا ہے۔ اور یہ مدت بعض دفعہ زندگی کے آخری حصے تک پھیل جاتی ہے۔

۲۴ نومبر

آج عید کا دن ہے۔ سب لوگ خوش نما لباس پہنے ادھر اُدھر ہشاش بشاش پھر رہے ہیں۔ میں بھی مجبوراً اپنے آپ کو خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔ لیکن سب فضول اس تنگنائے دنیا میں میرے لئے تو ہر قسم کا سامان مسرت ختم ہو چکا ہے۔

محلہ کی صورت آشنا لڑکیاں تمسخرانہ انداز سے مسکراتی ہوئی میرے پاس سے گذرتی ہیں۔ شاید میری ہیئت کذائی کا احساس دلانے کے لئے۔ وہ کچھ اس طرح دزدیدہ نگاہوں سے دیکھتی ہیں کہ میرے دل میں ان کے لئے نفرت سے مشابہ ایک جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ تاہم میں ان سب کے چہروں کا عمیق نظروں سے مطالعہ کرتا ہوں کہ شاید زرقا بھی ان میں ملی جلی کہیں نظر آ جائے لیکن یاس و ناامیدی کی دم کش فضا نے میری اس بے تابانہ توقع کا بھی گلا گھونٹ دیا ہے۔ شاید میری طرح اس کے لئے بھی عید میں کوئی دلچسپی نہیں رہی۔

پاس سے گزرنے والے لوگ میری طرف عجیب معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہیں۔ جس سے مجھے ایک جسمانی ایذا کا احساس ہوتا ہے۔ گویا مجھے کسی نے پیٹ ڈالا ہے۔

میرے روبرو تمام کائنات خوشیاں منا رہی ہے۔ اور میں ——— میرے لئے کوئی چیز جاذب نظر نہیں۔ مجھے کوئی شے نہیں بھاتی میں بالکل برف کی طرح سرد ہوں مجھے ایسے محسوس ہو رہا ہے۔ کہ میں دنیا کی ہر چیز سے علیحدہ کر کے پرے پھینک دیا گیا ہوں..... بالکل پرے..... ایک شے ناکارہ کی طرح.....

جس وقت میں درحقیقت تنہا ہوتا ہوں۔ اپنی تنہائی کا اتنا گہرا احساس نہیں ہوتا جتنا ایسے اشخاص کی موجودگی میں جو ہم نشین ہونے کے باوجود میرے لئے اب دلچسپی کا باعث نہیں رہے۔

عید گزر جائے گی چند دنوں کے بعد دنیا یہ بھی بھول جائے گی۔ کہ عید ہوئی کب تھی لیکن مجھے..... مجھے یہ دن کبھی نہیں بھولے گا۔

۳۰ نومبر

اسلم کہتا ہے کہ کل اس کی برات آئے گی میں سوچتا ہوں کہ یہ خبر سننے سے پیشتر میں مر کیوں نہیں گیا۔ مجھے یقین ہی نہیں آتا کیا اس کے تمام عہد و پیمان جھوٹے تھے۔ کیا وہ اپنے سب وعدے بھولے جا رہی ہے۔ یا وہ ایسا کرنے پر مجبور ہے لیکن وہ تو بڑے وثوق سے کہا کرتی تھی۔ کہ "میں تا حین حیات آزاد رہونگی۔ میں ہرگز ہرگز اپنی انفرادی حریت کو سلب نہ ہونے دونگی۔ خواہ اس کے لئے مجھے اپنے والدین کے خلاف علم بغاوت ہی کیوں نہ بلند کرنا پڑے مگر یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ کہ میری مرضی کے خلاف مجھے رسوم کی بھینٹ چڑھا کر ایک پر کاٹے ہوئے پرندے کی طرح محض دوسروں کے لطف و رحم پر چھوڑ دیا جائے۔ میں سوچتا ہوں کہ اگر وہ ایسی ہی مستقل مزاج لڑکی تھی۔ تو پھر یہ سب کیا ہے؟ کیا اس نے اب گونگی کا گڑ کھا لیا ہے

میری روح ٹکڑے ٹکڑے ہو رہی ہے۔ میں پاگل ہوا جا رہا ہوں میں خودکشی کرنا چاہتا ہوں۔ کاش کوئی مذہب ہی اس کے جواز میں میری اعانت کر سکتا ہائے میں کس قدر بے یار و مددگار ہوں۔

۲ دسمبر

آخر جس بات کا تصور ہی میرے لئے سوہان روح تھا وہ ہو کر رہی۔ کل اس کی برات آئی تھی۔ بھلا میں یہ سب کچھ کیونکر برداشت کر سکتا تھا۔ اسلم اور محمد دین کو لیکر کہیں دور چلا گیا۔ ایک دوسرے شہر میں ——— تمام رات آنسوؤں کی ندی میری آنکھوں سے میرے قلب کی گہرائیوں کی طرف بہتی رہی

۲۵ دسمبر

آج پھر نیند نہیں آتی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ دلیل کی رہنمائی کے بغیر جذبۂ دل کبھی حق بجانب نہیں ہوتا۔ میں عجیب عجیب بعید از قیاس تخیلات کا جائزہ لے رہا ہوں۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے۔ کہ میں کسی بھاری بھرکم بوجھ کے نیچے دبا جا رہا ہوں۔ کاغذ پنسل لیکر محض اس لئے میز کے سامنے بیٹھ گیا ہوں کہ وجۂ اضطراب کا کچھ نہ کچھ حصہ صفحۂ قرطاس پر بھی ٹپکا دوں۔ اس وقت بارہ بج گئے ہیں اور میں ہجوم خیالات میں محض یہاں تک پہنچ سکا ہوں ؎

سطح دریا پہ جس طرح موجیں ؎ چاہتی ہیں ملاپ ساحل سے
میرا دل بھی اسی طرح زرقا ؎ چاہتا ہے ملے تیرے دل سے

۵ اجنوری

سوچتا ہوں انسان کی حیات نفسی کا بھی کیا اعتبار بدلتے ایک لمحہ بھی تو نہیں لگتا۔ لاہور میرے نزدیک ہمیشہ بے مرکز و بے مقصد انسانوں کا ملجا و ماویٰ رہا ہے ——— میں زندگی کے پورے تین سال عین شاہانہ ٹھاٹھ سے اس شہر میں گذار چکا ہوں۔ اس مسلسل اور طویل اقامت کے مشاہدات و تجربات سے محض اسی قدر اخذ کر چکا ہوں کہ لاہور صرف تصنعات کا عجائب گھر ہے۔ اور اس کی فضاؤں میں ہر طرف تصنع ہی تصنع کار فرما ہے حسن و عشق ہو یا تمدن و معاشرت یہاں زندگی کے ہر شعبہ میں تصنع کو بہت بڑا دخل ہے۔ چار سو معصیت آلود زندگی ٹھاٹھیں مارتی نظر آتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے لاہور کو خیرباد کہا۔ ارادہ تو یہ تھا کہ آئندہ کبھی اس طرف کا رُخ نہیں کروں گا۔ لیکن ..... معلوم میری طبیعت کو اب کیا ہو گیا ہے۔ ارادوں کے فلک بوس آہنی محل تمام

کے تمام ایک ایک کرکے گر چکے ہیں۔ بار بار لاہور آتا ہوں۔ اور اکر پھر جانے کے تھوڑی سے گھبرا اٹھتا ہوں کئی کئی دن یہیں پڑا رہتا ہوں۔ ایسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے تصنع سے ایک گونہ رغبت ہوگئی ہے ــــ کیوں نہ ہو اسکی مصنوعی فضا سے اب

---

۲۴ فروری

خدا جانے مجھے کیا ہو گیا ہے۔ آنسوؤں کا ایک سیلاب ہے کہ آنکھوں سے جاری ہے۔ دل میں ایک آگ سی بھڑک رہی ہے۔ اور اپنے شعلوں میں سے دل و دماغ کو جلائے جا رہی ہے اور مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں گرے جا رہا ہوں۔ آخر یہ کیوں؟ اس لئے کہ میں گوناگوں جذبات سے مغلوب ہو گیا ہوں۔ کیوں نہ ہوں؟ وہ میرے سامنے ایک اسکولی لڑکی کی مانند گلی میں چہچہاتی۔ پھلانگتی اور پھدکتی پھرتی ہے ہنستی ہے۔ باتیں کرتی ہے۔ ہر اس ہمجولی سے دو چار ہوتی ہے گلی میں بار بار آتی ہے اور ہر بار نیا جوڑا زیب تن کئے۔ مگر میں کیسے سمجھوں کہ اسے میری نظروں میں سما جانے کی آرزو ہے۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی امارت کا مظاہرہ کر رہی ہے۔ کہ میں ایک مفلس اور نادار انسان ہوں۔

سوچتا ہوں کہ عورت کی فطرت کو کیسے سمجھوں کتنی تلوّن کیش ہوتی ہے زرقا کو یہاں آئے ہوئے کئی دن گذر گئے۔ اپنی سہیلیوں ہمسائیوں سے مل چکی لیکن اگر وہ کسی بدنصیب سے نہیں ملی تو وہ میں ہوں۔ دل کہتا ہے کہ اگر اسے محبت ہوتی تو وہ ضرور ملتی۔ دور ہی سے پیشانی پر ہاتھ رکھنے کے یہ معنی کیوں سمجھوں۔ کہ وہ پہلے کی طرح محبت بھرا اسلام کر رہی ہے شاید اس سے مجھے ستانا مقصود ہو۔

وہ میرے نزدیک ہوتے ہوئے بھی مجھ سے کتنی دور ہے۔ آج وہ ایک سہیلی کے ساتھ میری طرف دیکھکر ہنس رہی تھی شاید میری بیچارگی۔ ناکامی مفلسی، بیکسی، اور نارسائی پر۔ وہ ہستی کیوں ہے؟ اسے میری کیفیت دل کا احساس کیوں نہیں؟ وہ میرے چہرہ سے میرے دل کا حال کیوں نہیں پڑھتی؟ میرے بہتے ہوئے آنسوؤں کو دیکھکر وہ کیوں نہیں لرز اٹھتی اور بیتاب ہو کر کیوں میرے پاس نہیں چلی آتی؟ پہلے کی طرح چند لمحات کے لئے میں اُسے کچھ سنانا چاہتا ہوں حالِ دل۔ پریشانیٔ زندگی اور مایوسیٔ محبت کے معنی! مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ماضی کا کوئی دھندلا سا نقش بھی اس کی لوحِ ذہن پر محفوظ نہیں۔ آہ! مجھے اس سے کتنی امیدیں تھیں مگر اس کی کامل کنارہ کشی اور مسلسل خاموشی نے میرے دل کو گھن لگا دیا ہے۔ میں سمجھنا چاہتا ہوں کہ وہ اپنی زندگی میں اس قدر دلچسپی اور سرگرمی کیوں دکھا رہی ہے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بجلی کا مجسمہ ہے جو بٹن کے دبانے کے ساتھ ہی نہایت تیزی سے چاروں طرف گھوم جاتا ہے کبھی ادھر کبھی ادھر بڑی پھرتی اور طراری سے وہ ایک مشین کی مانند بھاگی پھرتی ہے۔ ایک لمحہ بھی سکون نہیں۔

آج خصوصاً طبیعت بس میں نہیں۔ آنکھیں روتی ہیں۔ دل روتا ہے جتنی کہ جسم کا بال بال رو رہا ہے۔ میری آشفتہ مزاجی دیکھکر دوست مجھے تسلی آمیز کلمات سے خوش کرنا چاہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ شکر کرو خدا کا۔ ذرا دیکھو تو ان لوگوں کو جو ہم سے بھی برے حال میں ہیں۔ اور میں دل ہی دل میں ایک مایوس اور غم انگیز ہنسی ہنستا ہوں اور سوچتا ہوں کہ یہ لوگ مجھے کتنا غلط سمجھ رہے ہیں۔ کیوں نہ سمجھیں جب وہ جو میری زندگی کی ایک عرصہ تک شریک رہی ہے۔ مجھے نہیں سمجھ سکی۔ تو یہ لوگ کس طرح سمجھیں ان کے خیال میں معاشی تفکرات نے مجھے افسردہ بنا رکھا ہے۔

میں کتنا سودائی ہوں۔ ذرا دیکھو تو رات کے بارہ بج گئے ہیں۔ اور مجھے یہ خیال ہے کہ شاید وہ آئے جب سے وہ یہاں آئی ہے۔ مجھے ہر رات یہ گمان ہوتا ہے کہ وہ آئے گی اس لئے میں دروازہ کھلا رکھتا ہوں۔ کھڑکی بند کرکے پردہ ڈال دیتا ہوں اور منتظر رہتا ہوں۔ گویا وہ آرہی ہے۔ کوئی چوہا اگر میری مایوسی یا لیمپ کی مدہم سی روشنی سے کھیلتی ہوئی خاموشی میں اپنی آواز بے ہنگام سے رکاوٹ پیدا کرتا ہے۔ تو میں چونک کر رہ جاتا ہوں کہ وہ آئی۔ مگر یاس کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ باہر کسی کے دروازہ کھلنے کی آواز میرے کانوں میں پڑتی ہے۔ تو میں سمجھتا ہوں کہ اس کا دروازہ کھلا ہے مگر جلد ہی مجھے اپنی غلط فہمی کا احساس ہو جاتا ہے رات اسی طرح گذر جاتی ہے۔ بے خوابی اور اشک افشانی سے میری آنکھیں سوج گئی ہیں۔ اور میرا دماغ ماؤف ہو گیا ہے۔ مگر مجھے اس کا ذرا بھی غم نہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کی یاد میں اتنا روؤں اور جاگوں کہ آنکھیں بہ نکلیں اور دماغ پگھل جائے۔ یہی وجہ ہے کہ تا دمِ تحریر آنسوؤں کا دریا میری آنکھوں سے اُمنڈا چلا آرہا ہے۔ باہر آسمان پر بادل رو رہے ہیں۔ میری مایوس راتوں کا سہارا شمع اندر رو رہی ہے اور مجھے ہنوز انتظار ہے کہ وہ آئے گی۔

غزل

الٰہی آتشِ الفت میں کیا تاثیر ہوتی ہے ؛ کہ جل کر خانۂ دل کی بنا تعمیر ہوتی ہے
بہار آئی جنوں۔ اب پھر کوئی تدبیر ہوتی ہے ؛ ہمارے واسطے تیار پھر زنجیر ہوتی ہے
شبِ تاریکِ غم میں پاس جب کوئی نہیں ہوتا ؛ انیسِ کنجِ تنہائی تری تصویر ہوتی ہے
یہ سوزِ عشق ہی تو کیمیا کا ایک نسخہ ہے ؛ کہ مشتِ خاک جس سے رشکِ اکسیر ہوتی ہے
یہ بے بال و پری مانع نہیں پرواز سے مجھکو ؛ تری بے ذوقیٔ پرواز دامنگیر ہوتی ہے
کسی سے جا کے کیا پوچھوں کہ میں خود ہی سمجھتا ہوں ؛ پریشانی مرے ہر خواب کی تعبیر ہوتی ہے

سدا اُڈر خود نمائی سے کہ شرعِ عشق میں کاظم
یہی تو معصیت اک قابلِ تعزیر ہوتی ہے

مولنا کریم الدین کاظم الرتسری

کلانچوی ایم اے

اقبال اور اردو غزل

آج سے تقریباً تین سو سال پہلے غزل اپنی تمام ایرانی خصوصیات کے ساتھ اردو شاعری میں داخل ہوئی۔ اگرچہ ایران میں غزل سے مراد "بازنان سخن گفتن" لی جاتی تھی۔ مگر فارسی زبان میں افعال کی تذکیر و تانیث کے فقدان نے ہندوستانی ذہنوں کو ایک نئے صنف کی طرف متوجہ کر دیا یعنی رفتہ رفتہ وہ تمام اصطلاحات اور خصوصیات جو عورتوں کے جسم اور لباس کے لئے مخصوص تھیں۔ مردانہ رنگ پکڑ گئیں۔ یا وہ مخلوط جذبات کے لئے مختص ہو کر رہ گئیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ یہ ایرانی رنگ تغزل تھا مگر دیکھا جائے تو ہندوستانیوں نے اسے اجاگر کیا اور قائم رکھا۔ دیکھئے خواجہ آتش لکھنوی نے اسی رنگ کو گہرا رنگا ہے

ع مدد اے سخت جانی کہ قاتل ہے مرا لڑکا ۔ ہماری یہ تقلید ہمارے لئے کوئی کامیابی کا زینہ نہ بن سکی۔ کیونکہ ایران میں زلفوں کے کٹ جانے پر بند قبا کے ٹوٹ جانے پر اور کج کلاہی کے رواج کے ختم ہو جانے پر ایرانی غزل نے بھی اپنا معیار بلند کر لیا ہے۔ اب ان کی غزلوں میں غیر فطری باتیں اور ابتذال اور رکاکت نہیں رہی۔ مگر ہندوستانی شاعر ابھی تک غزل کو اسی محور پر گھما رہا ہے۔ جو پہلے پہل اس کے لئے تجویز کیا گیا تھا۔ دنیا تقلید کے بندھنوں کو توڑ رہی ہے لیکن ہندوستانی شاعر اس سے لپٹے لپٹے جاتے ہیں۔ وہ دوسری قوموں کے شاعروں کے دل و دماغ کی پیداوار کی باسی جگالی کو اپنے لئے نوالۂ نو خیال کرتے ہیں میں ایسے شعراء سے پوچھتا ہوں۔ کہ وہ غزل کے مواد موضوع اور طریق کے لئے دوسروں کی دریوزہ گری کیوں کرتے ہیں کیا ہندوستان میں ہیر رانجھا پیدا نہیں ہوئے۔ کیا یہاں کی زمین حسن و عشق سے ناآشنا ہے۔ کیا یہاں کی آب و ہوا حسن آفرین اور عشق پرور نہیں ہے۔ اور کیا یہاں زندگی الجھنوں سے خالی ہے کہ ہم فرضی عشق و محبت مجازی وصل و فراق اور خیالی سوز و غم کا اظہار کرتے ہیں۔ اپنے ماحول پر نظر ڈالئے حقیقی موضوعات اس کثرت سے گھوم رہے ہیں کہ ہمیں ظنیات اور فرضیات کا دستگیر ہونے کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ اور نہ ہی ہمیں پرانی ذہنیت۔ پست خیالی اور لایعنی رسومات و قیود کے پابند رہنے کی حاجت رہتی ہے۔

غزل اپنی جامعیت اور وسعت کے لحاظ سے دوسری اصناف سخن سے بہت اکمل افضل اور جامع صنف ہے اس کے ذریعہ انسان کی روحانی اور نفسیاتی جذبات لطیفہ کا اظہار کیا جاتا ہے یعنی حسن و عشق۔ یاس و امید۔ وصل و فراق۔ اور اس قسم کی فطری حالتوں کے گہرے تاثرات کا ایک مقررہ اور معین حدود و قواعد میں بیان کرنا تغزل کہلاتا ہے مگر ہمارے شاعروں نے غزل کو ان خوبیوں سے بیگانہ کر دیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ہمارے خیالات کی وسعتوں کو ردیف و قوافی نے تنگ کر دیا ہے۔ ہمارا عشق بتوں میں گھس کر رہ گیا ہے۔ اور ہمارے احساسات مانگے تانگے کے رہ گئے ہیں۔

غزل کی اس کمزوری کا احساس شروع میں غالب کو ہوا۔ اور یہ احساس آج سے تقریباً ایک سو سال پہلے ہوا۔ انہوں نے محسوس کیا کہ غزل میں چھیڑ چھاڑ معاملہ بندی بوس و کنار اور ہوس پرستی کا وقت گیا اس لئے انہوں نے لکھنؤ اور دہلی کے رنگ سے بچ کر ایک نیا اور سنجیدہ راستہ پیدا کیا۔ جو پہلے تو غیر دلچسپ اور غیر مانوس سا تھا۔ مگر بعد میں کافی قبولیت شہرت اور تاکید و تقلید کے قابل سمجھا گیا۔ غالب نے جو نیا رستہ نکالا تھا وہ اس قسم کا تھا

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں؟
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں رلائے کیوں؟
قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں؟

غالب کے بعد داغ، امیر، حالی، آزاد اور فانی نے اس پگڈنڈی پر قدم دھرے۔ اور اس طرح انہوں نے غزل میں سنجیدگی۔ واقعیت۔ قومیت اور ادب کے رنگ بھرے۔

جہاں ۱۸-۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم نے ہمارے سیاسی اور معاشی مسائل میں ایک تغیر پیدا کیا۔ وہاں شاعری بھی متاثر ہوئے بنا نہ رہ سکی۔ اور یہ انقلاب نئے دماغوں کی کاوش سے رونما پذیر ہوا۔ اور یورپ اور دیگر ایشیائی ممالک کے اذہان کی تقلید نے اسے اور تقویت دی اس طبقے میں آغا حشر۔ فانی۔ حسرت۔ اصغر۔ جگر۔ جوش۔ ظفر علی اور اقبال ایسے شاعر شامل ہوئے۔ ان ہی کے ہاتھوں غزل نے اپنا عروج پایا۔

آیئے اب دیکھیں کہ کشتِ غزل کی آبیاری میں اقبال کا کہاں تک ہاتھ ہے اور غزل نے کس طرح عمودی ارتقا کے بعد افقی ارتقا حاصل کیا ہے اور اس کا دامن وسعت کتنا دراز ہو گیا ہے؟

ہم یہ نہیں کہہ سکتے۔ کہ اقبال نے شروع ہی سے نئی طرز میں غزل کہی ہو۔ البتہ یہ بات ضرور ہے کہ اقبال کے کلام میں سادگی۔ اختصار، شوخی اور بے ساختہ پن شروع سے موجود تھا آپ کی ایک ابتدائی غزل جس کا مطلع ہے

نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی ؛ مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی

تمام غزل کا رنگ لئے ہوئے ہے۔ اور شاید یہ ماحول کا تاثر تھا اور وقتی تاثر تھا کیونکہ بہت جلد اقبال کہنے لگا

مانا کہ تیری دید کے قابل نہیں ہوں میں ؛ تو میرا شوق دیکھ میرا انتظار دیکھ!

یہاں بھی وہی شوق ہے عشق ہے شوق دیدار ہے اور وصل طلبی ہے مگر یہاں جو لطافت اور پاکیزگی ہے وہ پہلی غزل میں نہیں ہے۔ وہ ستاروں کی خاموشی میں رو دیتا تھا اس کے نالے نرالے تھے اس کا عشق نرالا تھا اور پھر اسی عشق نے پختگی پکڑ لی تو کہنے لگا ؎

کبھی اپنا بھی نظارہ کیا ہے تو نے اے مجنوں
کہ لیلی کی طرح تو خود بھی ہے محمل نشینوں میں

محفل یار کے متعلق شاعروں نے بہت خیال رقم کئے ہیں کسی نے اپنی رسوائی کا تذکرہ کیا ہے کسی نے معشوق کی عدم توجہ کا شکوہ کیا ہے۔ اور کسی نے ناکامی اور نامرادی کا رونا رویا ہے مگر اقبال بھی محفل یار میں گیا اس کی رسوائی بھی ہوئی۔ ناکامی بھی ہوئی اور معشوق نے توجہ بھی نہ کی لیکن دوسرے شاعروں کی طرح وہ واویلا کرنا نہیں کرنا چاہتا۔ وہ اپنی رسوائی کی تشہیر نہیں کرنا چاہتا۔ وہ اپنا وقار قائم کرنا چاہتا ہے کہتا ہے

خموش اے دل بھری محفل میں چلانا نہیں اچھا
ادب پہلا قرینہ ہے محبت کے قرینوں میں

آگے چل کر وہ اپنے عشق کی انتہا۔ اس کی سادگی۔ اس کی شوخی اور پھر بے ادبی یوں بیان کرتا ہے ؎

ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں ؛ مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں
ذرا سا تو دل ہوں مگر شوخ اتنا ؛ وہی لن ترانی سنا چاہتا ہوں
بھری بزم میں راز کی بات کہدی ؛ بڑا بے ادب ہوں سزا چاہتا ہوں

شاعر اور واعظ کی چپقلش ازلی ہے۔ دونوں ایک دوسرے پر اوچھے حملے کرتے رہتے ہیں جس جنت پر واعظ نازاں ہے شاعر اسے شراب میں بہا دیتا ہے اور جس شراب پر شاعر لٹو ہے۔ واعظ اسے آگ کہتا ہے جہنم کی آگ۔ اور ان کی یہ کشمکش شاید دوسری دنیا میں بھی قائم رہے مگر اقبال کو واعظ سے ضد تھی۔ وہ اس کی تاویلوں میں آنے والا نہ تھا۔ اس نے اٹل فیصلہ سنا دیا۔ سنئے ؛ ؎

[illegible] لائے جو مے کے جواز میں ؛ اقبال کو یہ ضد ہے کہ پینا بھی چھوڑ دے

[illegible]ء میں اقبال نے ایک غزل کہی۔ جو اپنی رنگینیوں۔ لطافتوں اور مضمون آفرینی [illegible] بے مثال ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا عام دیدار یار ہو گا
سکوت تھا پردہ دار جس کا وہ راز اب آشکار ہو گا
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کریگی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہو گا
چمن میں لالہ دکھاتا پھرتا ہے داغ اپنا کلی کلی کو
یہ جانتا ہے کہ اس دکھاوے سے دل جلوں میں شمار ہو گا
نہ پوچھ اقبال کا ٹھکانا ابھی وہ کیفیت ہے اس کی
کہیں سر رہگذر بیٹھا ستم کش انتظار ہو گا

گذشتہ بیس سال میں غزل نے جو ارتقا اور عروج حاصل کیا ہے۔ اس کی رفتار بہت ہی تیز رہی ہے۔ جو انقلاب اڑھائی سو سال میں پیدا نہ کیا جا سکا۔ وہ چند سالوں میں ظہور پذیر ہو گیا جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں۔ گذشتہ جنگ عظیم نے کئی انقلاب اور کئی تغیر پیدا کئے ہیں اور اسی ماحولی تغیرات نے غزل پر بھی اثر ڈالا ہے۔ اب غزل میں فلسفہ، حسن و عشق، عرفان و حقیقت، اسرار و رموز۔ درس و پیام۔ درد و سوز، واردات اور محاکات وغیرہ وغیرہ ایسے موضوع شامل ہو گئے ہیں کہ غزل کی "بازنان سخن گفتن" والی حدود کٹ کر رہ گئی ہیں۔ غزل میں مندرجہ بالا موضوعات کی ترویج کا زیادہ تر ذمہ دار اقبال ہی گردانا گیا ہے اس نے غزل میں گرمنوازی اور سوز بھر دیا ہے۔ اس کی وسعتوں کو لامحدود کر دیا ہے اور اس کی رنگینی اور ترنم کو نئے نئے زاویئے بخشے ہیں۔ اس نے غزل کو زندگی کے بہت قریب کر دیا ہے۔ اس کی غزلوں میں زندگی ہے۔ قنوطیت۔ یاسیت فراری یا بیزاری وغیرہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے۔ وہ ہر شے سے اکتساب کیف کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے ہم نئے جہاں بنا سکتے ہیں۔ نئے آسمان بنا سکتے ہیں۔ وہ حوصلہ بندھاتا ہے۔ کہتا ہے جس چمن میں صیاد گھات میں نہ ہو۔ وہاں کی زندگی بے کیف ہے۔ وہ خیالی اذیت پرستی کو برا سمجھتا ہے۔ وہ جبر و قدر میں اپنا اختیار ثابت کرتا ہے۔ اس کا معیار زندگی ایک تعمیری خوش آئند اور کامیاب معیار زندگی ہے۔

حسن و عشق کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں ؎

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق ؛ عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی
کیا عشق ایک زندگی مستعار کا ؛ کیا عشق پائیدار سے ناپائیدار کا
نگاہ عشق دل زندہ کی تلاش میں ہے ؛ شکار مردہ سزاوار شاہباز نہیں
میں تو تیار ہوں مجھ سے حجاب اولیٰ ؛ کہ دل سے بڑھکے ہے میری نگاہ بیقابو
فارغ تو نہ بیٹھیگا محشر میں جنوں میرا ؛ یا اپنا گریباں چاک یا دامن یزداں چاک
گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر ؛ ہوش و خرد شکار کر قلب و نظر شکار کر
احوال محبت میں کچھ فرق نہیں ایسا ؛ سوز و تب و تاب اول سوز و تب و تاب آخر

اب کچھ فلسفہ اور تصوف کی مثالیں :-

کبھی اے حقیقت منتظر نظر آلباس مجاز میں ؛ کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبین نیاز میں
گاہ مری نگاہ تیز چیر گئی دل وجود ؛ گاہ الجھ کے رہ گئی میرے توہمات میں
یہ فیضان نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی ؛ سکھائے کس نے اسمعیل کو آداب فرزندی

اب کچھ درس و پیام کی مثالیں :-

متاع بے بہا ہے درد و سوز آرزومندی ؛ مقام بندگی دیکر نہ لوں شان خداوندی
گزر اوقات کر لیتا ہے یہ کوہ و بیاباں میں ؛ کہ شاہیں کیلئے ذلت ہے کار آشیاں بندی
مجھکو تو سکھا دی ہے افرنگ نے زندیقی ؛ اس دور کے ملا ہیں کیوں ننگ مسلمانی
کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق ؛ نے ابلہ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند

اب کچھ واردات کی مثالیں :-

ترے آزاد بندوں کی نہ یہ دنیا نہ وہ دنیا ؛ یہاں مرنے کی پابندی وہاں جینے کی پابندی
میخانہ یورپ کے دستور نرالے ہیں ؛ لاتے ہیں سرور اول دیتے ہیں شراب آخر
عروج آدم خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں ؛ کہ یہ ٹوٹا ہوا تارہ مہ کامل نہ بن جائے......

۴۳ اور تشریح طلب ہے۔ اس لئے بخوف طوالت مضمون میں اختصار کرتا ہوں ؛

غزل

کچھ اس درجہ ہم سرگراں ہو رہے ہیں
ہنسی میں بھی آنسو رواں ہو رہے ہیں
جوانی ہیں افسردگئی تمنّا
بہاروں میں نذرِ خزاں ہو رہے ہیں
کوئی اور بیداد باقی ہے شاید
سُنا ہے وہ پھر مہرباں ہو رہے ہیں
غمِ عشق میں ہیں کلیجے کی ٹھنڈک
وہ جلوے جو برق تپاں ہو رہے ہیں
ابھی دل میں احساسِ منزل ہے باقی
جو گردِ رہِ کارواں ہو رہے ہیں
محبت کی بے چارگی کچھ نہ پُوچھو
زباں ہے مگر بے زباں ہو رہے ہیں
تیری کیف پرور نگاہوں کے صدقے
کہ سرمست کون و مکاں ہو رہے ہیں
یقیناً ہے توہینِ ضبطِ محبّت
ستارے بھی کیوں رازداں ہو رہے ہیں
زمینِ محبّت کے ناچیز ذرّے
بلندی میں ہفت آسماں ہو رہے ہیں
گلوں کی خموشی سے اچھے ہیں اے دل
جو کانٹے مرے ہم زباں ہو رہے ہیں
وہ نالے جو پتھر کو بھی موم کر دیں
محبت میں سب رائیگاں ہو رہے ہیں
فدا آپ پر یہ کرم ہے کسی کا
کہ مشہور جادو بیاں ہو رہے ہیں

فدا پیالی

آغاز

سنتا ہوں مری بہنوں کی
وہ ایک حسین سہیلی ہے
ہر روز
جب اُن سے ملنے کو
وہ "راج نگر" میں آتی ہے
کیا بات ہے میرے سینے میں
اک درد سا ہونے لگتا ہے
میں اپنے کمرے سے چھپ کر
کیوں اس کو دیکھنے لگتا ہوں
اور اکثر یہ بھی ہوتا ہے
جس کمرے میں وہ بہنوں سے
کچھ باتیں کرتی ہوتی ہے
میں سوچ کے دل میں بات کوئی
اس کمرے میں آجاتا ہوں
(سینہ کو بالکل تانے ہوئے)
جیسے کہ اس کے آنے کی
تھی جس کو نہ مطلق کوئی خبر
اور دیکھ کر اس کو فوراً ہی
افسوس کے لفظوں کے ہمراہ
میں لوٹ آتا ہوں کمرے میں
کیوں جانے ایسا کرتا ہوں
آغازِ محبت میں اکثر
کہتے ہیں ہو ہی جاتا ہے

آشر چکوالی بی اے

مجید یوسف زئی
(عثمانیہ)

جان چرچل ڈیوک آف مارلبرو کا رومان

کرسمس کے آخری دن کی گھڑیاں ختم ہو رہی تھیں۔ رقص گاہ بقعۂ نور بنی ہوئی تھی۔ یہ تقریب سال رواں کی الوداعی اور سال نو کی آمد آمد میں منعقد ہوئی تھی۔ آرکسٹرا دھیمے سروں کی آوازیں بکھیر رہا تھا۔ عمائدین سلطنت اور شہر کے اعلےٰ معززین وہاں جمع تھے۔ اس تقریب میں دیگر ممالک کی نازنینوں کے علاوہ حرم شاہی کی خواتین بھی موجود تھیں۔ گو ان میں کی ہر دوشیزہ مجسمہ حسن بنی ہوئی تھی لیکن سارہ اس وقت ان سب میں کہیں زیادہ حسین نظر آرہی تھی۔ آرکسٹرا کے مدہم اور مدھر سُر آہستہ آہستہ بلند ہونے لگے۔ سارہ اپنا لہنگی گون سنبھالے آگے بڑھی لیکن دفعتاً اس کی نگاہیں ایک نوجوان پر جم کر رہ گئیں۔ وہ رُک گئی اور اسے دیکھتی رہی۔

نوجوان کی متجسسانہ نگاہیں ان پری جمال دوشیزاؤں میں کسی کو بے چینی سے ٹٹول رہی تھیں جب اسے اپنے تجسس میں ناکامی ہوئی۔ تو اس نے دوسری جانب ہال کا جائزہ لینے کے لئے نگاہیں پھیر لیں۔ اب اس کی نظریں حسین و جمیل سارہ سے دوچار ہو چکی تھیں۔ دونوں ایک دوسرے کو کچھ دیر تک دیکھتے رہے۔ یکایک سارہ کے ہاتھ سے رومال چھوٹ گیا اور نوجوان نے آگے بڑھکر خندہ پیشانی سے اس رومال کا اسے پیشکش کیا۔ دفعتہً نوجوان کو کسی نے پیچھے سے آواز دی۔ اور تھوڑی دیر بعد نوجوان ایک دوشیزہ کے ساتھ روانہ ہو گیا۔

سارہ جو اس وقت اپنی عمر کی بیس بہاریں دیکھ چکی تھی۔ نوجوان کو کسی زہرہ شمائل حسینہ کے ساتھ دیکھکر سراسیمہ سی ہو گئی لیکن اسے خیال ہوا۔ کہ کیوپڈ کا تیر خالی نہ لوٹے گا۔ اس روز کے بعد سے سارہ نے اپنا صبر و قرار کھو دیا۔ اس کی حالت روز بروز گرتی جا رہی تھی۔ ماں اس کی یہ حالت دیکھکر بے حد سراسیمہ ہوئی۔ جب اس نے اپنی اکلوتی لڑکی سے اس حالت کی حقیقت کے انکشاف کے لئے مجبور کیا۔ تو اس نے ڈیوک آف مارلبرو بادشاہ کی محبوبہ خاص باربرا ڈچس آف کلیولینڈ کا منظور نظر تھا۔ اسے اس کا بھی علم تھا کہ ڈیوک کو باربرا سے محبت ہو چکی ہے لیکن اس کے باوجود اس نے ڈیوک کو اپنا داماد بنانے کی تدبیر سوچ لی۔ اور اس نے سارا اور باربرا کو متعارف کرا دینا بہتر سمجھا۔

سارہ ماں کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے بہت جلد باربرا سے گھل مل گئی۔ اسے کیا خیال تھا کہ یہی بھری بھائی لڑکی اس کی رقیب بننے والی ہے۔ ایک دن شام کو ڈچس نے ازراہ عنایت سارہ کو اپنے کمرہ خاص میں ملاقات کے لئے طلب کیا۔ اس آراستہ کمرہ میں وہ بادشاہ سے ملا کرتی تھی۔ سارہ وقت مقررہ سے پیشتر ہی وہاں پہنچ گئی لیکن اس کی میزبان وہاں موجود نہ تھی۔ وہ موقع کو غنیمت جان کر باربرا

کے بستر پر دراز ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد دروازہ کھُلا اور جان چرچل ڈیوک آف مارلبرو کمرے کے اندر داخل ہوا۔ فرط حیرت سے اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں وہ مبہوت ہو کر اس نوجوان دوشیزہ کے حسن کا جائزہ لینے لگا۔ غیر خاتون کو کمرے میں دیکھکر اسے تعجب ہوا۔ اس وقت سارہ باوجود ہوشیار ہونے آنکھیں بند کئے لیٹی رہی۔ ڈیوک آگے بڑھا اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے قریب ہو کر اسے دیکھا سارہ کے ہاتھ میں وہی رومال نظر آیا۔ معاً اسے خیال آیا کہ یہ وہی دوشیزہ ہے جس کے لئے ایک عرصہ سے اس کی نظریں اسے ڈھونڈھ رہی تھیں۔ ڈیوک کو اب اپنے آپ پر قابو نہ رہا۔ اس نے دوشیزہ کے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لئے۔ سارہ نے آنکھیں کھول دیں اور اُٹھ کھڑی ہوئی۔ پہلے تو سارہ کچھ سراسیمہ ہوئی لیکن بہت جلد اس کے چہرے پر تبسم نمایاں ہوا۔ اسی اثنا میں پھر دروازہ کھلا۔ سارہ کی ماں کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ دونوں کو دیکھکر بڑبڑانے لگی۔ حالانکہ یہ تمام رومان پرور واقعات اسی کے ایما کے مطابق وقوع پذیر ہو رہے تھے۔ سارہ کی ماں نے جان چرچل سے کہا۔ کہ وہ اس کی عزت و آبرو خاک میں ملا رہا ہے۔ اب اس کی رسوائی ہو جائے گی۔
جان اپنے اس طرز عمل پر پریشان تھا۔ اسے کچھ سوجھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ سارہ ہی کی ماں سے حل کی تدبیر کے لئے دریافت کرنے لگا۔ سارہ کی ماں نے کہا۔ کہ وہ سارہ سے شادی کرلے۔ ڈیوک خاموش کھڑا تھا۔ بہت جلد اس خاتون نے شادی کے انتظامات کر لئے اور آناً فاناً سارہ اور جان کی شادی کی رسم پادری نے اسی مقام پر انجام دیدی۔
جب ڈچز کو اس بات کا علم ہوا کہ اس کی سہیلی نے اس کے محبوب کے ساتھ شادی کر لی ہے۔ تو اسے بہت افسوس ہوا۔ کہ اسے شادی میں شرکت کے لئے کیوں نہ مدعو کیا گیا۔ اس واقعہ کی تصدیق مسٹر ونسٹن چرچل وزیر اعظم انگلستان کے بائیوگرافی "مارلبرو اینڈ ہز ٹائمس" سے ہو سکتی ہے۔

ڈچز نے ان دونوں کی شادی پر دل سے نہ سہی لیکن بظاہر اپنی خوشی کا اظہار کیا۔

مارلبرو فوج کا بہترین سپہ سالار بھی تھا۔ اس کے بہادری کے جوہر میدان جنگ ہی میں نظر آتے تھے۔ ولیم سوم شاہ انگلستان اور ملکہ میری اس کو بے حد چاہتے تھے جب ملکہ میری کا انتقال ہو گیا۔ تو مارلبرو اور اس کی بیوی سارہ کی حیثیت ہی بدل گئی۔ اور جب ولیم سوم نے بھی وفات پائی۔ تو ملکہ این فرمانروائے انگلستان ہو گئی ملکہ این کی سہیلی اور بچپن کی ساتھی سارہ تھی۔ اور اس کا رسوخ اب بہت بڑھ چکا تھا۔ سارہ ہمہ تن اپنے شوہر کی فلاح و بہتری کی فکر میں لگی رہتی تھی ملکہ این اگر نا اہل

نہیں تو یقیناً کچھ بہت ہوشیار بھی نہ تھی۔ ولیم سوم کے بعد انگلستان کا فرمانروا اور اصل امیر مارلبرو ہی ہو گیا تھا۔ اور وہی مدت دراز تک ملک کے اندر اور باہر خدائی کرتا رہا۔ اس امیر کا سن اب ۵۲ سال کا اور دماغی اور جسمانی قویٰ بہت اچھے تھے۔ اس کے اخلاق پر سخت دنائت اور بہت کچھ ریاکاری کا داغ ہے لیکن سیاسیات و جنگ دونوں میں وہ بڑا شخص تھا۔ جوانی ہی سے حسن صورت اور دلکش اخلاق کی بدولت لوگ اس کے گرویدہ ہو گئے تھے۔ اور باقی ماندہ ساری زندگی اس نے اپنی ذاتی اغراض کے حصول میں گذار دی۔ ولیم کے عہد بادشاہی تک اسے بڑے پیمانہ پر اپنے اوصاف ظاہر کرنے کا موقع نہیں ملا لیکن جب کبھی اس نے کسی کام کا بیڑا اٹھایا تو ہمیشہ ثابت کر دکھایا کہ وہ اسے انجام دینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ قدرتی اوصاف کے لحاظ سے وہ حقیقت میں خوش نصیب تھا۔ اس کی جسمانی صحت برابر اچھی رہی اور وہ بڑی سے بڑی تکان جھیل سکتا تھا۔ نہایت قابل تعریف مزاج، بے جھجک ہمت اور بے خوف دل قدرت کا عطیہ تھے اور دوست ہو یا دشمن جس کسی سے ملتا غیر معمولی اخلاق و تواضع سے پیش آتا اور اس وضعداری میں کبھی فرق نہ آنے دیتا تھا۔

ان اخلاقی اوصاف کے ساتھ اعلیٰ درجہ کے دماغی اوصاف پائے تھے معاملات حاضرہ پر اس کے خیالات نہایت واضح اور لوجہ احسن قابل عمل ہوتے تھے کتابیں پڑھنے کا موقع اس قدر کم ملا تھا کہ اسے لکھنے کی بھی مطلق رغبت نہ تھی۔ تاہم اس کی مراسلات اور سرکاری تحریریں نہایت سلجھی ہوئی اور زوردار ہوتی تھیں اس کی مجلسی خطابت بھی مناسب محل ہوتی۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ ہر چیز کو اصل مقصد کے تحت لانا خوب جانتا تھا اور وہ ایسا سپہ سالار تھا کہ جو لڑائی لڑا ہمیشہ اس میں فتحیاب ہوا اور جس شہر کا محاصرہ کیا۔ اسے حاصل کر کے چھوڑا۔ بایں ہمہ جنگ کو وہ محض کسی مقصد کا ذریعہ سمجھتا تھا۔ اس میں صبر کا انتہائی مادہ تھا اور توکل کی بھی ایک شان تھی جس کے باعث بڑی بڑی ناکامیاں بھی اسے بالکل مایوس نہ کر سکتی تھیں۔ ایک موقع پر وہ خود لکھتا ہے کہ "چونکہ میں سمجھتا ہوں کہ اکثر امور تقدیری ہوتے ہیں۔ لہٰذا میرے نزدیک امکانی سعی کے بعد آدمی کو راضی بہ رضا ہو جانا چاہئیے" مارلبرو ہمیشہ سے پکا ٹوری تھا اور حکومت میں اس نے بڑے عہدے بھی ٹوریوں ہی کو دیئے ۱۷۱۱ء دسمبر میں اس کا مواخذہ بھی کیا گیا لیکن اس نے اپنے آپکو بری الذمہ ثابت کر دکھایا۔

اس تمام عرصہ میں مارلبرا اور سارہ اس کی مددگار بنی رہیں۔ ایک وقت جان چرچل سارہ کے ساتھ محو استراحت تھا کہ باہر کسی کے کھٹکھٹانے کی آواز آئی۔ بادشاہ خود آیا تھا۔ جان چرچل بے حد سراسیمہ ہو گیا۔

اب مارلبرا کو اپنی عزت و آبرو سنبھالنا مقصود تھی۔ کیونکہ اب عزت جانے میں کوئی کسر باقی نہ رہی تھی۔ جان کو ایک تدبیر سوجھائی دی اور وہ دوڑتا ہوا کھڑکی تک پہنچا اور وہاں سے صحن کا بازو جو بے حد بلند تھا۔ کود پڑا۔ اس کے اس دلیرانہ کام پر ڈچز بہت خوش ہوئی اور اسے پانچہزار پونڈ انعام دیئے۔ ڈچز اکثر دوا کے لئے جاتی۔ کیونکہ مارلبرو کے گھوڑے سے گرنے کے بہانے اسے دواخانے رجوع کیا گیا تھا۔

زندگی کے اکثر اور اہم اوقات میں جان چرچل کی سارہ نے بہت مدد کی اور ان کی شادی کے بعد کی ازدواجی زندگی بھی نہایت کامیاب ثابت ہوئی۔

جان چرچل کی وفات کے بعد ڈیوک آف سامرسٹ نے چاہا کہ جان کی بیوہ سے شادی کرے۔ لیکن سارہ نے اسے جواب دیا۔ کہ اگر میں نوجوان ہوتی اور مجھ میں وہی شوخی ہوتی جیسی کہ مجھ میں پہلے تھی تب کہیں میں آپ کے لائق ہوتی اس کے باوجود بھی اگر آپ میرے قدموں پر تمام دنیا کی دولت نچھاور کر دیں۔ تب بھی تم میرے دل پر قابو حاصل نہ کر سکو گے۔ کیونکہ وہ تو ڈیوک کیلئے ہمیشہ کے واسطے نذر ہو چکا۔

ریویو

حال ہی میں انڈیوتین انشورنس کمپنی لمیٹڈ جس کا صدر دفتر مدراس میں ہے کا ایک کنٹرولنگ دفتر برائے پنجاب شمال مغربی سرحدی صوبہ۔ دہلی اور یو پی۔ نسبت روڈ لاہور میں مسٹر بی ایل گاندھی صاحب کے ماتحت کھولا گیا ہے۔ اقتصادی بدحالی اور جنگ کے مہلک اثرات کے باوجود گاندھی صاحب اسے نہایت کامیابی کے ساتھ چلا رہے ہیں۔ اور یہ آپ ہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ اتنے قلیل عرصہ میں کمپنی کا نام ملک کے ہر حصہ میں مشہور ہو گیا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ کمپنی دن بدن ترقی کرے گی ؎

سب رس

اگر آپ کو اردو زبان سے کچھ بھی دلچسپی ہے۔ تو سب رس پڑھکر آپ بہت خوش ہوں گے۔ یہ ماہنامہ اردو زبان اور خاصکر حیدر آباد دکن کی جملہ علمی و ادبی سرگرمیوں کا آئینہ دار ہے۔ عیسوی مہینے کے پہلے ہفتہ میں پابندی اور آب و تاب کے ساتھ شائع ہوتا ہے۔

اس کے مضامین اور نظمیں بہت مفید اور دلچسپ ہوتی ہیں۔ ہر پرچہ باتصویر اور دیدہ زیب سرورق لئے ہوتا ہے۔ اس کے قلمی معاونین میں ہندوستان اور دکن کے اکثر بڑے بڑے ادیب انشاپرداز اور شاعر شریک ہیں۔ ان تمام خصوصیات کے باوجود اس ماہنامہ کا سالانہ چندہ صرف چار روپیہ آٹھ آنے ہے۔ نمونہ کا پرچہ ۶ر

بچوں کے لئے سب رس علیحدہ شائع کیا جاتا ہے۔ جو بچے اس کا ایک پرچہ دیکھ پاتے ہیں تو پھر اس کے اتنے گرویدہ ہو جاتے ہیں۔ کہ ہر ماہ اس کے مطالعہ کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ بچوں کی دلچسپی کے لئے ہر مضمون کے ساتھ تصویریں شائع کی جاتی ہیں۔ اس رسالہ کا سالانہ چندہ صرف ایک روپیہ آٹھ آنے ہے۔ نمونہ کا پرچہ ۲ر

ملنے کا پتہ:۔ سب رس کتاب گھر خیرت آباد حیدرآباد دکن

تصحیح

اس عنوان کے تحت غلط الفاظ و محاورات اور الفاظ و محاورات کے مروجہ غلط استعمال کی تصحیح شائع کی جاتی ہے۔

جُوں جُوں، تُوں تُوں

جُوں جُوں عمر بڑھتی جاتی ہے تُوں تُوں قویٰ میں اضمحلال پیدا ہوتا جاتا ہے

یہ الفاظ ہندوستان بھر میں زبان دہن و قلم پر جاری ہیں۔ میرے خیال میں انہیں متروکاتِ زبان میں شامل کر دینا چاہیئے۔

جوں جوں اور توں توں کے الفاظ میں

تنافر محسوس ہوتا ہے۔ ذوق سامعہ اب انہیں قبول کرنے کو تیار نہیں۔

ان کی بجائے

جُوں جوں" کیلئے "جیسے جیسے" اور "توں توں"

کی بجائے اگر ضروری ہو "ویسے ویسے" کے الفاظ کا عام رواج ہونا چاہیئے

مگر میں توں توں کے کسی نعم البدل کی ضرورت ہی نہیں سمجھتا مثلاً

جیسے جیسے عمر بڑھتی جاتی ہے قویٰ میں اضمحلال پیدا ہوتا جاتا ہے

اس فقرے کو توں توں کی ضرورت ہی نہیں۔

تاجور

شاہکار

جلد ۱۴ بابت ماہ جون جولائی سنہ ۱۹۴۲ء نمبر ۶، ۷

فہرست

احسان اللہ خان تاجر پرنٹر پبلشر نے عالمگیر الیکٹرک پریس لاہور میں [illegible] چھپوا کر دفتر شاہکار [illegible] متصل [illegible] لاہور سے شائع کیا

مختصرات

سکندر بلدیو سنگھ معاہدہ

کسی رہنما کی عظمت کا صحیح اندازہ اُس وقت کیا جا سکتا ہے جب حیات عامہ میں باہمی خلفشار کی طوفانی آندھیاں چل رہی ہوں۔ جماعتی افتراق و انشقاق کے سبب آپس کا اتحاد و اعتماد مفقود ہو چکا ہو۔ ہر فرقہ دوسرے فرقوں کو زندگی کا حق دینے سے انکاری اور ہر شخص اپنے حال سے مضطرب اور مستقبل سے غیر مطمئن نظر آتا ہو۔ اِس ہنگامہ ہیجان و بدحواسی میں جس رہنما کا دماغی توازن مرکزِ ثقل پر قائم رہ سکے سمجھ لیجئے کہ وہ ایک بڑا انسان اور صحیح معنی میں ایک بڑا آدمی ہے اُس کی موجودگی اس امر کی ضمانت ہے کہ یہ طوفان اضطراب فرو ہو کر حیات عامہ میں جلد سکون پیدا ہو جائیگا۔ اور انسانی زندگی کی رفتار بے منزل راہوں کو چھوڑ کر منزل مراد کے سیدھے راستے کو اختیار کر لیگی۔

پنجاب کی چپقلش بڑھتے بڑھتے اب اُن ہولناک حدود تک پہنچ رہی تھی جن سے آگے زمین کا رنگ خاکی سے سرخ ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ اور جہاں بہیمیت کا عفریت انسانی خون سے ہولی کھیلنے کا تمنائی رہتا ہے۔ ہر جماعت کے اخبارچی اپنی بے اصول صحافت کے مزبلوں سے اُبھر اُبھر کر اپنی قوم کے افراد کو درندگی کے تمام ہتھیاروں سے مسلح کر رہے تھے۔ قومی اجتماعات میں ہنگامہ زاد فرقہ وار لیڈر اپنی آتشیں تقریروں سے خونکاری اور فتنہ فشانی کی تلقین کر رہے تھے۔ اور ان ناسازگار حالات سے ایک ایسی ہولناک فضا تعمیر ہو چکی تھی۔ کہ کوئی سرسری نگاہ اِس ہنگامۂ رستخیز کو دیکھنے کی تاب نہ لاتی تھی۔ ایک معمولی دماغ اِس امن سوز آغاز کے تباہ کن انجام کا تصور کرنے سے بھی ہراساں نظر آتا تھا۔ ایسے عبرت آموز عالمِ اضطراب میں جبکہ ہر محبِ وطن قنوطِ کفر میں مبتلا تھا۔ یاس و حرماں کے گھٹا ٹوپ گرد و غبار سے سر سکندر کے لباس میں "مردے از غیب" نے ظہور کیا اور اپنے کراماتی تدبر سے کام لیکر صوبے کی سب سے شورش کار جماعت کے رہنماؤں سے ایک معاہدہ مصدافنت کر کے پنجاب کی طوفانی فضا میں سکون پیدا کر دیا۔

"سکندر بلدیو سنگھ معاہدہ" خانہ جنگی کی سلگتی ہوئی آگ پر پانی بن کر برسا اور سچ یہ ہے کہ اس کی دور رس سیلابی حیاتِ عامہ کے شعلہ خیز خلفشار پر بھی اثر انداز ہوئی ہے۔

اس مقدس معاہدے کا یہ معجزہ ہے کہ جو لوگ "خون کی ندیاں بہا دینگے" کے نعرے بلند کر رہے تھے۔ آج صلح و آشتی کا پرچار کر رہے ہیں۔

اگرچہ سبھائی پریس اس معاہدے کو اپنے خرمنِ تمنا کے حق میں برقِ خرمن سوز تصور کرتے ہوئے اِس کے خلاف ایک محاذ بنا کر چیخ رہا ہے۔ مگر امید ہے کہ صوبے کے اتحاد پذیر ہندو رہنما موجودہ غیر معمولی حالات میں اپنی سیاسی فراست سے کام لیکر اس تاریخی معاہدے میں جلد شریک ہو جائیں گے۔

ہم ایک طویل مدت سے آپس کی سر پھٹول کا تجربہ کر رہے ہیں۔ ہمارے گذشتہ تلخ تجربات اس افسوسناک واقعیت کے زندہ شاہد ہیں۔ کہ ہم نے باہمی تفرقہ پردازیوں میں بہت کچھ کھو دیا ہے۔ اور اگر یہ خانہ جنگی اسی صورت جاری رہی تو جنگ کے ہوش ربا حالات کے پیش نظر یقیناً ہم اپنا سب کچھ کھو بیٹھیں گے ہمیں ان ناطق تجربات کی آواز کو گوشِ دل سے سننے کی ضرورت ہے اس کے ساتھ ہمیں ماضی کی اُس شیریں یاد کو بھی حافظے سے محو نہ کر دینا چاہئے کہ جب کبھی ملک کی متصادم جماعتوں میں اتحاد ہوا ہے اہل ملک کی یکرنگی و ہم آہنگی حکومت کے لئے ایک غیر مفتوح طاقت بن گئی ہے اور ہم نے مشترکہ طور پر وقت کی سازگاری کو اپنی پشت پناہ بنایا ہے۔

یہ جھٹکے اور حلال کے جھگڑے حقیقت یہ ہے کہ ہماری باہمی کدورتوں کے نمائشی نام ہیں۔ ورنہ پیاز کے توبر تو چھلکوں کی صورت ان کا تہ منظر کوئی نہیں۔

میں کوئی سیاستدان نہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ جھٹکا اور حلال کے معاشری مسئلے کا تصور ہمیشہ میرے فہم و ادراک سے بالاتر رہا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہم نے اپنے عہد حکومت کی ساری طویل تاریخ میں غیر مسلم ذبیحے پر کبھی پابندی عائد نہیں کی۔ رہا بیف کا سوال۔ اسے سکھ بھائیوں نے نو مفت کی سیاسی دردسری بنا لیا ہے۔ ورنہ ان کے اصلی مذہب کو اس سوال سے کوئی دلچسپی نہیں۔ البتہ ہندو بھائیوں اور اُن میں بھی صرف سناتن دھرم اور اس کی بعض شاخوں سے وابستہ ہندوؤں کے جذبات کے احترام کی خاطر ہمیں اس مسئلے پر غور و فکر کرنے کی ضرورت ہے۔ اور اس سلسلے میں بیف فروشی کی نمائشی خرید و فروخت سے قطعیۃً اجتناب کرنا ہمارے لئے عین اسلام ہے۔ باقی یہ کہنا کہ "انگریزوں کے لئے روزانہ ہزاروں گائیں ذبح ہوتی ہیں۔ ہندو اُن سے تعرض کیوں نہیں کرتے؟" اس سوال کا صحیح حل نہیں کیونکہ یہ معاملہ ہندوؤں اور انگریزوں سے تعلق رکھتا ہے مسلمان اسے اپنے لئے آڑ نہیں بنا سکتے۔

لیکن مسلمانوں کے نقطۂ نگاہ سے اس سوال کا ایک مذہبی پہلو بھی ہے جسے ہمارے مسلم رہنما بربنائے لاعلمی اور ہندو لیڈر بخبرانہ غلط فہمی کی بنیاد پر

عموماً نظر انداز کرنے کے عادی ہو گئے ہیں۔

صورت مسئلہ یہ ہے کہ تمام اسلامی غذائیں مسلمانوں کے لئے از روئے مذہب مباحات میں شامل ہیں یعنی ہر غذا جسے مسلمان استعمال کر سکتے ہیں ہمارے لئے اس کا کھانا جائز ہے فرض نہیں، واجب نہیں ایسی کسی غذا کے کھانے یا ترک کر دینے پر مذہب کی جانب سے کوئی تعزیر عاید نہیں ہوتی مثلاً شلغم، مولی، دودھ گھی اور ایسی ہی تمام غذائیں مسلمانوں کے لئے مذہب کی رُو سے صرف مباح (جائز) ہیں۔ اگر کوئی مسلمان زندگی بھر دودھ گھی جیسی طیب غذا کا بھی استعمال ترک کر دے تو مذہب کا مطلقاً گنہگار نہیں۔ اسی ذیل میں گائے کا گوشت بھی آجاتا ہے کہ کوئی کھائے تو جائز ہے اور ہمیشہ کے لئے ترک کر دے تو بھی جائز ہے۔ البتہ اسلام ہی کا حکم یہ بھی ہے کہ اگر کوئی حکومت یا قوم کسی مباح غذا کی قانوناً یا جبراً ممانعت کر دے تو پھر ہر مسلمان پر فرض ہو جاتا ہے کہ اُس قانون کو توڑنے کے لئے سرگرم عمل ہو جائے جس کی رُو سے کوئی غذا جو اسلام نے اس کے واسطے مباح (جائز) بنائی ہے۔ ناجائز بنا دی جائے۔ مثلاً کوئی حکومت کسی وقت کوئی ایسا قانون نافذ کر دے جس کے پیش نظر گھی۔ دودھ سبزی چاول وغیرہ میں سے کسی غذا کا استعمال ناجائز قرار پا جائے (طبی احکام اس سے مستثنیٰ ہیں) تو مسلمان اپنے مذہبی احکام کی اطاعت پر مجبور ہو جائیگا اور اس قانون کی خلاف ورزی کو اپنا مذہبی فریضہ تصور کریگا۔

مندرجہ بالا دونوں اسلامی مسئلے بالکل صاف ہیں۔ ان مسئلوں کے پیش نگاہ ایک مبارک وقت ایسا بھی آسکتا ہے کہ مسلمان بہ حیثیت قوم برادران وطن کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے رضاکارانہ طور پر بیف کو اپنی غذا سے خارج کر دیں۔ مگر اس کے لئے کوئی ایسا قانون بنانے کی بجائے جس کی خلاف ورزی جب تعزیر قرار دی جائے۔ کوئی ایسا باہمی معاہدہ زیادہ مناسب ہوگا جس کی پابندی کرتے ہوئے مسلم رہنما اور اسلامی علماء اپنی قوم کو بیف فروشی اور گاؤکشی سے روک سکیں۔ کیونکہ قانون ممانعت کے بعد اس کی خلاف ورزی ہر مسلمان پر مذہبی رُو سے عائد ہو جائیگی۔ اور رضاکارانہ طور پر اس جائز غذا کو ترک کر دینے سے اپنے مذہب اور اپنی ہمسایہ قوم دونوں گھر پورے کئے جا سکتے ہیں۔

ضرورت ہے کہ ہر دو قوم کے مخلص رہنما باہمی اتحاد و اعتماد کی فضا پیدا کریں اور اس مبارک فضا کے لئے میدان پیدا کرنے کی ضروری اور اولین صورت یہ ہے کہ اپنے اپنے فتنہ پرور اخبارات کے لئے تفرقہ آرائی اور فتنہ کاری کو ناممکن بنا دیں حقیقت تو یہ ہے اور اس حقیقت کا اظہار ملک کے رہنما بھی اس لئے نہیں کرتے کہ انہیں اپنی ہر دلعزیزی کے مجروح ہونے کا خطرہ ہے کہ ہمارے اخبارات ہی ملک کی غلامی کو بے میعاد بنانے کے اصلی مجرم ہیں۔ ظاہر ہے کہ مادر وطن کی غلامی کی زنجیریں باہمی اتحاد و اعتماد کے بغیر نہیں ٹوٹ سکتیں اور باہمی اعتماد و اتحاد کی فضا کو ہمارے فتنہ پرور اخبارات پیدا نہیں ہونے دیتے۔ ان کی پیدا کی ہوئی باہمی خونریزیوں نے ملک کو بے انتہا نقصان پہنچایا ہے۔ ہزاروں خواتین کا سہاگ اجاڑا۔ لاکھوں بچے سایۂ پدری سے محروم ہو گئے۔ باہمی مقدمہ بازی پر بے شمار روپیہ برباد ہوا۔ اہل ملک کو سینکڑوں بار کاروبار کی تباہی کا نقصان اٹھانا پڑا مگر حکومت نے عموماً یہی کیا کہ عوام بے خبر کو ذمہ دار گردانا اور فسادات کے اصلی مجرموں (اخباریوں)

کی جانب سے جان بوجھ کر چشم پوشی برتی۔ اس ناروا طرز عمل ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ اردو صحافت کے مزبلوں میں پرورش پانے والے یہ انسان نما جراثیم فتنہ و فساد کی اصل زندگی بن گئے اخبارات کے صفحات ان فتنہ کار اور غرض پرست لیڈروں کے لئے محور حیات بن رہے ہیں۔ جو اپنی اپنی قوموں کے بے خبر عوام کو مذہب و قومیت کے پردے میں دوسری ہمسایہ قوموں سے لڑا کر نظام امن کو تہ و بالا کرتے رہتے ہیں۔

ہمارے ملک کی یہ انتہائی بدقسمتی ہے کہ ہر وہ ناکارۂ وقت اور آوارۂ زندگی جسے تمام معاشی طبقات بے ضرورت خیال کر کے اپنے دروازوں سے دھکے دیکر نکال دیتے ہیں کسی نہ کسی اخبار میں کھپ جاتا ہے اور اپنی بے لیاقتی اور بے سوادی کو چھپانے کی خاطر ہمسایہ قوم کے خلاف سب و شتم اُن کی تہذیب اُن کے مذہبی عواطف و امیال اور اُن کے مذہبی پیشواؤں پر زبان طعن و تشنیع دراز کرنے کی جد و جہد شروع کر دیتا ہے' اور پھر اپنے ہی جیسے نااہل فتنہ جو اور غنڈے لوگوں کی تبلیغ و تشہیر کر کے انہیں لیڈری کے منصب پر پہنچانے کی خاطر اپنی فطرت کی تمام پستیوں کو بروئے کار لے آتا ہے۔ اگر اس جہاد ناروا کی پاداش میں ایک آدھ بار خود بھی جیل کی ہوا کھا آئیے۔ تو خود اس کی لیڈری بھی ٹکسال بن جاتی ہے

یا دھر ملک کے تعلیمی ادارات (یونیورسٹیوں) میں ہر علم و فن کی تعلیم کا انتظام تو ہے مگر جرنلزم اور صحافت کی تعلیم و تدریس کی جانب ہمارے ملکی اداروں کی توجہ کبھی مبذول نہیں ہوئی۔ اگر ہماری یونیورسٹیاں صحافت و اخبار نویسی کی تعلیم کی جانب متوجہ ہو جائیں اور شعبہ صحافت قائم کر کے صحافت کا بلند اور حاوی نصاب مقرر کر کے اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوانوں کو صلائے عام دیں۔ تو اچھے تربیت یافتہ خاندانوں کے قابل نوجوانوں میں عام دلچسپی اور ترغیب پیدا کی جا سکتی ہے۔ صرف اسی طریقے سے ملکی زبانوں کا معیار صحافت بلند ہو سکتا ہے۔ بلیک میلروں اور بے سوادوں کو اس لائن سے نکالنے کی یہی صورت ہے۔

اس وقت ہماری اردو صحافت اور بالخصوص اس صوبے کی اردو صحافت صرف ایک اصول پر مضبوطی سے کاربند ہے اور وہ ہے بے اصولی روپیہ بٹورنا صرف روپیہ بٹورنا اس کا اول و آخری مقصد قرار پا چکا ہے۔ اور اس مقصد کے حاصل کرنے میں تمام جائز طریقوں کو خیر باد کہہ دی گئی ہے۔ روا اور ناروا کا امتیاز اٹھا دیا گیا ہے۔

مثالاً۔ ملاحظہ ہو کہ کل تک جو بعض سبھائی اخبارات مسلمانوں کو پانی پی پی کر کوس رہے تھے کہ یہ مل جل کر رہنا نہیں سیکھے۔ پاکستان کے خواب دیکھتے ہیں۔ ان کے قومی مطالبات اتحاد شکن ہیں۔ آج سکندر بلدیو سنگھ معاہدۂ اتحاد پر سب سے زیادہ وہی چراغ پا نظر آتے ہیں۔ ان کے خرمن امن و سکون کے لئے یہ معاہدۂ اتحاد برق خاطف بن رہا ہے وہ ایک جانب گمراہ کن سنگھ پارٹی کو سردار تارا سنگھ کی جماعت کے خلاف شہ دیکر سکھ قوم کو معاہدے سے خوف دلا رہے ہیں دوسری جانب سر سکندر اور ان کی اتحاد پارٹی اور اسلامیان پنجاب پر آوازے چست کرتے ہوئے اس معاہدے کو "سیاسی فریب" کا نام دے رہے ہیں۔ اس سے زیادہ بے اصولی اور کیا ہو سکتی ہے؟

سر سکندر کی خدمت میں بھی میں ایک گذارش کرنا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ

"سکندر بلدیو معاہدے" کے خلاف سچائی ایجی ٹیشن کرنا [illegible] کا ایک ہی ذریعہ ہے۔ یہ کہ سکندر بلدیو معاہدے کی طرح "سکندر نریندر ناتھ پیکٹ" کی تشکیل و تکمیل کو بھی وہ اپنی اہم مصروفیات میں شامل کر کے وقت کی پہلی فرصت میں اس امن آفرین نیکی کو سر انجام دیں۔ صوبے کے ہندو مدبرین میں محترم راجہ نریندر ناتھ ایک ایسے رہنما ہیں جو ذوقی طور پر مسلمانوں سے ادبی و لسانی اتحاد رکھتے ہیں۔ وہ ذاتی حیثیت میں ہندو مسلم امتیاز نہیں رکھتے۔ ان کے خانگی ملازموں میں ہندو بھی ہیں اور مسلمان بھی۔ اردو زبان و ادب سے انہیں والہانہ محبت ہے اسلامی تصوف سے وہ بہت زیادہ دلبستگی رکھتے ہیں۔ ہندو قوم کے بھی وہ مسلمہ رہنما ہیں اور ان کی صفات متذکرہ بالا کے پیش نظر ان کے ذریعہ ہندو مسلم معاہدہ سکھ مسلم معاہدے سے زیادہ آسان ہوگا۔ اس وقت خوش قسمتی سے سکندر بلدیو سنگھ معاہدہ کے سبب مجوزہ معاہدے کے لئے فضا بھی سازگار ہو گئی ہے یوں بھی صوبے کی اقلیتوں کے جائز مطالبات تسلیم کر کے انہیں مطمئن کرنا مسلم قوم کے لئے ضروری ہے۔ یہ معاہدہ بھی بروئے کار آجائے تو پھر صوبے کی مسلم اکثریت دوسری اقوام کے حقوق کا احترام کرتے ہوئے اطمینان و سکون سے اپنے حقوق کی حفاظت اور ان سے پورے طور پر بہرہ اندوز ہو سکے گی۔

پاکستان یہی ہے!

امن و اطمینان کی پنجاب گیر فضا قائم ہو جائے اور مسلم اکثریت اقلیتوں کے حقوق کا اطمینان دلا کر صوبے پر حکومت کرنے کے سازگار مواقع حاصل کرے بس یہی ہمارا پاکستان ہے۔ مجوزہ پاکستان میں اس سے زیادہ کچھ نہ ہوگا۔

اس لفظ سے کسی قوم کو خواہ مخواہ چڑنے کی مطلق ضرورت نہیں مقدس اسلام ہمیں کسی ہمسایہ یا غیر ہمسایہ قوم پر زیادتی اور اس کے حقوق پر دست درازی سے روکتا ہے صرف یہی نہیں بلکہ ہمسایہ اقوام کے ساتھ حسن سلوک رواداری بے جا چشم پوشی اور ایثار و قربانی کی تعلیم دیتا ہے صلح کل پالیسی اسلامی تعلیم کا بنیادی اصول ہے میری ایماندارانہ رائے تو یہ ہے کہ بعض فرقوں کو چند سرکاری اداروں میں توسیع دینے کے مقابلے میں مسلمانوں اور سکھوں میں اتحاد و موافقت پیدا ہونے کا معاملہ ہزار درجہ بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ قابل ترجیح اور انتہا درجے ضروری اور اہم ہے۔

جھٹکا ہمارے ہاں ناروا ہے اس سے ہمیں انکار نہیں لیکن شراب تو ناروا بھی ہے اور نجس العین بھی۔ پھر کیا اسٹیفل اور اسی قسم کے انگریزی ہوٹلوں میں جہاں شراب کھلے بندوں فروخت بھی ہوتی ہے اور پی بھی جاتی ہے۔ لحم الخنزیر پکتا ہے اور کھلایا بھی جاتا ہے کبھی کسی مسلمان نے انفرادی حیثیت میں یا مسلمانوں نے اجتماعی صورت میں اسٹیفل کی چائے پارٹیوں میں شریک ہونے سے اس بنا پر انکار کیا ہے؟ کہ یہاں شراب اور لحم الخنزیر کا کاروبار ہوتا ہے اسٹیفل کی پارٹیوں میں مسلم زعما مسلم علما اور مسلم اخبار نویس بے امتیاز سبھی دیکھے جاتے ہیں گزشتہ ۲۵ سال کی طویل مدت میں اس قسم کے انکار کی کوئی ایک مثال بھی میرے علم میں نہیں آئی پھر مجھے کوئی بتائے کہ چند ایسے سرکاری اداروں میں جن میں سکھ قوم کے نیچے بھی برابر کے شریک ہیں سکھوں کی جائز غذا (جھٹکے) کو کچھ توسیع دے دینے سے اگر ہمارے اور ان کے درمیان اتحاد پیدا ہو سکتا ہے تو سیاسی اور دینی نقطۂ نگاہ سے یہ سودا گراں کیسے ہو گیا؟

خلافت ایجی ٹیشن کے زمانے میں ایک مبارک سال ایسا بھی آیا ہے۔ جب برادران وطن کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے عید اضحیٰ کے دن سارے اسلامی ہند میں صرف ایک کنسٹیبل نے اپنے انگریز افسر کی انگیخت پر گائے کی قربانی کی تھی اور اس کی اس اتحاد شکن حرکت پر مسلمان اس کے خلاف ہو گئے تھے۔

اس واقعے کو میں اس پیشگوئی کی دلیل بناتا ہوں کہ "سکندر بلدیو معاہدے" کی مخلصانہ تعمیل سے ایک دن ایسا بھی آئے گا۔ کہ سکھ رہنما اپنی رواداری کا اظہار کرتے ہوئے سرکاری اداروں میں جھٹکے کی توسیع پر رضامند ہونگے۔ اور مسلمان سکھ بھائیوں کے اس روادارانہ ایثار کو دیکھ کر اس سے فایدہ اٹھانے سے انکار کر دینگے۔

جنگ کا آتش فشاں دیوتا ہندوستان کے دروازے کو توڑ کر صحن ملک پر قابض ہو چکا ہے محوری دل کی جنگی منزل مراد ہندوستان قرار پا چکا ہے وطن عزیز پر ایک ہولناک انجام گھنگھور گھٹا کی صورت چھا رہا ہے لیکن ملک کی اس مشترکہ مصیبت میں بھی جبکہ ملکی زندگی کو تاریخ کا سب سے بڑا مہلک چیلنج کر رہا ہے۔ یہ کس قدر غیرت سوز منظر ہے۔ کہ ملکی جماعتیں ان نازک حالات میں باہمی تفرقہ پردازیوں میں مبتلا نظر آتی ہیں۔ اور صوبہ پنجاب تو بالخصوص اپنے اندرونی خلفشار سے ہمسایہ ممالک تاریخ اور آئندہ نسلوں کے لئے ایک شرمناک نمونہ بن رہا ہے۔

اس وقتِ ناسازگار کو سطحی اور مقامی سیاسیات میں الجھ کر آپس کی رنجشوں سے ناقابل تلافی بنا لینے کے معنی اس کے سوا اور کیا ہو سکتے ہیں کہ ہم غیر ارادی طور پر دشمن کی جنگی مشکلات کو سہل سے سہل تر بنا کر اسے ملک پر تسلط جمانے کی دعوت دے رہے ہیں۔

شش جہاتِ خرد و مصلحت ہمیں چیخ چیخ کر متنبہ کر رہے ہیں کہ اپنے مذہب کی بقا، اپنے ناموس کی حفاظت اور ملکی غیرت کا احساس رکھتے ہو تو باہمی تشتت و افتراق سے دستکش ہو کر مشترکہ دشمن کا متحدہ مقابلہ کرنے کے لئے کمر ہمت باندھ لو۔ مگر ہماری بدطالعی رحم طلب ہے۔ کہ ہم تاریخ کی ان نازک ترین ساعتوں میں بھی اپنے دشمن خونریز سے بے خبر باہم دست و گریباں نظر آتے ہیں۔ ع

"وائے اگر از پسِ امروز بود فردائے"

تاجور

نوٹ:-

پنجاب یونیورسٹی پر جو سلسلہ مضامین گزشتہ دسمبر سے شائع ہو رہا ہے اس بار اس کے لئے گنجائش نہ نکل سکی۔ قارئین کرام آئندہ نمبر کا انتظار کریں۔
(ادارہ)

سید قیصر حسین زاہدی
بی اے علیگ

تیسرا خط

اچھی نے نواز!

میں بعض اوقات خود کو اس دنیا میں ایک بیکار شے سمجھنے لگتا ہوں۔ بالکل بیکار۔ لیکن بیکاری کا خیال آتے ہی کامیاب زندگیوں پر بھی نظر پڑنے لگتی ہے۔ وہ زندگیاں جنہیں دنیا والے کامیاب بتاتے ہیں مغربی ممالک میں خون کی ندیوں میں تیرنے والی اقوام کے ناخدا جن کے تشدد سے آج ساری دنیا کا امن خطرے میں ہے۔ جدید جنگ کے ماہرین اور آلات حرب و ضرب کے موجد۔ دنیا کو تباہ کر دینے والی آسانیاں بہم پہنچانے سائنسدان ملک کے اندرونی معاملات کو پیچیدہ اور ناقابل حل بنا دینے والے سیاسی لیڈر قوم کو زریں مستقبل کا زریں نقشہ دکھا کر سیاسی ترقی کے خواب دکھا کر اخلاقی پستی کی طرف لیجانے والے پرجوش خدام قوم بھوکے کتوں کی طرح زمین کے اگلے ہوئے خزانوں پر لڑنے بھڑنے والی تہذیب یافتہ اور مدبر ہستیاں انسانی جذبات کو کیسر ٹھکرا دینے والے اس کے حقوق کو ضبط کرنے والے اس کو ظاہرداری کی تلقین کر کے باطنی تاریکیوں میں دھکیل کر آسودہ دلشاد رہنے والے دینی رہبر تہذیب یافتہ ڈاکو پڑھے لکھے چور مسکین صورت قاتل اور انسانی ہیولے میں چھپے ہوئے افعی بھی ہماری موجودہ تہذیب کی بام پر چہل قدمی کرتے نظر آتے ہیں۔ انسان بہت کمزور ہے بہت کمزور۔ اور دنیا کی ۹۹ فی صدی آبادی غریب۔ بے مایہ۔ ہم ان نظام کے جاہل بانیوں کے ظاہری رکھ رکھاؤ اور اثرات امارت سے بے انتہا مرعوب ہو جاتے ہیں۔ ہم اپنے اندر وہ قوت محسوس نہیں کرتے جو اس ہر شکوہ و غارتگری کے خلاف آواز بلند کر سکے۔ غارتگری جسمانی اور روحانی ہم اپنے کو اس قدر جاہل اور بے بہرہ خیال کرنے لگتے ہیں۔ کہ سوسائٹی کے ظالمانہ جاہلانہ اور خود غرضانہ رویہ کو کسی ایسے اصول کی بنا پر قائم سمجھتے ہیں جس تک ہماری نظریں نہیں پہنچ سکتیں۔ شاید وہ اصول خدا کی طرف سے کسی پیغمبر یا کسی سیاسی ناخدا کو تفویض کیا گیا تھا۔ اسی کے مطابق احکام جاری کئے گئے۔ ہم سب انہیں احکام کے غلام ہیں ہماری زبانیں دنیا کی تمام غیر منظم تنظیموں کے خلاف بند ہیں۔ کیا دنیا منصف ہے؟ ہرگز نہیں۔ انسانی عقل انصاف کے معنی ہی کیا سمجھتی ہے کہ اس کی ترازو ہاتھ میں لے سکے۔ سمندر کے گہرے بے شمار ریت کے ذروں کی مانند بکھرے ہوئے شداید دنیا کی نظر سے اوجھل ہیں۔ کچھ پہاڑوں کی طرح زمین کو اپنے بوجھ سے دبا رہے ہیں۔ انہیں دنیا کے انصاف کا کوئی داؤ نہیں چل سکتا۔ یوں کہئے کہ ان کی چمکیلی اور برفیلی بلندیوں کا نظارہ کرتے وقت ہمارے انصاف کی آنکھیں جھپک جاتی ہیں۔ بس تو پھر انصاف کے تصرف میں صرف نہر کے کنارے کے بھدے سنگریزے آتے ہیں۔ وہ ان سے کھیلتا ہے ان پر اپنی تمام قوتیں صرف کر دیتا ہے اور مطمئن ہو جاتا ہے۔ ذرا سوچو تو کہ ایک گنوار کو اپنے ہمسایہ کے کھیت سے تھوڑی سی مولیاں اکھاڑ لینے یا دھان کے کچھ پودے کاٹ لانے پر ایک طویل عرصہ کے لئے قیدخانہ کی بلند دیواروں کے درمیان بیوی بچوں سے چھڑا کر اس کی آشاؤں پر پانی پھیر کر اس کے لطیف جذبات کو روند کر صرف کچھ دھان کے چند پودوں کے لئے یا چاندی کے چند حقیر سکوں کے لئے جنہیں وہ اپنے بال بچوں کو بھوک کے پنجہ سے نجات دلانے کے لئے کسی امیر کے گھر سے بغیر اجازت لے آیا تھا۔ یا کچھ مولیوں کے لئے اسے ایسی تاریک کوٹھری میں محبوس کر دیا جاتا ہے جہاں شاید کوئی درندہ بھی سانس لینا قبول نہ کرے۔ بتاؤ تو انسانیت کی قیمت کیا صرف چاندی کے چند سکے یا کھیت کی چند مولیاں قرار دی جا سکتی ہیں۔ قانون نے مجرم کی کونسی خامی کو پورا کر دیا۔ کیا قانون یہ نہیں جانتا۔ کہ تمام جرائم اور اخلاقی کمزوریوں کے ذمہ دار مجرم نہیں۔ بلکہ نفیس پردوں کے پیچھے عالیشان محلات میں چٹکتی ہوئی کلیوں کے درمیان سنہری کلس پر ناچتی ہوئی کرنوں کے نیچے آرام دہ صوفوں پر بیٹھنے والی وہ ہستیاں ہیں جنہوں نے دنیا کی تہذیب کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی ہے اور جو خود کو انتہا درجہ کی ذمہ دار شخصیت سمجھ بیٹھے ہیں۔ حکومت اور اس کے اراکین کیا یہ مزدور کے بہتے ہوئے پسینہ سے اپنے خس کے پردے نہیں بھگوتے۔ کیا سرمایہ دار طبقہ کسان کے بلکتے ہوئے بچوں کے آنسوؤں سے اپنی خواہشات کی آگ کو نہیں ٹھنڈا کرتا۔ مگر سوچو کبھی غریب کسان کو اس بات کا بھی احساس ہوا۔ جب مسٹر شا (Mrs. Shaw) نے اپنی 'Intelligent womens' guide to socialism' میں محنت اور دولت کی غلط تقسیم سے منسوب کیا ہے۔ دنیا کی تمام پیداوار کا ذریعہ مزدور اور تمام دولت کا مالک وہی capitalist مزدور کے ساتھ اتنا ظلم کیا گیا ہے۔ کہ اس کو اس تشدد کا احساس تک نہ رہا۔ وہ اپنے قاتل کے سنہری تیشہ یا دہلی سنگینوں کو دیکھ کر ان کے مظالم کو بھی ایک عقلمندانہ رویہ سے زیادہ کچھ نہیں سمجھتا اور بے کھٹکے سینہ تانے رہتا ہے یہاں تک کہ گولی اس کے سینہ سے پار ہو جاتی ہے۔ ایک آہ ضرور سنائی دیتی ہے۔ کچھ بچے بلکتے ہیں۔ کوئی نو عمر بیوی زار قطار روتی ہے اور مقتول کا جسم نہایت عقلمندانہ اور بے رحمانہ طریقہ سے زاغ و زغن کی سپرد کر دیا جاتا ہے۔ غریب اور امیر جاہل دونوں ہیں۔ نکتہ شناس نظر بغیر امتیاز قوم و نسل غربت و امارت معدودے چند کو حاصل ہے۔ فرق یہ ہے کہ ایک خوش پوش خوش نوش اور خوش فکر جاہل دوسرا غربت کا ستایا ظلم کا نشانہ، تشدد کے دشوار گزار راستوں سے گذرا ہوا فاقے پر فاقے کئے، ڈالے بیوی بچوں کو محنت مزدوری یا کبھی کبھی کوئی جرم کر کے پالنے والا ہاں ایک

محبت بھرا باپ" اور ایک محبوب خاوند جس طرح غریب کو اس بات کا احساس بھی نہیں ہوتا کہ ریل گاڑی کے فرسٹ کلاس بیٹھنے والوں کا ہر شمپین (Champaigne) کا گلاس اس کے دل سے کھینچا ہوا خون ہے جب وہ مئی کی تپتی ہوئی دھوپ میں اپنی بیل گاڑی میں اناج فروخت کرنے شہر کی طرف جا رہا تھا۔ یا عالیشان ڈرائنگ روم میں ہوا دینے والا برقی پنکھا اس کی بیوی کی سرد آہوں سے چل رہا ہے جو زمیندار کے تشدد نے اس کے سینہ میں بھر دی تھیں۔ بالکل اسی طرح امارت کے نشہ میں آدمی کو یہ احساس جاتا رہتا ہے کہ افلاس، مصیبت، گندگی، بیرحمی، گناہ یعنی سماج کی وہ ناگفتہ بہ حالت جس نے انسان سے اس کی انسانیت چھین لی، صرف اس کی تہذیب، تعلیم، ہنرمندی، فلسفیانہ نظریات اور ضروری تفریحات کی زائیدہ ہے۔

جرم کے معنی کیا ہیں؟ دیکھو بغیر کسی قانونی کتاب کے دیکھے ہوئے ہر عقلمند شخص اسی نتیجہ پر پہنچیگا کہ جرم سے مراد کسی شخص کو ناجائز طریقہ پر تکلیف دینا۔ دنیا کے جرائم کا اندازہ دنیا کے رونے بلکنے چلانے چیخنے سے لگایا جا سکتا ہے جس طرح ایک زمین کی زرخیزی کا اندازہ اس کی کاشت سے۔ آج دنیا پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خاکی سیارہ ظلم کی گھٹاؤں سے تاریک ہو رہا ہے۔ مغرب میں انسانیت کو ذبح کیا جا رہا ہے تو مشرق میں اس کا گلا گھونٹا گیا۔ مگر یہ سب جرائم ہیں۔ اور بتاؤ تو ان کا ذمہ دار کون ہے؟ اچھا سنو۔ اس تشدد کا ذمہ دار خود انصاف ہے۔ وہ انصاف جو دنیا کے معاملات کو سلجھانے کے لئے ایک ناخن عقدہ کشا نہیں رکھتا بلکہ ایک منصف بندر کی طرح برابر دونوں پلّوں کو ہلکا کرتا جاتا ہے اور اپنا پیٹ بھرتا ہے یہ ہے انصاف جس نے ظلم اور تشدد کو اس قدر آسان بنا دیا۔

زندگی ایک مبہم کوشش کا نام ہے۔ جو ایک سمجھ میں نہ آنیوالی شے کی تلاش میں انسان کو مختلف راستوں میں سے، اونچے نیچے، روشن تاریک سبھی مقامات سے گذارتی ہوئی الجھنوں میں مبتلا کر کے نکالتی ہوئی چلی جاتی ہے۔ ہاں اس کی ابدی زندگی کی پہلی منزل قبر تک۔ انہیں زبردست الجھنوں میں سے ایک الجھن ہمارا انصاف ہے۔

دنیا کی موٹی نظر تو دیکھو۔ بیس سال کی بندھنوں کو توڑ دینے والے ظالم شخص کو محبت کی جلتی ہوئی آگ میں تڑپتا چھوڑ جانے والے انسان کو جانور کو خود غرض بے رحم اور سفاک انسان کو، اس کو جس نے ایک زندگی کی آرزوؤں کو خواہشات اور امیدوں کو (اور انہیں سب کا نام زندگی ہے) کس بے رحمی کے ساتھ مولی کے پتوں کی طرح پاؤں تلے روند ڈالا۔ اس کو جس نے ایک معصوم اور بشاش لڑکی کو غم روحانی تکلیف اور زندہ موت کے گہرے اندھیرے غار میں دھکیل دیا۔ ایسے شخص کو بقول تمہارے دنیا جی بھر کر لعنت بھی نہ کریگی۔ انصاف تو درکنار۔ ہمارا انصاف کس قدر لاغر ہے کس قدر کمزور اور کتنا کم نظر کہ صرف جسمانی تکالیف کو تکالیف سمجھتا ہے۔ اور پھر روحانی تکالیف کو پس پشت ڈال دیتا ہے جسم کو اذیت پہنچانے سے بھی تو روح کو ہی تکلیف ہوتی ہے۔ انصاف نے پھر روحانی جرائم پیشہ لوگوں کو بے جنگل میں کیوں نہ دیدیا۔

آہ کتنی جاہل اور ظالم ہے دنیا!

خوشی اور حیا کی عزکر و تو تہذیب کی سب سے آخری سیڑھی یہی ہیں۔ اور یہی دونوں چیزیں آج دنیا میں مفقود۔ شاید کسی روشن مستقبل میں یہ چیزیں رونما ہو جائیں اس تاریک موجودہ کے بعد۔ مگر اب تو یقیناً ہم ترقی معکوس اور تہذیب جہالت کا شکار ہیں۔ اس دنیا میں نہ جسمانی خوشی نظر آتی ہے نہ روحانی۔ نہ جسمانی حیا کی ہے اور نہ روحانی۔ اس سے بہتر تو آدم کے بعد کی بے انتہا آدم کی نسلیں تھیں جنہیں یہ دونوں آزادیاں حاصل تھیں۔ اگر ہم انسانی عقل کی ترقی میں یقین کرنا چھوڑ دیں اگر ہم کسی بہتر مستقبل کی امید میں غلط سمجھنے لگیں یا یوں کہو کہ اگر ہم یہ کہنے لگیں کہ زندگی تنازع للبقا کا نام ہے جس کا فرمان یہ ہے کہ ایک کی تکلیف ضروری ہے دوسرے کی زندگی اور راحت کے لئے۔ پودے اور اناج سے ہماری زندگی، ہم سے کیڑوں کی، ان سے زمین کی، اس سے پھر پودوں اور اناج کی اگر یہ ایک امر مسلمہ ہے (اور جیسا کہ ہے) تو پھر یہ تہذیب کے ڈھونگ کیا؟ پھر یہ نظام اور تنظیم کیا معنی رکھتے ہیں؟ اور پھر یہ دنیا پر تہذیب کا خواب دکھا کر کیسا ظلم و تشدد۔ ہم کیوں نہ قطعی نیچرل ہو جائیں۔ اگر ہماری تہذیب کی کارفرمائی صرف یہاں تک ہے کہ وہ ہمارے انسانی حقوق یعنی خوشی اور حیا کی اور آزادی کو بھی سلب کرے کسی بہتر مستقبل کی ساخت کے لیے جس کے متعلق اسے معلوم ہے کہ قدرت کا فرمان اٹل ہے۔ ایک کو دوسرے کی راحت کے لئے ضرور تکلیف پہنچیگی۔ اور ہمیشہ ہمیشہ "The fittest will survive" پر فطرت کار بند رہیگی۔ تو ہم کیوں نہ اپنے انسانی حقوق واپس مانگ لیں۔ اور Rousseau کے Noble savage بن جائیں۔

پیاری سنے نواز! جذبات کی رَو میں کہاں سے کہاں نکل جاتا ہوں۔ کتنا بہک جاتا ہوں۔ اپنے متعلق کہہ رہا تھا کہ بعض اوقات خود کو ایک بیکار ہستی سمجھنے لگتا ہوں۔ بالکل بیکار اور کبھی دنیا کی ہر کوشش، تہذیب کی ہر منیک، اور ترقی کی ہر سعی، یہانتک کہ انسانی زندگی ہی مجھے بیکار نظر آنے لگتی ہے۔ کبھی میں یہ سوچتا ہوں کہ میں غلطی پر ہوں اور کبھی دنیا کو غلط راستہ پر گامزن دیکھتا ہوں میں اکثر انہیں الجھنوں میں مبتلا رہتا ہوں۔ اور اسی لئے اکثر بہت اداس اور پھر خوش بھی۔ پتہ نہیں کیوں مجھے دنیا کی کوئی چیز نہیں بھاتی لیکن مجھے اپنے تخیل کی دنیا میں زندگی محسوس ہوتی ہے۔ تم شاید مجھے بہت برا سمجھو۔ جب میں یہ کہوں کہ مجھے بہت برا سمجھو جب میں یہ کہوں کہ مجھے اپنے ماں باپ بھائی بہنوں، عزیز و اقارب، دوست احباب اور بہ استثنائے چند آپ کے پاس رہکر مجھے کوئی روحانی خوشی حاصل نہیں ہوتی۔ کیوں؟ اس لئے کہ وہ دنیا دار ہیں۔ یا یوں کہو کہ دنیا نے انہیں جکڑ لیا ہے اور ان کی کمزوری ان کے ساتھ تھی۔ مجھے ہر وقت یہ خیال ہوتا ہے کہ ان لوگوں کا self consciousness کچلا جا چکا ہے۔ اور پھر بھی یہ سب خوش ہیں۔ کیوں؟ انہیں اپنی اس زندگی پر قناعت کیوں ہے؟ یہ آزادی کے خواہاں کیوں نہیں۔ انہیں دنیا والوں کے مصائب کا اتنا احساس کیوں نہیں۔ ان کی اس کمزوری پر مجھے ہر وقت دکھ ہوتا رہتا ہے۔ سوچو تو کہ جو شخص اس نظر سے کسی کو دیکھ رہا ہو۔ اسے صحبت احباب و اعزا سے کیا لطف حاصل ہو سکتا ہے؟ میں یہ سوچتا ہوں۔ اور ہر وقت کہ یہ اتنی گندی دنیا میں کیونکر آسودہ و مطمئن ہیں۔ اور اگر ہیں تو یہ ان کی کم نظری، ہمت کی پستی اور کمزوری۔ بس پھر مجھے ان کی اس کمزوری کا اتنا احساس ہوتا ہے کہ اپنے تنہائی کے گوشہ کی طرف بھاگتا ہوں جہاں دنیا کو تخیل کے حسین سے حسین رنگوں سے رنگ کر اسے مختلف پھولوں کی خوشبوؤں سے معطر کر کے اور پاکیزگی کے سمندر میں نہلا کر اردگرد بسا لیتا ہوں۔

بس سن لیا؟ یہ ہیں ہم اور یہ مختصر سی ہماری کہانی جو آج ہم اپنی ہی زبانی سناتے ہیں۔ شاید کل کوئی دوسرا اس کو اندھیاری راتوں میں بچوں کو سلانے کے لئے یا دوجا کو رلانے کے لئے اپنی زبانی سنائیگا۔ زندگی کس قدر تھوڑی ہے پھر بھی ہم کتنی غفلت سے اسے ضائع کر رہے ہیں کتنی تکلیف ہیں اور یہ کیوں؟ یہ سب ہماری کمزوری ․․․․ پیاری نواز! تم میری ہمخیال ہو۔ ہو نا؟ یا دو تو دنیا کے مصائب میں میری دستگیر بھی کیوں؟ بولو نے نواز! میں ایک افسانوی دنیا کا باشندہ ہوں۔ ایک ایسی دنیا کا جو پاک ہے اور رنگین اور محبت سے لبریز۔ بس اسی کی معطر فضا میں سانس لیتا ہوں جب تلخ حقیقتیں مجھے اس دنیا سے باہر لے آتی ہیں تو میں ایک مجبور و لاچار بچے کی طرح ایڑیاں رگڑتا ہوں۔ اور روتا ہوں میں ایک ایسی دنیا میں ہمیشہ رہنا چاہتا ہوں۔ جہاں امن ہو اور خدا کا رحم۔ جہاں انسان کے جذبات کا احترام سونے چاندی اور جواہر سے زیادہ کیا جاتا ہو۔ میں خود اپنے جذبات کا احترام کرتا ہوں۔ اور دوسروں کے جذبات کا اس سے زیادہ ․․․․ مجھے محبت چاہئے اور معصومیت۔ اور اسے میں ایک حسین مجسمہ کہتا ہوں بعض اوقات اس حسن کو کسی پھول میں دیکھتا ہوں۔ اور اپنے آپ کو بالکل بھول کر تخیل کی نامحدود دنیا میں کھو جاتا ہوں یا خیالات کے سمندر میں ڈوبا چلا جاتا ہوں کبھی اس حسن کو میں آسمان سے ٹپکتے ہوئے قطروں میں دیکھکر بے اختیار خیالات کے سیلاب میں بہہ جاتا ہوں کبھی شفق کی رنگینی میں مجھے اپنے آئیڈیل (Ideal) کی جھلک نظر آتی ہے کبھی چاندنی میں نہاتی ہوئی نہر میں۔ مگر جب میں کہیں دور کسی بانسری کو بجتے ہوئے سنتا ہوں۔ تو میرا دل نامعلوم مسرت سے لبریز ہو جاتا ہے۔ اور میں کچھ دیر کے لئے مبہوت ہو جاتا ہوں میرے دل سے بے اختیار آہ نکل جاتی ہے۔ مگر اس میں عنبر کی خوشبو ہوتی ہے شاید میرا آئیڈیل میرے سامنے آ جاتا ہے۔ میں ایک پجاری ہوتا ہوں ایک بڑے معبد میں۔ اپنے آئیڈیل کے قدموں میں عنبر اور لوبان جلاتا ہوں۔ فضا مہک جاتی ہے اس سکوت کو پھر بانسری کا ایک دلگداز نغمہ توڑتا ہے اور میں بے اختیار چلا اٹھتا ہوں۔ "میری نے نواز! ․․․․ کیا مجھے میرا آئیڈیل مل گیا ہے؟ جس آئیڈیل کی پرستش میرا دل کرتا ہے۔ بولو تمہیں بھی تو کچھ بتانا چاہئے۔

دنیا میں ہر شخص ایک حسین کی تلاش میں ہے۔ کائنات کا ذرہ ذرہ بھٹک رہا ہے کسی کی تلاش میں کسی محبوب کی تلاش میں ہم بھی انہیں ذروں میں سے ہیں۔ زندگی کتنی تھوڑی سی ہے اور جستجو کتنی بڑی شے کی حسن دنیا میں بہت کم ملتا ہے۔ بلکہ یوں کہو کہ حسن تو کہیں بھی نہیں ملتا۔ اس کی جھلک اور اس کا پرتو ضرور دنیا کو چمکا رہا ہے۔ مجھے میرا حسن مل گیا۔ کیوں؟

ہوسٹل کے اندر ایک باغ ہے۔ ایک چھوٹا سا چمن اس میں بیچوں بیچ لال اینٹوں کا قریب دو فٹ اونچا اور آٹھ گز کا ایک مربع چبوترہ ہے۔ اس پر مغرب کی نماز پڑھتے ہیں۔ اور کبھی کبھی صبح کی بھی۔ اس کے چاروں کونوں پر چھوٹی چھوٹی گھاس میں تدم جمائے چار شمشاد کھڑے ہیں۔ اس چھوٹے سے سبز قطعہ زمین کو رنگین اور خوشبودار پھولوں کے پودوں کی حسین قطاروں سے ایک گھیرا بن جاتا ہے جس کی نوک ہوسٹل کے دروازہ کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ مجھے یہ چھوٹا سا خوشنما اور خاموش چمن بیحد پسند ہے نہ جانے کتنی راتیں کتنی چاندنی سے دھلی ہوئی پرکیف راتیں ․․․․ سکوت آور روائے نور میں لپٹی ہوئی راتیں" ․․․․ جانے کتنی سردیوں کی اداس راتیں سانس لیتے ہوئے پھول پتوں کے بیچ اس چبوترے پر بیٹھکر کبھی لیٹ کر اور کبھی اس کے چاروں طرف ٹہل ٹہل کر گذاری ہیں۔ ہاں تم مجھے پاگل کہو گی۔ یقین جانو کچھ تو صبح تک بیٹھے بیٹھے گذار دی ہیں۔ اس سال کے شروع میں بھی دو تین مہینے تک یہی رہا۔ مگر بعد میں کچھ زندگی کو Regular بنا لیا تھا۔ وقت پر سونے لگے تھے کچھ منتشر خیالات کو یہیں جمع کر کے لکھ بھی لیا کرتے تھے۔ زندگی کے کچھ جانکاہ واقعات یا پریشان دماغ کی پریشان تصویریں بس سب یہیں ہوتا ہے۔ یہ دنیا کچھ میری تخیل کی دنیا جیسی معلوم ہوتی ہے میں یہاں کا بس ایک باشندہ نظر آتا ہوں۔ یہاں کوئی راہی تک نظر نہیں آتا۔ کتنی اچھی دنیا ہے یہ جس وقت طبیعت اداس ہوتی ہے میں اس میں ٹہلنے لگتا ہوں خیالات میں ڈوبا ہوا اور نہ جانے کہاں کہاں پہنچ جاتا ہوں۔ اب بھی میرا یہی معمول ہے مگر زیادہ وقت ضائع نہیں کرتا بس یوں سمجھو کہ اپنے کمرہ سے دس قدم باہر نکلکر میں شاید کسی آسمانی دنیا میں اڑنے لگتا ہوں۔ ایک آزاد لیکن بے آزار پرند کی طرح پیاری نے نواز! میں کسی ایسی ہی دلکش دنیا کی تلاش میں ہوں۔ میں اس چمن میں آ کر دنیا کی گندگیوں کو بھلا کر محبت اور پاکیزگی کے جھولے جھولا کرتا ہوں۔ یہاں تک کہ خود کو بھی بھول جاتا ہوں۔ مگر کسی کی یاد میں گم ہو کر کسی ایسی ہی دلکش دنیا کی جستجو میں اپنے آپ کو کھو کر ․․․․ کیا مجھے ایسی دنیا مل جائیگی؟ بھلا کیسی؟ میرے خیالات قابل تحسین نہ سہی لیکن ان کی حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے کہ میں ایسا ہی محسوس کرتا ہوں۔ یہ دانشمندی پر مبنی ہیں یا نادانی پر میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں۔ ہاں یہ ضرور جانتا ہوں کہ میں نہ اپنی تخلیق کا ذمہ دار تھا اور نہ اپنی تخریب و تعمیر کا۔ انسان کی عقل ضرور اسے راستہ دکھاتی ہے مگر قدرت کے انتظامات نیچر کی باریکیوں کو ہم نہیں سمجھ سکتے ہماری عقل خود ماحول کی پابند ہے اور اس سے رنگی جاتی ہے۔ ہاں تو میں جو کچھ ہوں اس کا صرف تھوڑے درجہ تک خود ذمہ دار ہوں باقی میں وہ ہوں جو مجھے ماحول نے بنا دیا۔ اب تو میری خواہشات میری تمنائیں اور میری آرزوئیں بھی ماحول سے علیحدہ نہ دیکھی جا سکتی ہیں اور نہ سمجھی جا سکتی ہیں میں کچھ ایسی فضا میں پلا کہ دنیا کی آلودگی سے نفرت اور فطرت کی پاکیزگی اور انسانی پاک جذبات کی محبت میرے دل میں کوٹ کوٹ کر بھر دی گئی ہے۔ اب اگر میں ایک ایسی دنیا چاہتا ہوں جس میں سکون ہو اور معصومیت خوش ہو اور رحم، محبت اور آزادی ایک ایسی بستی جہاں کوئی پاپی نہ ہو۔ جہاں محبت کا کنول دل کے چشمہ پر پوری پوری کھل جائے جہاں ہمدردی اور ایثار کالے بادلوں کی شکل ہرے بھرے کوہ کے دامن پر چھا چھا جائیں۔ جہاں بس ایک مغنی ہو آئیڈیل پرست اور ایک آئیڈیل نے نواز! اور بس۔ تو اس کا میں تصور وار نہیں میں اسی کو اپنی زندگی کی تمام منزلوں میں اپنے دل میں چھپا ہوا دیکھتا ہوں بس یہی ایک خواہش ہے جو ہمیشہ سے چلی آ رہی ہے گو لوگ نادان کہینگے سمجھائینگے کہ ایسی دنیا کہاں مل سکتی ہے یہ تو ایک خیال ہی خیال ہے مگر میں انہیں بتا دونگا کہ دل کی خود ایک اپنی دنیا ہے جو کسی سے بھی کہیں نہیں چھینی جا سکتی مغنی کے ترانے اور نے نواز کے نغمے دنیا کی گندگی اور ناساز فضا سے بہت اوپر ان کے لئے ایک پاکیزہ دنیا بسا سکتے ہیں جہاں وہ اپنی محبت کے دوش پر سرا معصومیت کا جاہک لئے چاندنی راتوں میں اندھیاری راتوں میں غمگین شاموں میں خوشگوار صبحوں میں غرضیکہ زندگی کے ہر لمحہ میں اس دنیا کو بسا یا کریں۔ سینے کی چٹکتی ہوئی کلیاں ہی شاید انہیں زمین کی طرف دیکھنے پر مجبور کر سکیں دیکھو کتنا بہت سا لکھ دیا بس لکھتے ہی چلے گئے۔ پڑھکر پریشان تو نہیں ہو گئیں۔ اچھا سر میں درد ہو رہا ہے خدا حافظ۔

تمہارا مغنی

علامہ سیماب اکبر آبادی

اُجالابندی

فطرت کی روشنی میں

کل حکم اندھیرا کرنے کا آغاز شب میں آیا تھا
تعمیل میں اس کی ہر جانب گھنگھور اندھیرا چھایا تھا

مہتابی سے دیکھا میں نے تا دُور سماں تاریکی کا
چھایا ہوا سارے شہر پہ تھا گہرا سا دھواں تاریکی کا

نظروں میں مری آغازِ تخلیقِ عالم کا منظر تھا
جب ذکرِ چراغ و شمع نہ تھا جب آئینہ بے جوہر تھا

وہ حالت تھی جیسے کہ تمدن دنیا میں آیا ہی نہیں
ذہن اور شعورِ انساں کو قدرت نے چمکایا ہی نہیں

روشن تھیں گھروں میں کچھ شمعیں مستور حجابِ تاریکی
جیسے انسانِ اوّل کی قوت پہ نقابِ تاریکی

ایوانوں کو ہیبت آگیں تاریکی نے یوں گھیرا تھا
اندر کمزور اُجالا تھا اور باہر سخت اندھیرا تھا

مہتاب تجلی ریز ہوا ناگاہ اُفق کے کونے سے
جس طرح اندھیرے میں پھوٹیں رنگین شعاعیں سونے سے

ہر سمت اجالے پھیل گئے ساری ظلمت کافور ہوئی
سمٹے رفتہ رفتہ سائے، بزمِ عالم پر نور ہوئی

نزہت پھیلی ہر رخسارِ عنابی و سیمابی پر
ہونٹوں پہ تبسم کھل اُٹھا جب چھوٹ پڑی مہتابی پر

مہتاب کی زریں کرنوں کو انسان کبھی سنوار نہ سکا
فطرت کے اس "بجلی گھر" پر قابو کوئی بھی پا نہ سکا

خلقت کے نوشتے گوناگوں، قدرت کا مضمون ایک ہی ہے
دستور ہیں لاکھوں دنیا کے، فطرت کا قانون ایک ہی ہے

چاند اور سورج کی قندیلیں دن رات فروزاں رہتی ہیں
دنیا کی فضائیں دونوں سے ہر وقت درخشاں رہتی ہیں

انسانِ کمالِ حکمت سے مختار بنا ہے دنیا کا
ہستی کے عناصر پر اس کا ہرچند کہ ہے پورا قبضا

آگ اور ہوا پانی مٹی، سب پہ ہے حکومت انساں کی
پھر بھی انساں کو لاحق ہے مجبوری محکومیت کی

انساں کی مصنوعی شمعیں جب راتوں کو بجھ جاتی ہیں،
فطرت کی فطری روشنیاں، اپنی کرنیں پھیلاتی ہیں،

دُنیا کے محافظ ہاتھ، سہارا اگر نہ لگا دیں دُنیا میں
مختاریت کے دیوانے اندھیر مچا دیں دنیا میں

پابندِ نظامِ فطرت کا اعلان خودی معیوب ہی ہے
غالب کتنا ہی ہو جائے پھر بھی انساں مغلوب ہی ہے

کل چاند کی آزادی سے، کرن عرفاں کی دل میں پھوٹی ہے
مجبوری ہے اصلِ انساں اور مختاریت جھوٹی ہے

فطرت جب اپنی قوت کے انوار دوبالا کر دے گی
کیسا ہی اندھیرا ہو جائے دنیا میں اجالا کر دے گی

علّامہ ظریف

ہمارے ایک محترم دوست

(ایک تصویر بناتے ہیں بنے یا نہ بنے)

صاحب تصویر کا نام نہ بتائیں گے۔ آپ اصرار نہ کریں ہم طے کر چکے ہیں کہ نام نہ بتائیں گے بس کہہ جو دیا کہ نام نہ بتائیں گے کسی صورت نہ بتائیں۔ دیکھیے ڈاکٹر مدان ہم آپ کی دس باتوں میں سے نو مان لیا کرتے ہیں۔ نام بتانے کی بات دسویں بات ہے اسے نہ بتائیں گے۔ آپ ہمارے دوست ہیں بجا اور درست بڑے لائق بڑے فائق بالکل صحیح بڑے خطیب بڑے ذہین ہم مانتے ہیں۔ جانتے ہیں لیکن آپکے سر کی قسم اس سب کچھ کے بعد بھی نام سے متعلق کچھ بھی نہ بتائیں گے۔

ہاں اپنے ان محترم کے کام بتائیں گے صفحہ قرطاس پر ان کی تصویر بھی کھینچکر دکھائیں گے۔ مگر نام ؛ خاطر جمع رکھیے نام نہ بتائیں گے۔

یہ خیال نہ کیجئے۔ کہ ان کا کوئی نام ہی نہیں نہیں نہیں وہ بے نام نہیں ہیں۔ گمنام نہیں ہیں۔ خدا نہ کرے بدنام بھی نہیں ہیں۔ مگر آخری کہے دیتے ہیں۔ کہ ہم سے نام پوچھیے ہم ان کا نام نہیں بتائیں گے۔ ہاں آپ ان کی زیارت کرنا چاہیں۔ تو البتہ یہ مطالبہ قابل احترام ہے لیجئے پھر ہم ان کی منفی و مثبت صفات سے ایک تصویر بناتے ہیں۔ آپ پہچانئے ممکن ہے انہیں آپ نے کہیں دیکھا ہو۔ یا دیکھتے رہتے ہوں اچھا پہلے ان کی منفی صفات پڑھ لیجئے یعنی وہ خوبیاں جو ان میں تھیں انہیں معلوم کر کے ان کا پتہ لگائیے۔

دیکھئے ہمارے وہ محترم دوست فرشتہ نہیں دیوتا نہیں خدا نہیں ناخدا بھی نہیں۔ اگرچہ زندگی تلخ تجربات نے ان کی چار آنکھیں کر دی ہیں مگر یہ داستان روزمرہ اور محاورے تک ہی محدود ہے۔ دراصل ان کی چار آنکھیں نہیں وہ چار ہاتھ پاؤں سے چلنے کے بھی عادی نہیں۔ وہ پر پرواز بھی نہیں رکھتے سارا چڑیا گھر دیکھ آئیے۔ کوئی پرندہ بھی ان کے نام کا کسی پنجرے میں نظر نہ آئیگا۔ پانی کی تہ میں رہنا بھی انہیں سازگار نہیں۔ اس کا یہ مطلب نہ نکالا جائے۔ کہ وہ مگر مچھوں کی صورت کناروں پر لیٹتے رہتے ہیں۔ آپ سارے باغوں میں گھوم پھر لیجئے۔ ان کا رنگ و بو کسی پھول میں نہ پائیں گے۔ دنیا کی ہر کان میں اسے تلاش کر آئیے۔ کوئی دھات ان کا جواب نہ پیش کر سکیگی۔

موہنجوڈارو میں سب کچھ نکلا۔ وہ نہ نکلے ہڑپا سے ہر چیز برآمد ہوئی۔ وہ برآمد نہ ہوئے۔ وہ بات کرنے میں بالکل نہیں تتلاتے بات کا جواب دیتے ہوئے جواب پر غور کرنے کے لئے کھانستے بھی نہیں۔ کوئی تقدیر کا مارا خود پھنس جائے تو دوسری بات ہے وہ جان بوجھکر اپنے جال میں کسی کو پھانستے بھی نہیں۔ کوئی فرق پڑے یا نہ پڑے مگر انہوں نے کبھی پتلون کی جگہ قمیض نہیں پہنی

وہ عموماً دو رنگ کی جرابیں بھی نہیں پہنا کرتے۔ وہ ہمیشہ کرسی کے اوپر بیٹھا کرتے ہیں کبھی کسی نے انہیں کرسی کے نیچے بیٹھا نہیں دیکھا۔ تانگے میں اکثر سلیٹ پر بیٹھتے ہیں۔ جتے ہوئے گھوڑے کی کمر پر بیٹھے انہیں ہم نے تو دیکھا نہیں۔ ریل میں کبھی سفر کرتے ہیں تو عام طور پر ٹکٹ لے کر سفر کرتے ہیں۔

عدالتوں کا ریکارڈ اس کا گواہ ہے۔ برہمچریہ کا سر ور ان کی آنکھوں سے کبھی زائل نہیں ہوا لالنس گارڈن کی سیر میں حواس خمسہ کو گیٹ کے سپرد کبھی نہیں کرتے ساتھ رکھتے ہیں بیساکھی کے میلے پر راوی میں نہاتے ہوئے وہ ایک بار بھی نہیں ڈوبے۔ وہ عزیز و اقارب کو آخری منزل پر پہنچانے "شمشان بھومی" اکثر جایا کرتے ہیں لیکن اس حادثے کا کوئی چشم دید گواہ ہمیں نہیں ملا۔ جو سینہ پر ہاتھ رکھکر کہہ سکے۔ کہ ان کے احباب کبھی ان کے باڈی کو بھی وہاں لیجاتے دیکھے گئے ہیں۔ ریس کورٹ میں گھوڑوں کے ساتھ دوڑنے کو وہ بھی پسند نہیں کرتے۔ وہ راہ چلتے لاری سے ٹکر لینے کے حق میں بھی نہیں جیسے گریجوایٹ ہوئے ہیں انہوں نے کبھی پتنگ نہیں اڑایا اڑاتے ہیں تو پیچ نہیں لڑاتے پیچ لڑاتے ہیں۔ تو گڈی نہیں کٹواتے۔ ڈور ضرور لوٹا کرتے ہیں۔ پتنگ نہیں لوٹتے۔ وہ ہندوؤں کو دونوں آنکھوں سے نہیں دیکھتے سکھوں کو ایک آنکھ سے نہیں دیکھتے مسلمانوں کو دیکھنے کے لئے ان کے پاس سر کے سے آنکھیں ہی نہیں۔ ان کی منفی صفات سے آپنے کچھ نہ کچھ پتہ لگا لیا ہوگا کہ ہمارے محترم وہ کون بزرگ ہیں اگر اب بھی ان کے متے پتے کی ضرورت ہے۔ تو پھر اس تصویر میں رنگ بھرنے کے لئے مثبت صفات بیان کئے دیتے ہیں۔ اب آپ انہیں ضرور پہچان لینگے۔ پھر ملاحظہ ہو ان کا حلیہ۔

سر پر بال رکھتے ہیں مگر کچھ خود رو انداز کا ہے یعنی کچھ تراش خراش چاہتا ہے۔ اتھا جیو باشنا لا حجام فطرت کا تختہ مشق ہے۔ رنگ گورا ہوتا تو چہرے مہرے سے نیپالی سمجھے جاتے۔ مگر سرخ ہے اور رنگ کی سرخی میں کچھ ہیجانی قسم کی رعونت بھی جھلکتی ہے سر اور دھڑ میں جوش اختلاط دیکھکر گردن نے بیچ میں حائل ہونا تہذیب کے خلاف سمجھا۔ اس لئے کھسک گئی۔ یوں گردن نام کی ایک چیز سر اور دھڑ میں ربط قائم کئے ہوئے ضرور ہے لمبی اور اونچی ناک دونوں کانوں کا توازن قائم کئے ہوئے ہے چوڑے چوڑے کان دیکھکر شبہ ہوتا ہے کہ پچھلے جنم میں مہاراجہ اشوک کی عماری انہیں کی پشت پر سجائی جاتی ہوگی ضابطے کی خانہ پری کرنے کی خاطر عموماً خستہ بھی رہتے ہیں۔ اور ایمانداری کی بات یہ ہے کہ جب ہنستے ہیں تو خلوص دل سے

ہنستے ہیں مگر خدا جانے جذبات کے کسی کھیل میں ہار جانے کا اثر آج تک ان کی ہنسی کو بے کیف کیوں بنائے ہوئے ہے؟ اپنی آنکھوں میں ایک گہری قسم کا ذوق تلاش رکھتے ہیں۔ کہ نظر کی ہر کرن جہاں پڑتی ہے۔

کیوں، کب، اور کہاں؟

کے سوالات بناتی چلی جاتی ہے۔ ہر وقت کچھ کھوئے کھوئے سے رہتے ہیں۔ کیا کھویا؟ کیوں کھویا؟ کب کھویا؟ یہ تو وہی جانیں یا ان کا خدا۔ مگر کچھ نہ کچھ کھویا ضرور ہے۔ اس لئے آٹھ پہر حاضر غائب۔ رنگین ماضی کی ریسرچ میں لگے رہتے ہیں۔ وہ خیالات میں سو فیصدی ہندو۔ جذبات میں پچپن فی صدی مسلمان اور خدا نہ کرے کبھی غصہ آ جائے تو روپے میں سوا آنے ست سری اکال بن جاتے ہیں۔ اپنی بیماری کے تو نہیں البتہ اپنے مضمون کے ماہر خصوصی ہیں یعنی ڈاکٹر کہلاتے ہوئے بھی بیمار ہیں۔

بڑے شریف، بڑے ظریف کسی کے حریف نہیں۔ ہاں اپنی ذات کے سوا سب کے حلیف ہیں۔ ہاتف غیب پر الہامی شاعری کا جذبہ کبھی طاری ہوا تھا۔ کہ اس نے ان کی صورت میں ایک اچھوتا مصرعہ کہہ ڈالا۔ اب یہ اس مصرعہ کو مطلع بنانا چاہتے ہیں۔ اور دوسرا مصرعہ بھی نکل گیا۔ تو پھر یہ مطلع مطلع آفتاب پر چشمک زنی کرے گا۔

ایک آواز ۔ واہ علامہ صاحب! کیا خوب تصویر کھینچی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ مصور کے ہاتھ چوم لیجئے۔

مصور ۔ کون ڈاکٹر ندان۔ آپ نے تصویر پسند کر لی۔ ہماری محنت وصول۔ لیجئے یہ ہدیہ "محنت نظر" قبول کیجئے۔ اور مصور کے ہاتھوں کی بجائے تصویر ہی چومتے رہئے۔

قوتِ ملّت (ایمرسن)

جہاں میں سیم و زر سے قوم عزت پا نہیں سکتی
بجز مردانِ عزت مند قوت پا نہیں سکتی

ضرورت ان کی ہے جو بے خطر میداں میں آتے ہیں
نہ ان کی جو کہ وقتِ رزم ڈر کر بھاگ جاتے ہیں

یہی بیدار دل ہیں راستی پر سر کٹاتے ہیں
سراپا استقامت ہیں اگرچہ رنج اٹھاتے ہیں

ستونِ قوم کی تکمیل یہ افراد کرتے ہیں
وطن کے حکم کی تعمیل یہ افراد کرتے ہیں

مترجمہ فیروز سیالکوٹی

غزل

زیر لحد ملال و الم کا نشاں نہیں
شاید یہ وہ زمیں ہے جہاں آسماں نہیں

آتا ہو مانگنا تو مرادیں کہاں نہیں
اُن کا کرم جواں ہے تمنا جواں نہیں

میری قفس کی زیست تغیر سے پاک ہے
یعنی یہ وہ بہار ہے جس کو خزاں نہیں

کہہ دوں گا میں نظر سے تباہی کا ماجرا
مخصوص عرضِ حال کی کوئی زباں نہیں

سجدے کروں نہ اپنی ہی ہمت کے پاؤں پر
اونچا اس آستاں سے کوئی آستاں نہیں

پردہ میں یوں وہ بیٹھے ہیں موسیٰ کے غش کے بعد
گویا جہان میں کوئی نظر اب جواں نہیں

راہِ طلب میں ڈھونڈنے والے بہک چلے
اے پردہ پوش بول کہاں ہے کہاں نہیں

ان کی نگاہ چھا گئی سارے جہان پر
اب بجلیوں سے آبر کہیں بھی اماں نہیں

حضرت آبر احسنی گنوری

مترجمہ دھرم پال گپتا ایم اے
پروفیسر فرانسیسی ادب گورنمنٹ کالج لاہور)

سیویل نگر کا نائی

(فرانسیسی زبان میں چار ایکٹ کا ایک مشہور ڈرامہ)

یہ مشہور و معروف ڈرامہ پہلی مرتبہ ۱۷۷۵ء میں پیرس میں کھیلا گیا تھا اور اس وقت بری طرح ناکام ہوا تھا لیکن اس کے مصنف نے ہمت نہ ہاری اور دو چار ہی دن میں معمولی رد و بدل کے بعد اسے دوبارہ پیش کیا۔ میڈم ڈیو ڈیفان نے اس کھیل کے متعلق لکھا ہے "کل یعنی ۲۵ تاریخ کو میں نے بومارشے کی کامیڈی کو دوسری دفعہ دیکھا۔ پہلی رات کو لوگوں نے اسے نہایت ناپسند کیا تھا اور سی سی کر کے اسے ختم کرانا چاہا لیکن کل رات اسے غیر معمولی کامیابی ہوئی۔ لوگوں نے اسے آسمان پر چڑھا دیا۔ تالیوں کے شور سے کانوں کے پردے پھٹے جاتے تھے" مصنف نے یہ ڈرامہ پہلی دفعہ چھپوایا۔ تو عنوان کے نیچے ذیل کی عبارت درج کی "یہ کھیل کامیڈی فرانسیز Comedie Francaise کے تھیٹر میں ۲۳ فروری ۱۷۷۵ء میں کھیلا گیا۔ اور قطعاً ناکام رہا" اس کے باوجود چند ہی دن میں اس ڈرامے کا ہیرو "فگارو" پبلک کو اتنا پسند آیا کہ جب اس ڈرامے کا دوسرا حصہ بنام "فگارو کی شادی" کھیلا گیا۔ تو پبلک کے جوش کی انتہا نہ رہی "ہر طبقے کی پبلک۔ شاہی خاندان کے افراد سے لیکر معمولی آدمیوں تک نے تھیٹر کے دروازوں پر ہلہ بول دیا۔ ڈچزوں اور نواب زادیوں کو اگر گیلری میں اسٹول میں بیٹھنے کو مل گیا۔ تو انہوں نے اسے اپنی خوش قسمتی سمجھا اور وہ ایکٹرسوں کے کپڑے بدلنے کے کمرہ میں اچھی سی سیٹ کی امید میں گھنٹوں کھڑی رہیں۔ دروازہ کھلنے پر تین آدمی پیروں تلے روندے گئے اور پبلک سمندر کی لہروں کی طرح موجیں مارتی تھیٹر کے اندر داخل ہوئی"

دراصل "فگارو" کا کیرکٹر فرانسیسی ادب کی ایک نہایت مشہور اور کامیاب تخلیق ہے۔ فرانس میں انقلاب آنے والا تھا۔ امراء اور وزراء کی جبہ کاری اور عشرت پرستی حد درجے پر پہنچ چکی تھی مصنف نے ایک عام اور معمولی کہانی کو لے کر اپنے شاہکار فگارو کی مدد سے اسے ایک نئی اور پر معنی شکل دی۔ امیرزادوں اور امیرزادیوں نے فگارو کے منہ سے اپنے اوپر تنقید سنی اور مزے لے لیکر سنی لیکن انہیں خیال نہ آیا کہ جس جذبے کو فگارو پیش کرتا ہے۔ وہی ایک دن ان کی تباہی کا باعث ہوگا اور انہیں فرانس کی سرزمین سے نیست و نابود کر کے چھوڑے گا۔ فرانسیسی کامیڈی کی یہ خاص خوبی ہے کہ اس میں اکثر اپنے زمانے کی برائیوں پر تنقید ہوتی ہے۔ لیکن کچھ ایسے لفظوں میں کہ بغیر غور و خوض کے اس کا سمجھنا ناممکن سا ہو جاتا ہے۔ آدمی کے سامنے اس کی اپنی غلطیوں اور کمزوریوں کا خاکہ کھینچ دیا جاتا ہے لیکن اسے اپنی کمزوری اتنی معمولی معلوم ہوتی ہے کہ اس کا دھیان کامیڈی کے گہرے بلکہ ٹریجک (tragic) معنوں کی طرف جاتا ہی نہیں۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ کچھ سمجھایا جا رہا ہے لیکن دراصل اس ہنسی کے پردے میں مصنف زار و قطار رو رہا نظر آتا ہے۔ "سیویل نگر کا نائی" میں یہ تنقید اتنی واضح نہیں جتنی "فگارو کی شادی" میں ہے۔ یا یوں کہئے کہ "سیویل نگر کا نائی" کا فگارو ابھی اتنا انقلاب پسند نہیں بنا جتنا کہ وہ "فگارو کی شادی" میں نظر آتا ہے۔ پھر بھی فگارو کا انقلابی رجحان کاونٹ سے باتیں کرتے وقت صاف واضح ہوتا ہے۔ اس ڈرامے کی ایک اور خوبی مکالمے کی چستی اور برجستگی ہے کسی زبان کے چست فقروں کا دوسری زبان میں ترجمہ کر دینا "جوئے شیر" لانے سے کم نہیں رہا آزاد ترجمہ وہ مقابلۃً کم مشکل ہوتا ہے۔ میرا یہ ترجمہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ مترجم۔

افراد

کاونٹ الماویوا	ملک ہسپانیہ کا ایک جوان سال نواب۔ روزین کا عاشق زار
بارتھالو	ڈاکٹر۔ روزین کا سرپرست
روزین۔	ایک حسین و جمیل مگر بیکس و یتیم دوشیزہ
فگارو	سیویل نگر کا نائی
ڈون بازیل	روزین کا استاد فن موسیقی میں۔
نوجوان ہوشیار۔	ڈاکٹر بارتھالو کے نوکر چاکر

وکیل ....
مجسٹریٹ ....
شمع بردار (مشعلچی) ....

پہلا ایکٹ

(سیویل نگر کا ایک بازار۔ سامنے والے گھر کے کھڑکی اور دروازے سب بند ہیں۔ کاونٹ الماویوا ایک خاکی رنگ کے بڑے سے چغے میں آپ کو چھپائے داخل ہوتا ہے پہلے بند کھڑکی کی طرف دیکھتا ہے پھر گھڑی نکال کر وقت۔ او ٹہلنے لگتا ہے]

کاؤنٹ۔ کھڑکی اب تک نہیں کھلی؟ وقت کے متعلق دھوکا تو نہیں ہوا۔ پھر بھی وقت سے پہلے آنے میں حرج ہی کیا ہے؟ یہ تو نہ ہوگا کہ آئے بھی اور جی بھر کے دیکھا بھی نہیں۔ . . . مجھے کوئی دیکھے تو یقیناً یہی کہے۔ کہ یہاں پر عجیب قسم کا عشق سوار ہے۔ مان نہ مان میں تیرا مہمان۔ محبوبہ سے جان نہ پہچان اور آتے ہیں نظر بازی کے لئے سو میل کا فاصلہ طے کر کے۔ یہ عشق ہے یا خبط! کہنے والے جو جی چاہے کہیں مجھے پروا نہیں۔ دنیا والوں کے ڈر سے اپنی حسرتوں کا خون کر دیں۔ یہ تو مجھ سے نہ ہوگا۔ جب سرمایۂ نشاط کی خود سیڈر ڈ میں بھی کوئی کمی نہیں۔ تو ایک عورت کے لئے اتنی دور آنے کی ضرورت؟ نظر بازی تو ہر جگہ ہو سکتی ہے۔ حسن اور عورت کی کہاں کمی ہے لیکن نہیں کم بخت دل کو کیونکر سمجھاؤں۔ دل ہی تو ہے جہاں لگ گیا لگ گیا۔

(نگارو کمر میں سارنگی باندھے جھومتا جھامتا ہاتھ میں کاغذ پنسل لئے شعر لکھتا چلا آرہا ہے)

فگارو۔ دل کو غم سے خالی کر دے۔ دل کو غم سے خالی کر دے۔ مے عشرت کی اس میں بھر دے۔

دل کو غم سے خالی کر دے
مے عشرت کی اس میں بھر دے

~~ لا کڑوے (کڑوا نہیں) لا میٹھے دارو کا پیالہ۔ کر دے اے ساقی متوالا اس سے تو یہ زیادہ موزون ہوگا۔

آ کر دے متوالا　　لا میٹھے دارو کا پیالہ
لا میٹھے دارو کا پیالا　　آ کر دے ساقی متوالا

~~ گر ہاتھوں میں گلاس نہیں ہے۔ پھر جینے کی آس نہیں ہے۔ پھر جینے کی آس نہیں ہے۔ گر ہاتھوں میں گلاس نہیں ہے (یہاں گلاس کا لفظ کچھ دبتا سا معلوم ہو رہا ہے۔ خوب یاد آیا مرزا غالب مرحوم نے گلاس کا لفظ کس خوبی سے باندھا ہے۔

بجائے مے دیا پانی کا اک گلاس مجھے
سمجھ لیا مرے ساقی نے بدحواس مجھے

لیکن نگارو آجکل عروض کو کون جانتا ہے۔ شعر کی لے اچھی ہونی چاہئے۔ گانے میں سب کچھ کھپ جاتا ہے۔ (شاعری میں جس چیز کی ضرورت ہے۔ وہ ہے کیف سرور۔ تڑپ۔ سوز و گداز۔ شوخی۔ مستی۔ ہاں تو شیپ کا شعر ایسا ہونا چاہئے۔ جسے سنکر لوگ تڑپ اٹھیں) (گنگناتا ہے) پھر جینے کی آس نہیں ہے۔ دلبر دل کے پاس نہیں ہے اب جینے کی پیاس نہیں ہے۔ بہت خوب یہی چیز اگر ساز کے ساتھ گائی جائے تو پھر تو مزا ہی آجائے (کاؤنٹ کو دیکھتا ہے) یہ حضرت کوئی شناسا معلوم ہوتے ہیں لیکن یہ رعب! یہ جاہ و جلال!

کاؤنٹ۔ یہ عجیب و غریب صورت!

فگارو۔ یہ تو کاؤنٹ الماویوا ہیں۔

کاؤنٹ۔ میرے خیال میں تو یہ شیطان فگارو ہے۔

فگارو۔ سرکار! یہ شیطان فگارو ہی ہے۔

کاؤنٹ۔ خاموش! خاموش

فگارو۔ میں نے آپ کو پہچان لیا حضور! کوئی نئی بات نہیں۔ آپ بندے کو ہمیشہ انھیں محبت بھرے الفاظ سے یاد فرماتے رہے ہیں۔

کاؤنٹ۔ ارے تو تو بڑا موٹا تازہ ہو گیا۔

فگارو۔ کیوں نہ ہو حضور۔ مفلسی نے کر دیا موٹا مجھے (ٹھنڈی سانس بھرتا ہے)

کاؤنٹ۔ خوب! لیکن تو یہاں کیسے؟ میں نے تو تیری سفارش کی تھی سرکاری نوکری کے لئے۔

فگارو۔ حضور! شکریہ۔ وہ نوکری مجھے مل بھی گئی تھی۔

کاؤنٹ۔ دیکھ مجھے لنڈور کہہ کر خطاب کیا کر۔ دیکھتا نہیں کہ میں بھیس بدلے کھڑا ہوں۔ کوئی پہچان نہ لے۔

فگارو۔ تو پیچھے میں جاتا ہوں۔

کاؤنٹ۔ نہیں نہیں! میں کسی کے انتظار میں ہوں۔ تیرا اس وقت پاس کھڑا رہنا ہی اچھا ہے۔ بھائی اکیلا آدمی کھڑا ہو۔ تو لوگوں کو خواہ مخواہ شک گزرتا ہے۔ ہاں! تو تیری نوکری کا کیا ہوا؟

فگارو۔ آپ کی سفارش نے بڑا کام کیا حضور! مجھے کمپاؤنڈر کی جگہ مل گئی۔

کاؤنٹ۔ کہاں فوجی شفاخانے میں؟

فگارو۔ نہیں گھوڑا ہسپتال میں۔

کاؤنٹ۔ (ہنستا ہوا) خوب!

فگارو۔ نوکری اچھی خاصی تھی۔ دواؤں کا سٹور میرے قبضہ میں تھا۔ بس دوا ہسپتال سے لی اور دام کھرے کر لئے۔

کاؤنٹ۔ پھر تو اب تک تو کئی آدمیوں کو خدا گنج پہنچا چکا ہوگا؟

فگارو۔ حضور! آخر دنیا میں ایسی کونسی دوا ہے جو سب بیماریوں کا علاج کر سکے ہمیشہ نہیں تو میری دوائیاں بھی کبھی کبھی تو فایدہ کر ہی دیتی تھیں۔

کاؤنٹ۔ نوکری کیوں چھوڑ دی تو نے؟

فگارو۔ نوکری میں نے نہیں چھوڑی حضور! بلکہ خود نوکری نے مجھے چھوڑ دیا۔ لوگوں نے جا کر چغلی کھائی۔ قسمت کی بدنصیبی کو صبا و کیا کرے۔

کاؤنٹ۔ بس بس نوازش! کیا آپ کو شاعری کا بھی کچھ ذوق ہے؟

فگارو۔ اصل میں رونا تو یہی ہے حضور! جب میری شکایت کی گئی کہ صاحب وہ تو بڑے بڑے زبردست شعر لکھتا ہے۔ اخباروں میں پہیلیاں بھیجتا ہے۔ گیت بناتا ہے تو حضور۔ یہی خوبیاں میرے حق میں زہر قاتل ثابت ہوئیں۔ بقول شخصے ع اے روشنیٔ طبع تو بر من بلا شدی۔ میری

نوکری چھن گئی۔ اور افسروں نے کہہ دیا کہ لکھنے پڑھنے کا شوق اور کام کاج کرنے کی لیاقت دو متضاد چیزیں ہیں۔ مختصر یہ کہ ؎

شعر نے مجھکو نکما کر دیا ؛ ورنہ میں بھی آدمی تھا کام کا

کاونٹ۔ باتیں تو خوب بناتا ہے۔ آخر تو نے اپیل کیوں نہیں کی؟

فگارو۔ جان بچی لاکھوں پائے حضور۔ پنجابی حضرات کے بقول افسر کے اگاڑی اور گھوڑے کے پچھاڑی ہر دو لعنت۔

کاونٹ۔ نہیں نہیں۔ مجھے یقین نہیں آتا جب تو میرے پاس تھا۔ تو کونسی شرافت کا پتلا تھا۔

فگارو۔ حضور ہم غریبوں کی ذرا سی کمزوری بھی نظر انداز نہیں کی جاتی۔ چھوٹوں کی کمزوریوں کا تنکا بھی بڑے آدمیوں کی آنکھوں میں شہتیر کی طرح کھٹکتا ہے۔

کاونٹ۔ بیوقوف کہیں کا۔

فگارو۔ انصاف آپ کے ہاتھ ہے۔ آپ ہی فرمائیں۔ آپ کی نگاہوں سے ایسے کتنے آقا گذرے ہونگے۔ جو لیاقت میں اپنے غلاموں ہی کی برابری کر سکتے ہوں۔

کاونٹ (ہنستے ہوئے) خوب تو پھر تو یہاں آگیا؟

فگارو۔ آیا تو لیکن کچھ مدت کے بعد۔

کاونٹ۔ (قطع کلام کرتا ہوا) شاید وہ تھی۔ تم باتیں کئے جاؤ میں سب کچھ سن رہا ہوں۔

فگارو۔ حضور ہاں تو جب میں میڈرڈ سے واپس آگیا۔ تو پھر خیال ہوا کہ اپنے ادبی شوق ہی سے فائدہ کیوں نہ اٹھاؤں۔ چنانچہ تھیٹر میں کام شروع کر دیا۔

کاونٹ۔ بدقسمت!

فگارو۔ (کاونٹ کھڑکی کی طرف دیکھ رہا ہے) خدا جانے حضور مجھے کامیابی کیوں حاصل نہ ہوئی۔ اپنی طرف سے تو میں نے ناٹکوں جتن کر ڈالے۔ سینکڑوں تماشائیوں کو تیار کیا۔ ان سب سے کہہ دیا کہ دستانے چھڑیاں سب گھر چھوڑ جانا اور خوب تالیاں بجانا۔ تاکہ کھٹا کھٹ کی آواز سے سارا ہال گونج اٹھے لیکن حضور یہ کمبخت ریویو کرنے والے سارا بنا بنایا کام انہیں نے بگاڑا۔

کاونٹ۔ تو انہوں نے تھیٹر میں بھی ان کی دال گلنے نہ دی

فگارو۔ حضور اپنے سر کی قسم! کہیں مل جائیں تو.....

کاونٹ۔ تو بھی بڑے مزے کا آدمی ہے لیکن یہ تو تو نے بتایا ہی نہیں۔ کہ یہاں کیوں آیا؟

فگارو۔ میری خوش قسمتی ہی سمجھئے۔ نہ آتا تو آپ کی زیارت کیسے ہوتی حضور!

کاونٹ۔ شکریہ۔ شکریہ!

فگارو۔ جب بندے نے دیکھ لیا کہ میڈرڈ میں تو صرف کتے ہی کتے رہتے ہیں اور ایک کتا دوسرے کتے کو کھاتا پیتا دیکھ ہی نہیں سکتا۔ تو حضور دنیا سے بیزار۔ دنیا والوں سے نالاں۔ سر تا پا قرض کی بیڑیوں میں گرفتار میں نے سب کچھ چھوڑ دیا اور یہ خیال کرتا ہوا کہ استرے کا فن قلمکاری سے کہیں بہتر ہے حضور میں میڈرڈ سے چل کھڑا ہوا۔ اسباب کندھے پر اٹھایا اور فلسفیوں کی طرح چلتا رہا۔ راہ میں کہیں آرام ملا اور کہیں تکلیف کسی نے آگے بڑھکر قدم بوسی کی کسی نے قید میں ڈال دیا لیکن میں ہر حالت میں خوش راضی برضا رہا۔ اور طاقتوروں سے بچتا۔ بدمعاشوں سے لڑتا۔ اپنی حالت پر ہنستا اور ہر شخص کی حجامت کرتا ہوا حضور آخرکار یہاں پہنچ ہی گیا۔ اب میری ناچیز خدمات آپ کے لئے وقف ہیں۔

کاونٹ۔ فگارو۔ تو نے یہ نشاط انگیز فلسفہ کہاں سے سیکھا۔

فگارو۔ حضور! بدقسمتی نے سب کچھ سکھا دیا ہے۔ میں ہر بات پر پہلے ہی ہنس دیتا ہوں تاکہ بعد میں کہیں رونا نہ پڑ جائے لیکن حضور! آپ اس طرف کیا دیکھ رہے ہیں؟

کاونٹ۔ چل بھاگ چلیں۔

فگارو۔ یہ کیوں؟

کاونٹ۔ چل بھی کم بخت۔ تو تو بنا بنایا کام ہی بگاڑ دیگا (چھپ جاتے ہیں) (کھڑکی کھلتی ہے۔ روزین اور بارتھو کمرے میں نظر آتے ہیں)

روزین۔ یہ کھڑکی بھی کبھی کبھار کھلتی ہے۔ باہر کیسا سہانا سماں ہے۔

بارتھو۔ یہ کیا ہے تمہارے ہاتھ میں؟

روزین۔ ناکام محبت کے کچھ گانے۔ یہ استاد دے گئے تھے۔

بارتھو۔ کوئی نیا ماڈرن ڈرامہ۔ کوئی نئی خرافات!

روزین۔ میں کیا کہہ سکتی ہوں!

بارتھو۔ زمانہ بدل گیا۔ کیسے وقت آگئے؟

روزین۔ جناب زمانے کے پیچھے ہاتھ دھو کر کیوں پڑ گئے؟

بارتھو۔ اور کروں بھی کیا۔ کچھ خبر ہے۔ آجکل دنیا کا رخ کیا ہے جہاں دیکھو خرافات ہی خرافات۔ نہ دین رہا نہ ایمان نہ ماں باپ کی محبت رہی نہ بزرگوں کا ادب! اب تو وہ وقت آگیا کہ بچہ پیدا ہوتے ہی اپنے آپ کو بقراط زمان اور ارسطوئے دوران سمجھنے لگتا ہے۔ باپ دادا پڑے بوڑھے جو کچھ کر گئے وہ سب جہالت۔ یہ وقت تو تھیٹر ناچ اور گانوں کا ہے۔ نہ جانے اور کیا کیا ہونے والا ہے؟

روزین۔ (ہاتھ سے کاغذ چھوٹ جاتا ہے۔ اوہ! میرا کاغذ۔ گیا وہ گیا! ذرا جائیے تو لپک کر۔ ایسا نہ ہو کہیں کھو جائے۔

بارتھو۔ کیا! تم سے ایک کاغذ بھی اچھی طرح پکڑا نہیں جاتا۔

روزین۔ (بارتھو کے کمرے کے اندر نگاہ دوڑاتی ہے۔ اور پھر سڑک کی طرف اشارہ کرتی) شش شش کرتی ہے۔ (کاونٹ ظاہر ہوتا ہے رہا کاغذ کاغذ کاغذ۔ اٹھا لو! چھپ جاؤ (کاونٹ جھپٹ کر کاغذ اٹھا کر چھپ جاتا ہے۔

بارتھو۔ (گھر سے نکل کر ڈھونڈھتا ہے) کاغذ گیا کہاں؟ کہیں نظر نہیں آتا۔

روزین۔ چھجے کے نیچے دیوار کے دامن میں پڑا ہوگا

بارتھو۔ ہاں... چھا کام دیا تم نے! اس راستے کوئی راہگیر تو نہیں گذرا۔

روزین۔ میں نے تو کسی کو دیکھا نہیں۔

بارتھالو۔ (دل ہی دل میں) میں نے بھی کیا حماقت کی۔ (ان کی زبان سے "میرا کاغذ۔ جاؤ" نکلتے ہی اُتر آیا میں بھی کچھ عجیب قسم کا احمق ہوں (اپنے آپ سے) میرے دوست تمہیں اس بات سے سبق حاصل کرنا چاہئے۔ کان پکڑو بیٹا کہ آیندہ کبھی اس سڑک والی کھڑکی کا دروازہ کھلنے نہ دو گے۔

روزین۔ (دریچے سے) اور کر دل بھی کیا؟ یہ بھی کوئی زندگی میں زندگی ہے۔ (بارتھلو واپس آجاتا ہے) دن رات اکیلے پڑے رہنا۔ اس حقیر بڈھے کا ظلم سہنا۔ اس غلامی سے نجات حاصل کرنے کی کیوں کوشش نہ کروں!

بارتھالو۔ (دریچے میں آتا ہے) آیئے تشریف لایئے بیگم صاحبہ۔ اگر آپ کا گیت ضائع ہوا میری کوتاہی سے لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں۔ کہ آیندہ کبھی آپ کو اس قسم کا نقصان نہ ہوگا (کھڑکی کو تالا لگاتا ہے)

(کونٹ اور فگارو دونوں بڑی احتیاط سے آتے ہیں)

کاؤنٹ۔ وہ تو چلا گیا۔ اب ذرا خط کو دیکھنا چاہئے۔ اس میں کوئی نہ کوئی بھید ضرور ہوگا۔ ہائیں یہ تو پیام محبت معلوم ہوتا ہے۔ (پڑھتا ہے)

فگارو۔ اور میاں بارتھلو صاحب روزین سے پوچھ رہے تھے کہ "ناکام محبت" کس چڑیا کا نام ہے؛

کاؤنٹ (باآواز بلند پڑھتا ہے) آپ کے جوش گرویدگی سے میرا اشتیاق بھی لحظہ بلحظہ ترقی کر رہا ہے۔ میرے سرپرست جب باہر چلے جائیں۔ تو آپ معمولی طریقے پر گانا شروع کر دیں۔ اسی گیت کے سُر میں تاکہ مجھے کم از کم یہ تو معلوم ہو جائے۔ کہ آپ کون ہیں؟ آپ کا نام کیا ہے۔ آپ چاہتے کیا ہیں۔ اور یہ کہ اس بدقسمت روزین کے ساتھ اتنی شیفتگی آپ کیوں ظاہر کر رہے ہیں۔

فگارو۔ (نقل کرتا ہوا) میرا گیت۔ میرا گیت۔ وہ گیا۔ وہ گیا۔ پکڑو ذرا پکڑو (ہنستا ہے) ہا۔ ہا۔ ہا۔ یہ عورتیں بھی کیسی آفت کی پرکالہ ہوتی ہیں۔

کاؤنٹ پیاری روزین!

فگارو۔ اچھا! اب سمجھا حضور آپ کے بھیس بدلنے کا فلسفہ۔ ہاں تو آپ نظر بازی فرما رہے ہیں۔ اور یہ ہے آپ کے کھڑے ہونے کی وجہ۔

کاؤنٹ۔ [illegible] اب تو سمجھ گیا۔ لیکن بہت ٹرٹر کی تو . . . . .

فگارو۔ ہُم ہُم حضور میں وہ بڑے بڑے الفاظ اور لمبے لمبے فقرے استعمال نہیں کروں گا جن سے آجکل فرمانبرداری اور اطاعت کا سکہ بٹھایا جاتا ہے میں تو بس یہ جانتا ہوں کہ میری بھلائی حضور کی خوشی سے وابستہ ہے حضور کو خوش رکھوں۔ تو میرے لئے سب کچھ ہے ورنہ کچھ بھی نہیں۔

کاؤنٹ بہت خوب تو دیکھ چھ مہینے ہوئے حسن اتفاق سے میری نظر ایک روز پرادو میں ایک نوجوان دوشیزہ پر پڑ گئی۔ اس کا حسن و جمال میں کیا بیان کروں۔ تو خود ہی دیکھ چکا ہے میں نے اس مہ جبین کی تلاش سارے میڈرڈ میں کی۔ آج سے چند ہی روز قبل مجھے پتہ چلا ہے کہ اس کا نام روزین ہے۔ اور وہ ایک بڑے باپ کی بیٹی ہے لیکن ہے یتیم اور اس شہر کے ایک بوڑھے ڈاکٹر سے بیاہی ہوئی ہے۔

فگارو۔ قسم خدا کی چڑیا ہے تو خوبصورت لیکن آسانی سے ہاتھ آنے والی نہیں لیکن حضور آپ کو یہ پتہ کیسے چلا۔ کہ وہ ایک ڈاکٹر کی بیوی ہے۔

کاؤنٹ۔ کیسے معلوم ہوا۔ یہ کیسے معلوم نہیں۔

فگارو۔ کسی کی من گھڑت کہانی ہے حضور۔ تاکہ کسی رنگین مزاج کا اس کی طرف خیال ہی نہ جائے حقیقت مجھ سے سنئے۔ ڈاکٹر اب تک تو اس کا سرپرست ہے لیکن جلد ہی . . . . .

کاؤنٹ جلد ہی کیا؟ میں کہتا ہوں کبھی نہیں۔ اگر اس کی شادی ہی نہیں ہوئی۔ پھر تو کام آسان ہے۔ وقت بڑا قیمتی ہے۔ مجھے کسی نہ کسی طرح اس لڑکی کو اس بڈھے کھوسٹ کی گرفت سے نکالنا چاہئے۔ فگارو تو اس بڈھے کو جانتا ہے؟

فگارو۔ اپنی ماں کی طرح۔

کاؤنٹ۔ آدمی کس قسم کا ہے؟

فگارو۔ موٹا چھوٹا۔ پیری میں شباب کی باتیں۔ حد درجہ کا بخیل۔ وہمی ایسا جتنی میری پڑدادی۔ مجال ہے کہ گھر میں پتہ بھی ہل جائے اور اسے پتہ نہ چلے۔

کاؤنٹ۔ یہ سب کچھ ہوا۔ لیکن یہ تو بتا کہ اس کو خوش کرنے کا بھی کوئی طریقہ ہے

فگارو۔ کوئی طریقہ نہیں۔

کاؤنٹ۔ خیر ایماندار بھی ہے۔

فگارو۔ بس اتنا کہ پھانسی کے تختے سے بچا رہے۔

کاؤنٹ۔ پھر تو اس بدمعاش کا علاج صرف ایک ہے۔ کہ اس کی جوتی اس کے سر رکھی جائے۔ فگارو بھلا اس سے بڑھکر ثواب کا کام کیا ہوگا۔

فگارو۔ بالکل حضور اسی کو رفاہ عام و خاص کہتے ہیں۔ خاص ثواب کا کام ہے۔

کاؤنٹ۔ ہاں تو تو کہہ رہا تھا۔ کہ رنگین مزاج نوجوانوں کے ڈر سے وہ اپنے گھر کا دروازہ تک نہیں کھلنے دیتا۔

فگارو۔ حضور بالکل ایسا ہی ہے۔ بلکہ وہ تو درازوں کے بند کرنے کی فکر میں رہتا ہے۔

کاؤنٹ۔ یہ خبر تو بُری سُنائی۔ اچھا یہ تو بتا کہ تیرا اس کے گھر آنا جانا بھی ہے؟

فگارو۔ آنا جانا۔ تو میں رہتا کہاں ہوں حضور!

کاؤنٹ۔ ڈاکٹر کے گھر میں؛

فگارو۔ حضور بالکل وہیں۔ اور رہتا بھی ہوں مفت۔ ہاں ہر مہینہ کرایہ دینے کا وعدہ ضرور کر لیتا ہوں۔

کاؤنٹ (بےصبر سا ہوکر) اچھا خوب۔ تو تو اس کا کرایہ دار ہے؟

فگارو ۔صرف کرایہ دار ہی نہیں حضور اس کا حجام جراح اور کمپاونڈر غرض سب کچھ ہوں۔
جب کسی کو نشتر لگانا ہو تو خادم ہی کو یاد کیا جاتا ہے۔

کاونٹ (بغلگیر ہوتا ہوا) میرے دوست اب تو تم میرے لئے فرشتہ اور مسیحا نکلے۔

فگارو ۔کہاں راجہ بھوج اور کہاں گنگو تیلی بھلا ضرورت بھی کیسی چیز ہے۔ ورنہ حضور
کہاں ہیں اور کہاں آپ؟

کاونٹ فگارو۔ تو بڑا خوش قسمت ہے۔ تو ہر روز روزین سے ملیگا۔ تجھے معلوم ہے
یہ کتنی بڑی خوش قسمتی تیری۔

فگارو ۔آپ بھی بالکل بس حضور ہی ہیں اور کیا کہوں۔ روزین سے محبت آپ کو ہے
یا مجھے؟

کاونٹ (ٹھنڈی سانس بھرتا ہے) کسی طرح یہ چوکیدار بھی ہٹ سکتے ہیں؟

فگارو ۔میں بھی بس اسی فکر میں ہوں۔

کاونٹ صرف بارہ گھنٹوں کے لئے۔

فگارو ۔کونسی بڑی بات ہے۔ ہر شخص کو اپنا مطلب ضروری نظر آتا ہے۔ آپ اگر
دوسروں کا مطلب پورا کر دینگے۔ تو وہ آپ کی راہ میں کیوں رکاوٹ ڈالنے لگے

کاونٹ ۔بات تو ٹھیک کہی لیکن؟

فگارو ۔میں سوچتا ہوں کہ ہسپتال سے فایدہ کیوں نہ اٹھایا جائے؟

کاونٹ ۔یا جی کہیں کا!

فگارو ۔حضور میں کسی کو کوئی نقصان تھوڑا ہی پہنچانا چاہتا ہوں۔ وہ سب میرے پاس دوا
پینے خود ہی آتے ہیں بس سب کو ایک ہی دوا پلا دوں گا۔

کاونٹ ۔اور اگر تجھ پر شک کیا گیا۔

فگارو ۔شک کیا گیا تو پھر بات ہی کیا ہوئی۔ بات تو جب ہے کہ سانپ مرے اور لاٹھی نہ
ٹوٹے۔ دیکھئے خیال آیا شہزادہ ولیعہد کی رجمنٹ آج ہی اس شہر میں پہنچیگی۔

کاونٹ ۔اس رجمنٹ کا کرنل میرا دوست ہے۔ مگر اس سے فایدہ؟

فگارو ۔پھر تو کام آسان ہے۔ آپ فوجی وردی میں ڈاکٹر کے ہاں تشریف لایئے۔ اور
رہائش کا حکمنامہ ہاتھ میں ہو۔ پھر ممکن نہیں کہ وہ انکار کر سکے۔ باقی باتوں کی
ذمہ داری میں لیتا ہوں۔

کاونٹ بہت خوب!

فگارو ۔لیکن بات جب ہے کہ آپ کا روپ شرابیوں جیسا ہو۔

کاونٹ ۔کیا معنی؟

فگارو ۔فایدہ یہ ہے۔ کہ کسی قسم کے شک کی گنجائش ہی باقی نہ رہے۔ وہ یہی سمجھے۔
کہ آپ اس کے ہاں شب باشی کے لئے آئے ہیں۔ کسی قسم کی سازش کی نیت
سے نہیں۔

کاونٹ ۔اس کام کو اگر تم خود ہی انجام دو تو کیا ہرج ہے؟

فگارو ۔حضور آپ بھی کیسی باتیں کرتے ہیں۔ مجھے تو ڈر ہے کہ کہیں آپ ہی نہ پہچان
لئے جائیں۔ آدمی ایسا بھولا نہیں جیسا آپ نے سمجھ رکھا ہے اور پھر آپ اندر
کس بہانہ سے آئینگے؟

کاونٹ ۔ٹھیک کہتے ہو شرابی میں خود ہی بنوں گا۔

فگارو ۔لیکن آپ پارٹ بھی ادا کر سکینگے۔ کام آسان نہیں ہے؟

کاونٹ ۔کیا دل لگی کرتے ہو (شرابیوں کی طرح بولتا ہے) کیوں یار و ڈاکٹر
بارتھالو کا گھر یہی ہے۔ کیوں استاد کیسی رہی؟

فگارو ۔خاصہ اچھا ادا کیا ہے۔ شرابیوں کی طرح ذرا پاؤں بھی تو لڑکھڑایئے۔
(شرابیوں کی طرح بولتا ہے) او یار۔ یار ڈاکٹر بارتھالو یہاں ہی رہتا ہے نا؟

کاونٹ ۔تو تو خاندانی شرابی معلوم دیتا ہے۔

فگارو ۔اصلی شرابی بھی تو وہی ہیں حضور!

کاونٹ ۔دیکھ کوئی آیا۔

فگارو ۔ہاں اسے نکل جانے دیں (چھپ جاتے ہیں)

بارتھالو (گنگناتا باہر نکلتا ہے) ابھی واپس آیا۔ دیکھو کوئی داخل نہ ہونے پائے
میں بھی کتنا بیوقوف ہوں۔ ذرا اس نے کہا اور میں نیچے اتر آیا۔ مجھے اعتبار
نہ کرنا چاہیئے تھا۔ اور وہ کم بخت بازیل کہاں مر گیا۔ کل شادی کس طرح
ہو سکیگی۔ نہ معلوم کچھ انتظام بھی کیا ہے یا نہیں۔ دیکھوں تو کم بخت
کہاں مر گیا؟

کاونٹ ہیں کیا کہا شادی۔ شادی کیسی اور کس کی؟ اور وہ بھی کل۔ یہ کیا کہا
مردک نے؟

فگارو ۔حضور جتنی بات مشکل ہوتی جاتی ہے ہمیں اتنی ہی جلدی سے کام لینے
کی ضرورت ہے۔

کاونٹ لیکن یہ بازیل ہے کون؟ اور پھر اس کو اس شادی سے واسطہ؟

فگارو ۔یونہی ایک معمولی حیثیت کا آدمی ہے۔ گانا سکھانے آتا ہے۔ سمجھتا ہے
کہ اپنے فن میں ید طولیٰ رکھتا ہے لیکن سچ یہ ہے کہ دو پیسے کی اوقات
نہیں۔ خیر اس کا انتظام مشکل نہیں (کھڑکی کی طرف دیکھتا ہے) وہ
دیکھئے۔ ادھر کھڑکی کی طرف دیکھئے۔

کاونٹ ۔کیسے؟

فگارو ۔ذرا دیکھئے تو سہی۔ کھڑکی کے پیچھے کون کھڑا ہے لیکن نہیں ٹھہریئے

کاونٹ ۔کیوں؟

فگارو ۔اس وقت تو وہی گیت گاتے رہیئے۔ مگر معمولی طور پر ایسا نہ ہو کہ کوئی
شک کر بیٹھے۔ وہ دیکھئے وہ ادھر کا ادھر نہیں ادھر دیکھئے۔ دیکھا۔

کاونٹ ۔دیکھا۔ ہاں اب دیکھا مگر دوست! وہ یہ تو جانتی ہی نہیں کہ میں
کون ہوں۔ کہاں کا رہنے والا اور کس حیثیت کا مالک ہوں۔ لہذا مجھے
اپنا نام لندور رکھ لینا چاہیئے تاکہ جب پتہ چلے۔ تو تھوڑی دیر کے لئے
مزے کی دل لگی رہے (روزین کے پھینکے ہوئے کاغذ کو پڑھتا ہے) لیکن
گاؤں بھی کیا؟ گیت لکھنا تو میں جانتا ہی نہیں۔

نگارو۔ جو دل میں آئے گائے جایئے۔ لیجئے یہ رہی میری ستار!

کاؤنٹ۔ ستار کی ضرورت ہیں بجانا و جانا تو کچھ نہیں جانتا ستار لیکر کیا کروں؟

نگارو۔ میرے سرکار! ایسی وہ کونسی چیز ہے جس کو آپ نہیں جانتے۔ یوں تار پر انگلیاں رکھئے۔ اور یوں ہلاتے جایئے (بجاتا ہے) ٹرنگ ٹرنگ ٹرنگ یہاں بغیر ستار کے کوئی بھی نہیں گاتا مطلب یہ کہ آپ پہچان لئے جائیں۔

(نگارو قہقہے کے پیچھے دیوار سے لگ کر کھڑا ہو جاتا ہے اور کاؤنٹ چہل قدمی کرتا ہوا ستار کے ساتھ گاتا رہتا ہے)

غزل

انہیں کہہ دے نام و نشاں میں بتا دوں ۔ میں حیراں ہوں کیا ان کو اپنا پتہ دوں
یوں ہی رہ کے پوشیدہ مثل محبت ۔ اشاروں کنایوں میں سب کچھ سنا دوں
ہے لندور کہہ دے کوئی نام میرا ۔ نشاں اپنے ماں باپ کا ان کو کیا دوں
میں ہوں رکن گمنام سے خانداں کا ۔ سنیں تو سنا ساری ہی داستاں دوں
تھے دونوں ہی افلاس و غربت کے مارے ۔ جو حق بات ہے اس کو کیوں میں چھپا دوں
خدا مغفرت مجھکو گاتی د بدے ۔ تو خود بھی پڑھوں اور انہیں بھی پڑھا دوں
ہر اک کر اٹھے دیکھکر ان کو عشق عشق ۔ ہیں کاؤنٹ ہوں ان کو کا دشمن بنا دوں
کروں یاد میں عالم یاس میں بھی ۔ محبت کا گانا سحر دم سنا دوں
دل مضطرب کی تمنا یہی ہے ۔ انہیں پوری آپ اپنی بیتی سنا دوں

نگارو۔ جناب آپ تو ہیں زبردست شاعر ۔ میں اشعار کی داد دوں بھی تو کیا دوں

سبحان اللہ! سبحان اللہ! سرکار کیا نورانی گلا پایا ہے کیسی رسیلی آواز! کیا کہنے ہیں آپ کے۔ آپ تو ماہر فن معلوم دیتے ہیں میں تو سمجھتا تھا کہ صرف میں ہی گویا ہوں لیکن بخدا آپ نے تو لکھنو والے بندا سرن جیسے یکتائے زمانہ موسیقار کو بھی مات کر دیا۔

(نگارو تعریف کرتا ہوا آگے بڑھکر کاؤنٹ کے چوغے کو فرط جوش میں چوم لیتا ہے)

کاؤنٹ۔ نگارو!

نگارو۔ عالیجاہ!

کاؤنٹ۔ میری آواز ان کے کانوں تک بھی پہنچی ہوگی۔ کیا خیال ہے تیرا (گانے کی آواز آتی ہے۔ دونوں سننے لگتے ہیں)

روزین کے گانے کی آواز آتی ہے۔

یہی ہے زباں پر ہر اک شے کے جاری ۔ کہ لندور کی شکل و صورت ہے پیاری
کسی کی محبت میں جی سے گزرنا ۔ مجھے چاہئے عشق کی قدر کرنا

(گانا ختم ہونے پر دروازہ زور سے بند ہوتا ہے دونوں اوپر دیکھنے لگتے ہیں)

نگارو۔ سرکار! جواب مل گیا نہ۔ کہ آپ کو اب بھی شک ہی ہے؟

کاؤنٹ۔ ماں ہنے دروازہ بند کیا تو ہے۔ شاید کوئی مہمان آگیا ہوگا۔

نگارو۔ سرکار! ہنہ آپ نے کس غضب کی آواز پائی ہے۔ اُف رے سوز و گداز الفاظ کا حضور مجھے تو یقین ہو چکا۔ یہ یکطرفہ محبت کا کرشمہ نہیں ہے بلکہ یہاں تو دونوں طرف سے آگ برابر لگی ہوئی۔

کاؤنٹ۔ اور خود بھی وہی طریقہ استعمال کیا جا رہا ہے جو مجھے بتایا گیا تھا۔

نگارو۔ میرے اچھے سرکار! دلربائی کے ڈھنگ کی طرف بھی آپ کا خیال گیا اور پھر احتیاط کس حد کی ہے مجال ہے کوئی بھانپ جائے۔ اسی کو کہتے ہیں تریا چلتر!

کاؤنٹ۔ کیا خیال ہے میری ہو بھی جائیگی؟

نگارو۔ ہو بھی جانے کی ایک ہی کہی۔ اس میں بھی کوئی شک ہے۔ ذرا صبر سے کام لیجئے۔ ابھی آتی ہی ہوگی کھڑکی کی طرف۔

کاؤنٹ۔ بس مجھے یقین ہوگیا۔ روزین میری ہے میری ہمیشہ کے لئے میری۔

نگارو۔ خداوند نعمت۔ آپ یہ باتیں مجھے کیوں سناتے ہیں سننے والی تو کمرہ کے اندر ہے

کاؤنٹ۔ نگارو قبلہ۔ بات جو کچھ بھی ہو۔ روزین میری بیوی بنیگی اور ضرور بنیگی۔ ضرورت صرف اتنی ہے کہ میرا نام پوشیدہ رہے اور نام کا پوشیدہ رہنا تمہاری امداد پر موقوف ہے سمجھے کچھ؟

نگارو۔ سرکار! اچھا تو لیجئے بندہ رخصت! (اپنے آپ سے) چل بیٹے نگارو! عیش کر بچہ!

کاؤنٹ۔ تو آؤ ہم بھی چلیں کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی شک کر بیٹھے۔

نگارو۔ (زور سے) گھر پہنچکر ایسا منتر پھونکتا ہوں کہ سارے چوکیدار تڑ پڑ جائیں خواب خرگوش میں اور محبت کا دیوتا جاگ اٹھے تاکہ رقابت کا خاتمہ ہو جائے سازشوں کی راہیں مسدود ہو جائیں اور ساری رکاوٹیں ایک ایک کر کے دور پھر سرکار اس طرح تشریف لائیں کہ فوجی لباس زیب تن ہو بشب باشی والا حکمنامہ ہاتھ میں اور کیسہ ہائے زر جیب میں۔

کاؤنٹ۔ زر کیا ہوگا؟

نگارو۔ زر؟ واہ میرے بھولے سرکار! دنیا میں کوئی کام زر کے بغیر بھی چلا ہے۔

کاؤنٹ۔ اچھا تو بگڑتا کیوں جاتا ہے۔ بول کیا چاہتا ہے لیتا آؤں گا۔

نگارو۔ میں ابھی آپ سے یہیں ملونگا۔

کاؤنٹ۔ نگارو۔

نگارو۔ سرکار!

کاؤنٹ۔ تیرا استا کیا ہوا؟

نگارو (واپس آتا ہے) خوب یاد دلایا سرکار نے۔ ورنہ میری تو سرتال ہی غائب تھی (جانے لگتا ہے)

کاؤنٹ۔ ارے کچھ اتہ پتہ بھی بتلائے گا؟

نگارو۔ (واپس آتا ہے) سچ مچ میرا بھی دماغ ہی پھر گیا ہے سرکار! وہ رہی میری دکان (اشارہ کرتا ہے) وہ۔ وہ نیلا روغن آہنی دروازہ بس یہاں سے چار قدم کے فاصلہ پر ہے۔

(نگارو بھاگ جاتا ہے)

اشارات

نے رنگِ سبو حاصل، نے کیفِ مے باقی
کچھ تنگ ہے رندوں پر اب وسعتِ آفاقی
کچھ ایسی ہوا بدلی کچھ ایسی فضا بگڑی
گھومے ہے کہیں ساغر بگڑے ہے کہیں ساقی

مجھے نہ دیکھیے یوں محتسب نگاہوں سے
بھٹک نہ جاؤں کہیں اپنی سیدھی راہوں سے
یہ کیف جو نظر آتا ہے، مری آنکھوں میں
کیا ہے اخذ، چمکتے ہوئے گناہوں سے

دلِ جواں کا نیاز و خراج کیا کہیے!
فریبِ چشمِ حسیں کا علاج کیا کہیے!
کرے جو آتشیں سجدوں سے اک خدا پیدا
کرشمہ سازِ جبیں کا مزاج کیا کہیے!!

حدودِ خام سے، کچھ دور جا کے دیکھ مجھے
یقیں نہیں ہے اگر آزما کے دیکھ مجھے
میرا شعور، میری نیند تیرے سائے ہیں
خیال و خواب کی دنیا میں آ کے دیکھ مجھے

حفیظ رومانی صدیقی

منزلِ عشق

مقامِ بے خودی تک آ گیا جوشِ جنوں میرا
کوئی ہوش و خرد لوٹے کوئی چھینے سکوں میرا
بدل سکتی نہیں دل کے ارادے کو کوئی قوت
تلاطم لاکھ آئے ہے سفینہ جوں کا توں میرا
نگاہیں برق کی میری نگاہوں سے مقابل ہوں
جلا کر خاک کر ڈالے وہیں سوزِ دروں میرا
زمانے کو شناسائے نیازِ عاشقی کر دوں
تہِ افلاک چل جائے کسی صورت فسوں میرا
مری منزل تری منزل سے آگے ہے کئی منزل
پرے ہٹ دست و دامن چھوڑ اے دنیائے دوں میرا
قدم ڈر ڈر کے رکھتی تھی بہاراں کی سواری بھی
خزاں نے کر دیا تھا گلستاں پامال یوں میرا
پریشاں کاتبِ تقدیر ہے لکھے تو کیا لکھے
ادھر شوقِ فزوں میرا، ادھر بختِ زبوں میرا
تکبر اوج کے رستے میں ہے سنگِ گراں عشقی
بلندی کی تمنا چاہتی ہے سرنگوں میرا

حکیم عشقی الہاشمی

غیر معروف جرنلسٹ کے قلم سے

نمبر ۱۸۱

(طرزِ نو کا افسانہ)

بغداد کے شمالی دروازہ کے باہر جمیل کے قہوہ خانہ میں شام کے وقت احباب جمع تھے خوش گپیاں ہو رہی تھیں۔ اتنے میں ایک شخص قہوہ خانے میں داخل ہوا اور معًا سارے مجمع پر تھوڑی دیر کے لئے سکوت سا طاری ہو گیا۔ جمیل نے دور سے دیکھا۔ وہ اپنی جگہ سے اُٹھا۔ اور مؤدبانہ انداز سے اسے ایک نشست پر لے گیا۔ جو قہوہ خانے کے گوشے میں کھجوروں کے جھنڈ کے تلے کسی قدر علیحدہ واقع تھی۔ مہمان کو بٹھانے کے بعد جمیل پھر ہمارے قریب آ بیٹھا۔ محفل پھر سے اپنی اصلی روش پر آ گئی۔ تقریبًا پانسو مہمان ہر شام اس قہوہ خانے میں جمع ہوتے یہ لوگ عمومًا اپنا اپنا حلقہ بنا کر کرسیوں پر بیٹھے خاص وضع داری کے ساتھ اپنے اپنے شغل میں مصروف رہتے۔ اور یہ بات مجھ ایسے بلند بانگ اور ہنگامہ پسند پنجابی کے لئے موجب استعجاب تھی۔ کہ اتنے کثیر مجمعے کے باوجود کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہاں شور ہو رہا ہے۔ لباس ظاہری سے قطع نظر یہاں ایشیائی اور یورپی تمدن کے مابین کوئی حدِ فاصل نہ تھی۔ ہاں جمیل کے قہوہ خانے میں انسان آتے تھے۔ کبھی کبھی قہقہے کی آواز اُٹھتی۔ لیکن دوسروں کے آرام میں خلل انداز نہ ہوتی۔

کوئی آدھ گھنٹے بعد وہ اجنبی جمیل کے پاس آیا۔ اور مصافحہ کرتے ہوئے اس نے کہا "میں روانہ ہونے سے پیشتر آپ سے ملوں گا۔" وہ بل چکائے بغیر چلا گیا۔ یورپی فیشن میں ملبوس چھ فٹ سے کم کیا ہو گا۔ اکہرا جسم لاغر لیکن تنا ہوا چہرہ مضبوط اور نمایاں کلے جبڑے رخسار کی ہڈیاں قدرے اُبھری ہوئیں اُونچی اور کسی قدر خمیدہ ناک اور ہاں قیصری وضع کی گچھے دار بھوری مونچھیں، کنپٹی کے بال سفید تھے۔ وہ ان اشخاص میں سے تھا جو ہزاروں کے مجمعے میں ایک جُداگانہ شان سے نظر آتے تھے۔ میں یہ کہے بغیر نہ رہ سکا "کتنا بارعب ہے یہ شخص"

جمیل نے ہنس کر کہا "ہاں اور ظالم ۶۰ سال سے کم نہیں۔ ہمارے محکمۂ جیل کا سپرنٹنڈنٹ بن گیا تھا۔ پہلے فوج میں کپتان تھا۔ شکل و صورت اور ایک مخصوص فوجی انداز کے اعتبار سے وہ لوگوں میں قیصر کے نام سے معروف ہو گیا۔ فرانسیسی نژاد ہے یہ کپتان مازے سال میں ایک مرتبہ یہاں ضرور آتا ہے۔ ایک فریضہ ادا کرنے کے لئے۔

"فریضہ! یہاں قہوہ خانے میں؟" ہم نے بے اختیار کہا۔

"کپتان مازے کا اپنا بیان ہے کہ یہاں آنے کے بعد مجھے یک گونہ قلبی راحت محسوس ہوتی ہے۔ گویا میں ایک یاترا سے فارغ ہو گیا۔"

"یاترا؟"

جمیل تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہو گیا۔ اور ایک عجیب دلکش افسردگی اس کے سال خوردہ اور متبسم چہرہ پر چھا گئی۔ اس نے کہا۔ "جبتک اس کی بیوی زندہ تھی۔ وہ اس کے ساتھ آیا کرتی تھی۔ اب وہ اکیلا آتا ہے۔ اور مجھ سے بھی ضرور مل لیتا ہے میں اس کے ماتحت داروغہ تھا۔ وہ پندرہ منٹ۔ اُف! اُن کی یاد میرے لوح قلب پر آتشیں حروف میں منقوش رہے گی۔ خدائے قہار کا شدید ترین عذاب اس پر نازل ہوا۔ اور پھر قتل کے مقدمے میں میری گواہی۔"

"عذاب! قتل! پندرہ منٹ!" یہ الفاظ دوستوں کی زبان سے بے اختیار نکلے جمیل نے کہا۔ چلو آج کی بزم میں میں تمہیں یہی واقعہ سناتا ہوں۔ پھر ایک ہلکا سا قہقہہ لگاتے ہوئے کہا "لیکن پہلے ذرا شیشہ و پیمانہ کی ملاقات کرائیں" گلاس خالی کرنے کے بعد جمیل نے چھ انچ لانبا عربی سگرٹ جسے جگارہ کہتے ہیں سلگایا اور کہانی شروع کی:-

۱۹۱۷ء میں جب اتحادی فوج بغداد میں داخل ہوئی۔ تو اس قلعے کے دوسری طرف ترکوں کے زمانے کا فوجی جیل خانہ تھا۔ اس کا ناظم تو ترک تھا۔ اور اس کے ماتحت بیشتر ترکی عربی کچھ فرانسیسی اور اکا دُکا المانوی فوجی عہدہ دار تھے نئے دورِ حکومت میں اس جیل خانے میں دو سو کے قریب فوجی قیدی تھے۔ از بس خطرناک مجرم جن سے مشقت لینا جوئے شیر لانے کے برابر تھا۔ جو شرافت کو بزدلی اور ہمدردانہ سلوک کو تضیع اوقات سمجھتے تھے۔ آئے دن فتنہ و فساد ہوتا انہیں قابو میں رکھنے کے لئے انتہا درجے کی بیجگری جانبازی اور معاملہ شناسی کی ضرورت تھی۔ یوں سمجھ لو کہ ہمارا فوجی جیل خانہ قید خانے اور پاگل خانے کا مجموعہ تھا۔ افسروں کی نیند حرام ہو جاتی تھی۔ میں نے بڑے بڑے پرہیزگار اور متقی حکام کو دیکھا کہ وہ وحشت و درندگی کی اس فضا میں سانس لینے کے بعد بہت جلد اپنے دل و دماغ کو نشہ شراب میں غرق کر دینے پر مجبور ہو گئے۔ آپ نے قیصر کو ابھی دیکھا ہے۔ ۱۹۱۷ء میں جب یہ پہلے پہل سپرنٹنڈنٹ مقرر ہوا۔ تو کتنا خوش وضع اور مرعوب کُن تھا' یہ آپ اندازہ نہیں کر سکتے۔ سانڈ کی طرح مضبوط اور قوی الجثہ' اور چیتے کی طرح سڈول اور لچکدار۔ اِسے ہاتھ میں ایک چابک رکھنے کی عادت تھی۔ قیدی اِسے سانپ کا کوڑا سمجھتے تھے۔ خطرناک سے خطرناک مجرم بھی قیصر کو دیکھتے ہی جیل خانے کے کونوں کھدروں میں دبک جاتے۔ اس کے مقرر ہوتے ہی جیل خانے میں ضابطہ و تادیب کی ایک نئی لہر

دوڑ گئی۔ صبح ۸ بجے وہ مقدمے سنتا۔ سنجیدگی اور متانت کا پیکر ابوالہول کی طرح دہشت انگیز اور پُراسرار برفانی مجسمے کی طرح جذبات سے یکسر عاری۔ مجرموں کے لئے سزا کا حکم سناتے وقت یوں معلوم ہوتا انسان نہیں بلکہ ایک فولادی ربوط بول رہا ہے۔ آپ مجرمانہ ذہنیت سے واقف ہوں گے۔ ہمارے مجرم اپنے افسروں کو ستانے اور بیزار کرنے میں خاص لطف محسوس کرتے ہیں۔ کپتان میزے کے پُرسکون چہرے کو دیکھ کر وہ غضبناک ہو جاتے اور بعض اوقات گالیاں دینے تک سے دریغ نہ کرتے۔ لیکن کپتان کی پیشانی پر بل نہ آتا۔ وہ اپنا فتویٰ ایسے انداز سے دیتا۔ گویا وہ نوشتۂ تقدیر کا اعلان کر رہا ہے: "لے جاؤ تیس کوڑے۔ چپ رہو ۳ ہفتے کے لئے کالی کوٹھڑی"۔ اسی طرح دو تین مہینے گذر گئے۔ اس دوران میں وہ اپنی روش پر برابر قائم رہا۔ صبح اور شام وہ اور اُس کی بیوی اپنے کمسن بچے کو بچہ گاڑی میں بٹھا کر سیر کو نکل جاتے اور باری باری گاڑی کو دھکیلتے اور ہنستے کھیلتے واپس آجاتے۔ بس یہی اس کی تفریح تھی۔ شراب سے اسے نفرت تھی۔

ایک دن میں دفتر میں بیٹھا رپورٹ تیار کر رہا تھا۔ آرڈرلی روم ختم ہو چکا تھا قیدی اپنے اپنے کاموں پر بھیج دیئے گئے تھے۔ قصورواروں کو سزائیں مل چکی تھیں کپتان میز اُٹھکر جانے کو تھا۔ کہ ایک اردلی ہانپتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے فوجی سلام کیا اور گھبرا کر کہا

"جناب نمبر ۱۸۱ آپ سے ملنا چاہتا ہے"۔

کپتان نے اس کی طرف تیز اور متجسس نظروں سے دیکھا۔ اور کہا: "ہرگز نہیں اسے معلوم ہونا چاہئے کہ سارجنٹ کی اجازت کے بغیر وہ کسی صورت مل نہیں سکتا۔ ضابطے کی بات ہے اس سے کہو کہ آئندہ ایسی جسارت نہ کرے"۔

جمیل نے کہا کہ نمبر ۱۸۱ کے الفاظ سنتے ہی میری نظر اس ریوالور پر جا پڑی۔ جو کپتان کے پیچھے دیوار پر لٹک رہا تھا۔ اس خطرناک قیدی سے سب واقف تھے جیل کا کوئی ضابطہ نہ تھا۔ جو اس نے توڑا نہ ہو۔ اسے حکم عدولی میں خاص لطف آتا تھا۔ کئی مرتبہ اس کے کوڑے لگائے گئے۔ ایسے موقعے پر جونہی تازیانہ کی ہر ضرب اس کی پیٹھ پر مسطر کھینچتی۔ تو وہ خود بآواز بلند اسے شمار کرتا۔ ایک — دو تین — چار — پانچ — اور جب مقررہ تعداد کوڑوں کی ختم ہو جاتی۔ وہ زبان سے نہایت مغلظ گالی بک کر کہتا "ایک اور لگاؤ ہاں ہاں ایک اور"۔ یہ کہکر وہ ایک جھنجھلائے ہوئے گوریلا کی مانند افسروں کی طرف جھپٹتا۔ وہ بے اختیار خائف ہو کر پیچھے قدم اٹھاتے تو وہ ایک زلزلہ فگن قہقہہ لگاتا۔ ریچھ کی طرح گھنے بال اس کے جسم پر تھے۔ تنگ پیشانی، قبل از تاریخ زمانے کا انسان نما حیوان جسے سائنسدان موجودہ انسان کا جدامجد سمجھتے ہیں۔ قد بہت لانبا۔ بڑے بڑے بازو۔ ہتھوڑے کی طرح بھاری ہاتھ۔ چھوٹی چھوٹی آنکھیں انگاروں کی طرح سُرخ گھنی بھوؤں میں آدھی چھپی ہوئیں۔

اردلی نے تھوڑی دیر بعد کہا: "بہتر ہو اگر حضور اس سے مل لیں۔ نمبر ۱۸۱"

"نمبر ۱۸۱۔ میں نے اس کا ریکارڈ دیکھا ہے۔ کیا وہی تو نہیں جسے نئی سڑک پر پتھر توڑنے کے لئے لگایا گیا ہے۔ اس کے وارڈر کہاں ہیں وہ کس کی اجازت سے یہاں آیا ہے۔ گارد سے کہو اسے فوراً لے جائے اور کل آرڈرلی روم میں پیش کیا جائے۔ جاؤ"۔

اردلی نے گھبرا کر کہا: "حضور بہتر ہو اگر آپ اسے بلا کر حکم دیں"۔

"تو کیا تم اس سے ڈرتے ہو؟"

"حضور میں اپنے لئے نہیں۔ آپ کے بچے کی خاطر۔ وہ آپ کے لڑکے کو پکڑ لایا ہے اور کوئی شخص اس کے قریب نہیں جا سکتا۔ آپ کے بچے کی جان خطرہ میں ہے"۔

کپتان میزے نے آنکھ جھپکے بغیر سر ہلایا: "اچھا اسے بلا لو"۔

نمبر ۱۸۱ ایک مخمور ریچھ کی سی چال کے ساتھ ایک آنکھ بند کئے لڑکھڑاتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ بچی کو بائیں ہاتھ میں اٹھائے ہوئے۔ دایاں ہاتھ بچی کی گردن پر۔ منہ کے گوشے میں سگرٹ سلگ رہا تھا۔ اس نے کپتان کی طرف دیکھا اور کہا: "بچہ سو رہا ہے"۔

کپتان:- "شکریہ تم اسے کہاں سے اٹھا لائے؟"

نمبر ۱۸۱ نے قہقہہ لگایا: "سنو کپتان بچوں کی سی باتیں نہ کرو۔ نہ مجھے بچہ سمجھو۔ میں تمہارے اس بچے کی تاک میں تین مہینے سے تھا۔ کتنی خوبصورت ہے یہ۔ کیا عمر ہوگی اس کی دو سال؟"

کپتان:- "دو سال کے قریب۔ ہاں"

نمبر ۱۸۱:- "خوب خوب! وہ ارمنی دایہ جو رکھی ہے نا آپ نے۔ اس کا ہمارے ایک دوست سے معاملہ ہے۔ وہ بچہ گاڑی کو ٹھہرا کر اس سے باتیں کرنے لگی۔ کہ میں لپک کر بچی کو اٹھائے یہاں آگیا۔ وارڈ عاشق معشوق کی باتیں سن رہے ہیں"۔

کپتان:- "بہت خوب!"

نمبر ۱۸۱:- "گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ ہم سب ایک دوسرے کے دوست بن سکتے ہیں۔ اگر آپ مجھے ریوالور کی گولی کا نشانہ بنائیں تو بھی مجھے اس ننھے بچے کی گردن مروڑنے اور ریڑھ کی ہڈی کو چکنا چور کر دینے کے لئے کافی وقت مل جائے گا۔ کافی وقت (بائیں ہاتھ سے بچہ کی چھاتی کو دباتے ہوئے) بس ذرا یوں کرنے کی دیر ہے۔ بچے کی ماں کو بہت دکھ ہوگا"۔

کپتان نے دبے ہوئے لہجے میں پوچھا: "تم کیا چاہتے ہو؟"

نمبر ۱۸۱:- "ہم چھ آدمی ہیں۔ چھ رائفلیں اور فی کس ۵۰ کارتوس ایک موٹر کار جو ہمیں سرحد تک پہنچا دے اور اس کے بعد ۱۰ دن کی خوراک"۔

کپتان:- "مجھے سرکاری مال کسی کے حوالے کر دینے کا اختیار نہیں۔ بالفرض اگر تم سرحد تک پہنچ گئے۔ تو تم شاہی محافظوں سے بچکر کس طرح نکل سکتے ہو"

"یہ بات ہم پر چھوڑیئے"۔ نمبر ۱۸۱ نے جواب دیا۔ "اور اگر آپ ہمیں رائفلیں نہیں دے سکتے تو پھر ایک اور بچے کے لئے آپ دعا کیجئے"۔

نمبر ۱۸۱ کے کھردرے ہاتھ بچے کی گردن کی طرف بڑھنے شروع ہوئے
"تمہیں اس کے لئے پھانسی کی سزا ملے گی۔" کپتان نے کہا۔

"اس زندگی سے موت بھلی" نمبر ۱۸۱ نے کہا۔ "بچہ میرے پاس رہیگا جونہی آپ کا ڈرائیور ہمیں سرحد کے قریب لے جائے گا۔ ہم بچہ اس کے حوالے کردیں گے۔ منظور ہے؟"

کپتان :۔ "نہیں"

نمبر ۱۸۱ :۔ "کیوں نہیں ؟"

کپتان :۔ "فرض ۔ یہ فوجی نشان۔"

نمبر ۱۸۱ :۔ "اپنی بیوی سے بھی یہی کہوگے ؟ فرض فوجی نشان ؟"

کپتان :۔ "ہاں بالکل یہی۔"

نمبر ۱۸۱ :۔ (دانت پیستے ہوئے) "تم مجھے مجبور نہ کرو!"

کپتان :۔ "میں کب چاہتا ہوں کہ میرے بچے کو ہلاک کردو۔"

نمبر ۱۸۱ :۔ "لیکن اسے ہلاک کرنا میرا فرض ہے۔ نئی سڑک پر پتھر توڑنے والے پانچ ساتھی میرا انتظار کررہے ہیں۔ معاہدہ ہوچکا ہے۔ اگر میں اسے ہلاک نہ کروں تو وہ میرا خاتمہ کردیں گے۔"

کپتان :۔ "ایک معاملہ میں تم مجھ سے اتفاق کررہے ہو۔ میں نے اپنا فرض بتادیا۔ تم نے اپنا فرض بتا دیا۔"

نمبر ۱۸۱ نے چیختے ہوئے کہا :۔ "میں اپنی زندگی میں ۹ آدمی ہلاک کرچکا ہوں۔ نویں آدمی کا میں نے کیونکر خاتمہ کیا۔ رومال میں ایک پتھر باندھ کر اسے گھمایا اور کمبخت کی کھوپری کو پاش پاش کردیا۔"

کپتان نے دائیں ہاتھ کی انگشت شہادت سے بچے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اس کی کھوپری کو دیکھا تم نے کتنی نرم ہے' یہ چھوٹے چھوٹے سنہری بال حلقہ باندھے اس کی حفاظت کررہے ہیں۔"

نمبر ۱۸۱ :۔ "نو میں ایک اور کا اضافہ ہونے والا ہے۔"

کپتان :۔ "سنو ۔ میں اب ایک سگرٹ جلاؤں گا۔ تمہیں غالباً معلوم ہوگا کہ میرے دراز میں ریوالور بھرا ہوا ہے۔ میں تمہیں غیر ضروری اشتعال نہیں دینا چاہتا۔ مجھے صرف سگرٹ کی ضرورت ہے۔"

نمبر ۱۸۱ نے سر ہلایا۔ کپتان نے دایاں ہاتھ میز کے اوپر رکھا اور بائیں ہاتھ سے سگرٹ اور دیا سلائی نکالی۔ سگرٹ کو دیا سلائی لگاتے ہوئے اس کی انگلیوں میں ذرا بھر ارتعاش نہ تھا۔ پہلے جلے ہوئے سگرٹ کا دھواں حلقے بناکر آہستہ آہستہ اُٹھ رہا تھا۔

نمبر ۱۸۱ :۔ "تو اب میں آخری جواب چاہتا ہوں۔"

کپتان نے کش لگاتے ہوئے کہا :۔ "بھلے آدمی ذرا سوچو۔ میں اس جیلخانے کا سپرنٹنڈنٹ' فوجی کپتان' تم مجھ سے یہ توقع رکھتے ہو کہ میں چھ مجرموں کو سرکاری رائفلوں اور گولی بارود سے مسلح کردوں اور پھر خود ہی رہا کردوں۔ یہ تو تم جانتے ہو کہ بچے کی موت ۔۔۔۔۔۔

یکایک بچی نے آنکھیں کھول دیں۔ اور ادھر اُدھر دیکھا۔ پھر ننھے ننھے ہاتھوں نے قیدی کے بالوں کو پکڑ لیا۔ پھر گھبرا کر انہیں چھوڑ دیا۔ پھر اس کی نظر اپنے باپ پر پڑی اور اس نے رونی صورت بناتے کہا۔ "ابّا"

نمبر ۱۸۱ نے بچی کی چھاتی کو دونوں ہاتھوں سے دبایا۔ اس کی آنکھوں میں ایک خوفناک چمک پیدا ہوئی۔ اس کے بڑے بڑے پیلے دانت گھنے بالوں میں سے نمودار ہوئے۔ بچی نے اس کی طرف دیکھا اور ایک گھونسہ تان کر قیدی کی ٹوٹی ہوئی ناک پر مارا۔ قیدی کا سارا جسم کانپ اٹھا اور اس نے کہا :۔

"اسے کوئی خوف نہیں۔ بالکل میری طرح۔ کپتان لوگ مجھ سے کہتے ہیں کہ جب میں چھوٹا سا تھا تو کسی سے نہیں ڈرتا تھا۔ رونے کی بجائے دوسروں کو پیٹ ڈالتا تھا۔ اوہ اتنا نڈر بچہ! کپتان یہ نہ سمجھو کہ میں تم سے خائف ہوں' مجھ ایسے بہادر کبھی کبھی پیدا ہوتے ہیں۔ انہیں بچپن میں ہلاک کردینا اچھا نہیں یہ لو اپنے بہادر بیٹے کو سنبھالو۔ میری دعا ہے کہ میری طرح دنیا کو چیلنج دیتا رہے۔"

یہ کہکر نمبر ۱۸۱ نے بچہ کو میز پر رکھ دیا۔ اور ابھی وہ لوٹنے کو تھا کہ کپتان نے کہا۔ "ٹھہرو! میں جانتا تھا کہ تم ایسا بہادر اس معصوم کو جان سے نہیں مار سکتا۔ میں تمہاری سفارش کروں گا کہ تمہیں یہاں سے بدل دیا جائے۔"

"دیکھو کپتان۔ مجھے معاوضہ دینے کی کوشش نہ کرو۔ تم مجھے معاوضہ دے نہیں سکتے۔" اتنا کہا اور ایک بدمست انداز میں جھومتا ہوا باہر نکل گیا۔

جمیل نے کہا۔ کہ نمبر ۱۸۱ کے باہر جانے کی دیر تھی کہ کپتان نے مجھ سے کہا۔ "مجھے ایک پیگ دو ۔ اوہ بخدا" وہ بیہوش ہوچکا تھا۔

ہم نے جمیل سے پوچھا۔ "کپتان میرے نے اسے جیل خانہ سے تبدیل کرنے کی کیوں کوشش کی ؟"

جمیل نے جواب دیا :۔ "نمبر ۱۸۱ کے دوسرے ۵ ساتھی اس کی جان کے لاگو ہوگئے تھے۔ کپتان ۲۴ گھنٹے بیہوش رہا۔"

"۲۴ گھنٹے ؟" ہم نے کہا۔

"برانڈی سے اس کے ہوش قدرے بجا ہوئے اس نے حکم دیا۔ جاؤ جلدی جاؤ نمبر ۱۸۱ کو وہ لوگ مار ڈالیں گے۔"

"اس دوران میں نمبر ۱۸۱ کے دوستوں نے اسے غدار سمجھ کر ہلاک کردیا تھا کپتان نے قلعے کے مغربی دروازہ کے پاس اس کی قبر بنوائی۔ اس پر پھول چڑھانے کے لئے یہ ہر سال آتا ہے۔"

لوگ اسے ابھی تک قیدی کی قبر کہتے ہیں اور شاید ہی کوئی پنجابی ہوگا۔ جس نے اس کی زیارت نہ کی ہو۔ اور اس شخص کی یاد میں چند آنسو نہ بہائے ہوں جو جیل کے کاغذات میں نمبر ۱۸۱ کی حیثیت سے مشہور تھا ؂

فرار

میری امید کے چہرے پہ ہے نکھار ابھی
بجھی نہیں ہے مری شمع انتظار ابھی
دل حزیں کے کسی تابناک گوشے میں
کسی کی یاد کا پرتو ہے زرنگار ابھی

نہیں کہ جینے سے بیزار ہو چکا ہوں میں
نہیں کہ آس کی کشتی ڈبو چکا ہوں میں
مگر تلاش ہے ناممکنات کی مجھکو

مری نگاہِ تخیّل ہے اس نظارے پر
افق کے پاس لرزتے ہوئے ستارے پر
میں جا رہا ہوں وہاں چاند کے شکارے پر

(۲)

یہ دہر کروٹیں بدلے گا لاکھ بار ابھی
نہیں ہے بندوں سے مایوس کردگار ابھی
ہزاروں قافلے رنگینیوں کے گزریں گے
زمانہ دیکھے گا فطرت کے شاہکار ابھی

نہ ہوں گا میں ہی مگر اس طرب کی بستی میں

بہار بھی ہے یہاں چاندنی بھی مے بھی ہے
مجھے تلاش ہے جس کی کہیں وہ شے بھی ہے
میں اس کو ڈھونڈنے جاتا ہوں کہکشاں کے قریب
زمیں سے دور کسی اور آستاں کے قریب
شکستہ پر کو پہنچنا ہے آشیاں کے قریب

چودہری منظور احمد منظور

نوشتہ: گیبریل ڈانزیو — مترجمہ: شہاب سلمانی

"قربانی"

سینٹ گون سیلو کے بڑے بڑے جھنڈے ہوا میں لہرا رہے تھے۔ طاقتور اور ورزشی بدن والے آدمی جن کے چہرے سرخ اور گردنیں اتنی تنی ہوئی تھیں۔ ان کو نہایت ہوشیاری کے ساتھ لیجا رہے تھے۔

ریڈوسا کے لوگوں پر فتح پانے کے بعد میں کیلیکو کے رہنے والوں نے یہ "ستمبر کا جشن" بہت شاندار طریقہ سے منایا تھا۔ مذہب کی شدید رغبت نے ان کی۔ وحول کو عروج پر پہنچا دیا تھا۔ سب لوگ موسم خزاں کی پیداوار کو اپنے سرپرست دیوتا پر بھینٹ چڑھا رہے تھے۔ کھڑکیوں میں سے عورتیں اپنے گھونگٹ اٹھائے جلوس کو بڑی عقیدت کی نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ آدمیوں نے دروازوں کو سبز ہاروں سے سجایا ہوا تھا اور دہلیزوں پر سرخ و سپید پھول بچھے تھے۔ اور سڑک کی ہر چیز سجی ہوئی نظر آ رہی تھی جس کا اثر مجمع کو مست کر رہا تھا۔

جلوس گرجا سے ایک ندی کی مانند بہتا، بل کھاتا آ رہا تھا۔ اور چوک میں آ کر مختلف مجمعوں میں تقسیم ہو جاتا تھا۔ قربان گاہ کے سامنے جس پر سے سینٹ لیونے کو ابھی ابھی اتارا گیا تھا۔ آٹھ آدمی کھڑے تھے۔ یہ وہ چند اشخاص تھے جن میں سینٹ گون سیلو کے بت کو اٹھانے کا حق بخشا گیا تھا۔ ان کے نام ترتیب وار یہ تھے۔ جیوانی کیورو، ای آدبا، لڈو میٹیا اور ڈون سینزیو گوانو۔ وکوڈ سیوزو۔ بیتی ڈوٹے گیانٹے۔ بیا جیو ڈکلسکی۔ جیوانی سینزا لیرا — وہ بالکل خاموش اپنی اہم خدمت کو جانتے ہوئے اور اس کو جلد ہی انجام کو پہنچانے کے لئے مضطرب کھڑے تھے۔ ان کی قطار بھی جلوس کی دلچسپی کا باعث تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے قوی ہیکل دیو کھڑے ہیں جو آکاش سے دیوتا گون سیلو کے بت کو اٹھانے کے لئے خاص طور پر بھیجے گئے ہیں۔ ان کے کانوں میں سونے کی بھاری بالیاں لٹک رہی تھیں اور آنکھوں میں مذہبی جوش کی چمک ہویدا تھی۔ تھوڑے تھوڑے وقفہ سے وہ اپنے برہنہ بازوؤں کو دیکھتے اور سینہ پر نظر ڈالتے ہوئے نبض کی حرکت کو سنتے۔ گویا وہ یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ ان کی طاقت ان کو اس اہم خدمت کے انجام دینے میں جواب تو نہیں دیدیگی کبھی کبھی ان کے چہروں پر ہلکی سی مسکراہٹ دوڑ جاتی۔

سرپرست دیوتا کا بت وزن اور جسامت دونوں میں بہت بڑا تھا۔ اس کا جسم سیاہ پیتل کا اور ہاتھ اور سر چاندی کے بنے ہوئے تھے۔

"ہوشیار!" مینا او کی کرخت آواز گونجی۔

لوگ ہر طرف سے جلوس دیکھنے کے لئے جمع ہونے لگے۔ کھڑکیاں ہوا کے تیز جھونکے کے ساتھ کھڑکھڑانے لگیں۔ گرجا کے اندر لوبان اور عود کے دھوئیں منڈلا رہے تھے۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پورا اندرونی منظر دھوئیں میں ڈوب گیا ہے۔ باجوں کی آواز کبھی صاف سنائی دینے لگ جاتی۔ اور کبھی دور بہت دور غائب ہو جاتی۔ آٹھوں آدمیوں نے جو کہ اب تمام بھیڑ بھاڑ میں صاف نظر نہیں آتے تھے اور مذہبی جوش میں بھرے ہوئے تھے اپنے ہاتھ پھیلائے — وہ روانہ ہونے کے لئے بہت بیتاب تھے۔

"ایک — دو! — تین —" مینا او نے زور سے پکار کر کہا۔

آٹھوں آدمیوں نے اپنی مجموعی طاقت لگا کر قربان گاہ سے بت کو اٹھانا چاہا لیکن وہ بہت زیادہ بھاری ہونے کی وجہ سے سیدھا نہ اٹھ سکا۔ اور بائیں جانب کو تھوڑا جھک گیا۔ ان لوگوں کو بت کے پاؤں مضبوطی سے پکڑنے کے لئے ذرا سا بھی وقت نہ مل سکا وہ سب اپنا وزن سنبھالنے کے لئے تھوڑے سے آگے کو جھکے لیکن ان میں سے دو بیا جیو ڈکلسکی اور جیوانی کیورو جو زیادہ نو عمر اور ناتجربہ کار تھے بت کو نہ سنبھال سکے اور اس کو چھوڑ دیا — وہ پرشور آواز کے ساتھ لڑھک پڑا — اولڈو کے منہ سے ایک دلدوز چیخ نکل گئی!

"دیکھنا! — دیکھنا! —" سب طرف سے آوازیں آنا شروع ہوئیں۔ اور تھوڑی دیر میں یہ آوازیں ایک کان پھوڑ دینے والے شور و غل میں تبدیل ہو گئیں۔

اومالڈو اپنے گھٹنوں کے بل گر پڑا۔ بیا جیو ڈکلسکی اور جیوانی کیورو کے بت کو چھوڑ دینے کے بعد اس نے بت کو سنبھالنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکا اور اس کا سیدھا ہاتھ بت کے نیچے دب گیا۔ لیکن اس نے بت کو کوئی گزند نہ پہنچنے دی — اس کی آنکھیں اپنے ہاتھ پر جمی ہوئی تھیں۔

جیسے بت کے نیچے سے نکالنے کی اس میں طاقت نہیں تھی اس کی آنکھیں دہشت اور تکلیف سے پھٹی کی پھٹی ہی رہ گئیں۔ اس کا چہرہ شدت تکلیف اور درد کی وجہ سے تبدیل ہو گیا تھا لیکن اس نے منہ سے کوئی آواز نہ نکالی۔ نہ ہی اپنی حرکات سے بے چینی ظاہر کی — خون قربان گاہ سے ٹپک رہا تھا!

اس کے ساتھیوں نے بت کو اٹھانا چاہا لیکن اس نے منہ سے کوئی آواز نہ نکالی۔ نہ ہی اپنی حرکات سے بے چینی ظاہر کی۔ خون قربان گاہ پر سے ٹپک رہا تھا!

اس کے ساتھیوں نے بت کو اٹھانا چاہا لیکن یہ کوئی آسان کام نہ تھا — اومالڈو کا چہرہ شدید اور جان کن تکلیف کی وجہ سے اینٹھ گیا — قریب کھڑی ہوئی عورتیں یہ دلدوز منظر دیکھ کر خوف سے لرز اٹھیں۔

آخر کار بت بڑی مشکل سے اٹھایا گیا۔ اوراوبالڈو کا ہاتھ اس کے نیچے سے نکالا گیا — وہ بالکل کچل گیا تھا۔ اور خون میں لت پت ہو رہا تھا — اسے اب ہاتھ نہیں کہا جا سکتا تھا بلکہ وہ ایک بے شکل، بدڈول گوشت کا لوتھڑا رہ گیا تھا۔

"فوراً گھر چلے جاؤ! — تمہیں دیوتا کی قسم فوراً!" جلوس میں سے مختلف آوازیں آئیں اور لوگوں نے اسے زبردستی گرجا کے دروازے کی طرف لیجانا چاہا — لیکن وہ اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ ایک عورت نے اپنے رومال سے اس کے ہاتھ کو باندھنا چاہا۔ لیکن اومالڈو نے انکار کر دیا۔ وہ خاموش کھڑا ان لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔ جو بُت کے آس پاس کھڑے کسی بات پر جھگڑا کر رہے تھے۔

"میری باری ہے!"

"نہیں۔ اب میری باری ہے!"

"نہیں میری باری ہے!"

گلو پونو میٹیا اسکارفورولو۔ اور ٹامیسو کلسکی میں سے ہر ایک اومالڈو کی جگہ لینا چاہتا تھا۔

اومالڈو آہستہ آہستہ چل کر ان لوگوں کے پاس پہنچا۔ اس کا زخم خوردہ ہاتھ لٹک رہا تھا۔ اور اس میں سے خون کا فوارہ چھوٹ رہا تھا۔

"یہ جگہ میری ہے! — یہ میرا فرض ہے۔ میں ہی اسے انجام دوں گا!" اس نے کہا اور بُت کو سنبھالنے کے لئے اپنا شانہ لگا دیا۔ اس نے اندرونی تکلیف کو چھپانے کے لئے دانت داب رکھے تھے۔

"یہ تم کیا کر رہے ہو؟" میٹیا آو نے ازراہ ہمدردی پوچھا۔

"جو دیوتا گون سیلوو کی مرضی ہو!" اس نے کہا اور جلوس کے ساتھ بُت کو کاندھا دیئے چلنے لگا۔ لوگ اس کی بہادری پر عش عش کر رہے تھے! اس کا زخمی بدڈول ہاتھ لٹکا رہنے کی وجہ سے سیاہ رنگت اختیار کرتا جا رہا تھا — کبھی کبھی حیرت زدہ لوگ اس سے پوچھتے۔

"اومالڈو! — تکلیف کا کیا حال ہے؟"

اومالڈو جواب نہیں دیتا۔ اس میں جواب دینے کی طاقت نہیں تھی لیکن وہ بینڈ کے ساتھ قدم اٹھانے میں ہمیشہ منہمک رہتا — مجمع برابر بڑھتا جا رہا تھا" اومالڈو کا سر بھاری ہو رہا تھا۔ اور اس کی آنکھوں میں دھند چھانے لگی تھی لیکن وہ ہوا میں لہراتے ہوئے جھنڈے کے نیچے اپنے ساتھیوں کے ساتھ ساتھ قدم اٹھائے چل رہا تھا۔ ایک سڑک کے موڑ پر یکایک اومالڈو بیٹھ گیا — تھوڑا سا جھٹک گیا۔ ایک لمحہ کے لئے جلوس کی رفتار ہلکی ہو گئی لیکن فوراً ہی پھر وہ تیزی سے روانہ ہو گیا۔ اومالڈو کی جگہ میٹیا اسکارفرولا کو مل گئی — دو رشتہ دار بے ہوش اومالڈو کو اٹھا کر قریب کے کسی مکان میں لے گئے۔

این ڈیسیوز ایک بوڑھی اور تجربہ کار عورت نے جو کہ زخموں کے مندمل کرنے میں ماہر تھی۔ اومالڈو کے ہاتھ کو دیکھ کر نفی میں سر ہلا دیا —

"میں کچھ نہیں کر سکتی! — میں مجبور ہوں۔

اس معاملہ میں اس کا فن بالکل بیکار تھا۔

اومالڈو ہوش میں آیا — اب بھی اس کے منہ سے کراہنے یا رونے کی آواز نہ نکلی۔ اس نے خاموشی اسی طرح اختیار کر رکھی تھی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا سنجیدگی اور خاموشی سے اپنے زخم خوردہ ہاتھ کو دیکھا — وہ اب قطعی بیکار ہو چکا تھا۔ اس کا گوشت مع ہڈی کے چور چور ہو گیا تھا۔ ہاتھ کو ذرا سی حرکت دینا گویا قیامت کو بلانا تھا۔

دو تین اشخاص اسے اور دیکھنے آئے۔ اور انہوں نے بھی یہی رائے ظاہر کی

"دیوتا کو کون لے گیا؟" اومالڈو نے ان سے دریافت کیا۔

"میٹیا اسکارفیرولا" انہوں نے جواب دیا۔

"اور وہاں پر اب کیا ہو رہا ہے؟ — کیا جلوس گشت کر کے واپس آ گیا؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں آ گیا — اور اب شام کی نماز اور گانا ہونے والا ہے!" انہوں نے کہا ان لوگوں نے اسے خدا حافظ کہا اور "شام کی نماز" کے لئے روانہ ہو گئے۔

گرجا کی گھنٹیوں کی سہانی جھنکار صاف سنائی دے رہی تھی۔

ایک رشتہ دار نے اومالڈو کے پاس ٹھنڈے پانی کا برتن لا کر رکھ دیا اور کہا "اب ہم جا رہے ہیں" شام کی نماز کی گھنٹیاں بجنا شروع ہو گئی ہیں۔ تم اپنا ہاتھ اس میں رکھ لو۔ شاید اس سے کچھ تکلیف دور ہو جائے۔

اور وہ چلے گئے —

اومالڈو اکیلا رہ گیا — وہ کسی گہری سوچ میں غرق تھا۔

گھنٹیوں کی آواز کا سُر بدلا اور وہ اب زور زور سے بجنے لگیں دن تقریباً ختم ہونے والا تھا۔ اندھیرا پھیلنے والا تھا — ہوا کے جھونکوں سے زیتون کی شاخیں روشندانوں کے شیشوں سے لگ لگ کر عجیب خوفناک اور کریہہ آوازیں پیدا کر رہی تھیں! ——

آہستہ آہستہ اومالڈو نے اپنا ہاتھ دھونا شروع کیا۔ اور جب جمے ہوئے خون کے چھلکے علیحدہ ہوئے تو معلوم ہوا کہ زخم کتنا خوفناک تھا۔

"ہاتھ بالکل ضائع ہو گیا ہے — اب اس کی فکر بیکار ہے!" اومالڈو نے سوچا "دیوتا گون سیلوو! میں اس کو تیرے اوپر قربان کر دوں گا!" وہ یکایک چلا اٹھا "میری اس سال کی قربانی میرا ہاتھ ہو گی —!"

اس میں کیا معلوم کہاں سے چُستی آ گئی۔ اس نے ایک بڑا سا چاقو پکڑا اور روانہ ہو گیا — تمام سڑکیں سنسان پڑی تھیں۔ سب نیک لوگ گرجا میں جمع تھے۔ مکانوں کی چھتوں کے اوپر دودھیا رنگ کے بادل سنبر کی شفق میں رنگے ہوئے اڑ رہے تھے اومالڈو نے سوچا کہ اس کے ہاتھ سے نکلا ہوا خون بادل کی شکل اختیار کر کے "سورگ" کی طرف جا رہا ہے۔

گرجا میں اس وقت تمام سانس کے ساتھ کورس میں مشغول تھے۔ انسانی جسموں قندیلوں اور موم بتیوں کی گرمی نے گرجا کے اندر کی ہوا کو بہت بھاری کر دیا تھا۔ اور وہاں حبس ہو جانے کی وجہ سے سانس لینا دشوار تھا۔ دیوتا گون سیلوو کا سیمیں چہرہ مجمع کے اوپر ایک روشن ستون و منور مینار کی طرح چمک رہا تھا۔

اومالڈو گرجا میں داخل ہوا۔ بڑی مشکل سے بھیڑ کو چیر کر وہ قربان گاہ تک پہنچ سکا "دیوتا! — مقدس گون سیلوو! — میں یہ تیرے اوپر قربان کرتا ہوں!"

اس نے مضبوط اور کرخت آواز میں کہا — اور جوش میں آکر چاقو سے تیزی کے ساتھ اپنے سیدھے ہاتھ کو کلائی پر سے کاٹنا شروع کر دیا — حیرت زدہ عقیدت گذار دل پر قیامت کی سی خاموشی چھا گئی — کورس بند ہو گیا! — بدڈول ہاتھ آہستہ آہستہ بازو سے علیحدہ ہو گیا — ایک لمحہ تک وہ بازو سے الجھا رہا۔ اور پھر دیوتا کے قدموں میں روپیہ پیسے کی قربانیوں کے درمیان میں گر پڑا — !

اومالڈو نے فوارہ کی مانند خون بہتے ہوئے بازو کو ہوا میں ہلا کر زور سے کہا۔

"مقدس گون سیلو! میری اس حقیر قربانی کو قبول کر! — میں اسے تیرے اوپر قربان کرتا ہوں!!"

گرجا میں اتنی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ کہ اس کی آواز بہت دیر تک گونجتی رہی — سب کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں — لیکن اومالڈ کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو رقص کر رہے تھے!!

نغمۂ زندگی

(۱)

میں نے مانا زندگی اک خواب ہے
پھر بھی ہے یہ خواب کتنا دلفریب
سیم و زر کے قصر و ایواں اس میں ہیں
چپہ چپہ اس کا ہے اک خلد زار

(۲)

میں نے مانا زندگی ہے اک خیال
پھر بھی کتنی دلفریبی اس میں ہے
اللہ اللہ، اس کی رنگ آرائیاں
سحر سا ہے روح پر چھایا ہوا

(۳)

میں نے مانا زندگی ہے اک سراب
پھر بھی ہے یہ کس قدر نزہت اثر
موجزن تسنیم و کوثر اس میں ہیں
اس میں اٹھلاتی ہے جنت کی بہار

(۴)

میں نے مانا زندگی ہے اک فریب
پھر بھی یہ کتنا کشش انگیز ہے
اس کا ہر گوشہ ہے اک رنگیں طلسم
کھینچتا ہے دل کو جو بے اختیار

(۵)

میں نے مانا زندگی ہے اک حباب
پھر بھی کتنی استقامت اس میں ہے
اللہ اللہ اس کی رفعت کا فراز
قصر گردوں پر بھی جو ہے خندہ زن

(۶)

میں نے مانا زندگی ہے اک خمار
پھر بھی ہے یہ کس قدر کیف آفریں
اپنی فہمائش سے رکھ مجھکو معاف
زندگی کے جام پینے دے ندیم

زندگی جب تک ہے جینے دے ندیم

مولانا ابو محمد امام الدین رامنگری

سید اختر رحمن ہیڈ ماسٹر
ایم۔ بی ہائی سکول بٹالہ

ہائی جماعتوں میں انگریزی درسی کتب کی ضرورت

کسی زبان اور اس کے علم ادب کی تعلیم کی غایت صرف یہ ہوتی ہے کہ نوجوان طلبا اور طالبات کو زیور انسانیت سے آراستہ کیا جائے۔ اس نظریہ کے پیش نظر ہائی جماعتوں کے انگریزی نصاب کا کام بھی یہی ہونا چاہیئے۔ کہ طالبعلموں کی مدنی اور خانگی زندگی کے لئے تیار کیا جائے۔ یہ درست ہے کہ تعلیم و تربیت کا واحد ذریعہ کتابیں ہی نہیں لیکن کتابوں کے مطالعہ سے حظ اٹھانے کی اہلیت کی تخلیق نظام تعلیم کا ضروری جزو ہونا چاہیئے۔ مدارس کا فرض ہے۔ کہ اپنے طلبا میں یہ اہلیت پیدا کریں ہمیں طلبا کی ذہنی حالت کے ارتقا کو ہر وقت مدنظر رکھنا چاہیئے جس کا انحصار بڑی حد تک طلبا کی قدرت الفاظ پر ہے کیونکہ اس کے بغیر خیالات و فکر کا تسلسل غیر ممکن ہے بنا بریں یہ مطالبہ ناجائز نہیں کہ طلبا میں دو چیزوں کی اہلیت کا ہونا از بس لازمی ہے (۱) ان میں یہ اہلیت ہونا چاہیئے کہ دوسروں کے خیالات کو سمجھ سکیں اور اپنے خیالات کو سادہ اور غیر مبہم الفاظ میں ادا کر سکیں (۲) ان میں یہ صلاحیت ہونی چاہیئے کہ کتابوں کے علمی ذخیروں سے استفادہ کر سکیں۔ بنی نوع انسان کے مجموعی تجربات حیات تک ان کی رسائی اشد ضروری ہے۔ اور کتابوں کے ذریعہ کے بغیر ان نادر خزینوں کا حصول ممکن نہیں اگر کوئی طالب علم ذوق شوق سے کچھ کتابوں کا مطالعہ کرے اور انہیں اپنا محرم راز سمجھنے لگ جائے۔ تو بلاشبہ اُسنے تہذیب انسانی سے بہرہ ور ہونے کا بہترین ذریعہ حاصل کر لیا پس مجمل طور پر یہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ مطالعہ کتب سے دو فوائد مترتب ہوتے ہیں۔ ذہنی سرور اور اکتساب علم۔ سکولوں میں درسی کتب کا وجود لازمی ہے اور متذکرہ صدر مقاصد کے حصول کے لئے ضروری ہے کہ عمدہ ترین کتب کا انتخاب عمل میں لایا جائے۔ یہ کتابیں یا تو داخل نصاب کی جا سکتی ہیں۔ اور یا طلبا لائبریریوں میں ان کا مطالعہ کر سکتے اصطلاحی طور پر درسی کتب سے وہ کتابیں مراد ہیں جو علم کے کسی شعبہ میں بہترین اور معرکتہ الآراء تصانیف شمار کی جاتی ہوں لیکن تعلیمی اداروں کی اصطلاح میں درسی کتاب سے ہر وہ کتاب مراد ہے جو کمرہ جماعت میں مطالعہ یا حوالہ کے لئے تجویز کی گئی ہو بمقالہ ہذا میں ہم درسی کتاب سے وہی کتاب مراد لیں گے جس میں سے امتحان کے سوالات پوچھے جاتے ہوں۔

پچھلے سال پنجاب یونیورسٹی نے فیصلہ کیا کہ میٹرک کلاسوں کے لئے درسی کتب بند کر دی جائیں۔ اور صرف چند کتب کے مطالعہ کی سفارش پر اکتفا کی جائے اس فیصلہ کو نافذ کرنے سے پہلے یونیورسٹی نے رائے عامہ سے استصواب کرنا ضروری خیال نہیں کیا۔ اور نہ ہی کسی تحقیقاتی کمیٹی کے قیام کو ضروری خیال کیا گیا۔ دیگر متمدن ممالک میں جب کبھی اس قسم کی بنیادی تبدیلی عمل میں لائی جاتی ہے۔ پہلے کمیٹیاں اور کمیشن مقرر کئے جاتے ہیں جو معاملہ کے ماعلیہ پر پوری شرح و بسط سے غور کرنے کے بعد اس کے جواز کا فیصلہ دیتے ہیں لیکن یونیورسٹی پنجاب نے ان باتوں کو رسمی خیال کر کے ضروری نہیں سمجھا بعض احباب کا خیال ہے کہ یونیورسٹی کا یہ فیصلہ ایک سنسنی پیدا کرنے والے قانون کی حیثیت رکھتا ہے لیکن ایسی رائے کے اظہار سے پہلے ضروری ہے کہ ان حالات کا جائزہ لے لیا جائے جن سے یونیورسٹی اس اقدام پر مجبور ہوئی۔ وہ حالات مختصراً حسب ذیل ہیں:۔

(۱) یہ محسوس کیا جا رہا تھا کہ انگریزی کا معیار دن بدن پست ہوتا جا رہا ہے (ب) چونکہ یونیورسٹی اس بات پر مصر رہتی رہی ہے کہ نتائج ایک خاص حد تک کم نہ ہونے پائیں اس لئے اس حد کو برقرار رکھنے کے لئے صلاحیت کو نظرانداز کر دیا جاتا رہا (ج) طلبا انفرادی مطالعہ کی طرف مطلق توجہ نہ دیتے تھے۔ اور یہ امر جوہر قابل کی نشوونما کے لئے سخت سد راہ اور کتابی کیڑوں کی افزائش کا موجب بن رہا تھا (د) کتابوں کی تجارت چند بارسوخ تاجروں کا اجارہ بن رہی تھی۔ اس لئے موزون کتب کی فراہمی میں وقت پیش آ رہی تھی۔

اس میں کلام نہیں کہ یونیورسٹی کے عزائم نہایت نیک تھے لیکن اصلاح کے جو ذرائع تجویز کئے گئے ہیں وہ تمام خرابیوں کے استیصال کے لئے کافی نہیں۔ اب ہمیں مسئلہ کے دوسرے پہلو پر بھی روشنی ڈالنی چاہیئے۔ درسی کتب طلبا کے سامنے ایک معین نصب العین رکھ دیتی ہیں اور ان کے ذہنی ارتقا کے حسب حال ایک مناسب معیار مقرر کر دیتی ہیں۔ ہمارے نصب العین کے حصول کے لئے درسی کتب سنگ راہ نہیں بلکہ امتحانات کا ہوا۔ انگریزی زبان کے کسی استاد سے ذرا پوچھ کر دیکھیں کہ اس کے ذہن میں انگریزی پڑھانے کا مقصد کیا ہے۔ لامحالہ وہ یہی جواب دیگا کہ وہ زیادہ سے زیادہ طلبا کو امتحان میں کامیاب کرانا چاہتا ہے گویا اس کے نقطہ نگاہ سے وسایل و ذرائع نصب العین کا درجہ رکھتے ہیں۔ لازمی طور پر وہ غلط طریق کار اختیار کرتا ہے۔ اور درسی کتب پر تمام تر توجہ مرکوز رکھتا ہے۔ لیکن اس میں استاد بےقصور ہے وہ رائے عامہ کی خوشنودی کا خواہشمند ہے۔ والدین کے نقطہ نظر سے یونیورسٹی کا سرٹیفکیٹ ہی کامیابی کا معراج ہے۔ کیونکہ بدقسمتی سے یہ ان کی سب سے بڑی خواہش یعنی حصول ملازمت کا ذریعہ ہے۔ عوام کسی سکول کی کامیابی کا اندازہ اس کے یونیورسٹی نتائج سے لگاتے ہیں۔ اگر نتائج خاطر خواہ ہوئے تو سکول یقیناً عوام کی توجہ کا مرکز ہوگا ورنہ بصورت دیگر مورد ملامت جبتک امتحانوں کی لعنت موجود ہے اور اس کی اصلاح کی کوئی تدبیر عمل میں نہیں لائی جاتی

مطلوبہ مقاصد کا حصول ناممکن ہے دیگر ممالک میں حصول ملازمت کے لئے الگ امتحانات مقرر ہیں۔ یونیورسٹی کی سند ملازمت کے لئے کافی خیال نہیں کی جاتی کسی محکمہ میں داخل ہونے سے قبل خاص نصاب اور خاص امتحانات میں کامیابی لازمی ہوتی ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے ہمارے موجودہ نظام امتحانات کے نقائص محض درسی کتب کے بند کر دینے سے دور نہیں ہو سکتے۔ مگر کسی موثر اصلاح کی عدم موجودگی میں درسی کتب ایک حد تک منفعت بخش ہیں۔ اولاً یونیورسٹی حتمی طور پر معلوم کر سکتی ہے کہ اس کے طلبا کے ہاتھوں میں کس قسم کا مواد دیا گیا ہے۔ ثانیاً ان کی عدم موجودگی میں طلبا ان کتب کے مطالعہ کی بھی چنداں پروا نہیں کرتے جن کی یونیورسٹی نے سفارش کر دی ہو۔ بلکہ ان کی تمام تر توجہ اس امر کی طرف صرف ہوتی ہے کہ کسی نہ کسی طریق سے ممتحن کے رجحانات کا پتہ لگایا جائے۔ متوقع سوالات کی تلاش کی جائے وغیرہ۔ اس دھن میں وہ لغو ترین تصنیفات کی چھان بین میں اپنا وقت ضائع کرتے ہیں۔ اس کا لازمی نتیجہ گھٹیا درجہ کے خلاصوں کی روز افزوں افزائش کے سوا کیا ہو سکتا ہے۔ یونیورسٹی ان تصنیفات پر کوئی پابندی عاید نہیں کر سکتی۔ خواہ وہ اخلاق سوز باتوں سے مملو ہی کیوں نہ ہوں۔ اس کا نتیجہ ذہنی ارتقا کی بجائے ذہنی تسفل ہونا کچھ عجیب نہیں مزید براں یہ صورت حالات رٹنے کی عادت کی حوصلہ افزائی کا بھی موجب ہوگی۔ جو کہ یونیورسٹی کے نصب العین کے سخت منافی ہے۔

یونیورسٹی کا یہ خیال کہ درسی کتب رٹنے کی عادت کا موجب ہیں کچھ وزنی نہیں علم تعلیم کے تمام ماہرین اس امر پر متفق ہیں کہ کسی غیر ملکی زبان سیکھنے کے لئے رٹنا ایک حد تک ناگزیر ہے اگر طلبا الفاظ کے معانی کو ذہن نشین کرنے کے بعد انہیں رٹ لیں اور ان کے برمحل استعمال پر قادر ہوں تو ایسا رٹنا قابل اعتراض قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اب درسی کتب کی عدم موجودگی میں بھی رٹنے سے نجات ممکن نہیں طلبا کو محاورات، الفاظ اور انگریزی زبان کے دیگر ضروری قواعد کو رٹنے کے سوا چارہ نہیں۔ درسی کتب کی تنسیخ نے طلبا کو ان کی عمر کے نازک ترین دور یعنی آغاز بلوغت کے زمانہ میں کسی رہنما کے بغیر اور کسی نصب العین کی تعین کے بغیر چھوڑ دیا ہے تاکہ وہ لغویات سے لبریز بازاری کتب کے ہجوم میں کھوئے جائیں۔ اس امر کی اہمیت پر جس قدر بھی زور دیا جائے کم ہے کہ جس طرح اخلاق کی اچھی عادات کی تشکیل کے لئے ضبط و تعین کی ضرورت ہے اسی طرح مطالعہ کی اچھی عادات بھی ان قیود کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتیں۔ روحانی غذا کا التزام ایسا ہی ضروری ہے جیسا جسمانی غذا کا۔ لہٰذا ہر دو کے انتخاب میں حد درجہ کی احتیاط لازمی ہے۔ اگر طلبا کی حس مطالعہ متنفر نہیں تو اچھی کتب ان کے ذوق پر گراں گذرینگی۔

مزید براں درسی کتب کا عدم تعین نوجوان طلبا کے لئے سہولت کی بجائے حیرت و تشویش کا موجب ہو سکتا ہے۔ حوالہ کے لئے کتب کی فراوانی ضروری ہے لیکن کسی خاص مضمون کے مطالعہ کے لئے چند چیدہ کتب کا تعین لابدی ہے۔ طلبا کو ایک دو اہم ترین تصنیفات پر پورا عبور حاصل کرنے کے لئے مجبور کرنا از بس لازمی ہے۔ یہ امر بالکل لایعنی ہے کہ وہ لاتعداد کتب کے بھنور میں کھوئے رہیں اور کسی ایک کے متعلق کوئی وسیع معلومات بہم نہ پہنچا سکیں۔

پس ظاہر ہے کہ یونیورسٹی نے جن امور کی اصلاح کی ٹھانی تھی۔ وہ جوں کے توں موجود رہیں گے۔ خواہ درسی کتب کا وجود ناپید ہی کیوں نہ کر دیا جائے۔ امتحانات اپنی پوری ضرر رسانیوں کے ساتھ یونیورسٹی کے قلب و روح پر چھائے رہیں گے۔ اور رٹنے کے تمام محرکات باقی رہیں گے۔ بلکہ پہلے سے قوی تر شکل میں نمودار ہوں گے اور موزوں کتب کا انتخاب پہلے سے بھی دشوار ہو جائیگا۔

درسی کتب کی تنسیخ کوئی نئی اور انوکھی سکیم نہیں۔ پنجاب یونیورسٹی اس سے پہلے اس کا تجربہ کرنے کے بعد درسی کتب کی ترویج پر مجبور ہو چکی ہے۔ اس وقت یونیورسٹی نے خود اس امر کا اعتراف کیا تھا کہ یہ اقدام بے شمار ضروری اصلاحات کا پیش خیمہ ثابت ہوگا۔ اور تعلیمی رسائل نے یونیورسٹی کے اس اقدام کی بے حد تعریف کی تھی چند سال گذرے کلکتہ یونیورسٹی نے بھی یہ تجربہ کر کے دیکھا تھا۔ مگر اسے جلد ہی معلوم ہو گیا کہ یہ طریق بے حد پر خطر ہے اور آخر اسے خیرباد کہنا پڑا۔ پھر آزمودہ کو آزمانے کی کونسی ضرورت پیش آگئی تھی۔ اور اگر ایسا تجربہ ناگزیر ہی تھا۔ تو ابتدا جدید ہندوستانی زبانوں سے ہونی چاہیئے تھی۔ ان زبانوں کے لئے فضا بھی معاون ہوتی۔ یہ فضا انگریزی کے لئے موجود نہیں۔ انگریزی کے اساتذہ بصد مشکل کمرہ جماعت میں مصنوعی ماحول کی تخلیق سے کام چلاتے ہیں۔ یونیورسٹی کے اس فیصلہ کا ایک بڑا نقصان یہ ہوگا کہ طلبا کو سکول تبدیل کرنے میں بے شمار دقتیں پیش آئیں گی۔ کیونکہ مختلف مدارس میں مختلف کتب انتخاب کی گئی ہونگی۔ اس کا لازمی نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ کہ یونیورسٹی کا اشتراک پرور اثر زائل ہونے لگے۔ اور وہ قوتیں جو کمال ہم آہنگی سے مشغول عمل ہیں اسے منتشر ہو کر رہ جائیں۔

اس ملک میں انگریزی کو ایک خاص حیثیت حاصل ہے۔ نہ ہی تو یہ مادری زبان ہے۔ اور نہ ہی اس کی تعلیم کی غایت جاپان اور چین کی طرح یہ ہے کہ تجارتی کاروبار میں سہولت حاصل ہو سکے۔ ہندوستان میں اسے لنگوا فرانکا کا درجہ حاصل ہو چکا ہے صرف یہی ایک زبان ہے۔ جو اس ملک کے عوام پر علوم و فنون کے دروازے کھولتی ہے کیونکہ خود ملکی زبانیں اس صلاحیت سے عاری ہیں۔ انگریزی زبان ذہنی اور مادی ہر دو ضروریات کو پورا کرتی ہے۔ اس لئے لازمی ہے اس کی واقفیت محض سطحی نہ ہو بلکہ ٹھوس ہو۔ یہ مقصد درسی کتب کی تعین کے بغیر حاصل ہونا ممکن نہیں۔ اس میں کلام نہیں کہ انگریزی زبان کا یہ تفوق ملکی زبانوں کے لئے سخت خطرے کا موجب بن رہا ہے اور بعض حلقوں نے اس کے تفوق کے زائل کرنے کے لئے کوشش بھی بروئے کار لانا شروع کر دی ہیں ممکن ہے پنجاب یونیورسٹی کا فیصلہ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہو۔ مگر یونیورسٹی کا مجوزہ نسخہ ناکافی ہونے کے علاوہ نادرست بھی ہے۔ اس نئی تبدیلی کے حامیوں کا خیال ہے کہ یونیورسٹی کا یہ اقدام سر دمہرانہ ہے۔ کیونکہ ان کی رائے میں بعض کتابوں کے مطالعہ کی سفارش کر دینا بھی ناروا ہے۔ یہ نظریہ بالکل بجا ہے۔ کیونکہ کمرہ جماعت میں ایسی کتابوں کی تعلیم طلبا کے لئے بالکل لایعنی ہے اور استادوں کے اپنے مجوزہ بہترین طریق کار

پرخواہ مخواہ پابندی عائد کرنا ہے۔

ہندوستان کی دیگر تمام یونیورسٹیوں میں میٹرک امتحان کے لئے درسی کتب مقرر ہیں مگر پنجاب یونیورسٹی نے درسی کتب کو خیرباد کہہ کر جاپان کی تقلید کی ہے۔ کیا اچھا ہوتا اگر یونیورسٹی جی کڑا کر کے امتحان کی کامیابی کو انگریزی زبان میں کامیابی کی شرط سے بے نیاز کر دیتی۔ اس صورت میں انگریزی درسی کتب خود بخود اپنی موت مر جاتیں مگر جب تک یونیورسٹی انقلاب آفرین اقدام کا حوصلہ نہیں رکھتی اور انگریزی میں پاس ہونا امتحان میں کامیاب ہونے کی لازمی شرط ہے۔ کتابوں کا عمیق مطالعہ ناگزیر ہے جو کہ درسی کتب کے تعین کے بغیر ممکن نہیں۔

حالات کا اقتضا یہ ہے کہ یونیورسٹی معاملہ کے تمام نشیب و فراز پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے کے بعد کوئی اور موزوں لائحہ عمل مرتب کرے۔

جاپانی ماما کی عجیب و غریب زندگی

ہندوستان کی ماماؤں اور خادماؤں سے جاپانی ماما کی زندگی بالکل مختلف ہے جاپانی ماما کو صرف اپنے آقا کی خدمت ہی نہیں کرنی پڑتی۔ بلکہ اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے۔ کہ وہ اپنے آقا کا ادب پرستش کی حد تک کرے۔

جاپانی ماما کا یہ فرض ہے کہ وہ صبح اٹھتے ہی آقا کے گھر کے ہر ایک فرد کو اس طرح جھک کر سلام کرے۔ جیسے وہ ان کی پرستش کر رہی ہو۔ جاپانی ماما جب کھانا کھاتی ہے۔ خواہ وہ اکیلی ہی کیوں نہ ہو۔ تو کھانا شروع کرنے سے پہلے کہتی ہے "میں آقا کی اجازت سے کھانا شروع کرتی ہوں"۔ اور کھا چکنے کے بعد کہتی ہے۔ "اے آقا! آپ نے خوب مزیدار کھانا مجھے کھلایا"۔ یہ ضروری نہیں کہ یہ الفاظ ماما اسی وقت کہے جس وقت آقا اس کے سامنے موجود ہو۔ وہ اگر تنہائی میں بھی کھانا کھاتی ہے۔ تو غائبانہ طور پر یہ الفاظ کہنا ضروری سمجھتی ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح کہ ایک بندہ کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے پروردگار کا شکریہ ادا کرے

جاپانی ماما دن کا کام ختم کر چکنے کے بعد آقا سے کہتی ہے "کچھ اور کام ہو تو بندی حاضر ہے" جب آقا یا مالک باہر جائے۔ تو وہ دروازہ تک ساتھ جاتی ہے اور واپسی پر ان کا استقبال کرتی ہے جب آقا یا مالک میں سے کوئی باہر جاتا ہے۔ تو ماما کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ دعائیں دے۔ چنانچہ ماما کہتی ہے "خیریت سے جایئے۔ اور خوش خوش واپس آیئے"۔ کھانا یا اخبار پیش کرتے وقت اسے گھٹنوں کے بل کھڑا ہونا ہوتا ہے۔ جب اسے کوئی حکم دیا جاتا ہے۔ تو وہ گھٹنوں کے بل جھک کر اور ہاتھ باندھ کر حکم سنتی ہے۔ جاپانی ماما کے لئے یہ بھی لازمی ہے کہ وہ آقا اور مالک کے سامنے نہ کپڑے بدلے اور نہ بال بنائے۔ غرضیکہ ایک جاپانی ماما قدیم زمانہ کی زرخرید باندیوں کا جیتا جاگتا نمونہ ہوتی ہے۔ جس کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ آقا کی پرستش کرتی رہے۔

غزل

اگر ذرا بھی تری آرزو بدل جائے
تری نگاہ تری گفتگو بدل جائے

ہے تری خیر اسی میں رہے نہ تو تو ہی
ترا علاج یہی ہے کہ تو بدل جائے

تری نگاہ تحیر میں انقلاب نہیں
خیال ہی میں کہاں چارسو بدل جائے

نمازِ عشق لہو میں نہا کے پڑھتے ہیں
محال ہے کہ یہ رسمِ وضو بدل جائے

ہے شراب وہی کہنہ ساقیا! لیکن
پرانے جام پورا نا سبو بدل جائے

میں سرد و گرم زمانہ چشیدہ رند ہوں شیخ
مجال کیا جو مری ہاؤ ہو بدل جائے

اگر ہو علم امینِ منزلِ محبت کا
طریق کارِ رہِ جستجو بدل جائے

امین حزیں سیالکوٹی۔

نغماتِ شورش

قیدخانوں کی تاریک کوٹھڑیاں اگرچہ ہمیشہ سے ہر قسم کے ارضی وسماوی بلیات کا مرجع اور آفات ومصائب کا مرکز ہونے کے سبب انسانی زندگی کے حق میں عذاب جہنم ثابت ہوئی ہے لیکن اس حقیقت کا اعتراف بھی کرنا پڑے گا کہ انہیں عذاب گاہوں میں وہ کارنامے بھی سرانجام دیئے ہیں۔ تاریخ علم وادب کے اوراق شاہد ہیں کہ خاک بسر زندانیوں نے اپنے شکار مصائب میں علم وادب کو کبھی فراموش نہیں کیا۔ علامہ سبکیؒ نے اپنے محبس رجاہ تاریک) میں زندگی کی طویل ساعتیں بسر کرتے ہوئے اپنے ہمہ گیر علم وفضل اور حیرت انگیز حافظے کی امداد سے اپنے ان فداکار تلامذہ کو جو روزانہ صبح سے شام تک اس اندھے کنوئیں کی مَن (منڈیر) پر جمع رہتے تھے۔ اپنے تبحر کی کرامتی یادگاریں مجلدات میں قلم بند کرائی تھی۔ مغربی مصنفین میں آسکروائلڈ کی زندانی تصنیف انگریزی ادب کا شاہکار خیال کی جاتی ہے۔ ہندوستان میں سیدالاحرار مولانا حسرت موہانی پنڈت جواہرلال نہرو اور مولانا ظفر علی خان قید کی "حبسیات" ہمارے تصنیفی سرمائے پر ایک گراں مایہ اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یادش بخیر ہمارے آتش بیان و آتش نگار نوجوان لیڈر آغا شورش کاشمیری جو المناک زندانی عذاب کی برداشت میں مولانا حسرت موہانی کے حریف حیرت ہیں۔ اپنی زندانی زندگی کی کٹھن ساعتوں میں بھی ادب کو کبھی فراموش نہیں کرتے۔ گذشتہ چند ماہ انہوں نے ملک کے مشہور رہنما مسٹر یوسف مہرعلی لارڈ میئر بمبئی کے ساتھ جیل میں بسر کئے ہیں۔ اہل علم جانتے ہیں کہ یوسف مہرعلی ملک کے چند قابل ترین رہنماؤں میں سے ایک ہیں۔ ان کے سیاسی نظریات سے اختلاف ہوسکتا ہے مگر ان کے غیرمعمولی علم وفضل سے انکار کی کوئی جرأت نہیں کرسکتا۔ انہوں نے اپنی قید وبند کی تمام فرصتوں کو تصنیف وتالیف میں گذارا اور اپنے ساتھ ہمارے اس جوانمرد نبرد آغا شورش کاشمیری کو بھی یہی محبت مشغلہ سپرد کردیا ہمیں معلوم ہوا ہے کہ آغا صاحب "فن خطابت" پر ایک معرکۃ الآرا تصنیف کی تکمیل میں اپنا تمام وقت صرف کررہے ہیں۔ اور عنقریب اردو زبان میں اپنے موضوع پر یہ بے مثل تصنیف منصۂ اشاعت پر آنے والی ہے۔ سنا جاتا ہے کہ اسی موضوع پر لارڈ میئر بمبئی نے بھی انگریزی زبان میں ہدیۂ زنداں کے طور پر ایک قابل قدر کتاب مکمل کرلی ہے۔

آغا شورش کو اس کے عام اہل وطن صرف ایک شورش کار لیڈر ہی کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ لیکن یہ معلوم کرکے اپنی بےخبری پر تعجب ہوگا کہ شورش اگر سیاسیات کی "بھول بھلیاں" سے باہر ہوتا تو ادب وشاعری کے بڑے بڑے پیرتقیوں سے ان کی کرسیاں خالی کرالیتا۔

آغا شورش کی نثر میں آزاد مرحوم کی بےتکلفی، ابوالکلام آزاد کی اقتصادی طرفگی اور سجاد حیدر یلدرم کا فلسفیانہ شکوہ وجلال جلوہ کار ہے۔ اس کی نظم میں زندانی مصائب ایک بےپناہ سوزوگداز کی صورت میں رونما ہیں۔

جوانی کی بہاریں تو اپنے اپنے وقت پر ہر چمن زار زندگی کو لہلہاتی ہے لیکن شورش کے شرائن میں تو طوفان جنون برق بیقرار کی صورت کوند رہا ہے ناعاقبت اندیش جوانی کے نتائج وثمر واس کے حیرت کار تخلیقات اذکار کا زیر پردہ بن گئے ہیں مگر شورش کے دل ودماغ کے آتشکدے سے کبھی کوئی پردہ برافگن شعلہ اٹھتا ہے۔ تو اس ایک ہی لپیٹ فضائے جمود کو آتشیں بنا دیتی ہے۔ مندرجہ ذیل گرانمایہ اہل نظر اس نظم سے آغا شورش کے جذبات شررفشاں کا کچھ اندازہ کرسکیں گے۔

یوسف مہرعلی کے سازگار ماحول پر رشک آتا ہے کہ جیل کی چار دیواری سے ایک ہی زقند میں لارڈ میئر کے منصب رفیع پر پہنچ گئے۔ مگر بدنصیب شورش کے بال وپر کی برق پروازی ان خرانٹ لیڈروں کی تعمیر کا صدقہ بن رہی ہے۔ جن کے ہجوم اغراض اسے رخصت پرواز بخشنے پر آمادہ نہیں۔ میرا بس چلے تو میں شورش کی فصدیں کھلوا کر اس کی شریانوں سے متمرد خون کی اتنی مقدار رائیگاں کردوں کہ اس کی قوت فکر اعتدال کی راہیں ڈھونڈھنے پر مجبور ہوجائے۔ تاجور

اپنی عذرا کے حضور میں

مری امید کی شادابیاں بلاتی ہیں
مرے شباب کی بیخوابیاں بلاتی ہیں
تصورات کی بےتابیاں بلاتی ہیں
کہ تیرا درد محبت ستارہا ہے مجھے

تیری وفاؤں میں یہ انقلاب کیا معنی ؟
میری نگاہ سے یہ اجتناب کیا معنی ؟
چمن میں لالہ و گل سے حجاب کیا معنی ؟
کہ تیرا درد محبت ستا رہا ہے مجھے

میں اک شاعرِ غمخوار ہوں زمانے میں
تری وفا کا خریدار ہوں زمانے میں
قتیلِ حسرت دیدار ہوں زمانے میں
کہ تیرا درد محبت ستا رہا ہے مجھے

ترے بغیر نگاہیں اُداس رہتی ہیں
نیاز و ناز کی راہیں اداس رہتی ہیں
یہ سوگوار سی آہیں اداس رہتی ہیں
کہ تیرا درد محبت ستا رہا ہے مجھے

تجھے خیال کی رعنائیوں میں ڈھونڈا ہے
شب فراق کی تنہائیوں میں ڈھونڈا ہے
تصوّرات کی پنہائیوں میں ڈھونڈا ہے
کہ تیرا درد محبت ستا رہا ہے مجھے

فغاں کہ تیری جدائی میں اشکبار ہوں میں
تیری تلاش میں حیران و سوگوار ہوں میں
رہینِ وعدہ و پامالِ انتظار ہوں میں
کہ تیرا درد محبت ستا رہا ہے مجھے

میری بہار جوانی کا ماحصل تو ہے
میرے قلم کی روانی کا ماحصل تو ہے
میری تمام کہانی کا ماحصل تو ہے
کہ تیرا درد محبت ستا رہا ہے مجھے

اک ابتدائے محبت کی انتہا کی قسم
بتوں کا کوئی خدا ہے تو اس خدا کی قسم
تیرے غرور کی اور اپنی التجا کی قسم
کہ تیرا درد محبت ستا رہا ہے مجھے

(شورش کاشمیری)

محمد یوسف عباسی بی اے

گمنام عورت کا خط

آخرکار میں نے قسم کھائی ...... تم سے کنارہ کش ہونے کی شائد تم جانتے ہوگے کب لیکن تمہیں یہ معلوم نہیں کیوں؟ اگر زمانے کی گردش سے وہ نقوش جو میری شخصیت نے تمہاری لوح دل پر چھوڑے دھندلے نہ پڑ گئے ہوں، یا انہیں نسیان کے پردوں نے نہ چھپا لیا ہو، تو حافظہ پر زور دینے سے تمہیں میرا وجود ایک خستہ سنگ میل کی طرح تمہاری گذشتہ زندگی کے اُس راستے کے نشانات دکھلائے گا۔ جواب مسدود ہو چکا ہے میرا وجود ایک دُمدار ستارہ تھا جو تمہاری ہستی کی وسعتِ ظلمات کو منور نہ کر سکا اور پھر اسی کی حسرت فزا سیاہیوں میں گم ہوگیا۔

آج سے چند برس پیشتر ہم دونوں نے دائرہ ازدواجیت میں قدم رکھا۔ مجلسی رسم و رواج نے ہماری مختلف النوع طبائع کو یکجا تو کر دیا لیکن ان دونوں میں یگانگت اور ہم آہنگی پیدا نہ کر سکے۔ میری زندگی تم سے وابستہ تھی۔ ہم دن رات ایک دوسرے کے قریب رہتے۔ لیکن شاید تم نے بھی محسوس کیا ہو۔ کہ اس قرب کے باوجود ہم میں کتنا بُعد اور تفاوت تھا۔ میرے اور تمہارے درمیان ایک خلیج حایل تھی۔ جسے تم نے کبھی پاٹنے کی کوشش نہ کی۔ مجھ میں کبھی اتنی جرأت نہ تھی کہ تمہاری روکھی پھیکی سیرت کی عمارت کو گرا کر اس پر اپنی تمناؤں کا محل بناتی۔ اور تمہارے سیاسی خیالات کی بنجر سرزمین میں اپنے جذباتِ شعر و عشق کے گُل بُوٹے کھلاتی۔ تم صبح سے شام اپنے سیاسی نظریات کی بھول بھلیوں میں کھوئے رہتے۔ یہ جنون ہر گھڑی تمہارے سر پر سوار رہتا۔ ہر وقت مردانہ بے فکروں سے بھرا رہتا۔ اور پھر وہاں پر سیاسیات کی وہ کھال کھینچی جاتی کہ توبہ ہی بھلی۔ سیاسی مباحثوں کی چیخ و پکار سے کانوں کے پردے پھٹتے تھے۔ اُٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے تم اپنی ہی راگنی الاپتے رہتے کسی اور کی بات سُننا تمہارے گوشِ سیاست نواز پر بار تھا۔ سارے جہاں کا درد تمہارے جگر میں بھرا تھا۔ کہیں فلاکت زدہ کسانوں اور مزدوروں کی مفلسی کا رونا رویا جا رہا ہے۔ تو کہیں سرمایہ داروں کی بوالہوسی اور بے انصافی پر صلواتیں سنائی جا رہی ہیں کبھی فرقہ دارانہ فسادوں پر سینہ پیٹا جا رہا ہے۔ تو کبھی عوام کی جہالت کا شکوہ کیا جا رہا ہے۔ پھر جب کانگرس کے ممبروں کی بھرتی کی دُھن سوار ہوئی تو کئی کئی ہفتے گھر سے باہر رہے اور دیہات کے دورہ سے واپسی پر تو ماشاء اللہ حلیہ میں بھی چار چاند لگ جاتے۔ ڈاڑھی ساون کی گھاس کی مانند بے طرح بڑھی ہوئی، سر پر گرد و غبار سے اَٹے ہوئے خشک بالوں کے گُچھے، دھوپ سے چہرے پر زلفِ معشوق جیسی سیاہی چھائی ہوئی، میلے کچیلے کپڑوں میں ملبوس۔ مجھے تمہاری ہیئت کذائی دیکھ کر بجائے اس کے کہ ہنسی آتی رحم آتا تھا۔

تم کہوگے کہ تم نے میرے بلند مقاصد کو اپنی ہوس پرستی پر قربان کر دیا، تمہارا دل غریبوں کی تباہ حالی پر نہیں پسیجا، اور نہ ہی ملکی ادبار سے متاثر ہوتا ہے۔ نہیں ایسا نہیں۔ میرے پہلو میں بھی درد بھرا دل موجود ہے لیکن تم نے کبھی میرے سینے کی گہرائیوں میں ہاتھ ڈال کر اس کی بے چین دھڑکن کو محسوس نہ کیا۔ سیاسیات سے تمہارے دل کے تمام لطیف جذبات پر مُردنی طاری تھی۔ بعض اوقات میں تمہیں جذبات کی تڑپ سے آشنا کرنے کے لئے کوئی غزل گاتی تو تم ناک سکوڑتے ہوئے نفرت سے منہ پھیر لیتے۔ اُٹھتے اور خاموش چل دیتے۔ لیکن کئی دفعہ شاعری اور موسیقی کی مذمت میں دھواں دھار تقریر شروع ہو جاتی "شاعری ایک افیون ہے جس نے ہندوستانیوں کو موت کی نیند سُلا دیا ہے۔ یہ ایک ذہنی عیاشی ہے جو عمل کی راہ میں حائل ہے۔ جس ملک میں شاعر زیادہ ہوں وہ ملک سیاسی ترقی نہیں کر سکتا۔ وغیرہ وغیرہ" کئی دفعہ میں تمہارے ہمراہ شام کو دریا کے کنارے سیر کو جاتی۔ جہاں غروب آفتاب کا منظر نہایت دلفریب ہوتا۔ اُفقِ مغرب کی پہنائیوں میں بادلوں کے ننھے ننھے ٹکڑے سنہری کشتیوں کے مانند تیرتے ہوئے تاریکی شام میں گم ہو جاتے۔ لہراتے ہوئے سبزے پر روشنی کی زرد جھلک پھیل جاتی۔ دریا کی خاموش سطح پر چھوٹی چھوٹی بادبانی کشتیاں بڑے راج ہنسوں کی طرح پَر کھولے ہوئے اُڑی چلی جاتیں۔ اور ملاحوں کے مدھم سے نغمے ایک عجیب فسردگی کا عالم پیدا کر دیتے۔ اور مجھے ایسا معلوم ہوتا کہ زندگی کی کشتیاں وقت کے سمندر پر رواں ہیں۔ اور ملاحوں کے گیت مغموم روحیں ہیں جو وقت کے گذرنے پر نوحہ کناں ہیں۔ کئی دفعہ اس عالمِ محویت میں کونجوں کی قطاریں پرواز کرتی ہوئی اُفق کے دھندلکے میں اوجھل ہو جاتیں۔ چنانچہ میں کوئی بیت بھرا دلسوز گیت چھیڑ دیتی یا منظر کی رنگینی میں کھو جاتی۔ تم مجھے اکیلا چھوڑ کر میرے احساسات کے زیر و بم سے بے نیاز چہل قدمی میں مشغول رہتے جس طرح شاعر کو اپنے لطیف خیالات کو اشعار کی صورت میں دوسروں کے سامنے پیش کرنے سے مسرت ہوتی ہے۔ اس طرح میں بھی حسنِ منظر سے متاثر ہو کر اپنے جذبات کی تصویر تمہارے سامنے پیش کر کے تمہیں اپنی مسرت کا احساس کرانا چاہتی۔ افسوس تم بے حسی اور درشتی کے مُوقلم سے میری تصویرِ مسرت کے چمکتے ہوئے نقوش پر سیاہی مل دیتے۔ "آخر یہاں کیا دھرا ہے روز سورج غروب ہوتا ہے مجھے تو کوئی دلکشی نظر نہیں آتی۔ تمہاری

اور ایک سادہ لوح وحشی کی مسرت میں کوئی فرق نہیں۔ جو تمہاری طرح ان جذبات سے سرشار ہوتا ہے۔ دنیا میں اور بھی چیزیں ہیں چلو ریڈیو کی خبروں کے پروگرام کو دیر ہو رہی ہے۔" تم جذبات کو بھی سیاسیات اور اصول پرستی کی عینک سے دیکھنے کے عادی ہو چکے تھے۔

عورت اپنے لئے کیا چاہتی ہے؟ محبت بھرے چند کلمات اور تعریف حُسن کے چند فقرات۔ اگر تم عورت پر جھوٹی محبت کا ہی اظہار کرو تو وہ عشق کی منڈی پر خلوص جذبات محبت کو تمہارے قدموں پر نثار کر دے گی۔ عورت زندگی میں صرف ایک دفعہ محبت کرنا جانتی ہے اور وہ بھی بے لاگ یہی وجہ ہے کہ عورت کو محبت کے کھیل میں مردوں کے مقابلہ پر شکست ہوتی ہے لیکن تم عورت کی فطرت سے بے بہرہ تھے۔ سیاست کی مشین۔ کنوارپن میں میری طبیعت ملبلی تھی اور مجھے گھر والے اس ضد کی بدولت بہت کم محبت کرتے۔ میں اپنے بہن بھائیوں سے اٹھکر اکیلی اُداس رومان خیز افسانوں کی کتاب لیکر بیٹھ جاتی اور اپنی موجودہ افسردگی کو ایک رنگین مستقبل کے تصور میں گم کر دیتی میرا خاوند ما تصور یہ ہوتا کہ وہ کوئی بڑا خوبرو نوجوان ہے۔ جو اپنی محبت سے میرے دل کو شگفتہ کر دے گا۔ وہ میرا ہمراز ہوگا۔ اور جب مجھے کوئی تکلیف ہوگی۔ تو وہ فرط محبت سے جان نثار کرنے پر آمادہ ہوگا اور مجھے بہلانے کے لئے نت نئے تحفے لایا کرے گا اور میں بھی اس پر جان نچھاور کر دونگی۔ شومئے قسمت سے مجھے شوہر ملا بھی تو میری تمناؤں کے بالکل اُلٹ جس کے منہ سے مجھ تشنہ محبت کے لئے کبھی تسلی و تعریف کا ایک بھوٹا لفظ تک نہ نکلا اور جو کبھی میرا انیس و دمساز نہ بنا تمہاری اس سرد مہری کے باوجود مجھے تم سے محبت کی امید تھی۔

کبھی تم دیر سے گھر آتے تو میرا دل بیقرار سا ہو جاتا اور میں تم پر سوالوں کی بوچھاڑ کر دیتی۔ اتنی دیر کہاں رہے؟ مجھے اکیلی چھوڑ کر تمہارا دل کیسے لگتا ہے؟ وغیرہ لیکن اس کا جواب بالکل مختصر اور بے روح۔ تم نے کبھی پرتپاک رفاقت کا اظہار نہ کیا میں نے تمہاری خدمت کرنے میں بھی کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ کیا اور تمہیں خوش کرنے کے لئے نوکروں کی موجودگی میں گھر کا کام نہایت خوش اسلوبی اور سلیقے سے سرانجام دیتی لیکن میری مخلصانہ خدمت کی بھی تمہارے دل تک رسائی نہ تھی۔ میرے لئے صرف نوکروں کی طرح یہی فقرہ تھا "آج کھانا اچھا پکا ہے! تم کام کاج میں بہت ہوشیار ہو"

میرے سامنے اوروں کی تعریفیں کھلے بندوں ہوتیں۔ کہ مس فلاں نے پچھلی دفعہ دیہات کے دورہ میں پورے پانچسو ممبر بھرتی کئے۔ یاد رہے۔ وہ امیر اور خوبصورت ہونے کے علاوہ مشہور قومی کارکن ہیں۔ فلاں صاحبہ نے اپنے شہر کے جلسۂ اتحاد میں اپنی تقریر میں فصاحت وبلاغت کے دریا بہا دیئے اور اپنے پرزور دلائل سے تمام کو اپنے مقصد کا گرویدہ بنا لیا وغیرہ جب میں یہ باتیں سنکر نفرت و حقارت سے خاموش رہتی۔ تو تم ایک سرد آہ بھرتے۔ شاید جس کا مطلب یہ ہوتا کہ "کاش مجھے کوئی ان جیسی بیوی مل جاتی"۔ تم اس طرح میرے جذبات پر نمک پاشی کیا کرتے۔ عورت بے رخی کو تو برداشت کر سکتی ہے لیکن وہ کسی رقیب کی تعریف نہیں سن سکتی۔ جو اس کی خودداری کی توہین ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے تمہارے سیاسی مشاغل سے چڑ ہو گئی۔

میں نے بہت تجویزیں کیں اور بالآخر تمہارے سیاسی عقائد کو شکست دینے کی ٹھان لی چنانچہ میں نے اپنی طبیعت پر جبر کر کے خشک سیاسی کتب کا مطالعہ شروع کر دیا۔ پھر میں تمہارے سیاسی معاملات میں رخنے نکالتی اور تمہاری اس سرگرمی کا مضحکہ اڑاتی۔ "اگر غریبوں کی ہمدردی کا ایسا ہی مروڑ اٹھتا ہے تو کیوں نہیں اپنی لاکھوں روپوں کی جائداد نیلام کر کے تقسیم کر دیتے۔ میں حیران ہوں کہ آدمی صرف کھدر پہننے سے کس طرح غریبوں کا سچا خیر خواہ بن سکتا ہے جبکہ اسے موٹر کار کے بغیر دو قدم چلنا دوبھر ہو؟ اور پھر اس شان امارت پر غریبوں کا پھریرا اڑانا منافقت نہیں تو اور کیا ہے؟" لیکن تم بھی تھے پرانے گھاگ۔ اپنے وسیع مطالعہ اور سیاسی تجربہ سے مجھے نیچا دکھاتے اور پھر حریفانہ شماتت کے ساتھ میری شکست پر قہقہے لگاتے۔ احساس شکست سے میرے دل میں تمہارے خلاف نفرت کے جراثیم پرورش پانے لگے چنانچہ جب میں اپنی خفت کو چھپانے کے لئے درشت الفاظ پر اتر آتی۔ تو مجھے جھاڑیں پڑتیں۔ "نہ کچھ پڑھا نہ لکھا اور لے بیٹھیں سیاسی مسائل۔ لاکھ دفعہ سمجھایا لیکن سمجھ پاس تک نہیں پھٹکتی۔ اگر نہیں مانتیں تو نہ مانو میرے کان کاہے کو کھاتی ہو؟ جان چھوڑتی ہو یا نہیں"۔ یہ بدمزاجی اور ترشروئی کی حد تھی۔

اس لئے میں نے سیاسی مباحثوں کو ترک کر دیا۔ تم خوش تھے۔ کہ تمہیں میری مخالفانہ تنقید سے تو نجات مل گئی۔ مجھے تمہارے خدمت خلق، قومی ہمدردی، علم و تہذیب کے بلند بانگ دعووں میں خودستائی کی بو آنے لگی۔

تم نے میرے دل کی لہروں کو کبھی نہ ٹٹولا اور تیلی کے بیل کی طرح اپنی محدود زندگی کے محور کے گرد گھومتے رہے۔ میری محبت نے تمہارے دل کے دروازے پر دستک دی اور میرے حسن نے تم سے محبت کی بھیک چاہی لیکن تمہارے دل کے دروازے پر بے حسی اور جمود کا قفل پڑا ہوا تھا۔ میری نگاہیں ملتجی ہوئیں۔ مگر کوئی جواب نہ ملا۔ آخر کار میں نے ناکامی کے غصہ سے جھڑکیاں بھی دیں۔ لیکن مہر سکوت کو نہ ٹوٹنا تھا اور نہ وہ ٹوٹی۔ مجھے مایوس کر کے لوٹا دیا گیا۔ یہ میری ہتک تھی، خودداری کا خون تھا۔ کہ میں تمہیں ان جذبات الفت سے آشنا کرتی۔ جن کی تمہارے نزدیک ریزۂ سنگ سے زیادہ وقعت نہ تھی۔ میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ لوگ کہتے ہیں "صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے" لیکن بعض حالتوں میں صبر زندگی کا روگ بن جاتا ہے۔ اب میں خیال کرتی ہوں کاش میں صبر کر سکتی۔ لیکن آخر انسان ہوں۔ کب تک درگذر کرتی۔ خصوصاً جب میری قدر و منزلت اس بانسری کی طرح ہو۔ جسے ساتی مسرت کے لئے بجا کر پھر تغافل کی تاریک کوٹھڑی میں گلنے سڑنے کے لئے پھینک دیا جاتا ہے۔ مجھے اپنی اس بیعزتی پر سخت غصہ آتا اور میرا رواں رواں "انتقام انتقام" پکار رہا تھا۔ میرا تمہارے ساتھ رہنا اپنی فطرت کے خلاف پیہم کشمکش کے ہم معنی تھا۔ سب جانتے ہیں کہ اپنے آپ کے خلاف جنگ

کرنا بہت مشکل ہے میں تم سے دور رہتی۔ اور تنہائی میں جذبات نفرت کی آگ کو ہوا دیتی۔ یہ میرا آخری وار تھا۔ جو میں نے تمہارے پتھر دل پر کیا۔

جذبات کے دریا کا تیز بہاؤ مصلحت کی چٹانوں سے ٹکرا کر ایک سیل بے پایاں کی طرح بڑھا جس میں صبر و استقلال کے قد آور درخت حقیر تنکوں کی طرح بہہ گئے میرا اور تمہارا دامن ایک دوسرے سے وابستہ تھا لیکن ہم دونوں زندگی کی مختلف شاہراہوں پر چل رہے تھے جس سے یہ رشتہ ٹوٹنا لازمی تھا میری تشنگی محبت کو گناہ آبحیات معلوم ہوا اس مسافر کی طرح جس کو طویل سفر کی نقاہت سورج کی آتشیں تمازت اور پیاس کی شدت سے سراب ریگزار ہی پانی کی لہریں لیتا ہوا سمندر دکھائی دیتا ہے میں نے گناہ کا زیور پہننا شروع کیا جو تاریکئ شب میں چمکتا ہے اور جس کی چمک روشنی میں اندھیرے کی طرح غائب ہو جاتی ہے جب کسی بچے کو خوبصورت موتی دیا جائے تو وہ چمکتے ہوئے انگارے کو اس کا نعم البدل سمجھ کر اس کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے اور اپنی نادانی کا احساس اس وقت ہوتا ہے۔ جب اس کا ہاتھ جلتا ہے۔

پہلے پہل تو ضمیر نے ملامت کی لیکن پھر شکست خوردہ جذبات نے ضمیر کا گلا گھونٹ دیا۔ آہستہ آہستہ گناہ میرے رگ رپے میں سرایت کر گیا۔ اب میرے دن ایک ہنگامہ مسرت۔ اور میری راتیں دور نشاط تھیں۔ زندگی میرے لئے سراپا مسرت و نغمہ تھی۔

صبح ہوتی رہی شام ہوتی رہی اور وقت اپنے دامن میں گذشتہ مسرتوں کے پھول اور لپنے دل پر غم ماضی کے داغ لئے ہوئے گذرتا گیا ضمیر جو گناہ کی ایڑیوں تلے کچلے جانے کے باوجود بھی زندہ رہتا ہے۔ مرور زمانہ سے خزاں دیدہ درخت کی طرح شگوفے نکالنے شروع کئے بعض اوقات گذشتہ زندگی کا تصور میرے لمحات عیش و نشاط پر اپنے خوفناک پرچھائیں کو ڈال کر میری زندگی کو بے لطف اور میرے جام مسرت کو تلخ بنا دیتا۔ مجروح جذبات کے زخم دیر ہوئی بھر چکے تھے لیکن افسوس ان میں ضمیر کی موہوم سرزنش اور احساس گناہ کے تیر باقی رہ گئے تھے جن کی نوک کی چبھن مجھے بے چین کر دیتی۔ مجھے کسی پہلو بھی کل نہ پڑتی۔ کاش انسان کسی ایک حالت میں مطمئن ہو سکتا لیکن ایسا نہ ہونا ہی انسانی تکالیف کا سرچشمہ ہے۔ آہ! اس سے بڑی مایوسی کیا ہو سکتی تھی۔ کہ جس چیز کو میں نے اپنے غم غلط کرنے اور دکھوں کو بھولنے کا ذریعہ بنایا۔ وہی چیز مجھے سانپ کی طرح کاٹنے کو دوڑی آہستہ آہستہ گناہ کے زیور کا ملمع اتر گیا۔ اور یہ میرے ہاتھوں میں آہنی ہتھکڑیاں پاؤں میں زنجیریں اور گلے کا طوق بن کر رہ گیا۔ اب مجھے اپنا قصور صاف نظر آرہا تھا۔ اگر تم خطاوار تھے تو میں بھی تمہارے نقش قدم پر چل کر ہلاکت کے گڑھے میں گری۔ میرا قصور یہ تھا کہ میں نے تمہارے گناہ کا انتقام اپنے گناہ سے لیا۔ آہ گناہ کو گناہ سے شکست دینا آگ کو آگ سے بجھانے کے مترادف تھا۔

میں نے بساط ہستی پر زندگی کا کھیل ہار دیا میری شکست پر میرا رفیق اہرمن بھی فتح کے ڈنکے بجا رہا ہے چار سو تاریکی کی گھٹائیں چھائی ہوئی ہیں۔ اور نجات کی امید...... شاید تم لفظ امید پر ہنسو گے مگر وہی امید جو دنیا والوں کو حسین خواب دکھایا کرتی ہے۔ میری زندگی کی راہ کے اختتام پر چراغ سحری کی طرح ٹمٹما رہی ہے۔ یہ زندگی کے ڈوبتے ہوئے سورج کی آخری کرن ہے جس کی زرد جھلک راہ سے بھٹکے ہوئے افسردہ مسافر کو منزل کا نشان آخری دفعہ بتا رہی ہے جب احساس گناہ کی تلخی کے ساتھ بے بسی کا زہر بھی شامل ہو جائے۔ تو یہ تریاق دل و دماغ سے گناہ کے اثرات زائل کرتے کرتے بعض اوقات زندگی کی کھوکھلی بنیادوں کو بھی اکھاڑ پھینکتا ہے میری امید.... موت لیکن اس کے لئے کتنا سنگین عزم چاہئے اس کے خیال پر میرے عزم و استقلال کے قدم لڑکھڑاتے ہیں لیکن گناہوں کے کفارہ کا خیال اور نجات کا امکان میرے کمزور جسم کے رویئں رویئں کو فولادی طاقت بخش رہا ہے میں زندگی کے کنارے پر کھڑی دیکھتی ہوں۔ کہ موت کے دھندلکے میں ایک شمع روشن ہے اور مجھے اس تک پہنچنے کے لئے اس کی اتھاہ گہرائیوں میں کودنا ہوگا۔ گناہ کا زنگ دور کرنے کے لئے آتش دوزخ میں غوطہ لگانا ہوگا۔ الوداع! اے دنیا الوداع۔ تجھے چھوڑنے کا احساس کتنا دلدوز ہے لیکن میں منہ پھیر کر دیکھنا نہیں چاہتی۔ کیونکہ میری پچھلی طرف ظلمات عصیاں شکست و یاس کے پردے ہیں اور میرے سامنے نجات کی امید اور ابدی سکون... الوداع ---

.... اُف! میرے سامنے زہر کا چھلکتا ہوا جام...... ٹھہرو سنو! شام کی تاریکیوں میں دور سے مجھے ایک آواز سنائی دیتی ہے.... مندر کے ناقوس کی آواز۔ پجاریوں کے گیت ...... اور زہر کا چھلکتا ہوا جام.........

ٹھہرو۔ سنو!.....

اب مجھے مرنے سے پہلے مرنے کا فیصلہ کرنا ہے۔ (حرماں نصیب)

غزل

ضبط کر! ایسا کہ نوبت نہ فغاں تک پہنچے
شکوہ ان کا نہ کہیں دل سے زباں تک پہنچے

کہکشاں کا بھی گریباں نہ سلامت چھوڑا
اللہ اللہ تیرے دیوانے کہاں تک پہنچے

لذتِ دیدِ تکلم ملی دیوانوں کو
اور ارباب خرد حدِ گماں تک پہنچے

نہیں معلوم کہ اس میں ہے کشش کیا انور
وہ نہ لوٹے جو درِ پیر مغاں تک پہنچے

کبیر انور جعفری

سانیٹ

ایک رات

یاد ہے وہ عشرت رفتہ کی رنگیں ایک رات!
ہر نظر بہکی ہوئی تھی، ہر ادا تھی مست ناز!!
حسن مصروف نظارا، عشق تھا محو نیاز!!
"شاہد معصوم" کے جلووں میں گم تھی کائنات!

ڈھلتی شب، تاروں کی کچی نیند میں انگڑائیاں!
شرمگیں آنکھیں تھیں دامانِ حیا سے ہمکنار!!
نطق محبوس تکلف، لب سراپا انتظار!!
بادلوں سے چاند کی چھپ کر نظر آرائیاں!

صحن گلشن کی حسیں پہنائیوں کی دل کشی!
خود بخود جذب محبت کی اثر انگیزیاں!!
گرمی قرب محبت کی شرر انگیزیاں!!
زندگی کی گود میں مچلی ہوئی تھی زندگی!

اس طرح آنکھوں ہی آنکھوں میں کٹی تھی ساری رات!!
یاد ہے صہبا محبّت کا وہ پہلا التفات!!

صہبا لکھنوی

حاجی لق لق

گذشتہ جنگ عظیم کا ایک واقعہ

میرے احباب جانتے ہیں کہ پچھلی جنگ عظیم میں میں فرانس میں تھا۔ وہاں میری ڈیوٹی بڑے فوجی دفتر تھرڈ ایچلان میں لگی ہوئی تھی۔ ایک روز دفتر کے ملازمین میں وہ تحفے تقسیم ہو رہے تھے۔ جو فرانسیسی دیہاتیوں کی جانب سے برطانی افواج کے لئے دفتر میں موصول ہوئے تھے۔ میرے حصے میں جو چیزیں آئیں ان میں ایک اُبلا ہوا انڈا بھی تھا جس پر لکھا تھا کہ "میرے ساتھ خط وکتابت کرو" ساتھ ہی ایک لڑکی کا پتہ بھی درج تھا۔ میں نے پتہ نوٹ کر لیا۔ اور شام کو مس سوسن کے نام ایک خط لکھا۔ لفافے میں خط کے ساتھ اپنا فوٹو بھی شامل کر دیا۔ اور خود جا کر لیٹر بکس میں ڈال دیا۔ تیسرے دن مس سوسن کا جواب موصول ہو گیا جس میں اس نے لکھا تھا۔ فوراً رخصت لے کر آؤ۔ میں نے خط پڑھتے ہی ایک ہفتے کی چھٹی کی درخواست دے دی اور جب چھٹی منظور ہو گئی تو مس سوسن کو لکھ دیا کہ فلاں تاریخ فلاں ٹرین سے آ رہا ہوں۔

تاریخ مقررہ پر میں ٹرین میں سوار ہو کر روانہ ہوا۔ رووان سے دو اسٹیشن چھوڑ کر تیسرا اسٹیشن منزل مقصود تھی۔ وہاں اتر کر پلیٹ فارم پر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا کہ کوئی خوش اندام لڑکی مسکراتی ہوئی میری طرف آئے۔ لیکن وہاں سارے پلیٹ فارم پر کوئی عورت موجود نہ تھی۔ میں باہر نکلنے کو تھا کہ ایک بوڑھا کسان لپک کر سامنے آیا۔ اور ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں بولا۔ کہ "کیا آپ مسٹر لق لق ہیں اور مس سوسن کے مہمان ہیں؟" میں نے اثبات میں سر ہلایا اور بڈھے نے میرا سوٹ کیس اُٹھا کر چلنے کو کہا۔ باہر ایک دیہاتی وضع کا تانگہ کھڑا تھا۔ ہم اس میں بیٹھ کر روانہ ہوئے۔ اور راستے میں بڈھے نے مجھے بتایا کہ وہ سوسن کا باپ ہے اور اس کا نام دیکارلو ہے۔

ایک گھنٹے کے بعد ہم "دیکاریو فارم" پر پہنچے۔ جہاں ایک دیہاتی قسم کا بنگلہ خوشنما باغیچے کے وسط میں واقع تھا۔ اور اس کی صفائی اور آراستگی سے مالک کی خوش ذوقی ٹپکتی تھی۔ جس کمرے میں مجھے ٹھہرایا گیا۔ وہ پرانی قسم کے فرنیچر سے آراستہ تھا۔ اور چاروں دیواروں پر ایک ایک تصویر آویزاں تھی۔ ان میں سے ایک تصویر پر میری نگاہ اٹک کے رہ گئی۔ اور موسیو دیکارلو بول اُٹھا:-

"یہ سوسن کی تصویر ہے موسیو۔ اور میں بتا دینا چاہتا ہوں کہ سوسن کو کل شام مجبوراً قریب کے قصبے میں جانا پڑا۔ جو یہاں سے ۳۰ میل کے فاصلے پر ہے۔ بات یہ ہوئی کہ میری بیوی اچانک بیمار ہو گئی۔ اور اسے فوراً ہسپتال لے جانا پڑا۔ سوسن کو بہت افسوس تھا کہ عین آپ کی تشریف آوری کے وقت اسے گھر سے غیر حاضر ہونا پڑا۔ لیکن مجبوری تھی۔ بہرحال وہ جلد واپس آئے گی۔"

میں نے کہا۔ کہ کیا میں ہسپتال جا کر سوسن سے ملاقات نہیں کر سکتا؟ بڈھے کسان نے جواب دیا کہ ایک کنواری فرانسیسی کو ملنے کے لئے ایک ہندوستانی جنٹل مین کا ہسپتال میں جانا معیوب ہے۔ بہرحال آپ فکر نہ کیجئے سوسن چار روز تک تو ضرور آ جائے گی۔ چار روز کی بات سن کر مجھے اطمینان ہوا۔ کیونکہ میری چھٹی سات روز کی تھی۔

رات کو کھانے کے بعد اِدھر اُدھر کی گفتگو شروع ہوئی۔ مجھے فرانسیسی زبان میں شُدبُد ہو چکی تھی اور دیکاریو ٹوٹی پھوٹی انگریزی بول سکتا تھا۔ اس لئے بخوبی گذارہ ہوتا رہا۔ اس نے بتایا کہ میں ایک کسان ہوں۔ اور اس فارم کا مالک ہوں۔ سوسن گاؤں کے اسکول میں معلّمہ ہے اور انگریزی زبان جانتی ہے۔

اس کے بعد اہلِ فرانس کی آزاد خیالی اور بے تعصبی کا ذکر کرتے ہوئے اس نے کہا کہ جب سے جنگ عظیم کے سلسلے میں ہندوستانیوں نے فرانس میں آنا جانا شروع کیا ہے کئی ہندوستانیوں نے فرانسیسی لڑکیوں سے شادیاں کر لی ہیں۔

یہ سنکر میرے دل میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ میں نے امید بھری نگاہوں سے پھر مس سوسن کی تصویر کا جائزہ لیا۔

موسیو دیکاریو نے پھر اپنی دیہاتی زندگی اور اپنے زراعتی کاروبار کے متعلق گفتگو شروع کر دی۔ اور استفسار کیا کہ کیا آپ کو بھی زمیندارہ سے کچھ دلچسپی ہے؟ میں نے جواب دیا کہ میں بھی ایک کسان کا بیٹا ہوں۔ اور میرے والد کھیتی باڑی ہی کا کام کرتے ہیں۔ بلکہ میں بھی فوج میں بھرتی ہونے سے پہلے یہی کام کرتا تھا۔

بڈھے نے یہ سن کر کہا۔ کہ اگر یہ بات ہے تو چلئے کل ہی آپ کا امتحان کیا جائے۔ تاکہ معلوم ہو سکے کہ ہندوستانی فصل کاٹنے میں کس قدر مہارت رکھتے ہیں اور سوسن آ کر اس کے متعلق سنے گی تو بہت خوش ہوگی۔

اگلی صبح کو میں بڈھے کے ساتھ کھیتوں میں گیا۔ فصل کی کٹائی شروع تھی۔ دیکاریو نے مجھے بھی ایک درانتی دے دی اور میں نے خوب درانتی بازی

کے جوہر دکھائے۔

ہمیں کٹائی کرتے ہوئے چار روز گذر گئے تھے کہ شام کو بڈھا ایک بے لفافے کی چٹھی لئے کمرے میں داخل ہوا۔ اور کہنے لگا۔ سوسن کا خط آیا ہے۔ یہ لیجئے۔ میں نے چٹھی کو پڑھا۔ لکھا تھا "امید ہے۔ مسٹر لق پہنچ گئے ہوں گے۔ مجھے بیحد افسوس ہے کہ ملاقات میں دیر ہو رہی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ والدہ کی صحت کے لئے تین روز اور درکار ہیں۔ مسٹر لق کو ٹھہرائیے۔ اور انہیں میرا سلام کہہ دیجئے۔"

اگلے روز ہم پھر فصل کی کٹائی کے لئے گئے۔ اور تین دن میں تمام باقی فصل کاٹ کر رکھ دی۔ ساتویں شام کو سوسن کا انتظار رہا۔ بڈھا کسان ہر آہٹ پر پھاٹک تک جاتا۔ اور سوسن کو کوستا ہوا واپس آجاتا۔ آخر بہت انتظار کے بعد میں لیٹ گیا۔ اور سوسن کا تصور میرے دماغ میں چکر لگانے لگا۔

صبح ہوئی ٹرین آٹھ بجے چلتی تھی۔ اگر ہم واپس روداں نہ جائیں تو مفرور قرار دیئے جانے کا خطرہ تھا۔ اس لئے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ بڈھے نے کہا کہ آپ جائیے۔ جس وقت سوسن آئے گی۔ اسے روداں بھیجدیا جائے گا۔ فکر نہ کریں۔ اس کی بہن روداں میں رہتی ہے۔ وہاں پہنچکر وہ آپ سے ملاقات کرے گی۔

ہم سٹیشن پر پہنچے۔ میں ٹرین میں سوار ہو گیا۔ انجن نے سیٹی بجائی۔ اور میں نے مصافحے کے لئے بڈھے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ بڈھے نے ہاتھ ملانے کے بعد کہا۔ کہ "مجھے معاف فرمایئے گا جینٹل مین۔ میری کوئی لڑکی نہیں۔ مجھے فصل کی کٹائی کے لئے ایک مددگار کی ضرورت تھی۔ اس لئے میں نے مدد حاصل کرنے کے لئے یہ ترکیب سوچی۔ میرے کمرے میں آپ نے جو تصویر دیکھی۔ وہ پیرس کی ایک ایکٹرس کی ہے۔ خدا حافظ!"

میں بڑھ کے بڈھے کے منہ پر ایک تھپیڑ رسید کرنے کو تھا کہ ٹرین چل پڑی۔

اسلامیہ ہائی سکول لالہ موسیٰ

اس سکول سے اس سال ۲۹ طلباء امتحان انٹرنس میں شریک ہوئے ان میں سے ۲۱ طلباء کامیاب ہوئے۔ ۷ فسٹ ڈویژن میں۔ ۱۲ سیکنڈ ڈویژن میں اور صرف ۲ طالب علم تھرڈ ڈویژن میں آئے۔ محمد شریف نے ۶۹۸ نمبر حاصل کئے یہ لڑکا سنٹر بھر میں اوّل رہا۔ اور ضلع گجرات میں اس نے نمایاں پوزیشن لی ہے۔ اور سکول کے اعلیٰ نمبروں کے ریکارڈ کو مات کر کے سکول کی شہرت کو چار چاند لگائے ہیں۔

اس ساری کامیابی کا سہرا جناب قریشی محمد یوسف صاحب ہیڈ ماسٹر کے سر پر ہے جو شب و روز بڑے انہاک سے سکول کی بہتری کے لئے ہمہ تن کوشاں ہیں۔

(راجہ سردار علی)

غزل

فریب دے گئی آنکھوں کو چشمِ عشوہ فروش
رُبابِ عشق پہ رقصاں ہیں نغمہ ہائے سروش
ٹھہر ٹھہر غمِ اُلفت پکارتا ہے مجھے!
تھکے ہوئے کسی راہی کا نالۂ غم کوش
یہ بال بکھرے ہوئے ہیں کہ موجۂ کوثر
سبک لباس ہے یا حسنِ عافیت بردوش
پیامِ ناز کہ حوروں کی سرد سرد آہیں
جمالِ یار کہ مینا میں بادۂ سرجوش
یہ زمزمے کہ طربِ زارِ حسن کا پرتو
یہ قہقہے کہ اُبھرتے ہوئے شباب کا جوش
نجومِ چرخ کہ طبعِ جمیل کی ہلچل
شبِ سیاہ کہ ظلمت سرائے جوش و خروش
یہ نرم دوب کہ پریوں کے مخملیں بستر
حسین غنچہ کہ جبریل کا لبِ خاموش
سحر ہے یا کوئی عرشِ بریں سے نور فشاں
شفق کہ باغِ عدن میں کوئی حسیں گلپوش
یہ گلستاں کہ جھلک قدسیوں کے سجدوں کی
یہ نامرادِ محبت کہ چرخِ نیلی پوش
کمالؔ ان کے مقدر پہ رشک کیوں نہ کرے
جو نکلیں دیدِ گل و یاسمن کو دوش بدوش

منیر کمال بی اے (جالندھری)

مسٹر شبیر محمد اختر کے قلم سے

سائے

زبیدہ کی زندگی عجیب تھی۔ ابتدا کہاں سے ہوئی اور انتہا کہاں۔ وہ پہلے پہل تحریکِ آزادی کی رَو میں بہہ نکلی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قدامت پسند خاندان کی روایات کو پس پشت ڈالتے ہوئے وہ سیاسی اسٹیج پر آنے لگی۔ کالج کی محدود فضا سے آزاد ہو کر وہ سیاسی زندگی میں داخل ہوئی۔ وسیع میدان تھا۔ والدین کی مخالفت کے باوجود اُسے قومی درد اس میدان میں کھینچ لایا۔ وہ خوش تھی اس نے ایک مقدس کام کا بیڑا اٹھایا تھا۔ مردوں سے زیادہ اُسے اپنی عورت بہنیں قید نظر آتی تھیں۔ وہ غلام پیدا کرنے کی مشینیں تھیں۔ وہ بڑے بڑے بلند عزائم لیکر نکلی۔ عورت کی حالت زار پر اس نے لٹریچر پڑھا۔ روسی عورت کی آزادی اُسے پسند تھی۔ عورت غلام زادوں کی ماں۔ خود ان غلاموں کی غلام تھی۔ اس نے اس غلامی کے خلاف جہاد کرنا تھا۔ کالج کی تعلیم، خاندانی روایات، والدین کی مخالفت، عزیزوں کے طعنے اس کی راہ میں روک تھے۔ مگر وہ ان روکوں کو ہٹاتی آگے بڑھی

یہ تو سب کچھ اس کے بس کی بات تھی۔ مگر جس پر اُسے قابو نہ تھا وہ تھا اس کا شباب۔ اس نے قیمتی ریشمی ساری کی جگہ عمدہ سفید کھدر کی ساری پہن لی۔ مگر شباب تو تبدیل نہ ہو سکتا تھا۔ اس کا حسن پھٹا پڑتا تھا۔ پہلی بار جب اس نے تقریر کی۔ تو سارا ہال تالیوں سے گونج اُٹھا۔ نوجوان صدر نے اس کی وہ تعریف کی کہ سبحان اللہ۔ زبیدہ تعریف کے قابل بھی تھی۔ اس نے غلامی کے خلاف جہاد کا اعلان کیا تھا۔ قدامت پرستی کی زنجیروں کو توڑ کر وہ آگے بڑھی تھی۔ اپنے جیسی ہزاروں بہنوں کو آزاد کرانے کے لئے۔ قومی تحریک میں حصہ لینے والے نوجوان مسحور ہو گئے۔ جلسہ کے بعد جب وہ باہر نکلنے لگی تو اس کے گرد ایک ہجوم تھا۔ آٹوگراف لینے والوں کا۔ جب اس نے پہلی بار اپنا نام انگریزی میں لکھا تو اُسے لذت محسوس ہوئی۔ وہ گویا ہوا میں اڑنے لگی تھی۔

"محترمہ! ہندوستانی میں دستخط کیجئے۔" ایک شریر نوجوان نے اپنی کتاب بڑھاتے ہوئے کہا۔ "انگریزی بدیشی زبان ہے۔"

زبیدہ کو ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے اُس کے چٹکی لی ہو۔ وہ شرما گئی۔ اس کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔

یہاں سے فارغ ہو کر وہ آگے بڑھی ہی تھی کہ پریس رپورٹر موجود تھے۔ اس پر عجیب عجیب سوالات ہونے لگے۔

"مذہب کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔ ذاتی چیز ہے یا اجتماعی؟"

"مسلمان خواتین کا جنگ آزادی میں حصہ لینا کیا ضروری نہیں؟"

"ہندو مسلم اتحاد کے لئے آپ کیا راہ تجویز کرتی ہیں؟"

"تعلیم مقدم ہے یا قومی سیوا؟"

عجیب سوالات تھے اور اُن کے جوابات عجیب تر۔ وہ کھڑی بول رہی تھی اور نامہ نگاروں کی پنسل صفحہ قرطاس پر کیڑوں کی طرح رینگتی ہوئی مختلف اشکال بنا رہی تھی۔ زبیدہ کے لئے یہ ایک نیا تجربہ تھا۔ وہ اپنے آپ میں ایک سنسنی سی محسوس کر رہی تھی۔ لطیف اور خوش کن، وہ خوشی سے دل ہی دل میں ناچنے لگی تھی۔ کل اس کی تقریر شائع ہو گی۔ اس کا بیان چھپے گا۔ اس کا نام قومی لیڈروں میں آجائے گا ——

"چھوڑیئے، چھوڑیئے! آپ لوگوں نے مس زبیدہ کو بُری طرح گھیر لیا ہے" جلسہ کے نوجوان صدر بھاگتے ہوئے آئے۔ "آیئے مس صاحبہ! ان لوگوں کا کہیں پیٹ بھرتا ہے؟ یہ تو رات بھر لکھتے رہیں گے۔"

زبیدہ یہی چاہتی تھی کہ وہ رات بھر لکھتے رہیں۔ کل کے سارے اخبارات صرف اس کے بیانات سے پُر ہوں۔ مگر صدر کی بات بھی وہ رد نہ کر سکی۔

"کار حاضر ہے۔ میں آپ کو راستے میں چھوڑتے جاؤں گا۔"

"شکریہ!" زبیدہ کی نقرئی آواز فضا میں گونجی۔ "آپ کو خواہ مخواہ —— تکلیف ہوئی۔" نوجوان صدر نے فقرہ مکمل کرتے ہوئے کہا۔ "واہ! تکلیف کیسی! یہ تو میرا فرض ہے۔"

کار کا دروازہ خود صدر نے بڑے انداز سے کھولا۔ زبیدہ اندر داخل ہوئی۔ اور گیند کی طرح ایک کونے میں گر گئی۔ پھر صدر بھی دوسری گیند کی طرح آن پڑا۔ گدا اُبھرا۔ دونو کے کندھے ایک دوسرے کو چھو گئے۔

"اوہ" صدر مسکرایا۔

زبیدہ بھی مسکرا دی۔

کار چل رہی تھی۔

"آپ تھک تو گئی ہوں گی —— قومی کاموں کے لئے ہمت کی ضرورت ہے اور مزدور کا صبر۔ قربانی کی روح جب تک پیدا نہ ہو۔ کام نہیں بنتا۔ مجھے تو اپنا وکالت کا کام تک چھوڑنا پڑا! جب لندن میں تھے تو بڑے بڑے منصوبے باندھتے تھے کہ قانون کے میدان میں ایک تہلکہ مچا دیں گے۔ مگر جب سے سیاسی میدان میں قدم رکھا ہے لمحہ بھر کی فرصت نہیں، ملاقاتیں۔ جلسے، دورے، کانفرنسیں، پریس بیانات، کبھی واردھا جاتا کبھی الہ آباد۔ غرض صوبہ بھر کی سیاسی زندگی کا

بیدار رکھنا ہوتا ہے ——— فرصت نہیں ملتی "

زبیدہ صدر کا منہ تک رہی تھی۔ اس کا ساتھی کتنا مصروف تھا۔ اس نے غریب ہندوستان کے لئے کتنی بڑی قربانی کی تھی۔ اپنے مستقبل کی قربانی' ورنہ وہ آج کہیں کا بڑا حاکم ہوتا ——— مگر اب بھی وہ عوام کے دلوں پر حکومت کرتا ہے

زبیدہ مجسمۂ حیرت بنی اور بھی زیادہ خوبصورت دکھائی دیتی تھی۔ موٹر کے گدے اُچھلنے لگے۔ وہ دونوں اور قریب ہو گئے

مال کی شفاف سڑک' کار کی برق رفتاری' زبیدہ اور صدر' سردی کے باوجود زبیدہ کا جسم گرم تھا۔ اُسے ایسا محسوس ہو رہا تھا گویا وہ سمور میں لپٹی ہوئی ہے خوشی سے اس کا روآں روآں ناچ رہا تھا۔ وہ اپنے ساتھی کی گفتگو میں اور زیادہ دلچسپی کا اظہار کرنے لگی تھی۔

اس کے ساتھی نے ایک تجربہ کار شکاری کی طرح جب اپنا تیر نشانے پر لگتے دیکھا تو وہ اور زیادہ محتاط ہو گیا۔ اس نے گفتگو کا رُخ آہستہ آہستہ سیاست سے ادب کی طرف پلٹا۔ شعر و شاعری کے لطیف و جمیل موضوع پر سلسلہ کلام شروع ہوا۔ زبیدہ کی مشتاق نگاہیں اور زیادہ ہوتی گئیں۔

" میری اس مصروف زندگی میں" کانٹوں کا تاج پہننے والا' صدر کہہ رہا تھا" وہ وقت کتنا حسین ہوتا ہے۔ جب میں اپنی لائبریری میں ہوتا ہوں اس کی فرانسیسی کھڑکی سے جب میں اپنے باغ میں دیکھتا ہوں تو مجھے ایسا دکھائی دیتا ہے جیسے ساری دنیا اس کھڑکی کے نیچے ہے ———"

الفاظ کا جادو اپنا اثر کئے جا رہا تھا۔ زبیدہ مسحور ہوتی گئی۔ صدر کی تقریر کے الفاظ اور تیز ہوتے گئے

" میں دنیا کو بھول جاتا ہوں۔ حافظ اور عمر خیام کی طرح میں چاہتا ہوں کہ سارے تفکرات کو شراب کے جام میں ملا کر پی جاؤں۔ پھر میں بدمست ہو کر چلا اُٹھوں میرے بھائیو! آج میں نے تمہاری خوشی کے لئے یہ بوجھ اپنے دل میں لے لیا ہے ——— آزادی ——— آزاد ہندوستان ——— " وہ بالکل شرابیوں کی طرح بولے جا رہا تھا۔

" اوہ ایسٹیفل! شوفر گاڑی روکو!" وہ ہوش میں آچکا تھا " آپ تھک گئی ہیں۔ آپ سستا لیں اور کچھ پی بھی لیں"۔

زبیدہ خود بخود اس کے ساتھ چلی جا رہی تھی۔ وہ آگے بڑھے۔ کچھ لب ہلے۔ تبسم چہرے' ویٹر جھک گئے۔ دونوں چلے جا رہے تھے۔ ایک بے نیاز' دوسرا سمٹا سمٹا رک رک کر' یہ سمٹنا اور رک رک کر چلنا قیامت تھا۔ شباب جب سمٹے اور رک رک کر چلے تو اس کا جادو زیادہ زود اثر ہوتا ہے۔

ایک کیبن کے اندر دونوں جا بیٹھے۔ ویٹر موجود تھا۔ زیرِ لب صدر نے کچھ کہا ویٹر مسکرایا۔ دبے پاؤں چلا گیا۔ زبیدہ آج تک اس جگہ نہ آئی تھی۔ پھر رات گئے ایک غیر مرد کے ساتھ۔ اُسے بہتیرے تاثرات دلکش محسوس ہو رہے تھے چند لمحات کی خاموشی گفتگو سے زیادہ پُر لطف تھی۔ زبیدہ "ڈریم لینڈ" (خواب آفرین دنیا) میں تھی۔ اُسے ہر ایک واقعہ ایک خوش کن اور حسین خواب معلوم ہوتا تھا۔

"جب آپ میری لائبریری دیکھنے آئیں گی۔ تو آپ میرے ذوق کی داد دیں گی"۔

"ضرور۔ ضرور!" بڑی دیر کے بعد اُسے بولنے کا موقع ملا تھا۔ "مجھے بھی ادب سے بڑی دلچسپی تھی۔ مگر میں اسے آزادی کی راہ میں ایک روک سمجھتی ہوں اسی لئے میں نے ———"

"بالکل بجا فرمایا آپ نے" مگر زندگی کی تلخیوں سے گھبرا کر اگر ادب کے دامن میں چند لمحے آرام کے مل جائیں تو انہیں چھوڑ دینا ظلم ہوگا۔ اپنے آپ پر ظلم ——— آخر ہمارے غلام بھائیوں کی زندگی بھی تو ادب ہے۔ یہیں سے نیا ادب پیدا ہوتا ہے۔ شعر بنتے ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ یہ المیہ اشعار ہوتے ہیں۔ المیہ ڈراما سب پسند کرتے ہیں۔ اگر ہماری یہی زندگی جسے ہم بدلنا چاہتے ہیں۔ اس میں شعر کی چاشنی مل جائے تو یہی زندگی' زندگی بن جائے آپ اس زندگی میں سے شعر و ادب کو نکال کر اُسے اور بھی گھناؤنا بنا رہی ہیں ——— میں نے ———"

"حضور! کچھ اور" ویٹر نے میز پر دو ٹمبلر کسی بے رنگ مرکب سے بھر کر لا رکھے۔

جب وہ اپنے کمرے میں لوٹی۔ رات کافی جا چکی تھی۔ اس کا بدن تھکاوٹ سے چور ہو رہا تھا۔ اس کا سر خمار سے بوجھل' اس نے بتی روشن کی اور پھر اپنے بستر پر دراز ہو گئی۔ اُسے اسی طرح لطف آ رہا تھا۔ اس کے سامنے شام کے سارے واقعات سایوں کی طرح پھر رہے تھے۔

آزادی کی جنگ لڑنے کے لئے وہ مردانہ وار نکلی تھی۔ مگر اس جنگ کا خاتمہ بے رنگ مرکب کے ایک ٹمبلر پر ہوا۔ اس کے سامنے لاکھوں خواتین بُرے حال میں تھیں۔ اُن کے بدن پر چیتھڑے تھے۔ اُن کے چہروں پر موت کی سی خاموشی تھی۔ اُن کے گرد ہزاروں بچے بلک رہے تھے۔ غلام زادے ——— وہ ان عورتوں کو اپنا حق دلانے نکلی تھی۔ تاکہ غلاموں کی جگہ احرار پیدا ہوں۔ عورت کا جسم برہنہ نہ رہے۔ وہ آنے والی آزاد نسل کی ماں بن سکے۔ یہ غلام بچے آزادی کے سپاہی ہوں۔ وہ بھارت ماتا کا جھنڈا بلند کریں۔ اتنا بلند کہ تمام دنیا اس کو لہراتا دیکھے۔ یہ زندگی کیا تھی مسلسل عذاب' بھڑکتا ہوا دوزخ کرب و بلا کا میدان' اگر اس میں ادب کی چاشنی ہو تو المیہ شعر بن جاتے یہ زندگی ——— المیہ ڈراما ——— اس کا سر گھوم رہا تھا۔ ٹمبلر ابھی تک اُس کے ہاتھ میں تھامے تھی۔ ابھی تک شام کے تاثرات کا اثر باقی تھا۔ وہ اس اثر کو جاوداں کرنا چاہتی تھی۔ کتنی خوشی ہوئی تھی اُسے' ہزاروں سروں کا ایک سمندر ہمہ تن گوش بنا اس کو تک رہا تھا۔ مائکروفون پر اس کی آواز کتنی زوردار

ہوگئی تھی۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ ساری کائنات اس کے سامنے ہے۔ اور وہ' ایک عورت' دنیا کی ساری عورتیں سمٹ کر اس میں آگئی تھیں۔ اپنا حق مانگنے کھڑی تھی جکومت سے' سماج سے' غلاموں سے' مگر اُسے ملا کیا سٹیفل کے کیبن میں ایک ٹمبلر جسے نجانے وہ کیسے پی گئی ؛

آزادیٔ وطن نے اس کے دل میں مذہب کی جگہ لے لی تھی۔ وطن اس کے لئے خدا تھا۔ وہ اُسے اپنا دیوتا سمجھ رہی تھی۔ اس لئے اس نے دیوتا کے قدموں میں اپنا سب کچھ رکھ دیا۔ اپنا آپ' مذہب' خاندان' مستقبل' وہ آزادی کے مندر میں پجارن بن کر داخل ہوئی تھی۔ وہ بڑے بڑے سادھوؤں کو مہاتما سمجھ کر اُن کے پاؤں چھونا فخر سمجھتی تھی۔ مگر نزدیک آکر اس نے دیکھا کہ آزادی کے مندر میں جن دیوتاؤں کو وہ پوجنے نکلی تھی وہ سب پتھر کے بُت تھے۔ یہ اس کا فریبِ نظر تھا۔ ایک سراب ––– اس نے بلیدان دیا۔ ایک پتھر کے لئے' انسانیت کا دکھ درد بٹانے والے یہ' مہاتما نہ تھے بلکہ وہ خود ان دکھوں کے نام سے فائدہ اٹھا کر اپنے آپ کو نفع پہنچانا چاہتے تھے۔

اس کا آئیڈیل بُری طرح پاش پاش ہوگیا۔ اس نے دیکھا کہ وہ ایک طوفانی سمندر میں دھکیل دی گئی ہے۔ اس کے چاروں طرف بڑے بڑے نہنگ منہ کھولے اُسے لقمہ بنانے کو دور سے آرہے ہیں۔ اس نے اندازہ غلط لگایا تھا۔ وہ عورت تھی۔ سماج میں اس کی حیثیت عورت سے زیادہ نہ تھی۔ گلا پھاڑ پھاڑ کر چلانے والے آزادی کے حامی بھی اُسے اس سے زیادہ مقام نہ دے سکتے تھے۔ اس کا شباب اُن کے بھڑکانے کے لئے کافی تھا۔ وہ کھلونا تھی۔ مرد اس سے کھیلنا اپنا حق سمجھتے تھے۔ آزادیٔ وطن اسے وہ مذہب جیسی مقدس چیز سمجھتی تھی۔ مردوں نے اس کا یہ نظریہ محض اس کی خود نمائش کا ایک بہانہ جانا۔ اس کے رفیقانِ کار اس کے گرد منڈلاتے رہتے تھے۔

اس میں خون تھا' گرم اور کھولتا ہوا خون' اُسے اور گرمایا گیا۔ وہ بہک گئی وہ مجبور تھی۔ وہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی زہر کھا رہی تھی۔ کار' ٹمبلر' لائبریری' حافظ و خیام' اس کے بعد بھی اگر وہ شعر نہ کہنے لگتی تو یہ معجزہ ہوتا۔ وہ شاعری کی دنیا میں چلی گئی۔ عورتوں کی آزادی کی جگہ خود پرستی نے لے لی۔ وہ کھلونا بن چکی تھی۔ اُسے بھی کھیلنے میں مزہ آتا تھا۔

اکیلے میں کبھی کبھی اس کا ضمیر اُسے ملامت کرتا تھا۔ وہ گھبرا جاتی' اُس نے کتنی بڑی قربانی دی تھی۔ صرف اسی لئے کہ وہ کھلونا بن جائے۔ اگر وہ اپنے گھر میں ہوتی۔ اپنی تعلیم مکمل کر لیتی تو اس کا ٹھکانا کوئی شریف گھرانہ ہوتا۔ مانا وہ ازدواجی زنجیروں میں قید کر دی جاتی۔ مگر وہ زنجیریں اس آزادی سے ہزار بار بہتر تھیں۔ وہاں وہ ایک کی ہوتی۔ خاندان اس کی دنیا ہوتا۔ وہ اس دنیا میں ایک نئی زندگی پیدا کرتی تخلیق کا موجب بنتی۔ ایک اور خاندان کا دیا روشن ہوتا۔ مگر یہاں کیا تھا ––––

یہ خیالات اُسے تنگ کرتے۔ مگر اُن سے نجات حاصل کرنے کے لئے اس نے کئی بہانے ڈھونڈے تھے۔ اس نے سمندر کی لہروں کی بجائے اُن سے کھیلنا شروع کر دیا۔ مگر یہ کھیل وہ زیادہ دیر کھیل نہ سکی۔ عوام اُسے اب تک دیوی جانتے تھے۔ اس کی پوجا کرتے تھے۔ اس کے قدموں میں پھول چڑھانا باعث فخر سمجھتے تھے۔ انہیں کیا معلوم کہ اُن کی دیوی ایک معمولی کمزور عورت ہے۔ جس نے جذبات کی رو میں بہہ کر جنگِ آزادی کا خاتمہ کر دیا تھا۔ لوگوں کا یہ اعتقاد دیکھ کر وہ شرم سے پانی پانی ہو جاتی۔ اس کا مقابلہ کرنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ اس کا دیوتا پتھر کا بُت ثابت ہوا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اُسے کتنا صدمہ ہوا اس کے بُت کے ٹوٹنے کا۔ وہ نہ چاہتی تھی کہ بھولے بھالے لوگ جو اس کو دیوی جان کر اس پر جان چھڑکنا اپنا دھرم سمجھتے ہیں۔ اُن کا اعتقاد باطل ثابت ہو۔

اس نے زندگی کی کشمکش میں بُری طرح ناکامی کا مُنہ دیکھا۔ اب وہ دیوی نہ تھی۔ بلکہ ایک لاوارث عورت تھی جسے زندہ رہنے کے لئے سہارا ڈھونڈھنا تھا۔ اپنے گھر واپس لوٹ جانا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ وہ خاندان کو اور رسوا نہ کرنا چاہتی تھی۔ اس لئے وہ سیاسی میدان سے یکایک غائب ہوگئی

چند ماہ کے بعد وہ ایک نگار خانے میں تھی۔ اس کے لئے یہ ایک نیا تجربہ تھا "حقیقت سے دُور ہو کر ایسی اداکاری کرو کہ تمہارا ہر ایک فعل حقیقت بن جائے" یہ تھا وہ راز جو اس دنیا میں کارآمد ہو سکتا تھا۔ تمہیں رونا نہیں مگر اس طرح رو کہ لوگ بھی رونے لگ پڑیں۔ وہ اس "اُلٹی گنگا" والے نظریہ کا تجربہ کر چکی تھی۔ اس کے جذبات سے کھیلا گیا تھا۔ اب اُسے دوسروں کے جذبات سے کھیلنا تھا۔ اتنا کھیلنا کہ لوگ بیقرار ہو جائیں۔ یہ اس کی کامیابی کا راز تھا۔

سیاست میں اس نے دوسروں کو کھیلتے دیکھا تھا۔ اس کا آئیڈیل اسی سے ٹوٹا تھا۔ یہ کھیلنے والوں کے کردار کی کمزوری تھی۔ وہ اچھے اداکار نہ تھے۔ مگر زبیدہ تجربہ کار تھی۔ اس نے اداکاری کے فن کو خوب سمجھا۔

وہ چمکی۔ آفتاب سے زیادہ روشن ہوگئی۔ اس کا نام لبوں پر' اس کا خیال دلوں میں اور اس کی تصاویر کمروں کی زینت۔ اس کے نغمات گنگنا کر کئی نوجوان راحت محسوس کرتے' ہزاروں کالج کے طلباء سردیوں کی راتیں اس کے تصور سے گرماتے رہے۔

اس نے سابقہ تجربے سے فائدہ اٹھایا اب وہ اپنے پرستاروں سے دور دور رہتی۔ اس کی دوری نے اُسے اور بھی زیادہ قابلِ پرستش بنا دیا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ خدا ہم سے بہت دُور ہے۔ اور ہم اسی لئے اس کی زیادہ پرستش کرتے ہیں۔

چند سالوں میں ہی اس کی زندگی تبدیل ہو چکی تھی۔ روپے کی کمی نہ تھی۔ بمبئی کا بہترین بنگلہ' سمندر کا کنارہ' کار' بنک میں ایک بھاری رقم' وہ دنیا سے بے نیاز تھی۔ اس کا نام اب "مس پروین" تھا ––– ستاروں کا پھل ––– چمکتا ہوا ستارہ' اس تک رسائی مشکل تھی۔ وہ جسے چاہتی۔

پاس آنے کی اجازت دیتی۔ بڑے بڑے نقاد اس کے آرٹ کی تعریف کرتے تھے اس نے اپنی زندگی کو ایک معمہ رکھا۔ یہی اس کی کامیابی کا راز تھا۔

اس آرام و آسائش کے باوجود اس کی زندگی پر خود زندگی کا سایہ تھا۔ پردۂ سیمیں پر جب وہ نمودار ہوتی۔ تو تماشائیوں کے دل دھڑکنے لگتے۔ ہر بار اس نے نیا رول لیا۔ المیہ جذبات کا اظہار کرنے لگی تو سارا ہال رولا دیا۔ وہ ایک مجسم دکھ بن کر سامنے آتی۔ اس کی حسین آنکھیں جب آنسوؤں سے تر ہوتیں تو کتنے دل تھے جو ضبط کر سکتے۔ مگر جب وہ مسکراتی اٹھکیلیاں کرتی آتی۔ تو ہال ناچنے لگتا۔

اپنی اداکاری کا ساحرانہ کمال اس نے خود کئی بار دیکھا تھا۔ وہ خود بھی مسحور ہو گئی تھی۔ اس کی اداکاری آرٹ تھی۔ وہ فن کارانہ چابکدستیوں سے دلوں سے کھیلنے لگی تھی۔ اس کا حسن ابھی تک ویسا ہی تھا۔ وہ بھلا اُسے ضائع کر کے اپنا پیشہ تباہ کر سکتی تھی۔

پروین فن کار ہونے کے باوجود عورت تھی۔ اس کا دل ساتھی کی تلاش میں رہتا۔ مگر یہ تلاش عارضی ہوتی۔ ساتھی کی ضرورت ہوئی اُسے تلاش کر لیا گیا۔ جب کھیل سے جی بھر گیا۔ اُسے چھوڑ دیا جاتا۔ آخر وہ ساتھی ہوتا تھا۔

فن کی تکمیل کے ساتھ ساتھ اس کی اپنی انفرادیت تباہ ہوتی گئی۔ جب اس کا جی جذبات سے کھیلنے کو چاہتا تو وہ یہ جان نہ سکتی کہ وہ ادا کر رہی ہے یا اخلاص سے وہ اپنا دل بہلا رہی ہے۔ کاروبار کے علاوہ زندگی میں اُسے رنج و غم اور خوشی کے اظہار کے مواقع آتے۔ وہ نہایت کامیابی سے اس کا اظہار کرتی۔ مگر دل ہی دل میں وہ سوچتی کہ وہ اداکاری کر رہی تھی یا حقیقت تھی

اس کی ہر ایک حرکت اداکارانہ تھی۔ اخلاص جاتا رہا۔ اب وہ ایک مشین تھی۔ یہ خیال اس کے دماغ پر بُری طرح مسلط ہوتا گیا۔ اس کا گھر نگار خانے کا ایک سین تھا۔ اس کی زندگی ایکٹنگ۔ وہ تمام لوازمات زندگی جن کو پا کر وہ خوش ہوئی تھی۔ اب اس کے لئے وبالِ جان بن گئے۔

کئی نوجوان ملاقاتی اس کے ہاں آتے۔ بھولے بھالے نوجوان۔ اخلاص نے انہیں تھوڑا سا بیوقوف بنا دیا تھا۔ انہوں نے کلیجہ کھول اُس کے سامنے رکھ دیا۔ اس نے مرہم لگائی مگر اس فنکاری نے انہیں اور برباد کر دیا۔ وہ چاہتی تھی کہ ان میں سے کسی کی ہو جائے مگر وہ مجبور تھی۔ اس کے لئے ایسے سین ہر روز ہوتے تھے۔ وہ ہیروئن بنتی تھی لور کئی درجنوں اداکار ہیرو بن کر اس کے قدموں میں لوٹ چکے تھے۔

اس کی نگاہوں سے حقیقت اور اداکاری کا فرق مٹ گیا۔ وہ سراپا اداکاری تھی۔ ایک بار اس نے اپنے دلوتا کو کھو دیا تھا۔ اب خود اس کی زندگی جا رہی تھی۔ وہ اسے دینا نہ چاہتی تھی۔ یہ زندگی ——

روز بروز اس ماحول سے آزادی حاصل کرنے کا خیال پختہ ہوتا گیا۔ کئی بار شام کے بعد وہ گھر سے نکل گئی۔ ٹرام میں بیٹھ کر وہ گھومتی رہتی۔ رات گئے وہ تھک کر لوٹتی اُسے ٹرام اور ٹرام کے مسافروں سے دلچسپی سی ہونے لگی۔ وہ اکثر ایسا کرنے لگی۔ بمبئی کے گرد و نواح میں وہ ایک معمولی درجے کی عورت کے لباس میں گھوم آتی۔ اُسے تھوڑی سی تسکین مل جاتی۔ یہاں اُسے اداکارانہ زندگی کی بجائے حقیقت دکھائی دیتی۔ کئی بار اس نے معمولی ریستوران اور ہوٹل میں کھانا بھی کھا لیا۔ اُسے کتنا اچھا لگا تھا یہ کھانا۔

چاند جب چودھویں رات کا ہو تو نصف رات گئے اس کا کمال ہوتا ہے۔ اس وقت سمندر کا پانی بھی جوار کی تکمیل کرتا ہے۔ پروین کی زندگی اب جوار پر تھی۔ جذبات کی روانی میں وہ بہہ کر نقطۂ عروج تک پہنچ چکی تھی جس زندگی سے نکل کر وہ اس مقام تک پہنچی۔ اب آہستہ آہستہ اس کا دل پھر گذشتہ کی یاد سے معمور رہنے لگا۔ حقیقت کی طرف وہ رجوع کرنے لگی۔

"تاج محل" میں ایک عظیم الشان دعوت دی جا رہی تھی۔ اور وہ مدعو تھی میزبان نے خود آ کر اس سے آنے کا وعدہ لیا تھا۔ وہ تیار ہو رہی تھی۔ کہ اچانک اُسے کچھ خیال آیا۔ وہ رُکی۔ اس نے قیمتی لباس اتار دیا۔ معمولی سادہ لباس پہن لیا۔ وہ "تاج محل" میں داخل ہوئی' سمٹی ہوئی' ہیڈ ویٹر آگے بڑھا۔ اور —— وہ اُسے پہچان گیا۔ پروین نے انگلی کے اشارے سے اُسے روک دیا۔ وہ آج مہمان نہ تھی۔ بلکہ عام آنے والوں کی طرح ایک گاہک' ویٹر کے ذریعے ایک کونے میں اُسے محفوظ جگہ مل گئی۔ بمبئی کا دل اس کے سامنے تھا۔ مرد اور عورت —— دولت کی نمائش گاہ میں کس چیز کی کمی تھی۔ تہذیب و تمدن کا تماشا ہو رہا تھا۔ بجلی کی روشنی میں دن سے زیادہ رونق تھی۔ میزوں پر کھانوں کے انبار اُن کی ہوس کا پتہ دے رہے تھے۔ سیاہ لباس روشنی میں کتنا بھلا معلوم ہوتا تھا۔ سفیدی اور سیاہی۔

پھر "بلیک اینڈ وائٹ" کا دَور چلا۔ دولت کے خمار سے مست' بدمست ہو کر ناچنے لگے تھے۔ دعوت ارتقائی منازل طے کر رہی تھی سماج کا اعلیٰ ترین طبقہ تہذیب کے عروج پر آ گیا۔ ہوٹل کا آرکسٹرا اُن کے جذبات کو اور برانگیختہ کر رہا تھا۔ وہ لہروں میں بہے جا رہے تھے۔ عورت اور مرد ایک دوسرے سے بغلگیر ہو کر محو رقص تھے۔ گرم گرم جسم ایک دوسرے سے پیوست ہو گئے۔ زیر لب کچھ کہا جاتا۔ کوئی گنگناتا۔ سارا ہال ناچ رہا تھا۔ بجلی کے قمقمے ناچ رہے تھے۔ انسانیت ناچ رہی تھی —— اور پروین بیٹھی تماشا دیکھ رہی تھی۔ وہ فن کار تھی۔ اداکاری اس کا پیشہ تھا۔ وہ ناچتی تھی کسی کے جسم سے اس کا جسم بھی پیوست ہو جایا کرتا تھا۔ مگر محض کاروبار کے سلسلہ میں' یہاں یہ سوال نہ تھا۔ یہ تو تمدن کا ایک جزو تھا۔ کلچر کا فریضہ' ناچنے والے اپنی بیویاں دوسروں کی بغل میں دیکھ کر خوش ہوتے تھے۔ یہاں مرضی پر انحصار تھا۔ آزادی تھی۔

آزادی —— وہ بھی تو عورتوں کو آزادی دلانے نکلی تھی کیا یہ آزادی تھی۔ اُسے ہال میں سارے لوگ ساۓ دکھائی دینے لگے۔ عورت کی

داستانِ غم کا نقشہ اس کے دماغ میں مدھم پڑ گیا تھا۔ اس کے نقوش اُبھر آئے۔ ناچنے والوں کے سائے بڑھتے جا رہے تھے۔ پھٹے پرانے کپڑوں میں لپٹی ہوئی عورتیں ان آزاد عورتوں کو گھور رہی تھیں۔ موت کا سایہ بنکر ان کے سروں پر منڈلا رہی تھیں۔ آزادی۔ نسوانی آزادی، کیا، کیا اداکاری نہیں۔ تہذیب، اداکاری کا دوسرا نام نہ تھا۔ وہ، وہ بھی تو انہیں میں سے ہے ۔۔ اداکار ۔۔ آزاد عورت ۔۔ فنکار ۔۔ اس کے خیالات رُک رُک جاتے تھے۔ کالج سے بغاوت، نوجوان صدر ۔۔ ٹمبلر ۔۔ لائبریری ۔۔ عمر خیام کا انگریزی ایڈیشن ۔۔ عورت ۔۔ غلامی اس کے سامنے سارے واقعات سائے کی طرح بڑھتے چلے آرہے تھے۔ سارا ہال سایوں سے پُر ہو گیا ۔۔ بھیانک اور پُرخوف سائے ۔۔

غزل

نالوں میں اپنے آج اثر پا رہا ہوں میں
اُن کو بھی بے قرار کئے جا رہا ہوں میں

اب مل رہی ہے دل کے عوض لذتِ الم
کچھ کھو چکا ہوں عشق میں کچھ پا رہا ہوں میں

ڈوبا ہوا ہوں آج یہ کس کے خیال میں
خود پیکرِ خیال بنا جا رہا ہوں میں

آنسو سمجھ کے قدر نہ ان کی گھٹائیے
خونِ جگر یہ آنکھوں سے ٹپکا رہا ہوں میں

دنیا سے جا رہا ہوں لئے آپ کا خیال
کیا چیز اس جہاں سے لئے جا رہا ہوں میں

ساحل کو کیوں تلاش کروں بحرِ عشق میں
موجوں کے ساتھ ساتھ بہا جا رہا ہوں میں

منزل ہے دُور اور یہ منزل کی جستجو
اُٹھتے نہیں ہیں پاؤں مگر جا رہا ہوں میں

نیساں ہیں دیدنی مری ایذا پسندیاں
یعنی خوشی کے نام سے گھبرا رہا ہوں میں

نیساںؔ اکبرآبادی

غزل

ہر نفس گرمِ فغاں ہے، مجھے معلوم نہ تھا
زندگی بارِ گراں ہے، مجھے معلوم نہ تھا

عشق کی آگ کو گلزار بداماں سمجھا
جان کا اس میں زیاں ہے، مجھے معلوم نہ تھا

لامکاں کہتے رہے جس کو ازل سے اب تک
وہ بھی میرا ہی جہاں ہے، مجھے معلوم نہ تھا

اس فضائے الم و درد کی سرحد سے پرے
شعر و نغمہ کا جہاں ہے، مجھے معلوم نہ تھا

وہ جسے عشق کا اک شعلۂ عریاں کہئے
شمع محرابِ جہاں ہے، مجھے معلوم نہ تھا

مطربۂ ساز کے ہر پردے کی تہ میں رقصاں
ایک طوفانِ فغاں ہے، مجھے معلوم نہ تھا

رُوحِ آزادی کے مستقبلِ زرّیں کے لئے
ایک اک ذرہ تپاں ہے، مجھے معلوم نہ تھا

منتخب میں ہی رہا تیری جفاؤں کے لئے
یہ بھی اک لطفِ نہاں ہے، مجھے معلوم نہ تھا

سوزِ احساس کی افضالؔ بھڑکتی ہوئی آگ
حاصلِ دردِ نہاں ہے، مجھے معلوم نہ تھا

افضالؔ۔ شاہ آبادی۔ بی اے

مدبر ہاشمی بی اے (آنرز)

لفنگا

تارکول کی لمبی لامحدود سڑک پر چلتے چلتے اکتا کر وہ دھیمی چال سے بجلی کے کھمبے کے پاس پہنچا۔ پلٹ کر دکانوں۔ کوٹھوں اور سر بفلک عمارتوں کے فلیٹ پر ایک چمکتی ہوئی نگاہ ڈالی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے "جگہ خالی نہیں" کا بورڈ گھومنے لگا۔ کانوں میں سیٹھوں۔ رئیسوں۔ بابوؤں۔ مہاجنوں اور دکانداروں کی خوفناک صدائیں نت نئے الفاظ اور طرح طرح کے شہد کی مکھی کے چھتے کی آواز کی طرح بھنبھنانے لگے۔ بڑی بڑی بسیں۔ موٹر کاریں اور ٹرام کاریں سرعت سے گذر رہی تھیں۔ اس نے اپنے پیروں میں درد محسوس کیا۔ اور غیر ارادی طور پر اس کی نگاہیں گھسی ہوئی چپل پر جو صبح سے اس وقت تک اس کا ساتھ دیتی آئی تھی۔ اٹک گئیں تھوڑی دیر غور سے اپنی چپل کے ٹوٹے ہوئے فیتے اور جمی ہوئی گرد کو دیکھتا رہا۔ بجلی کے کھمبے سے لگ کر ذرا دم لینے کے لئے کھڑا ہو گیا۔ اور حسرت زدہ نگاہیں ادھر ادھر دوڑانے لگا۔

سامنے بھنبھناتی ہوئی مکھیوں سے بھرے ہوئے چھوٹے سے ہوٹل میں تھوڑے سے قلی۔ مزدور۔ مل میں کام کرنے والے۔ رکشا چلانے والے۔ چور۔ اچکے۔ جیب کترے وغیرہ۔ چائے کی پیالی سامنے رکھے جنگ حاضرہ پر تبادلہ خیال کر رہے تھے۔ کچھ آپس میں بازاری عورتوں اور آوارہ چھوکریوں کا تذکرہ کر رہے تھے۔

"ہٹاؤ بھی۔ کوئی لفنگا ہوگا۔ کبھی نہ کبھی یہیں آئے گا"۔ ایک نے دوسرے کے جواب میں ذرا بلند آواز میں کہا۔ اس نے پلٹ کر دکان میں دو میلی گنجی اور تہبند باندھے ہوئے بیڑی کا کش لگاتے ہوئے جوانوں کو اپنی جانب غور سے دیکھتے ہوئے پایا۔ وہ آہستہ آہستہ آگے چلنے لگا۔

سورج کی آخری زرد زرد کرنیں تارکول کی سڑک پر تھرتھراتی ہوئی اور فلک بوس عمارتوں کے سروں کو چھوتی ہوئی فضا کی وسعت میں تحلیل ہو رہی تھیں۔ شہر کے دھوئیں حلقۂ افق میں پھیل کر شام کے دھندلکے میں پیوست ہو رہے تھے۔ بجلی کی بتیوں کے بیضاوی قمقمے روشنی کی تیز لہروں میں جگمگانے لگے تھے۔

کالج کے طلبا اور طالبات بن سنور کر اپنی انوکھی اور نرالی سج دھج سے شہر کے حسن میں اضافہ کی کوششیں کر رہے تھے۔ کسی کی بکھری ہوئی سیاہ لٹیں ٹرام سے جھانک جھانک کر مطمئن دلوں کو اپنے جادو میں لپیٹ رہی تھیں۔ کسی کی نیم عریاں گوری باہیں۔ باریک ساڑھی سے جھانکتی ہوئی جوانی سے نوجوانوں کو ترغیب گناہ دے رہی تھیں۔ ہر طرف رعنائیاں اور رنگینیاں امارت کے ریشم اور چاندی کے پتوں میں لپٹی ہوئی درد سے کراہتے ہوئے فاقہ کش ہجوم کا منہ چڑا رہی تھیں

وہ سوچ میں کھویا ہوا چلا جا رہا تھا۔ شہر کے ہنگاموں سے بے خبر تو پھر یہ بی اے کی ڈگری کس کام کی ـــــ بے روزگاری اور بیکاری کا سلسلہ تو آج دو برس بیت گئے ختم ہوتا ہی نظر نہیں آتا آخر یہ زندگی ـــــ بہتر تو یہی تھا۔ کہ وقتی طور پر کوئی مزدور کا کام ہی کر لیا جائے۔ اگر یہ بھی نہیں ملا۔ تو قلی ہی کا پیشہ اختیار کر لیا جائے۔ اس شہر میں میرا روشناس بھی تو کوئی نہیں ـــــ اچانک ہیلی تیبض سے ڈھکا ہوا مونڈھا ایک عریاں باہوں والی اینگلو انڈین چھوکری کے شانے سے چھو گیا۔

"یو۔ لوفر۔ راسکل۔ بلاڈی" کی لوچدار آواز نے اس کا سلسلۂ تخیل چند لمحوں کے لئے ڈھیلا کر دیا۔ خاموشی سے اس نے میم صاحب کو دیکھا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے اپنے کالج کی ساتھی مس فرنچ کی تصویر گھومنے لگی۔ جس نے کبھی بھی اس سے ایسے درشت لہجہ میں بات نہ کی تھی۔ بلکہ اسکی قدر و منزلت کیا کرتی تھی۔ شائد اس لئے کہ وہ ہر وقت سوٹ میں کالج آیا کرتا تھا۔ اور یکایک اس کے تخیل کے پردے پر مرحوم باپ کا چہرا تھرتھرانے لگا۔ اس کے کانوں میں کچھ آواز آنے لگی۔ "خورشید! میرے لال۔ میرے جگر کے ٹکڑے۔ دیکھو۔ کبھی تم سے کوئی ایسا کام نہ ہو۔ جس سے دنیا تم پر اور تمہارے خاندان پر انگشت نمائی کرے۔ تم نے بی اے کی ڈگری اس لئے حاصل نہیں کی کہ تمہارے باعث تمہارے آباؤ اجداد کی ناک کٹے۔ دنیا والوں کی نگاہ میں قابل نفرت بن کر جیئو۔ میرے لال۔ میری عمر کا پیمانہ لبریز ہو چکا۔ اب اسے کتنا ہی سنبھالا جائے یہ چھلک کر ہی رہے گا۔ میری زندگی کی کشتی ساحل سے لگ چکی ہے۔ اب اسے گھاٹ واپس لے جانے کی ناکام کوشش کا فائدہ۔ بیٹا۔ بدنامی ایک دن میں اور عزت کی زندگی ایک زمانہ کے اچھے سلوک۔ اخلاق۔ عادات اور جلاتی کے بتاؤ کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ میں نے

تمہارے تحمل جوانی کو پہنچا ہے۔ دکھ اور مصیبت جھیل کر تمہیں اچھی تعلیم و تربیت دی ہے۔ پنی بچی کھچی پونجی بھی تمہیں پر خرچ کر دی ہے۔ میری آرزو تھی خورشید — کہ تمہیں کسی اعلیٰ عہدہ پر ممتاز دیکھوں۔ اب میں جا رہا ہوں۔ انوری کا خیال رکھنا۔ دیکھو یہ تمہاری مرحوم ماں کی یادگار ہے۔ انوری ابھی بچہ ہے۔ ضد کرے گی۔ لیکن اسے سمجھا بجھا کر منا لینا۔ ورنہ قبر کی تاریکی میں میری روح نفی کے لئے اضطراب اور بے چینی میں کٹے گی —"

"بڑے آئے یہ افسانہ نگار۔ جھوٹ موٹ کی ہمدردی۔ جیسے سارے جہان کا درد بس انہی کے جگر میں تو ہے۔ ہو گا کوئی لفنگا۔"
اس نے پلٹ کر پیچھے آنیوالے اسٹوڈنٹ نما نوجوان کو دیکھا۔ ان میں ایک اپنے ساتھی سے اظہار خیال کر رہے تھے۔

اس نے ایڈن گارڈن کی طرف دیکھا۔ کچھ مست شباب دوشیزائیں نیم عریاں لباس میں ملبوس۔ قہر بداماں۔ جنوں خیز۔ سیر گلگشت میں اٹھلاتی پھر رہی تھیں۔ شہر کے وارفتہ مزاج مرد کتوں کی طرح ان کے پیچھے ٹہل رہے تھے۔ چند شوخ و شنگ تیتریاں دام گیسو میں گرفتار شکاروں سے اٹکھیلیاں کر رہی تھیں۔ بعض پھولوں کے جھرمٹ میں روشنی سے بچکر عاشقوں کے لبوں سے کیف و لذت حاصل کر رہی تھیں۔ بعض صنوبر اور بام کی اوٹ میں محبت بھرے دھڑکتے دل کے ساتھ عاشقوں کے خط پڑھ رہی تھیں۔ پوڈر اور لیونڈر کی مست ہلکی ہلکی مہک فضا میں بھینی بھینی خوشبو پھیلا رہی تھی۔ پارک کی فضا ان امیر گھرانوں کی ہوس پرست دوشیزاؤں اور غریب حریص لڑکیوں کو گود میں لئے مسکرا رہی تھی۔

کچھ سوچ کر وہ پارک کی جانب مڑا۔ گیٹ پر اس کی ٹکر ایک سائیکل سوار سے ہوئی۔ وہ گرتے گرتے بچا۔ صاحب نے اتر کر "آوارہ" "لفنگا" اور "کمینہ" کہتے ہوئے اس کے گال پر ایک زبردست تھپڑ رسید کیا۔ دو موٹے موٹے قطرے اس کے گال پر ڈھلک آئے۔ اور قمیض میں جذب ہو گئے۔

پارک میں ایک خالی نشست پر بیٹھ کر اپنی وحشی آنکھیں جن میں یاس اور حرماں نصیبی کی دھندلی لکیریں پھیلی ہوئی تھیں۔ ادھر ادھر گھمانے لگا۔ اس کی نگاہیں چہار سُو آوارہ بھٹکتی ہوئی ایک کمسن بچی کے چہرے پر جم گئیں۔ اس لڑکی کے چہرے کی تراش اور معصومیت انوری سے کچھ اس طرح ملتی جلتی تھی۔ جیسے وہ بھائی سے ملنے آغوش لحد سے لوٹ آئی ہو۔ خیالات نے کروٹ لی۔ اس کی نظروں کے سامنے بخار میں جھلستی اور بھوک سے بلکتی ہوئی انوری کھاٹ پر پڑی کراہ رہی تھی۔
"بھیا۔ پانی۔ حلق سوکھ رہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے کانٹے چبھ رہے ہوں — تھوڑا پانی دو بھیا۔ بہت پیاس لگی ہے۔"

منظر بدلا۔ قبر سے سر نکالے کفن پوش انوری اس کی جانب انگلی سے اشارہ کرتی ہوئی کہہ رہی تھی۔
"بھیا۔ بہت بھوک لگی ہے۔ کہیں سے کچھ لا دو۔ بازار جا بھیا۔ اچھے بھیا۔ کسی سے مانگ کر ہی کچھ لے آ۔ جا بھیا۔ تو نے بھی تو دو دن سے پانی کے سوا کچھ کھایا نہیں۔ لے آ بھیا۔ مانگ لا۔ جا تجھے میرے سر کی قسم۔"

اس کا سارا جسم کانپ اٹھا۔ جیسے وہ کوئی بھیانک خواب دیکھ رہا ہو۔ معاً اس کی نگاہیں اس لڑکی پر پڑیں۔ جو اپنی بہن سے اس کی طرف اشارہ کر کے کہہ رہی تھی۔
"اُونہہ۔ کیا بچپنا کرتی ہو سائرہ۔ یوں کسی کو بغیر جانے بوجھے کس طرح رکھا جا سکتا ہے۔ کیا اعتبار اس کا۔ کوئی چور۔ اُچکا ہو گا۔ جس کو دیکھا بس یہ کہنا شروع کر دیا۔ کہ اسے رکھ لو۔ آپا۔ یہ تو مجھے اسکول اچھی طرح پہونچا سکتا ہے۔ چل جٹھ اب کوٹھی چلیں۔"

اسے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہ تھا۔ وہ حسرت سے ان دونوں کی طرف دیکھتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ نگاہوں سے اوجھل ہو گئیں۔

اگر پارک کا محافظ اسے وہاں سے نہ اٹھاتا۔ تو شائد وہ رات بھر وہیں گھاس پر بیٹھا ہوا ساری رات ماضی کی یاد اور مستقبل کی سوچ میں گذار دیتا۔ سامنے گرجا گھر کا گھنٹہ گیارہ کی چوٹ مار رہا تھا۔

وہ آہستہ آہستہ اپنے کمرے کی جانب چلا۔ لیکن کسی ناگہانی خیال نے اس کا راستہ بدل دیا۔ شائد اس نے یہ سوچا تھا۔ کہ مالک مکان نے کمرے میں تالا بند کر دیا ہے۔ وہاں جا کر ہی وہ کیا کرے گا۔

صبح سے اس وقت تک کچھ نہ کھایا تھا۔ جیب میں ہاتھ ڈالکر اس نے کچھ ٹٹولا۔ صرف تین آنے۔ کل کے خیال نے بھوک کا احساس سینہ میں گھونٹ دیا۔ اس نے سوچا۔ کل کیا کیا جائے گا۔ کوئی امید بھی تو نہیں۔ لیکن رات کہاں اور کس طرح گذاری جائے۔ اگر پولیس والوں نے شک کیا تو —

وہ اپنے تخیل کی بھول بھلیوں میں الجھا ہوا چلتا رہا۔ چلتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ وہاں پہنچ گیا۔ جہاں شاہدان بازاری حسن و شباب کا بیوپار کیا کرتی ہیں۔ جن کی زندگی روپ اور جوبن کے سہارے پاپ اور گناہ کے سایہ میں بسر ہوتی ہے۔

اس کی آنکھیں ان مجسمہ جراثیم اور بیماری پر جو چھجوں پر بنی سنوری بیٹھی رہتی ہیں سرعت سے دوڑ رہی تھیں۔ ایک نے اسے انگلی سے

اشارہ کیا۔ لیکن دوسری نے جو پاس بیٹھی تھی۔ گردن کو لوچ دیتے ہوئے کالے بالوں کو ڈھلے ہوئے سینہ پر لہراتے ہوئے کہا۔

" صورت سے تو کوئی لفنگا معلوم ہوتا ہے بہن۔ اس کے پاس پیسے تھوڑے ہی رکھے ہیں جو تو اسے بلاتی ہے۔ دیکھتی نہیں کپڑے تک تو درست نہیں "۔

شرم سے پسینہ کی ننھی ننھی بوندیں اس کی پیشانی پر کانپنے لگیں۔ تیز قدموں سے سر جھکائے وہ آگے بڑھتا گیا۔ چند بار اس نے سوچا کہ وہ فٹ پاتھ پر ہی لیٹ جائے۔ لیکن پولیس کے خوف نے اسے اس اقدام سے باز رکھا۔

وہ چلتا رہا۔ چلتا رہا۔ اور سوچتا رہا۔ سوچتا رہا اور چلتا رہا۔ گھڑیال نے ایک بجایا۔ دور سے ایک سپاہی نے اسے ہاتھ کے اشارہ سے روکا۔

" کہاں سے آ رہا ہے؟ — سپاہی نے جیب سے ایک چھوٹی سی کاپی اور پنسل نکالتے ہوئے کہا۔

" — اس نے کوئی جواب نہ دیا "

" سیدھے منہ بات کرنے کا عادی نہیں۔ پھر ہنٹر سے بات کروں؟"

" — وہ چپ تھا۔"

" گونگا ہے سنتا نہیں۔ کہاں سے اتنی رات گئے آ رہا ہے۔ بولیگا کہ نہیں حرامزادہ کہیں کا۔ چپ کیوں ہے"۔ سپاہی نے اپنی بائیں طرف کی مونچھ کو اینٹھتے ہوئے کہا۔

" گالی کیوں بکتے ہیں آپ "۔ اس نے پوچھا۔

" لاٹ صاحب کا چچا ہے کیا؟" بول نام کیا ہے "۔

" ادریس "

" کیا کرتا ہے "

" سڑکوں پر چلتا رہتا ہوں "

" ٹھیک ٹھیک جواب دے "

" بیکاری "

" کہاں رہتا ہے "

" جہاں جگہ مل گئی "

تو سیدھی طرح ماننے والا نہیں۔ لاتوں کے بھوت باتوں سے بھی مانا کرتے ہیں کبھی — کہتے ہوئے سپاہی نے دو تین ہنٹر رسید کئے۔ دوسرا سپاہی جو کچھ دور کھڑا ہوا تھا۔ آ کر پوچھنے لگا۔

" ارے چھوڑ یار۔ بیمار تو معلوم ہوتا ہے۔ چھوڑ دے کوئی لفنگا ہوگا "

اس سپاہی نے اس سپاہی کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے کہا۔

" چل ذرا کچھ پیا جائے "

کتنے پیسے ہیں تیرے پاس "— اس سپاہی نے پوچھا

" تین آنے "

" دیکھ جھوٹ مت بول "

" آپ میری جیب دیکھ سکتے ہیں "

" اچھا لاؤ۔ کہاں ہیں وہ تین آنے؟"

اس نے جیب سے نکال کر کل پیسے سپاہی کی ہتھیلی پر رکھ دیئے دونوں نے ایک دوسرے کو پُر معنی نظروں سے دیکھا۔ دوسرے نے کہا — " ایک آنہ واپس دیدے لفنگا ہے۔ چھوڑ دے "

وہ سوچتا چلا جا رہا تھا۔ غریب لفنگے ہیں۔ کمینے ہیں۔ آوارہ ہیں۔ ذلیل ہیں۔ جن کے کپڑے میلے اور پھٹے ہوتے ہیں۔ وہ دنیا میں نفرت ہی کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ ان کا کوئی ہمدم نہیں۔ اگر انہیں ستایا جائے اور ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئیں۔ تو کوئی پوچھنے والا بھی نہیں۔ کپڑوں کی پوجا کی جاتی ہے۔ انسان کی نہیں۔ اس کی قابلیت اور علم و ہنر کی نہیں۔ دولتمند چاہے کچھ بھی کریں۔ اگر وہ اچھے لباس پہن کریں تو وہی سوسائٹی اور سماج کے رکن اعلیٰ ہیں۔ دنیا انہیں کی ہے۔ غریبوں کا کوئی آسرا نہیں۔ کوئی سہارا نہیں۔

سپیدی صبح آہستہ آہستہ نمودار ہوتی جا رہی تھی۔ فضا قبر کے میدان کی طرح خاموش نیند میں لپٹی ہوئی تھی۔ بھور کا دھندلکا آہستہ آہستہ روشنی کی لہروں میں نہا رہا تھا۔

وہ خاموش تارکول کی سڑک پر چلا جا رہا تھا۔ اسے ہر طرف سے " لفنگا " کی صدائیں آ رہی تھیں۔ جیسے کہ اس کے کان بج رہے ہوں۔

ریویو

نسیم اینڈ کمپنی اکبری دروازہ لاہور نے جو کتابت کی سیاہی (نمبر ۴۴۴۴ مارکہ) جدید طریقے سے لیکوئیڈ قسم کی تیار کی ہے۔ اس کی تعریف سے قلم عاجز ہے۔ یہ رنگت میں بہترین اور روانگی میں بے نظیر ہے۔ اسے حل کرنے یا گھوٹنے کی ضرورت نہیں۔ قیمت میں تمام سیاہیوں سے ارزاں اور اوصاف میں بدرجہا بہترین جس نے ایک دفعہ استعمال کی۔ وہ ہمیشہ کے لئے اس کا مداح بن گیا۔ اور تمام سابقہ سیاہیوں کو بھول گیا۔ اسے نہ گرم کرنے اور نہ گھوٹنے کی ضرورت ہے ہمارے کہنہ مشق خوشنویسوں نے اس کی بے حد تعریف کی ہے۔ اور یہ ہر جگہ مقبول عام ہو رہی ہے ہندوستان کے ہر مشہور شہر میں اس کے بہترین اوصاف کی وجہ سے دن بدن مانگ بڑھ رہی ہے ہم ہر پریس اور خوشنویس صاحبان سے پرزور سفارش کرتے ہیں کہ یہ جدید طریقے سے تیار کی ہوئی سیاہی استعمال کریں۔

ظفر واسطی

فیصلہ

مجھے آتا ہے تیری آرزوؤں کا خیال اکثر
مجھے ہوتا ہے تیری بے بسی پر بھی ملال اکثر
میں تجھ کو شاد کر سکتی نہیں یہ غم بھی ہوتا ہے
تری مجبوریوں پر بھی مرا دل خون روتا ہے
سمجھتا ہوگا تو دل میں کہ میں مغرور ہوں پیارے
نہیں، تیری طرح میں بھی بہت مجبور ہوں پیارے
تیرا برباد دل اے کاش میں آباد کر سکتی
ترے غم دُور کر سکتی تجھے دلشاد کر سکتی
اگر تو مطمئن ہو سکتا ہے اظہارِ اُلفت سے
اگر دل تیرا خوش ہو سکتا ہے اقرارِ اُلفت سے
تو میں اقرار کرتی ہوں مجھے تجھ سے محبت ہے
تری فرقت کا غم میرے لئے وجہِ اذیت ہے
میں تیرے جذبۂ اُلفت کی دل سے قدر کرتی ہوں
میں تیرے صدمۂ فرقت میں نہ جیتی ہوں نہ مرتی ہوں
مگر یہ تو بتا تو یُوں رہے گا مطمئن کب تک
گذارے گا خیالوں ہی میں خوش ہو ہو کے دن کب تک
اگر تو چاہتا ہے کامرانی سے ہم آغوشی
تو پھر کیا معنی رکھتی ہے تری یہ خود فراموشی

عمل ہی اک کلیدِ کامیابی ہے زمانے میں!
عمل ہی وجہِ نُصرت ہے خدا کے کارخانے میں!
جو پختہ عزم کر لے۔ کر نہیں سکتا ہے انساں کیا
کہ پختہ عزم کے آگے سمندر کیا۔ بیاباں کیا
اگر کچھ بن نہیں سکتا تو میری یاد سے حاصل؟
میں سُن سکتی ہوں لیکن نالہ و فریاد سے حاصل؟
میں واقف ہوں کہ تیرے دل کو مجھ سے خاص اُلفت ہے
میں واقف ہوں کہ تیرا دل نہیں کانِ محبت ہے
مگر خالی محبت شاد رکھ سکتی نہیں ہم کو
غم و افکار سے آزاد رکھ سکتی نہیں ہم کو
فقط اُلفت ہمارا پیٹ بھر سکتی نہیں پیارے
ہماری بے بسی کو دُور کر سکتی نہیں پیارے
ہمیں جینا ہے اس دنیا میں اور عزت سے جینا ہے
ہمیں جینا ہے اور آرام سے راحت سے جینا ہے
اور ایسی زندگی کو مال کی زر کی ضرورت ہے
نہ صرف اک زر کی اس کیساتھ گھر وسکی ضرورت ہے
اگر تو اتنا مال و زر مہیا کر نہیں سکتا
تو میرا فیصلہ سُن مجھ کو اپنا کر نہیں سکتا

تبصرہ

شیر میسور - برطانوی عہد حکومت کی ہندوستانی تاریخیں ایک خاص نقطہ نگاہ کو پیش نظر رکھکر لکھوائی گئی تھیں - جو ملک کی بدقسمتی سے آج بھی ہمارے مدارس میں رائج ہیں - ان تاریخوں کی خصوصیت یہ ہے کہ ہندو مسلمان حکمرانوں کو مذہبی متعصب ان کی باہمی چپقلشوں کو مذہبی حروب اور اس سلسلے میں ان کی قساوت قلبی' درندگی اور بربریت کے افسانے بہت رنگ آمیزی سے تیار کر کے ان تاریخوں میں شامل کئے گئے ہیں - مرہٹہ سرداروں' شہنشاہ اورنگ زیب اور سلطان ٹیپو کو انسانیت کی تمام صفات سے عاری دکھایا گیا ہے - اس ملعون دماغی سازش کا متوقع مقصد اس نتیجے کی صورت میں رونما ہو رہا ہے - کہ مدت مدید سے ہندوستانی اقوام میں خلفشار پیدا ہے ملک کا فساد پسند عنصر مذہب اور جاتی کے نام پر تاریخی شہادتوں کے حوالے پیش کر کر کے اقوام ہند کے باہمی تصادم اور خونریزی کا سبب بن رہا ہے - ایک بار سوامی شردھانند آنجہانی نے دچھووالی کے سالانہ آریہ سماجی جلسے میں علی الاعلان یہ دعوے کیا تھا کہ "ہم مسلمانوں سے کسی مقام پر کسی صورت میں اتحاد نہیں کر سکتے - کیونکہ ان کی اور ہماری تہذیب معاشرت تاریخی روایات ایک دوسرے سے مختلف اور متضاد ہیں"

سوامی صاحب کے یہ خیالات ہندوستان کی ایسی ہی تاریخوں سے متاثر ہوئے تھے' رائے بہادر پنڈت شیو نرائن شمیم ایڈووکیٹ بڑے مرنجان مرنج قسم کے بزرگ تھے لیکن ایک دفعہ سلطان ٹیپو سے متعلق ایک رسالے کے مندرجہ مضمون پر تنقید کرتے ہوئے انہوں نے راقم الحروف سے بیان فرمایا کہ "کس قدر ظلم ہے کہ اس شخص کو وطن پرور اور محب وطن ثابت کیا جا رہا ہے جس نے اپنی رعایا کے ایک لاکھ مظلوم ہندوؤں کو اس لئے تہ تیغ کر دیا تھا کہ وہ اسلام کے حلقہ بگوش ہونا کیوں نہیں منظور کرتے" - انہوں نے یہ کہتے ہوئے ایک انگریزی تاریخ نکال کر پڑھی - اس تاریخ کا مصنف ایک برطانوی مصنف تھا - میں نے عرض کیا کہ "ایسی ہی جعلی تاریخیں سلطان ٹیپو کی بے جرمی کا ثبوت ہیں"

تاریخی تحقیقات نے اس نفس الامر کو فتنہ کار پرچارکوں اور پروپیگنڈسٹوں کے رطب و یابس تصنیفی انباروں کی تہ سے نکال لیا ہے - کہ سلطان ٹیپو انتہا درجے کا محب وطن - جان نثار وطن اور مذہبی اعتبار سے بے حد روادار اور آزادی و حریت کی شمع کا حیات سپار پروانہ تھا -

"شیر میسور" اسی تاریخی تحقیقات کی ایک کڑی ہے - اس کے جواں سال مصنف مسٹر قیصر مصطفےٰ بی اے نے اپنے دلربا انداز بیان میں جس تحقیق و تفحص سے یہ گراں مایہ کتاب ملک ۴۴

فلمیات

سلور فلمس کی "جھنکار"

"سلور فلمس کا وجود ہندوستان کے مانے ہوئے آرٹسٹ مسٹر اے ایم لمار کی کاوشوں کا زندہ ثبوت ہے اور "جھنکار" ہندوستانی صنعت فلمسازی کے جوان اور صاحب صلاحیت دماغوں کی اپج کا عملی ثبوت" - "جھنکار" فلمی دنیا کی ایک ایسی ناقابل فراموش تصویر ثابت ہو گی جس پر فلم بین طبقہ عرصہ ہائے دراز تک فخر و ناز کرتا رہے گا -

"جھنکار" ایک مکمل درس حیات ہے' ایک ایسی تصویر ہے - جو دن بھر کی کوفت اور الجھنوں کو رفع کرنے میں یقیناً آپ کی انیس ثابت ہو گی چندر موہن کی فطری اداکاری سب سے پہلے آپ اسی فلم میں دیکھیں گے - پرمیلا کی شوخ اور حسین اداکاری' کمار کی ناقابل فراموش جذباتی ایکٹنگ - آزوری کا مسحور کن رقص - گوپ کی ہنسانے والی حرکتیں - سب یکجائی طور پر آپ کو "جھنکار" میں ملینگی - مسٹر ایس خلیل "جھنکار" کو نہایت ہی سلیقہ مندی سے فلما رہے ہیں - صنعت فلمسازی کے پرانے تجربہ کار مسٹر مراد احمد پروڈکشن کے اور مسٹر عادل رشید پبلسٹی کی ذمہ داریوں کے واحد مالک ہیں -

---

۴۴ میں پیش کی ہے - اس کے مطالعہ کرنے کے بعد مصنف موصوف کے لئے دل سے بے اختیار دعا نکلتی ہے "شیر میسور" سلطان ٹیپو علیہ الرحمۃ کی پر انوار سیرت کا ایک مجلی آئینہ ہے جس میں ٹیپو کے چہرہ حیات کے تمام نقوش درخشاں نظر آتے ہیں - ملک کے مشہور مخلص و ایثار رشیدہ احرار رہنما مرزا مظہر علی اظہر کے خلف الرشید سے اہل نظر کو اسی قابل قدر تصنیفی کارنامے کی توقع تھی - در اصل مسٹر قیصر مصطفےٰ نے یہ تصنیف شائع کر کے ملک کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی ایک صلائے عام کی صورت میں رہنمائی کی ہے وہ چاہیں تو اپنے عہد شباب کی مصروفیتوں کو ایسے ہی علمی کارناموں کی تعمیر میں صرف کر کے ملک و قوم کی بے بہا خدمت انجام دے سکتے ہیں - "شیر میسور" زمزم بک ایجنسی لاہور نے شائع کی ہے - اس میں مختلف واقعات کی متعدد تصاویر ہیں - تقطیع ۲۲×۱۷/۸ ضخامت ۲۰۰ صفحات - کاغذ بہتر ہے - کتاب مجلد ہے - کتاب پر کوئی قیمت درج نہیں - زمزم بک ایجنسی لاہور سے دریافت کی جا سکتی ہے -

"تاجور"

شاہکار

جلد (۱۴) فہرست مضامین بابت ماہ اگست ۱۹۴۲ء نمبر (۸)

حصۂ نظم

احسان اللہ خاں تاجور پرنٹر پبلشر نے عالمگیر الیکٹرک پریس پرانی تحصیل بازار میں چھپوا کر دفتر شاہکار واقع نمبر ۶ محمد روڈ متصل تکیہ اڑی سائیں لاہور سے شائع کیا۔

مختصرات

پنجاب یونیورسٹی

گزشتہ نمبر میں لکھا جا چکا ہے کہ یونیورسٹی کے بجٹ میں ایک لاکھ روپے سے زیادہ کا خسارہ ہے۔ مگر یونیورسٹی کے بعض ارباب نظم و نسق یونیورسٹی فنڈ کو دوست نوازی پر ضائع کر رہے ہیں۔ اورنٹیل کالج کے زائد المیعاد سالخوردہ پرنسپل کو مزید توسیع دلانے میں وہ ناکام رہے تو انہوں نے اس کی پرورش اور بازار قیمت بڑھانے کی تین صورتیں پیدا کرنی چاہیں:-

(۱) یونیورسٹی کے گزشتہ سال کے قانون کے علی الرغم اُسے ایک سال نو ماہ کی فرلو دے کر یونیورسٹی فنڈ سے ۲۸ ہزار روپے کی خطیر رقم حوالے کر دی جائے۔

(۲) خان بہادری کے خطاب کے لئے اُس کے نام کی سفارش کی جائے۔

(۳) چلتے چلتے یونیورسٹی کی جانب سے ایل۔ایل۔ڈی کی اعزازی ڈگری اسے چپکا دی جائے۔

پہلی دو ناروا خواہشوں میں یہ لوگ کامیاب ہو گئے ہیں۔

حبذا جسٹس دین محمدؐ

مگر اس آخری خواہش کو یونیورسٹی کی سنڈیکیٹ کے معزز ممبر آنریبل جسٹس دین محمدؐ نے مجالِ نمود دینے سے انکار کر دیا۔ ہزار آفریں ہے جسٹس دین محمدؐ پر کہ انہوں نے عدالت عالیہ کے بلند پر ترجج کی حیثیت میں نہایت تنبیہات آموز انداز میں، ڈگری کے مجوزین سے دریافت کیا کہ ان بزرگ کی کس علمی تحقیق کی بنا پر یہ گراں پایہ ڈگری انہیں دی جا رہی ہے۔ انہوں نے کون سی ایسی ریسرچ کی ہے جس کا صلہ یہ ڈگری تجویز کی گئی ہے۔ صورت حال تو یہ ہے کہ یونیورسٹی کی سینٹ اس بار سے سبکدوش ہونا چاہتی ہے اور تم اُلٹی اُسے ایل۔ایل۔ڈی کی ڈگری بخش رہے ہو۔ (بمعناہ)

چنانچہ جسٹس موصوف کی اس باطل سوز گرج سے یونیورسٹی کے دوست نوازوں کی یہ کھچڑی ادھ کچری ہی رہ گئی۔

بات بھی ٹھیک ہے کہ اس شخص نے ۳۰ سال کی طویل مدت میں اپنے مالیات کی تعمیر کے سوا کوئی علمی کام نہیں کیا۔ یونیورسٹی کی مسلط پارٹی نے اسے اپنا نقیب بنا کر اس کے ذریعہ مسلمانوں کی بے خبر قوم کو غلط اطمینان میں مبتلا کئے رکھا۔ اس کے سوا یونیورسٹی میں اس کا کوئی کارنامہ نظر نہیں آتا۔ اور یہ کارنامہ ایل۔ایل۔ڈی کی ڈگری سے دُور کا بھی واسطہ نہیں رکھتا۔

رہا خان بہادری کا خطاب اس کی غیر موزونیت تو ظاہر و باہر ہے، ایک شخص جو بجنبال خویش یونیورسٹی میں صوبے کی علمی نمائندگی کرتا رہا ہو۔ عربی زبان و ادب کا استاذ ہو اس کے لیے صرف شمس العلماء کا علمی خطاب موزوں ہو سکتا تھا۔ مگر مجوزین بھی یہ جانتے تھے کہ یہ سفارش حکومت کے اربابِ نظر کی نگاہ میں پذیرائی حاصل نہ کر سکے گی۔ اس لئے انہوں نے یہ خیال کر کے کہ

”گندم اگر بہم نرسد بھس غنیمت است“

ایک ایسے کھلے ڈُلے خطاب کی حکومت سے سفارش کر دی جو عموماً دیہات کے ذیلداروں، گورنمنٹ کے کنٹریکٹروں اور انجمنوں کے سیاسی خدمت کرنے والے سیکرٹریوں کو دیا جاتا ہے۔

رائے بہادر لالہ الیشر داس سابق رجسٹرار پنجاب یونیورسٹی کو چونکہ وائس چانسلر پارٹی نے ایک سال کی بھی توسیع دینے سے انکار کر دیا تھا۔ اس لئے انہیں فرلو بھی گئی اور ساتھ ہی یہ قانون بھی بنا دیا گیا کہ آئندہ کسی ایسے ملازم کو فرلو نہ دی جائے۔ جسے کوئی توسیع مل چکی ہو، مگر اس قانون کو ایک ہی سال کے بعد توڑ کر اورنٹیل کالج کے زائد المیعاد پرنسپل کو اکھٹی ایک سال نو ماہ کی فرلو دے دی گئی، حالانکہ یہ بزرگ کئی توسیعیں لے چکے تھے۔ انہیں فرلو کا ۲۸ ہزار روپیہ دے کر ارباب نظم و نسق نے یونیورسٹی فنڈ کا غلط استعمال نہیں کیا تو آخر اس حرکت کے لئے کونسا عنوان تجویز کیا جائے گا؟

اپنی پارٹی کے کم سواد ملازموں کو اس انداز میں نوازنا یہ کہاں کا انصاف ہے؟ سر بھٹناگر جنہوں نے اپنی بلند پایہ علمی ریسرچ سے یونیورسٹی کا نام علمی دنیا میں روشن کیا، اور جنہوں نے چار لاکھ بیس روپے کی گرانقدر رقم سے یونیورسٹی میں ریسرچ کا شعبہ قائم کیا۔ اُن کے ایثار و قربانی کی یونیورسٹی نے کوئی قدر نہ کی۔ اُن کے اعتراف کمال کی جانب سے ارباب انتظام آنکھیں بند کئے بیٹھے رہے۔ لیکن اُن کے علی الرغم حکومت ہند نے دُور بیٹھے ہوئے اُن کے ہنر کی طلعتوں کو دیکھا۔ اور اُن کی گراں بہا خدمات سے سارے ہندوستان کو بہرہ ور کرنے کے لئے پنجاب یونیورسٹی کی محدود وسعتوں سے انہیں چھین لیا۔ ہاتف شیراز نے شاید کسی ایسے ہی موقع پر یہ الہامی فقرہ ارشاد کیا تھا کہ

”دورانِ باخبر نزدیک و نزدیکانِ بے بصر دُور“

اورئینٹل کالج کے سالخوردہ پرنسپل کے ریٹائر ہونے سے پہلے ایک بار حافظ محمود شیرانی کی یکے بعد دیگرے توسیع کی تجویز کو یورپین وائس چانسلر نے اپنے کاسٹنگ ووٹ سے مسترد کر دیا تھا تو اس پر یونیورسٹی کی دوست پرور پارٹی نے اپنے اخباری ایجنٹوں کے ذریعہ شور وشغب برپا کرا دیا تھا کہ

"مادر گیتی محمود شیرانی کو جننے کے بعد بانجھ ہوگئی ہے اور یہ یونیورسٹی سے رخصت کر دئے گئے تو یونیورسٹی کی بقا کا سوال مسئلۂ لاینحل بن جائے گا۔" (معناہ)

مگر سب دیکھ رہے ہیں کہ محمود شیرانی رخصت ہوگئے۔ یونیورسٹی اپنے مرکز ثقل پر جوں کی توں قائم ہے اور مادر گیتی کبھی بانجھ نہیں ہوئی۔ اگرچہ یونیورسٹی کو محمود شیرانی کا جانشین اُن سے بھی بڑھ کر علم و ہنر سے بے نیاز ملا ہے۔ جو ہندوستانی ڈگریوں کا پشتارہ تو کمر پر ضرور لادے پھرتا ہے۔ لیکن ڈگریاں اُس کے نام کے ساتھ ہاتھ کی چھوٹی اُنگلی کا سا اضافہ کرنے کے سوا اور کسی کام نہ آسکیں۔ بہرحال اس پہلو میں یونیورسٹی معذور بھی ہے کہ حفظ روایات ہماری مشرقی تہذیب کا خاصہ لازمہ سمجھا جاتا ہے۔

ریٹائر ہونے والے پرنسپل کے رخصت کرنے کی تجویز پر بھی اس کے لگے بندھے اخبار چیوں نے بہت کچھ شور مچایا۔ مگر ناسازگار وقت نے اُن غوغائیوں کا منہ بند کر دیا اور اب خیر سے وہ اپنے حدود خدائی سے یہ کہتے ہوئے رخصت ہو رہے ہیں کہ

قدم اُٹھتے نہیں کوئے بتاں سے
بھری محفل سے اٹھوایا گیا ہوں

(باقی آئندہ)

(ادارہ)

یہاں تک لکھا جا چکا تھا کہ دفتر شاہکار کو یہ افسوسناک اطلاع موصول ہوئی کہ آنریبل جسٹس دین محمدؐ نے پنجاب یونیورسٹی کی سنڈیکیٹ (انتظامی کونسل) سے استعفا دے دیا ہے۔ جسٹس موصوف کی رائے میں موجودہ وائس چانسلر کے ساتھ کسی آزاد خیال اور غیر جانبدار ممبر کا تعاون و تعامل دشوار ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جسٹس دین محمد کا یہ استعفا پنجاب یونیورسٹی کی زندگی کا ایک بہت بڑا حادثہ ہے۔ یونیورسٹی کی رفتار حال سے دلچسپی رکھنے والے تمام طبقات جانتے ہیں کہ ان جیسا بے لاگ، آزاد اور ہر مذہب و ملت کے فریقانہ تعلقات سے بلند معاملہ فہم اور صائب الرائے ممبر یونیورسٹی کو نہ پہلے کبھی نصیب ہوا تھا۔ اور بظاہر آثار آئندہ بھی توقع نہیں کہ یونیورسٹی اُن کا نعم البدل تلاش کرنے میں کامیاب ہوگی۔

واقعہ یہ ہے کہ موجودہ وائس چانسلر حد درجہ مطلق العنان واقع ہوا ہے۔ وہ یونیورسٹی کے اہم سے اہم معاملات کا بطور خود فیصلہ کرتے ہوئے سنڈیکیٹ کے صائب الرائے ممبران کے قیمتی مشوروں کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ اسے یہ احساس نہیں کہ صوبے کے وہ منتخب افراد جن کی گراں مایہ قابلیت حقیقت شناس نگاہ اور آزادیٔ رائے ملک کے لئے سرمایہ ناز ہے۔ پنجاب یونیورسٹی کے ممبر کی حیثیت میں مرتولوں اور مصلحتوں کے زیر اثر رہ کر کام نہیں کر سکتے۔

(ادارہ)

تحسین ہُنر شناس

شاہکار کے گزشتہ نمبر میں مختصرات کے ذیل میں "سکندر بلدیو معاہدہ" پر جو شذرہ شائع ہوا تھا۔ اُس سے متاثر ہو کر ایک بہت بڑی ریاست کے بیدار ضمیر وزیر اعظم نے (جو برطانوی ہند میں بھی ایک ایسے بلند منصب پر سرفراز رہ چکے ہیں جس پر اُن سے پہلے غالباً کوئی ہندوستانی نہیں پہنچ سکا) ذیل کے قدر افزا الفاظ میں اظہار تحسین کیا ہے۔ افسوس ہے کہ ہم اس وقت اُن کا نام ظاہر کرنے کی حیثیت میں نہیں ہیں۔

"سکندر بلدیو سنگھ معاہدہ" کے عنوان کے تحت جو عالمانہ مختصر سا مقالہ آپ نے تحریر فرمایا ہے، اُس کے لئے داد دیتا ہوں۔ شاید ہی کوئی اس مضمون کو اس طرح پیش کرتا۔

نڈر کبھی آپ غضب کے نکلے۔ اخبار چیوں کو بہت کچھ کہہ گئے۔ مشکل یہ ہے کہ بدترین اخبار چی بھی کبھی تسلیم نہیں کرے گا کہ اس کا اصل مطلب روپیہ بٹورنا ہے۔ کیا اخبار چیوں کے خلاف کوئی انجمن قائم ہو کر بیباک جلسے نہیں ہو سکتے کہ

بچو! ان سانپوں سے

ضرورت بہت ہے ہمت کم ہے۔

شاہکار کے جولائی نمبر کے لئے دلی شکریہ "سائے" مصنفہ مسٹر شبیر محمد اختر صاحب بہت پسند آیا۔ ابن حزین صاحب کا یہ شعر خوب ہے

"نمازِ عشق لہو میں نہا کے پڑھتے ہیں ✤ محال ہے کہ یہ رسم وضو بدل جائے"

خوب، بہت خوب۔ وقت یہ ہے کہ نماز اور وضو تو خیر رخصت ہو ہی رہے ہیں، عشق بھی ایک بجھنے والی شمع بن رہا ہے۔

اِس عنوان کے تحت غلط الفاظ و محاورات اور اُن کے غلط استعمال کی تصحیح کی جاتی ہے۔

کبھی بھی

اِس لفظ میں مجھے شائبہ تنافر محسوس ہوتا ہے۔ جن حضرات کا ذوقِ سماعت میری طرح اِس تنافر کو محسوس کرتا ہو وہ کبھی کے لفظ کے ساتھ بھی کا لفظ ملا کر استعمال کرنا چھوڑ دیں۔ خود کبھی کا لفظ کبھی بھی کے معنی ادا کر دیتا ہے

تاجور

برما کے ہندی مہاجرین

گزشتہ ۳۰ جون کو وائی - ایم سی - اے ہال میں برما کے ہندوستانی پناہ گزینوں کی امداد و اعانت کے لئے ایک ادبی جلسہ ہوا - بزم اردو لاہور کے ممبران نے اس جلسے کا اہتمام کیا تھا - صدارت کے فرائض میں نے انجام دئے تھے - جلسے میں مولینا ظفر علیخاں صاحب قبلہ کی نظم برمی پناہ گزینوں پر بہت دلچسپی سے سنی گئی - خان بہادر حکیم احمد شجاع صاحب ڈپٹی سیکرٹری پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی، خواجہ دل محمد صاحب ایم - اے پرنسپل اسلامیہ کالج، مسٹر صدیق بشارت - ایوب شاہد نسیم، سید نذر زیدی، مسٹر نگار ایم - اے، مسٹر جگن ناتھ آزاد بی - اے، پنڈت دلتہ پرشاد فدا بی - اے اور دیگر مشہور شعراء نے اپنے کلام سے حاضرین کو مسرور فرمایا - حاجی لق لق کی مزاحیہ نظموں نے اہل جلسہ کو بہت محظوظ کیا -

ذیل کی نظمیں خاص برمی پناہ گزینوں پر سنائی گئی تھیں - باقی نظمیں دستیاب نہ ہو سکیں - (مدیر شاہکار)

نشانۂ کشمکشِ روزگار ہیں یہ لوگ
فگارِ معرکۂ کارزار ہیں یہ لوگ

انہیں وطن سے نکالا جفائے دوراں نے
تباہِ گردشِ لیل و نہار ہیں یہ لوگ

وطن میں رہنے کی راحت انہیں نصیب نہیں
کہ بے وطن ہیں غریب الدیار ہیں یہ لوگ

یہ بے پناہ تمہاری شرن میں آئے ہیں
پناہ دو کہ بہت دل فگار ہیں یہ لوگ

پناہ دو ستمِ روزگار سے ان کو
بلاکشِ ستمِ روزگار ہیں یہ لوگ

مٹاؤ ان کے دلوں سے خیالِ بے وطنی
غمِ وطن میں بہت اشکبار ہیں یہ لوگ

یہ غم نصیب ہیں تم ان کے غمگسار بنو!
خزاں رسیدہ ہیں ان کیلئے بہار بنو!

ہے شش جہات پہ ان کے غموں کی تاریکی
مثالِ ماہ تم اس شب میں جلوہ کار بنو!

موافق ان کے نہیں آہ گردشِ ایام
اٹھو اور ان کیلئے بختِ سازگار بنو!

فتادگانِ رہِ زندگی ہیں بیچارے
وطن کے نام پہ تم ان کے چارہ کار بنو!

خدا کے بعد تمہیں ان کا آسرا بن جاؤ
خدا تو بن نہیں سکتے ہو ناخدا بن جاؤ

تاجور

برمی پناہ گزین

یہ برمی مہاجر ہیں مہماں ہمارے
یہ ہیں آسمانِ وطن کے ستارے
یہ جاپانیوں کے ستائے ہوئے ہیں
ستم کش ہیں جاپانیوں کے بچارے
یہ ہیں سب ستم دیدۂ راہِ غربت
غریب الوطن خانہ برباد سارے
بچالو تباہی سے اِن کو بچالو
تباہی کے یہ آ لگے ہیں کنارے
مہذب لٹیروں نے لوٹا ہے ان کو
یہ جاپانیوں کے ہیں نخچیر سارے
یہ ہر سُو پناہِ وطن ڈھونڈتے ہیں
غریبی کے زخمی مصیبت کے مارے
یہ بھارت کے مہمان بھارت میں پہنچے
تمہارے بھروسے، خدا کے سہارے
بہر صورت امداد واجب ہے اِن کی
بہر حال یہ ہم وطن ہیں تمہارے
بشارت یہ دو ان کو صدیق جا کر
نہ گھبراؤ تم مہماں ہو ہمارے
غریب الوطن تم نہیں ہو عزیزو!
وطن درمیاں ہے ہمارے تمہارے

صدیق بشارت انسپکٹر جنرل آف پرزنز پنجاب لاہور

برما کے مہاجرین

گلچیں کے ستائے ہوئے صیاد کے مارے
آئے ہیں یہ برباد چمن پاس تمہارے
تھے اپنی جگا جوت میں سورج سے بھی بڑھکر
یہ دیس کے آکاش کے ڈوبے ہوئے تارے
کیا تم سے کہیں رام کہانی یہ سفر کی؟
غربت کے ستائے ہوئے افلاس کے مارے
تھا زادِ سفر پاس نہ کچھ راہِ سفر سہل
پہنچے ہیں یہاں تک یہ محبت کے سہارے
فاقوں سے نڈھال اُس پہ غمِ دُوریِ منزل
بیٹھے ہیں سرِ راہِ سفر پاؤں پسارے
حیران ہیں حیرت کے دوراہے پہ کھڑے ہیں
بپتا یہ کہیں کس سے، کہاں جائیں بچارے؟
گھر بار لُٹا کر بھی ملا دیس نکالا ؟؟
قسمت، انہیں لے آئی تباہی کے کنارے
گر تم بھی نہ پوچھو گے تو پُوچھے گا انہیں کون
جیسے بھی ہیں، پھر بھی ہیں بہر حال تمہارے
تم بہرِ وطن اِن کو تباہی سے نکالو!
امداد طلب تم سے ہیں مہمان تمہارے
ایں راہ زنِ شرق بہ مشرق چہ روا داشت؟
از ملتِ جاپان خدا رے و خدا رے

ایوب شاہد نسیم نجیب آبادی

ظفر واسطی شاہ آبادی

ناک

رام پرشاد جی صبح سے ایک ٹانگ کے بل پھر رہے تھے۔ گو ان کے ایک چھوڑ دو دو بیٹے تھے۔ اور ملازموں کی بھی کمی نہ تھی۔ اس کے علاوہ رشتہ دار بھی بہت سے آئے ہوئے تھے جو نہایت خوشی سے ہر کام میں اُن کا ہاتھ بٹانے کے لئے تیار تھے لیکن رام پرشاد جی ہر کام اپنی خاص نگرانی میں ہوتا دیکھنا چاہتے تھے اور اس لئے صبح سے اُنہیں آرام کرنے یا کچھ دیر بیٹھ کر ستا لینے کی فرصت نہ ملی تھی۔ اور اس کا انہیں ذرا بھی خیال نہ تھا۔ کیونکہ یہ ان کی لاڈلی بیٹی سرلا کے بیاہ کا دن تھا۔ سرلا سے رام پرشاد جی کو بے انتہا محبت تھی، سرلا کو انہوں نے اپنے دونوں بیٹوں سے زیادہ ناز و نعمت سے پالا تھا اور پھر تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنے میں بھی کوئی کمی نہ اُٹھا رکھی تھی۔ یہ درست ہے کہ اس نے اسکول میں بھی تعلیم پائی اور کالج میں بھی لیکن مغربی بیہودگیوں سے رام پرشاد جی نے اسے نہایت سختی کے ساتھ الگ رکھا۔ اور اس کا نتیجہ ظاہر تھا۔ سرلا جوان ہو کر ایک نہایت عقلمند، خلیق، ملنسار، نیک طینت، ماں باپ کی مطیع اور بھائیوں کی فرمانبردار لڑکی بن گئی تھی۔ رام پرشاد جی نے اُس کے لئے بر کی تلاش میں بھی نہایت احتیاط سے کام لیا تھا۔ دسیوں لڑکوں پر نظر گئی، لیکن چھان بین اور غور و خوض کے بعد انہیں رد کر دیا گیا۔ آخر قریب کے ضلع کے ایک وکیل کا لڑکا انہیں پسند آ ہی گیا اور پسند آنے پر انہوں نے بہت زیادہ تزک و احتشام کے ساتھ اس کی شادی کی تیاریاں شروع کر دیں۔ لیکن جیسے جیسے شادی کا دن نزدیک آ رہا تھا سرلا سے جدا ہونے کا غم اُنہیں بے تاب کر رہا تھا۔ اور آخر وہ دن آ ہی پہنچا جس کا رام پرشاد جی سہمے ہوئے دل سے انتظار کر رہے تھے۔ اب ان پر صحیح معنوں میں اس بات کی حقیقت کھلی تھی کہ لڑکی دوسرے کی امانت ہوتی ہے۔ ماں باپ کا فرض صرف اتنا ہوتا ہے کہ اس کی نہایت احتیاط سے پرورش کریں اور جب وہ دوسرے کے گھر جانے کے قابل ہو جائے تو یہ امانت، یہ قابلِ قدر اور خوبصورت امانت دوسرے کے سپرد کر دی جائے۔

بارات کو نہایت پُر تکلف اور قسم قسم کے کھانے اور مٹھائی دی گئی۔ ان سب چیزوں سے فارغ ہو کر رام پرشاد جی ذرا دیر کو لیٹ گئے۔ کچھ تھک گئے تھے اور کچھ اس بات کے احساس نے کہ سرلا کل چلی جائے گی انہیں بے حال سا کر دیا تھا۔ پنڈتوں نے لگن دیکھ کر پھیروں کا وقت صبح تین بجے کا مقرر کیا تھا۔ رام پرشاد جی کو لیٹے ہوئے کوئی دو گھنٹے ہوئے تھے۔ کہ لڑکے والوں کا ایک آدمی آیا اور اس نے کہا کہ رام پرشاد جی کو نوشہ بلا رہا ہے۔۔۔ رام پرشاد جی کے بیٹے بولے کہ لالہ جی تو سو رہے ہیں چلئے ہم چلتے ہیں۔ لیکن آدمی نے جواب دیا۔ "مجھے تو نوشہ نے یہ کہا تھا کہ لالہ رام پرشاد ہی کو بلا کر لانا"

بیٹوں نے کہا "بھئی اُن کی تو آنکھ لگ گئی ہے اس میں کیا ہرج ہے اگر ہم میں سے کوئی جا کر پوچھ آئے کہ کیا بات ہے۔" لہٰذا بڑا بھائی اس آدمی کے ساتھ چلا گیا۔ دُولہا نے کہا مجھے جو کچھ کہنا ہے وہ لالہ جی ہی سے کہنا ہے، اس لئے آپ مہربانی کر کے انہیں ہی بھیج دیں۔ سرلا کے بھائی صاحب نے ہر چند کہا کہ آپ مجھے انہیں کی جگہ سمجھئے اور جو کچھ کہنا ہے بے تکلف کہہ دیجئے۔ لیکن نوشہ نہ مانا۔ آخر اس نے آ کر اپنے چھوٹے بھائی سے ساری بات بتا دی۔ اور دونوں بھائیوں نے مشورہ کر کے اپنے پتا کو جگا دیا۔ رام پرشاد جی بہت حیران ہوئے کہ نوشہ کی مرضی کے خلاف کیا بات ہوئی۔ جو اس نے مجھے اس وقت بلایا۔ خیر اُٹھے اور جا کر پوچھا "کیا بات ہے بیٹا۔ کیا تمہیں کوئی تکلیف پہنچی یا تمہاری مرضی کے خلاف کوئی کام ہوا؟" دُولہا نے کہا۔ "دیکھئے بات یہ ہے کہ مجھے ایک موٹر کار کی سخت ضرورت ہے۔ مجھے ایسے رشتے مل رہے تھے جن میں لڑکی والے جہیز میں کار دینے کا وعدہ کرتے تھے۔ لیکن چونکہ آپ بھی سیٹھ آدمی تھے۔ میں نے خیال کیا کہ آپ کے یہاں سے بھی کار مل ہی جائے گی۔ لیکن اب مجھے معلوم ہوا کہ آپ کار نہیں دے رہے ہیں۔ اس لئے مجھے آپ کو اس بے وقت تکلیف دینی پڑی۔ لہٰذا اگر آپ ایک فرسٹ کلاس موٹر کار اور پانچ ہزار روپیہ نقد دینے کا وعدہ کرتے ہیں تو پھیرے ہونگے ورنہ ہم لوگ اسی طرح واپس چلے جائیں گے۔"

دولہا کی بات رام پرشاد جی کو بہت ناگوار گزری۔ انہیں ایک دم غصہ آ گیا۔ ان کے خیال میں بھی یہ بات نہ آئی تھی کہ جس لڑکے کو وہ اپنی پیاری بیٹی سرلا کے لئے انتخاب کر رہے ہیں وہ اتنا کمینہ، اتنا گرا ہوا ہو سکتا ہے۔ تاہم وہ بوڑھے آدمی تھے اور نہایت دور اندیش اور نہایت عقلمند۔ اس لئے ضبط کر کے بولے:۔

"جو کچھ آپ نے کہا ہے میں اس کی قدر کرتا ہوں اور کوشش کرونگا کہ اس کا حرف بہ حرف پورا کر دیا جائے۔ لیکن یہ بھی تو سوچئے کہ اس وقت

جو ہم اور چیزیں دے رہے ہیں وہ کیا کم ہیں - اس کے علاوہ لڑکی والوں کے سر سے تو کبھی بوجھ اترتا ہی نہیں - ابھی اور موقعے آئیں گے تو کسی مناسب موقعے پر ہم آپ کو کار بھی لے دیں گے -"

لیکن نوشہ نے تو پہلے ہی اپنے دل میں ان سب باتوں کا فیصلہ کر رکھا تھا - بولا -

"آئندہ آپ کچھ دیں یا نہ دیں مجھے اس کی پرواہ نہیں - لیکن آج پھیرے اس وقت ہوں گے جب کم سے کم دس ہزار روپے کا چیک میرے پاس پہنچ جائے گا - کیونکہ پانچ ہزار سے کم میں اچھی کار نہیں آسکتی -"

رام پرشاد جی کو اس کا یہ جواب اور بھی زیادہ ناگوار گزرا - کوئی اور موقع ہوتا تو وہ شاید اس کے دو چار چپت رسید کرنے سے بھی نہ چوکتے - لیکن موقع ہی نازک تھا - ان کی عزت خطرے میں تھی اور اپنی عزت خطرے میں سے نکالنے کے لئے وہ ہر قربانی دینے کو آمادہ تھے - لہذا انہوں نے ایک دفعہ اور اسے نرمی سے سمجھایا اور جب وہ اس پر بھی نہ مانا تو انہوں نے کہا " اچھا وکیل صاحب کہاں ہیں مجھے ان سے بھی تو بات کر لینے دو -"

لڑکا نہایت ہی ڈھیٹ تھا - کہنے لگا " لالہ جی پھیرے مجھے کرنے ہیں یا وکیل صاحب کو - آپ اُن سے بات کرتے ہیں تو شوق سے کر لیجئے - لیکن ہوگا وہی جو میں نے کہا ہے -"

رام پرشاد جی نے ایک مرتبہ اور ضبط سے کام لیا اور یہ کہہ کر واپس چلے آئے کہ اچھا میں جا کر اپنے لڑکوں سے مشورہ کر لوں -

نوشہ نے کہا " لیکن ایک گھنٹے میں مجھے کوئی حتمی جواب بھیج دیجئے گا "

جب یہ واپس پہنچے تو دونوں بیٹے منتظر ہی بیٹھے تھے - لالہ جی نے انہیں من و عن ساری بات کہہ سنائی - وہ دونوں بھی دولہا کی پیش کردہ شرط پر بہت زیادہ آزردہ ہوئے لیکن صرف آزردہ ہونے سے کام نہ چل سکتا تھا - وہاں تو عزت کا سوال درپیش تھا - انہیں رنج اس بات کا تھا کہ جب وہ خود بیس بائیس ہزار روپے کا ساز و سامان اور زیور وغیرہ دے رہے تھے - تو دولہا نے دس ہزار کی اور شرط پیش کیوں کی - جو شخص اپنی لڑکی کے جہیز میں بیس ہزار روپے خرچ کر سکتا ہے وہ دس ہزار روپے اور بھی دے سکتا ہے - لیکن سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اسے مجبور کیوں کیا جائے ، اسے دھمکی کیوں دی جائے - ایسی شرط کیوں پیش کی جائے جس کے تصور ہی سے اس کے دل میں غم و غصہ کی آگ بھڑک اٹھے - لالہ جی کی مرضی تھی کہ دولہا کا منہ جھلس دیا جائے - اس وقت جو وہ مانگتا ہے دے دیا جائے - لڑکے کہتے تھے کہ ہمیں اس میں تو اعتراض نہیں جو کچھ ہے آپ کا ہے - آپ اگر دس ہزار کی بجائے سرلا کو چالیس ہزار اور دیدیں تو بھی ہمیں بُرا معلوم نہ ہوگا - لیکن سوال یہ ہے کہ اس طرح ایک بُری رسم کی طرح پڑ جائے گی - ہر لڑکا پھیروں کے وقت ایسی کڑی شرطیں پیش کرنے لگیگا - آپ کے پاس تو روپیہ ہے آپ دے دیں گے - لیکن غریب لوگ کہاں سے دیں گے - یہ تو اس نے ایسی بُری بات کی ہے کہ اس کی ہمت افزائی ہرگز نہ کرنی چاہیئے -

رام پرشاد جی کو اپنے لڑکوں پر پُورا پُورا اعتماد تھا اور ان کے خلوصِ نیت پر بھی شبہ نہ تھا - لیکن پھر بھی وہ چاہتے تھے - کہ اس وقت معاملے کو طول نہ دینا چاہیئے - اگر بیاہ نہ ہوا تو یہ بھی تو ممکن ہے - اگر بیا تما نہ کرے کوئی ایسی ویسی بات ہو گئی تو سرلا اپنے دل میں کیا کہیگی کہ پتا جی نے دس ہزار روپے کی خاطر اُس کا سہاگ خاک میں ملا دیا - اور ان کی اپنی ناک بھی تو کٹتی ہے - برادری والے کیا کہیں گے؟ اور پھر دُنیا کیا کہے گی ؟ اس کے علاوہ از سرِ نو لڑکے کی تلاش کرنی ہوگی - آج کل اچھے لڑکے بہت مشکل سے ملتے ہیں - ہر تعلیم یافتہ لڑکے نے اپنے ہونے والے خسر سے کچھ نہ کچھ امیدیں وابستہ کر رکھی ہیں - ایسی امیدیں جنہیں وہ خود یا اس کے ماں باپ پورا کرنے کی مقدرت نہیں رکھتے - ان امیدوں کو وہ اپنی بیوی اور اس کے ماتا پتا کے اخراجات پر پورا کرنا چاہتا ہے - اور ان میں سے اکثر کی امیدیں ہوتی بھی ہیں نامناسب -

باپ کی نیت دیکھی تو چھوٹے لڑکے کے بھی جی میں یہی آیا کہ دس ہزار روپے میں اگر عزت اور ناک بچتی ہے تو بچا لینی چاہیئے - اس کے نزدیک غلطی اُن کی اپنی بھی تھی کہ انہوں نے غلط لڑکے کو انتخاب کیا - لیکن بڑا لڑکا بولا کہ اگر آپ اجازت دیں تو دو چار بزرگ رشتہ دار جو مہمان آئے ہوئے ہیں انہیں بھی بلا لیا جائے - شاید اُن کے مشورے سے اس مشکل کا کوئی بہت ہی مناسب حل سمجھ میں آجائے - سیٹھ صاحب اس پر راضی ہو گئے -

لہذا سب عمر رسیدہ رشتہ داروں کو بلا کر ان کے سامنے سارا واقعہ بیان کر دیا - ان میں سے بھی اکثر نے یہی کہا کہ آپ کی لڑکی ہے - آپ خواہ اُسے کچھ دیں ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا ، لیکن نوشہ کا یہ مطالبہ بالکل ناجائز ہے اور پھر اس پر یہ دھمکی کہ اگر مطالبہ منظور نہ کیا گیا تو وہ پھیروں سے انکار کر دیگا - اگر آپ نے اس وقت اس کی یہ شرط مان لی تو اس کا یہ مطلب ہوگا کہ آپ نے ایک بہت ہی بُری مثال قائم کر دی - آئندہ غریب لوگوں کو لڑکیوں کی شادی کرنے میں یہ مشکلیں بھی پیش آیا کریں گی - اور کسی کو خبر تک نہ ہوا کرے گی - کہ دولہا کس چیز کی فرمائش کر دے اور اس بات کا تصور ہی رونگٹے کھڑے کر دینے کو بہت ہے - خیال کیجئے کہ لڑکی کے ماں باپ جسقدر پھیروں کا وقت قریب آ رہا ہے بیچارے متفکر ہوتے جا رہے ہیں کہ خبر نہیں دولہا کس بات کا مطالبہ کر دے - اور وہ اس مطالبہ کو پورا بھی کر سکیں گے کہ نہیں ؟

دو ایک کی رائے تھی کہ جہیز میں سے دس ہزار کی چیزیں کم کر دی جائیں - اور اُن کی بجائے دس ہزار روپے کا چیک دے دیا جائے -

رام پرشاد جی نے پہلے تو گردن پھیر پھیر کر سب کو غور سے دیکھا۔ شاید اطمینان کر رہے تھے کہ باہر والیوں میں سے تو وہاں کوئی موجود نہیں پھر اُنہوں نے کہا۔ ان کی آواز، فکر، غم اور غصے سے بھاری ہو رہی تھی۔

"جو کچھ آپ لوگوں نے کہا ہے وہ سب سچ ہے۔ لیکن آپ اس سارے معاملے کو میری نظر سے دیکھئے۔ آپ میرے جذبات سمجھنے کی کوشش کیجئے۔ میں یہ مانتا ہوں کہ یہ سب کچھ بُرا ہے۔ دُولھا کی فرمائش اور فرمائش کرنے کا طریقہ سب کچھ بُرا ہے۔ میں شاید کبھی اس کی شکل بھی دیکھنے کا روادار نہ ہوں۔ لیکن وقت کی نزاکت کا احساس بھی تو کیجئے۔ کیا آپ لوگوں کے نزدیک میری عزت خطرے میں نہیں۔ کیا آپ لوگوں کے نزدیک اگر میں نے دولھا کا مطالبہ پورا کرنے سے انکار کر دیا میری ناک نہ کٹ جائیگی اور ان سب باتوں سے زیادہ کیا سرلا میری اس حرکت پر مجھے معاف کر دیگی۔ کیا اُسے اس بات کا رنج نہ ہوگا کہ اس کے پتا نے دس ہزار روپے کے لالچ میں اس کا سہاگ بسنے بستے اُجاڑ دیا۔"

وہ نہایت جوش کے ساتھ یہ باتیں کہہ رہے تھے کہ ان کا پوتا آیا اور بولا۔ "داداجی بُوا بلا رہی ہیں!"

نوشے کی شرط کے متعلق عورتوں میں بھی خبر پہنچ گئی تھی اور عورتوں سے سرلا کو بھی معلوم ہو چکا تھا۔ رام پرشاد جی جب سرلا کے کمرے میں داخل ہوئے تو اس کی سکھیاں ادب کے ساتھ باہر چلی گئیں۔ سرلا نے اپنے پتا کو اپنے پاس بٹھا لیا اور بولی:۔

"پتاجی مجھے سب کچھ معلوم ہو چکا ہے۔ میں آپ کی اور بھائیوں کی نیت اور عادت اچھی طرح جانتی ہوں۔ اس لئے مجھے خوف ہو چلا ہے کہ کہیں آپ اُن کی وہ شرط نہ مان لیں۔"

رام پرشاد جی نے نہایت پریم سے جواب دیا:۔

"لیکن بیٹی ان حالات میں یہی درست ہے کہ اس وقت اس نالائق کی بات مان ہی لی جائے۔" وہ خوش تھے کہ اُن کی تربیت بہت اچھی رہی اور لڑکی نے ناجائز شرم و حیا سے کام نہیں لیا۔ جس بات سے خود اس کی زندگی اور اس کی زندگی کی خوشیاں وابستہ تھیں۔ اُس میں اُس نے بہت اچھا کیا۔ کہ اپنی زبان کھولی۔

سرلا نے کہا۔ "پتاجی آپ کے سامنے اس وقت زبان کھولنا بے تہذیبی ہے لیکن میرے خیال میں تو آپ اُن لوگوں کو یہاں سے اسی وقت نکال دیجئے اور انہیں کوئی بھی سہولت بہم نہ پہنچائیے۔ وہ خود اپنے لئے گاڑیوں وغیرہ کا انتظام کریں۔ یا جس طرح بھی جا سکتے ہیں اسی وقت چلے جائیں۔ میں جانتی ہوں کہ آپ کے دل میں میری محبت غالب آ رہی ہے۔ لیکن یہ بھی تو دیکھئے کہ میں وہاں کبھی خوش نہ رہ سکوں گی۔ اس وقت اگر آپ نے اُن کی یہ شرط مان لی تو دو چار مہینے میں وہ مجھے پھر آپ کے یہاں چھوڑ جائیں گے اور کہینگے۔ اگر آپ پانچ ہزار روپے فلاں کام کے لئے دیتے ہیں تو میں اسے لے جاتا ہوں، نہیں تو آپ اپنے یہاں رکھئے اور یہ بات پھر اسی طرح جاری رہے گی۔ دو چار مہینوں کے وقفوں کے بعد وہ ایسا کرتے رہیں گے اور پھر یہ سلسلہ کبھی ختم نہ ہوگا۔"

سرلا کی باتیں سُن کر رام پرشاد جی کی آنکھیں سی کھل گئیں۔ جو کام رشتہ داروں کی نصیحتوں اور بیٹوں کی درخواستوں سے نہ ہو سکا تھا وہ سرلا کی باتوں نے ایک سیکنڈ میں کر دیا۔ اس کے علاوہ ہونے والے داماد کی باتیں سُن کر ان کے دل کو جو رنج پہنچا تھا وہ بھی سرلا کی باتوں سے یک لخت کافور ہو گیا اور اس کی جگہ ایک اطمینان اور خوشی نے لے لی۔ انہیں اس بات کے احساس سے اور زیادہ مسرت تھی کہ انہوں نے سرلا کی تعلیم پر جو روپیہ خرچ کیا تھا۔ وہ بیکار نہیں گیا۔ بلکہ تعلیم نے اس کی جبلّی خوبیوں کو اور زیادہ اُجاگر کر دیا تھا۔ خاص طور پر سرلا کی یہ بات تو اُن کے دل میں اُتر گئی تھی کہ دو چار مہینے میں وہ پھر مجھے آپ کے یہاں چھوڑ جائیں گے اور کہیں گے کہ فلاں کام کے لئے اگر آپ پانچ ہزار روپے دیتے ہیں تو لے جاتا ہوں۔ نہیں تو آپ اسے اپنے یہاں رکھئے۔ اور پھر یہ سلسلہ کبھی ختم نہ ہوگا۔

لہذا انہوں نے جا کر سب رشتہ داروں کو بتا دیا کہ مجھے آپ لوگوں کی رائے سے اتفاق ہے۔ اور ان سب میں یہی طے پایا کہ بارات کو ابھی ابھی شہر سے نکال دینا چاہیئے۔ اب انہوں نے نوجوانوں کو بھی بلا لیا جو دوسری طرف تاش وغیرہ کھیلنے میں مشغول تھے۔ ایک بوڑھے آدمی نے ان نوجوانوں کو نہایت جوشیلی مگر مختصر تقریر میں بتایا کہ کیا ہو گیا ہے اور اب کیا کرنا چاہیئے۔ لہذا سب کے سب لاٹھیاں لے لے کر چڑھ گئے اور دُولھا سے جا کر کہا کہ بارات لے کر ابھی شہر سے نکل جاؤ ورنہ ہم تمہاری ہڈی پسلی ایک کر دیں گے۔ دُولھا نے یہ دیکھا تو اس کے ہوش اُڑ گئے۔ لگا منتیں کرنے کہ مجھے معاف کر دیجئے۔ مجھ سے غلطی ہو گئی اور اس کے باپ نے بھی بہت خوشامد کی کہ یہ تو نالائق ہے جو ایسی بات زبان پر لایا۔ میں آپ کا خادم ہوں۔ مگر ان لوگوں کو اتنا جوش آ چکا تھا کہ اُنہوں نے ایک نہ سُنی اور اُنہیں اسی وقت نکال کر دم لیا۔

اس واقعے کو ایک مہینہ نہ گزرنے پایا تھا کہ سرلا کے لئے ایک اور نہایت اچھے اور اونچے خاندان سے پیغام آ گیا اور جس ناک کے کٹنے سے رام پرشاد جی ڈرتے تھے وہ اور بڑی اور اونچی ہو گئی۔

آئین جواں مرداں حق گوئی و بیباکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں رُوباہی (اقبال)

کلامِ شاد

خدائے عشق کے ہاں مصلحت ہے بھول نہیں
یہ بھول کر بھی نہ کہیئے۔ دعا قبول نہیں

تضاد، فطرتِ مختار ہے اصول نہیں
جنہیں نظر ہے انہیں نکبدہ فضول نہیں

شکائتیں ہیں کہ پاسِ دلِ ملول نہیں
کبھی گلہ تھا کہ للّٰہ خط کو طول نہیں"

نہیں کہ سعیٔ طلب، مائل حصول نہیں
یہ ٹھوکریں ہیں تو محنت ابھی وصول نہیں

تباہیوں سے گزرنا کٹھن تو ہے - لیکن
ثبوت ہیں - کہ تباہی کوئی فضول نہیں

اس انجمن میں ہوا خواہیٔ اصولِ وفا
جس انجمن میں ہم آہنگیٔ اصول نہیں

مآلِ قوتِ نشو ونما ہے دادِ طلب
کمالِ قوتِ نشو ونما ہے پھول نہیں

نسیمِ صبح - یہ طوفانِ رنگ کیا شے ہے
اگر لباسِ گلِ عطر زا پہ دھول نہیں

قفس پہ برق چمکتی ہے عرضِ آزادی
جو اب نہیں تو کبھی جاذبِ قبول نہیں

ہم اپنے تجربۂ یاد پر یہ کہتے ہیں
جہاں فریبِ محبت نہیں ہے بھول نہیں

لگا رکھی ہے وہ پیرِ مغاں نے حج کیلئے
ابھی جو قیمتِ مے شیخ سے وصول نہیں

عبائے عقل سے عاری ہیں سیکڑوں انساں
ہزارہا وہ گدھے ہیں کہ جن پہ جھول نہیں

علامتیں ہیں یہ احسانِ برق و بادکہاں
تڑپ رہی ہیں بلائیں، مگر نزول نہیں

طبیعتیں ہیں - نگوں ساری و روا داری
مجھے پسند نہیں ہے انہیں قبول نہیں

یہ احتیاطِ محبت یہ خوفِ رسوائی
غزل میں شاد صداقت انہیں قبول نہیں

شاد عارفی رامپوری

حاجی لق لق

لیڈر بن جاؤ

اگر آپ کو دنیا میں کوئی کام نہیں ملتا تو لیڈر بن جاؤ۔ تجارت کرنے کے لئے سرمایے کی ضرورت ہے۔ کھیتی باڑی کرنے کے لئے محنت کی ضرورت ہے۔ اور نوکری کی تو بات ہی چھوڑ دیجئے۔ پہلے تعلیم کی ضرورت ہے۔ پھر سفارش کی۔ سفارش کے بغیر چپراسی کی نوکری بھی نہیں ملتی۔ ہاں لیڈری سب سے آسان چیز ہے۔ نہ سرمائے کی ضرورت۔ نہ محنت کی۔ نہ تعلیم کی۔ نہ سفارش کی۔ اور مزے ولایت پاس سے بھی زیادہ۔ جدھر جاؤ۔ عزت۔ "زندہ باد" کے نعرے۔ جلسے۔ جلوس۔ مرغ۔ پلاؤ۔ غرض مزے ہی مزے ہیں۔ اب آپ پوچھیں گے کہ لیڈری کا نسخہ اور اس کی ترکیب استعمال کیا ہے۔ سو پہلے یہ سن لیجئے کہ میں کس طرح لیڈر بنا۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ مجھے منٹگمری جانے کا اتفاق ہوا۔ شہر منٹگمری سے دس بارہ میل کے فاصلے پر میرے ایک زمیندار دوست تھے۔ ان سے کچھ کام تھا۔ میں لاہور سے انٹر کلاس کے ڈبے میں بیٹھ کر منٹگمری پہنچا۔ جب گاڑی اسٹیشن پر ٹھہری تو میں نے دیکھا کہ پلیٹ فارم پر سینکڑوں آدمیوں کا ہجوم ہے اور بہت سے لوگوں کے ہاتھوں میں پھولوں کے ہار ہیں۔ گاڑی ٹھہری ہی تھی کہ یہ ہجوم بھاگتا ہوا انٹر کلاس کے ڈبے کی طرف آیا۔ جس میں ایک میں اور ایک سکھ مسافر بیٹھے تھے۔ ایک معزز آدمی نے جھٹ میرے ڈبے کا دروازہ کھولا اور مجھ سے مصافحہ کیا۔ میں باہر نکلا تو لوگوں نے میرے گلے میں پھولوں کے ہار ڈالنا اور مصافحہ کرنا شروع کر دیا۔ میں حیران تھا کہ ؎

یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے

بات یہ تھی کہ اس شہر میں اسی ٹرین سے یو۔ پی کے مولانا رفاقت علی لاہور سے آنے والے تھے۔ اور مسلمانوں کے ایک جلسے میں تقریر کرنے والے تھے۔ اتفاق یہ ہے۔ کہ نہ تو مولانا کبھی پہلے منٹگمری آئے تھے اور نہ منٹگمری کے کسی شخص نے مولانا کو پہلے کبھی دیکھا تھا۔ ڈبے میں ایک میں تھا اور ایک سکھ۔ میں بھی داڑھی رکھتا تھا اور خالصہ جی بھی۔ اگر خالصہ جی اکیلے ہوتے تو شاید انہی کو مولانا رفاقت علی سمجھ لیا جاتا۔ بشرطیکہ خالصہ جی کے کیس نظر نہ آتے۔ بہرحال مجھے مولانا صاحب سمجھ لیا گیا۔

میرے جی میں آئی کہ میں حقیقت حال بیان کر دوں۔ اور کہوں کہ میں مولانا رفاقت علی نہیں۔ لیکن پھر سوچا کہ اس میں میرا بگڑتا ہی کیا ہے ایک دن لیڈری کر کے بھی دیکھ لینا چاہیئے۔ دل میں سوچا۔ کہ تقریر کرنی پڑیگی۔ کیونکہ مولانا کا یہاں بلائے جانے کا یہی مقصد ہو سکتا ہے اور میں نے کبھی تقریر نہیں کی۔ تقریر کے تصور نے تو مجھے کپکپا دیا۔ لیکن میں نے حوصلہ نہ ہارا۔ اور خاموش رہا۔ دل نے کہا کہ پروا نہیں۔ گزارا چل جائے گا۔ ساتھ ہی مجھے ایک لیڈر کا کہنا یاد آ گیا۔ ایک دفعہ ریل میں ایک لیڈر سے ہم سفری کا اتفاق ہوا تھا۔ میں نے اُن سے پوچھا کہ تقریر کرنے کا گُر بتائیے۔ لیڈر صاحب نے جواب دیا کہ تقریر کرنے کے لئے کھڑے ہو جاؤ۔ اور یہ تصور کر لو۔ کہ جتنے آدمی تقریر سننے کے لئے جمع ہیں سب کے سب اُلّو اور گدھے ہیں۔ ان میں مجھ سے زیادہ لائق کوئی نہیں۔ اس تصور کے ساتھ جو جی میں آئے کہتے جاؤ۔

بہرحال میں نے فیصلہ کر لیا کہ اپنی شخصیت کو ظاہر نہیں کروں گا۔

لوگوں کی بھیڑ بھاڑ میں اسٹیشن کے باہر پہنچا۔ تو وہاں جلوس کا انتظام تھا۔ مجھے ایک شاندار جلوس کی شکل میں شہر تک لیجایا گیا۔ راستے بھر مجھ پر پھولوں کی بارش ہوتی رہی۔ اور "مولانا رفاقت علی زندہ باد" کے نعرے لگتے رہے۔ میں نے لیڈروں کے جلوس تو کئی دیکھے تھے۔ اس لئے وہی حرکتیں کرتا رہا۔ جو لیڈر لوگ اپنے جلوس کے دوران کیا کرتے ہیں۔ یعنی مسکرا کر اور ماتھے کے قریب ہاتھ لے جا کر کبھی دائیں طرف کے تماشائیوں کو سلام اور کبھی بائیں والوں کو کورنش۔

جلوس ایک رئیس کے مکان پر ختم ہوا۔ جہاں ہم ایک اعلیٰ درجے کے فرش۔ فروش اور فرنیچر سے سجے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے۔ اور تھوڑے عرصے کے بعد کھانے کا وقت ہو گیا۔ کھانے کے کمرے میں گئے تو دیکھا نوابانہ شان کے بے شمار کھانوں سے دسترخوان سجا ہوا ہے۔ کھانا کھایا۔ چائے پی۔ صاحب خانہ نے کہا کہ مولانا جلسے کا وقت ہو گیا ہے۔ تشریف لے چلیئے۔

مجھے تشویش تو یہ تھی کہ مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ تقریب کیا ہے۔ جلسہ کس بات کا ہے اور تقریر کس موضوع پر کرنی ہے۔ اگر میں نے یہ باتیں پوچھیں تو راز افشا ہو جائیگا۔ میں اسی سوچ میں تھا کہ صاحب خانہ کا بچہ کھیلتا ہوا اندر آیا۔ صاحب خانہ نے اس سے کہا۔ کہ ادھر آؤ بیٹا۔ مولانا کی خدمت میں السلام علیکم عرض کرو۔ بچے نے میرے پاس آ کر السلام علیکم کہا۔ اور میں نے وعلیکم السلام کہہ کر اس سے ہاتھ ملانے کے بہانے دو

اشتہار لے لیا جو اس کے ہاتھ میں تھا۔ اور کہا کہ تم اس کو پڑھ سکتے ہو؟ لڑکے نے اٹک اٹک کر پڑھنا شروع کیا۔ لکھا تھا۔

"۲۰ مارچ کو بعد نماز عصر مولانا رفاقت علی صاحب مسلمانوں کے ایک جلسۂ عام میں ایک اصلاحی تقریر فرمائیں گے"

اب مجھے اس اشتہار سے یہ تو پتہ چل گیا کہ اصلاحی تقریر کرنا ہے۔ لیکن اس کا مطلب؟ اور میں اس موضوع پر کیا کہہ سکوں گا؟ میں نے دل کو حوصلہ دیا کہ تمام حاضرین الو ہوں گے اور میں ان سب سے لائق ہوں۔ جلسہ گاہ میں پہنچے۔ پہلے مقامی حضرات کی تقریریں ہوتی رہیں۔ اس کے بعد میں تالیوں کی گونج اور "زندہ باد" کے نعروں میں تقریر کرنے کے لئے اٹھا اور یوں گویا ہوا:-

"میرے بھائیو۔ میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے یہاں آنے اور تقریر کرنے کی عزت بخشی۔ آپ کی ہمت قابل داد ہے کہ آپ نے مسلمانوں کی اصلاح کا عزم کر لیا ہے مسلمانوں کی حالت بلاشبہ قابلِ رحم ہے۔ جوا کھیلتے ہیں شرابیں پیتے ہیں۔ اور سینما دیکھتے ہیں۔ سینما میں جاؤ۔ تو دیکھو گے کہ زیادہ تماشائی مسلمان ہیں۔ اور سینما میں شب اور ہر شو میں اتنی بھیڑ ہوتی ہے کہ الاماں۔ بھیڑ تو ریل میں بھی بہت ہوتی ہے۔ پچھلی دفعہ جب میں جالندھر گیا۔ تو بھیڑ کی وجہ سے ٹرین پر سوار نہ ہو سکا۔ اور شالامار باغ کے میلے میں بھی بھیڑ کم نہیں ہوتی۔ کھوے سے کھوا چھلتا ہے۔ اور پولیس کے سخت انتظام کے باوجود ایسی دھکا پیل ہوتی ہے کہ لوگوں کے کپڑے پھٹ جاتے ہیں۔ آپ میں سے جو لوگ لاہور گئے ہیں۔ انہوں نے شالامار باغ ضرور دیکھا ہوگا شاہانِ اسلام کی یادگار ہے۔

(نعرہ - "اسلام زندہ باد")

ہر سال یہاں میلہ لگتا ہے۔ اس میلے میں خلیفہ کے کباب اور قصوریوں کا مرغ مسلم کھانے کی چیزیں ہوتی ہیں۔ کباب بھی عجب چیز ہے اور یہ بھی مسلمانوں کی ایجاد ہے۔ ولایت کے ایک رسالے میں کباب پر پورے پانچ صفحوں کا ایک مضمون لکھا اور ثابت کیا کہ تہذیب دنیا میں مسلمانوں کا سب سے زیادہ قابلِ قدر حصہ کباب ہے۔

(نعرہ - "اسلام زندہ باد")

کباب دراصل گھر پر اچھے نہیں بنتے۔ انہیں دکان دار ہی بنا سکتے ہیں۔ دکانداروں کی بھی کیا پوچھتے ہو۔ گزارہ ہی چلتا ہے۔ کوئی آمدنیاں نہیں رہیں۔ آمدنی ہے تو سینما والوں کو۔ اچھی فلم ہو یا بری ان کا کام خوب چلتا ہے۔ بعض فلمیں بہت مخرب اخلاق ہوتی ہیں۔ میں نے ایک فلم دیکھی۔ میرا مطلب ہے کہ ایک شخص سے اس فلم کے متعلق سنا کہ بہت ہی گھٹیا درجے کی فلم تھی۔ اور اس سے اخلاق پر برا اثر پڑتا تھا۔ بس اے مسلمانو وقت آ گیا ہے کہ ہم اپنے اخلاق درست کریں۔

"گلدستہ اخلاق" میں لکھا ہے......"

میں اسی طرح تقریر کرتا گیا اور میں یہ دیکھ کر حیران تھا کہ لوگوں پر میری تقریر کا بہت اثر ہو رہا ہے۔ وہ بُت بنے ہوئے ایک ایک لفظ کو غور سے سُن رہے ہیں اور کبھی کبھی "زندہ باد" کا نعرہ بھی لگ جاتا ہے۔

میں ابھی تقریر کر ہی رہا تھا کہ ایک ٹیلیگراف کا ہرکارہ آیا اور صدر جلسہ کے ہاتھ میں ایک تار دے کر چلا گیا۔ صدر جلسہ نے تار کھولا اُسے پڑھا اور میری طرف دیکھنے لگا۔ لیکن میں نے تقریر کو جاری رکھا۔ جب تقریر ختم ہو گئی تو صاحبِ صدر نے اُٹھ کر حاضرین سے مخاطب ہو کر کہا۔

"صاحبان۔ میں آپ کو ایک عجیب بات سناؤں۔ جن صاحب نے ابھی آپ کے سامنے تقریر کی ہے یہ مولانا رفاقت علی نہیں۔ مولانا کا تار ابھی ابھی آیا ہے جو میرے ہاتھ میں ہے۔ مولانا اطلاع دیتے ہیں کہ میں دفعتہً علیل ہو جانے کے باعث نہیں آ سکتا۔ بہرحال نقلی مولانا رفاقت علی کو بھی داد دینی چاہیئے۔ کہ انہوں نے اپنا پارٹ خوب نبھایا اور تقریر سے جو نورٌ علیٰ نور تھی آپ کو محظوظ فرمایا۔ میں اب جلسے کی برخاستگی کا اعلان کرتا ہوں"

میں رات کو وہیں سویا اور صبح اپنے دوست کے گاؤں کو روانہ ہوا۔ لیکن اس واقعہ سے مجھے شوق پیدا ہو گیا۔ کہ لیڈر بننا چاہیئے۔ چنانچہ میں لیڈر بن گیا ہوں۔ آپ کو لیڈر بننا ہو تو اسی طرح بن جایئے۔ جس طرح میں بنا ہوں۔

"لیڈری زندہ باد"

خط و کتابت

کرتے وقت نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دیں۔ جو چٹ کے سرے پر تحریر کر دیا جاتا ہے اور نام و پتہ خوشخط لکھیں تاکہ ادارہ کو جواب دینے میں سہولت ہو۔

شاہکار :- کا نمونہ طلب کرنیوالے احباب خط کے ہمراہ آٹھ آنہ کے ٹکٹ ضرور ارسال کریں ورنہ تعمیل نہ ہوگی۔

مینیجر

غزل

ایسے بھی چند لمحے آئے ہیں زندگی میں
تجھ کو بھی جب نہ میں نے پہچانا بے خودی میں

روداد آرزو ہو یا سرگزشتِ حرماں
ڈھلتے ہیں یہ فسانے اشکوں کی روشنی میں

وہ ابر گھر کے اُٹھا وہ آئیں نرم بوندیں
رندو! وہ فرق آئے رفتارِ مے کشی میں

اِک اضطرابِ پیہم اِک سوزشِ مسلسل
لے دے کے ہم نے پایا یہ تیری دوستی میں

اپنی حقیقتوں سے آگاہ اب تو کر دو
بُت پُوجنے پڑے ہیں تکمیلِ بندگی میں

ہر شخص یُوں تو دعویٰ کرتا ہے عاشقی کا
لیکن وفا کے جوہر اب ہیں کسی کسی میں

یہ عشق یہ جوانی یہ غم یہ رنج و حرماں
یعنی خزاں کے دن بھی آئے بہار ہی میں

صحنِ چمن کو کس نے دیکھا ہے مُسکرا کر
اِک حُسن آ گیا ہے پھُولوں کی تازگی میں

اب مجھ سے کہہ رہے ہو اس بیخودی کو چھوڑو
جب آگ دے چکا ہوں سرمایۂ خودی میں

وقتِ سحر چمن کا منظر ہے کس بلا کا
شمعیں جلا رہی ہے شبنم کلی کلی میں

میں مسکراہٹوں کا انجام جانتا ہوں
غم کو بھی درج کر دو فہرستِ سرخوشی میں

راتوں کو آجکل وہ چھپ چھپ کے آ رہے ہیں
اختر چمک رہے ہیں قسمت کی تیرگی میں

اختر ہوشیارپوری

جناب شریف چکوالی کے قلم سے

قربانی

آدھی رات کا وقت تھا۔ چودھویں کے چاند کی نورانی کرنیں صاف و شفاف زمین پر پڑ کر ایسی معلوم ہو رہی تھیں جیسے پگھلی ہوئی چاندی کی ایک نہر بہی جا رہی ہو۔

ہر طرف پُر رعب خاموشی چھائی ہوئی تھی، پوری کائنات میٹھی نیند کے مزے لے رہی تھی۔ یہاں تک کہ ٹھنڈی ٹھنڈی فرحت بخش ہوا نے زاہدِ شب زندہ دار کو بھی محوِ خواب ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔

موہنی۔ شباب کی سرمستیوں سے چُور دوشیزہ —— جوانی کی میٹھی نیند سو رہی تھی، اس کے لمبے نرم سیاہ بال زمین کے بوسے لے رہے تھے۔ جیسے کالے ناگ لہرا رہے ہوں۔ ایک ہاتھ چارپائی سے نیچے لٹکا ہوا تھا۔ اور تکیہ بار بار کی انگڑائیوں سے تنگ آکر زمین کی طرف سرکنے کی کوشش کر رہا تھا —— حُسن و شباب کی ستم رانیاں، محبت بھرے دل ہی سہہ سکتے ہیں، بیچارے تکیے میں اتنی ہمت کہاں؟

موہنی کے حسین چہرے کے گرد ایک نورانی ہالہ سا نظر آرہا تھا اور رنیلی ترچھی بھویں —— جیسے اِس ملائک فریب حسن کی حفاظت کے لئے دو کمانیں کھینچی ہوئی ہوں!

~~~~~~~~~~

موہنی نے انگڑائی لی، چاند اور ستارے اس کی اس حرکت پر کھلکھلا کر ہنس پڑے، موہنی نے شاید اُن کی یہ "شرارت" محسوس کر لی۔ اُس کی آنکھ کھل گئی، وہ چاند کو اپنی طرف شوخ نظروں سے دیکھتے دیکھ کر شرما گئی۔ اُس کے رخساروں پر ہلکا سا گلابی رنگ چھا گیا اور ہونٹوں پہ ایک میٹھی مسکراہٹ —— جیسے کسی الہڑ دوشیزہ کو اس کے پریمی نے چھیڑ دیا ہو۔

ہوا کی چھیڑ چھاڑ اور چاند تارں کی تاک جھانک سے شرما کر اس نے چادر سے اپنے سارے جسم کو چھپا لیا، پھر عجیب نظروں سے چاند کو دیکھنے لگی جیسے کہہ رہی ہو۔ "اب بتاؤ —— ؟"

اُسی وقت دھیرے دھیرے باتیں کرنے کی آواز آئی اور موہنی آنکھیں بند کرکے چپکی لیٹ رہی —— یہ اُس کے ماتا پتا کی آواز تھی، موہنی نے دھیان سے سُنا، اُس کے پتا کہہ رہے تھے "وہ پانچ سو روپے پر بھی راضی تو ہو جائے گا۔ مگر سچ پوچھو تو میں اُسے بالکل پسند نہیں کرتا۔ نہ گھر نہ بار، نوکری کرتا ہے، مگر تنخواہ اتنی کم کہ گذر ہی نہ ہو سکے۔ بھلا موہنی وہاں کیا سُکھ پائے گی؟"

"ہوں ...... اور وہ سیٹھ صاحب کیا کہتے ہیں؟" موہنی کی ماں نے پوچھا۔

"اُن کا دماغ تو آسمان پر ہے، پانچ ہزار سے نیچے بات ہی نہیں کرتے۔ پھر لڑکا کچھ لکھا پڑھا بھی نہیں ہے۔ فرض کرو اگر بیوپار نہ چلے یا کسی اور وجہ سے اُسے ملازمت ہی کرنی پڑے۔ تو بھلا ایسے جاہل کو کہیں نوکری مل سکتی ہے؟" —— نہیں، باپ کے سہارے ساری زندگی گزارنے والے سے میں موہنی کو نہیں بیاہ سکتا۔"

"پھر آخر کرو گے کیا؟ موہنی کو اب گھر میں بٹھا رکھنا بھی تو ممکن نہیں، برادری میں مدت سے چرچا ہو رہا ہے۔ آخر اس کے لئے آسمان سے تو بَر آ نہیں جائے گا!"

"دیکھ تو رہی ہو، میں رات دن اسی فکر میں ہوں۔ رات کو آرام سے سونا بھی تو نصیب نہیں ہوتا، دن بھر لڑکے والوں کی خوشامد کرتا ہوں، اس پر بھی اگر برادری چرچا کرتی ہے تو میں کیا کروں؟"

"تو ایسا کوئی لڑکا کیوں نہ ڈھونڈو جو اتنا کما لیتا ہو جس سے دونوں کی گذر اچھی طرح ہو جائے، موہنی بھی سُکھی رہے اور ہم بھی سُکھ کا سانس لے سکیں"

"ایسے لڑکے تو بہت ہیں مگر سوچتا ہوں موہنی کی گزر کیسے ہوگی؟ تیس چالیس روپے تنخواہ، بوڑھے ماں باپ اور چھوٹے بہن بھائی، نہ گھر میں کوئی کام کرنے والا نہ کھُلی آمدنی —— کیا موہنی اس حالت میں پورے گھر کا بوجھ اُٹھا سکے گی؟ تم نے تو آج تک اُسے کسی کام کو ہاتھ بھی نہیں لگانے دیا۔ اب تم ہی بتاؤ۔ میں جان بوجھ کر اُسے ایسی جگہ کیسے بیاہ دوں؟"

"پھر آخر سوچا کیا ہے؟ میں تو لوگوں کی باتیں سنتے سنتے تنگ آ گئی ہوں۔ اب یہ سرگوشیاں نہیں سہی جاتیں۔ کہیں نہ کہیں تو موہنی کو بیاہنا ہی ہوگا ......"

"رائے بہادر سورج پرکاش کا بیٹا لڑکا ایم۔ اے میں پڑھ رہا ہے۔ میرا دیکھا ہوا ہے۔ دیکھنے سننے میں اچھا، پڑھنے لکھنے میں لائق، پھر باپ کی زمینداری کافی ہے اور اگر ملازمت بھی کرنی پڑے تو دو تین سو روپے ماہوار کہیں نہیں گئے۔"

"تو پھر وہیں ٹھیک کر لو نا، سوچتے کیا ہو؟"

"مگر وہ روپے بہت مانگتے ہیں، پندرہ ہزار سے نیچے بات ہی نہیں کرتے تھے۔ بڑی مشکل سے دس ہزار تک آئے ہیں۔ لڑکا ہزاروں میں ایک
~~~~~~~~~~

ہے۔ چھوڑنے کو جی بھی نہیں چاہتا مگر اتنے روپے بھی تو اپنے بس کی بات نہیں۔"

"کیا وہ پانچ ہزار پر راضی نہ ہوں گے؟ دیکھو نا اگر مان جائیں تو ہماری بچی کی قسمت کھل جائے۔"

"رام لال ہی تو انہیں آٹھ ہزار دے رہا تھا مگر انہوں نے صاف جواب دے دیا۔ اُن کی لڑکی موہنی کی سہیلی ہے اسی لئے وہ کچھ نرم ہیں اور امید ہے سات آٹھ ہزار پر راضی ہو جائیں گے۔"

"مگر آٹھ ہزار بھی کہاں سے آئیں گے؟"

"دو تین ہزار کا تو ہمیں گھر ہی سے بندوبست کرنا پڑے گا۔ کچھ روپے تو ہیں ہی، کچھ تمہارے زیوروں سے مل جائیں گے۔ باقی رہے پانچ ہزار — تو وہ اس مکان پر بنک سے لینے پڑیں گے — اس طرح کام چل جائے گا۔ کچھ بھی ہو یہ لڑکا چھوڑنے قابل نہیں۔ اب اگر ذرا بھی دیر کی تو پھر ہاتھ ملتے ہی رہ جائیں گے۔ کل ہی میں نے سیٹھ بہاری لال کو اُن کے ہاں جاتے دیکھا تھا۔"

"گھر بھی چلا گیا تو رہیں گے کہاں؟" موہنی کی ماں نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

"عزت بھی تو بچانا ہے۔ پھر موہنی کو سکھی دیکھنے کے لئے اتنی قربانی تو کرنا ہی پڑے گی — بھگوان بیٹی دیں تو بہت ساری دولت بھی دیں مگر جب دولت نہیں ہے تو جس طرح ہو بیٹی کو تو پار لگانا ہے، ہمارا کیا ہے زندگی تو گزر ہی چکی ہے جو دس پانچ سال باقی ہیں۔ یہ بھی روتے دھوتے گزر ہی جائیں گے — یہ کہتے کہتے وہ آبدیدہ ہو گئے۔

"جب یہی ارادہ ہے تو بھگوان کا نام لے کر جو کرنا ہے کر ڈالو، ہم پہ جو آئے گی جھیل لیں گے۔ بھگوان موہنی کا سکھ دکھائے۔ اُسے سکھی دیکھ کر ہمیں اپنا دکھ بھول جائے گا۔" موہنی کی ماں نے بھرائی ہوئی آواز سے رُک رُک کر کہا۔

"کل جاؤں گا اور بات پکی کر آؤں گا، ابھی تو نیند آ رہی ہے۔ اب تم بھی سو رہو۔ رات بہت جا چکی ہے۔" یہ کہتے ہوئے موہنی کے پتا کروٹ بدل کر سو رہے!

ہر طرف خاموشی چھا گئی اور ایسا معلوم ہونے لگا۔ جیسے چاند کی روشنی پھیکی پڑ گئی ہو، فضا پر ایک اداسی سی چھا گئی، ٹھنڈی آہوں کی آواز کبھی کبھی اس ہیبتناک خاموشی کو توڑ دیتی تھی۔

موہنی سانس روکے سب باتیں سُن رہی تھی اور اُس کا سارا جسم کانپ رہا تھا — "ماتا جی کے زیور اور مکان بیچ کر میرا بیاہ؟" اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اور اس نے رحم طلب نگاہوں سے آسمان کی طرف دیکھا۔

مگر وہاں بھی بادل کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے نے چاند کو چھپا لیا تھا۔!

موہنی سوچنے لگی "انہوں نے کتنی محبت و شفقت سے مجھے پالا پوسا۔ آج تک کبھی تو مجھے دکھ نہیں دیا۔ نہ کبھی کسی کام کو ہاتھ لگانے دیا، میں رانی بنی بیٹھی رہتی ہوں اور ماتا جی گھر کا سارا کام کرتی ہیں — دونوں جیسے مجھے دیکھ دیکھ کر جیتے ہیں۔ کیا اس کا یہی بدلہ ہونا چاہیئے؟ کیا میری وجہ سے انہیں بھکاری بن جانا چاہیئے؟...... نہیں میں یہ کبھی نہ ہونے دوں گی۔ مجھے ایسے سکھ کی ضرورت نہیں ہے۔ جو میرے پوجنیہ ماتا پتا کو راستے کا بھکاری بنا دے ...... نہیں یہ نہیں ہوگا ...... نہیں ......"

موہنی نے دل ہی دل میں کچھ طے کیا اور سو جانے کی کوشش کرنے لگی۔ مگر نیند کہاں؟ بار بار کانوں میں ماتا پتا کی آواز گونجنے لگتی، رہ رہ کر ان کی بربادی کا خیال دل پہ ایک چوٹ سی لگاتا — وہ سو نہ سکی۔

دوسرے روز گنگا اشنان کا دن تھا، محلے کی دوسری لڑکیوں کے ساتھ موہنی بھی نہانے چلی، جاتے جاتے نہ جانے کیوں اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے مگر اُس نے انہیں اپنی لمبی پلکوں کے نیچے چھپا لیا اور چلی گئی!

سورج شفق کی خونیں سرخی کو چیرتا ہوا نکل رہا تھا، اُس کی روشن کرنیں ہر چیز کو اپنی سنہری شعاعوں سے منور کر رہی تھیں۔ گنگا کی پُرشور لہروں سے کھیلتی ہوئی یہ سنہری شعاعیں قوسِ قزح کا دلفریب نظارہ پیش کر رہی تھیں۔ گھاٹ پر یاتریوں کا ہجوم تھا۔ مذہبی جوش اور پوتر گنگا کے درشنوں کے شوق ہزاروں آدمیوں کو گنگا کنارے کھینچ لایا تھا، کہیں پجاری ننگے ہوتے ہوئے سورج کو پرنام کر رہے تھے۔ تو کہیں نوجوان لڑکیاں ایک دوسری پہ چھینٹیں اُڑا رہی تھیں۔

اس چہل پہل سے بہت دور۔ گنگا کی پُرشور لہریں، گلابی ساڑی میں لپٹے ہوئے ایک پھول سے جسم کو سورج کی شوخ کرنوں، لوگوں کی لالچی نگاہوں اور رسم و رواج کی کٹھن بندشوں سے دور — بہت دور بہائے لئے جا رہی تھیں!

نسیمِ سحر

نوا مطربانہ ادا دلبرانہ

نظر عارفانہ روش کافرانہ

وطن صحنِ گلشن بہاروں کا دامن

طبیعت ہمہ تن کرم گسترانہ

مسرت سے پیہم لبوں پہ تبسم

تبسم مجسم سحر کا ترانہ

سحر کا ترانہ ہے اس کی نوا میں

پریشاں ہیں نغمے چمن کی فضا میں

چمن کی فضا میں پریشاں ہیں نغمے

معطر ہیں بہت بداماں ہیں نغمے

فروغِ بہاراں سے روشن ہیں جگنو

تجلی کے سرو چراغاں ہیں نغمے

نسیمِ سحر نے یہ کیا ساز چھیڑا

کہ خاکِ چمن میں پر افشاں ہیں نغمے

یہ کیا ساز چھیڑا نسیمِ سحر نے

لگیں باغِ جنت سے پریاں اترنے

قیوم نظر

زبانِ احسن

جس دل میں اُلفتِ بُتِ پردہ نشیں نہیں

دنیا میں قدر و منزلت اُس کی کہیں نہیں

پہلی سی آپ کی نگہِ خشمگیں نہیں

تیور نہیں وہ آپ کے چینِ جبیں نہیں

بزمِ عدو میں دیکھ لیں وہ چھیڑ کا مزا

یا غیر ہی کی خیر نہیں یا ہمیں نہیں

تیرے مریضِ غم کے سرہانے بجز اجل

پرسانِ حال کوئی دمِ واپسیں نہیں

جور و جفا کا نام ہی دنیا سے مٹ گیا

جب سے تمہاری وہ نگہِ خشمگیں نہیں

افسوس اس جہان سے احسن گزر گیا

اب کوئی اپنا یار نہیں ہمنشیں نہیں

حضرت احسن مارہروی مرحوم

پروفیسر دھرم پال گپتا
ایم۔ اے۔

سیویل نگر کا نائی

(دوسرا ایکٹ)

(روزین کمرے میں اکیلی ہے۔ ہاتھ میں موم بتی ہے۔ میز پر کاغذ کا ایک ٹکڑا پڑا ہے۔ اس پر کچھ لکھ رہی ہے)

روزین۔ (اپنے آپ سے) مارسلین بیمار ہے۔ باقی سب اپنے اپنے کاموں میں مشغول ہیں۔ کسی کو کیا معلوم ہو سکتا ہے۔ کہ میں کیا لکھ رہی ہوں۔ لیکن نہیں۔ "دیوار ہم گوش دارد" بھی تو مشہور ہے۔ اور ممکن ہے وہی مردک بے وقت آ دھمکے۔ نہ معلوم کیا بات ہے کہ ادھر میں نے ایک قدم اٹھایا یا منہ سے ایک لفظ نکالا اور اُدھر اس کو خبر ہو گئی ۔۔۔۔ ہائے لندور (لفافہ پر مہر لگا کر بند کرتی ہے) آخر خط کو تو بند کرنا ہی ہے۔ نہ معلوم ان تک پہنچا بھی سکوں گی یا نہیں۔ میں نے انہیں فگارو حجام سے باتیں کرتے دیکھا تھا۔ فگارو بظاہر آدمی تو اچھا معلوم ہوتا ہے۔ مجھ پر مہربان بھی ہے۔ کاش ایک منٹ کیلئے وہی آ جاتا۔

(فگارو داخل ہوتا ہے)

روزین (متحیر ہو کر) آئیے تشریف لائیے۔ بڑی خوشی ہوئی۔

فگارو۔ بیگم صاحبہ! آپ کا مزاج تو اچھا ہے؟

روزین۔ بس زندگی کے دن پورے کر رہی ہوں، یہ بھی کوئی زندگی میں زندگی ہے۔

فگارو۔ بے شک بیشک۔ یہ بھری جوانی اور ۔۔۔۔۔

روزین۔ آج صبح کس سے باتیں ہو رہی تھیں۔

فگارو۔ کوئی نہیں ایک رشتہ دار نوجوان طالب علم تھا۔ آدمی بڑا ہونہار۔ بڑا سمجھدار۔ بڑا لائق اور شکل وصورت بھی ماشا اللہ چندے آفتاب، چندے ماہتاب ہے۔

روزین۔ جوان ہے تو بیشک نہایت حسین۔ اس کا نام کیا ہے؟

فگارو۔ لندور۔ ایک غریب خاندان کا چشم وچراغ ہے۔ اس نے غلطی کی جو میڈرڈ سے جلد بھاگ آیا۔ ورنہ وہاں نوکری کی کمی نہیں۔ کوئی نہ کوئی صورت نکل ہی آتی۔

روزین۔ یہاں بھی مل جائے گی۔ نوکری کے لئے بھی یہاں وہاں کی شرط ضروری ہے؟ ایک نوجوان پھر ایسی شکل وصورت کا نوجوان کسی نہ کسی کی نگاہ پہ چڑھ ہی جائے گا۔

فگارو۔ (اپنے آپ سے) بہت خوب (باآواز بلند) لیکن اس میں ایک نقص بھی ہے اور نقص بھی بہت بڑا۔ اس کی ترقی کی راہ میں یہی تو روڑا ثابت ہو رہا ہے۔

روزین۔ وہ کیا؟

فگارو۔ کسی کا عشق کسی کے دام محبت میں اسیر ہے اور کیا۔

روزین۔ تو کیا عشق بھی آپ کی نظروں میں کوئی نقص ہے؟

فگارو۔ بے شک۔ ایک غریب آدمی کو عشق وعاشقی سے کیا غرض؟

روزین۔ قسمت بھی اندھی ہے۔ آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ وہ پیار کس کو کرتا ہے۔ میرا اشتیاق خواہ مخواہ بڑھ رہا ہے۔

فگارو۔ چھوڑئیے بھی ان باتوں کو یہ آپ کے سننے کی نہیں۔ ورنہ بتانے میں میرا حرج ہی کیا تھا۔

روزین۔ کیوں! میرے سننے کی باتیں کیوں نہیں؟ میں نہ پیٹ کی ہلکی ہوں نہ بچوں جیسی نادان کہ ہر کس وناکس کے سامنے راز کی باتیں کہتی پھروں ۔۔۔۔۔۔ بتا بتاؤ تو وہ محبت کس سے کرتے ہیں وہ خدا کی بندی ہے کون؟ نہ جانے ان کی باتوں سے مجھے دلچسپی کیوں پیدا ہو گئی۔

فگارو۔ کیا کہوں بیگم! عجب حسن دیا ہے خدا نے اس کو۔ وہ حسن جو نہ پریوں میں دیکھا نہ حوروں میں۔ بوٹا سا قد۔ مست چال۔ ہرنوں کو شرمانے والی بڑی بڑی آنکھیں۔ نازک اندام۔ پھول سے رخسار۔ موتی سے دانت۔ دیکھنے سے ایسا معلوم دیتا ہے جیسے قدرت نے حسن کے سانچے میں ڈھالتے ہوئے اپنا سارا کمال صرف کر دیا ہے۔

روزین۔ خوب! وہ رہتی کہاں ہے۔ اسی شہر میں؟

فگارو - شہر تو پھر بھی دُور ہے - اسی بازار میں -

روزین - کہیں محلے ہی میں تو نہیں ؟

فگارو - محلّہ کیا معنی ؟ مجھ سے صرف دو قدم کے فاصلے پر -

روزین - بڑا ہی خوش قسمت نوجوان ہے پھر تو، یہ خدا کی بندی .... ہے کون ؟

فگارو - ساری باتیں آج ہی بتا دوں بس کچھ تو سن لیا رہا صرف نام وہ بھی معلوم ہو جائے گا -

روزین - سننے والی بات بھی تو یہی تھی - ساری کہانی سننے کے بعد اگر نتیجہ ہی معلوم نہ ہو تو .... ؟

فگارو - معلوم ہوا آپ ماننے والی نہیں - اچھا ! لیجئے نام بھی سُن ہی لیجئے وہ ہیں ماسٹر بازیل صاحب کی چہیتی شاگرد - اور ان کا نام ہے روزین -

روزین - (ضبط سے کام لیتی ہوئی) چلو ہٹو بھی - میں نے نام کیا پوچھا کہ تم نے مجھی کو چھیڑنا شروع کر دیا - ہونہہ ! شاگرد ! روزین نام ہے

فگارو - خوب ! تو آپ کا خیال ہے کہ میں آپ سے دل لگی کر رہا ہوں - آخر یقین نہ کرنے کی وجہ ؟ اس غریب کی تو جان پر بن رہی ہے - آپ کے جمال جہاں آرا کی زیارت کے اشتیاق میں تڑپ تڑپ کر زندگی کے دن پورے کر رہا ہے اور آپ ہیں کہ یقین ہی نہیں آتا آپکو

روزین - جاؤ بھی تمہاری باتوں سے مجھے تو ہول دلی سی ہونے لگی -

فگارو - نہیں نہیں ہرگز نہیں - ڈر کا احساس تو خود ڈر سے ہوا ہے - لیکن آپ کو یہ بھی تو معلوم نہیں کہ میں نے ایسی تدبیر سوچی ہو کہ ایک دن کے لئے سارے چوکیدار چت لیٹ جائیں اور آپ فردوسِ محبت میں مصروف خرام ناز نظر آئیں -

روزین - خیر اگر یہ سچ ہے تو میری طرف سے کہہ دینا ؎

عشق صادق کا جو دعویٰ ہو تو خاموش رہیں
ضبط سے کام لیں - محتاط ہوں - باہوش ہیں
دل کی بے تابی کہیں راز نہ افشا کر دے
کہیں ایسا نہ ہو روزین کو رسوا کر دے

فگارو - بیگم صاحبہ ! ضبط اور عشق یہ دونوں تو متضاد چیزیں ہیں دونوں ایک ہی دل میں کیسے سما سکتی ہیں - کسی گرفتار عشق سے ضبط و صبر کی امید بالکل ایسے ہی ہے جیسے شیطان سے نیکی اور آدم سے بدی کی توقع رکھے - یا تو ضبط بغیر عشق کے ہوگا یا عشق بغیر ضبط کے پایا جائے گا -

روزین - میرے خیال میں ضبط بغیر محبت کے .....

فگارو - (بات کاٹ کر) اجی بالکل مردہ دلی ہے - میرا بھی یہی خیال ہے کہ محبت بغیر ضبط کے بہتر چیز ہے - اللہ نے اگر مجھے عورت بنایا ہوتا -

روزین - (گھبرائی ہوئی) فرض کرو اگر کوئی نوجوان کسی عفت مآب دوشیزہ سے محبت کرنے لگے تو اس میں اس بیچاری کا کیا قصور ؟

فگارو - میں کب کہتا ہوں کہ قصور ہے - نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں میں محبت کا پیدا ہو جانا بالکل فطری چیز ہے - اس نوجوان کی آپ کے ساتھ محبت ٹھیک اسی قانون کے ماتحت ہے -

روزین - بات ہے تو یہی جو تم کہہ رہے ہو لیکن اُن سے کہہ دو کہ کہیں ضبط کا دامن نہ چھوڑ بیٹھیں، ورنہ سارا کام ہی بگڑ جائے گا -

فگارو - (دل میں) کام بگڑ جائے گا ؟ (روزین سے) اگر آپ ایک خط لکھ دیں تو زبانی پیام سے یہ کہیں زیادہ اچھا رہیگا - لفظوں میں بڑی طاقت ہوتی ہے سمجھیں نہ آپ ؟

روزین - (لکھا ہوا خط دیتے ہوئے) اب دوبارہ کون لکھے ؟ لو یہی خط دے دیتی ہوں - دیکھو جب تم انہیں یہ خط دینے لگو تو اچھی طرح سمجھا بھی دینا - (آہٹ لیتی ہے)

فگارو - کوئی نہیں ہے - ہاں آپ کچھ اور بھی تو کہنا چاہتی تھیں ؟

روزین - میں نے یہ خط تمہیں صرف اس لئے دیا ہے کہ تمہارا رشتہ دار مجھے بھی عزیز ہے - کہیں ایسا نہ ہو کہ تکلیفوں سے گھبرا کر ....

فگارو - اجی عزیز کیا معمولی جان پہچان ہی کہئے — لیکن انسانی ہمدردی کے لئے معمولی جان پہچان بھی کیا کچھ کم ہے - آپ کو تو کچھ خبر نہیں میرا تو آٹھ پہر کا ساتھ ہے - وہ تو آپ کے عشق میں اندھا ہو رہا ہے - اس کے دل میں عشق کی آگ اس حد تک شعلہ زن ہے کہ اس کی گرمی سے جل بھن کر خود میں کباب ہوا جا رہا ہوں - حالانکہ اس عشق بازی سے مجھے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے ؟

روزین - (آہٹ لیتی ہے) لو آ گیا نا پھر وہی ناشدنی، میرا خیال ہے کہ وہی آ رہا ہے - ڈاکٹر وہی ڈاکٹر - اگر اس نے تمہیں میرے پاس دیکھ لیا تو بس .... جلدی کرو - جاؤ اس چھوٹے کمرے میں جلدی جاؤ -

فگارو - پروا نہ کریں آپ (کمرے میں داخل ہوتا ہے)

(روزین اکیلی رہ جاتی ہے)

روزین - جی گھبراتا ہے - نہ معلوم گھر سے کب نکلتا ہے - فگا بظاہر آدمی تو بھلا مانس معلوم ہوتا ہے - اس کے ساتھ میرے انس کی وجہ بھی یہی اس کی نیکی ہے - لو آ گیا - ظالم بھی آ گیا - جانے میرا کینہ

کہاں پڑا ہے (بتی بجھا دیتی ہے اور کشیدہ کاری کے چوکھٹے پر کام کرنے لگتی ہے)

(بارکھولو داخل ہوتا ہے)

بارکھولو۔ (غصے میں) ننگارو کے بچے۔ بدمعاش تجھ پر خدا کی مار۔ سارے جہان کی پھٹکار۔ لعنت ہزار بار لعنت۔ کیا ستم ہے دو منٹ کے لئے بھی گھر سے باہر قدم رکھنا دشوار ہو گیا۔ ادھر نکلا ادھر ظالم میری تباہی پہ تلا ہوا اندر داخل ہو گیا۔

روزین۔ آپ کا چہرہ کیوں تمتمایا ہوا ہے۔ کچھ میں بھی سنوں۔ خیر تو ہے آخر اس غصے کی وجہ؟

بارکھولو۔ دیکھا اس کمبخت ننگارو کو تم نے؟ ایک لمحے میں سارے گھر کو تہ و بالا کر دیا۔ جس کو دیکھو بستر پر چت پڑا ہے۔ ہوشیار کو غفلت میں وارفتہ خواب آور پلا دی۔ جوان کو نسوار سنگھا دی۔ یہی مارسلین اس کے پاؤں میں جونک چپکا دی۔ گھوڑی تک کو تو شیطان نے چھوڑا نہیں۔ اس بے زبان اندھے جانور کی آنکھوں پر پلستر باندھ ڈالی۔ اور یہ سب صرف اس لئے کہ قرضہ کا ایک پیسہ نہ دینا پڑے۔ کوئی یہاں آیا تو نہیں تھا۔ لوگ اس گھر میں اس طرح بیدھڑک گھسے چلے آتے ہیں جیسے سینما ہال کا ٹکٹ لے رکھا ہے

روزین۔ آپ کے علاوہ یہاں دوسرا آدمی کون آ سکتا ہے؟

بارکھولو۔ انسان کو ہر حالت میں ہوشیار رہنا چاہیئے۔ آجکل دنیا میں نئی نئی قسم کی شرارتیں پیدا ہو رہی ہیں۔ آج ہی دیکھا تم نے۔ صبح جب تمہارا گیت والا کاغذ گرا ہے تو اٹھا لے جانے والے نے میرے پہنچنے سے پہلے ہی چپکے سے غائب کر دیا۔

روزین۔ آپ تو بات کا خواہ مخواہ تبنگڑ بنا دیتے ہیں۔ کاغذ تو تھا ہی۔ کہیں اڑ گیا ہوگا یا کسی راہگیر نے اٹھا لیا ہوگا۔

بارکھولو۔ ہوا میں اڑ گیا ہوگا۔ یا کسی آتے جاتے کے ہاتھ لگ گیا ہوگا۔ اجی! میں خوب جانتا ہوں۔ ہوا میں اڑ کر کاغذ کہاں جاتا ہے۔ ان عاشق مزاجوں کی جیب میں جو اسی تاک میں کھڑے رہتے ہیں کہ کوئی کاغذ آئے اور وہ لے اڑیں۔

روزین۔ اچھا تو میں سمجھی۔ گویا آپ کے گمان میں اس کاغذ کو میں نے جان بوجھ کر نیچے گرا دیا تھا۔

بارکھولو۔ میرا تو یہی خیال ہے۔

روزین۔ (دل میں) کمبخت!

بارکھولو۔ لیکن جو کچھ ہو چکا ہو چکا، آئندہ ایسا کبھی بھی نہ ہو سکے گا۔ کھڑکی کو ایسا زبردست تالا لگاتا ہوں کہ انسان تو انسان موت کا فرشتہ بھی نہ کھول سکے۔

روزین۔ اجی اینٹیں چنوا دیجئے۔ جیلخانے اور کال کوٹھڑی میں فرق ہی کیا ہے؟

بارکھولو۔ ٹھیک کہتی ہو۔ بیشک سڑک والی کھڑکی میں اینٹیں چنوا دینا ہی خوب رہے گا۔ وہ حجام تو نہیں آیا؟

روزین۔ آپ کو اس حجام پر بھی اعتبار نہیں؟

بارکھولو۔ اعتبار۔ نہیں مجھے تو کسی پہ اعتبار نہیں۔

روزین۔ یہ جواب آپ کے منہ سے؟

بارکھولو۔ عورت چیز ہی ایسی ہے۔

روزین۔ شرم نہیں آتی کہتے ہوئے۔ آپ کے خیال میں مجھ سی عورت ننگارو حجام پر بھی گر پڑے گی۔

بارکھولو۔ ان عورتوں کی کچھ نہ پوچھو۔

روزین۔ اگر آپ کے گمان میں عورتیں بلا امتیاز ہر مرد پر جان دے سکتی ہیں تو میں آپ سے اتنی نفرت کیوں کرتی ہوں؟ کیا آپ حجام سے بھی گئے گزرے ہیں؟

بارکھولو۔ وجہ؟ اس کی وجہ پھر کبھی پوچھ لینا، اس وقت یہ بتاؤ کہ وہ ملعون یہاں آیا بھی تھا یا نہیں؟

روزین۔ (غصے میں) کیوں نہ آتا آیا بھی۔ میں نے ملاقات بھی کی اور خوب باتیں بھی کیں۔ ہاں یہ بھی کہہ دوں کہ مجھے اس سے اُنس بھی ہے۔ اب تو کلیجہ ٹھنڈا ہو گیا۔ یا اب بھی نہیں۔ جائیے۔ زہر کھا لیجئے۔ ڈوب مریئے چلو بھر پانی میں۔ (دریا پر چلی جاتی ہے)

بارکھولو۔ (اکیلا رہ گیا ہے) مر گئے کمبخت۔ ارے ہوشیار۔ او جوان کہاں مر گئے سب کے سب۔ کیا سبھی جہنم رسید ہو گئے؟ (ہوشیار آتا ہے)

ہوشیار۔ (جمائی لیتا ہے۔ آنکھیں نیم وا سی ہیں) آہ۔ آہ۔ آہ۔

بارکھولو۔ تو بھی کتنا بڑا بے وقوف ہے، بے وقوف جس وقت حجام یہاں آیا تو کہاں مر گیا تھا؟

ہوشیار۔ جناب میں! میں (جمائی لیتا ہے) آہ۔ آہ۔ آہ۔

بارکھولو۔ کوئی نہ کوئی شرارت ایجاد کرنے گیا ہوگا۔ کہتا کیوں نہیں کہ تو نے بھی اس کو دیکھا ہے؟

ہوشیار۔ دیکھا کیوں نہیں صاحب! انہی نے تو مجھے بتایا کہ میں بیمار سا نظر آ رہا ہوں۔ اس کا یہ کہنا تھا کہ میرے جوڑ بند میں درد

نگارو ۔ شہر تو پھر بھی مُدور ہے ۔ اسی بازار میں ۔

روزین ۔ کہیں محلّے ہی میں تو نہیں ؟

نگارو ۔ محلّہ کیا معنی ؟ مجھ سے صرف دو قدم کے فاصلے پر ۔

روزین ۔ بڑا ہی خوش قسمت نوجوان ہے پھر تو ، یہ خدا کی بندی ۔ ۔ ۔ ۔ ہے کون ؟

نگارو ۔ ساری باتیں آج ہی بتا دوں ، سب کچھ تو سن لیا ، صرف نام وہ بھی معلوم ہو جائے گا ۔

روزین ۔ سننے والی بات بھی تو یہی تھی ۔ ساری کہانی سننے کے بعد اگر نتیجہ ہی معلوم نہ ہو تو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ؟

نگارو ۔ معلوم ہوا آپ ماننے والی نہیں ۔ اچھا ! لیجئے نام بھی سُن ہی لیجئے وہ ہیں ماسٹر بانڈیل صاحب کی چہیتی شاگرد ۔ اور ان کا نام ہے روزین ۔

روزین ۔ (ضبط سے کام لیتی ہوئی) چلو ہٹو بھی ۔ میں نے نام کیا پوچھا کہ تم نے مجھی کو چھیڑنا شروع کر دیا ۔ ہونہہ ! شاگرد ! روزین نام ہے ۔

نگارو ۔ خوب ! تو آپ کا خیال ہے کہ میں آپ سے دل لگی کر رہا ہوں ۔ آخر یقین نہ کرنے کی وجہ ؟ اس غریب کی تو جان پر بن رہی ہے ۔ آپ کے جمال جہاں آرا کی زیارت کے اشتیاق میں تڑپ تڑپ کر زندگی کے دن پورے کر رہا ہے اور آپ ہیں کہ یقین ہی نہیں آتا آپکو ۔

روزین ۔ جاؤ بھی تمہاری باتوں سے مجھے تو ہول دلی سی ہونے لگی ۔

نگارو ۔ نہیں نہیں ہرگز نہیں ۔ ڈر کا احساس تو خود ڈر سے ہوا ہے ۔ لیکن آپ کو یہ بھی تو معلوم نہیں کہ میں نے ایسی تدبیر سوچی ہو کہ ایک دن کے لئے سارے چوکیدار چت لیٹ جائیں اور آپ فردوس محبت میں مصروف خرام ناز نظر آئیں ۔

روزین ۔ خیر اگر یہ سچ ہے تو میری طرف سے کہہ دینا ؎

عشق صادق کا جو دعویٰ ہو تو خاموش رہیں
ضبط سے کام لیں ۔ محتاط رہیں ۔ باہوش رہیں
دل کی بے تابی کہیں راز نہ افشا کر دے
کہیں ایسا نہ ہو روزین کو رسوا کر دے

نگارو ۔ بیگم صاحبہ ! ضبط اور عشق یہ دونوں تو متضاد چیزیں ہیں دونوں ایک ہی دل میں کیسے سما سکتی ہیں ۔ کسی گرفتار عشق سے ضبط و صبر کی امید بالکل ایسے ہی ہے جیسے شیطان سے نیکی اور آدم سے بدی کی توقع رکھے ۔ یا تو ضبط بغیر عشق کے ہوگا یا عشق بغیر ضبط کے پایا جائے گا ۔

روزین ۔ میرے خیال میں ضبط بغیر محبت کے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

نگارو ۔ (بات کاٹ کر) ابھی بالکل مردہ دلی ہے ۔ میرا بھی یہی خیال ہے کہ محبت بغیر ضبط کے بہتر چیز ہے ۔ اللہ نے اگر مجھے عورت بنایا ہوتا ۔

روزین ۔ (گھبرائی ہوئی) فرض کر و اگر کوئی نوجوان کسی عفت مآب دوشیزہ سے محبت کرنے لگے تو اس میں اس بیچاری کا کیا قصور ؟

نگارو ۔ میں کب کہتا ہوں کہ قصور ہے ۔ نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں میں محبت کا پیدا ہو جانا بالکل فطری چیز ہے ۔ اس نوجوان کی آپ کے ساتھ محبت بھی ٹھیک اسی قانون کے ماتحت ہے ۔

روزین ۔ بات ہے تو وہی جو تم کہہ رہے ہو لیکن اُن سے کہہ دو کہ کہیں ضبط کا دامن نہ چھوڑ بیٹھیں ، ورنہ سارا کام ہی بگڑ جائے گا ۔

نگارو ۔ (دل میں) کام بگڑ جائے گا ؟ (روزین سے) اگر آپ ایک خط لکھ دیں تو زبانی پیام سے یہ کہیں زیادہ اچھا رہیگا ۔ لفظوں میں بڑی طاقت ہوتی ہے سچ کہئیں نہ آپ ؟

روزین ۔ لکھا ہوا خط دیتے ہوئے) اب دوبارہ کون لکھے ؟ لو یہی خط دئے دیتی ہوں ۔ دیکھو جب تم انہیں یہ خط دینے لگو تو اچھی طرح سمجھا بھی دینا ۔ (آہٹ لیتی ہے)

نگارو ۔ کوئی نہیں ہے ۔ ہاں آپ کچھ اور بھی تو کہنا چاہتی تھیں ؟

روزین ۔ میں نے یہ خط تمہیں صرف اس لئے دیا ہے کہ تمہارا رشتہ دار مجھے بھی عزیز ہے ۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تکلیفوں سے گھبرا کر ۔ ۔ ۔ ۔

نگارو ۔ ابھی عزیز کیا معمولی جان پہچان ہی کہئے ــــ لیکن انسانی ہمدردی کے لئے معمولی جان پہچان بھی کیا کچھ کم ہے ۔ آپ کو تو کچھ خبر نہیں میرا تو آٹھ پہر کا ساتھ ہے ۔ وہ تو آپ کے عشق میں اندھا ہو رہا ہے ۔ اس کے دل میں عشق کی آگ اس حد تک شعلہ زن ہے کہ اس کی گرمی سے جل بھن کر خود میں کباب ہوا جا رہا ہوں ۔ حالانکہ اس عشق بازی سے مجھے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے ؟

روزین ۔ (آہٹ لیتی ہے) لو آ گیا نا پھر وہی ناشدنی ، میرا خیال ہے کہ وہی آ رہا ہے ۔ ڈاکٹر وہی ڈاکٹر ۔ اگر اس نے تمہیں میرے پاس دیکھ لیا تو بس ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جلدی کرو ۔ جاؤ اس چھوٹے کمرے میں جلدی جاؤ ۔

نگارو ۔ پروا نہ کریں آپ (کمرے میں داخل ہوتا ہے)

(روزین اکیلی رہ جاتی ہے)

روزین ۔ جی گھبراتا ہے ۔ نہ معلوم گھر سے کب نکلتا ہے ۔ نگارو بظاہر آدمی تو بھلا مانس معلوم ہوتا ہے ۔ اس کے ساتھ میرے انس کی وجہ بھی یہی اس کی نیکی ہے ۔ لو آ گیا ۔ ظالم بھی آ گیا ۔ جانے میرا کشیدہ

کہاں پڑا ہے (بتی بجھا دیتی ہے اور کشیدہ کاری کے چوکھٹے پر کام کرنے لگتی ہے)

(بارتھولو داخل ہوتا ہے)

بارتھولو - (غصے میں) فگارو کے بچے۔ بدمعاش تجھ پر خدا کی مار - سارے جہان کی پھٹکار۔ لعنت ہزار بار لعنت۔ کیا ستم ہے دو منٹ کے لئے بھی گھر سے باہر قدم رکھنا دشوار ہو گیا۔ اِدھر نکلا اُدھر ظالم میری تباہی پہ تُلا ہوا اندر داخل ہو گیا۔

روزین - آپ کا چہرہ کیوں تمتمایا ہوا ہے۔ کچھ میں بھی سنوں۔ خیر تو ہے۔ آخر اس غصے کی وجہ؟

بارتھولو - دیکھا اس کمبخت فگارو کو تم نے؟ ایک لمحے میں سارے گھر کو تہ و بالا کر دیا۔ جس کو دیکھو بستر پہ چت پڑا ہے۔ ہوشیار کو غفلت میں ڈال دینے والی خواب آور پلا دی۔ جوان کو نسوار سنگھا دی۔ رہی مارسلین اس کے پاؤں میں جونک چپکا دی۔ گھوڑی تک کو تو شیطان نے چھوڑا نہیں۔ اس بے زبان اندھے جانور کی آنکھوں پر پلستر باندھ ڈالی۔ اور یہ سب صرف اس لئے کہ قرضہ کا ایک پیسہ نہ دینا پڑے۔ کوئی یہاں آیا تو نہیں تھا۔ لوگ اس گھر میں اس طرح بیدھڑک گھسے چلے آتے ہیں جیسے سینما ہال کا ٹکٹ لے رکھا ہے

روزین - آپ کے علاوہ یہاں دوسرا آ ہی کون سکتا ہے؟

بارتھولو - انسان کو ہر حالت میں ہوشیار رہنا چاہئیے۔ آجکل دنیا میں نئی نئی قسم کی شرارتیں پیدا ہو رہی ہیں۔ آج ہی دیکھا تم نے۔ صبح جب تمہارا گیت والا کاغذ گرا ہے تو اٹھانے والے نے میرے پہنچنے سے پہلے ہی چپکے سے غائب کر دیا۔

روزین - آپ تو بات کا خواہ مخواہ تبنگڑ بنا دیتے ہیں۔ کاغذ تو تھا ہی۔ کہیں اُڑ گیا ہو گا یا کسی راہگیر نے اٹھا لیا ہو گا۔

بارتھولو - ہوا میں اُڑ گیا ہو گا۔ یا کسی آتے جاتے کے ہاتھ لگ گیا ہو گا۔ اجی! میں خوب جانتا ہوں۔ ہوا میں اُڑ کر کاغذ کہاں جاتا ہے۔ ان عاشق مزاجوں کی جیب میں جو اسی تاک میں کھڑے رہتے ہیں کہ کوئی کاغذ آئے اور وہ لے اُڑیں۔

روزین - اچھا تو میں سمجھی۔ گویا آپ کے گمان میں اس کاغذ کو میں نے جان بوجھ کر نیچے گرا دیا تھا۔

بارتھولو - میرا تو یہی خیال ہے۔

روزین - (دل میں) کمبخت!

بارتھولو - لیکن جو کچھ ہو چکا ہو چکا آئندہ ایسا کبھی بھی نہ ہو سکے گا۔ کھڑکی کو ایسا زبردست تالا لگاتا ہوں کہ انسان تو انسان موت کا فرشتہ بھی نہ کھول سکے۔

روزین - اجی اینٹیں چنوا دیجئے۔ جیلخانے اور کال کوٹھڑی میں فرق ہی کیا ہے؟

بارتھولو - ٹھیک کہتی ہو۔ بیشک سڑک والی کھڑکی میں اینٹیں چنوا دینا ہی خوب رہے گا۔ وہ حجام تو نہیں آیا!

روزین - آپ کو اس حجام پر بھی اعتبار نہیں!

بارتھولو - اعتبار - نہیں مجھے تو کسی پہ اعتبار نہیں۔

روزین - یہ جواب آپ کے منہ سے؟

بارتھولو - عورت چیز ہی ایسی ہے۔

روزین - شرم نہیں آتی کہتے ہوئے۔ آپ کے خیال میں مجھ سی عورت فگارو حجام پر بھی گر پڑے گی۔

بارتھولو - ان عورتوں کی کچھ نہ پوچھو۔

روزین - اگر آپ کے گمان میں عورتیں بلا امتیاز ہر مرد پر جان دے سکتی ہیں تو میں آپ سے اتنی نفرت کیوں کرتی ہوں؟ کیا آپ حجام سے بھی گئے گزرے ہیں؟

بارتھولو - وجہ اس کی وجہ پھر کبھی پوچھ لینا، اس وقت یہ بتاؤ کہ وہ ملعون یہاں آیا بھی تھا یا نہیں؟

روزین - (غصے میں) کیوں نہ آتا آیا بھی۔ میں نے ملاقات بھی کی اور خوب باتیں بھی کیں۔ ہاں یہ بھی کہہ دوں کہ مجھے اس سے اُنس بھی ہے۔ اب تو کلیجہ ٹھنڈا ہو گیا۔ یا اب بھی نہیں۔ جائیے۔ زہر کھا لیجئے۔ ڈوب مریئے چلو بھر پانی میں۔ (باہر چلی جاتی ہے)

بارتھولو - (اکیلا رہ گیا ہے) مر گئے کمبخت۔ ارے ہوشیار۔ او جوان کہاں مر گئے سب کے سب۔ کیا سبھی جہنم رسید ہو گئے۔ (ہوشیار آتا ہے)

ہوشیار - (جمائی لیتا ہے۔ آنکھیں نیم وا سی ہیں) آہ - آہ - آہ -

بارتھولو - تو بھی کتنا بڑا بے وقوف ہے، بے وقوف جس وقت حجام یہاں آیا تو کہاں مر گیا تھا؟

ہوشیار - جناب میں! میں (جمائی لیتا ہے) آہ - آہ - آہ -

بارتھولو - کوئی نہ کوئی شرارت ایجاد کرنے گیا ہو گا - کہتا کیوں نہیں کہ تو نے بھی اس کو دیکھا ہے؟

ہوشیار - دیکھا کیوں نہیں صاحب! اُسی نے تو مجھے بتایا کہ میں بیمار سا نظر آ رہا ہوں۔ اس کا یہ کہنا تھا کہ میرے جوڑ بند میں درد

شروع ہو گیا ۔ اُف ۔ اُف ۔ آہ ۔

بارتھولو ۔ (نقل کرتا ہوا) آہ آہ اُف! میرے جوڑ بند میں درد ہے ۔۔۔ جانے جوان کہاں اونگھ رہا ہے؟ موذی نے اُس کو میرے نسخے کے بغیر ہی دوا پلا دی ۔ اس میں بھی کوئی نہ کوئی شرارت ضرور ہے

(جوان بوڑھوں کی طرح لاٹھی ٹیکتا نمودار ہوتا ہے اور آتے ہی چھیں چھیں آچھیں چھیں شروع کر دیتا ہے)

ہوشیار ۔ (جمائی لیتے ہوئے) جناب! لیجیے وہ آیا ۔

بارتھولو ۔ کمبخت! چھیں چھیں آچھیں چھیں ۔ میرا بھی دماغ خراب کر دیا ۔

جوان ۔ حجور آپ دو ہی دفعے میں گھبرا اٹھے ۔ آچھیں آ ۔ یہ چھیں پچاسویں آچھیں ۔ دفعہ ہے حجور! ایک منٹ میں پچاس دفعہ آچھیں ۔

اس آچھیں نے تو میرا ناک میں دم کر دیا سرکار ۔ چھیں چھیں چھیں آچھیں چھیں ۔

بارتھولو ۔ آچھیں ۔ چھیں کے بچو! یہ تو بتاؤ کہ کوئی روزین کے پاس بھی آیا تھا تمہارے سامنے ۔ تم لیتے ہو تہ کہ فگارو ۔۔۔۔۔۔

ہوشیار ۔ (جمائی لیتے ہوئے) تو آپ کے خیال میں فگارو انسانوں میں داخل نہیں ۔ شاید کوئی جانور ہوگا ۔ آہ ۔ آہ ۔

بارتھولو ۔ یہ پاجی بھی ان سے ملا ہوا ہے ۔

ہوشیار ۔ (پاگلوں کی طرح روتے ہوئے) ہیں میں ملا ہوا ہوں ۔ ہوں ہوں! میں ملا ہوا ہوں ۔

جوان ۔ (چھینکتے ہوئے) خدا کی قسم دنیا سے انصاف ہی اُٹھ گیا ۔

بارتھولو ۔ انصاف! کمبخت آقا میں ہوں یا تم؟ انصاف کا ذمہ دار ہوں یا تم جیسے نمک حرام نوکر؟

جوان ۔ (چھینکتے ہوئے) لیکن صداقت پھر بھی صداقت ہی ہے ۔

بارتھولو ۔ صداقت صداقت ہی ہے! جب میں کہتا ہوں کہ صداقت و داقت کوئی چیز نہیں تو بس سمجھ لے کہ واقعی کوئی چیز نہیں ۔ ان پاجیوں کی کسی بات کا مان لینا دراصل مالکانہ حقوق و اختیارات سے دست بردار ہو جانا ہے ۔

جوان ۔ (چھینکتے ہوئے) حجور! مجھے تو چھٹی ہی دے دیں ۔ اچھی نوکری ہے دن رات کا فضیحتہ ۔ چار پہر کی دانتا کل کل ہر وقت بک جھک! باز آیا میں ایسی نوکری سے ۔

ہوشیار ۔ ہم بھی شریف آدمی ہیں حجور! آپ ہی جیسے ۔ بچپن میں ماں باپ نے لاکھ کہا ۔ ہزار سمجھایا کہ پڑھ لکھ لے بیٹا آگے چل کر کام آئے گا ۔ لیکن کمبخت فتّو ۔ سجانی کے ساتھ کھیل میں ایسا خراب ہوا کہ تو بہ ہی بھلی ۔ خدا بہشت نصیب کرے ۔ ماں باپ کی نصیحت کو گرہ نہ باندھنے کا یہی انجام ہوا کرتا ہے ۔ نہیں تو میں بھی آج کسی دفتر میں کلرک یا منشی تو ہوتا ۔

بارتھولو ۔ جا دُور ہو شریف کے بچے (نقل کرتا ہے) چھیں چھیں، آچھیں چھیں ۔ ایک نے چھینک چھینک کر کان کے پردے پھاڑ ڈالے اور دوسرا منہ پھاڑے اس طرح گھور رہا ہے جیسے ہڑپ ہی کر جائے گا ۔

جوان ۔ میں قسمیہ کہتا ہوں کہ اگر اس گھر میں صاحب جادی نہ ہوتیں تو منٹ بھر کے لئے ٹکنا دشوار ہو جاتا ۔ (چھینکتا ہوا باہر نکل جاتا ہے)

بارتھولو ۔ یہ ساری شرارتیں اُسی موذی فگارو کی ہیں ۔ خوب سمجھتا ہوں ۔ چاہتا ہے کہ قرض بھی چک جائے اور ہاتھ سے دمڑی بھی نہ نکلے ۔

(ڈون بازیل داخل ہوتا ہے)

بارتھولو ۔ ڈون بازیل (فگارو کمرے میں چھپا ہوا ہے لیکن کبھی کبھی نکل کر دیکھتا بھی جاتا ہے)

بارتھولو ۔ اخاہ ڈون بازیل! آپ کو تو روزین کو سبق دینا ہے نا؟

ڈون بازیل ۔ اتنی جلدی بھی کیا ہے؟

بارتھولو ۔ میں تو آپ کے گھر گیا تھا لیکن آپ ملے ہی نہیں ۔

ڈون بازیل ۔ میں آپ ہی کے کام کو گیا ہوا تھا، ایک بُری خبر ملی ہے ۔

بارتھولو ۔ بری خبر! کس کے حق میں بُری؟

بازیل ۔ آپ کے حق میں اور کس کے ۔ کاؤنٹ المادیوا اِسی شہر میں موجود ہے ۔

بارتھولو ۔ ارے حضرت! ذرا آہستہ ۔ وہی المادیوا جو روزین کی تلاش میں ہے اور سارے میدرڈ میں سرگرداں ہے ۔

بازیل ۔ وہی ۔ وہی چوک میں رہتا ہے اور ہر صبح بھیس بدل کر باہر نکلتا ہے ۔

بارتھولو ۔ پھر تو بلاشک خبر بُری ہی ہے ۔ لیکن اب کرنا کیا چاہیئے؟

بازیل ۔ آدمی اگر کوئی ایسا ویسا ہوتا پھر تو کوئی بات ہی نہ تھی ۔

بارتھولو ۔ پھر یہی ہوتا نہ کہ ہتھیاروں سے لیس ہو کر رات کے وقت کہیں چھپ بیٹھتے ۔

بازیل ۔ اور جھگڑا مول لو ۔ اس کا علاج تو صرف ایک ہی ہے اور وہ

ہے تہمت بازی۔

بارتھولو۔ اچھا طریقہ بتایا پیچھا چھڑانے کا

بازیل۔ اجی! آپ کیا جانیں کہ یہ تہمت بازی کس بلا کا ہتھیار ہے۔ شریف سے شریف انسان بھی اس کے پھندے سے بچ کر نہیں نکل سکتا۔ میں عرض کروں۔ کوئی سی بات لے لیجئے کتنی ہی چھوٹی کتنی ہی معمولی اور کیسی ہی بے بنیاد کیوں نہ ہو۔ شہر کے لفنگوں اور بیکاروں کو ایک دفعہ سنا دینے کی دیر ہے، پھر دیکھئے تماشہ! سارے شہر میں ایک اُودھم سی نہ مچ جائے تو جو سزا چور کی وہی میری۔ آپ کے شہر میں ایسے اٹھائی گیروں اور بھاڑے کے ٹٹوؤں کی کچھ کمی نہیں۔ ہاں! پہلے پہل معمولی سی چہ میگوئیاں ضرور ہوں گی۔ لیکن یہ بھی یاد رکھئے! شرارت کا بیج ضائع نہیں جاتا۔ چند ہی روز میں دیکھتے دیکھتے ایک اچھے خاصے تناور درخت کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اس قسم کی باتیں آندھی کی طرح پھیلتی ہیں۔ ایک دفعہ زبان زد ہو جائے۔ پھر تو ساری دنیا اگر متفقہ طاقت سے بھی کام لے تو بھی اس کا زہریلا اثر ضائع نہیں ہو سکتا۔ کمان سے چھوٹا ہوا تیر اور زبان سے نکلی ہوئی باتیں بھی واپس آئی ہیں۔

بارتھولو۔ جانے بھی دے یاران لغویات کو، کوئی مطلب کی بات کر! تو نے تو اچھا خاصا لیکچر ہی دے ڈالا۔

بازیل۔ سنئے جناب عالی مجھ سے۔ دشمن پر فتح پانے کا اگر کوئی مؤثر طریقہ ہے تو یہی آپ جس دنیا میں رہتے ہیں۔ اس کی تقلید کئے بغیر دوسرا کوئی چارہ نہیں۔ آپ اگر کامیابی کے طلبگار ہیں تو آپ کو بھی یقیناً وہی کرنا پڑے گا جو دنیا کرتی چلی آئی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ سونے کی چڑیا تو ہاتھوں سے نکل جائے اور آپ منہ ہی دیکھتے رہ جائیں۔

بارتھولو۔ دوست! اگر مجھ سے پوچھتے ہو تو میری خواہش تو یہ ہے کہ شادی کل ہی انجام پا جائے۔ اور انجام بھی پائے کچھ یوں چپ چاپ کہ اس کو یہ پتہ بھی نہ چل سکے کہ کاؤنٹ ہے کون اور کہاں!

بازیل۔ میری رائے بھی یہی ہے۔ لیکن وقت بڑا ہی قیمتی ہے اس کا ایک لحظہ بھی ضائع نہ ہونا چاہیئے۔

بارتھولو۔ تو کاؤنٹ ہے کس انتظار میں؟ میں نے تو تم سے کہا تھا کہ اب کے آنا تو پوری خبر کے ساتھ۔

بازیل۔ کہا تو تھا آپ نے لیکن پیسہ تو آپ ہاتھ سے نکلنے ہی نہیں دیتے۔ کام ہو تو کیسے؟ ــــ آپ ذرا خیال تو کریں۔ بڑھاپے کی شادی۔ بے جوڑ، بے محل۔ بالکل خلاف عقل و انصاف! آخر ان ساری باتوں پر پردہ ڈالنے کے لئے روپیہ پیسہ کے علاوہ کوئی اور جادو بھی کام کر سکتا ہے؟

بارتھولو۔ (روپیہ دیتے ہوئے) اچھا میں ہارا لو یہ رہی تمہاری جادو کی پڑیا۔

بازیل۔ یہی بات اگر پہلے کی ہوتی تو اب تک سب کام لیس ہو چکا ہوتا۔ خیر دیر آید درست آید۔ اب بھی کچھ نہیں گیا۔ سب کام کل ہی ٹھیک کئے دیتا ہوں۔ ہاں یہ خیال ضرور ہے کہ کوئی اس کو شادی سے پہلے آج ہی بہکا نہ دے۔

بارتھولو۔ ذمہ میرا۔ شام تک آ رہے گے نہ؟

بازیل۔ میرا انتظار آپ بالکل نہ کریں۔ سارا دن تو انتظام ہی کے جھگڑوں میں لگ جائے گا۔ بھلا آؤں گا تو کب اور کیسے؟

بارتھولو۔ (رخصت کرتے ہوئے) دیکھو بازیل میں تمہارا غلام ہوا۔ بندہ بے دام۔

بازیل۔ جناب والا۔ آپ گھبرائیں نہیں۔ میری طرف سے آپ بالکل مطمئن رہیں۔ اب آپ زحمت نہ فرمائیں، جائیں آرام کریں

بارتھولو۔ چند قدم اور سہی۔ میرے لئے یہ زحمت نہیں بلکہ عین رحمت ہے۔ ہاں سڑک والا دروازہ بھی تو بند کرنا ہے۔

(۹)

فگارو۔ (کمرے سے نکلتے ہوئے دل میں) کر لیجئے دروازہ بند۔ میں باہر جاتے ہی ابھی کھول دیتا ہوں کاؤنٹ کے لئے۔ یہ بازیل بھی بس ایک ہی حرامی ہے۔ مکار۔ لیکن غنیمت یہ ہے کہ مکار سے زیادہ احمق واقع ہوا ہے۔ گدھے کو اتنی سمجھ تو ہے نہیں کہ کسی پر الزام لگانا یا تہمت دھرنا کوئی آسان کام نہیں۔ اس کے لئے موقع و محل چاہیئے۔ ذرائع و وسائل چاہیئیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ تہمت ایسی تراشی جائے کہ سننے والے سن کر یقین بھی کر لیں۔ بھلا بازیل سے کندۂ ناتراش کی باتوں پر کوئی کان ہی کیوں دھرنے لگا، لیکن کمبخت کسی کی بات کہاں ماننے لگا۔ کیسے گا اور اس کے ساتھ ہی ساتھ منہ کی بھی بُری طرح کھائے گا۔

(۱۰)

(روزین اور فگارو)

روزین۔ (جلدی سے قریب پہنچکر) ابھی تک تم یہیں ہو فگارو!

فگارو۔ اس کو بھی آپ اپنی خوش قسمتی ہی سمجھئے بیگم صاحبہ! آپ کے اتالیق اور آپ کے ماسٹر صاحب دونوں ابھی ابھی باتیں کر رہے

تھے۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ یہاں ان دو کے سوا تیسرا آدمی کوئی بھی . . . .
نہیں۔

روزین ۔ اچھا! تو پھر تو ان کی ساری باتیں تم نے بھی سُنی ہوں گی۔ لیکن یہ بات تو اچھی نہیں

وگارو ۔ بات بات میں بھی فرق ہوتا ہے بیگم صاحبہ! اگر کسی بات کے سننے ہی میں فائدہ ہو تو پھر کیوں نہ سنی جائے؟ خبر بھی ہے کچھ آپ کو۔ آپ کے زبردست سرپرست صاحب آپ کے ساتھ شادی رچانا چاہتے ہیں۔ اور شادی بھی کل ہی۔

روزین ۔ میرے اللہ!

وگارو ۔ آپ گھبرائیں بالکل نہیں۔ چچا کو کچھ ایسی بُری طرح اُلجھاتا ہوں کہ شادی تو رہی الگ۔ شادی کا خواب دیکھنا بھی بھول بیٹھیں۔

روزین ۔ یہ قدم کی چاپ کیسی ہے! لیکن وہ دیکھو۔ شاید کوئی اندر آ رہا ہے۔ جاؤ جاؤ پچھلی سیڑھیوں سے جلد سے جلد چپکے سے نکل جاؤ۔ میرے تو ڈر کے مارے اوسان خطا ہوئے جاتے ہیں۔

(۱۱)

بارتھالو ——— روزین

روزین ۔ آپ باتیں کس سے کر رہے تھے؟

بارتھولو ۔ ڈون بازیل سے۔ تم تو دل میں دعائیں مانگتی ہو گی کہ کاش بازیل کی جگہ فگارو ہی ہوتا۔

روزین ۔ اس سے مجھے کیا؟ میری بلا سے کوئی بھی ہو، موا بازیل ہو یا نگوڑا فگارو۔

بارتھولو ۔ لیکن میں حیران ہوں کہ اس حجام کو اتنا ضروری کام تم سے کیا ہو سکتا ہے۔

روزین ۔ اب تو ساری بات ہی کہنی پڑے گی، وہ مجھ سے مارسلین کی حالت کہنے آیا تھا۔ بیچاری ابھی تک ویسی ہی پڑی ہے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو اب تک افاقہ نہیں ہوا۔

بارتھولو ۔ مارسلین کی حالت تمہیں بتانے آیا تھا۔ اجی! صاف یہی کیوں نہیں کہہ دیتیں کہ اُسے کسی کا پیام شوق دینا تھا۔

روزین ۔ کسی کا پیام شوق۔ یہ بھی ایک ہی رہی۔ ذرا یہ بھی تو فرمائیے کس کا!

بارتھولو ۔ کس کا! کسی ایسے شخص کا جس کا نام عورتیں بھول کر بھی لینے کے لئے تیار نہیں ہوتیں۔ پھر ممکن ہے تمہارے کاغذ ہی کا جواب باصواب ہو۔

روزین ۔ (دل میں) توبہ! کوئی ایسی چیز بھی ہے جس کا اس موئے کو پتہ نہ چل جاتا ہو۔ (بلند آواز میں) آپ ہیں بھی اسی لائق۔

بارتھولو ۔ (روزین کی انگلیاں دیکھتے ہوئے) ابھی ابھی یہ تم لکھ کیا رہی تھیں!

روزین ۔ (حیران ہو کر) اچھا تو اب آپ مجھ سے خط کا اقرار ہی کرانا چاہتے ہیں؟ کیوں! ہے نہ یہی مطلب؟ آپ کو بھی جب سوجھتی ہے دور ہی کی سوجھتی ہے۔

بارتھولو ۔ تو کیا غلط سوجھتی ہے۔ اگر میں مذاق کر رہا ہوں تو تمہارے دائیں ہاتھ کی انگلیوں پر ابھی تک سیاہی کے دھبے کیسے ہیں۔ بنتی ہو نہ بیگم!

روزین ۔ (دل میں) تجھ پر خدا کی مار۔

بارتھولو ۔ (ہاتھ کو بدستور پکڑے ہوئے) ان عورتوں کو اگر تھوڑی دیر کے لئے بھی تنہا چھوڑ دیا جائے۔ تو بس فوراً یہی سمجھ لیتی ہیں۔ گویا آزادی کا دائمی پروانہ ہاتھ آ گیا۔ شاید ان کی فطرت ہی کچھ اس قسم کی واقع ہوئی ہے۔

روزین ۔ واہ کیا کہنے ہیں آپ کے۔ خط لکھنے کا یہ اچھا ثبوت پیش کیا۔ چھوڑئیے بھی میرا ہاتھ۔ آپ نے تو بالکل توڑ مروڑ ہی کے رکھ دیا۔ اوئی میرے اللہ! چھوڑیئے گا بھی۔ موم بتی کے نیچے کام کر رہی تھی، انگلیاں جل گئیں۔ میں نے سُنا تھا کہ ایسے موقعے پر انگلیوں پر سیاہی لگا لینے سے چھالے نہیں پڑتے۔ میں نے بھی انگلیوں میں سیاہی لگا لی۔

بارتھولو ۔ کیا کہنے اس بھولے پن کے۔ لیکن میں اگر کوئی اور ثبوت دیدوں تو پھر؟ دیکھوں اس کاپی میں مجھے یقین ہے آج صبح چھ ورق تھے۔ میں روز گنتا رہتا ہوں۔ آج بھی شمار کیا تھا۔

روزین ۔ (دل میں) کمبخت (دبی زبان سے) چھٹا صفحہ . . . . .

بارتھولو ۔ (گنتا ہے) تین۔ چار پانچ ٹھیک تو ہے۔ چھٹا تو نادر ہے گیا کہاں؟ —

روزین ۔ (آنکھیں نیچی کر کے) چھٹا صفحہ! وہ تو میں نے ابھی ابھی پھاڑا تھا۔ فگارو کے لڑکے کے لئے تھوڑی سی مٹھائی بھیجنی تھی۔

بارتھولو ۔ آپ کو فگارو کے لڑکے کے لئے مٹھائی بھیجنی تھی۔ چلو اس کو بھی مانا! لیکن ہولڈر میں نب! یہ تو بالکل نیا تھا۔ اس کو سیاہی کیونکر لگ گئی۔ میں ہی بھولا شاید فگارو کا پتہ لکھنے لگی ہوں گی۔

روزین ۔ (ذرا دور ہٹ کر) یہ شخص شاید ماں کے پیٹ ہی سے شکی پیدا ہوا ہے۔ (بلند آواز سے) قلم سے میں نے جاکٹ پہ پھول بنایا تھا۔ لیجئے دیکھئے آپ ہی کی جاکٹ ہے یا کسی اور کی؟

بارتھولو ۔ شکریہ! بڑی تکلیف کی تم نے میرے لئے۔ لیکن یہ بات اب تک سمجھ میں نہ آئی کہ باتیں کرتے ہوئے تمہارا چہرہ رنگ کیوں بدل

رہا ہے؟ اس لئے تو نہیں کہ ایک جھوٹ کو چھپانے کے لئے تمہیں دوسرے جھوٹ کی آڑ لینی پڑتی ہے۔ لیکن ہاں چہرے کی رنگت کی تمہیں کیا خبر؟

روزین - جناب! جس معصوم پر تہمتوں کا اتنا بھاری بار رکھ دیا جائے اس کے چہرے کا رنگ بھی نہ بدلے کیا ستم ہے کتنا بڑا ظلم ہے؟

بارتھولو - ٹھیک ہے غلطی میری ہی ہے۔ انگلیوں کا جل جانا۔ سیاہی کا لگ جانا۔ مٹھائی کا بھیجا جانا۔ جاکٹ کے بیل بوٹے بنانا جن کی معصومیت کی صفائی میں آپ نے شاید موجود ہوں اس پر شک کرنا ظلم نہیں تو اور کیا ہے۔ لیکن ایک معمولی سمجھ والا انسان تو یہی کہے گا کہ تم اکیلی تھیں، خیال آگیا ہوگا کہ کوئی دیکھنے والا تو موجود ہی نہیں۔ چوری میں آئے کرتی جاؤں۔ لیکن بیگم صاحبہ! یہ کالی انگلیاں تب پر سیاہی کی موجودگی اور چھوٹے صفحے کا کہیں پہنچ جانا آخر کسی بات کی گواہیاں یہ بھی تو دے ہی رہے ہیں۔ خیر۔ گذشتہ را صلوٰۃ آئندہ را احتیاط۔ اچھا بیگم صاحبہ! اب کی دفعہ جب شہر جانے لگوں گا باہر سے ایسا زبردست تالا لگا جاؤں گا۔ کہ آئندہ آپ کو اس قسم کی زحمت کی نوبت ہی نہ آئے۔

(۱۲)

(کاؤنٹ داخل ہوتا ہے اور رسالدار کی وردی میں شرابیوں کی طرح جھوم جھوم کے گا رہا ہے)

غزل

جگا دو مری دلربا کو جگا دو ÷ جگا دو - جگا دو - جگا دو - جگا دو
اس الو کے پٹھے کے سینے پہ چڑھ کر ÷ سنگھا دو سنگھا دو۔ سنگھا دو سنگھا دو

بارتھولو - ہیں؟ - سپاہی! یہاں سپاہی کا کیا کام۔ جاؤ۔ روزین تم اندر چلی جاؤ۔

کاؤنٹ - (بدستور گا رہا ہے۔ جگا دو مری الخ اور روزین کی طرف رُخ کرتا ہے)

بیگمات! آپ دونوں میں سے کس کا نام ہے ڈاک... ٹر۔ بار... لوڈ۔ ڈو؟ (آہستہ سے) میں لنڈورا ہوں۔

بارتھولو - بارتھولو؟

روزین - (دبی آواز میں) ہیں لنڈورا!

کاؤنٹ - بار... لوڈ... ڈو۔ جا بھاڑ میں۔ میں تیری کیا پروا کرتا ہوں، میرا مطلب تو صرف یہ ہے کہ تم دونوں میں سے.... (روزین سے) یہ خط لو!

بارتھولو - ہم دونوں میں سے؟ - دیکھتا نہیں کہ میں بارتھولو ہوں۔ جاؤ بھی روزین اندر۔ سچ بھی ہے معلوم ہوتا ہے اس شخص نے پی

رکھی ہے۔

روزین - میں ہوں بھی تو یہاں اسی لئے کہ آپ اکیلے ہیں۔ ایسے موقع پر عورتوں کی موجودگی مفید ثابت ہوتی ہے۔

بارتھولو - جاؤ بھی تم اندر جاؤ۔ شاید تم مجھے ڈرپوک سمجھتی ہو۔

(روزین چلی جاتی ہے)

کاؤنٹ - میں نے تمہیں تمہارے حلیہ ہی سے پہچان لیا۔

بارتھولو - (کاؤنٹ سے جو کاغذ کو جیب میں چھپانے کی کوشش کر رہا ہے۔) یہ تم جیب میں کیا چھپا رہے ہو؟

کاؤنٹ - جیب میں؟ احمق! چھپا بھی تو اسی لئے رہا ہوں کہ تمہیں معلوم نہ ہو جائے۔

بارتھولو - یہ فوجی سپاہی بھی کتنے بداخلاق واقع ہوئے ہیں۔ تہذیب سے تو انہیں دور کا بھی واسطہ نہیں۔ باتیں خواہ کسی سے کریں لیکن سمجھتے یہی ہیں کہ گفتگو کسی سپاہی ہی سے کر رہے ہیں۔

کاؤنٹ - کیا کہنے تیرے! تو ہی تو یہاں کا نواب ہے۔ کہاں گیا تیرا حلیہ؟ (کاغذ پڑھنے لگتا ہے) ؎

بھینسے جیسا موٹا تازہ قد بونوں سا نٹ کھٹ ہے
پیٹ مٹکا۔ لٹکا لٹکا سوجھ بوجھ کا چوپٹ ہے
گیندیں جیسے گال پچکے ناک نمونہ قدرت کا
گنجا نطفہ کا پورا عقل کا اندھا نیلا گرگٹ ہے

بارتھولو - کندۂ ناتراش! ناخواندہ مہمانی کا کیا یہی صلہ ہے؟ میری توہین اور خود میرے ہی گھر میں۔ جاؤ ابھی ابھی نکل جاؤ۔ ورنہ...

کاؤنٹ - چلا جاؤں۔ یار جا بھی کیسی جہالت کی باتیں کرتا ہے۔ ڈا - ک ٹر گر ٹر دلو۔ دوست یہ تو بتا کہ تو کچھ لکھا پڑھا بھی ہے یا نرا ڈاکٹر ہی ہے۔

بارتھولو - استغفر اللہ! کیا مہمل سوال ہے۔

کاؤنٹ - گھبراتا کیوں ہے تو۔ تیرا جیسا ڈاکٹر تو خدا رکھے میں خود بھی ہوں۔

بارتھولو - وہ کیسے؟

کاؤنٹ - اچھا تو تجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ میں فوجی گھوڑا اسپتال کا ڈاکٹر ہوں۔ اسی لئے تو مجھے سرکاری حکم ملا ہے کہ آج کی رات اپنے ہم پیشہ ہی کے گھر میں قیام کروں۔

بارتھولو - ابے خر ناشخص! مجھ سے ایک نعلچی کا مقابلہ کرتا ہے تو!

کاؤنٹ - اور نہیں تو کیا تیری شان میں ہی تو کسی شاعر نے کہا ہے ؎

مرگھٹ میں پہنچانے والے موت کے ٹھیکیدار کو دیکھو ÷ شانِ الٰہی مرے یا بچ کر گھوڑوں کو بیمار کو دیکھو

گولی اُتری حلق کے نیچے دم بیمار کا باہر نکلا
دنیا کی خدمت کا دعویٰ خلق کے خدمتگار کو دیکھو
بچے کوئی یا بھاڑ میں جائے فیس میں لیکن کمی نہ آئے
بھری رہتی ہیں جیبیں ہر دم کیسا ہے بیوپار کو دیکھو
خاک سے دھول سے گھاس کے رس سے دام کھرے کر لیتے ہیں یہ
چار پہر رکھتے ہیں چالو چال سے ۔ کاروبار کو دیکھو

دوست ۔ شاید یہ شعر پسند نہیں آئے ۔

بارکھولو ۔ تجھ سے احمق لہار سے اور امید بھی کیا ہو سکتی ہے ۔ دشمن عقل! تجھے کچھ معلوم بھی ہے ۔ ڈاکٹر کا پیشہ سب پیشوں میں شریف اور وہ مفید ترین پیشہ ہے جس کے ساتھ خدا کے بندوں کی حیات و موت وابستہ ہے ۔ اس سے بڑا ثبوت اس پیشہ کی شرافت کا اور کیا ہو سکتا ہے)

کاؤنٹ ۔ بیشک فائدہ مند ۔ خاص کر ان کے لئے جو ڈاکٹر ہوں ۔

بارکھولو ۔ اس پیشہ پر خدا کی رحمت آفتاب بن کر چمکتی ہے ۔

کاؤنٹ ۔ اور تمہاری غلطیاں! اُن پر پردہ تو زمین ڈال دیا کرتی ہے نا!

بارکھولو ۔ تیری حماقت آمیز باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ ساری عمر تو صرف گھوڑوں ہی سے بولتا رہا ہے ۔

کاؤنٹ ۔ چہ خوش! میں تو خیر گھوڑوں سے بولتا رہا ہوں اور تیری زندگی شاید گدھوں کے ساتھ کٹی ہے ۔ ضرب المثل تو یہ ہے کہ گھوڑوں کے ڈاکٹر اپنے مریضوں کو چنگی بجاتے ٹھیک ٹھاک کر لیتے ہیں ۔ رہے تیرے جیسے ڈاکٹر وہ باتیں تو خوب بناتے ہیں ۔ باقی اللہ اللہ خیر سلا ۔

بارکھولو ۔ یعنی ان کے مریض اللہ نگر جا پہنچتے ہیں؟

کاؤنٹ ۔ حق بر زبان جاری ۔ یہ تو تم خود ہی کہہ رہے ۔

بارکھولو ۔ یہ بدمست شرابی تو ابلیس کا کوئی خاص ایلچی معلوم ہوتا ہے ۔

کاؤنٹ ۔ معلوم ہوتا ہے کہ تو لطف و شفقت کے جتنے الفاظ میرے حق میں استعمال کر رہا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

بارکھولو ۔ چاہتا کیا ہے؟ زبان دراز! اپنا مطلب بیان کر تو چاہتا کیا ہے

کاؤنٹ ۔ (نمائشی غصے میں) چاہتا کیا ہوں ۔ بتاؤں کیا چاہتا ہوں ۔ دیکھتا نہیں؟

(روزین داخل ہوتی ہے)

روزین (کاؤنٹ کی طرف دوڑتی ہے) رسالدار صاحب! ذرا ٹھہر جائیے ۔ خدا کے لئے ناراض نہ ہوجئے ۔ (بارکھولو سے) ذرا شیریں زبانی سے کام لیجئے ۔ ایک آدمی کا دماغ پھرا ہوا ہو تو ۔ ۔

کاؤنٹ ۔ ٹھیک کہا تم نے بالکل ٹھیک ۔ اس کا دماغ پھرا ہوا معلوم ہوتا ہے ۔ اور ہم دونوں بڑے ہی سمجھدار ہیں ۔ میں شیریں زبان اور تم ۔ ۔ ۔ خوبصورت ۔ ع

یہ اللہ ملائی جوڑی ۔ خوب ہے

اور حقیقت تو یہ ہے کہ سوا تمہارے میں کسی سے کوئی واسطہ ہی نہیں رکھنا چاہتا ۔

روزین ۔ فرمائیے! ارشاد! بندی حاضر ہے ۔

کاؤنٹ ۔ کچھ نہیں ۔ یوں ہی ادھر آگیا ہوں ۔ میرا مطلب ۔ ۔ ۔ ۔

روزین ۔ (بات کاٹ کر) اجی! مطلب تو میں سمجھ ہی لوں گی ۔

کاؤنٹ ۔ (خط دکھاتا ہے) اچھا تو تم اس خط کا مفہوم بھی سمجھ لوگی؟ لیکن مجھے تو صرف یہ پوچھنا ہے کہ آپ آج رات میرے قیام کا انتظام بھی کر دیں گے ۔

بارکھولو ۔ صرف سونے ہی کا نا؟

کاؤنٹ ۔ بس یہی اور کیا؟ لیجئے ہمارے افسر نے آپ کو ایک نامۂ عشق بھی لکھا ہے ۔ لگے ہاتھوں اس کو بھی پڑھ لیجئے ۔

بارکھولو ۔ دیکھوں ۔ (کاؤنٹ دوسرا خط دے دیتا ہے ۔ بارکھولو پڑھنے لگتا ہے) ڈاکٹر بارکھولو کے نام حکم صادر کیا جاتا ہے ۔ کہ وہ آج کی شب رسالدار لندور عرف طالب العلم کو بحیثیت ایک مہمان کے اپنے گھر رکھے ۔ کھانے پینے کی ضروریات مہیا کرے اور ایک رات کے لئے قیام کا انتظام بھی کر دے ۔

کاؤنٹ ۔ کہا نہ تھا کہ ایک رات کا انتظام کر دے

بارکھولو ۔ صرف ایک رات کا ہی نہ؟ (بلند آواز سے) کیا بات ہے!

کاؤنٹ ۔ فرمائیے اب ڈاکٹر بارلوڈو! بار برو

بارکھولو ۔ اس کمبخت کو میرا نام بگاڑنے میں خدا جانے کیا مزا ملتا ہے ۔ جا جہنم رسید ہو ۔ باربرو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بارب الو کے بچے ۔ جا اور کہہ دے جاکر اپنے خر دماغ افسر سے کہ جس روز سے میں میڈرڈ سے واپس آیا ہوں ۔ مجھ پر ایسے حکموں کی تعمیل کی ذمہ داری قطعاً عاید نہیں ہوتی ۔

کاؤنٹ ۔ (الگ ہو کر) یہ تو بُری سنائی ۔

بارکھولو ۔ خوب بہت خوب! شاید ناگوار گزری جناب کو یہ بات ۔ نشہ کا خمار بھی اب کچھ کچھ اترتا نظر آتا ہے ۔ لیکن اتنی سی بات سن کر کہیں آپ گدھے کے سینگ ہونے کا ثبوت نہ دیں ۔

کاؤنٹ ۔ (معلوم ہوتا ہے اس کو کچھ شبہ سا ہوگیا) کیا کہا گدھے کے سر کے سینگ ۔ ابے بھاگ تو ۔ میں اب کسی کے نکالے

نکلتا ہوں - خیر تجھ پر اگر اس حکم کی تعمیل کی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی تو کیا انسانیت کی ذمہ داریاں بھی عائد نہیں ہوتیں؟ لیکن تیرا وہ پروانہ کہاں ہے؟ جس میں مجھے ان ذمہ داریوں سے بری قرار دیا گیا ہے؟ لکھا پڑھا تو میں ہوں نہیں - لیکن پروانے کو دیکھ کر مطلب کا پتہ تو لگا ہی لوں گا - دیکھا - کہاں ہے؟

بارتھولو - دیکھ لے وہ رہا میز پر! (خود اٹھانے کے لئے بڑھتا ہے)

کاؤنٹ - (جب بارتھولو میز کی طرف بڑھتا ہے تو کاؤنٹ آہستہ سے کہتا ہے) پیاری روزین!

روزین - (اشارے سے) لنڈور! تم یہاں؟

کاؤنٹ - (اشارے سے) لو یہ خط تو لے لو -

روزین - (آہستہ سے) ہوا کیسا بری طرح گھور رہا ہے -

کاؤنٹ (آہستہ) اپنا رومال نکال لو - موقع پا کر خط کو اسی میں ڈال دونگا -

بارتھولو - رسالدار صاحب! ذرا ٹھہرئیے - میری بیگم کے قریب آنے کی زحمت نہ کیجئے - یہ بات مجھے قطعاً پسند نہیں -

کاؤنٹ - یہ تیری بیوی ہے؟

بارتھولو - جی! اس میں کوئی شک؟

کاؤنٹ - میں تو سمجھا تھا کہ تو ان کا پرنانا ہے یا پڑدادا - دونوں میں سے کوئی ایک بات تو ضرور ہوگی - کیونکہ تم دونوں کی عمر میں کم سے کم تین پشتوں کا فرق تو ضرور ہے -

بارتھولو - (ایک پرچہ پڑھتا ہے) باقاعدہ اور قابلِ اعتبار ثبوت کی بنا پر حکم دیا جاتا ہے -

کاؤنٹ - (ہاتھ مار کر کاغذ گرا دیتا ہے) مجھے اس لفاظی سے کیا سروکار -

بارتھولو - شاید رسالدار صاحب آپ کو معلوم نہیں کہ میں اپنے ملازموں کو بلا کر آپ کی خاطر خواہ تواضع بھی کرا سکتا ہوں -

کاؤنٹ - اچھا تو جنگ چھیڑنا چاہتا ہے اور میں بھی تو یہی چاہتا ہوں - یہ دیکھ! (پستول دکھاتا ہے ۔ ۔ ۔ پھر روزین سے مخاطب ہو کر) بیگم صاحبہ لڑائی کا تماشہ کبھی آپ نے بھی دیکھا ہے؟

روزین - خدا نہ دکھائے - میں دیکھنا بھی نہیں چاہتی -

کاؤنٹ - لیکن لڑائی ہے تو بڑے مزے کی چیز - آپ تصور فرمالیں - (بارتھولو کو دھکا دیتا ہے) کہ دشمن کھائی کی دوسری طرف ہے اور دوست اس طرف (روزین کو خط دکھا کر) رومال نکالئے جلدی (زمین پر تھوکتا ہے) یہ رہی آپ کی کھائی سمجھیں؟ ———

(روزین رومال نکالتی ہے - کاؤنٹ اس میں خط گرا دیتا ہے)

بارتھولو - (جھک کر) اچھا! اچھا!

کاؤنٹ - (خط اٹھا کر کہتا ہے) لے میں تو تجھے اپنے پیشے کا راز ہی بتانے لگا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دیکھیں شاید کوئی خط آپ کے ہاتھوں سے گرا ہے -

بارتھولو - دیکھوں -

کاؤنٹ - ابے تو کیوں اپنی ٹانگ اڑاتا ہے - دوسروں کے جھگڑوں سے تجھے کیا کام - تیری جیب سے اگر چہ شاندے دشاندے کا کوئی عبرانی نسخہ گر پڑا ہوتا تو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

روزین - (ہاتھ بڑھاتی ہے) اوہو - اب سمجھی رسالدار صاحب (خط اٹھا کر اپنے جامہ پوش میں چھپا لیتی ہے -

بارتھولو - نکلتا بھی ہے یا نہیں!

کاؤنٹ - بہت خوب - لو تو پھر میں چلا - خدا حافظ ڈاکٹر صاحب - گستاخیاں معاف! میری جان میرے حق میں بس ایک ہی دعا کرو کہ فرشتۂ اجل کچھ دنوں کے لئے مجھے رخصت دے دے - بخدا یہ زندگی مجھے اتنی عزیز کبھی نہ تھی جتنی پیاری اب ہے -

بارتھولو - جا دفع بھی ہو - اجل پر اگر میرا بس ہوتا تو تجھ کو کل ہی گرفتار کرا دیتا - اور تو منہ لپیٹ کر ایسا جاتا کہ ادھر کا پھر رُخ بھی نہ کرتا -

کاؤنٹ - اجل پر کیوں نہیں - کیا موت کی ٹھیکیداری چھوڑ بیٹھے ہو ڈاکٹر؟ افسوس ہوا مجھے -

(چلا جاتا ہے)

وصیّت

ایک پتی برتا اپنے شوہر کی جدائی میں گھُل گھُل کر مر رہی ہے۔ اُس کی سکھی اس حالت میں اُس سے چند سوال پوچھتی ہے - اور وہ جواب دیتی ہے۔

اگر وہ لوٹ کر آئیں سکھی ۔ میں کیا کہوں اُن سے ؟

یہی بس یاد میں ان کی ۔ کٹے ہیں آخری لمحے !

اگر مجھ کو نہ پہچانا تو پھر کیسے ملوں اُن سے ؟

بہن بن کر بڑی نرمی سے سُن لینا سوال اُن کے
کہیں ایسا نہ ہو اُن کو زمانے نے پچھاڑا ہو
تری باتوں سے شاید ان کو تھوڑا سا سہارا ہو

جو وہ پوچھیں تمہارا نام لے کر کیا کہوں اُن سے ؟

مری پیاری ! لبوں پر مُہر خاموشی لگا لینا
اُٹھیں سینے سے جو آہیں ذرا اُن کو دبا دینا
اگر آنکھوں میں آنسو آئیں تو اُن سے چھپا لینا
زمیں پر گاڑ کر نظریں یہ چھلا اُن کو دے دینا

اگر پوچھا انہوں نے یہ محل ویران سا کیوں ہے ؟
یہ ایوانِ مصفّا آج گورستان سا کیوں ہے ؟

انہیں پہلے دکھانا شمع وہ جو بجھ گئی جل کر
بتانا پھر یہ دروازہ کھلا رہتا تھا جو شب بھر
مری پیاری ! سمجھ جائیں گے پھر وہ رازِ ویرانی
انہیں معلوم ہو جائیں گے اسبابِ پریشانی

جو پوچھیں نیند کیسے آئی تھی تیری سہیلی کو ؟

تو کہنا آج تک سمجھی نہیں میں اس پہیلی کو
وہ اک دن لیٹے لیٹے مسکرانے پر اُتر آئی
ابد کی نیند آخر سو گئی پھر لے کے انگڑائی

مری پیاری سہیلی ! دیکھنا ! وہ ہوں نہ آزردہ
جو وہ آنسو بہائیں گے مرا دل ہوگا افسردہ

(خیال انگریزی نظم سے لیا گیا ہے)

آفتاب بیدار بخت

جناب حرماں خیرآبادی

حکیم آزاد انصاری مرحوم

ذیل کا مضمون افسوس ہے کہ دفتر کے کاغذات میں مخلوط ہو کر ایک مدت تک گم رہا اور باوجود تلاش دستیاب نہ ہو سکا - اب اتفاق سے مل گیا ہے ـــــ اس لئے معذرت کے ساتھ شائع کیا جاتا ہے - (ادارہ)

ابھی ابھی حضرت فانی بدایونی مرحوم کے سوگوارانہ حادثۂ ارتحال سے دوچار ہونا پڑا تھا کہ ایک اور عظیم ترین حادثۂ جانکاہ پیش آیا - یعنی دنیائے شعر و ادب کے ایک زبردست استاد، علم عروض کے ایک بے مثل ماہر اور فارسی و عربی پر ایک کامل قدرت رکھنے والے کی زندگی سے ہاتھ دھونا پڑا - میری مراد ہے حضرت حکیم الطاف احمد صاحب آزاد انصاری سہارنپوری سے! جو ان خصوصیات کے ہوتے ہوئے میرے بڑے گہرے دوست بھی تھے -

آزاد صاحب کی علمی و ادبی قابلیت سے شاید ہی ہندوستان کا کوئی ذی علم یا ادب دوست انسان ناواقف ہو، کیونکہ مرحوم نے اپنی ۷۵ سالہ عمر میں نہیں معلوم کتنے مشاعرے دیکھے اور نہ جانے کتنے ادبی جلسوں کے ہنگاموں میں حصہ لیا - اس کے علاوہ ہندوستان کے وقیع ادبی ماہناموں میں بھی اکثر ایک جداگانہ خصوصیت کے ساتھ جلوہ گر نظر آتے تھے -

اور اب چند سال ہوئے، کہ مرحوم کا مجموعۂ کلام بھی "معارف جمیل" کے نام سے شائع ہو کر شائقین کے ہاتھوں میں پہنچ چکا ہے - دوسرے مجموعے کے متعلق بلے چارے کوشاں تھے، معلوم نہیں کہ اُسے کس نوبت پر چھوڑ گئے - اس مجموعے کا نام غالباً "معارف جلیل" تجویز کیا تھا - اور اس میں زیادہ تر قومی اور اصلاحی نظمیں شامل ہیں - معارف جمیل میں غزلیں، رومانی نظمیں اور چند رباعیات خیام کے تراجم بھی موجود ہیں -

آزاد صاحب کی شاعری کی نسبت میری رائے یہ ہے، کہ موصوف پچھلے زمانے کے شاعر بھی تھے، اور عہد حاضر کے بھی! آزاد صاحب میں جدید و قدیم دونوں طرح کا امتزاج پایا جاتا تھا - فرق یہ ہے، کہ ان کے پچھلے کلام میں خیالات کی قدامت، مضامین کی فرسودگی و کہنگی کی بہتات ہے، اور جب عہد موجودہ سے متاثر ہو کر لکھا ہے، تو اس میں زندگی کی ایک تڑپ اور تخئیل میں ایک اچھوتا پن جا بجا پایا جاتا ہے - آزاد صاحب کی خصوصیات شاعری میں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ موصوف کے کلام میں الفاظ کی تکرار، بندش کی چستی، زبان کی روانی، اور بعض موقعوں پر ثقیل سے ثقیل الفاظ کی گھلاوٹ اپنی آپ مثال ہیں۔

اس کے علاوہ آزاد صاحب کے کلام میں وہ ایک استادانہ رنگ جو اکثر کہنہ مشقی کے باوجود لوگوں کو میسر نہیں آتا ـــــ جھلک رہا ہے اور اُن کی قادر الکلامی کی شہادت دے رہا ہے - جہاں تک علوئے خیال اور گہرائی نظر کا تعلق ہے، آزاد صاحب کے یہاں یہ چیزیں کم ہیں - اس لئے کہ موصوف کے پیشِ نظر عروض و فنون زیادہ رہا کرتے تھے، مضمون آفرینی کم - پھر بھی صرف یہی ایک کمی اُن کے مرتبۂ شاعری کو صدمہ نہیں پہنچاتی - کیونکہ موصوف کے یہاں اور بھی بے شمار ایسی خوبیاں ہیں جو اُن کے پیش رو اور معاصرین کے یہاں نہیں ہیں - کہیں کہیں آزاد صاحب بہت بالغ نگاہی سے بھی کام لے گئے ہیں - اور اس میں ہر پہلو سے کامیاب ہیں - لیکن یہ مثالیں نادر ہیں - بہرحال تمام خصوصیات کا ایک انسان میں یکجا ہونا کچھ ضروری نہیں - مثال کے طور پر ایک شعر پیش کرتا ہوں ؎

مری پستی تری رفعت کا مظہر بن کے دم لے گی
مری ہستی ترا رازِ نہاں معلوم ہوتی ہے

اسی طرح ایک اور شعر ملاحظہ فرمائیے - جس میں طرزِ خیال کے ساتھ ساتھ اُن کا مخصوص رنگ تکرار بھی پوری طاقت کے ساتھ نمایاں ہے ؎

اب امید نجات کارواں مشکل، بہت مشکل ؛ تباہی کارواں در کارواں معلوم ہوتی ہے

آزاد صاحب کے کلام میں علاوہ دوسرے مضامین کے شوخی، رندی اور ظرافت بھی کافی پائی جاتی ہے، چنانچہ کہتے ہیں ؎

دوستو! ناصح مرا دشمن نہیں ؛ اِک ذرا سر پھر گیا ہے، اور بس!

یا ایک جگہ رندانہ رنگ میں اس طرح ارشاد فرماتے ہیں ؎

وہ شغل میکشی کے بعد جب بربط اٹھاتے ہیں
تو پھر کانوں کے رستے سامعہ سے نوش ہوتا ہے

یا

یہ کیف بارشوں کے، یہ مستی سحاب کی ؛ توفیق ہو تو نہر بہا دوں شراب کی

ایک جگہ معاملہ بندی اور شوخی دونوں کو سمو دیا ہے ملاحظہ فرمائیے -

شکر ہے، کہ دل دے کر یار دلربا پایا ؛ یعنی جس قدر کھویا، اس سے کچھ سوا پایا

آزاد صاحب کی سرشت میں ٹھوس عالمانہ اور انتہائی شاعرانہ دونوں قسم کے جراثیم موجود تھے، جس کی تصدیق خود اُن کے اس قول سے ہوتی ہے کہ "اگر میں شاعر نہ ہوتا یا شاعری کی طرف دل نہ جاتا تو پکا مذہبی عالم ہوتا" یہ تھا آزاد صاحب کا تبحرِ علم اور منتہائے شاعری۔ اب آزاد صاحب کی شوخی اور جوانِ طبعی کے متعلق یہ عرض کروں گا، کہ شاید قدرت نے تمام شوخی کا نصف ساری دنیا کو اور نصف صرف آزاد صاحب کو بخش دیا تھا۔ مرحوم اپنی کبرسنی کے باوجود اس قدر چلبلے واقع ہوئے تھے۔ کہ لوگوں کی نوجوانی اُن کی شوخی کے سامنے پانی پانی ہوتی تھی۔ ظرافت میں اپنی مثال نہ رکھتے تھے۔ اس قدر چُست اور لطیف فقرے بروقت استعمال کرتے تھے۔ کہ مقابل کا منہ پھیر پھیر دیتے تھے۔ یہ حقیقت ہے کہ اگر مغلوں کا شاہانہ دور باقی ہوتا تو آزاد صاحب کو محض اُن کی موزونیت طبع کی بدولت بادشاہ کا تقرب حاصل ہوتا اور وہ دربار میں ایک مقبول ہم جلیس ہوتے۔ افسوس ہے کہ زمانے نے اُن کی کسی خصوصیت کی قدر نہ کی۔ ورنہ بادشاہت تو اس زمانے میں بھی کسی نہ کسی رنگ میں جلوہ گر ہے۔ البتہ اہلیت نہیں ہے۔

آزاد صاحب نے حیدرآباد دکن میں غالباً اپنی زندگی کا نصف حصہ بسر کیا لیکن مختلف زمانوں میں۔ میں جب حیدرآباد پہنچا تو شاعروں میں سب سے پہلے آزاد صاحب سے ملا۔ میری اور آزاد صاحب کی یہ پہلی ملاقات تھی موصوف بہت خندہ پیشانی سے ملے، اور رفتہ رفتہ اپنی عنایات میں اضافہ فرماتے رہے۔ مجھے حیرت تھی، کہ میں ایک نوجوان ہونے کے باوجود آزاد صاحب جیسے پیرانہ سال انسان سے غیر معمولی دلچسپی رکھتا ہوں، اُس کا سبب تھا، کہ وہ اپنی مختلف النوع خصوصیات کی وجہ سے دلچسپیوں کا خزانہ تھے اور میں دلچسپیوں کا بھوکا۔ اِس لئے خوب نبھی۔ کوئی دن خالی نہیں جاتا تھا کہ مجھے اُن کی معیت حاصل نہ ہو۔ میرے تعلقات یہیں تک محدود نہ تھے۔ بلکہ جب میں شہر حیدرآباد سے کچھ دنوں کے لئے مفصلات میں بہ ضرورت چلا گیا، تو بھی جب کبھی آتا تھا، آزاد صاحب ہی کا مہمان ہوتا تھا، یا جس زمانے میں آزاد صاحب کچھ مدت کے لئے دہلی چلے آئے تھے، تو میں محض اُن کی خاطر سے دہلی آتا تھا اور مہینوں رہتا تھا۔ میری اُن کی معیت کسی طرح خالی از دلچسپی نہ تھی۔ بلکہ ہماری زندگی کی خوشگوار گھڑیوں میں یہ تعلقات ایک یادگار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہاں اسقدر افسوس ضرور ہے، کہ لاہور آنے کے بعد کچھ مصروفیتوں اور کچھ اپنی فطری سہل انگاریوں کی وجہ سے خط و کتابت کا سلسلہ قائم نہ رکھ سکا۔ جس کی شکایت آزاد صاحب کی جانب سے بارہا ہوئی اور ناکام رہی۔ کاش اِس جذبے کو روح آزاد محسوس کر سکتی، کہ مجھے اُن کے مرنے کا اب تک یقین نہیں ہے حقیقتاً وہ شخص مرنے کے لئے پیدا ہی نہیں ہوا تھا۔ اللہ مغفرت کرے!

آزاد صاحب صرف نام ہی کے آزاد نہیں تھے۔ بلکہ اُن کی فطرت میں بڑی حد تک آزادی کے جوہر پائے جاتے تھے۔ آزاد خیال تھے۔ آزاد مزاج تھے، اور آزاد پیشہ! درآں حالیکہ موصوف کے لائق صاحبزادے اور میرے مخلص دوست جناب احسان احمد صاحب انصاری دارالترجمہ حیدرآباد دکن کے ایک قابل مترجم ہیں اور معقول یافت رکھتے ہیں لیکن آزاد صاحب کی فطرت آزاد نے کبھی گوارا نہ کیا کہ وہ اُن کے سامنے دستِ سوال دراز کرتے، یا اُن کے رحم و کرم کو اپنا ملجا و ماویٰ قرار دیتے۔ مجھے علم ہے کہ احسان احمد صاحب بارہا اصرار کے ساتھ اپنے والد کی شفقت کے طالب ہوئے، لیکن شاید آزاد صاحب نے پابندی کے خیال سے انکار کر دیا۔ گو آزاد صاحب حکیم بھی تھے اور تھوڑے سے ڈاکٹر بھی۔ لیکن تمام عمر صرف عینک سازی اور چشمہ فروشی کو وسیلۂ معاش بنائے رکھا چشمہ سازی میں یہاں تک کمال حاصل تھا کہ میں نے حیدرآباد بھر کے عینک ساز اور چشمہ فروشوں کو اُن کے سامنے زانوئے ادب تہ کرتے دیکھا ہے۔ جب کوئی مشکل پیش آتی تھی، تو تمام چشمہ فروش مشکلکشائی کے لئے ان کے پاس حاضر ہوتے تھے۔

آزاد صاحب کو حالی جیسے مشہور و معروف شاعر کی شاگردی کا فخر حاصل تھا، چنانچہ اکثر آزاد صاحب اپنے استاد کے تذکرے کرتے رہتے تھے، لیکن چونکہ مجھے شاعری میں استادی شاگردی سے اتفاق نہیں ہے۔ اور میں اِس کو ایک غلط چیز تصور کرتا ہوں جو استاد، شاگرد اور اُن کے شناساؤں کو یکساں طور پر غلط فہمی میں مبتلا رکھتی ہے۔ اِس لئے اکثر اِس مسئلے پر میری اور آزاد صاحب کی جھڑپ ہو جایا کرتی تھی، لیکن تھوڑی دیر کے لئے! اس کے بعد پھر ہم ایک ہو جاتے تھے اور اسی طرح ایک دوسرے کے بہی خواہ نظر آتے تھے۔ جس طرح تنازعہ سے پہلے۔

آزاد صاحب جہاں فنِ عروض کے ماہر تھے وہاں بلا کے نکتہ شناس واقع ہوئے تھے۔ مجال نہ تھی کہ شعر کی باریک سے باریک خوبی یا تاریک سے تاریک نقص اُن کی نظر سے بچ کر گزر جائے اور اس معاملے میں وہ اسقدر بے باک تھے، کہ وہ ہم لوگوں سے تو ازراہ دیستی فرما دیتے تھے۔ اور غیروں میں کوئی نہ کوئی اخلاقی حیلے سے کہہ ضرور دیا کرتے تھے۔ لیکن اِس میں اُن کی نیت مخلصانہ ہوتی تھی۔ نہ کہ فاسدانہ۔ آزاد صاحب کے علمی و ادبی احسانات صرف اُن کے۔۔۔

۔۔۔ مجموعۂ کلام ہی میں بند نہیں ہیں۔ بلکہ بے شمار ایسے لوگ ہیں، جن کے دماغوں اور سینوں میں بکھرے پڑے ہوئے ہیں۔ لطف یہ ہے کہ انہیں میں اکثر ایسے اشخاص بھی ہیں جو آزاد صاحب کی زندگی ہی میں اُن کے احسانات کے منکر تھے، اور آزاد صاحب بے چارے خاموش!! میرا مقصد کسی کی ذات پر حملہ کرنا نہیں ہے۔ بلکہ یہ واقعہ ہے کہ اب بھی ہندوستان کے ایک آدھ ایسے نامور شاعر جن کی ذات پر دنیائے شاعری ناز کرتی ہے۔ آزاد صاحب کے عالمانہ مشورۂ سخن سے خالی نہیں ہیں، اور کیا عجب، وقت آنے پر وہ خود اپنے ضمیر کی صداقت کے ساتھ اس کا اعتراف کرلیں۔

عجیب بات ہے، کہ آزاد صاحب غالبؔ کی طرح مومنؔ کے بھی عاشق تھے۔ مومنؔ کے اکثر اشعار پر سر دھنتے تھے اور اس کے عجیب و غریب خیالات پر تڑپ تڑپ کر داد دیتے تھے۔ میرا یہ مقصد نہیں ہے کہ وہ ایسا کیوں کرتے تھے۔ بلکہ مطلب یہ ہے، کہ وہ مومنؔ کو غالبؔ جیسے زندۂ جاوید شاعر کے مقابلے میں کسی طرح کم نہیں سمجھتے تھے۔ یہی نہیں، بلکہ وہ کچھ نہ کچھ تمام متقدمین شعراء کا احترام کرتے تھے، اور اگر ان اساتذہ کی شان میں کوئی گستاخی کرتا تھا، تو اُس سے رنجیدہ رہتے تھے۔ مجھے یاد ہے، کہ ایک بار میں نے مومنؔ کے اس شعر پر

کر علاج جوشِ وحشت چارہ گر ٭ لادے اک جنگل مجھے بازار سے

ناپسندیدگی کا اظہار کیا، تو ناراض ہو گئے اور کہا کہ "آپ استادوں کی شان میں گستاخی کرتے ہیں۔ یہی توقع آپ کو اپنے مابعد شعراء سے رکھنی چاہئے۔ وہ بھی آپ کے اشعار پر یونہی نکتہ چینی کریں گے۔" آزاد صاحب زمانۂ موجودہ کے شاعروں میں سب سے بہتر سر اقبال مرحوم کو، اور اُس کے بعد جوشؔ، فانیؔ اور ریاضؔ خیرآبادی کو سمجھتے تھے۔ سر اقبال کے متعلق آزاد صاحب کی رائے تھی، کہ اُن کے کلام میں استقدر فکر، گہرائی اور شائستگی کو دخل ہے جو دوسرے شاعروں کے کلام میں نہیں پائی جاتی اور جوشؔ کی خصوصیات شاعری میں رندی، سرشاری اور فلسفہ و حکمت کو پسند کرتے تھے۔ فانیؔ کے بے حد قدر دان تھے اور انہیں غالب ثانی تصور کرتے تھے۔ ریاضؔ خیرآبادی کی بے باکانہ رندی، اور شوخ بیانی پر مرتے تھے۔ آزاد صاحب دوسرے شعراء کی قدر و منزلت میں مطلق بخل سے کام نہیں لیتے تھے۔ بلکہ اس معاملے میں وہ اسراف کی حد تک بڑھے ہوئے تھے۔ چاہتے تھے کہ تمام دنیا شاعر ہو جائے۔ چنانچہ اس سخاوتِ طبع کی بدولت تمام عمر گدھوں کو انسان اور انسانوں کو شاعر بنانے کی دھن میں لگے رہے، لیکن ہاتھ کچھ نہ آیا۔ جب دیکھا تو اکثر شاگردوں کو بے وفائی سے پیش آتے ہوئے دیکھا۔ بہر حال انہیں شاعر گری کا ایک جنون تھا۔ اور اس جنون پر وہ اپنے قیمتی اوقات کو [illegible] دیا کرتے تھے۔ آزاد صاحب اگرچہ بالقصد ترنم سے نہیں پڑھتے تھے۔ لیکن اُن کی سیدھی سادھی آواز میں ایسی دلکشی اور موسیقی ہوتی تھی کہ سامعین ہمہ تن گوش ہو جاتے تھے۔ ان کے تحت اللفظ لب و لہجہ میں ایسا شیریں زیر و بم چھپا ہوا تھا، کہ آرکسٹرا کا دھوکا ہوتا تھا۔ پڑھتے وقت محو ہو جاتے تھے اور سننے والوں سے داد لئے بغیر نہیں رہتے تھے۔ سر کو ایک خاص ادا سے دائیں طرف جنبش دیتے ہوئے شعر کو اختتام تک پہنچاتے تھے۔

میں پہلے عرض کرچکا ہوں۔ کہ آزاد صاحب نے دنیا دیکھی تھی اور بڑے بڑے ادبی جلسوں اور مشاعروں میں پڑھ چکے تھے۔ اس کے باوجود اُن کی نیت سیر نہیں ہوئی تھی۔ وہ مشاعروں پر جان دیتے تھے۔ اگر کوئی بھولے سے مدعو کرلیتا تھا تو اُس کے یہاں خاص اہتمام سے پہنچتے تھے۔ ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ حیدرآباد میں ایک نہایت مختصر اور معمولی سی مجلس مشاعرہ منعقد ہوئی۔ جس میں شہر کے بعض حکام اور بعض مقامی شاعر مدعو تھے۔ میں نو وارد تھا۔ اور آزاد صاحب کے واسطے سے مدعو کیا گیا تھا۔ اتفاق سے اُس زمانے میں آزاد صاحب سخت تپ و لرزہ کے بیمار تھے۔ اور مشاعرہ کے صدر بھی وہی قرار پائے تھے۔ تو میری آنکھوں نے یہ دیکھا کہ آزاد صاحب اُفتاں خیزاں اُسی شدید علالت میں مشاعرے تک پہنچے۔ ہائے ہائے کرتے ہوئے خطبۂ صدارت جو پہلے سے لکھ کر لائے تھے پڑھا۔ پورا مشاعرہ انجام تک پہنچا کر واپس آئے۔ غالباً دہلی میں ایک بار آزاد صاحب کا اصرار تھا کہ میں بھی اُن کے ساتھ ایک مشاعرے میں ضرور شریک ہوں لیکن اُس میں نہ صرف مجھ کو شرکت سے انکار تھا، بلکہ میں چاہتا تھا کہ آزاد صاحب بھی نہ جائیں۔ جب میں نے آزاد صاحب کو باز رکھنے کی کوشش کی تو پہلے بہت ناراض ہوئے، اور پھر کہا کہ "شاعری چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟"

آزاد صاحب اپنی رندانہ فطرت کے باوجود بہت معصوم واقع ہوئے تھے۔ حقیقتاً ایسے معصوم، جیسے ولی ہوتے ہیں۔ وہ اپنی برائی سُن کر اس طرح بے پروا ہو جاتے تھے، جیسے نفس نے اُن کو کچھ کہہ کر مطمئن کر دیا ہو۔ کبھی دوست اور دشمن میں امتیاز نہ رکھا۔ انہیں یہ گُر معلوم ہی نہ تھا، کہ کسی کے ساتھ کسی طرح پیش آیا جائے۔ بس ایک راستہ تھا اور وہ بھی سیدھا سادھا، خواہ اُس میں کوئی خطرہ پیش آئے یا کوئی فائدہ۔ اس دور کے بعض ایسے سر پھرے شاعر جو شاعر تو کم ہیں۔ لیکن مغرور حد سے زیادہ! ان کو اپنے اخلاق سے مغلوب ہو کر جھک جھک کر سلام کرتے تھے۔ اور ان کی مزاج پرسی کو اپنا فرض سمجھتے تھے۔ آزاد صاحب میں یہ خاص بات تھی کہ وہ ہر چھوٹے بڑے، ہر باتکلف اور بے تکلف شخص کے ساتھ ایک تہذیب سے پیش آتے تھے۔ "آپ، جناب" کے سوا کسی دوسرے

لفظ سے خطاب نہیں کرتے تھے۔ جہاں دہلی کی ٹکسالی زبان کے عاشق تھے وہاں لکھنؤ کی نفاست زبان پر بھی مرتے تھے۔ بعض پرانے متروک محاورے اور بعض اردو کے وہ الفاظ جو میر تقی میر کے ساتھ دفن کر دئے گئے۔ اُن کو گلے سے لگائے رکھتے تھے۔ اور اگر میں اعتراض کرتا تھا، تو کہتے تھے۔ کہ "آپ اس کا مزہ کیا جانیں۔ آپ ایسے زمانے میں پیدا ہوئے ہیں جب آرٹ اور ٹکنیک کے سوا دوسرا لفظ استعمال ہی نہیں ہوتا۔" آزاد صاحب اگرچہ انگریزی سے ناواقف تھے، لیکن آزاد صاحب کا ذہن انگریزی ماحول سے خاصا متاثر تھا۔ انگریزی تہذیب اور انگریزی خیالات ان کے دل ودماغ پر اکثر چھائے رہتے تھے۔ آزاد صاحب انگریزی الفاظ پڑھنے کی کوشش میں کبھی کبھی کسی دکان کے سامنے کھڑے ہو جاتے تھے اور سائن بورڈ کی عبارت کو رُک رُک کر پڑھتے تھے۔ اگر مطلب سمجھ گئے تو خیر ورنہ دریافت کر لیتے تھے۔ آزاد صاحب کو زبان کے اضافے اور ترقی کا بہت شوق تھا۔ چنانچہ اکثر دارالترجمہ کی جدید اصطلاحیں اور انگریزی کے بعض وہ نرم اور شیریں الفاظ جو آسانی سے زبان میں تحلیل ہو سکتے ہیں ازبر کر لیتے تھے اور مناسب موقع پر ان کو استعمال کرتے تھے۔

آزاد صاحب اپنے آزاد وسیلۂ معاش کے باوجود نہیں معلوم کیوں ایک مدت دراز تک حیدرآباد دکن میں مقیم رہے۔ ان حالات میں، کہ جب نہ تو اُن کا وہاں کی سرکار سے واسطہ تھا اور نہ مہاراجہ کشن پرشاد بہادر ہی (خدا مغفرت فرمائے) جو تقریباً ہر اہل کمال کے قدرداں تھے، ان کی سرپرستی فرماتے تھے اور نہ وہاں کسی اور جاگیردار یا حاکم ریاست ہی سے ان کو کوئی فائدہ پہنچا تھا۔ سوا اس کے کہ کچھ منچلے احباب ضرور تھے، جو شریک صحبت رہا کرتے تھے۔ بات یہ تھی کہ آزاد صاحب حضرت داغ کی طرح جہاں بیٹھ جاتے تھے، بیٹھ جاتے تھے! اُنہیں اپنے مفاد واحتیاج کا خیال اُس وقت آتا تھا۔ جب سیلاب سر پر پہنچ جاتا تھا۔ کبھی کسی کی خوشامد کرنی نہیں آئی۔ میں نے مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر شاد کے دربار میں اچھے اچھے امراء اور ذی ثروت بزرگوں کو چاپلوسی کرتے ہوئے دیکھا۔ لیکن آزاد صاحب اس وقت بھی خاموش رہے۔ یا اگر بولے، تو اُس میں اُن کے ضمیر کی آواز گونجتی ہوئی معلوم ہوئی۔ تملق آزاد صاحب کے خمیر میں نہیں تھا، حالانکہ وہ شیخی خوروں کی طرح اپنے کیرکٹر کے مدعی نہیں تھے۔ مہاراجہ بہادر مرحوم کی بارگاہ سے آزاد صاحب کا صرف اسقدر تعلق تھا، کہ کبھی ہفتے، پندرھویں وہاں جاتے تھے اور اپنے ذاتی لباس میں جاتے تھے۔ صرف چند منٹ بیٹھے تھے۔ اگر کوئی مسئلہ اُن کی دلچسپی سے تعلق رکھتا نظر آیا۔ تو شریک ہو گئے۔ ورنہ معمولی مزاج پرسی کے بعد گھر چلے آئے۔ مہاراجہ بہادر مرحوم نے باوجود اُن کی چودہ، پندرہ سالہ نیازمندی کے نہ تو خود کبھی کوئی عطوفت فرمائی۔ اور نہ آزاد صاحب ہی نے ایسی کوئی درخواست کی۔ بہرحال وہ اس معاملے میں ہم جیسے اپاہج شاعروں کی طرح کسی کے بے لذت احسان سے زیربار نہیں ہوئے۔ ہمیشہ اپنے دست و بازو پر نازاں رہے۔ البتہ اپنے غریب دوستوں کی قدردانی پر ضرور پھیل جاتے تھے۔ گھنٹوں بیٹھتے تھے اور نہایت سنجیدگی سے ایک آدھ فرمائش بھی کر بیٹھتے تھے۔ احسان فراموشی اُن میں نہیں تھی۔ ذرا سا سلوک اُن کی نظر میں پہاڑ کی حیثیت رکھتا تھا۔ شکرگذارانہ جذبے میں ڈوبے ہوئے تھے اور بے حد قناعت پسند تھے۔ اُن کے ضروری ساز و سامان میں فضول اشیاء کی بہتات تھی۔ یعنی ان کا اثاثہ جو صرف چند جوڑے کپڑوں اور کچھ آلات چشمہ سازی وغیرہ پر مشتمل ہونا چاہیئے تھا۔ کاٹھ کباڑ سے بھرا ہوا نظر آتا تھا۔ پرانے اخبارات، رسالے، خالی بوتلیں شیشیاں، بوسیدہ اور غیر کارآمد جوتے، ٹوٹے پھوٹے سیکڑوں بکس اور پٹاریاں، انبار در انبار نظر آتے تھے اور ان بکسوں میں اخباروں اور رسالوں کی کترنیں، جن میں یا تو خود اُن کا کوئی مضمون، نظم یا کوئی تصویر ہوتی تھی، یا کسی دوسرے شخص کی کوئی چیز۔ آزاد صاحب اس تمام سامان کو حیدرآباد سے دہلی تک لئے لئے پھرتے تھے، اور کسی کو ہاتھ نہیں لگانے دیتے تھے۔ میں اُن کی اس عنایت کا ممنون ہوں، کہ وہ مجھ پر کافی اعتماد رکھتے تھے، اور اکثر اس لبریز خزانے کو میرے حوالے کر کے باہر چلے جایا کرتے تھے۔ آزاد صاحب خود تو معمولی سگریٹ پیتے تھے، لیکن اُن کے ایک بہت بڑے بکس کی تہہ میں صدہا اعلیٰ درجے کے سگریٹ کے ٹین رکھے ہوئے تھے۔ جو غالباً سالہا سال کی کوشش کا نتیجہ تھے۔

آزاد صاحب کے سفر کا ایک واقعہ یاد آیا، جب وہ حیدرآباد سے دہلی ایک مشاعرے میں شرکت کے لئے آ رہے تھے۔ میں اور حضرت بزم اکبرآبادی بھی اُن کے ہم سفر تھے۔ چنانچہ آزاد صاحب نے اپنے تمام اسباب کو جو مختلف بکسوں، گٹھڑیوں اور بڑے بڑے بے ڈول بنڈلوں پر مشتمل تھا۔ اُس میں ایک فولادی زنجیر جو خونخوار کتوں کے باندھنے کی ہوتی ہے پہنا دی اور اس تمام سامان کو زنجیر میں جکڑ بند کر کے اپنی کمر کے گرد لپیٹ کر اس میں علیگڈھ کا ایک قفل ڈال دیا۔ اور نہایت متانت سے لیٹ گئے۔ میں اُن کی اِس فراست پر اپنی ہنسی نہ ضبط کر سکا، اور دریافت کیا کہ "آزاد صاحب! یہ کیا معاملہ ہے؟" تو فرمایا کہ "جو شخص میرے سامان کا طالب ہو، وہ مجھے بھی اپنے

ہمراہ لے جائیے!"

جہاں تک میرا حافظہ کام کرتا ہے۔ مجھے نہیں یاد ہے کہ کبھی آزاد صاحب نے کسی کی برائی میں حصّہ لیا ہو، یا انتقاماً کوئی کلمۂ شر زبان پہ لائے ہوں۔ حالانکہ بعض لوگ خواہ مخواہ اُن کے درپئے آزار رہا کرتے تھے اور بعض تو ایسے منافق تھے جو ایک طرف اُن کی قابلیت سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کرتے تھے، اور دوسری طرف اُنہیں رسوا کرتے تھے۔ اِنہیں میں بعض مشہور شعرائے عظام بھی ہیں۔ آزاد صاحب کو قدرت نے یہ خوبی عطا کی تھی کہ وہ بچّوں میں بچے۔ بوڑھوں میں بوڑھے اور جوانوں میں نوجوان نظر آتے تھے۔ بڑی حد تک راست گو تھے، اکثر وقت کی نزاکت کا احساس کئے بغیر سچی بات زبان سے کہہ جاتے تھے۔ مکار صوفی، اور علمائے سالوس کی پگڑی اچھالنے میں ذرا نہیں جھجکتے تھے۔ بلکہ ایسے موقعوں پہ چبھتے ہوئے فقرے اور طنزیہ شعر بے جھجک پڑھ دیتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک صوفی، عالم، سیاس اور قدرے شاعر صفت بزرگ کے سامنے ہم لوگ بیٹھے تھے، اور اشعار سنائے جا رہے تھے، تو آزاد صاحب نے خاص طور پہ ایسی غزل پڑھی، جس کا مقطع تھا ؎

تجھے آزادیوں درویش کامل کون مانے گا

یہاں سے ہو حریب و جبہ و دستار پیدا کر

اس شعر کو سن کر ہم لوگ بزرگ موصوف کی صورت دیکھنے لگے اور اُنہوں نے مسکراتے ہوئے فرمایا، کہ "خوب!! ضرور پیدا کیجئے!"

آزاد صاحب کی زندگی کا ایک اہم واقعہ یہ بھی ہے کہ وہ اپنی کبرسنی کے باوجود بے تکان پیدل، اور سائیکل پہ کوسوں چلے جاتے تھے، ذرا تھکن محسوس نہیں کرتے تھے، اور کم ہمتی کو قریب نہیں آنے دیتے تھے۔ حالانکہ خود اُن کے بیان کردہ واقعات کے مطابق، ان کی تمام عمر رنگینیوں اور حسینوں کی عشوہ طرازیوں کی نذر ہوئی تھی، لیکن سخت سے سخت دھوپ اور برچھی سے زیادہ چبھتی ہوئی سردی اُن کی ہمّت کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتی تھی وہ بظاہر بہت دُبلے اور بہ باطن بڑے فولاد صفت اور جفاکش انسان تھے۔ جیسا ان کا باطن آئینہ تھا، اُسی طرح اُن کے چہرے سے روشنی کا ظہور ہوتا تھا۔ داڑھی رکھتے تھے اور جب کبھی میں کہتا تھا کہ اسے مغربی فیشن کی نذر کر دیجئے تو کہتے تھے کہ "یہی تو انصاری ہونے کی ایک علامت رہ گئی ہے، کیا آپ چاہتے ہیں کہ میں اپنے خاندان میں پہچانا بھی نہ جاؤں؟

آزاد صاحب کی ظرافت کے بے شمار واقعات ہیں، جن میں ایک آدھ بیان کرتا ہوں۔ ایک دفعہ آزاد صاحب کے ماموں جو آزاد صاحب سے بھی غالباً پچیس تیس سال بڑے تھے، وطن سے حیدرآباد تشریف لائے اور آزاد صاحب کے پاس بھی پہنچے۔ بڑے متقی اور پابند اوقات وصلواۃ آدمی تھے۔ مغرب کی نماز کا وقت قریب تھا، اور مسجد سامنے تھی۔ جیسے ہی موذن نے "اللہ اکبر" کہا۔ بزرگ موصوف نے آزاد صاحب سے کہا۔ "آؤ! نماز پڑھ لیں" آزاد صاحب تیزی سے اُٹھے اور جاتے ہی جماعت میں شریک ہو گئے۔ میں اِس واقعہ پر حیران تھا کہ آخر ماجرا کیا ہے؟ جب آزاد صاحب واپس آئے اور اُن کے ماموں صاحب چلے گئے، تو انہوں نے فرمایا کہ "خدا مجھے معاف فرمائے۔ آج پہلی بار میں نے مکاری کی ہے اور وہ بھی بے وضو!" اِسی مسجد کے غسل خانے اور بیت الخلاء میں اکثر آزاد صاحب رفع حاجت کے لئے جاتے تھے۔ ایک دن ایک بگڑا ہوا نمازی اُن سے اُلجھ بیٹھا۔ کہ "حضرت! نماز کے نام سے تو آپ کبھی صورت نہیں دکھاتے ہیں اور یوں آتے رہتے ہیں۔" آزاد صاحب نے برجستہ جواب دیا۔ کہ "کیا بالکل کافر ہو جاؤں؟ یہی غنیمت ہے، کہ اِس بہانے سے مسجد کو دیکھ تو لیتا ہوں!"

آزاد صاحب ایک معاملے میں گاندھی جی کے ہم صفت واقع ہوئے تھے، بلکہ کچھ اُن سے بھی بڑھ چڑھ کر۔ یعنی اکثر آزاد صاحب کی کھٹک رُک جاتی تھی۔ اور اِس کا سلسلہ بائیس بائیس دن، اور مہینہ مہینہ بھر تک جاری رہتا تھا۔ بس اِس دوران میں صرف چائے پہ قناعت کرتے تھے، نہ کچھ کھاتے تھے، نہ پیتے تھے۔ اور بدستور اُسی طرح مشقت جاری رکھتے تھے۔ گاندھی جی کے برت تو پھر دودھ اور پھلوں کے سہارے چلتے ہیں۔ لیکن آزاد صاحب صرف ایک گرم پانی کی پیالی پر اکتفا کئے رہتے تھے۔

تواضع کے معاملے میں گو آزاد صاحب زیادہ قابلِ ذکر نہیں ہیں لیکن اپنے مخلص احباب کے ساتھ جس میں یہ نیازمند بھی شامل ہے، کچھ نہ کچھ واجب ناواجب طرزِ عمل اختیار کرتے ہی رہتے تھے۔ یہ حقیقت ہے کہ وہ اپنے دوستوں کو پہچانتے تھے اور سچائی کے ساتھ اُن کی قدر کرتے تھے۔ مجھے اکثر موقعوں پہ آزاد صاحب سے ندامت ہوتی، جب کسی مجمع یا کسی جلسے میں اُن سے بچھڑ کر کسی دوسرے حلقۂ احباب میں پہنچ گیا اور وہاں باتوں میں محو ہو گیا۔ اور اس دوران میں آزاد صاحب بے چارے مجھے ایک ایک جگہ ڈھونڈتے پھرتے۔ یہ تھا اُن کا تعلق خاطر!

حقیقت یہ ہے کہ میں آزاد صاحب مرحوم کے مخلصانہ جذبۂ دوستی کی قدر نہ کر سکا۔ مجھے ان کی موت پر جس رنگ میں افسوس ہے وہ میرے دلی جذبات کی مفصل ترجمانی چاہتا ہے اور سب سے زیادہ افسوس یہ ہے کہ نہ اُن کی جائے مرگ کا اس وقت تک علم ہو سکا اور نہ یہی معلوم ہوا کہ اس آزاد رو اور دلیر شخص نے کس عالم میں جان دی۔ وہ دوستوں کو ہنسانے

والا، غمزدوں کا دل بہلانے والا، دوسروں کی خوشی پر اپنی خوشی قربان کر دینے والا، ذوقِ شاعری سے صحیح لذّت اُٹھانے والا، اور نکتے پر نظر رکھنے والا انسان اب کہاں نظر آئے گا؟ افسوس! آزاد مر گئے لیکن اپنا بدل نہ چھوڑ گئے۔ میں نے آزاد صاحب کی زندگی کے کچھ دلچسپ پہلو ہی ابھی تک بیان کئے ہیں، اور مضمون کافی طویل ہو گیا ہے۔ واقعات بہت ہیں اور جگہ کم! اس لئے یہی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چلتے چلتے کچھ آزاد صاحب کے اشعار بھی تبرکاً پیش کر دوں۔ اگرچہ مرحوم کا دیوان چھپ چکا ہے، اور اکثر لائبریریوں کی زینت بن چکا ہے۔ پھر بھی میں اپنا فرض سمجھتا ہوں، کہ اُن کے حالات کی رونق کو اُن کے اشعار کی رونق سے کچھ اور ترقی دوں۔

ذیل کے اشعار صرف چند غزلوں سے منتخب کئے گئے ہیں، ورنہ بے شمار غزلیں، ترجیع بند، رباعیاں اس کی مستحق ہیں کہ اُن پر سرسری نظر ڈالی جائے۔ آزاد صاحب کے سارے مجموعۂ کلام پر نظر ڈال جائیے۔ تو حیرت انگیز بات یہ ملے گی، کہ کہیں زبان کی کوئی لغزش یا بندش میں کہیں کوئی سستی آپ نہ پائیں گے، میں ایک بے حقیقت اور بے بضاعت انسان ہوں ایسا شخص کہ خود اپنے لئے مفید نہیں ہوں، ورنہ یہ کرتا، کہ اس مجموعے کو ہندوستان کی ہر لائبریری اور ہر درسگاہ میں پہنچا دیتا تاکہ عہدِ حاضر کے بے لگام شاعر کم از کم زبان اور ترکیب بیان ہی کے لحاظ سے کچھ فائدہ اٹھاتے، اور اُس بے چارے کی روح کو دعا دیتے۔

انجامِ کار کا بھی تجھے کچھ خیال ہے ⁂ کیا جو ستائے گا، وہ ستایا نہ جائے گا؟
غیروں کے واسطے ہی مسیحائے وقت ہو ⁂ ہم کو تو خاک میں بھی ملایا نہ جائے گا

کیا خاک مان لوں کہ وہ نامہرباں نہ تھا ⁂ اِک طرزِ التفات سے کیا کچھ عیاں نہ تھا
اربابِ فہم کیوں متاثر نہ ہو سکے ⁂ میرا سکوت بھی تو کم از داستاں نہ تھا

غفلتیں اور غفلتوں میں کوششیں ⁂ آہ! پتھر کا کلیجا ہو گیا

اُس روز زندگی کا بس خاتمہ سمجھئے ⁂ جس روز دل لگی کا کچھ مشغلہ نہ ہو گا

وہ مرا شکرِ ستم کر کے پشیماں ہونا ⁂ وہ ترا عذرِ ستم! اور وہ شرما جانا
جب کہیں سے کوئی آوازِ الم ناک آئی ⁂ ہم نے اپنے دلِ مرحوم کا نوحا جانا

لطف کی نظروں سے کیا دیکھا، کہ دم پر آبنی ⁂ اے جزاک اللہ! اچھا لطف کا انداز تھا

تم اور دل آزاری اربابِ محبّت ⁂ اربابِ محبت کا یہ شیوا نہیں ہوتا
ممکن ہے جفا داخلِ انداز و ادا ہو ⁂ تاہم یہ محبت کا تقاضا نہیں ہوتا

اب اگر تم مجھ سے خوش بھی ہو تو مجھکو کیا خوشی ⁂ غم مری قسمت، الم میرا مقدّر ہو گیا

کیا چیز تھا کسی کا غمِ عشق، کیا کہوں ⁂ اِک نیش تھا، کہ دل کیلیئے رشکِ نوش تھا

اگر یونہی مشقِ تصوّر رہے گی ⁂ تو اِک روز دل آنکھ کا کام دے گا

ہم سے بدقسمت اور اُس کا التفات ⁂ "این بہ بیداریست یا رب! یا بہ خواب"؟

حقِ الفت ادا کریں گے آپ ؟ ⁂ آپ پاسِ وفا کریں گے؟ آپ؟!

عرش و کرسی کی رفعتیں برحق ⁂ مگر اُس آستاں سے کیا نسبت

نہ آزاد میکش نہ شاہد پرست ⁂ وہ کمبخت بدنام ہے اور بس

دل جہاں بہلے وہی گلزار ہے ⁂ باغ و گلشن کی فضا سے کیا غرض
حضرت آزاد! ہم اِک رند ہیں ⁂ پارسایانہ ریا سے کیا غرض

وہ ترا الفت سے چتون پھیر کر بے جا عتاب
وہ مرا حیرت سے تکنا تیری چتون کی طرف

امید سو وہ مفقود، ارمان سو وہ معدوم ⁂ اے وائے دلِ مرحوم، صد وائے دلِ مرحوم!!
آزاد کی مے خواری آزاد کا حصّہ تھی ⁂ جب پی تو یہ کہہ کر پی "النادر کالمعدوم"

جب صدا آئی کہ "بارِ عشق اُٹھا سکتا ہے کون"
ہم بڑھے اور بے دھڑک بولے کہ "ہم! سرکار ہم"!!

آپ نے ملاحظہ فرمایا، یہ چند منٹ کی سرسری نظر میں انتخاب کیا گیا ہے اور ہجوم کار کی وجہ سے روا روی میں پیش کر دیا گیا ہے۔ ورنہ زبان و بیان، فصاحت و لطافت کا ایک بحرِ بیکراں ہے کہ موجیں مار رہا ہے۔ میرا دعویٰ ہے کہ عہد حاضر کے تمام شعراء کے مقابلہ میں صرف آزاد صاحب کا کلام زبان و بیان میں سب پر فائق ہے اور اسے میں آزاد صاحب کا معجزہ سمجھتا ہوں۔

ابر احسنی گنوری

بہ سلسلہ سوال و جواب
مضمون مشتمل بر سوالات

کچھ "شروعات" سے متعلق

شاہکار مئی سنہ ۴۲ء میں اعجاز صاحب مدیر رسالہ شاعر آگرہ نے حضرت علامہ تاجور نجیب آبادی سے "شروعات" کے فصیح غیر فصیح کے بارے میں استفسار کیا ہے۔ اعجاز صاحب کے پیچدار سوالات کا انداز بتاتا ہے کہ اعجاز صاحب علامہ صاحب موصوف سے اُس کو غیر فصیح منوانے کی نہ فقط سفارش ہی کر رہے ہیں بلکہ زور مار رہے ہیں مثلاً۔

(۱) جو الفاظ غلط العام فصیح کے ذیل میں آتے ہیں۔ کیا ان کے لئے ضروری نہیں کہ مستند اساتذہ سخن اور فصحا نے انہیں کلام میں بکثرت استعمال کیا ہو؟

(۲) اگر جواب اثبات میں ہے تو کیا لفظ "شروعات" پر غلط العام فصیح کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ جبکہ یہ لفظ قدیم و جدید مستند ادبا و شعرا و اساتذہ سخن کے کلام میں ڈھونڈھے نہیں ملتا۔

(۳) کیا جناب نے لفظ "شروعات" کسی مستند شاعر کے کلام میں دیکھا ہے؟ یا خود بھی نظم فرمایا ہے اگر نہیں تو کیوں؟

(۴) ایک جماعت شروعات کو ٹکسالی بتاتی ہے اور دوسری عوام کی زبان بتاتی ہے کون حق پہ ہے؟

قبل اس کے کہ اعجاز صاحب کے سوالات کا تجزیہ کیا جائے اور حضرت تاجور کے معقول اور واضح جوابات پر روشنی ڈالی جائے ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ اس ادبی بحث کے آغاز سے ناظرین شاہکار کو آگاہ کر دیا جائے۔ تاکہ ان کی سمجھ میں اصل معاملہ آسکے اور وہ حق ناحق کا خود فیصلہ کر کے اعجاز صاحب کی ذہانت طباعی نیز شاہکار میں شان نزول کی وجہ سمجھ سکیں۔

اب سے تقریباً ۹ - ۱۰ مہینے قبل حضرت نوح کے مشہور شاگرد رشید جناب دعا ڈبائیوی نے جو بسلسلہ ملازمت لشکر گوالیار میں مقیم ہیں - یہ دیکھ کر کہ اچھے اچھے ادیب اپنی تحریروں میں اس لفظ کو استعمال کرتے ہیں کہیں اپنے کسی شعر میں لکھ دیا ایک صاحب نے جو غالباً پہلے حضرت نوح کے شاگرد تھے اور پھر کسی پروپیگنڈے کے اثر سے آگرہ اسکول میں بھرتی ہو گئے اس پہ اعتراض کیا اور بطور استفسار اعجاز صاحب جیسے مستند ادیب و شاعر سے استفسار کیا اعجاز صاحب نے اپنے نئے استاد بھائی کی ہمت افزائی کے لئے اپنے رسالہ شاعر میں حسب ذیل ارقام فرمایا۔

"شروعات" نہ پڑھے لکھے بولتے ہیں اور نہ استعمال کرتے ہیں۔ جہلا کے متعلق میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ یہ لفظ نہ کسی لغت میں ہے۔ نہ کسی زبان پہ اس لئے میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ بالکل غلط ہے۔ جہاں ناظرین جواب کا چنگیزی لہجہ ملاحظہ فرمائیں جس میں ہفوات نگاری غلط گوئی وغیرہ وغیرہ تمام غیر محتاط الفاظ موجود ہیں۔ وہاں یہ بھی دیکھیں اور ان کی جرأت فتویٰ بھی نگاہ میں رکھیں کہ نہ پڑھے لکھے بولتے ہیں نہ استعمال کرتے ہیں نہ کسی زبان پہ ہے اور اگر کوئی بولتا ہو تو اس کے جاہل ہونے میں تو کوئی کلام ہی نہیں۔ اپنی مصلحتوں کی بنیاد پہ کسی کا دل بڑھانے کے لئے کسی شریف کو جاہل کہہ دینا یا جو حضرات اس کو استعمال کرتے ہیں اُن سب کا نام جہلا کی فہرست میں لکھ دینا نہ ادبی زبان ہے نہ ادبی خدمت صرف اپنی پوزیشن کا پروپیگنڈا ضرور کہا جا سکتا ہے۔

دعا صاحب نے سائل صاحب سے اس کے متعلق استفسار کیا انہوں نے اس کو کثرت استعمال کے باعث فصیح قرار دیتے ہوئے اپنا ایک شعر بھی لکھ دیا۔ ادھر اعجاز صاحب کی جماعت نے یہ سمجھ کر کہ سائل صاحب اور بیخود صاحب میں چلتی رہتی ہے۔ حضرت بیخود سے اپنی موافقت میں ایک ایسی گول مول رائے لکھوا لی جس سے کچھ پتا ہی نہیں چلتا اور پھر اسی کے ساتھ اپنے والد ماجد حضرت سیماب کی رائے لیکر جس میں انہوں نے بھی شروعات کو جہلا کی زبان قرار دیا ہے یہ لکھ دیا چونکہ تینوں ایک ہی استاد کے تلامذہ جلیل ہیں۔ لہذا دو کے مقابلہ میں ایک کی رائے کچھ نہیں۔ اس لئے شروعات جہلا کی ہی زبان ہے۔ راقم الحروف کو اعجاز صاحب کی یہ خود نمائی کہ وہ اپنے گھر بیٹھ کر اکابرین فن کی آن بان کی سے تذلیل کر کے اپنی غلط بات کو صحیح ثابت کریں اور جہلا سے خطاب کریں۔ اس لئے کہ لطیفہ حضرت تاجور بھی اس لفظ کو بولتے ہیں۔ میں نے اس بحث کا سلسلہ رسالہ رہنمائے تعلیم رام گلی لاہور میں جاری کر دیا۔

اور اعجاز صاحب کے بنائے ہوئے پسندیدہ محاذ پر (کثرت آرا پر فیصلہ) اکابرین و فصحائے ملک کو مخاطب کر کے ان کی آرا گرامی دریافت کیں۔ چنانچہ فروری سے مئی تک اس سلسلہ کی تین اقساط شائع ہو چکی ہیں اور چوتھی زیر طباعت ہے۔ چھ سات اقساط اور مرتب کر چکا ہوں۔ جو میرے پاس محفوظ ہیں۔ اگر ناظرین شاہکار اس دلچسپ بحث کی تفاصیل دیکھنی چاہیں تو رہنمائے تعلیم میں ملاحظہ فرمائیں۔ اب تک جن مستند حضرات کی آرا گرامی شائع ہو چکی ہیں ان کا خلاصہ حسب ذیل ہے :-

(۱) حضرت سائل دہلوی۔ یہ لفظ کثرت استعمال کے باعث فصحا کے حلقہ میں داخل ہو چکا ہے۔ اس کا استعمال بُرا نہیں۔ (مع اپنے ایک شعر کے)

(۲) حضرت نوح ناروی۔ میں اس کے استعمال کو بُرا نہیں جانتا۔ اس لئے کہ اس کو بڑے بڑے پڑھے لکھے استعمال کرتے ہیں۔

(۳) حضرت طیش مارہروی۔ چونکہ سب پڑھے لکھے اس کو لکھتے اور بولتے ہیں۔ لہذا اس کو فصیح قرار دئے جانے میں حیلہ و حجت کی ضرورت نہیں۔

(۴) حضرت دلیر مارہروی۔ یہ لفظ متقدمین فصحا کے یہاں نہ سہی۔ مگر حال کے پڑھے لکھے طبقہ میں بہت مقبول ہو چکا ہے۔ لہذا فصیح مان کر استعمال کرنا درست ہے۔ کسی کو اعتراض کا حق نہیں۔ (مع اپنے ایک شعر کے)

(۵) حضرت جوش ملسیانی۔ شروعات اپنے اندر مخصوص معنویت رکھتا ہے۔ اس کو غلط العام فصیح میں شمار کرنا چاہئے۔ سب لکھتے ہیں زبان میں ایک کمی پوری ہو رہی ہے۔

(۶) حضرت اختر نگینوی۔ یہ لفظ خوبصورت ہے۔ اچھا ہے۔ استعمال میں سقم نہیں سب بولتے ہیں۔ اس کو فصیح قرار دئے جانے میں کوئی ہرج نہیں۔ زبان پر قواعد کی پابندی نہیں ہوتی۔ (مع اپنے ایک شعر کے)

(۷) حضرت مہر گوالیاری۔ میری رائے وہی ہے جو بھائی سائل کی ہے میں اس کے استعمال کو ہر طرح جائز سمجھتا ہوں۔

یہ سات حضرات ایک ہی استاد کے تلامذہ جلیل ہیں۔ لہذا سات کے مقابلہ میں دو رائیں وہ بھی بر بنائے مصلحت کیا ہو سکتی ہیں۔ ناظرین خود فیصلہ کر لیں۔

(۸) حضرت جلیل مانکپوری۔ یہ لفظ متقدمین کے یہاں نہیں۔ اگر آپ کو وثوق ہو کہ فصحا بولتے ہیں تو آپ بے تکلف استعمال کر سکتے ہیں۔ زبان میں قواعد کی غلطی بے معنی چیز ہے۔

(۹) حضرت دل شاہجہانپوری۔ یہ لفظ بے دھڑک استعمال کیا جا سکتا ہے۔

(۱۰) حضرت جامی بدایونی۔ یہ لفظ بے عظمت و اضافت استعمال کیا جا سکتا ہے اور اپنے اندر وہ معنویت رکھتا ہے جو اس کے مترادف الفاظ میں نہیں کثرت سے استعمال ہوتا ہے۔ لہذا کیوں نہ فصیح مانا جائے۔

(۱۱) حضرت خواجہ حسن نظامی کی عبارت کا ایک ٹکڑا۔ "چونکہ اس جنگ کی شروعات دہلی سے ہوئی۔"

(۱۲) حضرت یگانہ چنگیزی لکھنوی۔ یہ کون لوگ شروعات کی بحث میں پڑ کر وقت ضائع کر رہے ہیں۔ شروعات اور اولیات فصحائے اردو کے حلقہ میں داخل ہو چکا۔ ہم لوگ یہ نہیں دیکھتے کہ ہر لفظ گرامر کے کس قاعدہ سے صحیح یا غلط ہے جو لفظ جس طرح فصحا کے یہاں رواج پا گیا۔ وہی صحیح ہے۔ اس کے علاوہ ہم کچھ کہنا سننا نہیں چاہتے۔

(۱۳) حضرت علامہ تاجور نجیب آبادی۔ میں اس لفظ کو پرائیویٹ گفتگو میں استعمال کرتا ہوں۔ اس کے اندر جو معنویت ہے وہ اس کے مترادف الفاظ میں نہیں۔ لہذا احتیاطاً تحریر میں نہیں لاتا۔ یہ چاہتا ہوں کہ سب کے بعد لکھوں۔ فصحا کو اس لفظ پر توجہ کرنی چاہئیے۔ (یعنی اس کو داخل فصاحت کرنا چاہئیے) (شاید حضرت کو یہ علم نہ تھا کہ آپ کے ہمعصر قریب قریب تمام فصحائے ملک اس کو فصیح تسلیم کر چکے۔ اس لئے اب لعد کا سوال نہیں رہا۔ (ا ب)

ان آرا گرامی کے علاوہ بہت سی آرا میرے پاس اور موجود ہیں۔ جن کا اظہار قبل اشاعت میں مصلحت کے خلاف سمجھتا ہوں اور جو اپنے وقت پر رہنمائے تعلیم میں شائع ہو جائیں گی۔ ناظرین شاہکار اگر چاہیں تو رہنمائے تعلیم کا سال حال کا فائل ملاحظہ فرمائیں۔ اس میں مشرح حالات معلوم ہو سکیں گے اور اعجاز صاحب نے شاہکار میں جس نوعیت سے سوالات قائم کئے ہیں ان کے ایک ایک لفظ کا مدلل جواب ان کو دیا جا چکا ہے۔ مگر اس کو کیا کیا جائے کہ باوجود ہر بات کا جواب پا لینے کے پھر دنیا کو فریب دینے اور ایک بات کو بار بار دہرانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

ظاہر بات ہے کہ ان آراء کے مقابلہ میں زبان کھولنا انتہائی ڈھٹائی ہے اور اپنی ہٹ دھرمی کا اعلان بھی۔ مگر چونکہ اپنی جماعت میں اپنا وقار باقی رکھنے کے لئے ایمانداری اور صحیح خدمتِ ادب کے جذبات کو پس پشت ڈالتے ہوئے اعجاز صاحب نے جواب دینا ضروری سمجھا۔ لہذا اپنے رسالہ میں تو انہوں نے کچھ لکھنا .... خلاف مصلحت سمجھا۔ اس لئے کہ وہ جو کچھ لکھتے وہ جواب ہوتا میرے مضامین کا جس میں انہیں لامحالا فصحائے عصر کے خلاف قلم اٹھانا پڑتا اور اس چیز کو وہ خواہ کتنی ہی رنگین عبارت میں پیش کرتے مگر ہر منصف دماغ پر یہ اثر پڑے بغیر نہ رہتا ـــــ کہ "یہ اپنے لیے مسلم اساتذہ کی مخالفت کر کے اپنی غلط بات پر ڈٹے ہوئے ہیں۔" اس لئے بہت سوچ سمجھ کر انہوں نے کچھ سوالات قائم کئے اور حضرت تاجور سے اس کا

استفسار کیا تاکہ اپنے پرائیویٹ خطوں میں یہ لکھنے کی گنجائش نکل آئے کہ "یہ بحث شاہکار میں جاری ہے۔" دوسرے یہ کہ اگر علامہ موصوف کچھ ان کی موافقت میں جواب دیدیں تو پھر تو اُنہیں تمام اُن کاسہ وائیوں کا . . . .
. . . . جواب وہ ہونا پڑے جن کے جواب دہ اعجاز صاحب ہیں۔ مگر اس کو کیا کیجیے کہ ان کا تیر نشانے پر نہ پڑا۔ اور علامہ صاحب نے وہ تمام پیچھے بے لاگ جواب دیدے جو قدرتی اور زمانہ کے تقاضے کے موافق تھے۔ سچ ہے حق کو ناحق ثابت کرنے کے لئے بڑی مشکلات کا سامنا ہوتا ہے۔ معقولیت کا تقاضا تو یہ تھا کہ پورے ملک کی آواز کو سن کر اعجاز صاحب نہایت فراخدلی سے شاعر میں اعلان کر دیتے کہ میں غلطی پر تھا اور اب اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔ مگر ایسا کرنے کے لئے بڑے . . . کی ضرورت ہے۔ حالانکہ صرف شہرت و برتری کی بقا کے لئے انہوں نے ایسا نہ کیا۔ اگر ایسا کرتے تو ارباب علم و عقل کے نزدیک ان کی شہرت و برتری نیز معقولیت مسلم ہو جاتی۔

آئیے اب اعجاز صاحب کے سوالات پر سرسری نظر ڈال لیں۔ وہ اپنے سوال ۱ و ۲ میں کسی لفظ کو الغلط العام فصیح قرار دینے کے لئے مستند اساتذہ اور فصحا کا استعمال بکثرت ضروری سمجھتے ہیں۔ شروعات ان کو ڈھونڈے بھی اساتذہ متقدمین کے یہاں نہیں ملتا۔ اس لئے اس لفظ کو لفظ فصیح قرار دینے کے موید نہیں۔ بلکہ جہلا کی زبان بتاتے ہیں۔ حضرت علامہ تاجور بھی جو نہ صرف یو۔پی اور پنجاب کو قابل فخر ہیں۔ بلکہ تمام ملک ان کی بات کو مستند مانتا ہے۔ سوال ۱ کا جواب وہی دیتے ہیں جو نہ صرف اعجاز صاحب کے موافق ہے۔ بلکہ سچا بھی ہے اور میں خود اپنے مضامین میں اُسے تسلیم کر چکا ہوں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ کلیہ اُن الفاظ کے لئے ہو سکتا ہے جو زمانہ حال سے پہلے فصیح قرار دئے جا چکے۔ شروعات نے تو اس دور میں شہرت و مقبولیت نیز اشاعت کے مدارج طے کئے ہیں یا کر رہا ہے۔ یہ لفظ متقدمین کے یہاں کس طرح مل سکتا ہے۔ مستقبل کے فصحا کے کلام میں تلاش کیا جا سکے گا۔ ابھی تو اساتذۂ عصرِ حاضر اس کو اپنا رہے ہیں۔ ان کی زبان میں دخل پا رہا ہے۔ سب اس کی معنویت خوبصورتی کے موید ہیں اور استعمال کرتے ہیں۔ جیسا کہ خود حضرت تاجور نے تسلیم فرمایا۔ پھر اس کو فصیح مان لینے میں قصر الادب آگرہ کو حجت کیوں ہے؟ فصیح کیا ہے؟ ایک غلط لفظ جس کو مستند فصحا پسند کر کے استعمال کرنے لگیں۔ شیکسپیر کتنا غلط گو شاعر تھا جس کی ہر غلطی اپنی مثال خود ہے۔ مگر جب وہ عروج اور ارتقا پر پہنچ کر مقبولیت کے انتہائی درجہ پہ آیا تو یورپ نے اس کے استعمال کردہ غلط الفاظ اور محاورات کی ایک الگ ڈکشنری بنا کر اس کی تمام غلطیوں کو داخل زبان کر لیا نہ صرف داخل زبان کر لیا بلکہ وہ سب غلطیاں جانِ فصاحت بن گئیں۔

اور یہاں تو ایک ضابطہ کے اندر ایک لفظ کو فصیح قرار دینے کا سوال ہے۔ اور اُس سوال کے موید ہندوستان کے ۱۳ شیکسپیر ہیں۔ مگر ایک قصر الادب اپنی ضد کی بنا پر سب کو ٹھکرا دینے کے لئے اڑا ہوا ہے اور تسلیم نہیں کرتا مطلب یہ کہ اتنے گرامی قدر حضرات کی آرا و اس کو فصیح قرار دینے کی موید ہیں کہ اب اگر مگر کی گنجائش نہیں رہتی۔ کبھی کسی غلط لفظ کو فصیح بنانے کے لئے حضرت جبریل ؑ نے زمین پر آکر منادی نہیں کی۔ بلکہ اس دور کے فصحا نے ہی اس لفظ کو اپنایا اور فصیح بن گیا۔ اس دور کے فصحا یہی حضرات ہیں اور سب کے دل میں اس کے استعمال اور اپنانے کا جذبہ موجود ہے۔ نہ صرف موجود ہے بلکہ وہ اس کے فصیح ہونے کی کھلی رائے دیتے ہیں۔ پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انہوں نے استعمال کیوں نہیں کیا؟ بطور حضرت تاجور سب اپنی پرائیویٹ گفتگو میں استعمال کرتے ہیں اور بہت سے خود اعتماد اس کو اپنی نثر و نظم میں بے تکلف لکھتے ہیں۔ مگر بہت سے حضرات بر بنائے احتیاط اس کو استعمال کرتے ہوئے اس لئے ڈرتے ہیں کہ ان کے ہمعصر اُن پر اعتراض نہ کر دیں۔ حضرت تاجور نے سوال ۱۲ کے جواب میں نہایت سچائی سے اس کا اعلان کر دیا کہ وہ ہر طرح اس لفظ کو فصیح قرار دینے کے حامی ہیں۔ مگر تحریر میں سب کے استعمال کے بعد لانا چاہتے ہیں اس کے دوسرے معنی یہ بھی ہیں کہ حضرت تاجور بھی راقم الحروف کی طرح (جیسا کہ میں رہنمائے تعلیم میں لکھ چکا ہوں)، اس بات کا یقین رکھتے ہیں کہ اب یہ لفظ بغیر فصیح قرار پائے رہ نہیں سکتا۔ آج نہیں تو کل سہی اس کو فصیح قرار ضرور دیا جائے گا۔ مگر گستاخی معاف۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ فصحا حضرات ایک دوسرے کا راستہ کیوں دیکھتے ہیں کیا ان کو اپنے فصیح العصر ہونے پر اعتماد نہیں۔ کیا اُن کی فصاحت کی سفارش میر۔ سودا یا مومن۔ غالب آکر کریں گے؟ اور اگر اسی طرح کل فصحائے ملک ایک دوسرے کا منہ تکتے رہیں کہ پہلے حضرت تاجور استعمال کریں تو میں بھی کروں تو ایسی حالت میں مدتِ مدید تک یہ نوبت نہ آئے گی کہ یہ لفظ استعمال میں آکر ٹکسالی بن سکے۔ بغیر استعمال کئے تو کوئی چیز استعمال ہو نہیں سکتی۔ پس جو چیز استعمال کے قابل ہے اور آپ استعمال کا حق بھی رکھتے ہیں تو کیوں استعمال کر کے راستہ نہیں کھول دیتے اور کیوں زبان میں ایک لفظ کا اضافہ نہیں کرتے۔ حالانکہ سب کا دل یہی چاہتا ہے کہ آج ہی یہ ٹکسالی بن جائے۔ بس اس جمود کو توڑنے کے لئے ضرورت تھی کہ قدرت کوئی ایسا انتظام کرے کہ فصحائے عصر اپنی رائے بے خوف ہو کر دے سکیں اور آج آپ کے سامنے اس لفظ کو فصیح قرار دینے کے موید ۱۳ فصحائے عصر مندرجہ بالا موجود ہیں۔ سب کی آرا پڑھ کے اور اعتراضات سے بغیر خوف کھائے استعمال کیجیے۔ جب آپ جیسے مستند اور فصیح العصر شروعات کی فصاحت پر فتویٰ دے چکے اور اس کا استعمال بھی فرمانے لگیں گے۔ تو ایک حضرت سیماب یا ان کے تلامذہ

ایک اور ساتھی آپ کی ہمنوائی پر مجبور ہو جائیں گے - خواہ ان کی تجارتی مصلحتیں ان کے عدم استعمال میں کتنی ہی مانع ہوں :

میں خیال کرتا ہوں کہ اعجاز صاحب کے سوالات پر جو پردے حضرت تاجور مدظلہ کے جوابات کے بعد بھی پڑے رہ گئے تھے وہ اس مختصر تحریر میں اُٹھ گئے ہوں گے - خدا کا شکر ہے کہ اب قصر الادب کے ارباب شروعات کو عوام کی زبان قرار دے رہے ہیں - اور غالباً انہوں نے اپنے اُن الفاظ کو واپس لیا کہ یہ جہلا کی زبان ہے اور ادب میں اس لفظ کا کہیں وجود نہیں - یا یہ لفظ کسی زبان پر نہیں - حضرت تاجور کے جواب سے نا امید ہو کر دیکھنا یہ ہے کہ اعجاز صاحب اب کیا ترکیب اپنے مطلب برآری کی استعمال کرتے ہیں - ہمارا انہیں یہ دوستانہ مشورہ ہے کہ اب وہ ہٹ دھرمی چھوڑ دیں اور ملک کے اتنے مسلم الثبوت اساتذہ کی بات کو ٹھکرا کر اپنی بات بالا کرنے کی سعیٔ لاحاصل نہ فرمائیں اور پیچ در پیچ سوال کر کے اکابرین کو دھوکا دینے اور اپنے ضدی ہونے کا ثبوت نہ دیں - کیونکہ اس آٹے کو وہ جتنا چھانیں گے وہ کرکرا ہوگا - اب ناظرین شاہکار پر یہ راز بھی منکشف ہو گیا ہوگا - کہ شروعات کو ٹکسالی بنانے والی جماعت اس بنیاد پر اس کو ٹکسالی ماننے پر مجبور ہے اس کے پاس اس لفظ کی فصاحت کے مؤید ۱۳ ایسے فصحائے ملک ہیں جن کی آواز کے ... خلاف آواز بلند کرنا کفرانِ ادب ہے اور ان کا فیصلہ اٹل ہے لہٰذا وہی جماعت حق پر ہے جس کی صداقت کو ۱۳ علماء ادب تسلیم کر چکے ہیں - کس قدر حیرت کی بات ہے کہ اعجاز صاحب کے حق میں جب ۲ رائیں تھیں اور ان کے مخالف کے پاس ایک رائے تو انہوں نے ببانگ دہل یہ فیصلہ صادر فرما دیا - کہ دو کے مقابل ایک رائے کی کوئی وقعت نہیں اور دو رائے رکھنے والا حق پر ہے - آج جب ان کے مخالف کے پاس ۱۳ رائے ہیں (علاوہ ان کے جو ابھی منصۂ شہود پر نہیں آئیں) اور ان کے پاس وہی ۲ جن میں ایک ان کے والد ماجد کی رائے ہے تو اس حالت میں بھی وہ اپنے صادر کردہ فیصلہ پر اڑے ہوئے ہیں اور اکابرین کو فریب میں مبتلا کر کے اپنے سر کی دوسروں پر دھکیل کر خود علیحدہ ہو جانا چاہتے ہیں - تاکہ پھر دور سے کھڑے ہو کر تماشا دیکھیں - افسوس اس ذہنیت پر

فقط

ازراہِ کرم حسب ذیل سوالات کا جواب شاہکار کے ذریعہ عنایت فرما کر شاکر فرمائیے۔ (ابر احسنی)

(۱) کسی لفظ کے الغلط العام فصیح کے ذیل میں شمار کرنے کے لئے کِن کِن چیزوں کی ضرورت ہے ؟

(۲) "شروعات" جو شہرت و مقبولیت کے بہت سے مدارج طے کر چکا - ادبی تحریروں میں یہ اکثر نظر آتا ہے فصحا اس کو اپنی پرائیویٹ زبان میں بولتے ہیں اور لکھتے بھی ہیں - ملک کے ۱۳ مسلّم فصحا اس کے فصیح ماننے اور جاننے کا فتویٰ دے چکے ہیں - کیا اس قابل ہے کہ اس کو فصیح قرار دیا جاسکے ؟ اگر نہیں تو کیوں ؟

(۳) کیا جو غلط الفاظ دورِ حاضر یا مستقبل میں فصیح بنے یا بن رہے ہیں یا بنیں گے ان کے لئے ضروری ہے کہ وہ فصحائے ماضی کے کلام میں ملیں اگر ضروری ہے تو یہ کیونکر ممکن ہے ؟

(۴) فصحا - کن حضرات کو کہہ سکتے ہیں ؟ کیا وہ اصحاب فصحا کہے جا سکتے ہیں جنہوں نے اساتذہ متقدمین کے بنائے ہوئے راستے میں اجتہاد کی آڑ لیکر سینکڑوں روڑے اٹکائے ہوں اور اُن کے اصولوں کی کھلم کھلا مخالفت کی ہو ؟

ادارے کا نوٹ :-

شروعات کے لفظ سے متعلق حضرت اعجاز سیمابی اکبرآبادی مدیر شاعر نے مجھے کچھ سوالات بھیجے تھے - میں اصل ہنگامے سے بے خبر تھا - جو کچھ میری رائے ناقص میں آیا جواب لکھ کر ایک کاپی اُنہیں بھیج دی اور دوسری شاہکار کے بہرۂ سوال و جواب کے حوالے کر دی - حضرت ابر گنوری کے اس مضمون سے معلوم ہوا کہ یہ لفظ ایک ادبی جدال کا محور بن رہا ہے اگر پہلے سے مجھے معلوم ہوتا تو کم سے کم شاہکار میں شائع نہ کرتا - شاہکار میں میرے جواب کو پڑھ کر حضرت ابر نے یہ مضمون بغرض اشاعت روانہ کیا ہے - بات یہ ہے کہ علمی یا ادبی مباحث میں جب جذبات مشتعل راہ پا جاتے ہیں تو یہ مفید بحثیں ضرر رساں بن جاتی ہیں - ابر صاحب کے اس مضمون میں بے ضرورت تلخ نوائی نے بحث کے افادی پہلو کو مجروح کر دیا ہے -

علامہ سیماب ادبی طبقات میں صاحب نظر و سائے استاد کا درجہ رکھتے ہیں، وہ اگر کسی جدید لفظ کی فصاحت و عدم فصاحت پر اظہار رائے فرمائیں تو اُنہیں حق پہنچتا ہے - میرا خیال ہے کہ اس ہنگامے کے ہیبت پس منظر سے اعجاز صاحب کو کچھ دلچسپی ہو تو ہو - علامہ موصوف کی رائے کو میں اس سے بلند تصور کرتا ہوں -

ابر صاحب اگر اس مضمون میں جذبات کی آمیزش نہ کرتے تو بہت مناسب ہوتا - اس مضمون میں مشاہیر ادب کے فتوے دیکھنے کے بعد اب میں مطمئن ہو گیا ہوں کہ "شروعات" سے متعلق میری رائے غلط نہ تھی اور اس لفظ کی افادی حیثیت کے پیش نگاہ اردو زبان کے فصیح الفاظ میں اسے شامل کر لینا چاہیئے - حضرت ابر کے مرسلہ سوالات کا جواب مندرجہ ذیل ہے :-

(۱) رواج عام - یعنی خاص و عام میں اس کا استعمال ہونے لگا ہو

(باقی صفحہ ۴۲ پر دیکھیں)

اُن کے نام

میں تمہارے بغیر بے چین رہتا ہوں ایک پل قرار نہیں تمہاری صورت اچھے دیکھکر مکھیاں تک خود بخود کھچی چلی آتی ہیں۔ ہر وقت آنکھوں کے سامنے رہتی ہے تمہارے دانت! اُف تمہارے سونے کے رنگ کے دانت کس قدر خوبصورت ہیں جب چاہتی ہو تم انہیں منہ میں رکھ لیتی ہو۔ اور جب چاہتی ہو طاق میں اٹھا دیتی ہو تمہیں دیکھکر کوے بھی وجد میں آکر گانے لگتے ہیں۔ چڑیا گھر والے تمہارے وجود پر جتنا بھی فخر کریں کم ہے۔

تم جانو شہر کے لوگ بہت چالاک اور ہوشیار ہوتے ہیں۔ باوجود کوشش کے اس مہینے میں دو تین سے زیادہ چھیپں نہ کتر سکا پھر تمہیں بتاؤ میں تمہیں خط کیسے لکھتا۔ کل بازار میں ایک بابو کپڑوں کا لفافہ لئے جا رہے تھے۔ لفافے میں سے میں نے ایک پنسل کی نوک نکلی دیکھی۔ یہاں بڑے بڑے دکاندار پنسلوں پر اپنی دکانوں کے پتے لکھوا کر اپنے گاہکوں میں مفت تقسیم کیا کرتے ہیں تمہیں خط لکھنے سے بیٹھا تھا۔ ایک جگہ بابو بھیڑ میں جو ٹھہرے۔ تو میں نے پنسل کھینچ لی بہت خوبصورت ہے وہ پنسل ——— مجھے معاف کر دینا میں تمہیں بُرے سے کاغذ پر خط لکھ رہا ہوں یقین جانو۔ مجھے اس سے اچھا کاغذ دستیاب نہ ہو سکا۔ تم نے جو مجھے پیسہ دیا تھا نا۔ میں نے اس کے پکوڑے کھا لئے ہیں۔ ایک تو پیسہ تمہارا دیا ہوا تھا دوسرے پکوڑے اس قدر مزیدار تھے۔ کہ میں وہ کاغذ پھینک نہ سکا روزانہ صبح کو چاٹ لیتا ہوں۔ تم بھی چاٹ لینا۔

آج کل بہت جانفشانی سے کام کرنا پڑتا ہے۔ کچھ پیسے جمع ہو جائیں تو اطمینان کا سانس لوں کس لئے؟ یہ بتاتے ہوئے شرم آتی ہے۔ مگر شرم کس بات کی۔ یہ دن تو سب کو دیکھنا پڑتا ہے لیکن پہلے سے انتظام کر لینا عقلمندوں کا کام ہے ——— خدانخواستہ اللہ میاں تمہیں مجھ سے چھین کر اپنے پاس بلا لیں تو میں تمہیں شان سے رخصت تو کر سکوں۔

اب شام ہو گئی ہے۔ بازار میں لوگ آ رہے ہیں۔ اب مجھے جانے دو ممکن ہے کوئی "شکار" ہاتھ لگے۔ چھوٹا سا خط لکھنے کے لئے معاف کر دینا۔

اسلم

شاہکار اور اردو مرکز کی علیحدگی

ادارہ شاہکار اور ادارہ اردو مرکز علیحدہ علیحدہ ادارے ہیں۔ لہٰذا تمام احباب روپیہ بھیجتے وقت جس ادارہ کا بل ہو اسی کے نام رقم بھجوایا کریں۔ ورنہ وہ نقصان کے خود ذمہ دار ہوں گے۔ (مینجر)

غزل

جہانِ عشق میں پھر دورِ انقلاب آیا
قیامت آئی کہ ظالم ترا شباب آیا

نگاہِ شوق سے اُٹھے جو پردہ ہائے دُوئی
تو ذرہ ذرہ نظر بن کے آفتاب آیا

لباسِ فصلِ بہاری میں تھی خزاں پنہاں
مسرّتوں کا زمانہ برنگِ خواب آیا

تری نگاہ کے بہکے ہوئے تصوّر میں
نہ بھول کر بھی خیالِ شرابِ ناب آیا

کھُلی جو چشمِ حقیقت شناس دُنیا میں
ہر ایک سمت نظر حُسنِ لاجواب آیا

وہ حُسن جس کیلئے طور پر گئے تھے کلیمؑ
نظر وہ مجھکو مرے دل میں بے حجاب آیا

سُنے جو مُطربِ اُلفت کے آتشیں نغمے
پلٹ کے میری نظر میں مرا شباب آیا

طفیلؔ بھولنے والے کی یاد کیا آئی
جہانِ قلب کو پیغامِ اضطراب آیا

طفیل بینے والوی

سید مقصود علی ہاشمی (بھوپال)

ترقّی

پورے مہینہ بھر قلم گھسیٹتے رہنے کا معاوضہ اسے ۳۰ روپیہ ملتا تھا۔ وہ صاحب کو خوش رکھنے کی ہر امکانی کوشش کرتا تھا۔ مگر صاحب کسی نہ کسی بات پر ضرور اُسے ڈانٹ دیا کرتے تھے۔

یہ حقیقت ہے کہ دن بھر پنکھوں کی ہواؤں میں ٹانگیں پھیلا کر آرام سے سونے والے صاحب کو کیا مشکل تھی۔ کہ وہ کسی کاغذ پر دستخط کرتے وقت اپنے ماتحتوں کو یہ تبلانے کے لئے۔ کہ وہ صاحب ہے۔ کوئی بیکار سا نقص نکال دے۔ اس کے علاوہ ہندوستان میں وہ صاحب ہی کیا جو اپنے ماتحتوں کے کام میں نقائص نہ نکالے۔

چنانچہ جہاں تک وہ اچھا کام کرتا تھا۔ کہ صاحب کسی ترقی کے موقع پر اُس کی سفارش محکمہ کے اعلیٰ آفیسر سے کردیں۔ وہاں صاحب اور اچھا کام لینے کی امید میں ایک نہ ایک غلطی ضرور نکال دیتے تھے۔ اس تانگہ والے کی طرح جو بھاگتے ہوئے گھوڑے کو اور تیز دوڑانے کے لئے ہر دس پانچ قدم کے بعد ایک چابک جما دیتا ہے۔

مگر اس پر بھی اُسے امید تھی کہ وقت آنے پر ضرور اس کا خیال کیا جائے گا۔ وقت آنے کا انتظار وہ اپنی ۲۰ سال کی عمر سے اس وقت تک کر رہا تھا۔ جبکہ اُس کے اعضا مضمحل ہو گئے تھے۔ زندگی کی حرکت سست اور دماغ مردہ ہو گیا تھا۔ آنکھوں کی روشنیاں بجھ سی گئیں تھیں۔ کائنات کی تمام دلچسپیاں بے لذتی میں تبدیل ہو گئیں تھیں۔

اُسے سوائے اپنی ترقی کے خیال کے دنیا کی کسی شے کا خیال نہ تھا۔ اسی امید میں اُس کی ہر صبح شام میں تبدیل ہو جاتی اور ہر شام صبح پر ختم ہو جاتی۔ مگر ترقی کے دلچسپ خواب اُس کی کائنات میں روشنی دیتے رہتے تھے۔

وہ صبح سب سے پہلے دفتر پہنچتا ـــــ اور شام اس وقت لوٹتا جب کائنات پر دھندلکے لوٹنے لگتے۔ سورج اپنی آخری ہچکیاں لیکر افق پر دم توڑ دیتا، اُسے کائنات کی ہر شے بے رونق اور مضمحل نظر آتی تھی۔ سڑک کے کنارے جھولتے ہوئے درخت ایک ہیولی کی طرح اُس کے خیالات کے پردوں پر گھومتے تھے۔

وہ بغیر کسی دلچسپی کے اس لمبی سڑک کو پار کر جاتا، اُس کی نظر میں صرف تھالی میں رکھی ہوئی روٹی مبہم دائروں میں پھرتی رہتی تھی شام ہوتے ہوتے گھر پہنچ جاتا تھا۔

اس قلیل تنخواہ میں وہ اپنے چھ چلتے پھرتے بچوں کو پال رہا تھا۔ سب سے بڑی لڑکی جو شباب کی منزلوں میں کھیل رہی تھی۔ اس کے بعد کا ایک لڑکا جو اب کافی ہوشیار تھا، اور دن بھر سڑکوں پر سرگشت کرتا پھرتا تھا جس کے متعلق اس نے کبھی سوچا بھی تھا تو صرف یہی کہ قسمت جو بنائے گی وہ ہو جائے گا۔ اس کی بیچ کی دو لڑکیاں اور دو لڑکے جن میں سے ایک چل پھر سکتا تھا اور دوسرا دھول خاک میں لتھڑا ہوا تمام گھر میں گھٹنوں چلنے کی مشق کر رہا تھا۔

ساتواں بچہ بغیر اپنی ماں کی خواہش کے اُس کے پیٹ میں تخلیق ہو رہا تھا جس کو اولادِ آدم بڑھانے کے مقدس فرض میں دو مرتبہ تقریباً موت نے نگل کر اگل دیا تھا، اگر برتھ کنٹرول کو وہ اعتقادی طور سے گناہ نہ سمجھتی تو یقیناً اس جی گھبرا دینے والی تخلیق کا سدِّ باب کر دیتی۔ جو اُس کی حد سے زیادہ بڑھی ہوئی مفلسی کے لئے ایک نہ سنبھلنے والا بوجھ تھا۔

زندگی کی دوڑ دھوپ میں اُسے یہ سوچنے کا موقع نہ ملا تھا کہ اس بے تحاشا بچہ پیدا ہونے کا مفہوم کیا ہے؟ وہ ہر بات کو سطحی نگاہ سے دیکھتی تھی جو کچھ ہوتا ہے وہ خدا کی مرضی سے ہوتا ہے۔ اس نظریے کے ماتحت اُس نے کبھی اپنی زندگی کا تجزیہ نہیں کیا تھا۔

نظامِ قدرت سمجھنے میں وہ اس سیدھی سادھی مسلمان عورت کی طرح تھی جو ہر اذیت اور ہر تکلیف کو اپنے ناکردہ گناہوں کا بدلہ خیال کرتی ہے۔

اگر ایک بچہ پیدا ہونے سے روک دیا جائے تو اس کے بجائے ان ہزاروں بچوں کا خون ہوتا ہے۔ جو نسل در نسل اس کے ذریعہ سے پیدا ہونے والے ہوتے ہیں۔ وہ اس عقیدے پر پختہ اعتقاد رکھتی تھی، اور اس کے بعد یہ سلسلہ اور اس گناہ کا بدلا خدا کے قہر اور جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ تک چلا گیا تھا۔ چھٹے بچے کے بعد اس نے اپنی التجائیں دعا کی صورت میں خدا کے سامنے پیش کر دی تھیں، کہ اب اُسے اس اولادِ آدم کے بڑھانے کے فرض سے سبکدوش کر دیا جائے۔

لیکن چھ مہینے بعد ہی اُسے معلوم ہو گیا کہ اس کی مرضی کے خلاف کچھ ہو رہا ہے اور وہ یہ سوچ کر خاموش ہو گئی کہ بچے پیدا ہی ہوتے ہیں۔

اس کو کبھی خاوند کی تنخواہ میں ترقی کا خیال مصیبتیں برداشت کرنے کی
ہمت دلاتا رہتا تھا، جو اُس کے خیال میں اب ہونے والی تھی - اس کے
بعد مستقل آرام کی سنہری تصویریں اُسے اپنے کنوارپن سے بھی زیادہ شاندار
معلوم ہوتی تھیں -

وہ دونوں زندگی کی گاڑی گھسیٹتے ہیں، ان تھکے ماندے بیلوں کی طرح
تھے جو لامحدود راستہ طے کرنے کے بعد بھی ناقابل عبور گھاٹیاں اس شوق
میں چڑھتے چلے جاتے ہیں کہ اس کے بعد ضرور منزل آجائے گی۔

وہ بھی افلاس کے قہرمان سمندر میں اپنی کشتی حیات کو اس اُمید
پر ڈوبنے سے بچائے ہوئے تھے کہ کسی نہ کسی دن وہ ضرور زندگی کے شاداب
ساحل تک پہنچ جائیں گے اور اب جبکہ انہیں یہ محسوس ہو رہا تھا، کہ یہ شکستہ
کشتی جو صرف آٹھ آدمیوں کے وزن سے سطح آب سے مل جا رہی ہے - نواں
آدم کا سپوت بھی انہیں کو دنے والا ہے - تو وہ خوف سے کانپ اُٹھتے تھے -
جب اس کی بیوی پوچھتی کہ کچھ ترقی کی اُمید بھی ہے، یا یونہی خیالی پلاؤ
پکایا کرو گے -

تو اُسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے کسی نے سوتے سے جگا دیا، وہ تھوڑی
دیر کے لئے سب کچھ بھول جاتا، کائنات اس کی نظروں میں تاریک ہو جاتی
دور - تاریکیوں میں امید کی ایک کرن جگمگاتی اور اس کی تاریک دنیا روشن
ہو جاتی - وہ کہتا، میں سخت کوشش کر رہا ہوں، جگہ خالی ہونے والی ہے -
چھوٹے صاحب مجھ سے خوش ہیں، وہ ضرور سفارش کر دیں گے -

اور اگر بڑے صاحب نے ان کی نہ مانی - وہ اس خیال کو اور روشن کرنے
کے لئے کہتی - نہ — مانی - کیوں نہ مانی - بڑے صاحب اگر ایسی نہ مانا کریں تو
دفتر کا انتظام کیوں ان کے ہاتھ میں دیں - اگر ایسا خیال کرو تو پھر دُنیا ہی درگور
ہو جائے - سب لوگ اُمید کے سہارے جیتے ہیں، مجھے بھی امید ہے -

وہ مستقبل کے سنہری خوابوں میں کھو جاتے، اُن کے دل اُس مسرت
سے کانپ اُٹھتے جو تھکے ہوئے مسافر کو منزل کی قربت سے حاصل ہوتی ہے
وہ اپنی جوان لڑکی کی شادی کا سوچتے، مہمانوں کی تعداد مقرر ہوتی،
گھر کی روشنی کا انتظام، اور پھر اُن کی کائنات میں باجے سے بجنے لگتے -

---

وہ رات گئے تک کام کیا کرتا، تمام دُنیا محو خواب ہو جاتی لیکن
وہ برابر قلم گھسیٹتا رہتا - جب سے اُس نے سُنا تھا کہ جگہ خالی ہونے والی
ہے - وہ گھر پر بھی رات کو کام کرتا تھا - تاکہ صاحب کو خوش کر کے جگہ حاصل
کر لے -

وہ تھک کر چور ہو جاتا، اُس کا دماغ مضمحل، اور دماغ پر گرانی
چھا جاتی - روشنی کی سُرخ سُرخ کرنیں اس کی آنکھوں میں لوہے کی گرم
سلاخوں کی طرح گھستی ہوئی معلوم ہوتیں - وہ اپنے آس پاس حیرانی سے
دیکھتا، وہی وہ مجسمے جو اُس کے گلے میں سُوکھے نوالے کی طرح اٹکے ہوئے
تھے - اُسے فضا میں اُچھلتے ہوئے معلوم ہوتے -

بیوی کے وضع حمل کے اخراجات اور سب سے زیادہ جوان لڑکی کی
فکر - وہ لرز جاتا، اور پھر کام میں مشغول ہو جاتا، یہاں تک کہ اس کی طاقت
جواب دے دیتی، اور وہ متضاد خیالات میں اُلجھ کر سو جاتا تھا -

آخر وہ دن بھی آگیا جس کی امید پر وہ زندگی گزار رہا تھا، دفتر میں ایک
جگہ ہیڈ کلرک کی خالی ہو گئی -

صاحب نے اسے بلا کر کہا، تم لائق آدمی ہو ہم تم کو جگہ دلانے کی
کوشش کرے گا - ہم تمہارے لئے اوپر سفارش لکھ رہا ہے -

اُسے صاحب کے الفاظ ایسے معلوم ہو رہے تھے جیسے سخت گرمی
میں کوئی ہولے ہولے پنکھا جھل رہا ہے -

وہ صرف جگہ دینے کے لفظوں کو سمجھ سکا - اور باقی الفاظ اس کے
کانوں کے پردوں پر بغیر کوئی مفہوم چھوڑے گزرتے چلے گئے -

ترقی کا خیال جیسے زندگی کا خیال تھا جس نے حیات کی بجھتی ہوئی
رگوں کو پھر سے جگمگا دیا، اس کا دماغ بلندیوں پر پرواز کر رہا تھا - اور
میلی دری جس پر بیٹھے بیٹھے وہ عمر کی ۵۰ منزلیں طے کر گیا تھا - اُسے
ایسی پُرہیبت معلوم ہو رہی تھی - جیسے کسی مقتول کے خون آلود کپڑے -
کتنے ارمان - کتنی تمنائیں اس دری پر بیٹھے بیٹھے اُس کے دل میں پیدا
ہوئیں اور پھر اسی میں دفن ہو گئیں -

اب وہ کرسی پر بیٹھا کرے گا - اور میز پر کاغذات جما کر لکھے گا -
اس کے خیالات مستقبل کے سنہری کُہر میں اُڑتے پھر رہے تھے -

صاحب چلے گئے - اور اُسے خبر بھی نہ ہوئی - وہ آج مسرت کی دنیا
میں کھویا ہوا تھا، جہاں آرام و راحت کی جاں بخش ہوائیں اس پر ہوا کر رہی
تھیں -

وہ جب دفتر سے نکلا، تو اپنے آپ کو بالکل بدلا ہوا پاتا تھا - آسمان
پر ڈوبتے سورج کی گلابیاں آج اُسے پھیکی اور بے کیف ہونے کے بجائے
ایسی معلوم ہو رہی تھیں جیسے اس کی خوشی میں قدرت نے یہ اہتمام کیا ہے -

اس کا دل چاہتا کہ ہر ایک سے کہتا پھرے کہ کل وہ ہیڈ کلرک ہو
جائے گا - اُس کے ایک دم ۲۰ روپیہ بڑھ جائیں گے - وہ لمبے لمبے ڈگ
بھرتا معمول سے پہلے گھر پہنچ گیا -

اس کی بیوی لیٹی ہوئی تھی -

"شاید تمہاری طبیعت خراب ہے۔" اس نے کہا اور قبل اس کے کہ وہ کوئی جواب دے اس نے اپنے ہونے والی ترقی کی خبر سنا ڈالی۔

آج وہ اپنی جوان بیٹی کو پریشانی کی نظروں سے نہیں دیکھ رہا تھا۔ اس نے کھانا کھانے کے بعد خلوص دل سے نماز پڑھی اور بڑی دیر تک دعائیں مانگتا رہا ——۔

صبح معمول سے پہلے وہ دفتر پہنچ گیا —— آج وہ اپنی پرانی جگہ سے رخصت ہونے والا تھا۔ اس نے بے ترتیب کاغذات، اور مسائل ترتیب سے اپنے شکستہ صندوق میں جما دیئے، اور میلی دری کو خوب جھاڑ کر صاف کر دیا۔ عمر کے بیشمار دن کی رفیقہ، اس کے ارمانوں کی قبر یہی دری تو تھی۔ آج وہ یہاں سے رخصت ہونے والا تھا، اس نے جلدی جلدی اپنا کام ختم کیا پھر صاحب کا انتظار کرنے لگا۔

خدا خدا کر کے ۱۲ بجے صاحب آئے، وہ بے چینی سے اپنے بلائے جانے کے انتظار میں اٹھ کر ٹہلنے لگا۔

جب وہ صاحب کے سامنے پہنچا، تو جھک کر سلام کیا اور پھر خاموش سیدھا کھڑا ہو گیا

صاحب نے اپنی سنہری فریم کی عینک اتاری، پھر ایک سرسری نظر سے اسے دیکھا۔

"ہم کو بڑا افسوس ہے۔ بڑا صاحب وہ جگہ اپنے فیملی مین کو دیگا"۔

اس کی آنکھوں میں کمرے کی دیواریں رقص کرنے لگیں، پنکھے کی ہوا میں لرزتے ہوئے کاغذ اسے ایسے معلوم ہو رہے تھے۔ جیسے کسی خوفناک خواب کے بھیانک منظر —— جیسے کسی نے فضا کی بلندیوں سے اسے نیچے چھوڑ دیا ہو ——

وہ خاموشی سے سر جھکائے ہوئے چلا آیا۔

وہ دفتر میں بالکل نہ ٹھیرا، سیدھا گھر کی طرف بھاگا، جیسے کوئی خواب میں اڑتا ہے، اس کے دماغ میں ایک خبط تھا۔ ایک دیوانگی تھی وہ چاہتا تھا کہ اس کی بیوی کا حمل ساقط ہو جائے۔ یا کاش بچہ ہوتے ہی مر جائے +

بقیہ "کچھ شروعات سے متعلق"

یہ وضاحت اس لئے کی ہے کہ رواج عام سے رواج عوام کا مغالطہ نہ ہو جائے۔ ساتھ ہی یہ بھی عرض کر دوں کہ اگر کاملین ذوق میں سے کوئی صاحب نظر استاد کسی ایسے لفظ کو گراں بار ذوق خیال کرے جو رواج عام پا چکا ہے تو اس پر طعن و تشنیع روا نہ ہوگی، ورنہ بہت سے اساتذہ سلف اس لپیٹے میں آجائیں گے۔ داغ مرحوم کے متروکات میں بہت سے الفاظ آج بھی رواج عام حاصل کئے ہوئے ہیں۔ مثلاً۔ مت۔ تلک۔ پہ بمعنی مگر وغیرہ التفات طلب ہیں۔ نواب داغ اپنے متروکات کے استعمال سے اپنی جماعت کو بھی روکتے تھے۔

(۲) شروعات کے لفظ کو میں قابل استعمال خیال کرتا ہوں۔ اس لئے نہیں کہ ۱۳ اساتذہ نے اسے فصیح اور دو چار نے غیر فصیح قرار دیا ہے بلکہ میرا خیال ہے کہ یہ طبقہ عوام سے گذر کر خواص کی زبانوں پر بھی آگیا ہے۔ ذوق سماعت کے لئے خوشگوار اور اپنے افادی پہلو سے "اردو لفظیات" میں ایک اچھا اضافہ بن گیا ہے۔ باقی یہ سوال غیر ضروری ہے کہ اساتذہ سلف نے اپنی نظم و نثر میں اسے کہیں استعمال نہیں کیا۔ کیونکہ یہ شرط ضروری قرار پا گئی تو زبان کی ترقی مسدود ہو جائے گی۔ اس سے قطع نظر ہمیں "کسواد" "کھیو" جیسے الفاظ کو آج فصیح ماننا پڑ جائے گا۔

(۳) ہر صاحب ذوق و نظر ادیب و شاعر جو الفاظ کے استعمال میں محتاط ہونے کے ساتھ ہی جدید و قدیم الفاظ کے استعمال میں صحیح انتخاب کی اہلیت کا مالک ہو فصحاء کے زمرے میں شمار ہوتا ہے۔

تاجور

قطعہ

اک ستارہ صبحدم میری نظر کے سامنے
آسماں کی نیلگوں پہنائیوں میں کھو گیا
یوں تڑپ کے جھلملا کر جس طرح ہو جائے گم
یاس کی مغموم ظلمت میں چراغ امید کا

سید جابر علی
(سیالکوٹ)

شاہکار لاہور

جلد (۱۴) فہرست مضامین بابت ماہ ستمبر ۱۹۴۲ء نمبر (۹)

خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر ضرور لکھا کریں۔ تاکہ تعمیل کرتے وقت ادارہ کو سہولت ہو۔ (مینجر)

احسان اللہ خاں تاجور پرنٹر و پبلشر نے عالمگیر الیکٹرک پریس پرانی تحصیل بازار لاہور میں چھپوا کر دفتر شاہکار واقعہ شیخ محمد روڈ متصل تکیہ اڑی سائیں لاہور سے شائع کیا۔

مختصرات

پنجاب یونیورسٹی

(۱۰)

سینٹ کے ایک ممبر کی بددیانتی

سرکاری محاسب حسابات کی جانچ پڑتال کرتے ہوئے یونیورسٹی کے کلرکوں کے "ٹانگہ الاؤنس" کے تمام بلوں کو جعلی بتاتے ہیں۔ اس پر وائس چانسلر اس معاملے کو پولیس کے حوالے کر دیتے ہیں اور پولیس کو فون پر یونیورسٹی کے کلرکوں کی گرفتاری کا حکم دے دیتے ہیں چنانچہ پولیس سب انسپکٹر پولیس کا ایک دستہ لیکر ہتھکڑیوں کے ایک انبار کے ساتھ یونیورسٹی کے دروازے پر پہنچ جاتا ہے۔ ساٹھ ستر کلرکوں کی گرفتاری کے وارنٹ دیکھ کر یونیورسٹی کا رجسٹرار ایک تاریخی جرأت کے ساتھ سینہ سپر ہو کر سب انسپکٹر پولیس سے کہتا ہے کہ یونیورسٹی کے آئین کے مطابق یونیورسٹی کا تمام آفس میرے قبضے میں ہے۔ وائس چانسلر کو اس دفتر سے کوئی تعلق نہیں۔ بہتر یہ ہے کہ آپ یونیورسٹی کے احاطے سے باہر ہو جائیں اور یا اپنے ذاتی خطرے کو قبول کر کے میرے کلرکوں کو گرفتار کر لیں۔" رجسٹرار کی اس آہنی گفتگو سے سب انسپکٹر واپس ہو جاتا ہے۔

وائس چانسلر رجسٹرار کی اس جرأت اور اپنے حکم کی بے اثری سے جز بز ہو کر اس معاملے کو سینٹ کے اجلاس میں پیش کر دیتے ہیں ادھر یونیورسٹی کے ڈیڑھ سو کلرکوں کی جماعت یونیورسٹی سینٹ کے اُن ممبروں کے پاس پہنچتی ہے جو عدالت عالیہ پنجاب کے جج بھی ہیں اور اُن سے عرض کرتی ہے:-

"بے شک ٹانگوں کے بل ہمارے بنائے ہوئے ہیں اور ان پر انگوٹھوں کے نشانات بھی ہمارے ہی ہیں - ٹانگے والوں کے نہیں - کیونکہ اکثر اوقات ٹانگے والوں سے رسید لینا بہت مشکل ہوتا ہے۔ وہ اتنی دیر اپنے ٹانگے کو ٹھیرانے پر رضامند نہیں ہوتے کہ قلم دوات اور کاغذ لایا جائے، رسید لکھی جائے - اور اس پر ان کے انگوٹھے کا نشان لیا جائے . تمام سرکاری و غیر سرکاری دفاتر میں یہی ہوتا ہے کہ سپرنٹنڈنٹ کی ہدایت پر کسی کلرک نے دفتری کام کے لئے ٹانگہ کرایہ لیا اور اس کام کو انجام دینے کے بعد کرایہ اپنی جیب سے کرایہ ادا کر کے ٹانگہ چھوڑ دیا اور پھر ضابطے کی خانہ پُری کرنے کے لئے ٹانگے سے کرایہ کا بل... ٹانگے والے کی طرف سے کرائے کی وصول یابی کی رسید بنا لی اور یونیورسٹی سے اپنی جیب سے ادا کیا ہوا کرایہ وصول کر لیا۔ مختصر یہ کہ ہم تمام دفاتر سرکاری و غیر سرکاری کے طریق عمل کے مطابق اور یونیورسٹی آفس کے دیرینہ طرز عمل کے پیش نظر فوری طور پر کرایہ اپنی جیب سے ادا کر دیتے ہیں اور پھر بعد کو یونیورسٹی سے وصول کر لیتے ہیں - دیکھنا یہ ہے کہ جن کاموں کی انجام دہی کے لئے ٹانگے لئے گئے ہیں وہ کام دفتر کو پیش آئے یا نہیں اور پیش آئے تو ان کی انجام دہی ہوئی یا نہیں؟ اگر اس بارے میں ہماری کوئی ذرا سی بددیانتی بھی ثابت ہو تو بیشک ہم دار و رسن کے سزاوار ہیں اور کسی رحم یا چشم پوشی کے مستحق نہیں - اس امر کی اچھی طرح جانچ پڑتال کر لی جائے اور ہم اصرار کرتے ہیں کہ یہ محاسبہ ضرور ہو تاکہ ہماری دیانت و بددیانتی کا امتحان ہو جائے۔"

لیکن حضور والا! ایک اور پہلو سے بھی اس واقعے پر نظر ڈالنے کی ضرورت ہے - وہ یہ کہ فرض کر لیجئے ہم نے جعل سازی کی ہے اور ٹانگوں کا کرایہ ادا نہیں کیا تو اس قسم کے تمام بلوں کے اخراجات کی رقم سو پچاس روپے سے زیادہ نہ ہو گی جو بل پیش کرنے والے ساٹھ ستر کلرکوں پر تقسیم کی جائے تو فی کلرک دو دو روپے بھی حصے میں نہ آئیں گے - ہم کلرک کلاس کے لوگ ہیں جن کی عیالداری کے اخراجات اس اقتصادی گرانی میں دگنے ہو چکے ہیں اور

اور ہماری تنخواہیں بہت تھوڑی ہیں۔ ہم لوگ اس قسم کی بددیانتی کے مرتکب ہو جائیں تو گو قانون ہم پر رحم نہ کرے گا لیکن سوسائٹی ہمیں معذور سمجھے گی۔ مگر اسی یونیورسٹی میں جو لوگ ڈیڑھ ڈیڑھ ہزار روپے ماہانہ تنخواہ پا رہے ہیں اور یونیورسٹی سنڈیکیٹ اور سینٹ کی ممبریوں کے دوہرے دوہرے اعزاز بھی رکھتے ہیں۔ اُن میں بھی تو بددیانتوں کی کمی نہیں، اُن کے لئے بھی پولیس کی ہتھکڑی اور وارنٹ کے تعزیری سامان مہیا کرنے کی ضرورت ہے کہ جرم بہرحال جرم ہے۔ کوئی تیس روپے کا کلرک اُس کا مرتکب ہو یا ڈیڑھ ہزاری منصب کا اعلیٰ ملازم۔ کیونکہ قانون کی گیرودار کسی کے ساتھ بھی رعایت نہیں کرتی۔"

"ثابت کردہ اُن کی بددیانتی"

اس سوال پر یونیورسٹی کے ماخوذ کلرک رجسٹر نکالتے ہیں اور ایک بل پیش کرتے ہوئے عرض کرتے ہیں کہ اس بل کو پیش کرنے والا یونیورسٹی سے ڈیڑھ ہزار روپیہ ماہانہ تنخواہ لیتا ہے۔ سنڈیکیٹ اور سینٹ کا ممبر ہے۔ سنڈیکیٹ کی ہدایت پر یونیورسٹی انسپکشن کمیٹی کے ممبر کی حیثیت میں لائل پور اپنی کار پر جاتا ہے۔ یونیورسٹی کے رولز کی رُو سے اُسے بل میں یہ بتانا چاہیئے تھا کہ اُس نے لائل پور کا سفر اپنی کار پر طے کیا ہے اور اُسے بل میں صرف پیٹرول کا خرچ پانچ چھ روپے درج کرنا چاہیئے تھا۔ مگر اُس نے یونیورسٹی کی بیخبری سے بیجا فائدہ اٹھاتے ہوئے ڈبل فسٹ کلاس ریلوے کرائے کا بل تیار کر کے پیش کیا اور بل کی رقم وصول بھی کر لی ہے۔ یہ ہے اُس کی رسید۔ آنریبل جج رجسٹر کے اندراجات بل اور رسید کو ملاحظہ فرمانے کے بعد ممبر مذکور کی بددیانتی کے متعلق صحیح رائے قائم کرتے ہوئے یونیورسٹی کلرکوں کی فریادی جماعت سے فرماتے ہیں۔

"ہاں یہ بددیانتی ہے۔ اب تم جاؤ اور اپنا مفوضہ کام جاری رکھو۔"

یونیورسٹی کی سنڈیکیٹ میں جب وائس چانسلر سرکاری آڈیٹروں (محاسبوں) کی رپورٹ اور پولیس کو باہر نکال دینے کی متعلق رجسٹرار کی گستاخانہ جرأت کا معاملہ پیش کرتے ہیں تو سنڈیکیٹ کے وہی آنریبل جج بددیانت ممبر سے مخاطب ہوتے ہوئے سوال کرتے ہیں۔

"آپ نے یونیورسٹی انسپیکشن کمیٹی کے ممبر کی حیثیت میں لائل پور کا سفر ریل کے ذریعہ طے کیا ہے یا اپنی کار میں آپ وہاں گئے تھے؟"

ممبر مسئول۔ (کار کے ذریعہ اس سفر کے راز کو افشا ہوتے دیکھ کر) جناب اپنی کار کے ذریعہ۔

آنریبل جج۔ پھر آپ نے ریلوے کے ڈبل فسٹ کلاس کرائے کا بل کیوں پیش کیا؟

ممبر مسئول۔ (عذر لنگ پیش کرتے ہوئے) جناب میرے کلرک نے میری اطلاع کے بغیر یہ بل بنایا اور مجھ سے بیخبری میں اس پر دستخط بھی کرا لئے۔

حالات کی خطرناکی کو دیکھ کر سنڈیکیٹ کی دوست پرور جماعت نے تجویز پیش کر دی کہ رجسٹرار کے خلاف وائس چانسلر کی حکم عدولی اور اس ممبر کے غلط بل کا معاملہ داخل دفتر کر دیا جائے۔ اس پر اس ٹولی کے دوسرے ممبر ہاں ہاں کا شور کر دیتے ہیں اور اس طرح ممبر مسئول عنہ کی اس کھلی بددیانتی کا معاملہ دبا دیا جاتا ہے۔

اب وائس چانسلر کی خدمت میں ہم اس حادثے سے متعلق چند سوالات پیش کر کے اُن کا تسلی بخش جواب طلب کرتے ہیں۔

(۱) یونیورسٹی کے اس ڈیڑھ ہزار روپیہ ماہانہ پانے والے ملازم کا ایک فریب آمیز بل پیش کر کے یونیورسٹی فنڈ سے زیادہ رقم وصول کرنا کیا بددیانتی اور جعل سازی نہیں ہے؟

(۲) پھر اس شخص کا یہ کہنا کہ میرے کلرک نے میری ہمدردی کے جوشِ طوفان میں بہتے ہوئے یہ غلط بل بنا لیا اور اس پر بیخبری میں مجھ سے دستخط بھی کرا لئے گیا "عذرِ گناہ بدتر از گناہ" کے ذیل میں نہیں آتا؟ اور کیا کوئی عدالت مجاز اس لچر اور فریب کارانہ عذر کو قبول کر سکتی ہے؟

(۳) اس عذر نا جرم کو بھی نظر انداز کر دیا جائے تو کیا اس کے پاس اس سوال کا کوئی معقول عذر ہے کہ تمہارے کلرک کا غلط بل بنانا اور تم سے بیخبری میں دستخط کرا لینا مان بھی لیا جائے تو تمہارا اس بل کی رقم وصول کر کے اپنی جیب میں ڈال لینا بھی کلرک ہی کی غلطی ہے؟ رقم وصول کرتے ہوئے کیا تم اس حقیقت سے بیخبر ہی رہے کہ یونیورسٹی سے کس کارکردگی کی یہ رقم مجھے مل رہی ہے؟

(۴) اس واضح اور بے تاویل بددیانتی کے بعد بھی اس ممبر کو پولیس کے حوالے نہ کرنا اُس وائس چانسلر کے فرائض نگرانی کے کہاں تک موزوں ہو سکتا ہے جو دو دو چار چار آنے کے ٹانگہ الاؤنس کو مشتبہ سمجھ کر یونیورسٹی آفس کی ساری کلاریکل جماعت کو گرفتار کرنے کے لئے پولیس گارد کو بلا لیتا ہے۔

(۵) پھر یہ کہ کیا اس بد دیانتی کے رسوا ہو جانے کے بعد اُس بد دیانت ممبر سے نا ئدر قم یونیورسٹی کے خزانے میں واپس کرائی گئی؟ نہیں کرائی گئی تو کیوں؟

(۶) قانونی عدالتوں کا طریقہ تو یہ ہے کہ زیادہ ذمہ دار مجرم کو عبرت دلانے کی خاطر عام مجرموں کی بہ نسبت زیادہ سخت سزائیں دیتی ہیں۔ تو کیا اس ممبر کو میعاد ملازمت ختم ہو جانے پر پانچ سال کی توسیع کے بعد ۱۸ ماہ کی فرلو دے دینا اُس کی بد دیانتی کے جرم کی کوئی عبرتناک سزا ہے؟

پنجاب یونیورسٹی لائبریری

(۱) یونیورسٹی سینٹ کے ایک ممبر نے اپنے ایک قریبی عزیز کو یونیورسٹی لائبریری میں ملازم کرا رکھا ہے اور خود وہ ممبر لائبریری سب کمیٹی کا ممبر بھی ہے۔ یہ صاحبزادے "میاں بھے کوتوال اب ڈر کاہے کا؟" کی ساز گار فضا میں سانس لینے کے عادی بن رہے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے گذشتہ سال کی تازہ خرید کردہ کتابوں کو ابھی تک ہاتھ نہیں لگایا، اُن کا انبار اپنے لاابالی منتظم کی تغافل فرمائی کا فریادی ہے۔ اس لئے کالجوں کے طلبہ اور اساتذہ تازہ عربی و فارسی لٹریچر کے مطالعے کا موقعہ نہیں پا سکے۔ اس سلسلے میں بعض اساتذہ کو شکایت ہے کہ عربی و فارسی سیکشن کا اسسٹنٹ لائبریرین سات بجے کی بجائے ۸ اور ۹ بجے گھر سے آتا ہے۔ اور وہ لوگ اس کا انتظار کر کے واپس چلے جاتے ہیں۔ کسی استاذ نے اس اسسٹنٹ کی تین دن کی مسلسل غیر حاضری سے متعلق تحریری شکایت لائبریرین سے کرتے ہوئے تحریری جواب طلب کیا، تو بےچارہ لائبریرین شش و پنج میں پڑ گیا۔ اور اپنی مجبوریٔ حال کو پیش کر کے استاذ سے مستدعی ہوا کہ وہ اپنی تحریری شکایت کو واپس لے لیں۔ استاذ مذکور نے اس سے انکار کر دیا اور تحریری جواب پر مصر ہوا، اس پر لائبریرین "بڑے صاحب" تک پہنچا اور وہاں سے کچھ الہام حاصل کر کے اُس نے اپنے اس اسسٹنٹ سے گذشتہ تین دن کی ایک ایک گھنٹے کی رخصت کی درخواست لے کر استاذ کی شکایت کا تحریری جواب یہ دیا کہ پچھلے تین دن لائبریری کے وقت کے پہلے گھنٹوں میں عربی فارسی سیکشن کا اسسٹنٹ رخصت پر رہا۔

(۲) چیف لائبریرین کے دو سینیئر اسسٹنٹ ہیں یعنی اُس کی غیر موجودگی میں اُنہیں میں سے کوئی قائم مقام لائبریرین بنتا ہے۔ اگر لائبریرین مستعفی یا ریٹائر ہو جائے تو اس کے بعد لائبریرین بننے کا انہیں دو میں سے کسی ایک کو حق پہنچے گا۔ گویا یہ اُن کا سرکاری درجہ ہے اور اس میں ردّ و بدل سنڈیکیٹ اور سینٹ کی منظوری کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ سینٹ کے اُس ممبر کا وہ عزیز لائبریری میں سب سے جونیئر ہے۔ ممبر مذکور موجودہ جنگ اور سابق لائبریرین کی اچانک موت کے سبب اپنے اس عزیز کو چیف لائبریرین بنانے کی اسکیم میں ناکام ہو کر اب اِس فکر میں ہے کہ اِسے کسی صورت سینئر اسسٹنٹ بنا کر اس کے لئے کبھی لائبریرین بننے کی راہ پیدا کر لے۔ اِس سلسلے میں اُس نے پہلا قدم یہ اٹھایا ہے کہ ایک سینئر اسسٹنٹ کو عربی و فارسی سیکشن میں بھیج دیا ہے اور اپنے عزیز کو جو سب سے جونیئر ہے۔ اُن کی جگہ منتقل کر دیا ہے۔ غالباً یہ عذر تراشا گیا ہوگا کہ اِن کا عزیز عربی و فارسی سے ناآشنا ہے۔ لیکن اس تبدیلی کی تہ میں یہی جذبہ کام کر رہا ہے کہ کسی جوڑ توڑ سے یہ لائبریرین کا فسٹ اسسٹنٹ بن جائے۔ اب وہ سینئر اسسٹنٹ غریب اس جونیئر کی جگہ فریاد کار خاموشی اختیار کئے ہوئے کام کر رہا ہے۔ زبان سے اُف کہنے کی مجال نہیں رکھتا کہ کہیں لائبریری سے بہ یک بینی و دو گوش نکال نہ دیا جائے۔ کیا ہمارے وائس چانسلر جذبۂ مروت سے الگ ہو کر اس غریب کے ساتھ انصاف کریں گے؟

واقعہ یہ ہے کہ غیر جانبدارانہ تحقیقات کی جائے تو اس سلسلے میں ایک عجیب و غریب اسکیم کے عناصر کا انکشاف ہوگا۔

مسلم یونیورسٹی

سنا جا رہا ہے کہ جس ناطق مصیبت کے پنجے میں پنجاب یونیورسٹی ۲۵ سال تک مبتلا رہی اب وہ بد بلا مسلم یونیورسٹی کی جانب قدم بڑھانا چاہتی ہے۔ مسلم یونیورسٹی پروفیسر میمن عبدالعزیز جیسے علامہ اجل کی موجودگی میں پنجاب یونیورسٹی سے جس مجسمۂ ناقابلیت کو خریدنا چاہتی ہے۔ اُسے یہ سودا بہت مہنگا پڑے گا۔ ہم آئندہ شمارے میں اس تصویر کی نقاب کشائی کی رسم ادا کریں گے۔

ادارہ

جناب ریاض شمیم کے قلم سے

ماہر نفسیات

اختر صاحب کے لئے زندگی سے عارضی فرار از حد غنیمت تھا ——

ہر روز وہی سیمنٹ کا مرمت طلب ناہموار فرش، وہی عریاں زرد دیواریں وہی کرخت اور ٹھوس چوبی میز اور اس پر کاغذات کے انبار، ٹین کی کرسی جس کی چوتھی ٹانگ ہمیشہ ہوا میں معلق رہتی تھی، فرش پر جابجا سیاہی کے دھبے اور چھت پر ہر جگہ مکڑی کے جالے —— ہر روز وہی ماحول وہی فضا، —— کاغذ پر دوڑنے والے قلم کے سوا ہر چیز پر جمود طاری، زنگ آلود ٹائم پیس کی سوئیاں بھی ساکن تھیں، نہ جانے کب سے، انہیں کبھی کسی نے چار بجے کے علاوہ اور کوئی وقت ظاہر کرتے نہ دیکھا تھا!

یہ اخبار کا دفتر تھا اور اختر صاحب اس میں ملازم تھے ——

اختر صاحب کے اپنے الفاظ میں اخباری دفتر کے ایک کلرک اور اخبار چھاپنے کی مشین میں صرف اتنا فرق ہوتا ہے کہ کلرک اپنا کام ختم کر چکنے پر گھر چلا جاتا ہے اور مشین اپنا فرض ادا کرنے کے بعد بھی وہیں کھڑی رہتی ہے - یوں تو گلے پڑا ڈھول بجانا ہی پڑتا ہے - لیکن بجانے بجانے میں فرق ہوتا ہے - ایک پیشہ ور فن کار کے لئے اس سے بڑھ کر اور راحت کچھ نہیں - لیکن ایک نفاست پسند اور حساس نوجوان کے لئے جسے ڈھول سے اسقدر ہی نفرت ہے جتنی ٹائی کی باریک اور کھنچی ہوئی گرہ سے، یہ سوہانِ روح ہے - اخبار کے دفتر کی ملازمت "آ بیل مجھے مار" قسم کے صاحب کے لئے شاید زیادہ موزوں ہوتی لیکن اختر صاحب کی امن پسند اور صلح جو فطرت کے یہ بالکل متضاد تھی - وہ تو یوں کہئے کہ ان میں اپنے آپ کو حالات کے مطابق ڈھال لینے کی صلاحیت انہیں سنبھالے ہوئے تھی ورنہ وہ بجانے کب کے یہ ڈھول گلے سے اتار پھینک چکتے - اور اس طرح نفسیات کا مطالعہ اُن کے آڑے آ گیا تھا ——

ہاں، اختر صاحب ماہر نفسیات بھی تھے - نفسیات کا مطالعہ اُن کا محبوب ترین شغل تھا اور انسانی فطرت اُن کا مرغوب ترین مبحث، وہ ایک کامیاب اور مشہور افسانہ نویس تھے - اُن کے تمام افسانے فطرتِ انسانی کے مختلف پہلوؤں کے بہترین تجزیے ہوتے تھے - اُن کی ملنسار طبیعت اور خوش اخلاقی اُن کے دائرۂ احباب کو بہت وسیع کر چکی تھی اور اُن کے افسانوں کے بیشتر کردار ان کے دوستوں کے عکس ہوتے تھے - اپنی روزمرہ زندگی میں معمولی معمولی واقعات سے وہ اپنے افسانوں کا مواد حاصل کر لیتے - اور یہی مشاہدے ان کے شاہکاروں کے محور بن جاتے تھے!

اختر صاحب چار سال سے اس دفتر میں کام کر رہے تھے اور اس طویل عرصے میں شاید ہی کبھی انہوں نے ناغہ کیا ہو - روزانہ صبح ساڑھے نو بجے وہ دفتر پہنچ جاتے اور چار بجے اپنی کرسی خالی کر دیتے - اگر کبھی کام ہلکا ہو تو وہ کرسی کی پشت کا سہارا لے کر قلم دانتوں میں دبائے مقابل کی دیوار پر نظریں گاڑ دیتے جہاں پلستر اکھڑنے سے عجیب عجیب شکلیں بنگئیں تھیں یا پھر وہ زنگ آلود گھڑی کو گھورتے رہتے اور سوچتے کہ اگر گھڑی کے رکنے ہی گھڑی کی پرواز بھی رک جاتی اور آفتاب ہمیشہ کیلئے اُفق مغرب پر جھکا رہ جاتا، تو انہیں کبھی ساڑھے نو بجے دفتر نہ آنا پڑتا ——

دن، مہینے اور سال یونہی گزرتے چلے گئے - گھر سے دفتر اور دفتر سے گھر یہ چکر سب معمول بغیر کسی حادثے کے چلتا رہا - اختر صاحب رفتہ رفتہ اس بے کیف زندگی سے اکتا کر محسوس کرنے لگے کہ انکی امن پرست طبیعت اب کسی ہنگامے کی تشنہ ہے - انکی یہ تشنگی تحت الشعور میں آہستہ آہستہ نمایاں ہوتی گئی - ان کے افسانے بھی اب تخیلی ہوتے جاتے تھے - اپنے ماحول سے بے نیاز ہو کر عالمِ تصور میں وہ اکثر اپنے آپ کو ایک ایسی جگہ پاتے تھے جہاں "ہمنفس کوئی نہ ہو اور ہمنوا کوئی نہ ہو" ——

اور پھر اچانک ایک حادثہ ہوا - اختر صاحب کے خواب حقیقت میں تبدیل ہو گئے - اخبار کے سلسلے میں انہیں چند ایام کے لئے کلو جانا پڑا - اختر صاحب کے لئے اپنی روزانہ زندگی سے یہ عارضی فرار از حد غنیمت تھا ——

کلو اختر صاحب کے لئے نئی جگہ نہ تھی، آٹھ نو سال ادھر کی بات ہے کہ انہیں ایک مرتبہ چند دوستوں کے ساتھ یہاں آنے کا اتفاق ہوا تھا - اس طویل وقفے میں کلو کی فضا بہت تبدیل ہو چکی تھی - غالباً اس لئے کہ اب اختر صاحب طالب علم نہیں بلکہ اخباری دفتر کے ایک معمولی کلرک تھے اور زندگی کے اس موڑ کو بہت پیچھے چھوڑ آئے تھے - ان کا ہموار راستہ نشیب و فراز سے نا آشنا تھا - لیکن سرائے کے پہاڑی چوکیدار کے لئے شاید دنیا اب بھی وہی تھی - آج صبح جب اختر صاحب سرائے سے باہر نکلے تو وہ انہیں جنگل کی طرف سے آتا ہوا ملا - وہ لکڑیوں کا ایک گٹھا اٹھائے ہوئے تھا، آٹھ نو سال پیشتر بھی اُس کا یہی معمول تھا —— فرق صرف اتنا نظر آتا تھا کہ اب اس کی کمر زیادہ خمیدہ ہو چکی تھی اور رفتار زیادہ سست!

"کیا لائے آئے بھئی؟" اختر صاحب نے پوچھا۔

بوڑھے نے گردن اٹھائی اور اختر صاحب کو دیکھ کر زرد دانت نکال دیئے۔

"شوکھی شوکھی لاکڑیوں کا گھاٹھا لایا مہاراج!"

"بیچا نا انہیں تم نے شاید؟"

بوڑھا خاموش رہا۔ اس کے ہونٹوں پر وہی غلیظ تبسم کھیل رہا تھا۔ اختر صاحب نے سوچا کہ یہ پہاڑیئے بھی کسقدر سیدھے ہوتے ہیں۔ انہوں نے بات کا رخ پلٹ دیا۔

"اور وہ چینگا ندی کا پل کدھر کو ہے معلوم ہے تمہیں؟"

"لوہے کا پل مہاراج؟"

"ہاں، لوہے کا پل۔"

"شیدھا جانا جی —— آگے بائیں پاشنے پگڈنڈی پر شے جانا —— شاکھی کے ٹبےّ کے پار ہے مہاراج۔"

"ہاں ہاں ٹھیک تو ہے، میں سمجھ گیا —— اچھا بھئی!"

"نمشتے مہاراج"

"نمستے"

سرائے سے آٹھ دس میل کے فاصلے پر ایک ندی ہے۔ ایک مقام پر یہ دو مہیب پہاڑوں کی عمیق وادی میں ہو کر گزرتی ہے۔ اور اس جگہ ایک سسپنشن برج ہے۔ پل پانی کی سطح سے تین سو فٹ کی بلندی پر دو پہاڑوں کے درمیان مکڑی کے جالے کی طرح آویزاں ہے۔ اختر صاحب اس پل کو کبھی نہ بھولے تھے۔ انہیں اچھی طرح یاد تھا کہ جب انہوں نے پہلی مرتبہ اس پل پر کھڑے ہو کر نیچے ندی کی طرف نگاہ ڈالی تھی تو ایک عجیب کیفیت محسوس ہوئی تھی، سر ہولے ہولے گھومنے لگا تھا، پاؤں جیسے نیچے ہی کھینچے جا رہے ہوں۔ بصیرت جیسے وادی کی گہرائی میں جذب ہو گئی ہو، ایک ہلکا ہلکا نشہ، ایک لطیف خمار ——

پہاڑی راستہ کٹتے معلوم نہیں ہوتا۔ میل کے بعد میل کم ہوتا جاتا ہے۔ اور تکان محسوس نہیں ہوتی۔ اختر صاحب گھومتے پھرتے دوپہر کے قریب پل پر پہنچ گئے۔ انسانی طاقت کا یہ آئینہ دار بھی اثراتِ وقت سے بچ نہ سکا تھا۔ آہنی گرڈر زنگ خوردہ ہو رہے تھے۔ کولتار کا فرش خستہ ہو چکا تھا۔ اختر صاحب ٹہلتے ہوئے پل کے وسط کی طرف آ گئے۔ ان کے پاؤں کی ہر جنبش پر پل لرزا جاتا تھا۔ یہاں وہ رک گئے اور جنگلے پر جھک کر نیچے دیکھنے لگے۔ چینگا ایک شفاف لکیر کی طرح بل کھاتی جا رہی تھی —— وادی پانی کے شور سے گونج رہی تھی۔ آفتاب کی شعاعیں لہروں سے کھیل کر منعکس ہو رہی تھیں۔ اور اس طرح کبھی کبھی اس سفید سی لکیر پر ایک چمک پیدا ہوتی اور کھو جاتی۔ —— ندی کے کنارے چند سیاہ دھبے متحرک تھے، شاید کچھ لوگ پکنک کے لئے آئے تھے۔

—— اختر صاحب کو پھر وہی کیف آور احساس ہوا، آنکھوں کے سامنے ندی کا منظر غیر واضح ہو گیا، سر ہولے ہولے چکرانے لگا اور توازن گم ہوتا محسوس ہوا —— انہوں نے بروقت جنگلے کا سہارا لیتے ہوئے اپنے آپ کو سنبھال لیا ——

کھٹ، کھٹ، کھٹ!

پل کے زیریں حصے سے کچھ آواز آ رہی تھی —— اختر صاحب دم بخود رہ گئے، انہیں پہلی مرتبہ یہ روح فرسا احساس ہوا کہ تین سو فٹ کی بلندی پر زمین اور آسمان کے درمیان لٹک رہے ہیں اور یہ مدتوں کا خستہ پل شاید —— شاید ان کا وزن برداشت نہیں کر سکتا۔ کتنا وحشتناک تصور تھا! انہیں یہ خیال پہلے کیوں نہ آیا؟ —— خطرہ کے احساس پر اختر صاحب سمجھتے تھے کہ بھاگنا ایک فطری فعل ہے اور یہ تحت الشعور کے ایما پر انجام دیا جاتا ہے، لیکن ایک ماہر نفسیات کی حیثیت سے وہ اپنے تحت الشعور کو شعور پر کبھی غالب نہ آنے دیتے تھے —— وہ سمجھتے تھے کہ اگر پل ان کا وزن برداشت کرنے سے قاصر ہے تو بھاگنے سے یقیناً ٹوٹ جائے گا۔ اور —— مگر یہ بھی تو وحشت ہے کہ اتنا بڑا پل، آہنی پل ایک من بھر کے آدمی سے لچک جائے —— نہیں، یہ بات نہیں۔ اختر صاحب کے مادۂ استعجاب نے انہیں مجبور کیا کہ وہ جنگلے پر جھک کر پل کے زیریں حصے کا معائنہ کریں ——

انہوں نے دیکھا اور حیرت زدہ رہ گئے۔ پل سے چار ضرب چار فٹ کے تختے کا ایک جھولا لٹک رہا تھا۔ اس پر ایک بوڑھا مستری کھڑا ایک ہتھوڑے سے پل کی مرمت کر رہا تھا ——

"کہو بڑے میاں کیا بن رہا ہے؟" اختر صاحب نے رسمی طور پر پوچھا۔

"دیکھ لیجئے" بوڑھے نے ایک نظر ان کی طرف دیکھ کر کہا۔

بڑے میاں کا جواب کچھ حوصلہ افزا نہ تھا اور اب گفتگو جاری رکھنا ذرا ٹیڑھا سوال تھا۔ لیکن اختر صاحب جیسے ماہر نفسیات کو ایسے موقع خدا دے۔ انہوں نے بوڑھے کو سر تا پا دیکھا اور پھر مسکرا کر بولے۔

"بڑے میاں، آپ کو خوف نہیں آتا؟"

بوڑھا اپنے کام میں محو تھا۔ لیکن اختر صاحب کے حوصلے اسقدر جلد پست نہ ہو سکتے تھے۔

"اس قدر بلندی پر آپ اتنے سے تختے پر کھڑے ہو کر کام کر رہے ہیں

"یہ ہمارا روز کا کام ہے بابوجی"

اُس کا لہجہ بتاتا تھا کہ وہ ایک طفلِ مکتب کے علم میں اضافہ کر رہا ہے

"لیکن جب تم ۔ جب آپ نیچے دیکھتے ہیں، ندی کی طرف ــــ"

بوڑھا ہنس دیا ــــ اُس کی ہنسی میں طنز اور مضحکہ تھا۔

"نہیں بابوجی ہم نے کبھی نیچے نہیں دیکھا ــــ کام سے اتنی فرصت ہی کہاں کہ نظارہ بازی کر سکیں۔"

"اور میری مانئے تو کبھی ایسی جگہ پہ کھڑے ہو کر نظارہ بازی کیجئے بھی نہ"

وقفہ ــــ اختر صاحب سوچ رہے تھے کہ نفسیات کے یہ مسائل اس بوڑھے کی سمجھ میں آ بھی سکیں گے کہ نہیں!

"آپ شاید نہیں جانتے کہ اتنی بلندی سے نیچے دیکھ کر دماغ پر کیا اثر پڑتا ہے ــــ یوں سمجھئے کہ دماغ منظر کی ہیبت سے مرعوب ہو جاتا ہے اور ــــ، ــــ اور نہیں تو کم از کم آپ کے اس جھولے کے چاروں طرف ایک جنگلہ ضرور ہونا چاہیئے!"

"بابوجی یہ بات تو ہمیں آج تک نہ سوجھی۔"

وہ اختر صاحب کی ہنسی اُڑا رہا تھا ــــ جاہل!

"تعجب ہے، بھئی میں تو کسی قیمت پر بھی تمہاری جگہ نہ کھڑا ہوں ابھی ابھی میں نے نیچے نظر ڈالی تو جان کے لالے پڑ گئے۔ وہ تو کہئے کہ جنگلہ پہ ہاتھ جا پڑا ورنہ ــــ"

بوڑھے نے اپنے ہاتھ روک لئے، اُسے پہلی مرتبہ اختر صاحب کی باتوں میں دلچسپی کا احساس ہوا۔

"کیوں ــ کیا ہوا تھا بابوجی؟"

وہ سچ مچ حیران تھا ــــ!

"دماغ مرعوب ــــ میرا مطلب ہے کہ اگر آپ نیچے دیکھیں ــــ یعنی اتنی بلندی سے نیچے نگاہ ڈالیں تو عجیب کیفیت محسوس ہوتی ہے۔ آپ شاید نہ سمجھ سکیں ۔ لیکن ذرا تصور کیجئے کہ جونہی آپ نیچے نظر ڈالتے ہیں ۔ آپ کا سر ہولے ہولے گھومنے لگتا ہے ۔ ہلکا سا چکر آتا ہے۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا جاتا ہے ۔ وزن گم ہو جاتا ہے۔ آپ لڑکھڑاتے ہیں اور سہارے کے لئے ــــ اے، اے بڑے میاں دیکھو، سنبھلو!!"

اور واقعی بڑے میاں لڑکھڑا رہے تھے ۔ ان کا توازن گم ہو چکا تھا اور ان کی بے نور آنکھیں بتائے دیتی تھیں کہ انہیں کچھ نظر نہیں آ رہا ــــ انہوں نے سہارے کے لئے اِدھر اُدھر ہاتھ مارے، پھر آگے کی طرف جھکے اور تختے سے علیحدہ ہو گئے!

اختر صاحب کی پھٹی پھٹی آنکھوں کے سامنے بڑے میاں وادی کی گہرائی میں ایک دھبہ ہو کر رہ گئے اور پھر دھم سے ندی میں کسی چیز کے گرنے کی آواز آئی ــــ چھینٹیں اٹھیں ۔ سفید سی لکیر پر ایک ستارہ سا بنا اور گم ہو گیا!

ذرا تصور کیجئے ــــ (مختار)

سانیٹ

اے رومان!

میکدہ بردوش ساون کی گھٹائیں آ گئیں
قلزمِ جذبات میں طوفاں اٹھانے کیلئے
دل میں بے نام آرزوؤں کو جگانے کیلئے
لڑکھڑاتی جھومتی، ٹھنڈی ہوائیں آ گئیں
ذرّہ ذرّہ میں جوانی کی ادائیں آ گئیں
نو بہارِ کیف میں نغمے لٹانے کیلئے
بجلیاں سی پھر مرے دل پر گرانے کیلئے
کوئلوں کی اور پپیہوں کی صدائیں آ گئیں!!!

اپنے سیمیں رتھ میں رومانِ حسیں لے چل مجھے!
مہروَمہ کی کہنہ و فرسودہ منزل سے پرے
اِس جہاں سے دُور اِن تاروں کی محفل سے پرے
وادئ شعر و محبت میں کہیں لے چل مجھے!
قیدِ شورش گاہِ ہستی سے چھڑا لے تو مجھے
سرزمینِ نور و نکہت میں بلا لے تو مجھے

افضال شاہ آبادی

نقشِ اُلفت

کریں یاد تم کو کہ دل سے بھلا دیں
ہم آخر غمِ عشق کو کیا بنا دیں

ڈبو کر غموں کے سمندر میں خود کو
محبت کی کشتی کنارے لگا دیں

خرابات عالم کی ویرانیوں سے
اگر ہو سکے زندگی کو صدا دیں

عجب کیا کہ بجلی گرے میرے دل پہ
مرے دردِ فرقت پہ وہ مسکرا دیں

مٹا دیں وہ سارے زمانے کو لیکن
یہ ممکن نہیں نقشِ اُلفت مٹا دیں

یہ پردے بھی اے دوست کیوں درمیاں ہوں
زماں و مکاں کے حجابات اُٹھا دیں

حیاتِ محبت کی تکمیل کر کے
حدیں موت اور زندگی کی ملا دیں

نگاہیں مری چھیڑنے پر جو آئیں
رُلا کر ہنسا دیں ہنسا کر رُلا دیں

محبت سے مخمور کر کے دلوں کو
ان اُجڑی ہوئی بستیوں کو بسا دیں

جہاں آگ برسے وہاں پھول برسیں
جہاں کے جہنم کو جنت بنا دیں

سرِ منزلِ دوست اہلِ محبت
مقدر کو بھی ٹھوکروں سے اُڑا دیں

وہ نقشِ وفا ہوں جسے وہ نگاہیں
گھٹا دیں بڑھا دیں بنا دیں مٹا دیں

محبت عبادت بھی جرم و خطا بھی
وہ کس کو سزا دیں وہ کس کو جزا دیں

بناتے ہیں ناحق وہ کیوں شیخ و واعظ
جو ممکن ہو انساں کو انساں بنا دیں

ترے عشق کے درد سے مسکرا کر
شبستانِ غم کو نہ کیوں جگمگا دیں

کہانی کہیں شامِ فرقت کی نجمہ
ستاروں کو کچھ آپ بیتی سنا دیں

(آنسہ) نجمہ تصدق ایم۔ اے (بی ٹی)

اخوند ظفر سجاد غلزئی

جنگ؟

قدرت کے ہر فعل میں دو رُخ پائے جاتے ہیں - دن کے بعد رات. اور بہار کے بعد خزاں کی آمد لازمی اور اٹل ہے - اگر ان تغیرات پر قدرے تدبر کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ دن رات کی بنیاد اور بہار خزاں کا پیش خیمہ ہے —— زندگی ہی موت کا باعث بن جاتی ہے اور موت وجہ حیات —— الغرض کسی چیز کو بھی لے لیجئے اس میں دو پہلو، بظاہر متضاد لیکن درحقیقت لازم و ملزوم، نظر آئیں گے۔

ایک بھوکا بھکاری بہزار دقت چند روٹی کے ٹکڑے حاصل کرنے میں کامیاب ہوتا ہے۔ لیکن کیا یہ چند ٹکڑے اس کی ہمیشہ کی بھوک مٹانے کو کافی ہیں؟ وقتی طور پر اُس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے بعد وہ ایک اور "بھوک" مول نہیں لے لیتا جسے مٹانے کے لئے اُسے دوبارہ کوشش کرنا پڑے گی؟ - تو بھوکا ہوئے بغیر انسان سیر نہیں ہو سکتا اور سیر ہوئے بغیر بھوکا —— بالکل یہی مثال جنگ اور امن کی ہے - نادان ہیں وہ لوگ جو جنگ کو امن سوز اور انسانیت کا قاتل بتاتے ہیں - اگر وہ ذرا غور سے بھی کام لیتے تو اُن پر واضح ہو جاتا کہ جنگ، امن کی بنیاد اور امن جنگ کا سبب ہے - امن اگر انسانی فطرت کا ایک جزو ہے تو جنگ دوسرا اور امن پسندی اگر شرافت کا معیار ہے۔ تو جنگجو ہونا شجاعت کی کسوٹی ——

تاریخ کے ہزارہا اوراق اُلٹ جائیے - جہاں کہیں بغاوت ہوئی یا کسی بیرونی دشمن نے حملہ کیا تو جنگ ہی ایک ایسا حربہ تھا جس کے ذریعہ ان کا مقابلہ کیا گیا - بنابریں جنگ امن کی محافظ اور مظلوموں کی مددگار رہی ہے ——

وہ کیا چیز تھی جس نے امریکہ کو آزادی دلائی —— ؟ وہ کون ہتھیار تھا جس نے فرانس کو سرمایہ داروں کے پنجے سے چھڑایا؟ اور کس شے کے بل بوتے پر چین اور روس نے اب تک اپنی ہستی کو برقرار رکھا؟ —— جنگ کے شعلوں میں آزادی کے نور کی جھلک ہے - توپوں کی گرج میں شجاعت کے نعرے پوشیدہ ہیں اور تڑپتے ہوئے لاشوں پر قومیت کی دیواریں استوار کی جاتی ہیں ——

کون کہتا ہے کہ وہ کونین بُری ہے جو ملیریا سے چھڑا دے؟ کس کا دعویٰ ہے کہ وہ جراحی مضر ہے جو گندے مواد کو نکال پھینکے؟ اور مرہم کی وہ جلن کسے ناگوار گزرتی ہے جس کا نتیجہ زخم کا اندمال ہو؟ —— تو جنگ کی ان سختیوں کو بُرا بھلا کہنا کہاں کا انصاف ہے جس کا مقصد ظلم کا انسداد، صداقت کا احیاء اور باطل کی تباہی ہو ——

ہمیں اقرار ہے کہ جنگ کے نتیجے میں سینکڑوں عمارتیں مٹی کا ڈھیر، ہزاروں عورتیں بیوہ اور لاکھوں بچے یتیم ہو کر رہ جاتے ہیں لیکن یہ قانونِ قدرت ہے کہ ہر تکلیف کے بعد راحت اور ہر راحت کے بعد مصیبت آتی ہے —— اگر پیاس تکلیف دہ نہ ہوتی تو پانی کو نعمت کا خطاب نہ دیا جاتا - اگر بھوک کی شدت بے تاب نہ کر دیتی تو اناج کی توقیر دلوں سے اٹھ جاتی - اور اگر جنگ کے شدائد بظاہر تباہ کن نہ ہوتے تو امن کی اہمیت ضائع ہو جاتی ——

کہہ دو کہ فلیٹ آئل کا استعمال بُرا، تالابوں میں تیل ڈالنا فضول کہ لاتعداد کیڑے مارے جاتے ہیں - گھروں میں دیئے جلانا غلطی کہ ناحق پتنگوں کا خون ہوتا ہے - اور دودھ کو اُبالنا حماقت کہ یہ ہزاروں جراثیم کی تباہی کا موجب ہوگا - وگرنہ جنگ کو بُرا کہنے سے کیا حاصل —— ؟

اگر لوہے کو کاٹنے کے لئے لوہا درکار ہے تو کیا وجہ ہے کہ ظالم کی اینٹ کا جواب پتھر سے نہ دیا جائے —— توپ و تفنگ کا مقابلہ گولوں اور بموں ہی سے کیا جا سکتا ہے اور ظلم کا قلع قمع سختی سے -

جنگ کرنا فطری جذبہ ہے - ایک کمزور مرغی بھی اپنے بچوں کو بچانے کے لئے باز کا مقابلہ کرنے کو تیار ہو جاتی ہے - اور ایک ناسمجھ بچہ کسی کو اپنا کھلونا چراتے دیکھ کر اُسے سزا دینے پر تُل جاتا ہے لیکن کبھی آپ نے سوچا کہ یہ مرغی کی اکڑ اور بچے کی جرأت کیوں؟ کیا ان کا مقصد اپنا امن اور چین کھو دینا ہوتا ہے؟ اگر نہیں تو ہماری جنگیں امن کی تباہی کا موجب کیونکر بن سکتی ہیں؟

پس جنگ کو امن اور انسانیت کا دشمن قرار دینا غلطی ہے —— غلط استعمال تو ہر چیز کا نقصان دہ ثابت ہوتا ہے۔ بھلا گرمیوں میں اونی شال اوڑھنا کہاں کی عقلمندی ہے؟ خنجر کا کام ہی کاٹنا ہے - یہ ہم پر منحصر ہے کہ ہم اسے دشمن کے گلے پر چلائیں یا اپنی گردنوں پر۔ تو بلا سبب کی لڑائی ویسی ہی مضرت رساں ہوگی جیسے چاقو کو قلم کی بجائے اپنی انگلی "بنانے" کے استعمال میں لانا ——

انقلاب

شہر سے باہر کی ویرانی کا عالم - الاماں
جس پہ اکثر کلبۂ احزاں کا ہوتا ہے گماں

ان مزاروں سے اٹھا ہے ہلکا ہلکا سا دھواں
رفتہ رفتہ رُخ ہوا ہے اس کا سوئے آسماں

لوگ کہتے ہیں کہ مزدوروں کی آبادی ہے یہ
قوم کے سینے پہ ناسوروں کی آبادی ہے یہ

اس جگہ رہتے ہیں وہ، نالاں ہیں جن سے اہلِ زر
جن کی خاطر بند ہیں ان کے سدا دیوار و در

اس جگہ رہتے ہیں وہ بیگانۂ جاہ و حشم
تا بہ ایندم جو رہے قدرت سے محرومِ کرم

یہ وہی ہیں، فاقہ مستی میں جو کرتے ہیں بسر
فارغ البالی کا کم ہوتا ہے ان کے ہاں گزر

یہ وہی ہیں، اپنی ہر حالت میں جو مسرور ہیں
فقر و ناداری میں اور عسرت میں جو مسرور ہیں

یہ چٹانیں ہیں، کہ جن پر برق و باراں بے اثر
ان کے آگے رہ گئی موجِ بلا سر پیٹ کر

یہ چٹانیں ہیں، کہ جن پر ثبت ہے مہرِ دوام
ہے ازل سے ہی فنا ناآشنا ان کا قیام

انقلاباتِ زمانہ ان کی خاطر بے ضرر
ان کو طوفانِ حوادث سے نہیں خوف و خطر

ان پہ بیداد و ستم کی تیغ چلتی ہی رہی
وقت کی آغوش میں یہ قوم پلتی ہی رہی

(۲)

کون سا کیا جانے قدرت لے رہی ہے انتقام
ہونے والا ہے تہ و بالا زمانے کا نظام

اس کی "آہِ سرد" کی "شعلہ فشانی" کچھ نہ پوچھ
بے بسی کی، بے کسی کی، زندگانی کچھ نہ پوچھ

اس کے دامانِ جنوں کی چاک دامانی نہ پوچھ
اس کی دنیائے سکوں کی خشک سامانی نہ پوچھ

مجھ سے اس صحرا کے ذرّوں کی درخشانی نہ پوچھ
اس شرارِ طور کی کچھ برق سامانی نہ پوچھ

پھونک سکتا ہے یہ آہِ سرد سے کون و مکاں
اپنی آہِ سرد میں رکھتا ہے ایسی گرمیاں

قصرِ سرمایہ پرستی پر گریں گی بجلیاں
ایک جنبش سے بدل دے گا زمین و آسماں

"ہستیٔ مزدور" پھر رنگِ دگر لانے کو ہے
اس جہانِ رنگ و بو میں "انقلاب" آنے کو ہے

راز یوسفی

غیر معروف جرنلسٹ کے قلم سے

طرز نو کا افسانہ
جدید ترین ٹیکنک کے ساتھ

"پیارے کوئی کہانی سناؤ"

کہانی ختم ہو چکی تھی - چھٹی کا دن تھا اور شام کا سماں - ساون کی گھٹائیں اُمڈ رہی تھیں - افسانہ نگار نے مسوّدہ کو میز کی دراز میں رکھا اور "بہار توبہ شکن مے رسد چہ چارہ کنم" گنگناتا ہوا ابھی اُٹھنے کو تھا کہ بیوی نے کہا "پیارے کوئی کہانی سناؤ -"

خاوند کے تھکے ہوئے دماغ نے یارانِ سرپل کی پُر لطف صحبت کا جو تصوّر باندھ رکھا تھا - یکایک اس کا شیرازہ بکھر گیا - اس نے پہلے کھڑکی میں سے آسمان کی طرف نظر دوڑائی جہاں سیاہ بادلوں کے ٹکڑے مختلف شکلیں بنائے ایک دوسرے پر چھا رہے تھے - پھر اس نے بیوی کی طرف دیکھا جو والہانہ انداز سے چارپائی پر لیٹے ہوئے تکیہ کو سینے پر رکھے دونوں بازوؤں سے دبا رہی تھی -

"کیسی کہانی ؟" اس کے سوال میں احتجاج بھی تھا اور استفسار بھی وہ ازراہِ معذرت کچھ اور کہنے کو تھا - کہ بیوی نے جواب دیا -

"مجھے سیدھی سادھی کہانی سناؤ -" لیکن جانم (وہ کبھی کبھی اسے جانم کہکر پکارتا تھا) محبت کی کہانیاں تو بہت طویل ہوتی ہیں اور پُر پیچ -

بیوی نے تکیہ کو سینے سے اٹھا کر پہلو میں رکھ لیا اور کروٹ بدلتے ہوئے کہا :- "تم اسے سادہ بنا سکتے ہو - میں ان کہانیوں سے اُکتا گئی ہوں - جن میں زندگی کے مسائل پر بحث ہو - حُسن اور عشق کے جھگڑے ہوں - جن میں ناگوار شخصیتیں ہوں مثلاً مدعی یا رقیب خنجر اٹھائے ایک دوسرے کی تلاش میں سرگرداں ہوں - مجھے ایسے کردار بھی پسند نہیں جو جلنسیات کی رَو میں بہ رہے ہوں - بات بات پر ڈاکٹر فریڈ اینڈ لر اور ژونگ کے حوالے دیتے ہوں - اور ہاں میں ایسی کہانی بھی سننے کو تیار نہیں جسے تم رومانی مثلث یا مثلثی رومان کہا کرتے ہو - جس میں ایک عورت کی خاطر دو مرد سرد آہیں بھر رہے ہوں - یا دو عورتیں ایک مرد کے پیچھے پنجے جھاڑ کر پڑ رہی ہوں -"

خاوند نے طنزیہ لہجے میں پوچھا "کچھ اور ؟"

بیوی نے تکیہ کو سینے سے اٹھا کر پہلو میں دباتے ہوئے تبسّم آمیز متانت سے کہا - "ہاں میرے قابل افسانہ نگار شوہر میرے سامنے بے وفا بیویوں اور ہوس کار مردوں کے قصے بھی نہ چھیڑ دیجئے گا - مجھے ایسی کہانی سناؤ جس کا ہیرو اور ہیروئن تمہارے اپنے الفاظ میں قدرت کی گود میں پلے ہوں - ان کے سینوں میں انسانی جذبات موجزن ہوں - وہ ایک دوسرے سے ملیں اور پھر یہ نہ ہو کہ وہ ایک دوسرے سے بچھڑ جائیں - دنیا کی کوئی طاقت انہیں جدا نہ کر سکے - ان کی شادی ہو - اور وہ ایک دوسرے کی محبت کا دم بھرتے ہوئے جوانی اور بڑھاپے کی منزلیں طے کریں -"

اب وہ آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی - تکیہ کو رانوں پر رکھا اور اس پر کہنیاں ٹیک کر اپنے دلکش اور شگفتہ چہرہ کو حنا دیدہ ہاتھوں کے فریم میں رکھ لیا -

خاوند سوچ میں پڑ گیا - اس کی نظریں بے اختیار آسمان کی طرف اٹھیں جہاں اب گھنگھور گھٹائیں زمین والوں کو پہلے نرم اور آہستہ اور پھر قدرے تیز اور تند لہجے میں متنبہ کر رہی تھیں - چند لمحوں کے بعد اس نے کہا -

"لیکن ایسی کہانی کے لئے تو ایک دفتر چاہیئے - اور ایک عمر - میں ایک ناول لکھ رہا ہوں جو شاید تمہیں پسند آ جائے -"

بیوی نے چہرے کو فریم پر سے اٹھاتے ہوئے کہا :- "خیر آج اس ناول کا دیباچہ ہی سہی"

خاوند :- "اچھا آپ بیتی ہو یا جگ بیتی -"

بیوی :- "جو آپ چاہیں - لیکن اس میں کوئی اُلجھن نہ ہو"

خاوند نے دراز میں سے ایک پرانا مسودہ نکالا اور کرسی کا رُخ کرتے ہوئے کہا -

"اگر تمہیں کہانی میں کسی جگہ الجھاؤ محسوس ہو تو مجھے وہیں ٹوک دینا - میں نے اس مسودہ میں ایک ناول سے متعلق نوٹ لکھے ہیں - سوال یہ ہے - کہ کہانی کا آغاز کیا ہو - اب میں یہ تو کہنے سے رہا - کہ جناب والا ایک تھا مرد اور ایک تھی عورت وہ دونوں بڑے پیار سے رہتے تھے -"

بیوی نے کہا :- "میں سمجھتی ہوں کہ کہانی میں کسی حد تک بناوٹ کی ضرورت ہے -" یہ کہہ کر وہ بستر پر لیٹ گئی اور پھر سے تکیہ کو پہلو میں لٹا کر اپنا رُخ خاوند کی طرف پھیرتے ہوئے آنکھیں بند کئے ہمہ تن گوش ہو گئی اور کہا - "ہاں پیارے پھر کیا ہوا -" اس کی بڑی بڑی بادامی آنکھوں پر دراز پلکیں ریشمی جھالر کی مانند نظر آتی تھیں -

خاوند نے کہانی شروع کی۔

شہر کے بارونق محلوں کی پیچ در پیچ گلیوں میں گھومتے ہوئے وہ تھک کر چور ہو گیا۔ کئی دن سے متواتر یہی حال تھا کہ وہ دن کا بیشتر حصہ اسی دوڑ دھوپ میں صرف کر دیتا۔ لیکن اس کے حسب پسند کوئی مکان نہ ملا۔ انہیں ایک سستے اور علیحدہ مکان کی ضرورت تھی۔ بھرے محلے میں ایک اکیلے خوبرو نوجوان کے لئے مکان کی تلاش کوئی آسان بات نہیں۔ آخر فیصلہ ہوا۔ کہ وہ دونوں مل کر اس مہم کو سر کریں گے۔ وہ ایک دور افتادہ نئی آبادی میں چلے گئے۔ جو بظاہر میونسپلٹی کی حدِ اقتدار سے باہر تھی۔ انہیں ایک چھوٹا سا مکان مل گیا۔ دو کمرے برآمدہ کے ایک گوشہ میں باورچی خانہ اور ایک کشادہ صحن جس میں ایک نلکا بھی تھا۔ انہوں نے اس کا نام رکھا محل سرا۔ اور اسے فوراً آباد کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ انہیں ایک دوست کے ہاں رہتے ہوئے ایک ہفتہ پورا ہونے کو تھا۔ وہ وہاں سے چپ چاپ کھسک جانے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ ان کا تانگہ چوک میں آ کر رک گیا۔ جہاں اینٹوں کے انبار کوئلہ کی راکھ ریت اور سنگریزوں کے تودے دیکھ کر گھوڑے نے آگے چلنے سے انکار کر دیا۔ ہیرو نے اپنی نازنین سے کہا:۔ "رانی صاحبہ آپ یہیں تشریف رکھئے۔ میں لگے ہاتھوں اس سامان کو محل سرا تک پہنچا آؤں۔" یہ کہہ کر اس نے اسباب کی بوری پیٹھ پر لاد دی اور دیکھتے دیکھتے نظروں سے غائب ہو گیا۔ واپسی پر انہوں نے تقسیم کار کے اصول کی پیروی میں اسباب اٹھائے ایک جلوس کی صورت محل سرا کا رخ کیا۔

رستہ میں نازنین نے کہا۔ پیارے ایک بات کہوں ابھی ابھی چوک میں سے ایک چھکڑا گذرا ہے۔ جس پر اچار کے ڈبے لدے ہوئے تھے۔ کیا تم میرے لئے ایک ڈبہ نہیں لا سکتے۔ ہیرو نے یہ الفاظ سنتے ہی تیزی سے قدم اٹھائے۔ اور اسباب کو محل سرا میں رکھ کر وہ چھکڑے کے پیچھے اس انداز سے دوڑا۔ جس طرح ایک سال پہلے وہ فٹ بال کے میدان میں اپنی ٹیم کے کیپٹن کی حیثیت سے دوڑا کرتا تھا۔

چھکڑے کے قریب آ کر اس نے رفتار نرم کر دی۔ ارد گرد نظر دوڑائی۔ موقع پا کر اس نے ڈبہ چھکڑے میں سے اٹھایا اور اتنی تیزی سے دوڑا گویا اس نے اپنی ٹیم کو شکست سے بچانے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دی ہے۔ محل سرا کے دروازہ پر پہنچ کر وہ چند لمحوں کے لئے رک گیا۔ پھر ایک ایسے رکن حکومت کی طرح اس نے محل سرا میں قدم رکھا گویا وہ ملکۂ معظمہ سے نائٹ کا خطاب حاصل کرنے کے لئے شاہی دربار میں داخل ہو رہا ہے۔ نازنین صحن میں ایک چٹائی بچھائے بیٹھی تھی۔ ہیرو نے ٹرنک میں سے ایک چاقو نکالا۔ اور ڈبہ کو کھول کر اس نے ایک گھٹنا زمین پر ٹیکتے ہوئے کہا۔

"میرے دل کی ملکہ یہ ادنیٰ خادم ایک ناچیز تحفہ پیش کرنے کی محبت آمیز جسارت کرتا ہے۔" ملکہ نے نیم وا آنکھوں سے اس تحفہ کو شرفِ قبول بخشا اور اچار کا ایک ٹکڑا منہ میں ڈالا۔ تیل کے قطرے اس کے احمریں لبوں کے گوشوں میں جمع ہوئے پھر ایک دھار کی صورت نوکدار ٹھوڑی کے دونوں طرف زمین پر ٹپکنے لگے۔

[افسانہ نگار نے اس مرحلہ پر پھر آسمان کی طرف دیکھا۔ جہاں بادلوں کی سیاہ چادر میں بجلی نقری نقش و نگار بنا رہی تھی۔ بیوی نے آنکھیں کھول دیں اور متبسم التجا کے ساتھ کہا۔ ذرا اپنی کرسی میرے قریب لے آؤ۔ بہت دلچسپ کہانی ہے۔ پیارے پھر کیا ہوا۔

خاوند نے کہانی کو جاری رکھتے ہوئے کچھ کہا کہ بیوی نے ہاتھ کے اشارہ سے اسے روک دیا۔ اس کے آویزے مشکبار زلفوں کے حلقے میں بے طرح الجھ گئے تھے۔ جنہیں چھڑانے کے لئے اس کی رنگین اور لانبی انگلیاں مصروف تھیں۔ خاوند نے دل میں کہا ان آویزوں کے سرخ موتی کالے بالوں میں دمک رہے ہیں۔ جس طرح کالے بادلوں میں بجلی۔ وہ اپنی کرسی کو چارپائی کے قریب لے آیا۔ اور سلسلۂ داستان کو جاری رکھتے ہوئے اس نے کہا:]

وہ اس محل سرا میں رہنے لگے۔ جس کی زینت ان کا پریم تھا۔ محض پریم۔ وہ دونوں سٹیج کے شیدائی تھے اور یہی چیز کالج کی زندگی میں انہیں ایک دوسرے کے قریب لے آئی تھی۔ موسیقی اداکاری محبت اور شادی شادی کے لئے ان کے والدین رضامند نہ تھے اور جب کالج کے یوم تاسیس کی سالانہ تقریب پر ان دونوں نے ملکہ" جھونپڑی میں محبت" کے ڈرامہ میں ڈوئیٹ گائے اور ان کے ترانوں سے مرکزی ایوان کی دیواریں گونج اٹھیں۔ تو کالج کے پرنسپل پروفیسروں طلبا، طالبات اور چپڑاسیوں کا اپنے اپنے حلقہ میں یہ متفقہ فیصلہ تھا کہ قدرت نے انہیں ایک دوسرے کے لئے بنایا ہے۔

کنسرٹ کے بعد انہوں نے شادی کر لی۔ اور بہت جلد اس کا خمیازہ اٹھا لیا۔ ہیرو کو یہ امید تھی کہ کسی ایچر کلب میں نہیں تو کسی کالج کی فٹ بال ٹیم میں ایک ماہر کی حیثیت میں کام کرنے سے گذارہ کی سبیل نکل آئے گی۔ اور واقعتہً کچھ مدت تک یہی صورت رہی۔ لیکن فٹ بال کا موسم بارہ مہینے نہیں رہتا اور سماج ابھی اس قابل نہیں ہوئی کہ اسٹیج پر معزز گھرانوں کی لڑکیاں لڑکوں کے شانہ بشانہ کام کر سکیں۔ حالات بتدریج بد سے بدتر ہوتے گئے اور آخر نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ انہیں ایک دوست کے ہاں پناہ لینا پڑی اور پھر وہ ایک نئی غیر مانوس نو آبادی میں سر چھپانے کو مجبور ہو گئے۔

اچار کے ڈبہ کے لئے اسے چور بننا پڑا - جب اچار کا تیل اس کی بیوی کے لبوں سے ٹپک رہا تھا - اس نے کہا - کہ تم روتی کیوں نہیں ؟ ہیروئن نے جواب دیا - آخر کیوں ؟ رونے کی کوئی وجہ نہیں - تم ذرا اس اچار کا مزا تو لو لو - اس یک منزلہ مکان میں جسے وہ فرطِ محبت سے محل سرا کہتے تھے - موسیقی کا یہ انتظام تھا کہ صبح سے شام تک مکھیوں اور شام سے صبح تک مچھروں کی بھنبھناہٹ رہتی اور ہفتہ میں ایک دو بار کپڑے دھونے کی آواز اس میں شامل ہو جاتی -

[یکایک بجلی کی کڑک سے کہانی کا سلسلہ ٹوٹ گیا - بیوی چونک کر اٹھ بیٹھی - ہوا میں ہر لحظہ خنکی پیدا ہو رہی تھی "کیسی خوشگوار ہوا ہے آج" بیوی نے کہا اور قمیض اتارنے میں مصروف ہو گئی - افسانہ نگار خاوند نے پھر آسمان کی طرف دیکھا - بادل ان کے مکان کی چھت کے قریب تک آ گئے تھے - آسمان سے بارش کا ایک طوفان زمین پر امڈ پڑا - بیوی نے لیٹتے ہوئے تکیہ کو اپنے سینے پر رکھ لیا اور کہا پیارے ذرا اور قریب آ جاؤ -

خاوند اپنے پاؤں چارپائی پر رکھتے ہوئے کچھ کہنے کو تھا - کہ بیوی نے زیر لب کہا بہت ہی پُر لطف ہے - تمہاری کہانی پیارے پھر کیا ہوا]

کہانی بہت لمبی ہے - خلاصہ یہ کہ ان پر مصیبت کی گھٹا چھا گئی - کانسی کی جگہ پیتل اور پیتل کی بجائے مٹی کے برتن - پُرانے پاجاموں کے غلاف بن گئے اور بچھونے کی چادریں لحاف کا کام دینے لگیں - کپڑے دھونے اور ہاتھ منہ صاف کرنے کے صابن میں کوئی فرق نہ رہا - جس تیل سے سالن پکاتے وہی بالوں پر لگاتے - ایک مرتبہ ہیرو نے کہا - بلیڈ بہت مہنگے ہو رہے ہیں - اگر میں فرانسیسی طرز کی داڑھی رکھ لوں - تو تمہارے اس تل کی قسم جس نے تمہارے رخسار میں ایک قاتلانہ دلکشی پیدا کر رکھی ہے - لوگ مجھے ایک پروفیسر سمجھیں

"یا حجام" بیوی نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا - وضع داری نے انہیں اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کے سامنے دستِ سوال دراز کرنے کی اجازت نہ دی - برسات کا موسم تھا - شام کا وقت - وہ بھوک مٹانے کی غرض سے بار بار گاتے رہے - تا آنکہ ہیروئن تھک کر سو گئی -

ہیرو چپکے سے مکان سے باہر نکلا - موسلا دھار بارش پڑ رہی تھی - دور دور تک کوئی شخص نظر نہ آتا تھا - محلہ کی دلدل کو عبور کرنے کے بعد وہ بڑی سڑک پر پہنچا جو شہر کو جاتی تھی وہ ایک درخت کے نیچے کھڑا ہو گیا - بارش قدرے تھمی - اس نے بازار کی طرف رُخ کیا - وہ فیصلہ کر چکا تھا - کہ رات کی تاریکی ہو وہ اپنے کسی دوست کے گھر جائے گا - دوست آں باشد کہ گیرد دست دوست والا مصرع دہرا

کر اس نے اپنے ضمیر کو مطمئن کر لیا تھا - صدر بازار کے چوک میں بھیڑ تھی - وہ لوگوں کی نظروں سے بچتا ہوا ہر گزرنے والے تانگے چھکڑے اور موٹر کی آڑ لیتا ہوا آگے بڑھا - ٹریفک رُک گیا - اس کے آگے ڈیری فارم کی موٹر تھی - دودھ کے خوش کن تصور سے اسے چائے پیسٹری مکھن توس کا خیال آ گیا - اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو رہا تھا - اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی - سامنے والی سیڑھی سے متصل ایک موٹر دان بیماس کی نظر پڑی - جس پر ڈبل روٹیاں لدی ہوئی تھیں - وہ موٹر کاروں اور لوگوں کے ہجوم کو چیرتا ہوا وہاں پہنچا - چوک کے وسط میں کنسٹبل نے اشارہ دیا - موٹر کاریں حرکت میں آئیں - ہیرو نے موٹر دان کے عقبی تختے پر کھڑے ہو کر اندر ہاتھ ڈالا - اور ایک پونڈ والی ڈبل روٹی اٹھا کر تختے سے اُترا ہی تھا - کہ "ٹھیر بدمعاش کیا کرتا ہے -" کے الفاظ اس کے کانوں میں پڑے اور اس کے ساتھ ہی اسے احساس ہوا کہ وہ مضبوط بازوؤں کی گرفت میں ہے - ایک جھٹکے سے اپنے آپ کو چھڑا کر وہ اُلٹے پاؤں دوڑا - "چور چور لیجیو پکڑیو جانے نہ پائے - بدمعاش لفنگا اٹھائی گیر" کے الفاظ اور پھر پولیس کی بلند بانگ سیٹیوں کی مسلسل آواز اس کے کانوں میں آ رہی تھی - اس نے دور سے دیکھا - کہ اس کا ایک دوست فٹ بال کا کھلاڑی ہم سبق سامنے سے آ رہا تھا - "آخر یہ کیا ماجرا ہے -" دوست نے پوچھا - ہیرو نے کہا "آگے چل کر بتاؤں گا ریل کے پُل کے پار اور یہ لو فٹ بال وہاں پہنچ جاؤ -" یہ کہتے ہی اس نے ڈبل روٹی اپنے دوست کی طرف اس انداز سے پھینکی گویا وہ آخری انٹر یونیورسٹی مقابلہ میں ہراول میں کھیلنے والے ساتھی کی طرف گیند منتقل کر رہا ہے - یہ کہہ کر وہ خود چھوٹے بازار میں گھس گیا - نتیجہ یہ کہ پیچھا کرنے والوں کی دو جماعتیں بن گئیں - بیشتر لوگ تو اس کے دوست کی طرف بھاگے جا رہے تھے اور وہ خود تھوڑے سے لوگوں کو بھول بھلیوں میں چھوڑ کر صاف نکل گیا -

[بارش کی بوچھاڑ چارپائی پر پڑی اور بیوی گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی اور کھڑکی بند کرتے ہوئے اس نے کہا - "تو گویا آپ کا ہیرو ایک چور ہے -" افسانہ نگار نے کہا "میری جان محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہے - واقعی کیسا سہاؤنا موسم ہے -" بیوی کی ساڑھی بارش سے بھیگ کر اس کے مرمریں بدن سے چمٹ گئی تھی - وہ چارپائی سے اٹھی اور ایک باریک سے دوپٹے میں لپٹ کر اپنی جگہ پر آ گئی - اس نے تکیہ سے کھیلتے ہوئے پوچھا - کتنی کہانی باقی ہے - ہیرو ڈبل روٹی اپنے ساتھ لے آیا - پھر کیا ہوا]

اس ڈبل روٹی نے ان کی قسمت کو پلٹ دیا - پُل کے پار اس

تے کے دوست نے کہا۔ "آخر تمہاری اس ہیئتِ کذائی کا مطلب ؟"

مطلب یہ کہ محلہ کے دوستوں نے شرط لگائی تھی کہ ہم میں سے ...سہ پہر کی چائے کے لئے مفت ڈبل روٹی لاتا ہے۔ اس کی تلاش میں دو گھنٹے صرف ہو گئے۔ وہ میرے انتظار میں ہوں گے۔ مزے سے گذر رہی ہے۔ زندگی کا لطف آرہا ہے۔"

"لیکن تم رہتے کہاں ہو۔ تمہارے کپڑوں کی حالت۔ اور یہ داڑھی ؟"

"نئی آبادی کے عین وسط میں ایک سر بفلک عمارت ہے۔ محل سرا کے سنہری حروف دور سے نظر آتے ہیں۔ گھر والوں سے صلح ہو گئی۔ یہی مناسب سمجھا کہ چند روز سماج سے علیحدہ تنہائی میں رہیں۔ اور کیوں یہ فرانسیسی داڑھی کیسی رہی اور دوست سچی بات یہ کہ بھیس بدلنے اور دوستوں کی نظروں سے بچنے کے لئے میں نے یہ کپڑے پہن رکھے ہیں"

"لعنت ہے تم پر عجیب آدمی ہو۔ میں کئی ہفتوں سے تمہاری تلاش میں ہوں۔ شہر کا کونہ کونہ چھان مارا۔ تھیئٹر، سینما، نمائش اور کوئی کلب ایسا نہیں جہاں تمہیں ڈھونڈا نہ ہو۔ اخباروں میں گمشدگی کے اشتہار دیئے اخبار نہیں پڑھتے ہو آجکل ؟"

"گھر میں ریڈیو لگا رکھا ہے۔ اس سے خبریں سن لیتا ہوں۔ دوست بات یہ ہے کہ اب یہاں سے جی اچاٹ ہو گیا ہے۔ باہر جانے کی تیاریوں میں ہوں۔"

"یہ کیا بکواس ہے۔ تم سے خدا سمجھے۔ کالج والے تمہاری جان کو رو رہے ہیں۔ تمہیں معلوم نہیں تو سنو۔ کالج کی منتظم کمیٹی نے فیصلہ کر دیا ہے کہ ایمچور تھیئٹریکل کلب کو مستقل کر دیا جائے۔ اور ظالم اس کے لئے تم سے بہتر ڈرامہ نگار اور ایکٹر کون ملے گا۔"

[روشن دانوں سے بارش کی بوچھاڑ اندر پڑی اور کہانی کا سلسلہ رک گیا۔ افسانہ نگار نے روشندان بند کر دیئے۔ کمرے میں اندھیرا چھا گیا۔ بجلی چمکی اور ایک لمحہ کے لئے خاموشی طاری ہو گئی۔ پھر بیوی نے انگڑائی لیتے ہوئے کہا "تمہارا ہیرو چور ہی نہیں بلکہ جھوٹا بھی ہے۔ اچھا پھر کیا ہوا۔ یہی نا کہ ان کی کایا پلٹ گئی۔ ہیرو اور ہیروئن امن چین سے رہنے لگے۔ اس کے بعد تمہارے ہیرو کو کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی۔

افسانہ نگار خاوند نے مسودہ کو میز پر رکھ دیا اور کرسی سے چارپائی پر آگیا۔ اور بیوی کے بالوں کو انگلیوں سے شانہ کرتے ہوئے اس نے کہا۔ اب وہ ڈرامے اور افسانے لکھتا ہے۔ ایکٹری کرتا ہے کبھی کبھی سہانے موسم میں جب اس کے دوستوں کو اس کا انتظار حد سے گذر رہا ہو اس کی بیوی اپنی بڑی بڑی آنکھوں کو اس کی آنکھوں میں ڈال کر یہ فرمائش کر دیتی ہے کہ پیارے کوئی کہانی تو سناؤ۔ اب تم ہی انصاف کرو کہ ایسی التجائے جمیل کو رد کرنے کی جرأت اسے کیونکر ہو سکتی ہے۔ خیر۔ بہت ہی کیف افزا موسم ہے آج پیاری ......]

غزل

جلو میں کاروانِ آرزو لیکر شباب آیا
شباب آیا، جہانِ زندگی میں انقلاب آیا

اٹھا اے ساقی! دعا کا آسمانوں سے جواب آیا
وہ چمکیں بجلیاں، جھومی فضا گھر کر سحاب آیا

دلِ ویراں میں اپنے کر رہے تھے جستجو جسکی
بہار آتے ہی گلشن میں وہ جلوہ بے نقاب آیا

پھر اسکی یاد نے سینے میں اک طوفاں اٹھایا ہے
ہوئی مدت مجھے جسکا خیال آیا نہ خواب آیا

شبستانِ فلک میں اڑ رہا ہے رنگ تاروں کا
لبِ بام آئے تم یا آسماں پر ماہتاب آیا

تجھے آزاد! خواہش تھی بہت خط کا جواب آئے
انہیں انکار ہے آنے سے، لے خط کا جواب آیا

جگن ناتھ آزاد

عبدالحلیم انصاری

مونٹے سوری سسٹم

کمسن بچوں کی تعلیم کا جدید ترین طریقہ مادام میریا مونٹے سوری کا رہین منت ہے۔ اور آپ کے مقرر کردہ لائحہ عمل کی نمایاں خوبی اس کی سائنٹفک نوعیت ہے۔ یورپ اور امریکہ کے ماہرین تعلیم نے سالہا سال کے تجربات کی بنا پر متفقہ حیثیت سے تسلیم کر لیا ہے کہ بچوں کی جسمانی دماغی اور اخلاقی تربیت کے لئے اس سے بہتر طریقہ ہنوز معلوم نہیں۔ مادام میریا مونٹے سوری اٹلی کی پہلی خاتون ہیں جنہوں نے ۱۸۹۴ء میں دارالعلوم رومہ سے علم طب میں اعلیٰ ترین ڈگری حاصل کی اور حقیقت یہ ہے کہ بچوں کی تعلیم کے مسئلہ میں آپ کی گہری دلچسپی کی محرک یہی طبی تربیت تھی۔ جس کی بدولت آپ کو بچوں کی ذہنی زندگی کے باقاعدہ مطالعہ کا موقع ملا۔ فارغ التحصیل ہونے پر یونیورسٹی میڈیکل کالج اور ہسپتال میں دماغی امراض کی تشخیص و علاج کا شعبہ آپ کے سپرد کیا گیا۔ اس زمانہ کے پاگل خانوں میں کم سن جوان اور عمر رسیدہ بیماروں کو یکجا رکھنے کا قبیح دستور تھا۔ جس کی اصلاح آپ کا پہلا کام تھا۔ آپ نے بیمار بچوں کے ذہنی توازن کو از سر نو قائم کرنے کے لئے مختلف قسم کے تجربے کئے۔ اور آخر ایک ایسا طریقہ معلوم کیا۔ جو بہت کامیاب رہا۔ اس سے پیشتر مہذب دنیا کا یہ خیال تھا۔ کہ ذہنی اعتبار سے ضعیف یا فاتر العقل بچوں کا علاج ڈاکٹر اور صرف ڈاکٹر کے سپرد ہونا چاہیئے۔ اس میں ماہر تعلیم کو کوئی دخل نہیں۔ ڈاکٹر مونٹے سوری نے اس خیال کو بے بنیاد ثابت کر دیا۔ اور اب ہر ترقی یافتہ ملک میں بچوں کی تعلیم و تربیت کے لئے وہ انقلاب آفریں طریقہ جاری ہے۔ جو مونٹے سوری سسٹم کے نام سے موسوم ہے۔ موجودہ جنگ سے پیشتر آپ نے ہندوستان میں آکر مدراس میں اس جدید طریق تعلیم کا مرکز قائم کیا۔

اس طریق کا مرکزی اصول

اس طریقہ کے دائرہ اثر میں صرف ایسے بچے آسکتے ہیں جن کی عمر ۲½ سال سے لیکر ۶ سال تک ہو۔ اس طریقے سے ایسے حیرت انگیز نتائج مترتب ہوئے۔ کہ یہ بہت جلد یورپ اور امریکہ کے معلمین کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ اور امریکہ کے سربرآوردہ رسائل "میک لیور میگزین" ورلڈز ورک اور انگلستان کے علمی جریدہ "ایتھی نیم" اور روزنامہ لنڈن ٹائمز نے اس جدید طریقہ کو مقبول عام بنانے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ یہ طریق اس اصول پر مبنی ہے کہ بچے کی ذہنی زندگی میں ڈھائی سال سے لیکر چھ سال تک مختلف مراحل آتے ہیں۔ جنہیں کامیابی سے عبور کرنے کے لئے بچہ کے لئے مختلف قسم کے ماحول کی ضرورت ہے۔

بچے کے دماغی قواء کو بروئے کار لانے کے لئے یہ زمانہ نہایت اہم اور موزوں ہے۔ ۲½ سال سے لیکر ۶ سال تک بچہ گرد و پیش کے حالات سے بے حد متاثر ہوتا ہے۔ اور اسی عمر کے تاثرات اس کی آئندہ ذہنی تعمیر کا سنگ بنیاد بن جاتے ہیں۔ زندگی کے فطری اشتیاق سے اس کے حواس خمسہ میں ایک زبردست تحریک پیدا ہوتی ہے۔ وہ ہر چیز کو غور سے دیکھتا اور اس کی تہ کو پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔ تجسس اور نقد و نظر کے اس دور میں بچہ کی جسمانی اور ذہنی زندگی کو مربوط بنانا معلم کا فرض اولین ہے اور اس فرض سے بوجوہ احسن عہدہ برآ ہونے کے لئے ڈاکٹر مونٹے سوری نے خاص قسم کے ساز و سامان کا اہتمام کیا ہے۔

سکول کو تفریح گاہ بناؤ

ان کی رائے عالیہ میں مدرسہ بچہ کے لئے بہترین تفریح گاہ ہونی چاہیئے۔ ہوادار روشن کشادہ کمرے آرام دہ نشستیں چھوٹے چھوٹے خوشنما میز جسے بچہ جہاں چاہے خود اٹھا کر لے جائے۔ مونٹے سوری سسٹم میں لکڑی کے ان بھدے ڈسکوں کے لئے کوئی گنجائش نہیں جن پر مادام موصوفہ کے الفاظ میں بچے اس طرح جم کر بیٹھتے ہیں۔ گویا تیتریوں کے پروں کو پن لگا کر انہیں بے حس حرکت کر دیا گیا ہے۔ ہر بچہ کے لئے میز اور سٹول علیحدہ ہونا چاہیئے۔ کمرے کا فرش دیواریں اور چھت شوخ رنگوں کے نقش و نگار سے مزین ہوں۔ اور پردے سفید براق شیشے اور چینی کی نازک اور باصرہ نواز اشیاء مثلاً گلدان ہوں۔ مدرسہ پورے معنوں میں ایک دلفریب اور بصیرت افروز چمنستان بن جائے اس میں اس درجہ جاذبیت اور دلچسپی کا سامان مہیا ہو کہ کم سن بچے اسے قیدخانہ سمجھنے کی بجائے تفریح و تفنن کا وسیلہ شمار کریں۔ قارئین اندازہ لگا سکتے ہیں۔ کہ ڈاکٹر مونٹے سوری نے اس نظریہ کے ذریعہ موجودہ اور آئندہ پود پر کسقدر احسان کیا ہے۔ ہم میں سے جن کو مسجد کے ملاں یا پاٹھشالہ کے پنڈت یا دیہاتی مدرس کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرنے کا موقع ملا ہے اور جن کی پشت کو

کوڑوں کی ضربوں سے مسطر بنانے کے بعد لاتوں اور گھونسوں سے اس پر نقش و نگار بنائے جاتے تھے۔ ان کے لئے ایام طفلی کی یاد کس درجہ کرب آلود ہے۔ اور اس کے برعکس ان بچوں کے دلوں میں عہدِ طفولیت کی یاد کتنی خوش آیند ہوگی جو جدید طریقۂ تعلیم کے ماتحت تربیت حاصل کر رہے ہیں۔

دوسرا اصول

درس گاہ میں ننھی ننھی خوشنما چیزیں رکھنے اور سفید پردے لٹکانے کا اثر بہت جلد رونما ہو جاتا ہے۔ یہ اہتمام بچوں کے حساس دماغ میں نہ صرف جمالیاتی احساس کا محرک ہے۔ بلکہ وہ نازک اور خوبصورت اشیاء کو قرینے سے رکھنے کا سلیقہ خود بخود سیکھ جاتے ہیں۔ سفید پردے پہ ذرا سا داغ ان کے لئے چیلنج کا حکم رکھتا ہے۔ ان میں صاف ستھرا رہنے کی عادت پڑ جاتی ہے۔ اخلاقی زندگی پہ اس ابتدائی رجحان کا نتیجہ ظاہر ہے۔ بچوں میں اپنے جیون کو پاکیزہ اور بے لوث رکھنے کا خیال جاگزیں ہو جاتا ہے۔ بھلا ان کی زبان پہ کوئی غیر شستہ یا نا ملائم خیال کیونکر آسکتا ہے۔ وہ ایسی صحبت سے کنارہ کش رہیں گے جس ناہمواری یا کثافت کا شائبہ ہو۔ وہ سچ بولیں گے اس لئے نہیں کہ فرمانِ الٰہی کا تقاضا ہے۔ بلکہ اس لئے کہ سچائی خوبصورتی میں داخل ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ جو بچہ ایسے ماحول میں رہے گا اس میں خودداری اور خودی کا ایک زبردست احساس پیدا ہو جائے گا۔ ڈاکٹر مونٹے سوری کے طریقۂ تربیت کا دوسرا اصول یہ ہے کہ بچہ خود اپنا معلم ہے۔ کوئی شخص دوسرے کو تعلیم دینے کا اہل نہیں۔ استاد کا کام ہے کہ بچہ کے گرد و پیش سازگار حالات پیدا کر دے۔ فطرت خود بخود طبعی اور ذہنی نشو و ارتقا کے ذریعہ بچہ کی رہنما بن جائے گی۔ یہ کہنے کے بعد ڈاکٹر موصوفہ کے طریقہ کا تیسرا اصول کسی تشریح کا محتاج نہیں۔

مدرسہ کی مرکزی شخصیت بچہ ہے

متذکرہ بالا اصول کی روشنی میں یہ حقیقت واضح ہے کہ دار العلوم کی مرکزی شخصیت معلم نہیں بلکہ متعلم ہے۔ مونٹے سوری سسٹم کے ماتحت زیرِ تربیت طلبا اور طالبات کے لئے عمر کے مطابق مختلف قسم کا ساز و سامان کمرے میں رکھکر استاد کے زیرِ نگرانی بچوں کو اس میں چھوڑ دیا جاتا ہے۔ بجائے اس کے کہ استاد بچوں پہ سوالات کی بوچھاڑ کرے۔ بچے استاد پہ جرح کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ استاد ایسے انداز سے جواب دیتا ہے کہ بچے کی دلچسپی بڑھتی جائے اور ان کے معلومات میں بتدریج اضافہ ہوتا جائے۔ جدید تعلیمی نظام میں باقاعدہ درس نہیں دیئے جاتے۔ حواس خمسہ کو بروئے کار لا کر بچہ تربیت حاصل کرتا ہے۔ کمرے کے اندر اور کھیل کود کے میدان میں بنیادی مقصد کو مدِ نظر رکھا جاتا ہے۔ کہ طلبا اور طالبات کے جسمانی اور ذہنی قویٰ کی متناسب تربیت ہو۔ اور ان میں انضباطِ نفس اور خود اعتمادی کا مادہ پیدا ہو۔ اس جدید طریق میں ہر بچے کی جداگانہ تعلیم کا انتظام کیا جاتا ہے۔ کمرے میں موزوں ماحول کے علاوہ ڈاکٹر موصوفہ کے وضع کردہ "کھلونے" رکھے جاتے ہیں۔ جن کی ایجاد اور حیرت افزا کامیابی کے لئے ڈاکٹر مونٹے سوری کو عالمگیر خراجِ تحسین ادا کیا گیا ہے۔

تعلیم و تربیت کی مختلف منازل

ان سائنٹفک کھلونوں کا مصرف بچوں کے حواس کی تربیت ہے۔ سب سے پہلے چھونے کی طاقت کو ابھارا جاتا ہے۔ ان کی آنکھوں پہ پٹی باندھ کر ان سے مختلف اشیا میں بناوٹ وزن اور حجم کے اعتبار سے فرق معلوم کرنے کی تاکید کی جاتی ہے۔ اس طرح ان کی قوتِ ممیزہ کی تدریج نشو و ارتقا کے لئے ایک مسلسل وسیلہ مہیا ہو جاتا ہے۔ دوسری منزل پہ چھونے اور دیکھنے کی طاقتوں کو باہم مربوط کرنے کا انتظام ہے۔ پھر بچے مختلف حروف کی شکلیں پہچاننے کے قابل ہو جائیں۔ تو انہیں انہی شکلوں کو کاغذ پہ منتقل کرنے کا ڈھنگ بتایا جاتا ہے۔ انگلیوں اور ہاتھوں سے کام لینے کی عادت تو انہیں شروع سے ہوتی ہے۔ لہذا مختلف شکلوں کو کاغذ پہ اتارنا ان کے لئے اتنا آسان ہو جاتا ہے کہ پانسال کا بچہ چھ ہفتوں کے اندر بے تکان لکھ سکتا ہے۔

ہر انقلاب انگیز تحریک کی طرح ڈاکٹر مونٹے سوری کے جدید طریقِ تعلیم کو بھی پہلے علانیہ و متصل مخالفت پھر تضحیک اور بالآخر کامیابی کی سہ گانہ منازل سے گذرنا پڑا۔ اس وقت تک ایک درجن زبانوں میں ان کی تصانیف کے ترجمے ہو چکے ہیں۔ اور تعلیمی و علمی رسائل میں ان کے وضع کردہ طریق پہ تبصرے کیے جاتے ہیں۔

جناب شیر محمد اختر

جنازہ

آج مسعود کے ذہن کے ایوانوں میں ماتم ہو رہا تھا۔ ایک کہرام مچ گیا تھا۔ اس کے ایوان متزلزل ہو گئے۔ اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ وہ ان محلات کو چھوڑنا نہیں چاہتا تھا مگر وہ مجبور تھا۔ اس کا جنازہ اس کے اپنے کندھے پر نکل رہا تھا۔ وہ خود اپنے آپ اپنا گلا گھونٹنے پر مجبور کیا گیا تھا۔ وہ مجبور تھا۔ اس کی موت ہی اس کی زندگی تھی۔ اس کی رُوح کا مرجانا اس کو زندہ رکھ سکتا تھا اس نے موت کو قبول کیا۔

مسعود ایک معمولی تعلیم اور اوسط درجے کے ایک گھرانے کا فرد تھا۔ اس کی بدقسمتی، وہ ادبی ذوق لیکر پیدا ہوا۔ اس کی زندگی کی ابتدا خوب تھی۔ سولہ برس کی عمر کا تھا۔ میٹرک کے امتحان ختم ہوئے جو تھا دن تھا کہ وہ قتل کے مقدمے میں دھر لیا گیا۔ قتل کوٹھڑی، جیل خانے کی فضا۔ قیدیوں کی دردناک زندگی، اس نے چالیس دن وہاں رہ کر مختصر سی جیل میں بہت کچھ دیکھا اور سُنا۔ وہ مذہبی گھرانے میں پیدا ہوا تھا۔ اس لیئے چالیس دن وہ راتیں جاگ کر استغفار پڑھا کیا۔ جب وہ آزاد ہوا تو اُسے باہر کی دنیا عجیب معلوم ہوتی تھی۔ اس کی آنکھیں چندھیا گئیں تھیں اُسے ہتھکڑی کے بغیر سڑکوں پر ٹہلتے ہوئے ایک سنسنی سی محسوس ہوتی تھی۔

ہندوستان پر قدرت نے جتنی لعنتیں مسلط کی ہیں اُن میں سے مقدمہ بازی ایک بہت بڑی لعنت ہے۔ سونے سے بھری ہوئی تھیلیاں لیکر مقدمہ لڑنے نکلیں ساری تھیلیاں خالی ہو جائینگی۔ مسعود کے والدین کا سارا اندوختہ ختم ہو گیا تھا۔ مسعود کے ماموں نے ذراسی عشق بازی کی تھی، محلے کی ایک لڑکی سے تعلقات بڑھائے تھے۔ راز فاش ہو گیا۔ جس کا نتیجہ فساد تھا۔ جس میں لڑکی کی طرف کا ایک بوڑھا آدمی مرگیا۔ کچھ زخمی ہوئے۔ جس کی وجہ سے مسعود بھی پکڑا گیا۔

جب مسعود آزاد ہوا۔ تو سب خاندان کی کفالت کا بوجھ اُسے ہی برداشت کرنا تھا۔ ہمت کہیئے یا غیرت، اس نے جب سرکاری دفاتر کے سارے دروازے اپنے لیئے بند پائے تو وہ صوبہ سرحد میں پولیس کا سپاہی بننے پر مجبور ہو گیا۔ وہ کمزور بدن کا تھا۔ خاموش، شرمیلا، نازک ناز و نعمت کا پلا ہوا۔ اس کے لئے سپاہی کا کام ناممکن تھا۔ مگر پیٹ بُری بلا ہے۔ وہ مجبور تھا۔ اسے زندہ رہنا تھا۔ اپنے چند اور بھائی بہنوں کو زندہ رکھنا تھا۔ اس کی کم عمری کے باوجود اُسے ملازم رکھ لیا گیا۔

خوش قسمتی سے عام سپاہیوں کی بجائے اُسے دفتر میں جگہ دے دی گئی۔ وہ کلرک بن گیا۔ یہ ترقی کا پہلا زینہ تھا۔ ایک سال میں ہی وہ ہیڈ کنسٹیبل ہو گیا۔ جرائم کی تفتیش کا اہم ریکارڈ اس کے سپرد تھا۔ وہ دن رات سنسنی خیز قتل اور ڈاکوؤں کی رپورٹیں پڑھا کرتا تھا۔ جن سے سارے صوبے میں ہلچل مچ جاتی۔ اس نے چار سالوں میں ہزار ہا رپورٹیں قتل اور ڈاکے کی مرتب کیں۔ وہ حیران ہوا کرتا تھا کہ صوبے بھر میں لوگوں کو اور کوئی کام نہیں تھا۔ انسانیت سوز جرائم جن کا تصور بھی رونگٹے کھڑے کر دیتا۔ کرائے کے قاتل، ایک انسان کو مار ڈالنے کا معاوضہ صرف ایک سو روپیہ، پچاس پیشگی اور پچاس تختہ دار پر چڑھنے کے بعد ورثا کو دے جاتے تھے۔ ننھے بچے صرف اس لیئے اس دنیا سے مٹا دئے گئے تاکہ دوسرے خاندان کا انتقام لیا جا سکے۔ ایک معصوم انگریز بچی سے زنا بالجبر کیا گیا۔ اس لیئے کہ انگریزی سے بدلہ چکایا جائے۔

اس نے بڑے بڑے ڈاکوؤں کی لاشیں دیکھیں۔ وہ جوان مرد ڈاکو جن کے نام سے پولیس کانپتی تھی۔ جسے گرفتار کرنے کے لئے ایک پوری فوج لگی۔ گولیوں سے اس کا بدن چھلنی ہو چکا تھا۔ اس کا چہرہ بگڑا ہوا تھا۔ خون سے لت پت بے گور و کفن لاش۔ تھانیدار سیاہ بوٹ سے ٹھوکریں مار رہا تھا۔ اُسے جس کے نام سے وہ کانپا کرتا تھا۔ اس نے ڈاکو کی جوان بہن کو گالیاں دیں۔ وہ کیوں بھائی کا ساتھ دینے آگئی تھی۔ لاش بے جان پڑی بہن کی گالیاں برداشت کر رہی تھی۔ بہن خاموش تھی۔ بھائی کی طرح، اس کا سہارا ٹوٹ چکا تھا۔ وہ بھی تو مردہ تھی۔

اس نے جرائم کی دنیا کا خوب مشاہدہ کیا تھا۔ اس کے ادبی ذوق کو ٹھوکر لگتی۔ جب وہ دفتر کے کام سے فارغ ہوتا تو اس کا تاریک کمرہ اُسے اپنے اندر پناہ دیتا۔ اس کی تاریکی اُسے کھا جاتی۔ وہ اسی میں خوش تھا۔ کتابیں اس کی رفیق ہوتیں۔ وہ پولیس کے افسروں کی بارکوں میں رہتا تھا۔ وہ بھی ایک افسر تھا۔ مگر سب سے نرالی قسم کا۔ جرائم کی روک تھام کرنے والے خود بھی تو مجرم ہو جاتے ہیں۔ مگر وہ جرم کے خیال سے بھی ڈرتا تھا۔ شاید اس کا دل زیادہ حساس تھا۔ اس کے ساتھی جرم کرتے ہوئے نڈر تھے۔ ان کے ہاتھ میں قانون تھا۔ وہ اس کا استعمال کر سکتے تھے۔ اس لیئے اُن کے جرائم اُسی قانون کی آڑ میں چھپ جاتے۔ مسعود کمزور دل تھا۔ وہ شباب کی مستیوں کے باوجود بوڑھا تھا۔ گرم خون رگوں میں دوڑتے ہوئے بھی اس کا دل بوڑھا ہو گیا۔ اس کے سامنے جوانی تھی۔ عہد شباب تھا۔ اسے کسی کا ڈر نہ تھا۔ وہ یہ چند برس، رومانی عہد، خوب گزار سکتا تھا۔

مگر اس حسین اور جاذب توجہ منظر کے پیچھے اسے ایک کتبہ نظر آتا۔ جو مہینے کی آخری تاریخوں میں اس امید پر فاقے کرتا کہ دو تین تاریخ کو ڈاک کے ہرکارہ کی مانوس آواز سنائی دے گی۔

پہلی بار جب اُس نے تنخواہ لی تھی تو وہ سیدھا ڈاک خانے گیا، اس نے ایک معمولی سی رقم منی آرڈر کر دی۔ اس کے پاس چند روپے باقی تھے۔ مہینہ بھر کا خرچ، اُس نے اُن میں سے اپنے ننھے بھائی کے لئے ایک اُونی سویٹر خریدا اور ایک اونی ٹوپی۔ دونو سرخ اون کے، دو کاندار زندہ دل تھا۔ اس نے سرخ رنگ پسند کرنے کی وجہ دریافت کی۔

"ننھا سفید رنگ کا ہے" وہ مسکرایا۔ اس کے لئے یہ باعث فخر تھا اس کا بھائی سفید رنگ کا ہے۔ "یہ سُرخ سویٹر اور ٹوپی اُسے بھلی معلوم ہوگی۔" وہ رکا۔ "وہ بالشویک بن جائیگا" مگر وہ دل میں ڈر بھی گیا۔ وہ تو خود پولیس کا ملازم تھا —— وہ پولیس کا ملازم سہی مگر اس کا بھائی اقتصادی مسائل کو حل کر سکے گا۔

اس کے جذبات کا چشمہ اُبھرنے سے پہلے دب گیا تھا۔ اُسے زندگی سے صرف اسقدر دلچسپی تھی کہ وہ دن بھر کام کرتا۔ فارغ اوقات اپنی تاریک کوٹھری یا کسی معمولی لائبریری میں گزار دیتا۔ قتل، خون، ڈاکے ہر وقت وہ یہی باتیں پڑھتا، لکھتا اور سوچتا۔ ساری کائنات اس کے لئے قتل و خون اور لوٹ مار سے بھری پڑی تھی۔ ناانصافی، دھڑا بندی، سفارش، رشوت اور نہ جانے کیا کیا برائیاں تھیں۔ جن کے نقشے ہر وقت اس کی آنکھوں کے سامنے پھر جاتے۔ سال بھر میں ہزار ہا بے گناہ انسانوں کے قتل کے مقدمات اسلئے داخل دفتر کر دیئے جاتے۔ کہ قاتل کی طاقت کے سامنے کسی کو آنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔

وہ اس زندگی سے گھبرا گیا۔ خاندان بھر میں وہ خوش قسمت سمجھا جاتا تھا۔ نوجوانی میں سرکاری افسر، مگر وہ پریشان تھا۔ جب وہ دفتر میں کام کرنے بیٹھتا تو اُسے ایسا معلوم ہوتا کہ اس کے اردگرد سب قاتل بیٹھے ہیں۔ ٹائپ کی ٹک ٹک اسے گولیوں کی مسلسل بوچھاڑ معلوم ہوتی۔ اُسے فائلوں کے انبار انسانی چہرے دکھائی دیتے۔ مرجھائے ہوئے۔ جب وہ کسی فائل میں سرخ لیبل دیکھتا تو وہ محسوس کرتا کہ کسی مقتول کا خون بہہ رہا ہے۔ انسانی کھوپڑیاں اُسے گھُور رہی ہیں۔ جب وہ کاغذ پر لکھ رہا ہوتا تو حروف اُسے زمین پر رینگتے ہوئے انسان دکھائی دیتے جو کسی کی گھات میں لگے ہوں۔

وہ فطری طور پر آرٹسٹ تھا۔ اُسے تخلیق کرنا تھی۔ مگر جب وہ اس تخریب کو دیکھتا تو وہ سوچا کرتا کہ خدا کا آرٹ عجیب ہے کہ اس میں بربادی اور تباہی کا عنصر بدرجہ اُتم ہے۔ نسل انسانی کی ابتدا قتل سے ہوئی تھی۔ فرشتوں نے آدم کو سجدہ کرتے وقت اسی خطرے کا اظہار کیا تھا۔ انسان کا خون انسان کے ہاتھوں بہہ رہا ہے لیکن وہ اپنی تخلیق کو ان باتوں سے دُور رکھے گا۔

یہ اس سے بھُول ہوئی کہ وہ اس دنیا کو چھوڑ کر چلا گیا۔ حالانکہ فنکار کے لئے انہی بہتی ہوئی خونی ندیوں میں ہزاروں قہقہے تھے۔ اس نے یہ نہ سمجھا کہ قہقہہ ہزاروں ارمانوں کے پائمال ہونے کے بعد ہی پیدا ہوتا ہے۔ اگر وہ آج تک وہیں ہوتا تو وہ ضرور زیادہ بہتر فنکار ہوتا۔

وہ آسمان سے گر کر کھجور میں اٹکا۔ مذہب کے آغوش میں اس نے جگہ لی۔ اس کے لئے مذہب ہی زندگی بن گیا۔ وہ ابھی ناتجربہ کار تھا بھٹک گیا۔ اس کو مذہب کا اسقدر خیال ہوا کہ اس نے مذہب کو پیشہ بنا لیا پیشہ وہ قعرِ مذلت میں گر گیا۔ وہ مذہب کو بیچتا تھا۔ اس نے اس خرید و فروخت کو جنت کا پیش خیمہ سمجھا۔ وہ قاتل سے نفرت کرتا تھا۔ اس لئے کہ قتل انسان کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیتا ہے۔ مگر اُسے کیا معلوم کہ مذہبی ماحول میں قتل کی وارداتیں زیادہ ہوتی ہیں۔ فرق اتنا تھا کہ ایک خون بہا کر اپنے جرم کا افشا کر دیتا ہے، دوسرا دل میں نشتر چبھوتا ہے۔ مرنے والے کو تریاق کا دلاسا دیکر جینے پر مجبور کرتا ہے۔ وہ زہر پلاتا ہے۔ جس کا اثر آہستہ آہستہ ہو۔

وہ اب فنکاری میں بڑھ رہا تھا۔ جرائم کی تفتیش اور اصل حالات پس منظر کا کام دیتے تھے۔ مذہبی ماحول اس کی ذہنی حسوں کو بیدار کر رہا تھا۔ اس کے دل کے ناسُور اُبھر رہے تھے۔ اس کا قلم جب اپنے جگر کے رستے ہوئے خون سے گلکاریاں کرتا تو وہ آرٹ کا شہ پارہ بن جاتا۔

وہ اقتصادی بدحالی کا شکار ہو چکا تھا وہ جس ادارہ میں کام کرتا تھا۔ اس کے اراکین اپنی ذاتی وجاہت اور امارت کی وجہ سے ممتاز لوگ تھے۔ ان کے اس امتیاز کا باعث وہ مذہبی ادارہ تھا۔ جس کے بل بوتے پر وہ آگے بڑھ گئے تھے۔ مگر وہ کارکن جن کے خون اور گوشت سے اس ادارہ کی عمارت تیار ہوتی تھی سسک رہے تھے۔ چند سالوں میں اس نے اپنے تین ساتھیوں کو اپنے ہاتھوں دفن کیا تھا۔ وہ تینوں تپ دق کا شکار ہوئے۔ وہ تینوں نوجوان تھے۔ ان کے "قتل" کا باعث وہ مذہبی لیڈر تھے۔ جو منبر سے چلا چلا کر اخوت اسلامی کا وعظ کیا کرتے۔ جن کی زندگی کا مقصد مذہب کے ذریعے انسانیت کو بلند کرنا تھا۔ اتنا بلند کہ آقا و غلام کی تمیز مٹ جائے۔ مگر ان انسانی بھیڑیوں نے ان لوگوں سے اتنا کام لیا کہ وہ جان کھو بیٹھے۔ وہ قاتل تھے مگر انہیں کوئی قاتل کہہ سکتا ہے؟ یہ کسے جرأت تھی۔

یہ فضا اس کے لئے ایک مہمیز تھی۔ بھُوک کی شدت سے بیتاب ہو کر جب وہ لکھنے بیٹھتا تو اس کی آنکھیں اشک بار ہوتیں۔ وہ روتا اور لکھتا۔ جب اس کی تحریریں رسائل میں چھپتیں تو اُسے ہر طرف سے داد ملتی

مگر روٹی، یہ لفظ شرمندۂ معنی نہ ہوتا —— وہ فن کار تھا۔ اپنی فطرت کی آواز سے مجبور تھا۔ وہ لکھتا۔ درد و غم میں مبتلا ہوتا تو زیادہ لکھتا۔ مجبوریوں نے اُسے اور چمکایا۔

اب اُس کا سرمایہ حیات یہی الفاظ تھے۔ جو سفید کاغذ پر سیاہ رنگ کا جامہ پہن کر سماج، مذہب اور خدا کا ماتم کیا کرتے۔ اُسے یہ الفاظ بڑے عزیز تھے۔ اُس کی تخلیق۔ وہ بھوک اور اِس کی شدّت سے بے نیاز ہو کر اپنی تخلیق میں محو ہو گیا۔ وہ مذہب سے بغاوت کرنے لگا تھا۔ اب اُسے جرم سے دلچسپی تھی۔ وہ مجرم کو بیمار جانتا تھا۔ اُسے اُس سے ہمدردی ہونے لگی تھی۔ عورت اُس کے لئے اب معمّہ نہ تھی۔ وہ اسے ایک ساتھی سمجھتا تھا۔ وہ ان سے بیباکی سے ملتا۔ ان سے باتیں کرتا۔ وہ انسانوں کے دلوں کے اندر جھانکتا۔ ہمدردی سے، اُن کے زخموں کو دیکھتا۔ اُسے اپنے زخم یاد آجاتے۔ جب اپنے زخموں کی تکلیف اُسے بیتاب کر دیتی۔ تو وہ چلانے کی بجائے روتا۔ آنکھوں سے دل کا خون بہہ نکلتا۔ ہاتھ لکھنے لگتا۔

جب وہ خوش ہوتا تو کنجوس کی طرح وہ اسے اپنے تک محدود نہ رکھتا بلکہ وہ اس میں ساری دنیا کو شامل کر لینا چاہتا۔ وہ ہنستا، دوسروں کو ہنساتا۔ اتنا ہنساتا کہ وہ لوٹ پوٹ ہو جاتے۔ اس کے زخم کھُل جاتے۔ مگر وہ ہنسے جاتا۔ تاکہ دوسرے خوش ہوں۔ اس کے دکھے ہوئے بھائی۔

اس نے اپنے کردار پیدا کئے جن سے وہ کھیلا کرتا۔ دیوانوں کی طرح وہ ہنسنے لگتا اور کبھی رونے، اس کا انہماک جاری رہتا۔ وہ حوادث کے طوفان میں بھی اپنے ان کرداروں کو سینے سے لگائے رکھتا۔ وہ اُسے اپنی جان سے زیادہ عزیز تھے۔ وہ اس کی رُوح تھے۔ اس کا مظہر، وہ آہستہ آہستہ ان میں ہی تحلیل ہوا جا رہا تھا۔ مسعود اب دو متضاد شخصیتوں کا نام تھا۔ ایک معمولی کلرک جو اپنی ضمیر کے خلاف دن بھر کام کرتا تھا۔ کام بھی کیسا —— موثر خطوط لکھ کر خدا کے نام پر پیسے مانگنا۔ جنت کے قطعات فروخت کرنا —— دوسرا ایک فن کار جو تخیّل کی بلندیوں پر اڑا جا رہا ہوتا۔ ہمدردی کا مجسمہ۔ جو مجرموں سے اس لئے محبت کرتا ہو کہ ان کا جرم سماج کے جسم کا ناسور ہے۔ وہ حُسن فروش عورتوں کو اس لئے قابل ہمدردی سمجھتا تھا کہ خدا کا شاہکار ایک روٹی جیسی حقیر شے کے لئے متاعِ عزیز بیچ رہا ہے —— دیوانگی کے ان لمحات میں جب مسعود کا جسم اپنے گھر میں ایک معمولی میز پر جھکا لکھنے میں مصروف ہوتا۔ تو اس کا دوسرا جزو کون و مکان کی وسعتوں پر چھا گیا ہوتا۔ یہ تخلیق کے اوقات تھے۔ جب بھی اس پر ایسے لمحات آتے تو ان کا نتیجہ ایک ایسا شہ پارہ ہوتا جو پہلے سب شہ پاروں پر سبقت لے جاتا۔

وہ وقت بھی آگیا۔ جب اس کا چھوٹا بھائی جوان ہوا۔ زندگی کی کشمکش میں وہ کامیاب تھا —— اُسے مسعود کی دیوانگی پر ترس آتا تھا۔ اس نے اقتصادی بدحالی سے مسعود کو کسی حد تک بے نیاز کر دیا۔ دیوانگی اور بڑھنے لگی۔ خالق کی ایک صفت بے نیازی بھی ہے۔ وہ بھی خالق تھا۔ آرٹ اور اس کی قیمت مسعود آج تک اس معمہ کو حل نہ کر سکا۔ وہ اس خیال کو بھی گناہ سمجھتا تھا۔ آرٹ کو اس نے مذہب کا رتبہ دے رکھا تھا۔ مذہب کو بیچنا رُوح کو مسخ کرنا تھا۔ اس کا یہ نظریہ دوسروں کے نزدیک محض ایک عیاشی تھا۔ وہ اُسے ادبی عیاش کہا کرتے تھے۔

وہ کچھ بھی تھا۔ مگر اس نے اپنے گرد ایک طبقہ پیدا کر لیا۔ انہیں اس سے محبت تھی۔ وہ اس کے آرٹ کے دلدادہ تھے۔ مسعود کی ساری توجہ اسی محفل پر تھی۔ وہ کتنا خوش تھا۔ اسے ان لوگوں سے مل کر کتنی خوشی ہوتی۔ اس کے لئے مرد اور عورت کا فرق نہ تھا۔ بلکہ وہ صرف چند رفیق تھے۔ جن کے ذریعے اس کا آرٹ شہرت حاصل کر رہا تھا۔

وہ سماج کا باغی تھا۔ خدا کا منکر۔ لیکن اس کے باوجود اس کا آرٹ ایک خاموش ندی کی طرح تھا جو ہولے ہولے بہہ رہی ہو۔ طوفانی دنوں میں اس ندی کا پانی بھی کناروں سے نکل بہتا۔ مگر ایسا کم ہوتا۔ وہ بغاوت کرتا مگر ہمدرد بن کر۔ جن کے خلاف وہ بغاوت کرتا اُسے ان سے بھی ہمدردی تھی۔ خدا کی ہستی سے منکر وہ اس لئے تھا کہ وہ ظالم کا حامی ہے۔

اس نے ذہن کے ایوانوں میں ایک نئی دنیا پیدا کی تھی۔ خاموش دنیا، جہاں ہر طرف سبزہ ہی سبزہ تھا۔ باغات، نہریں، چشمے، محلات، سکھ چین وہ خیال ہی خیال میں جسے دکھی دیکھتا اُسے اس فردوس میں لے آتا۔ اس کی دل جوئی کیلئے سارے لوازمات موجود ہوتے۔ کسی کا دکھ اس سے دیکھا نہ جاتا۔

وہ خود بھی تو دُکھی تھا۔ اس کے بچے جب اُسے اُن کا خیال آتا۔ تو وہ کانپ اٹھتا۔ اس کا جی چاہتا کہ وہ اپنے سارے شہ پاروں کو اکٹھا کر کے ایک چتا بنائے اور اس میں بیٹھ کر جل مرے۔ اس کے گرد شعلے بلند ہونے لگتے۔ وہ چلاتا۔ "میرے بچو! یہ ہے تمہارا باپ! فن کار! خالق! وہ جل رہا ہے اپنی ہی تخلیق کے ہاتھوں۔ اس نے خالق ہونے کا دعویٰ کیا تھا۔ وہ خدائی کا دعویدار تھا۔ کافر! اس کی سزا! —— وہ جل مرا —— مگر ——"

وہ رونے لگتا۔ عذاب اس کی جان تک محدود نہ تھا۔ اس کا اثر اس کے بچوں پر بھی ہوگا۔ وہ فاقوں مر جائیں گے۔

مگر کون جانتا تھا کہ مسعود کے بچے بھوکے ہیں اور اس کے بچے ہیں بھی؟ وہ فن کار تھا۔ اس کا پیدا کیا ہوا ادب ہمیشہ زندہ رہے گا۔ وہ انسانیت کا ہمدرد تھا۔ خدا کا آرٹ ایک دوسرے کو تباہ کرتا ہے۔ وہ بھی خدا کا آرٹ تھا۔ اس کے بچے بھی خدا کا آرٹ۔ خوبصورت بچے، وہ ان کو برباد

کررہا تھا - اس کی حسین بیوی ہڈیوں کا پنجر رہ گئی تھی - اس کا باعث وہ تھا۔ قاتل مذہبی لیڈروں کی طرح وہ گھن بن کر کنبہ کو کھائے جارہا تھا -

اس کا بھائی جو اسے دیوانہ سمجھ کر ترس کھاتا رہتا تھا۔ اب اُسے بھی اس سے نفرت ہونے لگی تھی - وہ مسعود کو جونک سمجھتا تھا - اس کے لئے اس کا فن محض تضیع اوقات تھا - وہ کاروباری آدمی تھا - وہ چاہتا تھا کہ ہر وہ لفظ جو مسعود لکھتا ہے - اس کی قیمت ملنی چاہیئے - مگر مسعود اپنی اولاد کو بیچنا گناہ جانتا تھا - انسانیت سوز گناہ ۔

نفرت ——— ہر طرف مسعود کو نفرت دکھائی دیتی تھی - اس کا بھائی جب اس کی طرف دیکھتا تو اسے ایسا معلوم ہوتا کہ دنیا بھر کی نفرت اس کی نگاہ میں ہے - ایک وقت تھا کہ مسعود کا ایک ذرا سا اشارہ اسی بھائی کے لئے فرمان ہوتا تھا - مگر اب یہ حالت ——— اس کے بلکتے بچے، نحیف بیوی، ان سے اُسے ڈر لگتا تھا ——— لیکن اب وہ نفرت کی آگ میں پھینک دیا گیا - وہ جل رہا تھا - اسے جلانے کے لئے ہر روز نیا حربہ استعمال کیا جاتا - وہ حساس تھا - اُسے زیادہ صدمہ ہوتا - وہ یہ صدمے برداشت کرنے کا عادی نہ رہا تھا - اس نئی مصیبت نے اُسے پریشان کر دیا - جب وہ اپنے افسانوں اور کتابوں کی طرف نگاہ اٹھاتا تو وہ اُسے ناچتے ہوئے دکھائی دیتے - اس کی برسوں کی کمائی ——— پھر وہ انسان بن جاتے - اس کی طرف حقارت سے دیکھنے لگتے - ان کی نگاہیں نفرت برساتیں ——— ہمارا خالق یہ ہے ——— مجنوں ——— دیوانہ ——— بے وقوف ——— خدا ——— " پھر یکایک ایسا ہوتا کہ ان کے ہاتھوں میں اس کے بچے اور بیوی کے سر ہوتے گردنوں سے لہو جاری ہوتا - وہ یہ نظارہ دیکھ کر آنکھیں بند کر لیتا - مگر یہ سین ذہن کی آنکھوں کے سامنے اور زیادہ روشن ہو جاتے ——— پھر ایک قہقہہ بلند ہوتا - ان کے پیچھے اس کا بھائی کھڑا قہقہے لگا رہا ہوتا ——— " ادبی عیاش ——— ظالم ——— طفیلی ——— لفافاہ !" وہ اشارہ کرتا ان بریدہ گردنوں کی طرف ——— پھر حقارت سے، وہ چند روپہلی سکے زمین پر پھینک دیتا ———

اس کی حالت خراب ہونے لگی - اس نے اپنا جہاں پیدا کیا تھا - جوانی دے دی تھی - اسے خیال تھا کہ وہ ادبی دنیا میں ایک نئے ادب کا اضافہ کرے گا - اس کو موت نہ آئے گی - جب تک اس کا ادب باقی رہے گا وہ زندہ رہیگا - اس نے اپنا مقام بلندیوں پر منتخب کیا تھا - اس کا معمولی گھر بھی (اپنے اندر تمام دنیا کے لئے آرام لئے تھا - اس نے سکھ اور چین کو گھر میں جگہ دی تھی - وہ چاہتا تھا کہ سارے عالم کا آرام یہاں موجود ہو - یہی وہ اپنے بچوں کی تربیت کر رہا تھا -

نفرت کا جوالا مکھی ایک دن پھٹ گیا - اس کا گرم اور سُرخ لاوا نکل کر مسعود کے جسم کو جلانے لگا - اس کا بدن گرمی کی شدت سے پھنک رہا تھا - وہ بلبلا اُٹھا - پگھلتا ہوا سیال مادہ - آگ سے زیادہ تیز جلانے والا وہ تڑپ اُٹھا - اُسے توقع ہی نہ تھی کہ پیار کی معمولی چوٹی ایک جوالا مکھی ہو سکتی ہے -

اس کا شفیق بھائی جس کی وہ پرستش کیا کرتا - اس کے احسانات سے مسعود کی گردن جھکی رہتی - اپنی شہرت اور آرٹ کا اسے موجب جانتا - لیکن وہ کریم انسان جوالا مکھی سے زیادہ غصہ سے پھنکار رہا تھا - نفرت کا اظہار ایسے سخت الفاظ میں کر رہا تھا - اس کے دوستوں کو ذلیل کر رہا تھا - مسعود کی بیوی اور بچے سہمے ہوئے رو رہے تھے - اپنی بدقسمتی پر - اپنے خاوند اور باپ کی بدقسمتی پر - جس درخت کے سائے تلے وہ بیٹھے تھے - وہی درخت کانٹے بن کر چبھ رہا تھا - ابر و باراں جس نے مسعود کے گلشن حیات کو بہاروں میں تبدیل کر دیا تھا - آج باد صرصر کا ایک طوفان بن کر سارے باغ کو جلا رہا تھا -

اس سارے انقلاب کا باعث، صرف چند روپوں کی فراوانی تھی - مسعود کے پاس یہ روپہلی سکے نہ تھے - بھائی ان کا مالک تھا - مسعود کا فن - اس کی مالیت کیا تھی - چند الفاظ - روپہلی سکے ان سے اس کا بھائی اپنی زندگی بہتر بنا سکتا تھا - عیش کر سکتا تھا - مسعود کی موجودگی اس کی راہ میں ایک روک تھی - اس کے بچے جونک بن کر چچا کا خون پی رہے تھے -

چچا نے جونکیں اُتار پھینکیں - مسعود کا سارا فن دھرا رہ گیا - ادارہ جہاں وہ ملازم تھا اسے اسقدر تنخواہ بھی نہ دیتا تھا - جس سے وہ زندہ رہنے کے لئے خوراک خرید سکے - مسعود نے زندگی وقف کی ہوئی تھی - توکل کی تلقین اور تھوڑی سی تنخواہ کافی سمجھی گئی تھی - اس کا فن بازار میں بک نہ سکتا تھا - اس کے باوجود اُسے زندہ رہنا تھا - مغموم بیوی - روتے ہوئے بچے - وہ ان سے سمٹا سوچ رہا تھا - اس کا جگر خون ہو کر آنکھوں میں آ گیا - وہ چاہتا تھا کہ بھائی کے قدموں پر سر رکھ دے اور اسے کہے کہ بھائی مجھ پر رحم کرو - مگر بھائی کی نفرت بھری آنکھیں ان سے وہ ڈرتا تھا - خوف سے اس کے حواس گم ہو رہے تھے -

اس کی بیوی نے رُکتے رُکتے اس کے کان میں کہا " آپ کہیں اور نوکری کر لیں - سنا ہے فوج میں ——— "

" کرلوں گا " وہ خود بھی یہی سوچ رہا تھا -

ذہن کے ایوان لرز گئے - مسعود کی روح کا جنازہ اس کے اپنے کندھوں پر نکل رہا تھا - وہ دس برس کردار تخلیق کر رہا تھا کہ وہ دنیا میں امن کا موجب بنیں - اس کا اپنا دل ان کرداروں کے جسم میں داخل ہو کر حرکت کرتا رہتا - اس نے جگر کا خون دیکر جن پودوں کو سینچا تھا انہیں خود

اکھاڑنے لگا تھا - خالق اپنی مخلوق کو چھوڑ کر جا رہا تھا - اپنے مدِ مقابل -
خدا ـــــ کی تخلیق کو برباد کرنے - تباہ کرنے - خدا کے عذاب میں ایک
پرزہ بن کر انسانیت پر بم برسانے کے لئے وہ تیاری کر رہا تھا - قاتل -
وہ بھی قاتل ہوگا - چند ٹکوں کے لئے - کرایہ کا قاتل ایک سو روپے کیلئے
سیکڑوں انسانوں کا خون کرے گا -

جوالامکھی کا کھولتا ہوا مادہ اس کی طرف بڑھا آ رہا تھا - وہ پریشان
تھا - رسائل اور کتابیں حسرت سے اُسے تک رہی تھیں - سہیل جمیل
سلیم آغا - فیروز - طاہرہ - زبیدہ - پشپا - اس کے کردار اس کا ماتم
کر رہے تھے - اس کی موت کا انہیں صدمہ تھا - اُن کے خالق کا جنازہ
نکل رہا تھا - وہ چتا میں جل رہا تھا - اس کا بھائی - پیارا بھائی نفرت کا تیل
ڈال کر آگ کو اور روشن کرتا گیا -

بچوں کو اس نے گلے سے لگا لیا - وہ زہر خندہ ہو کر مسکرایا - موت
ہی اس کی زندگی تھی - اس نے اپنے کرداروں کو زندہ جاوید بنا دیا تھا -
اب اُسے تخریب کے لئے نکلنا تھا - جوالامکھی اُسے بھسم کر دینا چاہتا
تھا - اس کے لئے صرف ایک ہی راہ فرار تھی - وہ تھا فوج میں نوکری -
ـــــ وہ اُٹھا اور اپنے بوسیدہ سارٹیفکیٹ تلاش کرنے لگا -

بلندی و پستی

(پرویز عباسی)

خارزار جنگلوں اور بیابانوں کو طے کرتے ہوئے ہم ایک سرسبز
وادی میں پہنچے - جہاں پہاڑی کے دامن میں ایک خوشنما جھیل تھی جس
کے چاروں طرف رنگ برنگ کے پھول کھلے ہوئے تھے - میں نے کہا بس
یہیں آرام کریں - مگر وہ نہ مانی - کہنے لگی ہم اس پہاڑی پر چڑھیں گے اور
وہاں سے دنیا کا تماشا دیکھیں گے - میں نے ہر چند سمجھایا کہ پہاڑی بہت
ڈھلوان ہے - ہر وقت نیچے گرنے کا خطرہ ہے - اس نے ایک نہ
سُنی اور چڑھتی چلی گئی - میں مجبوراً پیچھے پیچھے ہو لیا - بھلا اتنے منازل
طے کرنے کے بعد کس طرح ساتھ چھوڑ دیتا - آخر ہم دونوں چوٹی پر پہنچ
گئے - اس نے نیچے کی طرف دیکھا اور کہا کہ میں تو جھیل میں کودونگی -
مجھے تیرنا بھی آتا ہے - میں رکتا رہ گیا - کیونکہ میں نہ کودنا جانتا تھا - نہ تیرنا -
اس نے ایک چھلانگ ماری - میں کھڑا کا کھڑا رہ گیا - کچھ دیر تک وہ
پانی کی تہ میں غائب رہی - پھر کیا دیکھتا ہوں - جھیل کے اُس پار ایک
پھول ہاتھ میں لئے کھڑی مسکرا رہی ہے -

حفظِ جوانی

جوانی ہے فطرت کا نایاب غنچہ
مسلتا ہے بیدرد کیوں اس کلی کو؟
جوانی سے کامل ہوا ماہِ کنعاں
اسی سے ملا زورِ مولا علیؑ کو

۲

جوانی کا غنچہ ہے جنت بداماں
ہوا و ہوس کی لگے لُو نہ اس کو
مہکتا ہے اس کو ابھی کھِل کھلا کر
ملا خاک میں توڑ کر تو نہ اس کو

۳

جوانی توانائیوں کی ہے گنگا
مقاصد کے کھیتوں کو سیراب کر لے
بہارِ جوانی گذرنے سے پہلے
"گلِ سرخروئی" سے دامن کو بھر لے

۴

جوانی ہے پائے طلب زندگی کا
اسی سے جنوں کوشئِ جستجو ہے
کمالِ تمنا اسی کا کرشمہ
یہی پردہ دارِ رخِ آبرو ہے

(خان بہادر) امین حزین سیالکوٹی

غزل

جی یہی چاہتا ہے تیری تمنا کر لوں
کیسے لٹتی ہے جوانی یہ تماشا کر لوں

تیری مستانہ نگاہی کے تصدق ساقی
میں جوانی کو غریقِ مے و مینا کر لوں

لوگ کہتے ہیں ترے در پہ بدلتے ہیں نصیب
میں بھی کیا آنے کی تکلیف گوارا کر لوں

تم نہیں ہو تو مجھے خواہشِ دُنیا بھی نہیں
اِک ذرا آؤ کہ میں خواہشِ دُنیا کر لوں

کاش اُس نورِ مجسّم کی ضیاؤں سے کبھی
اپنے تاریک سے لمحوں میں اُجالا کر لوں

اُس نے پھر اِک نگہِ خاص سے دیکھا تو ہے
اور کچھ روز میں جینے کی تمنا کر لوں

عشرتِ لمحہ بھی گر تیرے شبستاں سے ملے
عمر بھر کو میں غمِ ہجر گوارا کر لوں

میری نظروں میں ہے تعمیرِ جہاں کا منظر
اِک ذرا نظمِ دو عالم تہ و بالا کر لوں

ناخدا دل کا تقاضا ہے کہ اب بہرِ نجات
اِنہیں اُٹھتی ہوئی لہروں پہ بھروسا کر لوں

کر سکے ایک اشارہ بھی نہ تم، ورنہ میں
موت تو موت ہے جینا بھی گوارا کر لوں

بہرِ طوفِ حرم و دیر بھی آ جاؤں گا
پہلے خود اپنی تجلّی کو تو سجدا کر لوں

میرے غم خانہ میں بھولے سے جو وہ آ جائیں
اپنے اخترؔ کو میں ہم اوجِ ثریّا کر لوں

اخترؔ ہوشیارپوری

شاعر ملک بی۔اے

ریڈیائی ڈرامہ
تاریخ کا ایک بھولا ہوا ورق

انعام

اداکار:-

سکندر اعظم ۔۔۔۔ شاہِ یونان
کمپاپسے ۔۔۔۔ محلوں میں ایک کنیز
ایلبیس ۔۔۔۔ مصوّر

(۱)

گجر یہ زور کی آواز ۔ بعد میں سازوں پر ہلکی سی دھن ۔
قدموں کی چاپ

سکندر اعظم - کمپاپسے!

کمپاپسے - عالم پناہ!

سکندر - اب تک کہاں تھیں کمپا؟

کمپا - میں محل سرا میں شہنشاہ کی آمد کا انتظار کر رہی تھی۔

سکندر - کیا ہماری فتح یابی کی خبر تم تک نہ پہنچی؟

کمپا - پہنچی عالم پناہ - اور جہاں پناہ کے پایہ تخت میں پہنچنے سے بھی پہلے۔

سکندر - تو تم دربار میں کیوں نہ چلی آئیں؟ معلوم ہوتا ہے تم خوش نہ ہوئیں۔

کمپا - میں ڈرتی تھی عالم پناہ -

سکندر - ڈرتی تھیں تم! کس لئے؟

کمپا - چاند کی موجودگی میں ایک دئیے کی کرن کا آنا مشکل تھا - میں ایک ناچیز کنیز ہوں۔

سکندر - مابدولت کا حکم ہے - تم جہاں جانا چاہو جا سکتی ہو - کیا تمہیں روکا کسی نے؟

کمپا - نہیں عالم پناہ ایسا کون ہے جو آپ کے حکم کی تعمیل میں کوتاہی کرے - لیکن میں پھر بھی ڈرتی تھی عالم پناہ -

سکندر - جیوپٹر کی قسم میں کچھ نہ سمجھ سکا -

کمپا - شاید عالم پناہ نہ سمجھ سکیں۔

سکندر - لیکن ہم نہیں چاہتے کہ تم ڈرتی رہو - اور ہم غافل رہیں - ہم صاف صاف سننا چاہتے ہیں -

کمپا - تو سنئے عالم پناہ - ایک غریب کنیز کے پاس نذرِ شاہی کے لئے کیا رکھا تھا - جو وہ وہاں حاضر ہوتی -

سکندر - خوب - تمہارے پاس کیا رکھا تھا - بتاؤں کمپا؟ تمہارے پاس میری نذر کے لئے کیا رکھا تھا -

کمپا - غریب کمپا تاجِ شاہی کے لئے ایک پھولوں کا ہار لائی ہے - قدرتِ الٰہی کا ایک نازک ترین تحفہ

سکندر - پھول - اور پھول جو کمپا کے دل سے بھی نازک ہوں - ہمیں یہ کبھی خیال نہ آیا -

کمپا - آپ بجا فرماتے ہیں عالم پناہ -

سکندر - کمپا کے یہ پھول درباریوں کی اشرفیوں - خزانوں کے لازوال موتیوں سے بھی ہم کو زیادہ عزیز ہیں کمپا؟

کمپا - عالم پناہ -

سکندر - ہم جاننا چاہتے ہیں - کہ جب ہم پایہ تخت سے دور میدانِ جنگ میں تلواروں اور نیزوں کے سایہ میں ہوتے ہیں - کیا کمپا کا دل دھڑکتا ہے - کیا کمپا کو ہم یاد آتے ہیں -

کمپا - آج تک پروانہ نہ کہہ سکا کہ وہ شمع پر کیوں جل جاتا ہے - عالم پناہ شاید اس کا جواب میں نہ دے سکوں -

سکندر - جیوپٹر کی قسم جواب لاجواب ہے - مگر کمپا ہم میدانِ جنگ میں واپس جا رہے ہیں - ہم چاہتے ہیں کہ تمہاری صورت ہر وقت ہمارے روبرو رہے - آج ہم ایک نامی مصوّر کو بلایا چاہتے ہیں - تمہیں چند گھنٹے اس کے سامنے بیٹھنا پڑے گا - صرف چند گھنٹے -

کمپا - عالم پناہ میں ایک اجنبی کے سامنے آنکھیں نہ اُٹھا سکوں گی -

سکندر - ایلبیس ایک معصوم نوعمر لڑکا ہے - پایہ تخت میں اس جیسا کوئی مصوّر نہیں - پھر مابدولت کا حکم ہے -

کمپا - عالم پناہ کا حکم سر آنکھوں پر - کنیز کی جان بھی حاضر ہے -

سکندر - اب تم جا سکتی ہو -

(قدموں کی چاپ کمپا کا جانا)

(سارنگی پر دھیما میوزک)

سکندر - دنیا ہمیں سکندر اعظم کہتی ہے - دنیا کو غلامی کی زنجیریں پہنانے

والا فاتح - دارا کی سلطنت کو کم کھا اُڑ دینے والا سکندر - دشمن کی صفوں میں گھس کر لڑنے والا شیر - حریف کے بالمقابل تھا - لیکن دنیا بھول لیتی ہے - سکندر قدرت کے اس عظیم الشان شاہکار کے سامنے جس کو دنیا عورت کہتی ہے اپنے ارادوں کو بالکل پست پاتا ہے - صنفِ جمیل کے اس بے خطا ہتھیار کے آگے جسے دنیا آنسو کہتی ہے - سکندر اعظم کا تاج شاہی جھک جاتا ہے - عورت گلشنِ عالم کی بہار ہے - گلزارِ حسن و خوبی کا شگفتہ پھول - تخلیقِ لطافت - تصویرِ وفاداری -

(گھنٹے پر زور کی آواز)

(۲)

سکندر - اپلیس کو حاضر کیا جائے -

(دور سے قدموں کی چاپ)

اپلیس - اپلیس شہنشاہ کی قدم بوسی کے لئے حاضر ہے -

سکندر - اپلیس -

اپلیس - عالیجاہ -

سکندر - کیا نوروز کو تمہیں ماہ دولت کے سامنے کیوپڈ کی تصویر لئے ہوئے حاضر ہوئے تھے ؟

اپلیس - عالی جاہ - اور عالم پناہ نے اسے بے حد پسند فرمایا تھا -

سکندر - اپلیس -

اپلیس - عالم پناہ -

سکندر - آج تمہیں کمپا کی تصویر بنانی ہوگی - قدرت کا عظیم الشان شاہکار جنسِ گراں مایہ - سرمایۂ حیات -

(پانچ سیکنڈ کا وقفہ)

کیوں اپلیس کیا سوچ رہے ہو - کیا تم کمپا کی تصویر نہ بنا سکو گے ؟

اپلیس - میں کوشش کروں گا - عالیجاہ - اگر دیوتاؤں کی برکتیں شاملِ حال رہیں تو شہنشاہ سے خاطر خواہ انعام پاؤں گا -

سکندر - خوب - تم ابھی سے کام شروع کر دو - تصویر مکمل ہونے پر دربار میں پہنچا دی جائے -

اپلیس - عالم پناہ کا حکم سر آنکھوں پر -

(قدموں کی چاپ)

(اپلیس کا جانا)

(۳)

(سازوں پر دھیمی دھن)

(اپلیس کی آہ بھرنے کی آواز)

اپلیس - اب آپ جا سکتی ہیں - تصویر مکمل ہو چکی -

کمپا - کیا تصویر مکمل ہو چکی ؟

اپلیس - تصویر ہر طرح سے مکمل ہے - میں شہنشاہ کی خدمت میں جا رہا ہوں -

(قدموں کی آواز)

کمپا - ٹھہرو اپلیس - میں تم سے کچھ کہنا چاہتی ہوں -

اپلیس - فرمائیے - میں حاضر ہوں -

کمپا - تمہاری ملول نگاہیں شاہد ہیں - کہ تم تصویر سے مطمئن نہیں ہو - شاید تصویر معیار پر پوری نہ اُتری -

اپلیس - نہیں کمپا پسے - تمہاری تصویر یقیناً میرا شاہکار ہے -

کمپا - تو مجھے امید ہے کہ . . . یونان کا مصوّر سکندر اعظم سے منہ مانگا انعام پائے گا -

اپلیس - نہیں کمپا - مجھے انعام کی خواہش نہیں -

کمپا - تو تم شہنشاہ کو ناراضی کی دعوت دے رہے ہو -

اپلیس - غریب مصوّر کا دل پہلے ہی رنج والم کا نشیمن ہے - کیا ہی اچھا ہوتا - اگر میں نے کمپاسپے کی تصویر نہ بنائی ہوتی -

کمپا - اپلیس -

اپلیس - کمپا -

کمپا - یہ تم کیوں کہتے ہو اپلیس - میں ایک ناچیز کنیز ہی سہی - سینے میں دل رکھتی ہوں اور دل میں درد - کیا کمپا تمہارے دکھوں میں شریک ہو سکتی ہے اپلیس ؟

اپلیس - ایسا مت کہو کمپا - شہنشاہ خود تم سے الفت کرتے ہیں - میں ایک غریب مصوّر ہوں - مخملی فرشوں پر چلنے والی کمپا کانٹوں پر نہ چل سکے گی -

کمپا - مت بھولو اپلیس شاہی محلوں میں رہنے والی کمپا - محبت کے سریلے نغموں کی جھنکار سنتے ہوئے تنکوں کی ایک جھونپڑی میں سُکھ کے دن گزار سکتی ہے - میں تم سے محبت کرتی ہوں -

(سازوں کی زبردست جھنکار)

اپلیس - کمپا !

کمپا - اپلیس -

اپلیس - اس کا انجام کیا ہوگا - شاید کمپا اس سے بے خبر ہے - شہنشاہ ہم دونوں کو گردن اُڑا دینے کا حکم دیں گے -

کمپا - شہنشاہ میرے جسم و جان کے مالک ہیں - میرے دل کے نہیں

اپلیس - کمپا سوچ لو - موت یقینی ہے -

کمپا - اہلیس معلوم ہوتا ہے۔ تم موت سے ڈرتے ہو - آزادی کی موت طلائی قفس کی موت سے کہیں بہتر ہو گی - تمہاری غیر موجودگی میں یہ محل مجھے کاٹنے کو دوڑیں گے - میری زندگی ویران ہوگی - ایک بیابان کی مانند اُجاڑ ایک جنگل کی طرح - اہلیس تم مرد ہو۔ حوصلوں کی پستی ذلت کی طرف مرد کا پہلا قدم ہے - اب تم جاؤ اور شہنشاہ کو اطلاع دو کہ تصویر تیار ہے۔ شہنشاہ تم کو منہ مانگا انعام دیں گے۔

(قدموں کی چاپ اہلیس کا جانا)

(۴)

سکندر - خوب اہلیس خوب! تمہاری محنت واقعی ہی قابلِ داد ہے - شاہی محلوں میں آج تک ایسی تصویر نہ بن سکی - ماہدولت بہت خوش ہوئے - تم اپنا انعام خود تجویز کر سکتے ہو۔

اہلیس - عالم پناہ نے ایک ناچیز مصوّر کی تصویر پسند فرمائی - یہ خوشی کسی انعام سے کم نہیں -

سکندر - نہیں اہلیس - آج ہم بہت خوش ہیں - کہو تو شاہی خزانوں کے پٹ کھول دیئے جائیں - کہو تو جاگیر عنایت کی جائے - اگر شاہی دربار میں کسی عہدہ پر سرفراز ہونا چاہتے ہو - تو کہو - اہلیس اہلیس - چپ کیوں ہو - آج ماہدولت بہت ہی خوش ہیں - بہت ہی خوش -

اہلیس - عالم پناہ غریب مصوّر کا انعام بہت بڑا ہے - شاید آپ دے نہ سکیں -

سکندر - اہلیس تم ماہدولت کے سامنے گستاخی کر رہے ہو - کسی اور کی زبان سے نکلے ہوئے یہ الفاظ اس کی موت کے مترادف ہوتے لیکن نہیں اہلیس - آج ماہدولت بہت ہی خوش ہیں - تم نے کمپا کی تصویر بنائی ہے - بولو کیا مانگتے ہو؟ -

اہلیس - بہت بہتر عالیجاہ - تو غلام کی استدعا ہے - کہ مجھے وہ کنیز عطا کر دی جائے - جس کی تصویر میں نے خدمتِ عالی میں حاضر کی ہے -

(گجر پر زور کی چوٹ - سازوں پر خوفناک تھرتھراہٹ -
بھیانک میوزک)
بجلی کے کڑکنے کی آواز

سکندر - کیا کمپا؟ -

(تین سیکنڈ کا وقفہ)

"کمپا کو حاضر کرو -"

(قدموں کی آواز)

کمپا - کنیز شاہِ اقدس کی خدمت میں حاضر ہے -

سکندر - کمپا -

کمپا - عالم پناہ -

سکندر - یہ نوجوان مصوّر اپنے انعام میں تمہیں طلب کرتا ہے - کیا تمہیں منظور ہے -

کمپا - جی عالم پناہ - میں اہلیس کے ساتھ جانے کو تیار ہوں -

(گجر پر زور کی آواز بھیانک میوزک)

سکندر - اہلیس ہم تم کو مبارک باد دیتے ہیں کہ کمپا کا چناؤ سب سے اعلےٰ ہے - اب تم جا سکتے ہو - دیوتاؤں کی برکتیں تم پر نازل ہوں -

(دونوں کا جانا)

(سارنگی پر دھیما میوزک)

سکندر - کیا سکندر دنیا کا عظیم الشان بادشاہ - دنیا کے سامنے اپنی کمزوری کا اعتراف کرے گا کہ وہ ایک کنیز سے محبت کرتا تھا - اور کنیز نے ایک معمولی مصوّر کو اس پر ترجیح دی - نہیں نہیں ہرگز نہیں - عورت ہاں عورت - ایک خوبصورت دھوکہ ہے - مجسمۂ بے وفائی - شیریں تبسم میں زہر کی تلخی -

(سارنگی پر میوزک)

غزل

خدا رکھے محبّت حاصلِ صد زندگانی ہے
تبسّم ہی تبسّم ہے جوانی ہی جوانی ہے

یہی بس مختصر بیتابیٔ غم کی کہانی ہے
ٹھہر جائے تو انگارہ جو بہہ جائے تو پانی ہے

نہ پوچھو اپنے دامن سے مرے بہتے ہوئے آنسو
گذرتی ہے جو دل پر یہ اسی کی ترجمانی ہے

نہ گھبرا ہم نفس اب جلد وہ ایام آتے ہیں
کہ جس کا ایک اک لمحہ سکونِ شادمانی ہے

عجب کیا؟ مر کے حاصل ہو حیاتِ جاوداں اختر
میں فانی ہوں مگر ان کی محبت غیر فانی ہے

سیدہ اختر حیدر آبادی

انتظارِ آزادی

ہم نشیں مجھ کو نہ دے پیغام رنگین بہار
مجھ کو کیا گر ساری دنیا محوِ کیف و رنگ ہے
مجھ کو کیا فطرت اگر ہے مائل رقص و نشاط
مجھ کو کیا گر پھول کی صورت ہے خنداں کائنات
مجھ کو کیا موسم اگر کرتا ہے اعلانِ شگفت
وہ اسیرِ قید زنداں وہ گرفتارِ قفس
ٹھوکریں در در کی جو کھایا کرے لیل و نہار
التفات آمیز پردے ہیں بطورِ انتقام
بے اجازت لب کشائی کی جسے جرأت نہ ہو
ہو جو ہر دم وقف غیروں کی غلامی کیلئے
چھین لے بیدادیٔ احساس جس سے مفلسی
جس کا نطق و لب بھی اور کلمات بھی محکوم ہوں
خاک لطف انگیز ہو سکتا ہے ان حالات سے
آئیگا جس دن نظامِ گلستاں میں انقلاب
جب چمن آزاد ہو گا پنجۂ صیاد سے
جب زباں بندی کو مل جائے گا حکمِ اختصار
جب چمن پر ہو گا اربابِ چمن کا اقتدار

ہوں وفورِ یاس و غم سے سرجیب انتشار
بزمِ ہستی غرق طوفانِ رباب و چنگ ہے
گل فشاں ہے محفلِ امکاں کی فردوسی بساط
گا رہی ہے سرخوشی کے زمزمے نبضِ حیات
مجھ کو کیا گر ہر نفس ہے موجِ طوفانِ شگفت
آشنائے تلخیٔ آزار و آلام ——— قفس
بھیک کے ٹکڑوں پہ ہو شام و سحر جس کا مدار
جس پہ خوئے جور نے کر دی ہو ہر راحت حرام
جس کو اک فریاد زیرِ لب پہ بھی قدرت نہ ہو
ذلت و ادبار کے حبسِ دوامی کے لئے
محو کر دے جذبۂ خوددار جس سے بے کسی
جس کے احساسات اور جذبات بھی محکوم ہوں
رنگ میں ڈوبے ہوئے آثار و کیفیات سے
صبح تسکیں سے بدل جائیگی شامِ اضطراب
ہر کلی محفوظ ہو گی خطرۂ بیداد سے
ٹوٹ جائے گا قفس کی تیلیوں کا جب حصار
ہوں گے جب بچھڑے ہوئے اک دوسرے سے ہمکنار

ہم نشیں ہونے تو دے اعلانِ تجدیدِ بہار
پھر مجھے آ کر سنانا مژدۂ عیدِ بہار

محمد شفیق الرحمن خاں شفق

شریف چکوالی

پیشبندی!

بارش ابھی تھمی نہیں تھی اور آسمان و زمین کا باہمی کھیل جاری ہی تھا کہ این - کے بوس ٹیکسی سے اُترا اور کچھ پریشان سا اپنے کمرے میں داخل ہو گیا - اس کے بعد جب اُس نے کمرہ اندر سے مقفل کر لیا تو اس کے چہرے پر اطمینان اور بے فکری کی جھلک اِس طرح نمایاں ہو گئی، گویا وہ کسی مشکل آزمائش میں پورا اُترا ہے —— پھر نہ جانے کیا سوچ کر وہ سڑک کی طرف کھلنے والی کھڑکی پر جا کھڑا ہوا اور باہر کی طرف دیکھنے لگا -

سمتِ مخالف سے ایک خوبصورت کار برق کی سی تیزی سے آئی - اور اس کے دیکھتے دیکھتے دروازے پر رُک گئی، ایک حسین نوجوان لڑکی نے گاڑی سے اُتر کر ڈرائیور کو کوئی ہدایت کی اور گاڑی اسی تیزی سے لوٹ گئی -

یہ نظارہ دیکھ کر این - کے بوس کے چہرے پر تشویش کے آثار پھر نمودار ہو گئے، وہ میز کی طرف بڑھا اور ٹیلیفون کا ریسیور اُٹھا کر کان سے لگا لیا - لیکن فوراً ہی اُسے معلوم ہو گیا کہ کسی نا معلوم وجہ سے ٹیلیفون کے تار کٹ گئے ہیں اور وہ اپنا کام نہیں کر سکتا -

اس نے ریسیور رکھ دیا - پھر اپنی جیب سے ایک چھوٹا سا لفافہ نکالا اور کسی گہری فکر میں ڈوب گیا - دفعتاً وہ چونک سا پڑا جیسے اچانک کوئی بھولی ہوئی بات یاد آ گئی ہو، اور میز کی ساری درازیں ایک ایک کر کے کھول دیں —— وہ، اس بظاہر بے معنی کام میں مصروف ہی تھا کہ دروازے کی گھنٹی بجی، گھنٹی کی آواز سنتے ہی اس نے ایک خاص انداز سے اپنے سر کو حرکت دی - جیسے کسی قطعی فیصلے پر پہنچ گیا ہو!

گھنٹی کی آواز دوبارہ سنائی دی اور اب اسے دروازہ کھولنے جانا ہی پڑا - کیونکہ وہ اس گھر میں اکیلا ہی رہتا تھا!

قیمتی لبادے میں لپٹی ہوئی وہی نوجوان لڑکی سامنے کھڑی تھی، مسٹر بوس کو دیکھتے ہی وہ ہلکی سریلی آواز میں "نلین" کہہ کر پیچھے ہٹی اور پھر "پیارے نلین"، کہہ کر پورے جوش سے اُس سے لپٹ گئی —— خوشی یا حیرت سے اس کی آواز چیخ میں بدل گئی تھی!

نوجوان این کے بوس محسوس کر رہا تھا کہ اس نے اس لڑکی کو کہیں کسی دعوت میں دیکھا ہے - کب اور کہاں دیکھا ہے وہ اس پر غور ہی کر رہا تھا کہ لڑکی بولی: "نلین! کیا تم بھول گئے! ارے پچھلے سال ہی تو ہم دہلی میں ملے تھے!"

وہ پچھلے سال دہلی ضرور گیا تھا - اس سے ایک سال پہلے بھی دہلی میں تھا - اور اس سے پہلے کئی سال وہاں رہ چکا تھا - وہاں بہت سی لڑکیوں سے اُس کی جان پہچان تھی جو سب کی سب نوجوان اور خوبصورت تھیں، اس لئے اُسے یاد نہیں آ رہا تھا کہ اس لڑکی کا نام کیا ہے؟ لیکا یک اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور اُس نے رُک رُک کر کہا - "پرتیما! اور لڑکی نے پورے جوش سے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا -

"پیاری پرتیما!" —— وہ جوش سے چلایا - اور اُس کے بازوؤں نے پرتیما کو پوری گرفت سے اپنے حلقے میں لے لیا، مگر پرتیما اس پُرجوش معانقے اور "نلین" کے جلتے ہوئے ہونٹوں کی گرمی سے کچھ بدحواس سی ہو گئی اور اپنی پریشانی چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی: "نلین، عجیب بات ہے کہ تم مجھے پہچان ہی نہ سکے!"

"نہیں پیاری، یہ بات نہیں دراصل میرے وہم و خیال میں بھی نہ تھا - کہ اس طرح اچانک تم سے ملاقات ہو جائے گی —— میں اپنے آپ کو اتنا خوش قسمت نہ سمجھتا تھا!"

یہ کہہ کر وہ ایک طرف ہٹ گیا تاکہ پرتیما کمرے کے اندر آ جائے - مگر وہ نہ جانے کس سوچ میں تھی کہ لمحہ بھر تک دروازے ہی میں کھڑی رہی - پھر اُس کے حسین ہونٹوں پر ایک پیاری سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور اپنے سر کو ہلکی سی جنبش دے کر وہ اندر چلی آئی -

کمرے کی ہر شے کو وہ بڑی دلچسپی سے دیکھ رہی تھی اور جب اس نے میز کی کھلی درازیں دیکھیں تو اُس کی آنکھوں میں نہ جانے کیوں عجیب چمک سی پیدا ہو گئی!

"تم نے اپنا کمرہ بہت اچھے ڈھنگ سے سجا رکھا ہے نلین، یقیناً تمہیں اس میں بہت آرام ملتا ہو گا!" اُس نے مسکرا کر عجیب بھولے پن سے سوال کیا!

"میں اس کی آرائش کا واقعی بہت خیال رکھتا ہوں اور اس لئے آرام ہونے میں بھی کوئی شک نہیں" اُس نے پرتیما کی تائید کرتے ہوئے کہا اور پھر دفعتاً رُک کر بولا "اپنا لبادہ مجھے دے دو، یہ بھیگ گیا ہے اور تمہیں سردی لگ جائے گی!"

پرتیما نے خاموشی سے لبادہ اُتار کر اُسے دیدیا اور وہ دوسرے کمرے میں اُسے کھونٹی پر ٹانگنے چلا گیا، جب وہ لوٹا تو اُس نے پرتیما کو عجیب اور پُراسرار نظروں سے اپنی طرف دیکھتے اور مسکراتے پایا۔

"سچ مچ آج تم پہلے سے بہت زیادہ حسین نظر آتی ہو۔" مسٹر بوس نے اس کی معنی خیز نظروں کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

"کیا میں؟" ——— وہ ناز سے اٹھلا کر بولی ——— میں آج بہت خوش ہوں نلین! بے حد خوش!!"

اُس کی دلفریب مسکراہٹ سے مسحور ہو کر "نلین" پُرجوش انداز سے اُس کی طرف بڑھا اور قریب تھا اُسے اپنے بازوؤں میں لے کر وہ جلدی سے ایک طرف ہو گئی اور گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی "میری طبیعت شاید ٹھیک نہیں ہے۔ سر چکرا رہا ہے، دل زور زور سے دھڑک رہا ہے اور حلق بھی سوکھ رہا ہے۔ میں کچھ پینا چاہتی ہوں!"

"ضرور! مگر کیا پیو گی؟ کوئی ٹھنڈی چیز یا گرم؟" "نلین" نے پوچھا۔

"تھوڑی سی چائے! مگر کیا تمہارے ہاں کوئی نوکر نہیں ہے؟" پرتیما نے سوال کیا۔

"نوکر کی ضرورت نہیں، میرے پاس بجلی کا چولہا موجود ہے۔ تم یہیں بیٹھو میں ابھی فوراً چائے بنا لاتا ہوں" اُس نے جواب دیا۔

"مگر میں تمہیں تکلیف دینا نہیں چاہتی ——— رہنے دو" پرتیما نے ہمدردانہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔

"تکلیف؟ تکلیف کیسی؟ ارے یہ تو میری انتہائی خوش قسمتی ہے۔ ایسے موقعے روز روز تھوڑے ہی ملتے ہیں!" یہ کہہ کر وہ مسکرایا اور پرتیما کے روکتے کے باوجود باورچی خانے میں چائے بنانے چلا گیا۔

——— باورچی خانے سے اُس نے دو ایک بار پرتیما کو مخاطب بھی کیا جس کا جواب پرتیما نے ہر بار اپنے مخصوص پیارے انداز میں دیا۔ اور جب اُس نے محسوس کیا کہ وہ چائے بنانے میں لگا ہوا ہے اور اُسے آنے میں دیر ہو گی تو شاید وقت کاٹنے کے لئے وہ تصویریں، کتابیں میز کی درازیں اور کمرے کی دوسری چیزیں دیکھنے لگی ——— چائے تیار کرنے کے بعد جب نلین کمرے میں داخل ہوا تو پرتیما کھڑکی کے سامنے کھڑی اپنے بال سنوار رہی تھی!

"یہاں سے باہر کا نظارہ بہت ہی بھلا معلوم ہوتا ہے!" وہ پیچھے مڑتے ہوئے کہنے لگی "ارے تم چپ کیوں ہو؟ باتیں کرو نا!"

"ہاں خاموشی تو مجھے بھی نہیں بھاتی۔ مگر سوچ رہا ہوں کس موضوع پہ بات چیت کی جائے۔" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا اور جب پرتیما بڑے کوچ پر نیم دراز ہو گئی تو اُس نے چائے کا سامان چھوٹی میز پر چُن کر اس کے سامنے رکھ دیا ——— پرتیما ایک دلفریب ادا کے ساتھ آگے کی طرف جھکی اور چائے انڈیلنے لگی۔ اس کے بعد اس نے آدھی پیالی چپ چاپ اس طرح پی لی۔ جیسے کسی گہری سوچ میں ہو۔ پھر کہنے لگی:۔

"کیا واقعی میں تمہیں اچھی لگتی ہوں نلین؟"

"بے شک! تم بہت اچھی ہو اور میں تمہیں سچے دل سے چاہتا ہوں!" ——— مسٹر بوس نے جوش سے جواب دیا۔

پرتیما نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر اُسے اپنی طرف کھینچا، اُس کے گھٹنے کوچ سے جا لگے، دونوں کے دھڑکتے ہوئے دل مل گئے اور ہونٹ ملنے ہی والے تھے کہ دروازہ کھلا اور دو اجنبی اندر گھس آئے۔ انہیں دیکھتے ہی "نلین" نے پرتیما کو چھوڑ دیا۔ اور دو قدم پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔

پرتیما نے سامنے والے غضبناک آدمی کو دیکھتے ہی ایک خوفناک چیخ ماری، اور بیہوش ہو کر گر پڑی!

اجنبی اپنی مضبوط چھڑی نلین پر تان کر زور سے چلایا:۔

"ذلیل کُتے، یہ کیا حرکت ہے؟"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا، نہ یہ جانتا ہوں کہ میں نے کون سا قصور کیا ہے!" نلین نے عجیب بھولے پن سے جواب دیا۔

"بدمعاش!" ——— اجنبی نفرت بھرے لہجے میں چلایا ——— "میں یہ پوچھ رہا ہوں کہ میری بیوی یہاں کیا کر رہی ہے؟ ——— ——— اکیلی، تمہارے ساتھ، تمہارے کمرے میں؟"

"یہ مجھے بتا رہی تھیں کہ جب سے ان کی شادی آپ کے ساتھ ہوئی ہے یہ بہت خوش اور سکھی ہیں!" نلین نے بدستور معصومانہ انداز میں جواب دیا۔ مگر غضبناک شوہر کی حالت میں کوئی فرق نہ آیا۔ وہ بالکل اُس آدمی کی طرح نظر آتا تھا جو اپنے ایک بڑے نقصان کا خیال کر کے پیچ و تاب کھا رہا ہو!

دفعتہً وہ جوشِ غضب سے دیوانہ سا ہو گیا اور قریب تھا اپنی چھڑی سے نلین کو مارنا شروع کر دے۔ کہ اس کے ساتھی نے اُس کی چھڑی پکڑ لی اور کہا: "اس کی ضرورت نہیں ہے مسٹر چوہدری، اسے قانون کے حوالے کر دینا ہی اس کا صحیح علاج ہے!"

"آپ کس حیثیت سے دخل دے رہے ہیں۔ جناب! جاسوس ہیں یا وکیل؟" نلین نے دفعتہً عجیب و غریب سوال کیا۔

"بے وقوف چھوکرے! تیرے حق میں بہتر یہی ہے کہ چپ رہے!" اجنبی نے ڈانٹ کر کہا۔ "میں قانون دان ہوں اور اس واردات کا شاہدِ عینی! اب تم قانونی گرفت سے بچ نہیں سکتے!"

"اسقدر باتیں نہ کیجئے، وکیل صاحب! آپ کی زبان تھک جائیگی۔

اور فیس دینے والا تو یہاں کوئی ہے نہیں ....!" نلین نے اس کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو، حامد!" غضنفر کے شوہر نے اپنے ساتھی کے خیال کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ "مگر قانون کے حوالے کرنے کی ضرورت نہیں، میں خود ہی اسے ٹھیک کئے دیتا ہوں!"

"آخر آپ چاہتے کیا ہیں؟ کیا میں جان سکتا ہوں؟" نلین نے اپنی مخصوص سنجیدگی سے کام لیتے ہوئے سوال کیا۔

مگر اُس کے سوال کا جواب نہ دیتے ہوئے پرتیما کا شوہر، اُس کے اور پرتیما کے بیچ میں کھڑا ہو گیا، پھر اپنے ساتھی سے مخاطب ہو کر بولا۔ "حامد، تم اس بے وقوف کے کمرے کی تلاشی لو، اور میں اس کی نگرانی کرتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ خط یہیں موجود ہے۔"

"بے کار پریشان ہوتے ہو!" نلین اُن کا مطلب سمجھ کر آرام کرسی پر لیٹتے ہوئے بولا۔ "تمہیں کامیابی کیسے ہو سکتی ہے۔ جبکہ پرتیما جیسی چالاک لڑکی کامیاب نہیں ہو سکی؟"

"پرتیما......!!" مسٹر چوہدری نے حیرت سے دُہرایا۔ "ہاں پرتیما —— تمہاری بیوی یا نہ جانے کون؟" نلین نے مُسکرا کر جواب دیا۔ "میں نے اسے ہر طرح موقعہ دیا تاکہ یہ اچھی طرح اپنا اطمینان کر لے اور جب میں نے اسے کھڑکی کے سامنے کھڑے ہو کر "بال سنوارتے" دیکھا تو مجھے یقین ہو گیا کہ وہ اپنے ساتھیوں کو مدد کے لئے بلا رہی ہے اور وہ ضرور آئیں گے!"

"افسوس شیلا، تم بالکل ہی نکمی نکلیں!" مسٹر چوہدری نے لڑکی کو قہر آلود نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔

"اچھا، تو تم پرتیما نہیں ہو!!" —— مسٹر لوبس نے طنز بھرے لہجے میں سوال کیا —— "اور نہ میں نلین ہوں!!"

"کیا؟؟؟" تینوں حیرت زدہ ہو کر بیک آواز چلائے "ہاں! تم لوگوں نے مجھے نلین سمجھا تھا، حالانکہ میں نلین نہیں ہوں!" مسٹر لوبس نے یہ کہہ کر قہقہہ لگایا۔

"ہمیں بے وقوف بنانے کی کوشش نہ کرو۔ ہم خوب جانتے ہیں، تم کون ہو!" مسٹر چوہدری نے غصے سے کہا۔

"ضرور جانتے ہو، مگر صرف اسی قدر کہ میں این۔ کے لوبس ہوں تمہیں یہ نہیں معلوم کہ میرا نام نرمل کمار لوبس ہے۔"

"نلین کمار لوبس" "نہیں!!!" مسٹر لوبس نے ہنس کر کہا۔

تینوں نے حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ مگر خاموش رہے۔ آخر حامد بولا۔ "ممکن ہے نام کے معاملے میں غلطی ہو گئی ہو مگر ہمیں اچھی طرح معلوم ہے تم کیا کام کرتے ہو!"

"تم نلین ہو یا نرمل۔ اس سے بحث نہیں، لیکن کیا جانتے ہو، ہم کیا چاہتے ہیں؟" مسٹر چوہدری نے سوال کیا۔

"خوب جانتا ہوں" نرمل نے مسکرا کر جواب دیا۔ "تم اس لفافے کی تلاش میں ہو جس میں ایک اہم فوجی دستاویز بند ہے اور جو تمہارا خیال ہے کہ میں قلعہ سے لایا ہوں!"

"مجھے خوشی ہے کہ تم ہمارا مطلب آسانی سے سمجھ گئے!" مسٹر چوہدری نے دفعتہً نرم ہو کر کہا۔

"مگر تم سب پہلے درجے کے بے وقوف ہو جو یہ سمجھے بیٹھے ہو کہ میں ایسی اہم دستاویز ایسے غیر محفوظ مکان میں لایا ہوں اور جہاں یہ وہ ہر وقت ضائع ہو سکتی ہے!" نرمل نے مفکرانہ انداز میں کہا۔

"چھوکرے! تو ہمیں دھوکا نہیں دے سکتا، ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کہ تو وہ خط اپنے ساتھ لایا ہے اور اسے لیکر کل ہی پچھلے دہلی جا رہا ہے۔ —— اور اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس وقت، اسی مکان میں کسی جگہ موجود ہے۔" مسٹر چوہدری نے پاگل کتے کی طرح غراتے ہوئے کہا۔

"کیا تم میں سے کسی نے محکمۂ ڈاک کا نام کبھی سنا ہے؟" مسٹر لوبس نے اچانک سوال کیا۔

"محکمۂ ڈاک!!!" تینوں نے حیرت سے دُہرایا۔

"جی ہاں، محکمۂ ڈاک —— اور وہ خط اس وقت اسی کی تحویل میں ہے، خط پر ایک پرائیویٹ پوسٹ بکس کا پتہ لکھا ہوا ہے۔ جو دہلی کے جنرل پوسٹ آفس میں نصب ہے اور جب میں وہاں پہنچوں گا تو وہ خط مجھے مل جائے گا!" مسٹر لوبس نے پوری سنجیدگی سے بات ختم کر دی۔

دونوں آدمی حیران اور خاموش کھڑے تھے اور اُن کی آنکھوں سے مایوسی جھلک رہی تھی مگر لڑکی چلائی: "یہ غلط ہے، جھوٹ ہے۔ خط پوسٹ نہیں ہوا۔ میں نے قلعے سے نکلنے کے بعد سے اب تک اس کی نگرانی کی ہے اور جب یہ جنرل کولین سے رخصت ہو کر قلعے سے نکلا تو خط یقیناً اسی کے پاس تھا اور راستے میں یہ کہیں نہیں رُکا!"

"تمہارا خیال یقیناً صحیح ہے شیلا!" مسٹر لوبس نے نیم تائیدی لہجے میں کہا۔ "واقعی قلعے سے نکلنے کے بعد میں نے خط پوسٹ نہیں کیا، مگر قلعے کے اندر بھی لیٹر بکس موجود ہے اور وہیں میں نے وہ خط ڈاک کے حوالے کر دیا تھا کیونکہ ایک ایسی فوجی اور سیاسی خفیہ دستاویز جس کی اہمیت تم ... ہے۔ قلعے سے باہر لانا اور اس کی حفاظت کی ذمہ داری اپنے سر لینا سراسر حماقت ہوتی! مجھے معلوم تھا کہ تم جیسے لوگ ضرور میری تاک میں ہوں گے لیکن میرے وہم میں بھی یہ بات نہ تھی کہ معاملات اتنے عجیب، دلچسپ اور

روماتی شغل اختیار کریں گے !"

مسٹر لوبس کی اس طنزیہ تقریر مگر سنجیدہ اندازِ بیان نے تینوں کو پریشان کر دیا تھا مگر فوراً ہی وہ سنبھلے اور بیک آواز چلائے: "اس کی باتوں پر یقین کرنا حماقت ہے !"

"تب جو جی میں آئے کرو !" مسٹر لوبس نے بے پروائی سے کہا۔ "ڈرنے کی ضرورت نہیں، ٹیلیفون کے تار خود تمہیں لوگ کاٹ چکے ہو۔"

تینوں دیکھ بھال میں مصروف ہو گئے اور سارے کمروں کا کونہ کونہ چھان ڈالا۔ حتیٰ کہ بستر کے گدّوں اور چادروں تک کو اُلٹ پلٹ کر دیکھ لیا۔

"اگر یہ عورت دوسرے کمرے میں چلی جائے تو تم میرے کپڑے اتروا کر بھی دیکھ سکتے ہو !" مسٹر لوبس نے سنجیدگی اور طنز کے ملے جلے لہجے میں کہا ——— اور عجیب و غریب اجنبیوں نے یہی کیا بھی !

"معلوم ہوتا ہے وہ خط یہاں نہیں لایا گیا" حامد نے سرگوشی کے طور پر مسٹر چوہدری سے کہا ——" کیونکہ وہ یہاں کسی جگہ نہیں ہے !"

"سچی بات کڑوی ضرور ہوتی ہے۔ مگر آخر کار اس پر یقین کرنا ہی پڑتا ہے۔" مسٹر لوبس نے جلتی آگ پر تیل ڈالا !

دونوں نے قہر آلود نگاہوں سے اُسے گھورا اور مسٹر چوہدری نے مری ہوئی آواز میں کہا۔ "چلو چلیں، اب کامیابی کی کوئی امید بھی باقی نہیں رہی !"

تینوں لڑکھڑاتے قدموں سے زینے کی طرف بڑھے، شیلا پیچھے تھی۔ مسٹر لوبس نے اُسے پکارا۔ "تم اپنا لبادہ بھولی جا رہی ہو، شیلا ——— پیاری! ٹھہرو میں لا دیتا ہوں" اس نے لفظ "پیاری" پر زور دے کر کہا اور جھپٹتا ہوا لبادہ لینے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ اس نے کھونٹی پر سے لبادہ اُتار کر اس کی تہہ کھولی اور اس کے اندر سے ایک چھوٹا سا لفافہ نکال کر احتیاط سے اپنی جیب میں رکھا اور باہر نکل آیا ——— بغیر ایک لفظ منہ سے نکالے، شیلا نے لبادہ اس کے ہاتھ سے لے لیا اور جلدی جلدی سیڑھیاں اُترنے لگی۔

جب وہ لوگ سیڑھیوں سے اُتر گئے تو وہ سڑک کی طرف کھلی ہوئی کھڑکی پر جا کھڑا ہوا اور اُس نے دیکھا کہ موٹر تینوں کو لئے طوفان کی سی تیزی سے اُڑی جا رہی ہے !

کھڑکی سے ہٹ کر اس نے لفافہ اپنی جیب سے نکالا اور مسکراتی ہوئی آنکھوں سے اُسے دیکھ کر بولا:۔

"جب ایسی کوئی جگہ نظر نہ آئے جہاں کوئی چیز چھپنے سے محفوظ رہ سکے تو ایک عقلمند آدمی کا کام یہ ہے کہ وہ خود چور کی جیب سے یہ کام لے !"

اور وہ اپنی کامیاب پیش بندی پر مسکرانے لگا۔ (ماخوذ)

غزل

یہ کس کا انتظار کئے جا رہا ہوں میں
عمرِ رواں کو طول دیئے جا رہا ہوں میں

ہر چند فصلِ گل میں دماغِ رفو نہیں
دامانِ چاک چاک سیئے جا رہا ہوں میں

اُمید و اشتیاق کے پہلو ہزار ہیں
کیا کیا فریب دل کو دیئے جا رہا ہوں میں

جینا اسی کا نام ہے جینا ہی اور کیا
لاکھوں مصیبتوں میں جیئے جا رہا ہوں میں

دل سے بھی لے رہا ہوں میں کیفِ خیالِ دوست
آنکھوں سے بھی شراب پیئے جا رہا ہوں میں

رکھوں گا ذوق و شوق کی دنیا کو ساتھ ساتھ
گلشن کو بھی قفس میں لئے جا رہا ہوں میں

مرنے کی آرزو ہے مجھے جانِ صد حیات
مرنے کی آرزو پہ جیئے جا رہا ہوں میں

کوثر نصیبِ عشق میں ہونا تھا اور کیا
اک داغ ہے کہ دل پہ لئے جا رہا ہوں میں

مہندر سنگھ کوثر

رفیق علیخاں صابر

پھکنا

"پھکنا!.... پھکنا!!"

چند نسوانی قہقہے فضا میں گونجے - اور ختم ہو گئے، ٹھیک اسی طرح جیسے کسی بچے کا اچھالا ہوا پھکنا فوراً ہی زمین پر آ رہے!!

جمیل اسی دیوار (قہقہے کے برابر ہی مرزا عظیم بیگ مرحوم کا ناول "چمکی" لئے بیٹھے تھے - لڑکیوں کی باتوں کی ہلکی آوازیں آ رہی تھیں " ذرا دیکھو تو سہی!.... "نا نا بہنو اماں سے پٹواؤں گی"....! "کیوں عورتوں کا نام بدنام کرتی ہے - ڈرپوک!!"... اوئی تمہیں مرد بننے کا شوق (جو چرایا ہے، بنو مگر چھچھوندر سے تو ڈرتی ہو"... اوئی کالی شلوار پر شبغین کا دوپٹہ، توبہ کوئی جوڑ بھی ہو!" —— کتاب تو کھلی ہوئی تھی مگر جمیل کے کان کہیں اور کام کر رہے تھے — وہ اس وقت اپنے "کان سینک" رہے تھے، چور کا دل آدھا ہوتا ہے - چچی کے ٹوک دینے کا بھی خوف تھا - اسی لئے ذرا سی کھڑ بڑ پر چونک پڑتے! —— ایک قہقہہ بلند ہوا جس کا تسلسل کئی سیکنڈ تک رہا!!

اُن کو افسانے لکھنے کا خبط تھا مگر اس وقت شاعری کی طبع آزمائی ہو رہی تھی - لڑکی کی ہنسی، اُف! جیسے کوئی سنسان رات میں ہلکے سروں میں بنسری بجا تا ہو، جیسے ستار پر انگلیوں کے آہستہ پڑنے کی آواز، یا کسی میم کے پیر میں کانٹا چبھ جانے کے بعد والی ہلکی سی چیخ! —— ان کے افسانوں میں ان کے کردار کی جھلک ضرور ہوتی تھی - وہ اپنی شخصیت کو بہت ہی حسین دکھاتے.... شاید سمجھتے ہوں کہ افسانہ ہی پڑھ کر کوئی دوشیزہ دل پھینک بیٹھے لیکن شائقین افسانہ سمجھتے ہوں گے کہ مرزا صاحب مرحوم نے خود کو ہمیشہ بدصورت لکھا - مگر تھے بہت حسین! اسی بنا پر جمیل....؟ توبہ! ——

جمیل فی الواقعی حسین تھے - سولہ ہی نہیں بلکہ سوا سولہ آنے، مگر نئے ادب کی طرح نئے حُسن کے زمرے میں آ تے تھے - عورتوں کی قدامت پسندی اور اُن کی بدقسمتی کہ صنف نازک ابھی حد جدید کی اس نئی تحریک کی معترف نہیں ہوئی ہے —— ہاں! تو وہ تھے ڈھائی من کے ہلکے پھلکے نوجوان، پھر چھوٹی چھوٹی آنکھیں جیسے بورے میں سیپ کے بٹن، اُن پر کالا چشمہ، چار آنکھیں تھیں یا چار چاند لگے تھے - لکھنؤ کے رہنے والے مگر انگلیاں... جونپور کی موٹی گنڈیریوں کی طرح، ناک کے نتھنے ذرا پھیلے ہوئے، ہونٹ اور دانت پان آلود —— سراپا حُسن!... کسی شاعر کا رنگیں خواب!

ننھے ظہیر نے سُرخ پھکنا لاکر اُن کی گود میں رکھ دیا، اور مونٹوں میں مسکراتا چلا گیا!.... بہت دیر تک وہ یہ ہی نہ سمجھ پائے کہ آخر اس پھکنے پر ہنسنے کی کون سی بات تھی - مگر چونکہ پھکنا بھیج کر شرکت ہنسی کی دعوت دی گئی تھی - اس لئے بے معنی طور پر وہ بھی متبسم فرمانے لگے!

چک کے قریب حرکت ہوئی - چہرہ کی ایک ہلکی جھلک!.... ہرے دوپٹے اور نیلی شلوار کی نمایاں جھلک، چوڑیوں کی جھنکار!.... یہ سب کچھ لمحہ بھر میں ہو گیا، سبھی تو کر ندگئی مگر جمیل صاحب کے دل پر اندھیرا چھا گیا - —— دل ہی دل میں عظیم بیگ مرحوم کی کتاب کے پلاٹ کو سراہنے لگے - کہ وہ کس حد تک، واقع ہوئے تھے!.... یہاں یہ افسانہ حقیقت بن گیا؟ ——

پھر پھکنا پھکنا کی آواز آئی، مگر اب اُن کے خیالی قلعے میں پھکنے نے بم کا کام کیا - انہوں نے چونک کر اپنی سُرخ قمیص اور سبک اندامی کو دیکھا - کچھ مسکرانے لگے —— مگر خفت آمیز طور پر!

گھڑ گھڑ گھڑ! —— ریل انہیں کالج کو لئے جا رہی تھی "پرستان" میں دس دن رہنے کے بعد وہ دو مہینے کے لئے "قبرستان" میں لے جائے جا رہے تھے، ان کے احساسات کو تو ریل کے پہیے کچل رہے تھے مگر تمناؤں اور آرزوؤں کا مدفن ہوسٹل کی چہار دیواری میں بننے والا تھا! —— کیا نام رکھا اُس لڑکی نے میرا، پھکنا.... بلا کی شوخ!.... بڑی شریر ہوگی - کالج میں کتنی تو لڑکوں نے میرے نام رکھے ہیں - مگر وہ اتنے موزوں نہیں - اُف! اس نام نے تو میرا سب غرور خاک میں ملا دیا —— آپا کہتی تھیں کہ وہ زیادہ خوبصورت نہیں!.... مگر شوخی و شرارت اسی کا حصہ ہے! —— واہ! اونہہ! آجکل کے نوجوانوں میں تو خوبصورتی کا معیار سفید چمڑا ہی رہ گیا ہے! ——

چھٹیوں کا بہانہ پھر جمیل چچی کے گھر آ دھمکے —— صبح کا وقت تھا، سر سے چادر اوڑھے گھوڑے بیچ کر سو رہے تھے، اگر محاورہ ان پر چپتا ہے تو ان کے خراٹے اس بات کا پتہ دیتے تھے کہ کوئی "عربی الاصل" گھوڑا ہوگا.... ایک لوٹا ٹھنڈے پانی کا پڑا تھا کہ گدھے خرید کر بیٹھے - دو چار پھریریاں سی لیں - کوئی دھم دھم کرتا کمرے میں غائب ہو گیا... صورت حال سمجھ گئے کہ وہی پھکنے والی ہوگی - "میں نے ایک گھڑا پانی جونڈا لا ہو

تو بات ہی کیا ہے۔ گھڑے کے پاس بار بار جاکر زور سے چلاتے۔ لیکن جب کمرے سے کسی کے ہنسنے کی آواز آتی تو اور زیادہ چراغ پا ہوتے۔ آپا نے آکر کہا ان کی ایک سہیلی نے دھوکے سے پانی ڈال دیا۔ وہ معافی مانگ رہی ہے "واہ آپا دُبلی پتلی اور مجھ میں کوئی فرق ہی نہیں، کمبخت! ... یہ تو صریحاً شرارت ہے سمجھی! قیامت تک تو معاف نہیں کروں گا"

"ساون من بھاون، لو ساون آیا رے" کوئی میٹھے میٹھے سُروں میں گنگنا رہی تھی، کبھی رُک جاتی کبھی پھر گانے لگتی۔ جیسے موسم کی خرابی کی وجہ سے ریڈیو کی آواز رُک رُک کر آتی ہے، گانے کی خوبی یہی ہے۔ کہ سماں بندھ جائے، اور دل میں اُترتا چلا جائے، ایسا گیت دوپہر کے وقت بنانا اور بے وقت کی راگنی ضرور تھی مگر جمیل میاں کا حسنِ اعتقاد کہ وہ ایسی چلچلاتی دھوپ میں بھی کالے کالے بادل، ہلکی ہلکی پھوار تصور کر رہے تھے۔ پھر ساتھ ساتھ اُنکے جذبات بھی جھولا جھول رہے تھے —— "سکھی پیا ملن کی آس"، اب سب لڑکیاں اپنی بے ہنگم آوازیں ملانے لگیں۔ گانے میں عجب درد تھا۔ سب پیا والے مرض میں مبتلا تھیں رفتہ رفتہ گانے نے پبلک کے مرثیے کی صورت اختیار کر لی۔ ایک صاحبہ منہ لٹکائے بیٹھی تھیں۔ ان کے میاں جنگ پر گئے ہوئے تھے، ایک دوسری بھی کچھ اُداس اُداس سی تھیں۔ کیونکہ ان کے شوہر مس زہرہ جان کو بمبئی کی سیر کرانے گئے تھے۔ غرض یہ دونوں آس سے بھی ہاتھ دھو چکی تھیں —— یکایک گانا رک گیا، ایک لڑکی نے بطور احتجاج کہا۔ "ہم سب چہکنے کو بھول گئیں"... پھر کیا تھا۔ کہاں بھونک لگے اُڑ جائے۔ کھٹکی بیھٹی شور مچائے!" والی قوالی شروع ہو گئی —— پہلے تو جمیل لڑکیوں میں Popular ہونے کی وجہ سے خوش ہوئے مگر پھر اس خیال سے کہ صنفِ نازک ان کا مضحکہ اڑا رہی ہے۔ ان کے احساس مردانگی کو ٹھیس لگی اور وہ انتقاماً لڑکیوں کے کمرے میں گھس گئے۔ انگریزی مثل کے مطابق Like A Bull in A China Shap

اُوئی! اُوئی!! اوئی تین چار آوازیں بلند ہوئیں ——

اور کمرہ خالی!!

اس وقت جمیل کی قوت حافظہ اپنے اوج کمال پر تھی۔ بھولی بسری باتیں یاد آ رہی تھیں —— "امیر العاشقین" اُن کے بہت گہرے دوستوں میں سے تھے۔ پہلے انہوں نے ان کی زرّین صلاحوں کی قدر نہ کی خاص کر جسم گھٹانے کے بعد سب سے پہلا انہوں نے عشق کرنے کو کہا تھا —— "امیر العاشقین" اس عشق کے معاملے میں جہاں دیدہ اور بڑے گرگ باراں دیدہ تھے۔ اچھے خاصے ہڈیوں کے ڈھانچے کم سے کم انہوں نے دو تین عشق تو کئے ہوں گے۔ پھر وہ یہ بھی کہتے تھے کہ "کبھی ایک عشق کیا اور رہوں!" —— جمیل بھی اسی پس و پیش میں تھے کہ وہ کسی "اس" لڑکی سے محبت کیوں نہ شروع کر دیں؟ ڈاک خانے میں محبت کی مہم افتتاح ہوئی، ایک خط امیر العاشقین کو؟ ... "ایک ماہ پارا سے شدید محبت ہو گئی ہے۔ وہ بھی مجھ پہ جان چھڑکتی ہے۔ بلکہ یوں کہو کہ میرا دم بھرتی ہے۔ تمہاری دعاؤں کی ضرورت ہے؟" —— وہ میرا پڑھی لکھی ہے... آپا لوگ کہتے ہیں بلیک آوٹ کی وجہ سے (؟...) کی رونق روبہ انحطاط ہے۔ مگر مجھے تو یہ شہر اور جگمگ جگمگ کرتا نظر آتا ہے، یہ سب کیوں ہے؟ ملوں گا تو بتاؤں گا" —— تیسرا وارڈن کے نام! ... کئی دن سے جاڑا دیکر بخار آ رہا ہے۔ افاقہ کی کوئی صورت نظر نہیں آتی، اچھا بھی ہو گیا تو نقاہت باقی رہے گی۔ دس دن مہلت اور درکار ہے!" —— آخری والد قبلہ کو! ... "چچی مصر ہیں کہ گرمیوں کی چھٹیوں میں یہیں آکر رہوں۔ پوری چھٹیاں گزارنے کا وعدہ تو نہیں کیا۔ مگر دس پندرہ دن یہاں گزار کر گھر آؤں گا!" —— غرض عشق کا ایندھن تیار کیا گیا اور دیا سلائی بھی لگا دی گئی، اور غالب کا شعر گنگناتے ہوئے واپس ہوئے ؎

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

چچی کو یہی گلہ تھا کہ جمیل کے سر میں سینچر سوار رہتا ہے نہ ٹھیک سے چائے پیتا ہے اور نہ کھانا دل سے کھاتا ہے، محبت کے لئے سینچر کا نام لیا جائے۔ وہ چچی کی اس بدشگونی سے بڑے دل برداشتہ تھے —— آج جمعہ کا دن تھا۔ دن اچھا تھا، خط لکھنے کی ٹھانی، کئی مضمون نظروں میں نہیں جچے۔ اسی لئے انہیں ردی کی ٹوکری کے نذر کیا گیا۔ پھر ایک "ماجرائے دل" پابند لفافہ کر کے، عطر چھڑک کر، بڑی تاکید سے ظہیر کو دیا اور ساتھ ہی ایک اکنی ہاتھ پر رکھ دی۔ ٹکٹ نہیں تھا تو کیا ٹکٹ کے دام تو انہوں نے اس ننھے سے قاصد کو دے دئے.... خط! ... "تم نے شاید سکندر فلم میں بڈھے ارسطو کے الفاظ سنے ہوں گے ... لڑکی تو صورت دیکھتی ہے دل نہیں دیکھتی۔ تم نے کبھی میرا جسم دیکھا دل نہیں دیکھا، تم جو آج کل مجھ میں دلچسپی لے رہی ہو ضرور کسی لگاؤ کی بنا پر ہے!" ——

کھانے پر ظہیر نے خوشخبری سنائی کہ جواب لے آیا ہوں۔ یہ مژدہ سُن کر اُن کے دل کی کلی کھل گئی۔ لقمے بڑی سرعت سے منہ میں منتقل ہونے لگے، بڑے مگن تھے، فقرے بھی چست ہو رہے تھے، چچی خلاف توقع خوش پاکر پوچھ ہی بیٹھیں۔ میاں آج بڑے خوش ہو! وہ ہنس کر بولے ابا جان نے میری ایک جگہ شادی طے کر دی، چچی کے منہ سے لگاتار دعائیں اور مبارکبادیں نکلنے لگیں لیکن آپا اُن کے اس من گھڑت جھوٹ پر مسکرا رہی تھیں —— انہوں نے تو ہاتھ دھو لئے۔ مگر ظہیر آہستہ آہستہ کھا تا رہا۔ وہ پریشان تھے۔ آپا بھی انکی بےچینی کو محسوس کر کے لطف لے رہی تھیں —— جس وقت ظہیر نے خط دیا انہوں نے اسے دل سے لگا لیا گو بچے کے سامنے ایسی حرکت کرنے پر ندامت ہوئی! ... خط ... "ہمارے آگے کسو نے جو تیرا نام لیا

دل ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا - مجھے یہی بتایا گیا تھا کہ آپ کا نام "پھکنہ" ہے حالانکہ خط سے پتہ چلا آپ جمیل ہیں - اسم بامسمیٰ ہیں - آپا کے منہ سے سنتی آئی ہوں - کہ آپ کسی لڑکی کو منہ نہیں لگاتے - لیکن آپ کا محبت بھرا خط پاکر خوشی سے پھولے نہیں سما رہی ہوں - اپنی قسمت پہ جتنا بھی ناز کروں کم ہے - لیلیٰ مجنوں کے نقشِ قدم پہ کیوں چلا جائے - گریبان کیوں پھاڑے جائیں، آہیں کیوں بھری جائیں - جتنی جلدی ہوسکے مجھے اپنی لونڈی بنا لیجئے!"

بات قاعدے کی کہتی ہے جتنی جلدی ہو یہ دو موتی ایک رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو جائیں! —— مگر لونڈی! . . . . واہ! تم تو میری دل کی ملکہ بنو گی - میری جیون نیا کی کھیون ہار، وغیرہ وغیرہ ——

بکھرے ہوئے بال، میلے کپڑے، کچھ کھوئے کھوئے سے رہنا لوازم محبت میں سے ہے، کوئی اپنی اصلی شریفانہ حالت میں محبت شروع کر دے، تو کم سے کم لوگوں کو یقین تو نہیں آئے گا - مگر چونکہ یقین دلانا بھی جزوِ محبت میں ہے - اس لئے قہرِ درویش برجانِ درویش ایسا کرنا ہی پڑتا ہے، پھر ایک پکے عاشق کو غالب، میر، داغ کے کم سے کم دو سو شعر تو ازبر ہوتے ہیں - جن کو وہ بار وقت سناتا رہے —— جمیل دو دن میں شاید ایک مرتبہ کنگھی کر لیتے ہوں - مگر اب تو ہر وقت ٹیڑھی مانگ نکلی رہتی قمیص بھی کھڑکدار پہنتے - غرض اقدام محبت سے اُن کی ہستی بدل گئی - جن اصلاحوں کے لئے ان کی ماں گھر سر پہ اٹھا لیتیں، والد زجر و توبیخ کرتے وہ خود بخود ان کی سرشت میں رونما ہو رہی تھیں - کاش ان کے باپ کو پتہ چل جاتا تو وہ ضرور لکھتے "بیٹا ایک محبت اور کرلو - پھر پورے انسان بن جاؤ گے!" —— ان کے طورِ رہائش اور طرزِ گفتگو میں بھی گونہ انقلاب ہو گیا تھا، وہ تھے فطرۃً چلبلے اور مسخرے مگر اب سنجیدہ اور متین بننے کی بے سود کوشش کرتے - مگر سب اُن کی سنجیدگی کو بھی مسخرہ پن ہی سمجھتے اور ہنستے، وہ دانت پیستے اور خون کا سا گھونٹ پی کر رہ جاتے!

جمیل اکثر قلم و کاغذ سے بزدآزما رہتے، کئی خط اور لکھے مگر جواب سے محروم! —— وہ فرہاد تھے اور ان کا قلم تیشہ، وہ دل میں خوش تھے - کہ عشق کے وسائل کتنی ترقی کر گئے ہیں - ہم سخن تیشے نے فرہاد کو شیریں سے کیا!" پہلے ہم سخن ہونے کے لئے دونوں کا ایک جا ہونا لازمی ہوتا ہوگا - مگر اب تو گھروں کے بیچ میں دیوار حائل ہونے کے باوجود غائبانہ طور پر وہ ہم سخن ہوگئے ہیں —— وہ عجب دماغی کشمکش میں تھے کہ آخر اس نے چپ کیوں سادھ لی، شاید رسوائی سے ڈرتی ہوگی - جبھی اس نے خط نہ لکھنے کے لئے ہفت اقلیم کا واسطہ دیا تھا . . . لیکن باپ کے خط نے جمیل کی محبت کا سارا نشہ ہرن کر دیا . . . خط! . . . "تمہاری ماں نے تمہارے خط کے مطابق پیغام کا ذکر کیا - تم میری مالی حالت سے تو واقف ہو، آج کل گیہوں سات سیر کے، چاول تین سیر کے ہیں، شکر بھی مہنگی ہے - کم سے کم میعادِ جنگ تک تو تم کو صبر کرنا ہی پڑے گا - میں نے محلے والوں کی دعوتیں کھائی ہیں - وہ بھی تو آس لگائے ہوں گے!" —— وہ کھسیانے ہوگئے - کہ رونے کی کسر تھی - محلہ والوں کو کوس رہے تھے، وہ کہہ رہے تھے - کہ دو بوری چنوں پہ بھی تو نکاح ہو سکتا ہے! ——

اسی اثنا میں انہیں دوسری جانکاہ خبر ملی کہ "وہ، چلی گئی، پھر ساتھ ساتھ یہ راز بھی طشت از بام ہوا کہ اس کی منگنی دو مہینہ ہوئے ہو چکی ہے، اُس کا شوہر لوکو جا کر اور خوبصورت ہے - جمیل لڑکی کو دل میں "آوارہ چھچھوری!" بہت کچھ بُرا بھلا کہہ رہے تھے، پھر ان کا دل یہ بھی چاہ رہا تھا کہ اُس کے شوہر کا ایسا گلا دبائیں کہ وہ جانبر نہ ہو سکے! —— ظہیر نے اُن کو ایک جھنکنا لا کر دیا کہ یہ نشانی دے گئی ہیں - انہوں نے یہ کہہ کر کسی کے جذبات سے کھیلنا اچھا نہیں ہوتا!" بڑی مایوسی سے پھکنے کی پھونک نکال دی - سُرسُرسُرسُرسُر

غزل

ساغر بدست ذکرِ خدا کر رہا ہوں میں
اور حق سے مغفرت کی دعا کر رہا ہوں میں

چل کر عدم سے محفلِ ہستی میں اے ندیم
آیا تھا کس خیال سے کیا کر رہا ہوں میں

موجوں سے کھیلتا ہوا بحرِ حیات میں
نظارۂ فنا و بقا کر رہا ہوں میں

جب زندگی کا درد ہے اک دردِ لا دوا
کیوں دردِ زندگی کی دوا کر رہا ہوں میں

کوئے صنم ہے اور ہے میری جبینِ شوق
اک اک قدم پہ سجدے ادا کر رہا ہوں میں

احساس تک نہیں انہیں احساس تک نہیں
جانِ عزیز جن پہ فدا کر رہا ہوں میں

جب جان ہی مری نہ کرے گی وفا طفیل
دنیا سے کیوں امیدِ وفا کر رہا ہوں میں

طفیل بینے دالوی

نقد و نظر

دیہاتی دنیا :-

مہتہ امرناتھ موہن بی - اے - ایل - ایل - بی منشی فاضل ہیڈ ورنیکلر کلرک کمشنر قسمت لاہور نے اردو لٹریچر میں دیہاتی دنیا کے ذریعہ ایک گرانقدر اضافہ کیا ہے - آپ نے دیہات اور ان کے رہنے والوں کی زندگی کو ایسے دلفریب شاعرانہ انداز میں پیش کیا ہے - کہ دیہات کی خشک اور سادہ دنیا میں ایک قسم کی دلاویز رومانیت پیدا ہوگئی ہے - اس کتاب کی افادیت کسی تشریح کی محتاج نہیں - پنجاب میں دیہات کی اصلاح کا جو کام مسٹر ایف - ایل برین آئی سی - ایس نے سرانجام دیا ہے - اس کے لئے ہمارے قومی لیڈروں نے بھی خراج تحسین ادا کیا ہے - مہتہ امرناتھ موہن نے مسٹر برین کے افکار عالیہ کو منظوم کرنے میں اپنی شاعرانہ افتادِ طبع کا ایک درخشندہ ثبوت بہم پہنچایا ہے - اصلاح دیہات کا کوئی پہلو نہیں - جو آپ کی ژرف نگاہی سے بچا ہو - تعلیم نسواں سے لے کر گڑھوں کی کھاد اور روشندانوں سے لیکر موسمی بخار اور اشتمالِ اراضی سے لیکر حُقّے تک دیہی معاشرت کا کوئی شعبہ نہیں جس پر آپ نے طبع آزمائی نہ کی ہو - ان نظموں کی ادبی برتری اس حقیقت سے آشکارہ ہے - کہ سر عبدالقادر نے دیہاتی دنیا کا دیباچہ لکھنے کی زحمت گوارا کی - شمس العلماء علامہ تاجور فاضل مصنف کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں - کہ یقیناً شاعر شیوا بیاں کا دماغ فولادی عناصر سے بنا ہے جس نے اس پتھریلی اور بنجر زمین کو اپنی حیرت انگیز طاقتِ فکر سے پانی بنا کر گلزار پُر بہار بنا دیا ہے - رنگین خیالات کو نظم کر دینا کسی شاعر کے لئے مشکل نہیں مگر خشک اور دیہات کے بے مزہ اقتصادی مسائل کو خوشگوار سماعت بنا دینا ہر ایک کا کام نہیں - اس لئے آج تک اردو شاعری کا دامن اس قسم کی مفید نظموں سے خالی نظر آتا ہے - یہ کرامت مہتہ امرناتھ صاحب کی حصہ بن چکی تھی - وقت نے اس امانت کو انجام کاران کے سپرد کر دیا -

لالہ تلوک چند محروم کے الفاظ میں یہ بڑا محنت طلب کام تھا - مہتہ امرناتھ کے کاوش پسند قلم نے سنگِ خارا میں وہ بیل بوٹے کندہ کر دئے ہیں کہ ان پر فصل بہار کی پھلواڑی کا گمان ہوتا ہے .... اس غیر شاعرانہ مضمون کو شاعرانہ انداز میں اس طرح ڈھال دیا گیا ہے - کہ تمام نظم میں آمد ہی آمد کی شان نظر آتی ہے - سلاست اور روانی میں یہ نظم آبدار اپنی نظیر آپ ہے -

اس طویل مجموعہ کا کوئی صفحہ اُلٹ لیجئے الفاظ و معانی کے لُوؤ ئے آبدار بصد حُسنِ لطافت غلطاں و درخشاں نظر آئیں گے - "دیہاتی دنیا" کے متعلق حفیظ جالندھری نے ایک دلاویز گیت لکھا ہے - جس کا یہ بند قابلِ ذکر ہے -

مہتہ جی نے پھول کھلائے — ایسی شور زمینوں میں
کیوں نہ مسرت دھوم مچائے — معنی کے گلچینوں میں

ہماری رائے میں "دیہاتی دنیا" ہمارے شہری اور دیہاتی تعلیمی نصاب کا مستقل جزو بننے کے لائق ہے - اس نظم سے شہریوں کو دیہات میں رہنے والوں کی حالت کا گہرا احساس ہوگا - دیہاتی تحریک کا حلقہ اثر وسیع تر ہو جائے گا اور طلبا اپنی زندگی کے بہترین دَور میں ملک کے حقیقی مسائل سے روشناس ہو جائیں گے - کتاب کے آخر میں مشکل الفاظ کی فرہنگ نے اس کی افادیت میں قیمتی اضافہ کر دیا ہے - دیہاتی دنیا ۷۶ صفحوں پر محیط ہے - اعلےٰ درجہ کی لکھائی چھپائی کے باوصف قیمت صرف ۱۲ آنہ ہے اور مصنف سے مل سکتی ہے -

جگ بیتی - حصّہ اوّل :-

محترمی پنڈت جواہر لال نہرو کی تصنیف ہے اور محمود علیخاں صاحب جامعی نے اردو میں ترجمہ فرمایا ہے - کتاب ۵۵۲ صفحات اور ۳۷ خطوط پر مشتمل ہے جس میں دیباچہ اور جنم دن کی مبارک باد اس کے علاوہ ہیں - تصنیف کا مقصد یورپ اور ایشیا کی تاریخ ماضی پر ایک اجمالی نظر ڈالنا ہے اور یہ ثابت کرنا ہے کہ دراصل مغرب جو آج امن و تہذیب کا دعویدار ہے قرون اولیٰ میں اس کی حیثیت کیا تھی ؟ اور پچھلا ایشیا مدنیت، معاشرت اور تہذیب کے اعتبار سے بلندی کے کس رتبے پر فائز تھا - پنڈت جی موصوف نے باتوں باتوں میں ہزاروں برس کی تاریخ بیان کر ڈالی ہے جو اپنے دلکش اسلوب کی وجہ سے مطلق بار نہیں گذرتی بلکہ ایک سانس میں پڑھ ڈالنے کو جی چاہتا ہے - پنڈت جی نے اس تاریخ کی تمام اقساط کو خطوط کی صورت میں تحریر فرمایا ہے - جس کی مخاطب اُن کی صاحبزادی مسز اندرا فیروز گاندھی ہیں - یہ طریقہ پڑھنے والوں کے لئے اور بھی دلچسپ ثابت ہوا کہ ایک

فلمی دُنیا

فلمی ریویو

بسنت

بمبئی ٹاکیز کی بسنت جس کا افتتاح ریجنٹ لاہور میں ہنگامہ خیز کامیابی سے ہوا۔ بعض اعتبار سے قابلِ ذکر بچہ ہے۔ اس سے پیشتر بمبئی ٹاکیز کے فلم اپنی افسانوی حیثیت ڈرامائی اپیل اور مختلف تفریحی پہلوؤں کے لحاظ سے تقریباً یکساں قسم کے رہے۔

پڑھا لکھا شریف الطبع نوجوان لڑکا حسین تربیت یافتہ لڑکی ان کی شادی کی راہ میں سماجی بندھن۔ ایک دائم المرض بزرگ جو قدامت پسند ہونے کے باوصف نوجوانوں کیلئے دل میں ہمدردی رکھتا ہے۔ کم ازکم ایک کمسن بچہ دو تین گیت جو جذبۂ قومیت سے لبریز ہوں۔ رقیب جو آخر کار اپنی نیک دلی کا ثبوت بہم پہنچا دے۔ پولیس اور ڈاکٹر اور ہاں ریل گاڑی بمبئی ٹاکیز کا کون سا سماجی فلم ہے جس میں ریل نہ ہو۔ مشہور امریکن ڈائرکٹر ارنسٹ لیوبٹش کا فتویٰ ہے کہ فلم میں ریلوے ٹرین کے آنے اور مسافروں کی ریل پیل اور ان کی مختلف حرکات سے دیکھنے والوں کیلئے ایک اچھی خاصی دلچسپی کا سامان مہیا ہو جاتا ہے۔ بمبئی ٹاکیز کے بیشتر سوشل فلموں میں متذکرہ بالا عناصر آپ کو مختلف صورتوں میں بار بار دکھائی دیں گے۔ نتیجہ یہ کہ فلموں میں تنوع پیدا نہیں ہو سکتا۔ بسنت نے یہ کسر پوری کر دی۔ اس کی روش عام فلموں سے جداگانہ ہے بعض مضمون کے اعتبار سے بسنت کو سکرین اور سٹیج کا ایک بہار آفرین مرقع کہہ سکتے ہیں۔ کیا سٹیج شریف عورتوں کے لئے موزوں نہیں۔ یہ مسئلہ کہانی کا مرکزی خیال ہے۔ جسے پردۂ سیمیں پر بمبئی ٹاکیز کی روایتی دلفریبیوں کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ بسنت کی دوسری نمایاں خصوصیت یہ ہے۔ کہ ہیروئن کے لئے بمبئی ٹاکیز والوں نے اپنی اس روایت کو پہلی مرتبہ نظرانداز کر دیا کہ وہ کسی فلم میں اہم رول ایسی عورت کو نہیں دیں گے جو پورے معنوں میں "سوسائٹی گرل" نہ ہو۔ ہمانسو رائے آنجہانی اس روایت پر سختی سے عامل رہے۔ دیوکا رانی، لیلا چٹنس، سیتا پربھا کے بعد اب...... ممتاز شانتی! ڈیلی ہیرلڈ کے فلمی نقاد کا بیان ہے۔ کہ ممتاز شانتی اب مسز دلی ہے لہٰذا رائے بہادر چونی لال نے بہت اچھا کیا کہ مسز موصوفہ کے آرٹ سے نہ صرف فائدہ اٹھایا۔ بلکہ اسے چار چاند لگا دیئے۔ اور حق یہ ہے کہ ممتاز شانتی بسنت میں ازسرتاپا نئے روپ میں جلوہ گر ہے۔ بمبئی ٹاکیز کا کمال یہ ہے کہ اس نے سوہنی کمہارن کی ہیروئن کو بسنت کی ہیروئن بنا دیا۔ ایسے موقعوں پر سینمائی محاورہ یہ ہے کہ ڈائرکٹر نے ہیرو یا ہیروئن کی شخصیت کو "STreamLine" کر دیا۔ کیا معنی کہ اس کے ناہموار اور کھردرے پہلوؤں کو تراشیدہ کر کے مربوط اور بہ حیثیت مجموعی خوبصورت بنا دیا۔ بسنت دیکھنے کے بعد ایک دوست نے کہا یوں معلوم ہوتا ہے کہ پنجاب کا "کرو ڈ آئیل" بمبئی ٹاکیز کی کیمیاوی لیبوریٹری میں جا کر پیٹرول بن گیا ہے۔ اس کے متناسب اعضا شعریت سے لبریز سکنات و حرکات مترنم آواز اور ناچ۔ غرضیکہ ممتاز شانتی کی شخصیت کا کوئی پہلو نہیں جسے بسنت میں بوجہِ احسن بروئے کار نہ لایا گیا ہو۔ وہ ممتاز ایسے ماہر رقص کے بالمقابل ناچتی ہے۔ کامل کامیابی کے ساتھ۔ بلکہ اپنی نغمہ ریزی سے اس پر چھا جاتی ہے۔ بسنت کے تین چار گیت ایسے ہیں کہ مدت تک یاد رہیں گے۔ خصوصیت سے بالم دھیرے بول کوئی سُن لیگا۔ میرے چھوٹے سے من میں چھوٹی سی دنیا رے۔ اور ادھر چھوری گنگا کے پار ملن۔

ڈرامہ میں ٹیلی فون اور ریڈیو انتہائی دلچسپی کا وسیلہ بن گئے ہیں۔ خاص کر ریڈیو ماں اور لڑکی کے ملاپ کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ ماں بیٹی کی ملاقات نہایت اثر ریز یا گریہ انگیز ہے اور معاف کیجئے "پنجابیت" سے قطعاً معرا۔ مطلب یہ کہ پنجابی فلم ہوتی تو اس سین میں ماں بال نوچتی سینہ کوبی کرتی اور اپنا اپنے بیٹی کا چہرہ لہولہان کرتی ہوئی غش کھا کر زمین پر گر جاتی اور پھر خدا جانے کیا ہوتا اور کیا نہ ہوتا۔ لیکن بسنت کے ڈائرکٹر نے اس سین کو غلو و غرابت سے قطعاً محفوظ رکھا ہے۔ اور یہ آرٹ کا انتہائے کمال ہے۔ پرمیلا نے غارت گر حسینہ کا پارٹ قابلِ تحسین خوبی سے ادا کیا ہے۔

کیا ناظرین تصویر کا دوسرا رُخ ملاحظہ فرمائیں گے۔ نرمل (الیاس) کا کردار فہم سے بالاتر ہے۔ وہ تھیٹریکل کمپنی کے مالک کا بھائی ہے اپنی

لڑکی کو سٹیج کی فضا سے دُور رکھنے کی خاطر کلکتہ چلا جاتا ہے۔ بیوی اس کے لئے مر چکی ہے۔ اس کے باوجود اس نے اپنی لڑکی کو ایک نامور ریڈیو سٹار بنا دیا۔ وہ ناچتی بھی ہے۔ اور گاتی بھی ہے اور آخر کار بغیر کسی معقول وجہ کے اسے سٹیج کی اسی فضا میں دھکیل دیا۔ جہاں وہ سانس لینا بھی پاپ سمجھتا تھا۔ خیر۔ ممتاز شانتی اور ممتاز کی خاطر زندہ دلان پنجاب اس ہارین تصویر کو بار بار دیکھیں گے۔ ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ۔ امید ہے کہ بسنت جس کی نمائش موسم برسات میں ہوتی ہے خزاں اور سرما کی منزلیں طے کرنے کے بعد آئندہ موسم بہار تک جاری رہے گی۔

سٹیشن ماسٹر

"ریل بابو کی کہانی" اس فلم کا عنوان ہو سکتا ہے۔ ریلوے ملازموں کی زندگی۔ عینک لگائے میز پہ جھکے ہوئے آنے جانے والی گاڑیوں کے اوقات آمد و رفت کی پابندی۔ افسروں کے رعب سے دبے ہوئے گویا کہ کی طرح ان کی نظریں زمین پہ گڑی رہتی ہیں اور حسن اتفاق سے انہیں پھر اٹھانے کا موقع ملے اور کوئی پیاری صورت نظر آ جائے تو ایک ہلکی سی مسکراہٹ ان کے چہرے پہ دوڑ جاتی ہے۔ ان کی زندگی کا ہر پہلو کتنا اور حقیر سا نظر آتا ہے۔ معمولی اغراض کے لئے افسران بالا کو خوش کرنے کے لئے بار بار کے قہقہے لگا رہے ہیں، چھوٹی چھوٹی سازشیں۔ پھر ایک ادنٰی سے ادنٰی ریلوے ملازم کی ذراسی غلطی کے باعث ہزاروں انسانوں کی زندگیاں فنا سے دوچار ہو سکتی ہیں۔ غرضیکہ یہ ریل بابو سٹیشن ماسٹر ہو یا کانٹے والا عظیم ذمہ داری و زندگی گراں باری سے ان کے کندھے جھکے رہتے ہیں۔ اور غیر رومانی فرائض کی یکسانیت سے ان کے دل و دماغ فرسودہ ہو جاتے ہیں۔ اس غیر دلچسپ پس منظر کے بالمقابل پرکاش پکچرز نے ایک زبردست ہیجان پرور اور کیف آور فلم پیش کیا ہے جو لاہور کے رٹز سینما میں کئی ہفتوں سے عوام کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے۔

پرمانند سٹیشن ماسٹر کا کردار جگدیش سیٹھی نے اپنی رعنائی شان سے نبھایا ہے۔ نیو تھیٹرز کا نظام منتشر ہونے پہ یہ فلمی ستارہ ایک سیارہ بن گیا۔ اور اب بڑی کمپنیوں میں شاید ہی کوئی باقی رہ گئی ہو جس نے اس کیرکٹر ایکٹر کی خدمات سے فائدہ نہ اٹھایا ہو۔ ایک سال میں چار چار فلموں میں مختلف اہم رول ادا کرنے کے باوجود اس کی اداکاری کا معیار بدستور بلند ہے۔ اور ہمیں یہ کہنے میں ذرا جھجک نہیں کہ سٹیشن ماسٹر کی ترجمانی میں وہ نیو تھیٹرز کے اونچے سے اونچے معیار تک پہنچ گیا ہے۔ کہانی کا سب سے دلفریب پہلو رتن مالا نے اوشا کی حیثیت میں پیش کیا ہے۔ اوشا سٹیشن ماسٹر پرمانند کی بیٹی ہے۔ جس کے بیاہ کی چنتا اسے کھائے جا رہی ہے۔ ارون (پریم ادیب) گارڈ ٹرین کے ساتھ آتا ہے

اس طرح گارڈ اور سٹیشن ماسٹر کی لڑکی کہانی کے مرکزی کردار بن جاتے ہیں۔ پھر مانک بابو (جیون) ہیڈ کلرک ہے جو ارون گارڈ کو دامادی میں لینا چاہتا ہے اور اس کی لڑکی شاما (کوشلیا) ہے۔ کالی چرن سگنل مین اور اس کی بیوی سونا بڑے پیار سے رہتے ہیں۔ مانک بابو کی یہ کوشش ہے کہ اوشا کی شادی ریلوے افسر نرنجن بابو سے ہو اور ان کی اپنی بیٹی شاما کا بیاہ ارون گارڈ سے ہو۔ ارون اور اوشا کے متعلق افواہیں پھیلنے لگیں۔ پرمانند سٹیشن ماسٹر سخت پریشانی کے عالم میں تھا۔ جس کے باعث گاڑیوں میں تصادم ہو گیا۔ تحقیقات کے نتیجہ میں پرمانند پر کوئی حرف نہ آیا اور یاس انگیز حالات ایک پُر لطف کامیڈی میں بدل گئے۔ اس فلم میں جگدیش رتن مالا اور پریم ادیب کے علاوہ شاکر نے سگنل مین اور امیربائی نے سگنل مین کی بیوی سونا کی حیثیت میں اداکاری کے جوہر دکھائے ہیں۔ پریم ادیب اوّل سے آخر ایک پیشہ ور گارڈ نظر آتا ہے۔ بلکہ ایک معاصر نے از راہِ طنز یہاں تک لکھ دیا۔ کہ پریم ادیب کو ایکٹر کی بجائے گارڈ بننا چاہیئے تھا۔ سٹیشن ماسٹر میں تفریح و تفنن کا سامان فراوانی کے ساتھ موجود ہے اور اس کے علاوہ یہ ریل بابو کی زندگی کا صحیح مرقع ہے۔

آنکھ مچولی

نشاط لاہور میں پنڈت راماشنکر چوہدری نے ایک طویل مدت کے بعد اپنی ہدایت کاری کا نمونہ "آنکھ مچولی" میں پیش کیا ہے۔ کبھی زمانہ تھا۔ کہ امپیریل فلم کمپنی کے ڈائرکٹر چوہدری کا سکہ ہندوستان کی فلمی دنیا پہ جما ہوا تھا۔ یہ سلوچنا کے عروج کا زمانہ تھا۔ پھر چوہدری کی قسمت کا ستارہ گردش میں آ گیا فلمی افق پہ نئی نئی صورتیں جلوہ آرا ہو گئیں۔ فلم آرٹ نے ایک عظیم صنعت کی صورت اختیار کر لی۔ حال میں امر پکچرز کے مالک سیٹھ چمن لال ڈلیبائی نے چوہدری کو اپنے کمال کے مظاہرہ کا موقع دیا۔ جس کا نتیجہ آنکھ مچولی ہے۔ اس سراسر دلچسپ فلم سے یہ حقیقت ایک دفعہ پھر آشکارا ہو گئی ہے۔ کہ فلم پروڈیوسر کے لئے ایک درجن ایمچور اور خام کار ڈائرکٹروں کی پلٹن رکھنے کی بجائے ایک پرانا تجربہ کار ماہر فن ڈائرکٹر رکھنا کہیں زیادہ نفع خیز ہے۔

کہانی سینریو اور مکالمے یہ سب چوہدری کے زرخیز دماغ کی تخلیق ہیں۔ کہانی کے کردار اپنے اپنے مخصوص خط و خال کے ساتھ نمایاں حیثیت سے نظر آتے ہیں۔ سر چونی لال سنہا ایک متمول زمیندار ہے۔ اس کی وفا شعار بیوی رادھا ہے۔ اور ان کی بچی ایکادشی۔ پھر مشتبہ چال چلن کی عورت سونا ہے۔ رادھا یہ دیکھ کہ میرا پتی اس عورت کے ہاتھوں تباہ ہو رہا ہے۔ اپنی لڑکی کو ساتھ لئے کہیں دُور نکل جاتی ہے۔ گمنام اور

افلاس زدہ رادھاکی لڑکی شباب کی منزل پہ آتے ہی دعوتِ نظارہ دیتی ہے اور فلم میں نئے کردار داخل ہو جاتے ہیں۔ چوبے جو دھرم کی آڑ میں کیا کیا ذلیل حرکات کرتا ہے۔ چوبے ایک گرسنہ بھیڑئیے کی طرح معصوم الیکا وشی پر جھپٹنا چاہتا ہے۔ ڈائرکٹر چوہدری نے افلاس زدہ حسن کی بے بسی اور سماج کے ہوس کار گرگوں کی ستم رانی کا نقشہ صفائی وصحت سے پیش کیا ہے۔ اور مختلف واقعات کی دلچسپی کو عروج مقام تک قائم رکھا ہے۔ ماں بیٹی ایک تلاطم خیز دریا کو انتہائی دُکھ درد کے بعد عبور کر کے سلامتی کے کنارہ پر پہنچ جاتے ہیں۔ سرچونی لال سہنا الیکا وشی سے ملتا ہے۔ گو اسے معلوم نہیں کہ یہ میری بیٹی ہے۔ اس کے بعد اظہارِ حقیقت وندامت اور غلط فہمیوں کا ازالہ اور گھر میں مسرت وشادمانی کا نیا دور۔ سابق ڈائرکٹر اے۔ پی کپور نے سرچونی لال کا پارٹ نمایاں کامیابی سے ادا کیا ہے۔ اس کا لب ولہجہ اور انداز تخاطب ہر توصیف سے بالاتر ہے۔ کتے کی طرح وفادار اور رجمی حضوری" ٹھاکر کا کردار نگندرہ موزمدار نے کمال خوبی سے نبھایا ہے۔

کملا چیٹرجی "پیاری" اور ستیش چھوٹے ہیرو کی حیثیت میں شاد کام رہے۔ ان سب سے بالاتر پارٹ نلنی جے ونت کا ہے۔ اس آنکھ مچولی میں وہ درخشندہ ستارے کی طرح ہے جس سے سارا فلم جگمگا اُٹھا ہے۔ کہانی کا بار بیشتر اس کے نازک کندھوں پر پڑتا ہے۔ لیکن اس آزمائش میں اس نے فاتحانہ کامیابی حاصل کی۔

ڈائرکٹر چوہدری نے سلوچنا اور جلّو کو آنکھ مچولی میں لاکر پرانا حقِ رفاقت ادا کر دیا ہے۔ سلوچنا جو کبھی شباب کی جملہ رعنائیوں سے عبارت تھی۔ اب ایک بھولا ہوا افسانہ ہے۔ جس کی یاد لمحہ بھر کے لئے آنکھ مچولی سے تازہ ہو جاتی ہے۔ جلّو بھی وہ منزلیں طے کر چکی ہیں۔ جب اس کے آرٹ کی تعریف میں ایک کور ذوق فلم ایڈیٹر نے اسے "لیڈی لان چینی" کا بے معنی لقب دیا تھا۔

لان چینی آنجہانی سینمائی دنیا کا مشہور اداکار تھا۔ ایڈیٹر نے اپنی جہالت کے باعث جلّو کو مرحوم کی "لیڈی" بنا دیا۔ بہر حال جلّو بھی سینمائی اعتبار سے ایک داستانِ پارینہ ہے اور چوہدری کا کمال یہ ہے کہ اس نے اسی سلوچنا اور اسی جلّو کے ذریعہ آنکھ مچولی میں خاص قسم کی دلفریبی پیدا کر دی ہے۔

——— ناظر۔ بی۔ اے

فلمی نوٹ

پیلس لاہور میں فلم خاندان کی سلور جوبلی ہندوستان کی سینمائی دنیا کا ایک اہم واقعہ ہے۔ ابھی کچھ زیادہ مدت منقضی نہیں ہوئی کہ ہندوستان کے فلمی نقشہ پہ پنجاب کا نام اتنے باریک حروف میں تھا کہ اسے ڈھونڈنے کے لئے شاید خوردبین کی ضرورت پڑتی۔ اب پنجاب فلمی اعتبار سے ہندوستان پر چھا رہا ہے۔ سیٹھ دلسکھ پنچولی نے پنجاب میں پروڈکشن کا کام نہایت ہمت شکن حالات میں شروع کیا۔ گذشتہ تلخ ناکامیوں کی یاد ابھی تازہ تھی اور سینمائی نظم ونسق میں پنجابی روایات ایسی نہ تھیں جو ہمارے لئے قابلِ فخر ہوتیں۔ پنچولی نے غیر متوقع عجلت کے ساتھ اس میدان میں قدم رکھا۔ کامیابی نے استقبال کیا۔ خزانچی دراصل آل انڈیا پیمانہ پر ایک چیلنج تھا۔ بمبئی اور کلکتہ کے نام" ذرا سنبھلنا پنجاب آرہا ہے"۔ اس کے بعد خاندان نے اس چیلنج پر صداقت کی مہر لگادی۔ اب زمیندار کی باری ہے اور جہاں تک ہمیں معلوم ہے۔ زمیندار اپنے پیش رو فلموں پر سبقت لے جائے گا۔ اب کی مرتبہ پھر سید امتیاز علی تاج کا خامۂ گل فشاں حرکت میں آیا ہے۔ اور ان کی کہانی کے کرداروں کا حقِ ترجمانی ادا کرنے کے لئے شانتا آپٹے، منورما، غلام محمد، اسمٰعیل، نارنگ، بیبی اختر، انوری، اجمل اور انگریزی محاورہ میں "بیوٹی" کے بالمقابل "بلیسٹ"، یعنی درگا مونا۔

پرکھات لاہور میں منگتی کو سلور جوبلی کی منزل طے کئے ہفتے ہو چکے ہیں۔ منگتی ان لوگوں کے لئے ایک مسکت جواب ہے۔ جو یہ سوال کرنے کے عادی ہیں کہ کیا کوئی پنجابی بھی فلمی کاروبار میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ اور ہمارے لئے یہ امر انتہائی مسرت کا موجب ہے کہ میسرز شوری سنیز اور جوبیز نے اس باب میں پنجابیوں کی لاج رکھ لی۔ اگر ناظرین اسے بین الاقوامی تحریک کی مخالفت نہ سمجھیں اور صوبائی طرفداری پر محمول نہ کریں تو اس حقیقت کا اظہار بے جا نہ ہوگا کہ پنجاب میں سو فی صدی پنجابی فلم کمپنی کامیابی سے بنانے کا سہرا شوری سینٹرا اور ان کے لائق فرزند روپ کرشن شوری کے سر ہے۔ پنجابی سرمایہ پنجابی اداکار پنجابی ڈائرکٹر اور پنجابی پبلسٹی انچارج ازلبکہ منگتی کی حیرت افزا کامیابی اس کے داخلی محاسن یعنی افسانہ کی بصیرت افروزی مکالمہ کی شگفتگی موسیقی کی سحر کاری اور اداکاری کی نفاست پر موقوف ہے۔ لیکن اس میں بے شبہ پبلسٹی کو کافی دخل رہا ہے۔ مسٹر ایس۔ آر باصر شعبۂ نشر واشاعت میں اپنے صحافتی تجربے اور ادبی لطافتوں کو ایسی خوش اسلوبی سے بروئے کار لائے ہیں کہ ان کے مرتبہ اشتہار میں بھی ایک خاص لطف ہوتا ہے۔ اور منگتی تازہ ترین ثبوت ہے اس دعوے کا کہ پبلسٹی کے لئے نصف درجن خوش پوش اناڑیوں کے بجائے ایک سیدھا سادا ماہر جرنلسٹ اقتصادی اعتبار سے کہیں بہتر ہے۔

چند اعداد و شمار

جرنل آف فلم انڈسٹری نے امریکہ اور ہندوستان میں سینما کے کاروبار سے متعلق ایسے کوائف بہم پہنچائے ہیں جن کی روشنی میں صنعتی اعتبار سے امریکہ کی برتری اور ہندوستان کی زبوں حالی آشکار ہے۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں تھیئٹروں کی تعداد ۱۶۹۵۱ ہے۔ جو ۸۴۸۸ قصبوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ سینما امریکی صنعتوں میں چوتھے درجے پر ہے۔ سرمایہ دار جسقدر روپیہ کسی فلم میں لگاتے ہیں۔ اس کا ۷۰ فیصدی حصہ تو اپنے ہی ملک میں وصول ہو جاتا ہے اور باقی ۳۰ فیصدی غیر ملکوں سے فلم پر لگائے ہوئے سرمایہ کا ۶۰ فیصدی چھ سے ۹ مہینوں کے اندر اور باقی ۴۰ فیصدی ۱ $\frac{1}{4}$ سال سے ۱ $\frac{1}{2}$ سال کے درمیان واپس مل جاتا ہے۔ ہمارے معاصر نے دوسرے ملکوں کے اعداد و شمار پیش نہیں کئے۔ جنگ سے پیشتر یہ حالت تھی کہ روس میں دس ہزار جرمنی میں ۵ ہزار برطانیہ میں ۴۸۹۷ فرانس میں ۴۰۰۰ اٹلی میں ۴۰۰۰ سینما تھیئٹر تھے۔ روس میں ہر ۱۶ ہزار اشخاص کے لئے ایک تھیئٹر ہے اور ہندوستان میں ۵۳۴۵۸۷ اشخاص کے حصہ میں ایک تھیئٹر آتا ہے۔ گذشتہ ۲۵ سال کے دوران میں آبادی کی عظیم اکثریت کے لئے کسی قسم کی سینمائی تفریح کا انتظام نہیں کر سکے۔

ہندوستان کی ساری فلم انڈسٹری پر لگائے ہوئے سرمایہ کی مجموعی میزان ۱۵ اور ۲۰ کروڑ روپیہ کے درمیان ہے۔ تین سو فلم ساز کمپنیاں ہیں۔ جن میں ۲۵ ہزار اشخاص کام کرتے ہیں۔ ہر سال ۲۵۰ تصویریں بنائی جاتی ہیں۔

مختلف نقطہ ہائے نظر

سر سٹیفورڈ کرپس

حال میں سر سٹیفورڈ کرپس نے ریڈیو پر تقریر کرتے ہوئے اس سوال کا جواب دیا کہ جنگ کے باعث روس کی سینمائی سرگرمیاں ختم ہو گئی ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ جنگی مقاصد کے حصول کے لئے روس کے مرد عورتیں اور بچے انتہائی ایثار سے کام لے رہے ہیں۔ اس وقت روس میں اگر تفریح کا ذریعہ ہے تو وہ موسیقی ڈرامہ سینما اور رقص ہے اور روس کی عظیم کلچر کے لئے یہ اتحاد اربعہ سنگِ بنیاد کا کام دیتا ہے۔ سوویٹ حکومت نے ان فنوں کو زمانہ امن میں اور اب بھی جبکہ جنگ جاری ہے۔ ترقی دینے کے لئے بہت کچھ کیا ہے اور کر رہی ہے۔

مسٹر بی۔ جی کھیر سابق وزیر اعظم حکومت بمبئی

مہاتما گاندھی نے ہریجن میں ریڈیو اور سینما کے خلاف جو نکتہ چینی کی تھی اس سے متاثر ہو کر فلم انڈیا کے نمائندے نے مسٹر کھیر سے استصواب رائے کیا۔ کیا مہاتما جی کے لئے یہ مناسب تھا کہ سینما دیکھے بغیر ہی اس کی مخالفت پر تل جاتے۔ مسٹر موصوف نے جواب میں کہا۔ اس امر کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔ کہ مہاتما جی نے یہ نہیں کہا کہ سینما "ہمیشہ" برا ہوتا ہے بلکہ آپ نے فرمایا۔ کہ "لیبا اوقات" برا ہوتا ہے۔ اس رائے میں سینما کی طرفداری کے لئے کسی قدر گنجائش ہے۔ مسٹر کھیر نے ذاتی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ کہ میں سینما کے حق میں ہوں اور وزیر اعظم کی حیثیت میں میں نے ایک سکیم مرتب کی تھی۔ جس کے مطابق بمبئی میں ایک ورزشگاہ ایک تیرنے کا تالاب ایک ریسٹورنٹ اور ایک سینما نہایت ارزاں داموں پر مزدوروں کے لئے مہیا کیا جاتا۔ آپ کی رائے میں بالغوں کی تعلیم کے لئے سینما سے بہتر کوئی وسیلہ نہیں اور بمبئی کی حکومت نے ناخواندگی کو دور کرنے کے لئے تعلیمی فلموں سے کام لیا تھا۔ سینما کو اگر غیر پسندیدہ عناصر سے پاک کر دیا جائے تو یہ قومی تعمیر کا اہم ذریعہ ثابت ہو سکتا ہے۔

شاہکار لاہور

جلد (۱۴) فہرست مضامین بابت ماہ اکتوبر ۱۹۴۲ء نمبر (۱۰)

ضروری اعلان

پوسٹنگ میں انتہائی حزم و احتیاط برتنے کے باوجود بعض اصحاب پرچہ نہ ملنے کی شکایت دفتر میں بھجوا دیتے ہیں۔ پرچہ نہ ملنے کے دیگر اسباب (مثلاً کسی شوقین دوست یا ملازم کی چیرہ دستی وغیرہ) پر تو غور نہیں کیا جاتا لیکن ادارہ کو مطعون کرنے میں نہایت عجلت برتی جاتی ہے۔ ایسی شکایات سے تنگ آ کر ادارۂ "شاہکار" نے فیصلہ کیا ہے کہ اس اشاعت سے پرچہ باخذِ رسید ڈاکخانہ خریدار حضرات کی خدمت میں بھجوایا جائے۔ چنانچہ اب پرچہ نہ ملنے کی صورت میں اپنے ہاں تحقیق کرنے کے بعد اپنے مقامی ڈاکخانہ سے باز پرس کرنی چاہیئے۔ ادارہ اس قسم کی شکایت موصول ہونے پر ڈاکخانہ کی پوسٹنگ رسید آپ کے ملاحظہ اور مقامی ڈاکخانہ کو دکھلانے کے لئے بھجوا سکتا ہے۔ امید ہے ہمارے معاونین اس سلسلہ میں ادارہ سے پورا اتفاق کرینگے۔

(ادارہ)

احسان اللہ خاں تاجور پرنٹر پبلشر نے عالمگیر الیکٹرک پریس پرانی تحصیل بازار لاہور میں چھپوا کر دفتر شاہکار نزد محمود بلڈنگ متصل تکیہ اڑی شاہ لاہور سے شائع کیا۔

مختصرات

اورنٹیل کالج لاہور

یکم اکتوبر کو اورنٹیل کالج کے سابق پرنسپل مسٹر شفیع کالج کی پرنسپل سپ سے ریٹائر ہوگئے اور نئے پرنسپل نے چارج لے لیا مسٹر شفیع کے رخصت ہونے پر تمام کالج اور خصوصاً مسلم اسٹاف کے ممبروں نے بہ یک زبان خدا کا شکر ادا کیا ہے۔ کیونکہ مسلم اسٹاف کالج میں اُن کی سخت گیر آقائی کو حدِ برداشت سے متجاوز سمجھ رہا تھا۔

یہ تو ہوتا ہے کہ کسی پرنسپل کے ماتحت اسٹاف میں اگر دس خوش ہوتے ہیں تو دو چار پرنسپل سے اپنے ذاتی مفاد کی ناپزیرائی کے سبب ناخوش بھی ہوا کرتے ہیں کہ کوئی شخص ہر کسی کو خوش نہیں رکھ سکتا۔ لیکن یہاں معاملہ برعکس ہے کہ پرنسپل شفیع کے ناروا طرزِ عمل سے ہر شخص جو کالج سے کسی نہ کسی صورت میں معاشی تعلق رکھتا ہے اُن سے بیزار تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس بیزاری کو اُن کے خوف سے کچھ لوگ دل ہی میں رکھتے تھے۔ مگر زیادہ تعداد اُن حضرات کی ہے کہ جو اس جذبۂ تنفر کے اظہار میں زبان کو بھی دل کا ترجمان بنائے ہوئے تھے۔

سابق پرنسپل نے اپنے سخت گیرانہ سلوک سے باندازِ استعارہ اسٹاف اور عملۂ انتظام کو یہ سمجھا دیا تھا کہ وہ اُن کو خدا کی مخلوق نہیں سمجھتے۔ بلکہ اپنی مخلوق تصور کرتے ہیں اور یہ کہ وہ ان کو بنانے بگاڑنے میں "فعّالٌ لما یرید" کی حیثیت کے مالک ہیں۔

مسلم یونیورسٹی کے علوم عربیہ کے فاضل استاذ علامہ میمن عبدالعزیز جو ہندوستان کے علاوہ مصر اور شام میں بھی علمی شہرت رکھتے ہیں اور آج مسلم یونیورسٹی میں شعبۂ عربی کے صدر کی حیثیت میں چھ سو روپے ماہانہ مشاہرہ پا رہے ہیں۔ بدنصیبی سے اِن کے ماتحت اورنٹیل کالج میں کچھ مدت کام کرتے رہے ہیں، لیکن سو روپے ماہانہ تنخواہ پر بھی ان ... وہ کالج کی غیر ضروری لعنت بنے رہے اور بالآخر انہیں مستعفی ہونا پڑا۔

مولینا سید محمد طلحہ علوم عربیہ کے ایک وحید العصر فاضل اِن کے خود داری کُش طرزِ عمل کے ہمیشہ شاکی رہے اور انجام کار میعادِ ملازمت کے ختم ہونے سے پہلے ہی استعفےٰ دے کر چلے گئے۔

مولینا حسن الدین صاحب ایم۔ اے جو فارسی ادب میں عبور تام رکھتے ہیں۔ پرنسپل کے جورِ بے کراں کے کارٹون بن کر رہ گئے ہیں۔

وہ سخت جاں تھے کہ اپنے حقوق کی پامالی دیکھتے رہے اور اپنی علمی خودداری کو اس آنچ سے بچاتے رہے۔ اب پرنسپل کے دورِ نامسعود کے خاتمے پر پہلی بار اطمینان کا سانس لینا انہیں میسر ہوا ہے۔ ڈاکٹر محمد باقر پی، ایچ ڈی نے اپنی خود داری کی حفاظت میں ذہن پاش تکلیفیں برداشت کیں، اپنے مفاد کو تباہ کیا۔ مگر اُن پر آفریں ہے کہ ستم آرا آقائی کے سامنے سرنگوں نہ ہوئے۔

جامعۂ ازہر (قاہرہ) کا ایک فاضل استاذ جو حالات سے بےخبری کے باعث اس کالج سے معاشی تعلق پیدا کر چکا تھا۔ واقف ہونے کے بعد پہلی فرصت میں کالج پر تین حرف کہہ کے رخصت ہوگیا۔

مولینا نور الحق منشی فاضل کلاس کے انچارج پروفیسر جو ادب عربی و فارسی میں یکساں وسیع نظر رکھتے ہیں۔ پرنسپل شفیع کی نقصان رسانی سے اپنے آپ کو ہمیشہ غیر محفوظ محسوس کرتے رہے۔

کالج کے ہیڈ کلرک مسٹر صدیق احمد خاں ایم۔ اے جو انگلش میں پرنسپل شفیع سے زیادہ قابلیت کے مالک ہیں۔ پرنسپل کی جا و بیجا جھڑکیوں اور سخت گیریوں کے آماجگاہ بنے رہے۔

بورڈنگ کا مسلمان سپرنٹنڈنٹ اس مظلوم کے داغہائے سینہ تو دیدنی نہیں ہیں۔ نادیدنی ہیں۔

کالج میں دو ایک مسلمان استاد ایسے بھی ہیں کہ انہیں چپ لگی رہی۔ لیکن اُن کے ضبطِ فریاد کا پس منظر شعلۂ جوالہ بنا رہا۔ اُن کی خلوتی مجلسیں پرنسپل کے شکوہ ہائے بےکراں سے معمور رہیں۔

ایک دیانت دار اور خدا کے سوا کسی سے نہ ڈرنے والا انسان جو پرنسپل اور کالج کے حالات سے واقف ہو حلف اُٹھا کر کہہ سکتا ہے کہ اس شخص کے ماتحت کام کرنا انسان کی بہت بڑی بدقسمتی ہے۔ اس افسوسناک کہانی کا ایک مضحکہ انگیز پہلو یہ ہے کہ اِس رستم داستان کی قہرمانی اسٹاف اور عملۂ انتظام کے غیر مسلم ممبران پر دامن پیسینے کی حد سے آگے قدم رکھنے کی مجال کبھی نہ پا سکی۔

کالج کے سابق ہندو ہیڈ کلرک پرنسپل شفیع کو کبھی خاطر میں نہ لایا۔ پرنسپل شفیع اسے سخت ناپسند کرتے تھے اور سنا جاتا ہے کہ ان دونوں میں رابطۂ گفتگو بھی منقطع رہا۔ لیکن ہیڈ کلرک کا جاہ و جلال

ملاحظہ ہو کہ وہ دفتر کے کاغذات پرنسپل کی حضوری میں خود پیش کرنے کی بجائے چپراسی کے ہاتھ ان کے کمرے میں بھیج دیا کرتا تھا اور خود ان کے دفتر میں جانا اپنی خودداری کے خلاف سمجھتا تھا۔ اس واقعیت کی عینی شہادت کالج اسٹاف کا ہر ممبر دے سکتا ہے۔

گذشتہ سال کالج کے ایک ہندو چپراسی کو اپنی روایتی خفگی کی لپیٹ میں انہوں نے لینا چاہا تھا مگر اس نے ان کے آئینی حدود دکھا کر اپنے حدود میں قدم رکھنے سے روک دیا۔ اس واقعے کی تفصیل ادارۂ شاہکار کی بجائے اسٹاف کی زبان سے سننے کے لائق ہے۔ مختصر یہ کہ پرنسپل شفیع اپنی خودساختہ فرماں روائی کا تختۂ مشق صرف مسلم اسٹاف اور مسلم ملازمین ہی کو بنایا کئے۔ کالج کے غیر مسلم رقبے پر ان کے حاکمانہ اقتدار کا ارمان اخیر تک دل میں حسرتِ انفعال ہی کی صورتیں بدلتا رہا۔

شاہکار کے تعلیم یافتہ طبقے میں اورنٹیل کالج سے متعلق ہمارے بیانات ایک افسانۂ خواب کی صورت پڑھے جا رہے ہوں گے، کیوں کہ جو لوگ کالجوں میں تعلیم پا چکے ہیں یا تعلیم پا رہے ہیں یا کسی کالج میں پرنسپل ہیں وہ اپنے اپنے مشاہدات کو ان بیانات سے منطبق نہ دیکھ کر حیرت زدگی میں مبتلا ہو رہے ہوں گے اور واقعہ بھی یہی ہے کہ عام کالجوں کے حالات کو دیکھتے ہوئے کوئی شخص مشکل ہی سے ان بیانات کو باور کرے گا۔ لیکن بات یہ ہے کہ اورنٹیل کالج لاہور کو دوسرے کالجوں پر قیاس کرنا ہی صحیح نہیں۔ اس کے نام کے ساتھ "کالج" کا لفظ تعلیم یافتہ طبقے کو اس مغالطے میں مبتلا کر دیتا ہے کہ عام کالجوں کی طرح یہ بھی ایک کالج ہے اور اس کے متعلق اندازے کی غلطی یہیں سے شروع ہوتی ہے۔

کبھی اپنے ابتدائی دور میں یہ کالج صحیح معنی میں مشرقی علوم والسنہ کا ایک مرکز سمجھا جاتا تھا۔ اور اس عہدِ زریں میں اس کالج سے جو طلبہ تکمیل تعلیم سے فارغ ہو کر نکلے وہ جہاں بھی پہنچے انہوں نے اپنا علم امتیاز بلند کئے رکھا لیکن اس دور کو ختم ہوئے ۳۵ سال کے لگ بھگ گزر چکے ہیں۔ مسٹر وولنر آنجہانی کی پرنسپلی سے کالج کی معنوی اور ظاہری حیثیت پر زوال کا آغاز ہوتا ہے اور ان کے بعد مسٹر شفیع کی پرنسپل شپ کا زمانہ اس آغاز کو انتہا تک پہنچا دیتا ہے۔

مسٹر وولنر پنجاب یونیورسٹی کے رجسٹرار بھی تھے اور اورنٹیل کالج کے پرنسپل بھی۔ یونیورسٹی اور یونیورسٹی سے باہر ان کی مصروفیتیں بےشمار تھیں۔ اس لئے انہوں نے کالج کے سیاہ و سپید پر کالج کے ہیڈ کلرک کو طاری کئے رکھا۔ کالج کے اساتذہ انگریزی نہ جاننے کے سبب پرنسپل کے لئے ناقابل خطاب و توجہ بن گئے اور اس لئے ہیڈ کلرک ہی عملی طور پر انتظام میں پرنسپل کا پارٹ ادا کرتا رہا۔ اس نے اپنے حدود اختیار کو اس قدر وسعت دی کہ کالج کے حدود سے علمی خودی اور تعلیمی خودداری عنقا ہو گئیں۔ ہم نے اپنی آنکھوں سے بارہا دیکھا کہ کبھی ہیڈ کلرک کسی کلاس میں آتا تھا تو اورنٹ اور شمس العلماء علامہ مفتی عبداللہ مرحوم تعظیم کے لئے سروقد کھڑے ہو جاتے تھے۔ شمس العلماء علامہ عبدالحکیم کلانوری مرحوم نے ایک بار اپنی خودداری کا اظہار کرتے ہوئے ہیڈ کلرک کے بلانے پر اتنا کہہ دیا تھا کہ "مجھ سے جو کچھ کہنا ہے لکھ کر بھیجئے، میں کلاس کو پڑھا رہا ہوں"۔ اس کا حشر یہ ہوا کہ وہ اپنی جرأت پر قربان ہو گئے اور ابسا عدیم النظیر فارسی دان یہ یک بینی و دو گوش کالج کے حدود کا خس و خاشاک بن کر اڑا دیا گیا۔ مولوی عالم کے مدرس مولوی محمد علی نے ایک بار طالبعلموں کی گذارش پر کالج کے چپراسی کو جو ان کی کلاس میں سے پانی کا گھڑا لے کر بار بار گذرا کرتا تھا روکا تھا۔ اس کے چند ہی دن بعد وہ کالج کے آبادجغرافیے سے جو نکلے ہیں تو انہیں پھر آنا نصیب نہ ہوا۔

ان واقعات سے کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس عہدِ تاریک کا اورنٹیل کالج کس پہلو میں کالج کہلانے کا مستحق تھا؟ مسٹر وولنر کے وانس چانسلر بننے کے بعد پرنسپل شفیع پرنسپل بنائے گئے۔ تو اسٹاف کو توقع ہو گئی کہ ہماری معلمانہ حیثیت کا احترام بحال ہو جائے گا۔ مگر اس سلسلے میں اس کی توقعات نہ صرف مجروح ہوئیں بلکہ بہت بری طرح کچلی گئیں، انہوں نے پرنسپل شپ کو گویا خدائی کا ہم معنی بنا کر اپنے خدائی اختیارات میں جباری و قہاری کے رنگ کو تیز کر کے کالج کے منحوس دورِ تاریک کو زیادہ مہیب صورت میں زندگی تازہ بخش دی۔ علمی خودی و خودداری حدودِ کالج کی اشیائے ممنوعہ بنا دی گئیں۔ اس اجمال کی تفصیلات بہت اندوہناک ہیں۔

کالج سے ان کی رخصتی ایک مصیبت طاری کے ختم ہونے کی مانند سمجھی گئی۔ ان کے اسٹاف نے الوداعی پارٹی دینے سے بھی احتراز کیا۔ اس کے برعکس نئے پرنسپل کی آمد پر تمام اسٹاف مسرور نظر آتا ہے۔ باہم مبارکبادوں کا سلسلہ جاری ہے اور مسلم اسٹاف تو بالخصوص اپنے جوشِ مسرت کو چھپا نہیں سکتا۔ کیوں کہ نیا پرنسپل جو بیس سال تک اسٹاف کا ایک ممبر رہا ہے حد درجہ شریف، علم نواز، منکسر المزاج، قابل اور قابلیت و وسعت کا قدر دان کیا جاتا ہے۔ اگر سابق پرنسپل کے ان دوستوں نے جو یونیورسٹی کے نظم و نسق پر حاوی ہیں اور جو مسٹر شفیع کی حمایت میں جانبداری کا امتیاز اٹھائے ہوئے ہیں نئے پرنسپل کو کام کرنے کا موقعہ دیا تو یقین ہے کہ کالج کی فضا ان تمام روایتی تاریک کثافتوں سے پاک و صاف ہو جائے گی۔ جو کالج کے تعلیمی معیار اور علمی وقار کو تباہ کرتی رہی ہیں۔

اورنٹیل کالج کی کالج کونسل

ہر کالج میں ایک کالج کونسل ہوا کرتی ہے۔ کالج کے تمام سینئر اور

جو نیز اساتذہ اس کونسل کے ممبر اور پرنسپل صدر ہوتا ہے۔
کالج کے تمام انتظامی و تعلیمی معاملات اس کونسل میں پیش ہو کر کثرت رائے کے مطابق طے پاتے ہیں۔ اکثر اوقات یہ ہوتا ہے کہ کالج کے کسی معاملے سے متعلق کونسل کے ممبران کی اکثریت اور پرنسپل کی تجاویز باہم مختلف ہوتی ہیں مگر اکثریت کی رائے پر جو تجویز منظور ہوتی ہے۔ وہی نافذ سمجھی جاتی ہے اور پرنسپل کو بھی اکثریت کی رائے کا پابند ہونا پڑتا ہے۔ اس کونسل کا ایک فائدہ تو یہ ہے کہ پرنسپل اور اسٹاف میں تعاون و تعامل قائم رہتا ہے اور اسٹاف کا ہر ممبر کالج کی بہبودی اور ترقی کے لئے ساعی رہتا ہے۔ دوسرا بڑا فائدہ یہ ہے کہ اساتذہ کا احترام پرنسپل کے لئے ضروری بن جاتا ہے۔ یہاں تک کہ پرنسپل اپنے آپ کو اس سے زیادہ کچھ خیال نہیں کرتا کہ وہ بھی اسٹاف کا ایک ممبر ہے اور اسٹاف کے تمام ممبر اس کے رفقائے کار ہیں۔
مگر اس عجیب و غریب کالج (اورینٹل کالج) کے افو کھے پرنسپل (مسٹر شفیع) چونکہ کسی صورت میں بھی اپنے اسٹاف کے ممبران کو سطح مساوی پر دیکھنے کی تاب نہیں رکھتے تھے۔ اس لئے انہوں نے اپنے کالج کی کونسل میں اسٹاف کے صرف وہ دو تین ممبر لے رکھے تھے جنہیں پرنسپل کی رائے کو الہام آسمانی ماننے میں تامل کی جرأت نہ تھی اور کونسل کے باقی ممبر کالج سے باہر کے لوگ لئے جاتے رہے حالانکہ ہر کالج کی کالج کونسل کالج کے تمام اسٹاف سے عبارت ہوتی ہے۔ بیرونی حضرات کو کالج کونسل میں ممبر بنانے کا تصور صوبے کے اور صوبہ کیا تمام ملک کے کسی پرنسپل کے دماغ میں کبھی نہ آیا ہوگا۔ اورینٹل کالج کی کالج کونسل میں اساتذہ کو اسی لئے "باہر کا آدمی" سمجھا جاتا رہا کہ ان پر ڈکٹیٹری انداز کا رعب طاری رکھنا مقصود تھا۔ خیر یہ دور مشؤم ختم ہوا۔ زائد المیعاد پرنسپل اب

"اکیلے پھر رہے ہیں یوسف بے کارواں ہو کر"

امید ہے کہ اورینٹل کالج کا جدید ہر دلعزیز اور عالم دوست پرنسپل جانے والے کی باقیات السیئات کو ایک ایک کر کے مٹاتے ہوئے پرانی نام نہاد کالج کونسل کے خاکستر پر عام کالجوں کے مطابق نئی کالج کونسل بنائے گا اور اس طرح اساتذہ کے علمی وقار کو بحال کرے گا۔

(ادارہ)

نوٹ:۔ اگلے نمبر میں ہم یہ بتائیں گے کہ کسی زبان کے استاذ میں قابلیت کا معیار کیا ہونا چاہیئے؟ اور ہمیں کس قسم کے نالائق لوگوں سے واسطہ پڑتا رہا ہے

(ادارہ)

علمی و ادبی صدمات

(۱) **حکیم الطاف احمد انصاری** کی رحلت کا صدمہ ابھی تازہ ہی تھا کہ بہار سے مولینا فضل حق آزاد عظیم آبادی کے انتقال کی خبر ملی، حضرت آزاد مرحوم اردو شاعری کے متاخرین کے دور کی آخری شمع اور دور جدید کے رہنما کی حیثیت بھی رکھتے تھے۔ ان کی وفات دنیائے اردو کے لئے ناقابل تلافی نقصان متصور ہوگی۔

(۲) دہلی کے مشہور صوفی شاعر **پنڈت امرناتھ ساحر دہلوی** بھی زندگی کی آخری منزل طے کر گئے۔ ساحر کو اگر شہید شاعری کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ نصف صدی تک اردو شاعری اُن کی زندگی کا محبوب ترین مشغلہ رہا۔ یہ اُن مقدس لوگوں میں سے تھے جن کے مشرب میں ہندو مسلم کا امتیاز اور دیر و حرم کی تفریق کلمۂ کفر خیال کی جاتی ہے اور حسرت ہے کہ اس بابرکت گروہ کے افراد ایک ایک کر کے ہم سے جدا ہو رہے ہیں۔

(۳) اس صوبے کے مشہور قانون دان **مسٹر عبید اللہ ایڈوکیٹ** کی حسرتناک وفات کی خبر ملک کے علمی، قانونی اور مجلسی طبقات میں بڑے تحسّر کے ساتھ سُنی جائیگی۔ اُنکی قانونی قابلیت ہمہ گیر تھی۔ دیوانی، فوجداری اور دیگر آئینی کاروباری شعبوں میں وہ یکساں طور پر قانونی مہارت و قابلیت کے مالک تصوّر کئے جاتے تھے۔ ملک کے کسی ایک وکیل میں اسقدر مختلف قانونی قابلیتیں بہت کم جمع ہوتی ہیں، شاید نہیں ہوتیں مختلف علوم و السنہ بالخصوص سیاسیات عالم، مختلف اقوام و ممالک کے دستور ہائے آئینی اور تاریخ پر اُنکی نظر بعید و وسیع تھی۔ بعض ایسے مقدمات کی پیروی کرنے کا بھی انہیں موقعہ ملا جو بین الاقوامی شہرت حاصل کر چکے تھے۔ افسوس ہے کہ یہ گنج گراں مایہ موت نے ہم سے چھین لیا ہم اُن کے برادران خورد مشہور افسانہ نگار محترم شیخ عباد اللہ صاحب اور شیخ ہادی حسن سے

علّامہ سیماب اکبرآبادی

نغمۂ وقت

دل اک جہانِ خودی چشمِ اعتبار میں ہے
دل اختیار میں ہے۔ سب کچھ اختیار میں ہے

زبسکہ دیرِ شگفتِ مزاجِ یار میں ہے
ابھی بہار سرا پردۂ بہار میں ہے

مذاقِ ناز بھی انسان کے شعار میں ہے
ہزار میں جو نہیں ہے تو سَو ہزار میں ہے

شکیبِ دل کو کچھ ایسا خیالِ یار میں ہے
کہ جیسے پھول کوئی دامنِ بہار میں ہے

مری نگاہ بیں ہے، میرے اختیار میں ہے
وہ انقلاب جو تقدیرِ روزگار میں ہے

دل اور عشق میں ترکِ معاملہ ہے ہنوز
ہوس کے ساتھ ابھی نفس کاروبار میں ہے

کرے نگاہ سے معلوم خود مقام اپنا
وہ کارواں جو نہ منزل نہ رہگذار میں ہے

چمن کے سوزِ نہفتہ کا دے رہی ہے پتہ
یہ ایک جنبشِ پیہم جو برگ و بار میں ہے

کسی سے سستیٔ پیماں کا کیا کروں شکوہ
مرا سکون ہی فردائے اعتبار میں ہے

یہ ولولے دلِ مرحوم تک ہی زندہ تھے
نہ اب ہے قرب میں لذّت نہ انتظار میں ہے

تری قبائیں ہیں تکلیفِ دوش اے منعم
طمانیت مرے دامانِ تار تار میں ہے

ہو ٹھوکروں سے نوازش کہ ناز و نفرت سے
نشاطِ سجدہ تمہاری ہی رہگذار میں ہے

نوا و ناز کو رخصت کرو کہ اب دُنیا
صدائے صورِ قیامت کے انتظار میں ہے

ہے اپنی آخری حد پر مآلِ آدم زار
اور آدمی وُہی فکرِ نشاطِ کار میں ہے

سپردِ خاک ہیں، پھُولوں سے کھیلنے والے
چمن فروش ابھی اندیشۂ بہار میں ہے

عمل بقا ہے، فنا ہے سزائے بے عملی!
حیات و موت سب انساں کے اختیار میں ہے

مؤرخینِ چمن کو یہ راز ہے معلوم
ہمارا خون بھی رنگینیٔ بہار میں ہے

ہے مُردہ آج ہر انساں۔ مگر ہے فرق اتنا
کوئی مزار کے باہر کوئی مزار میں ہے

نظر لگے نہ اسے انقلاب کی سیماب
سکون و امن کی جنّت مرے دیار میں ہے

(غیر مطبوعہ) (۱۶ دسمبر ۱۹۴۱ء)

کلرک کی زندگی

سید نصیر امام زیدی دہلوی
بی۔ اے

سعید میاں کا بچپن سے ہی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا ارادہ تھا۔ باپ کی اوقات تو اتنی نہ تھی۔ لیکن ایک تو اکلوتا بیٹا دوسرے ہونہار۔ شوقین۔ جس طرح بھی بن پڑی اپنا پیٹ کاٹا۔ سو ضرورتوں کو ردکا لیکن سعید کو بی۔ اے تک پہنچا ہی دیا۔ بیٹے نے باپ سے قول لے لیا تھا کہ وہ اسے ایم۔ اے ضرور کرا دیں گے۔ لیکن "تدبیر کند بندہ تقدیر کند خندہ"۔ بی۔ اے کے امتحان میں دو مہینے باقی تھے کہ باپ کو نمونیہ ہوا اور چار دن میں چٹ پٹ ہو گئے۔ سعید کی آنکھوں میں دنیا اندھیر ہو گئی۔ تمام حسرتوں آرزوؤں پر اوس پڑ گئی۔ گھر بھر کا بار سر پر پڑ گیا۔ باپ جس کے سر سہرا تھا وہ ہی دم نہ رہا۔ اپنی تعلیم کا خرچ۔ بیوہ ماں۔ تین بہنیں، کرے تو کیا کرے۔ کہے تو کس سے کہے؟ بہتیرا سوچا کہ کوئی صورت ایسی نکل آئے کہ دو مہینے تو کسی نہ کسی طرح لشتم پشتم گذر جائیں۔ بی۔ اے کا امتحان تو دے لوں، پھر محنت مزدوری کر دوں گا۔ اللہ مالک ہے۔ لیکن کوئی تدبیر سمجھ میں نہ آئی۔ آخر ماں کے آگے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ آنکھوں سے زار و قطار آنسو بہنے لگے۔ منہ سے ایک حرف نہ کہہ سکا۔ ماں کی مامتا۔ دوڑ کر کلیجے سے لگا لیا۔ اور کہا میرے چاند تو اپنا جی برا نہ کر، مجھ رانڈ بیوہ کا جب تک سانس چل رہا ہے خود کو بیچ کر بھی تیرا پوتھ پورا کروں گی۔ یہ کہہ کر کوٹھری میں گئی اور اپنی چمپا کلی لا بیٹے کے ہاتھ میں یہ کہہ کر دے دی۔ لے ماں کی جان تو اپنا دل نہ کڑھا اسے بیچ کر کالج کی فیس دے دے۔

سعید نے کانپتے ہاتھوں سے چمپا کلی لی اور اپنے مطالعے کے کمرے میں گھنٹوں بیٹھا اپنی پھوٹی تقدیر پر روتا رہا۔ ہزاروں خیالات سیلاب کی طرح امڈے چلے آتے تھے۔ ہر تصور جگر کے ٹکڑے کئے دیتا تھا۔ کبھی سوچتا کہ ایک بہن جوان بیٹھی ہے۔ اسے کب تک گھر بٹھائے رکھوں گا۔ منجھلی اور چھوٹی بھی خیر سے خاصی ہوشیار ہو گئیں، آنکھ بند کرتے تین چار سال گذرے اور وہ بھی جوان ہوئیں۔ اگر ماں کا تار چھلا بھی اپنی تعلیم پر آگ لگا دیا تو ان کے وقت پر کیا کروں گا۔ فقیر سے فقیر بھی ننگی بچی لڑکی اپنے گھر سے رخصت نہیں کرتا۔ دنیا میرے منہ پر تھوکے گی کہ بھائی کا راج تھا۔ بہنوں کو زیور نام کا ایک تار بھی نصیب نہ ہوا۔ ایسے تو کنگال بھی نہ تھے۔ آخر باپ کا بیس برس کا جما جمایا گھر تھا۔ دیگ کی کھرچن ہی بہت ہوتی ہے۔ نہ بھی لٹے گا تب بھی سوا لاکھ کا۔ کس کس کی زبان پکڑوں گا۔ آنکھ او جھل پہاڑ او جھل۔ کسی کو کیا خبر کہ کیوں کر دن بسر ہو رہے تھے۔ باہر تو سفید پوش رہنا ہی پڑتا تھا۔ ابا اللہ بخشے وضعدار آدمی تھے۔ مرتے دم تک اپنی وضع میں فرق نہ آنے دیا۔ آخر یہی سوچا کہ کچھ بھی ہو دو مہینے کی بات ہے، چودہ سال کی محنت اکارت ہوئی جاتی ہے۔ برسوں آنکھوں کا تیل نکالا ہے۔ بی۔ اے بھی نہ کیا تو کوئی دو کوڑی کو بھی نہ پوچھیگا۔ ہر چہ بادا باد۔ جب اوکھلی میں سر دیا تو دھمونکا کا کیا ڈر۔ ماں کا زیور بیچتے کیسی؟ جب ناچنے نکلی تو گھونگٹ کیسا؟ خدا کو منظور ہوا تو دن پھر ہی جائیں گے، وہ نہ رہے یہ بھی نہ رہیں گے اور اگر مقدر میں ہی پاپڑ بیلنے لکھے ہیں تو یہ چمپا کلی ہی کیا سہارا لگا لے گی۔ مرضیٔ مولیٰ از ہمہ اولیٰ۔

بُری بھلی طرح دو مہینے گذارے، اللہ کا نام لے کر امتحان دیا۔ اور اس کی رحمت پر بھروسہ کر کے بیٹھ رہا۔ دل کا خدا حافظ تھا۔ رات دن دُبداس پہ جان بنتی۔ دیکھئے اللہ کیا کرتا ہے؟ باپ کی موت اس پہ ناداری، نہ دل ٹھکانے تھا نہ دماغ۔ تمام امنگیں خاک میں مل چکی تھیں اب تو امتحان گلے پڑا ڈھول تھا جو بجانا پڑا۔ نتیجے کا ایک ایک دن گنتا۔ رات دن نمازوں اور دعاؤں میں بسر ہوتی۔ خدا خدا کر کے وہ دن آیا اور اللہ نے سن لی۔ سعید نے دروازے سے ہی پکار کر کہا۔ اماں جان خدا نے اپنا بڑا کرم کیا۔ آپ کا غلام کامیاب ہو گیا۔ ماں سن کر اچھل پڑی۔ دوڑ کر بیٹے کو کلیجے سے لگا لیا۔ چٹ چٹ بلائیں لیں، ساتھ ہی دل پر ایک گھونسہ سا لگا۔ بے تحاشا منہ سے نکلا۔ کاش آج وہ زندہ ہوتے۔ اللہ بخشے قبر میں اپنے ساتھ یہ ارمان ہی لے گئے۔ اکثر حسرت سے کہا کرتے۔ خبر نہیں میری زندگی میں میرا بچہ کسی قابل ہو گا بھی یا نہیں۔ بیگم میں تو اس انتظار میں ہوں کہ سعید بی۔ اے کر لے۔ اگر جیتا رہا تو دیکھ لینا۔ نتیجہ آنے کے ایک ہفتہ کے اندر ہی چٹ منگنی اور پٹ بیاہ۔ میں نے زندگی میں دیکھا ہی کیا ہے۔ جب سے ہوش سنبھالا آج تک پاپڑ ہی بیلے۔ بس ایک ہی تمنا پہ جیتا ہوں کہ اپنی آنکھوں سے سعید کو دولہا بنا ہوا دیکھ لوں۔ میں اکثر بگڑ کر کہہ دیتی کہ تمہیں بیٹے کی تو فکر پڑ گئی۔ بیٹی اللہ رکھے منہ کو آئی جاتی ہے۔ اس کا کچھ خیال نہیں۔ تو ہنس کر کہہ دیتے ہم باپ ہیں بیٹے کی فکر کر رہے ہیں۔ تم ماں ہو بیٹیوں کی فکر کرو

اس دن کی خبر نہ تھی کہ یہ ارمان ہی سدھار جائیں گے۔ نہ بیٹے ہی کا کار کرنا نصیب ہوگا نہ بیٹی کا۔ یہ کہہ کر ضبط نہ ہو سکا۔ چیخیں نکل گئیں۔ ماں کو دیکھ کر بچے بھی دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ گھر بھر میں کہرام مچ گیا۔

(۲)

سعید نے بادلِ ناخواستہ کالج کو خیر باد کہی۔ رات دن نوکری کی تلاش میں سرگرداں پھرتا۔ شام کو در در کے دھکے کھا کے بھوکا پیاسا گھر میں گھستا۔ باسی تازی دال چٹنی سے مل گئی تو کھا لی ورنہ اللہ کا شکر کیا اور پڑ رہا۔ دو مہینے کی رات دن بھاگ دوڑ کے بعد کسی دفتر میں چالیس روپے ماہوار کی عارضی نوکری مل گئی۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا۔ ماں نے دو رکعت نماز شکرانہ پڑھی۔ بہنوں نے منتی روزے رکھے۔ سعید میاں دفتر جانے لگے۔ افسروں نے پہلے ہی اس کو کہہ دیا تھا کہ بھائی تمہاری ملازمت بالکل عارضی ہے۔ اگر محنت سے کام کرو گے تو مستقل ہو جاؤ گے ورنہ فوراً جواب مل جائیگا۔ دودھ کا جلا چھاچھ کو پھونک پھونک کر پیتا ہے۔ تین مہینے بیکار جوتیاں چٹخاتے پھر چکے تھے۔ در در کے دھکے کھائے تھے۔ دفتر کے وقت سے گھنٹے آدھ گھنٹے پہلے پہنچتے اور چراغ جلے گھر میں آن کر گھستے۔ چودہ برس تعلیم حاصل کرنے میں لوہے کے چنے چبانے پڑے۔ اس سے فارغ ہوتے ہی نوکری کی بلا گلے پڑی سر منڈاتے ہی اولے پڑے۔ رات دن میں گھڑی بھر چین سے گذرنا نصیب نہ ہوتا۔ دن بھر دفتر میں دماغ سوزی کی، گھر میں قدم رکھتے ہی نون تیل لکڑی کی فکر میں سرگرداں ہوئے۔ جب کہیں رزق کی شکل دیکھنی نصیب ہوئی۔ وہ بھی خیر سے روکھی سوکھی۔ چالیس روپلی کی اوقات ہی کیا۔ اس پر چار دم، پھر بہن کی بھی فکر کرنی لازمی۔ غنیمت یہ تھا کہ ماں سر پر موجود تھی۔ ہزار جوڑ توڑ کرتی اور جس طرح بن پڑتا سب ہی کچھ کرتی۔ سال بھر بعد کسی نہ کسی طرح بیٹی کو گھر کا کر ہی دیا۔ جو کچھ قرض وام کیا تھا، رفتہ رفتہ اتارا۔ اب آخر ماں تھی۔ بیٹا اللہ رکھے جوان جہان برسر کار تھا۔ کب تک نرا نہ دکھا پھراتی۔ رات دن یہی فکر تھی کہ کسی نہ کسی طرح گھر میں بہو لے آؤں۔ خدا رازق ہے۔ وہ آئے گی تو اپنا رزق ساتھ لائے گی۔ مجھے میاں کی موت اور گھرداری کے فکروں نے مردہ کر دیا۔ سانس آیا آیا نہ آیا۔ آج مری کل دوسرا دن۔ باپ کا سایہ سر سے اٹھ ہی چکا۔ میری بندی کی آنکھ بند ہوئی تو لاوارث کو بیٹی کون دے گا۔ لگے ہاتھوں یہ بھی کار کرتی جاؤں۔ ورنہ دل میں کہے گا اماں ٹانگ پسار کر مر گئیں۔ بیٹے کا فکر نہ کیا کہ وہ کیا کرے گا۔ یہ سوچ کر دل کڑا کیا۔ جان پر کھیل کر بہو گھر لے ہی آئیں۔ دین سے دنیا بھاری۔ کہنے کو تو بیاہ دیا۔ لیکن اکلوتے بیٹے کا پہلا کار کرنے بیٹھی تھیں۔ بہتیرا دانت بھینچ بھینچ کر سکام کیا لیکن کچھ نہ کرتے کرتے بھی ہزار بارہ سو کے پھیر میں آ گئیں۔ آخر پرائی لڑکی گھر لانی تھی۔ گڈے گڑیا کا بیاہ تو تھا نہیں۔ کہ منہڈ کلیا پر ٹل جاتی۔ عمر بھر لوگوں کے ہاں کھایا تھا۔ آج کیسے ناک کٹا کر بیٹھ رہتی۔ دو دن نہ سہی دو وقت ہی سہی۔ دال ٹکیا سامنے رکھنی ہی تھی۔ بہو کو ستر ستائیس نہ سہی پانچ سات ہلکے بھاری جوڑے دینے لازمی۔ جھومر جھالنیا نہ سہی نتھ انگوٹھی ہاتھ گلے کا کچھ کرنا ہی تھا۔ غرض تھوڑا بہت بُرا بھلا سب ہی کچھ کرنا پڑا۔ اب کورے چالیس روپلے اور پورے کنبہ کا خرچ نئی بہو گھر میں دو بیٹیاں سینے پر سوار۔ ادھر قرض سے بال بال بندھا ہوا۔ کرے تو کیا کرے؟ کہے تو کس سے کہے؟ روز سوچتی کہ آج سعید سے کہوں گی بیٹا۔ سوکھی تنخواہ میں اب کیوں کر گذارہ ہوگا۔ کوئی ایک آدھ لڑکا ہی لگا لو۔ دس پانچ جو آئیں گے قرض میں ہی پھونکوں گی، کچھ تو بوجھ ہلکا ہوگا۔ لیکن جب بیٹا تمام دن کا تھکا ماندہ مغرب کے بعد گھر گھستا اور بے حال ہو کر پڑ جاتا تو منہ دیکھ کر رہ جاتی۔ ایک حرف کہنے کی ہمت نہ پڑتی۔ آمدنی وہی رہی۔ اور خرچ بڑھتے گئے۔ اب تک بہو بیٹے ہی تھے۔ اب پوتا پوتی والی ہو گئیں۔ نتیجہ ظاہر تھا۔ روٹی تک کے لالے پڑ گئے، ادھر بیڑیاں ادھیڑ ہونے کو آئیں۔ دن رات اسی ادھیڑ بن میں گذرتا۔ ساری ساری رات تارے گنتے گذر جاتی مصیبت کی ماری پھر اس پر ضعیفی اور رات دن کے فکروں نے چند ہی دن میں مُرنڈا کر دیا۔ سوکھ کر ہدف ہو گئی۔ پنپنے کی تو صورت ہی کیا تھی۔ غرض یونہی گھل گھل کر ایک دن ختم ہو گئیں۔

(۳)

سعید کے لئے ماں کی موت تباہی کا پیش خیمہ ہو گئی۔ باپ کے سائے سے تو قدرت نے محروم کر ہی دیا تھا۔ ایک ماں کا دم رہ گیا تھا۔ سب کو پروں تلے لئے بیٹھی تھی۔ لیکن وہی مثل ہوئی کہ اتنا بھی روپ کھو دوں تو کیا دے۔ پھر ایسی ناداری کی حالت میں مرغی کو تکلے کا گھاؤ بہت کفن دفن فاتحہ درود سب ہی کچھ کرنی پڑی۔ سو سوا سو روپے کا قرض اور سر پر چڑھ گیا۔ چوہا بل میں سماتا نہیں دُم سے بندھ گیا چھاج۔ بہو اکثر ساس سے برگشتہ رہتیں۔ لیکن ان کی آنکھ بند ہوتے ہی چودہ طبق روشن ہو گئے۔ آج تک سمجھتی تھیں کہ اماں نہ معلوم بیٹے کی کمائی میں سے کیا کچھ ڈھب میں رکھتی ہونگی۔ لیکن جب اپنے ہاتھوں خرچ کیا تو آنکھیں کھل گئیں۔ پہلی تاریخ کو میاں نے کہنے کو تو پچاس روپے لا کر دیئے۔ لیکن شام تک پانچ بھی نہ رہے۔ دس روپلے مکان کا کرایہ دیا۔ پانچ روپے کمین دھوبی، سقے کو چلے گئے۔ بیس روپے بنیے کو بھیجے تو آئندہ ساکھ رہا۔ چار روپے دودھ والا لے گیا۔ چار

پانچ روپے کا مرچ مصالحہ آ گیا - آمدنی خرچ تقریباً برابر رہا - رو پیہ دھیلی چٹ پٹ میں اُٹھ گیا اب چار پانچ روپے اوپر کا مہینہ - یہاں غریب - دن بھر جان کھپانے کے بعد دو وقت کی روکھی سوکھی کا شرمندہ تھا اور بس - ماں کے سامنے سگرٹ چھوڑ بیڑی پہ آ گیا - اب وہ بھی ختم ہوئی - صبح کا ناشتہ وغیرہ تو گیا بھاڑ میں - افیم کھانے کو دو پیسے جیب میں کبھی نہ ہوتے - لیکن غریب اُف نہ کرتا - صبح جو کچھ بیوی نے سامنے لکھ دیا اللہ کا شکر کر کے کھا لیا - اور کان دبا کر دفتر چلا گیا - شادی کی دعوت کے لئے دوستوں نے بیسیوں مرتبہ ایسا ایسا ذلیل کیا کہ آنکھوں میں آنسو آ گئے - لیکن ہاں کرنے کی ہمت نہ ہوئی - تہوار کو ایک ایک سے منہ چھپاتا پھرتا - ایک اچکن میں ساری گرمی گذر جاتی - اکثر لوگ جملے فقرے چست کرتے - میاں بیوی اماں سے کہو کہ اب یہ منتی کپڑے بڑھائیں ورنہ بدن پر چپک کر رہ جائیں گے - یہ غریب گردن جھکا کر چپ ہو رہتا - گھر میں بیوی کہتی اے دیکھو تو نگوڑے بچے تپتی زمین پر ننگے پاؤں پھرتے ہیں لبتہ تک اٹکانے کو نہیں - موئی چپلیاں لا دو! پاس پڑوس کی کوئی بیوی آ نکلتی ہیں تو غرق ہو جاتی ہوں - یہ دبی زبان سے کہہ دیتا بیگم کوڑی کوڑی تمہیں لا کر دے دیتا ہوں - مجھ سے کیا کہتی ہو - اللہ سے کہو - وہی اس بیڑے کو پار لگانے والا ہے - فی الحال تو منجدھار میں ڈوبتی نظر آتی ہے - بیوی بھی سُن کر چپ ہو رہتی - میاں کے پاس ڈھکا چھپا ہو تو لڑتی بھی اچھی لگے - وہی بندھی تنخواہ اوڑھو بچھاؤ - بھرا موسم گذر جاتا نگوڑے بچے فصل کی پھل ترکاری کو ترستے رہ جاتے - لیکن اکثر نئی کرنی بھی نصیب نہ ہوتی - محلے کے بچوں کی دیکھا دیکھی پیسے کے لئے للک رہے ہیں - ماں کی بوٹیاں نوچ لیتے ہیں اس کے پاس پھوٹی کوڑی نہیں - ہر چند بہلاتی ہے - لیکن بالک ہٹ مشہور ہے - عاجز آ کر اُٹھی - روٹی کے باسی کو سی ٹکڑے پر گُڑ کی ڈلی رکھ کر پیار دلاسے سے ٹال دیا - لیکن دل کی جو حالت ہوتی، وہ ماں کے ہی دل سے پوچھئے - کلیجے کے ٹکڑے اُڑے جاتے تھے - ادھر سعید کو دو بہنوں کا فکر کھائے جاتا تھا - کہتا تھا ایسی کون سی گھڑی ہو جو یہ ساتھ خیریت کے اپنے گھر کی ہوں - مرحومہ ماں کی رُوح کلپتی ہو گی جب کوئی صورت بن نہ آئی تو ایک روز بیوی سے عاجز اور دلگیر ہو کر بولا -

سعید - ارے بی سنتی ہو - مجھے آج تم سے ایک نہایت اہم گفتگو کرنی ہے -

بیوی - کہیئے - خیر تو ہے - کیا کوئی نیا گُل کھلا - خدا کے لئے جلدی کہیئے - میرا تو دل بیٹھا جاتا ہے -

سعید - تم اتنی گھبرا کیوں جایا کرتی ہو - اللہ کا فضل ہے سب طرح خیریت ہے - میں صرف اتنا پوچھنا چاہتا ہوں کہ میری بہنیں تمہاری کون ہوئیں ؟

بیوی - واہ یہ بھی عجیب بات پوچھی اے تمہاری بہنیں میری بہنیں -

سعید - دل سے کہہ رہی ہو یا منہ دیکھے سے - تمہیں ہمارے سر کی قسم سچ کہنا -

بیوی - مجھے پھپھڑ دلاسے نہیں آتے - میں تو انہیں اپنی سگی بہنوں سے کم نہیں سمجھتی -

سعید - بس تو بات ختم ہوئی، ان کی شادی کا جس قدر فرض مجھ پر عائد ہوتا ہے، اتنا ہی تم پر - اپنا زیور مجھے دو اب اور کوئی صورت نظر نہیں آتی - اسے بیچ کر انہیں گھر بار کا کر دیں - خدا کو منظور ہوا تو پھر میسر آ جائے گا -

بیوی - بھلا اس ہیر پھیر کی بات سے کیا نتیجہ ہوا - سیدھے سبھاؤ کہہ دیتے تو کیا مجھے انکار ہوتا - جب میں ہی تمہاری ہوں تو ہر چیز تمہاری ہے - تمہارے ہی نشیب و فراز کے لئے جگا جگا کر رکھا تھا - بندہ بشر ہے ہزار موقعے پڑ جاتے ہیں - سو تمہیں اختیار ہے جب چاہو حاضر ہے -

سعید - (آنکھوں میں آنسو بھر کر) بیوی خدا کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ آج بالکل ہر طرف سے مایوس اور عاجز ہو کر تم سے ذکر کیا ہے - کیا کروں ان مظلوموں کا کون والی وارث بیٹھا ہے - ہر پھر کر ایک بھائی کا دم ہے - اور بس - میں ہی نہ کروں گا تو اور کون کرے گا -

غرض بیوی کا کچھ زیور بیچا کچھ ساتھ کیا - کسی نہ کسی طرح دونوں کو گھر کا کر ہی دیا - بیوی بیچاری کان ناک تک سے ننگی ہو کر بیٹھ رہی لیکن تیوری پر بل نہ آنے دیا -

(۴)

بہنوں کی شادی کو مشکل سے سال بھر گذرا ہو گا کہ سب سے بڑی بہن بیوہ ہو گئیں - سسرال میں صرف میاں کا دم تھا وہ ہی قبر میں جا سوئے - ننھے ننھے اوپر تلے کے چھ بچے مرحوم نے اپنی نشانی چھوڑے بھائی کو جو خبر ملی چکرا گیا - دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر بیٹھ رہا - آنکھوں تلے اندھیرا آ گیا - سوچتا تھا کہ اب ہو گا کیا - گرتا پڑتا بہن کے گھر پہنچا - وہ بدنصیب کھڑی اور بڑی بیٹ رہی تھی - بھائی کو دیکھتے ہی آ کر لپٹ گئی اور رو رو کر کہا - بھیا تمہاری ماں جائی لُٹ گئی - اچھے بھائی دعا کرو کہ میری میت بھی ساتھ ہی اٹھے - اب میرا کوئی ٹھکانہ نہیں رہا - میں اس کچے ساتھ کو لیکر کس گھر جاؤں گی -

سعید نے بمشکل تمام اپنے کو سنبھال کر کہا بہن تیرا بھائی بے بس ہے، سہاگ تو واپس نہیں لا سکتا۔ لیکن جب تک اس کا سانس باقی ہے۔ بھیک مانگیگا محنت مزدوری کرے گا پہلے تیرے بچوں کو کھلا کر پھر اپنے بچوں کی فکر کرے گا۔ میری مظلوم دکھیاری بہن اللہ کی مرضی پر شاکر رہو۔ وہ اپنے نیک بندوں کا اس دنیا میں ہی امتحان لیتا ہے۔ بی بی اس درد سے نہ رو۔ بھائی کا اب کلیجہ پھٹ جائے گا۔

بہن نے عدت پوری کی تو بھائی نے پندرہ روپے ماہوار کا مکان لیا۔ اور بچوں سمیت لے آیا۔ اب خیر سے چھ بچے بہن کے۔ چار اپنے۔ ایک بہن ایک بیوی ایک خود۔ تنخواہ میں تو دو ہی ٹہیا چلنی مشکل۔ آخر صبح کو ایک لڑکے کو پڑھاتا۔ دن بھر دفتر کا کام کرتا اور شام کے سات بجے سے رات کے دس بجے تک ایک سوداگر کی دکان پر حساب کتاب لکھتا۔

آخر انسان تھا۔ حیوان بھی اتنی محنت مشقت کرے تو بیٹھ جائے۔ جب تک بن پڑی اپنے کو گھسیٹتا رہا۔ تین سال اسی کشمکش میں گزرے۔ صحت گرتی گئی۔ کبھی بخار ہے۔ کبھی معدے میں تکلیف ہے۔ پھر بیماری میں بھی آرام نصیب نہ ہوا۔ دن بھر کولھو کے بیل کی طرح پلنا بخار میں ہل ہلا رہا ہے۔ سر درد کے مارے پھٹا جاتا ہے۔ گرمی کا یہ عالم کہ خدا کی پناہ۔ یہ مصیبت کا مارا اسی عالم میں اندر گودام میں بیٹھا حساب لکھ رہا ہے۔ رات کو ساڑھے دس بجے گرتا پڑتا گھر پہنچا۔ رات بھر درد میں لوٹتا رہا۔ بخار میں تپا کیا۔ صبح کو حالت ہی غیر ہو گئی۔ بہتیری ہمت کی۔ لیکن پلنگ سے اٹھا نہ گیا۔ دفتر سے تو سو جتن کر کے مہینہ بھر کی رخصت مل بھی گئی۔ لیکن صبح شام کے دونوں ٹھکانے چھوٹ گئے۔ اب تو روٹی کے ہی لالے پڑ گئے۔ کس کی دوا اور کیسی غذا۔ بیوی پہلے ہی کان ناک تک سے ننگی ہو چکی تھیں۔ بہن کا تار چھلا خاوند کی دوا دارو و فاتحہ درود میں برابر ہو چکا تھا۔ اور کوئی آسرا نہ وسیلہ۔ بیوی حسرت سے بیٹھی خاوند کا منہ تکتی رہتی، جب بے دوا غذا میاں کا تڑپنا نہ دیکھا جاتا تو گھبرا کر کوٹھڑی میں جا کر خوب دل کی بھڑاس نکالتی۔ ادھر بچوں کے بھوک سے بلکنے کی آوازیں آتیں، تو بے تاب ہو کر دوڑی آتی ایک ایک کو کلیجے سے لگاتی۔ دل میں سوچتی کہ اگر آج میرا گہنا پاتا ہوتا تو یہ بپتا نہ پڑتی۔ لیکن ایک حرف منہ پہ نہ لاتی کہ میاں کو رنج نہ ہو۔ ادھر بہن بھائی کو اس حال میں دیکھ دیکھ کر پھڑکی جاتی۔ ندامت اور شرمندگی سے ان کے سامنے نہ ہوتی۔ پہروں بیٹھی سوچا کرتی کہ میں نا حق بہن ڈائن بن کر آئی اور بھائی کو فراش کر دیا۔ اگر مجھ بدنصیب کا بار نہ پڑتا۔ تو یہ اس حال کو نہ پہنچتے۔ لیکن تنکے کا سہارا نہ تھا۔ اس کچے ساتھ کو لیکر کہاں جاتی، یہ کیونکر ممکن تھا کہ بچوں کی انگلی پکڑ کر سڑک پر جا بیٹھتی۔ دل ہی دل میں گھٹتی لیکن نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن۔ اپنا چھٹڑا دم ہوتا تو بھائی کو کبھی بوجھ نہ تھا۔ اور اگر ایسا ویسا رنگ دیکھتی تو جس گھر جا بیٹھتی محنت مزدوری کرتی ٹکڑا کھاتی۔ یا بھائی کے ہاں بیٹھ کر ہی آنے دو آنے کی سوئی سلائی کرتی تو ایک دم کو بہت تھی۔ لیکن اس چینٹیوں بھرے کباب کو کیا کرے۔ اچھی طرح جانتی تھی کہ بھائی کی زندگی اس کے کارن خطرے میں آ گئی۔ مگر کرے تو کیا کرے۔ کئی دفعہ اسقدر دم گھٹا کہ پکا ارادہ کر لیا کہ رات کو چپکے سے بچوں کو لے کر جدھر منہ اٹھے گا نکل جاؤنگی عزت آبرو کہ بکنے لگے گا تو بلا سے، در در کی ٹھوکریں کھانی پڑیں گی۔ تو آنکھوں سکھ کلیجے ٹھنڈک۔ میرا ماں جایا تو بچ جائے گا۔ لیکن پھر خیال آتا کہ ایسا نہ ہو کہ وہی مثل ہو کہ

"اتنا بھی روپ کھو دوں تو کیا دے"

میں تو بھائی کے کارن در بدر ہو جاؤں اور بھائی دل میں سمجھے کہ جب تک بھائی کے ہاتھ پاؤں چلتے تھے، بہن صدقے قربان ہوتی پھرتی تھیں۔ آج جب بھائی پر وقت پڑا تو اپنے بچوں کو لے چمپت ہوئیں۔ ایمان کی بات ہے۔ آج کے دم تک پہلے بہنوں کے بچوں نے سیر ہو کر کھا لیا۔ تو اپنے بچوں کو کھلایا۔ ان کا تن ڈھانک کر کچھ بچ رہا تو اپنی اولاد کی فکر کی، اس کا صلہ بہن نے یہ دیا۔ آخر میرے بچے بھی تو بھوک سے بلبلاتے ہیں۔ بیوی خود مرنے کو پڑی ہیں۔ دوا تو دوا غذا تک بھی میسر نہیں۔

یہ سوچ کر مچھلی کی طرح تڑپنے لگتی۔ پاگلوں کی طرح کبھی ادھر گھبرائی پھرتی۔ پھر بھائی کے پلنگ کے گرد چکر کاٹنے لگتی اور رو رو کر کہتی۔ کہ بھیا بہن تیری الا بلا لے کر مر جائے۔ ذرا آنکھ تو کھول! ارے میں تیری بے کسی کے صدقے فقط اشارے سے اجازت دے میں بھیک مانگ کر تیری دوا دارو کروں گی۔ بھائی نے آنکھ کھولی اور عجیب حسرت کی نظر بہن پر ڈالی۔ بہن بھائی کو ندامت سے تکنے لگی۔ تمام بدن کانپ رہا تھا۔ اتنے میں بچے روتے ہوئے آکر ماں کی ٹانگوں سے لپٹ گئے اور کہنا شروع کیا۔ اماں بڑی بھوک لگ رہی ہے کل سے روٹی نہیں کھائی۔ اچھی اماں آیا پاس چلو اب ماموں جان روٹی نہیں دیتے۔ بچوں کے بھولے پن سے نکلے ہوئے الفاظ سعید کے دل پر نشتر بن کر لگے۔ بے ساختہ آنسو بہنے لگے۔ ایک آہ کی اور آنکھیں بند کر لیں۔ ادھر بہن نے پچھاڑ کھائی۔ ادھر بیوی کی ہچکی بندھ گئی۔

(۵)

سعید کی حالت یک لخت بگڑ گئی۔ سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ تمام بدن ٹھنڈے پسینے میں شرابور تھا۔ نند بھاوجوں نے پیٹنا

شروع کیا۔ محلے والے جمع ہو گئے۔ انہی میں سے کسی اللہ کے بندے کو رحم آگیا۔ جا کر ڈاکٹر کو بلا لایا۔ ڈاکٹر نے دیکھتے ہی کہہ دیا۔ کہ قلب کی حرکت نے خوفناک صورت اختیار کر لی۔ کوئی شدید صدمہ پہنچا ہے۔ دو تین منٹ سے زیادہ مریض کی زندگی کی امید نہیں۔ ڈاکٹر دروازے تک پہنچا تھا کہ سعید دار المحن سے ہمیشہ کو رخصت ہوا۔

بہن اور بیوی کی حالت دیکھی نہ جاتی تھی۔ اپنوں کا تو ذکر ہی کیا غیر تک زار و قطار رو رہے تھے۔ اُن کے بین سُن سُن کر جگر پاش پاش ہوا جاتا تھا۔ بچے بھوک سے بلک رہے تھے اور ماؤں کو ہوش نہ تھا۔ میت سے لپٹ لپٹ کر ہلکان ہوئی جاتی تھیں۔ بہن کہتی تھی۔ بھیا ڈائن بہن تم کو کھا گئی۔ اچھے تم ہی تو سر ہو کر لائے تھے۔ میا جائے رانڈ بیوہ کے سر پہ ہاتھ رکھ کر لائے تھے۔ اب اسے کس پہ چھوڑے جاتے ہو۔ ارے میرا رنڈاپا تم سے دیکھا نہ جاتا تھا۔ مجھے تسلی دیتے دیتے خود چیخیں نکل جاتی تھیں، اب اس دُکھیا کو چھوڑ گئے کہ تھا دج کو رنڈسالہ پہنائے۔ اچھی بھیا اسی دن کے لئے بہن کو لائے تھے۔ ارے لوگو آج میری بن بھائی کی ہو گئی۔ مجھ بندی کو پانی پی پی کر کوسو۔ بیوی پچھاڑیں کھا رہی تھی۔ پیٹ پیٹ کر بدن نیلا کر لیا۔ بال نوچ ڈالے۔ بچے بلک رہے۔ دل ہلا دینے والا سماں تھا۔ آج ایک پُر ارمان عمر بھر ... ننھے ننھے معصوموں کو یتیم اور بدنصیب شریک حیات کو ... کر تمام حسرت و ارمان کو سینے میں لے کر ہمیشہ کے لئے رخصت ... آج جب بہن کو خیال آتا ہے کہ مقدر کے ہیٹے بھائی نے جب سے آنکھ کھولی ایک دن سکھ کا دیکھنا نصیب نہ ہوا تو دونوں ہاتھ ... کر بیٹھ جاتی ہے۔ بیوی کو جب اپنی۔ اپنے بچوں کی اور اس کے بچوں کی لاوارثی نظر آتی ہے۔ بے تحاشا چیخیں نکل جاتی ہیں۔ دل سنبھالے نہیں سنبھلتا۔ پُر ارمان کی میت بے گور و کفن سامنے پڑی ... دیواروں سے سر ٹکراتی ہے۔ کاش سعید ایک غریب مزدور ہوتا تو ظاہرہ رکھ رکھاؤ نہ کرنا پڑتا۔ وضع داری کی فکر نہ ہوتی۔ دن بھر محنت مزدوری کر کے شام کو اپنے بیوی بچوں میں ہنسی خوشی وقت گذارتا۔ اگر معمولی تاجر ہی ہوتا تو سو دو سو ہزار پانچسو کا سرمایہ اپنے لاوارث کنبے کے لئے چھوڑ جاتا۔ کسی سوداگر کے ہاں ملازم ہوتا تو آج وہ اس کی احترام کے ساتھ منزل اوّل کرتا۔ اس کے ورثا کو تسلی ڈھارس دیتا۔ حتی الامکان ان کی مدد کرتا۔ قدمے درمے سخنے جو کچھ بھی ممکن ہوتا ... رکھتا۔ لیکن وہ ایک کلرک تھا۔ جب تک ہاتھ پاؤں چلتے ... مقدر کا لکھا اسے مل جاتا تھا۔ آج وہ اپنی خوشی نہیں بلکہ خدا کے حکم سے ہمیشہ کے لئے بے حس و حرکت ہو گیا۔ اب اس کے حقوق ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئے۔

قانون کی بے رحم اور غیر ہمدرد نگاہیں اس کی افسوسناک اور دردانگیز موت کو نہایت اطمینان کی نظروں سے دیکھ رہی ہیں۔ مرنے والے کی عمر بھر کی خدمت گذاری۔ ورثا کی کس مپرسی کا عالم۔ ان کی گریہ وزاری چیخ پکار۔ رونا بلکنا پچھاڑیں کھانا اور ٹکرانا اس کی نظر میں دنیا کا روزمرہ ہے۔ اس قسم کے قیامت خیز منظروں سے اس کا دل نہیں پسیج سکتا۔ وہ نہایت مستقل مزاج ہے۔ مردہ دوزخ میں جائے یا بہشت میں۔ اسے اپنے حلوے مانڈے سے کام۔ اس کے چہرے پہ آثار حزن و ملال کے بجائے خفیف سی مسکراہٹ اور مسرت رقصاں ہے۔ اس خوشی پہ کہ اس کے ایک پرانے تھکے ہوئے مہنگے خدمت گار کے عیوض اسے تر و تازہ نوجوان طاقتور اور سستے دو یا تین ملازم نہایت آسانی سے مل سکتے ہیں۔ رونے وہ اس کی موت پہ اس کی بلا کو کیا غرض ہائے کاش آج کوئی مرنے والے کے دل سے پوچھے کہ عمر بھر پاپڑ بیلنے کے بعد بھی اس کی رُوح کو چین نصیب نہ ہوا۔ اس کی روح اپنی ماں جائی اور بدنصیب شریک حیات کو اور اس کے معصوم بچوں کو تڑپتا بلکتا دیکھ کر کلپتی رہے گی اور وہ بے بسی سے دیکھے گی اور کوئی مدد نہ کر سکے گا۔

سعید کا تیسرے دن سیم ہوا۔ گھر میں دن بھر کہرام عظیم برپا رہا۔ تیسرے پہر نند بھاوجیں نڈھال اور بے حال ہو کر پڑی تھیں کہ پوسٹمین نے آواز دی۔ مرحوم سعید کا بڑا لڑکا قسیم ایک بڑا سرکاری لفافہ لے کر داخل ہوا۔ ماں پھوپھی نے پوچھا اتنا بڑا لفافہ کس کا ہے اس نے رو کر کہا۔ آبا جان کے دفتر سے آیا ہے۔ دونوں مقدر کی ہیٹی اپنی کم فہمی سے سمجھیں کہ شاید دفتر کو مرنے والے کی پُر ارمان وحسرتناک موت پہ اور اس کے ورثا کی لاوارثی پر رحم آگیا۔ اس لئے مرحوم کی خدمات کے عوض کوئی وسیلہ معاش زندگی کے لئے مقرر کر دیا ہے۔ قسیم نے خط کا ترجمہ بلند آواز سے پڑھا جو حسب ذیل تھا:-

"دفتر کی یونین سعید احمد کلرک کی قبل از وقت موت پہ انتہائی افسوس کا اظہار کرتی ہے۔ اسے مرحوم کے وارثوں سے کافی ہمدردی ہے۔ وہ دعا کرتی ہے کہ سعید احمد کو پروردگار عالم جوار رحمت میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ اس خط کی نقل مختلف اخباروں میں بھیجی جا رہی ہے اور اس کی ایک کاپی یونین کے فائل میں شامل کر دی گئی ہے۔"

خدا نہ کرے جو دنیا میں کسی کی امیدیں یوں بندھ کر پل بھر میں ٹوٹ جائیں اور وہ حسرت سے آنکھوں میں آنسو بھر کر ایک جگر سوز دلدوز!

(خان بہادر) امین حزیں

پیامِ ادب

نشاط و عیش کے مسیلمہ[1] کو یہ پیام دو — کہ سازِ نغمۂ بدی نئے پیمبری نہیں

شباب اگر بگڑ گیا تو عمر بھر کا روگ ہے — بگڑ کے پھر سنور سکیں سبھی تو بھرتری[2] نہیں

جبھی تو ہے نہاں نقابِ رنگ میں شمیمِ گل — برہنگی کا نقش کچھ بھی ہو، مصوّری نہیں

ادب ہے ایک سلسلہ وفورِ ذوق و شوق کا — یہ وجد و حالِ قلب ہے جنونِ خودسری نہیں

جوانیوں کی مستیاں ہیں مستیاں ہی مستیاں — ادا فروشیاں کسی حسیں کی دلبری نہیں

سکھا نہ شاہباز کو کبوتروں کی سرخوشی — کمندِ عیش میں پھنسا ہوا جواں جری نہیں

نگاہِ مستِ میفروش[3] کی اشارتیں سمجھ — قلندری نہ ہو تو کام کی سکندری نہیں

جو پر کٹا ہو باز آسماں کی سیر کر چکا — وہ بیج ہو چکا شجر جو وقفِ خود گری نہیں

[...]ر پھونکئے کلیمؑ بے نیاز ہے — خلیلؑ کو جلا سکے مجالِ آذری نہیں

[...] کا پیام ہے نویدِ زندگی — نہ ڈال دے جو راہ پر خضرؑ کی رہبری نہیں

ادیب سے بعید ہیں ہلاکت آفرینیاں
کہ معصیت کی تربیت امیں سخنوری نہیں

---

[1] مسیلمہ کذاب جو رسول صلعم کے عہدِ مبارک میں پہلے مسلمان ہوا لیکن بعد میں مرتد ہو کر مدعیِ نبوت ہوا۔ اس نے قرآن مجید کے جواب میں کچھ خرافات بھی تصنیف کیں۔ خلیفۂ اوّل صدیق اکبرؓ کے عہدِ خلافت میں مسلمانوں کے ہاتھوں قتل ہو کر اپنے کیفرِ کردار کو پہنچا۔

[2] بھرتری ہری۔ ایک عیاش راجہ جس نے بعد میں اصلاح نفس کر کے رشیوں کا درجہ حاصل کیا۔ بھرتری ہری کے اقوالِ حکمت و روحانیت کے انمول موتی ہیں۔

[3] میفروش سے یہاں مراد پیرِ ہندی علامہ سر محمد اقبال مرحوم و مغفور ہیں۔

پنڈت پرکاش بھوشن

پالش

سوا دو روپے کا ہیٹ - ایک روپیہ چھ آنے کی ٹائی - سات آنے کا کالر کل کے ہوئے چار روپیہ ایک آنہ اور یہ پانچ آنے کے موزے چار روپیہ چھ آنے ٹھیک یہ دونی بچ گئی - اب کیا رہ گیا - ایک آنے کے تسمے اور ہاں پالش تو یاد ہی نہیں رہی -

کل مجھے اپنے ایک واقف کار کی شادی پر جانا تھا - بس یونہی مل گیا راستے میں - مدت ہوئی وہ ہمارے ساتھ پڑھا کرتا تھا - بیچارے نے بڑی تکلیف اُٹھائی - اپنے گھر لے گیا - بڑے تکلف سے چائے پلائی - دو بیڑے پان کے کھلائے اور تاکید کی کہ کل ٹھیک دس بجے ضرور آجانا -

بس ابھی ابھی حامی بھر کر چلا آ رہا تھا - کہ دل نے کہا - کیا یونہی الٹرچپن سے بنے جاؤ گے ؟ ذرا سوٹیڈ بوٹیڈ ہو جاؤ - وہ بھی کیا کہے گا خوشی کا دن اور کھدر کے کپڑے - بٹوہ دیکھا - ساڑھے چار روپے پڑے آرام کر رہے تھے - اُن سے کہا کہ میاں اُٹھو - تمہارے آزمانے کا وقت آ گیا ہے اب جو ہال بازار آیا تو یہ سب سامان خرید ڈالا - یہ ہیٹ - یہ ٹائی - یہ کالر - ..... دل بلیّوں اُچھلنے لگا - آخر جوان ہے - کوئی اُدھیڑ بڑھا کھوسٹ تو ہے نہیں جو سوٹ بوٹ کا نام سنتے ہی کھانسنے لگے میں چلا جا رہا تھا دل خوش ہو رہا تھا

"پالس بابو جی -" سیاہ چمڑی والے ایک پوربئے چمار نے میرے فلیکس کے بوٹوں کی طرف نگاہ جماتے ہوئے پیلے پیلے دانت دکھا دئے - اور اُس کے پاس کھڑا اُس کا دوسرا ساتھی یوں میرے منہ کی طرف تکنے لگا - گویا میرے منہ پر بھی پالش کرنا ہے - "ہاں - ہاں - مگر ذرا جلدی ....."

کہہ کر میں اپنے تسمے کھولنے کیلئے جھکا -

"وہ چکر نہ کریں بابو - بس چٹکی میں لیو ... آں ہاں - ہم کھولے لیتے ہیں - تم کاہے تکلیف کری -" یہ کہہ کر اس کالے کلوٹے کلچر نے بڑی رحم دلی سے میرے تسمے کھولنے شروع کئے - اس کا ساتھی بھی اپنا بقچہ رکھ کر ڈٹ گیا - پھر دونوں نے ایک ایک بوٹ بانٹ لیا اور لگے بے دردی سے اُس پر برش کو رگڑنے - میں نے بھی اپنا یہ نیا خریدا ہوا مال پاس کی ایک ڈلیٹ (TO LET.) دکان پر رکھ دیا اور لگا ان دونوں کو گھورنے -

کالے چمار نے بوٹ پر اُنگلی سے پالش لگاتے ہوئے کہا - "سول بھی لگا دوں بابو جی"

"تجھے جو کچھ بھی کرنا ہے جلدی کر بھائی" میں نے جواب دیا -

"دیکھ بلوا - کالی مچ کا چمڑا لگے ہے" بوڑھے نے بوٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنے ساتھی سے کہا -

"مچ کا ؟" بلوا نے پوچھا -

"تو اتنی دیر سے پنجاب میں رہے ہے پر یہ نہ جانت کہ مچ کا ہووے - ارے بساطو کے بیٹے بھینس جو ہوئی -"

کالا کلچر - کالے بوٹ - کالی بھینس اور یہ کالی بولی، میرا جی متلانے لگا -

"صبو سے یہ بابو جی کا ہی کام کیا ہے - یا دوپہر کو سنتری جی کے بوٹ پالش کئے تھے - پر وہ تو کسی گنتی میں نہ - اور دن بھر ادھر اُدھر ٹھبکتا ہی پھرا -"

بوڑھے نے پھر سے کان کھانے شروع کیئے -

"نہ دادا ——— میں نے تو یہ بابو جی کے پیسے ملا کر سوا سات آنے بنا لئے - باقی ابھی سارا دن پڑا ہے - گاہک اور موت کی کا خبر جو ابھی چار آنے کا کام ایک دم آ جائے -"

"تو کل کا لونڈا کا جانے ——— ان ہاتھوں نے چودہ چودہ آنے روج کی کمائی کی ہے - پر یہ بات ہے پرانی، کوئی پندرہ بیس برس کی - اب تو جو کوئی چار برس کا چھوکرا ہووے تو ڈبیہ برس لے گھر سے نکل پڑے پالش کرنے - نہ گرو منتر نہ اُستاد - پھر کام نہ گھٹے تو اور کا ہو تیرا سر -"

"دیکھ دادا خواہ مخواہ کی رنجس اچھی نہ لگے -"

"ارے جا - رنجس کے لاڈلے لاٹ خاں گھر بیٹھ - سوا سات آنے کما لئے اور ابھی منہ کھولے بیٹھا ہے - کسی اور کو تو دو دھیلے کی کمائی کرنے دے"

"دیکھ دادا - میں پھر کہے ہوں - میرا غصو بڑا جالم ہے - نہیں جو آ جاؤں اپنے آپے میں تو اپنے باپ کی بھی کھال کھینچ کے رکھ دوں - تو تو ٹھہرا دور کا رستہ دار -"

"عجت (عزت) سے بات کر - میں جو ابھی منہ میں تمباکو ڈال پل پڑا تو تیرا اکا تجھے سبل ہسپتال ہی لے جاوے ہے - میرے منہ کی طرف کا دیکھت ہے ؟ کام کر ———"

نوجوان بلوے نے آؤ دیکھا نہ تاؤ دھڑ سے میرا چمکیلا بوٹ بوڑھے کی ناک پر جمایا اور بوڑھے نے دھڑا دھڑ بلوے کی کھوپڑی پلپلی کرنی شروع کی - دونوں طرف میرے بوٹ کی شامت -

آخر لوگوں نے بیچ بچاؤ کر ہی دیا - صرف بوڑھے کی ناک سے اور بلوے کے کان سے لہو بہہ رہا تھا - باقی سب خیریت تھی - البتہ میرا بوٹ فاتحہ پڑھ چکا تھا - اگلی پچھلی چاروں طرف سے سلائی اُکھڑ چکی تھی - میں نے دو چار صلواتیں سنا کر ڈلیٹ پھر اس نکالی اور کہا کہ تمہیں ایک کوڑی نہ دونگا - اور مڑ کر اپنا سامان لیکر بھاگوں - مگر وہاں تو بالکل صفائی ہو چکی تھی -

سید ضمیر جعفری بی اے

.... کے نام

میرے سانسوں میں بستی ہو، ہر سانس پہ یاد آجاتی ہو
اس پورب دیس میں یاد آ کر دل میرا تڑپاتی ہو

جب بوجھل بوجھل قدموں سے دفتر کی جانب جاتا ہوں
تیری باتیں یاد آتی ہیں، تیری باتیں دُہراتا ہوں

ہنگامِ رخصت ڈیوڑھی تک باچشمِ پُرنم آئی تھی
گردن بھی ذرا خم کھائے تھی، آواز بھی کچھ بھرّائی تھی

رنگت بھی اُڑتی اُڑتی سی، صورت بھی رونی رونی سی
جیسے کوئی مرمر کی مورت، حیرت میں کھوئی کھوئی سی

وہ سعئ ضبط میں بھی پیاری آنکھوں کا کٹورا چھلکا سا
وہ جیٹھ کے سامنے بھی سر سے دوپٹہ ڈھلکا ڈھلکا سا

گھبرا کر بھرنا ہاتھ میں دوپٹے کا کنارا لے کر
مبہوت کھڑے ہو ہو جانا کرسی کا سہارا لے کر

اُن نازک ہاتھوں کے پیارے خط مجھ کو یہاں جو آئے ہیں
وہ میرے دل کی ٹھنڈک ہیں، وہ میرے پیار کے سائے ہیں

اندر کی جیب میں رکھتا ہوں اُن پیار بھری تحریروں کو
"رومان گہِ گجرات" کے رنگیں خوابوں کی تعبیروں کو

افسوس معاش نے لا پھینکا، دہلی میں تم سے دُور بہت
جینا بھی تو اک مجبوری ہے، جینے پہ ہوں مجبور بہت

کیا پوچھتی ہو کس طرح یہاں میرے اوقات گذرتے ہیں؟
مزدور ہوں، مزدوروں کی طرح میرے دن رات گذرتے ہیں

تھی فطرت میری شاہینی، پرواز بلند تھا کام مرا
افسوس میرے خوش خواہوں نے خود مل کے بچھایا دام مرا

مجھ کو میری اپنی دُنیا سے، اس بستی میں لے آئے
میری رفعت سے ناواقف اپنی پستی میں لے آئے

حالات نے بھی کچھ یاری کی اور اُن کا کام بنا ڈالا
یعنی مجھ کو بھی اپنی طرح نامرد، غلام بنا ڈالا

سردار درشن سنگھ بی ۔ اے (آنرز)

محبّت اور کائنات

دوست!

میری زندگی کیا تھی —— ایک المناک کھیل ۔

چند خام جذبات کا مجموعہ —— رنگین مگر شکستہ آرزوؤں کا آئینہ —— تلخ ناکامیوں کا روزنامچہ —— تشنہ امنگوں کا مرجھایا ہوا گلدستہ —— مایوس امیدوں کا ویران مسکن —— پامال ارادوں کی زنگ خوردہ کڑی —— تشنۂ تکمیل و محوِ انتظار زندگی —— حقیر و لغزش آمیز زندگی —— غیر دلچسپ زندگی

دنیا سمجھتی تھی میرے پاس سب کچھ تھا ۔

دولت —— سرمستی —— عیش و عشرت کی محفلیں —— رقص و سرود —— دنیا کی دلچسپیاں شروع شروع میں میں نے بھی یہی محسوس کیا کہ میرے پاس سب کچھ ہے ۔

مگر جلد ہی

دولت کا خمار اُتر گیا —— سرمستی کا نشہ ہرن ہو گیا —— عیش و عشرت کی محفلوں کا سرور فنا پذیر ثابت ہوا —— رقص و سرود کا رنگین طلسم ٹوٹ گیا —— دنیا کی دلچسپیاں اپنی حقیقت کھونے لگیں ۔ حسین آرزوؤں میں مہلک فریب نظر آنے لگا —— کوہ اور سمندر کے نظاروں سے جی بھر گیا —— نیلگوں آسمان دنیا کے رہنے والوں کا جانی دشمن —— نظر آنے لگا ۔

چاند اور ستارے میری مصیبتوں پر مسکراتے ہوئے نظر آئے ۔

یہ سب روپیہ اور مٹی کا کھیل تھا —— میری روح بے چین تھی —— میری روح کی بیقرار آنکھیں کسی کو ڈھونڈ رہی تھیں ۔ مجھے اس زندگی سے نفرت ہو گئی —— مجھے زندگی میں کوئی دلچسپی نہ رہی ۔

میں نے دولت کی پرستش کی مگر اس سے مجھے سکون قلب حاصل نہ ہو سکا ۔ میں نے دولت کو آگ لگا دی ۔ دولت کو خاکستر بنا دیا ۔ مجھے شراب سے بھی سرور حاصل نہ ہو سکا ۔ مجھے اس سے نفرت ہو گئی ۔ میں نے بلور کے جام کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ۔

میں رقص و سرود کی مجلسوں میں شامل ہوا ۔ لیکن سکھ اور چین حاصل نہ ہو سکا ۔ میں رقص و سرود کی مجلسوں سے کنارہ کش ہو گیا ۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میرے پاس سب کچھ ہوتے ہوئے بھی کچھ نہیں ..... مجھے جینا دوبھر ہو گیا —— مجھے زندگی سے نفرت ہو گئی —— مجھے دنیا والوں سے نفرت ہو گئی —— میں ایک نامعلوم تاریک سمندر میں چھلانگ لگانے کو تھا ۔ مگر تو نے روک لیا —— بالکل اور ہمیشہ کے لئے روک لیا —— میں بے بس ہو گیا ۔

مجھے تیری محبّت نے روک لیا —— محبت نے مجھے ایک خطرناک گناہ کے ارتکاب سے روک لیا ۔

ہم دونوں اچانک مل گئے —— نہیں —— اچانک کیوں! —— ہمیں ملنا تھا —— یہ ہماری تقدیر میں تھا —— آخر ہم مل گئے —— ہم ایک ہو گئے —— محبت نے ہمارے دلوں میں گداز پیدا کیا اور ہماری نواؤں نے ایک پاکیزہ ہم آہنگی پیدا کر دی —— ہم پر زندگی کا راز روشن کر دیا —— ہم زندگی کے بھید کو سمجھ گئے —— محبّت زندگی کا بھید ہے ۔ مجھے محبت کا راز موت کے راز سے زیادہ حسین نظر آنے لگا ۔

محبّت نے ہمیں ایک کر دیا ۔

ہم ایک ہی تقدیر کے دو پہلو بن گئے —— ہمارے جسم ایک ہی روح کے دو پیرہن بن گئے —— ہم اکٹھے اڑنے لگے ۔

میری تاریک زندگی کی مایوس فضا میں پہلی بار امید کی کرن چمکی ۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میرے پاس کوئی چیز نہ ہوتے ہوئے بھی سب کچھ ہے ۔

کیونکہ مجھے تیری محبت حاصل ہو چکی تھی —— محبت کے بغیر سب کچھ ہیچ ہے ۔ محبّت کے ساتھ ہیچ بھی سب کچھ ہے ۔

میری زندگی ایک حسین کھیل بن گئی ۔ مجھے زندگی سے محبت ہو گئی ، کیونکہ میری زندگی اب صرف میری زندگی نہ تھی ۔ اب یہ تیری امانت تھی ۔

زندگی دلچسپ بن گئی ۔

میری امیدیں جاگ اٹھیں —— میری امنگیں بیدار ہو گئیں ۔

زندگی کی تلخ ناکامیاں بھولا ہوا خواب بن کر رہ گئیں - تیری محبّت نے مجھے زندگی کا نیا پیغام دیا ——— محبت کے جام سے میری تشنہ رُوح اپنی پیاس بجھانے لگی - دولت کا خمار - شراب کا نشہ ——— خواہشات کا دھوکہ ——— رقص و سرود کا سرُور ——— دُنیا کی دلچسپیاں ——— سب عارضی ثابت ہوئیں -

مگر محبّت کا سرور مستقل ہے ——— محبّت دوامی ہے - ابدی ہے ——— موت سے ناآشنا ہے ——— وقت اور عمر کی قیود و بند سے آزاد ہے ——— محبّت کا پھُول ہمیشہ شگفتہ رہتا ہے -

دوست!

جس سے مَیں پیار کرتا ہوں اور جو مجھ سے پیار کرتا ہے -

وہ میری آرزوؤں کا گہوارہ ہے ——— میری امیدوں کا سرچشمہ ہے ——— میری دلچسپیوں کا مرکز ہے - اس کی حسین اور معصوم آنکھیں -

جو میری منتظر رہتی ہیں ——— مجھے دیکھ کر چمک اُٹھتی ہیں - اُن کی چمک ——— اُن کی کشش ——— اُن کی معصومیت کبھی کم نہیں ہو سکتی -

اس کی محبّت سے طبیعت کبھی سیر نہیں ہو سکتی ——— محبت کی نشو و نما بے کراں ہے - محبت رُوح کا کھیل ہے ——— محبّت زندگی کی حقیقت ہے ——— حسن و عشق کے عناصر سے زندگی کی تعمیر ہوتی ہے ——— محبّت سے زندگی کی بیل پھلتی پھولتی اور پروان چڑھتی ہے ——— محبّت سے ہی قلبی سکون اور سرور حاصل ہوتا ہے ——— محبّت زندگی کی تکمیل ہے -

تشنۂ محبّت زندگی سے موت اچھی ——— مگر محبّت کی زندگی زندگی اور موت دونوں سے ہزار درجہ بہتر ہے -

ہماری تاریک زندگی میں صرف محبت ہی ایک روشن اور حسین پہلو ہے -

مگر اس کی روشنی زندگی کے سارے تاریک پہلوؤں کو روشن کر دیتی ہے -

محبت کرنا جرم نہیں ——— محبت نہ کرنا جرم ہے -

سنگین جرم ——— سنگین جرم ہی نہیں بلکہ سنگین گناہ بھی -

دوست!

(۲)

محبت سے میری زندگی میں ایک نئی تبدیلی آئی ——— محبت نے مجھے زندگی کا نیا راستہ دکھایا -

مَیں شرابی تھا - عیاش تھا - ظالم اور سنگ دل تھا -

محبّت میرے لئے شرافت اور پاکیزگی کا پیغام لے کے آئی - نیکی اور نرمی کا پیغام لے کے آئی -

مَیں بادۂ محبت سے مست تھا - مَیں نے بلوریں جام کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے - اب دوست اپنی آنکھوں کے جام میں میرے لئے محبّت کی صہبائے جاں فزا ڈھال دے -

انصاف، رحم، قربانی ——— سب محبت ہی کے عطیے تو ہیں

محبّت حسن کا سرچشمہ ہے -

حقیقی محبت میں -

دو دل کھل کر ایک پھول بن جاتے ہیں ——— دو جانیں مل کر ایک ہو جاتی ہیں -

زندگیوں میں موسیقی پیدا ہو جاتی ہے ——— کانوں میں ہر لمحہ حسین نغمے گونجتے رہتے ہیں -

محبت ایک نعمت آسمانی ہے -

دنیا محبّت ہی سے حسین ہے ——— آسمان محبّت ہی سے روشن ہیں -

جلوہ کا رحسن اپنی پاکیزہ شعاعوں سے تاریک دنیا کو روشن کرتا ہے - دنیا سے ظلم و ستم کو دُور کرتا ہے -

کائنات کی ہر چیز کو مقدس بناتا ہے -

محبّت کے بغیر -

دنیا تاریک ہو جائے ——— انسانی زندگی شرافت اور پاکیزگی - انصاف - رحم اور قربانی سے خالی ہو جائے ——— آرٹ بے جان ہو جائے ——— موسیقی بے معنی ہو جائے ——— موسیقی کے نغمے صرف نفسانی حرکات بن کے رہ جائیں -

زندگی کی حقیقت ایک تلخ دھوکا بن کے رہ جائے -

(۳)

زندگی کی گھٹا ٹوپ تاریکی میں صرف محبّت ہی روشنی کی ایک کرن بکر آتی ہے اور جہانِ امکان کے ذرّے ذرّے کو جگمگا دیتی ہے -

دنیا کی تاریک فضا میں محبّت کی روشنی ہی زندگی کا رستہ دکھاتی ہے

محبّت ستارۂ سرشام بھی ہے اور خندۂ رنگینِ سحر بھی -

اس کی روشنی بادشاہ کے محل میں بھی ہے اور غریب کی جھونپڑی میں بھی -

جہاں محبت کا شعلہ راجکمار کے دل میں روشن ہے۔ وہاں پریم کی شمع بھکارن کے دل میں بھی جل رہی ہے۔

محبّت سے دونوں کی زندگیاں سکون اور راحت حاصل کرتی ہیں۔

محبّت آرٹ کی جان ہے۔

محبّت شاعری اور فلاسفی کی رُوح ہے — محبت ادب کی رُوح ہے۔

عیش اور آرٹ کا بڑا قریبی رشتہ ہے — عشق کے بغیر آرٹ کا تصور ناممکن ہے — جذبۂ عشق کے بغیر بلند آرٹ کی تخلیق ناممکن ہے۔

بہترین شاعری عشق ہی کی پیداوار ہے — ادب اپنی نشو ونما اور عروج کے لئے عشق ہی کا شرمندۂ احسان ہے — محبّت کے بغیر ادب کانوں کے لئے بارِ زحمت بن جاتا ہے۔

آرٹ کیا ہے؟ — حُسن وعشق کی تاریخ۔

محبت دو دلوں کو ملا کر ایک کر دیتی ہے — محبت ہی سے ہر گھر کی آگ روشن ہے۔

محبّت ہی سے دنیا کی بنیادیں قائم ہوئیں — محبّت ہی سے اس ناپائدار دنیا کی بنیادیں قائم ہیں۔

سب سے پہلے محبت ہی نے دوامی زندگی کا خواب دیکھا تھا۔

زندگی محبت کے نغموں سے معمور ہے۔

موسیقی محبت ہی کی تو سامعہ افروز آواز ہے۔

جو غم کو خوشی میں — دُکھ کو سُکھ میں — پریشانی کو سکون میں بدل دیتی ہے۔ جو جھونپڑوں میں شاہی محلات کے ٹھنکے پیدا کر دیتی ہے۔ جو غریبوں کو بادشاہ بنا دیتی ہے۔

محبت اس حسین پھول کی خوشبو ہے جسے دل کہتے ہیں۔

محبّت کے پاکیزہ جذبے کے بغیر انسان حیوانوں سے بھی بدتر ہے۔ اور یہ دنیا دوزخ سے بھی ہولناک تر لیکن محبت کے پاکیزہ جذبہ کی وجہ سے یہ دنیا بہشت سے بہتر ہے اور انسان فرشتوں سے بھی بہتر۔

(۴)

زندگی کے وسیع صحرا میں چاروں طرف کانٹے اور جھاڑیاں ہی نظر آتی ہیں۔ زندگی کی کٹھن شاہراہ پر سوائے دکھ اور مصیبتوں کے کچھ نہیں۔ چاروں طرف تاریکی ہی تاریکی۔ قدم قدم پر مسلسل ناکامیاں اور مسلسل مایوسیاں ہماری منتظر ہیں — جو قدم قدم پر ہماری امنگوں کو پامال اور ہمارے ارادوں کو متزلزل کرتی ہیں — ہمارے قدم رُک جاتے ہیں۔ ہم آگے نہیں بڑھ سکتے — ہم دنیا کی جھوٹی تمائشوں میں کھو جاتے ہیں۔ جہاں ہمیں اپنی بھی خبر نہیں رہتی۔

کانٹوں اور جھاڑیوں کے اس صحرا میں صرف ایک حسین پھول ہے محبّت۔ صندل کی طرح انسان کے دل میں یہ پھول صرف ایک ہی بار کھلتا ہے۔

محبّت کا حسین پھول۔

تلخ زندگی کی پامال آرزوؤں کے کانٹوں میں کھل کر۔

انسان کی تشنہ و تاریک زندگی میں اس طرح ظاہر ہوتا ہے۔

جیسے طوفان میں چمکتا ہوا ستارہ

دو دلوں میں محبّت کا غنچہ مستور تھا۔

اچانک دو آنکھیں آپس میں ملیں — آنکھوں کے ملنے سے دل ملے — دو روحیں ملیں۔ دونوں مسکرا دئے — مسکرا کر پھر خاموش ہو گئے — اس خاموشی کے پردے میں ایک انقلاب رونما ہو رہا تھا۔

راہرو کے قدموں کی آواز سن کر دل کے اندر چھپا ہوا غنچہ کھل کر پھول بن گیا — دل میں ایک ہلچل سی پیدا ہوئی۔

محبت بیدار ہو گئی۔

محبت کا پھول پاس سے گزرتے ہوئے راہرو کے قدموں پر جھک گیا۔

راہرو نے اس محبوب اور حسین پھول کو آنکھوں کے راستے دل کی زریں خلوتوں میں چھپا لیا — وہ اس پھول کو اپنے ساتھ ہی لے گیا — اس زندگی کے صحرا کے اس پار — آگے ہی آگے — بہت آگے — کسی اور دنیا میں۔

وہ راہرو کتنا خوش نصیب تھا۔

زندگی کے اس خاردار صحرا میں صرف ایک مکمّل پھول ہے۔

"محبت"

ہماری اس تاریک زندگی میں روشنی کی صرف ایک ہی کرن ہے۔

"محبت"

اس ناامید زندگی کی مایوس گھڑیوں میں صرف ایک ہی خوش رنگ امید ہے۔

باقی سب کچھ صرف حسین دھوکہ ہے — ایک رنگین فریب ہے — پانی پر چلتا ہوا سایہ ہے۔ مایا ہے۔ محبّت انسان کے دل میں ایک بیش قیمت تحفہ ہے۔ جو خدا کی طرف سے انسان کو عطا ہوا ہے۔

محبّت کی خلش درحقیقت خدا کی ہستی کا ایک اعتراف ہے۔

محبّت کی ابتدا جسم سے ہوتی ہے۔ مگر اس کا اصلی مسکن رُوح ہے۔ اس کی بہت سی شکلیں ہیں مگر سب حسین۔ کوئی نہیں جانتا۔

یہ ستارہ کب اور کہاں سے شروع ہوا۔

اور کہاں اس کی آخری منزل ہے۔

چودھری منظور احمد منظور
بی اے ایل ایل بی

شکستِ امید

زندگانی کا گراں بار اُٹھائے سر پر
عرصۂ دہر میں بڑھتا ہی چلا جاتا تھا
جس جگہ گاڑے تھے غیروں کی قیادت نے علم
پھونک کر رکھتا تھا اُس راہ پہ میں اپنے قدم
بوجھ سے چور تھا منزل سے بہت دُور تھا میں
مجھ میں ہمت تھی کسی یاد سے مخمور تھا میں
کسی امید کا حاصل تھا سہارا مجھ کو
اسی امید پہ اک عمر گذاری میں نے
کہ بہت جلد بہت جلد تجھے پالوں گا
میں تجھے سینۂ بیتاب سے لپٹالوں گا
تیری پھیلی ہوئی باہوں میں سمٹ جاؤں گا
بھیگے ملبوس کی مانند لپٹ جاؤں گا
وہ تری آنکھیں وہ پُر نور ستارے جن پر
خضر و الیاس کا ہر آن گماں ہوتا تھا
قلزمِ وقت کی موجوں میں سفینہ اپنا
اِنہیں شمعوں کے اُجالے میں رواں ہوتا تھا

وشت و وادی میں انہیں پیشِ نظر پاتا تھا
یہ چراغِ سرِ منزل تھیں جدھر جاتا تھا
لوٹ کر آیا تو دیکھا کہ یہاں کچھ بھی نہیں
وہ فلک بوس محل اور وہ مکاں کچھ بھی نہیں
اب وہ آنکھوں کے چمکتے سے دیئے ہیں خاموش
وقت کے بس بھرے جھونکوں نے کئے ہیں خاموش
عرصۂ دہر کا اب مجھ سے سفر ناممکن
اَب وہ پُر ہول چٹانوں سے گذر ناممکن
آس وہ ٹوٹ گئی جس نے تسلی دی تھی
میری اِن خیرہ نگاہوں کو تجلی دی تھی
اَب یہاں ڈھیر ہیں مرجھائے ہوئے پھولوں کے
نہ وہ نزہت نہ وہ نکہت نہ وہ عشرت کا ہجوم
دیکھکر جس کو جھپکتی ہی نہ تھی چشمِ نجوم
اور کچھ پَر ہیں اِدھر سوختہ پروانوں کے
یہی کردار ہیں بھولے ہوئے افسانوں کے
جن سے منظور سجالوں گا میں ایوانِ خیال

از مس میری کیلے

کاشی ناتھ ایم۔ کنول

(آزاد ترجمہ)

جادو

افراد ڈراما:۔ (۱) بوڑھی عورت (۲) نوجوان عورت

منظر

[گاؤں کے ایک بہت ہی شکستہ جھونپڑے کا کمرہ۔ جو رسوئی اور بیٹھک دونوں کا کام دیتا ہے۔ دروازہ وسط میں دائیں طرف ایک کھلی بھٹی جس میں ایندھن جل رہا ہے، بائیں طرف ایک سادہ میز جس کے پیچھے ایک کرسی ہے۔ آگ کے نزدیک ہی ایک بہت پرانی کرسی ہے جس پر ایک بوڑھی عورت بیٹھی ہے اور گود میں رکھی ہوئی کسی چیز کی طرف دیکھتی ہوئی کچھ بڑبڑاتی ہے۔ کمرے میں صرف آگ کے مدھم شعلے کے سوا اور کچھ روشنی نہیں۔

پردہ اُٹھنے کے بعد ایک لمحے کے لئے کامل سکوت ہوتا ہے۔ پھر دروازہ کھلتا ہے اور تھکی ہوئی بے ہمت سی ایک نوجوان عورت داخل ہوتی ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک لالٹین ہے۔ جو وہ میز پر رکھتی ہے]

نوجوان عورت:۔ وہ چلی گئی!

بوڑھی عورت:۔ کون۔ گائے؟

نوجوان عورت:۔ ہاں .... وہ مرگئی!

بوڑھی عورت:۔ کیا بچھڑا زندہ تھا؟

نوجوان عورت:۔ نہیں۔ وہ مردہ ہی پیدا ہوا!

بوڑھی عورت:۔ اُف! اب کچھ بھی باقی نہ رہا۔

نوجوان عورت:۔ (دفعتہً چونک کر) بہت ہی بُرا ہوا ماں! بہت ہی بُرا۔ اب ہمارا کیا ہوگا؟ ہم امیر ہوتے تو گائے۔ بچھڑے۔ چوزے سب مرجاتے تو معمولی سی بات تھی اور ہمارے پاس پھر بھی بہت کچھ رہ جاتا ...... لیکن اب ہمارے پاس کچھ بھی نہیں ...... کچھ بھی نہیں؟

[بازوؤں کو میز پر ڈھیلا چھوڑتی ہوئی وہ اپنے آپ کو کرسی پر گرا دیتی ہے اور انتہائی رنج و غم کا اظہار کرتی ہے]

بوڑھی عورت:۔ یقیناً اب ہمارے پاس کچھ بھی نہیں! [لمحہ بھر کے لئے خاموشی۔ صرف نوجوان عورت کی رقت انگیز آہیں سنائی دیتی ہیں] لیکن اس طرح روتے رہنا فضول ہے۔ اس سے بیچارے حیوان واپس تو نہیں آئیں گے .... اب ہمیں کچھ نہ کچھ کرنا ہی چاہیئے!

نوجوان عورت:۔ تم بیہودہ باتیں کررہی ہو ماں! ہم اب کچھ نہیں کر سکتے .... ہم اب زندہ تو نہیں کرسکتے!

بوڑھی عورت:۔ یقیناً ہم اُنہیں زندہ نہیں کرسکتے ...... لیکن ادھر دیکھو پیاری! اس ساری مصیبت میں ہم کیوں گرفتار ہوئے؟

نوجوان عورت:۔ (از حد مایوس اور مغموم لہجہ میں) خدا کی مرضی اور کیا!

بوڑھی عورت:۔ آہ! یہ تمہاری بھول ہے۔ یہ مصیبت ہم پر خدا نے نہیں ڈالی۔ میں چالیس سال باقاعدہ گرجے میں جاتی رہی ہوں۔ اور مجھ سے کوئی ایسا فعل سرزد نہیں ہوا جس کی وجہ سے میں ایسی سخت سزا کی مستحق سمجھی جاؤں۔ وہ ہم سے بدلہ لینے کے لئے کبھی ایسی مصیبت میں ڈال نہیں سکتا۔ نہیں ہرگز نہیں!

نوجوان عورت:۔ تو پھر ہم نے کسی کا کیا بگاڑا ہے۔ جو ......

بوڑھی عورت:۔ آہ! جو کوئی بھی ہو۔ (دفعتہً خونخوار اور بھیانک لہجے میں) میں کہتی ہوں یہ شیطان کی مذموم حرکت ہے۔ اور ...... تمہارے گاؤں میں اُس کے بھی پرستار ہیں اور تمہارے خدا کے بھی!

نوجوان عورت:۔ تم کیا کہنا چاہتی ہو؟

بوڑھی عورت:۔ بچھڑے کس دن مرے تھے؟

نوجوان عورت:۔ سوموار کو۔

بوڑھی عورت:۔ اور چوزے؟

نوجوان عورت:۔ منگل اور بدھ کو۔ بدھ کی شام کو وہ سب مرے ہوئے پائے گئے۔

بوڑھی عورت:۔ آہ! .... اور پچھلی اتوار کو یہاں کون آیا تھا؟

نوجوان عورت:۔ صرف بوڑھی بیلے ینڈ کاٹ مجھے اچھی طرح یاد ہے

...... لیکن ماں! تمہارا اس سے مطلب ؟

بوڑھی عورت:- میرا مطلب اس کے نام سے تھا - میں نام جاننا چاہتی تھی اور یقیناً میں ایسا کرنے کی آج تک سعی کر رہی تھی - ورنہ کسی کا نام پوچھنے کی مجھے ضرورت نہ تھی -

نوجوان عورت:- ماں! ...... یہ کیوں ؟

بوڑھی عورت:- میں جانتی ہوں بیٹی! میں جانتی ہوں کیوں ؟ (مسکراتی ہے)

نوجوان عورت:- (خوفزدہ ہوتے ہوئے) یہ تمہاری گود میں کیا ہے ؟

بوڑھی عورت:- بیل کا دل!

نوجوان عورت:- (لمحہ بہ لمحہ بڑھتے ہوئے خوف سے مغلوب ہی ہوکر) کس لئے ؟ ...... آہ! ...... ماں! میں یہ پسند نہیں کرتی۔

بوڑھی عورت:- پیاری! میں اس میں سوئیاں چبھو دوں گی - اور پھر اسے آگ میں بھون لونگی (آگ پر رکھنے کے لئے نیچے جھکتے ہوئے) میں اسے راکھ بنا دوں گی۔

نوجوان عورت:- ماں!

بوڑھی عورت:- اور جب میں اسے آگ میں رکھوں گی - میری پیاری پھر...... پھر میں سب کچھ جانتی ہوں کیا ہوگا - سب کچھ!

نوجوان عورت:- (خوف سے سہم کر) ایسا نہ کرو ماں! ایسا نہ کرو! یہ شیطان کا کام ہے۔

بوڑھی عورت:- میں سب کچھ جانتی ہوں - اتنے ہی یقین کے ساتھ جتنا مجھے کتاب مقدس پر ہے اور جونہی آگ اس دل پر اثر انداز ہونا شروع ہوگی - تو ہمارا بدخواہ ہمارے دروازے پر ہوگا

نوجوان عورت:- ایسا نہ کرو ماں! میں ڈرتی ہوں!

[وہ اس گوشت کے ٹکڑے کو آگ سے نکالنا چاہتی ہے - لیکن بوڑھی عورت انتہائی غیظ و غضب کی حالت میں اُسے دھکا مار کر پیچھے ہٹاتی ہے]

بوڑھی عورت:- چھوؤ مت پگلی! اگر تم ایسا کروگی - تو میں تم سے نہیں بولوں گی اور مرتے دم میری بددعا تمہارا تعاقب کریگی۔

[نوجوان عورت خوف سے سہمی ہوئی میز کے ساتھ جا لگتی ہے] میں اپنے دشمن سے بدلہ لینا چاہتی ہوں اور کوئی طاقت مجھے ایسا کرنے سے روک نہیں سکتی -

[وہ آگ پر جھکی ہوئی کچھ الفاظ بڑبڑاتی ہے - تھوڑے وقفے کے لئے کامل سکوت ہوتا ہے - دروازے پر دستک ہوتی ہے - نوجوان عورت ایک دل دوز چیخ مارتی ہے - اور اپنے منہ کو ایپرن (APRAN) سے ڈھانپ لیتی ہے، بوڑھی عورت کھڑی ہو جاتی ہے اور اپنی نگاہیں دروازے پر گاڑ لیتی ہے - پھر دستک کی آواز آتی ہے - نوجوان عورت دوڑتی دوڑتی ماں کے قدموں پر جا گرتی ہے اور اپنا منہ اس کی گود میں چھپا لیتی ہے - بوڑھی عورت غصہ میں بیٹی کو جھنجھوڑتی ہے] کھڑی ہو جاؤ - نادان! [پھر کھٹکھٹانے کی مدھم سی آواز] کون ہے؟ [خاموشی] دروازہ کھولو - بے وقوف بچی!

نوجوان عورت:- (غشی کی حالت میں آنسو بہاتی ہوئی) میں! میں ایسا نہیں کر سکتی! ہرگز نہیں! ماں! مجھے ایسا نہ کہو!

بوڑھی عورت:- (اس کا بازو پکڑتی ہوئی) فوراً دروازہ کھولو (نوجوان عورت آہستہ اور بیدلی کے ساتھ اٹھتی ہے - اور ڈر کے مارے دروازے کے نزدیک ہی کھڑکی سے جھانکتی ہے - پھر دفعتہً چیخ مار کر بوڑھی عورت کے پاس آتی ہے] کیا ہے ؟

نوجوان عورت:- دروازے پر کوئی لیٹا پڑا ہے -

بوڑھی عورت لالٹین لے کر باہر جاتی ہے - جھک کر لالٹین کسی چیز پر رکھتی ہے - پھر مڑ کر کمرے کے وسط میں آ کھڑی ہوتی ہے - جوان عورت آگ کے نزدیک ہی جھکی ہوئی ناظرین کی طرف پیٹھ کر کے ماں کو دیکھتی ہے -

بوڑھی عورت:- یقیناً! وہ مری ہوئی ہے!

نوجوان عورت:- (تکلیف دہ دبی آواز سے) کون؟ ماں!

بوڑھی عورت:- (آواز میں بمشکل فتح کے اظہار کو چھپاتی ہوئی) سیلے بینڈ کاٹ!

(نوجوان عورت ایک دلدوز چیخ مارتی ہے اور زمین پر گرتی ہے)

(پردہ گرتا ہے)

تصحیح

شاہکار بابت ماہ جون میں ایک غزل چودھری منظور احمد صاحب منظور بی۔اے ایل ایل بی کے نام سے شائع ہوئی تھی - حالانکہ دراصل اس کے کار پرداز جناب منظور ایم۔اے ایم۔او۔ایل ہیں - چودھری صاحب کے ارشاد پر یہ تصحیح شائع کی جاتی ہے ہم دو سخن طرازوں کی ہمنامی ادارے کی اس فروگذاشت کا سبب بن گئی (ادارہ)

شاہزادہ احمد علی دُرّانی

غزل

چشمِ نظارہ باز تھی تیرِ نظر کو کیا کہوں
دل میں اُتر اُتر گیا روزنِ در کو کیا کہوں

عقل و خرد ہیں شعلہ ور ابرِ کرم کو کیا ہُوا
خرمنِ ہوش جل گیا برقِ نظر کو کیا کہوں

کیفِ نگاہِ یار سے رات تھی میکدہ بدوش
نرگسِ نیم باز کے فتنہ و شر کو کیا کہوں

رونقِ کارگاہِ دل بنتے ہی ہائے مٹ گئی
تیرے کرم کو کیا کہوں تیری نظر کو کیا کہوں

کشتِ امید زیرِ آب، آرزوئے دلِ خراب
نقش بر آب ہو گئی، دیدۂ تر کو کیا کہوں

سرد پڑی ہے انجمن جل کے ہُوا ہے دل کباب
ساقیٔ آتشیں فروش! خونِ جگر کو کیا کہوں

کاکلِ یار مشکبیز، روئے نگار دلفریب
عالمِ عشق و حُسن کی شام و سحر کو کیا کہوں

دیدہ و دل کا ہیں لہو حُسن کی لاجوابیاں
خُونِ شفق کا رنگ ہے نُورِ سحر کو کیا کہوں

لغزشِ طفلِ اشک نے دل کی بنی بگاڑ دی
لختِ جگر کو کیا کہوں! نُورِ نظر کو کیا کہوں

کتنی نگاہ فریب ہے عالمِ حُسن کی نمود!
تیری کمر کا وہم ہے اپنی نظر کو کیا کہوں

قصۂ دل ہوا تمام سیلِ سرشک سے میرے
کارِ حباب کر گیا کاسۂ سر کو کیا کہوں

فتنے جگا کے رکھ دیئے نیند حرام ہو گئی
کس نے حلال کر دیا، مرغِ سحر کو کیا کہوں

مست کا اعتبار کیا! شیشۂ دل نہ توڑ دے!
پھرتی ہے یوں لئے لئے تیری نظر کو کیا کہوں

غیر معروف جرنلسٹ

طرزِ جدید کا افسانہ

نالہ پابندِ نے نہیں ہے

یوں معلوم ہوتا تھا گویا سنتری کو ڈھال کر خاکی وردی کے قالب میں ڈال دیا گیا ہے۔ وردی اس کے بیڈول اور بھاری بھر کم جسم کا جزو بن گئی تھی۔ اس نے موٹر کار کا ہڈ اٹھایا اور موٹر انجن کا نمبر نوٹ بک پر درج کر لیا۔ صبح کا وقت تھا اور کڑاکے کی سردی بے خوابی سے سنتری کے پپوٹے اس کی چھوٹی چھوٹی گول آنکھوں کو بار بار ڈھانپ رہے تھے۔ اب اس نے پچھلی نشست کا جائزہ لینا شروع کیا۔ برف پر دوڑنے کے لئے پہیہ دار فولادی سینڈل اور لمبی نوک دار چھڑی۔ پھر اس نے موٹر والے کی طرف دیکھا۔ ننگے سر نوجوان لہراتے ہوئے بال۔ منہ میں سگرٹ ہولڈر جس پر سنہری بند لگے ہوئے تھے۔ نام پارکر سٹیفن پارکر۔

سنتری نے کہا:۔ "امریکن؟"

نوجوان نے اثبات میں سر ہلایا۔ یہ امریکن سیاح بھی عجیب لوگ ہیں۔ فروری کا وسط ہے۔ زمہریری ہوا کے جھونکوں میں یہ نوجوان کھلے سپورٹس موڈل میں ننگے سر بے تحاشا موٹر چلا رہا ہے۔ خیر۔ وہ جانے اور اس کا کام۔

سنتری نے کہا:۔ "جب آپ دوبارہ یہاں سے گزریں گے۔ تو آپ مجھے یہاں نہیں پائیں گے اور غالباً یہ سرحد بھی نہ رہے گی۔" سنتری نے پُل کا دروازہ کھولا۔ موٹر حرکت میں آئی۔ نوجوان نے بے پروائی سے پوچھا:۔ "میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔" سنتری نے نازی انداز میں بازو اٹھاتے ہوئے نعرہ لگایا:۔ "ہائیل ہٹلر" اور کہا:۔ "پُل کے دوسری طرف آسٹروی سپاہی سے پوچھ لینا۔"

پُل کے پار آسٹریا کی سرحد شروع ہوتی تھی۔ چونگی خانہ کے افسر نے سٹیفن کا پاسپورٹ دیکھا۔ "آپ کے پاس کوئی قابل محصول چیز تو نہیں۔ خوش آمدید۔" سٹیفن نے اس سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ "یوں محسوس ہوتا ہے۔ گویا میں اپنے وطن میں آ گیا ہوں۔ مجھے سالسبرگ جانا ہے۔ جہاں آپ کے ہم وطن مشہور ماہر موسیقی موزارٹ کی برسی پر دنیا بھر کے راگی جمع ہو رہے ہیں۔"

"لیکن جلسہ تو گرمیوں میں ہوگا۔" آسٹروی افسر نے کہا۔

"ہاں اس اثنا میں اس خوبصورت سرزمین کی سیر کروں گا۔"

"اور عیش" افسر نے ہنستے ہوئے کہا۔

"میں نے آسٹروی شراب کی بہت تعریف سُنی ہے۔ جو دیکھنے میں قوس و قزح کے بوقلموں رنگوں سے زیادہ دلفریب اور ذائقہ میں۔۔۔۔۔"

"بادۂ عشق سے زیادہ کیف زا ہے۔ میرے دوست اور یہاں کی عورتیں۔۔۔۔۔" آسٹروی افسر نے ابھی بات ختم نہ کی تھی۔ کہ سٹیفن نے اسے سگرٹ پیش کرتے ہوئے کہا۔ "ہاں ہاں یہ مجھے معلوم ہے آسٹریا کی عورتیں حسن و جمال کا مجسمہ ہیں اور جس عورت نے مجھے جنم دیا وہ اسی حسن خیز خطہ کی رہنے والی ہے۔"

سٹیفن کو اپنی ماں کے الوداعی الفاظ یاد آ گئے۔ تختۂ جہاز پر اس نے سٹیفن کی پیشانی پر بوسہ دیتے ہوئے کہا تھا۔ "خدا کے لئے پہلی لڑکی کو دیکھتے ہی اس سے اظہار محبت نہ شروع کر دینا۔ اگر شادی کا ارادہ ہو تو ایسی بہو کو یہاں لانا جو ہمارے خاندان کی شان کے شایاں ہو۔" باپ نے مسکراتے ہوئے ازراہِ تائید کہا تھا۔ "ہاں ہاں جو رنگ روپ میں تمہاری ماں سے کسی صورت کم نہ ہو۔" پھر کسی قدر متین انداز میں کہا "بیٹا ذرا دنیا کے رنگ ڈھنگ دیکھ آؤ۔ واپس آنے پر تمہیں کاروبار سونپ کر میں آرام کرنا چاہتا ہوں۔" ہاں سٹیفن کی ماں نے یہ بھی کہا تھا:۔ "اور میری جنم بھومی سالسبرگ کو میرا سلام کہنا۔ صدر بازار کے چوک میں اس تاریخی درس گاہ کو نہ بھولنا جہاں استادِ اعظم موزارٹ کے جانشین ابھی تک اس کی موسیقی کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ دُور دور سے لوگ سالسبرگ کی یاترا کو آتے ہیں۔"

(۲)

والد کے مشورہ کے مطابق وہ سیدھا سالسبرگ کے سب سے بڑے ہوٹل میں پہنچا اور چار ماہ کے لئے ایک کمرہ ریزرو کرا لیا۔ گرمیوں میں سالسبرگ کے بازاروں میں کھوے سے کھوا چھلتا ہے اور ایک امریکن کروڑپتی کے لئے بھی چھوٹا سا کمرہ کرایہ پر لینا محال ہو جاتا ہے۔ اب فروری کا وسط تھا اور سالسبرگ کا کوہستانی قصبہ برف کی چادر میں لپٹا ہوا ٹھٹھر رہا تھا۔ ہوٹل کے مینیجر نے کہا۔ "میرے معزز مہمان خدا

موسم بہار کا انتظار کرو - دیکھتے دیکھتے یہ برف زار ایک جلوہ زار بن جائے گا - ابھی سکیٹنگ کا موسم ہے - برف کی طرح گوری چٹی نوجوان عورتوں کے جھنڈ کے جھنڈ برفانی وادیوں میں گرمیٔ ہنگامہ پیدا کر رہے ہیں - اور ہر امریکی سیاح کو سونے کی کان سمجھ کر اس کے دل کی معصوم گہرائیوں کو اپنے لانبے حنا دیدہ ناخنوں سے کریدنا شروع کر دیتی ہیں - ذرا سوچ بچار کر قدم اٹھانا ان وادیوں میں -"

سٹیفن نے ڈنر کے بعد بڑے بازار کا رُخ کیا اور اس مشہور عمارت کے برآمدہ میں وہ ایک لمحہ کے لئے رُک گیا - جہاں اس کی ماں موزارٹ اکیڈمی میں گانا سیکھا کرتی تھی - مرکزی ایوان سے نغمے کی آواز اٹھی - سٹیفن نے آنکھیں بند کر لیں - سالسبرگ کا مشہور گانا -

اس نے بارہا اپنی ماں سے سُنا تھا - لیکن اس تازہ نغمے میں شباب کی حرارت اور عشق کی دعوت تھی - تھوڑی دیر بعد تیز و تند ترانوں میں ایک بھاری اور گہری آواز شامل ہو گئی - مردانہ آواز صاف اور مترنم - سٹیفن نے جھلّا کر آنکھیں کھول دیں - تخیّل کا طلسم ٹوٹ گیا " اس کی ماں تو کسی اجنبی کے ساتھ مل کر گانا نہیں گا سکتی " وہ برآمدہ کی نیم تاریکی میں اِدھر اُدھر گھومنے لگا پھر وہ درمیانی کمرے کی کھڑکی تک آیا - اس نے دیکھا کہ ایک شخص پیانو بجا رہا ہے - لمبے لمبے گھنے سیاہ بال بظاہر اس کی جوانی قبل از وقت ڈھل چکی تھی - ایک نوجوان لڑکی اس کے پاس کھڑی گا رہی تھی " لڑکی کے تر و تازہ شباب کے مدِمقابل یہ چہل سالہ استاد کس قدر سن رسیدہ معلوم ہوتا ہے -" سٹیفن نے دل میں کہا - کمرے میں ان دونوں کے سوا کوئی اور نہ تھا - استاد نے کہا :- "مس نینا تمہارا گلا سبحان اللہ کیا نورانی ہے اور راگ کس درجہ پُر درد - آخر کیوں ؟"

مس نینا کا جواب ایک سوال کی صورت میں تھا " میرے استاد یہ بتائیے کیا سال بھر میں مَیں گانا سیکھ سکوں گی -"

"ہاں - لیکن تمہاری آواز میں یہ گریہ انگیز لہر کیوں ہے - بہار میں خزاں کیسی "

" مجھے گھر والوں نے واپس بلا بھیجا ہے - مَیں فیس ادا نہیں کر سکتی - افلاس - قرض -"

استاد اٹھا - اس نے اپنے دونوں ہاتھ لڑکی کے سر پر رکھ دیئے "تمہیں فیس ادا کرنے کی ضرورت نہیں - مجھے تم سے محبت ہے -" اس نے کہا -

سٹیفن نے دیکھا کہ لڑکی یکا یک پیچھے ہٹ گئی - اس کی بڑی بڑی آنکھیں دہشت و حیرت کی ترجمان بن گئیں - پھر اس نے بے اختیار کہا :- " یہ ناممکن ہے - تم میرے استاد ہو - میرے باپ کی طرح قابلِ احترام - میں تم سے محبت نہیں کر سکتی . . . . آہ ! اب میری زندگی کا خواب پورا نہ ہو گا - موسیقی کے بغیر میرے لئے جینا محال ہے -"

وہ ایک ہرنی کی طرح جس نے شکاری کو دیکھ لیا ہو - دیوانہ وار اِدھر اُدھر گھومنے لگی - پھر اس نے جوشیلے انداز میں کہا :- " تم موزارٹ کے جانشین تمہاری شہرت یورپ اور امریکہ کے کونہ کونہ تک پھیلی ہوئی ہے - اور اب گرمیوں میں سالانہ تقریب پر . . . . . ."

استاد نے کرب آلود لہجے میں یہ کہہ کر فقرہ ختم کر دیا :- " ایک طوفان اٹھنے والا ہے - جس میں میرے ایسے ہزاروں خس و خاشاک کی طرح بہہ جائیں گے "

" آخر کیوں ؟ میں آپ کا مطلب نہیں سمجھ سکی " لڑکی نے حیرانی سے پوچھا -

" اس لئے کہ مَیں یہودی ہوں - اور مرنے سے پہلے مَیں تمہاری مرمریں باہوں کو اپنی گردن میں حمائل دیکھنا چاہتا ہوں -"

یہ کہہ کر استاد بازو پھیلائے ہوئے لڑکی کی طرف بڑھا - عین اس وقت اس کی نظریں سٹیفن پر پڑیں - جو کمرے میں داخل ہو رہا تھا - استاد نے مُڑ کر دیکھا اور رُک گیا - سٹیفن نے آگے بڑھ کر کہا :- " اس گستاخانہ جسارت کے لئے معافی چاہتا ہوں - مَیں اس درسگاہ کی زیارت کئے بغیر نہ رہ سکا - جہاں ۲۲ سال پہلے آپ لوگوں کی ایک ہم وطن سرزمین آسٹریا کا محبت انگیز ترانہ گا رہی تھی - اور ایک امریکن سیاح بازار سے گزرتا ہوا اس کی سحرکارانہ کشش سے بے اختیار کھچا آیا - اور گانے والی کا ہمیشہ کے لئے والا و شیدا بن گیا - وہ گانے والی میری ماں تھی -

استاد نے نووارد اجنبی کی طرف غور سے دیکھا اور پوچھا " کیا نام تھا اس کا "

" ایبرہارٹ ! "

ایبرہارٹ ! " استاد نے اپنے سیاہ گھنے بالوں کو کھینچ کر اپنی پیشانی اور آنکھوں کو ڈھانپ لیا - اور زیرِلب کہا :- " ایبرہارٹ - مجھے یاد ہے ۲۲ سال گذرے - میں اس وقت اس اکیڈمی کا جونیئر پروفیسر تھا . . . . . خیر "

تھوڑی دیر کے لئے اس پر سکوت طاری رہا - پھر اس نے لڑکی سے کہا - آؤ ہم دونوں مل کر سرزمین آسٹریا کا محبت انگیز ترانہ گائیں -

(۳)

"میں آج پہلی مرتبہ اپنی والدہ کی حکم عدولی کا مجرم ہوں"۔ سٹیفن اور نینا اکیڈمی سے باہر آ رہے تھے۔ نینا نے کہا: "میں تمہارا مطلب نہیں سمجھی۔" سٹیفن نے جواب دیا "ماں نے متنبہ کیا تھا: "دیکھنا سالسبرگ میں پہلی لڑکی کو دیکھتے ہی کہیں اس پر فریفتہ نہ ہو جانا۔ یوں معلوم ہوتا ہے گویا ہم سالہا سال سے اکھٹے رہے ہیں۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں میری جان! ہمارے امریکہ میں ایسے موقع پر تکلفات سے کام نہیں لیا جاتا میں سالانہ تقریب تک تمہارے جواب کا منتظر رہوں گا۔ اس دوران میں مجھے وائینا اور بوڈاپسٹ جانا ہو گا۔"

وہ ہوٹل کے سایۂ دیوار میں آدھی رات تک باتیں کرتے رہے۔ یوں کہنا چاہیئے کہ سٹیفن باتیں کرتا رہا۔ "میں ایک ہفتہ تک باہر جاؤں گا۔ تم مجھے روزانہ ملو گی نا۔ آؤ میرے کمرے میں ...... اچھا ابھی نہ سہی۔ جرمن زبان میں بات چیت کرنے کا سلیقہ آ جائے گا ..... میں تمہیں مجبور نہیں کرتا۔ ہمارے ملک میں یہ مثل مشہور ہے کہ امریکن خاوند خدا کی بہترین نعمت ہیں ... مطلب یہ کہ وہ رات دن روپیہ کمانے میں مصروف رہتے ہیں اور دنیا کے جہان کی دولت اپنی بیویوں کے قدموں پر ڈال دیتے ہیں ..... میں بعض اوقات سوچتا ہوں کہ حجاب اور شوخی کی کشمکش نے تمہارے چہرے میں کتنی دلکشی پیدا کر دی ہے۔ ...... مجھے معلوم نہیں کہ رخصت ہونے وقت یہاں مودبانہ طور پر سر جھکا دینے کا دستور ہے۔ یا بوسہ لیا جائے۔ ہاتھ کا بوسہ لیا جائے۔ یا منہ چوم لیا جائے ...... اچھا ہاتھ کا بوسہ لیتے وقت ایک گھٹنا زمین پر ٹیک دینا کافی نہ ہو گا یا مؤدبانہ ہونا ضروری ہے۔

سٹیفن نے جھک کر اس کے ہاتھ پر بوسہ دیا۔ اور دوڑتا ہوا اپنے ہوٹل میں داخل ہو گیا۔

وی آنا اور بوڈاپسٹ کی ہنگامہ پرور رنگین راتیں ڈینیوب کے کناروں پر قہوہ خانوں کے صحن میں جیسی نغمے جن کے ہوشربا زیروبم سے کبھی دل زور سے دھڑکنے اور کبھی ساکت ہونے لگتا ہے۔ اوپرا تھیئٹر اور شاہانہ مناظر غرضیکہ آسٹریا، ہنگری اور چیکوسلاویکیہ کی زندگی کا کوئی پہلو نہ ہو گا جسے سٹیفن نے اکیس سالہ تعلیم یافتہ اور متمول امریکن سیاح کی نظروں سے نہ دیکھا ہو۔ ابھی موزارٹ کی برسی میں دو ہفتے باقی تھے کہ وہ سالسبرگ میں دوبارہ داخل ہوا۔ اب شہر میں چہل پہل تھی۔ موسیقی کے جلسے شروع تھے۔ ہر حصص یورپ کے دلدادگانِ موسیقی سالسبرگ میں جمع ہو رہے تھے۔ موزارٹ اکیڈمی کے ہال میں استاد فرانز وولف کے شاگرد، مداح احباب اور معاصر جوق در جوق آتے۔ میونخ کا مشہور موسیقار ہانس ہم باخ بھی آیا۔ نازی حکام نے در پردہ اس کے رستہ میں قدم قدم پر مشکلیں حائل کر دیں لیکن جس کی روح نغمات کے لئے تڑپ رہی ہو۔

وہ کب پروا کرے گا۔ شدید سیاسی اختلافات کے باوصف فنِ موسیقی نے انہیں یکجا کر دیا۔ حکومتیں ایک دوسرے کو غضبناک نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں۔ لیکن آرٹ کے یہ پرستار جھوم جھوم کر ایک دوسرے کے فن کی داد دیتے تھے موسیقی کا یہ ہال ان کے لئے پناہ گاہ اور ایک مقدس استھان بن گیا۔ جس کی چار دیواری میں انہوں نے اپنے اپنے قومی اور نسلی تعصبات کو لباس کہنہ کی طرح اتار پھینکا۔ استاد فرانز وولف خوب گایا اور ایک لمحہ کے لئے اس نے مس نینا اور سٹیفن کی طرف دیکھا تو ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ہمہ تن گوش تھے۔

(۴)

یکایک فرانز رک گیا اور اس کے دل کی گہرائی سے نکلا ہوا بلند بانگ نغمہ ہوا میں معلق رہ گیا۔ جس طرح پوری تیزی سے اڑتا ہوا پرندہ گولی لگنے پر ایک لمحہ کے لئے ہوا میں ساکت ہو جاتا ہے۔ فرانز نے دایاں ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا سنو۔ دور سے شور سنائی دیا۔ کوچ کرتے اور گاتے ہوئے سپاہیوں کے کوچ کی آواز جو ہر لحظہ قریب آ رہی تھی۔ گویا کوہستانی دریا بند توڑ کر ایک خوفناک سیل کی صورت اختیار کر رہا ہے۔

مجمع پر سکوت طاری ہو گیا۔ اور فوجی نغمے پنچم سروں میں اس بزمِ موسیقی پر مسلط ہو گئے۔ استاد فرانز نے سر ہلاتے ہوئے کہا اب آپ اور قسم کی موسیقی سنیں گے جس کے لئے رباب اور وائلن اور پیانو کی بجائے مشین گن بم اور طیاروں سے کام لیا جاتا ہے۔ ہم لوگ گاتے ہیں۔ تو سننے والے کے تارِ حیات سے کیف آفریں نغمے روح کو وجد میں لاتے ہیں۔ اور اب ....

"وہ آ گئے۔ اب خبر نہیں۔ کیا ہو گا۔ بیٹھے رہو۔ سنو خاموش" کی غیر مربوط آوازوں میں دروازہ کھلا اور نازی سپاہی ہال میں داخل ہوئے۔ وہ قطار باندھے دیواروں سے متصل کھڑے ہو گئے۔ گویا انہوں نے مجمع کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ بڑے دروازے کے قریب ایک بلند پلیٹ فارم تھا۔ جہاں پیانو رکھا تھا۔ اور اس فوجی

مظاہرہ سے پیشتر سامعین استاد فرانز کے فن کی داد دے رہے تھے۔ لوگوں کی حیرانی خوف میں بدل رہی تھی کہ ایک نازی افسر پلیٹ فارم پر فرانز کے قریب آیا اور اس نے پوچھا " فرانز وولف تمہارا نام ہے" اثبات میں جواب ملنے پر اس نے ایک لفافہ فرانز کے سپرد کیا اور کہا۔ میں تمہارے جواب کا منتظر ہوں۔ فرانز نے مضطربانہ عجلت کے ساتھ لفافہ کھولا اور چھٹی پڑھنے کے بعد اس نے بآواز بلند کہا :۔ "جواب ابھی سن لو۔ نہیں نہیں نہیں۔ جب تک ہمارے جسم میں خون کا آخری قطرہ باقی ہے دنیا کی کوئی طاقت ہمیں روک نہیں سکتی۔" یہ کہہ کر فرانز نے لفافہ واپس کر دیا۔ نازی افسر کے اشارہ پر ایک سپاہی قریب آیا۔ جس نے جیب سے کارڈ نکالا۔ افسر نے یہ کارڈ استاد فرانز وولف کو دیتے ہوئے کہا۔ "تمہارے انکار کی یہ سزا ہے کہ تمہیں اسی وقت اس مجمع میں جرمنی کا قومی ترانہ گانا ہوگا۔ ورنہ اس پلیٹ فارم پر تمہاری لاش تڑپتی نظر آئے گی۔"

فرانز نے مجمع کے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ پھر اس نے پکار کر کہا " وہ قوم جس نے موزارٹ سا موسیقار پیدا کیا کبھی دب نہیں سکتی۔ تم لوگ مجھے ہلاک کر سکتے ہو۔ لیکن تمہارا قومی ترانہ میری زبان پر جاری نہ ہوگا۔ نہ ہوگا۔"

اس کے ساتھ ہی اس مجمع عظیم میں غیر معمولی جوش پیدا ہو گیا۔ نازی افسر کی چال ناکام رہی۔ اس نے اپنے سپاہیوں کو اشارہ کیا۔ اور وہ ایک ایک کر کے باہر نکل گئے۔ "آخر کیا معاملہ ہے۔ ان نازیوں کو ہمارے جلسے میں آنے کی کیوں کر جرأت ہوئی۔ حکومت کیا کر رہی ہے۔ پولیس کہاں ہے۔ آسٹریا زندہ باد فرانز زندہ باد....."

شور کم ہوا۔ فرانز نے پیانو پر مختلف چیزیں سنائیں۔ میونخ کے موسیقار "ہانس ہم بارخ" نے نہایت دلکش اوپیرا کا اہتمام کیا اور یہ بزم رات کے دو بجے ختم ہوئی۔

بطور حفظ ما تقدم سٹیفن اور نینا نے یہی مناسب سمجھا کہ وہ استاد فرانز وولف کو اپنے ساتھ ہوٹل میں لے جائیں۔ وہاں ہوٹل کے مینیجر کے ساتھ مشورہ ہوا۔ ہوٹل کے پچھواڑے سے یہ تینوں شہر سے باہر نکل گئے اور مینیجر خود موٹر کار لئے مقررہ مقام پر پہنچا۔ سٹیفن نے کہا میرے پاس پاسپورٹ ہے۔ اب چیکوسلاویکیہ کا رخ کرنا چاہیے صبح کاذب کی دھندلی لکیریں آسمان پر نمودار ہوئیں۔ سرحد قریب آ رہی تھی۔ وہ یکایک چونک اٹھے۔ ایک گولی سنسناتی ہوئی موٹر کار کے قریب سے گذر گئی۔ یہ سگنل تھا۔ کہ ٹھہر جاؤ۔ ورنہ تمہاری خیر نہیں فرانز نے کہا۔ "تم موٹر کو روک لو۔ بحث کا وقت نہیں۔ میں ان سے تنہا نپٹ لوں گا۔ سٹیفن فضول باتیں نہ کرو۔" ایک اور گولی زیادہ قریب سے گذر گئی۔ نینا میری جان نینا خوش رہو۔" موٹر کار ٹھہر گئی۔ فرانز نے نینا کی پیشانی پر بوسہ دیا " سٹیفن اسے خوش رکھنے کی کوشش کرنا۔ خوش رہو الوداع۔"

سٹیفن نے موٹر کار کو تیز کیا۔ وہ سرحد پر پہنچ گئے۔ وہاں سے رخ پھیرتے ہوئے انہوں نے دیکھا کہ فرانز دونوں ہاتھ بلند کئے سڑک کے درمیان کھڑا ہے۔ اتنے میں بندوق کی آواز آئی۔ گولی فرانز کے سینے میں پیوست ہو گئی۔ آسٹریا زندہ باد کا نعرہ لگاتے ہوئے وہ زمین پر گر گیا۔

ضروری گذارش

مضمون نگار حضرات سے گذارش ہے کہ مضمون کاغذ کے ایک طرف لکھیں۔ مضامین صاف اور خوشخط ہونے چاہئیں تاکہ ادارے کو پڑھنے میں سہولت ہو۔ نیز اپنا پتہ صاف اور خوشخط لکھیں۔

(ادارہ)

پروفیسر عبدالسلام اختر ایم اے
(ناگپور یونیورسٹی)

سب اپنی دُھن میں مگن تھے لیکن مجھے تمہیں یاد آرہی تھیں

سحر کی بھیگی ہوئی شعائیں چمن چمن جگمگا رہی تھیں
بہار نغمے الاپتی تھی گھٹائیں گھر گھر کے آ رہی تھیں
طلسم خاموش تھا مسلط اگرچہ ہر نفس زندگی پر
نفس نفس کے خموش سینے میں شوخیاں مسکرا رہی تھیں
سب اپنی دُھن میں مگن تھے لیکن مجھے تمہیں یاد آرہی تھیں

ٹپک رہے تھے ہوا سے پیہم مسرتوں کے حسیں ترانے
افق پہ اُترا ہُوا سا جوبن۔ روش پہ آئے ہوئے زمانے
چمن کے اک جھنڈ کے تلے چند بھیگے پتوں کی آڑ لیکر
سحر کا تارہ سنا رہا تھا گذشتہ شب کے حسیں فسانے
سب اپنی دُھن میں مگن تھے لیکن مجھے تمہیں یاد آرہی تھیں

وہ جدوجہدِ حیات کا دم بدم اُبھرتا ہوا سا پارا
خموشیوں کا سکوں سے اٹھنا جنوں کا لیتے ہوئے سہارا
وہ راہ چلتے ہوئے مسافر کوئی یہاں پر کوئی وہاں پر
کہیں پہ دبتی ہوئی امیدیں کہیں پہ اٹھتا ہوا شرارا
سب اپنی دُھن میں مگن تھے لیکن مجھے تمہیں یاد آرہی تھیں

وہ دن بھی آئیگا جب تمہیں داستانِ فرقت سناؤنگا میں
کہاں کہاں کسطرح سے گذری یہ حال سارا بتاؤنگا میں
حقیقتیں جب مجاز کی بندشوں سے آزاد ہونگی اختر
تمہیں بٹھا کر قریب اپنے یہ آپ بیتی سناؤں گا میں
سب اپنی دُھن میں مگن تھے لیکن مجھے تمہیں یاد آرہی تھیں

تعلیمات

عبدالحلیم انصاری

چند اہم مسائل

جنگ کا اثر

جنگ کا تعلیمی نظام پر کیا اثر ہوا ہے؟ جنگ کے ماحول میں جو طلبا تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ ان کی ذہنی نشو و ارتقا کا رجحان کیا ہوگا؟ جنگ کے بعد جو حالات رونما ہوں گے۔ ان سے عہدہ برآ ہونے کے لئے کس قسم کی تعلیم کی ضرورت ہے؟

یہ چند سوال ہیں۔ جن کا جواب ہندوستانیوں کے لئے کچھ کم اہمیت نہیں رکھتا۔ برطانوی کابینہ کے لیبر ممبر مسٹر بیون نے "ڈیلی ٹیلیگراف" کے نمایندہ سے کہا۔ کہ جنگ کے باعث برطانیہ کی درسگاہوں میں ایک قسم کا جمہوری عنصر داخل ہوگیا ہے اور اس کا نتیجہ بہ درجہ آخر خوشگوار رہے گا۔ دورانِ جنگ میں بعض تعلیمی اداروں کو نقصان پہنچا ہے۔ اور عظیم جنگی مصارف کے باوجود دُور اندیشی کا تقاضا ہے کہ ہم اپنے بلند تعلیمی معیار کو قائم رکھنے کی انتہائی کوشش کریں۔ ہمارا عزیز ترین قومی سرمایہ ہمارے بچے ہیں۔ اگر ہم واقعی ایک بہتر سماجی اور سیاسی نظام کی خاطر لڑ رہے ہیں۔ تو ہمارا فرض منصبی ہے۔ کہ ہم اپنے آیندہ شہریوں کے لئے بہترین ذہنی تربیت کا انتظام کریں۔ اور انہیں نئی دنیا میں تعمیری کام کرنے کے قابل بنائیں۔

مسٹر بیون نے ایک اور بصیرت افروز نکتہ پیش کیا اور وہ یہ کہ مشینوں کی فضا میں سانس لینے والے خود مشین بن جاتے ہیں۔ ان کے دل و دماغ میں ایک ہی قالب میں ڈھلے ہوئے پرزوں کی سی یکسانی اور یک رنگی پیدا ہونے لگتی ہے۔ ان کی شخصیت میں تنوع نہیں رہتا۔ موجودہ جنگ کے دوران میں خصوصیت کے ساتھ مشینوں نے انسانی شخصیت کے سامنے ایک زبردست محاذ قائم کر رکھا ہے۔ ہم کھانا مشینوں کے ذریعہ پکاتے ہیں۔ برتن مشینوں کے ذریعہ دھوتے ہیں۔ خبریں پہنچانے سنانے اور سننے کے لئے مشینیں ہیں۔ شعر و نغمہ سے لطف اندوز ہونا ہو تو ریڈیو حاضر ہے۔ ایسے ماحول میں تمام لوگ ایک ہی سطح پر آجاتے ہیں۔ اس کا علاج کیا ہے۔ مسٹر موصوف کے الفاظ میں انسانی روح میں غیر محدود ترقی کے امکانات پوشیدہ ہیں۔ وہ ماحول سے بالاتر ہوکر پرواز کر سکتی ہے۔ ہمیں ایسی تعلیم کی ضرورت ہے جو ماحول کے قید و بند سے ہماری آتما کو آزاد کردے۔ ہماری قوتِ متخیلہ بروئے کار آئے۔ اور ہم میں نقل و تقلید کی بجائے تخلیق کی طاقت پیدا ہو۔

خود اعتمادی

صحیح تعلیم کی بنیادوں کو استوار کرنے میں اس امر کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ بچے کی جسمانی اور ذہنی تربیت پر مصنوعی بندشیں عائد نہ کی جائیں۔ ڈاکٹر میریا مونٹیسوری اپنی معرکہ آرا تصنیف "رازِ طفولیت" (The Secret of Childhood) میں اس بات کی شاکی ہیں کہ بچے سیڑھیوں پر خود چڑھنے کے لئے مچل رہے ہیں لیکن ہم انہیں زبردستی گود میں اٹھا کر اوپر لے جاتے ہیں۔ وہ پیدل چلنے پر مصر ہیں لیکن ہم انہیں بچہ گاڑی میں بٹھا دیتے ہیں۔ ڈاکٹر موصوفہ کا بیان ہے۔ کہ ایک تندرست سہ سالہ بچہ کو کھلا چھوڑ دیا جائے۔ وہ ایک میل تک پیدل چل سکتا ہے۔ اب ہر ترقی یافتہ درسگاہ میں بچوں کے چڑھنے کے لئے موزوں قسم کے زینے ہیں۔ جنہیں عبور کرنے میں بچے جسمانی اور دماغی نشو و نما کے ساتھ ساتھ ذہنی مسرت محسوس کرتے ہیں۔

ایک سوال کا جواب

بچے پوچھتے ہیں۔ "ننھا کہاں سے آگیا؟" انہیں جواب ملتا ہے۔ "دایہ لے آئی" "کہاں سے لے آئی؟" "ہسپتال سے" "کہاں سے۔ ہسپتال سے۔ وہ کیا ہے؟" جواب میں خاموشی کے سوا والدین کو کچھ سوجھتا نہیں۔ ایسے سوالات کا مناسب جواب دینا چاہئیے۔ دایہ گری سے متعلق ایک ماہوار امریکن رسالہ کے ایڈیٹر ڈاکٹر لورے نے بچوں کے تعلیمی ادارے میں یہ رائے ظاہر کی ہے کہ بچوں کے سوالات کو ٹال دینے کی ناکام کوشش بچے کے حق میں چنداں مفید ثابت نہیں ہوتی۔ والدین کے متعلق ان کے حسنِ عقیدت میں فرق آجاتا ہے۔ وہ سوچنے لگتے ہیں۔ کہ "نومولود" کو گھر میں لانے کے لئے والدین کو دایہ کی ضرورت پڑی۔ آخر کیوں؟ زندگی کے مظاہرہ میں بچوں کی دلچسپی بالکل قدرتی امر ہے۔ ان کے سوالات معقولیت پر مبنی ہوتے ہیں۔ وہ کتے کے پلوں اور بلی کے بچوں کو دیکھتے ہیں۔ کبھی کبھی چڑیوں یا کبوتریوں کے انڈوں کو گھونسلے سے گرتا دیکھتے ہیں۔ "یہ کیا چیز ہے اماں جان" "اچھا چڑی کا بچہ اس سے نکلتا ہے۔ اب نہیں نکلے گا۔" ڈاکٹر لورے کا بیان ہے۔ کہ جس زبان میں ایسے سوالات کا جواب دینے کے لئے موزوں الفاظ نہ ہوں۔ وہ ادھوری زبان ہے۔ ان سوالات کی جنسی نوعیت سے گھبرانا نہیں چاہئیے۔ غیر اصطلاحی طریہان کا جواب دینے کی کوشش کرنا مناسب ہے۔

بچوں میں جمالیاتی احساس

ترقی یافتہ تعلیمی اداروں سے ملحقہ عجائب خانوں کا ابتدائی مقصد یہ ہے کہ تفریح و تفنن کے ذریعہ بچوں میں آرٹ کے لئے دلبستگی پیدا کی جائے اور ان کے جمالیاتی احساس کو ترقی حاصل ہو۔ امریکہ کے نیشنل ایجوکیشن ایسوسی ایشن کی ایک تازہ رپورٹ سے اس ضمن میں از بس سبق آموز واقفیت حاصل ہوئی ہے۔ عموماً دیکھا گیا ہے۔ کہ لڑکوں کو مکہ بازی یا لڑائی کے سین بہت پسند ہیں۔ اس کے برعکس لڑکیوں کو ایسے مناظر بھاتے ہیں جن میں خوشنمائی زیادہ ہو اور ایکشن (حرکت) کم ہو۔ مسرت و الم کے نظاروں سے لڑکے اور لڑکیاں دونوں متاثر ہوتے ہیں۔ چند بچوں کو ایک نگارخانے میں لے جایا گیا۔ ان میں سے آٹھ سال کے دو بچوں نے کہا:۔

"یہاں کسی حیوان کی تصویر نہیں"۔ یہ کہہ کر وہ باہر آگئے۔ تجربہ شاہد ہے کہ خوشنمائی یا بدنمائی کا احساس تیرہ سال کی عمر سے نمایاں ہونے لگتا ہے۔ اس عمر کا لڑکا ہو یا لڑکی وہ بدصورت چہرہ دیکھ کر بیزار اور خوبصورت چہرہ دیکھ کر لطف اندوز ہوتے ہیں۔ زمانہ حال کے مشہور فرانسیسی مصوّر نے عورتوں کی جو تصویریں تیار کی ہیں۔ ان کی امتیازی خصوصیت سادگی اور گرانباری یعنی "بھاری پن" ہے۔ آٹھ اور نو سال کے دو لڑکوں نے اس مصوّر کی ایک تصویر دیکھ کر کہا۔

"یوں معلوم ہوتا ہے یہ عورت اینٹوں سے بنائی گئی ہے"۔ ظاہر تھا کہ ان کمسن لڑکوں کے نزدیک نزاکت زنانہ حسن کا ضروری وصف ہے۔

چند معیاری درسگاہیں

ریاست ہائے متحدہ امریکہ کا تعلیمی نظام وہاں کی قومی زندگی سے کسقدر وابستہ ہے۔ اس کی تشریح کے لئے نیویارک کے صرف ایک سکول کا نصاب ملاحظہ ہو۔ جس میں طلبا اور طالبات کو پیشہ ورانہ تربیت دی جاتی ہے۔ یہ امر ہمارے وہم و گمان میں نہیں آسکتا۔ کہ ایک ہی درس گاہ میں قصاب باورچی اجناس خوردنی و نوشیدنی کی خرید و فروخت اور اس کے ساتھ ہی چائے پارٹیوں کے انتظام اور میزبانی کے اسلوب سکھائے جاتے ہیں۔ مشہور ہفتہ وار رسالہ "ٹائم" (ٹائمز نہیں) کے بیان کے مطابق اس سکول کے ڈائرکٹر نے اعلان کیا ہے۔ کہ کھانے پینے کا سامان بیچنے والی دکانوں پر لاکھوں آدمی کام کرتے ہیں۔ ان کی تربیت ہمارا قومی فرض ہے۔ حال میں جب یہ نیا نصاب جاری کیا گیا تو ۱۲ سو امیدواروں نے داخلہ کے لئے درخواستیں دیں۔ جن میں پانسو بالغ تھے۔ درس گاہ کا ساز و سامان اتنے ہمہ گیر پیمانہ پر ہے۔ اور اسے اس التزام سے بروئے کار لایا جاتا ہے۔ کہ طلبا فارغ التحصیل ہوتے ہی پختہ کار پیشہ ور دکاندار بن جاتے ہیں۔ قہوہ پینے کی مشین سے لے کر برف خانہ تک اور برقی مطبخ سے لیکر کیش رجسٹر تک یہاں موجود ہیں۔ بہت جلد خراب ہو جانے والی اشیا مثلاً ڈبل روٹی فواکہ مٹھائی وغیرہ کو دیر تک محفوظ رکھنے کا سالم کارخانہ ہے۔ قصاب کی دکان ہے۔ طلبا گوشت کاٹتے یا قیمہ بناتے وقت سرجنوں کی طرح سفید لبادہ پہنتے ہیں۔ بیکری یعنی مطبخ میں سالگرہ کی شاندار کیک سے لیکر بچوں کے بسکٹ تک تیار کئے جاتے ہیں۔ درس گاہ کے مختلف کارخانوں کی تیار کردہ چیزیں دوسرے تعلیمی اداروں کے ہوسٹل وغیرہ کے لئے مہیا کی جاتی ہیں۔ گویا سکول کارخانوں اور دکانوں کا مجموعہ ہے۔ چائے کی پارٹیوں کے لئے ہال ہیں۔ اور ان کا انتظام زیر تربیت لڑکوں اور لڑکیوں کے سپرد ہے۔

ٹیکنیکل تعلیم

اب موٹر کاروں کی صنعتی درس گاہ کو دیکھئے۔ بروکلن ہائی اسکول میں جو ابھی ابھی قائم ہوا ہے ۲۵ لڑکے داخل ہیں۔ جنہیں چار سال میں موٹروں کے صنعتی و تجارتی شعبوں میں طاق کیا جاتا ہے۔ یہاں ۵ لاکھ ڈالر یعنی تقریباً ستره لاکھ روپیہ کی مشینری ہے۔ ۲۶ دار التجارب ہیں۔ جن میں ہر موٹر کے مختلف نمونے کھلونوں کی شکل میں تیار کئے جاتے ہیں۔ ۹۴ نئی موٹر گاڑیاں خرید کر انہیں پرزوں کی صورت میں طلبا کے سپرد کر دیا جاتا ہے۔ تاکہ وہ ہر پرزہ کی ساخت و اہمیت کو عملی طور پر سمجھ لیں۔ طلبا کی اپنی موٹر کاریں قابل مرمت ہوں تو انہیں ٹیکنیکل مشورہ مفت دیا جاتا ہے۔ ایک "تصادم خانہ" بھی ہے۔ جہاں مختلف سمتوں سے آتی ہوئی موٹروں میں تصادم کرایا جاتا ہے۔ اس میں موٹروں کو جو نقصان پہنچتا ہے۔ اسے رفع کرنے کے طریقے بتائے جاتے ہیں۔ طلبا موٹروں کی خرید و فروخت کے متعلق تجارتی راز بھی سیکھتے ہیں۔ گویا یہاں ایک کلینر سے لے کر انجینئر اور ڈرائیور سے لیکر مینجر کی تعلیم ملتی ہے۔

اعلیٰ تعلیم کا نرالا انتظام

ہارورڈ یونیورسٹی میں ایک شعبہ "انڈر گریجویٹ فیکلٹی ایسوسی ایشن" کے نام سے گرانقدر مجلسی خدمات سر انجام دے رہا ہے۔ ہائی اسکول کا امتحان پاس کرنے کے بعد جو طلبا اعلےٰ تعلیم کی استطاعت نہیں رکھتے وہ اس ایسوسی ایشن کے دفتر میں آتے ہیں۔ موزوں طلبا کو منتخب کر لینے کے بعد یہ انتظام کیا جاتا ہے کہ ایسوسی ایشن مذکور کے رضا کار لیکچر روم سے نکلتے ہی سیدھے دفتر پہنچتے ہیں۔ اور نئے طلبا کو وہی لیکچر پڑھا دیتے ہیں۔ ۱۹۳۸ء میں یہ تعلیمی انجمن قائم ہوئی۔

اور پہلے سال ۲۰ طلبا کو بیس انڈر گریجویٹ ٹیچروں نے کالجی تعلیم دی اور وہ سب ڈگری لینے میں کامیاب ہو گئے۔ اس وقت ایک ہزار غریب طلبا اس انجمن کی وساطت سے گریجویٹ بن چکے ہیں۔

فن خطابت کی تعلیم | کیلی فورنیا کے تین ہائی سکولوں میں جونیئر اسپیکرز بیورو قائم ہیں جن سے یہ مقصود ہے کہ لڑکوں اور لڑکیوں کو مختلف موضوع پر تقریر کرنے کے طریقے بتائے جائیں۔ گذشتہ پانسال میں ۷۵ تعلیمی مجالس علمی اور معاشری انجمنوں اور کلبوں نے اپنے جلسوں کی رونق بڑھانے کے لئے ان لڑکوں اور لڑکیوں کو مدعو کیا۔ ریڈ کراس سوشل لیگ اور رفاہ عامہ کے متعدد ادارے فن خطابت کے ان مظاہروں سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ مختلف کاروبار تجارت صنعت فلسفہ سیاست مذہب شہریت وغیرہ سے متعلق کوئی اہم مسئلہ زیر بحث ہو۔ یہ نوجوان خطیب اس پر نئے انداز سے روشنی ڈالیں گے۔ بیورو مذکور نے یہ قاعدہ مقرر کر رکھا ہے کہ ہمارے طلبا ایک تقریب میں صرف پانچ منٹ تک تقریر کریں گے۔ ایک علمی کلب کے بنچ پر تقریر کرنے کے بعد طالب علم واپس آیا۔ تو اس نے اخباری نمائندہ سے کہا:-

"لطف آ گیا میری کرسی گرز کے بالکل قریب تھی اور میں نے پانچ منٹ تک سب کو محو حیرت بنائے رکھا۔"

غزل

خواجہ جمیل احمد
بی۔ اے

تری نگاہوں میں شوخیاں بھی ہیں بجلیاں بھی ہیں کیف بھی ہے
وہ جس میں مستی چھلک رہی ہو۔ بیبرے لئے انتخاب کر دے

خدا کرے تیرے بھی خیالوں میں آ بسے کوئی ایسی صورت
جو زندگی میں عذاب بھر دے جو تیری راتیں خراب کر دے

تیری نظر مائل کرم ہو تو کیا عجب ہے کہ یہ تجلی
چمک کے خاک چمن کے ہر ایک ذرے کو آفتاب کر دے

تیری نگاہوں کے ہوتے کوئی رہین مینا و جام کیوں ہو
نظر کے ساغر انڈیل، دنیا کو مست کیف شراب کر دے

نوازش حسن ہی سے ہوتی رہی ہے پرداخت عاشقی کی
تیرے سوا اور کس سے ممکن کہ جذب دل کامیاب کر دے

بہار غنچوں کی خوابگہ میں سکوت کی نیند سو رہی ہے
خرام کر ساحت گلستاں میں اور بپا انقلاب کر دے

تصحیح

"ناک چنے چبوانا"

اُردو زبان کا یہ محاورہ کسی کے زیادہ تنگ کرنے کے موقعے پر بولا جاتا ہے

"زید نے مجھے ناک چنے چبوا دیئے"

پنجاب کے اکثر اخبار نویس اسے

ناکوں چنے چبوانا

لکھتے ہیں۔ یہ صحیح نہیں

محاورے میں ناک کا لفظ واحد ہے جمع نہیں

تاجور

علمی و ادبی

سوال و جواب

سوالات

۱ - مولانا سید مختار احمد صاحب نے اپنی ایک تالیف میں آتش مغفور کے شعر

کسی کی محرمِ آبِ رواں وہ یاد آئی ؛ حباب کے جو برابر کوئی حباب آیا

کے متعلق لکھا ہے "آبِ رواں" اردو ہے اور محرم (انگیا کے معنی میں) بھی اردو ہے پھر (محرمِ آبِ رواں) کہنا کیونکر صحیح ہے؟

اسی شعر کے مصرعِ اولیٰ میں مرزا یاس یگانہ لکھنوی نے کچھ تصرف کرنے کے بعد ارشاد فرمایا ہے ؎

کسی کی محرمِ آبِ رواں کی یاد آئی ؛ حباب کے جو برابر کوئی حباب آیا

"محرم بمعنی رازدار اور محرم بمعنی انگیا - ان دونوں لفظوں کا قالب ایک ہے اور معنی جدا جدا مگر دونوں کے معنی میں بھی ایک مناسبت ہے لہذا یہ لفظ مہند بالمعنی ہے۔ اس حالت میں عطف و اضافت صحیح ہے۔ کیا 'محرمِ آبِ رواں' صحیح ہے؟ آپ کی اس کے متعلق کیا رائے ہے؟

۲ - علامہ اقبال مرحوم و مغفور نے لفظ "قُسطَنطِینیہ" کو "قسطنطنیہ" نظم کیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے ؎

خطۂ قسطنطنیہ یعنی قیصر کا دیار ؛ مہدیِ اُمت کی سطوت کا نشانِ پائدار

علامہ مغفور کے علاوہ ایک محقق، اہلِ فن، شاعر و ماہرِ عربی و فارسی • علامہ شبلی مرحوم نے بھی 'قسطنطنیہ' ہی لکھا - ان دو اصحاب کے علاوہ جہاں تک مجھے علم ہے کئی اور ادبا نے بھی قسطنطنیہ ہی لکھا ہے۔ میرے ناقص خیال کے مطابق لفظِ مذکور شہنشاہ قسطنطین کے نام سے مشتق ہے اور لفظ 'قسطنطنیہ' میں یائے نسبت ہے - مگر حضرت اقبال نے جس طرح نظم کیا ہے اس صورت میں یائے نسبت کی بجائے یائے اصلی گر گئی ہے -

آپ کا اس کے متعلق کیا خیال ہے اور اہلِ تحقیق کیا کہتے ہیں؟

(اصغر حسین راغب مرادآبادی)

جوابات

۱ - موجودہ اردو گرامر میری رائے ناقص میں موجودہ ترقی پذیر زبان کا ساتھ نہیں دے سکتی، زبان اس قدر آگے بڑھ گئی ہے کہ اس کے لئے موجودہ گرامر قریب قریب بےکار ہو چکی ہے۔ ملاحظہ ہو -

اردو گرامر کے قواعد کی رُو سے -

علمی دنیا، ادبی دنیا، فلمی دنیا، ایڈیٹر اتحاد، موسم برسات، بلکہ موسم گل بہ فتح سین موسم کی ترکیب بھی غلط ٹھیرتی ہے۔ کیونکہ موسم بہ فتحہ سین مہند ہے اور لفظ مہند کی فارسی ترکیب اردو گرامر کی رُو سے غلط ہو گی اسی طرح کوٹھیات، ٹھیکہ جات، نمونہ جات، ریاستوں میں ایک عہدہ ہوتا ہے منصرم کوٹھیات، رہائش، رہائشی مکان وغیرہ - ان الفاظ کو آپ کی گرامر غلط ٹھیراتی ہے - لیکن کیا مستند اہلِ زبان اور فصحائے اردو ان الفاظ کے استعمال سے اجتناب کر سکتے ہیں؟ آپ فصحائے اردو کا نثری کلام یا خطوط ملاحظہ فرمائیں گے تو اس قسم کے الفاظ کو ان میں کثیر الاستعمال پائیں گے شمس العلما مولینا آزاد نے ڈائرکٹر محکمہ تعلیم اور ججانِ ہائی کورٹ کے الفاظ استعمال کئے ہیں - ملاحظہ ہو :- "مکتوباتِ آزاد" - سرسید، مولینا حالی، ڈاکٹر نذیر احمد، پروفیسر ذکاء اللہ، مولینا عبدالحلیم شرر لکھنوی وغیرہم کی کتابوں اور خطوں میں ہزاروں ایسے الفاظ بے تکلف استعمال کئے ہیں جو گرامر کے قواعد کی رو سے غلط ٹھیرتے ہیں - جب سرسید کے عہد میں قواعد شکن الفاظ کا یہ زور تھا تو آج کی ترقی یافتہ زبان قواعد صرف و نحو کی کیونکر پابند ہو سکتی ہے؟

میں اگرچہ بربنائے وہم ایسے الفاظ کے استعمال سے بہت حد تک احتراز کرتا ہوں، لیکن دوسروں کو روکتا نہیں - "محرمِ آبِ رواں" کی ترکیب فارسی کو بھی اسی بنا پر غلط نہیں سمجھتا - اس ترکیب میں اگرچہ محرم کا لفظ مہند ہے - اور آبِ رواں (کپڑے کی ایک قسم کا نام) مہند ہو یا نہ ہو علَم تو ضرور ہے - چونکہ ان دونوں لفظوں کی صورت و شکل عربی اور فارسی ہے - اس لئے اس پہلو کو نظر انداز کرتے ہوئے کہ یہ اردو میں کس معنی استعمال ہوئے ہیں - ان کا صورۃً عربی و فارسی ہونا میرے نزدیک فارسی ترکیب کے جواز کے لئے کافی ہے -

میرا خیال یہ ہے کہ اصل شعر میں "وہ یاد آئی" نہیں بلکہ مرزا یاس نے "آبِ رواں کی یاد آئی" جو لکھا ہے اصل شعر کے مطابق ہے - گویا مرزا صاحب نے شعر کی تصحیح کی ہے اُس میں تصرف نہیں کیا -

۲ - اردو میں تو قسطنطنیہ بہ تلفظ قُسْ طَنْ طَنْ یَہ رائج ہے اور یہی صحیح ہے - ہم غیر زبانوں کے الفاظ کے ماخذی تلفظ و معنی کے پابند نہیں - اردو میں غیر زبان کا لفظ جس تلفظ جس معنی اور جس تصرف کے ساتھ عام و خاص کی زبانوں پر آجائیگا - اُسی تلفظ اُسی معنی اور اُسی تصرف کی صورت میں صحیح و فصیح ہوگا، لیکن اگر ضرورتِ شعری کے سبب کوئی مستند شاعر غیر زبان کے کسی لفظ کو ماخذی تلفظ یا وزن کی مجبوری سے ماخذی تلفظ کے مشابہ صورت میں استعمال کرے تو یہ استعمال حدودِ جواز ہی میں رہے گا - چنانچہ علامہ مرحوم کے شعر میں بھی قسطنطنیہ کا لفظ بہ تلفظِ خاص وزنِ شعری کی مجبوری کا شکار ہو گیا ہے - اور یہ تصرف حدودِ جواز سے باہر نہیں۔ (ادارہ)

سیاسی

سوال و جواب

سوال ۔ ہٹلر نے کس طرح پوری جرمن قوم پر نسلی تفوق کا جنون سوار کر دیا ہے؟

جواب ۔ ہٹلر اور اس کے ساتھی انسانی نفسیات کو خوب سمجھتے ہیں۔ انہوں نے اپنے موثر اور مسلسل پروپیگنڈے سے عام جرمنوں کے دل میں یہ بات بٹھا دی ہے ۔ کہ تم دنیا کی سب سے اعلیٰ نسل سے تعلق رکھتے ہو اور بنی نوع انسان کی رہنمائی صرف تمہارا ہی حق ہے ۔ اس بے پناہ پروپیگنڈے کا یہ اثر ہوا ہے کہ آج ہر جرمن یہ سمجھتا ہے کہ میں دنیا کی نجیب ترین نسل سے تعلق رکھتا ہوں ۔ میرے جسم میں پاک خون رواں ہے ۔ اور میں دوسروں پر حکومت کرنے کے لئے پیدا کیا گیا ہوں ۔ صرف یہی نہیں ۔ جرمنی میں بچوں کو ابتدائی ایام سے ہی یہ تعلیم دی جاتی ہے کہ تم جرمن نسل سے تعلق رکھتے ہو ۔ جرمن نسل بہادر ترین نسل ہے اور مستقبل میں تمام دنیا پر اسے اقتدار حاصل ہوگا ۔ ہٹلر تمہارا نجات دہندہ ہے ۔ اور وہ جو کچھ کہتا ہے درست کہتا ہے ۔ ذیل کا اقتباس ملاحظہ فرمائیے ۔ جو جرمنی کی قومی درسی کتاب سے لیا گیا ہے ۔ یہ کتاب تمام بچوں کو پڑھنی پڑتی ہے ۔

ہمارے سب سے بڑے رہنما اڈولف ہٹلر
ہم تم سے محبت کرتے ہیں ۔
ہم تمہارے لئے دعا کرتے ہیں ۔
ہم تمہاری آواز سننا چاہتے ہیں ۔
ہم تمہارے لئے مشقت کرنے کو تیار رہیں ۔

جرمنی کے سکولوں میں پانچ پانچ چھ چھ برس کے بچے ایک دوسرے سے اس قسم کے سوال و جواب دہراتے ہیں ؛۔

سوال :۔ آجکل دنیا میں حضرت مسیح کا نمونہ کون ہے
جواب :۔ اڈولف ہٹلر ۔
سوال :۔ اپنی وفاداری اور خود داری کے اعتبار سے حضرت عیسیٰ کے حواریوں کے مانند کون لوگ ہیں ؟
جواب :۔ گوئرنگ ۔ گوئبلز ۔

سوال میثاق سعد آباد کیا ہے یا اس میں کون کون سی سلطنتیں شریک تھیں ؟ سلطنتوں اور دوسرے اسلامی ممالک کا جنگ کے متعلق کیا رویہ ہے ؟

جواب "میثاق سعد آباد" سے مراد وہ تاریخی معاہدہ ہے جو دنیا کے چار اسلامی ممالک کے مابین ایک دوسرے کی مدد و اعانت کے متعلق قرار پایا تھا یہ چار ملک ٹرکی ، ایران ، افغانستان اور عراق ہیں ۔ اس معاہدہ کی تکمیل قصر "سعد آباد" میں ہوئی تھی ۔ اس لئے اس کا نام میثاق سعد آباد پڑ گیا ۔ اس معاہدہ کی سب سے بڑی شرط یہ ہے کہ یہ چاروں ممالک ایک دوسرے سے دوستانہ تعلقات قائم رکھیں گے ، اور وقت پڑنے پر ایک دوسرے کی امداد سے گریز نہیں کریں گے ۔ اس معاہدے کی نوعیت غیر جارحانہ ہے ۔ یعنی اس میں یہ شرط نہیں کہ جنگ کی صورت میں میثاق سعد آباد پر دستخط کرنے والا ملک اپنے کسی حلیف کو فوجی امداد دینے پر مجبور ہوگا ۔

اس وقت اس معاہدہ میں شریک سلطنتوں کی پوزیشن یہ ہے کہ عراق اور ایران انگریزوں کے حلیف ہیں ۔ ترکی اور افغانستان اس وقت تک رسمی طور پر غیر جانبدار ہیں ۔ لیکن بالفرض محال اگر انہیں جنگ میں شریک ہونا پڑے تو یہ ملک انگریزوں کا ساتھ دیں گے ۔ کیونکہ اس وقت انہیں خطرہ برطانیہ سے نہیں بلکہ جرمنی سے ہے ۔ اسلامی ممالک کی حکمت عملی یہی ہے کہ جہاں تک ہو سکے جنگ سے احتراز کیا جائے ۔ کیونکہ سچی بات یہ ہے کہ یہ سلطنتیں جرمنی کے مقابلے پر بہت کمزور اور ناتواں ہیں ۔ پولینڈ ، فرانس اور دوسرے یورپی ملکوں کے افسوسناک حشر کے پیش نظر ان کی یہ حکمت عملی کچھ قابلِ اعتراض نہیں لیکن اسلامی ممالک کی تمام ہمدردی جمہوریت کے ساتھ ہے اور وہ اس امر کے متمنی ہیں کہ دنیا کو آمروں کے ظلم و تشدد سے نجات ہو ۔

مصر میثاق سعد آباد میں شریک نہیں ۔ لیکن وہ برطانیہ کا حلیف ہے ۔ جرمنی سے اس کے سیاسی تعلقات منقطع ہو چکے ہیں ۔ اس وقت تک مصر نے جرمنی کے خلاف اور انگریزوں کی حمایت میں اعلان جنگ نہیں کیا ۔ اس کی وجہ محض یہ ہے کہ انگریزوں نے مصر کو اس بات کا اختیار دے رکھا ہے کہ وہ جب تک مناسب سمجھے غیر جانبدار رہے ۔ برطانیہ کی طرف سے اس پر جنگ میں شریک ہونے کے لئے دباؤ نہیں ڈالا جائے گا ۔ فلسطین کے عرب بھی برطانیہ کی حمایت کا اعلان کر چکے ہیں ۔

(ادارہ)

محترمہ ن ص صاحبہ

پیش گوئی

"اچھی نازلی!"

ایک طویل، کبھی ختم نہ ہونے والا پیار ———

تمہارا پیارا سا خط میں انتظار

میں مل کر بے حد مسرتوں کا حامل ہوا۔ اس محبت نامہ کو پا کر میں چند ننھے لمحات کے لئے دنیا و مافیہا سے بے خبر سی ہوئی جاتی ہوں۔ ایسے محسوس ہوتا ہے گویا دنیا کی تمام مسرتیں میرے پاس ہی سمٹ آتی ہیں۔ میں ایک حسین دنیا میں محو پرواز ہو جاتی ہوں۔ اچانک مجھے احساس ہوتا ہے جو پھر مجھے اس شب و روز کی دیرینہ کشمکش میں مبتلا کر دیتا ہے۔

نہ جانے تمہیں میری دکھ بھری کہانی سننے کا اتنا مطالبہ کیوں ہے بہرحال اگر تم مجھ سے میری کہانی کہلوانا ہی چاہتی ہو۔ تو میں کہتی ہوں تم سنو میں سناتی ہوں۔ تم اپنا شوق پورا کر لو۔ میں اپنی شادی سے پیشتر واقعات سے ہی شروع کرتی ہوں۔

اس سے پیشتر اخبار و رسائل میں سے افسانے پڑھ کر کبھی مسرور و شادماں کبھی رنجیدہ و پشیماں ہوا کرتی۔ مجھے اکثر وہ افسانے جو مایوسی و ناچاری اور رنج و غم کی زندہ تصویریں ہوتیں۔ زیادہ ہی پسند ہوا کرتے تھے۔ شاید میری طبیعت کا یہ رجحان ہی اپنے رنج و الم سے معمور افسانۂ زندگی کی پیش گوئی تھی۔ دوسروں کے غم و حسرت کے افسانے میرے لئے وقت گزاری کا بہترین مشغلہ ہوا کرتے تھے۔ اس زمانے میں میں اپنے آپ ہی کچھ اس طرح مست تھی کہ مجھے کائنات کی تمام چیزیں سیلاب مسرت میں ڈوبی نظر آتی تھیں۔ میری زندگی قلبی سکون کی حقیقی دولت سے مالا مال تھی۔ میں اپنے تصورات کی ایسی رنگین اور پُر روح پرور دنیا میں بستی تھی کہ کبھی اپنی زندگی کے بھیانک مستقبل کو نہ دیکھ سکی۔

چونکہ میں بارہا صنفِ نازک کو بعد از شادی، صنفِ قوی کے تباہ کن جھونکوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہوتے دیکھ چکی تھی۔ اکثر کتابوں کے مطالعے سے بھی مجھے یہی تلخ تجربہ ہوا۔ عورت کی داستانِ مظلومیت ان کی آرزوؤں کی پامالی نے مجھے صنفِ قوی سے حد درجہ بدظن کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک مختصر سے عرصے میں شادی سے نفرت کرنے لگی۔

اپنے عزیزوں کے پیہم اصرار کے باوجود مجھے کسی شادی میں شامل ہونا ناگوار گزرتا۔ میں اپنی آنکھوں سے کسی کو موت کے گڑھے میں جھکیلتے دیکھ نہ سکتی تھی۔ میری ہم عمر لڑکیاں اور خاص طور پر والدین میرے اس عجیب و غریب نظریے سے حیران ہوا کرتے تھے۔

آخر کار وہ وقت بھی آن پہنچا۔ جب میرے خیالات و تصوّرات کے حسین و دلکش دریا کی روانی کو مضبوط بند باندھ کر روک دیا گیا۔ میری خیالی دنیا کی عالیشان عمارت کے کواڑ اور بنیاد نہایت بے رحمی سے توڑنے کی کوشش ہونی شروع ہو گی۔ میری آرزوؤں کا خون کرنا شرعی قانون قرار دیا گیا۔ میری امیدوں پر پانی پھیرتے ہوئے کسی کا دل نہ پسیجا۔ میری آرزوؤں کے پُر رونق باغ میں اچانک خزاں آ گئی۔ میں اپنی بے بسی و بے کسی پر آٹھوں پہر روتی۔ میرے دن بے کیف اور راتیں بھیانک ہو گئیں اور ہر لمحہ میرے لئے مصیبت کی آمد کا پیغام لاتا۔ میرے لئے دن اور راتیں اتنے طویل ہو گئے کہ کاٹنے سے نہ کٹتے۔ دو ایک بار میرے دل میں اس تکلیف سے رہائی پانے کا آسان سا علاج بھی آیا۔ میں چاہتی تھی کہ خودکشی کر کے ہر نئی آنے والی تکلیف و مصیبت سے چھٹکارا پا لوں۔ لیکن اس کا انجام کتنا خوفناک، کتنا ہولناک تھا۔ اس سے بھی میں باخبر تھی۔ وہ جو کہتے ہیں کہ "دین سے دنیا رکھنی مشکل ہوتی ہے"۔ میرے بعد لوگوں کے عجیب و غریب شبہات۔ اپنے والدین کی عزت کا جنازہ ———
ان سب کا تصور مجھے ایک زہریلے سانپ کی مانند کاٹنے کو دوڑتا اور میں اس کے تصور سے سرتاپا کانپ اٹھتی۔ یہی وجہ تھی۔ کہ میں نے اپنا یہ ارادہ بھی ملتوی کر دیا۔

آخر کار ایک منحوس گھڑی آئی کہ مجھے ایک بے بس و بے کس سمجھ کر ایک غضبناک ہستی کے ہاتھوں سونپ دیا گیا۔

اچھی نازلی! میری طبیعت سخت بے چین ہو رہی ہے۔ خدا معلوم کیوں؟ اس کے بعد کیا ہوا؟ ——— اگلے خط میں لکھوں گی۔ اچھا خدا حافظ!

تمہاری بدنصیب۔۔ ن۔ص

خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔ جو ہر ایڈریس کے کونے میں تحریر ہوتا ہے۔ نیز اپنا پتہ صاف اور خوشخط لکھیں تاکہ ادارہ کو جواب دینے میں سہولت ہو۔ (مینیجر)

محترمہ دل آرا ع آبادی

پگڈنڈی کی کیچڑ!

بارش ابھی ابھی رُکی تھی - بادل آسمان کو اب تک گھیرے ہوئے تھے - میں سامنے کے منظر سے لطف اندوز ہونے کے لئے بالکنی پر آ کھڑی ہوئی - سبزہ پر پانی کی بوندیں بالکل موتیوں کی مانند نظر آ رہی تھیں - تیز آندھی پتوں سے بھری ہوئی بھاری ڈالیوں کو ایک پُر شور آواز کے ساتھ ہلا رہی تھی - سامنے کے کھیت میں بوئی ہوئی ککڑی کی بیلیں ہوا میں لہلہا رہی تھیں اور ہرے ہرے پتوں پر زرد پھول بہت ہی خوشنما معلوم ہوتے تھے - دور کہیں مور آم کی شاخوں پر بیٹھے بادل کی گرج پر کبھی کبھی چلّا پڑتے تھے - ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بارش ابھی ہوگی اور بہت زور سے ہوگی کھیت میں سے ہوتی ہوئی سامنے کی چند جھونپڑیوں میں جانے والی پگڈنڈی بارش کی زیادتی اور لگاتار آمد و رفت کی وجہ سے کیچڑ ہو کر رہ گئی تھی - اس پر سے جاتے وقت بیچارے کسانوں اور اُن کی عورتوں کے پاؤں کیچڑ میں لت پت ہو جاتے - ایسے کہ انہیں دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہونے لگتا گویا میرے پاؤں میں بہت سے کیڑے کاٹ رہے ہیں! —— لیکن اسی پگڈنڈی سے کسانوں کے بچے اور ان کی عورتیں روز صبح شام ایسے گذرتے جیسے سمنٹ کا نکریٹ پر چل رہے ہوں -

میری نظریں پگڈنڈی پر جمی ہوئی تھیں اور میں پگڈنڈی کے اس کیچڑ میں ہندوستانیوں کی تڑپتی ہوئی روح کو پھنسا ہوا پا رہی تھی —— یکایک اس کیچڑ میں جان پیدا ہو گئی - اس میں سے ایک پاؤں نکلا حسین - دوسرا پاؤں - تیسرا پاؤں - چوتھا پاؤں —— ہیں! یہ تو آگے بڑھ رہے تھے! —— میں نے نظر اُٹھائی دو دیہاتی عورتیں جا رہی تھیں - ایک جوان عورت تھی - جس کی گود میں سفید چادر میں لپٹا ہوا بچہ تھا - دوسری عورت بڑھیا تھی - جوان عورت کا لباس کم قیمت ہوتے ہوئے بھی بھڑکیلا تھا - اس کا سرخ لہنگا اور پیلا دوپٹہ اس کے حسن کو دوبالا کئے ہوئے تھے - شاید وہ دونوں ساس اور بہو تھیں —— لیکن وہ خاموش تھیں - حالانکہ دیہاتی بہت کم خاموش رہتے ہیں - خاموشی کے علاوہ ایک قسم کی افسردگی اور فکر کی علامت ان کے چہرے سے صاف ظاہر تھی —— تھوڑی دیر میں موڑ آ گیا اور وہ سڑک کی طرف مڑ گئیں - میں خدا معلوم کیوں ان کی خاموشی سے اتنی زیادہ متاثر ہوئی —— اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے پگڈنڈی پر بہت سے سانپوں کی دوڑ ہو رہی ہے -

دوسرے دن وہ ساس بہو پھر شہر کی طرف جاتی ہوئی دکھائی دیں - ان کے چہرے اُترے ہوئے تھے اور نوجوان عورت کی آنکھوں میں میں نے کچھ چمکتی ہوئی چیز محسوس کی —— بارش آج زیادہ ہوئی تھی اور پگڈنڈی کی کیچڑ بہت نرم اور چکنی ہو گئی تھی - ان دونوں کو میں نے دن میں دو بار شہر جاتے ہوئے دیکھا —— اسی طرح —— نوجوان عورت کی گود میں چادر میں لپٹا ہوا بچہ اور بوڑھی عورت خاموش اس کے پیچھے پیچھے! کیچڑ میں مشکل سے چلتی ہوئی —— شام کو وہ واپس ہوئیں - تو بچہ بوڑھی عورت کی گود میں تھا اور نوجوان عورت گھونگھٹ نکالے پیچھے پیچھے آ رہی تھی - اس کی چال سے کمزوری کا اظہار ہو رہا تھا - گویا اس میں چلنے کی طاقت نہیں ہے —— وہ اپنے آپ کو زبردستی بوڑھی عورت کے پیچھے گھسیٹ کر لیجانے کی فکر کر رہی ہے! —— خدا معلوم یہ دو عورتیں کیوں مجھے غمگین نظر آتی تھیں؟ آیا وہ سچ مچ کسی فکر میں محو راستہ طے کرتی تھیں یا میری ہی قوت متخیلہ انہیں میرے سامنے ایسا پیش کرتی تھی!

بارہ بج رہے تھے - میں نے انگڑائی لیتے ہوئے کھڑکی سے باہر جھانکا —— آندھی سائیں سائیں کرتی ہوئی درختوں سے ٹکرا رہی تھی - دھوپ سیاہ دیووں کی مانند بادلوں سے دھینگا مشتی کر رہی تھی —— مجھے قدرت کے ان عناصر کی آپس میں زور آزمائی کے شور کے ساتھ انسانی آہ و بکا کی آواز سنائی دی - سامنے کی جھونپڑیاں ساکت کھڑی تھیں - اُس سرے کی جھونپڑی میں سے رونے کی آواز اٹھتی اور دھوئیں کے مانند ہوا میں تحلیل ہو جاتی - میں نے کتاب بند کی اور کھڑکی سے لگ کر کھڑی ہوئی —— پگڈنڈی کے کیچڑ پر سے دیہاتیوں کی ایک قطار آ رہی تھی —— میں نے سلاخ میں سے منہ باہر کرنے کی کوشش کی - سب سے اگلے دیہاتی کے دونوں ہاتھوں میں سفید چادر میں لپٹی ہوئی کوئی اکڑی ہوئی چیز تھی - شاید وہ کہہ رہے تھے! رام نام ست ہے! —— میں نے پیچھے ہٹتے ہوئے جھٹکے سے کھڑکی بند کر دی اور پلنگ پر زور سے گر پڑی —— میری نظروں میں وہ دو عورتیں پھر گھومیں! —— ایک جوان ایک بوڑھی — جوان عورت کی گود میں ایک سفید چادر میں لپٹا ہوا بچہ —— بوڑھی عورت آہستہ آہستہ اسکے پیچھے چلتی ہوئی — اور پگڈنڈی کی کیچڑ!

سانیٹ

کچّے راستے!

وہ کچّے راستے گاؤں کے اکثر یاد آتے ہیں!!
وہ اُونچے نیچے میدان، کھیت، ناہموار پگڈنڈی!
اِدھر گلبن، اُدھر جھاڑی، اِدھر نالے، اُدھر ندی!
وہ منظر، عہدِ رنگیں کے وہ منظر یاد آتے ہیں!!

جنونِ عشق و مستی وہ فسونِ حُسن و رعنائی!!
نہ بھولوں گا وہ اِک شامِ زر افشاں، وہ حسیں جمگھٹ
جہاں پہلے پہل دنیائے دل نے لی تھی اِک کروٹ
جوانی کی پناہوں میں محبت کی وہ انگڑائی!!

وہ پیپل کی سلونی چھاؤں، وہ رنگیں ملاقاتیں!!
فضائے رنگ و بُو میں غم کی تلخی کو بھلا دینا!
مرے شانوں پہ سر رکھ کر "کنول" کا مسکرا دینا!
نہ آئیں گی کبھی پھر لوٹ کر وہ چاندنی راتیں!!

وہ کچّے راستے پیپل کی چھاؤں، وہ حسیں لمحے!!
نہ بھولوں گا، نہ بھولوں گا، بہار و کیف کے جلوے!!

صہبا لکھنوی

جی۔ڈی۔ چندن۔ بی۔اے

اگر

روزمرہ کی زندگی میں ہم بیسیوں مرتبہ لفظ "اگر" اپنی بات چیت کے دوران میں استعمال کرتے ہیں۔ لیکن شاید ہی کبھی کسی نے یہ غور کرنے کی تکلیف گوارا کی ہو کہ اس مختصر سے لفظ کو ہماری زندگی — میں کتنی اہمیت حاصل ہے اور ہم کس حد تک اس لفظ کے گھن چکر میں پھنسے ہوئے ہیں تین حروف پر مشتمل یہ لفظ اپنے دامن میں کچھ ایسے اختیارات رکھتا ہے کہ ہم اکثر اس کے حضور میں رحم کے ملتجی ہوتے ہیں۔

خاصیت کے لحاظ سے یہ شرطیہ بھی ہے اور قیاسی بھی۔ معنی اس کے جتنے سادہ اور آسان ہیں، بیان کرنے میں اتنے ہی مشکل اور دقیق۔ میں آپ سے پوچھوں کہ "کیوں صاحب، اگر کے معنی کیا ہیں؟" تو آپ فوری جواب نہیں دیں گے۔ بلکہ چند مثالیں پیش کر کے اپنے مطلب کو واضح کرنے کی کوشش کریں گے جس پھرتی سے آپ "آگاہ" کے معنی "خبردار" یا "انبار" کے معنی "ڈھیر" بتا سکتے ہیں۔ اسی لہجے میں آپ "اگر" کے معنی نہیں بتا سکیں گے اور یوں گویا ہوں گے کہ "اگر حرفِ شرط ہے جو شرط کے محل پر بولا جاتا ہے۔ جیسے اگر محنت کرو گے تو کامیاب ہو جاؤ گے یعنی اگر کا استعمال کلام کو دو جملوں میں تقسیم کرتا ہے اور دوسرا جملہ اس فعل کا نتیجہ یا بدلا ہے جو پہلے جملے میں بیان کیا گیا ہے۔"

جواب دینے والا اگر گرامر دان ہو۔ تو وہ یہ بھی کہے گا "کہ اگر، جو، جب، چونکہ، شرط کے معنی پیدا کرتے ہیں۔ اگر فارسی کا حرف ہے جو اردو میں بھی مستعمل ہے اور یہ نثر اور نظم دونوں میں آتا ہے۔" یعنی یہ سب ایک چھوٹے سے لفظ کو بیان کرنے کے لئے کہا جائے گا اور بعض قواعد دان قواعد بھی اضافہ کریں گے کہ "اگر کے استعمال کے ساتھ حرفِ جزا ضرور استعمال ہوتا ہے اور حروفِ جزا تو ہمیشہ پہلے جملے کا نتیجہ ہوتے ہیں اور ان کے استعمال کے بغیر فقرہ نامکمل رہتا ہے۔" اور تب متعدد مثالیں کہی جا سکتی ہیں۔

اگر تم تھک گئے ہو تو ہم بیٹھ جاتے ہیں۔ اگر مجھے پیشتر اس امر کے متعلق بتایا جاتا تو میں ضرور دھیان رکھتا۔ اگر تمہاری جگہ میں ہوتا تو انکار کر دیتا۔ اگر سب مویشی ہوتے تو یہ دنیا ایک چراگاہ بن جاتی۔ اگر سب کو بیس سال کی عمر پانے پر بیس لاکھ روپیہ مل جایا کرتے تو کوئی بھی کسی کے لئے بوجھ نہ ثابت ہوتا۔ اگر ہمیشہ مثبت ہو کر مفلسی کی چیخ پکار مسرتوں اور قہقہوں میں بدل جائے۔

یعنی اس طرح مثالوں کا ایک دفتر لگا دیا جائے گا اور اگر کا دریافت کنندہ بالآخر اتنے لمبے چوڑے جواب کو بھی ناتسلی بخش قرار دے گا۔ کیونکہ اسے ایک مختصر سے لفظ کا مختصر سا جواب چاہیئے۔ "اختصار ظرافت کی جان ہے۔" شاید کسی اگر کے معنی پوچھنے والے نے ہی کہا ہوگا۔

بعض لوگوں کا نظریہ یہ ہے کہ جو لوگ زیادہ بولتے ہیں ان میں عقل و فہم کے جزو زیادہ ہوتے ہیں اور وہ تعلیم و مطالعہ سے بہرہ ور ہوتے ہیں لیکن ایسے لوگوں کی تعداد بھی کم نہیں جو اکثر حالتوں میں خاموشی کو گفتار پر ترجیح دیتے ہیں اور ان دونوں قسم کے افراد کے علاوہ ایک ایسا طبقہ بھی ہے جو خاموشی اور بیان دونوں سے ہی گریز کرنا چاہتا ہے۔ موخرالذکر کچھ اس قسم کا دماغی توازن رکھتے ہیں کہ ان کے نزدیک زندگی کے معنی موت سے کچھ کم ہوتے ہیں۔ لیکن اگر کو ہر قسم کے لوگ ایک ہی معنی میں لیتے ہیں۔ اگر کے مقام پر سب لوگ ہم آواز ہیں اور اگر کو ایک عالمگیر حیثیت حاصل ہے۔

لفظ ظاہری طور پر کچھ بھی نہیں ہوا کرتے۔ لیکن معنوی لحاظ سے ٹھوس اور مدلل ثابت ہوتے ہیں۔ آپ اگر کو ہی لیجئے۔ معمولی سے تین حرفوں پر ختم ہے اور ان تینوں حرفوں کو علیحدہ علیحدہ لکھ دیجئے۔ تو ایسے معلوم ہوگا جیسے کوئی بچہ اپنے ہم سبق کی مشق کر رہا ہے۔ ان تینوں حروف کو الٹ پلٹ کر لکھئے ایسے معلوم ہوگا جیسے وہی بچہ خواہ مخواہ کسی کا نام لکھنے کی کوشش کر رہا ہے اور اگر یہی اگر آپ کسی شرط یا فرض یا قیاس کے محل پر کہیں تو آپ کا جملہ کافی اہمیت کا مالک ہوگا۔ تصورات کی دنیا میں یہی اگر ہمیشہ اندھے کی لاٹھی کی طرح سہارا دینا چلا جاتا ہے اگر یہ دیکھنا ہو کہ اگر کا مرتبہ کتنا بلند اور اس کا استعمال کس قدر ناقابلِ پرہیز ہے تو اسے اپنی لغات سے کچھ دیر کے لئے معطل کر دیں۔ اپنے کلام سے منسوخ کر دیں۔ آپ چند ہی لمحوں کے بعد یہ محسوس کریں گے کہ آپ کی حالت اس گونگے کی طرح ہو گئی ہے جو اشاروں سے اپنا مطلب سمجھاتا ہے۔

بلاشک و شبہ اگر کو ہماری قوت گفتگو میں اتنی ہی جگہ ہے جتنی کہ امید کو ہماری زندگی میں۔ ہم امید کرتے ہیں کہ ہمیں فلاں کام میں کامیابی

ہوگی لیکن جب ہماری امید بے رنگ ثابت ہوتی ہے تو ہم دل کو یونہی بہلا لیتے ہیں کہ "اگر یوں ہوتا تو ہمیں ناکامی نہ ہوتی" اور اس طرح اگر اور امید میں ایک خاص رشتہ ہے۔ کسی فیلسوف نے کہا ہے کہ "دنیا بہ اُمید قائم" اور اب جبکہ ہم اگر کو بھی امید کے حلقے میں مقیم دیکھ رہے ہیں تو ہمیں یہ کہنے میں تامل نہیں کہ جب تک اگر ہے تب تک دنیا ہے۔ اگر اور امید میں بھائی بہن کا تعلق ہے اور اس تعلق کا معاہدہ اتنا ہی قدیم ہے جتنا کہ "تاریخ جن" کا پہلا قصہ اور یہ معاہدہ اتنا ہی پختہ ہے جتنی کہ ضعیف الاعتقادی کی آخری کڑی۔

خواہش امید کی بہن ہے اور قدرتی طور پر اسے اگر سے خاندانی الفت ہے۔ ہمارے اندر خواہش اور امید کی تگ و دو کچھ اس رفتار سے ہو رہی ہے کہ ہم یہ نہیں جان سکتے کہ دونوں میں سے مقدم کون ہے۔ تاہم اس امر سے سب واقف ہیں کہ یہ دونوں یکے بعد دیگرے ہمارے دل و دماغ میں ظاہر ہوتی ہیں اور قدرے غور و خوض کے بعد ہمارا اندازہ یہ ہے کہ خواہش امید کی پیش رو ہے۔ خواہش اور امید کی رفتار وہی ہے جو حرفِ شرط اور حرفِ جزا کی۔ ہم پہلے خواہش کرتے ہیں اور پھر اس کی تکمیل کی امید رکھتے ہیں۔ گویا امید خواہش کا حاصل ہے۔

اب ذرا خواہش کا حسب و نسب ملاحظہ ہو کہ یہ تمام تکلیفوں کی بنیاد ہے۔ گوتم بدھ نے اپنی تمام عمر دشوار ترین اعمال میں گذار کر یہی معلوم کیا کہ اس دنیا میں ہر طرف مصیبتیں ہی مصیبتیں ہیں اور خواہش ہر مصیبت کا باعث ہے۔ اگر ہم خواہش کو کلی طور پر ترک کر دیں تو ہماری زندگی مجسم راحت بن جائے گی۔ ہر خواہش اپنے دامن میں کانٹے رکھتی ہے۔ اس لئے اس سے گریز کرنا ہی دور اندیشی ہے۔

یہ امر بھی نظر انداز نہ کیجئے کہ خواہش اگر سے وابستہ ہے۔ خواہش ہمارے دل سے اٹھتی ہے۔ اگر ہماری زبان سے ادا ہوتا ہے اور اس طرح دونوں ایک ہی مقصد کی طرف بڑھے جاتے ہیں۔

تصویر کے دوسرے رخ کا مطالعہ ذرا گہری نظر سے کیجئے۔ ظاہر ہوگا کہ اگر ہی ہماری بدبختیوں کے لئے ذمہ دار ہے۔ اگر ہی ہمارے شاد لمحات کو ناشاد ساعتوں میں تبدیل کر دیتا ہے۔ اور یہ اگر ہی ہے جو ہماری کوششوں کو اپنی سیاہیوں سے ناکام بنا دیتا ہے۔ اگر ہماری زندگی کو متواتر چوٹیں لگا رہا ہے اور ہم لڑھکتے ہوئے نہ جانے کن اہرمنی پستیوں میں گر رہے ہیں۔

فلمی دنیا

فلم "صاحب کبیر" —— حاجی لق لق کی نظروں سے

یونٹی پروڈکشن کے مالک سیٹھ لاہوری رام تمام ہندوستان کی متعدد مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے "صاحب کبیر" جیسی پاکیزہ فلم بناکر ملک بھر کے سرپر احسان کیا۔ فلم کیا ہے۔ اتحاد واتفاق کا درس ہے۔ محبت وآشتی کی تلقین ہے۔ انسانی اخوت کی دعوت ہے۔ ہندو مسلم ملاپ کی تعلیم ہے۔

کبیر بنارس کے ایک مسلمان گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ ذات کے جولاہے تھے۔ لیکن بچپن ہی میں آپ کا دل ودماغ نور معرفت سے روشن ہوگیا۔ آپ کے متعلق بے شمار روایات مشہور ہیں۔ اور آپ کی زندگی بھی اس دور سے گزری جس سے پہلے آپ کے فلسفۂ اخوت کا مضحکہ اڑایا گیا۔ پھر کھُلم کھُلا مخالفت کی گئی۔ سماج نے اپنے روایتی تعصب سے کام لے کر آپ پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا۔ لیکن بالآخر حق کی فتح ہوئی اور آپ کا شمار ان برگزیدہ ہستیوں میں ہونے لگا جو مختلف زمانوں میں دنیا کیلئے شمع ہدایت بن کر آتی رہیں۔

فلم کی سب سے نمایاں خوبی یہ ہے کہ ایک غیر دلچسپ اور خشک داستان کو ایسی نفاست سے پیش کیا گیا ہے۔ جو ایک رومانی افسانے سے کسی طرح بھی کم دلکش نہیں۔ عام فلموں کا سرمایۂ تفریح یہیں تک محدود رہتا ہے۔ کہ اس میں چند بازاری قسم کے گانے بھر دیئے۔ شراب خوری کے مناظر دکھا دیئے۔ مکالمے میں فحاشی داخل کر دی۔ بھونڈے مذاق اور اخلاق یافتہ "لطائف" شامل کر دیئے۔ ایک آدھ نیم برہنہ ناچ دکھا دیا۔ ہیرو اور ہیروئن کے معاشقے اور نغمہ سرائیاں پیش کر دیں۔ لیکن "صاحب کبیر" ان تمام فحاشیات سے یکسر پاک ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس درس بصیرت میں کوئی دلچسپی نہیں۔ کبیر صاحب اور ان کی شاندار زندگی کے مختلف حقائق نہایت دلفریب انداز میں دکھائے گئے ہیں۔

کبیر جی کے دوہے اور گیت ایسے اثر ریز ہیں۔ کہ دل میں اُتر جاتے ہیں۔ وہ سین خصوصیت سے رقت انگیز ہے جبکہ آپ والدہ کے مرنے کے بعد دنیا کے دھندے چھوڑ چھاڑ کر جنگل کی راہ لیتے ہیں۔ اور قدرتی مناظر میں اپنے دوہے گاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مثلاً:۔

چلتی چکی دیکھ کے دیا کبیرا روئے
دو پاٹن کے بیچ میں ثابت رہا نہ کوئے

کون ہوگا۔ جس نے کبیر جی کا یہ دوہا نہ سُنا ہو۔ لیکن ڈائرکٹر کی قابلیت داد کی مستحق ہے۔ کہ انہوں نے دوہے کے ہر ٹکڑے کے لئے بیک گراؤنڈ بنا کر دلچسپی پیدا کر دی۔ جونہی "چکی" کا لفظ کبیر جی کی زبان سے ادا ہوتا ہے۔ فوراً "چلتی چکی" کا نظارہ سامنے نظر آتا ہے۔ مکالمے صاف، سلیس اور عام فہم ہیں۔ اور اختصار کا پہلو لئے ہوئے ہیں۔ ریکارڈنگ بے عیب ہے اور عکاسی قابلِ تعریف۔

کبیر جی کی زندگی کے ہزارہا واقعات میں سے صرف وہ باتیں منتخب کی گئی ہیں۔ جو اپنے اندر روحانی اپیل رکھتی ہیں اور جنکی سحر کاری نے فلم کو بہت بلند معیار پر پہنچا دیا ہے۔ مسجد میں ملّا وعظ کر رہے ہیں اور مندر میں پنڈت اُپدیش کر رہے ہیں۔ لیکن ان ملّاؤں اور پنڈتوں کا واحد مقصد یہ ہے کہ نوجوان کبیر کو بنارس سے نکلوا دیا جائے۔ جب وعظوں اور اپدیشوں سے کام نہیں بنتا تو یہ لوگ راجہ کے دربار میں فریادی بن کر جاتے ہیں۔ ملزم شاہی عدالت میں پیش کیا جاتا ہے استغاثہ کی طرف سے ہنگامہ خیز تقریریں کی جاتی ہیں۔ اور سامعین کو یہ گمان گزرتا ہے کہ اب ملزم کی خیر نہیں۔ لیکن یہی وقت کبیر جی کی روحانی ظفر مندی کا ہے۔ وہ اپنی صفائی میں لفاظی سے کام نہیں لیتے۔ بلکہ یہی کہتے ہیں کہ رام اور رحیم ایک ہیں۔ کرشن اور کریم ایک ہیں۔ یہ سیدھی سادھی باتیں راجہ کے دل میں تیر کی طرح لگتی ہیں اور راجہ کبیر جی کو دعوت دیتا ہے کہ کبھی کبھی دربار میں آکر ہمیں اپنے کلام معرفت سے مستفیض فرمایا کریں۔ یہ سن کر ملّا اور پنڈت خائب وخاسر گھروں کو واپس چلے جاتے ہیں۔

واقعات کو نہایت خوبی سے (ایڈٹ ومرتب) کیا گیا ہے۔ جس کے لئے ایڈیٹر مستحق مبارکباد ہے۔

فلم کے ہیرو نے کبیر جی کا کردار پیش کرتے ہوئے فن اداکاری

کے جوہر دکھائے ہیں - اور اصل ونقل کی حد فاصل کو مٹا دیا ہے - میک آپ ، لباس ، وضع قطع اور لب ولہجہ تاریخی حقیقت کے عین مطابق ہے - بھگت جی کی ماں کا پارٹ کچھ کم اہم نہیں لیکن مہتاب نے ایک مشکل کردار کو قابل تعریف انداز میں سنبھالا ہے -

کاسٹ میں جس بچے کو کبیر جی کا زمانہ طفلی پیش کرنے کے لئے منتخب کیا گیا ہے - اس کا پارٹ دیکھ کر میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ایکٹر کی حیثیت سے اس کا مستقبل شاندار ہوگا ۔ وہ سراپا روحانی پیکر بن کر ہمارے سامنے آتا ہے اور اس کی میٹھی باتیں دل پر گہرا اثر ڈالتی ہیں -

مظہر نے کبیر جی کے باپ کے روپ میں آکر ایک دفعہ پھر فن اداکاری کا شاندار مظاہرہ کیا ہے - فی الحقیقت یہ مشکل پارٹ تھا اور اس کے لئے ایک مظہر خاں کی ضرورت تھی - جوانی میں اس کا لب ولہجہ تنومند کا جوان کا تھا - لیکن بڑھاپے کے دور میں یہ یقین کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ وہی شخص ہے اپنی کردار نگاری سے وہ فلم پر چھا جاتا ہے -

ڈائرکٹر کی ہدایت کاری فلم کے ہر ایک اہم مرحلے پر نمایاں ہے - جولاہوں کی پنچایت کا سین دیکھ کر تماشائی سوچنے لگتا ہے - کہ کبیر جی کے زمانے کے اتنے جولاہے کس طرح ایک جگہ اکٹھے ہو گئے - ان کی صورتیں دیکھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ بنارس کے اصلی باشندے ہیں جن کی بنی ہوئی بنارسی ساڑھیاں دنیا بھر میں مشہور ہیں - اور عورت ذات کو کچھ کا کچھ بنا دیتی ہیں - لیکن ان کا پارٹ دیکھ کر معلوم ہوتا ہے - کہ یہ سب کچھ ڈائرکٹر کی نظر انتخاب اور ایکٹروں کے فن کا مظاہرہ ہے -

اس اتحاد پرور فلم کی ایک اور خوبی یہ ہے - کہ اس میں بھرتی کا کوئی سین نہیں - چھوٹے سے چھوٹا واقعہ ایک مربوط داستان کی کڑی ہے - ماں باپ نے اپنے لاڈلے بچے کے بیاہ کے لئے بڑے چاؤ سے زردوزی ٹوپی اور جوڑا تیار کیا تھا - ظاہر بین آنکھ اسے ایک بے معنی سی بات سمجھے گی - لیکن یہی جوڑا کبیر جی کی والدہ کے جنازے کو ڈھانپتا نظر آتا ہے - اور ایک نہایت اثر ریز سین کا ذریعہ بن جاتا ہے - پھر خیال ہوتا ہے کہ ٹوپی کا کیا بنے گا ؟ - یہی ٹوپی سفید ریش کبیر موت کے سائے میں زیب سر کرتا ہے - اور ایک کجکلاہ تاجدار کی طرح موت کو لبیک کہتا ہے - اس کی روحانی لغت میں موت ایک شادی سے عبارت ہے - وہ لوگوں کو اپنی برات میں شامل ہونے کی دعوت دیتا ہے اور کہتا ہے کہ "آج میری شادی ہے -" اس کا چہرہ ایک نئی شادمانی سے چمک اٹھتا ہے - غرضیکہ اس قسم کی بے شمار لطافتیں اس روحانی فلم میں پائی جاتی ہیں - میرے خیال میں بہت کم ایسے فلم ہوں گے - جن میں کوئی روحانی نہ ہو - اور وہ تماشائیوں کے دل ودماغ پر مسلط ہو جائے یہ ایک

شاندار اتحاد پرور، دلفریب، تاریخی فلم جو روحانی حقائق سے معمور ہے "یہی فلم بھگت کبیر کیلئے اس عنوان کو موزوں سمجھتا ہوں اور نشاط سینما کے مینجر اور دوسرے کارکنوں سے اظہار ہمدردی کرتا ہوں کہ فلم کی ہنگامہ خیز کامیابی سے متاثر ہو کر انہیں تماشائیوں کے انبوہ کثیر سے نمٹنا پڑتا ہے۔

رائے صاحب

مجھے ایک دوست کی تحریک پر "رائے صاحب" دیکھنا پڑا۔ اور فلم کے خاتمہ پر میں اپنے دوست کی خوش ذوقی کی داد دینے پر مجبور ہو گیا۔ اس نے یہ بلند بانگ دعوائے کیا تھا کہ رتن بائی جس دلاویزی سے اس فلم میں گاتی ہے اس کی نظیر کسی دوسرے فلم میں نہیں ملتی۔ اگر اسے رتن بائی کے ایک "فین" کا مبالغہ آمیز بیان سمجھ لیا جائے تو بھی بے تامل کہا جا سکتا ہے کہ جہاں تک اداکاری اور موسیقی کا تعلق ہے اس فلم میں رتن بائی نے اپنا گذشتہ ریکارڈ توڑ دیا ہے۔ فلمی اصطلاح میں رائے صاحب کا شمار "الف" میں تو نہیں لیکن "ب" میں ضرور ہو سکتا ہے۔ یعنی غیر اصطلاحی زبان میں کہہ سکتے ہیں کہ رائے صاحب دوسرے درجہ کی اعلیٰ تصویروں میں سے ایک ہے۔

ایس۔ ایم یوسف نے ایک اچھی دلچسپ کہانی مرتب کی ہے جس میں وحید قریشی کی مکالمہ نگاری نے شگفتگی پیدا کر دی اور ان کی غزلوں اور گیتوں نے رتن بائی کی خوش گلوئی کے ذریعہ فلم کو کیف آور بنا دیا۔ رائے صاحب کے پارٹ میں جگدیش سیٹھی ایک دفعہ پھر خاص رنگ کا آرٹسٹ نظر آتا ہے۔ نیو تھیٹرز کو چھوڑنے کے بعد اس کے مداحوں کو یہ اندیشہ دامن گیر رہا۔ کہ وہ کلکتہ کے دیرینہ رفقائے کار کے دائرہ سے نکل کر بمبئی کی نئی زندہ فلمی دنیا میں کہیں کھو نہ جائے لیکن آرٹ چھپا نہیں رہتا۔ بمبئی پہنچ کر اس نے تین تین چار چار فلموں میں ایک ساتھ کام کرنا شروع کر دیا لیکن ہر موقع پر اس کا مخصوص رنگ قائم رہا۔ رائے صاحب میں وہ مرکزی کیرکٹر ہے جسے اس نے نہایت نفاست سے نبھایا ہے۔

کوشلیا نے منورما لیلا اور شوبھا کا سہ گانہ اور ترلوک نے پرکاش اور رمیش کا دوگونہ پارٹ کمال خوش اسلوبی سے ادا کیا ہے۔ ایڈیٹر کا خاکہ اڑانے میں میرزا مشرف کامیاب رہے اور تھیٹریکل کمپنی کو خستگی سے بچانے کے لئے جوگی مشرف اور گوپی کی سازش مزاح کا اچھا نمونہ ہے۔

شاعری میں وہ عنصر نظر آتا ہے جسے طنز یہ طور پر پروگیسو یا ترقی پسند کہتے ہیں۔ مثلاً "کیوں پیچ اٹھی بجنی . . . . پیچ اٹھی بجنی"

بتائیے جناب بجنی آخر اس غل غپاڑے کی وجہ۔

"اب من کی چیخیں سنتے سنتے جائے گی جوانی بیت بجنی۔"

اب معلوم ہوا کہ یہ دل کی فریاد تھی۔ ورنہ چیخیں سن کر شاید ہمسائے گھر کا محاصرہ کر لیتے۔

خیر ہیرہ و تار رات کے بعد صبح ہوئی شوبھا، رمیش اور رائے صاحب تینوں یکجا ہوئے۔ رائے صاحب نے کلیجہ پر پتھر رکھکر اپنی محبوبہ کو جو در اصل ان کی لڑکی تھی رمیش کے سپرد کر دیا اور قصہ ختم ہوا۔

ناظر بی۔ اے

مختلف زاویہ ہائے نظر

شریمتی کملا دیوی چٹو پادھیا:۔

بمبئی کے ایک فلمی معاصر سے دوران گفتگو میں شریمتی نے اپنی ابتدائی زندگی پر نظر بازگشت ڈالتے ہوئے کہا۔ کہ "میں سٹیج کی دلدادہ تھی اور سماج آرٹ اور آرٹسٹ کی طرف غضبناک نگاہوں سے دیکھتی تھی۔ لوگوں نے میری مخالفت کی۔ لوگ تو ایک طرف، میرے اپنے خاندان کے افراد نے مجھے حقارت سے دیکھا۔ لیکن میں اپنے عزم پر قائم رہی۔ آخر تعصب کی دیواریں ٹوٹ گئیں اور اب زیادہ سے زیادہ عورتیں سٹیج اور سکرین پر آ رہی ہیں۔"

اس سوال کے جواب میں کہ آخر وہ کونسی چیز تھی جو آپ کو سٹیج کی طرف کشاں کشاں لے گئی۔ آپ نے کہا۔ کہ سٹیج! میں بے اختیار اس کی جانب کھنچی چلی گئی۔ دل میں جذبہ اشتیاق زوروں پر تھا۔ آرٹ کی جو روح مجھ میں کارفرما تھی۔ میں اس کا مظاہرہ کرنا چاہتی تھی۔ سکول میں اس کے لئے مجھے موقع مل چکا تھا۔ لیکن میری خواہش تھی۔ کہ زندگی میں داخل ہونے کے بعد میں سنجیدگی سے اپنے آرٹ کو ترقی دوں۔

سٹیج اور سکرین کا معاملہ

اخباری نمائندہ نے ایک بہت دلچسپ سوال پوچھا۔ کیا ہندوستان میں سٹیج کے لئے ترقی کے امکان ہیں۔ کیا فلموں نے تھیٹر پر مخالفانہ اثر نہیں ڈالا۔ شریمتی کملا دیوی نے کہا۔ کہ سٹیج کے لئے ترقی کے امکانات غیر محدود ہیں۔ سٹیج ہماری قومی کلچر کا لازمی جزو ہونا چاہیئے۔ قومی تعمیر میں اسے ایک اونچا درجہ دینا چاہیئے۔ آئرلینڈ کی تحریک آزادی میں سٹیج کو اہم دخل تھا۔ اور اب چین میں نو حکومت نے قومی اور سوشل بیداری کے لئے وسیع پیمانہ پر ڈراموں سے کام لینا شروع کیا ہے۔ کیا سٹیج سینما کی دست برد سے محفوظ رہے گا۔ اس کے جواب میں آپ نے فرمایا کہ سٹیج کی حیثیت جداگانہ ہے اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں سٹیج صرف زندہ ہی نہیں بلکہ زور شور سے زندہ ہے۔ تھیٹریکل ڈراموں کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ لوگ ہفتوں پیشتر اپنی نشست ریزرو کرا لیتے ہیں۔ سینما اس معاملہ میں سٹیج کی گرد کو نہیں پہنچ سکتا۔ ترقی یافتہ ملکوں میں ڈرامہ کے نشوونما کے لئے نئے نئے تجربے ہو رہے ہیں۔

وسنت سینا اور بکھرے موتی میں پارٹ کیا

مسز چٹو پادھیا نے ہندوستان میں سٹیج کے انحطاط پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا۔ کہ یہاں ابھی یہ ترقی کی

منزلیں طے کر رہا تھا - ابھی پورے شباب پر آیا تھا کہ سینما نے اس پر دھاوا کر دیا - وہ سینمائی حملہ کی تاب نہ لا سکا - ایک ارزاں ذریعۂ تفریح نے گرانقدر آرٹ کو پیچھے دھکیل دیا - اس کے باوجود یاد رہے کہ ہندوستانی سینما کو اس وقت تک جو فروغ ہوا ہے - وہ اس کے لئے سٹیج کا مرہونِ منّت ہے - آپ نے کہا - کہ میں نے خود بھونانی کی وسنت سینا اور لعد کو بکھرے موتی میں پارٹ کیا تھا - لیکن دونوں کا ٹیکنیک علیحدہ ہے - جذباتی طور پر میں سینما کو اپنا نہ سکی -

مہاتما گاندھی کی مخالفت کا جواب

"شہباز" کے گذشتہ شمارہ میں سینما کے متعلق مہاتما گاندھی کی رائے قارئین کرام کی نظروں سے گذر چکی ہے - مسز کملا دیوی چٹو پادھیا سے استصواب رائے کیا گیا - تو آپ نے گاندھی جی کی رائے کو برحق قرار دیا - آپ نے کہا کہ ہر انصاف پسند سینما کی موجودہ حالت سے بیزار ہے - " ہمارے فلم حقیقت سے اسقدر دُور واقعیت سے اسقدر بیگانہ اور ہندوستانیوں کی آرزوؤں تمناؤں اور کشاکش مقاصد سے اتنے بے نیاز ہیں کہ وہ اوّل سے آخر تک ہالی وُوڈ کی نقالی کا پیکر بن گئے ہیں - ضرورت اس بات کی ہے کہ رائے عامہ کو صحیح راہ پر لایا جائے -

" آپ کو کس قسم کے فلم پسند ہیں؟" آپ نے کمال برجستگی سے اس سوال کا جواب دیا -

" میں ایسے فلم دیکھنے کی تمنائی ہوں - جن میں زندگی کی لہر موجزن ہو - مجھے اس بات کی پروا نہیں کہ وہ المیہ ہوں یا مزاحیہ - وہ بہرحال دلچسپ ہوں - "

مسز چٹو پادھیا حال ہی میں امریکہ جاپان اور چین کے دورہ سے واپس آئی ہیں - جاپانی فلموں کے متعلق آپ نے کہا کہ تاریخی واقعات کی بنا پر جو فلم جاپان میں دکھائے جاتے ہیں - وہ تو جاپانی قومیت کے اعتبار سے گوارہ ہیں - لیکن کامک فلم مذاق سلیم سے عاری ہیں - چین کی نئی روح چینی فلموں میں آشکارا ہے - حکومت چین نے تصویروں کے ذریعہ لوگوں کو تعلیم دینے میں روس کی کامیاب تقلید کی ہے - گو چینی فلم ٹیکنیک کے اعتبار سے روسی سینما کا مقابلہ نہیں کر سکتے -

کلاڈٹ کوبرٹ :-

" ۷۵ ہزار پونڈ سالانہ!" بیچارے افلاس زدہ اخباری رپورٹر نے حیرت زدہ ہوکر مشہور ایکٹرس کلاڈٹ کوبرٹ سے پوچھا :- " آپ کے لئے تو اتنا روپیہ خرچ کرنا بھی مشکل ہو جاتا ہوگا؟" ملکۂ مصر " کلیوپیٹرا" کا پارٹ کرنے والی ایکٹرس نے جواب میں پہلے تو ایک قہقہہ لگایا - اور پھر کہا " فی الحقیقت بڑی مشکل سے گذارہ کر رہی ہوں "

کلاڈٹ کوبرٹ فرانسیسی عورت ہے - اور فرانس کی زیرک اور کفایت شعار عورتوں کی طرح کاروباری اور گھریلو انتظام میں اسے خاص سلیقہ حاصل ہے - اس نے ازراہِ تشریح کہا کہ ۷۵ ہزار پونڈ میں سے ۴۲۸۶۴ پونڈ مجھے انکم ٹیکس ادا کرنا پڑتا ہے - ۷۵۴۹ پونڈ میرا ایجنٹ جو میرا بھائی ہے لے جاتا ہے - ۲ ہزار پونڈ میرے ملازموں کی تنخواہ ہے - میرے دو سیکرٹری ہیں - - - - - - - - - -

- - - دو مالی ایک ٹیلر ایک شوفر ایک باورچی اور دو نوکرانیاں - امریکہ میں گھریلو خادموں کی تنخواہ ۳ سے لیکر ۶ پونڈ فی ہفتہ سے کم نہیں - ان مصارف سے قطع نظر ۵ سو پونڈ سالانہ موٹر کاروں پر صرف ہوتا ہے -

کلاڈٹ کوبرٹ نے کہا کہ خرچ نکال کر میرے پاس صرف ۲۰ ہزار پونڈ رہ جاتے ہیں - کلاڈٹ کوبرٹ کی ماں اور ماموں اور پھر ماموں کے لڑکے اور لڑکیاں فرانس میں ہیں - ان سب کا خرچ اس کے ذمّے ہے - اس نے کہا مجھے ہر سال نئی موٹر کار خریدنا پڑتی ہے - اور ہالی ووڈ میں اعلےٰ مجلسی حیثیت کا تقاضا ہے کہ وہ ہر سال نیا سمور کا کوٹ خریدے - جسے وہ نئے فلموں کی افتتاحی تقریب پر پہنتی ہے - اس کے معمولی لباس کی قیمت ۴۰ پونڈ سے کم نہیں -

امریکن اداکاروں کے کثیر معاوضے محض ان کی فنّی قابلیت یا شہرت پر موقوف نہیں - تجربہ شاہد ہے - کہ بعض اعلیٰ درجہ کے فلم آمدنی کے لحاظ سے ناکام رہتے ہیں - اور اکثر اوقات متوسط معیار کے فلموں کی آمدنی خلاف توقع بڑھ جاتی ہے - ایسے فلموں کے اداکار آئندہ پروگرام کے لئے منہ مانگی تنخواہ لے سکتے ہیں اور لیتے ہیں -

مس سوشیلا المبیار ایم - اے

مس موصوفہ نے ستمبر کے فلم انڈیا کے ذریعہ " دھارمک " فلموں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی ہے - وہ فلم سازوں سے اپیل کرتی ہیں کہ ازرائے خدا دیوتاؤں کو سنگھاسن پر براجمان رہنے دو - انہیں تنگ نہ کرو - " میں بچپن میں دیوتاؤں کی پوجا کیا کرتی تھی - لیکن جب سے میں نے انہیں فلموں میں دیکھا ہے - میرے دل سے ان کی عقیدت اُٹھ گئی ہے - میں انہیں برتر از وہم و گمان روحانی ہستیاں سمجھتی تھی - لیکن فلم سازوں نے انہیں ایسے روپ میں پیش کیا ہے - جس میں تقدس کا شائبہ تک نہیں - پردۂ سیمیں پر ہمیں ایسے دیوتا دکھائے جاتے جو بے طرح تنومند و جسیم ہوں - جن کے پیٹ بڑھے ہوئے ہوں - بعض مجنوں کی طرح لاغر ہیں - بعض دیو زاد معلوم ہوتے ہیں اور بعض بالشتیے - بعض دیوتاؤں کی داڑھی ناف تک پہنچتی ہے -

اور بعض "فارغ البال" ہیں - ان باریش اور بے ریش دیوتاؤں میں ایک قدر مشترک یہ ہے - کہ ان سب کے دانت شکستہ اور میلے ہیں ہیں پوچھتی ہوں - کہ دیوتاؤں کی کھوپڑی میں کوئی دندان ساز نہیں ہے - مہرشی نارد کو کبھی داڑھی مونچھوں کے ساتھ اور کبھی ان کے بغیر پیش کیا جاتا ہے - یوں معلوم ہوتا ہے - کہ فلم ساز اس پارٹ کے واسطے ایک ایسے شخص کو چنتے ہیں - جو گانا جانتا ہو - بس - پرماتما نے انسان کو اپنے روپ میں جنم دیا ہے - لیکن ہم جن دیوتاؤں کو فلموں میں دیکھتے ہیں - انہیں اس روپ سے کوئی واسطہ نہیں - بعض دیوتاؤں کی شکلیں تو بالکل انڈے کی طرح صاف ہیں - اور یہ ساری حماقتیں آرٹ کے نام پر کی جاتی ہیں

ناظر بی - اے

نقد و نظر

شیخ و برہمن

ڈاکٹر اعظم کریوی کے سولہ افسانوں کا ایک دلپذیر مجموعہ شیخ و برہمن کے معنی خیز عنوان سے منظرِ عام پر آیا ہے۔ اسی عنوان کے افتتاحیہ افسانہ میں شیخ منیر اور پنڈت دیاشنکر کے برادرانہ تعلقات سے پریم چند کے قلم کی پڑوسی کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ جس میں ٹھاکر اور مرزا کی دوستی نے گاؤں والوں کو باہم نفاق کے امن سوز شعلوں سے بچا لیا تھا۔ موضع کھجنا میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ زندگی کے حالات ڈاکٹر اعظم نے بہ درجۂ کمال نفسیاتی اور فنی خوبیوں سے ایک بصیرت افروز کہانی کی صورت میں پیش کئے ہیں۔ اس مجموعہ میں جو افسانے ہندو معاشرت سے متعلق ہیں ان کا لائق تحسین پہلو ہندو سماج کا گہرا مطالعہ ہے۔ ہندوانہ رسم و رواج ہندو ناری کی سماجی حیثیت اس کے جذبات مشترکہ خاندان میں نابالغ خاوند اور بہو کی بیچارگی و بےبسی ساس اور خسر کا صبر آزما حد تک ستمرانہ سلوک اور بیشتر حالتوں میں اس سلوک کا ردِ عمل غرضیکہ فاضل مصنف نے ہندوؤں کے سوشل نظام پر مختلف زاویہ ہائے نظر سے بیز اور بعض موقعوں پر خیرہ کن روشنی ڈالی ہے۔ "مایا" میں لکھتے ہیں:-

"رات کو بھی رادھا اپنی بہو کو اپنے پاس سلاتی تھی۔ جیسے کوئی لالچی مال گنے کا رس خوب چوس چوس کر پیئے اور بچے دور سے دیکھ کر للچائے۔ وہی حال بسنت کا بھی تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے بیوی کا رس گرہستی (گرہست؟) کی چکی میں پس پس کر مٹی میں ملایا جا رہا تھا۔ لیکن وہ کچھ نہ کر سکتا تھا۔ ماں کے خلاف کوئی کام کرنے کی اس میں جرأت نہ تھی۔ مگر ضبط کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔"

آخر ہولیوں کا کیف زا اور توبہ شکن موسم آیا۔ اور بسنت کو یارائے صبر نہ رہا۔ ڈاکٹر اعظم کے ان افسانوں میں مقامی رنگ نہایت خوشی اور صحت کے ساتھ جھلکتا ہے۔ کوئی کہانی ایسی نہیں جس کا کوئی پہلو توجہ کش نہ ہو کسی میں سبق آموزی ہے۔ کسی میں دلچسپی۔ کسی میں یہ دونوں عناصر بہترین ٹیکنیک کے ساتھ شامل ہیں۔ ہیرو قیدی کی داستان از بس دردناک ہے۔ "بھکاری کا پریم" ایک محبت زدہ نوجوان فقیر کا دلفریب اسکیچ ہے۔ اور "اچھوت" اونچی ذات کے ہندوؤں کی ناقابلِ برداشت ناروا داری کا آئینہ دار۔ داراب شاہ نے اپنی منہ بولی بیٹی رجنی سے جو سلوک کیا اس کی بنا پر وہ ہر آئینہ "شریف ڈاکو" کے لقب کا سزاوار ہے۔ ساس اور بہو کے روائتی جھگڑے "پوجا" میں مضمر ہیں۔ "قربانی" پولیس والوں کی غاصبانہ دستبرد کی رُلا دینے والی کہانی ہے۔ "پریم کی پیاسی" کا پس منظر اوّل سے آخر تک شہری ہے۔ اور ایک منطق زدہ پروفیسر کی کایا پلٹ کا نفسیاتی مطالعہ۔ اسی طرح ایک اور شہری افسانہ "خود داری" میں ہیرا طوائف کی شرمناک زندگی کا ایک انقلاب انگیز واقعہ ایک حد تک رومانی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ یتیم بعض یتیم خانوں کا عبرت اندوز مرقع ہے۔

ڈاکٹر اعظم کریوی کے آرٹ کی امتیازی خصوصیت اس کی "واقعیت" ہے۔ اور واقعیت کی حدود میں وہ اپنی فنی قابلیت کو وسیع عمیق یا بلند پیمانہ پہ بروئے کار نہیں لا سکے۔ نتیجہ یہ کہ ان کے افسانوں کی دلچسپی اور سبق آموزی سطحی ہے اور بس۔ ان کے کردار ہندوستان کی دیہاتی دنیا کے باسی ہیں۔ اس دنیا کی تصویر تو ڈاکٹر اعظم نے قابلِ تعریف صحت و صفائی سے کھینچی ہے۔ لیکن اسے تخیل کی رنگینی سے مزین نہیں کیا۔ شیخ منیر، دیاشنکر، بسنت کمار، پاروتی مایا، حمیدہ، ظفر علی، عنایت، پیارے لال۔ محمود، صفدر علی، کوشلیا، منوہر بابو کشوری رانی آغا صاحب دلدار علی۔ ٹھاکر نہال سنگھ دیوان جی، بسنت رام سکھیا، کرپا رام، ہیرا، اقبال، سریندر، چمپا، داروغہ عباس علی، رحمت، شکرو اچمار بیرو اور روپا سنگھ اپنے دہر میں چلتے پھرتے بلکہ رینگتے نظر آتے ہیں۔ وہ عالمگیر انسانیت کے مظہر نہیں۔ ان کے جذبات محدود ماحول سے اوپر نہیں اٹھتے۔ ڈاکٹر اعظم کریوی اور پریم چند میں یہی بنیادی فرق ہے۔ پریم چند کے اکثر کیرکٹر عالمگیر نقطۂ نظر کے ترجمان ہیں ان کے تخیل کی روشنی نے بھارت کے شیخ و برہمن اور دہقان کو ہندستانی سے بالاتر انسانی روپ میں بے نقاب کر دیا ہے۔ اور دیہات کی خشک دنیا میں رومانیت پیدا کر دی ہے "شیخ و برہمن" ۱۴۸ صفحوں پر محیط ہے۔ کتاب خانہ دانش محل امین آباد پارک لکھنؤ سے دو روپیہ میں حاصل کیجئے۔

متین کے سو شعر:- یہ چھوٹی سی اردو کی کتاب مولانا متین مچھلی شہری کے سو منتخب اشعار کا مجموعہ ہے جس کو سید سعدی جعفری نے مرتب کیا ہے اور مکتبہ ادب الہ آباد نے شائع کیا ہے۔ شروع میں بطور دیباچہ حضرت سائل دہلوی کا ایک مضمون ہے۔ اس کے بعد دو مضامین اور ہیں۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ سب اچھے ہیں۔ قیمت کا علم نہیں۔ البتہ مکتبہ ادب۔ فاطمہ اسٹیٹ پریاگ الہ آباد یوپی سے دستیاب ہو سکتی ہے۔

(محکمہ تعلیم پنجاب کا منظور شدہ سرکلر نمبر سی-ایم ۵۲۲ ۱۴ مئی مورخہ ۱۳)

مسئول

(ڈاکٹر) عبد الحلیم انصاری

شاہکار لاہور

نگارندہ

شیر محمد اختر

جلد (۱۴) نمبر (۱۱)

فہرست مضامین بابت ماہ نومبر ۱۹۴۲ء

ضروری اعلان

رسالہ شاہکار کو کئی بار جانچ پڑتال کرنے کے بعد ڈاک خانے کے حوالے کیا جاتا تھا۔ مگر پرچہ نہ پہنچنے کی شکایات کسی صورت کم ہونے میں نہ آتی تھیں۔ پرچہ نہ ملنے کے دیگر اسباب (مثلاً کسی شوقین دوست یا ملازم کی چیرہ دستی وغیرہ) پر تو غور نہیں کیا جاتا لیکن دفتر کو ملزم خیال کرنے میں نہایت بے دردی برتی جاتی ہے۔ ایسی شکایات سے تنگ آکر دفتر شاہکار نے فیصلہ کیا ہے کہ اس اشاعت سے پرچہ ڈاکخانے کی رسید لیکر خریدار حضرات کی خدمت میں بھیجا جائے۔ اب حضرات خریداران کو پرچہ نہ ملنے کی صورت میں اپنے ہاں تحقیق کرنے کے بعد اپنے مقامی ڈاکخانہ سے بازپرس کرنی چاہیئے۔ دفتر اس قسم کی شکایت موصول ہونے پر ڈاکخانہ کی پوسٹنگ رسید آپ کے ملاحظے اور مقامی ڈاکخانے کو دکھلانے کے لئے بھجوا سکتا ہے۔ امید ہے۔ ہمارے معاونین اس سلسلہ میں دفتر سے پورا اتفاق کریں گے۔ اگرچہ پرچے کی رسید لیکر روانہ کرنے سے دفتر کا خرچ بڑھ گیا ہے۔ مگر اب امید ہو کہ خریداروں کو یہ تو اطمینان ہو جائیگا کہ دفتر والے پرچہ ہضم کرنے روا نہیں سمجھتے۔ (مینجر)

احسان اللہ خان تاجر پرنٹر و پبلشر نے عالمگیر پریس پرانی کچہری بازار لاہور میں چھپوا کر دفتر شاہکار واقعہ فتح محمد روڈ لاہور متصل تکیہ اثری شاہ لاہور سے شائع کیا۔

مختصرات

ہمارے وزیرِ تعلیم کا تاریخی کارنامہ

محکمۂ تعلیم میں ٹائم اسکیل کے طریقے پر اساتذہ کی ترقی کے متعلق اعلان کر کے آنریبل وزیرِ تعلیم پنجاب نے استادوں کی محرومیوں اور حق تلفیوں کی ایک طویل دردناک بلکہ کچھ حد تک شرمناک داستان کا خاتمہ کر دیا ہے۔ تعلیمی لائن سے باہر رہنے والے حضرات اس تاریخی اعلان کی اہمیت کا مطلق اندازہ نہ کر سکیں گے۔ لیکن جن بدنصیب اساتذہ کی عزیز زندگی حق ناشناس اور ناحق نواز افسران کی بے التفاتیوں کے سبب سزائے زندگی بن چکی اور بن رہی تھی۔ اُن سے پوچھئے کہ وزارت تعلیم کا یہ حق پرورانہ اعلان کیا قدر و قیمت رکھتا ہے؟

سچ تو یہ ہے کہ آنریبل میاں عبدالحی کی وزارت کا یہ کارنامہ ان کے عہد کو ایک مقدس تاریخی عہد بنا دیتا ہے۔ جدید اصلاحات کے بعد سے وزارت تعلیم کے منصب پر جتنے حضرات بھی سرفراز ہوئے انہوں نے غریب استادوں کی بدحالی پر کبھی کوئی لمحۂ التفات ضائع کرنا ضروری نہ سمجھا، حق رسی اور حق رسانی کے الفاظ تو تعلیمی ڈکشنری کے متروک الفاظ میں شامل ہونے کے قابل بن گئے ہیں۔

اِس طویل و عریض صوبے کے دُور دراز گوشوں میں کس مپرسی زندگی بسر کرنے والے ہزاروں استاد اپنی طویل میعادِ ملازمت کو راہِ بے منزل کی صورت طے کر گئے اور کسی نے نہ جانا کہ اِن کے کچھ حقوق خدمت نگراں افسران کی چشمِ التفات کے بھکاری ہیں۔ حالات کی کشمکش کے فشار زدہ اپنی بے مستقبل معاشی زندگی کو محرومیوں کے ایک جاں شکار خارزار کے طے کرنے میں ختم کر گئے اور کسی نے نہ دیکھا، کسی نے نہ سوچا کہ سکونِ زندگی ان آبلہ پا رہرووں کا بھی حق تھا جو انہیں نہ مِل سکا۔

تحقیقات کی جائے تو ہزاروں واقعات ایسے ملیں گے جن میں حقداروں کی حق کُشی کر کے غیر مستحقین کو ترقیاں ملیں اور اہلِ حق دیکھتے رہ گئے۔ پھر ترقی حاصل کرنے کی خاطر عموماً ناحق کوش ٹیچروں نے افسران کو خوش کرنے کے وسائل میں روا اور ناروا کا امتیاز اٹھائے رکھا۔ اِس بدعملی کے سبب معلمی کے مقدس روایات کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا۔

کسی استاد کو اگلا گریڈ ملنا اُس کی معاشی زندگی کی عید کے مترادف سمجھا جاتا تھا۔ تو ۹۰ فیصدی اساتذہ اپنی طویل میعادِ ملازمت کو اس عید کی حسرت ہی میں ختم کر دیا کرتے تھے۔ اُن کے لئے یہ جاں سوز منظر کسقدر شاق اور ہمت شکن ثابت ہوتا ہوگا کہ اُن کے حقوقِ خدمت کو پامال کر کے غیر مستحق پس رفتگان کو ان سے آگے بڑھایا جا رہا ہے۔ تعلیمی لائن میں اگلا گریڈ لینے کے لئے کارکردگی اور شبانہ روز محنت کی بجائے کوئی بڑی سی بیرونی سفارش کامیابی کی اصلی ضمانت تصور کی جاتی تھی۔ کونسلوں اور اسمبلیوں کے ممبر استادوں کے کعبۂ آمال بنے ہوئے تھے۔ علاقے کے کسی ذی رسوخ زمیندار کی حمایت حاصل کر لینا بڑی خوش نصیبی خیال کی جاتی تھی اس ناگفتہ بہ صورت حال کا اثر یہ ہوا کہ گریڈ کے پرستاروں نے تعلیمی کارکردگی اور اخلاقی عظمت کی جانب سے آنکھیں بند کر لیں اور اس کا غیر محسوس مگر عظیم نقصان جدید نسل کو اٹھانا پڑا۔

ان ناگفتنی حالات پر سرسری نظر ڈالنے کے بعد ہر شخص آنریبل وزیرِ تعلیم کے اس تاریخی اقدام پر صدائے تحسین و آفرین بلند کرے گا۔ واقعہ یہ ہے کہ ہمارے گرامی جاہ وزیر نے اساتذہ کی کس مپرس و بے مستقبل زندگی بسر کرنے والی جماعت کو ہمیشہ کے لئے اپنا گرویدۂ احسان بنا لیا ہے۔

وزیرِ تعلیم کے اس مبارک اقدام کا۔ اثر یہ ہوگا کہ اساتذہ اپنے حال اور مستقبل سے مطمئن اور زندگی کی پامال کُن کشاکش سے رہا ہو کر ہمہ تن اپنے فرائض تعلیم میں منہمک اور ترقی کے لئے وسائلِ ناروا کی تلاش سے کنارہ کش ہو جائیں گے اور اس طرح تعلیمی روایات کا تقدس بحال ہو سکے گا۔

ہم اس سلسلے میں آنریبل وزیرِ تعلیم پنجاب کی خدمت میں یہ گذارش کرنا ضروری خیال کرتے ہیں کہ آپ کا یہ کرم گسترانہ اعلان ابھی تشنۂ تکمیل ہے۔ کیونکہ اس کے دائرۂ نفاذ سے ڈی۔ بی اور ایم۔ بی مدارس کے مدرسین بے حصہ اور خارج نظر آتے ہیں۔ حالانکہ اُن کی تعداد صوبے میں تیس ہزار سے زائد ہے۔

یہ صحیح ہے کہ اضلاع کے بورڈ اور میونسپلٹیاں محکمۂ تعلیم کے حدودِ اختیار سے باہر ہیں اور محکمہ اُن پر براہِ راست کوئی اقتدار نہیں رکھتا۔ لیکن چونکہ محکمۂ تعلیم کی جانب سے سال بہ سال ہر بورڈ کو امدادی رقوم دی جاتی ہیں۔ اور ہر بورڈ میں محکمے کے ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس بورڈ اسکولوں کی رہنمائی پر اپنا تمام وقت صرف کرتے ہیں۔ حالانکہ ان کو

تنخواہ محکمۂ تعلیم کی جانب سے ادا کی جاتی ہے گویا یہ بھی ہر بورڈ کو محکمے کی ایک گرانقدر امداد ہے - ان وجوہ کی بنا پر اگر ہر ضلع بورڈ کی محکمانہ امداد استادوں کی ٹائم اسکیل کے سسٹم پر ترقی کی شرط سے مشروط کی جاسکے تو بہت ممکن ہے کہ ڈی بی مدارس کے مفلوک الحال اساتذہ بھی آنریبل وزیر تعلیم کے فیاضانہ اعلان سے مستفید ہوسکیں -

ڈی - بی اسکولوں سے قطع نظر پرائیویٹ اسکولوں کے استادوں کا حشر بھی بہت الم ناک صورت اختیار کرچکا ہے - ان مدارس کے متعلق یہ شکایت عام ہو رہی ہے کہ اکثر اسکولوں کے مینیجر اپنے استادوں کو تنخواہیں کچھ دیتے ہیں اور اپنے رجسٹروں میں ان سے زیادہ تنخواہوں کی فرضی وصول یابی پر دستخط کرا لیتے ہیں - اور اکثر یہ بھی ہوتا ہے کہ استادوں کو دس ماہ کے لئے مقرر کیا جاتا ہے - اور اس طرح تعطیل کے دو ماہ کی تنخواہ سے انہیں محروم کردیا جاتا ہے - پرائیویٹ اسکولوں کے اکثر منتظمین کئی کئی سال تک خدمت تعلیم لینے کے بعد بھی استادوں کو مستقل ہونے کا موقعہ نہیں دیتے - یہ حالات ایسے ہیں کہ محکمۂ تعلیم کو ان کی اصلاح کے لئے جلد تر ایک مضبوط قدم اُٹھانے کی ضرورت ہے -

آنریبل وزیر تعلیم کے درد آشنا دل میں معلمانہ حقوق کا جو احترام ہے اُس کے پیشِ نظر ہمیں توقع رکھنی چاہیئے کہ وہ اپنے عہدِ وزارت میں ان مدارس کی ناگفتہ بہ حالت کی اصلاح کے ساتھ ان کے غریب مدرسین کی بدحال جماعت کی بے چین زندگی کو بھی عذابِ زندگی بننے سے بچالینگے۔ تاجور

پنجاب یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر کا تقرر

پنجاب یونیورسٹی کا شعبۂ عربی و فارسی مدت ہائے دراز سے ضابطے کی خانہ پُری کی حیثیت میں کام کر رہا ہے - یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد میں نہ اتنی اہلیت کہ صوبے کے اِس سب سے بڑے تعلیمی ادارے میں عربی و فارسی کے افسوسناک انحطاط و زوال کا احساس کرسکیں - نہ انہیں اپنے ذاتی اغراض و مقاصد کے لئے کشمکش سے یہ سوچنے کی فرصت کہ اِس یونیورسٹی کا پہلا مقصدِ قیام مشرقی ادب والسنہ کی توسیع و ترقی قرار دیا گیا تھا - اس بیخبری و بے حسی کے عبرت آموز نتائج اکثر اِس صورت میں رونما ہوتے رہے کہ عربی اور فارسی ایم - اے کے امتحانات میں پرائیویٹ امیدوارانِ امتحان فسٹ اور سیکنڈ آیا کئے، حالانکہ پرائیویٹ اداروں میں عربی و فارسی پڑھانے والے استادوں کی تنخواہ عموماً دو ڈھائی سو سے زیادہ نہیں ہوتی اور یونیورسٹی میں ان زبانوں کے اساتذہ ڈیڑھ ڈیڑھ ہزار روپیہ تنخواہ لے رہے ہیں - لیکن اُن کے نتائج امتحان دیکھ دیکھ کر "قحط الرجال" کا شکوہ بے اختیار زبان پر آجاتا ہے - بالخصوص عربی زبان تو پنجاب یونیورسٹی میں سالہا سال سے ایڑیاں رگڑتی دکھائی دے رہی ہے - عربی ادب کے یونیورسٹی پروفیسر کو تو آج تک یہی معلوم نہ ہوسکا کہ بلادِ عربیہ میں عربی زبان کس قدر ترقی کرچکی ہے اور مصر و شام کا جدید عربی ادب کس نقطۂ عروج پر پہنچ چکا ہے - وہی پرانا کورس جو بیسویں صدی کے آغاز میں مقرر کیا گیا تھا آج تک جاری ہے - اور معلوم بھی کیوں کر ہوسکتا ہے جب کہ عربی دانی کا انحصار مستشرقین یورپ کے انگلش تراجم پر رہ گیا ہو جب کہ عربی زبان و ادب کے براہِ راست مطالعے کی اہلیت مفقود ہو - عربی زبان میں مکالمہ گفتگو یا تحریر تو درکنار عربی عبارات کو صحت کے ساتھ پڑھنا بھی سوالِ لاینحل بن چکا ہو یعنی اور مارگولیتھ کے عربی ادب کے انگلش تراجم آج دنیا سے ناپید ہوجائیں تو اِس قسم کے نام نہاد عربی دانوں کی عربی دانی بھی ختم ہوجائے -

پھر جب ایسے نیم ملاں نوشتۂ تقدیر بن جائیں تو "کارِ طفلاں" کی خرابی غیر متوقع تو نہیں - حالت یہ ہے کہ عربی زبان کا ایک ایم - اے - - انگریزی میں تو تعلیم و تدریس، تقریر و تحریر سب کچھ کرسکتا ہے - لیکن عربی میں گفتگو تو بڑی بات ہے - چار سطریں بھی صحیح نہیں لکھ سکتا - بلکہ عموماً اُس عربی کتاب کو پڑھ ابھی نہیں سکتا - جس کا انگلش ترجمہ موجود نہ ہو -

خیال کیجئے ۳۰ سال سے آج تک یونیورسٹی کے ایم - اے کے طلبہ کی عربی تعلیم پر یونیورسٹی فنڈ سے کئی لاکھ روپیہ صرف ہوچکا ہے مگر آج تیس سال کے بعد بھی یونیورسٹی ادب عربی کے کسی ایسے فاضل کی تلاش میں ناکام رہی جو اس یونیورسٹی کا سند یافتہ اور یونیورسٹی کا عربی استاد بننے کی لیاقت کا حامل ہو - پنجاب یونیورسٹی میں عربی زبان کے انحطاط کا اس سے زیادہ افسوسناک منظر اور کیا ہوسکتا ہے ؟

"وائے اگر ازپسِ امروز بود فردا ے"

ڈاکٹر قریشی کی تقرری

آج یہ سن کر صوبے کے اہل علم حضرات انتہائی مسرت محسوس کریں گے کہ پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ عربی کی نگرانی کے لئے پنجاب یونیورسٹی کے ارباب انتظام ڈاکٹر برکت علی قریشی ایم - اے - پی، ایچ، ڈی کی گرانقدر خدمات حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے ہیں - اُن چند در چند معاندین علم و فضل کے سوا جن کی آنکھیں اپنی لائن کے کسی قابل آدمی کو دیکھنے سے شب کوری میں مبتلا ہوجاتی ہیں - ہر عالم دوست ڈاکٹر قریشی کے تقرر پر یونیورسٹی کے اراکین نظم و نسق کو مبارک باد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا - بالخصوص ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین، آنریبل جسٹس دین محمد اور خان بہادر میاں افضل حسین وائس چانسلر علمی طبقات کی تہنیت و تبریک کے سب سے زیادہ مستحق ہیں کہ ان حضرات نے ذلیل نوعیت کی پیچ در پیچ سازشوں کو ناکام بنا کر ایک کام کے آدمی کو انتخاب کیا۔

"پسلی پھڑک اٹھی نگہِ انتخاب کی"

ڈاکٹر قریشی کی علمی قابلیت دیرینہ تعلیمی تجربات اور شاندار تعلیمی نتائج دیکھنے والی نگاہوں سے پوشیدہ نہ تھے۔ ان کے بلند اور خرد افروز مقالے "المیالی فی الاسلام" پر برلن یونیورسٹی انہیں نہایت اعزاز کے ساتھ پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری پیش کر چکی ہے۔ یورپ کی مشہور لائبریریوں میں وہ کئی سال تک عربی لٹریچر کا مطالعہ کرتے رہے ہیں۔ یورپ کے بڑے بڑے مستشرقین، عربی ادب پر ان کی وسعت نظر کا اعتراف کر چکے ہیں۔ یورپ سے مراجعت کے بعد وہ اسلامیہ کالج میں بہ حیثیت صدر شعبۂ عربی ۱۴ سال سے تعلیمی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ان کے تیار کردہ طلبہ عربی کے امتحان ایم۔ اے و آنرز میں عموماً فسٹ آتے رہے ہیں اور دو تین سال سے تو صرف انہیں کے شاگرد ایم۔ اے میں اوّل آ رہے ہیں۔ یونیورسٹی میں وہ دس بارہ سال سے جرمن زبان کے استاد ہیں۔ مدت سے یونیورسٹی کی ایم۔ اے کنٹرول کمیٹی کے ممبر کی حیثیت میں کام کر رہے ہیں اور پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ڈاکٹر قریشی بلا اختلاف رائے بہت شریف اور بلند اخلاق انسان ہیں۔ سازشوں سے بیگانہ بلکہ متنفر، علم و تعلیم ان کے محبوب مشاغل ہیں اور انہیں مشاغل میں وہ اپنی زندگی کی راحت محسوس کرتے ہیں۔

ہم نے ڈاکٹر صاحب کی شرافت طبع کو سب سے بڑی بات بتایا ہے۔ کیوں کہ ان کی گراں مایہ قابلیت سے تو ان کے تلامذہ ہی زیادہ تر فائدہ اٹھائیں گے، لیکن تعلیمی اداروں میں مشرقی ادبیات کے اساتذہ کو ان کی کریم النفسی اور شرافت اخلاق ہی ایک گم شدہ نعمت کے طور پر نصیب ہو گی۔

ڈاکٹر قریشی کے تقرر کا مسئلہ جب زیر بحث آیا تو یونیورسٹی کی سینٹ میں سابق وائس چانسلر مسٹر وولز آنجہانی کی ایک چٹھی پڑھ کر سنائی گئی۔ جس میں انہوں نے لکھا تھا کہ

"ڈاکٹر برکت علی سالہا سال سے یونیورسٹی کی تعلیمی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ لیکن گذشتہ طویل مدت میں وہ یونیورسٹی کی سازشی جماعت سے الگ تھلگ رہے ہیں۔" وغیرہ وغیرہ۔

اس پر سردار بہادر بدھا سنگھ ایڈووکیٹ فیلو پنجاب یونیورسٹی و سابق نائب صدر مجلس قانون ساز پنجاب مسٹر وولز کی چٹھی کے اس فقرے سے متاثر ہو کر بے اختیارانہ اٹھ کھڑے ہوئے اور فرمایا کہ

"ڈاکٹر برکت علی کی عربی قابلیت سے قطع نظر میں تو ان کی اس فطری خوبی کے پیشِ نظر کہ وہ سازشوں سے الگ تھلگ رہتے ہیں۔ اپنا ووٹ غیر مشروط پر ان کے حق میں پیش کرتا ہوں۔ کیونکہ میں مدت سے دیکھ رہا ہوں کہ بعض حضرات نے یونیورسٹی کو اپنی سازشوں کا آماجگاہ بنا لیا ہے"۔

سچ تو یہ ہے کہ سردار بہادر بدھا سنگھ نے ایک ہی فقرے میں یونیورسٹی کے سارے نظام پر ایک جامع و مانع تنقید کر دی ہے۔ اگرچہ اب سازش کی مشین کا ایک بڑا پرزہ نکل چکا ہے۔ مگر جس محور پر سارا نظام سلاسل گردش کرتا ہے۔ اس مشین کا وہ دھرا نکل جائے تو یہ مشین ناکارہ بن سکتی ہے اور جب تک یہ مشین بے کار نہ ہو گی، یونیورسٹی کا فنڈ غیر محفوظ ہی متصور ہو گا۔

یونیورسٹی کی سنڈیکیٹ اور سینٹ کے کئی بلند مرتبہ اراکین یونیورسٹی کے نظام میں اغراض پرست ٹولی کی شبانہ روز سازشوں کو بہت بری طرح محسوس کر رہے ہیں۔ چنانچہ رکنِ مذکور کے مندرجہ بالا فقرے سے اس امر کی تصدیق ہو جاتی ہے۔

یونیورسٹی کے اورینٹل کالج میں جہاں نئے پرنسپل کی آمد پر مسرت و اطمینان کا ایک طوفانی جوش پیدا ہے۔ ڈاکٹر برکت علی "قریشی" کے تقرر نے اس طوفان میں اور طغیانی کا اضافہ کر دیا ہے۔ کالج کا مسلم اسٹاف بالخصوص "اِنّ مع العسر یُسراً" الخ" (ہر سختی کے بعد دو آسانیاں نصیب ہوتی ہیں) کے وعدۂ خداوندی کو برای العین مشاہدہ کر رہا ہے۔

وائس چانسلر توجہ فرمائیں

(۱)

ہمیں اطلاع ملی ہے کہ ایک یورپین لیڈی کو یونیورسٹی میں آرٹسٹ کے طور پر ملازم رکھا گیا اور ڈیڑھ سو تا ڈھائی سو کا گریڈ اسے دیا گیا مگر ابھی چار ہی ماہ اس کی ملازمت کو ہوئے تھے کہ ایک دم اسے ڈھائی سو تا ساڑھے چار سو کا گریڈ دے دیا گیا اور اس کے خاوند کو جو تعلیمی لائن سے تعلق نہیں رکھتا۔ کسی پرچے میں اگزامینر بھی بنا دیا گیا اور پھر کچھ دن کے بعد سنٹرل ٹریننگ کالج میں اس کے لئے جگہ بھی مہیا کر دی گئی ہے۔ سنا جاتا ہے کہ اس لیڈی کے پاس آرٹ سے متعلق کوئی اعلیٰ ڈگری نہیں اور وہ یونیورسٹی میں آنے سے پیشتر کسی زنانہ پرائیویٹ کالج میں تیس چالیس روپے پر کام کر رہی تھی۔

اس سلسلے میں ہم وائس چانسلر سے سوال کرتے ہیں کہ

(۱) کیا یہ اطلاع صحیح ہے؟

(۲) اگر صحیح ہے تو کیا اس بیش قرار تنخواہ پر کوئی ایسی ہندوستانی خاتون نہیں مل سکتی تھی۔ جس کے پاس آرٹ کی کوئی ولایتی ڈگری ہو؟

(۳) کیا اِس پوسٹ کی واقعتہً کوئی ضرورت بھی تھی؟

(۴) اور کیا اِس پوسٹ کے لئے یونیورسٹی کی جانب سے کوئی اشتہار دیا گیا تھا؟ نہیں تو کیوں؟

(۵) پھر یہ کہ اپنی ملازمت کے پہلے چار ماہ میں ایسی کون سی غیر معمولی قابلیت کا اُس نے ثبوت دیا۔ جس کی بنا پر اسے ڈیڑھ سو تا ڈھائی سو کے گریڈ سے بڑھا کر ایک دم ڈھائی سو تا ساڑھے چار سو کا گریڈ دے دیا گیا؟

(۶) اور کیا اس کے خاوند کو ہیڈ اگزامینر بنا دینا جب کہ وہ کسی تعلیمی ادارے سے وابستہ بھی نہ تھا، درست طریقہ تھا؟

(۷) پھر یہ کہ اُس کے خاوند کو جس خدمت پر سنٹرل ٹریننگ کالج میں لگایا گیا ہے کیا اس پوسٹ کے لئے یونیورسٹی کی جانب سے اشتہار دیا گیا تھا؟

امید ہے کہ وائس چانسلر اس بارے میں ہمیں صحیح اطلاعات اور تسلی بخش جوابات دے کر اس بیدمیں مزید استفسار کی زحمت سے بچا لیں گے۔

(۲)

یونیورسٹی لائبریری کمیٹی کے چیئرمین کے لئے از روئے آئین یہ شرط ہے کہ وہ اس کمیٹی کا ممبر بھی ہو اور ممبر وہی بن سکتا ہے جو یونیورسٹی کا پروفیسر ہو۔ (ملاحظہ ہو یونیورسٹی کیلنڈر)

تو اب سوال یہ ہے کہ یونیورسٹی لائبریری کمیٹی کا موجودہ چیئرمین اب کس حق سے چیئرمینی کو قبضائے ہوئے ہے؟ جب کہ وہ یونیورسٹی میں اپنی میعاد ملازمت ختم کر چکا ہے اور یکم اکتوبر رواں کو اپنے عہدے کا چارج بھی دے چکا ہے۔ یونیورسٹی کے قواعد کی رُو سے اُس کے لئے ضروری تھا کہ اپنے عہدے کا چارج دینے کے ساتھ ہی لائبریری کمیٹی کی چیئرمینی سے بھی کنارہ کش ہو جاتا۔ مگر سُنا جاتا ہے کہ وہ ابھی تک اِس اقتدار بے زحمت کو چمٹا ہوا ہے۔

اگر یہ صحیح ہے تو محترم وائس چانسلر کب تک اُسے یونیورسٹی کے آئین کی خلاف ورزی سے نہیں روکیں گے؟

(۳)

ہم نے شاہکار کے کسی گذشتہ شمارے میں محترم وائس چانسلر کو توجہ دلاتے ہوئے لکھا تھا کہ

"پنجاب یونیورسٹی لائبریری کمیٹی کے چیئرمین نے اپنے حدود اختیار سے متجاوز ہو کر اپنے ایک عزیز کو (جو لائبریری میں سب سے زیادہ جونیئر ہے) ایک سینئر اسسٹنٹ کی جگہ لگا دیا ہے اور اُس سینئر اسسٹنٹ کو اپنے عزیز کی جگہ منتقل کر کے اُس غریب کی سینیارٹی کے حقوق کو خطرے میں ڈال دیا ہے، حالانکہ یونیورسٹی کی سنڈیکیٹ اور سینٹ کی منظوری کے بغیر کسی ملازم کے درجے میں ترمیم و تبدیلی کا ڈیپارٹمنٹ کے کسی ہیڈ کو بھی اختیار نہیں۔"

سُنا جاتا ہے کہ لائبریری کا وہ سینئر اسسٹنٹ ابھی تک اُس جونیئر کی جگہ کام کر رہا ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو ہم پوچھتے ہیں کہ لائبریری کمیٹی کے چیئرمین کی اِس خلاف آئین کارروائی پر یونیورسٹی کی حاکمانہ جماعت اب تک کیوں خاموش ہے؟

(۴)

ہمیں یونیورسٹی سینٹ کے ایک مقتدر ممبر کی زبانی معلوم ہوا ہے۔ کہ یونیورسٹی کا ایک اعلیٰ افسر ذاتی وجوہ کی بنا پر اپنے ایک ماتحت سینئر مسلمان افسر کے درپئے تخریب ہو رہا ہے۔ یہ سینئر افسر یورپ کا اعلیٰ تعلیم یافتہ اور یونیورسٹی میں دس بارہ سال سے ذمہ دارانہ خدمت انجام دے رہا ہے۔ سابق تین وائس چانسلر اپنے اپنے عہد میں اُس کے حُسن خدمات کا اعتراف کر چکے ہیں۔ مگر یونیورسٹی کے جدید کارپرداز افسر نے اُسے اُس کے واحد حق یونیورسٹی کی رجسٹراری سے محروم کرنے ہی پر بس نہیں کی بلکہ اب وہ اسے یونیورسٹی سے نکال لینے کے بھی درپے ہے۔ یونیورسٹی سینٹ میں اُس کے خلاف زہر پھیلا رہا ہے۔ اور اسے جا و بیجا طور پر تنگ کیا جا رہا ہے۔ کیا محترم وائس چانسلر ہمیں بتائیں گے کہ اُن کی آمد پر یونیورسٹی کے مسلم ملازمین اور بالخصوص ذمہ دار مسلمان ملازم ان خطرات میں کیوں گھرے ہوئے ہیں؟

رائے بہادر ایشر داس سابق یونیورسٹی رجسٹرار کے عہد ملازمت میں اس مسلمان افسر نے آٹھ دس سال اسسٹنٹ رجسٹرار کی حیثیت میں کام کیا ہے اور رجسٹرار اُس کے کام سے مطمئن اور اُس کے احساس ذمہ داری سے خوش رہے ہیں۔ اس امر کی تصدیق یونیورسٹی کے ریکارڈ سے ہو سکتی ہے، خود سابق رجسٹرار بھی جو آج کل یونیورسٹی کے فیلو ہیں اعتراف کرتے ہیں کہ میرے اسسٹنٹ نے میرے ماتحت وفاداری اور ذمہ داری سے اپنے فرائض انجام دئے ہیں۔" حق اور انصاف کا تقاضا یہ تھا کہ رائے بہادر لالہ ایشر داس کے ریٹائر ہونے پر رجسٹراری اُن کے دہ سالہ تجربہ کار اسسٹنٹ کو ملنی چاہیئے تھی۔ مگر یونیورسٹی کے جدید کارپرداز افسر نے بوجوہ معلومہ اس کو رجسٹراری کے حق سے محروم کر کے یونیورسٹی کے ایک دوسرے محکمے سے ایک غیر موزوں شخص کو رجسٹرار بنا دیا۔ اور اب سنا جا رہا ہے کہ رجسٹراری کے حق سے محرومی ہی اس مسلم افسر کیلئے کافی سزا نہیں سمجھی گئی بلکہ اسکو یونیورسٹی سے نکالنے کے واسطے زمین ہموار کی جا رہی ہے۔ (ادارہ)

امداد علی مضطر

ہرقل کی موت

یہ اس زمانہ کا واقعہ ہے جب انسان نے حیوانیت کے درجہ سے ترقی کر کے پہلے پہل انسانیت کے عالم میں قدم رکھا تھا۔ اسی سبب سے ہرقل کے کارنامے عقل و فہم سے بالاتر ہیں۔ یہ زور آورانِ سلف میں دوسرے نمبر پر تھا۔ یونان کے لوگ اس کو ہرقلیس کہتے تھے۔ رومیوں نے اس کو ہرقیولیس کہہ کر پکارا عرب ہرقل کہنے لگے اور انگریزی میں اس کو ہرکیولیز کہتے ہیں۔

یونانیوں کے اعتقاد کے مطابق ان کا دیوتا جیوپیٹر کل عالم کا بادشاہ اور تمام دیوتاؤں اور انسانوں کا باپ تھا۔ اس کی بیوی جونو کو وہ جنت کی ملکہ خیال کرتے تھے۔ جیوپیٹر کے متعلق یہ مشہور ہے کہ وہ بہت عیاش اور نفس پرست واقع ہوا تھا۔ ایک مرتبہ اس نے تھیبس (یونان) کے بادشاہ ایلیفی ٹریون کی حسین و جمیل ملکہ الکمینہ کو دیکھ لیا۔ اور اس کی محبت میں اس قدر وارفتہ ہوا کہ ہر ساعت اسی مہ لقا کی تاک میں رہنے لگا۔ اور آخر کار ایک دن کسی نہ کسی طرح اپنے مقصد میں کامیاب ہوا۔ الکمینہ کے بطن سے دو لڑکے پیدا ہوئے۔ جن میں سے ایک کا نام ایفی کلوس اور دوسرے کا ہرقل رکھا گیا۔ یہ ہی ہرقل یونان کا شہ زور اور مافوق الفطرت کارناموں کا مالک ثابت ہوا۔

ہرقل کے محیر العقول صدہا کارناموں میں سے سب سے پہلا واقعہ یہ ہے کہ جب جیوپیٹر کی بیوی جونو کو کچھ عرصہ بعد ہرقل کی پیدائش کا علم ہوا تو وہ اس درجہ برافروختہ ہوئی کہ اس نے ہرقل کی جان لینے کی ٹھان لی۔ اُس نے گوارا نہ کیا کہ اس کے شوہر کا یہ ناجائز بیٹا بقیدِ حیات رہے۔ چنانچہ اس نے دو قوی الجثہ دیو اس کام کے لئے مامور کئے۔ ہرقل ابھی صغیر سن ہی تھا کہ ان دونوں دیوؤں نے ایک دن موقعہ پا کر اس پر حملہ کر دیا۔ لیکن خدا جانے اتنی ہی سی عمر میں ہرقل نے کس بلا کی طاقت پائی تھی کہ اس نے ان دونوں دیوؤں کے سر آپس میں ٹکرا کر ان دونوں کو مار ڈالا۔

جونو کو جب اس واقعہ کی اطلاع ہوئی تو وہ بہت برہم ہوئی۔ ہرقل کی قوت کے خوف اور غصہ کے مِلے جُلے اثرات نے اس کو پریشان کر دیا۔ لیکن آخر تھی سب سے بڑے دیوتا کی بیوی۔ اس کی آتشِ انتقام اور زیادہ مشتعل ہو گئی چنانچہ اُس نے اُسکو اپنے جادو کے زور سے فاتر العقل بنا دیا۔ ہرقل پاگل ہو گیا۔ اور اس کا دیوانہ پن اس قدر ترقی کر گیا کہ اس نے علاوہ دیگر چند آدمیوں کے اپنے بھتیجوں کو بھی مار ڈالا۔ کچھ عرصہ بعد اس کا پاگل پن خود بخود دفع ہو گیا۔ مگر جب اس نے اپنی مجنونانہ حرکتیں سُنیں تو اس کو بہت صدمہ ہوا۔ اس کے ضمیر نے اس کو ملامت کی۔ اور اس نے اپنی آئندہ زندگی نیکی اور بھلائی میں گزارنے کا عہد کر لیا۔

ان دنوں افریقہ میں ایک زبردست آدم خور دیو نے وہاں کے باشندوں کو بہت پریشان کر رکھا تھا۔ اس کا نام القاؤس تھا۔ ہرقل وہاں کے لوگوں کی پریشانی کا حال سُن کر افریقہ پہنچا۔ اور پہنچتے ہی القاؤس کو للکارا۔ وہ ہرقل کی صورت دیکھتے ہی اُس پر جھپٹا۔ لیکن جیسے ہی دیو ہرقل کے قریب آیا۔ ہرقل نے اس کو اٹھا کر ہوا میں بلند کیا اور بلندی ہی پر اُس کا گلا دبا کر اس کو مار ڈالا۔ اور اس کی لاش کو زمین پر پٹک دیا۔

اسی طرح کا ایک دوسرا دیو جس کا نام کاکس تھا کوہ اونٹائن پر رہنے والوں کو ستایا کرتا تھا۔ ہرقل اس کو مارنے کے لئے بھی گیا۔ جس وقت وہ وہاں پہنچا تو دیو ایک غار میں چھپا ہوا تھا۔ ہرقل نے اس کو باہر نکلنے کے لئے کہا۔ جونہی وہ باہر آیا۔ ہرقل نے لپک کر اس کی گردن پکڑ لی۔ اور اتنے زور سے کھینچا کہ وہ چیخ چیخ کر مر گیا۔ وہاں کے باشندوں نے اس دیو سے نجات پانے کے بعد ہرقل کی یادگار میں اس پہاڑی پر ایک عمدہ مندر تعمیر کرا دیا۔

کچھ دنوں بعد ہرقل کو معلوم ہوا کہ تھیبس سے کچھ فاصلہ پر ایک شہر میں ایک نہایت ہی عجیب الخلقت مخلوق آباد ہے۔ جو سنٹور کہلاتے ہیں۔ ان کے جسم کا اگلا حصہ انسان کا اور پچھلا دھڑ گھوڑے کا سا ہے۔ ان میں سے ہر ایک فرد انسانوں کو بُری طرح ستاتے ہیں۔ ان کی ایذا رسانیوں سے وہاں کے باشندے سخت مصیبت میں مبتلا ہیں۔ ہرقل نے وہاں جا کر ان موذی سنٹوروں کو اپنی قوت سے اس کثرت سے ہلاک کیا کہ صرف چند ہی باقی بچے۔ وہ بھی اپنی جان بچا کر بھاگ گئے اور پھر کبھی کسی کو نہیں ستایا۔

ہرقل نے کئی مرتبہ افریقہ اور مصر کا سفر کیا تھا۔ ایک مرتبہ وہاں کے حکمراں بوسی رلیس نے اس کو بڑی جدوجہد کے ساتھ گرفتار کر کے اس کو موٹی موٹی زنجیروں سے جکڑوا کر اپنے دیوتا کی قربانگاہ پر بھینٹ چڑھانے کی غرض سے رکھ دیا۔ ہرقل پہلے تو خاموشی کے ساتھ سب کچھ دیکھتا رہا۔ لیکن جب اس نے دیکھا کہ ان لوگوں کا ایک جم غفیر شمشیر بکف اس کو قتل کرنے کے لئے آ رہا ہے۔ تو اس نے ایک ہی جنبش میں سب آہنی زنجیروں کے ٹکڑے اڑا دئے

اور تھوڑی ہی دیر میں بوسی ریس اور دیگر صدہا آدمیوں کو مار کر چل دیا۔

بوسی ریس کے قتل کا انتقام لینے کی غرض سے ایک اور فرمانروا معہ ایک زبردست لشکر کے ہرقل پر حملہ آور ہوا۔ اس فرمانروا کا نام نسطور تھا۔ ہرقل نے تنِ تنہا اس لشکر سے مقابلہ کیا اور اپنی قوت و شجاعت کے ایسے ایسے جوہر دکھائے کہ عقل انسانی دنگ رہ گئی۔ بالآخر لشکر کا ایک بڑا حصہ اس کے ہاتھ سے مارا گیا۔ باقی سپاہیوں نے راہِ فرار اختیار کی۔ سب سے بعد ہرقل نے نسطور اور اس کے گیارہ جوان بیٹوں کو ہلاک کیا۔ بارہویں بیٹے کو اس کی کم عمری پر ترس کھا کر زندہ چھوڑ دیا۔ اور اس کے باپ کا تاج و تخت اُسی کے سپرد کر دیا۔

ہرقل نے ایک بڑا پُر لطف معرکہ سر کیا۔ ان دونوں فرمانرواؤں کا انجام دیکھنے کے بعد میدیا والوں کے زبردست دیوتا اچیلوس نے اس سے جنگ کی۔ جب اچیلوس ہرقل کے مدِّ مقابل ہوا تو ہرقل نے اُس پر حملہ کرنا چاہا۔ اچیلوس نے لوٹ لگا کر اژدھے کی شکل اختیار کی۔ ہرقل ایک ساعت کے لئے ٹھیرا اور چاہتا تھا کہ دوبارہ اس پر حملہ کرے کہ وہ ایک مرتبہ پھر لوٹا اور اس مرتبہ وہ خونخوار سانڈ کی شکل میں نمودار ہوا۔ ہرقل نے بہ سُرعت تمام اس کا ایک سینگ پکڑ لیا۔ اور اس سینگ کو گھمانا چاہتا تھا کہ سانڈ نے انتہائی تکلیف سے بیتاب ہو کر جھٹکا دیا۔ سینگ ٹوٹ کر ہرقل کے ہاتھ میں آ گیا۔ اور سانڈ بدحواس ہو کر بھاگ گیا۔

ایک مرتبہ جبکہ ہرقل افریقہ میں تھا۔ اس کا باپ جیوپیٹر ایک مینڈھے کی شکل اختیار کر کے امّون کے نام سے نمودار ہوا۔ امّون نے اپنے سینگ سے ذرا سی زمین کھود کر صاف شفاف پانی کا ایک چشمہ جاری کر دیا۔ ہرقل نے ازراہِ عقیدت اسی چشمہ کے کنارے ایک مندر قائم کر دیا۔ جو عرصہ دراز تک قائم رہا۔ اور فتح مصر کے بعد سکندر اعظم نے بھی اس کو دیکھا تھا۔

ہرقل اپنی بیوی سے بہت محبت کرتا تھا۔ اس کی بی بی کا نام ہیبّہ تھا۔ ہیبّہ اسقدر خوبصورت تھی کہ سب اس کو "شباب کی دیوی" کہتے تھے۔ جیوپیٹر اور تمام دیوتاؤں کی وہ ساقیہ تھی۔ اس کے بطن سے ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام اِنی کے ٹوس رکھا گیا۔ اپنے لڑکے سے بھی ہرقل کو بڑی نسبت تھی۔

اس کی شجاعت۔ بہادری اور جواںمردی کے چرچے سن کر لیڈیا کی ملکہ اُمِ فالہ کے دل میں ہرقل کی نادیدہ محبت پیدا ہو گئی۔ اس نے ہرقل کو حاصل کرنے کی بہت سی ترکیبیں کیں۔ مگر ناکام رہی۔ اتفاق سے ہرقل بیمار ہوا اس کا دماغ اُلٹ گیا۔ اور وہ کئی طرح کے امراض میں مبتلا ہو گیا۔ دیوتاؤں نے اس کے لئے یہ علاج تجویز کیا کہ اس کو غلاموں کی طرح فروخت کر دیا جائے۔ اُمِ فالہ کو اس سے بہتر کون سا موقعہ مل سکتا تھا۔ فوراً ہرقل کو خریدنے کے لئے جا پہنچی۔ اور ایک معقول رقم کے عوض اس کو اپنے ہمراہ لے آئی جہاں

اتفاق سے ہرقل اُمِ فالہ کے گھر پہنچتے ہی صحتیاب ہو گیا۔ اور خود ہی ملکہ کے عشق میں گرفتار ہو گیا۔ ملکہ پہلے ہی اس سے محبت کرتی تھی۔ لہٰذا دونوں ازدواجی رشتہ میں منسلک ہو گئے۔ اُمِ فالہ کے بطن سے بھی ایک لڑکا پیدا ہوا۔

ہرقل کی اس مختصر داستان کے بعد اب ذرا قدرت کی ستم ظریفی ملاحظہ فرمائیے۔ کہ قدرت نے ایسے قوی ہیکل اور رستم زور کی موت بھی خود اسی کے ہاتھوں لکھی تھی۔ ایک دن ہرقل کوہ ایٹا کی ایک چٹان پر بیٹھا ہوا اپنے زہر آلود تیروں کو صاف کر رہا تھا۔ ایک تیر صاف کرتے ہوئے اس کی نظر ذرا چُوکی تو تیر کی نوک اس کے بدن میں چبھ گئی۔ زہر سُرعت کے ساتھ تمام بدن میں سرایت کر گیا۔ ہرقل بے بس ہو کر تڑپنے لگا۔ مدد کے لئے پکارا لیکن وہاں کوئی موجود نہ تھا۔ یہاں تک کہ کچھ دیر تڑپتے رہنے کے بعد جانِ بحق ہو گیا۔

لافانی

کلی شگفتہ ہوئی، اور پھول بن گئی۔

اس تبسم میں شیرینی۔ مہک، اور حُسن تھا۔ اس نے فضا کو رنگین کر دیا۔

پھول اپنی منزلیں عجلت کے ساتھ طے کر رہا تھا۔

کلی سے پیشتر پودے میں ایک نامعلوم شے، اور کلی سے پھول اور پھول کے بعد —— اس کی خوشبو کہیں بس رہی تھی۔

پھول مرجھا گیا —— اس کی خوشبو کہیں بلند و بالا مقام پر پہنچ گئی —— ابدی اور لافانی مقام پر پہنچ کر ابدی اور لافانی ہو گئی ——

یہ دیکھ کر روح بیتاب ہوئی۔ اور شبنم گل سے ہمراز ہوئی ——،

پھر فلک بوس ہوئی —— پھر فلک شگاف ——

بالا اور بالا —— ابدی اور لافانی۔

حکیم اللہ صدیقی بی۔ اے

سونے سے پہلے

رات کا روئے ارض پر ہے فشار
ابھی جھلکیاں 'پر افشاں ہیں
وسعتِ کائنات میں' تا دُور
صد جہاں جلوہ مستِ رعنائی
خاکدانِ حیات تیرہ و تار
تو یہ تو ظلمتیں اُفق پہ کنار
وادیاں، کوہسار، لیل و نہار
کیوں مجھے اِن سے پیار ہے آتا
وسعتِ چرخ کی فضاؤں میں
گرمِ رفتار خندہ زن تارے
دل - خدائے جہانِ بیتابی
توڑ دے گا طلسمِ بود و نبود !

ڈاکٹر تصدق حسین خالد
ایم - اے - پی - ایچ - ڈی
بار ایٹ لا

غزل

یا برقِ بے پناہ گرایا نہ کیجئے
یا ایمنِ نگاہ میں آیا نہ کیجئے
یا کشتِ آرزو پہ کیا کیجئے کرم
یا مطلعِ خیال پہ چھایا نہ کیجئے
یا پرسشِ خموش کیا کیجئے حضور
یا رہگذر میں آنکھ ملایا نہ کیجئے
یا اذنِ عرضِ شوق دیا کیجئے مجھے
یا مجھ کو سبز باغ دکھایا نہ کیجئے
یا درسِ ضبطِ درد دیا کیجئے اسے
یا دل کو یاد اپنی دلایا نہ کیجئے
بدلی ہوئی ہے آنکھ اگر غیر کی تو ہو
مجھ پر غضب جناب توڑھایا نہ کیجئے
فرمانِ خامشی نہ دیا کیجئے اِسے
خلوت میں یا امیں کو بلایا نہ کیجئے

(خان بہادر) امین حزیں

قاضی پولوس

میری زندگی کے چند اوراق

۳ مارچ

مجھے ہر وقت ایک آرزو، محض ایک تمنا تڑپاتی رہتی ہے۔ اُس کی طرف سے محبت نامہ وصول کرنے کی خواہش ہر لحہ میرے دل میں چٹکیاں لیتی رہتی ہے۔ مجھے ایک ایسے طویل خط کا انتظار ہے۔ جسے پڑھتے پڑھتے میری تمام زندگی ختم ہو جائے ——— کتنی خام اور بے بنیاد آرزو ہے یہ ——— بھلا وہ مجھے خط کیوں لکھنے لگی ——— مگر..... آخر اس میں اُس کا قصور بھی کیا۔ وہ لکھے بھی تو کیوں کر۔ نہ معلوم تو گرفتہ طائر کی مانند وہ آواز بھی نکال سکتی ہے یا ابھی دم کشیدہ ہی ہے ٭

۱۲ مارچ

چاند سے میری نفرت۔ نفرتِ ازلی کی سی حیثیت رکھتی ہے۔ [illegible] اس بات سے میرے تمام احباب واقارب بخوبی واقف ہیں۔ اور اکثر مجھ سے اُس کی وجہ بھی پوچھتے رہتے ہیں۔ ایک دن کا ذکر ہے کہ میں گلی میں سے گزر رہا تھا۔ میں نے دیکھا۔ کہ زرقا میرے سامنے مکان کی چھت پر آسمان کی طرف بڑی دلچسپی سے ٹکٹکی باندھے ایستادہ ہے۔ میں نے اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

" زرقا کیا دیکھ رہی ہو"

کہنے لگی " چاند"

میں نے حیرانگی سے کہا! چاند!

کہنے لگی۔ ہاں میں تو ہر مہینے نئے چاند کو ضرور دیکھا کرتی ہوں ———

[illegible] میں دل ہی دل میں اپنے [illegible] نفرت کو دبانا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

نہ معلوم اس واقعہ کو کتنا عرصہ گزر گیا ہے۔ کم از کم مجھے کچھ یاد نہیں۔ لیکن آج میری طبیعت میں ایک انقلاب برپا ہو چکا ہے۔ میری نگاہیں آج خود بخود اُفق مغرب کی طرف اُٹھتی جا رہی ہیں۔ کسی نامعلوم کشش مقناطیسی کے زیر اثر وہ ماہِ نو کی غیر مرئی لیکن یقینی کرنوں سے بغلگیر ہو رہی ہیں۔ میرے دوست احباب طبیعت کے اس تغیر پر حیران ہیں۔ گویا اُن کے نزدیک، مجھ سے یہ کوئی مافوق الفطرت فعل سرزد ہو رہا ہے۔ وہ میری پُرغم مگر بشاش آنکھوں سے اس راز کا انکشاف چاہتے ہیں کوئی بتائے کہ میں انہیں کیا بتاؤں۔ میں تو اتنا ہی جانتا ہوں۔ کہ چاند کی مدہم شعاعوں میں اِس وقت زرقا کی جادو نظری گھل مل رہی ہے اور مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے کہ میری بے کیف و مایوس نگاہیں اُس کی جادو نگاہی سے ہم آغوش ہو رہی ہیں۔ عین اُسی طرح جس طرح کہ ہر روز گلی میں آتے جاتے ہوا کرتی تھیں ٭

۲۰ مارچ

کتنا اُمید افزا ہے آج کا دِن۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے۔ کہ تمام کائنات پر موت کی سی مایوسی چھا رہی ہے۔ اور میں تن تنہا اس یاس انگیز فضا کو چڑانے کے لئے محو رقص و سرود ہوں۔ میں بار بار لفافہ پر لکھے ہوئے ایڈریس کو دیکھتا ہوں۔ فرطِ مسرت سے میرے ہاتھ کانپ رہے ہیں۔ اندر میں آپے سے باہر ہوتے جا رہا ہوں دروازہ بند کر کے میز کے پاس بیٹھ گیا ہوں۔ لفافہ کھول لیا ہے۔ لیکن میرے دل و دماغ میں کچھ عجیب نوع کے خیالات وو ساوس سما رہے ہیں۔ خیر دیکھوں تو..

" مائی ڈیر۔ ج

کیا تم واقعی میری محبت کو بھول گئے ہو۔ کیا وہ دن یاد نہیں۔ جب ہم تم اکٹھے محبت کے گیت گایا کرتے تھے۔ لیکن مجھے تو وہ ایک لمحہ کے لئے بھی فراموش نہیں ہوتے۔ میں تو ہر وقت تمہیں یاد کرتی ہوں۔ مگر تم ہو۔ کہ کبھی بھولے سے بھی خیال نہیں کیا۔ میں تو اپنے عہد پر اُسی طرح قائم ہوں۔ میرا پتہ یہ ہے:۔

۲۹۱۔ ٹرنک روڈ۔ لاہور

مگر آپ مجھے خط نہ لکھیں۔ کیونکہ مجھے سسرال والوں کی طرف سے کچھ خوف اور ڈر سا محسوس ہوتا ہے" تمہاری زرقا

آہ وہ کہتی ہے۔ میں اُسے خط نہ لکھوں۔ نہ معلوم وہ میرے دل کی خواہش کو اور زیادہ تیز یوں کر رہی ہے۔ اور دیکھو تو کتنا عجیب خیال ہے۔ کہ" میں اپنے عہد پر اُسی طرح قائم ہوں" گویا اُسے اپنی عہد شکنی کا علم ہی نہیں۔ کاش [illegible] س بات کا احساس اُسے اپنی شادی سے قبل ہوتا۔ یوں معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ [illegible] رت سے اپنا دماغی توازن کھو بیٹھی ہے۔ چند دن ہی تو گزرے۔ کہ وہ ایک اسکول [illegible] کی مانند میرے سامنے اچھلتی کودتی اور ناچتی پھرتی تھی۔ اِدھر اُدھر گلی میں آزادانہ [illegible] ۔ سہیلیوں کے ساتھ ٭

۳۱ مارچ

جب سے اُس کا [illegible] ہے۔ مجھے اس طرح محسوس ہوتا ہے کہ میرے دل کا خاکستر پرِ شرر [illegible] ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ خود غرض اور کینہ پرور دنیا۔ اس کے رہتے [illegible] ُن کے مشاغل مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتے۔ طبیعت عجیب چڑچڑی سی [illegible] ات بات پر بھڑک اُٹھتی ہے [illegible] جلتی ہوتی ہیں۔ جس کا مجھے احساس تو ہوتا ہے [illegible] ار وقت۔ کئی دفعہ میری

جواب طلبی بھی ہو چکی ہے۔ لیکن میں اس بارے میں ہیڈ ماسٹر کو کبھی موردِ الزام نہیں گردانتا۔ اس لئے کہ وہ بچارا میری موجودہ طبیعت کا اندازہ صحیح صحیح ہرگز نہیں لگا سکتا۔ وہ مجھے نہایت ہی کینہ توز، گستاخ اور جھگڑالو سمجھتا ہے اور ان تمام خرابیوں کا الزام میرے اَن ٹرینڈ ہونے پر لگاتا ہے۔ غریب کیا جانے کہ میرے لئے زندگی ایک خلشِ مسلسل ہو کر رہ گئی ہے۔ جس سے بے تاب ہو کر میں اپنا دماغی توازن تک کھو بیٹھتا ہوں۔

مدرسی کی یہ بے کیف زندگی اب مجھ سے نہیں گزاری جاتی۔ میرا دل متنفر ہو چکا ہے۔ خدا جانے مجھے کیا ہو گیا ہے۔ درد حیات کسی پہلو ختم ہوتا نظر نہیں آتا۔

۱۲ اپریل

آج جاتے ہی ہیڈ ماسٹر سے جھڑپ ہو گئی۔ بات یہ ہوئی۔ کہ میں حسبِ معمول سکول میں آج بھی دیر سے پہنچا۔ چشم پوشی کی بھی آخر کوئی حد ہوتی ہے اُس نے میری جواب طلبی کی۔ میں نے اپنی بے نیازانہ طبیعت کے زیر اثر "جواب طلبی نامہ" کے پُرزے پُرزے کر کے اُس کی میز پر رکھ دیئے۔ اور اُسے نہایت ہی غیر معقول سنانا شروع کر دیں۔ جھگڑے نے طول پکڑا۔ ملازمت سے تو پہلے ہی تنگ تھا۔ فوراً استعفا دے کر زندگی کے اِس بوجھ کو بھی ہلکا کر آیا۔

میرے تمام دوستوں کا خیال ہے کہ آج کا دِن میری زندگی کا منحوس ترین دن ہے۔ لیکن میرا دِل بخوبی جانتا ہے۔ کہ یہ دِن واقعی میرے لئے منحوس ترین ہی ہے یا مفید ترین۔

اس وقت رات کے گیارہ بجے ہیں۔ اور میں والدہ کو اس واقعہ کے متعلق خط لکھ رہا ہوں۔

اسلم صبح ہی سے کچھ کھویا کھویا سا نظر آتا ہے۔ وہ میرے متعلق بہت فکرمند ہے۔ کیونکہ ایک حقیقی دوست اور رشتہ دار ہونے کی حیثیت سے وہ میری حالت کو اچھی طرح سمجھتا ہے۔ باوجودیکہ مجھے اُس کے تنقیدی رویّہ سے ہمیشہ ایک اذیت سی پہنچتی رہی تاہم میں نے کبھی اُس سے بے اعتنائی نہیں برتی۔ اور اب کہ مجھے اُس کی مایوسی اور غمگینی کا احساس ہے اُس کے خیال میں اُس کی تنہا زندگی میری معیت میں نہایت دلچسپی سے گزر رہی تھی۔

۲۰ اپریل

کمرے میں خاموشی اور مایوسی بالکل دور سے آتی ہوئی موٹر کی گھر گھر کی مانند لمحہ بہ لحمہ نمایاں ہوتی جا رہی ہے۔ اور یوں دکھائی دیتا ہے کہ دروازہ کھڑکی الماری حتیٰ کہ کمرے کی ایک ایک چیز اس یاس کے عالم میں آنسو بہا رہی ہے۔ میں اپنا سامان باندھ رہا ہوں۔ اسلم اور محمد دین حیران ہیں۔ کہ اب کیا ہو گا۔ وہ بھی میری حرکات و سکنات کا مایوس خموشی سے مطالعہ کر رہے ہیں۔ میرا دل انہیں دیکھ کر بے اختیار ہوئے جا رہا ہے۔ میں کب چاہتا ہوں۔ کہ اسلم ایسے مخلص دوست اور اپنے تنہائی کے مونس اس کمرے سے جُدا ہو جاؤں۔ آہ میں تو اپنی زندگی کے آخری سانس تک ان کی معیت میں ختم کر دینا چاہتا ہوں۔ مگر کیا کروں موجودہ حالات کے ہاتھوں مجبور ہوں۔ جو بات میں آج سے ایک ہفتہ پہلے نہیں سمجھ سکا تھا۔ اب وہ بتدریج میری سمجھ میں آ رہی ہے۔ اور میں "ترکِ ملازمت" والی حماقت پر دِل ہی دِل میں پشیمان ہوں۔ والدہ میرے استعفیٰ دینے کے فوراً بعد گھر نہ پہنچنے پر نہایت ہی مشوش نظر آتی ہے۔ دو خط آ چکے ہیں۔ اور اب تو اس نے یہ بھی دھمکی دی ہے۔ اگر اس بار بھی میں خط دیکھتے ہی گھر نہ پہنچا تو اُسے خود آنا پڑے گا .... پھر سوچتا ہوں۔ کہ اب میرے لئے یہاں دھرا بھی کیا ہے۔ جب میری زندگی میں دلچسپی لینے والی ہی میری تمام دلچسپیوں کا خاتمہ کر گئی۔ تو پھر میں خواہ مخواہ اس بارے میں اپنے دل کو زیادہ پریشان کیوں کروں۔ اب محض اسلم اور میرا رومانی کمرہ ہی ہیں نا۔ سو انہیں کبھی کبھار آ کر سلام کر جایا کروں گا۔

ٹانگہ دروازے پر کھڑا میرا انتظار کر رہا ہے۔ میں سامان باندھ چکا ہوں۔ کوچبان ایک ایک کر کے میرا سامان ٹانگے میں دھر آیا ہے۔ مگر میرے قدم ہیں کہ اُٹھتے ہی نہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ اس کمرے کے فرش میں آج مقناطیسی قوت پیدا ہو گئی ہے۔ جو مجھے اپنی طرف کھینچ رہی ہے۔ اسلم اپنی آنکھیں ہاتھ کی ہتھیلی سے مل رہا ہے۔ محمد دین ایک طرف نیچی نظریں کئے کھڑا ہے۔ محلہ کے چھوٹے چھوٹے بچے بھی اپنے حیران کن استفسارات سے میرے دل پر اثر ڈال رہے ہیں۔ میں نے اپنی پُرنم آنکھوں کو رومال سے ڈھانپ لیا ہے .... کمرہ کو قفل لگا کر ایک چابی اسلم کے حوالے کر دی ہے۔ اور گلی میں آ گیا ہوں۔ صورت آشنا لڑکیاں اپنے اپنے کواڑوں میں سے سر نکالے ہوئے میری طرف مایوس نگاہوں سے دیکھ رہی ہیں۔ گویا میری دلی کیفیت کے ساتھ اُنہیں بھی ہمدردی پوری ہمدردی ہے

ٹانگہ اپنی مخصوص رفتار سے اسٹیشن کی طرف جا رہا ہے۔ اور میں شہر کے در و دیوار پر حسرت بھری نگاہیں ڈال رہا ہوں *

تنہائی

جینے کی اب پیاس نہیں ہے
مرنے کی بھی آس نہیں ہے

اپنے سوا اب بزمِ جہاں میں
کوئی بھی میرے پاس نہیں ہے!

شریف چکوالی

غزل

بیخودی میں وہ خودی پیدا کریں
تم جب آؤ ہوش میں آیا کریں

کی شبِ غم ہم نے رو رو کر بسر
صبح کے آثار ہیں اب کیا کریں

صورتِ پروانہ جل کر عشق میں
سوزِ قلبِ حسن میں پیدا کریں

پھر محبت آزماتی ہے ہمیں
پھر کسی کے دل میں گھر پیدا کریں

گلشنِ عالم سے جی اکتا گیا
دل میں ہے آباد اب صحرا کریں

پھونک کر اپنی متاعِ زندگی
اپنے دل کو شعلۂ سینا کریں

اصل میں دریا ہے قطرہ اشک کا
آ کہ ہر قطرے کو پھر دریا کریں

دور سے ہی دیکھتے رہتے ہیں ہم
پاس جا کر کیا انہیں رسوا کریں

آؤ نجمہ طرزِ فکر و شعر میں
اک نیا انداز ہم پیدا کریں

(آنسہ) **نجمہ تصدق** ایم۔اے

غزل

جلوہ بقدرِ جلوہ دکھایا نہ جا سکا
آئینہ وار سامنے آیا نہ جا سکا

اپنی طرف بھی دیکھ سکے ہم نہ عمر بھر
اُن کی طرف بھی ہاتھ بڑھایا نہ جا سکا

کانٹے رہے حریف گلوں کے سدا مگر
پھولوں سے کوئی کانٹا ہٹایا نہ جا سکا

اس نقش کو جنوں نے مکمل کیا ہے آج
نقاش سے جو نقش بنایا نہ جا سکا

خود داریوں نے میری کیا ڈوبنا پسند
ساحل کی سمت ہاتھ بڑھایا نہ جا سکا

سب راز کہہ دیا مرے اک رازدار نے
آنکھوں سے دل کا حال چھپایا نہ جا سکا

کیا جانے کیا ہوا ہے کہ مجھ سے تمام عمر
سینہ سے اپنے ہاتھ ہٹایا نہ جا سکا

دل میں ہمارے اس کو چھپایا بہ اہتمام
کونین کو جو راز بتایا نہ جا سکا

بیچارگیٔ عشق کا جالب یہ حال ہے
ہلکا سا ایک پردہ اٹھایا نہ جا سکا

جالب چغتائی مراد آبادی

حسن نجمی سکندر پوری

تعمیر یا تخریب؟

موجد: (اپنے دوست نجومی سے) دیکھا تم نے! میں نہ کہتا تھا کہ یہ کام مشکل نہیں - آخر کار میں نے اُس گتھی کو سُلجھا ہی لیا۔ پیارے دوست! اگر میں اپنے ارادوں میں کامیاب ہو گیا - اگر میرے تجربات صحیح ثابت ہوئے تو وہ دن دُور نہیں جب دنیا حیرت سے میرا منہ دیکھے گی۔ ہر شخص کی زبان پر میرا ہی نام ہو گا - آنے والی نسلیں مجھے فخر کے ساتھ یاد کریں گی - مورخین صفحوں کے صفحے سیاہ کر ڈالیں گے - میرا نام، خیر اس کی تو مجھے چنداں پروا نہیں۔ لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ میرا کارنامہ ایک ناممکن شے کو ممکن بنا دے گا - دنیا میرے احسانوں کے بوجھ سے جُھک جائے گی - انسان جب بغیر پر کے ہوا میں اُڑنے لگے گا اُس وقت اُس کے دل سے کس کے لئے دعائیں نکلیں گی؟ میرے لئے اور صرف میرے لئے۔ کتنا پُر مسرت ہو گا وہ دَور!!! کتنی پُر لطف ہو گی وہ زندگی!!! جب ہم خشکی اور تری کے علاوہ، ہوا کے بھی بادشاہ کہلائیں گے۔ نجومی! کیا خیال ہے تمہارا؟

نجومی: - میں کیا کہوں - مجھے تو اب بھی یہ بات ناممکن معلوم ہوتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ تم محض ہوائی قلعے تعمیر کر رہے ہو - بغیر پر کے انسان ہوا میں اُڑ ہی نہیں سکتا اور تم انسان کے بازوؤں میں پَر لگا بھی نہیں سکتے - پاگل کہیں کے بلاشبہ تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ کہاں انسان اور کہاں ہوا میں اُڑنا - توبہ کرو - جانے بھی دو اس خام خیالی کو۔

موجد - دوست! یہ ممکن ہے - میں اس خیال سے دست بردار نہیں ہو سکتا - تم سڑی ہو، کاہل ہو، تمہیں تارے گننے کے سوا اور آتا ہی کیا ہے؟ جب دیکھو بس اسی دُھن میں لگے رہتے ہو - مریخ، مشتری، زہرہ اور عطارد کی حرکات و سکنات پر غور کرنا بلا ضرورت کا غذ سیاہ کرنا ہی تمہارا محبوب مشغلہ ہے - کل بارش ہو گی - پرسوں چندر گرہن ہو گا - چھ مہینے بعد، فلاں بادشاہ مر جائے گا - سال بھر بعد، ایک بڑی خونریز جنگ ہو گی۔ "آخر ان بے سر پیر کی باتوں سے ہمیں فائدہ کیا ہوتا ہے؟ فائدہ تو اس کام میں ہو گا جسے میں کرنا چاہتا ہوں - بالتوں ہی باتوں میں انسان ہزاروں میل کا فاصلہ طے کر جائے گا - ابھی زمین کے اندر تہ خانوں میں بیٹھا ہوا ہے اور اُس کے تھوڑی دیر بعد، ہزاروں فٹ اوپر ہوا میں لہریں لیتا ہوا نظر آئے گا - کاش! میرا مقصد پورا ہو جائے - اے کاش! میرے تجربے کامیاب ثابت ہوں!!!

نجومی: - عقلمند دوست! تمہاری باتیں بالکل ٹھیک ہیں۔ میں ستاروں کے ہیر پھیر میں رہتا ہوں - لیکن سوچو تو سہی - اِس سے اِس دُنیا کو کتنا بڑا فائدہ پہنچتا ہے - بہت سے آنے والے خوفناک اور تباہ کُن حوادث کا پتہ پہلے ہی سے لگ جاتا ہے اور لوگ، قبل از وقت اُن سے بچنے کی ترکیبیں کر لیتے ہیں - اگر میرا طبقہ ان باتوں کا پتہ نہ لگائے تو ——؟ اب تک میرے طبقہ نے انسانوں اور دُنیا کو کتنی بڑی بڑی تباہیوں سے بچایا ہے - مگر تم اس پر غور ہی کیا کرو گے! تمہارے نزدیک تو نجومیوں کا وجود ہی بیکار ہے - تم تو انہیں زمین پر ایک بوجھ سمجھتے ہو - کہتے ہو "نجومیوں سے اِس دنیا کو کوئی فائدہ نہیں -" نہ سہی - مگر اس سے بھی تمہیں انکار نہ کرنا چاہیئے کہ تم جیسے موجد، جہاں اپنی ایجادات و اختراعات سے دنیا کو فائدہ پہنچاتے ہیں، وہیں اس دنیا میں ایک نہ ختم ہونے والی تباہی و بربادی کا سلسلہ بھی چھوڑ جاتے ہیں - تیر و کمان —— عہدِ قدیم کی ایجاد ہیں - اِن کے موجد نے انہیں جانوروں کا شکار، آسانی کے ساتھ کرنے کے خیال سے بنایا ہو گا - لیکن بعد میں کیا ہوا؟ انسانوں نے ان کی مدد سے ایک دوسرے کا سینہ چھیدنا شروع کر دیا - انہیں تیر و کمان کی مدد سے، راجاؤں نے بڑی بڑی بھیانک لڑائیاں لڑیں اور انسانوں کے کشتوں کے پشتے لگا دئے۔

مادیات کا دَور آیا - انسانی دماغ نے کچھ اور ترقی کی اور غلیل کی جگہ اُس سے زیادہ موثر اور کارگر ہتھیار، بندوق، بنایا - جس سے نہ صرف چھوٹے چھوٹے جانوروں اور پرندوں کا شکار آسان ہو گیا - بلکہ بڑے بڑے درندے، شیر، چیتے اور ہاتھی، پل مارتے ہی زمین پر تڑپتے نظر آنے لگے - کیا تم بتا سکتے ہو کہ بندوق کے موجد نے یہ ہلاکت پھیلانے والا ہتھیار اس خیال سے بنایا تھا کہ جھنجھناتی ہوئی گولیاں، انسانی سینوں کے پار کر دی جائیں اور ہنستا کھیلتا انسان، آن کی آن میں ایک چیخ مار کر، موت کی گود میں سو جائے؟ صرف ایک بندوق کی ایجاد نے درجنوں ایسی مشینیں بنا دیں جو ایک منٹ میں ہزاروں

انسانوں کا صفایا کر ڈالتی ہیں۔ اب.......

موجد نے نجومی کی بات کاٹتے ہوئے جواب دیا "مگر اس میں ایجاد کرنے والے کا کیا قصور ہے؟ موجد، جو کچھ کرتا ہے، بھلائی کے خیال سے کرتا ہے۔ اسے یہ تو معلوم نہیں ہوتا کہ اس کے بعد انسان، اُس کی بنائی ہوئی چیزوں کا بیجا استعمال کریں گے۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟"

نجومی:۔ ہرگز نہیں۔ موجد کے سامنے، ماضی کی ایک بھیانک تاریخ ضرور موجود ہوتی ہے۔ مگر وہ اس پر غور کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتا۔ اُسے تو نام اور دولت کی خواہش ہوتی ہے جو اُس کی عقل کی آنکھوں پر پٹیاں باندھ دیتی ہے۔ بندوق کے موجد کے سامنے، تیر و کمان اور تلوار کی مثال تو یقیناً موجود ہوگی۔ وہ معمولی سوچ بچار کے بعد اس نتیجہ پر ضرور پہنچ سکتا تھا کہ لوگ اُس کی ایجاد کو بھی غلط طور پر استعمال کریں گے پھر ——— ؟ کیا جواب ہے تمہارا؟

موجد:۔ جواب کیا دوں۔ تم تو ایسی باتیں کر رہے ہو جس کا مطلب یہ ہوتا ہے۔ کہ انسان ویسا ہی بن جائے۔ جیسا کہ وہ آج سے ایک لاکھ برس پہلے تھا۔ وہ موجودہ تہذیب و تمدن اپنے بسائے ہوئے خوبصورت شہروں اور اپنی بنائی ہوئی تمام چیزوں کو چھوڑ چھاڑ کر جنگلوں اور غاروں میں پناہ لے۔ تمہارا خیال تمہیں مبارک ہو۔ رہ گیا تمہارا اعتراض تو تم یقین مانو۔ میری ایجاد کردہ چیز سے دنیا کو سوائے فائدہ کے نقصان نہیں پہنچے گا۔

نجومی:۔ کیا خوب۔ بحری جہاز کے موجد نے بھی وہی سوچا ہوگا جو آج تم کہہ رہے ہو۔ لیکن اس کا انجام کیا ہوا؟ زمین سے زیادہ خطرناک سمندر بن گئے۔ کسے خبر تھی کہ ایک دن بحری جہازوں پر توپیں نصب کی جائیں گی۔ پانی کے جہاز، سمندر کے سینے پر آگ برسائیں گے۔ ایک نے بحری جہاز بنایا اور آج تم ہوائی جہاز بنا رہے ہو۔ مگر یاد رہے تم دونوں کی ایجاد میں کوئی فرق نہ ہوگا۔ تمہاری ایجاد بھی یقیناً دنیا والوں کی تباہی و بربادی کا باعث بنے گی۔ ابھی ہم دونوں جوان ہیں۔ اگر اپنی اپنی عمر طبعی کو پہنچ کر مرے تو شاید تمہیں اپنی ایجاد کے کرشمے اپنی ہی آنکھوں سے دیکھنے کو مل جائیں۔

موجد:۔ میں کسی طرح بھی تمہارا ہم خیال نہیں بن سکتا۔ تم صرف اندھا دھند مخالفت کرنا جانتے ہو۔ میری ایجاد دنیا والوں کے لئے ایک رحمت ہوگی اور بس ———

(۲)

پانچ سال کی طویل مدت ختم ہوگئی۔ موجد اپنے ارادوں میں کامیاب ہوگیا۔ دنیا حیرت میں ڈوب گئی۔ لوگ انگشت بدنداں رہ گئے۔ بحر و بر کا فاتح انسان، ہوائی کرہ کا بھی مالک بن بیٹھا۔ پلک جھپکتے ہزاروں میل کی مسافت طے ہونے لگی۔ موجوں کے تھپیڑوں۔ دل ہلا دینے والے طوفانوں کے تصادم اور خوفناک آبی جانوروں سے بچ کر، انسان، ہنستا، کھیلتا اطمینان و سکون کے ساتھ سمندروں کو پار کرنے لگا۔

خوش نصیب موجد، اپنی کامیابیوں پر پھولا نہ سماتا تھا۔ دُنیا اس کے قدموں پر جھک رہی تھی۔ لوگ اُس کی تعریف کرتے نہ تھکتے تھے۔ ہر گھر میں اس کا چرچا تھا۔ ہر اخبار میں اُس کی تصویر تھی۔ اُس کے دوست نجومی نے بھی یہ سب کچھ دیکھا پڑھا اور سنا اور دل تھام کر رہ گیا۔ اسے کسی نامعلوم خطرہ کا احساس ہو رہا تھا۔ مگر وہ چُپ تھا۔

۱۹۱۴ء کا خونیں سال شروع ہوا۔ جرمنی اور ترکی نے برطانیہ کے خلاف جنگ چھیڑ کر دُنیا کے امن اور سکون کو برباد کر ڈالا۔ ابھی دنیا آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر آبدوز کشتیوں کے کارنامے پڑھ ہی رہی تھی کہ یکایک موٹی موٹی سرخیوں میں یہ خبر شائع ہوئی۔ "موجودہ جنگ میں ہوائی جہازوں کا اہم پارٹ۔ فوجوں کو ہوائی جہازوں کے ذریعہ رسد پہنچائی جا رہی ہے"۔ اس خبر کا شائع ہونا تھا کہ نجومی کی باچھیں کھل گئیں۔ وہ دوڑتا ہوا اپنے دوست موجد کے پاس پہنچا اور اخبار کھول کر سامنے رکھ دیا۔

موجد:۔ (خبر کو بغور پڑھ کر) تو اس سے کیا؟ فوجوں کو رسد پہنچانے میں کوئی نقصان نہیں۔ اس سے کسی قسم کی خونریزی یا تباہی تو نہیں پھیلتی۔"

نجومی:۔ پیارے دوست ابھی تو یہ صرف ابتدا ہے۔ کاش تم اس کی انتہا بھی دیکھ سکتے!!!

موجد:۔ انتہا۔ انتہا کیا؟ اس آغاز کا یہی انجام ہے جو تم دیکھ رہے ہو۔ آگے اور کچھ نہیں۔

نجومی:۔ یہ میں کیسے مان لوں تاوقتیکہ زمانہ کی گردش مجھے یقین نہ دلا دے۔

موجد:۔ تم ہمیشہ یونہی کہتے رہو گے

نجومی:۔ میں یہ کب کہتا ہوں کہ تم نے جو کچھ کہا ہے۔ وہ غلط ہے میرا مطلب تو یہ ہے۔ کہ اس کا فیصلہ مستقبل کرے گا۔

(۳)

جنگِ عظیم اپنی تمام تباہیوں اور ہولناکیوں کو، ماضی کے سپرد کر کے ختم ہوگئی۔ لیکن اس طرح کہ صلح کے دن ہی ایک نئی جنگ کی بنیاد ڈالی گئی۔ شکست خوردہ قوموں نے اُسی دن سے جنگ کی تیاریاں شروع

کردیں - نئے نئے آلات جنگ بنائے جانے لگے - بحری اور ہوائی جہازوں میں بھی کافی تبدیلیاں ہوئیں اور جلد ہی نئے نئے ہلاکت آفریں ہتھیاروں کے ذریعہ چھوٹی موٹی لڑائیاں بھی لڑی گئیں - ایک بار پھر دنیا کے سامنے حیرت و استعجاب کا لہریں مارتا ہوا سمندر تھا - اسی لئے کہ ہوائی جہاز ہی ان لڑائیوں کی جان تھے - جتنی تباہی، بربادی اور دہشت انگیزی ہوائی جہازوں نے پھیلائی تاریخ اُس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے -

جنگِ عظیم ختم ہونے کے ٹھیک بیس سال بعد، دوسری جنگِ عظیم نے جنم لیا - اِس دوسری جنگ عظیم کا چوتھا سال شروع ہو چکا ہے موجودہ جنگ کا انحصار کس چیز پر ہے؟ اِسے تمام دنیا جان چکی ہے - آج نہ وہ نجومی ہے اور نہ وہ موعید ——— ورنہ وہ دونوں وارسا، بلگریڈ، لندن، امسٹرڈم، ہیگ، برلن، رنگون اور مانڈلے جیسے عظیم الشان شہروں کے کھنڈرات اور ہوائی حملوں سے معصوم مرنے والوں کی اَن گنت لاشوں کو دیکھ کر آپس میں آسانی کے ساتھ نپٹ سکتے تھے -

جس حیرت انگیز ایجاد کو دیکھ کر، انسان ایک دن خوشی سے ناچ رہا تھا - آج اُسی ایجاد (ہوائی جہاز) نے انسان کو دنیا سے نیست و نابود کر دینے کی قسم کھالی ہے - اپنی مایہ ناز ایجاد کے کارنامے، پڑھ، دیکھ اور سُن کر انسان کبھی چھاتی پیٹتا ہے اور کبھی سر دُھنتا ہے اور تہذیب و تمدن کا شیدائی انسان نہ جانے کب تک اپنی ایجاد کردہ مشینوں سے اپنا گلا کاٹتا رہیگا -

غزل

فضائے عالم پہ چھا گئے وہ فضا کو بیخود بنا بنا کر
جہاں کو مسحور کر دیا ہے فریبِ جلوہ دکھا دکھا کر

تری نوازش کے میں تصدق مگر اٹھا لے یہ جام و مینا
سرور قسمت میں جب نہیں ہے تو کیا کرے گا پلا پلا کر

جسے محبت پکارتے ہیں اسی کا شاید وہ نام ہوگا
کہ بارہا ان کو دیکھتے ہیں ہم اُن سے نظریں بچا بچا کر

ترے ہی ہاتھوں میں آبروئے نظر ہے پروردگارِ الفت
وہ اور نزدیک آ رہے ہیں نفس کے پردے اُٹھا اُٹھا کر

خدا کا سو شکر ہیں شوالک کی وادیاں سب بہار دربر
وہ جا رہے ہیں مرے وطن کی زمیں کو سونا بنا بنا کر

اگر رہے صبحِ حشر تک یہ گھڑی بھی یارب تو کیا بُرا ہو
وہ مجھ کو بیخود بنا رہے ہیں مری ہی نظمیں سُنا سُنا کر

وہ چاندراتوں کے مست لمحے مری جوانی کا آسرا ہیں
کہ روٹھ جاتے تھے وہ بھی اختر مجھے جب اکثر منا منا کر

اختر ہوشیارپوری

مسٹر اکرام قمر ایم - اے

احیائے علوم اور اصلاحِ مذہب کی تحریکات کے سیاسی افکار

(۱) مارزیلیو اور میکاولی

پڈومارزیلیو (۱۲۷۰ - ۱۳۴۳ء) ایک حیرت انگیز انسان تھا - وہ ایک طبیب بھی تھا اور کلیسا کا پادری بھی - (ایک دفعہ میلان کا اسقف بھی بن گیا تھا - مگر بعد میں اُسے کلیسائی حقوق سے محروم کر دیا گیا -) قانون دان بھی تھا اور سپاہی بھی - اور سیّاس بھی - اس نے ازمنۂ وسطیٰ کے خیالات اور پیچیدگیوں سے اپنے مشہور ہمعصروں سے زیادہ مکمل طور پر اپنے آپ کو آزاد کرا لیا تھا - اگرچہ شہنشاہ لوئی چہارم نے اسے اپنے پاس بلا لیا تھا تاکہ وہ پوپ جان لسبت و دوم کے خلاف اس کی مدد کرے مگر وہ مقدس سلطنتِ روما کے وجود کا بالکل منکر تھا - اس کے نظریات پاپائی طاقت اور شاہی اقتدار دونوں کے خلاف تھے - یہ سچ ہے کہ اس نے یہ تعلیم دی ہے کہ کلیسا ریاست کے اور پادری بادشاہوں کے ماتحت ہیں - مگر اس نے یہ بھی کہا ہے کہ اسقف اور بادشاہوں میں سے کوئی بھی خدا کا مقرر کردہ نہیں ہے بلکہ یہ سب حاکم عوام کے نمائندے ہیں -" اگرچہ یہ نظریہ قدیم رومی وکلاء کی سیاسی تعلیم کے مشابہ تھا - مگر چودھویں صدی کے لئے یہ اتنا انوکھا اور مروّجہ خیالات کے اتنا برعکس تھا - کہ پاپائیت نے اسے قابلِ نفرین گردانا اور سلطنت نے اسے متروک قرار دیا - لیکن یہ نظریہ محفوظ پڑا رہا - حتیٰ کہ تحریکِ احیائے علوم کے علمبرداروں نے اسے اپنا لیا - مارزیلیو کی کتاب "دفاعِ امن" (۱۳۲۴ء) میں تین موضوعوں پہ بحث کی گئی ہے :-

ا - مارزیلیو کے نزدیک دنیوی حکومت کا منتہا امن ہے اور امن کے لئے شہنشاہیت جمہوریت سے بہتر ہے - اور وہ عوام کی زیرِ نگرانی اور قانونی حدود کے اندر رہتے ہوئے اپنی طاقت کا استعمال کرتے ہیں - قانون کا ماخذ شہنشاہ نہیں بلکہ عوام ہیں - جو بادشاہ کا انتخاب کرتے ہیں -

ب - کلیسا صرف پادریوں پر مشتمل نہیں بلکہ اس میں تمام عیسائی مرد اور عورتیں شامل ہیں - اس لئے پاپائی مجلس کا کلیسا کی قوتِ اعلیٰ ہونا تو درکنار مجالسِ کلیسا بھی اس قوت کی مالک نہیں - بلکہ یہ قوت اُس مجلسِ عام میں ہے جس میں پادری اور دنیا دار لوگ دونوں موجود ہوتے ہیں اور جس کا بہتر حصّہ (جس کا اکثریت میں ہونا لازمی نہیں) امورِ متنازعہ کا فیصلہ کرتا ہے - پادریوں کو صرف روحانی فرائض تک محدود رہنا چاہیئے اور دنیوی معاملات میں مداخلت نہیں کرنی چاہیئے - پاپائے اعظم عیسائیوں کی مجلس عام کا صرف ایک نمائندہ ہے اور دوسرے عیسائیوں پر کسی قسم کی جبّلی افضلیت نہیں رکھتا -

ج - ریاست اور کلیسا دونوں ایک ہی قسم لوگوں پر مشتمل ہیں - جو اگرچہ مختلف گروہوں میں منقسم ہیں - اس میں کوئی شک نہیں کہ اگلی دنیا میں روحانی طاقت فوقیت رکھتی ہوگی - مگر اس دنیا میں دنیوی طاقت ہی افضل ہونی چاہیئے -

مارزیلیو ایک انقلابی مفکّر تھا - اسے دو صدی بعد پیدا ہونا چاہیئے تھا -

اس کے اور اس کے علمی بھائی میکاولی (۱۴۶۹ - ۱۵۲۷ء) کے درمیان کا زمانہ تحریکِ احیائے علوم کا عبوری دور تھا - اس زمانے میں سلطنت اور پاپائیت دونوں کی سیاسی اہمیت کم ہو رہی تھی، قومی ریاست کا موجودہ نظریہ نشو و نما پا رہا تھا - ہسپانیہ، فرانس اور انگلستان میں طاقتور بادشاہتیں قائم ہو رہی تھیں - جرمنی اور اطالیہ چھوٹی چھوٹی ریاستوں اور بلدیاتی اداروں میں تقسیم ہو رہے تھے - فنِ جنگ کا ایک نیا طریقہ ترقی پکڑ رہا تھا - یعنی بارود اہمیت اختیار کرتا جا رہا تھا - چھاپہ خانہ ایجاد کیا گیا - امریکہ معلوم کیا گیا - کائنات کی عظمت و وسعت کا کوپرنیکی[۱] انکشاف ہوا اور ازمنۂ وسطیٰ کے جغرافیۂ عالم کو غلط

---

[۱] مشہور پروشیائی ہیئت دان کوپرنیکس (۱۴۷۳ - ۱۵۴۳ء) نے ایک نیا نظامِ شمسی پیش کیا تھا جسے کوپرنیکی نظام کہا جاتا تھا - (مترجم)

ثابت کیا گیا۔ اس سیاسی و ذہنی انقلاب کے دور میں ازمنۂ وسطیٰ کا غیر محسوس خاتمہ اور موجودہ زمانے کا آغاز ہو گیا۔

میکاولی، فلورنس کی مختصر سی مگر عظیم الشان جمہوریت کا باشندہ تھا۔ وہ ایک اطالوی محبِ وطن تھا۔ وہ یہ دیکھ رہا تھا کہ اس کا ملک تشتت و انتشار اور مفسدہ پردازیوں کی بنا پر طاقت کی دوڑ میں مغرب کی بڑی بڑی قومی ریاستوں سے پیچھے رہ گیا ہے اور کہ وہ زمانہ کچھ دور نہیں جب اسے فرانس یا ہسپانیہ فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کر لیں گے یا یہ دونوں اس پر قبضہ کرنے کے لئے باہم جھگڑیں گے اور یہ تباہ و برباد ہو جائیگا۔ چنانچہ وہ کوئی ایسا طریقہ معلوم کرنے کے لئے بہت بیتاب تھا جس سے اطالیہ متحد ہو جائے۔ ہر قسم کے جارحانہ اقدام کا مقابلہ کر سکے، غیر ملکیوں کو باہر نکال سکے۔ نظم و قانون قائم کر سکے، اور فنون و تمدن کی ترقی کے لئے مناسب ماحول پیدا کر سکے۔ اسی مقصد کی خاطر اس نے تین بڑی بڑی کتابیں — "فن جنگ" "لائیوی پر مکالمات" اور "بادشاہ" لکھیں۔ وہ ایک عملی سیاس تھا، ایک سیاسی مفکر نہیں۔ اس کی تصنیفات فنِ حکومت پر ہیں۔ نظریۂ ریاست پر نہیں۔ اطالیہ کی بدحالی کے وہ چار اسباب پیش کرتا ہے۔ یعنی افتراق، بدنظمی، قوتِ مدافعت کی عدم موجودگی، اور غیر ملکی گروہوں یعنی ہسپانیہ، جرمنی اور سوئٹزرلینڈ کے باشندوں کے ہاتھوں اطالیہ کی غارتگری۔ بعد ازیں وہ اس صورت کا حل پیش کرتا ہے اور کہتا ہے کہ باشندوں کی ایک مضبوط قومی رضاکار فوج قائم کی جائے۔ اور ایک طاقتور و متحدہ قومی ریاست کا قیام عمل میں لایا جائے۔ لیکن اطالیہ کی بدنظمی و بدحالی کے زمانے میں ان تجاویز کو کس طرح عملی جامہ پہنایا جائے؟ اس کا خیال ہے کہ انہیں صرف ایک مطلق العنان، جابر، اور بے ایمان بادشاہ ہی عملی صورت دے سکتا ہے۔ اس کی اپنی ہمدردیاں جمہوریت کے ساتھ ہیں اور اسے اس امر کی توقع ہے کہ جب اطالیہ متحد ہو جائے گا اور اس میں امن قائم ہو جائے گا تو یہ ایک جمہوریت بن سکتا ہے۔ لیکن اُسے اس بات کا اعتراف ہے کہ جمہوریت کا قیام صرف اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب لوگ قدیم رومیوں کی طرح راستباز اور محبِ وطن بن جائیں گے۔ اور اگر لوگوں میں سولھویں صدی کے اطالیوں کی طرح بدعملی اور گروہ بندی موجود ہو تو ایک جابر بادشاہ کا عارضی عہدِ حکومت اگرچہ تکلیف دہ ہو مگر ضروری امر ہے۔ بادشاہ کو اپنے مقصد کے حصول کے لئے — یعنی اطالیہ کے اتحاد، ایک قومی فوج کے قیام، غیر ملکی حملہ آوروں کے اخراج، اور امن و خوشحالی قائم کرنے کے لئے — کیا ذرائع اختیار کرنے چاہئیں؟ اس کا خیال ہے کہ یہ مقصد اتنا عظیم ہے کہ ذرائع غیر اہم ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اگر بادشاہ اپنا مقصد ان ذرائع سے حاصل کرے جنہیں اخلاقی سمجھا جاتا ہے تو یہ ایک اچھی بات ہے۔ لیکن یہ اغلب — بلکہ تقریباً یقینی ہے کہ وہ ایسا نہیں کر سکتا۔ اس صورت میں اسے بلا تامل وہ ذرائع اختیار کرنے چاہئیں — مثلاً بے رحمانہ جبر و تشدد اور غیر محدود دغا و فریب — جنہیں عام طور پر غیر اخلاقی گردانا جاتا ہے۔ یہ میکاولیت کا لبِ لباب ہے۔ اس طرح سے سیاست کو اخلاقیات سے خارج کر دیا گیا۔ یہ نظریہ اس امر کا اعلان ہے کہ مقصد ہر قسم کے ذرائع کو جائز قرار دیتا ہے۔

(۲) کالوینی اور یسوعی

میکاولی نے اپنے خاص سیاسی اصولوں کو اپنے ذاتی معاملات پر عائد کر کے اپنی زندگی جلاوطنی، غربت اور ذلت میں بسر کر دی۔ مگر اس کی زندگی کے ختم ہونے سے قبل ہی اصلاحِ مذہب کی تحریک شروع ہو چکی تھی، جس نے ازمنۂ وسطیٰ کی عیسائی جمہوریت کے مؤثر اتحاد کو یک قلم تباہ کر کے رکھ دیا۔ اگرچہ اس تحریک کا مذہبی پہلو زیادہ اہم تھا۔ مگر اس میں سیاسی، سماجی، اور اقتصادی مسائل بھی شامل تھے۔ یہ لاطینی غلبہ کے خلاف ٹیوٹانی (جرمن) بغاوت تھی، قومی ریاست کی طرف سے غیر ملکی اقتدار کی مخالفت تھی۔ دنیاداری کی طرف سے کلیسائی جائداد پر حملہ تھا، مظلوموں کا ظالموں کے خلاف اعلان جہاد تھا، اور فرد کی طرف سے ہیئت حاکمانہ کی علانیہ نافرمانی تھی۔ چنانچہ اس تحریک نے اہم ترین سیاسی مسائل پیدا کر دئے۔ خصوصاً "دو طاقتوں" کے تعلق ازمنۂ وسطیٰ کے سوال کا ایک نئی شکل میں احیا کیا گیا۔ یہ "دو طاقتیں" اب بیّن طور پر کلیسا اور ریاست تھیں۔ علاوہ ازیں اس نے مذہبی رواداری کے پیچیدہ اور خارناک مسئلے کو بہت اہمیت دے دی۔

تھیوڈوسس کے متذکرۃ الصدر فرمان (۳۹۲ء) سے لے کر تمام ازمنۂ وسطیٰ میں شہریت اور رکنیتِ کلیسا باہم مترادف سمجھی جاتی تھیں۔ بدعت اور بغاوت ایک ہی [illegible] کی جاتی تھی جیسے آج مذہبی جبر کیا جاتا ہے۔ اُسے اُس زمانے میں عیسائی سلطنت کے خداوندی آئین کے بقا کے لئے لازمی تصور کیا جاتا تھا۔ لیکن اب عیسائی مملکت کا آئین ناقابلِ تلافی طور پر پارہ پارہ ہو چکا تھا۔ جتنے [illegible] مذہبی فرقے موجود تھے بدعت کی اتنی ہی کثیر اور نئی تعبیریں کی جانے لگیں۔ اپنی رعایا کے مذہبی اعتقادات کے متعلق بادشاہوں کی روش کیا ہونی چاہیئے؟ مصلحین کا بادشاہ کی طاقت و حاکمیت کے بارے میں کیا رویہ ہونا چاہیئے؟ اس قسم کے سوالات تحریکِ اصلاحِ مذہب نے پیدا کر دئے تھے۔

اس نئی تحریک کے علمبردار مارٹن لوتھر (۱۴۸۳-۱۵۴۶ء) نے اپنے بادشاہ فریڈرک آف سیکسنی کی شکل میں ایک ایسا شخص پایا تھا جو شاہی بندشوں اور پاپائی فرامین کے خلاف اس کا محافظ تھا۔ اس لئے لوتھر ایک زبردست شہنشاہیت پسند تھا اور اس نے اس بات پر بہت زور دیا کہ رعایا

اپنے حاکم کی اطاعت کرے۔ اس نے ریاست کو افضل قرار دیا - اس اصول کو صحیح تسلیم کیا کہ حکومت مذہب کے متعلق قوانین بنائے - المختصر اس نے اس جرمن فرقے کی بنیاد رکھی جس کی تعلیم ہیگل اور طریٹیشک نے مکمل صورت میں پیش کی ہے - تاہم اسے اس سوال کا بھی سامنا تھا کہ ہوسکتا ہے کہ ہر بادشاہ فریڈرک کی طرح اچھا اور مفید نہ ہو بلکہ جابر و دغا باز ہو - اس لئے وہ اسبات پر مجبور ہو گیا کہ (۱) بادشاہ پر زور دے کہ وہ مذہبی معاملات میں دخل انداز نہ ہو اور مذہبی و دینوی امور کی ایک دوسرے سے علیحدگی کو تسلیم کرے -

(۲) اگر ایک بادشاہ اپنی غلطی پر اصرار کرے تو ان امور کو علیحدہ علیحدہ رکھنے کا آخری طریق کار یہی ہے کہ رعایا مقابلہ کرے اور اطاعت سے انکار کر دے اور ایسا کرنا رعایا کا صرف حق ہی نہیں بلکہ فرض ہے -

یہ امر واقعہ ہے کہ "حق بغاوت" تحریک اصلاح مذہب کی فطرت میں تھا - ایک مصلح دنیاوی طاقت کا خواہ کتنا ہی حامی کیوں نہ ہو اس کے لئے اس حق کو تسلیم کئے بغیر اور کوئی چارہ نہیں - کلیسا اور ریاست کا امتیاز ایک دفعہ پھر واضح طور پر قائم کر دیا گیا - یہ حکم عظیم کہ "قیصر کی چیزیں قیصر کو اور خدا کی چیزیں خدا کو دو" ایک بار پھر زندہ ہو گیا - جس سے کوئی گریز نہ کر سکتا تھا -

جان کالوین (۱۵۰۹-۱۵۶۴ء) لوتھر کی طرح بدعت کے خاتمہ، امن و اطاعت اور حاکمیت کے قیام کا مشتاق تھا - لیکن آئین ریاست اور دو طاقتوں کے تعلق کے بارے میں اس کا نظریہ لوتھر سے بالکل مختلف تھا - سینٹ برنارڈ سے لیکر سینٹ ایکوئینس تک کے ازمنۂ وسطیٰ کے بڑے بڑے پاپائیت پرستوں کے بنیادی سیاسی نظریے کو اس نے تسلیم کیا اور روحانی طاقت کو دینوی طاقت پر اور کلیسا کو ریاست پر فوقیت دی - اس کے نزدیک بادشاہ اور عمال حکومت آسمانی خدا کا صرف دینوی بازو ہیں - مگر کچھ مدت بعد شہنشاہی طرز حکومت اس کے نزدیک بہترین نظام نہ رہا - لوتھر نے انتہائی غیظ و غضب میں جو کچھ کہا تھا، اس نے اس سے مکمل اتفاق کیا ——— یعنی بادشاہ عموماً صفحۂ ارض پر احمق ترین انسان یا بدترین بدمعاش ہوتے ہیں - اس کا خیال تھا کہ جمہوری حکومت جو کبائرِ کلیسا پر مشتمل ہو ایک ایسا نظام حکومت ہے جو آدرشی حکومت کے قریب ترین ہے - اگر ایسی حکومت قائم ہو جائے تو اس کی کسی قسم کی مخالفت برداشت نہیں کی جا سکتی - مگر کالوین کو بھی بڑی ہچکچاہٹ کے بعد اپنی کتاب "مبادیات قانون" کے آخری صفحات میں یہ لکھنا پڑا ہے کہ ناممکل نظام حکومت میں مخالفت نہ صرف جائز بلکہ ضروری ہے - اگر ایک بادشاہ "جابر" ہے تو ریاست کے ذمہ دار اس کی مخالفت کر سکتے ہیں - اگر بادشاہ "بدمعاش" ہے (مگر بدمعاشی کی تعریف کون کرے گا؟) تو تمام رعایا اس کی قانوناً مخالفت کر سکتی ہے - یہ تعلیم ایک چھوٹی سی لہر تھی - جس میں سے بغاوت کے طوفان ابھر ابھر کر برِ اعظم یورپ کو غرق کر سکتے تھے -

کالوین کے پیروؤں نے ——— خصوصاً فرانسیسی فلپ ڈپلیسس مورے نے اپنی کتاب "ونڈیشیا کونٹرا ٹائرینس Vindiciae Contra Tyrannos" مطبوعہ ۱۵۷۹ء میں اور اس کا سکاٹ جارج بکانن نے اپنی کتاب "ڈی جورے ریجنی ایپڈ سکوٹس" (De Jure Regni apud Scots) مطبوعہ ۱۵۷۹ء میں — "مبادیات قانون" کے ناممکل نظریہ "حق بغاوت" کو پھیلا کر پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا - یہاں تک کہ یہ نظریہ ان کے سیاسی فلسفے کا بنیادی تصور بن گیا - بغاوت کے حق پر جو زور وہ دیتے تھے اس کی وجہ درحقیقت وہ خونین مظالم تھے جو انگلستان کی میری ٹیوڈر، اسکاٹستان (Scotland) کی میری آف گائز، ہسپانیہ کے فلپ دوئم اور فرانس کے چارلس نہم نے کالوینیت پر روا رکھے تھے - سینٹ بارتھولومیو کے تہوار کے موقعہ پر ۱۵۷۲ء میں فرانسیسی پروٹسٹنٹ عیسائیوں کا جو قتلِ عام کیا گیا اس کی وجہ سے شہنشاہیت کے خلاف تصنیفات کا ایک سیلابِ عظیم امڈ پڑا -

صرف کالوینی ہی شہنشاہی اطمینان و سکون کو پارہ کر کے سولھویں صدی کے آخری دور میں موردِ جبر و عتاب نہیں تھے بلکہ پروٹسٹنٹ ممالک میں یسوعیوں (Jesuits) کا نیا فرقہ کیتھولک کلیسا سے وفاداری اور بدعتی بادشاہوں کے احکام کی نافرمانی کی حوصلہ افزائی کر رہا تھا - چنانچہ پروٹسٹنٹ بادشاہ اس فرقے کے خلاف ہو گئے اور اس پر سخت ظلم کئے - اس کے نتیجے کے طور پر یسوعی ماہرین[۱] دینیات حقِ بغاوت اور قتلِ جابر کی حمایت میں کالوینی مصنفوں سے بھی آگے نکل گئے - انہوں نے بھی ریاست کے متعلق ایک دلچسپ اور اہم نظریہ پیش کیا - ان کے نزدیک ریاست کے پاس خدا کی کوئی عطا کردہ طاقت نہیں ہے - یہ صرف ایک دینوی ادارہ ہے جو کلیسا سے مکمل طور پر کمتر ہے - ان کے خیال کے مطابق ریاست کی بنیاد خالصتہً انسانی یعنی قول و اقرار یا معاہدہ ——— ہے - ان کی تعلیم یہ ہے کہ حکومت کی طاقت کا ماخذ عوام ہیں -

(۳) ملوکیت پرست

کالوینیوں اور یسوعیوں نے جبر و استبداد کے خلاف جو نظریات پیش کئے -

---

[۱] مثلاً "ڈی ریج ایٹ ریجس انسٹی ٹیوشن" (De Rege et Regis Institutione) مطبوعہ ۱۵۹۹ء کا مصنف جان ڈی ماریانا۔

انہوں نے شاہی اور آئینی حلقوں میں اضطراب کی لہر دوڑا دی - ان عقاید کے سرگرم پیرؤں کے نظریات کی بنا پر جو قتل و غارتگری اور بغاوتیں ہوئیں وہ اس اضطراب سے بھی زیادہ پریشان کن تھیں - سولھویں صدی کے اواخر اور سترھویں صدی کے آوائل کے ہر مشہور سیاس کو ہر وقت متشددانہ موت کا خطرہ لگا رہتا تھا - ولیم آف آرینج ۱۵۸۴ء میں بالتھازر جیرارڈ کے پستول سے نشانۂ اجل ہوا - مگر اس سے پیشتر بھی اس کے قتل کی پانچ مرتبہ کوشش کی گئی تھی جس سے وہ بچ گیا - الزبتھ ملکۂ انگلستان نے ایک فرانسیسی سفیر کو بتایا کہ اس نے فلپ دوم شاہ ہسپانیہ کے کم از کم پندرہ ایسے جاسوس گرفتار کئے ہیں - جنہوں نے اس امر کا اقبال کیا ہے کہ وہ اس کے قتل کے لئے بھیجے گئے تھے - ہنری چہارم شاہِ فرانس پر انیس قاتلانہ حملے کئے گئے - مگر وہ بچ گیا - لیکن آخر کار ۱۶۱۰ء میں راویلاک کے خنجر سے موت کے گھاٹ اترا - سینٹ بارتھولومیو کے تہوار کے قتل عام پر شکر گزار وفادار پوپ نے خدا کی حمد و ثنا کی اور اس واقعے پر شاہ ہسپانیہ نے پرتپاک مبارکباد دی - کلیمنٹ نے ۱۵۸۹ء میں ہنری ہشتم کو دھوکے سے قتل کر کے والوئس خاندان کا خاتمہ کر دیا - اس فعل کی سکسٹس پنجم نے بہت تعریف کی - اور کیتھولک فرقے کے متعدد مذہبی علما نے اس کی صفائی میں دلائل پیش کئے - کارڈینل بیٹن کے اسکاچستان میں اور ڈیوک آف گائز کے فرانس میں قتل ہونے پر کالونیئیوں نے نعماتِ فتح و تحسین بلند کئے - جان ناکس اور تھیوڈور بیزا کے سے زہد و تقویٰ کے لئے مشہور اشخاص نے رونگٹے کھڑے کر دینے والے ان خوفناک واقعات سے چشم پوشی کی -

اس افسوسناک صورتِ حال کی بنا پر ——— جس میں مشتعل مذہبی فرقے سلطنت کی تباہی کا باعث ہو رہے تھے ——— سرگرم مکار و عیار لوگ قابل تعزیر اور معاشرت کش جرائم کا ارتکاب کر رہے تھے اور کلیسا کے اعلیٰ عہدہ داران جرائم کی صفائی پیش کر رہے تھے ——— ایک طرف تو شہریوں کی ایسی جماعتیں بن گئیں جو رواداری کے اصولوں پر مذہبی امن کو دوبارہ قائم کرنا چاہتی تھیں اور دوسری طرف حالاتِ زمانہ کے مطابق سیاسی اصول وضع کئے گئے -

شہری جماعتوں کے اصولوں کا علمبردار جین بوڈین (۱۵۳۰-۱۵۹۶ء) تھا - وہ ایک فرانسیسی تھا جو سینٹ بارتھولومیو کے موقع پر محض اپنی غیر معمولی چالاکی اور تقریباً معجزنما خوش قسمتی کی بنا پر بچ گیا تھا - وہ مذہب میں انتہائی جوش کے سخت خلاف تھا - اپنی کتاب "ہپٹا پلومرز" میں اس نے اطاعتِ وقت اور ریاست کے مفاد کی خاطر رواداری کے حق میں زبردست دلائل دئے - اس کی دوسری مشہور تصنیف "جمہوریت پر چھ مقالات" ۱۵۷۶ء میں سیاسیات پر بحث کی گئی ہے - ارسطو نے بعد سیاسیات پر جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں

ان میں یہ جامع ترین ہے - اس میں بوڈین نے ریاستی حاکمیت کا نظریہ پیش کیا ہے - مخالفت و بغاوت کے جبلّینہ حقوق کی مذمت کی ہے - قانون کو موضوعہ اور قطعی و ناطق قرار دیا ہے اور اعلان کیا ہے کہ کلیسائی طاقت دنیوی طاقت کے ماتحت ہے - یہ نظریہ ڈھائی سو سال سے مارزیلیو کی کتاب "دفاعِ امن" کے بعد کسی نے پیش نہیں کیا تھا - مارزیلیو کی اس کتاب نے مستقبل کے سیاسی خیالات پر بہت زیادہ اثر ڈالا تھا -

بوڈین بہت زیادہ عقلیت پسند اور آزاد خیال تھا - اس لئے ہر ایک کو خوش نہیں کر سکتا تھا - حتیٰ کہ ان اعتدال پسندوں کو بھی جن کے لئے اس نے کتابیں لکھی تھیں - یہ بات خاص طور پر قابلِ توجہ ہے کہ وہ ریاست کا بہت ذکر کرتا ہے - مگر بادشاہ کا بہت کم، بغاوت کا بہت ذکر کرتا ہے - مگر "قتلِ جابر" کے جرم کا کافی ذکر کبھی نہیں کرتا، سیاسیات کا بہت ذکر کرتا ہے - مگر مذہب کا بہت معمولی - چنانچہ مفکرین کے ایک اور دبستان نے بادشاہ کے نائبِ خدا ہونے کے نظریہ کو اختیار کیا اور اسے ترقی دی - ازمنۂ وسطیٰ میں جب پاپایانِ اعظم اور بادشاہوں کے درمیان جھگڑے اٹھ کھڑے ہوئے تھے، اس زمانے میں اس نظریئے کی نامکمل طور پر بنیاد رکھ دی گئی تھی - ملوکیت پسند اشخاص مثلاً دانتے یہ کہتے تھے کہ قیصر نے اپنی طاقت خدا سے براہِ راست حاصل کی ہے - اس نظریئے کو قومی بادشاہوں اور ان کے حامیوں نے اپنایا اور اسے وسعت دی - حتیٰ کہ اس کی آخری شکل مندرجہ ذیل پانچ اصولوں پر مشتمل تھی :-

(۱) بادشاہت خدا کا ایک مقرر کردہ ادارہ ہے -

(۲) بادشاہت کا ماخذ اور نمونہ عہد نامۂ عتیق میں مذکور سر قبیلی (Patriarchal .) نظام ہے -

(۳) بادشاہت خلفِ اکبر کو ترکے میں ملتی ہے -

(۴) جو بادشاہ خداوندی نیابت کو وراثت میں حاصل کرتے ہیں وہ اپنے حاکمانہ افعال کے لئے صرف خدا کے سامنے جواب دہ ہیں -

اور (۵) اس لئے رعایا کا فرض ہر حالت میں بادشاہِ وقت کی مکمل اطاعت ہے -

اس مطلق العنانی کے نظریئے کے زبردست مبلغوں میں سے دو اسکاچستانی ——— ولیم بارسلے اور جیمز اوّل ——— بہت مشہور ہیں ولیم بارسلے فرانس میں استادِ قانون کی حیثیت سے آباد ہو گیا تھا - اس نے اس نظریہ کو اپنی کتاب "ڈی ریگنو ایٹ ریگالی پوٹسٹیٹ" (De Regno et Regali Potestate) مطبوعہ ۱۶۰۰ء میں پیش کیا ہے - جیمز اوّل شاہِ انگلستان کی حیثیت سے انگلستان میں آباد ہو گیا تھا - اس نے اس نظریہ کی انتہائی شکل کو اپنی کتابوں "آزاد

بادشاہوں کا حقیقی قانون اور بادشاہوں کے حق کا جواز" اور دیگر مختلف تحریروں اور تقریروں میں پیش کیا ہے - لبدازاں سترھویں صدی میں سر رابرٹ فلمر نے اس کی معتدل اور معقول صورت کو اپنی کتاب "سر قبیلی نظام" میں پیش کیا ہے (یہ کتاب ۱۶۴۲ء میں لکھی گئی مگر ۱۶۸۰ء تک شائع نہیں ہوئی تھی) یہ ایک چھوٹی سی کتاب ہے - اگر جان لوک اس کتاب کا خون کرکے اسے حیاتِ ابدی نہ بخشتا تو یہ کبھی کی ختم ہو چکی ہوتی۔

تمام ملوکیت پسند اشخاص بادشاہ کے نائبِ خدا ہونے کے نظریئے کو مکمل طور پر اپنا نہ سکے - اس کے لئے اس زبردست اعتقاد کی کی ضرورت تھی کہ تمام جائز طور پر بنے ہوئے بادشاہ حضرت ابراہیمؑ کے صلبی وارث ہیں اور دنیا کی تمام جائز سیاسی طاقت عہد نامۂ عتیق میں مذکور سردارانِ قبائل سے حاصل کی گئی ہے - جو اشخاص اس نظریئے کی تردید پر مجبور ہو گئے تھے - ان میں مالمسبری کا فلسفی طامس ہوبز (۱۵۸۸ - ۱۶۷۹ء) بھی شامل ہے - لیکن وہ جیمز اوّل کی طرح ریاست کی حاکمیت کا زبردست حامی، قانونِ موضوعہ کی قطعیت کا زبردست مؤید اور مبیّنہ "حقِ بغاوت" کا زبردست مخالف تھا - انگلستان کی خانہ جنگی اور قربِ جنگ کی بنا پر اپنی جان بچانے کی غرض سے وہ پیرس چلا گیا - اور وہاں اس نے اپنی مشہور کتاب "عفریت" (Levia than) مطبوعہ ۱۶۵۱ء لکھی جس کا ایک نسخہ اُسے مغرور بادشاہ چارلس دوم کی خدمت میں بھی پیش کرنے کا شرف حاصل ہوا - اس اہم کتاب میں اُسنے بوڈین کے نظریۂ ریاستی حاکمیت پر زور دیا ہے اور اسے پایۂ تکمیل تک پہنچایا ہے (اس کے نزدیک ریاست کی بنیاد ایک ناقابلِ تنسیخ معاہدۂ عمرانی پر رکھی گئی ہے) بوڈین کے نظریۂ قانون کی توضیح و توسیع کی ہے (اس کے نزدیک مدنی قانون بادشاہ کا حکم ہے اور ہر قسم کے قدرتی اور خداوندی قانون پر فوقیت رکھتا ہے) اور زبردست دلائل سے کلیسا کو دنیوی طاقت کے مکمل طور پر ماتحت ثابت کرنے کی کوشش کی ہے -

(ترجمہ)

ضروری اطلاع

خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر اور اپنا پورا پتہ صاف اور خوشخط لکھا کریں -

(مینجر)

غزل

خونِ جگر سے جس کی آنکھ عشق میں تر نہ ہو سکی
اُس کو نصیبِ لذتِ فکر و نظر نہ ہو سکی

تھی تری کائنات ہی تیرا مقامِ بندگی
اے دلِ غفلت آشنا تجھ کو خبر نہ ہو سکی

جانے میں کیوں خموش تھا حُسن کی بارگاہ میں
تجھ سے بھی کوئی بات اے میری نظر نہ ہو سکی

جس کو جہانِ عشق میں مل نہ سکی نگاہِ پاک
تیری خبر تو کیا اُسے اپنی خبر نہ ہو سکی

چھائی رہیں نگاہ پر یاس و الم کی بدلیاں
غم میں تمیزِ آمدِ شام و سحر نہ ہو سکی

ضبط ترے ہی ہاتھ سے عشق کی آبرو لُٹی
اشک کی ایک بوند تک تجھ سے گہر نہ ہو سکی

نالہ وہ کیا جو چیر کر عرش و فلک نکل نہ جائے
آہ وہ کیا جو حاصلِ برق و شرر نہ ہو سکی

حوصلے لاکھ گو دیئے دل نے زبان کو طفیل
اُس سے حریمِ حُسن میں بات مگر نہ ہو سکی

طفیل بہنے والوی

سید نصیر احمد بی - اے

ٹکٹ بابو

فرید کئی ماہ سے بیروزگار تھا - لہذا سخت پریشان تھا - ورنہ وہ ریلوے اسٹیشن پر یہ معمولی سی ملازمت ہرگز قبول نہ کرتا - جس دن حضور گورنر بہادر نے اپنے مبارک ہاتھوں سے اُسے ایک چوکور کاغذ پر ایم - اے کی ڈگری دی تھی، اس دن سے اس نے یہ سمجھنا شروع کر دیا تھا کہ اس کو ضرور بالضرور کوئی نہایت اعلیٰ درجہ کی سرکاری ملازمت مل جائے گی یا نہیں تو وہ کسی کالج میں پروفیسر یقیناً ہو جائے گا - اس لئے کہ انگریزی زبان پر اسے ویسا ہی عبور حاصل تھا جیسا خود انگریزوں کو ہوتا ہے - وہ اس طرح فرفر انگریزی بولتا تھا کہ سننے والوں کو حیرت ہوتی تھی - پھر اس کا تلفظ؟ اس کا کیا کہنا - کچھ پوچھئے نہیں معلوم ایسا ہوتا تھا سیاہ رنگ کے پردہ میں کوئی خالص انگریز بول رہا ہے - وہ انگریزی رسالوں میں ہر ہفتہ مضمون لکھا کرتا تھا - اس کا محبوب موضوع "شیلے اور بائرن" تھا - مگر جمہوریت اور اشتراکیت پر بھی جب کبھی وہ قلم اٹھاتا تو ہر طرف سے تحسین و آفرین کے نعرے بلند ہوتے تھے -

مگر ڈگری لینے کے بعد اس پر ایک تکلیف دہ حقیقت کا انکشاف ہوا - ایسی اعلیٰ درجہ کی انگریزی لکھنے کے باوجود اسے کہیں بھی معقول سرکاری ملازمت نہ مل سکی - اس نے ہزار کوشش کی لیکن ناکام رہا - اور تو اور وہ کسی کالج میں پروفیسر بھی نہ ہو سکا - اسے پتہ چلا کہ وہ صرف تنہا ہی نہیں بلکہ اس جیسے سینکڑوں نوجوان جن کی انگریزی کی قابلیت اس سے کسی طرح کم نہیں اور بھی ہیں - مگر باایں ہمہ فرید اپنے آپ کو یہ یقین نہیں دلا سکا کہ اس کی ناکامی کا سبب محض یہ دوسرے نوجوان ہیں - اس نے اس مسئلہ پر ٹھنڈے دل سے غور کر کے یہ فیصلہ کیا کہ اس کا بوڑھا باپ معمولی سی حیثیت کا آدمی ہے اور اس کا کسی پر ذرا بھی اثر نہیں - کام آج کل رسوخ سے چلتے ہیں اور اس کا باپ کسی کو جانتا نہیں - بات بنے تو کیسے؟ اور کام چلے تو کیوں کر؟ ادھر کوئی اچھی سی ملازمت نکلتی ہے اور ادھر اہل رسوخ چیل کوؤں کی طرح اس پر جھپٹ پڑتے ہیں - ان کے بیٹے ہوتے ہیں - بھانجے - بھتیجے اور نہ جانے اور کون کون - یہ کہیں ختم ہوں تو کسی دوسرے کو بھی ملازمت ملے -

فرید کا باپ ایک معمولی سا دوکاندار تھا جو نئے اور پرانے بائیسکل فروخت کیا کرتا تھا - یہ نہیں کہ اسے اپنے لڑکے کا کچھ خیال نہیں تھا - اسے فرید سے بےحد محبت تھی اور کسی اعلیٰ افسر کو نہ جاننے کے باوجود وہ اس کے لئے کئی دفتروں میں مارا مارا پھرا تھا اور تو اور اس نے اپنے نام کے کارڈ بھی چھپوا لئے تھے - مگر اس کا بھی کچھ نتیجہ نہ نکلا اور ایک واقعہ کے بعد تو اس نے بالکل ہی کہیں آنا جانا چھوڑ دیا - یہ واقعہ اگرچہ معمولی سا تھا مگر اس سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ سرکاری معاملات سے وہ کس قدر بےخبر ہے - ایک دن کسی دفتر میں جا کر اس نے ایک ایسے افسر سے ملنے کی خواہش ظاہر کی جو کسی بھاری غلطی کی وجہ سے برخواست ہو چکا تھا -

جب فرید نے یہ واقعہ سُنا تو اسے اپنے باپ کی بےخبری اور جہالت پر بڑی شرم آئی اور اس نے ایک آہ بھر کر اپنے آپ سے کہا "کوئی تعجب کی بات نہیں اگر مجھے کوئی معقول ملازمت نہیں ملتی - میرا باپ کس قدر احمق ہے" اور اسے اس وقت تمام عوام اور احمق لوگوں سے جیسا اس کا باپ تھا نفرت ہو گئی -

اس نفرت کے باوجود فرید کو اس بات کا احساس تھا کہ اس کے باپ نے اس کے لئے کافی کوشش کی ہے - لہٰذا جب ایک دن اس کا باپ ہنستا ہوا گھر واپس آیا اور کہا " فرید آخر ایک ملازمت میں نے تمہارے لئے حاصل کر ہی لی ہے -" تو فرید کے لبوں پر بھی مسکراہٹ آ گئی - اگرچہ یہ ملازمت اس کی توقعات سے کہیں کم تھی - چند روز پیشتر اس کے باپ کی دوکان پر ایک گاہک آیا تھا جس نے نہایت عمدہ وردی پہن رکھی تھی - دفعتاً بوڑھے کے دل میں ایک خیال آیا اور اس نے پوچھا " جناب کس محکمہ میں ملازم ہیں -"

"ریلوے میں" اس کے گاہک نے بے پرواہی سے جواب دیا

جب وہ گاہک اپنی بیٹی کے لئے ایک نیا سائیکل پسند کر چکا تو بوڑھے نے اسے بتایا کہ اس کا ایک نہایت قابل لڑکا ہے جو ملک و قوم اور حکومت کی خدمت کرنا چاہتا ہے اور اگر وہ ریلوے میں فرید کو کوئی ملازمت دے سکیں تو وہ یہ سائیکل ان کی خدمت میں بطور تحفہ پیش کر دے گا - گاہک جو کوئی بڑا افسر تھا اس بات کو مان گیا اور سائیکل لے کر رخصت ہوا -

فرید کے باپ نے یہ واقعہ سنانے کے بعد آخر میں کہا - " اور فرید اس کی وردی بڑی خوبصورت تھی - چمکتی ہوئی تمہیں بھی ایسی ہی ملے گی -"

مگر بوڑھے کو کیا خبر تھی کہ فرید کو ایسی وردی نہیں مل سکتی - اس لئے کہ اس کی حیثیت نہایت معمولی ہو گی - اس میں کوئی شک نہیں کہ ملازمت کے بعد اسے

وردی مل گئی مگر یہ سیاہ سوتی کپڑے کی بنی ہوئی تھی۔ اس کا کام دروازہ میں کھڑے ہو کر تیسرے درجہ کے مسافروں کے ٹکٹ دیکھنا تھا۔

یہ اس کی زندگی تھی۔ اس کو وہ زمانہ یاد آیا جب کالج کے شاندار کمرہ میں بیٹھا وہ انگریزی ادب کا مطالعہ کیا کرتا تھا۔ اس کے دائیں بائیں لڑکے اور لڑکیاں ہوتی تھیں۔ خوبصورت دبلی پتلی اور شوخ و طرار لڑکیاں اور نیسے سنورے اور فیشن ایبل لڑکے کیتنی رنگین زندگی تھی وہ۔ اور اب !

اب اسے کئی کئی گھنٹے کھڑا رہ کر تیسرے درجے کے مسافروں سے نپٹنا ہوتا تھا اور ان لوگوں کی عجیب حالت تھی۔ وہ کوئی بات ہی نہیں سمجھتے تھے۔ وہ دوپہر کو جانے والی گاڑی کا ٹکٹ خریدنے صبح سویرے ہی آ دھمکتے تھے اور واپس نہیں جاتے تھے۔ وہ اس انتظار میں گھنٹوں زمین پر بیٹھے رہتے کہ پلیٹ فارم پر جانے کے لئے کس وقت دروازہ کھلتا ہے۔ جونہی دروازہ کھلتا وہ ایک دوسرے کو دھکا دیتے، کاندھے مارتے اور چیختے چلاتے دروازہ کی طرف دوڑتے، لپکتے۔ ان کے چہروں پر تھکن، پریشانی اور حیرانی کے ملے جلے جذبات نمایاں ہوتے۔ فرید کا کام کیا تھا بس یہ کہنا "کس گاڑی سے جانا ہے؟ کہاں جاؤ گے؟ تمہارا ٹکٹ کہاں ہے؟" اسے مختلف بولیوں میں جوابات ملتے تھے اور اسے بار بار کہنا پڑتا تھا "یہ وہ گاڑی نہیں ہے جس سے تمہیں جانا ہے" یا "اپنا ٹکٹ دکھاؤ"۔

اسے یہ باتیں ہر روز کئی کئی بار دہرانا پڑتی تھیں۔ ہر روز جو لوگ وہاں آتے تھے ایک ہی قسم کے ہوتے تھے۔ پریشان حال، اجڈ، اکھڑ، ان پڑھ اور پھر ان کے بڑے بڑے گٹھڑ اور گٹھڑیاں، حقے، بانس، گنے، بوریاں اور نہ جانے کیا کیا اور ان کا ہر روز دروازہ کی طرف ہجوم۔ خدا کی پناہ

فرید ان لوگوں سے سخت نفرت کرنے لگا۔ انتہائی نفرت، یہ نفرت اس وجہ سے اور بھی زیادہ تھی کہ وہ ان کی کسی طرح سے اصلاح نہیں کر سکتا تھا۔ اسے ان کی اس حماقت کی وجہ سے سخت ذہنی تکلیف تھی۔ ایک بار تھا مگر وہ اسے دور نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے دو روز صرف کر کے بڑی محنت سے مختلف قسم کی ہدایات کے تختے دروازہ کے آس پاس لگا دئے۔ تاکہ یہ ان لوگوں کی راہنمائی کر سکیں۔ مگر یہ لوگ ایک لفظ بھی نہیں پڑھ سکتے تھے۔ ان کو ہدایات سے کوئی واسطہ ہی نہ تھا۔ ایک بار جب فرید نے ان میں سے چند کو اس طرف متوجہ کرنا چاہا تو ایک نوجوان دیہاتی نے منہ پھاڑ کر اس کی طرف دیکھا اور کہا "جناب میں ایک دن بھی اسکول نہیں گیا۔ میں نہیں جانتا ان پر کیا لکھا ہے۔"

اب اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا کہ فرید پہلے ہی کی طرح چیختا چلاتا اور دیہاتیوں کے طوفان کو دروازہ سے پیچھے دھکیلنے کی کوشش کرتا۔ کسی کو سمجھاتا، کسی کو ڈراتا۔ اسے گھنٹوں اسی کشمکش میں گذارنا پڑتے۔

یہاں تک کہ رات کو بھی اسے ایسا معلوم ہوتا جیسے وہ ان احمق لوگوں سے دست و گریباں ہے۔ خواب میں بھی اسے ان کے تاریک، پریشان اور ڈراؤنے چہرے نظر آتے۔ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھتا۔ پھر سوتا تو پھر وہی چہرے۔

فرید تنہا تھا اور یہ سب اتنے سارے۔ اسے اس تمام طوفان کو روکنا اور پھر ایک ایک کر کے دروازہ میں سے گذارنا پڑتا تھا۔ آخر کار اس میں ضبط اور صبر کی قوت نہ رہی۔ اس نے اپنے آپ پر غور کیا۔ وہ جوان تھا اور تعلیم یافتہ۔ مگر اس کی تعلیم کس کام کی؟ اس سے نہ خود اس کو فائدہ پہنچا اور نہ کسی دوسرے کو۔ اسے ہر روز ایک ہی کام کرنا پڑتا تھا۔ ایسا کام جس سے کسی کی اصلاح ممکن نہیں تھی۔ اس جہالت کے پہاڑ کو دیکھ کر اسے نہ صرف جسمانی بلکہ روحانی اذیت بھی ہوتی تھی مگر اس کا انہیں احساس تک نہیں تھا۔

اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اکل کھرا ہو گیا اور اس کے رویہ میں زیادہ سختی اور تلخی آ گئی۔ وہ انسان سے چیخنے چلانے اور لوگوں کو لعنت ملامت کرنے والی ایک مشین بن گیا۔

اور دفعتاً ایک صبح کو چند لمحوں کے لئے وہ بالکل پاگل ہو گیا۔ اس وقت دروازہ میں کوئی مجمع بھی نہیں تھا۔ گاڑی آنے میں دیر تھی اور وہ ایک پٹ کے ساتھ ٹیک لگائے اس آفت و مصیبت کا منتظر تھا جو نصف گھنٹہ کے بعد اسے پیش آنے والی تھی اور اسی لمحہ ایک کسان بھاگتا ہوا دروازہ کی طرف آیا۔ اس کا چہرہ گرد آلود تھا۔ کپڑے پھٹے ہوئے اور میلے کچیلے اور پشت پر ایک گٹھڑی۔ بغیر ایک لفظ کہے اس بڈھے کسان نے دروازہ کا دوسرا پٹ کھولنے کی کوشش کی۔

فرید نے اسے دیکھا اور اسی ایک چہرہ میں اس کو ایسے لاکھوں چہرے نظر آئے اور یہ دیکھتے ہی وہ پاگل ہو گیا۔ دانتوں کو پیس کر اس نے بڈھے کسان پر حملہ کر دیا اور اسے مارنے پیٹنے لگا۔ ایک دو آدمیوں نے جو قریب ہی موجود تھے اسے الگ کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہے۔ فرید نے اپنے بے کیف و خشک دنوں اور اپنی تمام مایوسی و نامرادی کا اس بڈھے کسان سے انتہائی انتقام لیا۔

مگر اس کی انگریزی کچھ کام آ ہی گئی۔ اس لئے کہ پیٹنے کے دوران میں اس نے اس زبان میں یہ الفاظ سنے:۔

"وہ دیکھو کون اس بڈھے کسان کو پیٹ رہا ہے!"

انگریزی الفاظ نے وہ کام کیا جو دوسرے نہ کر سکے تھے۔ فرید دفعتاً ہوش میں آ گیا۔ اس نے اوپر نگاہ اٹھائی اور دیکھا کہ انگریز عورت کھڑی ہے۔ اس کے چہرہ پر رحم اور ہمدردی کے جذبات تھے۔ مگر فرید کے لئے نہیں بلکہ اس بڈھے احمق کے لئے۔ یہ دیکھ کر فرید نے کسان کی طرف دیکھا۔ یہ بالکل ظاہر تھا کہ غریب کسان کی سمجھ میں یہ سب

(بقیہ صفحہ ۲۷ پر)

حاجی لق لق

مزاحیہ

شاعر کا ہاتھی

آپ نے شاید میراثی کے ہاتھی کی بات سُنی ہوگی۔ نہیں تو سنئے ایک میراثی کو مہاراجہ رنجیت سنگھ نے ہاتھی بخشش میں دیا۔ میراثی ہاتھی کو خوشی خوشی گھر لے گیا۔ لیکن ہاتھی کی خوراک کہاں سے آتی؟ چند روز تو اس نے اپنے زمیندار ججمانوں سے کماد وغیرہ مانگ مانگ کر گذارا چلایا۔ اس کے بعد وہ پریشان ہوگیا۔ پریشان کیوں نہ ہوتا؟ ہاتھی رکھنا کوئی معمولی بات نہیں۔ اگر کوئی شخص حد سے زیادہ خرچ والا کوئی کام کر بیٹھے تو لوگ کہا کرتے ہیں۔ کہ بھئی فلاں نے تو ہاتھی باندھ لیا ہے۔ میراثی بیچارہ ہاتھی کا خرچ کس طرح اٹھا سکتا تھا۔

سوچ بچار کے بعد میراثی نے ایک ترکیب سوچی۔ ہاتھی کے گلے میں ڈھول باندھ دیا۔ اور گاؤں کے باہر لے جا کر چھوڑ دیا لوگوں نے پوچھا کہ اس کا کیا مطلب؟ میراثی نے جواب دیا کہ میں بھی گا بجا کے اپنا پیٹ پالتا ہوں۔ یہ بھی گا بجا کے اپنا گزارہ چلا لے گا۔

یہ تو تھی میراثی کے ہاتھی کی بات۔ لیکن آج میں آپ کو ایک شاعر کے ہاتھی کی بات سناتا ہوں۔ پرانی بات ہے۔ لاہور میں ایک شاعر ناظم نظمی رہا کرتا تھا۔ شعر خاصا کہہ لیتا تھا۔ اور راج درباروں میں جانے کا بہت عادی تھا۔ کسی نواب راجے کی سالگرہ کا دن آتا تو وہ قصیدہ لکھ کر پیش کرنے لے جاتا۔ اور انعام اکرام مل ہی جاتا۔ اسے زیادہ شوق نئی نئی ریاستیں دریافت کرنے کا تھا۔ جس طرح کولمبس نئی دنیاؤں کی تلاش میں سرگرداں رہتا تھا۔ اسی طرح ناظم نئی ریاستوں کی جستجو میں لگا رہتا اور ایک دو سال میں ایک نئی ریاست ضرور ڈھونڈھ لیتا تھا۔ اسی وجہ سے لوگ اسے "ریاستوں کا کولمبس" کہتے تھے۔

ایک دفعہ ناظم نے ایک نئی ریاست دریافت کی۔ اور نواب صاحب کی شان میں قصیدہ مدحیہ لکھ کر لے گیا۔ نواب صاحب بہت خوشامد پسند تھے۔ انہوں نے ناظم کو انعام واکرام سے مالا مال کر دیا اور درباری شاعر کا اعزاز بھی عطا کیا۔

ناظم نے نواب صاحب کے دیئے ہوئے انعام سے دو سال تک خوب فارغ البالی کی زندگی بسر کی۔ اور دوسرا سال ختم ہونے پر پھر ایک قصیدہ لکھ کر ریاست کو روانہ ہوا۔ اب کے اس نے ریاست کے وزیر اعظم کی شان میں بھی ایک قصیدہ لکھ کر ساتھ لے لیا۔

دار الخلافہ میں پہنچا۔ تو معلوم ہوا کہ نواب صاحب شکار کے لئے گئے ہوئے ہیں اور کئی ہفتوں تک واپس نہیں آئیں گے۔ بہر حال وزیر اعظم نے اس کی بہت آؤ بھگت کی۔ اور دو تین روز تک اپنے ہاں مہمان رکھا۔ ناظم نے قصیدہ سنایا۔ وزیر اعظم بہت محظوظ ہوا اور سوچنے لگا کہ کیا انعام دیا جائے؟ وہ جانتا تھا کہ نواب صاحب شاعر پر بہت مہربان ہیں۔ اس لئے اس نے شاہی فیل خانے کے داروغے کو بلایا اور کہا کہ ایک ہاتھی شاعر صاحب کو دے دو۔ اور خود اپنی جیب سے وزیر اعظم نے دو سو روپے عنایت فرما کر شاعر کو رخصت کر دیا۔ شاعر ہاتھی اور مہاوت کو ساتھ لے کر لاہور کی طرف روانہ ہوا۔ اور جس شہر یا گاؤں سے گزرتا کتے بھونکتے ہوئے ہاتھی کے پیچھے بھاگتے۔ لیکن ناظم اس شان سے اکڑ کر بیٹھا ہوا نظر آتا۔ گویا تمام پنجاب کا بادشاہ ہے۔ دائیں بائیں لوگوں کی طرف اس طرح دیکھتا۔ گویا یہ سب لوگ زمین کے حقیر باشندے ہیں اور وہ خود کوئی آسمانی مخلوق۔

کئی دن کے سفر کے بعد لاہور آیا اور ہاتھی پر چڑھا چڑھایا گھر کے دروازے تک پہنچا۔ بازاروں میں لوگ اسے ہاتھی پر سوار دیکھتے تھے اور طرح طرح کے آوازے کستے تھے۔ ایک نے کہا۔ اجی ناظم صاحب! یہ کس کا ہاتھی چُرا لائے۔ کوئی کہتا۔ ناظم مہاوت کا کام سیکھ رہا ہے۔ ایک بولا اجی نہیں سرکس میں نوکر ہو گیا ہے۔

غرض مہاوت نے ہاتھی کو ناظم کے گھر کے سامنے میدان میں باندھ دیا۔ اور ناظم کھانا کھانے کے بعد مہاوت کو ساتھ لے کر رات خرید نے گیا۔ اور ہر روز شوق کے باعث خود ہاتھی کی خوراک خریدنے جاتا۔ چند روز میں اس نے شہر کے تمام گنے ہاتھی کو کھلا دئے۔

اور پھر قریبی دیہات کا رُخ کیا - جو کچھ بھی ملتا لے آتا - اور ہاتھی کا پیٹ بھرتا - لیکن تابہ کے؟ کوئی ڈیڑھ دو مہینے میں دو سو روپے جو وزیر اعظم نے دئیے تھے - ہاتھی کے پیٹ میں چلے گئے اور ناظم گھبرا گیا - کہ یہ کیا مصیبت گلے پڑ گئی؟ جس دوست کو اپنا دکھڑا سناتا وہ پھبتیاں کستا - ایک نے کہا کہ میاں - اونے پونے کر کے ایک ہمبو کارٹ بناؤ اور ہاتھی کو اس کے آگے جوتو - دن میں سواریوں کے تین چار پھیرے بھی باغبانپورہ تک کے لگ گئے تو گزارہ چلتا جائے گا - ایک نے مشورہ دیا کہ کھیتوں میں کھلا چھوڑ دو - پولیس پکڑ کے کانجی ہاؤس بھیج دے گی اور تمہارے گلے سے یہ جنجال اتر جائے گا -

کئی دن سوچنے کے بعد اسے یہ کانجی ہاؤس والی تجویز پسند آئی - اس نے ہاتھی کو باہر لے جا کر کھلا چھوڑ دیا - ہاتھی نے کھیتوں کا رُخ کیا اور جدھر گیا کھیتوں کی تباہی کرتا گیا - زمینداروں نے کوتوال صاحب سے شکایت کی - کوتوال صاحب نے پولیس بھیج کر ہاتھی پکڑ وا منگایا اور اسے ناظم کے مکان کے سامنے بندھوا کر ناظم کو گرفتار کر لیا - ناظم بہت سٹپٹایا - کہ ہاتھی کو کانجی ہاؤس بھجوانے کے بجائے میں خود کانجی ہاؤس پہنچ گیا - آخر ناظم کو اپنے ایک کرم فرما رئیس کی مداخلت سے نجات ملی - لیکن گھر جا کر پھر سوچنے لگا کہ ہاتھی کا کیا کروں؟ ایک دوست نے مشورہ دیا - کہ اسے بندوق سے ہلاک کرا دو -

ناظم کو یہ تجویز پسند آئی - اس نے دل میں کہا کہ ہاتھی سے نجات حاصل کرنے کی یہ ترکیب سب سے بہتر ہے - چنانچہ وہ بندوق تلاش کرنے لگا - کئی ایسے شخصوں کے پاس گیا جو بندوق رکھتے تھے - لیکن بندوق کون دیتا؟ بندوق تو نہ ملی - لیکن یہ بات آہستہ آہستہ عام ہو گئی - حتیٰ کہ میونسپل کمیٹی کے سیکرٹری نے بھی سُن لی - اس نے فوراً ناظم کو بلا بھیجا اور کہا کہ سنا ہے تم ہاتھی کو ہلاک کرنا چاہتے ہو - اس کا مطلب یہ ہے کہ تم ہاتھی کی لاش سے تعفن پھیلا کر شہر میں وبا پھیلانا چاہتے ہو - میں تمہیں میونسپل ایکٹ کی فلاں دفعہ کی رو سے پولیس کے حوالے کرنا چاہتا ہوں - ناظم کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی اور لگا منت سماجت کرنے - سکرٹری نے حکم دیا کہ تمہاری نیت کا چونکہ مجھے علم ہو گیا ہے - اس لئے تمہارا چھٹکارا صرف اس صورت ہو سکتا ہے - کہ کل تک ہاتھی کو شہر سے نکال لے جاؤ - ورنہ میونسپل ایکٹ کے ماتحت سزا ملے گی - ناظم نے وعدہ کر لیا کہ میں کل تک ہاتھی کو باہر بھیج دوں گا -

گھر آیا تو سوچنے لگا کہ ہاتھی کو بھیجوں کہاں؟ اور نہیں بھیجتا تو پھر وہی پولیس اور وہی حوالات جس سے ایک دفعہ خدا خدا کر کے نجات ملی ہے - بیوی نے کہا - کہ بھلے آدمی - شہر کے کسی رئیس کو تحفہ کے طور پر دے دو - لیکن ناظم نے تیوری پر بل ڈال کر کہا - اونہہ - تم مجھے بدنام کرانا چاہتی ہو؟ لوگ کہیں گے کہ ہاتھی کو سنبھال نہیں سکا - اس لئے دے دیا - میں یہ بدنامی کس طرح گوارا کر سکتا ہوں -؟ شاعر ہوں شاعر - میں کسی کی بات کب سن سکتا ہوں؟

صبح ہوئی تو ناظم صاحب نے مہاوت کو بلا کر کہا - کہ نواب صاحب کی چھٹی آئی ہے - لکھتے ہیں کہ وزیر اعظم صاحب نے آپ کو اچھا ہاتھی نہیں دیا - آپ جیسے نامور شاعر کو سفید ہاتھی بنا چاہیئے تھا - اس لئے ہاتھی واپس بھیج دیجئے - تاکہ بدل دیا جائے -

مہاوت نے کہا کہ حضور کا جیسے حکم - ناظم بولا - کہ ابھی ہاتھی کو لے کر روانہ ہو جاؤ - نواب صاحب کی خدمت میں میری طرف سے مجرا بجا لانا - اور دیکھو وہاں ایک ہفتے سے زیادہ نہ ٹھہرنا کیونکہ میرے بھائی کی شادی ہے اور دولہا ہاتھی پر سوار ہو کر جائیگا

ناظم نے دس روپے مہاوت کو زادِ راہ کے طور پر دیئے اور ہاتھی کو رخصت کیا - اس کے بعد توبہ کر لی - کہ کبھی پھر اس ریاست میں نہ جاؤں گا -

---

بقیہ ٹکٹ بابو

کچھ نہیں آیا تھا - اس نے صرف نہایت عاجزی سے اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کی تھی - وہ کئی بار پٹا تھا اور آج تک اس کا سبب نہیں سمجھ سکا تھا - وہ سمجھتا تھا کہ پٹنا اس کی قسمت میں لکھا تھا - جب اس نے دیکھا کہ معاملہ ختم ہو گیا ہے تو اس نے بڑی انکساری سے فرید کی طرف دیکھا - اور پھر ڈرتے ڈرتے دروازہ کی طرف بڑھا -

تھوڑی دیر کے لئے فرید دم بخود ہو گیا - اس نے ہاتھ سے اپنا منہ صاف کیا - ایک سرد آہ بھری اور وہی الفاظ کہے جو کئی بار وہ کہہ چکا تھا - تمہیں کہاں جانا ہے؟ ٹکٹ کہاں ہے - گاڑی میں دیر ہے - "

مضمون نگار حضرات سے گذارش ہے کہ مضمون کاغذ کے ایک طرف لکھیں - مضامین صاف اور خوشخط ہونے چاہئیں - تاکہ ادارہ کو پڑھنے میں سہولت ہو -

(ادارہ)

غزل

جب رُوحِ عشق پیکرِ خاکی میں ڈھل گئی
غمخانۂ حیات کی دنیا بدل گئی

موجِ بہارِ حُسن کے سانچے میں ڈھل گئی
وحشتکدے میں دل کے تمنا مچل گئی

وہ لُطف چاندنی میں نہ گلشن میں وہ بہار
تم کیا خفا ہوئے، مری دنیا بدل گئی

اُس چشمِ پُرفسوں میں نگاہِ سُبک خرام
اِک برق تھی جو اس دلِ مضطر میں ڈھل گئی

ہے مستیٔ شباب کی روداد مختصر
تھوڑی سی تیز مے خمِ دل سے اچھل گئی

ہم محوِ جلوہ ہائے خمستانِ دل رہے
آخر نظر بچا کے جوانی نکل گئی

بے چین اور کر گئی دل کو نگاہِ لُطف
حسرت فزوں ہوئی جو تمنا نکل گئی

بیم و رجا سے ہم کو رہا واسطہ مدام
پر اس اُدھیڑ بُن میں طبیعت بہل گئی

احسنؔ خمارِ نشۂ اُلفت کا ذکر کیا
محسوس اب ہوا مری دنیا بدل گئی

سیّد اصغر علی احسنؔ جالندھری

غزل

جو بے دل ہو چکے ہیں عشق کا حاصل سمجھتے ہیں
اسے جوشِ طلب کی آخری منزل سمجھتے ہیں

نظر آتی ہے صورت ان میں ان کے حسنِ رعنا کی
حقیقت آشنا ذرّوں کو جزوِ دل سمجھتے ہیں

بہت ممکن ہے اے دل تا درِ جاناں پہنچ جائیں
جو ہر کوشش کو اپنی سعیٔ لاحاصل سمجھتے ہیں

کھنچے ہیں اب تو دامن پر امید و یاس کے نقشے
کہ ہر آنسو کے قطرہ کو مآلِ دل سمجھتے ہیں

یہ مانا بحرِ اُلفت کی نہیں سرحد۔ مگر ہم تم
جہاں دل ڈوب جاتا ہے وہیں ساحل سمجھتے ہیں

شبِ فرقت ہجومِ غم کی نیرنگی معاذ اللہ
کہ اب دم کا نکلنا ہم بہت مشکل سمجھتے ہیں

نظر کے سامنے ہے منظرِ روزِ ازل ہر دم
ہمیں کچھ مدعائے زینتِ محفل سمجھتے ہیں

نہ ہے وارفتگیٔ دل! زہے جوشِ جنوں مضطرؔ
وہ ہیں پیشِ نظر۔ ہم پردہ حائل سمجھتے ہیں

مضطرؔ نعمانی ایم۔ اے

ابو محمد امام الدین رامنگری

لوائے احمر

پال نوورج گال پر ہاتھ رکھے بیٹھا سوچ رہا تھا۔ آخر بھائی صاحب جنگ پر چلے ہی گئے۔ انہوں نے سرخ فوج میں نام لکھوایا تھا تو مجھے کتنی خوشی ہوئی تھی لیکن آہ کیا معلوم تھا کہ ان کی جدائی کا اس قدر صدمہ برداشت کرنا پڑے گا۔ اس میں شک نہیں کہ بھائی صاحب نہایت دلیر اور جانباز ہیں۔ لیکن بھابی کا صبر و استقلال بھی کچھ کم قابل داد نہیں۔

بھائی صاحب نے جنگ کیلئے روانہ ہوتے ہوئے ہنسے کہا "شاید یہ ہماری آخری ملاقات ہو" بھابی مسکرا کر بولیں "ہاں کچھ تعجب تو نہیں ہے" ان کی آنکھیں نمناک تک نہ ہوئیں۔ لیکن میرا دل بھر آیا اور آنکھیں اشک آلود ہو گئیں۔

اب بھائی صاحب کے نقش قدم پر مجھے بھی چلنا ہی پڑے گا۔ سوئیٹ یونین کی حفاظت ہر فرزند روس کا سب سے بڑا فریضۂ حیات ہے۔

بھائی صاحب نے میدانِ جنگ کو جاتے وقت کہا تھا "میں سوئیٹ روس کو کبھی فنا نہ ہونے دوں گا۔ اس کا سرخ پرچم ہمیشہ لہراتا رہے گا"

مجھے اس وقت یہ خیال کر کے کتنا صدمہ ہوا تھا کہ اب بھائی صاحب سے کبھی ملاقات نہ ہو گی۔ بس ایک روز خبر آ جائے گی کہ وہ جنگ میں کام آ گئے۔

پال کے جذبات بے قابو ہو گئے، وہ اپنے کو سنبھالنے کے لئے خود بخود کہنے لگا۔ "لیکن بھائی صاحب کے لئے اس قدر غم کرنا فضول ہے کچھ وہی تنہا تو لڑنے گئے نہیں ہیں، ان کی طرح لاکھوں فدائیانِ وطن ہیں جو وطن کی عزت و حرمت کے لئے جانیں قربان کر رہے ہیں جس سوئیٹ کو مزدوروں نے اپنا خون بہا کر حاصل کیا۔ اس کی حفاظت بھی مزدوروں کا خون طلب کر رہی ہے۔ تو پیش کرنا ناگزیر ہے، اگر فرزندانِ روس نے جان کی محبت کی اور سوئیٹ کو شکست ہو گئی ——"

پال کی بھنویں کمان کی طرح تن گئیں اور اس کے ہاتھ کی مٹھیاں خود بخود بند ھ گئیں۔ اس نے دانت پیس کر کہا "نہیں ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا کوئی طاقت سوئیٹ روس کو شکست نہیں دے سکتی! کوئی بھی نہیں!"

یہ کہتے کہتے اپنے حد سے بڑھے ہوئے جوش و خروش پر پال خود ہی شرما گیا۔ سوچنے لگا۔ اگر بھابی آ گئیں تو آوازہ کسیں گی "میرا پال یقیناً ایک روز ورد شلوف یا ٹموشنکو بنے گا۔"

پال ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اس کی بھابی ہاتھ میں اخبار "پروا" لئے ہوئے آ گئیں اور کہنے لگیں "پال! لو مجھے اخبار تو سناؤ میں اخبار بھی سنتی چلوں اور اونی بنیائن کا کام بھی پورا کر لوں"

پال نے بھابی کے پاس آ کر کہا۔ "بھابی! تم مجھے بھی بُننا کیوں نہیں سکھا دیتیں۔ میں بھی سپاہیوں کے لئے کچھ چیزیں تیار کر دیا کروں۔ تاکہ اس جنگ میں میری حقیر خدمات بھی شامل ہو جائیں۔"

رُدیا نے ہاتھ بڑھا کر پال کو گود میں کھینچتے ہوئے کہا "میرے عزیز دیور! خدا تمہیں جلد جوان کرے اور تم سوئیٹ روس کے فرزندوں کے لئے ایک نمونہ بنو، شاید تم سوچ رہے ہو گے کہ تمہیں کبھی میدانِ جنگ میں جانا نہ پڑیگا لیکن ایسا نہیں ہے، میں نے تمہیں اس روز بتایا تھا۔ کہ اس جنگ سے کوئی فرزند روس علیحدہ نہیں رہ سکتا، آج جو بچے ہونے کی وجہ سے جنگ میں حصہ نہیں لے سکتے انہیں کل جوان ہونے کے بعد جنگ میں شرکت کرنی پڑے گی۔ سمجھ گئے نا میرے پیارے دیور!"

"ہاں بھابی!" پال نے بھاوج کی گود میں بیٹھتے ہوئے کہا "میرا تو بہت جی چاہتا ہے کہ کاش میں فوراً جوان ہو جاتا اور بھائی صاحب کی طرح میں بھی میدانِ [illegible] میں جا کر دادِ شجاعت دیتا۔ میری آرزو ہے بھابی کہ میں ایک بہادر پائیلٹ بنوں۔ ابھی تو شاید میری عمر دس سال کی ہو گی۔ پائیلٹ بننے کے لئے کئے سال کی عمر کی ضرورت ہے؟ اٹھارہ سال کی نا؟ اس حساب سے مجھے پائیلٹ بننے میں آٹھ سال کی اور دیر ہے۔ اس وقت تک تو میں پورا جوان ہو جاؤں گا۔ کیوں بھابی؟"

پال نے جذبات آلود نظروں سے بھاوج کی طرف دیکھا۔ رُدیا دل ہی دل میں خوش ہوئی کہ اس کے کمسن دیور کا ننھا سا دل محبتِ وطن کے جذبات سے کسقدر لبریز ہے۔ اس نے کہا "اچھا۔ اب اخبار سناؤ۔ یہ سب باتیں رات کو ہوں گی۔"

(۲)

اس کے کوئی تین ہفتے بعد پال اپنے دوستوں کے ساتھ شام کی سیر سے واپس آ رہا تھا کہ راستے میں اسے معلوم ہوا۔ اس کا بھائی جنگ میں کام آ گیا اور بھی بہت سے لوگوں کے مارے جانے کی خبر تھی۔ پال کی زبان سے بے اختیار "آہ بھائی صاحب" نکلا اور اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

وہ گھر آ کر بے اختیار کرسی پر گر پڑا اور "بھابھی! بھابھی!!" پکارنے لگا۔ ایک عورت نے سامنے آکر جواب دیا۔ "وہ ابھی کام پر سے نہیں آئیں"

"آہ!" پال ایک لمبا سانس لیکر سوچنے لگا "بھابی بھی کسقدر محنت و جفاکشی کرتی ہیں۔ بھائی صاحب ہمیشہ کے لئے ان سے جدا ہو گئے۔ لیکن انہیں ان کی یاد میں آنسو بہانے کی بھی فرصت نہیں"

بھابی کی بات سوچتے سوچتے وہ بھائی کی بات سوچنے لگا۔ ماضی کے کتنے واقعات فلم کی طرح اس کی آنکھوں کے سامنے گردش کرنے لگے۔ اس کا دل بھائی کے غم سے اور بھی مضطرب ہو گیا۔

اتنے میں زینے پر کچھ قدموں کی چاپ سنائی دی اور دو شخص اس کے سامنے آکر کھڑے ہو گئے۔

ایک نے پوچھا "کامریڈ رووبا کہاں ہیں؟"

"وہ ابھی کام پر سے واپس نہیں آئیں۔"

"اچھا تو ہم لوگ جا رہے ہیں۔ کچھ ضرورت سے آئے تھے"

آنے والوں نے ایک کمسن بچے سے بات چیت کرنی مناسب نہ سمجھا۔

پال نے کہا "آپ لوگ تشریف رکھئے نا۔"

"نہیں اس وقت بیٹھنے کا موقع نہیں ہے۔"

دونوں آہستہ آہستہ زینے سے نیچے اتر گئے۔

پال کو ابھی تنہائی کی ضرورت تھی۔ وہ روکر اپنے دل میں اٹھتے ہوئے طوفان کو ہلکا کرنا چاہتا تھا۔

شام کو رووبا گھر واپس آئی تو اس نے دیکھا پال پڑا ہوا ہے اور اس کے رخسار آنسوؤں سے تر ہیں۔

رووبا نے ایک قومی گیت گنگناتے ہوئے کپڑے اتارے پھر آہستہ آہستہ پال کے پاس آکر اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے شیریں اور محبت آمیز لہجہ میں آواز دی۔ "پال! پال!!"

پال آنکھیں ملتا ہوا اٹھ بیٹھا بولا۔ "بھابی! تم ہو! میں نے تو سمجھا بھائی صاحب بلا رہے ہیں۔"

"ارے پال۔ تم یہ رو کیوں رہے ہو؟ کیا اپنے بھائی صاحب کا خواب دیکھ رہے تھے۔ اگر تم اس طرح کے خواب دیکھتے ہو گے تو بڑے ہو کر کمیونسٹ کیسے بنو گے؟ سوویٹ روس کو تم سے بڑی بڑی امیدیں ہیں کیا وہ امیدیں تمہارے اس طرح پڑے رہنے سے پوری ہوں گی؟ اٹھو۔ شام کو کچھ کھایا تھا یا نہیں؟ معلوم تو ہوتا ہے کہ آج تم بالکل بھوکے ہو۔ اچھا میں تمہارے لئے کھانا منگائے دیتی ہوں۔ آؤ تمہیں ایک خوشخبری سناؤں"

رووبا نے پال کو سینے سے لگا کر کہنا شروع کیا "ہمارا یہاں کا کام ختم ہو گیا۔ اب ہمیں باقاعدہ سرخ فوج سے علیحدہ ہو کر گوریلا جنگ میں حصہ لینے کی اجازت مل گئی ہے۔ لیکن اس بات سے مجھے جتنی خوشی ہو رہی ہے اتنا ہی رنج بھی ہے۔"

"رنج کس بات کا بھابی؟"

"یہی کہ اب تم تنہا رہ جاؤ گے؟"

پال نے نہایت پر استقلال لہجے میں کہا "نہیں بھابی تمہیں میرے لئے کسی طرح کا رنج کرنے کی ضرورت نہیں۔ مجھے تنہا رہنے میں کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ تم جاؤ اور اطمینان سے اپنے فرائض انجام دو۔ لیکن ہاں تم ایک طویل مدت کے لئے جا رہی ہو۔ اس لئے تمہیں ایک رخصتانہ دعوت دینی چاہیئے۔ میں اس کے انتظام کے لئے آئیون کے پاس جا رہا ہوں۔"

پال اٹھنے لگا۔ رووبا نے پال کے گال پر ایک محبت آمیز تھپکی دے کر کہا "تم بڑے شریر ہو۔ تم نہیں جانتے کہ مجھے ابھی تم سے کتنی باتیں کرنی ہیں۔ مجھے کل ہی جانا ہے معلوم نہیں پھر کب ملاقات ہو اور ہو بھی یا نہیں۔ اس لئے جتنا موقع ہے اتنی تو باتیں کر لینے دو۔"

"کیا تم کل ہی چلی جاؤ گی؟"

"ہاں میں کل صبح چھ بجے کی گاڑی سے چلی جاؤں گی۔ تمہیں تنہائی کے باعث یقیناً پریشانی ہوگی۔ اس لئے کتابوں کے مطالعہ سے دل بہلانا یا کامریڈ انیا کے پاس چلے جایا کرنا۔"

"تمہیں میرے لئے اسقدر فکر کیوں ہے بھابی؟ کیا اس لئے کہ میں بچہ ہوں؟"

رووبا نے ظرافت آمیز لہجے میں کہا "اور کیا بچے نہیں تو بوڑھے ہو؟"

پال شرما گیا۔ بولا "یہ بات نہیں بھابی۔ میں اپنی کمسنی کے باوجود سوویٹ روس سے محبت کرتا ہوں۔ اور اس کے لئے ہر طرح کی تکلیف و مصیبت برداشت کرنے کو تیار ہوں۔"

رووبا نے پرجوش لہجے میں کہا "میں تم سے اچھی طرح واقف ہوں بھائی۔ مجھے تم پر کامل اعتماد ہے۔ مجھے امید ہی نہیں یقین ہے کہ تم ایک قابل تقلید کمیونسٹ بنو گے۔" رووبا پیار سے پال کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگی۔

(۳)

آج پال پھر گال پر ہاتھ رکھے سوچ رہا تھا۔ بھابی بھی چلی گئیں۔ جاتے وقت انہوں نے سرخ پرچم دیکر کہا تھا "آج ہم لوگ اس پرچم کیلئے جان دینے جا رہے ہیں اور آئندہ کیلئے تم لوگوں کو اسکی عزت و حرمت کا امین اور محافظ بنائے جا رہے ہیں اس کے اعزاز و احترام کا برقرار رکھنا تم لوگوں کا فرض ہے۔ دیکھنا مزدوروں کے خون سے رنگے ہوئے اس سرخ پرچم کو کسی طرح سرنگوں نہ ہونے دینا"

پال نو وہ بھابی کے دئے ہوئے سرخ پرچم کو ہاتھ میں لیکر آپ ہی آپ کہنے لگا "بھابی انہیں اس پرچم کی طرف سے مطمئن رہنا چاہیئے۔ ہمارا نقش قدم تمہارے پس روؤں کی ہمیشہ رہبری کرتا رہے گا۔ اور ہم اپنے خون کے آخری قطرے بہنے تک بھی اس سرخ خونی پرچم کی عزت و حرمت کی حفاظت کریں گے اور اسے فضائے آسمانی میں سربلند رکھیں گے۔"

"شمّا"

نفسیات کا ارتقاء

بر کفِ جامِ جنوں و بر کفِ سندانِ عقل
ہر "ہوسناکے" نداند جام و سنداں باختن!

ہم انسانوں کو اپنے اشرف المخلوقات ہونے کا دعویٰ ہے۔ حالانکہ انسانی زندگی ایسی ناپائدار اور ضعیف کوئی شے نہیں۔ اور اس کے برعکس عالمِ حیوانات میں اور جاندار ہم سے کہیں زیادہ قوی الجثّہ اور عظیم الہیئت موجود ہیں، تاہم ہم انسان جن کے متعلق

یہ شرارے کا تبسّم، یہ خسِ آتش سوار

عارف ہندی رح نے کہہ دیا، پھر بھی خداوند عزّ و جل کے اس فرمودہ کے سزاوار ٹھہرتے ہیں کہ فقد خلقنا الانسان فی احسنِ تقویم!! ———

قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انسان "احسن تقویم" کا سزاوار اور اشرف المخلوق ہونے کا حقدار کیسے ٹھہرا؟ ——— سوال ٹیڑھا ہے۔ اور جواب بن نہیں پڑتا۔ بعض مفکروں کا خیال ہے کہ انسانی دماغ ساری مخلوقات کے مقابلے میں اس کے لئے تمغۂ امتیاز ہے۔ بات معقول ہے لیکن تجربات شاہد ہیں کہ دماغ تو ذہنی استعداد کو جانچنے کا صرف ایک ذریعہ ہے۔ چنانچہ ویل مچھلی کا دماغ اپنی ساخت کے لحاظ سے انسانی دماغ سے بالکل ملتا جلتا ہے۔ لیکن ہزارہا سال گزرنے پر بھی خود ویل مچھلی نے اشرف المخلوق ہونے کا دعویٰ نہ کیا اور نہ ہی ہم اشرف المخلوقات نے اسے اپنی برادری میں شامل کیا۔ سو ظاہر ہے کہ محض دماغی استعداد ہی برتری کا ذریعہ نہیں۔

دوسرے مفکّر کہتے ہیں کہ انسان کی فوقیت کا باعث اس کا ذہن ہے۔ بعض کی یہ بھی رائے ہے کہ فہم، عقلِ سلیم اور قوتِ متخیّلہ اس برتری کی وجوہ ہیں۔ ایک اور طبقے کی یہ بھی رائے ہے کہ خدا نے انسان کو جانوروں سے ممیز کرنے کے لئے اُسے آمرِ آتما عطا فرمائی ہے!

یہ جوابات تمام کے تمام حقیقت پر مبنی ہیں۔ لیکن یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ان کو صحیح مان لیا جائے تو پھر فہم، عقلِ سلیم، قوتِ متخیّلہ، دماغ اور آتما کیا چیزیں ہیں؟ ——— پھر ان گتھیوں کا سلجھاؤ بہت سے اور سوالات کا موجب بنتا ہے ——— ان سوالات کا جواب اور یہ سوالات نفسیات کا نا مولود ہیں!!

نفسیات کیا ہے؟

کسی سے نفسیات کی تعریف پوچھنا شاید اس شخص کی توہین خیال کی جائے۔ پھر بھی مختصر الفاظ میں اس کی تعریف یوں کی جا سکتی ہے کہ اعمالِ ذہنی کا نام نفسیات ہے۔

کوئی اخبار ہو یا رسالہ، کتاب ہو یا کوئی تحریر آپ کو یہ لفظ بار بار نظر آئے گا۔ آپ کو مقالات اس موضوع پر ملیں گے۔ آج کل ہر موضوع اپنی نفسیات رکھتا ہے۔ آپ نے یہ عنوان تو اکثر رسائل میں دیکھے ہونگے: جنگ کی نفسیات، امن کی نفسیات، تجارت، صنعت، مالیات، جرائم، تعلیم۔ مذہب غرض کون سا مضمون ہے جس کا نفسیاتی مطالعہ نہیں کیا جاتا۔ غرض ہر انسانی فعل کا نفسیاتی مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ ماہرین نفسیات کی مخصوص زبان کے بیشتر الفاظ ہماری روزمرہ کی بول چال میں داخل ہو چکے ہیں۔ ہمارا پڑوسی ہمیں اگر تنگ کرے تو ہم اسے "ذہنی الجھاؤ" کا شکار کہہ کر دل کی بھڑاس نکال لیتے ہیں۔ بڈھوں کا نام "اعصاب زدہ" رکھا جاتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ "امتناع"، "فوبیا" اور "دباؤ" ایسے مخصوص الفاظ بھی ہماری زبان پر آ جاتے ہیں۔ آپ نے "نفسیاتی لمحات" کی اصلاح کبھی سنی ہوگی۔

آئیے ذرا اس مفروضہ نفسیاتی علم کا تجزیہ کریں۔ جس کا اظہار ہم اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے کرتے رہتے ہیں۔ فرض کیجیے چند ذہین اور لکھے پڑھے لوگ تبادلۂ خیالات میں مصروف ہیں۔ نفسیات کے موضوع پر گفتگو ہو رہی ہے۔ عموماً ایسی بات چیت ذرا طویل ہو جایا کرتی ہے۔ اس گفتگو سے ایک غیر جانبدار مگر تنقید پسند سامع کیا نتیجہ اخذ کریگا؟ قیاس کیا جاتا ہے کہ وہ تین نتائج نکالے گا۔

اوّل یہ کہ نفسیات اعمالِ ذہنی کا نام ہے، گو یہ ایک مسلمہ بات ہے لیکن پھر بھی سب اس پر متفق نہیں کہ وہ اعمال کیا ہیں۔ ایک کے نزدیک نفسیات عصبی . . . . امراض کے علاج کا نام ہے۔ دوسرا اُسے شریر بچوں کی تربیت کا ایک طریق جانتا ہے۔ تیسرے کے لیے زندگی کی مسرتوں کے سارے راز اسی میں پوشیدہ

ہیں وغیرہ وغیرہ -

ثانیاً ساری بحث کا ماحصل یہ ہے کہ نفسیات عملی طور پر مفید ہو سکتی ہے یا نہیں - ثالثاً اس مجلس کی دو آراء ہونگی - ایک کے نزدیک نفسیات بالکل بے فائدہ پیشہ ہے - ایک لایعنی طُولِ کلام لیکن دوسرے کے لئے انسان کے ہر ذہنی مرض کا یہی مداوا ہے -

نفسیات کا کوئی ایک عالمگیر نظریہ ہونے کی بجائے اس کے کافی مختلف دبستان ہیں - جو ایک دوسرے کے بالکل مخالف ہیں - ان کا اختلاف روز بروز زیادہ ہوتا جا رہا ہے - جوں جوں نئے نئے دبستان پیدا ہوتے جاتے ہیں - اسی قدر زیادہ اختلاف بڑھتا جاتا ہے -

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان مختلف نظریات کے درمیان ربط اور ترتیب پیدا کرنے یا کوئی جامع طریق پیش کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی - تاکہ کسی طرح ان متضاد خیالات کا امتزاج ہو سکے - ہر ایک دبستان کے پیرو اپنے مخصوص نظریئے کی نشو و نما میں سرگرم عمل نظر آتے ہیں اور سمجھوتے کی کوششیں طاق پہ اٹھا رکھی جاتی ہیں -

اس اختلاف کے ہوتے ہوئے بھی ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ مفید کام ہو رہا ہے - ان میں سے کوئی بھی محض نظریہ تک اپنے تئیں محدود نہیں رکھتا بلکہ اکثر ان اصولوں کے ذریعے انسانی مشکلات کا حل تلاش کرتے ہیں - یوں نظر پڑتا ہے کہ ایک "مکمل" نفسیات کی تلاش کرنے کا خیال چھوڑ دیا گیا ہے - بلکہ اس کی بجائے جس کسی نے تھوڑی سی سچائی پا لی وہ اسے عمل میں لانے لگا - ایسا کیوں ہوا ؟

یہ سوال دلچسپ ہے اور اس کا جواب بالکل سادہ، نفسیات نسل انسانی کی طرح قدیم سے چلی آ رہی ہے - گذشتہ صدی میں اس میں انقلاب —— بلکہ انقلابات کہنا زیادہ صحیح ہوگا —— آیا ہے - اس لئے اب اسے علم النفس کی بجائے "علوم النفس" کہنا زیادہ درست معلوم ہوتا ہے -

پہلے پہل جب انسان ابھی غاروں میں رہا کرتا تھا - اس وقت کسی مرد یا عورت کے ذہن میں کوئی ایسا خیال آیا ہوگا یا اس نے کوئی ایسا خواب دیکھا ہوگا جس سے اُس کا قلبی سکون متزلزل ہو گیا اور وہ سوچنے لگا کہ اس کا باعث کیا ہے - یہ تو تھی ابتدا - لیکن آج جس علم کو ہم نفسیات کہتے ہیں وہ ہمارے اسی زمانے کی ایجاد ہے بالکل اُسی طرح جیسے موٹر کار - ہوائی جہاز - لاسلکی اور ریڈیو آج کل کی ایجاد کردہ مفید مصیبتیں ہیں !!

اب ہمیں اس انقلاب کے بارے میں سوچنا ہوگا جو ظہور پذیر ہوا - آخر وہ تھا کیا ؟ جس کے باعث نفسیات، مابعد الطبیعات اور فلسفہ کی بھول بھلیوں سے نکل کر ایک مستقل سائنس کی حیثیت سے متعارف ہوئی -

جس انقلاب کا ہم ذکر کر رہے ہیں اس کے ہلکے ہلکے نشانات صدیوں سے ہی ملتے آئے ہیں - لیکن وہ بیسویں صدی میں ہی معراج تک پہنچا - انیسویں صدی میں نفسیات کا دائرہ عمل محض محفل کی گفتگو اور مطالعہ تک محدود تھا - یہ ایک معقولی نظریہ تھا جس کا زندگی سے کوئی تعلق نہ تھا - لیکن اس صدی کے آغاز سے نفسیات جدید طریقوں سے نشو و نما پانے لگی - ماہر نفسیات محض فاضل مدرس ہونے کی بجائے عملی لوگ بن گئے اور کام کرنے لگے

اس صدی کے مشہور ماہر نفسیات ولیم جیمز کہتے ہیں کہ "وہی سائنس سائنس ہے جو حقیقی معنوں میں زندگی سے تعلق رکھتا ہے -" دوسرے مشہور ماہر نفسیات ڈاکٹر الفرڈ ایڈلر اس پہ اور اضافہ کرکے کہتے ہیں "یہ بھی کہا جائیگا کہ جس سائنس کا زندگی سے تعلق ہے اس میں نظریئے اور عملی پہلو کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا -"

ڈاکٹر ایڈلر کے واضح الفاظ نفسیات کی صحیح پوزیشن کو ظاہر کر رہے ہیں - واقعی آج نظریہ اور عمل کا اسقدر امتزاج ہو چکا ہے کہ ہم انہیں جدا نہیں کر سکتے، اور یہی وجہ ہے کہ نفسیات اب بہت زیادہ سائنٹفک چیز بن گئی ہے -

کبھی کبھی ایک اعتراض سننے میں آتا ہے "نفسیات ابھی ایک سائنس کی حیثیت نہیں رکھتی" ہم کہتے ہیں یہ کبھی ہوگا ہی نہیں - اس کا موضوع اسقدر زیادہ وسیع ہے کہ اس پہ عبور ممکن نہیں - لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم نفسیات کے سارے مفروضات اور ان کے نتائج کو شک کی نگاہ سے دیکھیں - اگر اس ذہنی رویے کو عام کر دیا جائے تو دنیا کے تمام علوم شک کے دھندلکوں میں گھلتے نظر آئیں گے -

دوسرا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ نفسیات ابھی تجرباتی حالت میں ہے لیکن اس کا جواب بھی یہی دیا جا سکتا ہے - کہ سارے علوم اسی حالت میں ہیں - تجربات ہی ارتقا کی طرف لے جاتے ہیں - دوسرا جواب یہ ہے کہ ہم نفسیات کی تمام تاریخ کا جائزہ لیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ یہ اس تجرباتی حالت میں نہیں ہے جیسا کہ بعض لوگ خیال کرتے ہیں -

موجودہ نفسیات کو ہم نے انقلابی کہا تھا - لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بات ذہن نشین کر دینی ضروری ہے کہ کوئی بھی انقلاب خواہ وہ کسقدر "بت شکن" ہی کیوں نہ ہو - اس کا ماضی سے بالکل قطع تعلق نہیں کیا جا سکتا آپ عمارت کی تخریب کر سکتے ہیں - لیکن تعمیر کے لئے زمین وہی پرانی ہوگی جس پر نئی بنیادیں کھڑی کرنی ہوتی ہیں - موجودہ نفسیات تخلیقی ہے تخریبی

نہیں - وہ ماضی کو بھلا دینے کی بجائے اُسے یاد کرتی ہے -

اس زمانے میں عام تحریروں میں چونکہ جدید نفسیات پر بہت زور دیا جاتا ہے - اس لئے پرانی باتیں آہستہ آہستہ کم سامنے آتی ہیں "تجزیہ نفس" کو لے لیجئے - اس نے دنیا میں ایک تہلکہ مچا دیا ہے - پرانے معتقدات اور نظریات کو بکھیر کر رکھ دیا گیا ہے - حیران کن نئے نفسیاتی نظریات پیش کئے ہیں - کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ سب کچھ خود بخود ہو گیا - اس کا ماضی سے کوئی تعلق نہیں ؟

ڈاکٹر سگمنڈ فرائڈ (۱۸۵۶ - ۱۹۳۹ء) تجزیہ نفس کا باوا آدم خود اس بات کا اقرار کرتا ہے - وہ اپنے "تجزیہ نفس پر تمہیدی لکچروں" میں صاف صاف کہتا ہے کہ "تجزیہ نفس" کا علم [illegible] پرانی باتوں میں کچھ اضافہ ہی کرتا ہے -" پھر وہ "خود نوشت زندگی" میں ایک جگہ لکھتا ہے

"مجھے اس بات کی خبر نہ تھی کہ ہسٹریا کا جنس [illegible] سے تعلق کو ثابت کرتے ہوئے میں طب کے ابتدائی اصولوں کی طرف جا رہا ہوں اور افلاطون کے خیالات کی اتباع کر رہا ہوں" اسی کتاب میں وہ دوسری جگہ لکھتا ہے "ارسطو نے خواب کی جو تعریف ـــــ سوتے میں ذہنی زندگی ـــــ کی تھی وہ آج بھی بالکل درست ہے -"

آپ نے دیکھا تجزیہ نفس کے دو بنیادی اصول یونانی افکار میں موجود تھے - یہ چند صدیوں کی بات نہیں بلکہ مسیح سے تین صدی قبل کی پرانی یادگار ہے - اس سے پتہ چلتا ہے کہ علمی نفسیات افلاطون اور ارسطو سے پہلے بھی موجود تھی -

قبل مسیح چھٹی صدی میں طبیبوں نے حواس کے ذریعہ علم کا خام مواد حاصل کرنے اور ذہن کے ذریعے اس میں پختگی پیدا کرنے میں امتیاز کرنا شروع کر دیا تھا - ان پر عیاں ہونے لگا کہ انسان میں کوئی ایسی قوت یا استعداد موجود ہے جس سے علم کے اجزا ہم آہنگی اختیار کرتے ہیں - پھر ان سے خیالات کی تخلیق ہوتی ہے - بمشکل معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں وہ احساس کے نظریے سے ہمہ گیر یا منتزع خیالات کی کھوج نکالتے -

اسی صدی میں فیثا غورس (۵۸۲ - ۵۰۶ قبل مسیح) یونانی ریاضی دان اور فلاسفر نے "غیر فانی روح جو فانی جسم میں مقید ہے" کا نظریہ پیش کیا - روح کی قید سے رہائی کا ذریعہ صرف موت تھا - اس نظریے نے اختلافات اور بحث کا ایک ایسا دروازہ کھول دیا - جس پر اب تک تبادلہ خیالات ہوتا رہتا ہے -

کیا انسان میں روح ہے ؟ اگر ہے تو کیا رُوح فانی ہے یا غیر فانی ؟ کیا روح اور ذہن ایک ہی چیز ہیں ؟ ذہن اور جسم کا ایک دوسرے سے کیا تعلق ہے ؟ کیا یہ دونوں ایک ہی نظام کے دو پہلو ہیں یا دو مختلف ہستیاں ؟

یہ وہ سوالات تھے جو فیثا غورث کے نظریے کے بعد پیدا ہوئے - لیکن دراصل یہ سوالات نفسیات کی ذیل میں نہیں آتے - ان کا براہ راست تعلق مابعد الطبیعات سے ہے - جس کا کام "ہونے اور جاننے" کے فلسفہ سے بحث کرنا ہے - مگر کئی صدیوں تک یہ خیالات نفسیات کی ذیل میں بھی زیر بحث آتے رہے - نفسیات "سائی کالوجی" کا ترجمہ ہے جس کے لغوی معنے "روح کا علم" ہیں - یہ لفظ یونانی الفاظ "سائی" کی معنی رُوح اور "لوگوس" معنی علم - کا مرکب ہے -

نفسیات اور مابعد الطبیعات کی حدیں کیسے مل گئی ہیں - اس کا پتہ لگانا آسان کام نہیں ہے - یہ فرق بالکل ویسا ہی ہے جیسا علم کیمیا اور علم طبیعات میں ہے یا علم کیمیا اور حیاتیات میں - اس علوم میں بعض مسائل ایسے آ جاتے ہیں - جہاں کسی ایک میں تمیز کرنا مشکل ہو جاتا ہے - یہی حال نفسیات اور مابعد الطبیعات کا ہے اور دوسری طرف نفسیات اور حیاتیات کی سرحدیں بھی ملتی ہیں - جہاں نفسیات اور حیاتیات (Biology) آپس میں مل جائیں تو "قدرتی سائنس" کی سرحدیں شروع ہو جاتی ہیں اور جہاں نفسیات نے مابعد الطبیعات اطوار اور اخلاق کا [illegible] چھیڑا تو یہاں سے فلسفہ کی مملکت شروع ہو گئی -

یونانی حکما نے فلسفہ میں بہت زیادہ ترقی کی - لیکن حیاتیات میں اُن کا علم کچھ خام ہی تھا - انہوں نے نفسیات کے دونوں پہلوؤں پر تحقیقات کی - مگر فلسفہ کے میدان میں وہ بہت کامیاب ثابت ہوئے اور دوسرا پہلو چونکہ سائنٹفک تھا اس لئے وہ ذرا کمزور رہا - ان کے بعد عیسائیوں نے اس میدان میں قدم رکھا - مذہب کی ابتدا تھی اس لئے ان کا سارا زور نفسیات کے روحانی پہلو پر مرکوز رہا -

افلاطون اور ارسطو اعصابی نظام سے بالکل ناواقف تھے - اُن کا عقیدہ تھا کہ احساس خیال اور قوت ہوا کے ذریعہ رگوں میں دوڑتے پھرتے ہیں - یہ غلط عقیدہ اٹھارویں صدی تک قائم رہا - ارسطو کا خیال تھا کہ "خیال" دل سے پیدا ہوتا ہے - افلاطون کے نزدیک خواہش کا مقام جگر تھا -

دونوں اس بات کو مانتے تھے کہ آدمی کا مزاج چار عناصر کا مرکب ہوتا ہے خون بلغم صفرا سودا لیکن انہوں نے "بے مسام غدودوں" Ductless glands کے بارے میں کبھی سنا بھی نہ ہوگا کہ جنہیں آج مزاج کی تغیر کا منبع مانا جاتا ہے -

(ہے باقی و ماہتاب باقی)

سوال و جواب

سوالات :-

(۱) میں نے ۲۶؍۶؍۴۲ کو ایک غزل شاہکار میں بغرض اشاعت ارسال کی تھی جس میں مطلع اوّل کا مصرع اولیٰ ع

بہ برہم آج کیوں کون و مکاں ہے

تھا۔ میں نے "کون و مکاں" کو واحد نظم کیا ہے۔ جہاں تک میری یادداشت کام کرتی ہے بعض اساتذہ نے بھی اسی طرح باندھا ہے لیکن اس وقت حافظہ میں کوئی شعر نہیں۔

کیا موقع و محل کے اعتبار سے یہ استعمال صحیح ہے مطلع ملاحظہ کیجئے ؎

یہ برہم آج کیوں کون و مکاں ہے
نظر کس کی بہ سوئے آسماں ہے!

(اصغر حسین راغب مراد آبادی - شمالہ مشرقی)

(۲) بعض اصحاب مصر ہیں کہ "صحافت نگاری" صحیح ہے - میں اسے غلط سمجھتا ہوں -

(۳) پروا کو پرواہ کیوں لکھا جاتا ہے ؟

(۴) اردو مرکب اضافی میں حرف اضافت و مضاف کے بعد از مضاف الیہ کا رواج عام ہوگیا ہے - مثلاً " میں نے کتاب جو آپ نے بھیجی تھی کے بیس صفحے پڑھ لئے ہیں -

(۵) بعض شعرا ہائے ہوز کو اشعار میں حروف علت کی طرح استعمال کر لیتے ہیں - مثلاً :-

" میرے دل کا اضطراب ہے بڑھ رہا "

کیا یہ جائز ہے ؟

(ایک افسرِ تعلیم)

جوابات :-

(۱) " یہ برہم آج کیوں کون و مکاں ہے "۔

کون و مکاں میں عطف بیانی ہے - مفہوم دونوں کا ایک ہے - اس لئے اس کی صحت میں کوئی شبہ نہیں - واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب -

نوٹ :- ایک سوال آپ نے اور کیا ہے مگر اس کا جواب دینا پرچے کی مصلحت کے خلاف ہے -

(۲) آپ کا خیال صحیح ہے - "صحافت" کے معنی اخبار نویسی کے ہیں - صحافت کہنا روا نہ ہوگا - اس کے معنی یہ ہو جائیں گے - اخبار نویسی نویسی -

(۳) متقدمین شعرا میں بعض نے "پروا" کو پرواہ لکھا ہے - یہ فارسی لفظ ہے اور پروا یعنی ہائے ہوز کے بغیر ہے - جنہوں نے اسے "پرواہ" لکھا ہے بےخبری کی بنا پر لکھا ہے -

(۴) "آپ نے جو کتاب بھیجی تھی میں نے اُس کے بیس صفحے پڑھ لئے ہیں -"

فقرے کے صحیح ہونے کی یہی صورت ہے -

مندرجہ سوال فقرہ بالکل غلط ہے -

(۵) آپ کا سوال مثال سے منطبق نہیں "ہے بڑھ رہا" تو تعقید لفظی کی صورت ہے - یہ تعقید مخل فصاحت ہے میں اسے روا نہیں سمجھتا -

دو سوال :-

(۱) ان اشعار میں کون کون سی صنعتیں ہیں ؟

(۱) تارے آنکھیں جھپک رہے تھے
تھا بام پہ کون جلوہ گر رات

(۲) ہوا ہے مدرسہ بھی درسگاہِ عیش و نشاط
کہ شمسِ بازغہ کی جا پڑھے ہیں بدرِ منیر

(۲) صحیح لفظ بے مِثل ہے یا بے مَثل ؟ (سید صابر علی سیالکوٹ)

جوابات :-

(۱) (۱) پہلے شعر میں بظاہر کوئی صنعت تو معلوم نہیں ہوتی - شعر کے پہلے مصرعے میں استعارہ ضرور ہے -

(۲) دوسرے شعر میں صنعتِ مراعاۃ النظیر ہے "شمس بازغہ" فلسفے کی مشہور کتاب اور "بدرِ منیر" میر حسن مرحوم دہلوی کی مشہور مثنوی ہے - بازغہ اور منیر ہم معنی الفاظ ہیں شمس اور بدر میں تلازمہ ہے -

(۲) بے مثل - بہ فتحۂ میم و سکونِ ثا صحیح ہے - **تاجور**

سیاسی

سوال و جواب

سوال - جبرالٹر کی تاریخی و سیاسی اہمیت کیا ہے؟

جواب - جبرالٹر اپنی فوجی اہمیت کے لئے صدیوں سے مشہور چلا آرہا ہے - اس کا اصل نام جبل الطارق تھا - جو بعد میں انگریزی زبان میں بگڑ کر جبرالٹر ہو گیا - جبل الطارق کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ جب آٹھویں صدی کے اوائل میں مشہور مسلمان فاتح طارق نے سپین پر حملہ کیا - تو وہ گھر سے تخت یا تختہ کی نیت کر کے نکلا تھا - سپین کے ساحل پر پہنچتے ہی اس نے وہ تمام کشتیاں جن کے ذریعے اس کی فوج سپین پہنچی تھی - وہیں ساحل پر جلا ڈالیں - اس کے رفقا نے اس کے اس فعل پر اعتراض کیا اور کہا کہ اس طرح جان بوجھ کر اپنی ہلاکت کا سامان کرنا اسلام کی رُو سے ناجائز ہے ہمارا اپنا ملک دُور ہے - یہاں ہم اجنبی ہیں - اگر خدانخواستہ واپس جانے کی ضرورت پڑی تو کیا کریں گے؟ طارق نے شمشیر آبدار کو نیام سے باہر نکالا اور مسکرا کر کہا - "اپنے ملک واپس جانے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ ہر ملک ہمارا ملک ہے - کیونکہ ہمارے خدا کا ملک ہے"۔ ع

ہر ملک ملکِ ماست کہ ملکِ خدائے ماست

طارق ہی کا قول ہے - اسی طارق نے جبرالٹر کی فوجی اہمیت کو سب سے پہلے بھانپا اور سن ۷۱۱ء میں یہاں ایک مضبوط قلعہ بنایا - یہ قلعہ سات سو سال تک عربوں کے قبضہ میں رہا - ان کی سلطنت کے زوال کے بعد سپین والوں کے قبضہ میں گیا - لیکن اٹھارھویں صدی کے آخر میں سپین نے برطانیہ سے جزیرہ مارنیورکا اور مشرقی و مغربی فلوریڈا لیکر جبرالٹر کو انگریزوں کے حوالے کر دیا - برطانیہ ۲۳۶ سال سے اس قلعہ پر قابض ہے - اور اب ہٹلر اور مسولینی کی شہ پر فرانکو اسے واپس لینے کے خواب دیکھ رہا ہے - لیکن اس خواب کے شرمندۂ تعبیر ہونے کی کوئی امید نہیں کی جا سکتی - جبرالٹر کے استحکامات نہایت مکمل اور تقریباً ناقابلِ تسخیر ہیں - کیونکہ وہاں رہنے والے بحری افسروں کے سوا کوئی ان کی تفصیل سے واقف نہیں ہے - اس سے پہلے جبرالٹر پر سن ۱۷۷۹ء میں ایک نہایت خوفناک حملہ ہو چکا ہے - سپین والوں نے سن ۱۷۷۹ء سے لیکر سن ۱۷۸۲ء تک پورے تین سال اس کا محاصرہ جاری رکھا - مگر لاکھوں روپیہ اور ہزاروں جانیں گنوانے کے باوجود وہ اسے فتح نہ کر سکے۔

جبرالٹر کے متعلق ایک دلچسپ بات یہ ہے - کہ برطانوی حکومت اسے ایک قلعہ کی بجائے ایک جنگی جہاز (BAHLESHIP) کے نام سے موسوم کرتی ہے - برطانیہ کی بحری فوج کے کاغذات میں بھی جبرالٹر کا نام دوسرے جنگی جہازوں کی طرح درج کیا گیا ہے وہاں اسے H. M. S. Cormorant کا نام دیا گیا۔ یعنی حضور ملک معظم کا جہاز کارمورنٹ -

سوال - مارکسی فلسفہ کی حقیقت کیا ہے؟

جواب - مارکس کا یقین تھا کہ انسانی سماج کی نشوونما کی تمام کوششوں اور مظاہروں میں زیادہ تر ایک ہی خیال کام کرتا رہا ہے - اور وہ خیال یہ ہے کہ زندگی کی اولین ضروریات کس طرح پوری کی جائیں اور کسبِ معاش کے ذرائع کا تحفظ کیسے ہو - اس کا طریقہ یہ نکالا گیا کہ آئینِ حکومت اور قوانینِ معاشرت کی پابندیاں عائد کی گئیں - مارکس کے خیال کے مطابق ہمارے آئینِ حکومت، طرزِ معاشرت، فلسفہ اور مذہب وغیرہ ان سب کی تہ میں اقتصادی ضرورت کا راز چھپا ہے - مارکس کہتا ہے - کہ زمانہ کی رفتارِ ترقی میں آئندہ ایسے دو انقلاب کا آنا لازمی ہے کہ جو دنیا کی تمام دولت و ثروت اور اقتدار اختیار کو متوسط درجہ کے شرفا اور امیروں اور جاگیرداروں کے ہاتھ سے نکال کر کاریگروں، مزدوروں اور کسانوں کے ہاتھوں میں یعنی جمہور کے ہاتھوں میں منتقل کر دیگا - دنیا کی ساری سماج مساوات کا رکھے گی - مرتبہ اور درجہ کے امتیازات مٹ جائیں گے اور صحیح معنوں میں جمہوریت اور آزادی کا دور قائم ہوگا - جس میں امیر و غریب کی تفریق جائے گی اور سب آزادی اور برابری کے دعویٰ سے خوش خوش زندگی بسر کریں گے - مارکس سرمایہ داروں اور دولتمندوں کو ان مظالم کے لئے جو وہ غریبوں پر ڈھاتے ہیں کوئی الزام نہیں دیتا - وہ کہتا ہے کہ یہ ان کا قصور نہیں بلکہ رائج الوقت نظام کا قصور ہے - اس نظام کے ماتحت نیک سے نیک دل سرمایہ دار کے لئے بھی مزدوروں پر ظلم کرنا لازمی ہے - اس کے علاوہ مارکس یہ بھی کہتا ہے کہ مزدوروں اور غریبوں کا ان امراء کا دشمن ہونا بھی لازمی امر ہے - کیونکہ موجودہ نظام کو

(بقیہ صفحہ ۳۷ پر ملاحظہ فرمائیں)

دل آرا - ع آبادی

جُرم

ایک روز بھیّا بازار سے آتے ہی سیدھے اپنے کمرہ میں چلے گئے۔ میں باورچی خانہ میں بیٹھی ہوئی پلاؤ کی یخنی تیار کر رہی تھی - امّاں دالان میں خالہ جی سے باتیں کر رہی تھیں - بچے صحن میں شور و غل مچا رہے تھے میں نے خیال کیا کہ شاید بچّوں نے انہیں چھیڑ دیا ہے اور وہ اپنی عادت کے مطابق غصّے کا اظہار کرنے کے لئے اپنے کمرے میں جا گھُسے ہیں - لیکن میں نے کسی کو "بھائی جان ——— تلی ——— لی ——— لی" کہتے تو سُنا نہیں تھا - نہ ہی "بابو صاحب - سہارن پور کا ٹکٹ دیدینا" ہی کسی نے کہا تھا - "

تھوڑی دیر میں اماں مزعفر کا بگھار دینے کے واسطے آئیں -

"دیکھوں تو کیسے چاول لایا ہے؟"

"وہ ادھر آئے ہی کہاں - سیدھے اپنے کمرے میں چلے گئے ہیں"

امّاں نے بھیّا کو پکارا ——— وہ آئے - ان کا منہ اُترا ہوا تھا -

"کیوں بیٹا - دشمنوں کی طبیعت خراب ہو گئی ہے کیا؟" خالہ اماں نے پوچھا -

"جی نہیں ———" بھیّا کچھ بولتے بولتے رُک گئے -

"تو پھر اتنے پریشان کیوں ہو رہے ہو؟"

"کچھ نہیں خالہ اماں - آج بازار میں ایسا منظر دیکھا کہ ———"

"کیوں - کیا ہوا بھیا؟" میں نے پوچھا -

"کرفیو آرڈر کی پہلی توپ چل چکی تھی - دوکان پر بہت بھیڑ تھی - میں نے دوسروں کی طرح دھکا پیل میں گھُسنا پسند نہیں کیا - الگ کھڑا ہو کر یہ دیکھنے لگا کہ ان آدمیوں سے بنیا بنٹ جائے تو میں چاول لے لوں - اتنے میں ایک اندھا اپنے کمسن لڑکے کے سہارے دوکان پر آیا - اس کے کپڑے صاف لیکن شکستہ تھے - صورت پر غربت و افلاس کی علامات صاف ظاہر تھیں - اس کے لڑکے نے بنیئے سے کہا "سیٹھ جی آٹھ آنے کا آٹا دینا -"

بنیے کے نوکر نے کہا "دوکان سے ہٹ کر کھڑا ہو - دیکھ دال کے ڈبے سے کھیل مت -"

"بابا ہمیں دُور جانا ہے - پہلی توپ چل گئی ہے - پہلے ہمیں دے دو" اندھا بولا "توپ چل گئی ہے - تو میں کیا کروں - جو مجھ سے پہلے کے آئے ہیں - انہیں کیا بھگا دوں -"

اندھا چپ ہو گیا - شاید اس نے سوچا جب اس کی باری آئے گی - بنیا خود ہی دے دیگا -

لیکن بنیئے نے اسے بڑی دیر تک کھڑا رکھا - یہاں تک کہ میں بھی چاول لے چکا ——— " اب دوکان پر بھیڑ کم ہو گئی تھی - توپ چلنے میں تھوڑی سی دیر تھی - اندھا لکڑی کے سہارے آگے بڑھا - لیکن بنیا دوکان بند کرنے لگا - اندھے کے لڑکے نے کہا -

"سیٹھ جی آٹا تو دے دو - پھر دوکان بند کرنا -"

"اب بہت زیادہ وقت ہو گیا -" بنیئے کے نوکر نے کہا

"سیٹھ آٹا دے دو - ورنہ آج بھی بھوکا سونا پڑے گا -" اندھے نے کہا

"ارے جاجا - اب آٹا نہیں ملے گا - مجھے بھی تو گھر جانا ہے -" بنیئے نے کہا - اور اس نے دوکان بند کر دی ——— "

"بڑے ظالم ہوتے ہیں یہ بنیئے" خالہ اماں نے مُنہ بنا کر کہا -

"ارے اس نے اس بیچارے اندھے تک کا خیال نہ کیا - آٹھ آنے کا آٹا دینے میں اسے ایسی کتنی دیر لگ جاتی" امّاں بولیں -

"اور کیا تھی خیرات تھوڑی مانگ رہے تھے وہ بیچارے" مجھ سے بھی چُپ نہ رہا گیا - بھائی جان نے پیشانی کا پسینہ پونچھتے ہوئے کہا -

"میں نے دیکھا کہ اندھے کی بے نور آنکھوں میں غم کی ایک لہر دوڑ گئی - لڑکے نے اس سے کہا "بابا اب ہمیں کہاں سے آٹا ملے گا!"

بڈھا بولا - "اب کل ہی کہیں سے خرید لیں گے - چلو گھر چلیں -"

"بابا صبح بھی تو کھانا نہیں کھایا تھا - مجھے تو بہت زور کی بھوک لگ رہی ہے - کیا تمہیں بھوک نہیں لگی؟"

"نہیں -"

"تو مجھے بھی نہیں لگی ——— چلو بابا جلدی گھر چلیں ورنہ سپاہی ستائیں گے -"

اندھے نے اس کو سینہ سے لگا لیا - میری آنکھوں سے آنسو نکل پڑے - مجھ سے یہ نہ دیکھا گیا - ایسے صابر لوگ بھوکے رہیں اور یہ میرے یہاں پلاؤ اور زردے پکیں! ——— میں نے وہ چاول ان دونوں کو دے دیئے! ——— "

"ہیں! ——" خالہ اماں چونک پڑیں۔

"چار سیر چاول —— ارے پورے دو روپیہ کے چاول تُو نے اسے دیدیئے ہیں؟"

اماں نے آنکھیں نکالتے ہوئے پوچھا۔

بھیا خاموش رہے

"بڑا سخی بنا تھا۔ اب یہاں کیا پکے گا تیرا سر؟"

"اماں وہ دو دن کے بھوکے تھے۔ میں نے بھیا کی طرفداری کی"۔

"بھوکے تھے تو کیا ہم نے ان کا ٹھیکہ لیا تھا؟"

"اور ان کے پاس تو دام تھے۔ کیا وہ دوسری جگہ سے نہیں لے سکتے تھے؟" خالہ اماں بولیں۔

"دوسری دوکانیں بند ہو گئی تھیں خالہ —— یہی تو وجہ تھی"

بھیا نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"رہنے دے اپنی وجہ! ——" اماں بڑبڑاتی ہوئی چلی گئیں

"اگر یہی لچھن رہے تو بچے تو گھر بار خاک پتھر چلائے گا!" خالہ اماں کہہ رہی تھیں!

میں سوچ رہی تھی کیا بھیا نے واقعی بُرا کیا؟!

(بقیہ سیاسی سوال و جواب)

خاتمہ اسی وقت ہوگا کہ جب ان دونوں گروہوں میں دشمنی اس حد تک بڑھ جائے کہ از خود ہنگامہ برپا ہو جائے۔ مارکس کی رائے میں پہلے مزدوروں، کسانوں اور کاریگروں کا طبقہ ہر شہر۔ قصبہ اور گاؤں میں اپنی جمعیت تیار کرے گا۔ پھر یہ اپنا نظام ملک اور قوم کی حیثیت سے ترتیب دینگے لیکن ان کی نجات کا وقت جب ہی آئے کہ جب یہ جمہور قومی اور ملکی تفریق مٹا کر بین الاقوامی حیثیت سے اپنے تئیں مضبوط اور متحد کر کے دنیا کے سرمایہ داروں اور دولتمندوں کے خلاف جنگ چھیڑیں گے اور ہنگامہ برپا کریں گے۔ مارکس نے اپنے انہیں خیالات کو نہایت وضاحت اور تصریح کے ساتھ ۱۸۴۸ء کے اعلان میں بیان کیا ہے اور اس کی تصنیف (CAPITAL) سرمایہ تو جامعیت کے لحاظ سے اس فلسفہ کا بیش بہا خزانہ ہے۔ مارکسی فلسفہ کے آگے چل کر بہت سی شاخیں ہو گئی ہیں اور سوشلزم یا اشتراکیت بھی اب وہ نہیں رہی۔ جس کا پرچار مارکس نے کیا تھا۔ بلکہ اب اس نے مختلف ملکوں اور قوموں میں مختلف شکلیں اختیار کر لی ہیں۔ ان میں سے مشہور کمیونزم (communism) انارکسٹ کمیونزم (ANARCHIST Communism) سٹیٹ سوشلزم STAT (SOCIALISM) اور سنڈیکلزم (SinDICALISm) وغیرہ ہیں

خان احمد سعید خاں بی۔اے

ٹائم اسکیل تعلیم

یہ امر محتاج بیان نہیں کہ حکومت پنجاب نے نیا ٹائم اسکیل منظور کرنے میں نہ صرف صوبہ پنجاب پر بلکہ تمام ہندپر اور اہلِ ہند پر احسانِ عظیم کیا ہے۔ فی الحقیقت یہ ایک عظیم الشان قومی کارنامہ ہے۔ جس کے گراں مایہ نتائج سالہا سال تک روز افزوں حالت میں ظاہر ہوتے رہیں گے۔ حسنِ اتفاق سے حکومت پنجاب کا یہ اقدام واردھا اسکیم اور روڈیا مندرا اسکیم کی کوتاہ نظری کا ایک عملی اور نہایت ہی موزوں جواب ہے اور یہ اس امر کا بھی صحیح اعتراف ہے کہ صرف اساتذہ اور مدرسہ جات ہی صحیح معنوں میں ایک مستقل قومی زندگی کا سرچشمہ بن سکتے ہیں۔ غالباً انہیں خیالات کو لیتے ہوئے پنجاب کی بیدار مغز حکومت نے محکمہ تعلیم کے سسکتے ہوئے مریض کو اس اعجاز مسیحائی کے ذریعے نہ صرف جان بحق ہونے ہی سے بچالیا ہے بلکہ اس کو ایک قابلِ رشک زندگی بھی بخش دی ہے۔ ضروریاتِ وقت اور حادثاتِ زمانہ نے یہ حقیقت قطعی طور پر روشن کردی ہے کہ مدرسہ جات کی زیادہ سے زیادہ تکمیل کئے بغیر دنیا کی اعلےٰ سے اعلےٰ تہذیب بھی ایک دلچسپ خواب بن کر رہ جائے گی اور مہلک عناصر ہمیشہ عدل و انصاف صلح و آشتی کے آشیانوں کو آگ دکھاتے رہیں گے۔ اس خیال کے پیشِ نظر استاد نہ صرف مقامی طلبا کی قسمت کا معیار بلکہ قومی اور بین الاقوامی زندگی کا بانی مبانی اور لیڈر بن جاتا ہے۔

اِس وقت یہی معاملہ غور طلب ہے کہ کیا صرف ٹائم اسکیل کے قائم ہوجانے ہی سے پنجاب کا مدرس اس اہم فرضِ انسانیت کے سرانجام دینے کے قابل بن جائے گا۔ اگر نہیں تو اور کونسی تبدیلیاں ہیں جو حالات حاضرہ میں عمل میں لائی جاسکتی ہیں۔ جن کے برسرِ کار ہوجانے سے خود بھی منزل مقصود پر پہنچ سکے۔ اور جماعت انسانی کو بھی ہلاکت کے بھنور اور مظالم کی چٹانوں سے بچاتا ہوا امن، انصاف اور نیکی کے کنارے آتارے۔ موجودہ عالمگیر جنگ اگرچہ ہماری تعمیری ترقیوں میں بہت حد تک حائل ہے لیکن خیال ہے کہ دنیا کے عظیم ترین اصلاحی پروگرام دورانِ جنگ یا دورانِ مصیبت میں ہی مرتب اور عمل پیرا ہوئے ہیں۔ کیونکہ امن کے وقت عموماً عشرت اور کاہلی کی زنجیریں ہم کو شاہراہِ ترقی پر قدم بڑھانے سے روکتی ہیں۔ میرے خیالِ ناقص میں تین ایسی اصولی ضروریات ہیں جنکے پورا ہوجانے پر سرزمین پنجاب تمام ہند کیلئے زندگی اور زندہ دلی کا ایک اعلیٰ نمونہ بن جائیگی۔

پہلی ضرورت ٹائم اسکیل سے ہی متعلق ہے اور یہ کہ ہر درجے کے بعد لیاقتی مزاحمت (ایفیشنسی بار) قائم کردیا جائے جیسا کہ محکمہ ڈاکٹری میں مروج ہے۔ آئندہ ترقی کا اسی شخص کو مستحق سمجھا جائے۔ جو ایک خاص لیاقتی امتحان میں جو اس مقصد کے لئے ہو۔ کامیاب ہوجائے۔ اس امتحان میں واقفیتِ عامہ کو خاص اہمیت دی جائے۔ اس طریقے سے اساتذہ میں مطالعہ اور غور و فکر کا مادہ پیدا ہوتا رہیگا۔ اور اسی شوق کو وہ طلبا میں بھی پیدا کرنے کی کوشش کریں گے۔ اساتذہ کی شخصیتوں میں ایک انقلابی تبدیلی ہوتی رہے گی۔ جس کے بغیر وہ طلبا کے چال چلن اور شخصیت کو کسی موزوں سانچے میں ڈھالنے سے قاصر رہیں گے۔ دوسرے الفاظ میں صاحب شخصیت اور قابل استاد پیدا کئے بغیر محکمے کی تمام کوششیں اور اسکیمیں بہت حد تک ناکامیاب ثابت ہوتی رہیں گی۔

واضح رہے کہ اِس سلسلے میں جو اخراجات بھی ہوں گے وہ سب کے سب فیس امتحان سے پورے کئے جاسکیں گے۔

دوسری اہم ضرورت یہ ہے کہ اساتذہ کو ایک منظم جماعت میں تشکیل دیا جائے اور یہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ تمام صوبے میں مدرسین کی تحصیل وار انجمنیں قائم کی جائیں اور ان انجمنوں کا اجلاس عام سال میں کم از کم دو مرتبہ ہو۔ ہر تحصیل سے کم و بیش پانچ نمائندے ضلع کے اجلاس کے لئے سال میں ایک بار اکھٹے ہوں۔ اور وہ نمائندے اور ضروری کارروائی کے لیے علاوہ پانچ نمائندے صوبہ کی کانفرنس کے لئے منتخب کریں۔ اس طرح صوبہ کے تمام اضلاع کے نمائندے ہر سال ایک جگہ اکٹھے ہوکر اپنی تکالیف اور ضروریات کو محکمے کے سامنے پیش کرسکیں گے۔ اس کانفرنس کی تمام کارروائی کو چھپوا کر ہر تحصیلی سنٹر میں تقسیم کیا جائے۔ اور ہر مرکزی اجلاس میں اس کو پڑھ کر سنایا جائے۔ اس میں بھی گورنمنٹ کو کوئی خرچ برداشت نہ کرنا پڑے گا اور معمولی

اخراجات تحصیلی انجمنوں سے برداشت کئے جاسکیں گے - صوبجاتی پیمانے پر مدرسین کی یہ کانفرنس قلیل مدّت میں ہی دوررس اور حیرتناک نتائج پیدا کر دکھائے گی - اوّل تو مدرسین میں جو اُس وقت اپنے وجود کو بے حقیقت اور بے معنی سمجھے بیٹھے ہیں - خودداری کی ایک زبردست لہر دوڑ جائے گی اور وہ محسوس کرنے لگیں گے کہ وہ ایک ایسی مشین کے کل پرزے ہیں جو ہر سال روبہ ترقی ہے اور جس پر بہت حد تک تمام قومی زندگی کا دارومدار ہے - اساتذہ اپنی زندگی اور فرضِ منصبی کے اعلےٰ مقصد کو بہت جلد سمجھ جائینگے اور اپنے کام میں زیادہ دلچسپی لینے لگیں گے - علاوہ ازیں وہ ایک مفید قابل عمل اور مکمل نصاب تعلیم مرتب کرنے میں بھی کامیاب ہوسکیں گے - اس طرح محکمے کو ہزاہا لوگوں کے تجربات اور غور و فکر کے نتائج کسی خرچ اور ہرج کے بغیر میسر ہو جایا کریں گے -

سب سے آخری اور سب سے اہم ضرورت یہ ہے کہ حکومت یک لخت یا بتدریج تمام مدرسہ جات کے بارِ گراں سے لوکل باڈیوں کو سبکدوش کر دے - اور ان کے نظام کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں سنبھال لے - موڈل اسکولوں سے اس کی ابتدا بھی کی جاسکتی ہے اور تجربہ بھی - ان علاقوں میں جہاں کم اوسط تعداد یا اوسط حاضری کی کمی کے سبب گورنمنٹ اپنا اسکول کھولنا ضروری نہ سمجھے وہاں کوئی اسکول بھی نہ ہونے سے لوکل باڈی کا اسکول ہونا ہی مناسب ہے - بیہماری بدقسمتی تھی یا سوءِ اتفاق کہ محکمہ تعلیم کو بھی اُن شعبہ جات میں شامل کر لیا گیا - جو عوام کی تربیت خود اختیاری کے لئے منتخب کئے گئے تھے - اس تجربہ سے جو قومی نقصان ہوا ہے - اس کا بیان کرنا نہ مفید ہے اور نہ مناسب - لیکن یہ ضرور ہے کہ اگر محکمہ جات پولیس اور عدالت کو بھی لوکل باڈیوں کے سپرد کر دیا جاتا تو شاید عوام ہند کو اس سے زیادہ نقصان نہ پہنچتا - جو محکمہ تعلیم کے ان کی تحویل میں آجانے سے ہوا ہے - کئی سال ہوئے جبکہ کمشنر تعلیم ہند نے پرائمری تعلیم پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ لوکل باڈیوں کے وسیلہ جو رقم خطیر خرچ کی جارہی ہے وہ بہت حد تک اکارت جارہی ہے - یہی رائے باقی تعلیم کے متعلق بھی درست ہے - بدعملی کے زیرِ تحت جو نقصان مدرسین اور مدارس کو پہنچ رہا ہے اس کے دور ہونے میں ایک مدت درکار ہوگی - تعلیم جیسا شعبہ لوکل باڈیوں کی بجائے صوبجاتی حکومت کے زیرِ نگرانی ہی کہیں بہتر کام کرسکیگا اور اساتذہ بھی بلحاظ وسعت خیالات اور فرض شناسی بہتر حالت میں ہوجائیں گے -

میرے خیالات ناچیز کے مطابق اگر ان امور میں سنجیدگی سے غور کیا جائے اور صحیح طور سے عمل کیا جائے تو دیکھتے دیکھتے ہی سرزمین پنجاب سے جہالت گمراہی اور پست خیالی کی دردناک داستان ہمیشہ کیلئے ختم کی جاسکتی ہے -

فلمی دُنیا

کیا فلموں پر تنقید کرنے کیلئے کوئی معیار ہے

(معیاری فلم کے اجزائے ترکیبی اور ان کا تجزیہ)

یہ مضمون ان حضرات کی خاطر لکھا گیا ہے جنہوں نے لبنت ہٹیش ماسٹر اور آنکھ مچولی پر ہماری تنقید کے متعلق یہ پوچھنے کی زحمت گوارا فرمائی ہے کہ ہم نے کس معیار پر ان فلموں کو جانچا۔ اس سوال کی عمومی حیثیت نے ہمیں ترغیب دی۔ کہ اس موضوع پر قدرے تفصیل سے روشنی ڈالی جائے۔

عوام کے مذاق کا اندازہ لگانا آسان نہیں۔ معاصر فلم انڈیا کے ایڈیٹر مسٹر بابو راؤ پٹیل سے کسی نے پوچھا کہ آپ نے کبھی کسی فلم کو ایک سے زیادہ مرتبہ دیکھا ہے؟ آپ نے جواب دیا۔ کہ ہاں آج تک صرف ایک فلم یعنی خزانچی میری نظروں سے گذرا ہے۔ جسے دوسری مرتبہ دیکھنے کی خواہش اس لئے پیدا ہوئی کہ میں دیکھوں آخر وہ کونسی چیز ہے جس نے اس فلم کو احاطۂ بمبئی میں اس درجہ مقبول بنا دیا۔

منگنی دیکھنے کے بعد میرے دل میں یہ سوال اُٹھا کہ اس کی حیرت انگیز مقبولیت کا راز کیا ہے۔ اس کے برعکس ایسے فلم بھی ہیں۔ کہ عوام ان کی بلندی معیار تک پہنچ نہ سکے۔ لہٰذا وہ مالی اعتبار سے ناکام رہے۔

تنقیح طلب امر یہ ہے کہ فلموں کے لئے کوئی ایسا معیار قائم کیا جا سکتا ہے جس کی روشنی میں ان کا جائزہ لیا جا سکے۔ بالفاظ دیگر ایک کامیاب فلم کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں۔ ایک فلم میں کونسی باتیں ہیں جن سے متاثر ہو کر ناظرین نعرۂ تحسین بلند کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

کامیاب فلم کے اجزائے ترکیبی

ظاہر ہے کہ ڈرامہ میں انسانی زندگی کا بصیرت افروز یا دلچسپ یا ہر دو پہلو پیش کئے جاتے ہیں۔ تھیٹریکل یا فلمی کہانی کا انجام دردناک ہو یا الم انگیز یا وہ اوّل سے آخر تک قہقہہ کی محرک ہو وہ ناظرین کی توجہ کا مرکز اسی صورت میں بن سکتی ہے جب اس کے مختلف مراحل میں کشمکش کی کیفیت پیدا ہو۔ دیکھنے والے اندازہ نہ لگا سکیں کہ اب کیا ہو گا ڈرامائی عناصر فلمی کہانی کی جان ہیں۔ آپ لبنت میں ایکٹرس اور اس کی گمشدہ لڑکی کی ملاقات کا سین دیکھتے ہیں۔ ممتاز شانتی کا خاوند اس ملاپ کو توڑتا نہیں دیگر فلم کا یہ مرحلہ اپنی ڈرامائی نوعیت کے باعث ازبس توجہ کش ہے۔ اس ضمن میں ایک اور نکتہ یاد رہے۔ واقعہ اس قسم کا ہو۔ کہ لوگوں کو غیر ممکن نظر نہ آئے۔ دیکھنے والا صرف اتنا کہہ دے کہ ہاں یوں بھی ہو سکتا ہے۔ غرضیکہ اچھے فلم کی اولین شرط یہ ہے کہ جو واقعات پردۂ سیمیں پر رونما ہوں۔ وہ ڈرامائی نوعیت کے ہوں اور ممکنات کی حدود کے اندر ہوں۔

مکالمہ مختصر اور معنی خیز

مکالمہ کی گرانباری ایک مشہور امریکن ڈائرکٹر کے الفاظ میں کمبل کا کام دیتی ہے۔ ہر چہ گیرد مختصر گیرد کی صداقت ان فلموں سے آشکارا ہے۔ جن کے طویل مکالموں سے لوگ تنگ آ جاتے ہیں۔ حد سے بڑھا ہوا ڈائلاگ فن اداکاری کو اُبھرنے نہیں دیتا۔ فلمی ڈرامہ کو سیٹھی بنا دیتا ہے۔ معنی خیز مکالمہ سے میرا مطلب یہ ہے کہ گفت و گو کے سلسلہ میں دلچسپ اور شگفتہ باتیں ہوں۔ ان کا موضوع پیش پا افتادہ نہ ہو۔ مجھے یہ کہنے میں ذرا باک نہیں کہ بہترین مکالمے نیو تھیٹرز کے فلموں میں ہیں۔ اس باب میں کمال امروہی کی مکالمہ نگاری قابل داد ہے۔ دھوپ چھاؤں اور سکندر میں سدرشن کے زور نگار قلم نے بے شمار لطافتیں پیدا کر دیں۔ فلم قیدی کی غیر معمولی ناپسندیت بہت حد تک اس کے زوردار مکالمہ اور ڈرامائی واقعات کے تسلسل کے باعث تھی۔ فلمی گفت و شنید طولانی ہو۔ دوسرے لفظوں میں اگر مختلف کیرکٹر باتیں کرتے چلے جائیں۔ تو الفاظ کی بھرمار میں ان کی سیرت کے خط و خال دھندلے پڑ جائیں گے۔ کوئی فلم اعلیٰ درجہ کا ہو نہیں سکتا۔ اگر اس کا مکالمہ متوازن مختصر اور جامع نہ ہو۔

اداکاری منحصر ہے....

معیاری فلم کی تیسری شرط ہے اداکاری کی خوبی۔ ڈرامائی انداز کا واقعہ ہو۔ ڈرامہ نگار نے مکالمے میں تیر و نشتر رکھ دیئے ہوں۔ تو اداکار کو اپنا جوہر دکھانے کا موقع مل جاتا ہے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہو گا۔ کہ اکثر اوقات سامعین جو خراج تحسین ایکٹر کو پیش کرتے ہیں۔ وہ از روئے انصاف مکالمہ نویس کو ملنا چاہیئے۔ تھیٹریکل ڈرامہ کی ایک اصلاح ہے یہ ایکٹر پروف پارٹ؟ یعنی ایسا پارٹ جسے ادا کرنے کے لئے خاص اداکاری کی ضرورت نہیں۔

اوسط سے کم درجہ کا ایکٹر بھی اسے بخوبی ادا کر سکتا ہے۔ فی الواقعہ ایسے ڈرامے ہیں۔ جن کے کردار "فولادی سانچے" میں ڈھلے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ مثلاً ظالم بادشاہ کے پارٹ میں زوردار مکالمہ ہو۔ تو ایکٹر کا کمالِ فن اور بھی نمایاں ہو جائے گا۔ حقیقی اداکاری کا مظاہرہ ان ڈراموں میں ہو سکتا ہے جنہیں نفسیاتی کہتے ہیں۔ ہیملٹ کا کردار سراسر نفسیاتی ہے اور شیکسپیر سے لیکر آج تک ہر سٹیج پر ایکٹر کی یہ خواہش رہی ہے کہ وہ اس کردار کو اپنے نقطۂ نظر سے پیش کرے۔ فرانس کی مشہور ایکٹرس "سارہ برن ہارٹ" کی شہرت نصف النہار تک پہنچ گئی جب تھیٹریکل دنیا نے اسے ہیملٹ کے روپ میں دیکھا۔ نفسیاتی ڈراموں کا ایک دلچسپ پہلو یہ ہے۔ کہ کردار کو نبھانے کے لئے ہر اداکار اپنے مخصوص ٹیکنیک سے کام لیتا ہے۔ اس طرح ڈرامہ کے کیرکٹر میں بوقلموں دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے۔ ایسے کیرکٹر کا حقِ ترجمانی ادا کرنا ہو تو اس کے لئے کاملِ فن کی ضرورت ہے۔ تاکہ ڈرامہ انتہائی بلندی تک پرواز کر سکے۔

کیرکٹر ایکٹر

ڈرامہ نگار کا کمال یہ ہے کہ وہ ایسے کردار پیش کرے۔ جو عالمگیر دلچسپی کے حامل ہوں۔ وکٹر ہیوگو کے شہرہ آفاق ناول "مصیبت زدگان" میں انقلاب فرانس کی حیرت انگیز تصویریں ایسی خوبی سے رونما ہیں۔ کہ دیکھنے والا ان میں گم ہو جاتا ہے۔ اس ناول کے فلمی ڈرامہ میں کبڑے کا پارٹ لان چینی آنجہانی کے سپرد تھا اور وہ اپنے میک آپ اور اداکاری کے طفیل ایک ایسی شخصیت بن جاتا تھا۔ جس کا تصور وکٹر ہیوگو کے تخیل میں تھا۔ موجودہ ایکٹروں میں پال منی نے کم و بیش ایک درجن کردار ایسی نفاست سے نبھائے ہیں۔ کہ آپ اسے پہچان نہیں سکتے۔ وہ ہر مرتبہ کبھی سائنس دان کبھی مجرم کبھی فوجی افسر کبھی چینی کسان کے بھیس میں اس انداز سے آتا ہے کہ نقل اور اصل میں ذرہ بھر فرق نہیں رہتا۔

موضوع

شکر ہے کہ ہمارا فلم آرٹ بیش از پیش پیمانہ پر ہماری موجودہ معاشرت کا آئینہ دار ہو رہا ہے۔ علم الاصنام سے متعلق پارینہ داستانوں کو کچھ مدت کے لئے طاق پر رکھ دیا گیا ہے۔ یہ بھی غنیمت ہے۔ وہ آرٹ زندہ نہیں رہ سکتا۔ جس کی نظریں ہمیشہ گذرے ہوئے زمانہ کی طرف لگی رہیں۔ عوام کو موجودہ مسائل کی اہمیت سے روشناس کرنا بذاتہ ایک بھاری قومی خدمت ہے۔ زمانۂ قدیم کی نیم مذہبی اور روائتی کہانیوں کو رہنے دو۔ اور عہد حاضرہ کے سنجیدہ سوالات پر روشنی ڈالو۔ بہرحال موضوع خالص مذہبی ہو یا تاریخی، سوشل ہو یا سیاسی فلمائی ہوئی کہانی میں واقعیت ضرور ہونی چاہیئے

"واقعیت" ہماری قلم کا عنوان ہے اور واقعیت سے یہ مراد ہے کہ ہیرو انسان ہو فرشتہ نہ ہو، شیطان نہ ہو، دیوزاد نہ ہو، بعض تصویروں میں ہیرو پہاڑوں جنگلوں اور دریاؤں کو کمال بے تکلفی سے پھاندتے دکھائی دیتے ہیں، مسلح لشکر کا مقابلہ کرتے ہیں اور ان کا بال بیکا نہیں ہوتا۔ ہیروئن کو اس قسم کی نیکی اور شرافت کا مظہر بتایا جاتا ہے۔ جو کم از کم اس کرۂ ارض پر نہیں ملتی۔ اور اگر ملتی ہے تو حماقت کے روپ میں وہ زہر پی جاتی ہے۔ لیکن "آملکبن" کی وجہ سے اس پر زہر اثر نہیں کرتا۔ یا اپنے آوارہ گرد پریمی کے فراق میں ڈوب مرتی ہے۔ اور پھر ان دونوں کی لاشیں دریاؤں کے سنگم پر باہم لپٹ جاتی ہیں۔ واقعیت سے انحراف کی یہ چند مثالیں ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے گویا فلم ساز فلم بین پبلک کو احمق سمجھتے ہیں۔ انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ بیشتر بالغ اشخاص فلمیں دیکھتے ہیں۔ وہ پردۂ سیمیں پر زندگی دیکھنا چاہتے ہیں۔ واقعات جو الف لیلہ سے اخذ نہ کئے گئے ہوں۔ بلکہ بیسویں صدی سے متعلق ہوں اور ہندوستانی معاشرت پر مبنی ہوں۔ دور از کار نہ ہوں۔ اور غلو و غرابت سے معرا ہوں۔

آخری شرط

ڈرامہ سٹیج سے متعلق ہو یا سکرین سے اس کی کامیابی کے لئے متذکرہ بالا شرائط کے لئے ایک ایسی چیز کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے۔ جس کا انحصار پروڈیوسر پر ہے۔ اسے اصطلاح میں ڈرامہ کا احساس کہتے ہیں۔ یہ احساس ایک لطیف شے کی طرح ساری داستان پر چھا جاتا ہے اور اس کے زیر اثر ناظرین نقالی کو حقیقت سمجھنے لگتے ہیں۔ یہی فریب نظر ہے۔ جس میں ڈرامہ کی سحرکاری کا راز مضمر ہے۔ لوگ تھیٹر سے باہر نکل کر اسی کے زیر اثر یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ کہ واہ لطف آگیا۔ کبھی یوں بھی ہوتا ہے۔ کہ کسی آرٹسٹ کی کوئی ادا لوگوں کو بھا جاتی ہے۔ کوئی ترانہ، کوئی غزل کوئی فریاد کوئی اشارہ یا کنایہ کوئی فلسفیانہ نکتہ کسی ایکٹرس کی عشوہ طرازی کسی ایکٹر کے اظہار عشق کا انداز کوئی قدرتی سین کسی مکالمہ کا ٹکڑا ایک معمولی ڈرامہ کو پستی سے بلندی کی طرف لے جاتا ہے۔

ایک فلم میں مارسین ڈیٹریش کا عاشق صحرا میں گم ہو جاتا ہے اور ڈیٹریش کی آنکھیں گھوڑوں کی ٹاپ سے اٹھتے ہوئے گرد و غبار کو ایسی وارفتگی سے دیکھتی ہیں کہ ناظرین کلیجہ تھام لیتے ہیں۔ گریٹا گاربو کسی روپ میں آجائے اس کی شخصیت نہ صرف اداکاروں بلکہ دیکھنے والوں پر اس درجہ مسلط ہو جاتی ہے کہ وہ ڈرامہ کی سپرٹ میں کھو جاتے ہیں۔ سٹی لائٹس میں گلفروش عورت اپنے محسن سے پوچھتی ہے کہ کیا یہ تم تھے جس نے میری دنیا ہی بدل ڈالی اور جواب میں چارلی چپلن اس کی طرف اس انداز سے دیکھتا ہے۔ کہ ایک بہت بڑے نقاد کے الفاظ میں اس ایک لمحہ کی قیمت دس لاکھ ڈالر سے کم نہیں۔

رجسٹرڈ ایل نمبر ۳۵۱۸ شاہکار۔ لاہور